سالِ اجرا موسمِ بہار ۱۹۳۰ء ——— عرصۂ اشاعت ۱۴ سال

قصر الادب کا خالص علمی۔ ادبی اور فنی ماہنامہ

شاعرِ آگرہ

زیرِ سرپرستی

اعلیٰحضرت رسوا مظلومی والیٔ پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ

محکمہ ہائے تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار۔ ریاست میسور۔ ریاست کشمیر!!

چندہ سالانہ

عوام سے	۴	معاونین سے	۲۴
خواص سے	۶	مربیوں سے	۵۰
ہمدردوں سے	۱۲	محسنین سے	۶۰
انیسوں سے	۱۵	سرپرستوں سے	۱۲۵

ششماہی عہ ——— فی پرچہ ۶/

اشاعت گاہ مکتبۂ قصر الادب آگرہ

شجرۂ مربی، معاونین اور انیسان و ہمدردان شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ روپے سالانہ
(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیتر خورجوی ۶۰ روپے سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کیتانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ روپے سالانہ
(۴) محسنۂ ادب شہزادی تاج بخت صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ روپے سالانہ
(۵) محسنِ ادب جناب محترم وزیرزادہ شجاعت خانصاحب مہر جوناگڈھی ۶۰ روپے سالانہ

مربیانِ ادب و شعر

(۶) مربیِ ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں سر کرنل حشمت اللہ خاں مرحوم کے۔ بی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵۰ روپے سالانہ
(۷) مربیِ ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز و اسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹا نگر) ۵۰ روپے

معاونین ادب

(۸) معاونِ ادب مسٹر اے۔ پی۔ فلیس صابر بی۔ اے اکبر آبادی ۲۴ روپے سالانہ
(۹) معاونۂ ادب کنز مرکو تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی مدیرہ رسالہ ادیب دہلی ۲۴ روپے سالانہ
(۱۰) معاونِ ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی بمبئی ۲۴ روپے سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۱) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندہری ۱۲ روپے سالانہ
(۱۲) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ روپے سالانہ
(۱۳) ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ شکور حسین خانصاحب قیس آف ہنڈو ۱۲ روپے سالانہ
(۱۴) ہمدردِ ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب یزدانی ذکی جمشید پور ۱۲ روپے سالانہ
(۱۵) ہمدردِ ادب جناب صاحبزادہ سید مظفر حسین صاحب [illegible] رئیس و زمیندار (دان رادھارام) ۱۲ روپے سالانہ
(۱۶) ہمدردِ ادب جناب سمعیل کھوکھر صاحب راز جوناگڈھی ۱۲ روپے سالانہ
(۱۷) ہمدردِ ادب جناب خانصاحب عبدالحمید خاں آف مانا ودر ۱۲ روپے سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۸) جناب صاحبزادہ سلطان حامد خانصاحب تروت گلشن آبادی ۶ روپے سالانہ
(۱۹) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ۶ روپے سالانہ
(۲۰) جناب عبدالحفیظ صاحب ناصر صدیقی پھلواری بی۔ اے ۶ روپے سالانہ
(۲۱) جناب لالہ گنگارام صاحب آبد سرہندی ۶ روپے سالانہ
(۲۲) جناب سید مظفر حسین صاحب عزمی دہلی ۶ روپے سالانہ
(۲۳) لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور ۶ روپے سالانہ
(۲۴) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶ روپے سالانہ
(۲۵) جناب محمد عبید اللہ خاں صاحب بزم امروہوی ۶ روپے سالانہ
(۲۶) جناب [illegible] حسن خانصاحب [illegible] بمبئی ۶ روپے سالانہ
(۲۷) جناب نذیر احمد صاحب نذیر [illegible] کوٹ
(۲۸) جناب [illegible] صاحب رشید صدیقی امروہوی ۶ روپے سالانہ
(۲۹) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ۶ روپے سالانہ
(۳۰) جناب [illegible] صاحب [illegible] ٹونکی ۶ روپے سالانہ
(۳۱) جناب [illegible] صاحب [illegible] جنوں ۶ روپے سالانہ
(۳۲) [illegible] ۶ روپے سالانہ
(۳۳) جناب حبیب حسن خانصاحب حبیب شاہجہانپوری (کوئٹہ) ۶ روپے سالانہ
(۳۴) جناب بابو نفیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) ۶ روپے سالانہ
(۳۵) جناب بشیر پرشاد صاحب برگ باندوی ۶ روپے سالانہ
(۳۶) جناب حکیم مولوی عبدالرحمن صاحب شاعر کاندھلوی ۶ روپے سالانہ
(۳۷) جناب علامہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ روپے سالانہ
(۳۸) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر نہٹوری ۶ روپے سالانہ
(۳۹) جناب کنور فاروق علی خاں صاحب عارف رئیس ہنڈو ۶ روپے سالانہ
(۴۰) جناب صوبہ دار اختر علی صاحب اختر گوالیاری ۶ روپے سالانہ
(۴۱) جناب ڈاکٹر ماتا پرشاد صاحب استھانہ زیب بریلوی ۶ روپے سالانہ
(۴۲) جناب مقبول احمد صاحب سحر اعظم گڈھی ۶ روپے سالانہ
(۴۳) جناب مولوی مظہر الدین صاحب مظہر راماسی گورداسپوری ۶ روپے سالانہ
(۴۴) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ روپے سالانہ
(۴۵) جناب مولوی محمد احسان حسن خانصاحب احسان موضع پھلواری (بہار) ۶ روپے سالانہ
(۴۶) جناب مولوی نعیم الدین صاحب تیمدر امارہ (میرٹھ) ۶ روپے سالانہ
(۴۷) جناب عطاء الرحمن صاحب عطا جالندہری دہلی ۶ روپے سالانہ
(۴۸) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب بڑودانی اسٹیٹ ۶ روپے سالانہ
(۴۹) جناب الیس بشیر احمد صاحب فاروقی رکن ادارۂ "الاسلام" کوئٹہ ۶ روپے سالانہ
(۵۰) جناب بابو من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی۔ پی) ۶ روپے سالانہ
(۵۱) جناب میاں محمد مخدوم صاحب رئیس چک نیانہ (پنجاب) ۶ روپے سالانہ
(۵۲) جناب محمد حسین صاحب خادم شنوی دہلی ۶ روپے سالانہ
(۵۳) جناب چودہری حیم یار صاحب سندیلہ ۶ روپے سالانہ
(۵۴) جناب سید شاہ عنایت مولیٰ صاحب تابانی القادری مناپور (بنگال) ۶ روپے سالانہ
(۵۵) جناب جمعدار سی۔ پی۔ مجاور صاحب بمبئی ۶ روپے سالانہ
(۵۶) جناب شیخ عبدالرحمن صاحب شباب دہلوی ریواڑی ۶ روپے سالانہ
(۵۷) جناب ملک قربان حسین صاحب شہید جہلمی بمبئی ۶ روپے سالانہ
(۵۸) جناب عبدالرؤف صاحب ذوق سکریٹری اقبال لائبریری نندا گنج (گیا) ۶ روپے سالانہ
(۵۹) جناب رگھوندر راؤ صاحب جذب عالمپوری ۶ روپے سالانہ
(۶۰) جناب سید یوسف پیر صاحب تیر تکمی۔ جمعدار حکم ۶ روپے سالانہ

تعارف

تصویر :- وحید العصر حضرت بیخود دہلوی جانشینِ مرزا داغ دہلوی

جلد ۱۴ | جنوری سنہ ۱۹۴۳ء | نمبر ۱

شعرِ انقلاب :-

ایک انتباہ

بودھ مندر (گیا) کی سقفِ بلند سے جاپان کو

میں بودھ مندر (گیا) کی سقفِ کہنہ پہ ہوں ایستادہ
طبیعت جوش پر ہے، ذہن ہے طوفان آمادہ

نظر کے سامنے ہے ہند کا ماضی و مستقبل
نگاہوں کو مری عرفانِ عہدِ حال ہے حاصل

سُنا ہے ہند پر حملہ فضا سے ہونے والا ہے
یہاں جاپان نے اپنا سیاسی جال ڈالا ہے

نئے فتنے اُٹھانے کی یہ سعی رائیگاں کیا ہے
بتانا چاہتا ہوں میں اُسے ہندوستاں کیا ہے؟

یہ گوتم کا وطن ہے، کرشن کی ہے یہ جنم بھومی
یہاں شورش فزائی عقل و دانش سے ہے محرومی

یہاں ہردوار ہے، پریاگ ہے اور بندرابن ہے
یہاں روحانیت بستی ہے، یہ روحوں کا مسکن ہے

شوالے ہیں گیا کے بودھ کی نگیں یادگاریں ہیں
یہاں ہر ذرہ میں محفوظ ماضی کی بہاریں ہیں

کپل وستو گیا اور راج گرِ کاشی، کشی نارہ
رہے اسّی برس تک عارفِ ہندی کا گہوارہ

یہاں کی خاک پر برسوں پڑے ہیں پاؤں گوتم کے
ابھی موجود ہیں اس سرزمیں میں کانوں گوتم کے

وہ گوتم بودھ اہنسا جنکا مشرب تیاگ مذہب تھا
وہ دنیا دار ہو کر سب سے پہلے تارکِ دنیا

گیا سے تبت اور جاپان تک گونجی صدا جنکی
ابھی جاپان والوں میں پرستش ہے روا جنکی

پرانی مورتیں بودھ کی یہاں محفوظ ہیں ابتک
وقارِ رفتہ کے دھندلے نشاں محفوظ ہیں ابتک

اگر ہندوستاں میں تونے کی تکلیف بمباری
تو گوتم بودھ کی ہوگی یہ حقیقت میں دل آزاری

یہ آثارِ قدیم اس ملک میں عزت کے قابل ہیں
نقوشِ عہدِ ماضی ہیں، مگر عبرت کے قابل ہیں

یہ بودھ کا مٹھ اگر ویراں ہو جائے عجب کیا ہے
لڑائی کا جسے سب دیوتا کہتے ہیں "اندھا" ہے

کہے دیتا ہوں میں جاپان کے خورشید زادوں سے
ابھی ہے وقت باز آجائیں اپنے ان ارادوں سے

ارادے کے بدل دینے میں اتنی دیر کیا معنی؟
ہو تم اولادِ سورج کی تو پھر اندھیر کیا معنی؟

یہ حرصِ ملک گیری، اک بلا ہے ایک لعنت ہے
جو کچھ ابتک ملا سورج کے سائے میں غنیمت ہے

"گرو کا دیش اگر محروم امن و عافیت ہوگا
گرو کی بد دعاؤں سے زوالِ سلطنت ہوگا

دل اُسکے بھکشوؤں کا نالہ و فریاد کرتا ہے
کوئی اپنے پیمبر کا وطن برباد کرتا ہے؟!

(۲۸ جولائی ۱۹۴۲ء)

سیماب اکبرآبادی

جرعات

سال نو

فطرتاً ہر نئی صبح عزائم و عمل کو اپنے دامن میں لئے ہوئے آتی ہے باوجودکسل و
انسان تازگی اور سرخوشی محسوس کرتا ہے ناکامیوں کا خیال کامیابیوں آور
رومیوں کا تقاضا ہر ومندیوں سے بدل جاتا ہے نہ گلۂ نارسی رہتا ہے اور نہ شکوۂ بےبسی۔
ت کا رُخ تیز ہو جاتا ہے۔ اور ہنگامۂ حیات میں پھر ایک کشش محسوس ہونے لگتی ہے۔ امسال بھی
زگاہ رنگا رنگی کوٹسلی بخش دیکھے دل فسردہ پریشان اور کشمکش زیست کا گلہ گذار ہے نئے سال کی آمد سے پہلے ہی حوادِ
جنگ کی تعبیر ہمارے سامنے آگئی۔ برما اور رنگون کی شکست نے ہماری کاروباری زندگی
پر اثر ضرور کیا تھا، ہمارے دلوں میں ایک کسک ضرور تھی لیکن کم، چٹگانگ کے حملوں سے
باخبر ہونے کے باوجود ہم استغنائی رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ اب جب کہ ہندوستان
کے اہم ترین تجارتی مرکز کلکتہ میں جنگ کے شتابہ میں آگ لگادی گئی ہے تو ہم اپنی زندگی
پر ایک خاص قسم کا دباؤ محسوس کر رہے ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی
ہے اور اب یقین سا ہو چلا ہے کہ ہندوستان جنگ کے شعلوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا
ب ہمارے سینوں سے خود ایک آواز آرہی ہے کہ امتحان کا وقت قریب آپہونچا۔ یہ طے ہے
امروز کے حادثات و سانحات فردا میں زیادہ اہم صورت ضرور اختیار کرینگے۔ موت و زیست
رنج و الم۔ نفع و نقصان سب کسی دوسری قوت کے اختیار میں ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے نیاز
کہ صرف تدبیر منزل کا خیال رکھنا چاہئے۔ میرا ایمان ہے کہ ہر سلمان صلاح الدین و قاسم
اور ہر ہندو ارجن و بھیم ہے اور سب کو یقین ہے کہ انقلاب لازمۂ زندگی ہے پھر کیوں
ہم ان عارضی لمحاتِ مصیبت کو ہنسی خوشی نہ گذار دیں یہی وقت جرأت و ہمت کے اظہار کا
قدرت ہم سے تقاضہ کر رہی ہے۔ اگر قدرت کے تقاضوں کو سمجھنے کی ہم میں اہلیت نہیں ہے
تو کم از کم یہی سمجھیں کہ اگر اس وقت ہم نے بے توجہی، قومی تعصب اور بیگانہ وشی سے کام لیا
تو ساری دنیا ہم پر ہنسے گی۔ ہمیں ارادہ کر لینا چاہئے کہ ہم سخت سے سخت مصیبت و ابتلا
میں بھی گھبرائینگے ـ ایک دوسرے کی مدد کرینگے اور مردانہ وار ہنستے ہوئے میدان
اور گرجتے ہوئے طوفانوں سے گذر جائینگے۔

صحافت کا کارنامہ

جنگ کا ہر سال ہمارے رسائل و اخبارات کے لئے انتہائی مشکلات لیکر آیا۔ کاغذ
کی انتہائی گرانی۔ سامان طباعت کی یکیابی کام کرنیوالوں کی پریشانی خریداروں کی بے توجہی ڈاکخانہ
کی سختیاں اور حکومت کی پابندیاں، سخت سے سخت ہوتی چلی گئیں جس کے باوجود تمام زندہ ہنے والے
رسائل و اخبارات زندہ ہیں اور اپنے مال و املاک کو قربان کر کے ادب۔ زبان اور صحافت کی زندگی
کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اب سے ایک ماہ قبل کاغذ کا جو نرخ تھا اُسے گرانی کی انتہا سمجھتے ہوئے
سب شور مچا رہے تھے اور یقین سا ہو گیا تھا کہ اب کاغذ کا بازار اس سے آگے نہیں بڑھے گا لیکن دسمبر
کے دوسرے ہفتہ ہی سے ایک قیامتِ کبریٰ شروع ہوگئی وہ کاغذ جو پہلے ۵ روپے رم تھا اور اپنی
گرانی کے عروج پر پہونچکر ۸ روپے رہا اب ۱۶ روپے رم ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہزار سعی و کاوش کسی کسی
دوکان پر بہت کم تعداد میں ملتا ہے یہ افواہیں بھی گرم ہیں کہ موجودہ نرخ ابھی دگنا ہوگا ـــــــ
اب معاملہ اس منزل میں ہے جہاں آسانی کے ساتھ کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ رسائل و اخبارات
اپنی زندگی قائم رکھ سکینگے یا نہیں۔

بہرحال موجودہ حالات ادارہ "شاعر" کے لئے بھی انتہائی صبر آزما اور پریشان کن ہیں
لیکن یہ ابتدا ہی میں طے کیا جاچکا ہے کہ ہم ایک سیکنڈ کے لئے مایوس نہ ہونگے۔ جیسے جس طرح اور
جب تک کاغذ کے ملنے کا امکان رہے گا ہم "شاعر" کو شائع کرتے رہینگے خواہ اس کے لئے ہمیں اپنی
متاعِ حیات کی بھی بازی کیوں نہ لگانی پڑے۔ کاش ہمارے جنونِ خدمت کا ناظرین کو بھی
احساس ہو۔ کاش ہماری قربانیاں آپ کے ذوق کو بھی متاثر کرسکیں اور کاش ہماری زندگی
ادب و شعر کی تبلیغ و اشاعت ہی میں ختم ہو جائے۔ ہمیں اپنی ایثار و قربانی پر ناز نہیں لیکن
ناظرین کی بے توجہی کا گلہ ضرور ہے۔ دسمبر ۴۲ء کے "جرعات" میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا وہ
مطلق بے اثر ثابت ہوا اور کسی ایک شخص نے بھی توسیع اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی، تو کیا ہم
یہ سمجھ لیں کہ شاعر نواز طبقے میں احساس باقی نہیں رہا؟ اگر نہیں تو اب بھی وقت اور موقع ہے
اجتماعی کوشش سے زیادہ انفرادی سعی و کاوش سودمند اور زود اثر ہوتی ہے۔ ناظرین
شاعر میں سے ہر شخص اگر **صرف ایک خریدار** بہم پہونچادے تو وہ کافی ہے۔ بجز اُن
لوگوں کے جو رسائل و اخبارات نکال رہے ہیں شاید اس کا یقین کسی کو آئے کہ خریداروں کے
بڑھنے سے اس وقت رسائل و اخبارات کو سخت نقصان ہے مثلاً اس وقت شاعر کی ایک
کاپی کی لاگت ۱۰ ار ہے اور ہم ۶ ر میں خریداروں کو دے رہے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ ہم دیدہ و دانستہ یہ نقصان کیوں برداشت کر رہے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ
خریداروں کی زیادتی سے کمتر تعمیر الادب کو تقویت پہونچتی ہے ـــــــ ہمیں اُمید ہے
ہے کہ ہماری یہ دوسری درخواست نہ ٹھکرائی جائے گی۔

سالنامۂ "شاعر"

کسے خبر تھی کہ سالنامہ کا اعلان کرتے ہی گرانی کی ایک بلائے ناگہانی سر پر ٹوٹ پڑے گی۔ جب جان کی بازی لگانا ٹھہری تو پھر سستے اور مہنگے کا کیا سوال؟ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ بمبئی، لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، دہلی اور آگرہ میں کاغذ کے لئے انتہائی کوشش کی گئی اور کہیں سو خاطر خواہ انتظام نہیں ہوا۔ سالنامہ تو سالنامہ جنوری کے شاعر کے لئے بھی کاغذ کا مہیا کرنا جوئے شیر لانے سے کم ثابت نہ ہوا۔ کوششیں جاری ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا ہوگی۔ حکومت سے بھی خط و کتابت ہو رہی ہے۔ ریلوں سے بھی اس انتظام میں اگر ایک دو ماہ کی دیر ہو جائے تو ناظرین شاعر ہمیں معاف فرمائیں۔ بہرحال جو ارادہ کیا ہے اس کی تکمیل ہمارے لئے ضروری ہے ملک کے مستند شعرا اور ادبا سالنامے میں شریک ہو رہے ہیں۔ جس خصوصیت کا سالنامہ "شاعر" ہوگا وہ یقیناً امتیازی ہوگی۔ شاید ہم فروری کے شاعر میں پوری تفصیل دینے کے قابل ہو سکیں۔

دسمبر ۴۲ء کا "شاعر"

چونکہ دسمبر کا شاعر مدیر "شاعر" کی غیر موجودگی میں شائع ہوا اس لئے اس میں جابجا کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ناظرین سیاق و سباقِ عبارت سے انھیں درست فرمالیں جن دوستوں اور کرم فرماؤں کے ذاتی خطوط کا مدیر "شاعر" کی طرف سے ابتک جواب نہ پہونچ سکا وہ بھی معاف فرمائیں۔ جنوبی ہند کے طویل سفر کے بعد بھی کئی سفر کرنے پڑے اور یہی وجہ تعویق ہے۔ حضرت علامہ سیماب مدظلہ کے تلامذہ بھی مطمئن رہیں اُن کے خطوط کے جواب کچھ دیدئیے گئے ہیں اور کچھ دیدئیے جائینگے۔

جنوری اور فروری ۴۳ء کی اشاعتیں

جنوری کا "شاعر" آپ کے سامنے ہے۔ شاید آپ اسے پسند فرمائیں اس میں وہ تمام خصوصی ابواب ہیں جو گذشتہ سال قائم کئے گئے تھے اور جو مضامین کی طوالت کی وجہ سے کئی ماہ سے شائع نہ ہو سکے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ نئے اضافے کئے جائیں۔ لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے پڑ رہے ہیں۔ اس اشاعت میں ڈاکٹر اقبال مرحوم سے متعلق صرف ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اعلان تین مضامین کا تھا۔ بقیہ مضامین انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں پیش کئے جائینگے۔ بعض لوگوں کو ان مضامین کی اشاعت پر اعتراض تھا اس لئے یہ اقدام کیا گیا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شاعری اور اُن کے پیام سے کوئی تضاد یا اتفاق اُن کی بلند مرتبت ہستی سے بالکل جداگانہ چیز ہے۔ بعض لوگ ارادت و عقیدت کے طوفان میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے میرے خیال میں یہ نہ ہونا چاہیے۔ آزادیٔ رائے ہر شخص کو حاصل ہے اگر کسی کو کوئی اختلاف ہو تو وہ سنجیدہ اور علمی و ادبی پیرایہ میں اس کا اظہار کر سکتا ہے ناراض ہونا یا بُرا ماننا کسی طرح مناسب نہیں۔

چونکہ زیر نظر "شاعر" میں جنوبی ہند کے سفرنامہ کے لئے چند صفحات نکالنے پڑے ہیں۔ اس لئے اس ماہ بھی "موحدِ اعظم" کی آخری کڑی شائع نہ ہو سکی۔ آئندہ اشاعت میں اس سلسلہ کو یقیناً ختم کر دیا جائے گا۔ ہر ماہ کے صفحات محدود ہیں اور کہنا بہت کچھ ہے اس لئے اس مرتبہ ماہ فروری ۴۳ء میں شائع ہونے والے مضامین کی فہرست نہیں دی جا رہی ہے۔

"شاعر" کے مربی

ادارۂ "شاعر" محترمی سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید بوٹ میکرز کی علم دوستی اور "شاعر" نوازی کے لئے بے حد ممنون ہیں۔ موصوف اس ماہ "شاعر" کے مربیوں میں شریک ہو رہے ہیں۔ ہم سید صاحب کی تصویر اور اُن کی زندگی کے مختصر حالات آئندہ اشاعت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

آہ منشی دیا نرائن نگم

ہم نے یہ اطلاع انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ سُنی کہ ۱۷ر نومبر ۴۲ء کو شب کے دو بجے رائے صاحب منشی دیا نرائن نگم بی۔ اے کا انتقال ہو گیا دسمبر ہی کے "شاعر" میں ان کی وفات کے متعلق نوٹ لکھدیا گیا تھا لیکن افسوس کہ عدم گنجائش کی وجہ سے اُس کی اشاعت نہ ہو سکی۔ ہمیں اس جانکاہ سانحہ آنجہانی کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے اور اس کا احساس و اعتراف ہے کہ نگم کی موت سے اُردو زبان و ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء سے منشی جی نے "زمانہ" کی ادارت اپنے بازوئے ہمت پر لی اور اس وقت تک انتہائی سلامت روی سے چلاتے رہے۔ "زمانہ" نے اُردو ادب و شعر کی جو خدمت کی ہے وہ یادگار رہے۔ سب سے بڑا کام آنجہانی نگم نے یہ کیا کہ مسلمان ادبا اور شعرا کیساتھ ہندو ادبا اور شعرا کو بھی اپنے رسالہ کے ذریعہ متعارف کرایا۔ ۱۹۱۲ء میں ہفتہ وار اخبار "آزاد" جاری کیا۔ خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے رائے صاحب کا خطاب دیا، وہ متعدد درسی کتابوں کے مصنف اور "اعلیٰ قابلیت" کے امتحان کے ممتحن بھی رہے خدا انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

ہر ساز سے آفرینش سوز ہے آج
جو لمحہ ہے، انقلاب اندوز ہے آج
حالات نئے ہیں اور آثار نئے
مشرق کو نوید، صبحِ نوروز ہے آج

بم باریوں کی صدائے برہم تو نہیں؟
آوازِ نقیبِ جنگِ اعظم تو نہیں؟
کس نے یہ سوادِ ہند پر دستک دی؟
دیکھو کہیں انقلابِ عالم تو نہیں!؟

ہر خوف زدہ دل کو شکیبائی دے
امیدِ شکستہ کو توانائی دے
ہے معرضِ انقلاب میں خطۂ ہند
یارب اِسے قوتِ گوارائی دے

ہے شورشِ و ہنگامہ و تیر جانے کو
ہیں روز و شب و شام و سحر جانے کو
انسان کو چاہئے رکھے استقلال
آتا ہے ہر اک وقت گذر جانے کو

اب کوئی گھٹا جنگ کی گھنگھور نہیں
کچھ آخری ہچکیاں ہیں یہ شور نہیں
کمزور ہیں قوتیں بقدرِ مقدرت
اب طنطنۂ جنگ میں وہ زور نہیں

باقی جو حکومت رہے، لاج اُسکی ہے
جاگیر، بقائے تخت و تاج اُسکی ہے
اب فتح و شکست کا نیا ہے معیار
جو مان لے ہار، جیت آج اُسکی ہے

جسنے یہ بسایا ہے جہاں، وہ جانے
ہوگا کہ نہیں امن و اماں، وہ جانے
ہم کون زمین و آسماں کے ضامن؟
جسکے ہیں زمین و آسماں، وہ جانے

انساں کو ابتک ہے بس اتنا معلوم
اک "خالقِ علم" ہے مگر لامعلوم
اس دور میں علم ہے فسادِ اکبر
معلوم اُسے ہے کہ نہیں؟ کیا معلوم!

آتی ہے بلا تو مسکرا دیتے ہیں
ہندی کہیں اپنا حوصلہ دیتے ہیں
آتا ہے نظر فضا میں جب کوئی جہاز
بچے کچھ تالیاں بجا دیتے ہیں

ہنگامۂ جنگ اک تماشا ہے ہنوز
بے سود ہے اور بے نتیجا ہے ہنوز
کیا کیجئے سالِ نو میں اندازۂ صلح
اندیشۂ جنگ روح فرسا ہے ہنوز

سیماب

شخصیات :-

وحید العصر حضرتِ بیخودؔ دہلوی

ابھی کچھ سال پہلے اُردو غزل کے رنگ کو جاننے اور پہچاننے کے لئے صرف مقامی رنگ کو اُس کا معیار بنایا جاتا تھا۔ شعر کا لب و لہجہ اور انداز و اسلوب صاف بتا دیتا تھا کہ شاعر کس مرکزِ زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ زبان کے مراکز میں دہلی اور لکھنؤ ہی کو اوّلیت اور قبولیت و سند کا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ فوراً یہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا تھا کہ فلاں کا تعلق دہلی اسکول سے ہے اور فلاں کا لکھنؤ اسکول سے۔ دہلی اور لکھنؤ اسکولوں کے بیّن فرق کے متعلق کچھ کہنا بے سود ہے ان دونوں مراکز کے متبعین چھپائے سے نہیں چھپتے۔ دہلی اور لکھنؤ کے رنگ کو زیادہ پختہ اور واضح کرنے والوں میں دورِ آخر کے دو شاعروں کا نام بار بار زبان پر آتا ہے اور وہ امیرؔ و داغؔ ہیں۔ ان سے قبل کے شعرا میں زبان کا اختلاف ہو تو ہو لیکن اسلوبِ بیان میں کوئی نمایاں اختلاف نہیں پایا جاتا۔ میرؔ کے یہاں دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ موجود ہیں۔ جرأتؔ۔ انشاؔ اور مصحفیؔ کے یہاں بھی زبان و اسلوب کے اعتبار سے کوئی خاص انفرادیت نہیں پائی جاتی۔ اس نہج سے ان اسکولوں کے امام یا یوں کہئے کہ خس و خاشاک سے پاک کر کے ایک ڈھلی منجھی چیز پیش کرنے والے امیرؔ و داغؔ ہی تھے۔ ہر چند شاعری کے نئے میلانات نے دہلوی اور لکھنوی امتیاز کو ایک حد تک اٹھا دیا ہے، پھر بھی مقامی رنگ کبھی کبھی جھلک ہی جاتا ہے اور بعض شعرا کا کلام تو مطلقاً اتباعی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا داغؔ دہلوی کیا دہلی اسکول کے متبعین میں حضرتِ بیخودؔ دہلوی کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

بیخودؔ صاحب کا نام وحید الدین احمد ہے جو حسنی الحسینی سید ہیں۔ سلسلۂ نسب غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے۔ والد کا نام سید شمس الدین احمد عرف سید احمد اور تخلص سالمؔ تھا۔ دادا صاحب سید بدر الدین احمد عرف فقیر سالکؔ و کاشفؔ مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔ پردادا امتیاز الدولہ افتخار الملک نواب سید احمد میر خاں بہادر منصور جنگ عالمگیر ثانی کے وزیر تھے۔ منشی صدر الدین خاں آزردہؔ بیخودؔ صاحب کے والد کے پھوپا تھے۔

بیخودؔ صاحب ۳ رمضان المبارک ۱۲۸۰ہجری میں بمقام ریاست بھرتپور پیدا ہوئے۔ دو ماہ کی عمر ہی میں دہلی لائے گئے اور چار سال کی عمر میں یہیں تعلیم شروع ہوئی۔ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالیؔ پانی پتی سے فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مولانا حالیؔ ہی نے آپ کو ظہوری، نیم روز اور دیوانِ غالبؔ (فارسی) پڑھایا۔ فارسی زبان میں بیخودؔ نے بہت جلد مہارتِ تام حاصل کر لی۔ شعر و شاعری کے ذوق نے عربی تعلیم نہ ہونے دی ۱۲ سال کی عمر سے شعر و شاعری کا چسکا لگا۔ سب سے پہلا شعر یہ کہا ؎

دل سے نکل گیا کہ جگر سے نکل گیا
تیرِ نگاہِ یار کدھر سے نکل گیا

ایک دن آپ کے چچا فکرِ سخن کر رہے تھے، آپ نے دریافت کیا تو فرمایا کہ غزل کہہ رہا ہوں، آپ نے کہا کہ میں بھی اس زمین میں طبع آزمائی کرونگا۔ جواباً چچا صاحب نے کہا کہ تم کیا کہوگے! یہ بات بیخودؔ صاحب کو ناگوار ہوئی۔ لیکن پاسِ ادب ملحوظ رکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس وقت ۱۴ سال کی عمر تھی۔ پھر بھی ایسی غزل کہی کہ ۲۵ سال بعد انہیں چچا کی غزلوں پر اصلاح دینی پڑی۔

ایک دن آپ کے ماموں حکیم عبداللہ خاں رساؔ نے ایک قطعہ کہا ؎

دیکھو تو آئینہ ذرا اے حضرتِ رساؔ — چہرے سے آشکار تھا رنج و ملال کب
ہم نے نہ کہدیا تھا کہ اچھا نہیں ہے عشق — کب تم تھے بےقرار ہوا تھا یہ حال کب

حضرتِ بیخودؔ نے فوراً اس پر مصرعے لگائے ؎

میری خطا معاف ہو یہ ہے شرم کی یہ جا — یہ حالِ زار اور ہو حضرت سا پارسا
بیخودؔ کی شکل کو بھی تو دل سے بھلا دیا — دیکھو تو آئینہ ذرا اے حضرتِ رساؔ
چہرے سے آشکار تھا رنج و ملال کب

تھا قول آپ کا تو، کہ گردوں نشیں ہے عشق — یا کہتے ہو کہ موت سے بدتر کہیں ہے عشق
کیوں ہے زباں پہ دشمنِ دنیا و دیں ہے عشق — ہم نے نہ کہدیا تھا کہ اچھا نہیں ہے عشق
کب تم تھے بےقرار ہوا تھا یہ حال کب

ہر چند اوپر کے مصاریع میں کئی سقم ہیں دوسرے بند میں تکرار ہے لیکن بیخودؔ کی عمر کے اعتبار سے یہ ابتدا قابلِ تحسین ضرور تھی۔ مولانا حالیؔ نے جب یہ مصرعے سنے تو خوش ہوئے اور فرمایا کہ تم شعر کہا کرو۔ چنانچہ بیخودؔ صاحب کا یہ معمول ہوگیا کہ وہ روزانہ دو غزلیں کہتے اور چاک کر دیتے۔ پہلے نادرؔ تخلص تھا۔ سولہ سال کی عمر میں بیخودؔ تخلص رکھا دورانِ مشق میں مولانا حالیؔ کو اکثر اپنا کلام سنایا کرتے اور اصلاح لیا کرتے تھے۔ ۱۳۰۹ھ میں مولانا حالیؔ کی تحریک سے حضرت داغؔ دہلوی کے شاگرد ہوگئے۔ مولوی عبدالرحیم خاں

آپ دہلوی آپ کو فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی خدمت میں لے گئے اور شاگردی کی استدعا
حضرتِ داغ نے بیخود صاحب سے کہا کہ کوئی غزل پڑھو۔ اُنھوں نے ایک غزل سنائی اور
یہ شعر پڑھا ؎ جب آنکھ پڑی اپنی اک بات نئی پائی
ان دیکھنے والوں نے تجھ کو ابھی کیا دیکھا

تو حضرتِ داغ نے بہت تعریف کی اور بیدلؔ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ کہنہ مشق
۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میرے علم میں تو کبھی کبھی کہتے ہیں۔ یہ غزل آج ہی کہی ہے۔ حضرت
داغ نے فرمایا کہ اس غزل کا تیسرا شعر پختگی اور مشاقی کا پتہ دیتا ہے۔ حضرتِ بیخود نے استاد کے
سامنے اپنی خاموش مشق کا راز فاش کر دیا ہے۔ حضرتِ داغ قاصر توجہ فرمانے لگے اور بقول بیخود صاحب
یقین ماہ اصلاح دیکر فرمایا کہ اب اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، مولانا حالیؔ اور خود اُن کے استاد
کلام کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔

بیخود دہلی کی ٹکسالی زبان کے علمبردار ہیں، دہلی کی دُھلی منجھی زبان اور محاورے
کے دم سے زندہ ہیں، بعض اعتبارات سے انھیں مرزا داغ کا بہترین مقلد کہا جا سکتا ہے
داغ نے اُردو زبان اور شاعری میں جو اصلاحات کیں وہ ان کے سختی سے پابند ہیں۔ زبان
شعر کہنے والے بعض شعرا کے یہاں اس دَور میں بھی متروک چیزیں ملتی ہیں لیکن بیخود
متروکات کا بطورِ خاص خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً "سدا" بمعنی ہمیشہ، "میں" کا نون دبانا،
"وہاں" بجائے یہاں وہاں"، اور "جگہ" "اَر" وغیرہ، مرزا داغ کے جانشین بھی ہیں
پیرِ داغ مرزا خورشید عالم بہادر نے سر پر دستارِ خلافت باندھی اور بھری محفل نے
تائید کیا ددی۔

حضرتِ بیخود اساتذۂ عصر میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ نظم و نثر دونوں پر عبور ہے
اردو کی ایک بڑی جماعت آپ سے مستفیض ہو رہی ہے۔ دہلی اسکول کی شمع آخری۔ وضع کے
اور مشرقی روایات کے حامل ہیں۔ مزاج میں تیکھا پن اور انداز گفتگو میں درشتی
پائی جاتی ہے۔ بڑے صاف گو اور پاک طینت بزرگ ہیں۔ حضرتِ بیخود سے بیا بار ملکر ان کے
اخلاق و عادات کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ حضرتِ داغ کی خدمت میں رہنے کا اکثر اتفاق
ہوا ہے مرزا استاد کا بہت زیادہ ادب و احترام کرتے تھے اور وہ اپنے تمام شاگردوں سے
زیادہ محبت، ہر چند باوجود جو اختلاف ہوتا تھا اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیتے تھے، اور
استاد کو ماننا پڑتا تھا۔

بیخود قدیم رنگِ تغزل کے پیرو ہیں لیکن اس قدامت میں بھی جدت کا پہلو مضمر ہے
دہلی کی زبان اُن کے یہاں محفوظ ہے۔ سلاست۔ روانی۔ بے ساختگی اور پختگی بھی بدرجہ
اتم۔ ہر چند اُن کے یہاں موضوعاتِ غزل پرانے ہیں اور خیالات بھی فرسودہ لیکن
وہ انھیں اپنے رنگ میں بڑے لطف کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری کتنی ہی پرانی
کیوں نہ سہی پھر بھی اُس سے کہنہ مشقی ٹپکتی ہے۔

نمونۂ کلام

کافرِ عشق ہے کمبخت، خرابی یہ ہے — ہو سکے تم سے تو بیخود کو مسلماں کرنا

کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں — نقشِ قدم کسی کا سرِ رہگذار تھا

سمجھ سکتا ہے کوئی "نہ تھا وہ مدعا میرا — مری بیتابیوں نے راز شاید کہہ دیا میرا

جب عرش پہ رہتے تھے تو اب ایسے کیسں ہو — پہچان لیا ہم نے تمہیں تھے وہ تمہیں ہو

میں چشمِ عنایت کا بھروسہ نہ کرونگا — سو رنگ بدلتے ہوئے دیکھا ہے نظر کو

میں پوچھ تو سکتا نہیں رستہ تری گھر کا — حسرت سے تکا کرتا ہوں ہر راہ گذر کو

دمِ آخر انھیں ارمان میری زندگی کے ہیں — وہ اب سمجھے کہ یہ سارے تعلق جیتے جی کے ہیں

جُدائی میں بھی پیمانِ ازل بھولے نہیں ابتک — وہاں بھی آپ ہی کے تھے یہاں بھی آپ ہی کے ہیں

اے نالۂ دل سنا، تھم تھم کے اثر کرنا — نازک ہے بہت کوئی اس پر بھی نظر کرنا

ہم اُسے دیکھ لیتے جبتک ہمیں غفلت رہی — پڑ گیا آنکھوں پہ پردہ ہوش آ جانے کے بعد

راہ میں بیٹھا ہوں میں تم سنگِ رہ سمجھو مجھے — آدمی بن جاؤنگا کچھ ٹھوکریں کھانے کے بعد

اُمیدِ وصل میں کاٹے ہیں دن جُدائی کے — خزاں کا رنگ نظر میں بہار ہو کے رہا

کیوں دل کے تقاضے سے بے وقت دعا مانگی — کچھ جبر کیا ہوتا، کچھ صبر کیا ہوتا

مجھے کس طرح باور ہو کہ وہ تشریف لاتے ہیں — کلیجہ میں نہ ٹیس اُٹھی نہ دل میں اضطراب آیا

حضرتِ بیخود کے دو دیوان "گفتارِ بیخود" اور "درِ شہوارِ بیخود" شائع ہو چکے ہیں۔
دیوانِ غالب کی شرح بھی آپ نے لکھی ہے۔ بوجہ پیرانہ سالی اب بہت کم کہتے ہیں لیکن جو کچھ
کہتے ہیں وہ اپنے مخصوص رنگ میں۔ تازہ کلام سے چند شعر دیکھئے ؎

اس پر بھی تو انصاف کی اُمید ہے مجھ کو — تنہا ہوں اِدھر اور اُدھر ساری خدائی

ہر سنگ کو سنگِ درِ جانانہ سمجھ کر — اک عاشقِ ناکام نے کی ناصیہ سائی

پھر آ پڑا دُعا کا اثر سے معاملہ — پھر طے ہوا ہے تیغ و جگر سے معاملہ

پھر جان کا ہے بانیٔ شر سے معاملہ — پھر ہو گیا ہے دل کا نظر سے معاملہ

"رہتا تھا پہلے تیر بہت ہی نشاں سے دُور"

کس کو نہیں ہے میری حقیقت سے آگہی — جن و ملک پہ بھی مجھے حاصل ہے برتری

میرا ظہور ایک تجلا ہے ذات کی — دیکھے کوئی کس طرح مجھے چشمِ تجلی

"اب تو نکل گیا ہوں میں کون و مکاں سے دُور"

اعجاز صدیقی

تحقیق و تصحیح

استفسار :—

الف :— ایک صاحب کو حضرتِ فانی بدایونی مرحوم کے مندرجۂ ذیل مصرعوں پر اعتراض ہے

(۱) لاش کی صورت زباں تھی اور میں خاموش تھا

(۲) ؎ جبینِ درد سے بیتاب سجدہ لے فانی
کہ ہر ہے خاک ترے دل کے آستانے کی

(۳) یہاں تو کام ہے اک نشترِ توجہ سے

(۴) ؎ پہلوئے زوال ہوں معنیٔ کمال میں
میں ہوں صدائے نیاز جلوۂ جمال میں

پہلے مصرع میں "زبان" کی تشبیہ "مردہ لاش" سے دوسرے شعر میں "جبینِ درد" اور "دل کے آستانے کی خاک"۔ تیسرے مصرع میں "نشترِ توجہ" محلِ نظر ہیں۔ چوتھا شعر بظاہر مہمل ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

حسن احسانی مراد آباد

ب :

(۱) شیر بر آمد بدید از طرفِ دشت
از خروشِ او فلک لرزندہ گشت

(۲) بادِ صرصر طرفِ شمعِ مزار آئی ہے۔

علامہ اقبال کے پہلے شعر میں "طرف" بروزن گرد استعمال ہوا ہے۔ اور دوسرے مصرع میں بروزن "سبق"۔ لہذا "طرف" کا صحیح تلفظ کیا ہے۔

ج :—

(۱) "ہے خود غرضی سیاست اور محبت خود فراموشی"

(۲) خود غرض مکار۔ ابن الوقت جھوٹوں کے امام

علامہ سیماب کے پہلے مصرع میں غرض کا "ر" ساکن ہے اور دوسرے مصرع میں ایسا نہیں۔ آخر یہ وجہ اختلاف کیوں؟

د :—

عالمِ عشق کا نظام آ کے ذرا اُلٹ نہ دو
عشق سے فرق آ گیا حُسن کے امتیاز میں

حضرتِ فانی بدایونی مرحوم کے مندرجۂ بالا شعر میں "ذرا اُلٹ نہ دو" کا ٹکڑا محاورۃً یا علامتِ استفہام؟

نظر بھڑوچی

ہ :—

صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گذرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بالی پری کا

باوجودِ غور و فکر میر کے اس شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ براہِ کرم ذریعہ "شاعر" مطلع فرمائیے۔

منظور احمد منظر سیانہ ضلع بلند شہر

و :—

مرزا غالب کے مندرجۂ ذیل شعر کا مطلب تحریر فرمائیے ؎

دکھا غفلت نے دورِ افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

خموش از ڈیری (سرحد)

ز :—

لے کے آیا ہوں تجلائے رُخِ شمس و قمر
جلوۂ دلکشیٔ کاہکشاں لایا ہوں

کیا کاہکشاں صحیح ہے؟

ضیا احمد ہانی بھیمڑی ضلع تھانہ

ح :—

"ستاروں کی محفل سے دیکھا کسی نے"

اس مصرع میں کسی۔ کبھی۔ خودی وغیرہ قوافی ہیں اور "نے" ردیف۔ کیا اس میں
ینے۔ دینے۔ پینے وغیرہ قوافی آسکتے ہیں؟

نصیر چھاؤنی مہو۔

واب :—

لف :—

(۱) زبان کو لاش سے تشبیہ دینا غلط نہیں۔ لاش چونکہ بے حس وحرکت ہوتی
ی زبان کو بھی اسی کی مانند بتایا گیا ہے۔ یہ تشبیہ انتہائی خاموشی پر دلالت کرتی ہے
(۲) جبینِ درد نئی ترکیب ہے اور قرین قیاس نہیں۔ دل کے آستانے کی خاک
ع ہے اکثر شعرا کے یہاں یہ خیال موجود ہے۔
(۳) نشترِ توجہ بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ توجہ اور عدم توجہ دونوں برابر کا کام کرتی
ہیں۔

(۴) شعر کے پہلے مصرع کا مطلب تو واضح ہے کہ میں بحیثیتِ انسان عروجی
ثیت رکھتا ہوں لیکن اس میں زوال کا پہلو بھی ہے۔ کمال سے مراد ہر چیز پر قابو پانا
ا اور زوال سے مراد موت ہو سکتی ہے۔ یہی چیز جلوۂ جمال (خدا) اور مجھ میں حدِ امتیاز
م کرتی ہے۔

ب :—

(۱-۲) طرف بروزن سبق بمعنی سمت ہی صحیح ہے، اور "طرف" بسکون را کے
رے یا گوشے کے معنی میں آتا ہے۔ پہلے شعر میں طرف بسکون را کے معنی کنارہ یا
شہ اور دوسرے مصرع میں "سمت" کے ہیں۔

ج :—

(۱-۲) "خود غرضی" میں "ر" ساکن نہیں متحرک ہی ہے۔ "ر" کو مفتوح پڑھنے
سے تقطیع میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا

د :— ذرا الٹ نہ دو۔ نہ محاورہ ہے اور نہ استفہام بلکہ ایک التجا اور
درخواست ہے

ہ :—

شعر کے الفاظ تو بظاہر بالکل سادہ ہیں۔ میرے خیال میں یہی مطلب ہو سکتا
ہے کہ سیکڑوں بہاریں ایسی گذری ہیں۔ جن میں ہمارے بازو بستہ رہے اس لئے
بے بال و پری کا زور اور بل دیکھنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔

و :— مرزا غالب کے دیوان میں یہ شعر میری نظر سے نہیں گذرا اطلاع دیجئے کہ کس نسخہ میں ہے۔
مجھے اس کی صحت میں شک ہے اور اسی لئے معنیٰ پیدا کرنا مشکل۔ غالب "بریدہ" کو تشدید کے ساتھ
کبھی نہیں لکھ سکتے۔ ترشے ہوئے ناخن سے ذوقِ فنا پیدا ہونا یا عقل کو کسی قسم کا اشارہ ملنا بعید از عقل سا
ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کیا نکتہ پوشیدہ ہے۔ اہلِ فکر ونظر بھی توجہ فرمائیں۔

ز :—

کہکشاں اور کاہکشاں ایک ہی بات ہے۔ کہہ۔ کاہ کا مخفف ہے۔
دونوں کے معنی وہ نورانی راستہ ہے جو تاروں بھری رات میں اکثر آسمان پر
بن جایا کرتا ہے۔

ح :—

ہاں آسکتے ہیں، بشرطیکہ مطلع میں اس کی قید نہ ہو۔ یہ قافیۂ معمولہ
کہلاتا ہے۔ کسی عروض کی کتاب میں تفصیل دیکھئے۔

اعجاز صدیقی

لکھی جاتی ہے خط صرف ایک کے لئے، نہ کہ لاکھوں پڑھنے والوں کے لئے، اس لئے ان میں جان ہوتی ہے۔ ادھر چھپیں اُدھر زمانے کی زد سے محفوظ ہوگئیں، لیکن خطوط کے لکھتے وقت اگر اشاعت کا خیال ہو، تو اُن کی ساری ذاتی و سعادت جاتی رہتی ہے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بے تکلف خطوط ہوں، دلی جذبات کا آئینہ ہوں۔ ان میں تصنع کا شائبہ نہ ہو، لکھنے والے کے چہرہ پر نقاب نہ ہو۔ مکتوب نویسی کا آرٹ کیا ہے؟ صرف فطری ہونا، جہاں بناوٹ آئی خط، خط نہ رہا، مضمون ہوگیا۔ خط وہ نہیں ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دئے جائیں، بلکہ اچھا خط وہ ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے اور جس میں اس کی سیرت کا حقیقی عکس ہو۔ غالب اس گُر سے واقف تھے، جب ہی تو وہ زبانِ قلم سے باتیں کرتے اور ہجر میں وصال کے مزے لیتے تھے۔"

مولانا عبدالحق صاحب نے، مکتوباتِ حالی کے مقدمہ میں لکھا ہے :۔

"یہی سادگی اور بے ریائی ہے، جو دلوں کو لبھا لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوط سے انسان کی سیرت کا جو اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔ خطوط میں کاتب، مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے، جو خیال جس طرح اسکے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے، نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے، اور اگر وہ دل ایسا ہو، جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو، تو بتاؤ کہ اس دل کی ترادش کیسی ہوگی؟"

خطوط ... کے مقدمہ میں فرماتے ہیں :۔

"خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں، جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں، ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے، جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے، جہاں اندیشۂ لائم نہیں ہے یہ دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے، پھر کون ہے، جو محرم موثق آواز کو سننے کا مشتاق نہ ہوگا؟ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وہ صداقت اور خلوص ہے، جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا، یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو کسی دن دماغ میں گذرتے ہیں، جنھیں نہ انشا کی صنعت مسخ کرسکتی ہے اور نہ تہذیب اور مصلحت کا دباؤ دبا سکتا ہے، گویا وہ کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت، ہر خیال، اور ہر تمنا جیتی، جاگتی اور

گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔"

ادب کی یہ صنف (خطوط نویسی) اُردو زبان میں مرزا غالب سے شروع ہوئی اور ان کی خداداد جودت نے ان کی تحریر میں وہ حسن پیدا کیا کہ آج تک اُس کا جواب ممکن نہ ہوسکا غالب پہلے شخص ہیں جنھوں نے خطوط میں القاب و آداب کا فرسودہ اور فضول طریقہ اختیار کرنے سے احتراز کیا۔ پنج آہنگ میں لکھتے ہیں :۔

"خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم و کاغذ اُٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اسکی حالت کے موافق ہوتا ہے، پکارتا ہوں اور اسکے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب کا پُرانا طریقہ اور شکر و شکوہ شادی و غم کا قدیم ردیہ میں نے بالکل اُٹھا دیا۔"

لیکن غالب نے جو اسلوب طریقہ اختیار کیا وہ کچھ زیادہ مقبول نہ ہوسکا، جہاں تک القاب و آداب کا تعلق ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قدیم رواج بالکل جاتا رہا، مگر اس میں بڑا ہاتھ جدید تعلیم و تہذیب کا ہے، ورنہ غالب کے بعد بھی عرصہ تک ان کا استعمال جاری رہا۔ مگر مکالمہ کا طریقہ رواج نہ پاسکا۔ شبلی کے ہزاروں خطوط میں ایک خط ایسا ہے جو مکالمہ کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ وہ یہ ہے :۔

"بھئی کچھ سُنا؟"

محمد سمیع ۔ خیر تو ہے!

"ہاں! ایک تازہ واقعہ ہے، میاں شبلی کا انتقال ہوگیا۔"

محمد سمیع ۔ ارے سچ؟ !! نہیں جھوٹ ہوگا، ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا، اُن کا ایک خط میرے نام آیا تھا۔

مولوی محمد عمر صاحب ۔ تو تم نے آج سُنا ہے۔ اجی اسکو تو کئی دن ہوئے اُنھوں نے جو کتابیں بھیجی تھیں اُن کی رسید بھی تو میں نے اسی وجہ سے نہیں بھیجی۔

محمد سمیع ۔ انا للہ! افسوس ابھی مرنے کے کوئی دن تھے!

حمید ۔ ہاں! واقعی سخت رنج ہے مگر تقدیر سے کس کا زور چلتا ہے (اور دبی زبان سے) ارے میاں چلو قصہ پاک ہوا، آئے دن کی حکومتوں سے دم ناک میں آگیا تھا بھلا روئداد تو خیر ایک بار کا کام تھا لکھ بھی لیا، اب روز مدرسہ میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو، اس پر طرہ یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ لکھکر اُن کے پاس بھیجتے رہو، اچھی خاصی بیگار بھگتا کرو۔

عبدالغفور ۔ ارے میاں! خیر مرنا تو سب کے لئے ہے، ہاں اُن کے خط کا جواب رہ گیا، مگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے۔ جی نہ چاہے تو مفت کی محنت کون

گوارا کرے

حافظ علی حسن صاحب ۔ بیچارے اُن کو خط لکھتے لکھتے رہ گیا، امتحان کا حال لکھا تھا، اور جو کچھ ہو، آدمی تو مرنے کا تھا، دو گھڑی کیفیت رہتی تھی۔

مولوی محمد عمر ۔ بھئی کیا کہئے، دل لگی ہی جاتی رہی، اور تو کس کام کا آدمی تھا، مگر ہاں ذرا جی بہل جایا کرتا تھا۔

مولوی احمد اللہ ۔ اجی، جی کیا بہلتا تھا، دنیا بھر کی شکایتیں ہوا کرتی تھیں کبھی ان کی نقل کی، کبھی ان کا خاکہ اڑایا، اور اس کے سوا اُن کا کام ہی کیا تھا، چلو اچھا ہوا۔

یا خوش قسمتی سے ایسے ایسے عزیز احباب ہاتھ آئے ہیں۔

لوگ کہیں گے کہ کیا حماقت کی ہے، مگر خدا کی قسم دل کی چوٹ اور حضرات کی عنایت کا پورا چربہ ہے، تمہیں انصاف کرو، خط لکھنا، کمبخت کونسا کام ہے مگر یہ بھی نہیں ہوسکتا"[۱]

مولانا کے خطوط میں بسا اوقات شوخی اور مزاح بہت نمایاں اور واضح ہوجاتا تھا۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اچھا ذرا سلاموں کا پشتارہ تو سر پہ لے لو اور سب کے حصہ کا تقسیم کراؤ، جناب حافظ حبیب اللہ صاحب جناب حافظ علی صاحب، جناب منشی خدا بخش صاحب (بوڑھے تو شاید ہولئے، چلو اب جوانوں سے شروع کرو) مولوی احمد اللہ صاحب فخر الملتہ والدین، کہیں نت اڑانہ جانا، منشی حسن رضا خاں صاحب، منشی دل جان صاحب ہماری فنا دی ٹھہراتے ہی رہ گئے، میاں خادم حسین صاحب، ہے ہے سخت غلطی ہوئی، اُن کا نام کسی سے نام کے ساتھ ملا کر یا نیچے لکھا تھا، اگرچہ ٹاٹ میں مونج کا بخیہ سمجھا جاتا، مکرمی محمد عمر صاحب، کیا خطوں کا جواب نہیں دیتے تو سلام کا جواب بھی نہ دیں گے، افتخار القوم حضرت ماموں محمد سلیم صاحب دام فیضہ علینا، جناب مولوی محمد حسین صاحب، مگر جانے وہ کہاں ہوں، میرا سلام مفت میں خاک چھانتا پھرے، کوئی بھول تو نہیں گیا۔ آہا مرزائے مختصر میاں سلیم اللہ صاحب رہ گئے۔ اتنا سا تو قد مجمع میں نظر آئیں تو کیونکر، ایک اور میرا مایۂ فخر و ناز رہ گیا، جناب مولوی مرزا محمد سلیم صاحب خیر انھیں کے صدقے مرزائے مختصر بھی یاد آگئے، ع

بہ نیکاں ببخشد کریم

اب تو چھوٹے عزیز رہ گئے۔ اُن کو میرا سلام و دعا۔ چھوٹے ہی مزے میں رہے، سلام و دعا دونوں، سب کے نام کی تو اب جگہ نہیں، (کاغذ میں ورنہ دل میں تو سبھوں کی جگہ ہے) ایک دو کا نام سُن لو محمد عثمان و سلیمان، یونس، علاء الحق"

مولانا شبلیؒ اپنے معاصرین میں سب سے بڑے انشا پرداز تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کے خطوط ادب و زبان کے لحاظ سے ان کے معاصرین کے خطوط سے کہیں زیادہ اچھے ہیں، مولانا حالی کی زبان کا پھیکا پن بہت مشہور ہے، مگر یہ چیز جس قدر خطوط میں نمایاں ہے، اتنی ان کی دوسری تحریروں میں نہیں ہے، مولانا حالی کے خطوط، مکتوباتِ حالی کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں، انھیں پڑھئے تو طبیعت اُلجھنے لگتی ہے، القاب و آداب میں انتہائی قدامت اور فرسودگی ہے۔ چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں:

"برخوردار سعادت اطوار خواجہ سجاد حسین طال عمرہ

بعد دُعا کے مدعا یہ ہے کہ لالہ بنارسی داس بی۔ اے متوطن پانی پت جو علاقہ تحصیل گوجر خاں کے کسی خالصہ اسکول میں سیکنڈ ماسٹر ہیں، وہ ہمارے شفیق دوست لالہ تلسی رام صاحب ساہوکار کے نہایت قریب کے رشتہ دار ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب معائنہ کے موقع پر وہ اپنے اسکول میں تم سے ملیں گے، چونکہ تم اُن سے واقف نہ تھے۔ اس لئے تلسی رام صاحب کی یہ خواہش تھی کہ لالہ بنارسی داس کے حال سے تم کو مطلع کردیا جائے تاکہ ملاقات کے وقت تم اُن سے اپنے عزیز ہموطنوں کی طرح ملو...... ......"[۲]

دوسرا خط ملاحظہ ہو۔ خط کشیدہ عبارت کو ذرا غور سے پڑھئے گا۔

از جانب الطاف حسین بعد دُعا کے واضح ہو کہ سلطان احمد خاں صاحب کے نام تمہارا خط دلّی گیا تھا، اس میں تم نے اپنی علالت کا حال

---

[۱] سید انصاری صاحب نے جو یہ مولوی ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا اور دلائل سے ثابت کیا تھا کہ اردو عناصر میں سب سے بڑے انشا پرداز مولانا شبلی تھے اس مقالہ پر موصوف کو انعام بھی ملا تھا۔ "مولانا شبلی" کے نام سے یہ مقالہ ناظر بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوچکا ہے۔

[۲] مکتوباتِ حالی جلد دوم صفحہ ۲۰۲

لکھا تھا، فی الحال یہ معاملات سابقہ کا ذکر تھا، جو دورِ زوال شروع ہو جانے
میں بیکار رہا تھا، کیونکہ سرمی کی زبانی معلوم ہوا کہ بہ عنایت الٰہی جمعیت
اچھی ہے۔ مفصل حال لکھا۔ میں جب تک کہ بھائی فیاض حسین صاحب
یہاں مقیم ہیں، پانی پت میں ہوں گا۔ سلطان احمد خاں اور میاں عنایت اللہ
کرنال آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میاں عنایت اللہ کا ولایت جانا ٹھہر گیا
ہے۔ منشی صاحب نے بارہ ہزار روپیہ دینا قبول کر لیا ہے ......[۱]"

تقریباً یہی حال دوسرے "دعناد" کا بھی ہے اور اسی زمرے میں سرسید کے خطوط بھی آ جاتے ہیں۔ میں نے سرسید کے متعلق ایک مستقل اور مبسوط مضمون[۲] میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں سادہ نگاری کی طرح ڈالی اور فارسی ترکیبوں اور بے جا استعارات و تشبیہات سے اجتناب کیا۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "فورٹ ولیم کالج کے ترجموں اور داستانوں میں سادگی اور سلاست کی یقیناً کوشش کی گئی، لیکن اگر سرسید ادھر توجہ نہ کرتے تو شاید منزلِ مقصود تک پہونچنے میں بہت دیر لگتی۔" دوسری جگہ لکھا ہے "تہذیب الاخلاق کا اردو زبان و ادب کے انقلاب میں نہایت ممتاز اور نمایاں حصہ ہے اور قدیم اسلوب اور طرزِ نگارش کی اصلاح و تبدیلی میں اسکا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔" مگر مجھے ڈر ہے کہ شاید ان کے خطوط کے بارے میں میں اپنی اس رائے پر قائم نہ رہ سکوں گا۔ طوالت کا خوف ہے، ورنہ کوئی پورا خط تو یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا، مگر چند ٹکڑے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان سے ان کے خطوط کی زبان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:-

"گورنمنٹ قرضہ لینے کو منع نہیں کرے گی اور نہ اجازت لینے کی ضرورت
ہے کیونکہ میں پرنسپل کو جا دے گی درخواست رخصت میں صرف
اس قدر لکھنا بطور اطلاع کے کافی ہوگا کہ جیسا جلدی منظوری رخصت
اور تیار ہو جانے کے سفر ولایت کو میں فلاں شخص سے اس قدر روپیہ
قرض لوں گا، کیونکہ بعد حصول رخصت اور بروقت تجویز سے تمام سے
اس ضلع سے قرض لینا خلاف قانون نہیں سمجھتا یہ صورت سوقت ہے
جبکہ دہندہ قرض ہمارے علاقہ کا ساکن ہو، ورنہ اس کی بھی کچھ
ضرورت نہیں۔[۳]"

[۱] مکتوبات علی جلد دوم صفحہ ۲۰۳، ۲۰۲ [۲] یہ مضمون "اضطراب" (بنارس) بابت ستمبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ [۳] خطوط سرسید صفحہ ۲ بنام محسن الملک مرحوم

چند ٹکڑے اور ملاحظہ ہوں:-

"مصنف نے لکھا ہے کہ جو الزام جلا دینے کتب خانہ مصر کا نسبت حضرت
عمرؓ لگایا جاتا ہے، غلط ہے۔ آپ اس قدر معذرات مخاطرانہ درباب
ادائے قیمت کیوں لکھتے ہیں۔ درباب سفر ولایت، یقین ہے کہ
انشاء اللہ ہو نیچے گی۔ میں نے بہت سی کتابیں دی ہیں متعار واسطے
لکھنے کتاب کے، اس شرط پر کہ .... جو صدمہ کہ ادائے لاگت
کتاب کا مجھ پر ہے، بیان نہیں ہو سکتا۔ میں نے آپ کو واسطے مقرر
کرنے ایک ایسوسی ایشن کے خط لکھا تھا۔ عریضہ سابق میں درباب
تقرر ایسوسی ایشن کے لکھا تھا اور اس عریضہ میں منع لکھا تھا، اب بعد
معائنہ اخبار مذکور کے یہ لکھتا ہوں .... تاکید اکید تصور فرمائیے
جو کچھ غصہ آپ کا مجھ حرام خور پر درباب گردن مروڑی ہوئی مرغی
کے ہے، وہ میری گردن پر۔ جب تک کہ قرض نہ لیا جائے مراجعت
منتشر (دشوار) ہے۔ کتابیں مطبوعہ صندوقوں میں بند ہو رہی ہیں
واسطے روانگی ہندوستان کے ....[۴]"

مگر مولانا شبلی کے خطوط پڑھئے، تو دلی اور لکھنؤ کی زبان کا مزا آتا ہے اور کہیں کہیں تو عبارت اسقدر بلیغ ہو جاتی ہے کہ آدمی دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو کر گھنٹوں مزا لیتا ہے۔ ایک خط ملاحظہ ہو:-

قبلۂ ام۔ تسلیم

گو میرا قلم خامۂ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب و غریب
مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں، تاہم مجھکو یہ امید نہیں
کہ اس کوشش سے عزیزانِ وطن کو، جو میرے خط پر آنکھ لگائے
بیٹھے ہوں گے، اپنے شوق و انتظار کا صلہ مل جائے گا۔
میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز
مقام ہے، لیکن اگر "تعجب انگیز" اور "دلچسپ و فرحت زا" ہونا دو
جداگانہ چیزیں ہیں، تو مجھ ایسے ایشیائی خیال آدمی سے یہ امید
رکھنا عبث ہے کہ اسکو "فرحت زا" بھی مان لوں گا، ہاں جو لوگ
انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں اُن کا مذہب کیا پوچھنا۔ ع

[۴] یہ ٹکڑے صفحہ ۲۲ سے ۲۳ تک سے لئے گئے ہیں

ہرچہ آید در دلم غیر تو نیست

اب حالات سنئے۔

کاٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہے اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کاٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے، مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے۔ عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوتی ہے جس پر رستہ چلتا ہے۔ باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے، جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے۔ نینی تال جب تین میل رہ جاتا ہے، تو پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ سطح زمین سے اس مقام کا ارتفاع تین میل سے کم نہیں ہے، مگر اس پیچ در پیچ سے راہ نکالی ہے کہ بے اختیار انگریزوں کی ہمت پر آفرین کی صدا بلند ہوتی ہے۔ آپ خود خیال کر سکتے ہیں، جو کوٹھا تین میل کا اونچا ہوگا، اُسکے زینے کیسے پر پیچ اور دشوار گذار ہونگے، کوئی شخص کیسا ہی بے حس یا مستقل دل رکھتا ہو، یہاں پہونچکر ممکن نہیں کہ حیرت کے صدمے سے بچ سکے ......"[۲]

نہ صرف مولانا کے خطوط میں، بلکہ اُردو ادب میں بہترین خطوط وہ ہیں جو عطیہ بیگم اور زہرہ بیگم کو لکھے گئے ہیں، ان کا مجموعہ **خطوط شبلی** کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شروع میں مولانا عبدالحق صاحب کے قلم سے ایک مبسوط اور طویل مقدمہ ہے، ان خطوط کے متعلق مولانائے موصوف لکھتے ہیں:-

"...... علاوہ ان وجوہ کے، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میں مولانا شبلی کے ان خطوط کو جو انھوں نے زہرا بیگم صاحبہ اور عطیہ بیگم صاحبہ کے نام لکھے ہیں۔ کئی لحاظ سے قابلِ قدر سمجھتا ہوں، ایک تو انکا طرزِ بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے جو ان کی دوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا؛ دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں، جو ان کی تصانیف میں نظر نہیں آتے اور شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انھوں نے فرمایا۔ تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بو آتی ہے، جو اُن کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے اور یہ ایک بہت بڑی وجہ، ان کی دلچسپی اور قدر کی ہے۔

مولانا کے ایک ارشد تلمیذ نے حال ہی میں شعرالعجم کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ "وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کی داستان ہے۔" گویا واقعات شاعری پر کچھ اثر ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعرالعجم واقعات کی کھتونی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی۔ لیکن اگر وہ ان خطوط کو دیکھتے (اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصور اُن کے ذہن میں تھا، وہ شعرالعجم میں نہیں، ان خطوط میں ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے دوسروں کے جذبات سے ایک دستۂ گل تیار کیا ہے اور یہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ نقل ہے اور یہ اصل وہ جگ بیتی اور یہ آپ بیتی اور ظاہر ہے کہ آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی میں کہاں ....

...... ان خطوط میں جیسا کہ میں شروع میں لکھ چکا ہوں، محبت اور خلوص کی بو آتی ہے، اس سے قبل مولانا کے رقعات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن وہ اس داستان سے خالی ہیں۔ محبت کے دلوے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں کا لطف لینا ہو، تو ان رقعات کو پڑھنا چاہئے یہ وہ جواہر ریزے ہیں جو ہمارے ادیبوں اور انشا پردازوں کے کلام میں مشکل سے ملیں گے اور اگر ہیں تو یا تو فرضی اور بناوٹی یا پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے ...."

مذکورہ بالا وجوہ و اسباب ہیں، جنکی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ مولانا شبلی کے خطوط نہ صرف صنف مکتوب نویسی میں بلکہ پورے اُردو لٹریچر میں بہت بڑی اہمیت کے مالک ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین صاحب رضوی نے اپنے ایک خط میں جسے حقیقت میں مضمون کہنا چاہئے، اُردو کے سرمایہ خطوط پر فاضلانہ تبصرہ کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"اُردو کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے ہیں اور ابھی بہت سے شائع ہونگے، کیونکہ ترقی اس زبان کی فطرت میں ہے۔ اس وقت بھی جو خطوط ہمارے سامنے ہیں، ان میں ہر طرح کے خطوط مل سکتے ہیں، اگر کسی کو فارسی کے قدیم طرز کے نمونے دیکھنے کا شوق ہو تو غلام غوث بیخبر اور غلام امام شہید کے خطوط دیکھ لے، اگر کوئی خط کا صحیح مفہوم جاننا چاہتا ہے

---

[۲] مکاتیب شبلی حصہ اوّل صفحہ ۱

ماہی گیر

میرے ایک دوست نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک روز صبح کے وقت میں اپنے مکان میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک ایک ماہی گیر آیا۔ اس کے کاندھے پر ایک جال پڑا ہوا تھا اور جال میں ایک خوشنما مچھلی ——— اُس نے مچھلی میرے سامنے پیش کی۔ میں نے اس سے قیمت دریافت کی اور بغیر کسی رد و قدح کے اس کی بیان کردہ قیمت ادا کر کے مچھلی خرید لی۔ اس نے میری طرف بہ نگاہ تشکر دیکھا اور خوش ہو کر کہنے لگا ——— "یہ پہلا اتفاق ہے کہ میں نے حسب منشا قیمت پائی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس حسن سلوک کی جزائے خیر عطا فرمائے اور جیسا کہ آپ دولت و ثروت کے اعتبار سے خوش قسمت ہیں خداوند قدوس حقیقتاً آپ کو خوش قسمت بنائے۔"

مجھے یہ دُعا سُن کر بہت مسرت ہوئی اور میں نے یہ تمنا کی کہ کاش ربّ اکبر اس کی دُعا کو شرفِ قبولیت عطا کرنے کے لئے بابِ اجابت وا کر دے لیکن میرے لئے یہ امر باعثِ حیرت و استعجاب تھا کہ اس کہن سال بوڑھے کو اس حقیقت کا علم کس طرح ہو گیا جس کا علم مخصوص حضرات کو بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے ——— یعنی انسان کی خوش قسمتی کا انحصار دولت و ثروت پر نہیں بلکہ کسی دوسری ہی چیز پر ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا:—

"کیوں بوڑھے! کیا تم دولت مندی و مرفہ الحالی کو خوش قسمتی کا معیار نہیں سمجھتے؟"

اس کے چہرے پر ایک پُرسکون اور اثر آفریں تبسم رقصاں نظر آنے لگا، اُس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:—

"نہیں اگر دولتمندی پر خوش قسمتی کا انحصار ہوتا تو شاید آج دُنیا میں مجھ سے زیادہ بدبخت کوئی نہ ہوتا کیونکہ میں بہت زیادہ نادار و مفلس ہوں۔"

میں نے سوال کیا:—

"کیا تم خود کو خوش قسمت سمجھتے ہو؟"

"کیوں نہیں! میری موجودہ آمدنی میرے لئے کافی ہے اور میری زندگی کی موجودہ حالت میرے لئے مسرت بخش ہے۔ نہ تو میں کسی عظمت و حشمت اور راحت و آرام کے عدم حصول کی وجہ سے ملول و مغموم ہوں اور نہ کسی خاص شئے کا متمنی و آرزومند، پھر میں خود کو بدقسمت کس لئے خیال کروں؟"

میں نے اُس کی طرف بنظر تحیر دیکھتے ہوئے کہا: "تم یہ کیا کہہ رہے ہو، کہیں ضعیف العمری نے تمہارے دماغ میں خلل تو پیدا نہیں کر دیا۔ تم اپنے کو خوش قسمت خیال کرتے ہو ——— حالانکہ تمہارے پاؤں محروم پاپوش اور تمہارے جسم پر چند کپڑے ہیں مگر دریدہ و فرسودہ۔"

بوڑھے ماہی گیر نے جواب دیا: "اگر لذتِ نفس اور راحت و آرام کا نام خوش قسمتی ہے اور رنج و کلفت کا نام بدقسمتی ——— تو میرے خوش قسمت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کیونکہ میرے لئے اس دریدہ لباس اور سخت کوش و سادہ حیات میں سے کوئی چیز اذیت رساں نہیں ہے۔ مجھے دُنیا میں کسی بات کا رنج و ملال نہیں ہے۔ اگر خوش قسمتی کا یہ معیار غلط ہے تو بیشک یہ میرے فہم و ادراک سے بعید و بالا ہے۔"

میں نے کہا: "کیا رؤسا کی شان و شوکت، مال و دولت، نظر فریب اور دلکش محلات، اُن کے ملازمین، بہترین سواریوں، انواع و اقسام کے خوش ذائقہ کھانوں کو دیکھ کر تیرا دل گہوارۂ حزن و یاس نہیں بن جاتا۔ کیا اپنی اور اُن کی کیفیت و حالت کا تقابل و تفاوت حسرت و اندوہ کی تخلیق نہیں کرتا؟"

اُس نے جواب دیا: "معاف فرمائیے! میری نظر میں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں، میں امراء و رؤسا کے پاس تعیش و تنعم کے تمام سامان ہوتے ہوئے بھی اپنے کو اُن سے زیادہ خوش نصیب سمجھتا ہوں اور میرا یہی احساس ہے جس نے ان تمام چیزوں کو میری نظر میں ہیچ بنا دیا ہے ——— خوش ذائقہ کھانوں کا مقصود و مطلوب اگر شکم سیری ہے تو جہاں تک مجھے یاد ہے میں کبھی تشنہ و گرسنہ نہیں سویا ہوں ——— اگر آپ کا مطلب لذتِ نفس یا زبان کا چٹخارہ ہے تو مجھے یہ بھی حاصل ہے۔ کیونکہ میں کھانے کو اس وقت ہاتھ لگاتا ہوں جب مجھے خوب بھوک لگتی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت مجھے کھانا جس قدر لذیذ معلوم ہوتا ہے، امراء کو اس سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتا ہوگا ——— رہا امراء کے فلک بوس اور خوبصورت محلات کا معاملہ ——— تو میری نظر میں ان کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ میرے دل میں کبھی یہ حسرت و تمنا پیدا نہیں ہوئی کہ میری بھی ملکیت میں ایک عالیشان محل ہوتا۔ میں ایک معمولی سے [illegible]

مالک ہوں جو میری بیوی اور بچوں کے لئے کافی ہے اور میں اسی میں مسرور و مطمئن ہوں ـــــــ اگر آپ حسین و دلفریب مناظر سے حصولِ کیف ضروری سمجھتے ہیں تو الحمد للہ مجھے یہ نعمت بھی حاصل ہے۔ جب میں آفتاب طلوع ہونے سے پہلے اپنا جال کاندھے پر ڈال کر سوئے دریا روانہ ہوتا ہوں تو پانی کی دلکش روانی، حسین سبزہ زار، سحر پرور سپیدۂ سحر میرے لئے کیف آفریں ہوتے ہیں جب آفتاب گوشۂ مشرق سے ایک منور سونے کی تھال یا شعلۂ آتشیں کی صورت میں نقاب کشائی کرتا ہے اور اُس کی زریں شعاعیں سطحِ آب پر جلوہ بار ہوتی ہیں تو اُس وقت میری وجدانی کیفیات کا حال کچھ نہ پوچھئے، لطیف احساسات و جذبات کی دُنیا میں پہنچکر میری حالت اس شخص کی طرح ہو جاتی ہے جو کسی حسین خواب سے لطف اندوز ہو رہا ہو کہ اس خواب کی مدتِ حیات قیامت سے بھی زیادہ ہو ـــــــ میری اس خود فراموشانہ کیفیت میں جب کوئی مچھلی جال میں پھنس جاتی ہے تو جال کو ایک زبردست جھٹکا لگنے کی وجہ سے میں چونک پڑتا ہوں، مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مچھلی جال میں اپنی اسارت کے باعث مضطرب و بے چین ہے ـــــــ آخر وہ کیوں مضطرب ہے؟ ـــــــ صرف اس وجہ سے کہ اسکی آزادی و مطلق العنانی ختم ہو گئی اور زیرِ آب ہونے کے باوجود ایک ایسی جگہ مقید و محبوس ہے جہاں وہ حسبِ منشا دشستن و رفتن سے محروم ہے ـــــــ بس میں تو ماہی مضطرب کی اس موجودہ حالت، اور مقید ہونے سے قبل کی حالت کو مفلسی اور اسیری سمجھتا ہوں۔

ایک افلاس زدہ بھکاری کو حسبِ منشا، آمد و رفت میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی وہ جہاں چاہے آ جا سکتا ہے۔ گویا وہ ایک ایسا آزاد رَو پرندہ ہے جس کو ایسی جگہ پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی جہاں وہ آزادی سے کھا پی سکے اور اطمینان سے نغمہ سرائی کر سکے ـــــــ آخر کیوں؟ ـــــــ اس لئے کہ لوگوں کی توجہ، اپنی طرف منعطف کرنے کے لئے اس میں کوئی کشش و جاذبیت نہیں ہے پھر لوگوں کو اسکی نقل و حرکت سے کیا واسطہ۔ وہ جہاں چاہے اُڑتا پھرے ـــــــ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے کہ ایک دولتمند مالدار شخص جس کو ایک معمولی سی جنبش بھی لوگوں کے لئے جاذبِ توجہ ہوتی ہے وہ اس وقت تک مکان سے باہر قدم نہیں نکال سکتا جب تک وہ آئینے کے روبرو گھنٹہ بھر تک بناؤ سنگار نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ اپنے خیال میں خود کو لوگوں کی نگاہ و انگشت کے قابل بنانے کے بعد مکان سے باہر نکلتا ہے تب بھی اسے اپنے عمل و حرکت میں آزادی میسر نہیں ہوتی ہر وقت یہ خیال سامنے رہتا ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جس سے پوزیشن پر بُرا اثر پڑے اور یہی خیال اس کو فطرت کے دلکش مناظر سے لطف اندوز ہونے سے مجبور رکھتا ہے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب میری حسبِ ضرورت جال میں مچھلیاں پھنس جاتی ہیں تو میں دریا واپس آ کر اُن کو بازار میں یا مکان پر فروخت کر ڈالتا ہوں اور شام تک اپنے گھر واپس آ جاتا ہوں۔ مجھے دیکھ کر میرے بچہ کو بے انتہا مسرت ہوتی ہے وہ مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔ میری بیوی مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی ہے۔ فرطِ خوشی سے اُس کا چہرہ دمکنے لگتا ہے۔ اس طرح حصولِ رزق کے بعد جب میں اپنے اہل و عیال کا حق ادا کر دیتا ہوں تو نماز پڑھکر رزاقِ حقیقی کا شکر بجالاتا ہوں۔ اب میرے لئے آرام ہی آرام ہے۔ مجھے آرام سے پاؤں پھیلا کر سونے میں اب کوئی چیز مانع نہیں ہوتی ـــــــ یہ صحیح ہے کہ میں مال و دولت اور شان و شوکت سے محروم ہوں۔ نہ میرے پاس قالین ہے اور نہ گرم و نرم بستر ـــ لیکن مجھے اطمینانِ قلب کے لئے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں اور جب مجھے اطمینانِ قلب حاصل ہے تو میں خود کو بدنصیب خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں سمجھتا۔

مجھ میں اور ایک مالدار میں صرف اتنا ہی تفاوت ہے کہ لوگ مجھے دیکھکر میری تعظیم و تکریم کے لئے سر و قد کھڑے نہیں ہوتے۔ اُن کی نظر میں میری کوئی عزت و وقعت نہیں ہے لیکن اس تعظیم و تکریم اور عزت و وقعت کو میں قطعاً بے قیمت اور لاحاصل سمجھتا ہوں مجھے اس کی چنداں پروا نہیں ہے۔ میں لوگوں کے معاملات و افعال میں دست اندازی نہیں کرتا۔ میری طرف سے خواہ وہ بیٹھے رہیں یا کھڑے ہو جائیں، ہوا میں پرواز کریں یا دریا میں غوطہ زن ہوں۔ مجھے اس سے کیا مطلب ـــــــ میرے نزدیک ان زندہ انسانوں کی وقعت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں ہے۔

میں صرف ایک خدا کا پرستار ہوں، اسی کی وحدانیت کا قائل ہوں۔ وہی مجھے روزی دیتا ہے اور اسی کی میں عبادت کرتا ہوں۔ صرف وہی میرا معبود ہے مجھے اس کے علاوہ کسی اور کی ربوبیت پر اعتقاد نہیں ہے اور میرا یہ اعتقاد اس قدر راسخ و پختہ ہے کہ اس میں ذرہ برابر بھی تنزل کا امکان نہیں۔ اس استحکامِ اعتقاد کے بعد کسی شخص کی عظمت و امارت میرے دل میں کیا جگہ حاصل کر سکتی ہے ـــــــ اگر میں ایک شہنشاہ کو اپنی پوری شان و شوکت، جاہ و جلال اور مرعوب کن عسکری قوت کے ساتھ دیکھوں تو اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا اس کا دبدبہ و جلال مجھے متاثر نہ کر سکے گا، کیونکہ میں اُس کو ایک شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتا۔

میرا یہ یقین، رنج و الم میں میرے لئے تسلی بخش ہوتا ہے۔ جب میں

حوادث روزگار سے دو چار ہوتا ہوں اور کسی آفت و مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہوں تو یہی تیقن میرے لئے طمانیت قلب بن جاتا ہے اور بار مصائب کو ہلکا کر دیتا ہے، بھلا میں مصائب سے کیونکر گھبرا سکتا ہوں جب کہ مجھے بخوبی معلوم ہے کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ضرور سامنے آکر رہے گا۔ مقدر سے گریز نا ممکن ہے اور اس کا بھی بخوبی علم ہے کہ تکالیف و مصائب کے وقت جس قدر صبر و تحمل سے کام لونگا اتنا ہی مستوجبِ اجر ہوگا۔

میری نظر میں دنیاوی جاہ و جلال کی کوئی قیمت نہیں۔ میں دُنیا کو ایک حقیر و ذلیل شے سمجھتا ہوں کیونکہ میں عذاب و ثواب، خیر و شر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہوں۔ نہ تو کوئی نعمت میرے لئے باعثِ مسرّت ہوتی ہے اور نہ کوئی مصیبت باعثِ الم۔

دُنیا کی کوئی بھی کیفیت و حالت قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ ہر چیز کا دار و مدار حیات پر ہے اور حیات کی ایک انحطاط پذیر سایہ سے زیادہ وقعت نہیں ہے۔

میں جب جال لیکر دریا کی طرف روانہ ہوتا ہوں تو اس سے قطعاً بے خبر کہ —— میں اپنے کاندھے پر مچھلیاں لاد کر لاؤنگا۔ یا لوگ میرا جنازہ اپنے کاندھے پر لاد کر لائینگے۔

لوگوں کو دنیا کے بحر زخار میں تیرنے والی مچھلیوں کی طرح سمجھ لیجئے اور موت کو ایک ماہی گیر —— جو ہر وقت دام بر دوش پھرا کرتا ہے اور جس مچھلی کو چاہتا ہے اپنے مضبوط پنجہ میں جکڑ لیتا ہے اور جس کو جی چاہتا ہے نہیں پکڑتا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ جس مچھلی کو اُس نے چھوڑ دیا ہے اس پر باب تحفظ وا ہو گیا ہے۔ نہیں —— بلکہ ایک نہ ایک دن اسکی مضبوط گرفت میں اُسے ضرور پھنسنا پڑیگا۔ اس سے دامن کشی ممکن نہیں ہے۔ پھر میں دُنیا کی اس ثروت فانی پر آتش رشک و حسد میں کیوں جلوں۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ اس کاروانسرائے میں چند روز کا مہمان ہوں آج نہیں تو کل مجھے خیر باد کہہ دینا لازمی و ضروری ہے"

میرے دوست نے بیان کیا کہ ماہی گیر کی اس گفتگو نے اُس کی وقعت و عزت میرے دل میں جاگزیں کر دی اور میں اُس کی ذکاوت طبع پر متحیر رہ گیا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا دل اُس کی خوش بختی پر رشک کرنے لگا۔

میں نے اس سے کہا: "اکثر اصحاب کو میں نے خوش بختی کے عدم حصول کے باعث اسکا آدیکھا ہے وہ جستجو پیہم کے باوجود اس سے محروم و تہی داماں رہتے ہیں۔ اب انھوں نے اپنی تمام مساعی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے کہ حیات و بدبختی لازم و ملزوم ہیں"

ماہی گیر نے جواب دیا: "نہیں! یہ درست نہیں ہے۔ انسان فطری طور پر خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ لیکن وہ خود اسے بدبختی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ کیونکہ ثروت و شوکت کی طمع اس پر کچھ اس درجہ غالب آجاتی ہے کہ اپنی کیفیت موجودہ پر ہر وقت متالم و غمگین رہتا ہے۔ وہ اپنی کوتاہ فہمی سے یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اسکی ہر تمنا و امید کا درجہ تکمیل تک پہنچنا اس کا پیدائشی حق ہے، یہی وجہ ہے کہ شکست آرزو تخلیقِ الم کا ذریعہ بن جاتی ہے اور وہ شاکی و غمگیں نظر آنے لگتا ہے —— ایسے ہی جب اس کی دولت کو نقصان پہنچتا ہے یا اولاد ضائع ہو جاتی ہے تو اُس کی آنکھیں اشک ریز ہو جاتی ہیں اور زبان معمورِ فریاد ——

اس کی وجہ ایک ہے اور صرف ایک —— کہ یہ سب کچھ اسکی توقع و اُمید کے خلاف ظہور پذیر ہوتا ہے —— لیکن اگر اس کو ابتدا سے یہ تیقن ہو کہ قبضۂ و تسلطِ انسانی کی ہر ایک شے اُس کے پاس ایک معین وقت کے لئے عاریتاً ہے تو کوئی بھی نقصان اس کے دل میں یاس و قنوطیت کی آفرینش نہیں کر سکتا —— کیونکہ جو کچھ ظہور پذیر ہوا وہ اس کے لئے پہلے سے مقدور تھا۔ انسان کی یہ ایک بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے دل کو غلط امیدوں کا گہوارہ بنا لیتا ہے اور جب وہ اپنی امید و آرزو کو شکستہ پا دیکھتا ہے تو فریادی بن جاتا ہے۔

انسان خود اکثر مصائب کا خالق ہے، کیونکہ بہت سے مصائب اسکی اندرونی بد اخلاقی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہ اصلی اور واقعی نہیں ہوتے —— اسکو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ایسا شخص جس کی طبیعت حاسدانہ واقع ہوئی ہے وہ جب کسی خوش قسمت انسان کو دیکھتا ہے تو اس کا دل غمگین ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک کینہ توز کو مجبوریٔ انتقام متالم کر دیتی ہے، اور ایک حریص و طامع کو شکستِ امید رنجیدہ و ملول، ایک شراب خور کو افاقہ شراب مضطرب اور ایک بے رحم و ظالم کو بد دعائے مظلوم بے چین —— یہی کیفیت کاذب، چغل خور اور دیگر گناہگاروں کی ہے۔ جن کو اپنی عصیاں شعاری کے باعث مصیبت برداشت کرنی پڑتی ہے ——

اس لئے اگر کوئی شخص خوش قسمتی اور بہجت حقیقی کا طالب ہے تو وہ اپنے نفس امارہ میں اس دولت کی جستجو کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ بد نصیب ہے خواہ آسمان و زمین کے تمام خزائن اس کی ملک کیوں نہ ہوں"

ماہی گیر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور اپنا عصا لیکر اُٹھ کھڑا ہوا اور چلتے ہوئے کہنے لگا:۔

"اچھا میرے محترم! خدا حافظ —— میں اپنی پسندیدہ دعا آپکے لئے بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حقیقی مسرّت و خوش نصیبی عطا فرمائے"

(ماخوذ مصری مصنف مصطفیٰ لطفی منفلوطی) مترجمہ —— امتیاز نسیمی

آجکل

برہم مزاجِ عالمِ امکاں ہے آجکل
جو مطمئن ہے وہ بھی پریشاں ہے آجکل

یہ انتہائے گردشِ دوراں ہے آجکل
انساں کا خون خاک سے ارزاں ہے آجکل

محوِ نظر حقیقتِ پنہاں ہے آجکل
انساں ہلاکِ جلوۂ انساں ہے آجکل

شورش گہِ حیات کی آویزشیں نہ پوچھ
دل سے دماغ دست وگریباں ہے آجکل

مطرب سے کہدو نغمہ و نے کو کرے وداع
دورِ نشیدِ سازِ رگِ جاں ہے آجکل

پروانوں کے لئے ہے رہِ رقص و وجد بند
بے کیف و بے فروغ شبستاں ہے آجکل

آسودگی کے جس میں نظر آرہے تھے خواب
وہ نیند خود ہی خواب پریشاں ہے آجکل

دنیا، کہ جو حمیّت و غیرت کی تھی امین
بازیچۂ ضمیر فروشاں ہے آجکل

تاراجِ انقلاب ہوئی دولتِ بہار
کانٹوں پہ کار و بارِ گلستاں ہے آجکل

لب بستگیٔ غنچہ پہ کیا غور کیجیے
سارا چمن ہی سر بگریباں ہے آجکل

وہ خاکداں جمود سے تھی جس میں تیرگی
پھر خونِ آدمی سے فروزاں ہے آجکل

انساں کی وہ نگاہ جو درمانِ درد تھی
پروردگارِ نشتر و پیکاں ہے آجکل

کانٹوں کے سر ہیں خون کی بارش سے لالہ گوں
رنگیں بساطِ دشت و بیاباں ہے آجکل

ہر غنچہ سہم ناک، ہر اک پھول سینہ چاک
کس کو دماغِ سیرِ گلستاں ہے آجکل

ہستی، جو اپنے دامنِ خالی پہ تھی اداس
اتنا تو ہے کہ خاک بداماں ہے آجکل

قوموں کی زندگی کا ہے مشرق میں اہتمام
روشن چراغِ خانۂ دہقاں ہے آجکل

شاید کہ بزمِ حشر ابھی منعقد نہ ہو
عالم خود ایک حشر خراماں ہے آجکل

ازبسکہ ابتلا و حوادث ہیں جانگداز
خود موت زندگی کی نگہباں ہے آجکل

دیکھ خودی بنا دیا انسان کو خدا،
فطرت خود اپنے دل میں پشیماں ہے آجکل

دشوار زندگی کا ہوا ہے معاملہ
تو واقعی قریبِ رگِ جاں ہے آجکل

تاریخِ عصر یاد کریگی تمام عمر
سیماب جس ادا سے غزلخواں ہے آجکل

بنگلور ۲۹ نومبر ۱۹۴۲ء

سیماب اکبرآبادی

کیا اقبال کا پیام کوئی نیا پیام ہے؟

اس موضوع پر کچھ اظہارِ خیال کرنے سے قبل یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے محاکرۂ شعری کا میں معترف ہوں اور اس حیثیت سے کہ انھیں اظہارِ خیال پر قدرتِ تام اور دستگاہِ کامل حاصل تھی۔ مجھے اُن کی تعلیم و تفہیم سے بھی انکار نہیں، لیکن میں کبھی بھی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ وہ پیغامبر۔ مفکرِ اعظم۔ حکیم مشرق۔ فلسفی۔ مجتہد العصر اور محقق یعنی سبھی کچھ تھے۔ اُن کے مفکرانہ نبوغ و ابتکار کا میں قائل نہیں البتہ وہ شاعر تھے اور شاعرِ محض اُن کے بیان میں غدوبت اور اندازِ بیان میں زور تھا اور کافی ——

عصرِ حاضر کے ایک معروف مبصر کا یہ قول کہ "اقبالیات کے سلسلہ میں گذشتہ چند سالوں میں جتنا جھوٹ بولا گیا ہے، شاید کئی صدیوں میں نہ بولا گیا ہوگا" لفظ بلفظ صحیح معلوم ہوتا ہے مرحوم کی لسانی کوتاہیوں[1] اور تناقض افکار و تضاد و اعیاب[2] سے قطع نظر میں اس مختصر مقالہ میں (یوم اقبال میں اس مقالہ کے پڑھنے کے لئے صرف دس منٹ دیے گئے تھے۔) یہ بتاؤں گا کہ ڈاکٹر اقبال میدانِ شاعری میں تمام عمر اپنے پیشروؤں کی تقلید کرتے رہے اور اندازِ بیان کے علاوہ ان کا تمام سرمایۂ فکر مستعار رہے۔ اکابر شعراء و مفکرین کے کلام و اقوال سے۔

——— • (۲) • ———

اقبالیات کو بڑی آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جس میں سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک کا کلام مدوّن ہے اور دوسرا وہ جو سنہ ۱۹۲۵ء سے شروع ہوکر سنہ ۱۹۳۸ء میں ختم ہوتا ہے۔

ہم ڈاکٹر اقبال کے پہلے دور کے کلام کو "ادب برائے ادب" اور دوسرے دور کے کلام کو "ادب برائے زندگی" سے تعبیر کریں گے۔ "ادب برائے ادب" سے ہماری مراد جمالیاتی یا (AESTHATIC) شاعری اور "ادب برائے زندگی" تہ حیاتیاتی یا (BIOLOGICAL) شاعری ہے۔

ہم نے پہلے دور کی شاعری کا نام "ادب برائے ادب" اور دوسرے دور کی شاعری کا نام "ادب برائے زندگی" اس لئے تجویز کیا ہے کہ اقبال کی شاعری کا پہلا دور مجتہدانہ اور پیغمبرانہ مزعومات سے یکسر پاک ہے۔ اس دور کی شاعری کا رنگ بالکل وہی ہے جو متقدمین کا طرۂ امتیاز تھا۔ لیکن دوسرے دور کی شاعری بزعم خود اک "مردِ خود آگاہ" کے بصیرت افروز پیغام کی حامل ہے۔

"ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" میں کون کس پر اور کیوں مرجح ہے۔ ہم اس سے بحث نہ کریں گے۔ البتہ شاید یہ بتا دینے میں مضائقہ نہیں کہ ہم شاعری کو ہر قسم کے پند و موعظت اور تحقیق و اجتہاد سے بیگانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک شاعر کا درجہ۔ واعظ۔ فلسفی۔ مجتہد اور حکیم سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ ہمارے یہاں شاعری نام ہے مترنم الفاظ کے ایک ایسے دلکش مجموعہ کا۔ جو جمالیاتی جذبات کی مکمل تصویر ہو اور جو قلب و روح میں ہیجان و تہیّج پیدا کر دے۔ ہمارے یہاں نہ شاعری کی کوئی منزل ہے اور نہ شاعر کا کوئی پروگرام۔ ہمارا شاعر "دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند" اور ہماری شاعری "گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے" کے صحیح مصداق ہیں ہمارا شاعر گلاب کے پھولوں کو دیکھکر اُن کی لطافت۔ پاکیزگی۔ رنگینی اور نکہت آفرینی سے متکیف ہوتا ہے۔ جھومتا ہے۔ گنگناتا ہے۔ کھلکھلا کر ہنستا ہے اور پھر کچھ سوچ کر رونے لگتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ ان پھولوں سے گل قند تیار ہو سکتا ہے اس لئے کہ وہ کائنات و مافیہا کو حکیمانہ، فلسفیانہ یا مجتہدانہ نظریہ سے نہیں دیکھتا بلکہ شاعر اور شاعرِ محض کی حیثیت سے۔

آپ دیکھیں کہ ڈاکٹر اقبال کی [illegible] ہے

---

[1] مرحوم کو اس میں اعتراف تھا۔ جناب وصل بلگرامی سابق مدیر "مرقع" لکھنؤ کے ایک خط کے جواب میں جو میری نظر سے گذر چکا ہے مرحوم نے اپنی اس کمزوری کا اعلان کیا ہے۔

[2] مرحوم کے نظریاتِ حیات میں جو تناقض و تضاد پایا جاتا ہے اس کی مثال شاید دنیا کا کوئی صحیفۂ ادب نہیں پیش کر سکتا۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مرحوم کا تمام کلام پڑھ جانے کے بعد یہ اندازہ لگانا کہ وہ کیا تعلیم دینا چاہتے ہیں بیحد مشکل ہے۔ انشاء اللہ میں کسی فرصت میں اس خصوص میں اظہارِ خیال کرونگا —— بہار

آپ کو شاید یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا یہ دَور سب سے دور ناہموار ہے۔ یہاں اُن کا رنگ کلام بہت جلد جلد متغیر ہوتا ہے۔ ان کی تلون مزاجی کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی اس دَور کی شاعری سے یہ اندازہ لگانا کہ وہ کس پایہ کے شاعر تھے ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ اس دور کی تمام تر شاعری رسمی اور تقلیدی نظر آتی ہے، رنگ کلام کا جلد جلد بدلنا ہی ان کی مقلدانہ ذہنیت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ ان کی شاعری کا دوسرا دَور بھی جسے ہم نے "ادب برائے زندگی" سے تعبیر کیا ہے یکسر مقلدانہ ہے اور وہ تمام نظریات جن کو ان کی شاعری کا حاصل کہنا چاہیے مستعار نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال کو حکیم مشرق، مجتہد العصر اور مفکر اعظم کا خطاب دینے والے اور اُن پر "پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت" کی تہمت لگانے والے کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ مقلد نہیں محقق ہیں۔ ہاں انھوں نے ان نظریات کو جنھیں ہم مستعار کہہ چکے ہیں شد و مد کے ساتھ اور اس انداز میں پیش کیا ہے کہ عوام تو کیا خواص بھی یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ یہ سب کچھ انھیں کا ساختہ پرداختہ ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی گرمیِ سخن اور زورِ کلام مسلم اور ان کا شاعرانہ آرٹ مسلم ہے۔ ان کا شاعرانہ آرٹ انھیں اُردو ہی نہیں بلکہ دُنیا کی ہر زبان کے شعراء سے ممیز کر سکتا ہے اور یہ ایسا کمال ہے جو انھیں شاعر اعظم کے لقب کا کسی حد تک اہل بنا دیتا ہے۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ان کے پرستار انھیں وہ سب کچھ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ وہ نہیں ہیں مگر اصل کمال اور جوہر کا ذکر بھول کر بھی نہیں کرتے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ اقبال زبردست آرٹسٹ تھا یا اس کا ملکۂ شعری ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے ان کی مصلحانہ شاعری مٹ سکتی ہے اور مٹ جائیگی مگر نہیں مٹ سکتا اور نہیں مٹایا جا سکتا انکا آرٹ اور ان کے کلام کا بے پناہ زور۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ ان کی شاعری میں تقلیدی عنصر کو کس حد تک دخل ہے اور وہ اپنے پیشرؤں سے کس حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ تقلید کتنی بُری عادت ہے انھیں کی زبان سے سُنئے ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اور اسی لئے مولوی نے فرمایا ہے ؎

آں محقق ہرچہ میگوید حق است
آں مقلد ہرچہ میگوید دف است

بانگ درا کے حصّہ دوم کی [illegible] آپ کے سامنے ہیں [illegible]

دوبارہ جنم لیا ہے۔ یہ دعوٰی بے دلیل ہی نہیں بڑی حد تک مضحک بھی ہے۔ غالب کی شاعری یکسر تغزل اور اقبال کی کائنات شعری سر تا سر مصلحانہ ہے۔ اقبال کی غزلیات کا مختصر اور بلا نمک مجموعہ بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ انھیں غالب کے کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی، اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ بہت جلد تغزل کے میدان سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ غالب اور اقبال کے تغزل میں کیا فرق ہے اسکا جواب اپنے ذوق سے طلب کیجئے۔ اقبال کے تغزل کے شاید آپ بھی قائل نہ ہونگے۔ اس لئے کہ شاید آپ کو "اے حقیقت منتظر" والی غزل کے چند اشعار کو چھوڑ کر انکی کسی دوسری غزل کا ایک بھی شعر یاد نہ ہوگا اور یاد بھی کیوں رہتا۔ بعض خوش عقیدہ حضرات ان کے تغزل کو حکیمانہ شاعری سے موسوم کرتے ہیں۔ چونکہ مومن کے تغزل پر بھی حکیمانہ شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ہم مومن کے کچھ شعر پیش کر کے آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اقبال کے یہاں اس حکمت کا کہیں پتہ لگتا ہے ؎

جلوہ افروزیِ رُخ کے لئے مے نوش ہوا
میں کبھی ہوش میں آیا تو وہ بیہوش ہوا

غیروں پہ کُھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

رحم فلک اور میرے حال پر — تو نے کرم اے ستم آرا کیا
اس سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی — مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

تغزل کا صحیح معیار کیا ہے، یہ معلوم کرنے کے لئے اقبال کے بعض ہمعصر شعراء کے دو دو ایک ایک شعر سُن لیجئے۔

ریاض ؎

ابھارو تو سہی شاید مرا ٹوٹا ہوا دل ہو — کوئی شے بحرِ غم میں تہ نشیں معلوم ہوتی ہے

حسرت ؎

شکوۂ جور۔ تقاضائے کرم۔ عرضِ وفا — تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

سیماب ؎

یہ کس کافر نے لیں انگڑائیاں صحنِ گلستاں میں
قیامت چھپتی پھرتی ہے گلوں کے چاک داماں میں

ثاقب لکھنوی ؎

ذکرِ غم آپ کی محفل میں کچھ آیا تو سہی — خوش ہیں اب پھر شب دلاسے [illegible]

[illegible]

[illegible]

ان چند اشعار سے تغزل کی قدرت کا کچھ کچھ اندازہ آپ کو ضرور ہوگیا ہوگا۔ اقبال اس تغزل کے معیار پر پورے نہ اترے اور اس کوچے سے کنارہ کش ہوکر نیچرل شاعری کا دامن تھامنے پر مجبور ہوگئے۔ یہاں پہونچ کر انھوں نے اسمٰعیل میرٹھی اور نظیر اکبرآبادی کے کلام کو اپنا آئیڈیل قرار دیا۔ انکی وہ تمام نظمیں جو بچوں کے لئے کہی گئی ہیں مثلاً "ایک کڑا اور مکھی" "ایک پہاڑ اور گلہری" "گائے اور بکری" وغیرہ وغیرہ اسمٰعیل اور نظیر ہی کی تقلید میں انگریزی نظموں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اسمٰعیل اور نظیر کے مقابلہ میں انکی شاعری پھیکی نظر آتی ہے۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ اسمٰعیل اور نظیر دونوں تمام عمر بچوں کی تعلیم پر مامور رہے اور اس طرح انھیں بچوں کی فطرت کے مطالعہ کا بخوبی موقع ملا اور اقبال کو یہ ماحول میسر نہ آسکا۔ اس لئے انھیں اس صنف میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ علاوہ ازیں اسمٰعیل کی زبان کی گھلاوٹ، شیرینی و نغمگی اور لوچ بھی اقبال کے دسترس سے باہر تھی۔ انکی شاعری،

اے دین و دنیا کے مالک — اے راجہ پرجا کے مالک
اے نکڑے توڑوں کے مالک — اے اندھوں کی آنکھ کے تارے
میرا بخشا کان کو تو نے — ملک دیا حیوان کو تو نے
رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے تیری گائے بنائی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارہ

والی زبان سے محروم رہی۔

آپ نے دیکھا اقبال کے رجحانات شعری کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ اسمٰعیل کی تقلید سے عاجز آکر اقبال انیس کی منظر نگاری کو اپنا مطمح نظر بناتے ہیں۔ یہاں وہ اور چکبست ایک ہی منزل کے ہمسفر نظر آتے ہیں۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ چکبست زیادہ سبکرو اور تیزگام ہیں۔ وہ اقبال کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور زبان کا سوال اقبال کو چکبست کا حریف نہیں بننے دیتا۔ موازنہ کے لئے ہم چکبست کی نظموں میں سے "گوکھلے کا ماتم" "خاکِ ہند" "راماین کا ایک سین" اور "پھول" اور اقبال کی نظموں میں سے "غالب" "ہندوستانی بچوں کا گیت" اور "گل پژمردہ" پیش کرینگے۔

آپ شوق سے اقبال کو چکبست پر ترجیح دیں، ہمیں تو صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اقبال محاکاتی شاعری میں انیس کے دسترخوان کے خوشہ چیں ہیں، اور اگر آپ خوشہ چیں ماننے کے لئے تیار نہیں تو یہی سہی کہ انکی محاکاتی شاعری کی محرک انیس کی محاکاتی نظمیں ہیں۔ بہرحال اقبال کا دامن یہاں بھی تقلید سے ملوث نظر آتا ہے۔

ذرا اور چلئے اقبال اس کوچے میں بھی ماعزاز انتظار کررہے ہیں۔ اب انکی شاعری اکبر کے دامن میں پناہ لے رہی ہے۔ آپ میں سے بعض حضرات کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ اقبال گہری دلچسپی کے ساتھ اکبر کے ظریفانہ اور طنزیہ رنگ میں چمک رہے ہیں۔ "بانگِ درا" اٹھائیے اور اقبال کے ظریفانہ قطعات پر جو کتاب کے آخری صفحات پر درج ہیں ایک نظر ڈال جائیے۔ کہ دانہ تقلید کسے کہتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال آپ کو اقبال کے اس حصۂ کلام میں ملے گی۔ اکبر کے مقابلہ میں اقبال کی پسپائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ اقبال نے بھی کبھی رنگِ اکبر میں طبع آزمائی کی تھی۔

رنگِ حافظ میں بہک اٹھتے ہیں اربابِ نشاط
یہ سمجھتے نہیں وہ بادہ پرستی کیا تھی

یہ شعر اکبر نے کہیں اقبال ہی کی شان میں تو نہیں فرمایا تھا۔

آپ نے دیکھا اب تک اقبال کی شاعری کا رنگ ڈانواں ڈول ہے اور ان کی شاعری بُری طرح تلاش زبان بکھار رہی ہے۔ شعر کہتے ہوئے پورے چھبیس سال ہوچکے اور ہمارے "امامِ مشرق" کسی مستقل رنگ کے مالک نہ ہوسکے۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس تمام عرصہ میں یعنی ۱۹۰۲ء سے لیکر ۱۹۲۸ء تک اقبال کی شاعری نے انھیں کیا فیض پہونچایا، میرٹھ کا رسالہ "نظارہ" بابتہ جولائی ۱۹۱۷ء اٹھائیے اور دیکھیے حکیم آبادی کا مضمون "اکبر الٰہ آبادی" جس میں وہ لکھتے ہیں،

"اس دور کا سب سے بڑا شاعر اکبر ہے"

اسی طرح نظارہ میرٹھ بابتہ فروری ۱۹۱۸ء کے ایک مضمون میں حسرت کو اس دور کے متغزلین کا امام بتایا گیا ہے۔ دیکھئے اقبال کا بھی کہیں اور کسی حیثیت سے ذکر آیا۔ خود اقبال ہی سے انکی شاعری کا حال سُنئے

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

یا

مرا یاراں غزلخوانے شمردند

یا

کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست

اقبال یورپ جانے سے پہلے وہاں اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور مغربی شعر و ادب

کے ساتھ تنہائی کو تھا کر جذب کر لیتے ہیں۔ اور اب وہ "شاعرِ انقلاب" کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اب پیرِ مے نے دو آتشہ ہو چکی ہے اس میں بلا کی تندی اور تیزی آ گئی ہے یہ "مرید ہندی" "جذبِ مستی کردار" کی مے سے ہو کر رہے بُری طرح سرشار ہو جاتا ہے۔ یہاں سے اقبال کی شاعری کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے ہم نے "ادب برائے زندگی" سے تعبیر کیا ہے۔ اب وہ

"دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو"

والی شاعری کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور اپنے عزمِ محترم کی وصیت،

"چل کے اب ایسی جگہ رہئے جہاں کوئی نہ ہو"

کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، اور

"حیات جاودان اندر ستیز است"

کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں۔ اب انھیں پہلی مرتبہ معلوم ہو رہا ہے کہ :-

خودی کی موت ہے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا راز داں پیدا

خدائی کا راز داں بن جانے کے بعد دعویٰ کرتے ہیں کہ ؎

اور وں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

اب آیئے دیکھیں کہ کیا واقعی اقبال کے "پیام" اور "طرزِ کلام" میں کوئی شانِ انفرادیت پائی جاتی ہے۔ جہاں تک طرزِ کلام کا تعلق ہے یہ مان لینے میں ہمیں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ اقبال کا اس قدر کا کلام پُرزور دار رہے اتنا زوردار کہ اس سے بقول اقبال :—

"سراپا شوخیٔ رندانہ"

اور ہمارے نقطۂ نظر سے "سراپا لغزشِ رندانہ" کی بو آتی ہے مگر پیام اور ہے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی نظر آتا ہے۔ اُن کا پیام ہمارے نزدیک کوئی نیا پیام نہیں ہے اور ان کے تمام تر نظریات مستعار ہیں۔ وہ نطشے، رومی سعدی اور فارسی کے دیگر جدید شعراء سے اعلانیہ استفادہ کرتے ہیں۔ ان کا نظریۂ خودی خودنگری یا خود آگاہی یا یوں سمجھئے کہ ان کی تمام پیامبری نطشے کے فکرِ بلند کی پیداوار ہے۔ اُسی نطشے کی جس کے حق میں اقبال یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں

خدنگ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند
کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لئے

یہ دوسری بات ہے کہ کہ اپنا تقلید کے الزام سے بچنے کے لئے کچھ عرصہ کے بعد یہ کہنے لگیں کہ "حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم" یا یہ کہ

"قلب او مومن دماغش کافر است"

نطشے کا دماغ کافر ہو یا مومن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال کی دُنیا میں انقلاب پیدا کرنے والا نطشے ہی ہے۔

نطشے کہتا ہے :-

"کیا تو ایسی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہے کہ جس نے اپنے ارادہ ہی کو خدا کی مشیت بنا لیا ہو۔ کیا تو خود ہی اپنا واضعِ قانون نہیں بن سکتا"

اقبال کے یہاں آ کر یہ چیز یوں ہو جاتی ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایک جگہ نطشے کہتا ہے :-

"ہر وہ شخص جو اپنے ضمیر کے زیرِ اثر رہنا گوارا نہیں کرتا ہمیشہ دوسروں سے مغلوب اور محکوم ہو کر زندگی بسر کرتا ہے"

اسی خیال کو اقبال اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر از دیگراں

نطشے کا قول ہے۔

"ہماری عقل ایک خوبصورت دوشیزہ ہے جو صرف ان لوگوں سے محبت کرتی ہے جو مردانہ وار میدانِ جنگ میں کود پڑیں"

اقبال اس چیز کو جگہ جگہ بیان کرتے ہیں۔ اور یہی چیز ہے جس نے اُن سے یہ کہلوایا۔

"دلِ بیباک را ضرغام سنگ است"

نطشے رحم کو حماقت تصوّر کرتا ہے۔

اقبال عفوِ بے جا کو سردیٔ خونِ حیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال اقبال کے عمل، خودی، جد و جہد اور حرکت کے تمام نظریات کا ماخذ نطشے کے افکار ہیں۔

اقبال کے کلام پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی اور اُردو کے شعراء کے کلام سے بھی استفادہ کرتے رہے ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے :-

مولانا روم ؎

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اقبال ؎

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

غالب ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اقبال ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے — اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

مولانا روم

ہست بیروں قطرۂ خورد و بزرگ — در صدف آں دُر خرد است و سترگ

طبع نافِ آہو است آں قوم را — از بروں خوں از دروں شاں مُشکہا

اقبال ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

جامی ؎

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی — کاں دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اقبال ؎

عشق در جان و نسب در پیکر است — رشتۂ عشق از نسب محکم تر است

غالب ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اقبال ؎

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا — نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

غالب ؎

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں — ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

اقبال ؎

آہ کہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں — پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

حافظ ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اقبال ؎

بمیری گر بہ تن جانے ندارد — اگر جانے بہ تن داری نمیری

اقبال نے جگہ جگہ عقل و عشق یا خبر و نظر کا موازنہ کیا ہے۔ انکا قول ہے

عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

اس خیال کو فارسی شعرا نے کثرت سے ادا کیا ہے۔ نظیری کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

بحکم عقل عمل در طریق عشق مکن
کہ راہ دور کند رہبرے کہ دانا نیست

دقت پسندی، غم طلبی اور ایذا کوشی غالب کا محبوب موضوع ہے۔ کہتے ہیں:—

جی خوش ہوا تھا راہ کو پُر خار دیکھ کر

اقبال اس کو یوں نقل کرتے ہیں:—

خوشم کہ منزلِ ما دور و راہ خم بخم است

عرفی ان دونوں پر سبقت لے گئے ہیں:—

مجلس بنوحہ گرکن وازنے نوا مجوئے
خنجر بہ سینہ تیز کن از کس فغاں مخواہ

اقبال کے کلام کا ایک بڑا حصہ "سوزِ ناتمام" تب و تابِ مسلسل۔ ناکامی۔ محرومی و فراق کے بیان کے لئے وقف ہے۔ ٹیگور۔ کارلائل۔ شوپن ہار اور تقریباً تمام فارسی شعرا نے اس خصوص میں طبع آزمائی کی ہے۔

اقبال کہتے ہیں:—

زندگی در جستجو پوشیدہ است

غالب نے اس چیز کو اس طرح بیان کیا تھا ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

لیکن ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

مگر انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو اقبال سیکڑوں شعروں میں کہہ سکے۔

محرومی کے بیان میں کسی کا شعر ہے ؎

نگاہِ گرم تو در عالم آرزو نگذاشت
تغافل است کہ در فکرِ کار سازی ہاست

اور غالب کا "ذوقِ تپیدن" تو بڑی چیز ہے۔

غالب ؎

دیا دیارِ منت مزدور سے ہے خم
لے خانماں خراب نہ احسان اُٹھائیے

اقبال ؎

مرا از شکستن چناں عار ناید   کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اقبال نے "باخبر شو از مقام آدمی" کی دعوت دیتے ہوئے فلاطون کو بہت بُرا بھلا کہا ہے۔ "ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست" کا پیام پہونچاتے ہوئے انھیں یہ یاد ہی نہ رہا کہ ان سے پہلے ہی عمر خیام نے یہ پیام "آدمی" کو پہونچا دیا تھا۔

خیام:—   موجودِ حقیقی بجز انساں نبود

اس طرح آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اقبال کا تمام و کمال سرمایۂ شعری مستعار و ماخوذ ہے اور اُن کا یہ دعویٰ کہ "اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے" صرف تعلّی ہے۔ البتہ "طرزِ کلام اور ہے" والا دعویٰ حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے۔ لیکن معاف کیجئے یہ طرزِ کلام بھی اپنی جگہ عجیب غریب چیز ہے۔ اس طرزِ کلام کی شوخی کا حال نہ پوچھئے۔ وہ شوخی جو یزداں کا داماں چاک کرنے سے بھی نہیں جھجکتی مگر جس پیامبر کا سلک یہ ہو کہ ؎

گر از دستے تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

وہ ان فرو گزاشتوں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ درحقیقت اقبال کی اسی جسارت نے اُن کے کلام میں متانزانہ شان پیدا کر دی ہے۔

حضرتِ سعدیؒ نے فرمایا تھا۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

گر اقبال کی شریعت نے اس تعلیم کو یوں مسخ کر دیا

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

ہمارے دوسرے پیغمبرانِ سخن اور اقبال کی شاعری میں صرف اسی "بساز" اور "ستیز" کا فرق ہے۔

بہار کوٹی

بازگشت

آہوں سے سوزِ عشق بڑھانے لگا ہوں میں   دیکر ہوا چراغ جلانے لگا ہوں میں
لطفِ خیالِ دوست اُٹھانے لگا ہوں میں   ہستی کی تلخیوں کو بھلانے لگا ہوں میں
پھر دل میں اضطراب سا پانے لگا ہوں میں   شاید کسی کی یاد پھر آنے لگا ہوں میں
پھر جذبۂ جنوں کو بڑھانے لگا ہوں میں   پھر زندگی میں کیف سمانے لگا ہوں میں
ذرّاتِ خاکِ دل کی یہ اللہ رے وسعتیں!   اب کائناتِ دہر یہ چھانے لگا ہوں میں
یہ کون آ گیا مری بزمِ خیال میں؟   رگ رگ میں ارتعاش سا پانے لگا ہوں میں
طے کر رہا ہوں منزلِ عرفاں کی وادیاں   ہر نقشِ ماسوا کو مٹانے لگا ہوں میں
اللہ رے یہ نشترِ غم کی نوازشیں!   لذت سی دل کے زخم میں پانے لگا ہوں میں

اے قمرؔ اُن کے ہجر میں آنسو نہیں رواں
سرمایۂ حیات لٹانے لگا ہوں میں

قمر عثمانی (وزیرزادہ) چھاگڑھی

گلبانگِ بہار

بڑی ہی دلکش و رنگیں ہے داستاں میری — چمن میں آ کے قفس میں کھلی زباں میری
فلک بھی جس کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے — وہ درد جھیل گئی جانِ ناتواں میری
وہیں ہزاروں بہشتیں بھی ہیں خدا وندا — سسک سسک کے کٹی زندگی جہاں میری
چراغ بجھ گئے نیند آ گئی ستاروں کو — جب اُنکے ذکر سے غافل ہوئی زباں میری
مجھے قبول ہے گھٹ گھٹ کے جان دیدینا — ہے بارِ خاطرِ نازک اگر فغاں میری
انھوں نے بڑھ کے وہیں طرحِ آستاں رکھدی — ذفورِ غم سے جھکی تھی جبیں جہاں میری

نہ جانے جاگ اُٹھے کس وقت آہ کی تاثیر
کہا بھی مانئے سُنئے نہ داستاں میری

بہار کوٹی

احتمالات

وہ جانِ صد بہار آئے نہ آئے — مرے دل کو قرار آئے نہ آئے
مری آنکھیں تو ہیں نمناک، لیکن — کسی کو اعتبار آئے نہ آئے
قفس کو باغ میں صیاد رکھ دے! — نہ جانے پھر بہار آئے نہ آئے
جو منظر طور پر دیکھا تھا موسیٰ! — نظر وہ بار بار آئے نہ آئے
کوئی جب دیکھنے والا نہیں ہے — چمن میں پھر بہار آئے نہ آئے
مرا دل شمع آسا جل رہا ہے — کوئی پروانہ وار آئے نہ آئے
ازل سے آج تک آنکھوں کو جس کا — رہا ہے انتظار آئے نہ آئے
ہم اپنی جان دے بیٹھے وفا میں — کوئی سوئے مزار آئے نہ آئے

گلوں سے جھولیاں بھر لے چمن میں
اسد پھر یہ بہار آئے نہ آئے

اسد

ناک (ایک ریڈیائی تمثیلچہ)

(قدرت نے انسان کے چہرہ پر مختلف اعضا کسی ضرورت کے لئے بنائے ہیں، مثلاً آنکھ دیکھنے، کان سننے اور ناک سونگھنے کے لئے۔ اب یہ ہماری ستم ظریفی ہے کہ ہم ان کو خوبصورتی اور بدصورتی پرکھنے کی کسوٹی بنا لیں اور انکے مصرف کو نظر انداز کر کے انکی بڑائی موٹائی، لمبائی کو نکتہ چینی کا عجیب ذریعہ بنا لیں۔ چنانچہ اس قسم کی ایک حماقت کا نمونہ ملاحظہ ہو کہ ایک بھلے چنگے، کھاتے پیتے گھر میں جہاں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ ناک محض ایک چھوٹی سی بھونڈی سی ناک میاں بیوی کے درمیان روز روز کے جھگڑے کا باعث بنی ہوئی ہے۔)

خالد۔ میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم بدصورت ہو، بیگم تمہاری آنکھیں، تمہارے لب، تمہارا رنگ الغرض سب کچھ اپنی جگہ پر لاجواب ہیں مگر..... مگر تمہاری ناک کچھ ایسی اچھی نہیں، یہ ذرا اور بلند ہوتی اور آگے سے اتنی پھیلی نہ ہوتی تو میری حسینہ واقعی حسینہ ہوتی۔

حسینہ۔ بس تمہاری تو وہی ایک رٹ ہے۔ ناک، ناک۔ صبح، شام ہر گھڑی ناک کا وظیفہ، اٹھتے بیٹھتے پڑھتے ہو۔ میرے کان، یا اللہ اس طوطے کی رٹ کو سنتے سنتے پک گئے ہیں۔

خالد۔ بیگم۔ خفا ہو کر چیخنے، چلانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تو تمہارے حسن کی تعریف کر رہا تھا۔ سخن گسترانہ "بات میں بات نکل آئی اور تمہاری ناک کا ذکر آ گیا ورنہ تم خود دیکھتی ہو، مجھے دفتر کے کاموں سے اتنی مہلت کہاں ملتی ہے کہ

"بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کئے ہوئے"

حسینہ۔ سن چکی تمہاری شاعری۔ بس اب تو چپ ہی رہو۔ مجھ سے زیادہ بکواس نہ کرو، میرے اللہ سارے جہان میں تم جیسا کسی کو نہ پایا۔ جمیلہ، شکیلہ، زکیہ، فرخندہ سب ہی عورتیں ہیں اور سبھوں کے چہرے پر ناک ہے تم ہی کہو ان میں کون نک سک سے درست ہے مگر ان کے خاوند تو انکی ناک کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہیں پڑتے۔

خالد۔ بیگم کیا کہا؟ زکیہ؟........ آہ! اسکا ذکر نہ کرو۔ اسکی ناک ماشاء اللہ، چشم بد دور، تلوار کی دھار اور برچھی کی انی ہے، کسی یونانی سنگتراش کے کمال کا بہترین نمونہ معلوم ہوتی ہے، تم نے اس کی یاد کیوں دلائی ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

حسینہ۔ بس بس، بڑی آئی تمہاری زکیہ اور اسکی ناک، زبان نہ کھلواؤ، وہ بھی کوئی ناک ہے جیسے برس دن کے مرغے کی سوکھی ہوئی، ٹھٹھری ہوئی، بلند اتنی جیسے جہاز کا مستول، توبہ، توبہ جیسی روح ویسے فرشتے۔

خالد۔ کہیں چھوٹا منہ بڑی بات نہ ہو جائے، بیگم ذرا ادب سے، کہاں زکیہ کی یونانی دیوی جیسی ستواں ناک اور کہاں تمہاری ڈبل روٹی کی طرح پھولی ہوئی اور چھتری کی طرح پھیلی ہوئی ناک "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" خدا کی قسم جب کبھی خواب میں بھی تمہاری پکوڑے جیسی ناک کا خیال آتا ہے تو یہی جی چاہتا ہے کہ کھا جاؤں یا خود کہیں بھاگ کر اپنا منہ کالا کروں۔ نہ جانے قدرت کو یہ کیا سوجھی تھی کہ ایسے حسین چہرے پر ایسی بھونڈی ناک چپکا دی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا۔

حسینہ۔ ہائے میرے اللہ میں کیا کروں، اپنی اس ناک کو کیسے کاٹ کر پھینک دوں کہ دشمن کے دل میں ٹھنڈک پڑے۔

(بچہ کے پکارنے کی آواز..... امی، امی.....)

آئی۔ خدایا یہ بچہ ہے یا بھوت، ہر گھڑی امی، امی کی رٹ لگائے رہتا ہے۔

(جانے کی آواز)

خالد۔ اور ماشاء اللہ صاحبزادہ کی ناک بھی آپ سے کچھ کم نہیں، کیوں نہ ہو؟ لائق ماں کا ہونہار بیٹا ہے۔

—————•(۲)•—————

(خالد گنگناتا ہے ؎ ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کلاک گیارہ بجاتا ہے، آنے کی آواز۔)

خالد۔ بیٹا شوکت

شوکت۔ جی

خالد۔ ادہر آؤ، یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟
شوکت۔ یہ بیٹ ہے اور یہ گیند میں میدان میں ہاکی کھیلنے جا رہا ہوں۔
خالد۔ مگر یہ کھیلنے کا وقت نہیں۔ اچھے لڑکے ہاکی نہیں کھیلتے۔ آج کا سبق یاد کیا تم نے؟
شوکت جی ہاں
خالد۔ اچھا تو سناؤ، RAT ریٹ، ریٹ معنی؟
شوکت۔ بلی
خالد۔ اور CAT کیٹ۔ کیٹ معنی؟
شوکت۔ موٹا
خالد۔ اور FAT فیٹ۔ فیٹ معنی؟
شوکت۔ چوہا۔
خالد۔ اوہو، کچھ نہیں، تم کو کچھ یاد نہیں۔ جاؤ اور اچھے لڑکے کی طرح اپنا سبق یاد کرو۔
شوکت (روتی آواز میں) مگر میں تو کھیلوں گا۔ امی نے کہا ہے جا کر کھیلو۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

خالد۔ کون
ظہیر۔ میں ہوں ظہیر (آنے کی آواز)
خالد۔ آؤ بھئی۔ عرصہ کے بعد دکھائی دیئے، مزاج اچھا ہے نا
ظہیر۔ خدا کا شکر ہے، تم اچھے رہے نا ..... اور میاں شوکت، واہ بھائی، یہ رونی صورت کیسی؟
شوکت۔ ابا ہاکی کھیلنے نہیں دیتے۔ امی نے کہا ہے کہ جا کر کھیلو۔
خالد۔ یہ حضرت ہر وقت اپنی امی کے بل بوتے پر کھیلنا چاہتے ہیں مگر سبق سننے تو الف کے نام ب بھی یاد نہیں
ظہیر۔ نہیں میرا شوکت بڑا اچھا ہے، ابھی جا کر سبق یاد کریگا اور دوپہر کی دھوپ میں ہاکی نہیں کھیلیگا۔
شوکت (روکر) نہیں میں تو ابھی کھیلونگا (رونے اور سسکنے کی آواز)
ظہیر۔ (ہنستے ہوئے) اوہو، تم تو رونے لگے (چمکار کر) اچھا وہ دیکھو سامنے کیا ہے؟ ...... اور یہ میاں دیکھنا تو تمہاری ناک پر کیا لگا ہے۔ چھی، چھی، اتنے بڑے ہو کر ناک میں روشنائی لگا رکھی ہے۔

شوکت (روتے ہوئے) میں امی سے ابھی جا کر کہتا ہوں کہ چچا بھی میری ناک،
(رونے کی اور جانے کی آواز میں)
ظہیر۔ ارے رے سنو، سنو، میاں کہاں چلے، یہ لو، ادھر دیکھو ......
خالد یہ کیا بات ہے۔ شوکت کیا کہنے اپنی ماں کے پاس گیا ہے؟
خالد۔ جو کچھ کہنے گیا ہے وہ اب سن ہی لوگے، یہ لو وہ آئیں (آنے کی آواز)
حسینہ یہ کس نے میرے بچے کی ناک کو برا بنایا؟
خالد۔ بیگم قسم لے لو، جو میں نے کچھ بھی کہا ہو، یہ ظہیر نے کچھ ......
حسینہ۔ دیکھئے ظہیر صاحب، آپ کا غریب خانہ پہ آنا میرے سر آنکھوں پر، مگر یہ ہرگز برداشت نہ کرونگی کہ کوئی میرے بچہ کی ناک میں نقص نکالے۔
ظہیر۔ بھابی جان، میں قسمیہ عرض کر رہا ہوں کہ میں نے شوکت کی ناک کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ بلا وجہ رو رہا تھا تو میں نے محض بہلانے کے لئے کہا "میاں شوکت دیکھنا تو تمہاری ناک پر یہ سیاہی کیسے لگی ہے؟"
حسینہ۔ واہ جناب واہ، آپ کا بہلانا بھی خوب ہے۔ سیاہی آپ نے اسکی ناک پر کیوں لگائی۔ کیا اس کے سارے جسم پر اور کوئی جگہ نہ تھی جہاں آپ سیاہی لگا سکتے تھے؟
دیکھئے صاحب، اگر ناک خراب ہے تو میری نہ کہ اس معصوم بچے کی۔ اس غریب کا صرف یہی قصور ہے کہ یہ میرا بچہ ہے۔ اور ہاں میں دنیا کو کیا کہوں جب اس بدنصیب بچے کے باپ کی نگاہ میں بھی ہم دونوں کی ناک ایسی ہے کہ کوئی ان پر تھوکے بھی نہیں۔ بھائی اس بگڑی ہوئی ناک کا بنانے والا بھی وہی خدا ہے جس نے ساری دنیا کی ناک بنائی ہے۔ اس میں اگر قصور ہے تو خدا کا اس کو جا کر چھیڑو، مجھ دکھیا کو خواہ مخواہ کیوں پریشان کرتے ہو۔
ظہیر۔ بھابھی، مگر ...... مگر ...... مگر ...... میرا مطلب تو یہ
خالد۔ بیگم ذرا بات تو سنو، کیوں ہوا سے لڑائی مول لے رہی ہو۔
حسینہ۔ بس جناب بس، بہت ہوا، میں بہت سن چکی آپ کی باتیں، اب تو خدا اس گھر سے اٹھا ہی لے تو اچھا ہے ہر روز کے طعن و تشنوں سے ناک میں دم آ گیا ہے۔
خالد۔ (ہنس کر) کیا کہا، کہاں دم آ گیا ہے
بیگم خدایا تیری پناہ ...... (پاؤں پٹخ کر جانے کی آواز)

—— ٠(٣)٠ ——

(CALL BELL کی آواز)

ملازم۔ حضور،

ڈاکٹر۔ دوسرا مریض

ملازم۔ باہر کوئی مریض نہیں، ایک خاتون ہیں جو آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔

ڈاکٹر۔ اندر آنے دو۔ (آنے کی آواز)

حسینہ۔ آداب عرض ہے۔

ڈاکٹر۔ آداب عرض ہے۔ تشریف رکھئے، فرمائیے،

حسینہ۔ ڈاکٹر صاحب میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

ڈاکٹر۔ ہاں ہاں شوق سے بلا جھجک فرمائیے۔

حسینہ۔ میں نے سنا ہے کہ آپ پلاسٹک سرجری (PLASTIC SURGERY) کے ماہر ہیں اور اکثر لوگوں کے کان، ناک وغیرہ جو بدنما اور بھدے تھے درست کر دئیے ہیں، کیا میں اُمید رکھوں کہ آپ میری......

ڈاکٹر۔ ہاں، ہاں، کہئے کیا کہنا چاہتی ہیں۔

حسینہ۔ میری ناک کو بھی خوبصورت بنا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ خاتون آپ کی ناک تو ماشاء اللہ اچھی خاصی ہے۔

حسینہ۔ (ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے) ہوگی میرے خاوند کو تو مطلق پسند نہیں مری یہ مردار ناک ہر گھڑی اُنکی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہے گھر میں سوائے اس ناک کے کسی اور کا ذکر ہی نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب، میرے حال پر رحم کیجئے اور مجھے اس ناشدنی ناک کے بارے سبکدوش کر دیجئے میں آپ کو منہ مانگی فیس دونگی۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

ڈاکٹر محترمہ خاموشی سے کام لیجئے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں اور میں اپنی یہ بڑی خوش نصیبی سمجھونگا۔ اگر میرا فن آپ کی گھریلو زندگی کو خوشگوار بنا سکے مگر میں مجبور کرونگا کہ آپ اپنے ارادہ پر نظر ثانی کیجئے میرا اب تک یہی [illegible] کہ آپ کی ناک ایسی [illegible] کہ اس پر نکتہ چینی کی جائے۔

حسینہ۔ [illegible] کہ [illegible] بہر حال [illegible] آپ [illegible] بھی [illegible]

ڈاکٹر۔ اگر آپ کا فیصلہ اتنا اٹل ہے تو میں بھی حاضر ہوں (کرسی پیچھے دھکیلنے کی آواز) میں دیکھوں آپ کی ناک پر کس قسم کا عمل جراحی کرنا ہوگا   سانس لیجیے   سر اٹھائیے۔   میری طرف دیکھئے   پونے دو انچ لمبی ..   سوا انچ چوڑی   آنکھوں کا درمیانی فاصلہ۔ ایک انچ   اچھا گنئے۔ ایک   دو   تین

حسینہ۔ (نون غنہ کی آواز میں) ایک   دو   تین

ڈاکٹر۔ میرے خیال میں آپ کی ناک ایسی نہیں کہ کسی قسم کے بھی عمل جراحی سے خوبصورت بنائی جاسکے مجھے اسکو قطعی بدلنا پڑے گا

حسینہ (حیرت اور خوف سے) مگر کیا یہ ممکن ہے؟

ڈاکٹر۔ ہاں مگر اس کے لئے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا اور وہ ناک جو لگائی جائیگی اس کی قیمت بھی آپ کو ادا کرنا پڑے گی۔

حسینہ۔ (تعجب سے) تو کیا ناک بکتی بھی ہے؟

ڈاکٹر۔ ہاں بس کچھ یونہی سمجھ لیجئے غالباً ستو روپیہ کو ایک خوبصورت سی ناک مل جائیگی

حسینہ کہاں؟

ڈاکٹر۔ یہ میں موقعہ ملنے پر آپ کو بتادونگا، مجھے آپ اپنا پتہ دے جائیے

حسینہ (اُٹھکر) یہ لیجئے میرا پتہ

ڈاکٹر۔ اور ٹیلیفون نمبر

حسینہ۔ ایک ہزار سولہ مگر ڈاکٹر صاحب ذرا جلدی کیجئے گا آداب عرض

ڈاکٹر۔ آداب عرض (جانے کی آواز)

—— ٠((٤))٠ ——

خالد۔ بیگم دفتر کا وقت قریب ہے اور کھانا لاپتہ ہے، کیا آج بھی گھر میں ہڑتال ہے؟

حسینہ۔ مجھے یہ فقروں جیسا طرز کلام پسند نہیں۔ کھانے کے متعلق اپنے چہیتے خانساماں سے پوچھئے۔ جس نے قسم کھالی ہے کہ کھانا وقت پر پکائیگا ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں کیا اتنی بڑی خدائی میں سے دیکر بس یہی ایک رہ گیا ہے۔ جسکے منہ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت۔ جب دیکھو حقہ گڑگڑا رہا ہے یا اونگھ رہا ہے۔

خالد۔ نہیں دنیا میں [illegible] مگر [illegible] دفتر سے [illegible]

حسینہ۔ جب نوکر نہیں ملا تو کھانا نہ ملنے کی شکایت بھی فضول ہے۔

خالد۔ کیا جس گھر میں نوکر نہیں ہوتا وہاں فاقہ ہوتا ہے؟ آخر گھر کی بیگمات کس دکھ درد کی دوا ہیں، کیا ان سے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ.....

حسینہ۔ نہیں صاحب مجھ سے یہ نہ ہوگا کہ باورچی خانہ میں جا کر چولہے میں اپنا چہرہ جھلسوں مجھ سے ہر کام کرا لو مگر یہ کھانا پکانا نہ ہوگا۔

خالد۔ جی ہاں آپ تو سارے جہاں کے حسینوں میں ایک ہیں جس کا رنگ باورچی خانہ کے دھوئیں سے میلا ہو جائیگا۔

حسینہ۔ اگر خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی نہیں

خالد۔ اور آپ کی ناک بھی ایسی ہے جس پر کوئی مکھی نہ بیٹھ سکے۔

حسینہ۔ (غصے سے بیتاب ہو کر) نکالیں پھر اس موئی ناک کی باتیں........ خدایا کیا کروں اپنی اس ناک کو (ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز) ہیلو...... جی میں ہوں مسز خالد ......کون؟ ......اچھا...... فوراً آجاؤں ...... (ٹیلیفون بند کرنے کی آواز۔ جانے کی آواز)

خالد۔ کیوں، کون تھا، کہاں چلیں (دروازہ زور سے بند کرنے کی آواز)

—— (۵) ——

(آنے کی آواز)

ڈاکٹر۔ ہیلو مسز خالد، آداب عرض ہے۔ جلدی کیجئے...... میں نے آپ کی ناک بدلنے کا سامان کر لیا ہے۔

حسینہ۔ وہ کیسے؟

ڈاکٹر۔ ابھی کچھ دیر ہوئی نیو مارکیٹ کے سامنے موٹر کا ایک شدید حادثہ ہو گیا۔

حسینہ۔ (خوف اور حیرت سے) تب کیا ہوا

ڈاکٹر۔ اور اس حادثہ سے ایک نوجوان لڑکی کی موت واقع ہو گئی۔

حسینہ۔ جی، پھر

ڈاکٹر۔ اس لڑکی کی ناک بہت حسین اور ستواں ہے اور اُس کا سائز بھی بالکل آپ کی ناک کا ہے۔

حسینہ۔ جی، کیا؟

ڈاکٹر۔ یعنی اُس کی یہ ناک آپ کے چہرے پر بالکل ٹھیک بیٹھے گی۔ میں نے آپ کی طرف سے اس کا سودا بھی کر لیا ہے۔

حسینہ۔ ڈاکٹر صاحب مگر...... یہ تو مردے کی ناک... ...

ڈاکٹر۔ خاتون آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ میں نے اسے ایک سو دس روپیہ میں اس کے ورثا سے خرید لیا ہے..... اور یہ دیکھئے میں اسے کاٹ کر لے آیا ہوں۔

حسینہ۔ (چیخ کی آواز)

ڈاکٹر۔ خاتون گھبرائیے نہیں، آپ فوراً اپریشن کے لئے تیار ہو جائیے، دیر کرنے سے اندیشہ ہے کہ یہ ناک آپ کے چہرہ پر چپکے گی نہیں

حسینہ۔ ڈاکٹر صاحب، مگر...... سُنئے ...... ڈاکٹر صاحب ....

(کال بیل کی آواز) (آنے کی آواز) ....

ڈاکٹر۔ اسسٹنٹ، مریضہ کو ٹیبل پر لے چلو..... جلدی کرو۔

حسینہ۔ (چیخ کی آواز) ..... نہیں ..... نہیں .... (زور لگانے اور کھینچنے کی آواز.......)

ڈاکٹر۔ محترمہ اگر آپ زیادہ شور کریں گی تو میں پھر اپریشن نہ کرونگا۔ جلدی کیجئے، ہر منٹ قیمتی ہے...... سانس لیجئے...... گنیئے....... ایک ...... دو...... تین

حسینہ۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) ایک .... دو ....

(آلوں کے رکھنے کی آواز جیسے آپریشن روم میں ہوتی ہے)

—— (۶) ——

شوکت۔ (رو کر) امی کہاں گئیں، ابا انہیں بلا دیجئے۔

خالد۔ بیٹا گھبراؤ نہیں وہ آجائیں گی۔ شوکت، بیٹا......... دیکھو تو یہ کیا رکھا ہے؟

شوکت۔ (بدستور روتے ہوئے) کچھ نہیں، میری امی ...... امی

خالد۔ بیٹا اچھے لڑکے نہیں روتے، امی تمہاری آ ہی رہی ہونگی، گھبراؤ نہیں۔

شوکت۔ (روتے ہوئے) آپ تو روز کہتے ہیں امی آرہی [illegible] ۔ مگر وہ کہاں آتیں۔

روؤ نہیں بیٹا، تمہارے چچا [illegible] امی کو ساتھ لے کر آرہے ہونگے۔

شوکت۔ (رونے اور سسکنے کی آواز [illegible] آواز بیک گراؤنڈ میں مسلسل قائم رہے گی) (دروازہ کھٹکھٹانے اور کھلنے کی آواز)

خالد۔ آؤ ظہیر کیا خبر لائے؟

ظہیر۔ (تھکا ہوا سانس لے کر) بھائی شہر کا کونا کونا ڈھونڈ مارا، کچھ پتہ نہیں چلتا۔

خالد۔ کیا اخباروں میں اشتہارات دیئے گئے ہیں۔

ظہیر۔ کب کے، اور آج اسی وقت ریڈیو میں بھی اعلان کرا کر آ رہا ہوں۔

خالد۔ بھائی یہ میری حماقتوں کا نتیجہ ہے، آہ ایسی نیک دل اور سمجھدار بیوی کو اپنی حماقت سے کھو بیٹھا۔ پتہ نہیں بیچاری اس وقت کہاں ہوگی، کیا کر رہی ہوگی اور کیسی گلی گلی خاک چھان رہی ہوگی، ہائے اب وہ مل جائے تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کبھی اسے نہ چھیڑوں گا۔ ظہیر وہ دیکھو۔۔۔۔ شوکت نے رو رو کر بُرا حال کر لیا ہے، کسی صورت بہلائے نہیں بہلتا، گھر میں الگ خاک اُڑ رہی ہے، میں تو اپنی ناپاک زندگی کو ختم ہی کر دینا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔

ظہیر۔ خالد تم بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو، گھبرانے اور سر پٹخنے سے کیا ہوتا ہے تم نے بھابی کو بہت چھیڑا ہے وہ تنگ آ کر کہیں اپنے کسی ملنے والے کے ہاں جا کر بیٹھ رہی ہیں تاکہ تم اُنکی محبت جانو، میرا تو دل کہتا ہے کہ وہ آج کل میں آ ہی جائینگی۔

خالد۔ بھائی، میں توبہ کرتا ہوں، اب کبھی اُنکی ناک پر نکتہ چینی نہ کرونگا، خدایا تو بڑا مسبب الاسباب ہے، میری عزیز از جان بیگم کو مجھ سے ملا دے۔

(دروازہ کھٹکھٹانے اور اندر آنے کی آواز)

خالد۔ کون؟ بیگم!

ظہیر۔ اُف بھابی جان؟۔۔۔۔۔

شوکت۔ میری امی، میری امی۔۔۔۔۔

خالد۔ (ہنس کر) مگر بیگم۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔ کہ

حسینہ۔ جی، جی فرمایئے، کیا کہنا چاہتے ہیں؟

خالد۔ خاکم بدہن۔۔۔۔۔ خطا معاف۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ بیگم۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری ناک تو اب پہچانی نہیں جاتی۔

حسینہ۔ (بوتل میز پر رکھنے کی آواز) جی صحیح ہے، میری وہ ناشدنی ناک اب اس بوتل میں بند ہے۔

شوکت۔ میری امی۔۔۔۔ میری اچھی امی

محمد ظہیر الدین از جھانسی

انجمستان

آلہی کون نظروں کے مقابل ہوتا جاتا ہے
کہ دل کا ذرہ ذرہ ماہِ کامل ہوتا جاتا ہے

خدا رکھے ترے دردِ محبت کو خدا رکھے
یہی اب زندگی کا میری حاصل ہوتا جاتا ہے

شعور و ذہن میں اک دشمنی محسوس کرتی ہوں
مری ہستی میں آخر کون شامل ہوتا جاتا ہے

کوئی ملے ناخدا تدبیر بھی ہے پار اُترنے کی
سفینہ زندگی کا غرقِ ساحل ہوتا جاتا ہے

گل و لالہ سے اکثر چوٹ لگتی ہے مگر پھر بھی
دلِ ناداں بہاروں کے مقابل ہوتا جاتا ہے

ارے ظالم یہ کس کو دیکھ کر تو نے ادھر دیکھا
پریشاں ہی پریشاں رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

نہیں معلوم کتنی دور ہے منزل مسافر کی
کہ ہر اختر غبارِ راہِ منزل ہوتا جاتا ہے

نہ اپنا ہوش ہے مجھ کو نہ دنیا کی خبر باقی
یہ پردہ اٹھتا جاتا ہے کہ حائل ہوتا جاتا ہے

یہ کس نے رس بھری نظروں سے مجھ کو اس طرح دیکھا
کہ نجمہ بے نیازِ دو جہاں دل ہوتا جاتا ہے

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

ہندوستانی معلم

وہ ادب آموز فطرت علم کا آئینہ دار
ناخدائے زندگی تہذیب کا پروردگار

ناظم اجزائے ملت موجب احیائے قوم
مشعل راہ ہدایت حوصلہ افزائے قوم

ضو فروز علم تابندہ نظر، روشن دماغ
جگمگاتا مسکراتا زندگانی کا چراغ

عام جس کی ضو فشانی ہر تجلے دل کے لئے
روشنی پاتے ہیں جس سے ٹمٹماتے سب دیئے

جسکے در کا ذرہ ذرہ مسکراتا آفتاب
جس کے گلخانے کا ہر کانٹا ہے اک رنگیں گلاب

ہر نظام مستقل جسکے اشارے سے چلا
کاروان زندگی جسکے سہارے سے چلا

جسکے دامن میں پناہیں لیں جہاں کی شورشیں
ضامن تقدیر بن جاتی ہیں جسکی کاوشیں

بخشتا ہے جو زمانے بھر کو تسکین و ثبات
جب کبھی انگڑائیاں لیتا ہے آشوب حیات

تا شگفتہ ہے وطن کی شادمانی کے لئے
مٹ رہا دوسروں کی کامرانی کے لئے

بس یہی ہے تربیت اسکا نظام زندگی
درس ہی میں کاٹتا ہے صبح و شام زندگی

بٹ گیا ہے گھنٹہ گھنٹہ اسکی پیاری زیست کا
ہو چکا ہے لمحہ لمحہ وقف ساری زیست کا

صبح سے لے شام تک بچوں کو درس زندگی
زندگی اسکی یہی ہے سرخوشی اسکی یہی

توڑ دیتی ہیں بسا اوقات اسکی ہمتیں
زندگی کی الجھنوں کے ساتھ ذہنی الجھنیں

کانپتے ہیں زیست کی منزل میں وہ ڈر کر قدم
ہر قدم پر سنگ رہ بنتا ہے بے قدری کا غم

ظلمتوں میں سے اڑی ہے اسکو اندھی قت کی
ٹھوکریں کھاتی ہوئی پھرتی ہے اسکی زندگی

منفعت اندوز ذوق کامرانی سے نہیں
مطمئن ہے اپنے نظام زندگانی سے نہیں

اے وطن ناسوس [illegible] زبان [illegible] شگفتہ حال
جسکی [illegible] زندگی
[illegible] ہمکنار [illegible] کے صدہا [illegible]
[illegible] بے نیاز
[illegible] کر امتیاز

ھبا

ہمارا ادب

"ادب اقوامِ عالم کی ترقی و تنزل کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے" اس جملہ کی جو کچھ بھی تشریح کی جائے مگر یہ اپنے اندر حقائق کی دنیا لئے ہوئے ہے۔

ہر قوم کے ارتقاء و عروج، انحطاط و تنزل کی تدریجی رفتار کو اگر معلوم کرنا ہو تو اس قوم کے ادب پر غائرانہ نظر ڈالنے سے اس کی بڑھتی، چڑھتی ہوئی کیفیت یا گرتی سنبھلتی ہوئی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دراصل ادب قومی ذہنیت اور اجتماعی مزاج کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ بس قوم جن حالات و کیفیات سے گزر رہی ہوگی، ادب اس کو آپ کے سامنے بلاکم و کاست پیش کر دیگا۔ اسی بنا پر شعبہ ہائے ادب میں محاضرات (علم تاریخ) کو جسقدر اہمیت دی گئی ہے وہ ہر اہلِ علم پر آشکارا ہے۔ تا وقتیکہ ادیب کسی قوم کے واقعاتِ گذشتہ اور حالاتِ حاضرہ سے روشناس نہ ہو۔ جبتک اس قوم کے آغاز ترقی و عروج تمدن اور درمیانی کڑیوں سے آگاہ نہ ہو جبتک اسکے سامنے اس قوم کے آباؤ اجداد کے کارنامے اور وقائع موجود نہ ہوں، وہ کسی صورت میں ادبیت کے دعوے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

ادب کے ہر شعبہ، ہر حصے کی بنیاد واقعات ہی کی ٹھوس چٹانوں پر قائم کیجاتی ہے۔ اگرچہ وہ واقعات ظاہر بین نگاہوں میں کتنے ہی دور از عقل، بعید از قیاس معلوم ہوتے ہوں لیکن ان کے پس پردہ قوم کی مشہور و مخفی ذہنیت ضرور جھلکتی ہوگی کسی ادب کا کامیاب و مقبول ہونا اس پر شاہد ہے کہ اس نے قوم کے مطالبہ قوم کی مانگ کو بھی اور اپنی خلاقانہ صلاحیت سے کام لیکر اس کو جدید انداز [illegible] اسکے اندر موقع شناسی و مزاج شناسی کا جوہر ملکہ نہ ہو تو وہ کبھی بھی اپنے مقصد میں شادکام نہیں ہو سکتا۔

ادب کو خواہ مخواہ قوم کے ذہنی سانچے میں ڈھلنا ہی پڑتا ہے۔ ادب کی [illegible] ملکی و اجتماعی حیات کے ہر ہر گوشہ میں اس طرح پھیلی ہوتی ہیں کہ اسکی طرف [illegible] اسکے قومی واقعات کے فروغ اور رشتے کسی طرح بھی اسکے سامنے نہیں [illegible] گویا ادب ایک مرکز ہے جس کے ارد گرد زندگی کے تمام مسائل گھومتے [illegible] ادب یا ایک سرچشمہ جہاں سے زندگی کے واقعات کے تمام [illegible]

[illegible] سمجھتے ہیں۔

ہم کو اس وقت تمام دنیا کے ادب پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف ہندوستانی ادب پر سرسری نظر ڈالنا ہے کہ وہ آجکل کس منزل سے گذر رہا ہے؟ اور آیا اسکے اندر صلاحیت ہے کہ اگر بین الایشیائی نہیں تو کم از کم بین الہندوستانی ادب میں امتیاز حاصل کر سکے۔ جہانتک ہمارے غور و فکر کا تعلق ہے ہم نہایت جرأت و بیباکی سے اسکا اعلان کر سکتے ہیں کہ اس دس سال کے عرصہ میں جس قدر تیزگامی و برق رفتاری کے ساتھ ہم منزلِ مقصود کی طرف جا رہے ہیں اس کی بنا پر یہ توقعات بیجا نہیں اگر ہم ہندوستانی ادب کی تاریخ گذشتہ سنہ سے (جبکہ فرنگی زیر کسنے دور رہنوں سے اس تیز و طرار چھوکری کے طفلانہ شوخیوں کو دیکھ کر حسن کی جوانی کے عشوہ ہائے بے پناہ کا اندازہ کر لیا تھا) لیکر اب تک کا جائزہ لینا شروع کر دیں تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ اس نازنین نے اب واقعی منزلِ شباب میں قدم رکھ دیا ہے۔ اسکی حشر انگیز خوش ادائیوں، قیامت خیز غمزہ سازیوں نے لوگوں کے دل و دماغ کو مسخر کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ دن دور نہیں کہ ایک عالم کو اپنی عشوہ طرازیوں سے مسحور کر سکے۔ پھر جس طرح انسانی زندگی کے ادوار میں سب سے زیادہ دشوار ترین حصہ مطالعہ کے لئے جوانی ہے جس [illegible] طلسم شباب کی نیرنگیاں [illegible] ۔ [illegible] زیادہ انقلابی شان پائی جاتی ہے بالکل اسی طرح [illegible] ادب زندگی کے [illegible] نئے [illegible] کے ساتھ [illegible]

[illegible]

تخیل فطرت، ماحول بلکہ خود اپنے نفس پر بنا رنگ چڑھا دیتا ہے پھر اسی عینک سے تمام کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جس قوم کا جس عہد میں زندگی کا مرکز خارجی عالم ہوا سے احساس فطرت کم ہوگا۔ داخلی رنگ میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے یہاں تو بالکل ہی نہیں مکمل احساس ان میں ہوگا جنھیں داخلی تفکر کا ذوق، اور خارجی عالم کا مشاہدہ دونوں ہوں۔ اس لئے جمال تعلق میں فطرت کے ساتھ ایک مافوق الطبعی جھلک بھی ہوتی ہے۔ تنہائی، دل گرفتگی، روحانی آرزو آغوش فطرت میں انسان کو پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے جس سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہوتی ہے، لیکن اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ فطرت ہم سے مخاطب نہیں ہوتی یا طبیعت میں اُمنگ اور ولولہ کا فقدان ہو تو دفعتاً فطرت عریاں معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس لئے ہمارے فلسفیانہ ادب کی سرحدیں بھی رومانی ادب سے جا ملتی ہیں۔ ہمارے نوجوان ادب میں درحقیقت بیداری کے خواب ہوتے ہیں جس میں تمنائیں، آرزوئیں کھوئی ہوئی دنیا کے حاصل کرنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ جو کبھی جوش فکر وفی وانقلابی ادب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کبھی کبھی خیال سے محو اور بیگانۂ عمل کرنے والے رومانی ادب کی صورت۔

درحقیقت یہ واردات قلبی کی صدائے بازگشت ہے۔ باہر سے آنے والے لذت کی مشق بعد کیف نفس کا خمار ہے۔ اس خواب خیال کا مرکز خود انسان کا اپنا پُراسرار نفس ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کیا کیا فرض کرکے شدید تخیل پر سوار کرکے کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔

مگر ان تمام جذبات میں اثبات خودی کی اُمنگ یا حصول شخصیت کے ولولہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو حقیقتاً زندگی کے محرکات میں سے ہے اس لئے ہمارے ادب کے لئے یہ من گھڑت تصورات خوش آئند اور تابناک مستقبل کے ضامن قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

وجدی الحسینی (فاضل دیوبند مولوی فاضل بھوپال)

تجلیات

جب بھی جگنو کوئی چمکا صحن گلشن کے قریب
میں یہ سمجھا برق آپہنچی نشیمن کے قریب

پھر وہ کیوں جانے لگا وادیِ ایمن کے قریب
کوندتی ہوں بجلیاں جسکے نشیمن کے قریب

وائے ناکامی کہ رخصت ہوگئی فصلِ بہار
ہم ٹہلتے ہی رہے دیوارِ گلشن کے قریب

تنکے چُن کر کیوں کروں تو ہینِ حسنِ انتخاب
پھول جب موجود ہیں میرے نشیمن کے قریب

پھر نہ ہوتا شکوۂ محرومیِ قرب و حضور
کاش اسکو ڈھونڈتے ہم اپنی گردن کے قریب

یا الٰہی! میرے دو تنکوں کی رکھنا آبرو
اک دھواں سا اٹھ رہا ہے صحن گلشن کے قریب

امتیاز اتنا کہاں منزل رسی کے شوق میں
جان کر رہبر چلا جاتا ہوں رہزن کے قریب

باغِ عالم میں وہ ہوں میں بلبلِ آتش نفس
برق جل جائے جو آجائے نشیمن کے قریب

کھل گئی تقدیرِ بلبل، کھل گیا باغِ مراد
شاخِ گل آئی جو بڑھ کر خود نشیمن کے قریب

چاہیے اے مہرؔ! اپنی تابِ نظارہ کی شرم
آج وہ بیٹھے ہوئے ہیں اپنی چلمن کے قریب

مہر تقوی جے پوری



آشیاں نہیں معلوم

یہ جاں نواز ہے یا جاں ستاں نہیں معلوم ابھی تمہیں مرا دردِ نہاں نہیں معلوم

ہنوز انھیں بھی مری داستاں نہیں معلوم کس انتظار میں ہے رازداں نہیں معلوم

قفس سے چھٹ کے کہاں جائیں اب اسیرِ بہار کوئی گھر اور بجز آشیاں نہیں معلوم

میں دل کے سوز کو پہلو میں ہوں دبائے ہوئے کہاں پھٹے گا یہ آتش فشاں نہیں معلوم

براہِ راست جو چھوتی ہے روح کے پردے ابھی وہ لے ہی تجھے نغمہ خواں نہیں معلوم

ہیں بے شمار مہ و مہر خاک میں پنہاں زمیں کی قدر تجھے آسماں نہیں معلوم

چمک رہی تھیں ابھی بجلیاں چمن کی طرف بچا کہ خاک ہوا آشیاں نہیں معلوم

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا کی خبر کہاں سے آئے چلے ہیں کہاں نہیں معلوم

ہر ایک پیڑ ہر اک پھول پر گری بجلی تباہ کیوں نہ ہوا باغباں نہیں معلوم

ہوئی نہ دفن وطن میں نہ دشتِ غربت میں پڑی رہی مری میت کہاں نہیں معلوم

سرشتِ حسن بدستور ہے نشاط انگیز مزاجِ عشق ہے کیوں سرگراں نہیں معلوم

وہی بہار و خزاں کے لئے ہوں سرگشتہ جنھیں مآلِ بہار و خزاں نہیں معلوم

جو اس میں کیف ہے اے مردہ دل تو کیا جانے تجھے حیات کی دلچسپیاں نہیں معلوم

یہ بجلیاں کچھ اس انداز سے چمکتی ہیں کہ جیسے ان کو مرا آشیاں نہیں معلوم

تباہ کر نہ سکے ہستی و عدم نیر

ہمیں پناہ ملے گی کہاں، نہیں معلوم

نیر خورجوی

سزائے جمیل!

کشور جب میرے کمرہ میں داخل ہوا تھا تو عجب پریشان اور بدحواس سا نظر آرہا تھا، آتے ہی سامنے والے صوفے پر دراز ہو گیا، وہ اس وقت بالکل خاموش تھا۔ حالانکہ وہ ہمیشہ مجھے سڑک پر ہی سے آواز دیدیا تھا اور اُسکی آمد طوفان باد و باراں کی طرح پُر شور ہوتی تھی۔ مگر آج اُس کے چہرہ پر نہ وہ پہلی سی بشاشت تھی اور نہ شوخیٔ مزاج، وہ بالکل گم سم اور اُداس تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج وہ اپنی شوخیاں شرارتیں اور خوش مذاقیاں کہیں رہن رکھ آیا ہے۔ میں بڑی دیر تک منتظر رہا کہ وہ بولے تو ماجرا سمجھ میں آئے۔ لیکن جب ۵ منٹ تک اُس کے لبوں کو جنبش نہیں ہوئی تو میں بے چین ہو گیا اور اُس کو مشتعل کرنے کے لئے کہا:-

"یہ حادثہ کب پیش آیا؟"

"کون سا حادثہ! کیا مطلب؟"

"کیوں! تمہاری نانی کی موت؟"

"کیا واہیات بک رہے ہو؟ میری نانی بخیر و عافیت ہیں۔"

"مجھے یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے تمہارے چہرہ سے اندازہ لگایا کہ تم سے کوئی جُدا ہو گیا ہے اور چونکہ کوئی شخص علیل نہیں اور نہ ہی اس قسم کی کوئی اطلاع ہوئی ہے میں نے قدرتاً یہ سمجھا کہ شاید بوڑھی خاتون ہی چل بسی ہیں۔"

"احمق! یہ لغویات بند کرو، یہ بہت ہی نازک معاملہ ہے، میری بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"ارے کیا واقعی چلی گئی؟"

"میں ہمیشہ تم سے کہتا رہتا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی حماقت کو محسوس کریگی اور . . . ."

اتنے میں ملازم چائے لیکر آگیا، میں نے اس سے کشور کے لئے ایک پیالی اور لانے کو کہا۔ چائے نے اُس کے جذبات کو مربوط کر دیا اور آہستہ آہستہ وہ "صحیح راستہ" پر آگیا۔

اُس نے سوال کیا "دیویندر کو تم جانتے ہو جسکا ہمارے کالج میں ابھی ابھی تقرر ہوا ہے؟"

"کیا تمہارا مطلب کیمیا کے جدید لیکچرار سے ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، اچھا تو سُنئے یہ حضرت ہی میری مشکلات و پریشانیوں کی جڑ ہیں۔"

"اچھا تو یہی تمہاری بیوی کو ورغلا کر لے گئے، کیا انہوں نے کوئی پتہ بھی چھوڑا ہے، میں مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں......"

چپ رہیئے! میں کچھ کہہ رہا ہوں اور تم ہو کہ مذاق اُڑا رہے ہو———

اچھا اب تم ہی سب کہہ لو———

"نہیں——— نہیں تم اطمینان سے اپنی داستانِ غم" سُناؤ!"

"جاؤ ہم نہیں سُنانتے!"

میں نے اُس کو گدگدا دیا، وہ ہنس پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اب وہ موڈ میں آگیا، اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"میں شاید تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہمارے کالج کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ ایک نیا لیکچرار اسٹاف کلب میں اپنی شمولیت اس طرح کرے کہ وہ اسکے تمام اراکین کو شاندار "دعوتِ طعام" دے، دیویندر اس سے بچنا چاہتا تھا، ہم نے اپنی مقدور بھر کوشش کر ڈالی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، ہم نے اس سے بحث و محبت کا ہر طرح بہلایا پھسلایا حتیٰ کہ دھمکایا بھی مگر "ذات شریف" ٹس سے مس نہ ہوئے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس خصوصیت کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے میں نے ایک اسکیم بنائی جسکی سب نے تہہ دل سے تائید کی۔"

اُس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا اور مجھے دیا، یہ ایک خط تھا، جس میں نسوانی انداز میں حسب ذیل عبارت لکھی تھی:-

میرے محبوب!

"آج شام میں فرصت میں ہونگی [illegible]

سنہری چین کا بہت بہت شکریہ [illegible]

بہت خوش ذائقہ اور شاندار ہیں، بھولئے گا نہیں ——
وہی جگہ آٹھ بجے، ہسپتال کے گھنٹہ گھر کے قریب! باقی باتیں
ملاقات کے وقت —— !

محبت و پیار کے ساتھ،
تمہاری
"پرستار"

"تم نے خط دیکھا؟" کشور نے پوچھا "تمہیں معلوم ہے میں طرزِ تحریر اور نسوانی انداز نگارش میں کس قدر ملکہ رکھتا ہوں یہ تمہیں بھی خیال نہیں ہوگا کہ یہ خط میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں خفیف سا بھی شبہ نہیں کر سکتا کہ تم ایسے حسین خط کے مصنف ہو سکتے ہو؟"

"ہاں تو تجویز یہ تھی کہ اس خط کو چپکے سے دیویندر کی جیب میں کھسکا دیا جائے اور پھر رفتارِ حالات کا مطالعہ کیا جائے۔

اگر، جیسی کہ ہم سب کو اُمید تھی، اسکی بیوی اس خط کو دیکھتی تو یقیناً بڑا طوفان بے تمیزی برپا ہوتا، اس کے بعد ہم حالات کی صفائی نہیں کرتے اور شاندار دعوت اُڑاتے کتنی لاجواب اسکیم ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟ خصوصیت بھی قائم رہتی اور کسی کو بُرا بھی نہ کہنا پڑتا۔"

میں نے اس سے اظہارِ اتفاق کیا کہ اسکیم بہت خوب تھی!

"مگر ساری تدبیر اُلٹی ہوگئی، جیسے ہی میں اس قیمتی دستاویز کو دیویندر کی جیب میں کھسکانے والا تھا کہ پرنسپل نے اچانک اسکو بلالیا، میں اسکی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر وہ اتنی دیر تک مصروفِ کار رہا کہ گھنٹی بج جانے پر مجھے کلاس میں چلا جانا پڑا، میں نے بادلِ نخواستہ خط کو اپنی جیب میں رکھ لیا اور دوسرے دن پر اس نیک کام کو اٹھا رکھا۔ مگر قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو ——"

یہاں کشور رک گیا اور پھر سنجیدہ بنگیا، تھوڑے وقفہ کے بعد اس نے کہنا شروع کیا:-

"مجھے باقی حالات کی کوئی خبر نہیں مگر اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کہ کیا ہوا ہوگا، شاید آج شام دھوبی آیا تھا اور میری بیوی نے اس کو کپڑے دینے سے پہلے جیبوں کو دیکھا ہوگا اور اس کو وہ خط —— مل —— گیا ہوگا!"

کشور نے اپنی جیب میں پھر ہاتھ ڈالکر ایک خط نکالا اور مجھے دیتے ہوئے کہا "پڑھو"

"جب میں شام کو سیر کرکے گھر پہونچا تو میز پر یہ خط رکھا ہوا ملا۔"

میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:-

"اچھا تو اب یہ شغل ہیں! مجھے تو ایک عرصہ سے اسکا شبہ تھا میں اس کو برداشت نہیں کر سکتی آپ اپنی پرستار کے پاس جاسکتے ہیں اور میں اپنے والد کے یہاں جارہی ہوں، خدا حافظ۔

تمہارے اور تمہاری پرستار کے لئے ہزاروں دعائیں۔"

تمہاری —— کملا

رشدی بھوپالی

اندازِ نظر

کہیں کیا حسن کی فطرت کو ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی اک برق در پردہ کبھی جلوا سمجھتے ہیں

وفائے عشق حسنِ بے وفا کا اک مرقع ہے
نیاز و ناز کے عالم کو بس اتنا سمجھتے ہیں

ادا اک یہ بھی ہے در پردہ نازِ دلربائی کی
ترا انداز ہم اے چشمِ بے پروا سمجھتے ہیں

دلِ پُر آرزو ہے اک چمن جوشِ تمنا تک
جو ہیں انجام سے کچھ باخبر صحرا سمجھتے ہیں

نگاہیں محوِ حیرت ہیں یہ ہے تنویر کا عالم
وہ ہیں پیشِ نظر پھر بھی تو ہم پردا سمجھتے ہیں

ہزاروں حسرتوں کے ساتھ بزمِ ناز تک پہنچا
یہ ہنگامہ ہے پھر بھی وہ مجھے تنہا سمجھتے ہیں

ستم ہو یا کرم جو کچھ بھی ہو ہم کو گوارا ہے
ہم اندازِ نظر کو حاصلِ دنیا سمجھتے ہیں

فضا جو آشنا ہیں رازِ ہستی کی حقیقت سے
نفس کی آمد و شد کو بھی اک دھوکا سمجھتے ہیں

فضا جالندھری

احساسِ مجبوری

ہے کسی کی جنبشِ ابرو پہ عالم کا نظام — کاہ سے تا کہکشاں ہر خشک و تر مجبور ہے
کب کسی صورت سے پا سکتا ہے رازِ کائنات — جبکہ عرفانِ بشر ہی سے بشر مجبور ہے
اپنے محور سے نہیں ہٹتے ستاروں کے قدم — اک ڈگر پر گردشِ شام و سحر مجبور ہے
رحم کے قابل ہے اپنی بے بسی میں آدمی — سب اسے مختار کہتے ہیں مگر مجبور ہے

جس بلندی پر حقیقت کے شواہد ہیں وہاں
عقل ناکارہ ہے پرکارِ نظر مجبور ہے

احسان دانش

آیۂ محکم

رہی نہ قبضۂ مسلم میں فقر کی تلوار — جہاں ہے منتظرِ ضربِ حیدرِ کرّار
عجب نہیں جو خرد اس پہ غالب آ جائے — کہ جسمِ بندۂ مومن ہے روح سے بیزار
ہے میرے خامہ سے افکارِ نو بہ نو کی نمود — کہ میں نے عشق سے سیکھی ہے جدتِ گفتار
خزاں نے فاش کیا گل کا رازِ سربستہ — وگرنہ حاملِ اسرارِ رنگ و بو تھی بہار
جوانِ پاک ہے عقل و خرد سے بالاتر — کہ حق نے اسکو عطا کی ہے وحدتِ کردار
عرب کے سوز میں باقی نہیں وہ سازِ طلب — سکھائی جس نے مسلماں کو گرمیِ رفتار
خودی کی موت سے ہوتی ہے پرورش اسکی — وہ اختلال کہ ہیں جس میں امتوں کے مزار
شراب و شاہد و نغمہ فرنگ کا مقصود — مری متاعِ حیات ایک مستیِ بیدار

یہی ہے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ
کہ تیری روح پہ طاری ہو نشۂ کردار

آفسر سیمابی احمد نگری

دورِ حاضر اور تحقیق

دورِ حاضر اردو ادبیات کی تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے زرّین کہا جاتا ہے مگر ہمیں اپنی زیرِ تالیف کتاب "مثنویاتِ اُردو" کے سلسلے میں تجربہ ہوا کہ جہاں تک "مثنویت" کا تعلق ہے ہمارے محققین ایک دوسرے سے اس قدر مختلف اور اتنی متضاد تحقیقوں کے مالک ہیں کہ بہت سی چیزوں کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کی ہی نہیں جا سکتی۔ اور عوام ان کی تحقیق سے نہ کوئی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور نہ کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) مثنوی نگاری کی ابتدا اور اُردو زبان کی سب سے پہلی مثنوی کے متعلق صاحب "شعر الہند" نے لکھا ہے کہ :۔

"غالباً اسکا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا چنانچہ ۱۰۱۸ھ میں قطب شاہ نے ایک نعتیہ مثنوی لکھی۔"

یہ غالباً کی بھی ایک ہی رہی۔ مولانا سیماب اکبرآبادی نے بھی "مثنوی" اور "مقدمہ" دیتیہ میں ایسا ہی کچھ فرمایا ہے :۔

"اُردو میں مثنوی کہنے کا رواج ۱۰۱۸ھ میں ہو چکا تھا۔ غالباً قطب شاہ فرمانروائے گولکنڈہ (دکن) نے سب سے پہلی مثنوی نعت میں بزبان دکھنی بھاشا کہی تھی۔"

صاحبِ "مثنویات" نے اور بھی کمال کر دیا ہے، اُن کا فرمانا ہے کہ :۔

"کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۱۰۱۸ھ میں ایک مثنوی نعت میں کہی تھی اور یہی پہلی مثنوی تھی جو دکنی بھاشا میں نظم کی گئی۔ مگر وجہی کی مثنوی "تحفۂ عاشقاں" اس سے بھی پہلے کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ "تحفۂ عاشقاں" تاریخی نام ہے اور اس سے "۱۰۱۵" حاصل ہوتے ہیں۔"

مولانا عبدالباری آسی نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ رسالہ "اُردو" جنوری نمبر ۱۹۲۹ء اور "نگار" کے "مصحفی نمبر" میں بھی فرمایا ہے کہ ۱۰۱۵ھ میں وجہی کی مثنوی "تحفۂ عاشقاں" اور ۱۰۱۸ھ میں قطب شاہ کی نعتیہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ اوّل تو یہی غلط ہے کہ "تحفۂ عاشقاں" ۱۰۱۵ھ کی تصنیف ہے ... وجہی کا زمانہ ... رہویں صدی ... گزرا ہے پھر وہ ۱۰۱۵ھ میں کیسے کوئی مثنوی کہہ سکتا ہے ... صاحبِ "مثنویات" نے صرف "تحفۂ عاشقاں" کے اعداد گنے اور سال تصنیف ۱۰۱۵ھ فرما دیا۔ حالانکہ "تحفۂ عاشقاں" کا سال تصنیف ۱۰۵۳ھ ہے جو پورے مصرع :۔

"پچھانو اسے تحفۂ عاشقاں"

سے نکلتا ہے۔ اس مثنوی "تحفۂ عاشقاں" کے متعلق رام بابو سکسینہ نے اور بھی مزہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" میں اسکا ذکر تین جگہ کیا ہے اور اسکا سنہ تصنیف انھوں نے ایک جگہ ۱۰۱۵ھ دوسری جگہ ۱۰۵۳ھ اور تیسری جگہ ۱۰۵۵ھ لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ تینوں غلط ہیں۔

رہا قطب شاہ کی نعتیہ مثنوی کا ذکر جو ۱۰۱۸ھ کی تصنیف بتائی جاتی ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ محمد قلی قطب شاہ بچپن سے شعر کہتے تھے اور انکا انتقال ۱۰۲۰ھ میں بعمر ۴۸ سال دورہ ہوا ہے۔ ایسی صورت میں یہ نعتیہ مثنوی بجائے خود قطب شاہ کی سب سے پہلی مثنوی نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ وہ اُردو زبان کی سب سے پہلی مثنوی قرار دی جائے اور بفرضِ محال اگر اس نعتیہ مثنوی کو ۱۰۱۸ھ کی تصنیف مان بھی لیا جائے تو بھی ہم اسے اُردو زبان کی سب سے پہلی مثنوی نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" اسی سنہ کی تصنیف الوقت موجود ہے۔

(۲) ابن نشاطی نے "پھول بن" نام کی ایک مثنوی لکھی ہے۔ جس کے دیباچہ میں اُنہوں نے لکھ دیا ہے کہ اس مثنوی کا افسانہ "بساتین" سے ماخوذ ہے اور یہ ۱۰۶۶ھ کی تصنیف ہے۔ چنانچہ صاحبِ "مثنویات" اور صاحبِ "اردو شہ پارے" نے اسکا ذکر کرتے ہوئے اسے "بساتین السلاطین" کا ترجمہ فرما دیا ہے۔ صاحبِ "اردوئے قدیم" نے "کشف الظنون" مصنفہ حاجی خلیفہ کی سند دیکر لکھا ہے کہ یہ مثنوی ملا احمد زبیری کی فارسی تصنیف "بساتین الانس" کا ترجمہ ہے۔ اب واقعہ سنئے :۔

(الف) دراصل اس مثنوی کا افسانہ "بساتین السلاطین" سے نہیں بلکہ "بساتین الانس" سے ماخوذ ہے۔

(ب) "بساتین الانس" ملا احمد ... کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ... احمد حسن دبیر ... کی ہے۔

(ج) "کشف الظنون" میں کہیں بھی درج نہیں کہ "بساتین الانس" ملا احمد زبیری کی تصنیف ہے۔

(د) "پھول بن" ہرگز "بساتین" کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے فسانہ کا پلاٹ کسی حد تک اس سے ماخوذ ہے۔

اب آیئے اسکے سنہ تصنیف کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے۔ میجر اسٹیوارٹ نے اسکا سنہ تصنیف ۱۰۵۹ھ بتایا ہے مولانا امیر احمد علوی اور ڈاکٹر محمد باقر نے ۱۰۶۶ھ ظاہر کیا ہے درانحالیکہ اسکا سنہ تصنیف ۱۰۶۶ھ ہے۔

(۳) مثنوی "ابر شمہ" کا مصنف صاحب "کلیات بحری" اور صاحب "اُردو شہ پارے" نے انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ دیکھکر "امین" کو ظاہر کیا ہے۔ صاحب "اُردو مثنوی کا ارتقا" نے حیدر آباد کا مایہ ناز ذخیرۂ کتب دیکھکر اسکا مصنف جنیدی کو ظاہر کیا ہے۔ گر مولانا عبدالحق نے "اردو" جولائی نمبر ۱۹۳۲ء میں فرمایا ہے کہ:۔

"میرے پاس اسکے متعدد نسخے ہیں لیکن کسی میں امین یا محمد امین نہیں آیا ہے بلکہ ہر نسخے کے آخر میں اسکا نام "ادیا" لکھا ہوا ہے"۔

اب بتایئے کس کے مطالعہ و تحقیق کو ہم صحیح باور کریں؟

(۴) طبعی نے ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" لکھی ہے۔ پروفیسر زور نے اس کے ماخذ کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ شمس اللہ صاحب قادری اور پروفیسر مجنوں کے نزدیک اسکا مواد نظامی کی مثنوی "ہفت پیکر" کی ایک داستان متعلق "گل اندام" سے ماخوذ ہے عبدالقادر سروری صاحب کے نزدیک "بہرام و گل اندام" کا ماخذ بہرام گور کے فارسی قصص ہیں۔ علامہ کیفی چریا کوٹی اس کو ہاتفی کی مثنوی "ہفت پیکر" سے ماخوذ بتلاتے ہیں۔ درانحالیکہ ہاتفی نے کوئی مثنوی "ہفت پیکر" کے نام سے نہیں لکھی ہے بلکہ اس نے ایک مثنوی "ہفت منظر" کے نام سے لکھی ہے۔ اب اصل واقعہ سنئے کہ دراصل طبعی کی یہ مثنوی کاتبی نیشاپوری کی فارسی مثنوی "بہرام و گل اندام" سے ماخوذ ہے

(۵) ڈاکٹر گریم بیلی، صاحب "اردو شہ پارے" صاحب "اردو مثنوی کا ارتقا" اور صاحب "یورپ میں دکنی مخطوطات" نے ملک خوشنود کی دو مثنویاں ظاہر کی ہیں ایک "یوسف زلیخا" اور دوسری "ہشت بہشت"۔ نیز کہا ہے کہ یہ دونوں مثنویاں، حضرت امیر خسرو کی اسی نام کی مثنویوں کا ترجمہ ہیں، صاحب "اُردو شہ پارے" اور صاحب "یورپ میں دکنی مخطوطات" نے "یوسف زلیخا" کو لاپتہ بتایا ہے اور اول الذکر کا مثنوی "یوسف زلیخا" کے متعلق بیان ہے کہ:۔

"اس مثنوی کے متعلق ملک خوشنود نے برٹش میوزیم کے "ہشت بہشت" کے مخطوطے میں ذکر کیا ہے"۔

مگر ڈاکٹر محمد باقر صاحب اپنے مضمون مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ فروری ۱۹۴۱ء میں فرماتے ہیں کہ:۔

"راقم نے برٹش میوزیم کے مخطوطے کو خوب غور سے دیکھا ہے لیکن "یوسف زلیخا" کا کوئی ذکر کہیں بھی نہیں ملا"۔

ملے تو کیسے اور کیوں جبکہ امیر خسرو غریب نے "یوسف زلیخا" نام کی کوئی مثنوی ہی نہیں لکھی ہے تاریخ تصنیف کے متعلق صاحب "اردو شہ پارے" خاموش ہیں۔ صاحب "اردوئے قدیم" نے فرمایا ہے کہ "ہشت بہشت کی تاریخ تصنیف کا کوئی پتہ نہیں چلتا" مگر صاحب "یورپ میں دکنی مخطوطات" فرماتے ہیں کہ سنہ تصنیف کتاب میں موجود ہے اور وہ ۱۰۵۶ھ ہے۔

(۶) پروفیسر ٹاسی نے ضیاء الدین نخشبی کی فارسی مثنوی "طوطی نامہ" کے متعلق لکھا ہے کہ اسی نام سے اسکا ترجمہ ابن نشاطی نے کیا ہے۔ انہوں نے اس کا سنہ تصنیف بھی ۱۰۴۹ھ ظاہر کیا ہے۔ میجر اسٹیوارٹ نے بھی ٹاسی کی ہمنوائی کی ہے اور اسکا سنہ تصنیف ۱۰۶۴ھ بتایا ہے۔ مرزا علی لطف نے "تذکرۂ گلشن ہند" کے مقدمہ میں مولانا عبدالحق نے بھی ابن نشاطی کی ایک مثنوی "طوطی نامہ" ظاہر کیا ہے لیکن سنہ تصنیف نہیں دیا ہے، صاحب "اردوئے قدیم" بھی اس کے قائل ہیں اور وہ ابن نشاطی کے "طوطی نامہ" کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ ظاہر کرتے ہیں۔ مگر پروفیسر زور نے "اُردو شہ پارے" میں اس کی تردید کی ہے۔ ہم نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ۱۰۶۶ھ ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کا سنہ تصنیف ہے اور ۱۰۴۹ھ جس "طوطی نامہ" کا سنہ تصنیف ہے وہ ابن نشاطی کی نہیں بلکہ غواصی کی تصنیف ہے۔

(۷) مولانا عبدالحی نے "گل رعنا" میں ولی اورنگ آبادی کی صرف ایک مثنوی "دہ مجلس" بتایا ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے بھی مثنوی "مادر ہند" کے مقدمہ میں ولی کی ایک مثنوی ظاہر کی ہے۔ مگر وہ اسکا موضوع "در حالات شہدائے کربلا" بتلاتے ہیں شفیق اورنگ آبادی نے بھی "چمنستان الشعرا" میں صرف ایک مثنوی ظاہر کی ہے مگر وہ اسکا موضوع "در تعریف شہر سورت" بیان کرتے ہیں۔ جناب امیر احمد صاحب نے "مثنویات" میں ولی کی دو مثنویاں ظاہر کی ہیں ایک شہر سورت کی تعریف میں اور دوسری "شہدائے کربلا کے حالات" پر مشتمل۔ آخر الذکر مثنوی کا نام انھوں نے غالباً کے لفظ کے ساتھ "دہ مجلس" بتایا ہے۔ پروفیسر زور نے بھی "اُردو شہ پارے" میں ولی کی دو مثنویاں بیان کی ہیں مگر نام نہیں دیا ہے۔ البتہ "دہ مجلس" کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔ مولوی

عبدالقادر سروری نے بھی "اُردو مثنوی کا ارتقا" میں وؔلی کی دو مثنویاں کی ہیں۔ ایک شہر سورت کی تعریف میں اور دوسری "روحانی کیفیات" کے بیان میں۔ انجمن ترقی اُردو نے وؔلی کا جو دیوان شائع کیا ہے اس میں مولانا احسن مارہروی کا مقدمہ شامل ہے جس میں انھوں نے صاف طور سے کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا ہے کہ:—

"بعض صحیح روایتوں اور شاہدوں سے پتہ چلتا ہے کہ شہادتِ کربلا کے بیان میں "دہ مجلس" ولی کی مثنوی کا نام ہے جس کی تاریخ اختتام اس دیوان کے آخر میں درج ہے۔"

ہم حیران ہیں کہ ولی کی واقعاً کتنی مثنویاں سمجھیں اور اسکا موضوع کیا تعین کریں۔

(۸) تین مثنویاں "قصہ ملکہ مصر"، "قصہ فیروز شاہ" اور "لعل و گوہر" کے نام سے مشہور ہیں۔ صاحبِ "اُردو شہ پارے" نے "ملکہ مصر" کو محمد علی عاجز کی مثنوی اور "قصہ فیروز شاہ" اور "لعل و گوہر" کو عارف الدین عاجز کی تصنیف بتایا ہے۔ صاحبِ "تذکرہ شعرائے دکن"، صاحبِ "گل رعنا"، صاحبِ "کلیات بحری"، صاحبِ "مثنویات" اور صاحبِ "اُردو مثنوی کا ارتقا" نے "قصہ ملکہ مصر" اور "قصہ فیروز شاہ" کو محمد علی عاجز کی تصنیف اور "لعل و گوہر" کو عارف الدین عاجز کی مثنوی ظاہر کیا ہے۔ "لعل و گوہر" کو عارف الدین عاجز کی مثنوی کہنے میں صاحبِ "چمنستان الشعرا" بھی ان لوگوں کے ہمنوا ہیں۔ صاحبِ "اُردوئے قدیم" ان تینوں مثنویوں کو محمد علی عاجز کی تصنیف کہتے ہیں اور صاحبِ "جواہر سخن" ان تینوں کو عارف الدین عاجز کی مثنویاں قرار دیتے ہیں۔ مولانا عبدالحق ان مثنویوں کے متعلق تو خاموش ہیں لیکن صاحبِ "اُردو لٹریچر" ان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:—

"مصنف "قصہ ملکہ مصر" اور "قصہ فیروز شاہ" کا نام محمد علی عاجز غلط ہے۔ اس نے خود اپنی تصنیف ملکہ مصر میں اپنا نام محمود بتایا ہے۔ عاجز تخلص بھی غلط ہے۔"

گویا اس وقت تک جو کچھ تحقیق ہوئی ہے وہ یکسر نادرست اور یک قلم غلط ہے۔

(۹) صاحبِ "چمنستان الشعرا" نے لکھا ہے کہ سراج کی مثنوی "بوستانِ خیال" کا سنہ تصنیف سنہ ۱۱۶۰ھ ہے۔ ان کے عہد میں سراج زندہ تھے اور ان سے تعلقات بھی قائم تھے۔ صاحبِ "مثنویات" فرماتے ہیں کہ "بوستان خیال":—

"سنہ ۱۱۶۰ھ کی تصنیف ہے اور اسی رعایت سے اس میں ۱۱۶۰ اشعار بھی ہیں۔"

وہ ثبوت میں مصنف کا یہ شعر بھی پیش کرتے ہیں:—

زبس ہیں ہے یہ گلشن تمام ● دکھا "بوستانِ خیال" اسکا نام
عدد جبکہ اس نام کے آئے ہاتھ ● مطابق ہوئے سال ابیات ساتھ

مگر صاحبِ "اُردوئے قدیم"، صاحبِ "گل رعنا" اور صاحبِ "کلیاتِ بحری" اسکا سال تصنیف سنہ ۱۱۷۳ھ فرماتے ہیں۔ آخرالذکر نے اسکا مطابق سنہ ۱۷۵۹ء فرمایا ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ یہ محقق سنہ ہے۔

(۱۰) جرأت کی مثنویوں کے متعلق صاحبِ "شعرالہند" نے لکھا ہے کہ "کوئی مثنوی ہی نہیں لکھی"۔ صاحبِ "تاریخ ادب اردو" نے لکھا ہے کہ دو مثنویاں انھوں نے لکھی ہیں۔ صاحبِ "تاریخ مثنویات اردو" نے ان کی نو مثنویاں ظاہر کی ہیں مگر جب ہم نے جرأت کا دیوان دیکھا تو اس میں ستائیس ۲۷ مثنویاں ملیں۔

(۱۱) صاحبِ "کاشف الحقائق" نے میر حسن کی صرف ایک مثنوی "سحرالبیان" ظاہر کی ہے۔ صاحبِ "تاریخ مثنویات اُردو" فرماتے ہیں کہ "سحرالبیان" کے علاوہ مولانا روم کے طرز پر "رموزالعاشقین" کے نام سے ایک اور مثنوی تصوف میں لکھی ہے"۔ صاحبِ "آبِ حیات" کا بیان ہے کہ "سحرالبیان" کے علاوہ دو ۲ مثنویاں اور لکھی تھیں مگر وہ نام نہیں بتاتے۔ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی نے "سحرالبیان" کے مقدمہ میں فرمایا ہے کہ "سحرالبیان" کے علاوہ دو ۲ مثنویاں اور ہیں:— "گلزارِ آدم" اور "رموزالعارفین"۔ صاحبِ "مثنویات" نے ان کی دس مثنویاں ظاہر کی ہیں۔ مگر نام کسی کا بھی نہیں پیش کیا ہے۔ ہم نے جب ان کا دیوان دیکھا تو گیارہ مثنویاں ملیں۔

(۱۲) ایک مثنوی "نیہ درپن" ہے صاحبِ "اُردو شہ پارے" اس کو عشرتی کی تصنیف فرماتے ہیں اور صاحبِ "اُردو مثنوی کا ارتقا" نے اس کو عشرتی کے بیٹے ہنر کی مثنوی کہا ہے۔

بہرکیف کہاں تک لکھا جائے اور کیا کیا لکھا جائے۔ بظاہر اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے محققین تحقیق تو کم کرتے ہیں لیکن جدتِ طبع کو زیادہ کام میں لاتے ہیں۔ کاش ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہو۔

عطاء اللہ پالوی

ستی

اک چتا میں جل رہا تھا اک حسینہ کا سہاگ
جسکے شعلوں نے لگادی اُسکے جان و تن میں آگ

اک طرف تو اُڑ رہی تھیں آگ کی چنگاریاں
اک طرف آتشِ بداماں آہِ سوزاں کا دھواں

اک طرف تو سر سے اونچا آگ کا سیلاب تھا
اک طرف دل سوزِ غم سے ماہیِ بے آب تھا

اک طرف تھی ہستیِ فانی کے پیراہن میں آگ
اک طرف بھڑکی ہوئی تھی زیست کے خرمن میں آگ

اک طرف ملبوسِ تن خاکستری پوشاک تھی
اک طرف چہرے پہ گیسو گیسوؤں پر خاک تھی

اک طرف مٹنے کو تھا نام و نشانِ زندگی
اک طرف تھا رو بمنزل کاروانِ زندگی

ایک دل دیتا تھا تسکیں صدمہ و آلام کی
ایک دل کہتا تھا ایسی زندگی کس کام کی

ایک دل کہتا تھا دیکر جان کیا مل جائیگا
ایک دل کہتا تھا جینے کا مزا مل جائیگا

ایک دل کہتا تھا جلتا جیتے جی انساں نہیں
ایک دل کہتا تھا جینا بھی تو کچھ آساں نہیں

ایک دل کہتا تھا حُسنِ دلربا مِٹ جائیگا
ایک دل کہتا تھا آخر کون سے کام آئیگا؟

ایک دل کہتا تھا زُلفیں خاک میں ملجائینگی
ایک دل کہتا تھا زنجیر اب کسے پہنائینگی

ایک دل کہتا تھا ماریگی جگر پر تیر کون
ایک دل کہتا تھا ہوگا تیر کا نخچیر کون

ڈبڈبائی آنکھ آئی لب پہ ہلکی سی ہنسی
درد کے پردے میں درماں غم کے پردے میں خوشی

آتشِ شوق اسقدر بھڑکی وفورِ جوش میں
گر پڑی آخر دہکتی آگ کی آغوش میں

چوں زنِ ہندو کسے در عاشقی مردانہ نیست
سوختن بر شمعِ کشتہ کارِ ہر پروانہ نیست

تمر یکا بری مینائی

.... کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں ـــــ بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرہ)

عنوان کی ناتمامی ناظرین کو گوناگوں اُلجھنوں میں ضرور ڈالے گی۔ اِس سلسلے میں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ اِس ڈائری کے مرتب کو کچھ لوگ ادیب سمجھتے ہیں، کچھ شاعر اور کچھ ایڈیٹر۔ یہ اِس تضاد یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ڈائری کس کی ہے۔ بہرحال راقم الحروف کو جو جس حیثیت سے سمجھتا ہے وہ اُسی اعتبار سے اِس کا مطالعہ کرے۔

۲۲ نومبر سنہ ۴۲ء

خیال تھا کہ گذشتہ شب کو اوّلِ وقت نیند کی شہزادی کو خوش آمدید کہہ دونگا اِس لئے کہ دو ہفتہ سے مسلسل شب و روز کام کر رہا ہوں۔ دل و دماغ تھک چکے ہیں۔ لیکن باوجود کوشش کامیابی نہیں ہوئی اور دو بجے شب تک کام کرنا پڑا، جسے مرکز سے دو دن ہٹنا بھی دشوار ہو اُسے جنوبی دن کے طویل سفر کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ کم ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تمام کام بحسن و خوبی ختم ہو گئے۔ دسمبر کا شاعر کتابت کی آخری منزل میں ہے۔ جنوری کا رسالہ بھی مرتب کر دیا ہے تاکہ میری غیر موجودگی میں اُس کی کتابت شروع ہو جائے۔ صبح آنکھ دیر سے کھلی، رختِ سفر تو رات ہی کو مرتب کر لیا تھا SHAVING کے بعد غسل کیا۔ ابھی لباس ہی تبدیل کر رہا تھا کہ حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ نے کھانے پر آواز دے لی، لیا دیا کھانا کھا پایا۔ تانگے آ چکے ہیں اور سامان لد رہا ہے۔ ایک طویل سفر کے لئے جتنی ضروری چیزیں ہو سکتی ہیں وہ سب ساتھ ہیں، بہت سی چیزیں نظر انداز کرنے کے باوجود ۱۳ بنڈل ہو گئے ہیں۔ برادرِ معظم حضرتِ منظر صدیقی کا پانچ سالہ بچہ یوسف اختر برادرم میاں سجاد حسین کا ۴ سالہ لڑکا اکبر اظہر اور میرا بچہ تاجدار احتشام بڑے غور و فکر سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ افراد کی رخصت بھی بچوں کے لئے کتنے متضاد جذبات و احساسات کی حامل ہوتی ہے۔ بچے تو بچے بیگم کو بھی سفر کے طویل تصورات سے ایک قسم کی وحشت ہو رہی ہے۔ تانگے میں قدم رکھتے ہی تاجدار احتشام پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ۱۲ بجے راجہ منڈی اسٹیشن پہونچ گئے۔ ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہے اور لطف یہ کہ ہر درجہ کا ٹکٹ بند۔ علاء الدین ملازم کو سامان کی نگرانی کے لئے چھوڑ کر قبلہ و کعبہ کے ساتھ بکنگ آفس پہونچا اور بمشکل سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لئے۔ ٹرین کی منتظر گھڑیاں بڑی بے لطفی سے کٹیں۔ خدا خدا کرکے ٹرین آئی اور بصد سعی و کاوش صرف ایک پہلو سے بیٹھنے کی جگہ ملی۔ کس قدر حسرتناک منظر ہے کہ سیکڑوں مسافر ناکام و نامراد واپس جا رہے ہیں۔ کسی کو ٹکٹ نہیں ملا اور کسی کو فوجیوں کی چیرہ دستی اور وحشتناک سلوک نے پائدان پر بھی پاؤں نہ رکھنے دیا۔ یقیناً حکومت کی ضرورتیں ہماری ضرورتوں سے اہم ہیں۔ لیکن عوام کے ساتھ گائے بیل کا سا سلوک کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دو بجے کے بعد ٹرین گوالیار پہونچی، برادرانِ مکرم جناب رضا قریشی جناب شفا گوالیاری اور جناب الٰہی نوحی ہار پھول لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ رضا صاحب بڑے خاموش سنجیدہ، صلح کل اور پُرخلوص انسان ہیں۔ شفا صاحب کی عقیدت و محبت تو احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ جس نے شمع و پروانہ کو دیکھا ہو وہی شفا صاحب کی نیاز مندیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ رضا صاحب قریشی تو خیر دیرینہ مشق شاعر ہیں لیکن شفا صاحب نے چند سال ہی میں غیر معمولی ترقی کی ہے جناب نوحی گوالیاری کو میں نے ہمیشہ بڑے خلوص سے ملتے دیکھا۔ آج تک کوئی ایسا موقع نہیں ہوا کہ میں یا حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ ادھر سے گذرے ہوں اور وہ اسٹیشن پر تشریف نہ لائے ہوں۔ چند ہی لمحے گذرنے پائے تھے کہ ٹرین کی حرکت نے آنے والوں کو ہم سے جدا کر دیا۔

پانچ بج چکے ہیں اور جھانسی اسٹیشن قریب ہے۔ میں نے دانستہ جسم کا کچھ حصہ کھڑکی سے باہر نکال لیا ہے تاکہ حسن یاور نقوی مجھے دیکھ لیں۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آہستہ خرام اور یاور تیز گام۔ تاکہ کسی طرح ہم سے جلد مل لیں۔ اُن کے ساتھ بھی چند حضرات ہیں۔ یاور نے خلوص و محبت کے مہکتے ہوئے پھول نچھاور کئے۔ یاور کو سمجھنے والے خواہ کچھ بھی سمجھیں لیکن وہ میری نظر میں ایک زود احساس اور مرنجان و مرنج نوجوان ہیں جن کے لئے جذبات کی رَو میں ہر وعدہ آسان اور ایفا مشکل، مجھے یاور کو چھیڑنے میں بڑا لطف محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے موقع بموقع ہلکی ہلکی چٹکیاں لینا شروع کیں۔ انگلیوں سے نہیں بلکہ نگاہ اور نوکِ زباں سے۔ وہ تڑپے اور میں مسکرایا۔ یاور ہم سے بھی مخاطب ہیں اور ایک مسئلہ کے حل میں بھی کوشاں یعنی سیکنڈ کلاس کے جس ڈبہ میں ہم سفر کر رہے ہیں

طویل سفر کرنے والے چند انگریز سپاہی اور ایک بری بھی ہے۔ رات کو سونے کا مسئلہ درپیش ہے۔ ۹ آدمی اور چھ نشستیں۔ بڑی ردّوکد کے بعد یہ طے ہوا کہ ایک نشست ہم دو آدمی لے لیں اور باقی کو وہ سات، یاور شاعر ہیں اور حکیم مومن خاں کے رنگ کے مقلّد۔ اسقدر چبھتا ہوا شعر کہتے ہیں کہ پڑھنے والا تڑپ جائے۔ اسحاق حیدر صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں۔ بڑی دیر سے نگاہیں انھیں ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اسحاق حیدر صرف ایک کامیاب اور صاحب کمال آرٹسٹ ہی نہیں بلکہ اُن مصوری کا بھی الگ معیار دوسروں کو موہ لیتی ہے نہٹور ضلع بجنور کے مشہور زیدی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، انھیں سالانہ شاعرہ ۱۹۴۳ء کے لئے کچھ کام سمجھایا۔ کچھ اپنی ضرورتوں کا احساس دلایا اور کچھ اُن کی مصروفیتوں کی کہانی سنی۔ جھانسی بھی اب گزشتنی ہو چکا ہے۔ یاور نے مجبور کیا ہے کہ ہم واپسی میں جھانسی اتریں، لیکن ابھی منزل مقصود دور ہے اور واپسی کے دن کس نے دیکھے ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب کھانا کھایا چونکہ دن بھر آرام نہیں کیا ہے۔ اس لئے طبیعت مضمحل سی ہے۔ حضرت قبلہ مولانا سیمآب مدظلہ، تو خصوصیت کے ساتھ بہت تکان محسوس فرما رہے ہیں۔ بستر پر پہونچتے ہی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ لیکن یہ خیال ستا رہا ہے کہ ۱۱ بجے شب کو بھوپال آئے گا۔ اگر آنکھ لگ گئی تو مخلصینِ بھوپال کو بڑی تکلیف ہوگی۔ ادھر ایک سیٹ پر دو آدمی، پھر بھی غنودگی کا سا عالم رہا۔ سردی بھی کچھ چمکی ہوئی ہے۔ ہر چند کمبل سے جسم باہر نکالنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن ٹرین کی رفتار سست ہوتے ہی کسی خاص جذبہ نے اُٹھا کر بٹھا دیا اور حسنِ اتفاق کہ یہ بھوپال اسٹیشن تھا۔ گردن نکال کر جو دیکھتا ہوں تو چند لوگ گیس لیمپ کی دھوپ چھاؤں میں تیزی کے ساتھ کسی کو تلاش کر رہے ہیں یکایک نگاہ شاہکارِ معصومیت جناب وحیدی الحسینی بھوپالی پر پڑی اور وہاں سے پلٹی تو سراپا نیاز رشدی بھوپالی مدیر روزنامہ "ندیم" کو منہ بنائے ہوئے دیکھا جیسے کہ وہ بڑی منزلیں طے کر کے آئے ہیں۔ قبلہ و کعبہ کو نیند آ چکی ہے۔ لیکن ارادت و عقیدت کے تقاضے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ اُنھیں بھی جگانا پڑ رہا ہے۔ قبلہ و کعبہ بیدار ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر آتے ہی جناب شاد بھوپالی اور برادرم مخمور بھوپالی بھی آ گئے۔ سب نے ہار اور پھول پیش کئے وحیدی الحسینی دیوبند کے فاضل اور ایک صالح نوجوان ہیں۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی معصوم فرشتہ بول رہا ہے۔ سنجیدہ اور ترقی یافتہ شاعر ہیں اور رشدی —— کون کہہ سکتا ہے کہ آل انڈیا مشاعرہ بھوپال ۱۹۴۱ء کی رسمی اور سرسری ملاقات اتنی پائدار ہو سکتی ہے۔ اب رشدی میری داخلی اور خارجی زندگی میں برابر کے شریک ہیں اور اُن کے خطوط خلوص و محبت کے مرقعے۔ رشدی ایک کامیاب فسانہ نگار اور تجربہ کار جرنلسٹ ہیں۔ ترجمہ بھی خوب کرتے ہیں۔ برادرِ کرم شاد بھوپالی کے خلوص میں اگر کوئی فکر کرے تو کافر —— انھیں مجھ سے محبت ہو یا نہ ہو لیکن وہ قبلہ و کعبہ کے سچے پرستار ہیں اور ایسے پرستار جن میں ارادت و عقیدت کے تمام پہلو بدرجۂ اتم جلوہ فرما ہیں۔ بھوپال کے خوش فکر شاعر ہیں اور بہت پرجوش انسان۔ مخمور بھوپالی بھی نوجوان شاعر ہیں مگر کچھ کم عمل۔ حال ہی میں قبلہ و کعبہ کے شاگرد ہوئے ہیں۔ یہ اُن سے دوسری ملاقات ہے۔ میرا خیال ہے کہ رسمی لگاؤ کو وہ بھی روا نہیں رکھتے۔ اور اُن میں بھی خلوص ہے۔ ایک یا دو صاحب اور بھی تشریف لائے۔ نام ذہن سے نکل چکے ہیں۔ ٹرین کی ایک ہی گردش نے اس کاروانِ خلوص کو بھی نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور اُسی وعدۂ بازدید کے ساتھ جو جھانسی اور گوالیار میں ہوا۔

۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء

شب کو نیند نہ آ سکی اور آئی بھی تو بہت اچٹی اچٹی۔ حوائج سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا۔ دس بجے منماڑ اسٹیشن آ گیا۔ یہاں سے مالیگاؤں ۲۴ میل ہے۔ خیال تھا کہ اربابِ مالیگاؤں شاید نہ آ سکیں۔ لیکن جناب عقیل مالیگانوی سکریٹری ضلع مسلم لیگ۔ جناب قوی مالیگانوی اور جناب خاور شہادوی موجود ہیں، اور خلوص و محبت کی یہ دلیلِ محکم ہے کہ کل شب ہی کو مالیگاؤں سے منماڑ آ گئے تھے۔ قوی صاحب سے تو ایک بار پہلے بھی آگرہ میں ملاقات ہو چکی ہے۔ تجارتی مصروفیتوں کے باوجود شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ عقیل صاحب بہت خاموش اور سلجھے ہوئے نوجوان ہیں۔ قومی خدمت کے ساتھ ساتھ ادب و شعر سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ خاور صاحب شہادہ کے رہنے والے ہیں اور سلسلۂ کاروبار مالیگاؤں میں مقیم۔ شہادہ کے شعرا میں ممتاز ہیں۔ سب نے مہکتے ہوئے ہار اور دمکتے ہوئے گلدستے بطور ہدیۂ خلوص پیش کئے ہر شخص وفورِ عقیدت و ارادت سے جھکا جا رہا ہے۔ انھیں پرستاروں میں ایک اور پتلا دبلا نوجوان بھی ہے جو احمد نگر سے چل کر منماڑ آیا ہے تاکہ اپنے استاد کی زیارت سے شرف یاب ہو، یہ جواں سال شاعر افسر احمد نگری ہیں چہرے سے ذہانت و فطانت کے آثار نمایاں۔ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کے رسمی نہیں بلکہ حقیقی پرستار اور میرا تو خیال ہے کہ اقبال کی روح کو افسر کی روح سے ساز باز ہے۔ اگر افسر کے کلام کے ساتھ ان کا نام نہ لکھا جائے تو ہر شخص اسے اقبال مرحوم کے نام سے منسوب کریگا یہ میری رائے نہیں بلکہ عام ادبی حلقوں کی رائے ہے۔ یہ ضرور ہے کہ افسر کا تجربہ ابھی تشنہ ہے اور یہ کمی عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ پوری ہو جائے گی۔ افسر کا مستقبل انتہائی تابناک ہے۔ اگر [illegible] تعصب اور صوبائی مخالفت نے انھیں [illegible] علامہ اقبال مرحوم کے صحیح جانشین ہونگے [illegible] حضرات سے کوئی تفصیلی

گفتگو تو نہ ہو سکی پھر بھی بہت سی باتیں ہو گئیں۔ ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔ مالیگاؤں کے حضرات مجبور کر رہے ہیں کہ ہم واپسی میں مالیگاؤں اتریں اور آفر صاحب زور دے رہے ہیں کہ احمد نگر کی طرف واپس ہوں۔ لیکن واپسی میں کیا صورت پیش ہو گی اس سے سب بے خبر ہیں۔ بہرحال وعدہ کسی سے نہیں کیا جا سکا۔ عقیل صاحب کی طبیعت اس سرسری ملاقات سے سیر نہیں ہوئی۔ وہ اسی ٹرین میں سوار ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ بمبئی جا رہے ہیں۔

جوں جوں عروس البلاد بمبئی قریب ہوتا جا رہا ہے۔ نگاہِ شوق تیز سے تیز ہوتی جا رہی ہے۔ دل و دماغ خیالات کا مرجع بن کر رہ گئے ہیں۔ طبیعت بے چین ہے کہ کس طرح جلد ارباب بمبئی سے ملاقات ہو۔ قمر، آسی، شفیق کوٹی، ساز، حیدر، کیف "موحدِ اعظم" والے مولانا جالب، یہ اور وہ ______ ٹرین کی رفتار سے زیادہ خیالات کی رفتار تیز ہے۔ ٹرین اگت پوری سے آگے نکل چکی ہے اور پہاڑوں کا سینہ چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ نگاہیں مشاہدۂ فطرت میں مصروف اور دل شوقِ ملاقات کا چور۔ کہیں کھاڑیاں اور کہیں سیکڑوں فٹ نیچے گڑھے۔ کہیں پل اور کہیں ندیاں۔ لاکھوں درخت۔ سر و دفشاں اور سکوت لب۔ آخر ٹرین بمبئی کی حدود میں داخل ہوئی اس وقت ڈھائی بجے ہیں۔ بمبئی کی ہنگامہ آفرین زندگی کے آثار نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ سر بفلک عمارتیں۔ پٹریوں کی سیکڑوں قطاریں۔ بمبئی کے نمایاں اسٹیشن ______ طبیعت خود بخود افسردہ و پریشان ہوتی جا رہی ہے۔ دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا ہے ______ آہ اب سے چند سال پہلے اسی جنت نشاں شہر میں میری حور صفت اکلوتی بڑی بہن **جمیلہ خاتون** بھی رہتی تھیں ______ موت کا جابر و قاہر ہاتھ انھیں ہم سے چھین چکا ہے۔ ان کے شوہر امیر الدین حیدر صاحب بمبئی ہی میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ گذشتہ دو مرتبہ بمبئی آنے میں جو کشش اور جاذبیت تھی وہ اب نہیں ہے مرحومہ کے خیال نے جذباتِ الم کو ابھار دیا ہے۔ دادر اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اتفاقی طور پر میں نے باہر کی طرف دیکھا تو برادرم امیر الدین حیدر صاحب دوڑتے ہوئے نظر آئے ہیں اور قبلہ و کعبہ ان سے بغلگیر ہوئے۔ اس طرح کہ دل رو رہا تھا اور آنکھیں خشک تھیں۔ معلوم ہوا کہ انھیں رخصت نہ مل سکی صرف چند منٹ کے لئے دادر آ گئے ہیں۔ تاکہ ملاقات ہو جائے۔ اب وہ شب کو آئیں گے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ طبیعت کو بہت کچھ سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ تمام زخم ہرے ہو چکے ہیں۔ اس لئے یہ تڑپ فطری ہے۔ دادر سے چند منٹ چلنے کے بعد وکٹوریہ ٹرمنس کی عظیم الشان عمارت ہمارے سامنے تھی۔ کچھ دیر کے لئے جذبات و خیالات نے پھر کروٹ بدلی۔ [illegible]

مولوی محبوب حسن صاحب آسی تو فوراً دیکھتے ہی پہچان گئے ہیں۔ بقیہ لوگوں کے پہچاننے میں قدرتی طور پر دقت ہونی ہی چاہئے۔ ٹرین سے اترتے اترتے ہار اور پھولوں سے جسم ڈھک گیا۔ اب جو غور کرتا ہوں تو شفیق صاحب غائب۔ اور مولوی بدیع الزماں صاحب قمر نعمانی سہسرامی بھی نظر نہ آئے میں نے ایک صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ سامنے کھڑے ہیں ______ یا اللہ تصویر کے بالکل برعکس۔ کیا یہ وہی قمر نعمانی ہیں جو اپنے خطوط میں سب سے زیادہ خلوص و محبت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ میں خود ان کے قریب پہونچا، وہ مسکرائے اور گرمجوشی کے ساتھ معانقہ کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ فطرتاً خاموش اور سیدھے آدمی ہیں۔ لیکن اس وقت ان کی خاموشی بے محل تھی یا بامحل اسے وہ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ لیجئے برادرم شفیق اللہ خاں شفیق کوٹی بھی تشریف لے آئے۔ گھڑی نے کچھ دھوکا دیا اور دفتر سے روانہ ہونے میں چند منٹ کی دیر ہو گئی۔ معذرت خواہ ہیں۔ شفیق صاحب۔ قمر صاحب۔ آسی صاحب کے علاوہ ساز رامپوری۔ احسن عثمانی۔ شاہد۔ اجمل اور صابر صاحبان نے بھی خوش آمدید کہا۔ یہ سب لوگ قبلہ و کعبہ سے عقیدت و ارادت رکھتے ہیں۔ یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ مولانا جالب صاحب سہسرامی کو رخصت نہ مل سکی۔ ایک ہائی اسکول میں حال ہی میں ان کا تقرر ہوا ہے۔ قیام کا انتظام شفیق صاحب نے اپنے مکان پر کیا ہے۔ وہ، میں اور حضرت قبلہ مولانا سیماب مدظلہٗ ایک کار میں روانہ ہو گئے۔ اور سامان گاڑیوں میں۔ جن صاحب کی کار ہے وہ خود ہی تشریف لائے ہیں۔ بمبئی کے متمول لوگوں میں سے ہیں۔ اور کئی کارخانوں کے مالک، نام تو یاد نہیں رہا ہاں ان کی خصوصیت ہے کہ عربی اور انگریزی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتے شفیق صاحب سے گہرے تعلقات ہیں۔ ہمارے عقیل صاحب مالیگانوی بھی ہمارے ساتھ ہی بمبئی آئے ہیں تاکہ کچھ دن قبلہ و کعبہ کی خدمت میں رہ سکیں۔

جلسے قیام پر پہونچکر غسل کیا۔ ساڑھے پانچ بجے جالب صاحب تشریف لائے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان سے ملکر کتنی مسرت ہوئی۔ میں تمام مشرقی روایات کو ان میں کیجا پاتا ہوں۔ نہایت سنجیدہ۔ بامذاق اور سلجھے ہوئے بزرگ ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "مظاہر العلوم" کے فارغ التحصیل ہوتے ہوئے بھی ان میں مولویوں کی سی خشکی نہیں ہے انھیں دیکھکر مجھے مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔ اے فاضل دیوبند یاد آ گئے استاد کے احترام اور برادرانہ حقوق کی نگہداشت کا انھوں نے آتے ہی مظاہرہ شروع کر دیا۔ کچھ دیر "موحدِ اعظم" کے متعلق گفتگو رہی۔ میں نے انھیں بتایا کہ مفتی مہدی حسن صاحب آپ کے مضمون کا جواب کتابی صورت میں شائع کرنے والے ہیں کچھ اور علما سے بھی فتوے منگائے ہیں تو فرمانے لگے کہ مفتی صاحب جو اب بھی آپ کے [illegible] اور میرا خیال ہے کہ مفتی مہدی حسن صاحب [illegible]

اُن کی اتنی عظیم اور کفر کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتے جسکے وہ حضرت قبلہ کو کافر کہہ کر مرتکب ہوئے ہیں۔ اپنے ہی جیسے مولویوں سے وہ فتوے لکھوا سکتے ہیں۔ لیکن کوئی حق پرست مسلمان ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ہندوستان کے علمی۔ ادبی اور مذہبی طبقات پر اُن کی مولویانہ دیانت و درایت کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ وہ تمام عمر کوشش کریں لیکن جو کلنک کا ٹیکہ اُن کی پیشانی پر لگ چکا ہے وہ ہرگز نہیں مٹ سکتا۔ جناب اُن کی ناسعدیت کا اچھی طرح ڈھونڈ ورا پیٹے چکا ہے اور آئندہ اُن کی مذہبی چالوں کو اور واضح طور پر پیش کریگا۔ بمبئی میں اُن سے جو گرگے چھوڑ ہوئے ہیں۔ انھوں نے اکثر مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی وہ چاہتے ہیں کہ میں خاموش ہو جاؤں لیکن میں نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں اعلائے حق کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا!! وغیرہ وغیرہ۔ مولانا ابوالہاشم کیفؔ ہماری بھی تشریف لائے ہیں۔ اُن کی طرزِ گفتگو اور ملنے جلنے کا انداز یہی بتا رہا ہے کہ بہت خوش اخلاق اور نیک سیرت بزرگ ہیں۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ شفیقؔ صاحب انتظامی امور میں مشغول ہیں وہ بیک وقت شفیق بھی ہیں اور مشفق بھی اُن کی شفقت سے دوچار ہونے کا مجھے بارہا موقع ملا ہے۔ کوٹ ضلع فتح پور (یو۔پی) کے رہنے والے ہیں۔ پہلے محکمۂ نمک (سانبھر) میں ملازم تھے۔ اب اپنی ملازمت کو جنگی خدمات کے سلسلے میں منتقل کرا لیا ہے۔ بڑے خوش مذاق۔ ہنس مکھ۔ متواضع اور ہمدرد انسان ہیں۔ اپنے تو اپنے غیر دلوں کی خلش کا بھی انھیں احساس ہوتا ہے۔ بے اصولی کو ان کی زندگی میں ذرا بھی دخل نہیں۔ اُن کی صحبت میں کتنا لطف حاصل ہوتا ہے یہ کچھ وہی لوگ جانتے ہیں، جو اُن کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مجسم ایثار ہیں۔ اُن کی زندگی کا نصب العین دوسروں کو فائدہ پہونچانا ہے۔ اُن کا پوری لب و لہجہ اسقدر دلنشیں ہے کہ گھنٹوں ہم کلام رہنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی شفیقؔ صاحب کی ارادت و عقیدت کے سلسلے میں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ وہ فنائی الاستاد ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے عزیزی کلیم اللہ خاں بھی دفتر سے آگئے ہیں۔ چار پانچ سال قبل میں نے کلیم میاں کو سانبھر میں دیکھا تھا۔ اب تو ماشاءاللہ جوان ہو گئے ہیں نہایت سعید اور ہونہار ہیں۔ چہرے سے مستقبل کی درخشانیوں کا پتہ چلتا ہے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ وہ بھی خاطر مدارت میں مصروف ہیں گویا کہ ان کے یہاں آج عید ہے ہر شخص خوش نظر آ رہا ہے۔ تمام تلامذہ ارادت و عقیدت کے بہترین مظاہرے کر رہے ہیں چونکہ میں خود بہت بے تکلف ہوں اس لئے بہت جلد مجھ سے سب گھل مل گئے قمر صاحب کو کئی بار چھیڑ چکا ہوں، بڑے اچھے آدمی ہیں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جذبات خلوص ان کے دل میں گھر کئے ہوئے ہیں اور وہ ان کے لئے الفاظ نہیں پاتے برادرم قمر عربی و فارسی کے فاضل ہیں غور و فکر کے بہت عادی ہیں۔ علم و فن میں بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور شعر تو ماشاءاللہ بہت ہی اچھا کہتے ہیں۔ میں انھیں جہاں تک سمجھ سکا ہوں وہ مستقل مزاج۔ معاملہ فہم اور قانع انسان ہیں۔ جہاں تک قناعت کا تعلق ہے مجھے اُن سے اتفاق نہیں۔ وہ زندگی کے ساتھ چلو کر رہ انھیں لکھنے لکھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ حضرت مولانا شہاب مالیر کوٹلوی تشریف لے آئے موصوف بمبئی کے صیغۂ تعلیمات میں ملازم ہیں۔ شعر و ادب سے نہ صرف دلچسپی ہی ہے بلکہ ایک اچھے شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ میں جب کبھی بمبئی آیا ہوں۔ مولانا سے ضرور ملاقات ہوئی ہے حضرت قبلہ مولانا سیمابؔ مدظلہ سے عام و عوام کی زبان پر بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میں ولایت حسین صاحب شفقؔ عظمت حسین صاحب بیکسؔ۔ ننھے خاں صاحب تکمیلؔ اور غلام حسین صاحب آ گئے۔ یہ سب حضرات بہترین موسیقار اور اپنے فن میں مشہور و ممتاز ہیں۔ بمبئی کے فلمی حلقوں پر بھی ان لوگوں کا احسان ہے۔ آفتابِ موسیقی جناب فیاض حسین خاں صاحب بڑودے والے کے یہ سب قریبی عزیز ہیں۔ شعر و شاعری سے خاص شغف ہے۔ بمبئی کے تمام تلامذہ بنگلور سے ہماری واپسی پر کچھ اجتماعات کرنا چاہتے ہیں اس لئے تمام تلامذہ مخفور گروہ میں مشورہ کر رہے ہیں۔ میں بھی شریک ہوں۔ ۔ ۱ بجے شب کو مشاورتی کمیٹی برخاست ہوئی۔ برادرم امیرالدین حیدر صاحب کا اصرار ہے کہ میں اسی وقت باندرہ چلوں۔ باندرہ میں بھائی صاحب کا مکان ہے۔ میں خود بھی اپنی مرحوم بہن کی قیام گاہ کو ایک مدت کے بعد دیکھنے کا آرزومند تھا۔ اس لئے باندرہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ قبلہ و کعبہ شفیقؔ صاحب ہی کے یہاں ہیں۔ بھائی صاحب کی دوسری اہلیہ اور میری نسبتی بہن نے خاص خاطر مدارت کی۔ ڈھائی بجے شب تک خاندانی امور کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور پھر میں نے خلافِ تقاضائے طبیعت آنکھیں بند کر لیں۔

۲۴ر نومبر ۴۲ء

علی الصباح اُٹھنا پڑا۔ ناشتہ کیا اور بھائی صاحب کے ساتھ باندرہ سے بمبئی چلا آیا آج دو بجے دن کو بنگلور کے لئے روانہ ہونا ہے۔ دس بج چکے ہیں۔ سامان درست کر رہا ہوں ۱۲ بجے کھانا کھایا اور ایک بجے سب کی معیت میں ہم اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ جناب صاحب کیفؔ صاحب۔ سازؔ صاحب۔ امیرالدین حیدر صاحب۔ آسیؔ صاحب قمرؔ صاحب شفیقؔ صاحب اور شاہد صاحب پہونچانے آئے ہیں۔ ٹرین کی روانگی میں کافی وقت ہے۔ بہت دیر تک سب سے دلچسپ باتیں اور نوک جھونک رہی۔ ڈھائی بجے گاڑی کی ایک ہی سیٹی نے اس منظر کو بھی نگاہوں سے محو کر دیا۔ اب پھر مسافر اپنی منزل کی طرف تیز گام ہے۔

سُنا ہے کہ پونا کے راستے کے مناظر بہت دلکش [illegible] کچھ ایسے ہی ہیں۔ ابھی چلتے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی ہے کہ سرنگوں (TANNELS) کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ راستہ واقعی بہت پُر فضا اور [illegible] سے بمبئی جاتے ہوئے جو مناظر پیش نظر ہوتے ہیں۔ اُن سے زیادہ [illegible] پر دور اور نظر گئر ہیں۔ ۸۰ ہے سرنگیں تعداد کی [illegible] کا گلا سکے جو

اُڑا دے سکے ہیں۔ جگہ جگہ ہنڈ تو ڑ کھاٹیاں۔ ٹپل۔ غرض فطرت اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہے۔ حدِ نظر تک پہاڑیں پھیلا دور زمین ما ہموار ہے۔ کچھ وقت نظارۂ فطرت میں اور کچھ اس طرف کے لوگوں کے تہذیب و تمدن اور بول چال کے مطالعہ میں گذرا۔ مسلسل جگار اور ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ نے دماغ کی چولیں ہلادی ہیں۔ بہت چاہا کہ بنگلور کے مشاعرہ کے لئے غزل ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی شب کے ۱۱ بجے نیند آگئی۔

۲۵ نومبر ۴۲ء

ہر چند رات کو اچھی ہولی نیند آئی لیکن طبیعت میں کسی قسم کا اضمحلال نہیں ہے۔ شاید یہ جنوبی ہند کی آب و ہوا کا اثر ہو۔ ۸ بجے گنتکل اسٹیشن آیا۔ یہاں بنگلور کے لئے ٹرین تبدیل کرنی ہے۔ دوسری ٹرین سامنے تیار ہے۔ بڑی تیزی سے سامان اتروایا اور بنگلور جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ گنتکل سے بنگلور تک کا راستہ بھی بہت پرفضا ہے۔ یہاں کے نشیب و فراز اور موڑ توڑ بڑا لطف دیتے ہیں۔ بعض جگہ تو ٹرین ایک حلقہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہوا میں ایک خاص قسم کی تازگی اور فرحت انگیزی ہے اور شاید یہ اسی تازگی کا اثر ہے کہ چند گھنٹوں میں غزل ہو گئی۔ کہیں کہیں ہلکا ہلکا ترشح بھی ہوا۔ برادرم شفیق کوٹی نے کافی ناشتہ اور کھانا ساتھ کر دیا تھا۔ پھر بھی آج تازہ کھانے کے لئے فطرتاً طبیعت کا تقاضا ہوا۔ چونکہ ٹرین میں کھانے کی گاڑی نہ تھی اس لئے ایک اسٹیشن پر کھانے کا انتظام کیا۔ لیکن وہاں تیار نہ ملا مگر ۲ ڈبلیو ٹکٹ مل گئے اور کہہ دیا گیا کہ آنے والے اسٹیشن پر کھانا تیار ملے گا۔ وہ اسٹیشن بھی آیا اور کھانا بھی۔ دو پیتل کے ناشتے دان۔ نہایت مجلیٰ اور مصفیٰ۔ کھانے والے نے پہلے کیلے کے دو بڑے بڑے پتے بچھائے، پھر دو گول برتنوں میں پانی لا کر رکھا۔ سیکنڈ کلاس کی سیٹ اور کیلے کا پتہ؟ ——— یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ اب جو ناشتہ دان کھولتا ہوں تو پہلے حصہ میں ایک پاپڑ۔ دوسرے میں موٹے چاول اور بقیہ تین حصوں میں ترکاری اور دال کا پانی۔ یا اللہ، پانی اور چاول کس طرح کھائے جائیں گے! تمام کھانا پھینکنا پڑا۔ یہیں سے مجھے جنوبی ہند کی معاشرتی بیگانگی اور کمتری کا احساس ہوا۔ راستہ بہت دلچسپی سے کٹا۔ اس وقت ۵ بجے ہیں اور بنگلور کی سرسبز شاداب حدود میں ٹرین داخل ہو چکی ہے۔ بنگلور سٹی اسٹیشن پر میزبان موجود ہیں۔ خطیبۂ ہند سیدہ سردار بیگم اختر حیدرآبادی۔ جناب نور ہاشمی۔ جناب آسی میسوری اور ابوالکلام جناب شاد بنگلوری نے ہاروں اور پھولوں سے پرجوش استقبال کیا۔ سیدہ اختر صاحبہ ہمارے آنے سے کتنی خوش ہیں، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو اس وقت کی گفتگو میں شریک ہو۔ اسٹیشن سے ان کی کار میں قیام گاہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں سیدہ نے مختصراً بتایا کہ یہاں بعض لوگ ہماری آمد اور مشاعرہ کی مخالفت کر رہے ہیں۔

دورانِ گفتگو میں حضرت مولانا محوی لکھنوی اور حضرتِ ماہر القادری کی جماعتوں کا بھی ذکر آیا۔ یہ جماعت بندی بھی ہمارے ملک کے لئے لعنت سے کم نہیں۔ سیدہ نے اور بھی چند وجوہ بتائیں۔ میں صرف اس نتیجہ پر پہونچ سکا ہوں کہ مخالفین بے جا دباؤ ڈال کر روپیہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جن مخالفین کے انھوں نے نام لئے اُن میں بجز ایک صاحب کے جن کا مطالبہ ایک حد تک جائز ہو سکتا ہے اور جن کی مخالفت صرف اصولی تھی۔ باقی سب غیر ذمہ دار اور تخریبی ذہنیت کے لوگ ہیں ۔۔ اسی دوران میں سیدہ اختر صاحبہ اور ڈرائیور صاحب راستہ کی بعض عمارتوں اور خصوصی مقامات کا بھی ذکر کرتی رہے۔

جائے قیام پر پہونچکر چند منٹ ملاقاتی کمرہ میں بیٹھے جہاں اور بھی بعض لوگ موجود تھے۔ افسوس کہ بجز جناب سائل بنگلوری اور جناب شیدا کاشمیری کے اور کسی کا نام یاد نہیں رہا۔ چند منٹ کے بعد ہم اُس کمرہ میں لائے گئے جو شعراء کے قیام کے لئے مخصوص تھا۔ شعرا کے قیام کا انتظام دو جگہ ہے۔ ایک محمد علی ہال میں اور دوسرا اختر صاحبہ کی کوٹھی پر۔ اختر صاحبہ نے اپنی کوٹھی پر حضرات سیماب۔ جوش۔ جگر۔ ساغر۔ امید امیٹھوی۔ مجاز اور میرے قیام کا انتظام کیا ہے۔ قیام گاہ کو بڑے سلیقہ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ دروازے پر ایک بورڈ ہے جس پر صرف "۶" ہے کسی کمرہ پر "کاشانۂ سیماب" اور کسی پر "حجرۂ امید" ایک کمرہ میں چار مسہریاں، دوسرے میں دو اور تیسرے میں ایک۔ ہر مسہری پر مچھر جالی اور مکمل نفیس و آرام دہ بستر۔ مسہری پر شاعر کے نام کی چٹ اور ایک چھوٹی میز، جس پر بطور مذاقِ شاعر کے مذاق کے خلاف کچھ کتابیں اور رسالے۔ مثلاً حضرت جوش کی میز پر نمونہ انسائیکلوپیڈیا۔ حضرتِ جگر کی میز پر دوسری کتابوں کے ساتھ "شاعر" کا وہ پرچہ جس میں اُن کے حالات شائع ہوئے ہیں۔ ہر میز پر ایک چھوٹا سا رومال تاکہ شاعر صاحب صفائی کا بھی خیال رکھیں اور اپنی بدمذاقی کا ثبوت نہ دیں۔ درمیان میں بڑی میز۔ اُس پر اعلیٰ قسم کے خط لکھنے کے کاغذ۔ لفافے۔ قلم۔ سیاہی۔ پن۔ ٹکٹ۔ سب سے بڑی میز جو کونے میں لگائی ہے اُس پر کئی قسم کا عطر۔ اعلیٰ درجہ کا تیل۔ صابن۔ ہیزلین۔ ولیلیز کنگھے۔ برش۔ ٹوتھ پیسٹ۔ قبض کُش گولیاں۔ دردِ سر دور کرنے والی ٹکیاں۔ زمبک۔ ٹنکچر آیوڈین اور خدا جانے کیا کیا چیزیں قرینے سے سجائی گئی ہیں۔ عطر کی شیشیوں پر شاعروں کے تخلص کے اعتبار سے نام لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً "ادہم جوش" "خونِ جگر" یہ کیا ہے؟ "روغن الشعرا" سیدہ اختر بھی ہنس رہی ہیں اور ہم بھی۔

(باقی۔ باقی)

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر :- مصرعِ طرح :- "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

حضرت تسلیم سہروردی گوالیاری

محفلِ دل میں چراغانِ تمنا کیجئے
کچھ تو تقلیدِ رہ و رسمِ کلیسا کیجئے

گو کسی صورت سے ہو عرضِ تمنا کیجئے
لب ہوں گویا، تو نظر سے دل تقاضا کیجئے

جب گرا اپنا مقامِ فہم سے سمجھو فرصت ہی نصیب
پھر کتابِ زندگی پر تبصرہ کیا کیجئے

باعثِ طوفاں بھی ہو سکتے ہیں قطرے آبجو
ان کو یوں چشمِ حقارت سے نہ دیکھا کیجئے

جلنا ہے پھول، شبنم خارِ صحرا کبھی ہو
وجہِ تسکینِ نظر سب کو بنایا کیجئے

ترک جس نے آرزو کی، مدعا کو پا لیا
ہو سکے تو کوششِ ترکِ تمنا کیجئے

بزم کی ہنگامہ آرائی سے آنکھیں جھک گئیں
رزم کی شعلہ فشانی کا تماشا کیجئے

اے تسلیم اب یہی ہے فصلِ گل ذرِ جنوں
خیر مقدم بے خودی سے آج کل کا کیجئے

محسنِ ادب حضرت نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ الہ آبادی

رو دیئے، پھر اپنے ہر آنسو کو دریا کیجئے
اک تماشا ختم کر کے اک تماشا کیجئے

جس کا ملنا عالمِ امکاں میں ممکن ہی نہیں
کب تک اس کی آرزو، کب تک تمنا کیجئے

ایک ہی جلوے سے چشمِ شوق خیرہ ہو گئی
اب کہاں ہمت کہ ارمانِ تماشا کیجئے

کیا کہوں کیفیتِ نظارۂ حسن و جمال
دیکھئے اس کو تو حسرت ہو کہ دیکھا کیجئے

جب مسلم ہے کہ دینے والا کوئی اور ہے
کیوں کسی کے در پہ اظہارِ تمنا کیجئے

چاہتے ہیں آپ اگر دیں ساتھ دنیا ایک کا
سہل سی تدبیر یہ ہے ترکِ دنیا کیجئے

یوں سوال میں تنگ دل کا حضرتِ نشتر کہا
دل کو پتھر کیجئے، یا پانی کلیجا کیجئے

حضرت مولانا جالب سہسرامی

کم سے کم اتنا تو جذبِ شوق پیدا کیجئے
حسنِ بے پروا کو مجبورِ تماشا کیجئے

مانعِ حسنِ حقیقت ہیں حجاباتِ مجاز
آرزو ہے دید کی تو چشمِ دل وا کیجئے

زندگی جدِ طلب ہے، موت ہے امن و سکوں
جو نہ پوری ہو کبھی ایسی تمنا کیجئے

سجدہ گاہِ شوق ہو ہم پلۂ عرشِ بریں
حاصلِ کیفیتِ معراج، سجدا کیجئے

مجھ کو ہر اک طرح ہے اپنی نظر پر اعتماد
آپ اب جس طرح چاہیں مجھ سے پردا کیجئے

سبزۂ بیگانہ ہوں اس گلشنِ ایجاد میں
کون ہے اپنا یہاں کس کی تمنا کیجئے

ہے گماں جالب کسی میں ہمتِ قدرِ وفا
اب مناسب ہے یہی سب سے کنارا کیجئے

حضرتِ آسی رڑکوی از بمبئی

بے خودی میں یہ مذاقِ دید پیدا کیجئے
دیکھئے اس کو مگر اپنا تماشا کیجئے

چار دن کی زندگی ہو ہر طرح کٹ جائے گی
دوستوں سے کیا مروت کا تقاضا کیجئے

اہلِ دنیا کی نظر میں ہو گئے خود دار ہم
اک دن دل نے کہا تھا راز افشا کیجئے

کیا تعجب ہے کہ خود ہی منہ کی کھا لیجئے
آج کشتی کو سپردِ موجِ دریا کیجئے

میں بہر صورت ابھی تک منتظرِ تکمیل ہوں
آپ ہی ترکِ محبت کا ارادا کیجئے

سر نہ اٹھے آستانِ حسن سے تا زندگی
ماسوا کو بھول کر اس طرح سجدا کیجئے

حضرتِ آسی نہ پھیلے دامنِ [illegible]
جو شکایت ہو بعنوانِ تمنا کیجئے

حضرت قمر نعمانی سہسرامی

پھر جہانِ آرزو میں حشر برپا کیجئے
پھر ذرا چشمِ سخن گو سے اشارا کیجئے

عشق آ جاتا ہے گستاخی پہ چشمِ لطف سے
اپنے شوریدہ سروں کو یوں نہ دیکھا کیجئے

یہ تغافل یہ تجاہل یہ ستم اچھا نہیں
کچھ تو پاسِ خاطرِ اہلِ تمنا کیجئے

مٹ نہ جائے امتیازِ آدمیت دہر سے
فطرتِ آزاد کا احساس پیدا کیجئے

آپ چھپتے ہیں ضیائے حسن چھپتی ہی نہیں
پردہ کر لیجئے تو ہر صورت سے پیدا کیجئے

آپ چاہیں بھی تو پھر ویرانہ اس کو کر سکیں
اس طرح آباد میرے دل کی دنیا کیجئے

بے نیازِ زاد و رسمِ خلق رہتا ہے قمر
کب اثر ہوتا ہے اس پر لاکھ رسوا کیجئے

جناب کیف بہاری

اپنی خودداری کو کیوں گیتی میں رسوا کیجئے
جس سے وہ بیتاب ہوں وہ درد پیدا کیجئے

اپنے شیدائی سے اس درجہ نہ پردا کیجئے
انتظامِ یک نگاہِ بے محابا کیجئے

آج بھی بیٹھا ہوا ہوں گوش بر آواز ہوں
ساز کے پردے ہی سے کوئی اشارا کیجئے

آتشِ فرقت میں جلنا جب مقدر ہو چکا
کیوں نہ رنگ و بوئے گلشن سے کنارا کیجئے

اللہ اللہ حسنِ پنہاں کی کرشمہ سازیاں
بند کیجئے اپنی آنکھیں اور دیکھا کیجئے

دیکھنے والی نگاہیں دیکھتی ہی رہ گئیں
[illegible] پیدا کیجئے

زندگی و موت کے [illegible]
[illegible] کیجئے

جناب شفیق کوٹی

مرے عشق و عاشقی کا اب چرچا کیجئے   میری دنیائے محبت کو نہ رسوا کیجئے
آیئے راہِ عمل میں نام پیدا کیجئے   جنسِ آزادی کا خونِ دل سے سودا کیجئے
عشق کی منزل میں مشکل تصور بھی تو ہو   ہو سکے گر آپ سے تو آپ پردا کیجئے
اپنا ساقی ہو اور اپنی صہبا اپنا جام ہو   ہو سکے تو اس طرح کا دور پیدا کیجئے
بن نہ جاؤں میں کہیں عنوانِ عشق و عاشقی   کیجئے لیکن مجھے اتنا نہ رسوا کیجئے
مٹ گیا سجدوں سے وہ نقشِ کفِ پا ہی مگر   اے جبینِ شوق ایک نقش کو سجدا کیجئے
دیکھئے پامال کب تک ہے گلشن کو شفیق   ابھی بھی کوئی نمو کی شکل پیدا کیجئے

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

دل ہی کی بے کیفی کا کیوں پردہ فاش کیجئے   کس کی صورت دیکھ کر عرضِ تمنا کیجئے
تا کجا اندیشۂ تاریکیِ شامِ حیات   تابکے فکرِ مآلِ صبحِ فردا کیجئے
ہے اسی کا نام تکمیلِ عبادت عشق میں   اس کو سجدہ کرتے کرتے خود کو سجدا کیجئے
سر دُھنے چھیڑنے سے اس طرح کیا فائدہ؟   ساز کے مدھم سُروں میں سوز پیدا کیجئے
زندگانی نام ہے مجموعۂ آلام کا   زندگی میں دل پہ جو گذرے گوارا کیجئے
جن کو سن کر وجد فرمائے مغنیِ ازل   سازِ فطرت پر وہ نغمے گنگنایا کیجئے
ہو گئی بدمستِ محفل چھا گیا کیفِ وجود   ختم طرفہ اب تو ذکرِ جام و مینا کیجئے

جناب شفا گوالیاری

یہ ضرورت ہے کہ پھر تقلیدِ موسیٰ کیجئے   وہ ہیں پردے میں تو اپنا ہی تماشا کیجئے
حسن کی ناز آفرینی خود ہو مجبورِ نیاز   عشق میں خودداریاں اتنی تو پیدا کیجئے
میں غمِ شامِ تمنا سے گلے مل لوں ذرا   پھر مجھے آسودۂ صبحِ تمنا کیجئے
رنگ و بو کے بھیس میں ہے جلوہ سرا ہر رنگ و بو   سوچ کر دل کو اسیرِ حسنِ دنیا کیجئے
پھول بنتے بنتے کیسے رہ گئی دل کی کلی   پھر ذرا اوضاعِ تبسم کا اشارا کیجئے
مرکزِ جلوہ ہے دل، اور وہ نظر کے سامنے   خود کو سجدہ کیجئے، یا اُن کو سجدہ کیجئے
ذرہ دارِ عیش ہوتا ہے ہر اک غم اے شفا   بے محابا ہر غمِ دنیا گوارا کیجئے

جناب آذر ناگپوری

خونِ ارماں کیجئے، خونِ تمنا کیجئے   کیجئے اپنے مریضِ غم کو رسوا کیجئے
چشمِ بینا سے حقیقت کا تماشا کیجئے   جلوۂ خورشید ہر ذرے سے پیدا کیجئے
دردِ پنہاں کو [illegible] کیجئے   ہو سکے تو غم کا غم ہی سے مداوا کیجئے
[illegible]   [illegible] حشر برپا کیجئے
تنگ ظرفی کا جنونِ عشق کو بھی ہے گلہ   میرے ماتم خانے کو ہم شکلِ صحرا کیجئے
یوں اگر ہو جائے تو ہو جائے تسکینِ نظر   رات بھر تاروں میں چھپ کر مسکرایا کیجئے
اُٹھ رہی ہے اب بساطِ دہر آذر ہر طرف   کس کا ماتم کیجئے کس کس کو رویا کیجئے

جناب ہلال ریمی از کوکشی (ریاست دھار)

وہ فریبِ دل رہا اور اُن کو ڈھونڈا کیجئے   یہ مذاقِ جستجو نظروں میں پیدا کیجئے
چھوڑیئے دنیا، یہ دنیا تو پرانی ہو چکی   اب نئے سر سے کوئی تعمیرِ دنیا کیجئے
بحرِ غم میں کوئی تو تنکے ہو سہارے کے لئے   یا ڈبو ہی دیجئے، یا پار بیڑا کیجئے
چند دن کی بات ہے پھر ہم کہاں دنیا کہاں   تلخیوں کا زندگی کی کس سے شکوا کیجئے
کاش دے فطرت ہمیں توفیقِ ترکِ آرزو   ایک دل اور حسرتیں لاکھوں کہاں تک کیجئے
کھل نہیں سکتی زبانِ آرزو جب عشق میں   کیوں نہ پھر نظروں سے اظہارِ تمنا کیجئے
مطلقاً چھٹ جائیں قوموں کے اندھیرے اے ہلال   روشنی ایسی وطن میں کوئی پیدا کیجئے

جناب تنویر احمد آبادی

طور پر جانے کی کیوں زحمت گوارا کیجئے   دل کے آئینے میں حسنِ یار دیکھا کیجئے
خواہشِ دنیا نہ دنیا کی تمنا کیجئے   کیجئے حدِ تعین سے کنارا کیجئے
دیکھنے پر بھی جمالِ یار دل بھرتا نہیں   چشمِ حسرت کا تقاضا ہے کہ دیکھا کیجئے
آستانِ یار ہے ہر ذرۂ راہِ عشق کا   ہو سکے تو ہر قدم پر ایک سجدا کیجئے
ناتواں پائے طلب ہے اور منزل سخت تر   اے جنوں اب ساز و سامانِ سفر کیا کیجئے
آپ کو مل جائیگا خونِ گشتہ دل کا بھی سراغ   اور کچھ دن خونِ حسرت کا تماشا کیجئے
کیجئے تنویر شمعِ عشق روشن اور پھر   سوزِ پنہانِ محبت آشکارا کیجئے

جناب ارشد ساگری

کس کو رہبر جانئے کس پر بھروسا کیجئے؟   اپنا ہی نقشِ قدم مڑ مڑ کے دیکھا کیجئے
دیکھئے برہم نہ ہو جائے نظامِ بزمِ زیست!   سازِ دل پر بے محل نغمے نہ چھیڑا کیجئے
شدتِ غم، کثرتِ آلام، انبوہِ ملال   دل پہ جو گذرے محبت میں گوارا کیجئے
پھول بھی تو گلشنِ عالم میں ہیں خستہ نصیب   چاک دامانی کا اپنی کس سے شکوا کیجئے
آرزو تیری بجا، لیکن دلِ جلوہ طلب!   کس سے مل کر طور پر عرضِ تمنا کیجئے
تا کجا حالِ دلِ بیتاب پر رکھئے نظر   تابکے بارِ غمِ ہستی اٹھایا کیجئے
اس طرح میں غزل کہنے سے ارشد فائدہ   لطف تو جب ہے کہ کوئی بات پیدا کیجئے

جناب خرم خلیق جمیلی ایولوی

"کیا بہار اور کیا خزاں [illegible] کیجئے"   [illegible] کیجئے

زندگی پُرخطر ہو گئی حاصلِ مسرور   یعنی ہر منزل میں ہر تلخی گوارا کیجئے
پہلے ہی سے ہند کی حالت ہے کچھ ناگفتہ بہ   باہمی جھگڑوں سے کیوں طوفاں برپا کیجئے!
دل کو اپنے کیجئے مجبورِ پابندِ عمل   بیٹھتے اُٹھتے تقاضے پر تقاضا کیجئے
آرزوئے طور و فکرِ جلوۂ ایمن ہے کیوں   ذوقِ دل سے آپ خود سینے کو سینا کیجئے
ایک قطرہ بھی بہت ہے اہلِ ہمت کے لئے   آپ اسی قطرے کو وسعت دے کے دریا کیجئے
در پئے آزار ہے سارا زمانہ ائے خلیق   اپنی ہستی کے تحفظ کا مداوا کیجئے

جناب رِند کلیانی

منتشر شیرازۂ ملت ہے یکجا کیجئے   از سرِ نو قوتِ اخلاص پیدا کیجئے
نکبت و افلاس کا پہلے مداوا کیجئے   قوتِ بازو سے پھر تسخیرِ دنیا کیجئے
بے حسی قانونِ فطرت میں سراسر موت ہے   زندگی کا یہ تقاضا ہے کہ تڑپا کیجئے
پہلے جذباتِ عمل کو مشتعل کر لیجئے   ارتقائے زندگی کی پھر تمنا کیجئے
سعیٔ پیہم کا یقیناً کامیابی ہے صلہ   کس لئے اندیشۂ امروز و فردا کیجئے
سرفرازی سرفروشی کے سوا ممکن نہیں   جرأتِ رندانہ پیدا ہو تو سودا کیجئے
رِند اب بھی کامرانی پاؤں چومے گی ضرور   کیوں نہ اپنے زورِ بازو پر بھروسا کیجئے

جناب نازش پرتاب گڈھی

کیوں بھروسہ دہر میں نازش کسی کا کیجئے   راہ اپنی اپنی منزل آپ پیدا کیجئے
آنکھ کہتی ہے کہ بس کر اب نہیں تابِ دید   دل یہ کہتا ہے کہ اُس جلوے کو دیکھا کیجئے
کود پڑنا چاہئے طوفانِ بے پایاں میں اب   کب تک آخر دور سے گرداب دیکھا کیجئے
وہ جفا پرور ستمگر اور وفا شرمائے ہوئے   ہمنشیں یہ اپنی اپنی بات ہے کیا کیجئے
"کوہ و صحرا کو ہے خطرہ بحر و بر خطرے میں ہے"   کس پہ تکیہ کیجئے کس پر بھروسا کیجئے
آپ کو نازش اگر کچھ گلستاں سے عشق ہے   "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

جناب وحید بلاسپوری

جو اُلجھ کر جیب و دامن میں نکلیں پھر کبھی   ایسے کانٹوں سے بھی ربط و شوق پیدا کیجئے
سرد ہو کر رہ گیا کیوں ہر رگ و پے کا لہو   زندگی میں حشر کے سامان پیدا کیجئے
درس جو دینے لگے تخریب کو تعمیر کا   دل کے ہر ذرہ میں ایسی روح پیدا کیجئے
عزم و استقلال کی بنیاد دل میں ڈال کر   انقلابِ زندگی کے کھیل کھیلا کیجئے
زندگی نے پا لیا جب مایۂ رنج و نشاط   "کیا بہار اور کیا خزاں اب کچھ گوارا کیجئے"

کثرتِ جلوہ سے اکثر خاک ہو جاتا ہے دل   یوں ہماری بزمِ ہستی میں نہ آیا کیجئے

جناب اکرم حنیفی دھولیوی

تا کجا آوارہ گردی صورتِ گرد و غبار   اپنی حالت کا ذرا احساس پیدا کیجئے
انتہائے بے کسی میں آ رہی ہے یہ صدا   کون ہے اپنا جہاں کس پر بھروسا کیجئے
انقلاباتِ زمانہ مقتضائے وقت ہیں   انقلاباتِ زمانہ کا نہ شکوا کیجئے
خواب آورِ بے حسی میں چھپ گئے گا تا بکے   سازِ دل سے نغمۂ بیدار پیدا کیجئے
دل پریشاں ہو تو پھر راحت کہیں ملتی نہیں   عزمِ گلشن کیجئے یا قصدِ صحرا کیجئے
انقلابِ دہر کا اکرم تقاضا ہے یہی   اب تو جیسے بھی گذرتی ہو گذارا کیجئے

جناب غنی جبلپوری

کون کہتا ہے مرے غم کا مداوا کیجئے   میں تو کہتا ہوں ابھی کچھ اضافہ کیجئے
آپ کو پردا ہی کرنا ہے تو پردا کیجئے   مجھ کو تو لیکن نہ مجبورِ تماشا کیجئے
ہے وہی نشاۂ اُلفت جو ہو نشاۂ جنوں   پھاڑ کر جیب و گریباں قصدِ صحرا کیجئے
یاد میں تیری ہے کس کو فرصتِ نظارہ اب   صحنِ گلشن میں بہار آئی ہے تو کیا کیجئے
درحقیقت ہیں یہی تو زندگانی کے مزے   رنج ہو غم ہو خوشی ہو سب گوارا کیجئے
اس طرح طے کیجئے راہِ محبت اے غنی   ہر قدم پر شکریہ کا ایک سجدا کیجئے

جناب شہید جبلی

میری جانب اک نگاہِ لطف افزا کیجئے   قطرۂ ناچیز ہوں ہمدوشِ دریا کیجئے
یا مجھے چشمِ محبت سے نہ دیکھا کیجئے   یا جو پیدا ہو تمنا اسکو پورا کیجئے
خود بخود رک جائیگی یہ موجۂ انقلاب   کچھ اگر دل میں تو اسکا کام پیدا کیجئے
کہہ رہا ہے اہلِ عالم کو گرج کر انقلاب   "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"
حسرتیں، مایوسیاں، ناکامیاں، محرومیاں   یہ اگر حاصل ہو تو کیا تمنا کیجئے
وقتِ فرصت ڈال کر منہ کو گریباں میں شہید   خواہشاتِ عشق کی تعبیر دیکھا کیجئے

جناب شفیع گوالیاری

طالبِ دیدار سے اتنا نہ پردا کیجئے   کیجئے للہ احساسِ تمنا کیجئے
ہوش کھو بیٹھے تو یہ کس کی خطا تھی ہے کلیم   آپ سے کس نے کہا تھا آپ ایسا کیجئے
نکلے آزادی کی لے اے نغمہ سنجانِ وطن   بلبلِ ہر اک تارِ نفس کو نغمہ پیرا کیجئے
میری روداد الم سنکر وہ فرمانے لگے   واقعی پر درد قصہ ہے مگر کیا کیجئے
بے خبر ہو جائے گا لیلا آپکو بھی بھول جائیگا   [illegible]
آپ کو مدت سے ہے حق شاہ [illegible]   [illegible] کیجئے

۱؎ حضرت سیماب مدظلہ کا مصرع ہے۔

جناب فضا الہ آبادی

تنگِ الفت ہے اگر عالم میں پرچا کیجئے
کیوں نہ منہ کے سامنے ہی انکا شکوا کیجئے

دل میں پہلے درد کا احساس پیدا کیجئے
پھر کسی کو تغافل کی تمنا کیجئے

مدعا یہ ہے کسی کے حسنِ عالم سوز کا
ہوش کا کیا ذکر دل کی بھی نہ پروا کیجئے

مقبولِ عشق ہوں نہیں قصہ کلیم و طور کا
پھر ترے دیدار کی کیونکر تمنا کیجئے

کارِ دنیا فکرِ عقبیٰ بندۂ اعظم کا خیال
چار دن کی زندگی میں اے فضا کیا کیجئے

جناب ثمر چھپرادی، بی۔اے

وقتِ آخر وہ دیدِ دل کا کچھ مداوا کیجئے
اب تو بہرے حالِ پریشاں خدارا کیجئے

حالِ پروانہ نہیں کچھ جائے عبرت اہلِ بیں
شمع ہے فانوس میں لرزاں تماشا کیجئے

آتشِ نمرود بھی پھر گلستاں ہو جائے گی
سنتِ دینِ براہیمی کو زندہ کیجئے

دہر کی ہر ایک شے محدود ہو کر رہ گئی
اب تصور زندگی سے ماورا کیا کیجئے

باغِ الفت میں ثمر آ جائے گی خود ہی بہار
خونِ دل سے آبیاریٔ تمنا کیجئے

جناب حسنی فاروقی کلم نوری

پائے طوفانِ حوادث کی نہ پروا کیجئے
زورِ بازو سے کسی ساحل پہ قبضہ کیجئے

جس طرح گذرے بہر صورت گذارا کیجئے
"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

دل پہ قابو ہو سکے اور ہوش خود پر ہو بس
تابِ دیدِ جلوہ ہائے حسن پیدا کیجئے

ہے غلط یہ راستہ اے طالبانِ حریت
اپنے ہاتھوں سے نہ غارت اپنی دنیا کیجئے

بوالہوس کم مایہ سے حاصل کچھ نہیں ہوتا حسنی
عشق کے دریائے بے پایاں میں ڈوبا کیجئے

جناب مظہر گوالیاری

امتیازِ دیر و کعبہ عشق میں کیسا کیجئے
جس جگہ جلوہ نظر آ جائے سجدہ کیجئے

رنگ لائیگا کبھی تو جذبۂ حسن آزما
کیجئے کب تک کرینگے آپ پردا کیجئے

گو نصیحت یہ بجا ہے آپ کی ناصح مگر
دل ہی جب قابو سے باہر ہو تو پھر کیا کیجئے

میں تو ہنسنے کی کہہ رہا ہوں کب خواہش ہو
آپ دیوانہ سمجھتے ہیں تو سمجھا کیجئے

جو وفا والے ہیں وہ اُف تک نہیں کرتے کبھی
آپ بھی مظہر ہر اک غم کو گوارا کیجئے

جناب بسمل بھنڈاروی بی۔اے

عشق کی خودداریوں کو دیکھ کر بس جانشی
حسن کے جلووں کو مجبورِ تماشا کیجئے

اپنی تیرہ بختیوں پر اک نگاہِ التفات
ظلمتِ اختر کو تنویر فزا کیجئے

[illegible]
یوں مذاقِ عشق کو اپنے نہ رسوا کیجئے

[illegible]
[illegible] اپنی آنکھوں میں پیدا کیجئے

ہے یہی لازم کہ بسمل دل میں ہر دم ہو
سوزِ پروانہ گدازِ شمع پیدا کیجئے

جناب خادم شملوی

"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"
شاکرِ تقدیر رہئے کچھ نہ شکوا کیجئے

گر مجھے رسوا ہی کرنا ہے تو اچھا کیجئے
کیجئے دنیا میں مجھ کو خوب رسوا کیجئے

ہاں تقاضا بھی یہی ہے حسن کا آپ کی
حسرتیں میری بیٹھے آپ کچلا کیجئے

سوزِ غم نے دل جگر دونوں کو مٹی کر دیا
کیجئے بھی اب جو حال اپنا بیاں کیا کیجئے

قسمتِ برگشتہ پر اپنا نہیں کچھ اختیار
راہ پر لانے کی خادم کوششیں کیا کیجئے

جناب قدیر محشر فرخ آبادی

کیوں کسی انساں کا دنیا میں بھروسا کیجئے
جس طرح بھی ہو سکے ترکِ تمنا کیجئے

ہو نہ جائے عشق کو خود زندگی اپنی گراں
سامنے آ کر نہ ہنسنے کا ارادہ کیجئے

جب یہ طے ہے زندگی ہے اک تقیدِ مستقل
"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

ایک جلوہ گاہ اُن کی خلوتِ دل بھی تو ہے
طور پر جانے کی کیوں زحمت گوارا کیجئے

آپ کو اُن کے دلِ مجبورِ الفت کی قسم
یوں سرِ بازار محشر کو نہ رسوا کیجئے

جناب منظور قریشی

کام جب کرنا ہے پھر کیا سوچا کیا کیجئے
سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے سوچا کیجئے

دل یہ کہتا ہے رہے انکا تصور ہر گھڑی
آنکھ کہتی ہے انہیں ہر وقت دیکھا کیجئے

وہ اُدھر روٹھے اِدھر سینے کے لالے پڑ گئے
حضرتِ دل اور اظہارِ تمنا کیجئے

اس قدر مایوس ہو کر رہ گئے کیوں اے کلیم
پھر دکھائیں گے وہ جلوہ پھر تمنا کیجئے

دل کی حسرت اور ہے آنکھ کا ارمان اور ہے
انکے تیور اور ہیں منظور ایسا کیجئے

جناب انور سہادوی

حسن کی تنویر بن کر دل میں چمکا کیجئے
پیری دنیائے تخیل میں اُجالا کیجئے

کیا عجب ہو جائے آنکھ یک بیک شوقِ ظہور
اشتیاقِ دید پیدا مثلِ موسیٰ کیجئے

سرفروشانہ کسی کی راہ میں سر دیجئے
اقتضائے وقت کا منشا ہے پورا کیجئے

لکنتِ موسیٰ سے لطفِ ہم کلامی پوچھئے
بات کرنے میں کوئی انداز پیدا کیجئے

یہ تقاضا دل کا ہے انور ہی مجھ سو رات دن
درد بنکر صورتِ سیماب تڑپا کیجئے

جناب کرامت گوالیاری

دل میں پہلے جذبۂ کامل تو پیدا کیجئے
پھر تغافل کیشیوں کا اُنکی شکوا کیجئے

پست سا کچھ ہوتا جاتا ہے مذاقِ زندگی
ہو سکے تو دردِ دل میں کچھ اضافہ کیجئے

آ گئے ہیں آپ تو سن لیجئے رودادِ غم
جب کرم اتنا کیا ہے اور اتنا کیجئے

ساری دنیا تو کہتی ہے کہ میں ہوں آپ کا   آپ بیگانہ سمجھتے ہیں تو سمجھا کیجئے
زندگی بھر کھل نہیں سکتا ہو راز زندگی   زندگی بھر اسے کرامت آپ سمجھا کیجئے

جناب قمر فاروقی بھل ضلع میانوالی

اپنے جلوؤں سے منور میری دنیا کیجئے   میرے غمخانے کو رشکِ طورِ سینا کیجئے
کامرانی اور ناکامی سے ہوکر بے نیاز!   "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"
دشمنِ انسانیت ہے برسرِ پیکار دوں   حفظِ آزادی کی خاطر جوش پیدا کیجئے
اپنی تہذیب و تمدن اور عزت کے لئے   منتشر شیرازہ برکیں در رو ما کیجئے
ہو چکا ہے ایک مدت سے قمر محرومِ حسن   آئیے زندہ اسے بنکر مسیحا کیجئے

جناب اثر ذائقی بنگلوری

تابکے یہ ننگِ محکومی گوارا کیجئے   آئیے اور حریت کی راہ پیدا کیجئے
نعرہ ہے لب جنکی حریت نا آشنا   بے حسی پر اُنکی ماتم کم ہے جتنا کیجئے
اجنبیت کے اثر سے پاک خود ہو جائیگا   اتحاد اپنے وطن میں پہلے پیدا کیجئے
اے اثر اب ہند میں بھی انقلاب آنیکو ہے   آجکل آپ انقلابی نظم لکھا کیجئے

جناب کلیم کریمی دھولیوی

فکرِ دنیا کیجئے یا فکرِ عقبیٰ کیجئے   چار دن کی زندگی ہے اس میں کیا کیا کیجئے
کیجئے ہاں عام اتنا اپنا جلوہ کیجئے   ذرہ ذرہ کو جوابِ طورِ سینا کیجئے
ذرہ ذرہ کانپ اٹھے کائناتِ عشق کا   اک تڑپ سی بھی اپنے دل میں پیدا کیجئے
پھر نقاب اُلٹے ہوئے پیشِ کلیم آجایئے   پھر منور اس کے دل کا گوشہ گوشہ کیجئے

جناب اشعر ہاشمی ملیح آبادی

دل دیا ہے جرم تو کوئی نہیں ہم نے کیا   جائیے جتنا بھی چاہیں آپ رسوا کیجئے
تجھ کو مجھ پر کچھ یقیں ہے مجھ کو تجھ پر اعتبار   کس طرح پھر بے رخی کا تیری شکوا کیجئے
ہم نشیں جب ان کی نفرت ہی میرا ہر شاہد ہو   کیا کسی کے سنگِ در پر جا کے سجدا کیجئے
خود سری اخلاق کا بھی ہے اک شیوہ نہیں   تابکے توہینِ الفت کی گوارا کیجئے

جناب ہنر مالیگانوی

کر نہیں سکتی گوارا شانِ خودداری مری   قیس بنکر کیا طوافِ کوئے لیلیٰ کیجئے
ہو شریعت یا محبت یہ تو جائز ہی نہیں   بنتے ہوئے غیر کو کس طرح سجدا کیجئے
کیوں ہے بے فیض معطل اہلِ جوانانِ وطن   خون میں گرمی حرارت دل میں پیدا کیجئے
کاوشِ فکر تخیل کا تقاضا ہے ہنر   اک نئی آباد اک دنیا نئی دنیا کیجئے

جناب سراج احمد آبادی

ستیوں تا گلہ ہم نے کیا ہو دشت میں   ایسے دیوانے سے ذکرِ گلستاں کیا کیجئے
شامِ غفلت ہی رہے گی تا کجا تخیل میں   صبح بیداری کے کچھ آثار پیدا کیجئے
دل کی بربادی کا عالم کس سے دیکھا جائیگا   یوں نگاہِ ناز سے ہم کو نہ رسوا کیجئے
اذنِ رخصت دے رہا ہے لمحہ لمحہ اے سراج   چار دن کی زندگی میں کیا تمنا کیجئے

جناب شوق شہادوی

عمر بھر آزادیٔ گلشن کو ترسا کیجئے   "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"
سرکشوں کا ہو ہی جائیگا کسی دن سر نگوں   پہلے اپنے بازوؤں میں زور پیدا کیجئے
تنگ آ کر ہو ہی جائیگی نمائش حسن کی   طور تو موجود ہے تقلیدِ موسیٰ کیجئے
منحصر ہے زندگی پر جن کی نمودِ انقلاب   پہلے ان مردہ دلوں میں جان پیدا کیجئے

جناب فضا کوثری

عمر ہے محدود لامحدود اپنی خواہشیں   کس کا ارماں کیجئے کس کی تمنا کیجئے
ہے تغیر آشنا ہر لحظہ فطرت کا نظام   "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"
محرمِ اسرارِ دنیا میں نہیں ہے ایک بھی   رازہائے عشق کو کیا آشکارا کیجئے
اے فضا برقِ تجلی موجزن ہو جائیگی   دل کے ہر ذرے کو رشکِ طورِ سینا کیجئے

جناب قیس بدایونی

اُنکی صورت نقشِ سجدہ ہی میں پیدا کیجئے   کیجئے سجدہ اگر اُنکو تو ایسا کیجئے
آگئے صیاد کے بس میں تو اب کیا کیجئے   "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"
آتی ہے رہ رہ کے اُنکی یاد دل میں اور بھی   جسقدر بھی بھول جانے کی تمنا کیجئے
جو مصیبت میں بدلکر دشمنوں کے دوست ہوں   قیس ایسے دوستوں کا کیا بھروسا کیجئے

جناب سالک ہاشمی ناگپوری

جلوۂ حسنِ حقیقت آشکارا کیجئے   ذرے کو خورشید اور قطرے کو دریا کیجئے
پھر سرِ طور اُن کے جلوؤں کا تقاضا کیجئے   پھر نگاہِ شوق کو محوِ تماشا کیجئے
کچھ کمی ہونے نہ پائے اضطرابِ شوق میں   [illegible]
جس سے اک لمحہ بھی سالک ہو نہ امید وفا   [illegible]

جناب شارب قریشی ناگپوری

حسن کی تصویر جو کہ آئینے دل میں ہے   [illegible]
دیر و کعبہ سے طبیعت اب تو گھبرانے لگی   [illegible]
[illegible]   [illegible]

ساسنے اُنکے زباں کُھلتی نہیں تو کیا ہوا
دل کا افسانہ نگاہوں سے سُنایا کیجئے

جناب اختر حزیں از کانپور

اب تو ان نظاروں سے بھی الفت سی ہمکو ہوگئی
حالِ دل اُن پر نہیں تو کس پہ افشا کیجئے

گل پرستوں کو نہیں زیب کبھی ترکِ چمن
"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

پھر جبیں کو یاد آئی لذّتِ آغوشِ در
جی میں آتا ہے کہ پھر سجدے پہ سجدہ کیجئے

خیر باد اے اختر محروم و رسوا خیر باد
تو ہی اک دردآشنا تھا لیکن اب کیا کیجئے

جناب اثر احمد آبادی

بے نیازِ دید سے پردہ کیا تو کیا
ہو سکے تو دیکھنے والوں سے پردہ کیجئے

منتشر نظمِ جہانِ آرزو ہو جائے گا
شورشِ جذباتِ پیہم سے نہ گھبرایا کیجئے

جادہ راہِ طلب شہاب ہے تو کیا ہوا
ہر قدم پر [illegible] نئی زحمت گوارا کیجئے

بزمِ خلوت میں شرابِ شوق پیکر ہو اثر
عشق کی کیفیتوں کے ساتھ ہو جایا کیجئے

جناب بیتاب کالپوری از جالون

اپنے ہی قلبِ مصفّا میں نظارا کیجئے
کیوں طوافِ کعبہ و دیر و کلیسا کیجئے

خاک کرنا ہی اگر مقصود ہے تخصیص کیوں
ارضِ دل ہی کو نہ کیوں پھر طور و سینا کیجئے

شانِ استغنا میں ہے بیتاب لطفِ زندگی
حرصِ دنیا کیجئے کیوں فکرِ فردا کیجئے

جناب مرزا شہادوی

پہلے احساسِ محبت دل میں پیدا کیجئے
پھر کسی سے عشق کرنے کا ارادا کیجئے

پھر بجا تکلیفِ دل کی آنچ ہو بزم میں
رنگِ شمع و خاکِ پروانہ کا یکجا کیجئے

یاد ہے [illegible] آجتک [illegible] مجھے
جس میں اپنا فائدہ ہو کام ایسا کیجئے

جناب سالک حنیفی نصرآبادی

چاہتا ہے دل کہ اظہارِ تمنّا کیجئے
پھر خیال آتا ہے کیا اُن سے تقاضا کیجئے

کہہ رہی ہے اہلِ گلشن سے زمانے کی روش
"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

دے جو سالک اہلِ دل کو دعوتِ فکر و عمل
نظم میں ایسا کوئی انداز پیدا کیجئے

جناب فہمی جبلپوری

جو دکھائے گردشِ [illegible] دیکھا کیجئے
"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

جبکہ میں [illegible]
[illegible] کیجئے

شامِ فرقت [illegible]
[illegible] کس پر بھروسا کیجئے

جناب گلشن [illegible]

میری رسوائی [illegible]
[illegible] کیجئے

پھر پھڑک اُٹھیں ارماں پھر پھڑک اُٹھی نظر
اس غلط انداز سے مجھکو نہ دیکھا کیجئے

ہے مشیّت کارفرما جسکی ہر تقدیر میں
شوخیٔ تقدیر کا اُس سے گلا کیا کیجئے

جناب فلک پالن پوری

خندہ پیشانی سے جینا بس یہی ہے زندگی
مسکرا کر ہر مصیبت کو گوارا کیجئے

حرّیت خود آئے گی پابوس ہونے کے لئے
سر بکف ہو جائیے سر کی نہ پروا کیجئے

اے فلک گر راہ اپنی پُر خطر ہو بھی تو کیا
جانبِ منزل قدم اپنا بڑھایا کیجئے

جناب راز یزدانی دھولیوی

کشمکش ہی زندگی ہے زندگی ہے کشمکش
زندگی بھر سامنا رنج و بلا کا کیجئے

تجربہ ہے اُمیدیں بارور ہوتی نہیں
دل میں کیوں اُمید پر اُمید پیدا کیجئے

جناب رازی بہل ضلع میانوالی

شاید آ جائے سکوں نا آشنا دل کو سکوں
نشترِ غم میری رگ رگ میں چبھویا کیجئے

اُٹھ رہی ہے سینہ میں رازی کیسے محبت تمام
دلنشیں فتنے ہیں دنیا کا گوارا کیجئے

جناب محسن ساگری

گلشنِ ہستی کا ہے ہر رنگ دگرگوں کل جب
"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

پرورش جسکی جگر کے خون سے ہوتی رہی
وہ دلِ دردآشنا جاتا رہا کیا کیجئے

جناب شاد سلیمانی نقشبندی جالندھری

چارہ گر کوئی نہیں جب دردِ الفت کے سوا
دردِ الفت کو نہ کیوں اپنا مسیحا کیجئے

دل کو خوش آتی ہے یہ ٹھنڈی ہوا یہ چاندنی
کیوں نہ اشک و آہ میں ہر شب گزارا کیجئے

جناب طالب بھاٹاپاروی

میری رسوائی نہیں رسوا نہ کرئیے آپ کو
اپنی رسوائی سمجھ کر مجھ کو رسوا کیجئے

انقلابِ دہر سے انکار رہتے ہیں آپ کیوں
"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

جناب غیرت موراوی

کروٹیں لینے کو ہیں اب انقلاباتِ جہاں
"کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

ہاں شوق آتے ہیں غیرت اور نہ بہکئے کبھی
دل ہی دل میں اپنے منصوبے بنایا کیجئے

جناب سلام ساگری از جبل پور

[illegible]
راہِ الفت میں بھلا کس پر بھروسا کیجئے

[illegible]
کیجئے پھر اے سلام اب [illegible]

جناب نظامی جبل پوری

[illegible]
[illegible]

جناب انجم احمد آبادی

اسے بٹھا کر تصور میں سرے تصویرِ حسن — تیرگیِ شامِ فرقت میں اُجالا کیجئے

جناب سوز ابنالوی

ہے سفر در پیش جنبک زندگی سے موت تک — "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

جناب کیفی احمد آبادی

دل مرا بیتاب ہے آنکھیں ہیں پُرنم مضطرب — اب خدا کے واسطے مجھ سے نہ پردا کیجئے

جناب ارمان مصطفےٰ آبادی

آپ خورشید صداقت ہیں ہوں جلوہ آپکا — مرے دل کا حال اپنے دل سے پوچھا کیجئے

جناب رازی قاسمی لکھیم پوری

غرق ہو کر خودی میں جس سے ساری کائنات — اس طرح محفل میں رازی گنگنایا کیجئے

جناب سہیل شہادوی

گلستانِ دہر میں ممکن ہو جب اپنا سہیل — "کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجئے"

جناب محسن ساگری

اب تو کوسوں دور ہیں تابِ شکیبائی سے ہم — اب بیاں منزل کا کوئی اور قصا کیجئے

اصلاحِ سخن :- جناب سید یوسف پیر نیر کھمی کی غزل پر حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

(گذشتہ اشاعت میں حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم کی اصلاح پیش کی گئی تھی)

۱ ازل سے مٹی پلید میری یہ خاکدانِ خراب میں ہے — ~~پہنچا ہی تیرا کارفرما تو~~ (مگر یہ تیری ہی کارفرمائی) آب و گل کے حجاب میں ہے

۲ (فریب ہے یہ کہ آج) ~~بہا رہی ہیں نظر میں~~ ہر شے جبینِ عمرِ شباب میں ہے — یہ کھیل سب حسن و عشق کا ہے (کے ہیں) وگرنہ کیا خاک (انسان) خواب میں ہے

۳ ~~محبت کے طوفاں رہ گیا ہے مگر ہے آئینہ~~ دل کی دھڑکن — فضا کے تیور بتا رہے ہیں جو ~~خنشی~~ (کشمکش) باد و آب میں ہے

۴ سنا ہے میں نے چلتے بیٹھا ہے چرخ ~~ظالم خنجر لا کھوں~~ (قاتلوں کو) — زمیں والوں کا خاتمہ اک اشارۂ انقلاب میں ہے

۵ جہانِ فانی کے تلخ تر تجربوں نے کھولا یہ راز مجھ پر ۴ ~~قلوب~~ (نشاط) کی زندگی نجاتِ غمِ عذاب و ثواب میں ہے

۶ میں ایک قطرہ ہوں گو بظاہر مگر بباطن ہوں عینِ دریا ۴ مجھے بقائے دوام حاصل طلسمِ زارِ حباب میں ہے

۷ دہائی قہرِ کرم نمائی ہے جاں بلب راہ میں مسافر ۴ زبان پر العطش نظر اس کی غرق موجِ سراب میں ہے

۸ محال آنا ہے ان کا آجائے کاش بادِ فنا کا جھونکا ۴ مرے مقدر کا فیصلہ اک پیالۂ زہرِ ناب میں ہے

۹ فقیہ ہو یا خطیبِ فتویٰ فروش مفتی ہو یا ~~کہ~~ شاعر — ہر ایک کی پوچھ پیشِ ربِّ قدیر یوم الحساب میں ہے

۱۰ ~~خدا کا عطیہ ہے میرے ذمے ہے جو شبوں کا گداز نیر~~ (خدا کا ہے صرف اک عطیہ یہ پچھلی شب کا)
میں ایک بیدار اور کل کائنات مصروفِ خواب میں ہے

توجیہ :-

(۱) مصرع اولیٰ میں "یہ" کا محلِ استعمال غلط تھا اور مصرع ثانی کچھ اسلوبِ بیان میں خامی تھی اصلاح سے مفہوم وہی رہا اور خامی دور ہو گئی۔

(۲) مصرع اولیٰ کا پہلا ٹکڑا "بہا رہی ہیں نظر میں" پورے مصرع میں جھول پیدا کر رہا تھا اور اسلوبِ بیان نہایت بھدا ہو گیا تھا۔ دوسرے مصرع میں "جو خواب" ہے اس کے مفہوم کو بھی شعر واضح نہ کرتا تھا صرف اصلاح میں لفظِ "فریب" نے ہر بات واضح کر دی۔ مجموعی طور پر اصلاح کے ہر لفظ نے شعر میں جان ڈال دی ہے اور لطف یہ ہے کہ مفہوم وہی رہا۔

(۳) شعر کا مفہوم بالکل تشنہ تھا اور الفاظ بے محل۔ اصلاح سے شعر بہت بلند، صاف اور جاذب ہو گیا۔

(۴) پہلے مصرع میں "ظالم کے چلتے" بالکل بیکار تھا۔ اصلاح سے یہ عیب دور ہو گیا۔

(۵) نیر صاحب یہ کہنا چاہتے تھے کہ دل کی زندگی اس میں ہے کہ وہ غمِ عذاب و ثواب سے بے نیاز ہو جائے اور فاضل استاد نے "نشاط" بنا کر معنی کو زیادہ وسعت اور لطف بخش دیا یعنی خوشی سے زندگی اسی وقت کٹ سکتی ہے جب عذاب اور ثواب کا کوئی جھگڑا ہی نہ ہو۔

(۹) پہلے مصرع میں "کہ" بھرتی تھا۔

(۱۰) اس شعر کے پہلے مصرع میں دو غلطیاں تھیں اول یہ کہ عطیہ کی "ی" مشدد ہے دوم "شبوں کا گداز" بھی صحیح نہ تھا۔ گدازِ شب یا شب کا گداز ہونا چاہیے تھا۔ شب کی جمع شبوں غلط ہے۔ پھر مصرع میں وہی الفاظ کی بے ربطی تھی جو پہلے دوسرے اور تیسرے شعر میں ہے اصلاح نے مصرع میں چار چاند لگا دیئے سبحان اللہ۔

اعجاز صدیقی

نقد و نظر

چراغِ لالہ از صائب عاصمی تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۶۰ صفحات. کاغذ اور لکھائی چھپائی اوسط. کتاب مجلد ہے اور جلد پر سنہری ڈائی کندہ ہے۔ مع تصویرِ مصنف. قیمت ۸؍. مصنف سے بسرز مطر چند کپور اینڈ سنز. میکلاگن روڈ لاہور کی معرفت منگائی جا سکتی ہے۔

صائب عاصمی پنجاب کے نوجوان شاعر ہیں. یہ اُنکی نظموں. غزلوں اور قطعات کا مجموعہ ہے. ان کی زندگی کے حالات پڑھنے کے بعد ان کا کلام زیادہ موثر اور واقعیت سے قریب معلوم ہوتا ہے چونکہ وہ زندگی کی دشوار گذار راہوں سے گذر رہے ہیں اس لئے کلام میں درد و کرب ہے لیکن واضح نہیں اور یہ شاید اُن کے تاثرات کی خامی ہے پھر بھی ایسے اشعار کافی مل جاتے ہیں جو دُکھے ہوئے دل کی پکار کہے جا سکتے ہیں۔ صائب کا مستقبل اُن کے کلام سے صاف جھلک رہا ہے لیکن جذبات کی نوک کو ذرا اور تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ ذیل کے چند اشعار اُن کا رنگِ طبیعت سمجھنے کے لئے کافی ہیں ؎

اب میرے دل میں حسرتِ پرواز بھی نہیں\
اُڑنے کے دن تو سارے قفس میں گذر گئے

حالِ دلِ الم نصیب پوچھ رہے ہو مجھ سے کیوں — دیکھ لو رنگِ رخ مرا دیکھ لو خامشی مری\
ایک نویدِ گریہ ہے، درد کا اک پیام ہے — قہقہے اور ہنسی مری عیش مرا خوشی مری\
گرچہ میں نوجوان ہوں صائبِ خوش بیان ہوں — ننگِ شباب ہے مگر آہ یہ زندگی مری

نہ مجھے جہاں میں سکوں ملا نہ مجھے جہاں میں اماں ملی\
جو ملا تو عشق و جنوں ملا جو ملی تو آہ و فغاں ملی

ہائے قسمت میں نہیں اک پھول بھی — ہم چمن میں بھی تہی داماں رہے\
بعدِ فصلِ گل چمن مرجھا گیا — داغ سینے کے مگر خنداں رہے

ہر چند صائب کے کلام میں کوئی انفرادیت نہیں اور نہ مشاقی نمایاں ہے. اس کے باوجود اشعار بے لطف نہیں. انھوں نے بڑی حد تک سنجیدہ تغزل پیش کرنے کی کوشش کی ہے. نظموں اور غزلوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں. اس لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اُنکا میلانِ طبع کس طرف ہے۔ البتہ قطعات میں صائب کی شاعری کے کچھ گہرے نقوش نظر آتے ہیں ؎

نہ ہو جس میں محبت کا قرینہ — ڈبو دے اُس تمدن کا سفینہ\
یہی انسانیت ہے میرے اللہ — لبوں پر مسکراہٹ دل میں کینہ

صائب کو خود اس کا اعتراف ہے کہ اُن کے یہاں علمی و فنی فروگذاشتیں موجود ہیں. اس لئے اس پہلو پر کچھ لکھنا بے سود ہے۔ ورنہ اُن کے یہاں ایسے مصرعے بھی پائے جاتے ہیں. ممکن ہے اس میں کتابت کی غلطیاں ہوں لیکن بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا.

"وہ تیرِ شکستہ کی خلشِ غم انگیز" — پیوستہ ہر تارِ دل و جاں ہو ابھی تک\
"امتیازِ فراق و وصل ہو جس سے پیدا" — وہ ہوس ہے اُسے تم عشق کا سودا نہ کہو

بہر حال ایک نوجوان اور دکھے ہوئے دل کے شاعر کو دادِ سخن دینے کیلئے علم دوست طبقہ کو یہ مجموعۂ کلام ضرور خریدنا چاہیئے۔

بادۂ ناخوردہ از شاداں اجمیری. تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۸۰ صفحات لکھائی چھپائی اوسط. کاغذ اعلیٰ. کتاب مجلد ہے اور جلد پر سنہری ڈائی کندہ. قیمت ۸؍

ملنے کا پتہ اثر جلیلی حافظ منزل اجمیر راجپوتانہ

مقامِ شکر ہے کہ راجپوتانہ کے شعراء بھی اب آگے بڑھنے کے جذبات اُبھرنے شروع ہوگئے ہیں. راجپوتانہ کے دوسرے شہروں اور ریاستوں سے قطع نظر اجمیر القدس میں ہمیشہ شعرا کی ایک ستھری جماعت گرمئ بزمِ شعر رہی ہے. اس وقت بھی دیرینہ مشق شعرا کے علاوہ وہاں چند نوجوان چھا گئے ہیں۔ جناب شاداں بھی نوجوان اور باذوق شعرا میں سے ہیں. یہ ان کی غزلوں کا مختصر مجموعہ ہے اُن کی

ملکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ابھی نومشق ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ چلکر ترقی کرجائیں گے۔ ابتدا میں حضرتِ بہار کوٹی کا ایک بسیط اور فاضلانہ مقدمہ ہے۔ اس کے بعد خود مصنف کا "عرضِ حال" ہے۔ حضرتِ بہار کا مقدمہ کتنا ہی ٹھوس اور معلومات آفریں کیوں نہ ہو، لیکن اتنے مختصر مجموعۂ کلام کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ "بادۂ ناخوردہ" کے لئے تو چند الفاظ کافی تھے۔

شاداں کے کلام میں بحث و نظر کی بڑی گنجائش ہے۔ تنقید کے دوسرے پہلو سے شاید وہ کوئی غلط اثر لیں۔ اس لئے نظرانداز کرتا ہوں۔ چند اچھے شعر بطورِ نمونہ یہاں درج ہیں ؎

مری زندگی درد و غم ہے سراسر　　یہ وہ نظم ہے جس کا عنوان نہیں ہے

پھر طعنۂ آوارگیٔ شوق نہ دینا　　کیا ڈھونڈ لیں ہم بھی کوئی منظورِ نظر اور

تو سوچ رہا ہے کہ ترے دل کو ہوا کیا　　ظالم یہ مرے جذبِ محبت کا اثر ہے

دوزخ سے مجھے منظور رہتا ہر حال میں شاداں　　جنت میں اگر دل کا سہارا نہیں ہوتا

شاداں چمن بھی عکسِ رخِ دوست ہیں ہو　　کیوں موجِ رنگ و بو میں بہتا جا رہا ہوں میں

سارے عالم پہ چھا رہی ہے بہار　　اپنے گھر رونقِ بہار نہیں

اس کو کہتے ہیں ضبطِ ستمکم　　سوزِ غم ہے مگر کراہ نہیں

زبانِ حال ہو کو عرضِ مدعای دل　　جب اور کوئی طریق بیاں نہیں ملتا
بہت تلاش کیا بجلیوں نے ای شاداں　　وہ بے نشاں ہوں مرا آشیاں نہیں ملتا

جواہر العلوم ترجمۂ مولانا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل، منشی فاضل تقطیع $\frac{26 \times 20}{8}$ حجم ۲۲۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر۔ قیمت دو روپیہ۔

ملنے کا پتہ کتابستان۔ پوسٹ بکس ۲۱۶۴ بمبئی ۳

یہ مصر کے ایک مشہور عالم علامہ طنطاوی جوہری کی مشہور کتاب جواہر العلوم کا اردو ترجمہ ہے جو بڑے سلیس انداز میں کیا گیا ہے۔ علامہ طنطاوی جوہری علوم جدید و قدیم کے ماہر ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے کلام پاک کی روشنی میں انسان۔ حیوان۔ نباتات۔ جمادات۔ نظامِ فلک۔ آفتاب۔ ماہتاب اور سیاروں کی گردش۔ غرض تمام ارضی و سماوی کیفیات کا انکشاف کیا ہے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ زمانہ میں اسرارِ کائنات کو قرآن کی آیات سے ثابت کرنا اور سائنس کے انکشافات کو اُن سے منطبق کرنا واقعی ایک بڑا کام ہے۔ اس سے جہاں قرآن کی عظمت، سچائی اور بحر العلوم ہونے کا پتہ چلتا ہے، وہیں خدا کی حکمتِ کاملہ کا عرفان بھی ہوتا ہے۔ کتاب بے حد دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

ہوائی حملے از آغا محمد اشرف صاحب دہلوی ایم اے تقطیع $\frac{30 \times 20}{16}$ حجم ۱۱۶ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی

موجودہ جنگ کا سب سے تباہ کن حربہ بم ہے۔ جس سے بیک لمحہ ہماری زمین کی ہر چیز خاک ہوسکتی ہے۔ یہ طے ہے کہ ہوائی حملے کی مدافعت بجز تدبیر اور کسی چیز سے نہیں ہوسکتی۔ آغا محمد اشرف صاحب کی اس کتاب میں وہ تمام باتیں شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہیں جو ہمیں اس خوفناک حملے سے کسی حد تک ضرور محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ آغا صاحب نے نہایت اہم مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہے۔ حکومت کی طرف سے تو خیر ہمیں بہت سی تدابیر بتائی جاتی ہیں لیکن یہ صورت زیادہ موثر ہے۔ اس کتاب کو صرف ایک بار دیکھنے سے تمام باتیں محفوظ ذہن ہوجاتی ہیں۔ دشمن دھاوا کرے تو شہری کیا کریں۔ بلیک آؤٹ۔ کیا دہلی پر ہوائی حملہ ہوگا۔ شہر خالی کرنے کا سوال۔ ہوائی حملے کے وقت دس ضروری باتیں۔ پروفیسر ہالڈین کی چند تجویزیں۔ اسپتال اور فرسٹ ایڈ کے مرکز۔ پروپیگنڈا۔ زہریلی گیس۔ آگ۔ بیماری پھیلنے کا خطرہ۔ پناہ خانے۔ شہر خالی کرنے سے پہلے۔ ہوائی حملے کے بعد۔ ہندوستان میں ہوائی حملوں سے بچاؤ وغیرہ وغیرہ اس کتاب کے خاص مضامین ہیں۔ اس کتاب کی ایک کاپی ہر گھر میں رہنی ضروری ہے۔ اور اگر ہندوستان کے تمام اسکولوں اور کالجوں میں اسے بطور درس شامل کیا جائے تو اور زیادہ فائدہ ہو۔

اعجاز صدیقی

سالِ اجرا موسم بہار ۱۹۳۰ء ——— عرصہ اشاعت ۱۴ سال

زیرِ سرپرستی — اعلیٰحضرت رسوا مظلومی والئی پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ
محکمۂ تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار
محکمۂ تعلیم ریاست میسور

منظور شدہ
حکومت ممالک متحدہ اگرہ و اودھ
محکمۂ تعلیم ریاست کشمیر

تعارف

تصویر ——— جناب افسر احمد نگری

جلد ۱۴ | ماہنامہ "شاعر" اگرہ ——— اپریل ۱۹۴۳ء | نمبر ۴

چندہ سالانہ [illegible]

محسنین مربی معاونین اور خاصان ہمدردان شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسن ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ روپے سالانہ
(۲) محسن ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۶۰ روپے سالانہ
(۳) محسنہ ادب ہرہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ روپے سالانہ
(۴) محسن ادب جناب وزیرزادہ شجاعت خانصاحب قہر جوناگڈھی ۶۰ روپے سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۵) مربی ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں سرکرنل حشمت اللہ خاں صاحب سی آئی ای کے ٹی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵۰ روپے سالانہ
(۶) مربی ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز و اچشا ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹا نگر) ۵۰ روپے سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاون ادب مسٹر اے۔ بی۔ ظلیس قمر اکبرآبادی ۲۴ روپے
(۸) معاونہ ادب محترمہ بیگم نصرت ایم اے۔ بی۔ ٹی مدیرہ رسالہ "ادیب" دہلی ۲۴ روپے سالانہ
(۹) معاون ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی (بمبئی) ۲۴ روپے سالانہ
(۱۰) معاون ادب جناب صوبیدار افتخار علی صاحب گوالیار ۲۴ روپے سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۱) ہمدرد ادب جناب گیانی عبدالغفور صاحب تسکین جالندہری ۱۲ روپے سالانہ
(۱۲) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ روپے سالانہ
(۱۳) ہمدرد ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب آزاد دکنی جمشید پور ۱۲ روپے سالانہ
(۱۴) ہمدرد ادب جناب خلیل محمد صاحب راز جوناگڈھی ۱۲ روپے سالانہ
(۱۵) ہمدرد ادب جناب نوابزادہ شکر حسین خانصاحب قیس آف بیڈو ۱۲ روپے سالانہ
(۱۶) ہمدرد ادب جناب خانصاحب عبدالحمید خانصاحب آف نانا ندر ۱۲ روپے سالانہ
(۱۷) ہمدرد ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲ روپے سالانہ
(۱۸) ہمدرد ادب محترمہ ملقبہ جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۱۲ روپے سالانہ
(۱۹) ہمدرد ادب جناب سید غلام محمد شاہ صاحب رئیس اعظم زجرہ۔ چنیوٹ ضلع جھنگ ۱۲ روپے سالانہ

خاصان ادب

(۲۰) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ۶ روپے سالانہ
(۲۱) جناب عبدالحفیظ صاحب قمر صدیقی چھراؤنی بی۔ اے ۶ روپے سالانہ
(۲۲) جناب لالہ گنگا رام صاحب امید سرہندی ۶ روپے سالانہ
(۲۳) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی شکور بستی دہلی ۶ روپے سالانہ
(۲۴) جناب محمد عبداللہ خاں صاحب بزم امروہوی ۶ روپے سالانہ
(۲۵) جناب ماسٹر حسن خانصاحب آخر بمبئی ۶ روپے سالانہ
(۲۶) جناب نذیر احمد صاحب نذیر منشی کوٹی ۶ روپے سالانہ
(۲۷) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶ روپے سالانہ
(۲۸) جناب [illegible] حمید صاحب بزم دہلوی ۶ روپے سالانہ
(۲۹) جناب [illegible] علی صاحب [illegible] ۶ روپے سالانہ
(۳۰) جناب سبحان علی صاحب فاضل چندل ۶ روپے سالانہ
(۳۱) جناب بابو قیصر محمد خانصاحب فاروق سیالکوٹی (کوئٹہ) ۶ روپے سالانہ
(۳۲) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶ روپے سالانہ
(۳۳) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹھا ۶ روپے سالانہ
(۳۴) جناب شیو پرشاد صاحب برق باندوی ۶ روپے سالانہ
(۳۵) جناب حکیم مولوی عبدالرحمن صاحب شاعر کاندھلوی ۶ روپے سالانہ
(۳۶) جناب علامہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ روپے سالانہ
(۳۷) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر نکوڈری ۶ روپے سالانہ
(۳۸) جناب کنور فاروق علی خاں صاحب عارف رئیس بیڈو ۶ روپے سالانہ
(۳۹) جناب مقبول احمد صاحب سحر اعظم گڈھی ۶ روپے سالانہ
(۴۰) جناب مولوی نظام الدین صاحب نظم رامداسی گورکھپوری ۶ روپے سالانہ
(۴۱) جناب ڈاکٹر ماتا پرشاد صاحب استغنا زیب بریلوی ۶ روپے سالانہ
(۴۲) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ روپے سالانہ
(۴۳) جناب مولوی محمد احسان حسن خانصاحب احسان موضع پھلواری (بہار) ۶ روپے سالانہ
(۴۴) جناب مولوی نصیرالدین صاحب جنید امارہ (میرٹھ) ۶ روپے سالانہ
(۴۵) جناب عطاء الرحمان صاحب عطا جالندہری دہلی ۶ روپے سالانہ
(۴۶) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب فردانی اسسٹنٹ ۶ روپے سالانہ
(۴۷) جناب بشیر احمد صاحب فاروق رکن ادارہ "الاسلام" کوئٹہ ۶ روپے سالانہ
(۴۸) جناب بابو من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی۔ پی) ۶ روپے سالانہ
(۴۹) جناب میاں محمد مخدوم صاحب رئیس چک میانہ (پنجاب) ۶ روپے سالانہ
(۵۰) جناب محمد حسین صاحب خادم شملوی دہلی ۶ روپے سالانہ
(۵۱) جناب چودھری علیم یار صاحب سندیلہ ۶ روپے سالانہ
(۵۲) جناب سید شاہ کفایت علی صاحب تاباں القادری مٹیابرج (بنگال) ۶ روپے سالانہ
(۵۳) جناب جمعدار سی۔ بی مجاہد صاحب بمبئی ۶ روپے سالانہ
(۵۴) جناب شیخ عبدالرحمن صاحب شباب دہلوی بیدار ملسی ۶ روپے سالانہ
(۵۵) جناب ملک قربان حسین صاحب [illegible] ۶ روپے سالانہ
(۵۶) جناب عبدالرؤف صاحب [illegible] ۶ روپے سالانہ
(۵۷) جناب [illegible] صاحب [illegible]
(۵۸) جناب سید [illegible] صاحب [illegible]
(۵۹) جناب پنڈت [illegible] صاحب [illegible]

شعرِ انقلاب —— جاہل باش و خوش باش؟

ظاہر و باطن کی ہے تفریق علم و جہل میں ایک تکمیلِ خرد ہی، اک جنوں کی بے حدی
علم ظاہر، عشق باطن، وہ زباں یہ عینِ دل مکتبِ اسرار کا یہ منتہی وہ مبتدی
ظالم و جاہل کیا ہے تجھ کو پیدا فطرتاً علم اور عرفان کا احساس ہی بے مقصدی
عشق سرتاپا فنا ہے، علم بیزارِ فنا عشق ادراکِ حقیقت، علم تمییزِ بدی
ہیں افادے میں برابر درکِ ہستی کے لئے ایک لمحہ عشق کا اور علم کی پوری صدی
معنوی تعلیم قلب و جسم کو دیتی ہے روح ہے فقط اک رسمِ مہمل مُرشدی و مُرشدی
رات دن انسان کو دیتی ہیں درسِ کفر و جہل یہ نظر افروز پردے ابیضی و اسودی
باخبر ہونا ہے گویا بے خبر ہونا یہاں اُمّی و الکن زباں ہیں ترجمانِ ایزدی
جن کو ہے عرفان انکی بند رہتی ہے زباں خامشی ہے وجہ تسکین و نشاطِ سرمدی

صورتِ منصورؒ جو بولا، وہ مارا جائیگا
پیرِ سندھی ہو کوئی یا ہو فقیرِ سرحدی

سیماب اکبرآبادی

۱۹ مارچ ۱۹۴۳ء

جرعات

زیرِ نظر اشاعت کے مضامین کی تعداد گذشتہ اشاعتوں سے کچھ کم ہے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کمی محسوس نہ کی جائے گی اور اس کی تلافی اُن دو طویل مضامین سے ہو جائے گی جو اسی اشاعت میں شریک ہیں یعنی "**اصغر کے عاشقانہ خطوط**" اور "**بساطِ سخن**"۔ طویل مضامین کی اشاعت ہر رسالہ کے لئے ناقابلِ عمل اور دقت طلب ہوتی ہے۔ ایڈیٹر کے ذوق کو جانے دیجئے، لیکن ناظرین کا مذاق اور ذوقِ مطالعہ تو زیادہ سے زیادہ مضامین چاہتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر رسالہ میں صرف ایک ہی طویل۔ ٹھوس اور معیاری مقالہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ کاغذ کی ارزانی اور صفحات کی زیادتی کے زمانہ میں جب طویل مضامین کی اشاعت ممکن نہ ہوتی تو اب کس طرح ہو سکتی ہے؟ مگر کیا کیا جائے کہ اچھی چیز شائع کئے بغیر دل نہیں مانتا۔ "**اصغر کے عاشقانہ خطوط**" اردو ادب میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ جس التزام کے ساتھ اصغر مرحوم نے انھیں لکھا ہے وہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ پھر روانی۔ سلاست اور بے ساختہ پن میں بھی کسی قسم کا جھول پیدا نہیں ہوا۔ خطوط سے ادبی شان زیادہ سے زیادہ نمایاں ہے۔ حالانکہ قید و شرط سے فطرتاً ایک تصنع پیدا ہو جانا چاہیے مگر ان خطوط میں یہ بات نہیں ہے۔ میں حضرت مولانا احتشام اشتہابی اکبرآبادی کی خصوصی کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں کہ موصوف نے اپنے کتب خانہ کے نوادرات میں سے یہ انمول ہیرا نکال کر دیا۔ مولانا کی تمہید بھی بہت خوب ہے۔ "**بساطِ سخن**" کے متعلق میں اپنی زبان سے کیا کہوں! دنیائے ادب خود اس کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ یہ نظم کس کد و کاوش کی حامل ہے۔ اس نظم کی تکمیل کے بعد خود میرے یقین کے قدم ڈگمگا رہے ہیں اور میں اپنی ناتوانی کو دیکھتے ہوئے حیران ہوں کہ اتنا بڑا کام مجھ سے کیونکر ہو گیا۔ اس نظم سے یوں تو سبھی لطف اندوز ہونگے لیکن ان حضرات کو زیادہ لطف آئے گا جو شاعرِ مذکور کے کارناموں، اسکی زندگی کے حالات اس کے کلام کی خصوصیات اور اس کے کردار سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر اس نظم کو قبولِ عام حاصل ہوا تو میں سمجھونگا کہ یہ میری حیاتِ شعری کا کارنامہ ہے۔

امدادی فنڈ کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے "شاعر" نواز طبقہ کوشاں ہے۔ انفرادی طور پر عطیات کی روانگی کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ شاید اس تحریک سے "شاعر" کے مستقبل کے لئے کوئی مؤثر ذریعہ پیدا ہو جائے۔ مندرجہ ذیل حضرات نے اس ماہ میں "امدادی فنڈ" میں حصہ لیا ہے۔

(۱) حضرت نثار اٹاوی صہ

(۲) سید محمد یحییٰ صاحب رونق نوزیری۔ چن پٹن (میسور) عہ

"**شاعر کی مانگ**" اتنی زیادہ ہے کہ ایجنٹوں کی بڑھتی ہوئی فرمائشوں کو کسی طرح پورا نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ماہ تعداد میں اضافہ کیا جاتا ہے لیکن وسطِ ماہ میں تمام پرچہ ختم ہو جاتا ہے۔ ڈاک کی انتظامی خرابیوں کی وجہ سے اکثر رسالہ نہ پہنچنے کی شکایتیں بھی آتی رہتی ہیں۔ جن حضرات کے پاس ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہونچا کرے وہ جلد شکایتی خط لکھ دیا کریں تاکہ دوبارہ روانگی کی کوشش کی جائے آخر ماہ میں کسی طرح رسالہ فراہم نہیں کیا جا سکتا۔

مندرجہ ذیل شاعر نواز حضرات نے جدید خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ ادارہ اس توجہ فرمائی کا بیحد ممنون ہے اور ابھی اُسے اپنے بہی خواہوں سے بہت کچھ توقع ہے۔

جناب عبداللہ صاحب عشرت عظیم آبادی (جمشید پور)	۴	خریدار
جناب مخدوم سید علی اسد صاحب اسد نقوی البخاری احمد آبادی (جھنگ)	۲	"
جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی لکھنوی (سنگرستی دہلی)	۲	"
جناب نیر نقشبندی کولاری۔ کولار (میسور)	۱	"
جناب قدیر محشر فرخ آبادی (جھنگ) کانپور	۱	"
جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی (کوئٹہ)	۱	"
جناب رفیع الدین احمد صاحب عالی۔ پونہ (شمالی ارکاٹ)	۱	"
جناب سلام ساگری۔ ساگر	۱	"
جناب منظر سیانوی	۱	"

سیماب لٹریری سوسائٹی ہندوستان کے کئی شہروں میں قائم ہے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ ارتقائی اصولوں پر شعر و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر متمدن شہر میں سیماب لٹریری سوسائٹی قائم ہو۔ جو لوگ اپنے شہروں میں سوسائٹی قائم کرنا چاہیں وہ آگرہ کی مرکزی سوسائٹی سے تفصیل معلومات حاصل کر لیں۔ [illegible] میں سیماب لٹریری سوسائٹی کا افتتاح [illegible] کے ہاتھ سے ہوا۔ وہاں اب تک سوسائٹی کی چھوٹے اور بڑے جلسے ہو چکے ہیں اور سوسائٹی [illegible] جلسوں کی ادبی شہرت نے ان کو زیادہ سے زیادہ گرما دیا ہے۔ مولوی یحییٰ حسین صاحب تجمیر گوپاموی صدر سوسائٹی اور جناب جری ہوشنگ آبادی (اعزازی سکریٹری) کی مساعی قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ خدا سوسائٹی کو استحکام عطا فرمائے۔

(اعجاز صدیقی)

تحقیق و تصحیح

استفسار:-

الف (۱) علامہ اقبال کے اس شعر میں ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

کیا لفظ "چاک" کا حرفِ آخر تقطیع سے گرتا ہے؟

(۲) محترمہ نجمہ تصدق کا شعر ہے ؎

یہ پردے بھی اے دوست کیوں لے رہا ہوں
زمان و مکاں کے حجابات اٹھا دیں

"دوست" اور "حجابات" کی ت تقطیع سے گرتی ہے کیا یہ صحیح ہے؟

(۳) جناب امین حزیں سیالکوٹی کی ایک غزل میں دُنیا۔ سودا۔ تقاضا وغیرہ قوافی ہیں کیا صوتی لحاظ سے "مرتفع" جائز ہو سکتا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

ہر شعر امین اس کا تصویر ہے فرقت کی
تیری یہ غزل گویا ہجراں کا مرقع ہے

سید شمیم ترمذی (رہتک)

ب۔ پچھلی عید کے موقع پر ناچیز نے ایک نظم لکھی تھی۔ اُس کا ایک شعر یہ تھا ؎

دُنیا سے کو پھولوں کے گہنے پہنا کے لا
ساغر کو آج چاند سی دُلہن بنا کے لا

ان دنوں حضرت جوش ملیح آبادی بھی غریب خانہ پر مہمان تھے جب یہ شعر میں نے اُن کو سُنایا تو انھوں نے لفظ "دُلہن" پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ لفظ "گلشن" یا "دامن" کے ہموزن نہیں ہے بلکہ لکھنؤ کے فصحا اسے "چمن" اور "کمن" وغیرہ کا ہموزن قرار دیتے ہیں مجھے کوئی ایسا شعر یاد نہ تھا جو کسی اہلِ زبان کا ہو اور میں سند کے طور پر پیش کر سکوں اس لئے میں نے مجبوراً اپنی شکست تسلیم کر لی۔ میں جوش سے صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ جب "دولہا" یا "دولھا" صحیح ہے تو کیوں نہ "دولھن" کو بھی مطابقہ واو اور بہ اعلان ہائے ہوز صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ جیسے "مالی" اور "مالن" ظاہر ہے کہ آپ "مالن" کو "مَلِن" تو مانا نہیں سکتے بہرحال یہ بحث وہیں ختم ہو گئی۔ آج مارچ ۱۹۴۳ء کے "شاعر" میں صفحہ ۴۴ پر "عروسِ شب" کا مطلع دیکھ کر یہ خیال آیا کہ اس متنازعہ مسئلہ کا فیصلہ ہی کر لینا چاہئے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ شعر یہ ہے ؎

حسنِ ادا سے شب کی دُلہن سنور رہی ہے — ہلکی ہوئی فضائے دلکش نکھر رہی ہے

اب آپ از راہِ کرم میرے سوال کا جواب عنایت فرمائیں اور اگر یاد آ جائیں تو اساتذہ کے کلام میں سے کوئی شعر بھی بطورِ سند پیش کر دیں۔ اگر میرا شعر غلط تھا تو میں اپنی غلطی بخوشی تسلیم کر لوں گا۔

سید ابن الحسن فکر ایم۔ اے (ادارہ "تیج" دہلی)

جواب:-

الف:- تقطیع کے اصولوں میں یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ جب دو ساکن برابر برابر آئیں تو دوسرا ساکن محسوب نہیں ہوتا (۱) "چاک" میں الف اور کاف ساکن ہیں اور "دوست" میں س اور ت اس لئے اعتراض نہیں ہو سکتا (۲) "حجابات" کے بعد چونکہ الف وصل موجود ہے اس لئے اس پر بھی گرنے اور دبنے کا اعتراض نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک سامنے کی بات ہے۔

(۳) صوتی قوافی متقدمین نے استعمال کئے ہیں لیکن آجکل متروک اور معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ سودا کا قافیہ مرتفع غلط ہے۔

ب:- آپ نے جس مسئلہ کے فیصلہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے وہ واقعی اس قابل ہے کہ اس پر توجہ کی جائے میں نے بھی اکثر شعرا کے یہاں "دلہن" بقافیہ گلشن دیکھا ہے لیکن وہ شعرا ایسے ہیں کہ سند میں پیش نہیں کئے جا سکتے۔ آپ نے دلہن کے جواز کے سلسلے میں جو اصول پیش کیا ہے وہ بڑی حد تک قابلِ غور و قبول ہے لیکن اس کا فیصلہ اساتذہ فن ہی کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے بھی مشہور اساتذہ کے دواوین کی چھان بین کی تو مجھے "دلہن" بروزن "گلشن" کہیں نہیں ملا ہاں "دلہن" بروزن "چمن" ضرور ملتا ہے۔ مثلاً حضرت امیر مینائی کا یہ شعر ؎

نہیں پلکوں کی اوجھل میں وہ چتون
دلہن چلمن میں شرمائی کھڑی ہے

اس لئے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید "دلہن" بروزن "گلشن" صحیح نہ ہو۔ میں اس سلسلے میں حضرت نوح ناروی۔ حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت سائل دہلوی۔ حضرت عزیز لکھنوی۔ حضرت ثاقب لکھنوی۔ حضرت نادر گلاؤٹھوی۔ حضرت بسمل شاہجہانپوری۔ حضرت جلیل مانکپوری۔ علامہ سیماب اکبرآبادی اور حضرت تاجور نجیب آبادی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی گرامی آراء سے مطلع فرمائیں۔ **اعجاز صدیقی**

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

دولت اب جلد ہی بِکھی جاتی ہے
پیشانیِ سرکشی جھکی جاتی ہے
آغاز کی فطرت میں ہے تخیلِ انجام
کچھ روز میں یہ جنگ رُکی جاتی ہے

دُنیا کی یہ زندگی ہمیشہ تو نہیں
انسان کا ہستی پہ اجارا تو نہیں
نانے گا حیات کی طنابیں کب تک
ہٹلر ہے کوئی خضرؑ و مسیحاؑ تو نہیں

اک روز بکھر جائیں گے کھیلوں کی طرح
مِل جائینگے خاک میں ذلیلوں کی طرح
شہباز نہ بن سکیں گے یہ طیارے
اُڑتے ہیں جو آسماں پہ چیلوں کی طرح

ہر چند بہارِ گلستاں بھی نہ رہی
وہ نزہتِ شاخِ آشیاں بھی نہ رہی
آمد سے خزاں کی آج خائف ہیں جو لوگ
اک روز سنیں گے کہ خزاں بھی نہ رہی

اس جنگ سے "مسلم" کو سروکار نہیں
وہ کون ہے جو نافرد و بیزار نہیں
ٹرکی۔ مصر و حجاز سب ہیں خاموش
اسلام ابھی شریکِ پیکار نہیں

دُنیا ہے اسیرِ زعمِ خود آگاہی
سائنس نے پھیلائی ہے یہ گمراہی
یہ شورشِ مستقل مٹانے کے لیے
درکار ہے ایک ضربِ اِلّا اللّٰہی

یا د اس کو علاجِ فتنہ و شر نہ رہا
انسان میں باقی کوئی جوہر نہ رہا
اک ہُو میں یہ سلطنے فنا ہو جاتے
دُنیا میں مگر کوئی قلندر نہ رہا

اربابِ فضا شناس روپوش ہیں آج
رہزنِ شمشیر و دشنہ بردوش ہیں آج
جن میں نہیں ظرف شور برلب ہیں وہی
جو واقفِ اسرار ہیں خاموش ہیں آج

شاید گذرا ہو کوئی ایسا عالم
سرگشتۂ اندیشہ ہے سارا عالم
کہنے بنتی ہے کچھ نہ چپکے رہتے
گویا ہے عجیب گومگو کا عالم

دُنیا، مری زندگی رہی مشغلۂ غم
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سیماب

شخصیات:-

جناب افسر احمد نگری

نقادانِ ادب کا خیال ہے کہ تقلیدی شاعری کا دَور ختم ہو گیا اور اب وہی شاعر سلسلۂ ادب پر چمک سکتا ہے جو اپنے کلام میں کوئی خصوصیت اور انفرادیت پیدا کر سکے۔ موجودہ تنقیدی زاویوں کے مطابق انفرادیت ضروری ہے اور بعض کے نزدیک وہ کامیاب شاعر ہی نہیں جو اپنے لئے ایک علیحدہ راہ پیدا نہ کر سکے۔ تنقید کے اس نظریہ سے اتفاق ہے لیکن میں اُس انفرادیت کا قائل نہیں جو ادب و شعر کے اجتماعی اور مسلّمہ اصولوں کو ٹھکرا کر بے راہ روی کی حد تک پہونچ جائے۔

تقلیدی شاعری کا اطلاق زیادہ تر اُس غزل پر ہوتا ہے جو پہلے ادوار کے متغزلین کو سامنے دیکھ کر کہی جاتی ہے یعنی جس میں ہجر و وصال، بوس و کنار، زلف و رخسار، گل و بلبل، شیخ و واعظ پر تبرّا اور سوقیانہ مذاق کی ترجمانی ہو یا یوں کہئے کہ صرف قافیہ پیمائی کے لئے یا زبان و فن کی چاشنی سے لطف اندوز کرنے کے لئے شعر کہا جائے مگر جن شعرا نے تغزل میں واردات و جذبات کو بھی شامل کر دیا ہے جن کے یہاں محسوسات کا نام شاعری اور حسیات کا نام غزل ہے۔ ان پر تقلید کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ شاعر بڑی حد تک انفرادیت ہی کے حامل ہوتے ہیں۔ انفرادیت کی ایک شان اور بھی ہے اور وہ یہ کہ کوئی شاعر شباب کا افسانہ خواں بن گیا تو کسی نے صرف غم کی ترجمانی کی۔ ایسے شاعروں کو دُور سے پہچانا جا سکتا ہے۔

آج جس شاعر کا شخصیات کے صفحات میں ذکر ہو رہا ہے اُسکی شاعری پر بھی تقلید کا گمان ہوتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے وہ مقلد ضرور ہے لیکن اسکی انفرادیت اُس کے کلام سے نمایاں ہے۔ غزل سے قطع نظر موجودہ شاعری کے میلانات اور رجحانات اتنے وسیع ہو چکے ہیں کہ انکا احاطہ مشکل ہے آج ہماری شاعری زندگی کے ہر شعبہ کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور بہ اعتبارِ موضوع اُس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر موجودہ شاعری شاعری کو چار طبقات میں تقسیم کیا جائے تو رومانیت، وطنیت، سیاسیات اور اخلاقیات کے تحت تمام خیالات آ سکتے ہیں [illegible] ہے کہ قومی شاعر [illegible]

بنائے گا اور کپیل سلاف کو۔ وطنی شاعر وطن والوں کو اُبھارنے کی کوشش کریگا جنکی نظروں میں ذات پات کی تمیز بے معنیٰ ہوگی۔ وہ اُس کی فلاح و بہبود کے لئے لائحۂ عمل پیش کریگا۔ سیاسی شاعر موقع اور محل کے مطابق حکومت پر تبصرہ کریگا۔ نظم و نسق پر کڑی نگاہ رکھ سکے گا۔ اخلاقی شاعر پند و نصائح کے علاوہ اور کیا کہے گا۔ رہا طرزِ بیان کا سوال تو اس میں مماثلت ہو ہی جاتی ہے۔ جہاں حالی کی قومی شاعری کا دوسرے شعرا نے اپنے جذبات کے ساتھ اتباع کیا وہیں اکبر کی اصلاحی اور اخلاقی شاعری بالکل انھیں کے رنگ میں اکثر شعرا نے کی۔ جوش کے بعد آنے والے شعرا بلا شبہ کوشاں ہیں کہ وہ جوش کی انقلابی شاعری کا اتباع کریں۔ احسان دانش کی تقلید میں افلاس اور سرمایہ داری کا رونا اور بھی بہت سے شعرا رو رہے ہیں۔ سیماب کی سنجیدہ شاعری کا تتبع ہندوستان کی ایک بڑی جماعت کر رہی ہے اور اس کا بڑی حد تک امکان ہے کہ ہندوستان جوش، سیماب اور احسان وغیرہ کے رنگ کے دوسرے شاعر پیدا کرلے جب حسرت موہانی کو میر کا، اصغر گونڈوی کو میر درد کا، فانی کو غالب اور مومن کا اور جگر کو داغ کا نقشِ ثانی بتایا جا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس دَور کے شعرا کے حقیقی نسبیں پیدا نہ ہوں خواہ وہ باندازِ مختلف اپنے خیالات کی پینگیں بڑھائیں یا بالکل انھیں کے نقشِ قدم پر چلیں مگر اُن پر یہ الزام عائد نہیں ہو سکتا کہ وہ کورانہ شاعری کے مقلد ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ کسی شاعر کا تتبع نہیں کرتے بلکہ شعبہ ہائے حیات سے وہ اسکے متاثر ہیں کہ کسی طرح زندہ اور حیات بخش شاعری کے دائرے سے نکل ہی نہیں سکتے۔



افسر احمد نگری

افسر احمد نگری بھی ہندوستان کے ایک عظیم المرتبت شاعر کامیاب اور نہایت مقبول ہیں افسر کا نام عبدالغفور اور والد کا اسم گرامی مولوی محمد فضیل ہے [illegible] ۱۹۲۳ [illegible] (منگل) دکن میں پیدا ہوئے چونکہ آپ کے والد [illegible]

پندرہ سال کی عمر ہی میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ یہ اخترؔ کی ذہانت و فطانت کی پہلی مثال ہے۔ افسوس کہ ۱۹۳۵ء میں اُس کے والد کا انتقال ہوگیا اور تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ مگر بقول اخترؔ۔ اگر اسکول اور کالج کے دروازے بند ہوگئے تو کیا دل و دماغ کی کھڑکیاں تو کھلی ہوئی تھیں۔ اخترؔ نے مطالعہ کیا اور خوب کیا۔ بلند مرتبت شعرا، ادبا اور فلاسفہ کے اقوال و ارشادات کو اُس نے اپنے سینے میں بھر لیا مگر غیر شعوری طور پر لیکن جب شعور پیدا ہوا تو یہ آتش فشاں پھٹا اور نظم کی راہوں سے اس کا گرم مادہ بہنے لگا۔

اخترؔ کو ذوقِ شعری ورثے میں ملا ہے۔ اُس کے دادا فقیر محمد تیغؔ اور چچا سلیمان خاں آوجؔ سرزمینِ احمد نگر کے اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ اُس کا شاعر ہونا تو تعجب سے نہیں لیکن اُس کا رنگِ سخن یقیناً حیرانیوں کا باعث ہے صرف ۴ سال میں کسی شاعر کا اپنے لئے مخصوص مقام پیدا کر لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اخترؔ کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ ابتداً اُس نے بھی سب کی طرح غزلیں کہیں لیکن کس رنگ کی؟ اُس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے ؎

میرے نغموں سے ہے یہ گرمیٔ ہنگامۂ سرِ دوش	کیا مزہ ہو جو مری خاک پریشاں ہو جائے
خوابِ رنگینیٔ آزادی کی تعبیر نہ پوچھ	خندہ زن مجھ پہ نہ ہر ذرۂ زنداں ہو جائے
دُور ہے منزلِ ادراکِ حقیقت اخترؔ	دل نہ ہنگامۂ باطل سے پریشاں ہو جائے
میری ان مستی بھری آنکھوں میں اے لیلیٔ جمال	رقص فرما رازِ عمرِ جاوداں ہے اور میں
دشت سے لایا ہوں اے اخترؔ جنونِ تیز گام	وسعتِ عالم بقدرِ یک فغاں ہے اور میں

یہ اشعار بغیر کسی انتخاب کے پیش کر رہا ہوں۔ اخترؔ کی ابتدائی غزلیں اسی قسم کے تغزل کی حامل ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اخترؔ کے ذوقِ شعری کو ابھارنے میں جہاں فطرت کا ہاتھ ہے وہیں اُس کی دقت پسند طبیعت کا تقاضا بھی ہے اِسی ابتدا ہی سے کہنہ و فرسودہ راہِ سخن اختیار نہ کی۔ غزل میں بھی بجائے تغزل کے تفکر پایا جاتا ہے اس کے باوجود وہ بہت جلد تنگنائے غزل سے اکتا گیا، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اخترؔ علامہ اقبالؒ اور غالبؔ کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس کے شب و روز ان ذو معنی اور عدیم المثال شاعروں کے کلام کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے میں صرف ہوتے تھے۔ اسی دوران میں علامہ سیمابؔ کے کلیاتِ نظم و غزل سے بھی ذوقِ مطالعہ آشنا ہوا۔ اخترؔ نے تینوں شعرا کی جداگانہ راہوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنے ذوق و وجدان کے ایما سے علامہ اقبال مرحوم کے رنگ کا نشتر اپنے دل میں چبھو لیا۔ اب اُس کے سامنے ایک نئی راہ تھی اور اتنی دشوار گذار کہ جس میں اچھے اچھے کھو جائیں۔ چنانچہ وہ بھی بھٹکا اور اتنا کہ علم تجربے کی لگا۔ فطرت نے پہلا بھی اس کا ساتھ دیا اور اُس نے اپنی رہبری کے لئے علامہ سیمابؔ کو منتخب کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی ماہ میں گمراہی کے بادل چھٹ گئے اور دلوں [illegible] آزاد کے اخترؔ کا کلام رسائل میں بحکم خدا شائع ہوا [illegible] شاعروں میں بھی شریک نہیں ہوتا اور نہ اُس میں ابھی خود اپنے پروپیگنڈے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے۔ ایک ذاتی مکتوب کے ذریعہ مجھے اخترؔ کے نصب العین کا علم ہوا [illegible] اس کا ہر دو چاہتا ہے کہ اپنے رنگ اور مذاق کی پختگی کے بعد پیدا ہوگا

تابانیوں کا مطلع انوار ثابت ہو۔ بہر حال اب تک اخترؔ کا جتنا کلام شائع ہوا ہے اور جو کچھ میرے پیشِ نظر ہے اس سے ابھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کی منزل کیا ہے اور وہ مستقبل میں کن رفعتوں کا حامل ہوگا ابھی اُس کے تجربات کسی حد تک خام ہیں مگر وہ اتنی تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے کہ منزل رسی کا یقین ہو جاتا ہے ہو سکتا ہے کہ اخترؔ اپنا کمالِ فن ثابت نہ کر سکا ہو بلکہ اُس کا کلام علامہ اقبالؒ کی صدائے بازگشت ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس رنگ کو اپنی شاعری میں سمونے کی قدرت رکھتا ہے یا نہیں۔ اخترؔ کے کلام پر علامہ اقبالؒ کے رنگ کا پورے طرح دھوکا ہوتا ہے۔ اخترؔ کی شاعری کا محور اور مرکز اقبالؒ ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ اس میں نئے خیالات دیکھنے ہی نہ ملتے ہوں۔

حقائق و معارف اس کی شاعری کا جزوِ اعظم ہیں۔ عربی اور فارسی کے بلند الفاظ، مشکل تراکیب اور لیوانی کے ساتھ ساتھ ترتیبِ بیان و زبان کا بھی وہ بہت زیادہ خیال رکھتا ہے۔ یہ قطعات دیکھئے ؎

کربلائے مقدس

ہے کربلائے مقدس کے ذرے ذرے پر	ربابِ دل کے لئے آزمائشِ صد سوز
سوادِ گلشنِ ماضی میں گرمِ سیر ہوں میں	نگاہِ شوق! مبارک ہو عشرتِ نوروز

حق و باطل

کشاکشِ حق و باطل سے بے نیاز ہے تو	تری خرد کو گوارا ہے ربطِ شیشہ و سنگ
نہ پوچھ مجھ سے حریفانِ تشنگی کا مآل	ہنوز جلوۂ آبِ فرات ہے بے رنگ

آتشِ نمرود

ابھی ہے ماہ و کواکب کو انتظارِ حسین	اگرچہ برق بہ داماں ہے آسمانِ کبود
یزیدیوں کی جفاؤں سے تو ملول نہ ہو	فروغِ عشق کا باعث ہے آتشِ نمرود

مسلکِ شبیرؓ

خودی کے نے میں ابھی نغمۂ حجاز نہیں	اسی لئے تو ہے وحدت سے بے تہی یہ ایاغ
اگر عزیز نہ ہو مجھ کو مسلکِ شبیرؓ	خدائے عشق بجھا دے مری نفس کا چراغ

اخترؔ اقبال کی خودی کا پجاری اور سچا پرستار ہے وہ بھی اقبال کی طرح جگہ جگہ خودی کی تفسیر بیان کرتا ہے اس کے یہاں بھی عزم و یقین کی منزل وہی ہے جو اقبالؒ کے یہاں ہے وہ بانیٔ اسلام کی تعلیم اور اسلام کے حقیقی خدوخال کو نمایاں کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہتا ہے۔ اور ان کوششوں میں اُمید کی ایک ایسی جھلک نظر آتی ہے کہ گویا ہندوستان دوسرا اقبال پیدا کر رہا ہے۔

عرفانِ وجودی جس کا ہو آئینِ مسلم	وہ قوم ہے لادینی افکار سے آزاد
محروم ہے تو جوہرِ فیضانِ یقیں سے	معراجِ خودی میں نہیں اندیشۂ میعاد

خودی کی موت سے ہوتی ہے پرورش اُس کی	وہ اختلال کہ ہیں جس میں اُمتوں کے مزار
یہی ہے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ	کہ نہیں [illegible] خودی ہو استوار

یقین و عزم کتابِ خدا کی تفسیریں [illegible]
[illegible]

بادۂ صافی

یہ حرم، وہ بتخانہ، کس سے انحرافی ہے؟ — ایک ہی حقیقت ہے، صورت اختلافی ہے
دیکھکر یہ محشر میں، مجرم اعترافی ہے — رحمتیں پکار اُٹھیں درخورِ معافی ہے
عشقِ بے زباں سے وہ آشنا نہیں شاید — لطفِ بے محل انکا مائلِ تلافی ہے
ہم اور اُس ستمگر سے شکوۂ جفا کرتے! — شکوۂ جفا شانِ عشق کے منافی ہے
دُرد، یا مئے باقی، کچھ تو کر عطا ساقی — تیرے دستِ نازک سے جو ملے وہ کافی ہے
ابر بنکے چھائی ہے رحمتِ تمام انکی — جتنی پی سکے پی لے، آج کی معافی ہے
شکوۂ جفا سُن کر مسکرا کے فرمایا — بات؟ تو نہیں کچھ بھی تیری مُو شگافی ہے
خود بنا کے نقشِ اُنکے، التجا، دُعا، سجدے — خلوتِ تصوّر کا رنگِ اعتکافی ہے
ہستیاں مٹانے کو، موت کے بہانے کو — زندگی ہی کافی تھی عشق تو اضافی ہے

بادۂ محبّت کا اے نثار کیا کہنا
بدمزہ سہی لیکن ہر مرض میں شافی ہے

نثار اٹاوی

شبستانِ محبّت

پھر زینتِ آغوش ہے وہ جانِ محبّت — فردوس بداماں ہے شبستانِ محبّت
ہر سانس ہے اب سلسلہ جنبانِ محبّت — ہر اشک میں ہے موجۂ طوفانِ محبّت
سَو بار اُٹھی شورشِ طوفانِ محبّت — چھوٹا نہ مگر ہاتھ سے دامانِ محبّت
ہر گوشے میں کونین کے اسرار نہاں ہیں — دیکھے تو کوئی وسعتِ دامانِ محبّت
رہ رہ کے مرے دل میں کھٹکتا ہے جو ہر دم — ارمانِ محبّت ہے کہ پیکانِ محبّت
فردوس گری اُن کی تمنا کی نہ پوچھو — سر تا بقدم دل ہے گلستانِ محبّت
میں اور کروں اُن سے تغافل کی شکایت — یہ شانِ محبّت ہے نہ شایانِ محبّت
دل میں ہے ترا درد، زباں پر ہے ترا نام — وہ جانِ محبّت ہے یہ ایمانِ محبّت

کیا اور کہوں اُن کی نگاہوں کا فسانہ
اب تک مرے سینہ میں ہیں پیکانِ محبّت

[illegible]

اصغر کے صنّاعِ خطوط

"شاہجہاں بادشاہ (۱۰۳۷ — ۱۰۶۹ھ) کا عہد اُردو کے لئے مبارک عہد تھا۔ اس عہد میں اُردو زبان بات چیت سے گذر کر خط وکتابت تک ترقی کر چکی تھی یہاں تک کہ خود بادشاہ بھی ضرورتاً اسی زبان میں خط وکتابت کیا کرتے تھے جس زمانہ میں شجاع اور اورنگ زیب برسرِ پیکار تھے تو شاہجہاں نے ایک شقہ شجاع کو لکھا یہ شقہ کسی طرح اورنگ زیب کو مل گیا اور اس کی بنیاد پر اورنگ زیب نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس میں لکھا ہے"۔

"آں فرمان عالی کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی است (دستور العمل آگہی)[1]

صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں ایک جگہ لکھا ہے" شاہجہاں کا دستی اُردو خط جو دارا کے نام ہے وہ میری نظر سے گزرا ہے۔

عہدِ اورنگ زیب میں اُردو ہندی الفاظ کا لغت غرائب اللغات مدون ہوا۔ قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی نے اس پر نظرِ ثانی کی بہت سے الفاظ اور معنی اضافہ کئے۔ غلطیاں درست کیں اور اسے نوادر الفاظ کے نام سے موسوم کیا

۱۱۰۲ھ میں میر مہدی خاں نے مرآت المستہلین اور عبد الغنی بن جمال الدین (۱۱۱۳ھ) نے روضہ کرم اور محمد نجیب امیٹھوی (۱۱۲۳ھ) نے رسالہ نجیبی لکھا۔ مرزا محمد خاں دہلوی نے ۱۱۲۵ھ میں تحفۂ ہند مرتب کی۔ شاہ عزیز اللہ نے ۱۱۴۳ھ میں تفسیر چراغِ ابدی لکھی۔[2]

محمد شاہ کے عہد (۱۱۳۷ھ) میں مہاراجہ سوائی جے سنگھ جے پوری نے دہلی میں عظیم الشان رصد (جنتر منتر) کی تعمیر شروع کی۔ علمائے ہندسین کی جماعت قائم ہوئی۔ مرزا خیر اللہ امیرِ جماعت تھے فنِ ہیئت کے رسائل کے ترجمے ہوئے۔ شرح چغمینی کا ترجمہ ہندی (اُردو) میں کیا گیا

وَقَدْ نَقَلَ العُلَمَاءُ الّا	ہندوستان کے علمائے جے سنگھ کے
هَاهُنَا بِأَمْرِ جَی سنگ شرح	حکم سے شرح چغمینی وغیرہ کتابوں کے
الجغمینی وَغَیْرِهٖ مِنْ کُتُبِ الهیئة	جو علم ہیئت اور ہندسہ میں تھی
والهندسة مِنَ العربیة إلی	عربی زبان سے ہندی زبان میں
الهندیة[3]	ترجمہ کیا۔

محمد شاہ کے عہد میں ہی میر فضل نے کربل کتھا (۱۱۴۵ھ) لکھی یہی وہ وقت تھا کہ آگرہ سے انسان کے بعد آبرو۔ مضمون۔ آرزو۔ مظہر۔ میر کے بعد دیگرے دلی پہونچے ان کے جاتے ہی ان کے خاندان والے بھی دہلی چلے گئے۔

میر محمد حسین کلیم بھی آگرہ کے تھے جو سجاد کے بعد دلی گئے اور وہیں کے ہو گئے میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرہ شعرا میں لکھا ہے۔

میر محمد حسین کلیم جوان محمد شاہی گندم گوں دراز قد بود بامیر تقی قرابت قریبہ دارد۔ در فنِ شعر و شاعری استادِ سخن بحرِ زخارِ طبعش در نثر و نظم موجزن رسالہ در عروض و قافیہ ہندی تصنیف نمودہ و فصوص را کہ کتاب عربی ست بزبانِ ریختہ ترجمہ کردہ کتابے در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ در شاہجہاں آباد بہ رحمتِ الٰہی پیوست۔

یہ فصوص الحکم کا ترجمہ احمد شاہ کے نابینا کئے جانے کے بعد لکھی گئی ہے۔

(نمونہ) :—

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو
بغیر ایسی دولت سے زنہار زنہار فاعتبروا یا اولی الابصار"

میر و سودا کے معاصر شوق شیخ الٰہی بخش اکبر آبادی تھے انہوں نے بھی ایک کتاب اُردو میں تصنیف کی۔ نصر اللہ خاں فخر اپنے تذکرۂ شعرا میں لکھتے ہیں:—

"شوق تخلص شیخ الٰہی بخش اکبر آبادی سخن ور و نور دوادی ایں فن کتابے لعف تصنیف کردہ بجلکشِ شوق بجہاں آباد رسید و برسمِ ارمغان پیشکش شاہ کرد۔ وفاتش در سن ایک ہزار دو صد و چہل و یک ہجری (۱۲۴۱) اتفاق افتاد"۔

---

[1] اُردوئے قدیم صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۲ [2] "یو۔ پی میں اُردو" مرتبہ انتظام اللہ شہابی (کتوبلی) [3] سبحۃ المرجان صفحہ ۱۲۵

پھر تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علامہ حکیم محمد شریف خان دہلوی نے ترجمہ کلام مجید کا اُردو میں کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد نوطرز مرصع میر عطا حسین تحسین نے لکھی اور مولانا شاہ عبدالقادر نے ترجمہ قرآن مجید کا سنہ ۱۲۰۵ھ میں کیا۔ حکیم غلام امام اکبرآبادی نے سنہ ۱۲۰۹ھ میں ترجمہ چہل حدیث کا کیا اور سنہ ۱۲۰۷ھ میں منتخب النجوم کتاب لکھی۔

انھیں ایام میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور انگریزوں کو اُردو سکھانے کے لئے ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے نثر اُردو میں متعدد کتابیں لکھوائیں۔ اس کے بعد نثر نویسی کو رواج عام حاصل ہو گیا[۱]۔

سنہ ۱۸۴۳ء میں اگرہ کالج سے متعلق اگرہ بک سوسائٹی قائم ہوئی جس کی جانب سے ترجمہ شائع کئے گئے۔ ہیئت و سائنس کے رسائل مرتب ہوئے۔ سید محمد میر لکھنوی اور محمد فتح اللہ خاں اکبرآبادی سوسائٹی کے رکن اعلیٰ تھے۔

شاہزادہ جیش معتمد مسٹر جانس کا ترجمہ اقلیدس ہیئت کے رسالہ کا ترجمہ متذکرہ حضرات کا کیا ہوا راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

پنڈت ہیرالال اکبرآبادی نے سنہ ۱۸۴۲ء میں خلاصہ نظام آسمانی لکھا۔ اور میر واجد علی نے دریائے لطافت کے مقابلہ میں گلدستہ انجمن لکھا اور مطلع العلوم شمس العلوم (انسائیکلوپیڈیا) کا ترجمہ کیا

مولوی کریم الدین اکبرآبادی نے سائنس کی کتاب کا ترجمہ رسالہ کہربائی کے نام سے کیا جو سنہ ۱۸۵۲ء میں طبع ہوا۔ ڈاکٹر اشرف علی نے کمسٹری پر مبسوط کتاب لکھی[۲]۔ اگرہ میں علمی کتب بیش از بیش ترجمہ و تصنیف و تالیف ہوئیں۔

سنہ ۱۸۳۴ء میں محمد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ میں رصدخانہ زیر نگرانی مسٹر ولکاکسر قائم ہوا۔ مہتمم صاحب کی اعانت سے مولوی عبدالرب اکبرآبادی نے مسٹر بین کی کتاب مساحت کا ترجمہ انگریزی سے کیا[۳]۔ مولوی صاحب کی ایک تالیف علم ہندسہ پر بھی ہے۔

نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ کے وقت میں حکیم فرکیوسن کے اصول علم ہیئت کا ترجمہ مرحوم نے بوسیلہ عبدالسلام لکھنوی اُردو زبان میں کیا جو سنہ ۱۸۳۹ء میں مفتاح الافلاک کے نام سے شائع ہوا۔

خط و کتابت

اُردو نثر کی تدریجی ترقی کی داستان سامنے آچکی ہے نامہ و پیام کی ابتدا تمام شرفا کیا ہندو کیا مسلمان سب ابتدائی یا خانہ ساز فارسی میں ہی خط و کتابت کیا کرتے اور اس کو سرمایہ لیاقت سمجھتے تھے بسنہ ۱۸۲۲ء کی حضرت بیخبر کی خانگی خط و کتابت صرف اُردو میں نظر آتی ہے۔

پروفیسر حامد حسن قادری داستان تاریخ اُردو میں لکھتے ہیں:—

"خواجہ بیخبر نے۔ اُردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کی طرف سنہ ۱۸۲۶ء میں توجہ کی یعنی غالب سے بھی کچھ پہلے۔ تقریظوں میں بیخبر کا بھی وہی رنگ ہے جو اس زمانہ میں مقبول تھا ... لیکن اردو قسم کی نثر میں اس سے بہتر و سلیس ترکیبیں ہیں"۔

مگر بیخبر کے خطوط دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح مرزا غالب کے یہاں جدید طرز نے ترقی پائی وہی حال بیخبر کا ہے۔ بیخبر کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ مگر مولانا حالی سے شاگرد بیخبر کے کہاں تھے جو چرچا ہوتے بڑھاتے۔ غرضکہ اُردو میں نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا مرزا غالب نے وہ رنگ اختیار کیا جو مرزا کا کمال کہلایا۔ پھر تو معاصرین نے توجہ کی اور صاف اُردو سلیس بول چال کا عمل و دخل مراسلات میں آگیا۔

اُردو میں انشائیں لکھی جانے لگیں۔ مولوی قمرالدین خاں اکبرآبادی نے سہ نثر ابوالفضل کے انتخاب کا ترجمہ کیا۔ مفتی انعام اللہ ساحر گوپاموی ثم اکبرآبادی نے انشاء خلیفہ کا ترجمہ کیا۔

مولوی غلام امام شہید کی انشاء بہار بیخزاں کی عام شہرت ہے۔ پھر تو خطوط کے مجموعہ مرتب ہونے لگے۔ مرزا غالب کے خطوط کا مجموعہ منشی عبدالغفور سرور مارہروی نے "مہر غالب" منشی غلام غوث بیخبر خان بہادر ذوالقدر نے "عود ہندی" کو ترتیب دیا۔ "اردوئے معلیٰ" "فغان بیخبر" وغیرہ مجموعہ مکاتیب شائع ہوئے۔ اسی زمانہ میں مرزا رجب علی بیگ سرور کے مقابلہ میں سید اصغر علی اصغر اکبرآبادی نے عشقیہ خطوط کا مجموعہ تیار کیا جو اپنی صنعت کے لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔ عبارت کا طرز وہی ہے جو اس عہد کا ہے۔

انتظام اللہ شہابی

سوانح حضرت اصغر اکبرآبادی

نام و نسب | سید اصغر علی ابن سید ارشد علی اکبرآبادی شرفائے اگرہ سے تھے۔

---

[۱] اُردوئے تعلیم صفحہ ۲۲ [۲] یو۔پی میں اُردو مرتبہ انتظام اللہ شہابی [۳] راقم سطور کے کتب خانہ میں ہر دو کتب موجود ہیں

خاندانی حالات آپ کے مورث اعلیٰ شیخ احمد مشہور امیر تیاں چشتی عہد جہانگیر میں وارد آگرہ ہوئے۔ امارت کے ساتھ فقر بھی تھا۔ ہر وقت مصلے کے سامنے آگ روشن رہتی۔ نماز پڑھا کرتے۔ اسی سے تپاں مشہور ہوئے[۱]۔ دوسری طرف لنگر جاری رہتا۔ یہ حضرت شیخ نظام نارنولی کے مرید خاص تھے ۱۰۴۱ھ میں وصال ہوا۔ وزیر پورہ میں دفن ہوئے[۲]۔ آپ کے ایک بھائی شیخ محمد احمد بھی تھے جن کا مزار درگاہ شاہ ابوالعلاء[۳] کے احاطہ میں ہے۔

شیخ کی اولاد میں نام آور بزرگ میر تفضل حسین تھے جن کے بھائی سید ارشد علی تھے۔ میر تفضل حسین پٹیالہ میں ملازم تھے اور سید ارشد علی تحصیلدار ہو گئے تھے۔ جنہوں نے عمر کا بیشتر حصہ عیش و عشرت میں بسر کیا۔

پیدائش سید اصغر علی یکم ربیع الثانی سنہ ۱۲۵۶ھ بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ علمائے عصر سے رسمی تعلیم پائی۔ تعلیم و تربیت میر تفضل حسین کے آغوش میں ہوئی۔ بعد شعور سے جناب اصغر پٹیالہ چلے گئے وہیں میر تفضل کے ذریعے دربار پٹیالہ میں منسلک ہو گئے۔ ترقی کرتے کرتے مہاراجہ مہندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کی پیشی میں آ گئے اور میر منشی کہلانے لگے۔

علمی شوق جناب اصغر کو کتب بینی کا شوق غالب تھا جملہ فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے ادب سے دل لگاؤ تھا۔ فسانۂ عجائب رجب علی سرور اکبر آبادی کی ان کے ملاحظہ سے گذری۔ خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر وزیر اعظم پٹیالہ کی فرمائش سے اس کے مقابلہ میں گلشن جانفزا سنہ ۱۲۸۱ھ میں تصنیف کی[۴]۔

آگرہ آئے تو مفتی اکرام اللہ شہابی گوپاموی صاحب تصویر الشعراء سے ملنے گئے وہ اس زمانہ میں بوستانِ خیال۔ میر تقی کا خلاصہ کر رہے تھے۔ دوران گفتگو میں "مہدی نامہ" کا ذکر آیا میر اصغر علی کہنے لگے مفتی صاحب آج بھی مثل بوستانِ خیال کے داستان جامع لوگ لکھ سکتے ہیں بات آئی گئی ہوئی۔ چند سال بعد پھر اتفاق ملاقات باہمد گر ہوا تو ایک جلد "فسانۂ منصور الزماں" پیش کی اور فرمایا سات دفتر اس کے مرتب ہو چکے ہیں۔ ایک بیسہ مطبوعہ ہے بقیہ مسودات کی صورت میں موجود ہیں۔ مفتی صاحب نے تقریظ و تاریخ منصور الزماں کی لکھی ہے۔

اخلاق و عادات اصغر خلیق متواضع تھے۔ ہر کہ و مہ سے محبت سے پیش آتے آگرہ آتے تو اپنے اعزا اور احباب کے یہاں گھر گھر جاتے اور تحفہ تحائف پیش کرتے۔

حلیہ و لباس دُبلا پتلا بدن متوسط قد سانولا رنگ۔ پٹے سر پر رکھتے تھے۔ اچکن پہنتے تنگ چوڑی دار پاجامہ۔ نیچا کرتہ۔ چوگوشیا ٹوپی عموماً اور باتخصوص پٹیالہ کے رواج کے بموجب صافہ باندھتے تھے۔ بتلی چھڑی ہاتھ میں رہتی تھی۔

تصانیف و تالیف راجہ صاحب کے خانگی جھگڑے کی تندیر اصغر علی کی ملازمت ہوئی۔ یہ وطن لوٹ آئے لکھنے پڑھنے کا شغل تمام عمر رہا۔ "لمعاتِ اصغری"۔ "شورش عشق" "مثنوی میر حسن" دہلوی کے طرز پر ظفر بیگم مثنوی لکھی۔ میرے محترم دوست ادیب العصر منشی لطیف الدین احمد صاحب مثنوی کے محاسن شعری پر ایک علمی مقالہ بھی مرتب کر رہے ہیں۔ اکثر فنون پر رسائل لکھے۔ تاریخ زی ولڈ گرانی۔ بوقلمون مشہور ہیں۔ مفتاح الفرائض۔ نیرنگ فرنگ۔ گنج بے رنج۔ ہدیہ شائقین وغیرہ تقریباً ۲۰ کتب تصنیف و تالیف سے ہیں۔

احباب آپ ملنسار اور کثیر الاحباب تھے۔ مولوی ابوالحسن فتحپوری۔ خان بہادر ڈاکٹر وزیر الدین۔ ڈپٹی وقار علی بیگ۔ ڈپٹی نثار علی بیگ۔ خان بہادر مولوی نصر اللہ خاں صدر الصدور۔ منشی سید نظام علی خاں منصف۔ ڈاکٹر مولوی الہام اللہ شہابی۔ مولوی مظفر علی شاہ جعفری القادری مولوی محمد رضا وکیل شکوہ آبادی۔ قاضی باسط علی حضرات سے راہ و رسم تھی۔

شاعری اس زمانہ میں آگرہ شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا۔ آنکھ کھولی تو شعر و شاعری کے چرچے ہر طرف موجود تھے ان کے مکان واقع محلہ مکھوں گلی کے قریب ہی منشی سید نظام علی خاں منصف متخلص افضل اکبر آبادی کا دولت خانہ تھا جہاں ہر ہفتہ محفل مشاعرہ ہوا کرتی۔ مفتی انعام اللہ انعام لعبیدہ ساحر کے یہاں نیل کھانہ ماہانہ مشاعرہ ہوا کرتا۔ راجہ مرزا قمر کے یہاں تو روزانہ ہی بعد نماز عشاء مجلس احباب منعقد ہوا کرتی جہاں شعر و شاعری کے چرچے رہتے۔ جناب اصغر بھی شریک مشاعرہ ہوتے۔ ہر علمی صحبت میں بیٹھتے۔ علمی ذوق تو تھا ہی شاعری سے بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ فکر سخن کرنے لگے غزل گوئی میں کمال پیدا کر لیا قصہ کی طرف توجہ کی مگر مثنوی لکھنے میں صاحب کمال تھے شعر و شاعری میں کسی استاد کے رہین منت نہ تھے جس طرح اردو میں نتیجہ فکر ہے ایسے ہی فارسی میں بھی ہے۔

وفات اکتالیس[۴۱] برس کی عمر ہونے پائی تھی کہ اصغر آخرت اختیار کیا ۱۲۹۷ھ میں وفات پائی "آہ اصغر" مادۂ تاریخ ہے۔ ناشر تصحیح حسین اصغر

---

[۱] گلزار ابرار غوثی [۲] تذکرہ مشاہیر اکبر آباد صفحہ ۶۲ [۳] تتمہ تصویر الشعراء از مفتی اکرام اللہ شہابی گوپاموی [۴] گلشن جانفزا صفحہ ۸

اور اہلیہ مولوی استقامت علی امام مسجد تاج یادگار رہے تھے۔ سید وجاہت علی وجاہت مرحوم جناب اصغرؔ کے نواسے تھے۔

کلامِ اُردو

مرنے سے محبت کا اثر جائے تو جائے   یہ درد کوئی جی سے گذر جائے تو جائے
ناصح تو مرے ساتھ نہ کر صغرؔ کو خالی   عادت یہ جبیں سائی کی مر جائے تو جائے
پہ بعدِ فنا زلزلۂ تربت اصغرؔ   دو پھول وہ خود آن کے دھر جائے تو جائے

دل میں جا جا کے خیالِ بتانِ ہند   دانستہ میں نے کعبہ کو مندر بنا دیا
یکتائیِ جمال کا دعویٰ غلط ہوا   آج آئینہ نے ان کو دو پیکر بنا دیا
کر کر کے ذکر کاکلِ پیچاں کا رات دن   سودائی ہم کو آپ نے اصغرؔ بنا دیا

دل عبرالامکاں تھا ولیکن ہزار حیف   آہوں نے اُس کو گنبدِ اخضر بنا دیا
لایا تھا میں تو چھین کے ایماں کو زلف سے   کمبخت دل نے جا کے وہاں گھر بنا دیا
چھینٹے لہو کے دامنِ قاتل پہ ڈال کے   خود ہم نے اپنے خون کا محضر بنا دیا
گو پہلے پارسا تھے مگر اب نہیں رہے   کافر ہمیں بھی عشق نے اصغرؔ بنا دیا

جلے جو اپنی خاطر اس پہ جلنا کچھ نہیں مشکل   وہ دیکھو شمع پر کس شوق سے پروانہ آتا ہے
حرم کا راستہ معلوم ہے مجھ کو مگر زاہد   خیالِ حرمتِ دیرینہ رہنما نہ آتا ہے
مجھے مدت ہوئی توبہ کئے لیکن مگر اب بھی   بگڑ جاتا ہے دل جب سامنے میخانہ آتا ہے

دکھلائیں گے ہم سینۂ بے کینہ کے جوہر   تم تیز اگر خنجرِ فولاد کرو گے
باتیں بھی تو کچھ آپ کی شیریں نہیں ناصح   پھر خاک علاجِ دلِ فرہاد کرو گے
یک قطرۂ خوں ہے سو تہِ نوکِ مژہ ہے   ہم دل ہی نہیں رکھتے جو بیداد کرو گے
اے چارہ گرو وصل ہی قسمت میں نہیں ہے   کیا خاک علاجِ دلِ ناشاد کرو گے
تصویر بھی تصویر سے ہو گی نہ بغل گیر   تم لاکھ اگر منتِ بہزاد کرو گے
کیا شور ہے اے تازہ اسیرانِ محبت   بدنام کہیں خانۂ صیاد کرو گے
کس ناز سے کہتے ہیں وہ منہ منہ کو ملا کر   کس منہ سے تم اب شکوۂ بیداد کرو گے
اصغرؔ دلِ ناشاد لگانا نہ کسی سے   پچھتاؤ گے ورنہ ہمیں پھر یاد کرو گے

داغِ جنوں سے جسم مرا لالہ زار ہے   ہاں موسمِ خزاں میں بھی فصلِ بہار ہے
کیسی خلش ہے یہ ذرا خنجر تو لائیو   دیکھوں تو میرے سینہ میں دل ہے کہ خار ہے[۱]

فارسی کلام

صبر و طاقت عقل و دانش نقدِ جاں گم کردہ ام   در بیابانِ محبت کارواں گم کردہ ام
چشمِ گریاں رخت ہستی لختِ دل خونِ جگر   در فراقِ یار جملہ خانماں گم کردہ ام
کفر و اسلام دل وحشی نمیدانم کہ چیست   ایں قدر دانم کہ در کوئے بتاں گم کردہ ام
نورِ ایماں در رہِ عشق بتے است ای صغرؔ مرا   ہاں مگر انوار دانش ہے گماں گم کردہ ام

ز فراقِ یار عاشق ہمہ شب تپیدہ باشد   نہ سحر دمیدہ باشد نہ اجل رسیدہ باشد
بلبم رسیدہ اصغرؔ ز فراقِ یار جانم   مگر او نخواہد آمد نہ خبر رسیدہ باشد

رقعاتِ اصغرؔ

رقعہ در ترکِ الف

سوزِ تپِ فرقت سے عجب رنگ ہیں دل کے   تحریر نہیں ہوتے ہیں جو ڈھنگ ہیں دل کے

طوطیٔ شیریں نغمۂ چمنِ مودت بلبلِ خوش نوید گلشنِ محبت غنچۂ مقصد ہمیشہ شگفتہ رہو ؎

غمِ فرقت سے سینہ میں مرے شعلے بھڑکتے ہیں
کلیجہ۔ دل۔ جگر تینوں تہِ بسمل سے تڑپتے ہیں

جگر سوختۂ شعلۂ مہجوری دل برفتۂ سوزشِ دوری ذبیحِ خنجرِ چشم پوشی مجروحِ شمشیرِ شیوۂ خموشی خو کردۂ رنج و غم ستم دیدۂ بیم خو پرچشیدۂ قدح دُردِ درد مریض تپِ ہجر چہرہ زرد نبضِ لب مرد سے سرد رہے ہیں خوشی و خوبی سے محروم رہے رقیمہ شریف جو ہر دقیقہ رقیمہ کہ حرف حرف زخمِ جگر کو مرہم صحت بخش ہے لفظ لفظ دلِ مغموم کو فرحت نقش ہے پہنچا پردر جب سے فلک کج رو در پے ستم دور رہے بیشتر وحشت زندہ در گور رہے۔ گو روتے روتے دیدۂ خوں میں نمی نہیں پھر بھی لختِ جگر کے نکلنے میں کمی نہیں شب و روز زلف و رخ کی دھن ہے۔ ملت گلن میں شمع نمط فرقت سوزش سے جل جگر کی رنگ دود ہے۔ خشک ہو رہے خلش ہے دل و جگر میں مشعل تپش ہے کہ کم کدورت سے کدر ہوں تحمل غم سے منغص ہوں جنون خیزی کے ڈھنگ ہیں سنتے ہیں حرف زندگی

---

[۱] گلزارِ صوفی صفحہ ۱۵

ہے وحشت نوردی کی کاوشش ہے بشتگی پرورش وپرستش ہے سب لوگ عشق کہتے ہیں حیرت سے منہ کو دیکھ کر چپ ہو رہتے ہیں گریہ کی کثرت ہے زیست کی فلت ہے سینہ ریش ہے مرگ در پیش ہے ع

جو ہمدم سے قصد ہو ملتے ہیں پکڑ کر سر نصیبوں کو

مرے سوز تپ فرقت سے حیرت ہے طبیبوں کو

رقعہ در ترک بار موعدہ

چشم خونبار غم سے لخت جگر آنے لگے — وحشت وسودا سے صحرا کو لیجانے لگے

آشنائے دریائے موالفت و اخلاص شناور قلزم معادقت واختصاص نیبو اللہ بقائہ ع

کیوں نہ کھٹکیں آسماں کو نالہ ہیں ناتواں

مشکل ہے چھالا کی اس میں گجو بیچ ظلم خار کا

چرخ دغا دنا ہنجار ستمگار ہے کوئی مونس ہے نہ غمخوار ہے زندگی سے یاس ہے جینے کی کسے آس ہے ع

تو سفر فراق میں مجکو کرے دردناک بجے — مرے تو مر نہیں سکتا جئے تو خاک جئے

حالت فرقت سے جی گھٹتا ہے آہ گرم سے سینہ میں ہر دم شعلہ سا اٹھتا ہے طاقت طاق ہے سر ہے اور سنگ فراق ہے آمد جنوں ہے وحشت فزوں ہے۔ دل میں درد ہے آہ سرد ہے۔ چہرہ زرد رنگ فق ہے۔ دل خستہ اور جگر شق ہے دحشت زدہ ہے ملالت شدید ہے سینہ ماتم سرا ہے جسم خشک زخم جگر ہرا ہے۔ ناتوانی کا زور ہے دیوانگی کا شور ہے۔ دیدۂ خونفشاں کی طغیانی ہے لخت دل وجگر کی چشم سے روانی ہے ہر دم دنیا سے نفرت ہے۔ جوش وحشت کی شدت ہے۔ جینے سے جی چھوٹ گیا۔ گجو کو دلِ زندگی کس سے خوب کہا ہے ع

کاشکے دو دل ہوتے سینہ میں عشق میں — ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

رقعہ در ترک تا رو فلاں

جنون غم سے گر جیتے رہے ہیں ہم ہیں ہیں یاں — مشکل راہ عدم ہوگی کفن میں بھی یاں

جوہر نعاہر شد ناصدق وصفا کو اک ثواقب برنا ورق دو لاز زید اللہ خرتہ ع

مرگ سو بجھے ہے آج کل مجکو — بیکلی سے نہیں ہے کل مجکو

عجب طرح کا نیا رنگ دکھلایا جس کے بدلے خوب دلایا — خنجر غم ہے دل ہے جوش الم ہے۔ خون جگر چشم سے رواں ہے۔ سینہ میں صرف دل کا گماں ہے۔ خوشی عنقا ہے کباب ہے چشم سے طغیانی کو بیتاب ہے ع

سینہ جلتا ہے سوز دروں جاتا ہے — اک آگ سی لگ رہی ہے کیا جانئے کیا ہوتا ہے

مرگ در پیش ہے جگر پاش پاش ہے سینہ ریش ہے خیال زلف عنبر مو سے ہول پریشانی وخروش وسودا ہے۔ دیوانہ ہو رہا ہوں۔ گرمی سوز ہجر سے جسم نزار میں بخار ہے ہم دوری دل وجگر کے دوسار ہے۔ داغ درم ہے سینہ گنجینہ ہے۔ گریہ صبح ہے نالہ شب ہے۔ کوہ وبیاباں مسکن ہے۔ دیوانگی کا چال وچلن ہے۔ گردش طالع ہے۔ پاؤں میں چکر ہے روز وشب صحرا نوردی ہے۔ دوران سر ہے بیکسی نفس ہے مایوسی جلیس ہے اشک پینے غم کھانے سے کام ہے۔ خواب وخور بالکل حرام ہے دل بیتاب چین ہے۔ صبح ومسا خورد شین ہے۔ بلبل وار نالہ زن ہوں۔ مثل قمری طوق بگردن ہوں۔ مرض فراق سے دل پژمردہ ہے۔ سینہ کباب ہے جگر افسردہ ہے دل کو خفقان ہے۔ گریبان چاک ہے۔ پاؤں میں آبلہ سر پر خاک ہے۔ متمنی دیدار ہوں۔ پابوسی کا طلبگار ہوں ع

بیتابی کی طرح اپنے سر شام خبر لے — اس شب کو خدا ہی ہے جو ظالم وہ سحر لے

رقعہ در ترک ثار الثلثہ

ہوا ہے اب تو یہ نقشہ ترے بیمار ہجراں کا — کہ جس نے کھول کے منہ کا دیکھا بس ہو گیا کا

آشنائے دریائے آشنائی شناور بحر دلربائی گوہر اکلیل لطافت جوہر شمشیر صداقت اطال اللہ تعالی ع

اس گردش افلاک سے بھولے نہ سنبھلے ہم — خود بخود روز ہوا لگتی ہے پاؤں کے تلے ہم

درد جگر سے کام تمام ہوا مرنا انجام ہوا اگر دیدہ اشکبار سے ایسی ہی طغیانی رہے گی تو کشتی فلک بھی کوئی دم میں بہے گی وحشت سمائی ہے۔ جنوں کی چڑھائی ہے دل کو اضطراب ہے جگر کباب ہے نہ چشم میں خواب ہے نہ جی کو تاب ہے۔ ناتوانی سے جسم نزار کا یہ حال ہے کہ اجل کو بھی دیکھنا محال ہے ع

تپ کاہش سے اب اس طرح نزار ہوں میں — نظر میں خلق کی رنگ خط غبار ہوں میں

سوز فراق سے داغ جگر آتش کے پرکالے ہیں۔ شب وروز گریہ وزاری ہے زخم دل آئے ہیں۔ کبھی بکتا ہے کبھی ہنسی ہے عجب مصیبت میں طبیعت پھنسی ہے خدا کی مار ہے۔ وحشت کے زور میں گریباں چاک ہے۔ حسرت دیدار میں چشم وا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہر دم بکتا ہے ع

دل حسرت ہجراں کا نکل جائے تو اچھا — ارماں کا نکلتا ہے نکل جائے تو اچھا

رقعہ در ترک جسم

حالت ہے ایک تار کی برق وشرار کی — کیا کیا تڑپ رہا ہے دل بیقرار کی

ایک تو آرائی موالفت ومعاونت ونگ اخترات اور رنگ صداقت ووفت

نبالشہ محبت ہے ؎

عمر کی گر ہو بالیدگی ہو تو آتو — دل گرفتہ نہیں سینہ میں سمائیگا

نیرنگیِ گردوں حد سے افزوں ہے۔ زندگی سے دل تنگ ہے حالت زبوں ہے تپِ وحشت ہے اپنے بیگانے سے نفرت ہے۔ دامنِ صبر بیرون دست ہاتھ سے نکل گیا شعلہ لو زنی سے دل پگھل گیا بار مصیبت ہے سر ہے تنگ فرقت ہے دل مضطر ہے دل میں خلش خار مفارقت ہے۔ سینہ دلریش ہے موت کا سامنا ہے مرگ غریب الوطنی درپیش ہے۔ آتشِ فراق سے سینہ کباب ہے کبھی حیرت ہے کبھی سکتہ ہے۔ سیماب وار دل بیقرار ہے گریہ وزاری بے شمار ہے۔ دن تو صحرا نوردی سے کٹتا ہے رات کو آہ و زاری سے سینہ پھٹتا ہے۔ شعلہ غم والم سے تن بدن تنور ہے۔ دیدۂ گریاں سے طوفانِ نوح کا ظہور ہے۔ آہ سرد ہے نالہ گرم ہے عقل سے یاس ہے۔ شب و روز یکساں ہے دل اداس ہے۔ دن کو ذلت و خواری ہے۔ شب کو اختر شماری ہے بیقراری کو قرار ہے۔ ملک الموت کا انتظار ہے ؎

دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا — یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا

رقعہ در ترک حائے حطی

نکلے ہے خون شُر شُر زخم جگر خراش سے — چھیڑ دو اس کو ہدہد و نوکِ قلم تراش سے

نصوص اخلاص خلوص نصوص اختصاص خصوص نور اللہ وجہہ ؎

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا — کہ جس کے عوض یوں رُلانے لگا

کس کو دکھلاؤں آبلے دل کے — زخم تازہ ہوئے ہیں چھل چھل کے

گریہ شعاری ہے طاقت آہ و زاری ہے۔ عشق کا آزار ہے جگر پاش پاش سینہ فگار ہے۔ داغِ فراق سے دل داغدار ہے جلبِ عشق کا سایہ ہے خزاں کی بہار ہے گلا ہے اور خنجرِ فراق ہے مرنے کی خوشی سے جینا شاق ہے آوارہ خانماں جہاں گم کردہ کارواں ہوں۔ زلف شکیں میں دلِ پریشان پھنس رہا ہے مری گنگھی سے جنون آمیز ہے کوئی گرہ تا لال ہے کوئی پھنس رہا ہے۔ گریبان تار تار ہے موت کا آثار ہے جب دیدۂ جگر سے گھبراتا ہوں یہ شعر زبان پر لاتا ہوں ؎

بیتابیِ دل کسے سنائیں — یہ دیدۂ تر کسے دکھائیں

دم گھٹتا زبان سے شعلے نکلتے ہیں پیالہ جگر آتش دوری سے جلتے ہیں بیہوش و عقل دور [illegible] فقط [illegible] ہے ؎

[illegible] — عمر نے ہم سے بے وفائی کی

دل [illegible] — [illegible] آرزو [illegible] کی

رقعہ در ترک خائے معجمہ

ہیبت آگ نکلتی ہے اپنے سینے سے — الٰہی موت دے گذرا میں ایسے جینے سے

صدر نشینِ چار بالشِ الفت و صفا مسند آرائے محافلِ محبت و ولا دام افضالہ

عشق کا سا کوئی آزار نہ دیکھا نہ سنا — اس کا بچتا کوئی بیمار نہ دیکھا نہ سنا

آنکھوں میں دم ہے انتظار کی شدت ہے بستر غم پر پڑا تڑپتا ہوں جان کی نوبت ہے ؎

یہی پیغام درد کا کہنا — گر کبھی کوئے یار میں گذرے

کون سی رات آن ملیگا — دن بہت انتظار میں گذرے

ناتوانی زور خود دکھاتی ہے آہ سرد دم بدم سینۂ سوزاں کو جلاتی ہے کشتیِ وفا کو امواجِ اشک نے ڈبو دیا۔ سفینۂ جسم کو کنارہ دنیوی سے کھو دیا شکل ماہیِ بے آب ہے موت کے کنارے آلگا ہوں زندگی مانند حباب ہے چشم دریا بار نے جل تھل بھر دیئے سب کشت زار سیراب کر دیئے ؎

دیدۂ گریاں سے سوا ہو گیا — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

غرض کہ قلزمِ غم و الم میں غرق ہوں شدت تپ مفارقت سے غرق غرق ہوں ؎

صحرا میں سیلِ اشک مرا جابجا پھرا — مجنوں بھی اس کی موج میں مدت بہا پھرا

رقعہ در ترک دال مہملہ

کھائیے تھوڑا زہر ستائے ہم اور کہیں تم اور کہیں — کیا لطف ہو ایسے جینے کا ہم کہیں تم کہیں

ہر بہرِ بے وفائی ماہ سیمائے دلربائی کو ہمرنگ آشنائی جوہر تیغ یکتائی [illegible]

ایک وضع پر نہیں ہے زمانہ کا طور آہ — معلوم ہو گیا ہمیں بسمل تمام [illegible]

یارانِ ہم نفس کا کیا گلا ہے یہ تو یوں ہے کہ اپنا ہی طالع کبھی بیدار [illegible] کوئی مونس ہے نہ رفیق ہے نہ یار ہے۔ گوشۂ تنہائی ہے بستر غم ہے شب تار ہے ؎

گر یونہی رہے گی بیزاری — تو ہو چکی زندگی ہماری

صحرا مسکن کوہ ٹھکانہ ہے ہر ایک بیگانہ بیگانہ ہے۔ خانہ ویرانی نصیب ہوئی اجل قریب ہوئی ؎

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی — حیف ہے مجھ سے ملاقات نہ ہونے پائی

مرضِ مفارقت سے چارہ نہیں ضعف و ناتوانی سے گویائی کا یارا نہیں بستر سے نشست کی طاقت نہیں [illegible] ناتوانی [illegible] رگ [illegible] غم جسم زار [illegible] ماتم ہے [illegible] مفارقت شاق ہے وصل کا اشتیاق ہے [illegible] پرواہ [illegible] ہے ؎

ہیں دشت نوردی کی کوشش ہے برہنگی طرح پوشش ہے سب لوگ وحشی کہتے ہیں جیسے منہ کو دیکھ کر چپ ہو رہتے ہیں گریہ کی کثرت ہے زیست کی قلت ہے سینہ ریش ہے بہوت دریپش ہے ؎

جو بہد مرتے وہ روتے ہیں پکڑ کر سر نصیبوں کو
مرے سوز تپ فرقت سے حیرت ہے طبیبوں کو

رقعہ در ترک بار موحدہ

چشم خوں افشار سے لخت جگر آنے لگے
وحشت و سودا ابھی صحرا کو لیجانے لگے

آشنائے دریائے موالنت و اخلاص شناور قلزم مصادقت و اختصاص زید اللہ لطفہ ؎ کیوں نہ کھٹکوں آسماں کو ناتواں میں ناتواں
مشکل ہے بچار کی اس میں بچھ جیسا عالم خار کا

چور غم و اندوہ ناہنجار سنحوست آزار ہے کوئی مونس ہے نہ غمخوار ہے زندگی سے یاس ہے بجینے کی کیسے آس ہے ؎

نو سے فراق میں بکو نگریہ درد ناک بجے
مرے تو در نہیں سکتا بجے تو خاک بجے

حالت فرقت سے جی گھٹتا ہے آہ گرم سے سینہ میں ہر دم شعلہ سا اٹھتا ہے طاقت طاق ہے۔ سر ہے اور سنگ فراق ہے آمد جنوں ہے۔ وحشت فزوں ہے۔ دل میں درد ہے آہ سرد ہے۔ چہرہ زرد رنگ فق ہے۔ دل خستہ اور جگر شق ہے دشت نوردی ہے حالت دردی ہے سینہ ماتم سرا ہے جسم خشک زخم جگر ہرا ہے۔ ناتوانی کا زور ہے دیوانگی کا شور ہے۔ دیدۂ خونفشاں کی طغیانی ہے لخت دل و جگر کی چشم سے روانی ہے۔ مردم دنیا سے نفرت ہے۔ جوش وحشت کی شدت ہے۔ بجینے سے جی چھوٹ گیا۔ جگر کو دل ٹوٹ گیا کسی نے خوب کہا ہے ؎

کاش کے دو دل ہوتے عشق میں
ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

رقعہ در ترک تار فوقانی

سوز غم سے گر جلیں یونہیں بدن میں ہڈیاں
مشعل راہ عدم ہونگی کفن میں ہڈیاں

جو اہر زواہر گنج صدق و صفا کواکب ثواقب برج رفق و دلا زید اللہ حسنہ ؎

مرگ سوجھے ہے آجکل مجکو
بیکلی سے نہیں ہے کل مجکو

گنبد اسدی گردوں نیا رنگ لایا۔ ہنسی کے بدلے خوب رلایا ـــــ خنجر غم ہے دل ہے نیش الم ہے۔ خون جگر چشم سے رواں ہے۔ سینہ میں مرغ دل کا گماں ہے شعلہ غم ہے جگر کباب ہے چشم سے طغیانی خون ناب ہے ؎

سینہ جلا کے ہے سوز دروں بلا ہے
اک آگ لگ رہی ہے کیا جانئے کیا ہوا ہے

مرگ دریپش ہے جگر جگر پاش پاش ہے سینہ ریش ہے موخیال زلف عنبر موہوں جوش و خروش وسودا ہے۔ دیوانہ ہوں۔ گرمی سوز ہجرت جسم زار میں بخار ہے سم دوری دل وجگر کے دو سار ہے۔ داغ درم سے سینہ گنجینہ ہے۔ گریہ صبوحی ہے نالہ شبینہ ہے۔ کوہ و بیاں مسکن ہے۔ دیوانگی کا چال و چلن ہے۔ گردش طالع ہے۔ پاؤں میں چکر ہے روز و شب صحرا نوردی ہے۔ دوران سر ہے بیکسی انیس ہے مایوسی جلیس ہے اشک پینے غم کھانے سے کام ہے۔ خواب خور بالکل حرام ہے دل بے چین ہے۔ صبح و مسا فرد و شین ہے۔ بلبل دار نالہ زن ہوں۔ مثل قمری طوف بگرداں ہوں۔ مرمر فراق سے دل پژمردہ ہے۔ سینہ کباب ہے جگر افسردہ ہے دل کو خفقان ہے۔ گریبان چاک ہے۔ پاؤں میں آبلہ سر پر خاک ہے۔ مشتاق دیدار ہوں۔ پابوسی کا طلبگار ہوں ؎

بیمار کی رح اپنے سرشام خبر لے
اس شب کو خدا ہی ہے جو ظالم وہ سحر لے

رقعہ در ترک ثار الثلثہ

ہوا ہے اب تو یہ نقشہ ترے بیمار ہجراں کا
کہ جیسے کھول کے منہ کا دیکھا لبش ہو شعلا کا

آشنائے دریائے آشنائی شناور بحر دلربائی گوہر اکلیل لطافت جوہر شمشیر صداقت ملہ اللہ تعالی ؎

اس گردش افلاک سے پہلے نہ پھلے ہم
جوں سبزۂ دیدہ کو اگتی ہے پاؤں کے تلے ہم

درد جگر سے کام تمام ہوا مرنا انجام ہوا اگر دیدۂ اشکبار سے ایسی ہی طغیانی رہے گی تو کشتی فلک بھی کوئی دم میں بہے گی وحشت سمائی ہے۔ جنوں کی چڑھائی ہے دل کو اضطراب ہے جگر کباب ہے نہ چشم میں خواب ہے نہ جی کو تاب ہے۔ ناتوانی سے جسم زار کا یہ حال ہے کہ اجل کو بھی دیکھنا محال ہے ؎

تپ کی جدائی سے اب اس طرح نزار ہوں میں
نظر میں خلق کی رنگ خط غبار ہوں میں

غم فراق سے داغ جگر آتش کے پرکالے ہیں۔ شب روز گریہ و زاری ہے زخم دل تازے ہیں۔ کبھی بیکل ہے۔ کبھی بیکس ہے۔ عجب مصیبت میں طبیعت پھنسی ہے غم و الم خوراک ہے۔ وحشت کے زور میں گریباں چاک ہے۔ حسرت دیدار میں چشم وا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہر دم بیکل ہے ؎

دل سے غم ہجراں کا نکل جائے تو اچھا
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

رقعہ در ترک جیم

حالت ہے اکی تار کی برق و شرار کی
کیا کیا تڑپ [illegible] دل بے قرار کی

اے نیکو آرائی موالنت و موافقت رنگ افزائے اور [illegible]

زید اللہ مجدہٗ ؎

غموں کی گر یہی بالیدگی ہے تو آخر — دل گرفتہ نہیں سینہ میں سمائیگا

نیرنگیٔ گردوں حد سے افزوں ہے۔ زندگی سے دل تنگ ہے حالت زبوں ہے ترقیِ وحشت ہے اپنے بیگانے سے نفرت ہے۔ دامانِ صبر بر دست ہاتھ سے نکل گیا شعلہ نوحہ زنی سے دل پگھل گیا بارِ مصیبت ہے سر ہے تنگیٔ فرقت ہے دلِ مضطر ہے دل میں خلش خار مفارقت ہے۔ سینہ دلریش ہے موت کا سامنا ہے مرگ غریب الوطنی درپیش ہے۔ آتشِ فراق سے سینہ تپتا ہے کبھی حیرت ہے کبھی سکتہ ہے۔ سیماب وار دل بیقرار ہے گریہ و زاری بے شمار ہے۔ دن تو صحرا نوردی سے کٹتا ہے رات کو آہ و زاری سے سینہ پھٹتا ہے۔ شعلۂ غم و الم سے تن بدن تنور ہے۔ دیدۂ گریاں سے طوفانِ نوح کا ظہور ہے۔ آہ سرد ہے نالۂ گرم ہے جنگل سے یاس ہے۔ شب و روز بیکلی ہے دل اُداس ہے۔ دن کو ذلت و خواری ہے۔ شب کو اختر شماری ہے بیقراری قرار ہے۔ ملک الموت کا انتظار ہے ؎

دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا — یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا

رقعہ در ترک حائے حطی

نکلے ہے خوں ٹھہر ٹھہر زخم جگر خراش سے — چھیڑ دو اس کو ہمدمو نوکِ قلم تراش سے

نصوص آیاتِ خلوص نصوص اختصاص خصوص نور اللہ وجہہ ؎

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا — کہ جس کے عوض یوں رُلانے لگا

کس کو دکھلاؤں آبلے دل کے — زخم تازہ ہوئے ہیں چھل چھل کے

گریہ شعاری ہے عادت آہ و زاری ہے۔ عشق کا آزار ہے جگر پاش پاش سینہ فگار ہے۔ داغ فراق سے دل داغدار ہے خنجر عشق کا سایہ ہے خزاں کی بہار ہے گلا ہے اور خنجرِ فراق ہے مرنے کی خوشی ہے جینا شاق ہے آوارہ خانماں ہوں گم کردہ کارواں ہوں۔ زلف مشکیں میں دلِ پریشاں پھنسا ہے میری گفتگو سے جنوں آمیز ہے کوئی گریہ نالاں ہے کوئی ہنس رہا ہے۔ گریباں تار تار ہے موت کا آثار ہے جب درد جگر سے گھبراتا ہوں یہ شعر زبان پر لاتا ہوں ؎

بیتابیٔ دل کسے سنائیں — یہ دیدۂ تر کسے دکھائیں

دم گفتار زبان سے شعلے نکلتے ہیں دل و جگر آتش دوری سے جلتے ہیں ہوش و عقل دونوں کھو بیٹھے، تقدیر سے ہاتھ دھو بیٹھے ؎

اس کے ملنے سے ہم نے تجربہ کیا — عمر سے ہم نے بے وفائی کی

دل کو ہم نے غم سے کیا — ہم نے آہ نارسائی کی

رقعہ در ترک خائے معجمہ

ہمیشہ آگ نکلتی ہے اپنے سینے سے — الٰہی موت دے گزرا میں ایسے جینے سے

صدر نشین چار بالش الفت و صفا مسند آرائے محافل محبت و ولا دام اللہ فیوضہٗ

عشق کا سا کوئی آزار نہ دیکھا نہ سنا — اس کا بچتا کوئی بیمار نہ دیکھا نہ سنا

آنکھوں میں دم ہے انتظار کی شدت ہے بستر غم پر پڑا تڑپتا ہوں جان کی نوبت ہے ؎

یہی پیغام درد کا کہنا — گر کبھی کوئے یار میں گذرے

کون سی رات آن ملے گا — دن بہت انتظار میں گذرے

ناتوانی زور خود دکھاتی ہے آہ شرر دم بدم سینۂ سوزاں کو جلاتی ہے کشتیٔ قرار کو امواج اشک نے ڈبو دیا۔ سفینۂ جسم کو کنارہ دنیوی سے کھو دیا مثل ماہی بیتاب ہے موت کے کنارے آ لگا ہوں زندگی مانند حباب ہے چشم دریا بار نے جل تھل بھر دیئے سب کشت زار سیراب کر دیئے ؎

دیدہ سمندر سے سوا ہو گیا — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

غرض کہ قلزم غم و الم میں غرق ہوں شدت تپ مفارقت سے عرق عرق ہوں ؎

صحرا میں سیل اشک مرا جا بجا پھرا — مجنوں بھی اس کی موج میں دست بہا پھرا

رقعہ در ترک دال مہملہ

کھا لیجئے تھوڑا زہر منگا، ہم اور کہیں تم اور کہیں — کیا لطف ہوا ایسے جینے کا ہم ہوں کہیں اور کہیں

مہر سپہر بے وفائی ماہ سمائے رعنائی گوہر تاج آشنائی جوہر شمشیر یکتائی جیتے رہو

ایک وضع پر نہیں ہے زمانہ کا طور آہ — معلوم ہو گیا ہمیں لیل و نہار سے

یارانِ ہم نفس کا کیا گلہ ہے سچ تو یوں ہے کہ اپنا ہی طالع کج پر آمادہ ہے نہ کوئی مونس ہے نہ رفیق ہے نہ یار ہے۔ گوشۂ تنہائی ہے۔ بستر غم ہے شب تار ہے ؎

گر یونہی رہے گی بیقراری — تو ہو چکی زندگی ہماری

صحرا مسکن کوہ ٹھکانہ ہے ہر ایک یگانہ بیگانہ ہے۔ خانہ ویرانی نصیب ہوئی اجل قریب ہوئی ؎

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی — حیف ہے تجھ سے ملاقات نہ ہونے پائی

مرضِ مفارقت سے چارہ نہیں ضعف و ناتوانی سے گویائی کا یارا نہیں اللہ رے ضعف کہ جان لبوں تک نہیں آتی ہے ناتوانی اپنا نہ رہنے دیتی ہے رگ و پے میں خون غم ہے جسم زار سراپا ماتم ہے۔ اب مفارقت شاق ہے وصل کا اشتیاق ہے خدائے برساز برکتاری ما ؎

اس میں پھنستا ہے وہی جس کی قضا ہوتی ہے　　اُلفتِ زلفِ سیہ رنگ بلا ہوتی ہے

رقعہ در ترک ذال معجمہ

ہوش آجاتا ہے وحشت میں جو جالی ازکر　　چھیڑ دیتا ہوں رگِ سودا کو نوکِ خار سے

جواہر زواہر درجِ الفت کو ٹوٹتے لالاتے صدفِ محبت ہمیشہ تاجِ محبوبانِ جہاں رہیو ؎

دکھلاتے ہیں سیر اسے لالہ زار کی　　تجدید کر رہے ہیں دلِ داغدار کی

گردشِ چرخ دوّار نے اپنا رنگ دکھایا ہے. جنونِ مشربی نے صحرا نوردی کا ڈھنگ سکھایا ہے بالوں میں چھالے ہیں لب پہ نالے ہیں جوشِ جنوں کی بہار ہے سینہ داغِ الم سے تختۂ گلزار ہے سر میں سودا ہے دماغ میں خلل ہے خانۂ تن ویران ہے. حضرتِ عشق کا عمل ہے. تشنہ لبی ہے. گریہ نیم شبی ہے. آنکھوں میں دریا کی روانی ہے جسمِ زار ناتوانی سے پانی پانی ہے موجِ اشک نے کشتیِ چرخ کو ڈبو دیا. حضرتِ عشق نے دونوں جہاں سے کھو دیا. پیکِ اجل نے دلِ مجروح پر اور نمک بھوری کا لگا دیا. سینۂ داغدار کو آشیانۂ مرغِ بسمل بنا دیا. دل کے دھڑکے سے تمام بدن پر رعشہ ہے ضعفِ جگر ملنے نہیں دیتا. عجب تماشا ہے.

شکوہ کیا کیجئے ناتوانی کا　　کھو دیا لطف زندگانی کا

لطف کرتے ہی دل کو چھین لیا　　روز یہ ڈھب ہے مہربانی کا

ہاتھ گریباں تک گریباں دامن تک آتا ہے. جوشِ وحشت یہ مزا دکھاتا ہے نہ کوئی مونس ہے جسے دل کا حال سناؤں. نہ کوئی غمخوار ہے جسے سینہ کے داغ دکھاؤں. آپ ہوں یا دلِ دیوانہ ہے ہر شخص کی زبان پر میرا افسانہ ہے ؎

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی　　دور پہنچی ہے میری رسوائی

رقعہ در ترک رار مہملہ

چمن کا نام سُنا تھا وَلے نہ دیکھا ہائے　　جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

شاہنشاہ ملکِ خوبی لنشت پناہ ولایت محبوبی ادام اللہ جالہٗ واقبالہٗ ؎

بو تے کباب سوختہ آئی دماغ میں　　شاید کہ دل کو آتشِ غم نے جلا دیا

تمام تمام دن شعلۂ الم سے سوختہ کا دل خاشاک آتش دادہ کی مانند پہلو میں سلگتا ہے. چشمِ خونفشاں کا بجھاتے امداد کے یہ قول ہے کہ اس تل کو سوائے اس کے کون بجھا سکتا ہے. بخدا آپ کی تپِ جدائی سے بہت تباہ حال ہے ضعف کے باعث آہ تو آہ سانس بھی لینا محال ہے. تنہائی ہے ہم آغوشی میں دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں نہ دم نکلتا ہے نہ نیند آتی ہے. کفِ افسوس ملتے ملتے شام سے صبح ہو جاتی ہے دستِ ہمائی کہ جن آپ کے ہوشِ و حواس نے کوچ کیا. ہمدردوں نے یک لخت دستِ شفقت اُٹھا لیا ؎

جب سے ہم اُلفت میں دیوانے ہوئے　　اپنے بیگانے سے بیگانے ہوئے

ہیہات دلِ بیتاب سے ایک بھی صدمۂ شعلۂ محبت کا نہ اُٹھایا گیا. سانس لیتے ہی جل گیا. آہ سوزاں کے ساتھ ہی دھواں بن کے پہلو سے نکل گیا. مطلق دل کی تمنا نہ نکلنے دی پہلی ہی منزل میں ایسے ہمنشیں نے بیوفائی کی ؎

نے خون ہو آنکھوں سے بہا اور نہوا داغ　　اپنا تو یہ دل آہ کسی کام نہ آیا

رقعہ در ترک زار معجمہ

دلِ بیتاب کی کرتا نہیں جب کوئی غمخواری　　تو پھر لاچار میں ہی اسکو چھاتی سے لگاتا ہوں

کلیدِ گنجینۂ مہر و وفا خورشیدِ مطلعِ صدق و صفا ہمیشہ سربلند رہیو ؎

پہونچی شاید جگر تک آتشِ عشق　　اشک ہیں اب شرار کی مانند

رفتہ رفتہ آنکھوں سے اب اشکِ سرخ بہنے لگے مردمِ دیدہ ہر دم گنجۂ خون میں غرق رہنے لگے روتے روتے آنکھوں کا نقشہ بگڑ گیا فرطِ خونفشانی سے سینہ میں گھاؤ پڑ گیا. اب سرِ شام سے ریشِ دل اس طرح سے تڑپتا ہے کہ آہ و نالہ سے سننے والوں کا بدن تھرتھراتا ہے. ہمدم تڑپتے دیکھکر آنکھیں بند کر لیتے ہیں. جراح ہول دل سے سینہ پر ہاتھ دھر لیتے ہیں. جگر سا ہمنشیں جو ہر وقت پہلو بہ پہلو رہتا ہے فریاد و فغاں سُن سُن کر ہر بار یہی کہتا ہے للہ مجھے اس آفتِ آسمانی سے بچانا جلد کوئی مرہم دستِ دلدار کا لگانا ورنہ بیقراری سے طائرِ روح کے بال و پر بھی نظر نہ آئیں گے. صبح ہوتے ہوتے پہلو میں دو چار خون کے قطرے رہ جائیں گے مگر سوائے غمِ تنہائی کون ہے جو بُرے وقت میں کام آئے بیچارے کی تسکین فرمائیے اگر یہی حال رہا تو دو ایک دن میں دونوں کا کام تمام ہوگا. آپ کے عشق میں بیدل دلِ جگر ہمارا ابھی نام ہوگا ؎

مل گئے خاک میں یہ پھل پایا　　تخمِ غم کشتِ دل میں بو بو کے

رقعہ در ترک سین مہملہ

وحشتِ عشق بُری ہوتی ہے دیکھا نادان　　ہم چلے آئے یہاں چھوڑ کے گھر بار کو تو

نگینۂ خاتمِ یگانگی مہرۂ نردِ دیوانگی مدام لعابِ آبِ دہن آبِ حیات باد ؎

جینے مرنے کا کب ٹھکانا ہے　　دشتِ وحشت میں آشیانہ ہے

اے رشکِ لیلیٰ تیرے عشق میں مجنوں نام ہوا کوہ و صحرا مقام ہوا اب دماغ میں جنون ہے آنکھوں میں خون ہے دل پھڑکتا ہے کلیجہ دھڑکتا ہے تیرا الم جگر کے پار ہے چشمِ خونچکاں رشکِ آبشار ہے مزاج برہم ہے. خیالِ زلف درہم ہے. عریانی پر خاک ہر لختِ جگر خوراک ہے جنگل کی خاک چھانتے ہیں بیقراری کو قرار جانتے ہیں. تپِ فراق نے تن زار میں آگ لگا دی ہے. دلِ بیقرار کشتۂ ابروئے خمدار نے پارہ کی

خاصیت پیدا کی ہے لیل و نہار نالہ و بکا ہے۔ فقط ملنے کی دعا ہے اگر امید وصال نہ ہو تو ایک دم میں تن بدن جل کر خاک ہو جائے دوری و مہجوری کا قصہ بکھیڑا پاک ہو جائے ؎

ہے امید وصل مانع ورنہ او وعدہ خلاف　　کچھ جدائی میں نہیں دشوار مر جانا ہمیں

رقعہ در ترک شین معجمہ

درد ہوتا ہے میرے سینے میں　　اب نالاں ہے مجھ کو جینے میں

رنگِ گلستانِ محبت بہارِ چمنستانِ مودت مدام چہرۂ الفت باآب و تاب باد ؎

اب زباں پر تو آہ و نالہ ہے　　اور دردِ جگر دوبالا ہے

سینہ تنگ میں دل گھبراتا ہے۔ فرطِ آہ و نالہ سے جان جاتی ہے۔ کلیجہ منہ کو چلا آتا ہے سودا گزینی سے حواس میں خلل ہے ملکِ خرد میں سلطان جنوں کا عمل ہے۔ سینہ خالی صحرا ہے تختِ جگر سے بھرا ہوا ہے پتلی فرطِ انتظار سے نکال ڈالی ہے۔ آنکھوں پر مرہمِ خیالِ دلدار دھرا ہے۔ دودِ آہ سے چراغِ عقل گل ہے دل و پہلو میں صحبت میاد و مل ہے۔ سر سجدہ کا امیدوار ہے لب قدم بوسی کے آرزومند ہیں۔ دیدۂ دل نرگسِ حیراں کی طرح وا ہے۔ آنکھیں غنچۂ سوسن کی صفت بند ہیں ؎

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری　　دل میں یہ کس کا تصور چھا گیا

گلو میں پھانس ہے سینہ میں سانس ہے پہلو میں کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ دم فرطِ انتظار سے چھاتی میں اٹک رہا ہے ؎

اپنی صورت ہم کو دکھلاؤ خدا کیواسطے　　جان جاتی ہے ابھی آؤ خدا کیواسطے

رقعہ در ترک صاد مہملہ

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا　　بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

نشترِ غمِ دوری خنجرِ جراحتِ مہجوری ہمیشہ معرکۂ دلبری سرخرو باد ؎

دردِ فرقت نے ہم کو مارا ہے　　ستمِ چرخ آشکارا ہے

زباں پر جنوں آمیز کلام ہیں سودا گزینی کے سرانجام ہیں لڑکے جھولیاں بھر بھر کے پتھر مارتے ہیں۔ چھیڑنے والے میاں مجنوں کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہم اپنی آفت میں پھنسے ہیں لوگ ہماری باتوں پر ہنس رہے ہیں جو کوئی ہنسی سے آپ کا نام زبان پر لاتا ہے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ رونا چلا آتا ہے۔ ہائے وحشت نے سرِ دستِ بیاباں دکھایا ہے۔ دستِ جنوں نے بیدردی سے پیرہن کو قبا بنایا ہے ؎

وحشت ہی اب ملے جوشِ جنوں بچلو کو تو نے　　جھگڑا ہی نہ کچھ دستِ دگر بیاں میں چھوڑا

طبیعت حیران و پریشان ہے روز و شب آئینہ روا اندوہ زلفِ عنبر بو کا دھیان ہے

کلیجہ دکھ رہا ہے۔ تن پھنک رہا ہے ؎

دل جلا آنکھیں جلیں جی جل گیا　　عشق نے کیا کیا ہمیں دکھلائے داغ

رقعہ در ترک ضاد معجمہ

پہلے تو خون نکلتا تھا اشکِ سیاہ سے　　اب بخت دل بھی آنے میں آنکھوں کی راہ سے

عکسِ آئینہ اختصاص نقش نگار خانۂ اخلاص مدام بازیب و زینت باد ؎

خانۂ چشم کو اشکوں نے ڈبایا پیارے　　آپ نے چہرۂ انور نہ دکھایا پیارے

دردِ فراق سے روتے روتے آنکھوں کو رو بیٹھے ہم تو اپنے دل و جگر سے ہاتھ دھو بیٹھے آہ سرد کے ساتھ اشکِ گرم نکلتا ہے ہر بنِ مو سے خون کا فوارہ اچھلتا ہے چشمِ خونفشاں اور دلِ داغدار میں باہم لاگ ہے۔ دیدۂ گریاں میں پانی بھرا ہے۔ سینہ بریان میں از سر تا پا آگ ہے ؎

ڈبا دیا مجھے اس چشمِ تر کو کیا کوسوں　　جلا دیا مجھے سوزِ جگر کو کیا کوسوں

دل و جگر آنکھوں کی راہ سے خون ہو کر بہ گئے۔ سینۂ سوزاں میں صرف داغوں کے نشان باقی رہ گئے ؎

پوچھا نہ یہ کہ درد کدھر ہے کدھر نہیں　　میرے دل و جگر کی تمہیں کچھ خبر نہیں

دن کو گریہ ہے رات کو زاری ہے لیل و نہار دیدۂ بلاکش سے اشکِ خون جاری ہے ؎

کیا کہوں او بتِ بے رحم تری دوری سے　　کون سا دن تھا کہ میں دیدۂ گریاں نہ رہا

رقعہ در ترک طاء مہملہ

مری تو سن لے کہ مانندِ شمع بزمِ اغیار　　پگھل چکا ہے سراپا زبان باقی ہے

آیتِ مصحفِ آشنائی حدیثِ مشکوٰۃ دلربائی انار اللہ برہانہ ؎

سوزِ تپِ فراق کا کیا کیجئے بیاں　　دل جل رہا ہے آگ کا شعلہ جگر میں ہے

دمِ گرم سے سینہ جل گیا شعلۂ آہ سے دماغ پگھل گیا۔ سوزِ مفارقت سے جگر میں گھاؤ ہے تپِ مہاجرت سے سینہ الاؤ ہے۔ سانس کے ساتھ سینہ میں آگ بھڑکتی ہے پہلو میں مرغِ بسمل کی مانند کوئی چیز پھڑکتی ہے امدادِ نفس سے شعلے اٹھتے ہیں ہر بنِ مو سے آبِ جہنم کے فوارے چھوٹتے ہیں۔ دلِ ناداں کو کسی شعلہ رو کے تصور میں شغلِ آتش پرستی ہے۔ چشمِ خونفشاں سے تختِ جگر کے عوض آگ برستی ہے۔ دمِ آتش افروز مفارقت سے سینۂ دل خاکستر ہے۔ داغوں کی کثرت سے سینہ دو ہم جنوں کا گنجینہ ہے سوزشِ دل سے دعا برخلاف اپنا اثر دکھاتی ہے۔ مرہم زنگاری میں پاسنگ کی طاقت ہو جاتی ہے ؎

اگر سوزد بدینسان آتشِ شیفتہ تن مارا   بجز خاکستری دیگر نہ بینی از نشانِ ما

رقعہ در ترکِ ظائے معجمہ

یہی کہتا ہے رو رو کر دلِ پُرسوز سینے میں   دمِ سوزاں سے آخر پڑ گیا ناسور سینے میں

ہر سپہر یک رنگی ماہ سیمائے دل تنگی میدان دلربائی میں ہمیشہ سر بلند رہو۔

شل گل اپنا گریباں چاک کر ڈالوں تو بھی   اس دلِ بیتاب کو میں خاک کر ڈالوں تو بھی

دستِ جنوں نے بے طرح پنجے جھاڑے ہیں۔ سر سے پاؤں تک عقل و خرد کے پرزے بکھرے ہیں۔ جب فرقتِ دلدار سے سینہ میں سانس آکر اٹکتی ہے تو کسی کروٹ کسی پہلو کل نہیں پڑتی ہے پردہ کے روبرو چشم قلزم ایک قطرہ ہے۔ اشک دریا رنگ سے قلعۂ زیست کے گر پڑنے کا خطرہ ہے۔

تک نہ چل او نسیمِ صبح کہیں   رہ گیا ہوں چراغ سا گل ہو

نالہ و آہ سے رعد و برق کا دم بند ہے ہمارے رونے کا ابرِ مطیر سے رتبہ بلند ہو۔

بجا ہے طعن گر ابرِ بہار پر مارے   یہ چشم وہ ہے کہ دریا کو دھار پر مارے

اگر جلد دیدار دکھاؤ گے تو جان بچ جائے گی۔ ورنہ فریاد و فغاں سے اک قیامت مچ جائے گی۔

دیکھنا ہوئے گا دھوکا نالۂ دلِ گمکین   صاف اسرافیل سمجھے گا کہ محشر ہوگیا

رقعہ در ترکِ عین مہملہ

کیا یاد آئے گا یہ حسن روزگار کا   دیکھا نہ آنکھ سے کبھی موسم بہار کا

ملاحِ دریائے آشنائی و دلبری غواصِ لجۂ وفاپروری و مہرگستری مادام گوہرِ مراد ہمکنار باد۔

اس چرخ نے طفلی ہی سے دیوانہ بنا کر
مجنوں کی طرح مجھکو دبستاں سے نکالا

اول ہی شیرِ مادر میں خونِ جگر کا مزہ پایا لڑکپن میں ہی ہمیشہ رونے ہی سے دل بہلایا طفلی ہی سے گریباں پھاڑنے کی خو ڈالی۔ انگوٹھے چوس چوس کر انگشتِ حسرت کاٹنے کی راہ نکالی جب کچھ ہوش آیا تو مدرسِ غم نے مکتبِ محبت میں الف لام میم کا سبق پڑھایا۔ اب رنج و محن کا دفتر ہے۔ کلیجہ میں ناسور ہے۔ آبلۂ دل پکا ہے۔ زخمِ جگر لپک رہا ہے۔

اپنے پہلو میں دلِ بیتاب ہے وہ غم زدہ   جس کے ہاتھوں سے کہیں آرام پا سکتے نہیں

ذرا آپ بھی قدم رنجہ فرمائیے۔ بیمارِ محبت کا اپنی آنکھ سے حال دیکھ جائیے تپ مہجوری اور آتشِ دوری دونوں مل کر پردۂ چشم جلاتی ہیں۔ آنکھیں حسرت سے ڈبڈبا کر رہ جاتی ہیں۔

دل تو ٹھنڈے ہی پہ حسرت سرمیں کہاں ٹوٹکی   ابرِ تصویر کو رقت سے سروکار نہیں

رقعہ در ترکِ غین معجمہ

صدا ہر دم یہ آتی ہے درِ آمالہ دل سے   نکل جاوے گی اک دن لیلی جاں تن کے محمل سے

طوطیٔ شکرخای صدق و صفا عندلیبِ خوشنوائے چمنستانِ ولا مدام گلِ مراد شگفتہ باد۔

نہیں دونوں جہاں سے کام ہمیں   اک فقط تیرے مبتلا ہیں ہم

سینہ میں جوش ہے لب پر خروش ہے دل صدمہ ہجر سے بیہوش ہے دنیا و مافیہا بالکل فراموش ہے زندگی کا قصہ تمام ہے ملک الموت کا پیام ہے۔ ہر دم نالہ و آہ سے کام ہے۔ یہی دن کا چین ہے یہی رات کا آرام ہے۔ دلِ ماہیٔ بے آب ہے۔ جگر سوزِ فراق سے کباب ہے نہ دل میں طاقت ہے نہ جگر میں تاب ہے۔ صرف ایک دو دم کا حباب ہے۔

وحشتِ طبع روز افزوں ہے   حال دل کا مری دگرگوں ہے

اگر وصل ہو تو چندے آرام پائیں گے ورنہ یہ حسرت گور میں ہمراہ لیجائیں گے لیکن وہاں بھی تپِ فراق سے نیند نہ آئے گی۔ جانے تنگ و تنہا یک شب ہجر کا لطف دکھائے گی۔

وہ بلبلِ مردودِ بہار او خزاں ہوں   جس کا کہ ٹھکانا نہ چمن میں نہ قفس میں

رقعہ در ترکِ فا

آتش بھری ہوئی ہے مرے جسم زار میں   پارے کا ہے خواص دلِ بیقرار میں

جوہرِ تیغ ناز و نیاز قطرۂ تیغِ غمزہ و انداز ہمیشہ گلشنِ خوبی شاداب رہو۔

برگشتہ ایک جہاں سے طبیعت ہے آجکل   دل کو خیالِ یار سے صحبت ہے آجکل

ہم ہیں اور غمِ دلدار ہے سینہ ہے اور آہِ شرربار ہے۔

جگر غم سے یکلخت خوں ہو گیا   ڈکھا دل تو آخر جنوں ہو گیا

تن بدن سنسناتا ہے ناطاقتی سے غش پر غش چلا آتا ہے۔ دلِ بیتاب اٹھ پھر اسی طرح پھڑکتا ہے گویا کوئی زخم تازہ پر نمک چھڑکتا ہے۔

درد و غم۔ رنج و الم خوب بسے ہیں دل میں   مجھکو ڈر ہے کہ یہ بستی نہ ہو ویراں کہیں

دیکھ کر سب ترے بیمار کو یوں کہتے ہیں   یا رب اس شخص کی مشکل ہو آساں کہیں

آج کے تیرے قلق سے مجھے ڈر ہو جرأت   کہ نکل جائے نہ گھبرا کے تری جاں کہیں

سنتے ہیں موسمِ خوشحالی چلا اب بہار آئی ہے۔ بلبلیں [illegible]

غل مجانی ہے۔ جن کے دل فگار ہیں وہ میرکو جانتے ہیں۔ عندلیبوں کے نالے سُن کے قہقہے لگاتے ہیں ۔

اپنی تو یہ حالت ہے کہ جوں بلبل تصویر ۔۔۔ پرواز کی طاقت نہیں اور پاس چمن ہے
بلکہ داغہائے جنوں خون سودا سے بھرے ہوئے ہیں آمد موسم گل سے زخم جگر ہرے ہوئے ہیں ۔

گر بہار آئی تو کیا ہم بے پر و بال اے جنوں ۔۔۔ وہ خوشی ہو دیں کہ جن کو طاقت پرواز ہو

رقعہ در ترک قاف

مجنوں کا دل ہوں محمل لیلیٰ سے ہوں جدا ۔۔۔ تنہا پھروں ہوں دشت میں مثل نالہ جرس
دوائے درد مندان الفت و استمداد شفائے مستمندان محبت تو دو داد، ہمیشہ بامراد رہو ۔

لب پہ نالہ زباں پہ بتنالہ ۔۔۔ میری حالت تو آجکل یہ ہے
سینہ فرط نالہ سے رشک رباب ہے بجز وصف و سینہ خراشی سے غیرت مضراب ہو زخم دوری پر خنجر تغافل کا مرہم ہے صدمۂ دل سے تنگ ہوں مزاج برہم ہے آنسو سوکھ گئے۔ اب چشم حیرت کھلی کی کھلی رہ جائے گی۔ دل و جگر آہ سوزاں سے جل چکے آنکھوں سے اب کیا خاک آئے گی ۔

خون آنکھوں سے اب نہیں آتا ۔۔۔ زخم سینے کے بھر گئے شاید
حضرت دل کی وہ تپش نہ رہی ۔۔۔ کوچ پہلو سے کر گئے شاید
چشم تر ہے سینۂ سوزاں میں جان زار گھٹتی ہے۔ درد جگر ہے منہ پر ہوائی سی چھٹتی ہے ۔

موت ہی اب تو زیست ہے کہ بہت ۔۔۔ درد دل کا علاج کر دیکھا
جیتے جی موت کی بھی لذت کو ۔۔۔ خوب دیکھا کہ تجھ پہ مر دیکھا
شہر میں لڑکے ستاتے ہیں جنگل سے [illegible] کھینچ لاتے ہیں نہ آبادی میں چین ہے نہ ویرانہ میں آرام ہے۔ ہر جگہ دل مبتلائے اندوہ و آلام ہے ۔

شہر سے دل اُچاٹ ہے انس نہیں اُجاڑ سے
پھوڑئیے سر کو اے جنوں کون سے اب پہاڑ سے

رقعہ در ترک کاف

بڑھی سینہ میں آتش رفتہ رفتہ آہ وہ نالے سے ۔۔۔ سنبھلتا ہی نہیں اب تو دل مضطر سنبھالے سے
[illegible] برق وہ [illegible] آتش عشق [illegible] ۔

برس [illegible] ہے [illegible] ۔۔۔ [illegible] تصور میں مزہ آتا ہے

جب تصویر خیال مد نظر ہوتی ہے تیری صورت یاد آتی ہے۔ دم الٹ جاتا ہے پھر دل سینے میں سانس نہیں سماتی ہے۔ داغوں سے پیپ بہتی ہے۔ سینہ میں ہمیشہ سوزش رہتی ہے۔ لبوں پہ نالہ ہے۔ زباں پر بتنالہ ہے۔ سینہ خزینۂ ابر بہار ہے چشمہ چشم آبشار ہے خار صحرا آبدار ہیں۔ تلووں میں چھالے ہیں۔ حضرت دل غمخوار ہیں الاجان لینے والے ہیں۔ خیال رخ جانانہ نعیمت و بندا فسانہ ہے۔ ناخن وحشت سے سینہ پر خراش ہے۔ خنجر تغافل سے زخم دل رنجور پاش پاش ہے۔ تپ دوری سے چہرہ زرد ہے سوز مہجوری سے لب پر آہ سرد ہے۔ شب تنہائی میں اختر شماری ہے یہ نئی بیماری ہے ۔

اس تڑپنے سے تمہارے مری جان عاری ہے
آنکھ پھر حضرت دل آنکھ سے خوں جاری ہے

رقعہ در ترک لام

دو دن کی زندگی میں یہ ہے ہم کے ہوئے ۔۔۔ جوش جنوں نے زور کیا جب بہار کے
زینت بزم موافقت رونق صدر موانست دام مجدکم ۔

رخصت سیر باغ تک نہ ہوئی ۔۔۔ یونہی جاتی رہی بہار افسوس
تقدیر نے شب ہجر سے زیادہ روز سیاہ دکھائے گیسوئے عنبریں کے پھندے سے کبھی چھوٹنے نہ پائے۔ جگر میں خنجر مژگاں کی کاوش ہے آنکھوں سے خون ناب کی ہر دم تراوش ہے۔ آئینہ رخ کی یاد میں جو حیرانی ہے وہ کہہ نہیں سکتا ہوں دیوانوں کی طرح ہر ایک کا منہ تکتا ہوں۔ افسانہ رنج و فراق ہے۔ قصۂ حیات مستعار تھوڑا ہے چھاتی پر غم کی تکیہ ہے۔ سینہ میں ناسور ہے پھوڑا ہے ۔

دیکھئے اب کے غم سے جی میرا ۔۔۔ نہ بچے گا بچے گا کیا ہوگا
آنکھوں کا پانی آہ سرد کی کثرت سے یکبارگی جم کے برف ہو گیا۔ یہی سوزش غم دوری کے واسطے مرہم تھا سو یوں صرف ہو گیا جب اپنی حسرت پر ہنسی آتی ہے تو انسان حیران آنسو بہا کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ سنگ خارا حباب کی طرح پھوٹ کر بہہ جاتے ہیں ۔

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا ۔۔۔ پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

رقعہ در ترک میم

آپ وہ چہرۂ روشن جو دکھا دیں بخدا ۔۔۔ بیقراری دل بیتاب کو ہرگز نہ رہے
سرد گلزار رعنائی تدرد کوہسار بیوفائی زید اللہ حسنہ ۔

ہجر سے دل ٹوٹ گیا اے پیارے ۔۔۔ زندگانی ہی سے جی چھوٹ گیا اے پیارے
الفت نے دیوانہ بنایا ہے۔ جوش وحشت نے جنگل دکھایا ہے۔ جسے عشق کہتے ہیں

وہ قیدِ فرنگ ہے جیاتِ دو روزہ سے چھوٹتے نہیں پاتے دل بہت تنگ ہے نہ خود کسی کی صحبت کے قابل رہے ہیں نہ دوسرے کو مجالِ افشائے راز پاس بٹھا سکتے ہیں نہ وصالِ یار ہی نصیب ہوتا ہے نہ جانِ زار ہی نکل چکتی ہے۔ رات دن تپِ فراق سے پڑے سسکتے ہیں نہ اپنے بیگانہ سے اُنس ہے نہ تنہائی گوارا ہے۔ ادہر سیر گلزار سے بکل ہوتی ہے ادہر خار صحرا سے طبیعت پریشان ہے آوارہ ہے جب آنکھوں سے آنسو نکلتے ہیں تو آہ سوزاں جلا دیتی ہے اور جو کبھی آتش سینہ میں بھڑک اُٹھتی ہے تو اشکوں کی جھڑی بجھا دیتی ہے اربعہ عناصر سے پوچھئے تو سوائے آب کے خاک باقی نہیں ہے سر سے پاؤں تک دھواں بھرا ہے دل و جگر جل کر برباد ہو گئے۔ جھکو سے سینہ خالی دھرا ہے ؎

سینہ کو شعلۂ تپ فرقت سے بھر دیا ۔۔۔ دل کو جگر کو آپ پہ قربان کر دیا

رقعہ در ترک نون

بہت بیکل ہے دُوری سے تپِ فرقت سے مرتا ہے
خبر لے او بتِ بے رحم عاشق کوچ کرتا ہے

اختر برج دفق دوار گوہر دُرجِ صدق و صفا ہمیشہ سلسلۂ محبت یکتا باد ؎

شدّتِ غم سے کیسی حالت ہے ۔۔۔ دل کو پہلو سے آج دیکھ تو لو

غم و الم کی کثرت سے دل کی جگہ پہلو پہ صرف داغ رہ گیا ہے۔ افسوس دود آہ کی نمایش سے گل ہو کر ایسا مردہ چراغ رہ گیا ہے۔ اس داغ سے کباب کی بو آتی ہے تمام چھاتی جلی جاتی ہے باقی جگر رہا سو وہ لہو ہو کر پردۂ چشم پر جم گیا۔ دیدۂ حیرت زدہ قطرۂ آب کو ترس گئے۔ اشک ایسا کہ تھم گیا ہر لحظہ شمع رو کی لو لگی رہتی ہے۔ فرطِ آہ سے چراغ حیات گل ہے ہر دم رخسار کا خیال آتا ہے۔ پہلو سے شورِ بلبل ہے جسم زار ضعف سے بیٹھا جاتا ہے مگر قدم وحشت ہر بار صحرا کی طرف اُٹھتا ہے۔ چھاتی داغہائے جگر سوز سے تختۂ لالہ زار ہے۔ دم آنے جانے گھٹتا ہے شب روز فراق سے چلاتے چلاتے تالو چھل گیا۔ تپ ہجر کا وہ صدمہ ہوا کہ خوف سے کلیجہ ہل گیا ؎

اب بھی دیدار دکھاؤ تو شفا ہوتی ہے ۔۔۔ گرچہ فرقت سے بُرا حال ہے لب پر دم ہے

رقعہ در ترک واو

مرضِ عشق جان لیتا ہے ۔۔۔ صدمۂ ہجر مار دیتا ہے

شمع محفل اخلاص چراغ مجلس اختصاص چہرۂ مراد درخشاں باد ؎

دل میں آتش بھری ہے کثرت سے ۔۔۔ ڈبڈبائی ہے آنکھ حسرت سے

دردِ فرقت رگ رگ میں جاری ہے کسی طرح شفا نہیں ملتی جان عاری ہے۔ سنتے ہیں اس کا معالجہ شربتِ دیدار ہے جس کا میسر آنا محال ہے۔ تلاش طراز مربکار ہے ہر دم آنکھ سے

لختِ جگر ٹپکتا ہے۔ عاشق جاں نثار کا یہی کام ہے ہر گھڑی سینہ میں خارِ غم کھٹکتا ہے جاں کنی اسی کا نام ہے۔ ضعف سے غش چلے آتے ہیں۔ نیند کا بہانہ ہے دل پر زخم محبت کاری لگا ہے زیست کا کیا ٹھکانہ ہے۔ آنکھیں سرخ ہیں۔ چہرہ زعفرانی ہے۔ جسم زار پہ داغ مثلِ چراغ چمکتے ہیں کشتۂ فراق کی یہی نشانی ہے ہمیشہ خیالِ یار کا سامنا ہے۔ دلِ مضطر کا بہت مشکل تھامنا ہے۔ اب درد جدائی سے دم میں ہزار ہزار بار بگڑتے ہیں۔ رات دن تپِ فراق سے جلتے ہیں۔ پڑے ایڑیاں رگڑتے ہیں ؎

خبر لیجئے یاں تلک آیئے ۔۔۔ خدا کے لئے شکل دکھلایئے

رقعہ در ترک ہائے ہوز

چشم دریا بار سے اب خونِ دل آنے لگا
دشتِ وحشت سوئے داماں آپ ہی جانے لگا

دُرِّ غرر دریائے محبوبی لؤلوئے لالائے بحرِ حُسن و خوبی تا گردش آفتاب الماس محبت تاباں باد ؎

سوزِ جگر سے آگ لگی جسم زار میں ۔۔۔ فرقت نے ڈالے زخم دلِ داغدار میں

اشکوں کی روانی نے جسم ضعیف کو پانی کا بُلبلا بنا دیا چشم خوں افشاں نے کشتیِ عمر کو ساحلِ مرگ پر لگا دیا جوشِ وحشت سے خون سودا اُبل گیا۔ بیمارِ محبت سودائی بنکر جنگل کو نکل گیا۔ خارِ صحرا نے تسلی دی دست منّت جوڑ کے آخر کار اپنا مطلب نکالا۔ پاؤں کے آبلے توڑ کے۔ دوست بن کر بُرا آزار دیا۔ پاؤں کو چُور کیا۔ چلنے سے مجبور کیا خیال کا کل پیچاں نے طبیعت کو پریشان بنایا کلیجے پر سانپ سا لوٹنے لگا جب پیچ و بل یاد آیا۔ نقاش تصوّر نے خوب کام کیا کہ ورقِ خیال پر قامت دلدار کی تصویر اُتار لی۔ فرطِ محبت میں کام آ گئی اُسی کے پاؤں پڑے اضطراب میں دلِ بیتاب کو یوں تسکین دی۔ اب رحم کیجئے۔ تشریف شریف ارزانی فرمایئے۔ خدا کے لئے عاشقِ نیم جاں کی بالیں تک خراماں آیئے ؎

شربتِ دیدار آکر دیجئے ۔۔۔ اپنے عاشق پر تلطف کیجئے

رقعہ در ترک یائے تحتانی

سنگِ فرقت پہ لا کے سر پٹکا ۔۔۔ نہ مٹا خارِ ہجر کا کھٹکا

بُلبلِ بوستانِ الفت عندلیب چمنستانِ محبت مدام غنچۂ مراد شگفتہ باد ؎

دلِ مضطر جو تا ماں دھڑکا ۔۔۔ مُرغِ بسمل سا رات بھر پھڑکا

جوشِ سودا فزوں ہوا دل لہو جگر خون ہوا بارِ محبت سر پر رکھا خوب الفت کا مزہ

چلا۔ صدمۂ فراق کو ہرگز نہ مانا ہجرِ جاناں کو وصالِ دلدار جانا، بزمِ تصور کو ہزار ہزار طرح سنوارا۔ دل پر رُخِ محبوب کا نقشہ آنا دارفتہ رفتہ جگر پر داغِ الم ہوا پہلو تختۂ لالہ زار بنا۔ آہستہ آہستہ ہجومِ زخم رنج و غم ہوا جسم زار رشکِ گلزار بنا آخر کار لب پر نالہ زبان پر شور ہوا۔ عاشقِ بدنام زندہ درگور ہوا شعلۂ آہ بھڑکا ہر جگہ ناسور ہوا خانۂ تن مو بمو خانۂ زنبور ہوا۔ عرصہ تک چہرۂ زرد پر اشکِ سرخ بہا کشتِ خشک پر ابرِ بہار کا عالم رہا۔ قصہ کوتاہ حسرت و تمنا عشق خانہ خراب کا انجام ہوا جلد خبر لو کہ ناکام محبت کا کام تمام ہوا ؎

شعلہ بھڑکا صنم دماغ جلا لو خبر ورنہ دردمند چلا

رقعہ در ترک منقوطہ

دل کم حوصلہ کو گو کہ صد ادرد رہا ہمدم اس کا گلہ آلودہ سر درد رہا
سالک مسلک وداد مالک ملکِ سداد مدام داد رس کردگار مددگار رہو ؎
سلسلہ گر کلام کا وا ہو ماجرا دردِ دل کا سودا ہو

درد دلدار کا مارا ہوا کوہ کوہ صحرا صحرا آوارہ ہوا مدام دل کو سوگ رہا دردِ سر کا روگ رہا۔ دردِ گردہ ہوا دل مُردہ ہوا دکھ درد ہم کو حصول ہوا۔ کلمۂ آہ معمول ہوا دل حالِ درد و آلام رہا مدام محو دلارام رہا ؎

ہر دم ہوسِ وصال دارد دلِ ما درد و الم و ملال دارد دلِ ما
در مرحلۂ وداد ہر سو گردد حالا کہ دگر کسال دارد دلِ ما

دل کا درد سوا ہوا۔ دود آہ دوا ہوا مادۂ سودا معمار ہوا محلِ روح مسمار ہوا علٰحدہ وہ مہرو ہوا۔ دل و گردہ لہو ہوا۔ دل مکدر رہا مدام دردِ سر رہا سائلِ درد داد کا ڈر ہوا مرگ کا ساطور ہوا۔ دود آہ کا صدمہ سہا کاسۂ الم کا دورہ رہا مدام دل کا گھاؤ ہرا رہا مرہم سود علٰحدہ دھرا رہا سہم الم دوسار ہوا درد و آہ مآل کار ہوا دلارام ہو دوا دو اِدھر آؤ مکھڑا دکھاؤ ؎

کرم کرو اِدھر آؤ کہ روح ہو مسرور دکھا دو ہم موسیٰؑ کو کوہِ لمعۂ طور

انتظام اللہ شہابی

(بقیہ صفحہ ۲۸) نہایت استقلال کے ساتھ تیز گام تھے ——— لحظہ باغیچے میں بلبل زمانے کی بے ثباتی پر نغمہ زن تھا ——— معصوم کی نگاہوں کی چھلکی ہوئی شراب کی بوندیں اُس کے رخساروں پر موتی کی طرح چمک رہی تھیں ——— دیوان خاموش تھا۔ اور کسی اہم مسئلہ کی عقدہ کشائی میں مستغرق ———

ہاں شاید میرا خیال کسی حد تک صحیح ہو ——— مگر انسان اُمیدوں کے ہی سہارے جیتا ہے اگر اسکا دامنِ حسرت چھوٹ جائے تو اس کی زندگی اُس پروانہ سے ہرگز کم نہیں جو شمع سے دور رہ کر وہ زندہ تو رہتا ہے مگر زندگی کے امن سکون سے بیگانہ ——— زندگی حادثات اور رد عمل کا نام ہے! پروانہ جلکر خاکستر ہو جاتا ہے مگر شمع کی روشنی نہیں سنولاتی ——— یہ ہے زندگی ——— اور یہ ہے زندگی کی حقیقت۔ اسلئے میں اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں ——— "اور کسی چیز کی خواہش تو نہیں ہے"؟ ——— اُنہوں نے سگار کا کش لیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ———!

مجھے کسی چیز کی حسرت نہیں ہے مگر میری موت کے بعد اتنا خیال ضرور رکھئے کہ میری یادگار کا استھان بنا دیا جائے۔ اس طرح شاید میرے والدین کو معلوم ہو جائے کہ اُن کے جگر گوشے کی ہڈیاں اس جگہ دفن ہیں اور بس مجھے کوئی آرزو نہیں ہے۔ ہوا کے تیز تیز جھونکوں سے گلاب اور چنبیلی کی ڈنگیاں ہلانے لگیں ——— اُس کے خیالات تیزی سے بدلنے لگے ——— اس طرح جیسے آفتاب کی شعاؤں میں ستاروں کی ضیائیں ماند پڑنے لگتی ہیں ——— اُس کی روح کے ہیجان کی لے ساز کی آخری آواز کے ساتھ ختم ہو چکی تھی ——— پھانسی دیدی گئی ——— آہ معصوم اور بے گناہ روح کا اضطراب ——— چند لمحوں میں اسکی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ——— اُن کے دل پر چوٹ سی لگی ——— اسکا دل اس پر لعنت و ملامت کرنے لگا ——— کوئی نامعلوم جذبہ اُسے مقتل کی طرف کھینچ رہا تھا ——— اور ہدایت کے فرشتے اُسکا منہ تک رہے تھے ——— ظالم اور بے رحم یہ تو نے کیا کیا ——— اُس کی عقل مسلوب ہو گئی ——— اور ——— ساعت معدوم، وہ اُٹھا اور قتل گاہ کی جانب تیز تیز قدم بڑھانے ——— اُسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان رواں تھا ——— اُف کتنی بھولی اور قابلِ رحم تھی اُسکی صورت۔ اُسکے منہ سے بے اختیارانہ طور پر ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی ——— خون کھولنے لگا ——— اب وہ قتل گاہ میں تھا ——— اُس کی روح میں گھٹن تھی اور جسم میں ارتعاش ——— آندھی اب بھی اپنے پورے زور شور سے چل رہی تھی ——— اُس کے کانوں میں فضاؤں سے آواز آ رہی تھی کہ یہ تیرے بھولے بسرے خواب کی کیسی تعبیر تھی ——— اُس نے معصوم کی بوسیدہ قمیص اُٹھا کر نم آلود نگاہیں اُس کے سینے پر گاڑ دیں۔ آہ میرا بیٹا ——— اُس کے منہ سے ایک الم ناک چیخ نکلی ——— دائیں ہاتھ پر "پرتش" لکھا ہوا تھا اور سینے پر کالا نشان ——— اُس سے زیادہ قوی دلائل کیا ہو سکتے تھے! ——— اسکو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اُسکو تاریخ حیات دیکر واپس لے لی ہو ——— آندھی ——— سکوت ——— آہیں اور آنسو ———

ہلال پریمی

آ

اپنے جلوؤں سے تجلی خانۂ عشرت بنا
آ مرے ظلمت کدے میں اور اسے جنت بنا

دے نئے پیام زندگی مُردہ تمناؤں کو پھر
پاس سندِ عشق کی بگڑی ہوئی قسمت بنا

دل کے زخموں کو ذرا پھر نشترِ مژگاں سے چھیڑ
درد کی ہر ٹیس کو پھر محشرِ لذت بنا

جاگ اٹھے تیرے دیوانے کا پھر ذوقِ جنوں
نالۂ زنجیر کو ہنگامۂ وحشت بنا

دوں پیامِ آرزو میں بھی تجھے آنکھوں میں پھر
میرے نالوں کو وفائے عشق کی حجت بنا

کھول دے زلفِ مسلسل دے نئے جلوہ بار پھر
ظلمتوں کو نور کردے نور کو ظلمت بنا

کر رہے تب روئے انور سے مرا روزِ فراق
گیسوئے شبرنگ سے میری شبِ فرقت بنا

چشمِ حیرت آفریں سے دیکھ لے میری طرف
میرے دل کو جوہرِ آئینۂ حیرت بنا

اپنے آئینوں میں آ کر اپنے ہی جلوؤں کو دیکھ
اپنی تصویروں میں اپنے رنگ کی صورت بنا

تیری آنکھوں کو ہر اک سو تو ہی تو آئے نظر
عالمِ کثرت کو اک دن عالمِ وحدت بنا

آلم مظفرنگری

حوصلۂ گناہ

نقد و نظر فضول ہے حُسن کی جلوہ گاہ سے
عشق کو دیکھ عشق کے زاویۂ نگاہ سے

پایا ہے حاملِ فروغ اپنی ہی گردِ راہ کو
گذری ہے جب نگاہِ شوق جادۂ مہر و ماہ سے

میرا ہی شوق و اضطراب کر گیا اُن کو بے نقاب
ورنہ وہ مطمئن سے تھے جلوہ گاہ گاہ سے

حُسنِ تباہ کار کی برہمیاں نہ پوچھئے
پھونک دیے کلیم و طور اُس نے فقط نگاہ سے

موت و حیات کے نقوش شعبدہ ہائے صبح و شام
منزلِ شوق بے خبر آگے ہے گردِ راہ سے

وسعتِ دو جہاں بلی ذرے کی طرح تنگ و تار
لوٹا ہیں کامیاب جب آپ کی جلوہ گاہ سے

حادثہ ہائے درد و غم، سنگِ منازلِ حیات
ان کو اگر ہے دیکھنا، دیکھ مری نگاہ سے

رحمتِ خاص کو تری زحمتِ عفو کون دے
ورنہ مجھے اور احتراز حوصلۂ گناہ سے!

فضل الدین آشر اکبرآبادی
ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

جاسوس

جاسوس کی شکل و صورت کے متعلق **فاؤلر** کے ذہن میں جو تصورات پہلے سے موجود تھے **اوزابل** قطعی طور پر اس کے برعکس ثابت ہوا۔ وہ اس کی خیالی تصویر سے کوئی مطابقت نہ رکھتا تھا ـــــ فرانس کے ایک معمولی ہوٹل میں اوزابل کا قیام تھا ـــــ فاؤلر کے خیالات کی شکست اس کے دل میں ندامت اور افسوس کی ہلکی سی مجموعی کیفیت کی تخلیق کا باعث بن گئی ـــــ اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے خواہ مخواہ ایک لایعنی خیال کو اہمیت دے کر اپنا وقت ضائع کیا ہے ـــــ ہوٹل کی چھٹی منزل میں اوزابل کا کمرہ تھا جس کی تعمیر میں اس درجہ غیر معمولی اختصار سے کام لیا گیا تھا کہ اُسے دیکھ کر وحشت ہونے لگتی تھی ـــــ ظاہر ہے کہ اس کمرے کو جاسوسی کے عجیب اور تحیرزا افسانوں کی تعبیر سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا ـــــ پھر خود اوزابل کی ہیئت کذائی ـــــ اس کا میلا اور شکن آلودہ سوٹ فاؤلر کے ذہنی خاکہ سے بہت دُور تھا ـــــ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ فربہ اندام تھا ـــــ اور اس کی زبان ـــــ یہ عجیب بات ہے کہ وہ فرنچ اور جرمن دونوں زبانیں نہایت شستگی اور خوبی کے ساتھ بول سکتا تھا لیکن اپنی مادری امریکن زبان کو صحیح تلفظ اور درست لہجہ کے ساتھ ادا کرنے پر قادر نہ تھا۔ ممکن ہے پیرس میں متواتر بیس سال قیام اس کا باعث ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا ہے ـــــ اوزابل نے پیچھے مُڑ کر فاؤلر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا:۔

"آپ کو بتایا گیا تھا کہ میں جاسوس ہوں ـــــ جاسوس ـــــ یعنی ایک حیرت انگیز اور افسانہ خیز شخصیت ـــــ جس کی زندگی عبارت ہوتی ہے متواتر خطرات کے ایک بھیانک مگر دلچسپ تسلسل سے ـــــ شاید آپ اس لئے یہاں آئے ہیں کہ میری کتاب حیات کے کسی پسندیدہ باب کا مطالعہ کر سکیں۔ کیونکہ آپ مصنف ہیں ـــــ ایک نوجوان اور پُرجوش مصنف ـــــ جب جاسوس کا تصور آپ کے ذہن میں آتا ہوگا تو آپ خیال آرائی کیا کرتے ہونگے کہ ـــــ اندھیری رات میں منہ پر سیاہ نقاب ڈالے ایک اجنبی ہستی سایہ کی مانند بڑھتی چلی آرہی ہے اچانک پستول کا دھماکا ہوتا ہے ـــــ یا شراب میں کوئی جان لیوا زہر حل کیا جاتا ہے ـــــ یا پھر کوئی بیہوشی کی دوا دی جا رہی ہے ـــــ مگر یہاں ان تمام باتوں کے برعکس آپ کو سابقہ پڑتا ہے۔ ایک موٹے تازے، نفرت خیز اور کریہہ صورت آدمی سے ـــــ جس کے ساتھ آپ کو اپنی ایک قیمتی شام فرانس کے ایک ایسے رقص کدہ میں گذارنی پڑی جہاں نہ کوئی غیر معمولی اور متحیر کن حادثہ پیش آیا اور نہ کوئی مخبر حسینہ ہاتھ میں کوئی کاغذ کا ایسا پرزہ دے گئی جس میں کوئی سنسنی خیز اطلاع تحریر ہوتی یا کسی راز سربستہ کا انکشاف ہوتا ـــــ ہاں ایک مرتبہ ٹیلیفون کے کمرہ تک جانا پڑا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کمرہ میں جہاں اس وقت ہم موجود ہیں، فون پر کسی سے ملاقات کے متعلق گفتگو کرنی تھی ـــــ بہرکیف ظاہر بھی ہوتا ہے کہ مجھ سے متعلق آپ کے تمام ترقیاسات بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں۔"

فاؤلر مبہوت اور ششدر کھڑا یہ سب باتیں سُن رہا تھا۔

آپ کو جاسوس کی اصلیت آج معلوم ہوئی ہے ـــــ اوزابل نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ـــــ "لیکن اگر آپ تھوڑی دیر اور تحمل و اطمینان سے کام لیں تو آپ ایک ایسا عجیب و غریب کاغذ دیکھیں گے۔ جس کے فکرِ حصول میں بہت سے لوگوں نے جان کی بازی لگا رکھی ہے ـــــ ممکن ہے آئندہ کسی زمانہ میں یہ کاغذ ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کرلے۔ کہئے۔ کیا آپ کے لئے یہ چیز موجبِ مسرت ہوگی؟"

اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے اوزابل نے کمرہ کا دروازہ بند کر دیا اور بجلی کا بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ روشنی کے ساتھ ہی فاؤلر کو پہلی مرتبہ کسی قدر رنگینی آمیز دہشت محسوس ہوئی۔ اُس نے دیکھا ـــــ کمرہ کے عین درمیان میں ایک تیسرا شخص ہاتھ میں پستول لئے کھڑا ہوا ہے اور پستول کا رُخ ان دونوں کی طرف ہے۔

ایک لمحہ کے لئے اوزابل کے چہرہ پر خوف و دہشت اور حیرت و استعجاب کے آثار پیدا ہوئے مگر وہ بہت جلد ہوش و حواس کی پوری قوت کے ساتھ بولا:۔

"اوہ مارکس ارے تم نے تو مجھے چونکا دیا۔ میرا خیال تھا کہ تم آج کل برلن میں ہو خیر کہو یہاں میرے کمرہ میں اس وقت کس غرض سے آدھمکے؟"

مارکس طویل القامت اور چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ جس کی شکل و صورت

کو ایک چالاک لومڑی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اگر پستول کو نظر انداز کر دیا جائے تو کمرہ میں اس طرح اس کی موجودگی بالکل بے خطر قرار دی جاسکتی تھی۔

"وہ رپورٹ" ——— اُس نے دھیمی آواز میں کہا ——— "وہی رپورٹ جو جرمنی کی فضائی قوت سے متعلق ہے اور جو آج رات تمہارے پاس پہنچنے والی تھی میں نے سوچا کہ میں اس کو تمہاری بہ نسبت زیادہ محفوظ طور پر رکھ سکتا ہوں۔"

اوزابل شدید غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا :-

"عجیب بد دماغ شخص ہے یہ ہوٹل کا منیجر ——— میں اس کو کئی بار متنبہ کر چکا ہوں۔ مگر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ یقین کرو اس ماہ میں آج یہ دوسرا واقعہ پیش آیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک شخص تمہاری ہی طرح اس کمبخت چھجہ پر چڑھ کر، کھڑکی کی راہ سے کمرہ میں گھس آیا تھا۔

کمرہ میں ایک معمولی سی کھڑکی تھی۔ فاؤلر نے اُس طرف دیکھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اُس کے باہر چاروں طرف تاریکی مکمل طور پر تسلط جمائے ہوئے تھی۔

"چھجا" ——— مارکس نے تعجب کے ساتھ کھڑکی کی طرف دیکھ کر اوزابل کی بات کا تردیدی جواب دیا ——— "نہیں جناب! میں نقلی کنجی کی مدد سے اندر آیا ہوں۔ مجھے پیشتر سے علم ہوتا تو کنجی بنوانے کی زحمت سے بچ جاتا۔"

"یہ اور طرفہ تماشا ہے کہ چھجہ میرے کمرہ کا نہیں ہے" ——— اوزابل نے غضب آلود لہجہ میں کہنا شروع کیا ——— "دراصل یہ بغلی کمرہ کا چھجہ ہے جو نہایت بھونڈے طریق پر میرے کمرہ کی کھڑکی سے ملحق ہو گیا ہے۔"

"بات یہ ہے!" ——— اُس نے فاؤلر پر ایک سلیس نگاہ ڈالتے ہوئے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا ——— "یہ بغلی کمرہ، ہوٹل کے بڑے کمرہ کا ایک جزو تھا لیکن اب اس کو علیحدہ کر کے ایک مستقل رہائشی کمرہ بنا دیا گیا ہے۔ چھجہ اسی کمرہ پر بنایا گیا ہے تحتی یا اس بغلی کمرہ میں ہو کر ہر شخص بآسانی میرے کمرہ میں آسکتا ہے۔ چنانچہ ابھی چند روز پیشتر یہاں ایک آدمی آچکا ہے ——— منیجر صاحب اگرچہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ چھجہ اور کھڑکی کے درمیان ایک دیوار بنوا دی جائیگی۔ مگر آپ جانتے ہیں ان منیجروں کی بات کا کیا اعتبار؟"

فاؤلر اوزابل کے قریب سکتہ کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ مارکس نے پستول کا ایک معنی خیز اشارہ کیا اور دونوں سے مخاطب ہو کر بولا :-

"اچھا آپ لوگ بیٹھ جائیں۔ ابھی ہم کو نصف گھنٹہ تک اور منتظر رہنا پڑیگا ——— کم از کم نصف گھنٹہ ——— کیوں اوزابل! ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں صرف گیارہ منٹ" ——— اوزابل نے جواباً کہا :- "ساڑھے بارہ بجے کا وقت ملاقات کے لئے طے ہوا تھا ——— ہاں یہ تو بتلاؤ؟ تمہیں اس رپورٹ کے بارے میں کیسے اطلاع ملی؟!"

پستول تانے ہوئے مارکس نے مصنوعی ہنسی کے ساتھ جواب دیا :-

"اور معلوم نہیں یہ رپورٹ جرمنی کے باہر پہنچی کس طرح؟ ——— خیر اب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ عنقریب میرے ہاتھ میں آجائے گی۔"

دروازہ پر کسی کے دستک کی آواز سُن کر فاؤلر چونک اُٹھا۔

"کون؟"

"پولیس کے سپاہی ہیں" ——— اوزابل ایک مکمل بے پروائی کے عالم میں جمائی لیتے ہوئے بولا ——— "میں نے سوچا کہ اس قدر اہم کاغذ ہے اس لئے اس کے تحفظ کا کافی انتظام کرنا چاہئے!"

مارکس شدید غصہ کی حالت میں اپنا ہونٹ کاٹنے لگا۔ دروازہ پر دوبارہ کھٹ کھٹ ہوئی۔

"اب کیا کرو گے مارکس؟" ——— اوزابل نے طنزیہ لہجہ میں دریافت کیا ——— "اگر میں خاموش رہتا ہوں تو وہ خود دروازہ کھول کر اندر آجائیں گے۔ تالا کھلا ہوا ہے۔ اگر تم نے بھاگنے کی سعی کی تو یاد رکھو یہاں کی پولیس گولی چلانے میں بہت مشاق ہے۔"

مارکس کا چہرہ زرد ہو گیا ——— وہ آہستہ آہستہ اُلٹے پاؤں کھڑکی کی طرف جانے لگا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر اُس نے بایاں پاؤں چوکھٹ پر رکھ دیا۔ اور دھیمی آواز میں تحکمانہ انداز میں کہنے لگا :-

"پولیس کو واپس بھیج دو! میں پیچھے پر انتظار کرونگا ——— ان کو فوراً واپس کر دو، ورنہ میں گولی چلا دونگا اور یہاں کھلبلی مچ جائیگی۔"

دروازہ پر کھٹ کھٹ کی آواز مسلسل تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"موسیو! ——— موسیو اوزابل!!" ——— باہر سے کسی نے بلند آواز سے پکارا۔

مارکس ایک ہاتھ میں ہوشیاری کے ساتھ پستول تھامے ہوئے تھا لبلبی پر اُس کی انگلی تھی ——— وہ فاؤلر اور اوزابل دونوں کو نشانہ بنائے ہوئے تھا

دوسرے ہاتھ کی مدد سے اُس نے پوکھٹ کو مضبوط پکڑ لیا اور اچک کر کھڑکی پر چڑھ گیا۔

دروازہ کُھلنے لگا۔ مارکس بائیں ہاتھ کا سہارا لیکر اُلٹے پاؤں پیچھے پر کود پڑا۔ کودنے کے ساتھ ہی ایک خوفناک چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور ــــــــ

دروازہ کُھلا۔ ہوٹل کا ملازم ٹرے میں شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے کمرہ میں داخل ہوا۔

"حضور! آپ نے رقص کدہ سے واپسی پر "کونیاک" پیش کرنے کا حکم دیا تھا وہی لیکر حاضر ہوا ہوں"!

یہ کہہ کر ملازم نے ٹرے میز پر رکھدی اور سلیقہ کے ساتھ بوتل کا کارک کھول کر باہر چلا گیا۔

فاؤلر کے چہرے سے انتہائی خوف و حیرت ظاہر ہو رہی تھی۔ اور وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے ملازم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جب ملازم نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ اوزابل کی طرف متوجہ ہوا اور ہکلا کر بولا:ــــ

"لیکن وہ پولیس کے پاہی؟"

"پولیس" ــــ اوزابل نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور مسکرا کر جواب دیا :"ارے پولیس ولیس کچھ نہیں یہ صرف ہنری تھا۔ ہوٹل کا ملازم ــــ جسے میں نے رقص کدہ جاتے ہوئے اس وقت یہاں شراب پہنچانے کے لئے کہا تھا"

"لیکن اگر مارکس واپس آیا تو ــــ ؟" ــــ فاؤلر نے دہشت آگیں انداز میں کانپتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں ــــ ہرگز نہیں" ــــ اوزابل نے جواب دیا ــــ "وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا ــــ کھڑکی کے نیچے کوئی چھجہ نہیں ہے اور یہاں سے زمین کا فاصلہ بہت طویل ہے!"

مصنفہ
رابرٹ آرتھر

مترجمہ
امتیاز نسیمی (دیوبند)

(بقیہ صفحہ ۵۲)

جناب مسلم جبلپور

چراغِ آرزو کو شوق کی جب روشنی دیدی ۔۔۔ تمہیں سے لو لگائی اور تمہیں پر جاں بھی دیدی
مٹا کر عشق میں مجھکو حیاتِ دائمی دے دی ۔۔۔ تمہارے حُسن کے فیضان نے دُنیا نئی دیدی

جناب طالب بھاگلپوری

نہ سجدہ ریز ہے کیوں آستانِ غیر پر طالب ۔۔۔ تجھے بھی عشق نے کیا قیس کی وارفتگی دے دی

جناب اختر زاہدی

جو دل پر چوٹ دل وجہ نشاطِ بزمِ ہستی ہے ۔۔۔ مجھے دل دیکے اک دُنیا کو تم نے زندگی دے دی

جناب حسن از چھندواڑہ

خدا کی شان ہے یہ حسن اجارہ کچھ نہیں سمیں ۔۔۔ نگاہِ ناز اُن کو اور ہمیں وارفتگی دے دی

جناب آرزو اکبرآبادی

وہ اب کیا چاہتے ہیں آکے تربت پر کہیں دن ۔۔۔ ہمارے پاس اب کیا ہے فقط اک زندگی تھی دیدی

جناب سلطان نقشبندی باردولوی

نئے سر سے کسی کی یاد نے وارفتگی دے دی ۔۔۔ میں خود کو بھولتا جاتا ہوں ایسی بیخودی دیدی

جناب زہری رہتوی

[illegible] ۔۔۔ یہ بھی خود نمائی تھی کہ جس نے بیخودی بھی دی

جناب نسیم از فروکہ ضلع سرگودھا

بظاہر محوِ حیرت ہو گئیں۔ لیکن حقیقت میں ۔۔۔ "ترے جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دیدی"

جناب بیدل گگھرپوری (مرادآباد)

تمہارے بارِ احساں سے بار تھا یہ بیدل ۔۔۔ ذرا سی جان کا احسان تھا وہ جان بھی دیدی

جناب اشرف گیاوی

جھکے آنے ہیں کیا کیا داک صحرا خوشی کے مارے ۔۔۔ جنونِ عشق نے یوں تارِ دامن کو کمی دیدی

جناب نصیر مدسی

نصیر اب دیدنی عالم ہے اپنے دیدۂ دل کا ۔۔۔ نہ جانے کس کے جلوے نے نئی اک زندگی دیدی

جناب عشرت صالحپوری

میں اب کھویا ہوا ہوں ایک رومانِ تصور میں ۔۔۔ یہ اُنکی یاد نے کیسی انوکھی اک بیخودی دیدی

جناب محمود دایوی

تمہیں محمود کچھ نسبت نہ تھی سلطان غزنی سے ۔۔۔ مگر اس عشق نے تم کو بھی شانِ غزنوی دیدی

> **مشاعرۂ شاعر** مصرع طرح برائے ماہ جون ۱۹۴۳ء
> "یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"
> آستیں، زمیں وغیرہ قوافی "میرے لئے" ردیف

تبرکات

یہ جی میں ہے کہ دل کی داستانِ غم بیاں کر دیں
انھیں نا آشنائے لذّتِ خوابِ گراں کر دیں

کہیں اک بار دل سے ہو جو زندانِ جہاں کر دیں
تو پیدا بزمِ امکاں میں فضائے لامکاں کر دیں

ابھی ظاہر ہم اپنے دل کی کیوں بیتابیاں کر دیں؟
ابھی تو اُن کو موقع ہے نہیں کر دیں کہ ہاں کر دیں

شکستِ دل کو ہم رنگِ نشاطِ جاوداں کر دیں
شگفتِ غنچہ میں پیدا ہم اندازِ فغاں کر دیں

شناورِ ہنگامۂ ہستی کی غایت ڈھونڈنے والے
خلافِ مصلحت افشا وہ کیوں رازِ نہاں کر دیں؟

جنوں کی پردہ داری سے مآل اندیش بنتے ہیں
وگرنہ ہم تو دامانِ خرد کی دھجیاں کر دیں

تمہاری سرد مہری کے خنک چھینٹوں میں کیا دم ہے
ہماری سرد آہیں جب کہو آتش بجاں کر دیں

گرا دیں ہم کو نظروں سے وہ ایسے بے بصر کب ہیں
نہ ایسے ہم سبک سر ہیں کہ اُن کو سرگراں کر دیں

قریبِ منزل آ کر ہمت آخر ہار دیں کیونکر
یہ ساری کی کرائی اپنی محنت رائیگاں کر دیں؟

کفن باندھے ہوئے سر سے ہیں اپنا عزم راسخ ہے
حصولِ مدعا کی نذر جانِ ناتواں کر دیں

مساعد ساز و ساماں بخت یاور مہرباں ساقی
حسن چاہیں تو ٹھیک اب ہم مزاجِ آسماں کر دیں

سیّد حسن امام مدیر "ندیم" گیا

شاعر کی دُنیا

ہے دُنیا مری، چاند تاروں کی دُنیا
تماشوں کی دُنیا، نظاروں کی دُنیا

چمکتے ہوئے جگنوؤں سے بسی ہے
لہکتے ہوئے سبزہ زاروں کی دُنیا

مہکتے ہوئے پھول کلیوں کا عالم
چہکتے ہوئے مرغزاروں کی دُنیا

پھڑکتے ہوئے جان لیوا نظارے
چھلکتے ہوئے آبشاروں کی دُنیا

کہیں وادیاں ہیں کہیں ندیاں ہیں
بلند از نظر کوہساروں کی دُنیا

یہ احباب کی محفلیں خوبصورت
یہ یاروں کی بستی یہ پیاروں کی دُنیا

کہیں میٹھی میٹھی خوشی کی ترنگیں
کہیں سونی سونی مزاروں کی دُنیا

کہیں مطمئن کامگاروں کی محفل
کہیں مضطرب دلفگاروں کی دُنیا

مچلتے ہوئے اہلِ تسکیں کے نغمے
بدلتی ہوئی بیقراروں کی دُنیا

کہیں حسن کے شاہ پاروں کی بستی
کہیں عشق کے سوگواروں کی دُنیا

خوشی بھی الم بھی، وفا بھی جفا بھی
بہاروں کا عالم سہاروں کی دُنیا

کہیں مطلقاً بادہ خواروں کا مجمع
کہیں صرف پرہیزگاروں کی دُنیا

کہیں وحشیانِ محبت کے محشر
کہیں ہوش میں ہوشیاروں کی دُنیا

وہ دُنیا ہے میری، وہ عالم ہے میرا
کہ ہے رشک میں تاجداروں کی دُنیا

تخیل مرا خالقِ شعریت ہے
یہ فطرت کے ہے شاہکاروں کی دُنیا

حاجی نبی احمد بریلوی

ضعیف الاعتقادی اور جوانی

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایک اُداس، مضمحل اور محتاط نوجوان کس کام کا؟ اس میں شک نہیں کہ دنیا کی ننانوے فیصدی آبادی اسی میں زندگی کی کامیابی کا راز سمجھے ہوئے ہے کہ وہ نہایت پُرامن اور محتاط زندگی بسر کرے جس میں نہ کوئی ہنگامہ ہو اور نہ کوئی کارنامہ اور نہ پڑوسیوں تک سے "تُو تُو میں میں" کی نوبت آئے۔ عام طور سے مذہبی اصولوں اور حکیمانہ اقوال کے مطابق زندگی بسر کرنے کو زندگی کا نصب العین سمجھ لیا گیا ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ اس شخص کو حیرت و تعجب یا شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے جو قدیم اقوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دُنیا کے موجودہ پُرسکون نظام میں ذرہ برابر بھی انقلاب پیدا کرنا چاہے۔ اس کے برعکس اس شخص کو عالم اور درویش سمجھا جاتا ہے جس کی گفتگو میں حکیمانہ اور دور اندیشانہ اقوال کو زیادہ سے زیادہ دخل ہو، چاہے وہ اقوال موقع و محل کے لحاظ سے اب کتنے ہی فرسودہ کیوں نہ ہو گئے ہوں۔ عام لوگوں کی رات دن کی گفتگو میں بھی ضعیف الاعتقادی اور بزدلی نمایاں طور سے نظر آتی ہے یہی تو وجہ ہے کہ ۹۹ فیصدی انسانی آبادی جہاں کوئی دلیرانہ قدم اُٹھانے کے لئے اپنے آپ کو نااہل سمجھ لیتی ہے وہاں اُسے اپنی موجودہ پستی بھی باعثِ ننگِ حیات نہیں معلوم ہوتی ——— چونکہ دنیا کی انسانی آبادی کا بیشتر حصہ ضعیف الاعتقاد افراد پر مشتمل ہوتا ہے لہذا ان بزدلانہ اور حکیمانہ اقوال کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی، اُس کو آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ ایک نظریہ دوسرے نظریہ کے مقابلہ میں کیونکر غلط اور صحیح ٹھہرایا جا سکتا ہے جبکہ دونوں نظریے اپنی اپنی کامیابی کے حق میں زبردست دلائل بھی رکھتے ہوں۔ آپ کو کہاں سے یہ حق حاصل ہے کہ آپ "اکریس"[1] کو بھی اسی قدر عزت اور رشک کی نگاہوں سے نہ دیکھیں جتنا کہ ایک کامیاب تاجر "سیموئل بجیٹ" کو؟ اس لئے کہ اوّل الذکر نے اپنے ناعاقبت اندیشانہ اقدام کے باعث جان دیدی اور آخر الذکر ہنوز زندہ ہے اور اُس کا روزانہ جھگڑنے کا محبوب شغل بھی جاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناقص العقل اور بزدل اشخاص کے نزدیک آخر الذکر کی زندگی میں کامیابی کا راز مضمر ہے لیکن ان پست شکن اعتقادات کے دوش بدوش پھر ہم وہ زریں اصول اور مردانہ اقوال بھی پڑھتے ہیں جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ایک شیر کی طرح قبل از وقت مر جانا اُس کتے کی طویل زندگی سے کہیں بہتر ہے جو رینگ رینگ کر دوسروں کے سہارے جی رہا ہو ——— نیلسن نے ۱۸۰۵ء میں اپنی جان کو ملک الموت کے سپرد کرنے سے بیشتر اپنے ملاحوں اور سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا "آج انگلستان ہر آدمی سے متوقع ہے کہ وہ اپنے فرض کی ادائیگی کے سامنے جان کی پروا نہ کریگا" ——— اسی طرح میری ٹیوڈر کے عہدِ حکومت میں پروٹسٹنٹ پادری لیٹیمر نے اس دُنیائے فانی کو خیرباد کہنے سے پہلے اپنے ساتھی پادری رڈلے سے کہا تھا "ماسٹر رڈلے، خوش و خرم رہو اور بہادری سے کام لو۔ ہم آج انگلینڈ میں ایسی شمع روشن کر جائینگے جو کبھی گُل نہ ہوگی"۔ تاریخی ہستیوں کے اس قسم کے اقدامات کو دُنیا کے عوام الناس چاہے کسی نظر سے دیکھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُن کی قربانیاں بھی یقیناً اس قابل ہیں کہ وہ مذاہب کے ہادیوں کی خدمات کے مقابلہ میں پیش کی جا سکیں۔ دنیا کے عام لوگوں کی ضعیف الاعتقادی کا تو یہ حال ہے کہ اُنکے نزدیک ہر وہ نوجوان شخص جو بحری سفر اختیار کرتا ہے سزا احمق ہے۔ جو شخص اپنی چھتری ساری عمر کہیں نہ بھولے اُنکی نگاہ میں وہ زیادہ قابلِ احترام ہے بہ مقابلہ اُس شخص کے جو مسکراتا ہوا دار کے تختہ کی طرف جا رہا ہو۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے ایام نہایت احتیاط اور دور اندیشی سے گذار رہا ہو ——— اُس کی مالی حالت بھی اچھی ہو اور بہت سے اُس کے دست نگر بھی ہوں تو عام لوگوں کے خیال میں بس وہی ایک کامیاب انسان ہے۔

عام لوگوں کا اعتقاد اُس وقت ضرور ڈانوا ڈول ہونے لگتا ہے جب وہ اس عقدہ لاینحل کو سُلجھانے سے اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ حضرت سلیمان سے لیکر بنجمین فرینکلن تک اُن کے ہادیوں کی جو فقیدت شدیم

[1] روم کی سرزمین میں ایک گہرا شگاف ہوگیا تھا۔ "پوپ اعظم" نے اعلان کر دیا کہ جب تک کوئی اپنی جان کی قربانی پیش نہیں کریگا اُس وقت یہ شگاف پُر نہیں ہو سکتا۔ "اکریس" روم کا ایک نوجوان اس غرض سے کہ اُس شگاف میں داخل ہو کر ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگیا تھا۔ شگاف پُر ہوگیا تھا۔

امن پسندی اور عمدہ اخلاق کا ساری عمر درس دیتے رہے۔ اہلِ عالم نے اتنی عزت نہیں کی جتنی کہ تاریخ کی اُن مایۂ ناز ہستیوں کی جنھوں نے اُنکے ہادیوں کے ارشادات کے عین خلاف کام کیا۔ تاریخی ہستیوں کے تو ملک کے بڑے بڑے شہروں میں مجسمے بھی نصب ہوگئے اور اُن کے ہادیوں کا کوئی نام لیوا تک نہیں۔ یہ گتھی بیچارے عوام سے سُلجھائے نہیں سُلجھتی اور اُن کا ضمیر اپنی ضعیف الاعتقادی کے پونچ پن کو تاڑنے لگتا ہے۔ عام لوگ **جان آف آرک** کے جذبہ اور ولولے کی قدر کرنا کیا جانیں **جان آف آرک** جس کو والدین کا سایۂ عاطفت اور پُر سکون گھر جیسی نعمتیں میسّر تھیں، بیٹھے بٹھائے حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہوکر جنگجو سپاہیوں کے ایک دستہ کی سپہ سالاری کرنے کے لئے دفعتاً تیار ہوگئی۔ اُس کے شاندار اور یادگار اقدام کو عوام اپنی بزدلانہ منطق کی بنا پر حماقت سے محمول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح جب عوام **کولمبس** کو جس کی صبر آزما رہنمائی دُنیا کے نقشہ میں سرزمینِ امریکہ کے اضافہ کا باعث ہوئی۔ ایک نا عاقبت اندیش جہاز راں سے کہنے لگتے ہیں تو کون اُنکا منہ نوچ سکتا ہے۔ **کولمبس** کی زندگی کے حالات دُنیا کے ضعیف الاعتقاد اور بزدل لوگوں کے لئے خطرہ کے الارم کی سی حیثیت رکھتے ہیں **کولمبس** کے نقشِ قدم پر چلنے سے وہ اپنے بچوں کو اسی طرح باز رکھتے ہیں جس طرح کسی خراب سے خراب کام سے ـــــ تاریخی ہستیوں کے لاتعداد ناموں اور کارناموں کو یہاں پیش کرنا لاحاصل ہے۔ دُنیا کے عوام الناس کے طبقہ کو بس ایک ایسا گروہ سمجھئے جو آنکھوں پر دقیانوسیت کی پٹی باندھے ہوئے اندھا دُھند چلا جارہا ہے۔ ایک ساہوکار اور سود خوار کے سامنے تاریخی ہستیوں کے کارنامے پیش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے بھینس کے سامنے بین بجانا ـــــ تصویر کے دونوں رُخ میں اشارتاً پیش کرچکا ہوں ـــــ

بزدلانہ طرزِ زندگی اور بہادرانہ طرزِ زندگی ـــــ ضعیف الاعتقاد لوگ معاملہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بھی بھلا اپنی جگہ سے کیوں جنبش کرنے لگے......

عام لوگ **بالک لاوا** کے مشہور تاریخی حملے سے متعلق واقعات یا کسی ڈرامہ کے مطالعہ کے مختلف النوع اثرات کے فرق کو بہت کم محسوس کرتے ہیں۔ وہ ان جری جنرلوں کو جو لڑائی کے میدان میں آڑے ترچھے توپ لگاتے ہوئے توپوں کے خوفناک دھماکوں کے درمیان گھوڑوں کو کُدائے پھرتے ہیں اُن ایکٹروں (ACTORES) سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے جو پردۂ فلم پر اپنے چہروں پر بہت سا غازہ تھوپے ہوئے کرایہ پر کام کرتے ہیں۔

اُنکے خیال میں ان تاریخی ہستیوں اور جنگجو جنرلوں پر "اشرف المخلوقات" کے لفظ کا صحیح اطلاق ہوتا ہی نہیں.........

ہمارے بزرگوں اور ہادیوں کے اقوال کتنے ہی دُور اندیشی پر مبنی کیوں نہ ہوں اور اپنی اصولی صورت میں چاہے وہ کتنے ہی دلکش ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُنکا عملی پہلو نہ صرف مضحکہ خیز بلکہ بنی نوعِ انسان کی زندگیوں کے لئے اسی طرح تباہ کن ہے جس طرح دیمک لکڑی کے لئے ـــــ ضعیف العمر لوگوں کے ارشادات کو زندگی کے متعلق تمامی اور قطعی سمجھا جاتا ہے اور ایک نوجوان کی پُرجوش گفتگو اور اُسکے بہادرانہ اقدام پر ہر طرف سے انگشت نمائی ہونے لگتی ہے ـــــ ایک نوجوان اور ایک ضعیف العمر کے درمیان گفتگو پر ذرا منطقی نقطۂ نظر سے غور فرمایئے ـــــ عمر رسیدہ آدمی نوجوان کے پُرجوش اور ہمت آزما ارادوں کا حال سُن کر سر ہلاتے ہوئے اُس سے کہتا ہے "آہ! میں بھی ایسا ہی سوچا کرتا تھا جب میں تمہاری عمر کا تھا"۔ اور اگر اس تاکیدِ نصیحت کے جواب میں وہ نوجوان بھی یوں جواب دیدے "میرے بزرگ! میں بھی ایسا ہی سوچنے لگونگا جب میں آپ کی عمر کو پہونچونگا۔ اسوقت تو میرے جوش اور ولولوں کا خون نہ کیجئے"۔ تو نوجوان کے اس جواب کو جواب نہیں سمجھا جاتا حالانکہ نوجوان کے ارادوں اور اُس کے اقدامات ہی میں زندگی کے صحیح مقاصد پوشیدہ ہیں۔

بقول **مِلٹن** "ضعیف العمر اور تجربہ کار اشخاص کی رائے ہماری زندگی کے نصب العین کی تکمیل میں معاون و مددگار تو ضرور ثابت ہوسکتی ہے لیکن اُسکے یہ معنی نہیں کہ اُن آرار کو صحیح معنوں میں قطعی اور تمامی بھی سمجھ لیا جائے ـــــ"

میرے خیال میں تو یہ متعدد آرار منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے مختلف راستوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں......عوام الناس میں یہ وبا عام طور سے پھیلی ہوئی نظر آئیگی کہ وہ اپنے اپنے بزرگوں اور ہادیوں کے چند فرسودہ اور غیر ذمہ دارانہ اقوال کو اپنی گفتگو میں بار بار دُہرا کر اپنے مخالف کا منہ بند کرنا چاہتے ہیں۔ جتنے زیادہ اقوال کسی کو حفظ زبان ہونگے اتنا ہی زیادہ عوام میں وہ شخص مقبول ہوگا اور ان کو گفتگو میں بار بار دُہرانا کسی طرح ایک عام شخص کی فضیلت اور انسانیت کا امتیازی نشان سمجھا جاتا ہے جس طرح ایک معمولی سپاہی کے "ڈنڈے" (STAFF) کو دیکھ کر دیکھنے والے کی آنکھوں کے سامنے کسی حکومت کے جلال اور اُسکی عظمت کی تصویر کھینچ کر رہ جاتی جلال ...

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر ملاحظہ فرمایئے)

بساطِ سخن

اُردو شاعری کے آغاز سے اسوقت تک کے مشاہیر شعرا کے کلام کی نمایاں خصوصیات پر ایک منظوم اجمالی تبصرہ ـــــ انتہائی غور و فکر اور تحقیق کی روشنی میں

از ـــــ اعجاز صدیقی

سنہ ۱۹۴۱ء میں جناب شبلی بی کام مدیر عالمگیر" لاہور نے "عالمگیر" کے تاریخ نمبر کے لئے ایک تاریخی نظم کا مطالبہ کیا، میں تاریخی نظم کے لئے موضوع تلاش ہی کر رہا تھا کہ ایک رات حضرت امیر خسروؒ کی زیارت سے شرف یاب ہوا۔ امیر جادہ سخن حضرتِ امیر خسرو نے فرمایا کہ" پریشان کیوں ہوتا ہے مجھ سے لیکر اپنے تک ہر دور کے مشاہیر شعرا کے کلام کی خصوصیات کو نظم کر ڈال"۔ بیدار ہوا تو دل و دماغ پر ایک سرمستی سی طاری تھی۔ میں اس اشارہ غیبی سے جتنا مسرور تھا اتنا ہی متردد بھی، تردد صرف نظم کی اہمیت اور تکمیل کار کے متعلق تھا۔ چنانچہ چند دن کے عمیق مطالعہ کے بعد صرف متقدمین کا دور ختم کر سکا۔

سنہ ۱۹۴۲ء سے اواخر فروری سنہ ۱۹۴۳ء تک اس طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملا۔ امسال پھر حضرت شبلی نے یاد فرمایا تو اس ناتمام نظم کا خیال آگیا اور اس دفعہ میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو نظم ضرور مکمل کرونگا۔ چنانچہ سات راتوں کے گہرے مطالعہ اور جانکاہ کوشش و کاوش سے جو کچھ ہو سکا ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس نظم کے ہر قطعہ میں اسقدر الحاقی اشارات (TOUCHES) ہیں کہ اگر انہیں نثر میں پھیلایا جائے تو شاعر کی زندگی اور اس کے کلام کی خصوصیات سے صفحے کے صفحے رنگ جائیں۔ نظم کا اجمال قابلِ غور ہے اور اس سے زیادہ کیا کہوں۔ شاید ادبی حلقوں میں میری یہ حقیر کوشش و کاوش پسند کی جائے۔

یہ نظم عالمگیر کے "تاریخ نمبر" میں بھی شائع ہو رہی ہے۔ شائع شدہ چیز کو شائع کرنا میرے مسلک کے خلاف ہے لیکن چونکہ اُردو ادب میں یہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔ اس لئے اپنے مسلک سے ہٹنا پڑ رہا ہے تاکہ ناظرینِ "شاعر" بھی لطف اندوز ہوں۔

اعجاز صدیقی

دورِ متقدمین:- (اوّل):- ـــــ

امیر خسرو دہلویؒ

ہے مذاق کا مضمون آب و رنگِ سخن — دکھا گیا ترے دستِ قوی سے سنگِ سخن
[...]ل سکا جو نہ اس وقت تک نکالے سے — چبھو دیا دلِ شاعر میں وہ خدنگِ سخن

بھلا سکا نہ کوئی تیری اوّلیت کو — کہ ہے جنوب سے شہرت شمال تک تیری

مضمون اکبرآبادی

سخن میں بھر دیے پھول نئے نئے تونے — حقیقتاً لکھے مضمون نئے نئے تونے
کہ جیسے غیب کی آواز تھی تری آواز — خیال نظم کئے یوں نئے نئے تونے

ـــــ

[...]ے شاطی و نوری و نصرتی، وجہی — رہ سخن میں ترے اتباع پر مجبور
[...]ے نہ ہوش میں غواصی و جنیدی بھی — ملا کچھ ایسا تری طرزِ نو میں کیف و سرور

شاہ مبارک آبرو اکبرآبادی

دیارِ شعر میں کی شاہراہِ نو ایجاد — عجیب تھی تری طبعِ رسا کی کچھ افتاد
دماغ و روح سے کی تونے آبیاری شعر — مذاقِ شاہ مبارک اب تجھے مبارکباد

دورِ متقدمین:- (ثانی):- ـــــ

ولی دکنی اورنگ آبادی

[...]رمزِ حق آگاہ و حق شناس ولی — ادب میں خاص جگہ ریختے کو تونے ہی دی

خان آرزو اکبرآبادی

ہے یاد آج بھی وہ طرزِ گفتگو تیری — ہر ایک بزمِ سخن میں تھی آرزو تیری
بلندیاں ترے شعروں کی کوئی کیا سمجھے — مذاقِ عام سے ہٹ کر ہے جستجو تیری

مرزا مظہر جانِ جاناں اکبرآبادی

کچھ ایسی ادا سے کیا تو نے وا درِ اُردو   ہر ایک شعر تھا بلبلِ نغمہ مظہرِ اُردو
ہیں تیرے شعر ضیا بار و ضو فگن ہنوز   تو آسمانِ سخن پر تھا خاورِ اُردو

شاہ حاتم دہلوی

جہان میں ابھی محسوس ہے کمی تیری   زمینِ شعر ابھی تک ہے ماتمی تیری
دیئے جواہرِ رنگیں زبانِ اُردو کو   ہے یادگارِ ادب میں یہ حاتمی تیری

دَورِ متوسطین :- (اوّل)

مرزا رفیع سودا دہلوی

ترے سخن کا نظیر و عدیل کوئی نہیں   قصیدہ گوئی میں تیرا مثیل کوئی نہیں
نہیبِ ہجو سے ڈرتے تھے تیری شاہ و گدا   ترے کمال میں اب تک دخیل کوئی نہیں

خواجہ میر درد دہلوی

یہ ہست کیا ہے، یہ طوفانِ ہستی کیا ہے   تجھے خبر تھی کہ عرفان و آگہی کیا ہے
ہر ایک شعر ہے درس و پیام کا حامل   ہے ایک مبدعِ اخلاق شاعری کیا ہے

میر تقی میر اکبرآبادی

یہ حال ہوتا ہے اشعار کو ترے پڑھ کر   کہ جیسے روح میں چبھ جائیں تیر اور نشتر
وہ میٹھے بول، وہ لطفِ زبان و طرزِ بیاں   ہوا ہے اور نہ ہوگا کوئی ترا ہمسر

میر حسن دہلوی

بہت ہی لطف ترے رنگِ سادگی میں ہے   کمالِ زورِ قلم تیرا مثنوی میں ہے
جو بات تجھ میں تھی سب کو ہی اتفاق اس پر   وہ بات سب میں نہیں ہے کسی کسی میں ہے

دَورِ متوسطین :- (دَورِ ثانی)

جرأت اکبرآبادی ثم لکھنوی

وہ سادہ سادہ اشارات وہ نزاکتِ شعر   وہ حُسن و عشق کے جذبات وہ حلاوتِ شعر
تماشہ گاہِ جہاں میں تو بے بصر تھا مگر   عطا ہوئی تھی تری طبع کو بصارتِ شعر

انشا لکھنوی

کہیں نشاط کے تیور کہیں غموں کے نشاں   ترے سخن میں تصنّع کی رنگینیاں عجب ہیں یہاں
تو وہ ہے جس نے کیا استوار اُردو کو   ہے آج بھی تری ممنون مرقعِ و خوش زباں

مصحفی امروہوی

رہِ سخن میں نئے کارواں کو ساتھ لیا   پھر اس کو ہمتِ منزل رسی کا درس دیا
کلام کیا ہو تری طبع کی روانی میں   کوئی حریف ترا زود گوئی میں نہ ہوا

میاں نظیر اکبرآبادی

جگہ دی شعر میں رسم و رواج کو تو نے   سمجھ لیا تھا جہاں کے مزاج کو تو نے
وطن کو درس و پیامِ اتحاد کا دیکر   بہت بلند کیا "ارضِ تاج" کو تو نے

دَورِ متاخرین :- (اوّل)

ناسخ لکھنوی

تری نظر نے کیا ایک صبح و شام کا رنگ   سخن میں ہے ترے جو خاص و عام کا رنگ
کہیں نیاز، کہیں ناز اور کہیں شوخی   بہت ہی جاذبِ دل ہے تری کلام کا رنگ

آتش لکھنوی

لگا دی آگ سخن نے ترے خدائی میں   تو یادگار ہے اپنی فسوں نوائی میں
بیک نظر جو اتر جائے روح کی تہ تک   وہ لطف ہے ترے اشعار کی صفائی میں

ذوق دہلوی

دماغ و دل تھا ترا علم و فضل کا دریا   ہوا ہے اور نہ ہوگا فسوں نوا تجھ سا
تو باکمال تھا ہر صنفِ شاعری میں مگر   سمجھ سکا نہ کوئی آج تک ترا رتبا

مرزا غالب اکبرآبادی

کہے نہ کیوں تجھے دنیا خدائے شعر و سخن   یہاں تجھی سے ہوا ارتقائے شعر و سخن
دماغِ شعر تری فکر سے ہے عرش نشیں   بلند تو نے ہی کی ہے نوائے شعر و سخن

مومن دہلوی

رنگینی ہے بیاں میں، زباں میں سوز و گداز   تری طرح کوئی شاعر ہوا نہ زمزمہ ساز
ترا کلام ہے اک سیلِ قلزمِ اسرار   ملا نہیں ابھی تک کسی کو یہ انداز

میر انیس لکھنوی

جو رزم گاہ کی منظر کشی پہ تو آئے   تو خوں زمین و فلک کے گھروں سے بہ جائے
ہے یادگار ترا فنِ مرثیہ گوئی   ترے سخن [illegible]

مرزا دبیر لکھنوی

بیاں جو رزم و شہادت کا تو نے حال کیا — زباں کی تیغ سے الفاظ کو حلال کیا
کسی سے ہو نہ سکی تیری رنگ کی تقلید — ترے کلام بلاغت نے یہ کمال کیا

منیر شکوہ آبادی

عطا ہوئی تھی تجھے فطرتاً نغز سخن — تری نوا سے رہا مطمئن ضمیر سخن
ترا کمال سخن رام پور میں چمکا — تو اپنے وقت کا تھا واقعی منیر سخن

اسیر و شیفتہ و رند اور خواجہ وزیر — قلق، نسیم، امانت، صبا و شاہ نصیر
ہر ایک میں تھیں نمایاں خصوصیات سخن — جہان شعر میں رکھتے نہ تھے یہ اپنی نظیر

دور متاخرین (ثانی):—

راسخ دہلوی

تو ایک زندۂ جاوید شخصیات میں ہے — خصوصیت یہی نمایاں تری حیات میں ہے
سند میں آج بھی لیتے ہیں سب ترے اشعار — یہ دسترس تجھے حفظ محاورات میں ہے

تسلیم لکھنوی

مذاق شعر سے آگاہ و خوش نوا تسلیم — سمجھتے ہیں شعرا تجھ کو قابل تعظیم
کمال کر دیا استاد کے تتبع میں — ترے کلام سے قائم ہے رنگ فکر نسیم

امیر مینائی لکھنوی

رئیس شعر و سخن ہائے امیر مینائی — ہے اب بھی نغمہ زن ہند تیری شہنائی
جگر، جلیل و ذکی ابتک ہیں یادگار تری — ہے جن سے طور سخن کو فروغ سینائی

مرزا داغ دہلوی

فصاحتوں کے خدا سوز و ساز کے محرم — بلند ہند میں سب سے رہا ترا پرچم
یہ معجزہ ہے ترا، آج تیرا ہر شاگرد — جہان شعر میں ہے ایک رہبر اعظم

جلال لکھنوی

جلال، خادم شیوہ بیان کلیم سخن — بجا ہے تجھ کو کہا جائے گر حکیم سخن
زبان شعر و ادب تجھ سے [illegible] — قواعد اور ضوابط ہوئے بزم سخن

حالی پانی پتی

ادیب و مجتہد عصر، خواجہ حالی — ادب کی جان، چمن نظم و نثر کے مالی
ترے دماغ نے تجدید کی قدامت کی — رہ سخن میں نئی طرح بیل اک ڈالی

اکبر الہ آبادی

تو رازہائے پستی تہذیب کھولنے والا — تو قوم مردہ کی نبضیں ٹٹولنے والا
فضائے طنز میں اصلاح بالمزاح کیا تھا — نبات و قند کو کانوں میں گھولنے والا

سرور جہاں آبادی

تو اپنی ہستی مغموم کو بھی بھول گیا — نئے سخن میں کچھ ایسا تجھے سرور ملا
ہے شاعری تری درد و اثر کا آئینہ — گداز تیری نوا میں تھا فطرتاً پیدا

شاد عظیم آبادی

ہے تیرے شعر کی اخلاق و فلسفہ بنیاد — ہر ایک بزم سخن میں رہے گی تیری یاد
جہاں ادب ہوا فکر بلیغ سے تیری — زبان و فن کا تجھے مانتے ہیں سب نقاد

ریاض خیر آبادی

خصوصیت تجھے حاصل ہے وضعداری میں — تکلفات نہیں تیری سادہ کاری میں
تمام عمر مئے شعر تو نے چھلکائی — ہے تیرا ہاتھ بھی اردو کی آبیاری میں

مضطر خیر آبادی

بجا ہے تجھ کو کہیں گر مصور جذبات — ہیں جان شعر ترے واردات و حسیات
ابھی تو اہل ادب تجھ سے بے خبر ہیں مگر — ضرور تڑپے گی ترے سخن سے نبض حیات

اسمٰعیل میرٹھی

بھلا سکے گی نہ تجھ کو یہ محفل ایجاد — ہے ملک و قوم کے بچوں کے دل میں تجھ سی یا
رہیں گی سب تری نظمیں زبان زد عالم — ہو "چلتی نہر" کی — یا "بوڑھے ڈال کی فر

دور حاضر (نشاۃ اول):—

ڈاکٹر اقبال سیالکوٹی رح

حکیم شعر و سخن، راز آشنائے خودی — رہیگی زندہ ابد تک تری نوائے خودی
تو ایک "مفکر اعظم" تھا اہل مشرق میں — اسی لئے تجھے کہتے ہیں سب خدائے خودی

سیماب اکبرآبادی

ادیب و شاعرِ مشرق، امام و عالمِ فن — رہے گا تا بہ ابد ہند میں ترا چرچا
نظامِ شام و سحر لاکھ کروٹیں بدلے — نہ کر سکے گا مگر تجھ سا "مجتہد" پیدا

بیخود دہلوی

امینِ طرز و بیانِ فیض گسترِ دہلی — ترا جواب نہیں اے سخنورِ دہلی
غزل قدیم ہے تیری مگر بہت روشن — بجا ہے تیرا لقب ماہِ انورِ دہلی

اصغر گونڈوی

ترے کلام میں پیوست کیفِ روحانی — تری نگاہِ رسا اہلِ دل کی عرفانی
پڑھے تجھے وہ جسے عرش بوسیاں ہوں نصیب — تجھے وہ سمجھے جو رکھتا ہو ذہنِ قاآنی

جلیل مانکپوری

فصیحِ وقت کہوں تجھ کو یا "امام الفن" — ہزار میں نہیں چھپتا ہے ترا رنگِ سخن
ترا کلام ہے روحِ امیر مینائی — شرف یہ ہے کہ ہے استادِ شاہِ ملکِ دکن

عزیز لکھنوی

نیا نکھار مذاقِ سخن کو تجھ سے ملا — بنائی اک حدِ فاصل میانِ بین و بکا
ترے کلام میں رنگینیاں ہیں پاکیزہ بھی ہے — عزیزِ ملک ہمہ گیریوں سے اپنی ہوا

صفی لکھنوی

کسے پسند نہیں رنگِ لکھنوی تیرا — جمود خیز ہے گو دورِ آخری تیرا
ہے یادگار ابھی تک تری غزل کا شباب — مٹے گا نام نہ اس بزم سے کبھی تیرا

حکیم آزاد انصاری سہارنپوری

کہیں ہے صنعتِ "ترصیع" اور کہیں تکرار — ترے کلام میں ہے صنعتوں کی اک بھرمار
سلاست اور صفائی بھی ہے ہر سخن میں ترے — ہے بول چال پہ گویا تری غزل کا مدار

آرزو لکھنوی

جدید طرز کے موجد، فروغِ بزمِ جلال — کبھی کلام میں تھا تیرے رنگِ یاس و ملال
مگر اب اس میں ہے اندازِ سادگی ہی پھبن — ہے تابناک بہر حال تیرا ماضی و حال

احسن مارہروی

تھیں قدرتیں بخدا فنِ شعر پر تجھ کو — ملی تھی ایک فضا آشنا نظر تجھ کو
ترے کلام میں تھی سادگی و پرکاری — رہا پسند تغزل بھی سادہ تر تجھ کو

ثاقب لکھنوی

کہوں میں لکھنوی تجھ کو کہ اکبرآبادی — مسلّم اہلِ ادب میں ہے تیری استادی
تری غزل میں متانت بھی ہے صفائی بھی — غلو ہے ترے تغزل کا سنگِ بنیادی

نوح ناروی

دیارِ شعر میں فیضانِ نوح جاری ہے — سمندر ایک تہِ دامانِ نوح جاری ہے
جنھیں زبان کا چسکا ہو موج موج آئیں — زبان میں ابھی طوفانِ نوح جاری ہے

وحشت کلکتوی

ادیبِ نکتہ رس و پیرِ ماہرِ بنگال — ہوا نہ تجھ سا کوئی اور شاعرِ بنگال
ترے کلام کی لذت سے نیند آتی ہے — کہوں تجھے میں سخنور کہ ساحرِ بنگال

آغا شاعر قزلباش دہلوی

فصاحت اور سلاست تری کلام کی جان — گھلا ہوا تھا تغزل میں تیرے لطفِ زباں
تو وہ کہ ناز ہو دہلی کو شاعری پہ تری — ہوا نہ تجھ سا کوئی شاعرِ شگفتہ بیاں

پنڈت کیفی دہلوی

عطا ہوا ہے تری فکر کو وہ نقدِ سخن — کہ تھام لیتا ہے نظرِ دلی شعر کا دامن
ہزار شعر میں لذت نہیں ہے لیکن — ہے تجھ سے پھر بھی سرود آشنا زبانِ وطن

سائل دہلوی

رئیسِ ملکِ سخن گستری و پیروِ داغ — مئے کہن سے لبالب بھرا ہی ترا ایاغ
فصاحتیں بھی ہمیشہ تیری فصاحتوں پہ نثار — تو خانوادۂ نواب داغ کا ہے چراغ

مرزا بزم آفندی اکبرآبادی

بہارِ باغِ سخن، یادگارِ بزمِ منیر — نگاہ و دل میں سمجھے ہوئے ترے کلام کے تیر
ہے تو اسیر و جلال و امیر کا ہم عصر — تری غزل میں ابھی تک ہے شوخی و تاثیر

تو وہ ہے جس نے لیا ...

قمر بدایونی

ترے کلام نے جادو نہیں کیا کس پر ۔ نہ پوچھ مجھ سے تو اپنی غزل کا جذب و اثر
تھی تجھ میں سادگیٔ میر و لذتِ مومن ۔ تو علم و فن میں بھی رکھتا تھا اک عمیق نظر

فانی بدایونی

مفکرِ غمِ ہستی، مصورِ جذبات ۔ تری غزل کا ہر اک شعر ایک زمزمِ حیات
کبھی یہ ختم ہے اندازِ دلنشیں تیرا ۔ تو ہے پیمبرِ سوز و گداز و حسیات

چکبست لکھنوی

انڈیل دی ہے مئے حبِ وطن پیالے میں ۔ رکھا نہ فرق کوئی مسجد اور شوالے میں
ترے سخن میں ہے آزادیوں کی وہ نکہت ۔ جو پائی جائے کسی نو شگفتہ لالے میں

ظفر علی خاں کرم آبادی

ترے کلام کا موضوع گو سیاست ہو ۔ مگر نہ پوچھ کہ کس درجہ اس میں قوت ہو
ہر ایک شعر میں دہکا ہوا جہنم سا ۔ ہر ایک لفظ ترا خالقِ قیامت ہے

حسرت موہانی

تری بیاں کی حلاوت، تری زباں کا نکھار ۔ سبک خرام ہو گلشن میں جیسے بادِ بہار
جبھی تو کہتے ہیں سب تجھ کو بادشاہِ غزل ۔ ہے حسن و عشق پہ مطلق تری غزل کا مدار

آغا حشر کاشمیری

تو اپنے دور کا شاعر بھی تھا، ادیب بھی تھا ۔ فروغ اردو ڈرامے کو صرف تجھ سے ملا
ہزار کوششیں تقلید کی ہوئیں لیکن ۔ ہوا نہ ہند میں کردار آفریں تجھ سا

دل شاہجہانپوری

فروغِ بزمِ امیر، اعتبارِ ملکِ سخن ۔ ہوا نہ تنگ غزل کا تری کبھی دامن
ہے امتزاجِ قدیم و جدید تیرا بیاں ۔ اور اس طرح کہ نہ چھوٹے زمامِ اشہبِ فن

شفق عمادپوری

کہیں کلام ہے سادہ ترا، کہیں ہے دقیق ۔ کہیں طلوعِ شفق ہے کہیں غروبِ شفق
ہے اعتراف سبھی کو کمال کا تیرے ۔ عروض سے لئے علم و فن تجھ سے سبق

مرزا یاس یگانہ چنگیزی

تو یاس تھا تو خدا کی قسم یگانہ تھا ۔ ہر اک زباں پہ ترا رس بھرا ترانہ تھا
یگانہ جب ہوا، سوز و ساز ختم ہوا ۔ تری غزل کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا!

ناطق گلاوٹھوی

ترا کلام ہے گو بادۂ کہن ناطق ۔ ہے آشکار مگر اس سے رنگِ فن ناطق
یہ سادگی، یہ زباں، یہ محاورات کا لطف ۔ حسین ہے ترا بوسیدہ پیرہن ناطق

تاجور نجیب آبادی

بلندیوں پہ ادب کی مقام ہے تیرا ۔ یہ مانتا ہوں کہ سادہ کلام ہے تیرا
تو ہے ادیب بھی، شاعر بھی، اور ناقد بھی ۔ بلند گلشنِ اردو میں نام ہے تیرا

کیفی چریا کوٹی

تو بے عدیل، ترا علم و فضل بے پایاں ۔ احاطہ فکر و سخن کا تری نہیں آساں
"ادب برائے ادب" تیرے شعر کا مقصد ۔ مگر یہ لطف کہ ہے اس میں لطف کا ساماں

آسی لکھنوی

سخنوری سے عیاں تیری ذوقِ نقد و نظر ۔ تو لکھنوی ہے ترا رنگ دہلوی ہے مگر
ترے کلام میں ہے قوتِ بیان و زباں ۔ اور اس کے ساتھ ہی ہلکا سا ایک جذب و اثر

محوی لکھنوی

ہر ابھرا ہی بہت کچھ ترے سخن کا نہال ۔ ترے کلام میں پیوست رنگِ ماضی و حال
جواہراتِ ادب سب کے دامنوں میں بھر ۔ کہ تری اعز جنوبی میں یوں ہے شارعِ شمال

دورِ حاضر (نشاۃِ ثانی):—

جوش ملیح آبادی

تری نوا سے لرزتے ہیں قصر اور ایواں ۔ تری صدا سے دہلتا ہے سینۂ میداں
تو انقلاب کا سب سے بڑا پیامی ہے ۔ مصوری ہے تری شاعری کہ اک طوفاں!

حفیظ جالندھری

غزل میں نغمگی اور نظم میں روانی ہے — اور اس سے بڑھ کے تری طرزِ خوش بیانی ہے
رہیں گے گیت ہمیشہ لبِ ادب پہ ترے — مجھے یقیں ہے تری بات جاودانی ہے

احسان دانش کاندھلوی

ترے دُکھے ہوئے دل کی پکار تیرا کلام — اُلٹ کے رکھ دیا سرمایہ داریوں کا نظام
کہیں ہے سوز، کہیں آہ اور کہیں ہے کراہ — جہانِ شعر میں تجھ کو ملے گا اوجِ دوام

جگر مراد آبادی

تری غزل سے عیاں تیرا عالمِ مستی — کلام میں ترے جذبات ہے، مگر مستی
سپردگی بھی ہے وارفتگی بھی کیف بھی ہے — ہے حسن و عشق کی پیغامبر تری ہستی

ساغر نظامی

ہر اک غزل تھی تری نقشِ جادۂ مشرق — ہر ایک نظم تھی میخانہ زادۂ مشرق
مگر وہ کیف ترا قبلِ وقت ختم ہوا — چھلک چکا جو چھلکتا تھا "بادۂ مشرق"

بہزاد لکھنوی

پسندِ عام ہے رنگِ مذاقِ عام ترا — ہر ایک لب پہ ہے بزمِ طرب میں نام ترا
یہ مانتا ہوں ہے سادہ بھی اور سستا بھی — ہے جذب و کیف کا حامل مگر کلام ترا

اثر لکھنوی

ترے کلام میں اک کیف ہے مگر کم کم — تو ایک ساز ہے ایسا ہو جس کے سُر مدھم
نہیں غزل میں تری شورشِ شیونِ فریاد — شگفتگی سی ہے، ہلکے گداز سے محرم

ماہر القادری (کیسر کلاں ضلع بلند شہر)

غزل میں تیری ملاحت ہے نظم میں جذبات — ہے اُن صفات کا مجموعہ ایک تیری ذات
جو صرف شاعرِ جاوید ہی میں پائی جائیں — سخنوروں کو نہ کیونکر لگے یہ بری بات!

علی اختر حیدرآبادی

تو صرف اخترِ ارضِ دکن نہیں اختر — تمام ہند کو ہے ناز تیری نظموں پر
ترے قلم کی روانی کہیں نہیں رکتی — شباب کا ہو ترانہ کہ قوم کا منظر

اختر شیرانی

شبابِ شعر کو ہم رنگ کر دیا تو نے — جوانیوں سے بڑا کام لے لیا تو نے
مگر ہے شیب کا پیغام تیرا کیفِ شباب — جوانیاں یہ بہت دن پہ کیا کیا تو نے؟

روش صدیقی جوالاپوری

تو اپنے وقت کا ہے کامیاب نظم نگار — نگاہِ اہلِ ادب میں ہے کیوں نہ تیرا وقار
ترا کلام ہے شعر و ادب کا گنجینہ — تری روش پہ ہے مستقبلِ سخن کا مدار

اعجاز صدیقی اکبرآبادی

یہ کس پہ تبصرہ کرنے چلی زبانِ ادب — "غزل ہے لطفِ زبان اور نظم جانِ ادب"
ہو خود نگاہ میں اپنی ہو ننگِ شعر و سخن — ہو اس کی فکر کا کیونکر معترف جہانِ ادب!

۷، مارچ ۱۹۴۳ء — **اعجاز صدیقی**

(بقیہ خادمانِ ادب صفحہ ۴)

(۶۰) جناب محمد اکرام اللہ صاحب تنہا قریشی وکیل جھنڈ سے سالانہ
(۶۱) جناب میاں گل محمد خان صاحب کلہار رئیس فروکہ ضلع سرگودھا سے سالانہ
(۶۲) جناب بسمل اورنگ آبادی (حوشت) باکی پور پٹنہ سے سالانہ
(۶۳) محترمہ بیگم روشن آرا القادری پارک سرکس کلکتہ سے سالانہ
(۶۴) محترمہ خورشیدی بیگم صاحبہ رپن اسٹریٹ کلکتہ سے سالانہ
(۶۵) جناب منشی ایم۔ آر شاہد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (آنرز ان پنجابی و پشتو) ایبٹ آباد سے سالانہ
(۶۶) جناب خادم حسین صاحب خادم زیبائی سیمابی جہلم سے سالانہ
(۶۷) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری [illegible] سے سالانہ
(۶۸) جناب شیخ محمد احمد صاحب نازش سیمابی [illegible]
(۶۹) محترمہ [illegible]
(۷۰) جناب [illegible]

اُس کا لڑکا

اس کی آرزوؤں کے سنگین قلعے مسمار ہو چکے تھے ـــــ زمانہ کی بے رحمی سے نہیں بلکہ قدرت کی ستم ظریفی سے، اس کی تمناؤں کا خون قبل از وقت ہو چکا تھا ـــــ اُس کے ارادوں کی سخت چٹانیں حوادث کے تند و تیز تھپیڑوں سے پس کر رہ گئی تھیں اُس کے عزائم کی پختہ و مضبوط دیواریں کسی نامعلوم طاقت نے ڈھا دی تھیں۔ اسکی امیدوں ، رنگین اور پُربہار پھول خزاں کے ایک ہی جھونکے نے پامال کر دیئے تھے ـــــ مستقبل کے جو جو خواب دیکھ چکا تھا آج اُن کی تعبیر بالکل اُلٹی نظر آ رہی تھی ـــــ سچ ہے اگر امیدیں پوری ہو جایا کریں تو فقیر بادشاہ ہو جایا کرتے۔ مستقبل کے خطرات اور منزلوں کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ زندگی ایک بہتا پانی ہے لیکن اپنے راستہ سے بےخبر ـــــ نہ زمانہ کی تیزگامی ختم ہوتی ہے نہ انسانی عمروں کی پرواز ـــــ انسان کا سفینۂ حیات ایک موجِ بےقرار کی صورت ہچکولے کھاتا رہتا ہے ـــــ اس کی تمناؤں میں کبھی بہار ہی بہار تھی مگر اُس کا مآل خزاں آلود ثابت ہوا ـــــ سرشی اسکی زندگی کا آخری چراغ، اُسکا سرمایۂ حیات، اسکی آنکھوں کا نور ـــــ دل کا سرور، ہر لحظہ آہ نہ معلوم کہاں گم ہو گیا ـــــ اُس کی بیوی اپنے لختِ جگر کی جُدائی میں گھل گھل کر فنا کے گھاٹ اُتر گئی ـــــ کسی نے سچ کہا ہے مصیبت اکیلی نہیں آتی "وہ اپنی اس آخری تمنا کو بھی پامال ہوتے ہوئے دیکھکر تڑپ گیا۔ اس کی روح میں جہنم سا دہکنے لگا ـــــ وہ خیال کر رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی بدکرداریوں اور گناہوں کی سزا ہے۔ غریب اور بےقصور مجرموں کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ کاش میں ایسا نہ ہوتا ـــــ یہ سب کچھ صحیح کہ انسان لغزشوں کا مجموعہ ہے پھر بھی اگر انسان اپنی خطا سے پہلے عدالت کے جابر و ظالم ہاتھوں کے انتقام کا تصور کر کے اقدامِ جرم سے باز آ جائے تو اُسے مصائب کا سامنا ہی کیوں کرنا پڑے۔ مگر سچ ہے گناہوں کا احساس گناہ کے بعد ہی ہوتا ہے ـــــ وہ دو ماہ کی چھٹی لیکر سیر و تفریح کے لئے کشمیر چلا گیا مگر کوئی ایسی تو شے ہے نہیں کہ جسے بہار دل تفریح گاہوں، پھولوں اور چشموں کے دلنشیں نظاروں سے بہلایا جا سکے۔ یہ تو جان گداز ہونے کے بعد مشکل ہی سے نکلتا ہے ـــــ کشمیر میں بھی اسکے رنج و غم کا مداوا نہ ہوا اور وہ یاس و حرماں کا دامن کو تھامے ہوئے وطن چلا آیا ـــــ آلام کی چنگاریاں جب شعلہ بن جاتی ہیں [illegible] انتقام کر رہی ہے۔ [illegible]

گر جاتے ہیں تو انسان خود بخود انکا خوگر ہو جاتا ہے اور اُس میں بردشت مصیبت جھیلنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ـــــ اب وہ بھی رفتہ رفتہ رنج و غم کا خوگر ہو گیا تھا اتنا خوگر کہ اس کو کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی متاثر نہیں کر سکتی تھی ـــــ اسے تجربہ ہو گیا ـــــ کامل تجربہ کہ زندگی غم و آلام ہی کا نام ہے۔ اور موت مکمل سکون عافیت ـــــ بارہ سال گذر گئے ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے ـــــ اب وہ تمام واقعات ماضی کا ایک فسانہ ہو کر رہ گئے تھے ـــــ اور ایک گذرا ہوا خواب ـــــ فرقت کی شعلہ فشانی سرد ہو چکی تھی ـــــ اس کی زندگی سے غم و حسرت متلاطم تھے۔ اسکی کشتیِ حیات حریفِ غم ہو کر دریائے آلام و حسرت میں ہچکولے کھا رہی تھی ـــــ اس کا ماحول زندگی کی کشاکش سے بھرا ہوا تھا ـــــ اُس نے کسی خیال کے بغیر عدالت کی جانب قدم بڑھائے۔ معمول کے مطابق آرام کرسی پر بیٹھ گیا ـــــ وہ سست تھا اور بےحد مضمحل ـــــ سامنے بالکل قریب میز پر مقدمہ کے کاغذات کا انبار لگا ہوا تھا ـــــ اُس نے ایک ایک کر کے ان سب پر سرسری نظر ڈالی اور پھر کسی خیال میں غرق ہو گیا ـــــ وادیِ خیال کے سبزہ زاروں میں اسے اپنی کامیابی کی ایک دھندلی مگر موثر جھلک نظر آئی اُسے یقین تھا کہ ڈاکوؤں کا گروہ ضرور گرفتار ہو کر آئیگا اُس کی اُمیدوں کی کچی دیواریں اسکے سامنے کھڑی تھیں ـــــ وہ ایک ریاست کا دیوان تھا اور انتہائی جابر و قاہر ـــــ سپاہیوں کا ایک دستہ صرف ایک معصوم ـــــ فرشتوں سے بھی زیادہ معصوم لڑکے کو گرفتار کر کے لایا ـــــ بوسیدہ اور پھٹے ہوئے کپڑے۔ عمر چودہ سال کے لگ بھگ ـــــ اُس کی حالت قابلِ رحم تھی ـــــ دیوان نے آرام کرسی پر لیٹے ہی لیٹے سر سے پاؤں تک اس معصوم فرشتے پر نظر ڈالی۔ اُسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس معصوم اور غریب بچے کی رگ و پے میں شرافت کا خون ہے۔ یہ مجرم ہرگز نہیں ہو سکتا ـــــ اُس کے قہر و جبروت کے بلند بلند پہاڑ دھس گئے ـــــ کیا یہ کم سن اور معصوم لڑکا جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہنوز پہلا ہی موقع ہو ـــــ کانسٹبل اُس کی پشت پر بےدردی سے ہنٹر لگا رہا تھا ـــــ اُف معصوم روح کی تڑپ ـــــ اور ننھے سے دل کی کسک ـــــ

کیا تم اعترافِ جرم کرتے ہو ـــــ دیوان نے آنکھوں کو گردش دیکر ایک عجیب انداز سے دریافت کیا۔

اعترافِ جرم !!! ہاں مجھے جرم سے انکار نہیں ہے ــــ مگر یہ سب کچھ.....
یہ سب کچھ اس پیٹ نے ــــ پاپی پیٹ نے کرایا ہے ــــ میں مجرم نہیں ہوں
مجھے رہا کر دیجئے ــــ میں بے گناہ ہوں ــــ جب انسان یاس و الم کی تصویر ہو کر
رہ جاتا ہے ــــ جب ہر طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آنے لگے ــــ اور جب کسی کے
کھانے کے لئے بھی ایک پیسہ نہ رہے ــــ تو آپ ہی بتایئے کہ وہ کیا کر سکتا ہے
ترچھے دکھے ہوئے دل کی بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب یا اپنی جان..... اُف ــــ !
کہیں سے سوز، کہیں آہ اور آنسو آرسے بہہ رہے تھے ــــ !
وہ کہہ رہا تھا سچ ہے. جب کسی کے پاس زہر کھانے کے لئے بھی پیسہ نہ ہو
، یا تو اپنی جان دیدے ــــ یا بڑے سے بڑے جرم کا مرتکب
ہو جائے ــــ وہ رحم اور ہمدردی کی منزل سے پھر بھٹکا. نہیں اس نے جرم کیا ہے اور
ایک سنگین جرم، ایک دیوان کے سامنے ہمدردانہ خیالات نہیں ہونے چاہئیں ــــ
قہاری کی شان نمایاں ہوئی اور ہمدردی کے بھڑکتے ہوئے شعلے مدھم ــــ تم نے
بہت بڑا جرم کیا ہے اس لئے تمہیں پھانسی کا حکم دیتا ہوں ــــ ! اس کی روح
پھانسی کے تصور سے لرز گئی ــــ نہیں اے ایشور ــــ
وہ کانپنے لگا زخم خوردہ ہرن کی طرح ــــ اس کے جسم میں کانٹے
سے چبھنے لگے ــــ
پھانسی !!! اُف کیسے تاب لا سکوں گا ــــ اس کی نگاہوں میں پھانسی
کا پھندا گھومنے لگا ــــ جسم سے خون بدستور جاری تھا ــــ نہیں نہیں آپ
مجھے اتنی سخت سزا نہیں دے سکتے ــــ
کیوں نہیں دے سکتا ــــ اس نے کڑک کر کہا ــــ دور بہت دور
مطرب نغمے بکھیر رہا تھا، فضا خاموش تھی اور ماحول معتدل ــــ ! اس لئے کہ
میں یتیم ہوں ــــ میرے ماں باپ نہیں ہیں ــــ
ماں باپ کے لفظ نے اس کے دل کے زخموں کو ہرا کر دیا ــــ اور دل کے
ساکت و ساکن تار دل پر ایک مضراب سی لگی ــــ
کاش اس کا باپ، اور میرا بیٹا زندہ ہوتا ــــ اس کی آنکھوں سے
بے اختیار آنسوؤں کے موٹے موٹے دو قطرے گر کر آستین میں جذب ہو گئے ــــ
اس کی نگاہوں کے سامنے ماضی کے خواب ناچنے لگے ــــ انصاف اور رحم کی جنگ
ــــ آخر ہمدردیوں پر انصاف غالب آیا ــــ ! اور رحم پر قانون
کی فتح ہوئی ــــ !

تم مجرم ہو ــــ بہت بڑے مجرم اس لئے تمہیں قانون رہائی کی اجازت نہیں
دیتا ــــ تمہیں اس جرم کی سزا میں پھانسی ہی ملنی چاہئے ــــ ہوا کا ایک ہلکا
جھونکا معصوم کے غبار آلود بالوں کو چھو کر چلا گیا ــــ محبت کے قلعے انصاف اور قانون
کی پُرشور آندھی میں اڑنے لگے ــــ نامعلوم جذبے کے تحت اس کی روح میں ایک
ہنگامہ برپا ہو رہا تھا ــــ انسان کے خیالات کی بنیاد کتنی کمزور اور کچی ہوتی ہے
کہ ذرا سا اثر سے دھس جاتی ہے ــــ خیال ایک جذبہ کا نام ہے، جس کا گذر ارتفاعِ
آسمانی سے بھی دور ہے ــــ انسان کے دل و دماغ کا اعتبار نہیں ــــ
کبھی محزون کا ہجوم ــــ اور کبھی مسرت کا انبوہ ــــ جو ہر لمحہ عیش و عشرت اور
مسرتوں کے خیالی قلعے تعمیر کرتا رہتا ہے اُسے قانونِ قدرت کی سچی اور پائیدار خوشی
چھو تک نہیں اور وہ ذرا ذرا سی مشکلات پر چیخ چیخ اٹھتا ہے ــــ
پھانسی تمہارے لئے موزوں سزا ہے ــــ اس کی آواز معصوم بچے کے
کانوں کو چھوتے ہوئے فضا میں منتشر ہو گئی ــــ !
" تو پھانسی مجھے جلد مل جانی چاہئے تاکہ میری روح کو جلد سے جلد ابدی سکون
حاصل ہو جائے " ــــ یہ دردناک آواز بے گناہ اور معصوم فرشتے کی تھی ــــ
وہ مرتعش تھا اس کا عضو عضو کانپ رہا تھا ــــ اُف معصوم دل کے ننھے تار دل
پر مضراب ــــ کیا تمہیں موت عزیز ہے ــــ اس نے دانتوں میں انگلی
دبا کر استفسار کیا ــــ ؟
ہاں ! میں اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں ــــ میرا فیصلہ جلد کر دیجئے
تاکہ مجھے اپنی اس بدترین زندگی سے سبکدوشی حاصل ہو جائے ــــ اس نے
درد و بے چینی سے کراہتے ہوئے ــــ !
آندھی زور سے آئی اور شیشے کی کھڑکی سے ٹکرا کر نکل گئی ــــ بادل
کے ٹکڑے دنیا والوں پر حسرتیں برسا کر چلے گئے ــــ اچھا اب تمہاری پھانسی کا
وقت قریب ہے ــــ تمہیں کسی چیز کی آرزو تو نہیں ہے ؟
مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں..... مگر کاش میں اپنے ماتا پتا سے اپنے گناہوں کی
معافی مانگ سکتا ــــ
اُس نے نمناک نگاہیں آسمان پر جماتے ہوئے کہا ــــ
یتیم کیا کہہ رہے ہو ــــ ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمہارے ماتا پتا نہیں
ہیں ــــ آفتاب کی مدھم اور سنہری شعاعیں کھڑکی سے جھانک رہی تھیں
ــــ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اپنی نامعلوم منزل کی سمت

([illegible])

ثمرات

مری زندگی کا حاصل مرا ذوقِ غم پسندی — یہ جنون و شوق و مستی ہے دلیلِ ہوشمندی

مرے دل کی وسعتوں میں تہِ درد بیکراں ہے — تب و تاب جاوداں ہے مری خوئے سوزمندی

مری خاکساریوں پر ہے وہاں وہی تکدر — مرے کام کچھ نہ آئی یہ مری نیازمندی

مری نظم دلکشا تھی مرا شعر دلربا تھا — انھیں خوش مگر نہ آیا یہ مذاقِ فکرمندی

مرے خون کی تپش سے روشِ شفق ہے پیدا — یہ ہے فطرتِ شہادت کہ حنا کی لالہ بندی

یہ تری نظر کی گرمی کہ صفیرِ شاہبازاں — مری سرد سرد آہیں کہ فغانِ گوسفندی

مرے نام سے نہ ڈر تو مجھے کام سے غرض کیا — نہ وہ دورِ تاج پوشی نہ وہ عہدِ تیغ بندی

مری زندگی کی راتیں نہیں خواب آشنا کیوں؟ — یہ حکایت و فسانہ یہ مری زباں بندی

بہت انقلاب آئے، نہ ہوا کوئی تغیر — وہی میری پست فطرت وہی تیری سربلندی

میں خودی پہ مر مٹا ہوں ہے خودی خدا شناسی — ہے خودی ہی مصطفائی، ابو لہبی خودپسندی

جو ترا یقیں ہو محکم تو ثمر عجب نہیں ہے
تجھے سربلند کر دے یہی تیری مستمندی

عبدالکریم ثمر

آسرے

حقیقت کا بقدرِ شوقِ عرفاں ہوتا جاتا ہے — کوئی محسوس نزدیکِ رگِ جاں ہوتا جاتا ہے

دلِ کاہش بجاں تسکیں بداماں ہوتا جاتا ہے — سفینہ جس قدر نزدیکِ طوفاں ہوتا جاتا ہے

محبت کا اثر دونوں پہ یکساں ہوتا جاتا ہے — پریشاں کرنے والا بھی پریشاں ہوتا جاتا ہے

باندازِ وفا اب دل کی قیمت بڑھتی جاتی ہے — سزاوارِ نگاہِ نازِ جاناں ہوتا جاتا ہے

سماتا جا رہا ہے نغمہ بن کر روح میں کوئی — دلِ غم آفریں میرا غزلخواں ہوتا جاتا ہے

نہ پوچھو میرے سوزِ غم کا فیضِ اشک افشانی — فروغِ دل سے دنیا میں چراغاں ہوتا جاتا ہے

بقدرِ ذوقِ پردہ بے حجابی بڑھتی جاتی ہے — وہ اپنے ہی حجابوں سے نمایاں ہوتا جاتا ہے

چلے بھی آؤ، ورنہ پھر خودی بے رنگ لانے کو — کوئی پھر ماورائے حدِ امکاں ہوتا جاتا ہے

نہیں ہے لب کشائی کی بھی آزادی اسیروں کو — سکوت اب داخلِ آدابِ زنداں ہوتا جاتا ہے

شفا یہ پیروی سنتِ اہلِ محبت ہے
شکایت کیوں جو غم حد سے فراواں ہوتا جاتا ہے

شفا گوالیاری

ذہنی غلامی

زندہ قوم کے نشانات اپنی ملکی تہذیب سے شغف، اپنے وطن کے رسم و رواج اور روایات سے وابستگی اور اپنی قومی خصوصیات سے والہانہ تعلق سمجھے جاتے ہیں۔ اسکے مقابلہ میں مردہ قوم کی علامات اپنی معاشرت سے بیگانگی، اپنے تمدن سے بے تعلقی، اپنی تاریخ سے نفرت و حقارت قرار دی جاسکتی ہے۔

عالمگیر انسانی زاویۂ نگاہ سے اس پر خواہ آپ کتنی ہی تنقید فرمائیں۔ بین الاقوامی نقطۂ نظر سے اس پر آپ کتنی ہی نکتہ چینی کریں۔ نظریاتی اعتبار سے جسقدر بھی تردیدی بیانات سے اس کو ناقابل قبول ثابت کریں۔ لیکن عملی دنیا کی روشنی میں یہی نظریہ مسلم الثبوت تسلیم کیا جا رہا ہے۔ واقعاتی لحاظ سے کم ازکم اسوقت یہی متفقہ فیصلہ سمجھا جا رہا ہے۔ آپ کہیں گے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ تو جواب ظاہر ہے کہ بنی نوع انسان نے سینکڑوں برس کے الٹ پھیر ہزاروں سال کے تجربات سے شخصی اقتدار کا طوق اپنے گلے سے اتار کر، شخصی حکم کی سطح کو اونچا کر کے اپنے آپ کو قومیت کی سطح پر لا کر کھڑا کیا ہے۔ ترقی کا یہ قدم جس طرح وقت دراز کی مسلسل جادہ پیمائیوں کے بعد عمل میں آیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانیت اور بین الاقوامیت کے بلند سطح نظر تک پہونچنے کے لئے ابھی بہت کافی ٹھوکروں کی ضرورت ہے۔ ایک ہی جست میں ساری سیڑھیوں کو چھوڑ کر زینہ کی آخری سیڑھی تک جا پہونچنا بعض شخصیتوں کے لئے تو ممکن ہو سکتا ہے لیکن اجتماعی انسانیت کے لئے ابھی ممکن نہیں ہے۔ ابھی راستہ میں بہت سی دشوار گذار گھاٹیوں کو قطع کرنا باقی ہے۔ ابھی تو بہت سی پریشان کن خلیجوں کو عبور کرنا باقی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آثارِ منزل نظر آ رہے ہیں لیکن کسی طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ منزل کو جا لیا، اس لئے بے شک نظرِ انسانیت اگر قوم پرستانہ نظریات سے آگے نہیں بڑھ سکی تو اس میں افراد کا کوئی قصور نہیں اگر عام طور پر قوموں کی حیات و ممات کا یہی معیار گردانا گیا ہے تو اس میں حیرت انگیزی کی کوئی ضرورت نہیں۔

خیر! اسکو بھی جانے دیجئے خواہ مذکورہ بالا نظریہ سب کے نزدیک مسلم الثبوت ہو یا نہ ہو۔ لیکن کم ازکم اسوقت مشرق و مغرب کی ترقی و تنزل پر حرف بحرف صادق آتا ہے ایک طرف یوروپین ممالک کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ہر فرد حب قومی کے نشہ میں سرشار ہے۔ ہر شخص کا دل خدمت قوم و وطن کی شراب سے مخمور ہے۔ ہر ایک کو اپنے ملک کی تہذیب، تمدن، صنعت و حرفت سے خصوصی دلچسپی ہے۔ ہر فرد کی یہی تمنا ہے کہ اپنے وطن کو بام ثریا پر پہنچا کر چھوڑے۔ ہر ایک کی یہی آرزو ہے کہ مسابقت اقوام کے سلسلہ میں اسکی قوم ہی سرفراز رہے۔ قوموں کی دوڑ دھوپ کے میدان میں وہی سب سے پیش پیش رہے۔ غرض اپنے نظریۂ زندگی، اپنی تعمیر حیات، اپنے لائحۂ عمل کا تنہا مالک اور ذمہ دار بننے کے لئے آمادہ ہے۔ وہ اپنی قومی روح اپنی ملکی ثقافت کے تحفظ و برقراری کے لئے اپنی جان کی بازی لگانے کے لئے مستعد و تیار ہے۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے محرکات کیا تھے؟ جہاں اسکے اقتصادی و معاشی اور استعمار پرستانہ اسباب تھے وہاں قومی و ملکی کلچر کی حفاظت سامانی کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اپنی ملکی ثقافت کی تباہی قابل برداشت نہیں ہوتی خود اپنی بربادی کو گوارا کر لیا گیا۔

آخر اس عالمگیر جنگ میں روس کی زبردست قربانی برطانیہ کی آخری دم تک بے جگرانہ جنگی مساعی کس چیز کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی۔ وہی قومی تحفظ کا جذبہ ہے جس نے ہر قوم کو بزم امن و عیش سے کھینچکر عرصۂ کارزار میں داد شجاعت دینے کے لئے سرگرم کار کر رکھا ہے۔ لیکن اس قومی جد و جہد کے آئینہ میں اگر ہم اپنے مجاہدانہ خد و خال کو دیکھنا چاہیں تو بڑی شرمندگی ہوگی۔ کیونکہ ہم نے ابھی تک قومی رواج کی اہمیت کا احساس ہی نہیں کیا ہے۔ ابھی تک ہمیں ملکی ثقافت کی قدر کا عرفان ہی نہیں حاصل ہوا ہے۔ ہم ابھی تک یہ ہی نہیں سمجھے کہ خود اپنی زندگی بنانا کس کو کہتے ہیں؟ زندگی کے لئے لائحۂ عمل بھی کوئی ضروری چیز ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہوا کرتا ہے۔ گویا ہم ابھی تک بالکل زندگی کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔

ہمارے ذہنی و دماغی سرچشموں کے سوتے اسقدر خشک ہوگئے ہیں کہ ہماری سائنٹفک علمی تحقیقات، تمدنی ایجادات کا عظیم الشان ذخیرہ (جو ہمارے اسلاف کرام سے ورثہ کے طور پر ہم تک پہونچا ہے) کے متعلق بھی کوئی حتمی رائے، کوئی مستحکم فیصلہ نہیں کر سکتے۔ تا وقتیکہ اس پر مستشرقین یوروپ کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو۔ ہمارے ملک کی تاریخ کے متعلق بیان شدہ بات تک یقین نہیں آتا جبتک ہمارے سامنے انگریز مورخین کے صادر شدہ ارشادات موجود نہ ہوں۔ حالانکہ دنیا میں تاریخ ہی قوم کا بڑا سرمایہ سمجھی جاتی ہوتی ہے جس کو وہ ہمیشہ نوکِ زبان پر رکھتی ہے۔ ہر قوم نے اپنے آبا و اجداد کے ایک ایک

کارنامہ کو اس طرح اپنے سینہ میں محفوظ رکھتا ہے کہ سازِ حیات کے اس تار کے چھو جانے
سے ہی زندگی کے تمام تاروں میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا حیات قومی کے شیرازہ
میں تاریخ ہی کا رشتہ استحکام بنا ہوتا ہے۔ جہاں اس میں انتشار پیدا ہوا وہاں زندگی کا
تار و پود بکھر کر رہ گیا۔ چنانچہ جب کسی جشن ملی کے موقع پر لہرا لہرا کر قومی ترانے گائے جاتے
ہیں۔ اسوقت ہر پیر و جوان کے چہروں کی بشاشت دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ گویا خود
ہر شخص ہفت اقلیم کو زیر نگیں کر کے فتح کا پرچم اڑا رہا ہے۔ کائنات کی تمام مسرتیں سمٹ کر
اسکے جسم و جاں میں حلول کر گئی ہیں اور وہ مسرت و شادمانی کی ترنگ میں اپنے آپ
کو نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگتا ہے۔

یہ ان زندہ قوموں کے کارنامے ہیں جنھوں نے اپنے بچوں کو گھٹی میں تاریخ
کے اسباق گھول گھول کر پلا دیے ہیں۔ تاریخ کی اہمیت کو بتانا مقصود نہیں بلکہ یہ دیکھنا
ہے کہ ترقی یافتہ اقوام اپنی قدر و قیمت سے کس قدر واقف ہوتی ہیں وہ اپنی قومی
متاع کو متاع گرانمایہ سمجھتی ہیں۔ اُن کے پاس جو دستورِ زندگی ہوتا ہے اس میں کسی دوسری
قوم کی دریوزہ گری گوارا نہیں کیا جاتا۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ مغربی روشنی کی جھلک پر
اس طرح محو ہو گئے ہیں کہ اپنی طبعی ساخت و پرداخت کو بھی فراموش کر دیا فضیلت
کے یہ معنی نہیں کہ ہم دوسروں کی تقلید سے اپنی عزت اپنی آبرو بنائیں جبتک خود ذاتی
جوہر نہ ہوگا اُس وقت تک اُفق وطن سے ترقیوں کا آفتاب طلوع نہ ہوگا۔

کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ ہم اپنے اصولِ زندگی میں اسقدر کورانہ تقلید کے
خوگر اور غیروں کی نقالی کے عادی ہو گئے ہیں کہ ہمارے قوائے عقلیہ میں اسوقت
تک کسی قسم کی تحریک اکسی نوعیت کی برانگیختگی پیدا ہی نہیں ہوتی جبتک یورپین اقوام کی
نظریں نہ پیش کی جائیں، جبتک ان تہذیب ساز قوموں کے واقعات کو نہ دہرایا جائے

جسکے معنی یہ ہیں کہ ہمیں خود اپنے غیر متمدن، غیر مہذب اور وحشی ہونے کا پورا پورا
یقین ہے۔ پس ذہنی کا اس سے زیادہ پست درجہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ کہ ایک قوم
دوسری قوم کی ذہنی و دماغی دریوزہ گری کو باعثِ فخر و نازش قرار دینے
لگے اور تطریانی علقہ بگوشی کو در خورِ اعزاز سمجھنے لگے۔ جس کے نزدیک حق و باطل
کے امتیاز کی کسوٹی اغیار کی تصدیق و تردید ہو اور خود اُسکی نگاہ حق بینی و حق
شناسی کی صلاحیت سے محروم ہو گئی ہو۔ جسکی نظر سے کھوٹے کھرے کی جانچ پڑتال
کرنے کی قابلیت ہی رخصت ہو چکی ہو۔ جسکے ضمیر کی آواز غلامی کی بھاری بھرکم زنجیروں
کے بوجھ سے دب کر رہ گئی ہو۔

جسکی دماغی پستی کا یہ عالم ہو کہ اسکی طرزِ فکر بھی ممنون کرم ہو مغربی پرتوِ افکار کی۔
بقول بکنزی یہی وہ ذہنی غلامی ہے جسکی زنجیروں کو تلوار سے بھی نہیں کاٹا جا سکتا۔
لیکن ہمیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ سب سے پہلے ہمارا ادب ہی ہے کہ ذریعہ ہوا اسکا خوشگوار
ردِ عمل ہوا۔ جس طرح ہمارے ادب نے مغربی لٹریچر کے اخذ و اقتباس میں تبدیلی ہی کو اساسِ زندگی کا
ثبوت دیا بالکل اسی طرح مقلدانہ طرزِ فکر پر احتجاج بھی نہایت اچھے پیرایہ میں کیا گیا۔ مولانا
شبلی نے سب سے پہلے قومی روح کی بیداری کے سلسلہ میں اپنی تاریخی معلومات کا دہانہ کھول کر
ہماری توجہات کی باگ اس طرف موڑ دی۔ پھر مولانا ظفر، چکبست، پریم چند، اکبر،
اقبال، سیماب، جوش نے اس تحریک میں بیش از بیش حصہ لیکر نئی شاہراہیں
کھول دیں۔ چنانچہ اب ہمارے اندازِ فکر پر اور رجحانِ شعری کا افق اپنی درخشندگی
سے ایک نئی صبح کی آمد آمد کا پتہ دے رہا ہے۔

وجدی الحسینی (فاضل دیوبند) بھوپال

(بقیہ صفحہ ۳۰) میں کسی بات کی تہ تک پہونچنے کی کہاں اہلیت ہوتی ہے، وہ غریب اس اعتقاد
کے سینکڑوں من بوجھ کے نیچے جو لیشتہا پشت سے ان میں سرایت کرتا چلا آتا ہے
اس طرح دبے رہتے ہیں کہ ان میں لب تک ہلانے کی طاقت نہیں ہوتی جس طرح ایک جاہل
لاطینی زبان میں مقدس بائبل کے چند فقرات پیش کرکے عوام کے ایک کثیر گروہ
پر رعب جماکر اور اپنا امام بناکر چلا جاتا ہے اسی طرح ان اقوال نے بھی ہماری زندگیوں
میں یہی صورت اختیار کر لی ہے۔ عوام کی کم فہمی کا اس سے اندازہ ملاحظہ ہو کہ وہ ان بے بنیاد
اقوال کو اپنے کم سن بچوں کے سامنے بھی اکثر و بیشتر دہراتے رہتے ہیں، نیز ان افسوسناک
حکایت کے مانند معمولی ... ہیں کہ وہ خود بھی پست ہمتی اور ضعیف الاعتقادی
کے باعث ... کر ... خوش ... انقلاب پیدا کرنے سے قاصر ہے

——— اب وہ اپنی اولاد کو سپاہیانہ اور حق کی خاطر سر فروشانہ امنگ
سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ صحیح معنوں میں ایک بہادر شخص یا ایک
محقق و موجد ان سارے اقوال کو ٹھکراتا ہوا سرفروشی کے لئے میدان میں آجاتا ہے
یا ان مصائب و تکالیف کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے بغیر کسی پس و پیش کے تیار ہو جاتا ہے
جو اسکی تحقیق یا ایجاد کے راستہ میں سدِ راہ کا کام کر رہا ہو ——— اور پھر عوام کا یہ کثیر گروہ
اور ضعیف الاعتقاد افراد پر مشتمل گروہ اُس بہادر شخص یا اُس دُھن کے پکے محقق اور موجد کو
جن حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھتا ہے وہ حقیقتاً دیکھنے کی چیز ہوتی ہے بس جیسے کہ ان عام
لوگوں کی ڈرسے دیکھکر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں ——— (نامکمل)

مترجمہ توکل دبائیوی ایم اے

صبحِ انقلاب

کب نظمِ کائنات برنگِ دگر نہیں کب انقلاب گردشِ شام و سحر نہیں
ہر سو ہے ایک معرکۂ قتلِ عام گرم وہ آج کون ہے جو ہلاکِ اثر نہیں
کل تک تھا جن رگوں میں بھرا جوشِ انبساط کاٹو تو آج اُن میں لہو بوند بھر نہیں
کل تک تھی سرفرازیِ عالم جنھیں نصیب آج اُنکی گردنیں ہیں تو گردن پہ سر نہیں
روشن جس انجمن میں تھے کل تجلیوں کے جھاڑ آج اُس میں جگنوؤں کا بھی شب بھر گذر نہیں
کل جس مکاں میں رات کو تھی دن کی روشنی آج اُس میں فرقِ جلوۂ شام و سحر نہیں
کل تک فروغِ مے سے فروزاں جو بزم تھی آج اُس میں کوئی جام بجز چشمِ تر نہیں
کل فرشِ گل بھی جنکی نزاکت پہ بار تھا آج اُن کی خاک تک بھی سرِ رہگذر نہیں
کل تک تھی جس دکان میں داد و ستد کی دھوم آج اُس میں کوئی پرسشِ نفع و ضرر نہیں
کل جس گلی میں سیکڑوں قصرِ بلند تھے آج اُن کی یادگار بھی دیوار و در نہیں
کل جنکے در پہ رہتا تھا دربان کا ہجوم آج اُن میں کون ہے کہ جو دریوزہ گر نہیں
کل جنکے مال خانوں پہ پہرے تھے ہر طرف آج اُن کی بھیک پر بھی تو ہوتی بسر نہیں
کل تک تھی کشوروں کی خبر جن کو ہر گھڑی آج اپنی موت کی بھی انھیں کچھ خبر نہیں

ہر صبحِ انقلاب کا آئینہ ہے یہ شعر
او سونے بس اب کہ موقعِ خوابِ سحر نہیں

سریر کابری مینائی گیاوی

جواہر پارے

اُنکی نظر نے دل کو مرے دل بنا دیا جامِ جہاں نما کے مقابل بنا دیا
اُٹھتے ہی اُس نگاہ نے بسمل بنا دیا دعوے کو برقِ طور کے باطل بنا دیا
اب تم ہمیں بناتے ہو کیا دیکھتے ہے یہ ہم نے تو تم کو پیار کے قابل بنا دیا
حاصل ہے اُن کو دل کے بنانے میں کمال "چٹکی اُٹھائی خاک کی اور دل بنا دیا"
اللہ رے فیضِ ساقیِ رنگیں جمال کا چھینٹا دیا کہ مرشدِ کامل بنا دیا
کتنی ہے موج ہو کے یہ ساحل سے ہمکنار ممنون ہو مرا کہ مجھے ساحل بنا دیا
جس راہ سے گذر کے جنازہ مرا گیا دنیا نے اُسکو جادۂ منزل بنا دیا
ہنگامِ نزع آئے وہ ہمراہ غیر کے مشکل کو میری اور بھی مشکل بنا دیا
قربان تیری چشمِ فسوں گر کے ساقیا ہشیار کر دیا کبھی غافل بنا دیا
شاعر کا دل بھی ہوتا ہے اک بحرِ بے کنار لہر آگئی تو موج کو ساحل بنا دیا

سب کچھ یہ فیضِ خدمتِ علم و ادب کا ہے
جوہر کو جس نے جوہرِ قابل بنا دیا

جوہر ڈبائیوی

قسط چہارم :-

...........کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں ——— بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرہ)

"شاعر" میں آپ کی ڈائری نہایت دلچسپ ہے میں "شاعر" آتے ہی سب سے پہلے اُسی کو پڑھتا ہوں۔ جزئیات پر آپ کی نظر بہت غائر پڑتی ہے۔ منظرکشی میں کمال حاصل ہے۔ سفر دکن قابلِ مبارکباد ہے۔ جہاں سے آپ یہ رنگین تحفہ لائے اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے" ——— **نشار اٹاوی**

"آپ نے "...... کی ڈائری" شروع کرکے نگاہوں کو مشتاق بنا دیا ہے۔ میں سب سے پہلے اسی کو پڑھتا ہوں اور محسوس کرنے لگتا ہوں کہ گویا اس سفر میں میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کی طرزِ نگارش داد سے مستغنی ہے۔ (اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ) ——— **ارشد صدیقی امروہوی**

"شفیق اعجاز بھائی ——— آپ نے "شاعر" میں اپنی ڈائری کا سلسلہ شروع کرکے "شاعر" کی دلچسپیوں میں اور بھی اضافہ کردیا ہے۔ یہ آپ کی اچھوتی طرزِ تحریر! یہ تصویر کشی یہ حسین منظر نگاری! تعریف و توصیف کے لئے کہاں سے الفاظ لاؤں۔ آپ کا یہ فقرہ "اُف اتنی رنگ و نور کی بارش جیسے سبزہ زار مری اس تمنا کا مذاق اڑا رہا ہو"۔ اور اُس کے بعد کے جملے۔ آہ ان فقروں میں کتنی رومانیت بھری ہوئی ہے۔ نہ جانے ایسے کتنے شگفتہ پھول آپ نے صفحۂ قرطاس پر بکھیرے ہیں۔ یہ جی چاہتا ہے کہ نگاہوں سے چُنتے ہی چلے جائیے۔ ڈائری کیا ہے ایک حسین خواب کی تعبیر۔ کاش آپ اپنی جدتِ قلم کی جولانیوں سے جلد محروم نہ کریں ——— **وزیرزادہ قمر عثمانی جوناگڈھی**

"ڈائری کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کر رہا ہوں۔ اس میں آپ نے اعلیٰ۔ پاکیزہ اور معیاری ادب پیش کیا ہے۔ اس کی رنگینی اور منظر نگاری کی کیا تعریف ہو سکتی ہے"

نشاط القادری

"صرف ڈائری ہی نہیں "شخصیات" میں بھی آپ کی طرزِ نگارش قابلِ ستائش ہوتی ہے۔ ہاں ڈائری تو صد درجہ دلچسپ ہے۔ سب سے پہلے اسی کو نظریں ڈھونڈتی ہیں مگر آپ اس کو کب تک قائم رکھ سکتے ہیں؟ خدا کرے آپ کسی اور دور دراز کے مشاعرہ میں مدعو کئے جائیں اور اس طرح ہمیں بھی آپ کے ہمراہ رہنے کا موقع ملے" ———

رونق دکنی

آج شام ہی سے مشاعرہ کی دوسری نشست کے متعلق اطلاعات آنی شروع ہوگئی ہیں۔ صاحبانِ ذوق ٹکٹوں کی خریداری کے لئے بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ اہلِ بنگلور کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے بانیانِ مشاعرہ نے ٹکٹ کی قید اٹھا دی ہے۔ سُنا ہے کہ یہ رعایت خصوصیت کے ساتھ طلبہ کے لئے ہے۔ مدراس۔ میسور۔ کولار۔ وانمباڑی اور حیدرآباد (دکن) وغیرہ سے شعرا کی کثیر تعداد بنگلور پہونچ چکی ہے۔ سیدہ اختر کے دل میں گدگدی ہو رہی ہے اور شعرا کے قلوب میں ایک ہیجان پیدا ہو رہا ہے۔ چونکہ مشاعرہ غیر طرحی ہے اس لئے ہر شاعر اپنی کامیاب ترین نظم و غزل کے انتخاب میں کوشاں ہے تاکہ شعرا کے اس انبوہ میں اپنے لئے کوئی نمایاں جگہ پیدا کرسکے سُنا ہے کہ حضرت علی اختر حیدرآبادی اور حضرت میرزا یگانہ چنگیزی بھی تشریف لے آئے ہیں۔ دس بجے شب کو مشاعرہ گاہ کے لئے روانہ ہوئے۔ آج ہال کا عالم ہی کچھ اور ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ گذشتہ شب کا اژدحام انتہائی تھا لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ محض خیال ہی خیال تھا۔ آج تو یہ عالم ہے کہ جیسے سیلاب موجیں مار رہا ہو۔ انتہا تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی وجہ سے یہ بھیڑ بھاڑ ہے انھیں بھی ڈائس پر بمشکل جگہ مل رہی ہے۔ یعنی ہمارے دیر سے تشریف لانے والے شعرا ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ اپنے پہلو میں جگہ دے دے جس کو جہاں جگہ مل سکی ہے وہ وہاں بیٹھ گیا ہے۔ سیدہ اختر ابھی نہیں آئی ہیں لیکن سامعین کے اصرار سے تنگ آکر بعض دیگر حضرات نے مشاعرہ شروع کرا دیا ہے۔ کل شب کی نشست میں چند مقامی شعرا کی طرحی غزلیں رہ گئی تھیں۔ چنانچہ اُن میں سے بعض کو موقع دیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد غیر طرحی مشاعرہ شروع ہوگا۔ لیجئے سیدہ اختر بھی آگئیں۔ جھومتی مسکراتی اور اپنے قلب کی دھڑکنوں کو چھپاتی ہوئی ——— کے بعد دیگرے مشاہیر شعرا

اپنا کلام سُنا رہے ہیں مگر سامعین کی سیری ہی نہیں ہوتی تو کیا گھول کے پی جائیں گے بنگلور والے شاعروں کو؟ ـــــــ ایک صاحب نے دبی آواز میں کہا۔ "شب کے ڈیڑھ بجے" اور "پڑھئے" کی آوازوں کو سیدہ اختر نے بڑی خوش اسلوبی سے روکا۔ شعرا کے کلام سے لذت گیر ہونے اور انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ سننے کا ایک منظر میں کبھی نہ بھولوں گا۔ ہوا یہ کہ آج کی نشست میں دروازوں تک آدمی بھرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا پولیس کے آدمیوں کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔ آدمیوں سے پیچھے ہو کر کسی شاعر کو سننا اور دیکھنا ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک کانسٹیبل دو انگلیوں سے کان کو تھامے ہوئے پنجوں کے بل کھڑا ہے اور کان کا رُخ ہال کی طرف کر دیا ہے جیسے کوئی بہرا آدمی اپنا کان آگے بڑھا دے ـــــــ آج کی نشست میں مردوں کی طرح خواتین بھی زیادہ ہیں اور دوسری بالائی گیلری بھی بھری ہوئی ہے۔

۲ بجے مشاعرہ ختم ہونے کے بعد باہر آئے تو ایک صاحب نے کہا "چلئے آپ کو گلزار اختر تک پہونچا دوں۔" چنانچہ ہم اُن کی موٹر میں بیٹھ گئے اور اپنی جگہ یہ سمجھ کر لیجانے والے منتظمین میں سے ہیں مگر کچھ دور جا کر معلوم ہوا کہ وہ صاحب ہماری قیام گاہ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے علم و وقوف کے مطابق اُن کی کافی رہنمائی کی مگر منزل کا نشان نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ ایک ایک سڑک کے دس دس چکر کاٹے۔ ایک ایک بازار میں کئی کئی مرتبہ گھوم کر ہر بار ناکامی کا سامنا ہوا۔ عام راہگیروں کا یہ حال کہ اگر موٹر روک کر اُن سے کچھ دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ ڈر کر بھاگتے ہیں، پھر پوچھئے کچھ اور جواب کچھ۔ معلوم ہوا کہ یہاں کے عوام ٹرٹری کے آدمیوں سے بہت خائف ہیں۔ اپنے گھنٹے کی مسلسل کد و کاوش کے بعد یہ طے پایا کہ ہال واپس چلا جائے، شاید وہاں کوئی آدمی مل جائے۔ ابھی کچھ دور ہی چلے تھے کہ اتفاق سے جناب ابوالکلام شاد مل گئے اور اس طرح یہ بھولا بچھڑا کارواں تین بجے ۳ ۱/۲ بجے اپنی منزلِ مقصود پر پہونچا۔

۲۹ نومبر ۱۹۴۲ء

آج کا دن بڑی مصروفیت کا ہے اور اہم بھی۔ اس لئے کہ دس بجے دن سے اُردو کانفرنس کا آخری اجلاس ہے اور شب کو مشاعرہ کی آخری نشست ـــــــ سب نے دیکھا ہے کہ جب لیمپ بجھنے کے قریب ہوتا ہے تو اُس کی روشنی تیز ہو جاتی ہے۔ یہی حال یہاں کا ہے۔ لوگوں کا جوش و خروش اپنی انتہا پر ہے۔ ہمیں تو دو چار گھنٹے آنکھ بند کرنے کا موقع بھی مل گیا لیکن سیدہ اختر گذشتہ شب مطلق نہ سو سکیں اس لئے کہ شب کے آخری حصہ میں بقول سیدہ ایک شاعر صاحب نے بیخودی و بدمستی کے عالم میں کمرۂ طعام کو غلاظت سے بھر دیا اور غریب سیدہ نے اتباعِ رسولؐ اور اپنے خاندانی اخلاق و ایثار سے کام لیکر دن نکلنے تک مہمانوں اور ملازمین کے بیدار ہونے سے پہلے پہلے اُسے اپنے ہاتھوں سے صاف کیا تاکہ اُن صاحب کا راز فاش نہ ہو۔ وہ بیداری سے تھکی ہوئی آنکھوں، خشکلبوں اور مضمحل چہرے سے بڑے مزے کے ساتھ شب کا واقعہ سُنا رہی ہیں اور میں دم بخود ہوں۔ آخر زبان نہ مانی اور کہنا ہی پڑا کہ جہاں نوازی اسی کا نام ہے ـــــــ وہ مجبور کر رہی ہیں کہ ہم جلد ناشتہ کر لیں تاکہ دس بجے کانفرنس میں شریک ہو سکیں۔

آج کانفرنس میں بھی کافی ہجوم ہے۔ تقریباً تمام شعرا اور ادبا موجود ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر سروری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ علامہ سیماب اکبرآبادی۔ حضرت مولانا محوی لکھنوی۔ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی۔ حضرت جگر مرادآبادی۔ حضرت علی اختر حیدرآبادی۔ حضرت ساغر نظامی۔ حضرت اُمید امیٹھوی کے علاوہ متعدد پروفیسر اور روساے شہر "دانش" پر جلوہ فرما ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور قادری ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور علامہ محوی لکھنوی میرے ہی قریب تشریف رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا ہے۔ ادبی دُنیا میں غائبانہ تعارف تو ایک کو دوسرے سے ہوتا ہی ہے مگر جب کسی ادیب اور شاعر سے ملاقات ہو جاتی ہے تو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ موصوف سے شرفِ نیاز حاصل ہو جانا کم از کم میرے لئے تو بہت زیادہ وجہ مسرت ہے۔ ڈاکٹر زور کی خدماتِ علم و فنون اور تنقیدی فنون سے کون واقف نہیں۔ تمام ہندوستان کو اُن کی ادبی اہلیتوں کا اعتراف ہے۔ وہ اپنے وقت کے بلند مرتبت ادیب ہیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی داغ بیل ڈال کر ڈاکٹر صاحب نے اتنا بڑا کام کیا ہے کہ صدیوں ہندوستان انھیں یاد رکھے گا۔ یہ ادارہ دکن کا سب سے بڑا ادبی ادارہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اُردو زبان و ادب کی خدمت نہایت پامردی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر زور بذاتِ خود۔ محبت۔ اخلاق اور مروت کا مجسمہ ہیں۔ ان کا اندازِ گفتگو صاف بتا رہا ہے کہ وہ علم و ادب کا سرچشمہ ہیں اور اُن کے تیور اس قوت کو آشکار کر رہے ہیں۔ جو مصلحین میں پائی جاتی ہے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب سے کسی ادبی موضوع پر گفتگو نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ کانفرنس کی کارروائی جاری ہے پھر بھی یہ سرسری ملاقات یادگار رہے گی۔ حضرت مولانا محوی لکھنوی سے میں کبھی نہ ملا تھا اور مدت سے آرزو تھی آج اس آرزو کو بھی شائستۂ تکمیل دیکھ رہا ہوں ـــــــ مسرت اور بے انتہا مسرت۔

حضرتِ محوی شمالی ہند کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں۔ غالباً ۲۰ سال سے مدراس یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ آپ جنوبی ہند میں اُردو کی ترقی کا بڑی شد و مد سے فرض ادا کر رہے ہیں مولانا کے شاگرد بھی کافی ہیں۔ کلام میں جدید و قدیم کا امتزاج ہے اور علم و فن میں یگانگی کا

رکھتے ہیں۔ جلسہ کے صدر رکن الملک جناب سید عبدالواحد صاحب بنزواری بی۔ اے ریٹائرڈ ریونیو کمشنر ہیں۔ ابتدا میں کئی قرار دادیں (ریزولیشن) پاس ہوئیں۔ اس کے بعد خواجہ حمید الدین احمد شاہد مدیر "سب رس" حیدرآباد نے ایک مقالہ پڑھا پھر حضرت ساغر نظامی نے "نظم آزاد" پر ایک تفصیلی، تحقیقی اور پر مغز مقالہ سنایا۔ حضرت ساغر کے سنانے کا انداز بذاتِ خود دلچسپ تھا اور مقالہ اس سے زیادہ جاذب۔ اس لئے بڑی توجہ سے سنا گیا۔ علامہ سیماب نے آخر میں مشاعرہ اور کانفرنس پر تبصرہ فرمایا اور بھی چند ایک حضرات نے تقریریں کیں۔ ڈاکٹر زور کی مختصر تقریر جو ایک ریزولیشن کے سلسلے میں تھی خوب تھی۔ اس کے بعد ریاست میسور و بنگلور کے متعدد اکابرین نے بڑھ بڑھ کر سیدہ سردار بیگم اختر کی مساعی جمیلہ کو سراہا اور ان کے ایثار و قربانی کا اعتراف کرتے ہوئے خوب خوب داد دی۔ جلسہ میں اس وقت جذبات و محسوسات کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ اخبارات کے نمائندے اور رپورٹر ایک بڑی میز کے قریب بیٹھے ہوئے جلدی جلدی تمام کارروائی نوٹ کر رہے ہیں۔ سیدہ اختر ہیں کہ پھولی نہیں سما رہی ہیں۔

کانفرنس سے واپس ہوتے ہی دسترخوان بچھا اور ۲ ½ بجے تک فارغ ہو کر سو گئے۔ شام کو ۵ بجے آنکھ کھلی۔ آج صبح "آکاش وانی" (میسور ریڈیو اسٹیشن) ڈائرکٹر صاحب بہت مجبور کر گئے ہیں کہ ہم ۶ ½ بجے شام کو آکاش وانی سے اپنا کلام نشر کریں۔ آج ہی ۸ ½ بجے شب کو "آل میسور مسلم لیگ" کی طرف سے تمام شعرا کو ایک خیر مقدمی عشائیہ دیا جا رہا ہے۔ خان صاحب محمود شریف صدر آل میسور مسلم لیگ کی طرف سے اُردو زبان میں ایک نہایت ستھرا مطبوعہ دعوت نامہ اُردو زبان میں آیا ہے۔

۶ بجے شام کو ڈائرکٹر صاحب ریڈیو اسٹیشن کی کار لیکر آگئے۔ حضرت علامہ سیماب مدظلہٗ اور جناب شیدا کاشمری بھی چل رہے ہیں۔ راستہ میں محمد علی ہال ۲ جہاں دیگر شعرا اور ادبا ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں سے ایک پروفیسر صاحب بھی شریک ہو گئے۔ ریڈیو اسٹیشن بہت معمولی اور ابتدائی حالت میں ہے۔ ایک چھوٹا سا کمرہ، مختصر فرنیچر اور معمولی مائکروفون۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے مجھے بارہا بولنے کا موقع ملا ہے، وہاں بیٹھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ بولتے ہی رہئے اور کبھی نہ اٹھئے۔ یہاں بھلا وہ بات کہاں۔ بہرحال امتثالِ امر ضروری تھا۔ اس لئے سب نے یکے بعد دیگرے بنگلور کو دیکھنے کے بعد اپنے پہلے تاثرات کا اظہار کیا اور پھر کلام سنایا۔ پروفیسر صاحب نے ایک مختصر سا مقالہ پڑھا۔ افسوس کہ پروفیسر صاحب کا نام یاد نہ رہا۔ بڑے خلیق اور ملنسار بزرگ ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں "خیر مقدمی عشائیہ" میں پہونچا دینگے۔ چنانچہ پروگرام ختم ہونے کے بعد تقریباً سوا آٹھ بجے "کوچہ بانکے نواب" پہونچے کچھ دیر نیچے کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ یہاں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور حضرت جگر وغیرہ معروفِ گفتگو تھے کچھ دیر بعد بالائی کمرے میں لیجائے گئے تقریباً ساٹھ ستر آدمی ہیں۔

عشائیہ شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہوگیا۔ اس عشائیہ میں جنوبی ہند کی معاشرت کے مطابق کھانے ہیں۔ اس سے فارغ ہوئے تو سب کو ہار پھول پہنائے گئے اور ایک صاحب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ جواباً تمام شعرا کی طرف سے حضرتِ ساغر نظامی نے میزبانوں کی مردم شناسی اور مہمان نوازی کا اعتراف کیا۔ اس عشائیہ میں پروفیسر عبدالقادر سروری ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی صدر شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی میرے بالکل قریب ہی تشریف رکھتے ہیں موصوف سے خورد و نوش کے دوران میں بھی خاصی گفتگو رہی۔ سروری صاحب کے اکثر مضامین میری نظر سے گذر چکے ہیں وہ تمام ہندوستان میں متعارف ہیں اور ایک تازہ و زندہ دل و دماغ کے مالک۔ میسور میں اُن کی مساعی سے اردو کا ذوق یقیناً ترقی کریگا اور اُمید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں وہ اپنی ہمسایہ ریاست حیدرآباد کے نقشِ قدم پر تیزی سے گامزن ہوجائیگا۔

چونکہ ۹ ½ بج چکے ہیں اس لئے تمام شعرا کو براہِ راست مشاعرہ گاہ تک لے جایا جا رہا ہے۔ آج سرپٹین جیٹی ٹاؤن ہال کا کیا حال ہے۔ اسے کس لئے میں الفاظ کہاں سے لاؤں؟ وہ تو سب گذشتہ نشستوں کی بھیڑ بھاڑ کے ذکر میں ختم ہوگئے۔ اب تو یہی کہنا پڑیگا کہ آج ہال میں اتنی ریل پیل ہے کہ ایک کے اوپر ایک نظر آرہا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ سامعین کی نشست گاہ کو چھوڑ کر شعرا۔ ادبا اور عمائدین کی نشست گاہ یعنی "ڈائس" بھی کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ بہت سے شعرا بجائے صوفوں اور کرسیوں کے نیچے دری پر بیٹھے ہوئے ہیں انھیں میں ہمارے ملک کے دو مشہور شاعر حضرت یگانہ چنگیزی اور حضرتِ ساغر نظامی بھی ہیں اور بڑی خوشی کے ساتھ زمین پر تشریف فرما ہیں۔ یہ موقع بھلا کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ شاعر تو ایثار اور قربانی کا مجسمہ ہوتا ہے اور اس کے لئے اس قسم کی باتیں کسرِ شان نہیں ہوتیں۔ مولانا محوی لکھنوی میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ مولانا بھی میری طرح پان کے بہت عادی ہیں۔ لہٰذا مجھے اور مولانا کو یہ یقین ہوگیا کہ ہم دونوں کی ڈبیاں مل کر مشاعرے کے اوقات کو کاٹ دینگی مگر دوسرے ادبا اور شعرا کی فرمائشوں کو کیا کیا جائے چنانچہ بہت جلدی ڈبیاں خالی ہوگئیں۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا اور اسی اصول کے ساتھ۔ یعنی پہلے تلاوتِ کلام پاک اور پھر نعت شریف۔ اس نشست میں جناب منیر کولاری نے علامہ سیماب مدظلہٗ کی نعت بڑی خوش الحانی سے پڑھی۔ اس کے بعد صدر صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ مشاعرہ شروع ہونے ہی والا تھا کہ علامہ سیماب مائکروفون پر تشریف لائے اور خطیبۂ ہند سیدہ سردار بیگم اختر حیدرآبادی کو ان الفاظ "زہرۂ سخن" کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

حضرات!

اس سے پہلے کہ مشاعرہ شروع ہو میں ایک مجلسی فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔
آج دن کو جلسۂ اردو کانفرنس میں آپ میں سے جو لوگ موجود تھے انھیں

معلوم ہوگا کہ اُردو کانفرنس نے کیسے کیسے ادیبوں کو جگمگا دینے والے جنوبی ہند میں آفتابِ اُردو کی عالم افروز شعاعیں پھیلانے والے ریزولیشن پاس کئے۔ جو تمام جنوبی ہند کے لئے عموماً اور بنگلور کے مستقبل کیلئے خصوصاً نئی بیداریوں اور نئے اُجالوں کے ضامن ہیں۔ یہ سب کچھ خطیبۂ ہند سیدہ اخترؔ صاحبہ حیدرآبادی کی مساعیٔ جمیلہ اور لطیف الخیالی کا نتیجہ ہے جس میں اُن کے شوہر خانصاحب عبدالغنی آرمی کونٹریکٹر برابر کے شریک ہیں۔

اگر میں میسور اسٹیٹ کا فرمانروا ہوتا تو آج اخترؔ صاحبہ کو اپنی حکومت کی طرف سے کوئی سرکاری خطاب دے کر اُنکی حوصلہ افزائی کرتا۔

اُردو کانفرنس میں بھی ایک ایسی اجتماعی قوت موجود تھی جو اِس فرض کو ادا کر سکتی تھی لیکن وہ بھی کسی مصلحت سے خاموش رہی۔

لہٰذا میں، ایک خادمِ ادب اور ایک شاعرِ عصر ہونے کی حیثیت سے اِس بھری محفل میں سیدہ اخترؔ صاحبہ کو "زہرۂ سخن" کا تابناک خطاب دیتا ہوں جسکی وہ مستحق ہیں۔ اُمید کہ خطیبۂ ہند یہ ہدیۂ درخشاں دُنیائے ادب کی طرف سے قبول فرمائینگی اور آپ سب حضرات میری تائید فرمائینگے"

سیمابؔ اکبرآبادی

۱۹ ر نومبر سنہ ۱۹۴۲ء

علامہ سیمابؔ کی اِس مردم شناسی، معارف پروری اور اخترؔ نوازی نے ہال میں ایک آگ سی لگادی۔ شعرا اور ادبا ایک لمحے کے لئے کسی خیال میں ڈوب کر رہ گئے کہ ایک شہنشاہِ سخن خطاب دے چکا ہے اب خیال آرائی اور رائے زنی بے سود ہے۔ اِس کے بعد ہی تالیوں اور نعروں سے تائید کی گئی۔ اُف فطرت انسان کو جو کچھ بنانا چاہتی ہے وہ بنا کر چھوڑتی ہے۔ اسبابِ عمل پر غور و خوض بیکار ہے یہاں تو حق بہ حقدار رسید والا معاملہ ہے۔

آج کی نشست میں حیدرآباد کے چند نوجوان شعرا کو چھوڑ کر باقی تمام مشاہیر شعرا ہی اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ ایک ایک شاعر سے دو دو تین تین نظمیں اور غزلیں سُنی جا رہی ہیں حضرتِ یگانہؔ چنگیزی کو بھی آواز دے لی گئی ہے۔ ایک مدت کے بعد مجھے موصوف کی زبان سے شعر سننے کا اتفاق ہو رہا ہے۔ جب وہ آگرہ میں تھے تو اکثر یہ سعادت حاصل ہوتی تھی بڑی دردبھری اور لچکیلی آواز ہے مگر افسوس کہ اُنھوں نے اپنی آجکل کی شاعری سُنائی جس پر واہ واہ تو ہوئی مگر متضحک پیرائے میں اور یہ رنگ دیکھ کر موصوف اُٹھ گئے۔

ابھی حضرتِ یگانہؔ اُٹھے ہی تھے کہ نہ جانے کس جذبہ کے تحت میں خانصاحب عبدالغنی نے انھیں گود میں اُٹھا کر پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ اِس پر ایک فرمائشی قہقہہ لگا اور جب اُس کی بازگشت ختم ہوئی تو حضرتِ یگانہؔ نے چیں بجبیں ہو کر فرمایا کہ "میں نے سیکڑوں مشاعرے پڑھے ہیں، میں رنگینیٔ محفل سمجھتا ہوں" بہرحال دوسری غزل پڑھی مگر بجھے ہوئے دل سے۔ حالانکہ غزل اپنی جگہ بہت خوب تھی اور غالباً اُس وقت کی تھی جب حضرتِ یگانہؔ صرف یاسؔ عظیم آبادی تھے"

حضرتِ جگرؔ سے بھی کئی غزلیں سُنی گئیں اور محفل میں رنگِ کیف و مستی بکھر گیا علامہ سیمابؔ۔ حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی۔ حضرت ساغرؔ نظامی۔ حضرت علی اخترؔ حیدرآبادی اور حضرت مولانا محویؔ لکھنوی غرض تمام مشاہیر شعرا سے کئی کئی غزلیں سُنی گئیں۔ اس کے باوجود سامعین کا ذوق سیراب نہ ہوا۔ چونکہ وقت کافی ہو چکا تھا۔ اس لئے علامہ سیمابؔ اور حضرت جوشؔ دورانِ مشاعرہ ہی سے تشریف لے گئے مگر مشاعرہ آخر تک جوان رہا۔ جب پروانوں کو نیند آنے لگی جب ہواؤں میں خنکی پیدا ہو گئی جب ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگیں اور جب شعرا اپنا کلام سُناتے سُناتے اُکتا گئے تو یہ آخری یادگار نشست "زہرۂ سخن" سیدہ اخترؔ کو دعائے حیات دیتے ہوئے، اہلِ میسور کو سوزِ سخن سے گرماتے ہوئے اور شمالی ہند سے جلنے والے مشاہیر شعرا کی زبانوں سے یہ سنتے ہوئے کہ ہم نے بہت کم ایسے اجتماعات دیکھے ہیں، انتہائی کامیابی اور حسن و خوبی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

واپسی میں حضرت جگرؔ مرادآبادی کا ساتھ ہو گیا، وہ اور میں ایک ہی کار میں ہیں، مشاعرہ گاہ سے جائے قیام تک اُن سے خوب گفتگو رہی۔ حضرتِ جگرؔ نے بادہ و ساغر کو جب سے الوداع کہا ہے۔ اُس وقت سے میں کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ اُنکے کلام سے وارفتگی اور ربودگی ختم ہوتی جا رہی ہے مگر ثقاہت اور سنجیدگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ اب اُن کی گفتگو بڑی حد تک سنجیدہ، بامحل اور علمی و ادبی موضوعات سے متعلق ہوتی ہے اور ہاں وہ نمازی بھی ہو گئے ہیں ——— یہ ہیں انسانی کردار کے نشیب و فراز۔ آغا حشرؔ کاشمیری نے بھی زندگی کی آخری گھڑیوں میں توبہ کر لی تھی۔ جگرؔ ایک وارفتہ مزاج شاعر ہیں۔ اُن کے تغزل کی یکرنگی نے اُنھیں ہندوستان کا ممتاز شاعر بنا دیا ہے ——— اور وہ قابلِ مبارکباد ہیں

آج شب کو بہت دیر سے سونا نصیب ہو رہا ہے۔ دماغ میں اُردو کانفرنس کے نقوش مرتسم ہیں اور دل میں کسی کی انتھک کوششوں کا اعتراف۔

(باقی۔ باقی)

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "ترے جلووں نے نظر کو نئی اک زندگی دے دی"

حضرت نشتر ہتگامی

وہ جان اپنی خوشی پائی وہ جان اپنی خوشی دے دی
امانت تھی خدا کی ہم سے جب مانگی گئی دے دی

محبت میں تمہاری جس نے اپنی زندگی دے دی
حیاتِ دائمی لے لی حیاتِ عارضی دے دی

بڑھاپے نے طلب کی مجھ سے جو انکار کیا کرتا
جوانی یوں بھی تھی مجھکو وبالِ زندگی دے دی

سکونِ دل مرا رکھا کبھی قائم کبھی برہم
مری توفیقِ ضبطِ غم کبھی لے لی کبھی دے دی

نہ ہوگی تیری بیداری اے قسمتِ خفتہ
جب ان کے دیکھنے کا وقت آیا بیخودی دے دی

غمِ فرقت نہ سنبھلا آج بیمارِ محبت سے
وہ ہچکی آئی جس میں اس نے اپنی جان ہی دے دی

غمِ دنیا کا مجھکو فکر کیوں ہونے لگی نشتر
خدا نے غم غلط کرنے کو مجھکو شاعری دے دی

حضرت جذب عالم پوری

مرے دل کو مذاقِ عاشقی نے بیکلی دے دی
ضرورت تھی مجھے جس چیز کی آخود ہی دے دی

نہ حسنِ خود نما باقی نہ اب ہوشِ خدا باقی
خودی لیکر مرے ساقی نے اچھی بیخودی دے دی

اسی کو بے خبر دونوں جہاں سے کر دیا اس نے
جسے اسرارِ فطرت سے ذرا سی آگہی دے دی

دلِ ویراں کی اب کیا پوچھتے ہو وہ دلِ ویراں
بہت مدت ہوئی اس گھر میں ہم نے آگ بھی دے دی

بڑھا دی رونقِ ہنگامۂ عالم کی یوں اس نے
کسی کو دیدیا تخت کسی کو بانسری دے دی

دل ان کو دے چکے تھے اور پہلے تھے نذرِ ایماں بھی
ذرا سی جاں باقی تھی تو اب وہ جان بھی دے دی

کروں کیا شکرِ جذب اسکی جاں نوازی کا
کہ مرگِ عشق نے اک جاودانی زندگی دے دی

حضرت مہر تقوی سبے پوری

تری الفت نے معراجِ نیازِ عاشقی دے دی
فضائے عرش کے تاروں پہ مجھ کو برتری دے دی

تری نظروں کو کس نے یہ اداے دلکشی دے دی
کسی کی زندگی چھینی کسی کو زندگی دے دی

یہ اسکی شانِ وہابی کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے
کہ میری دلقِ درویشی کو شانِ خسروی دے دی

محبت میں تصور رات نئے جلوے دکھاتا ہے
اس آئینے کو تم نے قدرتِ صورتگری دے دی

حیاتِ نو کے رنگا رنگ پردے ڈال کر دل پر
ہمیں فطرت نے کیسی شورش آگیں زندگی دے دی

لگا دی تھی یہ کس جلوہ گری کی تڑپ پروانے کے دل میں
کہ جس نے شمع کی الفت میں اپنی جان ہی دے دی

فرشتوں کو بھی جس کی آرزو میں مضطرب پایا
محبت نے ہمیں اے مہر! ایسی زندگی دے دی

جناب سہا قریشی

خرامانی رفتار ظلم عطا کی بیکسی دے دی
مناسب تھی جو شے میرے لئے مجھکو وہی دی تھی

جوانی دی جوانی دی حسن بخشا سادگی دی دی
نہیں خالقِ قدرت نے ساری دلکشی دے دی

شفق کا عکسِ زریں یوں گلوں پر جلوہ افگن ہے
کہ جیسے صحنِ گلشن میں کسی نے آگ سی دے دی

بھلا فرمایئے روزِ ازل مانگا تھا دل کس نے
بلائے ناگہانی آپ نے تو آپ ہی دے دی

اگر تھی کاوشِ کنجِ قفس ہی غایتِ ہستی
بہاروں نے مجھے کیوں آرزوئے زندگی دے دی

کہیں تو کون مانے گا کہ وہ آکر سرِ تربت
یہ بولے ہم نے دل مانگا تھا تم نے جان بھی دے دی

نہیں تقسیمِ قدرت کا کوئی شکوہ سہا مجھکو
یہ تو دینے کا دینا ہے جو اسے شاعری دے دی

جناب شفا گوالیاری

گلوں کو تازگی تاروں کو تو نے دلکشی دے دی
مگر دل کی کلی کو جانے کیوں افسردگی دے دی

بقدرِ ظرف اس نے آگہی دگر ہی دے دی
خودی دیدی کسی کو اور کسی کو بیخودی دے دی

زمانہ کچھ کہے اے دوست لیکن شکریہ تیرا
کوئی تو مصلحت تھی جو مجھے دیوانگی دے دی

کسی کی پرسشِ خاموش بھی اک حسنِ پرسش تھا
کہ جس نے پھر ہماری زندگی کو زندگی دے دی

میں فطرت کی غلط بخشی پہ اکثر غور کرتا ہوں
غلامی اس نے کیوں انسان کو انسان کی دے دی

حقیقت میں جنونِ عشق معراجِ محبت ہے
اسے سب دیدیا تو نے جسے دیوانگی دے دی

شفا کو اب نہیں حاجت خدایا بادشاہت کی
یہ کیا کم ہے غلامی حضرتِ سیماب کی دے دی

جناب جری ہوشنگ آبادی

بہت اچھا کیا معراجِ عشق و شاعری دے دی
خودی جس پر تصدق ہو مجھے وہ بیخودی دی دی

مئے خورشید کے دو جام بھر کر روز پیتا ہوں
مجھے ساقی فطرت نے دو گونہ سرخوشی دے دی

محبت جب نہ تھی مجھ کو کسی کی ہیچ تھی دنیا
محبت نے ہر اک شے کو جہاں کی دلکشی دے دی

ازل میں بڑھ گئیں جب میری تشنہ کامیاں حد سے
مجھے ساقی نے پینے کو شرابِ زندگی دے دی

میں فانی ہوں تو کیا میری محبت تو نہیں فانی
محبت نے مجھے آخر حیاتِ دائمی دے دی

الٰہی میں عطیہ اس کو سمجھوں یا سزا سمجھوں
عطا کر کے مجھے دل مستقل اک بے کلی دے دی

جری مانگو دعائیں اب خلافِ مدعائے دل
سکوں مانگا تھا تم نے تو خدا نے بیکلی دے دی

جناب صادق از بھنڈ

انھیں پہلے تو میں نے دل دیا پھر جان بھی دے دی
غرض جو چیز اُن کی نذر کے قابل تھی دے دی

جہاں میں شور ہے منصور کے شورِ انا الحق کا
یہ کیا معبود ہو کر عبد کو تم نے خودی دے دی

حقیقت آشنا جو ہو گئی حسنِ حقیقت کی
"ترے جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دے دی"

کبھی میں تم سے واقف تھا مگر اب خود سے غافل ہوں
نہیں ہوش بخشا تھا تمہیں بیخودی دے دی

نہ دی وہ چیز کیوں تم نے مجھے جس کی ضرورت تھی
یہ کیا آشفتگی دے دی یہ کیا درماندگی دے دی

ہماری جان لینے کی پھر ایسی کیا ضرورت تھی
جو تم نے جان لے لی ہے نئی پھر زندگی دے دی

ابد تک موت کا خدشہ نہیں ہے جس کو اے صادق
محبت نے کسی کی مجھ کو ایسی زندگی دے دی

جناب بزم امروہوی

ہمیں جب دینے والے نے مجال زندگی دے دی
تو دانستہ متاع بیخودی لی اور خودی دے دی

محبت میں جو تھے فطرت نے دی وہ کام کی دے دی
انھیں بیتابیاں دیر و حرم میں دیوانگی دے دی

نظر آیا تھا جب تک بڑی بیچینیاں سی تھیں
نگاہوں کو ترے جلووں نے اک آسودگی دے دی

جو اپنے ہوش میں رہتے تو شاید دل پہ بن آتی
غنیمت ہے محبت نے ہمیں خود رفتگی دے دی

دکھا کر جلوۂ تاباں تصور کے دھندلکوں میں
یہ کس نے مرنے والے کو نوید زندگی دے دی

تڑپ کر دل نے اوروں کو بھی تڑپایا سر محفل
محبت نے تڑپنے کی اجازت جب کبھی دے دی

شکایت بیکسی کی عشق میں ہو گی جنہیں ہو گی
ہمیں تو بزم آنکھوں نے خبر تک تو نہیں دے دی

جناب نسیم ترپاتوری

(غزل مسلسل)

اسے احساس کامل اور اسی کو بے حسی دے دی
جسے جس شے کی حاجت تھی اسے تو نے وہی دے دی

ستاروں کو چمک دی مہر و مہ کو روشنی دے دی
گلوں کو رنگ و بو بخشا کلی کو دلکشی دے دی

چمن کو نغمہ سنجی بخشی گل و ریحان و سنبل سے
بہار جانفزا کو خدمت مشاطگی دے دی

پتنگے کو سکھایا تو نے حسن شمع پر مٹنا
فروزاں شمع کو صرف ایک شب کی زندگی دے دی

کوئی خضر طریقت ہے کوئی غارت گر ملت
کسی کو رہبری دے دی کسی کو رہزنی دے دی

تو سب جلووں کی رنگینی نگہ کو سب ہیں آئینے
کہ ہر اک شے کو تو نے ایک کیفیت نئی دے دی

سکون نا آشنا قلب نسیم زار و مضطر ہے
یہ کیا سیمابیت بخشی یہ کیسی بے کلی دے دی

جناب بیتاب کالپوی

جمال دوست نے پہلے مجھے وارفتگی دے دی
پھر اس کے بعد مست حسن کر کے بیخودی دے دی

فراز طور کا ہر ذرہ اب تک ماہ کامل ہے
بہاری کو بھی جلووں نے تری تابندگی دے دی

فرشی انساں تھا آگاہ جو اپنی حقیقت سے
اسی انسان کو دونوں جہاں کی آگہی دے دی

کسی کو کر دیا مجبور ترک زندگانی پر
کسی کو حسن کافر نے نئی اک زندگی دے دی

ہوا انساں کا انساں دشمن اس زمانے میں
نہ جانے کون سے جذبے نے خوئے دشمنی دے دی

خدا بخشے کہ انساں گو سمجھے ہیں اب آقاؤں میں
فریب نفس نے انساں کو کتنی خودسری دے دی

عجب بیتاب ہے تو بھی کہ بیتاب یہ بھی ہے کرم اس کا
مجھے اپنا بنا کر دولت دیوانگی دے دی

جناب حزیں قریشی احمد آبادی

کمال عشق نے اک غیر فانی زندگی دے دی
ملا کر خاک میں ہم کو حیات سرمدی دے دی

خودی عشق کی منزل خدا داروں کی منزل ہے
دل آگاہ کو کس نے نوید بیخودی دے دی

چمکتا ہے وہ ذرہ قسمت خورشید بن کر
جمال یار نے جس کو ذرا سی روشنی دے دی

ملال اس کا ہے دل کو ابتلائے غم نہیں حاصل
خوشی اس بات کی ہے تم نے غم پرور خوشی دے دی

مرا اپنے آپ کو سجدہ کیا کرنا ہوا خلوت میں
نہ جانے کس نے یہ تعلیم رسم کافری دے دی

دیا کیا اذن نظارہ فراز طور سینا پر
"ترے جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دے دی"

جناب اشعر ہاشمی ملیح آبادی

جگر کو زخم، دل کو غم، نظر کو بیکسی دے دی
ہمیں یہ موت سے بدتر کس نے زندگی دے دی

ہزاروں سر کف عشاق کا مجمع ہے مقتل میں
یہ کس نے آج ان کے دست نازک میں چھری دے دی

یہ کب کہتا ہوں ذوق بندگی مجھ میں نہ تھا لیکن
تمہارے نقش پا نے اس کو اک تکمیل سی دے دی

خمار نشۂ عشرت بڑی مشکل سے اترا تھا
برا ہو بادۂ غم کا مجھے پھر بیخودی دے دی

نگاہ حسن تو کیوں ہے پشیماں کچھ نہ دینے پر
یہ کیا احساں ذرا کم ہے کہ مجھ کو شاعری دے دی

لئے جاتا ہے اس کو عین طوفاں کے مقابل میں
نہ جانے دل نے کس کے ہاتھ میں کشتی مری دے دی

چراغاں ہو گیا بزم تصور میں مری اشعر
شب فرقت مرے اشکوں نے اتنی روشنی دے دی

حضرت ارشد صدیقی امروہوی

محبت نے ہمیں صہبائے کیف سرمدی دے دی
حقیقت تو یہ ہے ارشد حقیقی زندگی دے دی

اب اتنا ہوش بھی باقی نہیں میں کون ہوں کیا ہوں
تصور نے کسی کے مجھ کو اتنی بیخودی دے دی

نہیں ہے آفتاب حشر کو بھی تاب نظارہ
جبیں کو ان کے سنگ در نے وہ تابندگی دے دی

سمجھ میں آ گیا جب مدعا تخلیق ہستی کا
تو جس نے زندگی دی تھی اسی کو زندگی دے دی

تمہاری یاد کیا آئی دل افسردہ میں گویا
نسیم صبح نے آکر چمن کو تازگی دے دی

عجب فطرت کا یہ انعام ہے انساں پہ ارشد
بڑی دولت عطا کر دی اگر خود آگہی دے دی

جناب خادم زیبائی سیمابی مقیم جبلپور

خدا نے جس کے لائق چیز جو بھی تھی وہی دے دی
مجھے الفت تمہیں حسن اور دل کو بیکلی دے دی

تری راہ طلب میں وہ بھی اک مجبور سا ہی ہمرہ تھا
بیک جلوہ جسے تم نے حیات سرمدی دے دی

یہ حسن عشق کی نیرنگیوں کا اک کرشمہ ہے
[illegible] دے دی

جو دنیا گیر تھا جذب عشق لیکن اصل میں تم نے
[illegible] دے دی

تمہیں کیا پوچھتا ہوں ما سوا سے بے خبر کر کے
[illegible]

کسی کے جلوۂ ناز کا خادم [illegible]
[illegible]

جنابِ طرفہ قریشی بھنڈاروی

محبت نے تری مجھ کو نشاطِ دائمی دے دی
کچھ ایسی روح پھونکی زندگی ہی زندگی دے دی

دکھایا یہ نیا اعجاز اسے جوشِ جنوں تو نے
خرد کے ہاتھ میں بھی مشعلِ دیوانگی دے دی

صلہ الفت کا اور اس پہ زیادہ حسن کیا دیتا؟
جگر کو ٹیس، دل کو درد، آنکھوں کو نمی دے دی

گری اک کوند کو کچلی قفس میں شامِ تنہائی
سیہ خانے کو میرے آسماں نے روشنی دے دی

مرے قلبِ فسردہ کو دیکر ذوقِ نظارہ
تری نظروں کو قسامِ ازل نے دلکشی دے دی

چمک اٹھے مرے جذبات کس کے فیض سے طرفہ؟
مرے اشعار کو کس نے حیاتِ دائمی دے دی

جنابِ منتظر کلیمی جام پوری

فضائے جانفزا سے اس نے روح کو پھر زندگی دے دی
سکوں فرما ہو جس پر اک ایسی بیکلی دے دی

مجھے آزاد فطرت کر کے پیدا میرے خالق نے
مری تقدیر کو دونوں جہاں کی بےبسی دے دی

الٰہی! حسن اگر پیدا ہوا تھا عشق کی خاطر
تو اس سے حسن کو پھر تو نے کیوں خودنمائی دے دی

نقاب اٹھتے ہی وزدیدہ نگاہی نے تری ظالم
کچھ ایسی بیخودی دی دی کہ میں نے زندگی دے دی

ترا ممنون ہوں [illegible] اے غمِ پیہم
کہ مجھ کو منتخب کر کے نشاطِ سرمدی دے دی

ڈرے وہ موت سے کیونکر جسے تقدیر نے منتظر
فنا کر کے محبت میں حیاتِ دائمی دے دی

جنابِ اکرم حنیفی دھولیوی

ابھی تو دور رہتے افکارِ رنگا رنگ کی محفل
خیالِ حسن نے مجھ کو ابھی سے بیخودی دے دی

جو جیتا ہوں تو رسوائی جو مرتا ہوں تو بدنامی
محبت نے مجھے کیا کشمکش کی زندگی دے دی

مری سرگشتگی شاید مرے مقصد کی حامل ہے
کہ اس نے جان کر اپنا مجھے دیوانگی دے دی

فسردہ غلامی طبیعت سے گھبرا گیا تھا میں
"تری جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دے دی"

انھیں تو بے رخی سے دل لگی منظور تھی لیکن
مریضِ عشق نے مجبور ہو کر جان ہی دے دی

نوازش کی یہ قسامِ ازل نے مجھ پہ اے اکرم
اٹھانے کے لئے لطفِ محبت شاعری دے دی

جنابِ فارغ اودے پوری

بہارِ حسن کی تو نے کسی کو تازگی دے دی
عطا کر کے کسی کو دردِ دل کی بیکلی دے دی

سزا میں دلشکن تیری عطا میں جاں فزا تیری
اگر لی روشنی آنکھوں کی، دل کی چاندنی دے دی

لبِ گویا کو اسرارِ نہاں سے بے خبر کر کے
حقیقت آشنا دل کو زبانِ خامشی دے دی

جبینِ سجدہ ہے یا یہ طلوعِ صبحِ روشن ہے
جبینِ سجدہ کو اتنی یہ کس نے روشنی دے دی

ترے دردِ محبت نے تڑپ بخشی رگِ جاں کو
"ترے جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دے دی"

نفس کم گم راہ کن کیا [illegible] جوشِ تمنا کی
کہ قدرت نے بشر کیا [illegible] فارغ خود [illegible] دے دی

جنابِ فردوس [illegible]

دلیل [illegible] دے دی
خطا کرنے کی [illegible] زندگی دے دی

تجھے اچھی طرح سیراب کر دینا تھا اے ساقی
مئے عرفاں پلا کر پھر مجھے کیوں تشنگی دے دی

تمہارے [illegible] ہوں زندہ اتفاقات سے لیکن
نہ جانے موت نے پھر کیوں نویدِ زندگی دے دی

پرستش کر رہا تھا میں تری کرنے لگا اپنی
سجودِ شوق نے ایسی مجھے وارفتگی دے دی

فرشتے جو نہ پا سکتے [illegible] ہیں
مجھے فطرت نے ایسی کونسی خوشنودگی دے دی

بھلا فردوس مجھ کو خوف کیا دوزخ کے شعلوں سے
مجھے فطرت نے ہے جاگیر فردوس کی دے دی

جنابِ محشر فرخ آبادی

ہوا اچھا اگر اک شے بہم مذاقِ عاشقی دے دی
خودی کو انتہا کی اور ہم نے بیخودی دے دی

سر اب اپنی حقیقت میں جو کچھ بھی ہے سب کیا مطلب
مری تشنہ نگاہوں کو تو اک آسودگی دے دی

اب ان کے سنگِ در سے سر اٹھائے بھی نہیں اٹھتا
یہ کیسی بیخودی تو نے مذاقِ بندگی دے دی

ہر اک ٹھوکر ہے اب رہبر ہر اک جادہ ہوا منزل
مری گمراہیوں نے قوتِ منزل رسی دے دی

ہٹائے سر نہیں ہٹتی ہر اک تیغ بُرّاں سے ان کے
تجھے کس نے یہ جرأت اے نگاہِ بے خودی دے دی؟

انھیں آئے نہ آئے اعتبارِ عاشقی محشر
ثبوتِ عشق میں ہم نے تو اپنی جاں بھی دے دی

جنابِ تنا از گوالیار

شکایت کیا ہے اس کی دی دیا غم یا خوشی دے دی
ہر اک نعمت اُسی کی ہے جو دل میں آ گئی دے دی

زمانہ تیرا شیدائی، خدائی تیری دیوانی
غضب کی تجھ کو فطرت نے ادائے دلکشی دے دی

صلہ دیتے ہیں وہ کیا دیکھئے ہم کو وفاؤں کا
ہم ان پر دل بھی قرباں کر چکے اور جان بھی دے دی

بہت کچھ دید بالے دینے والے شکریہ تیرا
کمی اب کیا ہے تو نے مجھ کو دولت عشق کی دے دی

جنونِ عشق ہے گویا ترا عرفان ہو جانا
جسے دیوانگی دیدی اُسے فرزانگی دے دی

یہ اس کی دین ہے شاعر بنا کر اے تنا اس نے
مجھے بیٹھے بٹھائے عظمتِ پیغمبری دے دی

جنابِ کوثر نقوی گڑھی کوٹاہہ

ترے جلووں نے نظروں کو نئی اک روشنی دے دی
ضیائے آگہی دیدی، تجلیٔ خودی دے دی

وہی نورِ مکمل مرجعِ انوارِ عالم ہے
کہ جس نے ہر کسی شب تاب کو تابندگی دے دی

جزاک اللہ شانِ امتحانِ عاشقِ صادق
پئے تکمیلِ اثباتِ حقائق جان بھی دے دی

اگر چھپ کر رہی رہنا تھا نصیب یوں سات پردوں میں
نگاہِ شوق کو پھر کیوں تمنا دید کی دے دی

کمالِ ارتقائے خود شناسی ہے خودی کوثر
غنیمت ہے جو ان نظروں نے مجھ کو بیخودی دے دی

جنابِ وحید بلاسپوری

تبسم پھول کو بخشا، ستاروں کو ہنسی دیدی
مجھے فطرت نے کتنی خوبصورت زندگی دیدی

نہ قدرت ہی نگاہوں کی، نہ دل قابو میں ہے میرا
محبت نے تری مجھ کو یہ کیسی بےبسی دے دی

تری آواز سنتا ہوں میں اکثر خلوتِ دل سے
بڑی شے بخشدی تو نے جو مجھ کو بیخودی دے دی

[illegible]
[illegible] زندگی [illegible] دے دی

وہ جذبات کیوں ہے شمعِ مسرت ڈھونڈنے جاؤں   کہ خود غم نے مرے ایوانِ دل میں روشنی دے دی

جناب اخلاص زبیری ایم۔ اے از بجنور

جمالِ دوست کے صدقے عجب دانائی دی دی   تصدق جس پہ ہشیاری مجھے وہ بیخودی دی دی

ہے اپنی امید و بیم راہ امن و خوشحالی   نہ کر شکوہ خدا نے گر تجھے آسودگی دے دی

نہیں سود و زیاں دہر سے کچھ واسطہ باقی   ہمیں اک عشق نے ہر فکر سے وارستگی دے دی

بہم عیش و عشرت میں حاصل ہو نہ سکتی تھی   مصائب کے تھپیڑوں نے ہمیں وہ آگہی دے دی

اُمیدیں ہو چکی تھیں ختم سی بیمارِ فرقت کی   کسی نے خواب میں آکر نئی اک زندگی دے دی

جناب خیالی قادری چشتی (میرٹھ)

حقیقت تو یہ ہے معراج اوسکو عشق کی دیدی   کرم اور لطف سے تو نے جسے دیوانگی دے دی

مری بزمِ تصور طور بنکر جگمگا اوٹھی   خیالِ روئے تاباں نے جب اُنکے روشنی دے دی

حجاباتِ حقیقت کی بھی کچھ آگے نکل آیا   مجھے ساقی نے یہ کیسی شراب بیخودی دے دی

نہ آیا جب کوئی بہرِ عیادت بھی دمِ آخر   تو بیمارِ محبت نے تڑپ کر جان ہی دے دی

مشیت کی ودیعت بھی خیالی کیا ودیعت ہے   کہ عیشِ زندگی کے ساتھ فکرِ موت بھی دے دی

جناب آذر ذاتقی بنگلوری

تمنا تھی مجھے جس چیز کی اُسنے وہی دے دی   غمِ الفت عطا فرما کے دنیا کی خوشی دے دی

نہیں قسمت میں عاشق دم بھر حسن برہم سے   سرِ بزمِ حسن میں یارب یہ کیسی برہمی دے دی

[illegible] مسکرا اٹھے   چمن میں آپ نے آکر نویدِ زندگی دے دی

مری ہر داد و ستد بھی عشق میں ہے دید کے قابل   کہ دردِ زندگی نے کر نثارِ زندگی دے دی

[illegible] نقش و نگار بیکرِ نرگس   "ترے جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دے دی"

جناب ہلال بریمی

ہر کلی کو دلکشی دی اور پھولوں کو ہنسی دے دی   مجھے صرف آنسوؤں سے کھیلنے کو بیکلی دے دی

فرشتوں کا گذر بھی جس جگہ ہوتا ہے مشکل سے   مجھے وہ سوز و ساز عشق نے دنیا نئی دے دی

پتنگوں کو سحر ہونے تک شمع کی بدنام دیوانے   کہ پروانے آپنی فنا اپنے آپ ہی دے دی

تغافل کیشیوں سے حسن کی بن جائیگی دل پر   مجھے بیدلہ کیوں دیا عشق اتنی آگہی دے دی

ہلال اُٹھا ہوں کعبے سے اُٹھ کر سوئے بتخانہ   ہلالِ ایسی وفورِ شوق نے وارفتگی دے دی

جناب نفیس بدنوی

کسی کو حقیقت سے مجنوں بنا کی آگہی دیدی   بڑی پُرکیف تو نے زندگی اے بیخودی دے دی

[illegible] ترے اک سرخوشی دیدی   تبسم دے دیا غنچوں کو پھولوں کو ہنسی دے دی

[illegible] کرشمہ ساز ہاں دیکھو   کسی کی زندگی لے لی کسی کو زندگی دے دی

[illegible]   اب آئے ہیں تو نظروں کو نئی اک زندگی دے دی

حقیقت میں ہوا اُنکے پرتو کا اک آئینہ   اُسی نے تیرہ و تار یک دل کو روشنی دے دی

جناب اثر عثمانی انبے پور

بہکنے آیا خیالوں میں تصور میں نگاہوں میں   کہ جس نے اضطرابِ شوق میں اک تازگی دے دی

مری دنیا کو یوں چونکا دیا اُنکے تبسم نے   کسی نے کوئی شے جیسے مجھے بھولی ہوئی دے دی

بڑھا کی جس قدر صیاد نے مدت اسیری کی   مجھے اتنی ہی گویا فرصتِ فریاد کی دے دی

نہیں معلوم میں کھویا ہوا رہتا ہوں کیوں اتنا   خدا جانے یہ کس نے مجھکو ایسی بیخودی دے دی

اگر روداد غم سارے زمانے کو سناؤں گا   اگر کچھ اضطرابِ شوق نے مہلت کبھی دے دی

جناب پریم شیدائی

مجھے جنوں دل کو درد آنکھوں کو نمی دے دی   یہ کس نے غم کے بدلے میں متاعِ زندگی دے دی

مری ادنیٰ محبت پر فرشتے رشک کرتے ہیں   مجھے دل نے وفا و عشق کی پیغمبری دے دی

اسی باعث فضا خاموش ہر تارا سا لرزتے ہیں   مریضِ غم نے آغوشِ سحر میں زندگی دے دی

فضائے نات بھرِ گلشن پہ کیفِ حسن برسایا   سحر کی مست انگڑائی نے غنچوں کو ہنسی دے دی

وہاں کا ذرہ ذرہ پریم بن جائیگا بُت خانہ   اگر تم نے سرِ کعبہ اذانِ بیخودی دے دی

جناب انجم احمد آبادی

گلا اس کا نہیں انجم خودی یا بیخودی دے دی   تمنا دل کو میرے حسبِ منشائے دل دے دی

کسی کو دولتِ عشرت کسی کو خوشی دے دی   مجھے تقدیرِ الفت نے خلش اک دائمی دے دی

نہ فکرِ منزل مقصد نہ ہوش جادۂ منزل   دلِ وارفتہ کو میرے یہ کس نے بیخودی دے دی

یہ کیوں رہ رہ کے اٹھتی ہے خلش دردِ محبت کی   یہ کس کی یاد نے پھر مرے دل کو بیکلی دے دی

مرے اشعار انجم ہیں مرا سرمایۂ ہستی   عوض دولت کے فطرت نے متاعِ شاعری دے دی

جناب شوق شہادری

کلی کو مسکراہٹ اور گل کو دلکشی دے دی   یہ مانگنے ہی قسمت نے مجھے دیوانگی دے دی

اداؤں نے تری دل کو صدائے سرخوشی دے دی   "تیرے جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دے دی"

تصور مسکراتا ہے کمالِ ذہنِ فطرت پر   کہ ان کھلتی ہوئی کلیوں کو برقِ آبادگی دے دی

نہ ہے کچھ درد دُکھنے میں نہ ہنسنے میں لطافت ہے   نہیں معلوم کیوں مجھکو سزائے زندگی دے دی

یقیں آیا نہ ہرگز شوق اُنکو مرے قصدِ وفا پر   انھوں نے مجھکو مجبورِ قسمِ استادگی دے دی

جناب کشفی از جبلپور

پھر اس انداز سے آئی بہار چمن کو دلکشی دے دی   کہ غنچوں کو تبسم اور پھولوں کو ہنسی دے دی

جہاں کا ذرہ ذرہ ہو رہا ہے خائف و لرزاں   نظامِ بزمِ عالم کو یہ کس نے برہمی دے دی

ابھی نکلا کہاں دل سے مری دیدار کی حسرت   ابھی ہوا کے جلوے نے مجھے کیوں آگہی دے دی

بہت شرما کے تھی پہلے مرے احساس کی دنیا   [illegible]

وہ رند پاک طینت ہوں کہ ساقی نے مجھے کشتی
بلا کر اپنی نظروں سے نئی اک زندگی دے دی

جناب نجم خلیق جمیل اولوی

ترے جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دے دی
بالفاظ دگر مجھ کو حیات دائمی دے دی

غلامی میں ہم آخر زندگی کب تک بسر کرتے
بالآخر راہ آزادی جلا کر ان جاہی دے دی

نہ آئے وہ تو کیا شکوہ، مگر اک جانے والے نے
جہاں جاتے جاتے بھی صدائے آخری دے دی

کہوں کیا دل پہ جو گذری سواد شام غربت میں
مصائب جز جو نکوں نے مجھے افسردگی دے دی

خلیق زار کو صورت دکھائی آج کیا تم نے
نئی اک زندگی دیدی نئی اک تازگی دے دی

جناب ارشد صدیقی ساگری

بقدر ظرف خالق نے چمن کو دلکشی دے دی
کلی کو مسکراہٹ اور غنچوں کو ہنسی دے دی

ہوئی پھر داغہائے دل سے تخلیق ضیائے نو
مرے ظلمت کدے کو پھر کسی نے روشنی دے دی

وہ بت ہی خوب تھے یارب جو در پر عجز سے بیٹھے
حرم کی پاسبانی دیکے تو نے خود سری دے دی

بہار حسن بنکر کون آیا میرے گلشن میں؟
مرے نخل تمنا کو یہ کس نے تازگی دے دی

وہ اپنے چاہنے والے کو ارشد اور کیا دیتے
خلش بخشی جگر کو، اور دل کو بیکلی دے دی

جناب سالک حنیفی نذر آبادی

نظر کو سحر بخشا اور ادا کو دلکشی دے دی
بہر صورت خدا نے حسن میں دلبستگی دے دی

محبت نے دل بیتاب کو دنیا نئی دے دی
مصائب میں گھری رہتی ہے جو وہ زندگی دے دی

زہے صد شکر عطا کر کے دل درد آشنا مجھ کو
زمانے کو ہو جس پر ناز ایسی زندگی دے دی

رہیگا تا قیامت نام زندہ میرا دنیا میں
مرے اشعار نے مجھ کو حیات دائمی دے دی

بذات خود محبت موت ہے۔ سمجھے نہ وہ اسکو
بڑا نادان تھا سالک کہ جس نے جاں ہی دے دی

جناب موج دیوبندی

نظر کو تم نے جب سے دعوت جلوہ گری دے دی
شراب سرخوشی دے دی نوید بیخودی دے دی

ہر اک ذرہ بجائے خود نظر آنے لگا کعبہ
مجھے وسعت نئی تو نے نماز بیخودی دے دی

جھکی جاتی ہے عظمت دو جہاں کی سامنے میرے
نظر کو اتنی رفعت کیوں جنون بندگی دے دی

ستارے کانپ اٹھے دیکھ کر ایثار پروانہ
جب اس نے جسم کے آغوش سحر میں زندگی دے دی

سمجھتا ہے وہی اے موج راز قلزم ہستی
فلک کے ہاتھ میں جس نے بنا کے زندگی دے دی

جناب حلیم (جامعی) ترپاتوری

قیامت تک نہ آئے ہوش پھر وہ بیخودی دیدی
بہکی آنکھ کی نگاہ مست نے آسودگی دے دی

نہ رکھا دست وحشت کے لئے کچھ مشغلہ باقی
مری عریانی تن نے مجھے آسودگی دے دی

[illegible] مرا شعلہ تند [illegible]
[illegible] زندگی دے دی

[illegible]
[illegible] زندگی دے دی

نجم زار کی ممنونیت کے پھر میں کیا کہنے
اگر شاعر نے ان تک بندیوں کو برتری ہو دی

جناب منصور انصاری مالیگانوی

دل تاریک میں دیر و حرم کی روشنی دے دی
مری دنیا کے ذرے ذرے کو تابندگی دے دی

جلا کر جلوہ سامانی غضب کی نور افشانی
کسی کی اک ادا نے زندگی کو زندگی دے دی

بتوں کے عشق سے ہے داغ دل کی نور افشانی
چراغ دیر سے کعبے کو اس نے روشنی دے دی

نظر آنے لگے ہو تم ہی تم اب ذرے ذرے میں
مجھے کیوں اپنے ذوق آرزو سے آگہی دے دی

غضب کا حسن داووں میں ہے انداز مسیحائی
ادائے ناز ڈالا پھر نظر سے زندگی دے دی

جناب حبیب ازکوٹی

وہ میرے سامنے ہیں پھر بھی ان کا منتظر ہوں میں
مجھے سرشاری الفت نے ایسی بیخودی سی دی

ہماری جان ہی پر منحصر ہو تو کیوں دنیا
محبت میں اگر جاں دی تو اپنی چیز تھی جو دی

سنبھالوں گا میں دل کو، پاس آ کے دیکھو تو جب پردہ
تری دیدار کی حسرت نے اک الجھن نئی دے دی

خبر کیا شمع کو، خود پھونکتے ہی ہو آگ میں اپنی
کہ اس پر جل کے پروانے کو کیسی زندگی دیدی

سنائے گا کسی دن بیٹھ کر روداد غم اپنی
حبیب خستہ کو دنیا نے کیا فرصت کبھی ہو دی

جناب شاقی نسبے پوری

بنا کر اپنا بندہ اس نے شان بندگی دیدی
فنا ہو یہ نہیں سکتی۔ مجھے وہ زندگی دیدی

چھڑک کر اپنی میٹھی مسکراہٹ کا نمک اس نے
مرے زخم جگر کو از سر نو تازگی دے دی

کہاں ہوں کون ہوں کیا ہوں، خبر تک بھی نہیں مجھ کو
بنا کر اس نے اپنا، اس قدر بیگانگی دے دی

قدم بوسی کو میری آ رہے ہیں شہریار بھی اے شاقی!
کرم اسکا ہے جس نے مجھ کو ایسی بیخودی دے دی

جناب ثاقب بڑوانی

پہلے دی ضبط کی قوت ان کو خود سری بھی دیدی
جسے جو چیز دینی تھی مقدر نے وہی دیدی

بہار آئی سنا کر آخری پیغام آزادی
نئے سر سے اسیران قفس کو زندگی دیدی

نگاہ ناز سے پہلے دل بیتاب کو دیکھا
اور اُس کے بعد تم نے عمر بھر کو بیکلی دیدی

وہ آئیں یا نہ آئیں ہم تو ہیں سرشار اے ثاقب
مجھے پہلے سے اُن کی یاد نے اک بیخودی دیدی

جناب سہیل شہادوی

ترے جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دیدی
سکون جاوداں دیکر حیات دائمی دے دی

قمر کے داغ میں دیکھی جو میں نے کثرت تابش
مہ و خورشید اور تاروں کو بھی کچھ روشنی دیدی

ترا احسان صیاد بھولا ہوں نہ بھولوں گا
بہار آتے ہی مجھ کو قید سے وارستگی دے دی

سہیل ابن در ظلمت میں چمکتا ہی رہا دائم
ازل سے مجھ کو فطرت نے کچھ ایسی روشنی دیدی

جناب اکرم عثمانی

[illegible]
[illegible] آگہی دے دی

جو اسے اہلِ حقیقت! مجھ سے بیگانہ ہی بنا تھا
تو کیوں ہر ایک ذرہ سے مجھے دلبستگی دے دی

بہارِ حسنِ فطرت کی یہ جدت دیکھئے اکرم
کہ صحرا میں ہر اک وحشی کو دہشت بھی نئی سی دی

جناب اثر احمد آبادی

محبت کے تصور سے مری آباد ہے دنیا
یہ مجھ ناکام کو کس نے محبت کام کی دی دی

میں جب احساسِ غم کرتا ہوں ہو جاتا ہوں آزردہ
مری فطرت نے دل کو کس بلا کی تازگی دی دی

برائے لذتِ پائے طلب صحرا کی منزل میں
جنونِ شوق نے ہر گام پر زحمت نئی دے دی

جناب سراج احمد آبادی

محبت آئینہ ہے اصل میں عرفانِ ہستی کا
محبت جس کو دے دی اک متاعِ قیمتی دے دی

غم آمیں غمکدے کو پھر منور کر دیا کس نے
یہ کس نے آج پھر مجھ کو نویدِ خرمی دے دی

محبت ہی لباسِ آدمیت ہے حقیقت میں
محبت ہی نے انساں کو تمیزِ زندگی دے دی

جناب محسن ساگری

تیری جلووں کو ہم نے ہی نوازا اپنی نظروں سے
دعائیں دے کہ تجھ کو دلبری دی دلکشی دی دی

تیری نظروں نے اس انداز سے پیغام پہنچایا
نئے تیرِ ستم ناوک کو میری زندگی دی دی

کہا میں نے مجھے کیا دو وفاؤں کا صلا بخشا
تو بولے غم دیا فکرِ رسا دی شاعری دی دی

جناب حفیظ مالیگانوی

دلِ وحشی نے صحرا ہی کو سمجھا جنتِ رنگیں
گلوں نے خار کے دامن کو اپنی دلکشی دے دی

نہیں معلوم کیا کیا رنگ لاتی میری دانائی
بہت اچھا کیا تم نے مجھے دیوانگی دے دی

مآلِ زندگی سے دل مرا کیوں کانپ جاتا ہے
کسی کے ہاتھ میں جب آبروئے بیکسی دی دی

جناب حسن جمالی از نئی دہلی

ابھی آئیں یا نہ آئیں سامنے یہ آپ کی مرضی
نگاہِ شوق نے تو دعوتِ جلوہ گری سی دی

نہ ہوتا میں تو کیوں تو آشنائے دو جہاں ہوتا
مری نظروں نے جلووں کو تری تابندگی دی دی

مری ہستی حجابِ حسن دو عالم تھی احسانی
فنا فی العشق ہو کر یہ امانت جس کی تھی دی دی

جناب کوکب از کوچ

فدا ہو کر جو تجھ پر میں نے اپنی زندگی دے دی
محبت نے تری مجھ کو حیاتِ دائمی دے دی

ادائے دلربائی انکی آخر جانستاں نکلی
وہ دل لیکر گئے ایسے کہ ہم نے جاں ہی دے دی

وہ اپنی تیرہ بختی پر کہاں تک روئیگا کوکب
جسے صبحِ ازل ہی اُسنے شامِ بیکسی دے دی

جناب سلام ساگری

ازل کے روز قسامِ ازل نے واہ ری قسمت
سیہ بختی مجھے دی انکو صورت چاند سی دے دی

تیرا ابرِ کرم اٹھا تو کوہِ طور پہ برسا
کہ موسیٰ آگ لینے کو گئے پیغمبری دے دی

ازل کے روز حق نے سلامِ اپنی عنایت کر
عطا ذوقِ زباندانی کیا اور شاعری دے دی

جناب عباس انصاری دھولیوی

تمہاری ذات سے مجھ کو توقع یہ نہ تھی لیکن
مسرت چھین کر تم نے مجھے آزردگی دے دی

حوادث کے تھپیڑے بھی مٹا سکتے نہیں جس کو
مذاقِ عشق نے عباس کو وہ زندگی دے دی

جناب اسعد اکسیدی (ایولہ)

ہجومِ رنج و غم سے اور آلام و مصائب سے
تڑپ کر ہجر میں عاشق نے تیری جان ہی دے دی

ہمارے حوصلۂ دنیا کے عوض میں ہم نے اے اسعد
ذکا و فہم ادراک خودی و آگہی دے دی

جناب حامد القادری (مدناپور)

مثالِ دیدۂ یعقوب آنکھیں ہو گئیں روشن
"تری جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دے دی"

یہ انکی مست آنکھوں کا کرشمہ تھا کرا اے حامد
جہاں کو ہوشیاری اور مجھ کو بیخودی دے دی

جناب مضطر دھولیوی

شرابِ معرفت ساقی نے اس انداز کی دے دی
بنا کر اپنا متوالا نئی اک سرخوشی دے دی

گئے وہ دن کہ قبضے میں ہمارے تختِ شاہی تھا
فلک کی کج روی نے آہ مضطر بیکسی دے دی

جناب عارف ساگری

الٰہی جبکہ تیرا نام خیر الرازقین ٹھہرا
غریبوں کو یہ کس بادشہ میں فاقہ کشی دی دی

دلِ عارف کہ تھا آماجگاہِ حسرت و ارماں
نہ جانے ڈال کر نظریں یہ کیسی زندگی دی دی

جناب غافل از بیتول سی۔ پی

فقط اک عشق سے تکمیل مقصد کس طرح ہوتی
غنیمت ہے کہ اس نے عشق میں وارفتگی دے دی

بجھا دونگا لہو سے تشنگی ہر خارِ صحرا کی
جنوں نے مجھ کو صحرا کی گدائی گر کبھی دے دی

جناب قابل ادونی

چمک اٹھا شعلۂ حسن سے دنیا کا ہر ذرہ
"تری جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دی دی"

جہاں پایا ترا نقشِ قدم سجدہ کیا برسوں
مذاقِ عشق نے مجھ کو کچھ ایسی بیخودی دے دی

جناب تاباں القادری، مناپور

زمانہ اپنی نظروں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا
"تری جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دی دی"

بہت بے کیف تاباں جی رہا تھا میں زمانے میں
نئے سر سے کسی نے پھر نئی اک زندگی سی دی

جناب غیرت سورانوی

ہلا ہے ذوقِ دل میں مدد جہاں کی زندگی دی دی
غمی سی اک غمی کے دن خوشی سی اک خوشی دی دی

مسیحا الکھ بالیں پر ہماری آکے سر پھوڑیں
ہم اتنا ہی جئیں گے تو نے جتنی زندگی دی دی

جناب اسلم

ازل کے روز مجھ کو دردِ بخشا زندگی دی دی
مگر یہ زندگی کیا دی مسلسل بیکلی دی دی

یہ عالم ہے کہ اب ہر چیز میں تو مجھکو پاتا ہوں
"تری جلووں نے نظروں کو نئی اک زندگی دی دی"

اصلاحِ سخن

:- جناب منظر سیانوی کی غزل پر حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی کی اصلاح

۱ کیجیے ہر سختیٔ دوراں گوارا کیجیے | جو دکھائے چرخِ فتنہ ساز دیکھا کیجیے

۲ یا نظر میں جراتِ نظارہ پیدا کیجیے | یا نہ پھر ~~بہرِ خدا~~ [بے فائدہ] تقلیدِ موسیٰ کیجیے

۳ کیجیے کچھ دردِ الفت کا مداوا کیجیے | ~~استعرف بھی غور~~ [پھر توجہ] ای رشکِ مسیحا کیجیے

۴ میری بے ہوشی سے کچھ واقف ہیں اہلِ ہوش ہی ۴ | آپ دیوانہ سمجھتے ہیں تو سمجھا کیجیے

۵ اک جھلک میں ہو گئے بیخود تو کیا دیکھا کلیم ۴ | دیکھنے کا لطف تو جب ہے کہ دیکھا کیجیے

۶ ~~گر رہائش اس چمن کی آپ کو مطلوب ہے | کیا بہار اور کیا خزاں سب کچھ گوارا کیجیے~~

۷ لطفِ غمخواری تو جب ہے زلف اور دل کی طرح | کفر و ایماں میں بہم اک ربط پیدا کیجیے

[منتظر ہوں آپ کہ اٹھائیں تو سہی رخ سے نقاب]
۸ ~~آیئے اور آن کر ہو جائیے پھر بے نقاب~~ | ~~پھر ذرا~~ [آیئے] اندازۂ تابِ تماشا کیجیے

۹ لطف ہے اک وقت میں آئیں نظر دو آفتاب | بام پر آ کر نقابِ حسن ترچھا کیجیے

۱۰ ہو گیا گم آج آخر خود ہی جویا آپ کا | حشر تک اب ڈھونڈنے والے کو ڈھونڈا کیجیے

۱۱
~~وہ~~ نظر آ جائیں تو پھر وہ بھی آ جائیں نظر
منتظر اُن کے دیکھنے والوں کو دیکھا کیجیے

توجیہ :-

۲- "بہرِ خدا" میں ایک التجا پائی جاتی تھی اس لئے بے فائدہ بنایا گیا۔ اور یہاں التجا کا کوئی موقع نہ تھا۔ بہرِ خدا زائد یا برائے بیت معلوم ہوتا تھا۔

۳- منظور کا یہاں محل نہ تھا۔ غور تو کسی بات پر کیا جاتا ہے۔ درد کے ازالہ کے لئے طبیب کی توجہ ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

۶- شعر پست اور پہلا مصرع اچھا نہ تھا اس لئے قلم زد کر دیا گیا۔

۸- شعر میں "آن کر" خلافِ فصاحت تھا۔ اصلاح نے جان ڈال دی مفہوم وہی رہا۔

۱۱- "اُن" ضمیر غائب کے لئے تو "وہ" صحیح تھا لیکن اُن کے دیکھنے والوں کے لئے وہ صحیح نہیں ہو سکتا اس لئے "یہ" بنایا گیا

اعجاز صدیقی

سیٹھ فتح دین اور ڈائرکٹر رفیق ۔ اے ۔ رضوی

ہندوستان کی ان دو اولو العزم ہستیوں نے ہندو مسلم اتحاد کا بیڑہ اٹھایا ہے
یقین ہے کہ انکی یہ **کوشش** بجھی ہوئی آنکھوں کے لئے اکسیر اور سوئی ہوئی امنگوں کے لئے نخچیر ثابت ہوگی



جو دین پکچرز کی پہلی اور اپنے قسم کی واحد تصویر ہوگی آپ لوگوں کے سامنے اتحاد کا ایک
زبردست پیغام لے کر آ رہی ہے
مکالمے اور گانے ہندوستان کے بیدار مغز نوجوان ادیب و شاعر کامل رشید کے تحریر کردہ ہیں

آپ کے پسندیدہ اداکار
حسن بانو، یعقوب ۔ ترلوک کپور ۔
مرزا مشرف بنیترا ۔ شاکر ۔ کلیانی
دار کاشمیری ۔ انارکلی اور
ماسٹر نثار
کوشش کی کاسٹ
میں شامل ہیں

میوزک
پروفیسر بشیر دہلوی

اسٹوری
رفیق ۔ اے ۔ رضوی

دین پکچرز لمنگٹن روڈ بمبئی

سالِ اجرا موسم بہار ۱۹۳۰ء ———— عرصۂ اشاعت ۱۴ سال

زیرِ سرپرستی — اعلیٰحضرت رسوا مظلومی عالی باجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ — نقارہ — منظور شدہ

محکمۂ تعلیم صوبۂ ممالک متوسط و برار — حکومت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

محکمۂ تعلیم ریاست میسور — محکمۂ تعلیم ریاست کشمیر

تصویب: ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

جلد ۱۴ | ماہنامہ "شاعر" — آگرہ — جون سنہ ۱۹۴۳ء | نمبر ۶

چندہ سالانہ لاعوام ۲ خواص ۳ ہمدردوں ۸ انصاری ۱۲ معاونین ۲۴ مربیوں ۵۰ محسنین ۶۰ سرپرستوں ۱۲۵ فی پرچہ ۶

محسنین، مربی، معاونین اور اینسانؔ ہمدردانِ شاعر

محسنینِ ادب و شعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ـــہ سالانہ

(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۶۰ـــہ سالانہ

(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیا حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ـــہ سالانہ

(۴) محسنِ ادب جناب وزیر زادہ شجاعت خانصاحب مہر جوناگڈھی ۶۰ـــہ سالانہ

مربیانِ ادب و شعر

(۵) مربیِ ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں سرکرنل حشمت اللہ خانصاحب مرحوم کے. ٹی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵ـــہ سالانہ

(۶) مربیِ ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور کنٹریکٹرز و اسٹارٹ مارکیٹ جمشید پور (ٹاٹا نگر) ۵ـــہ سالانہ

معاونینِ ادب

(۷) معاونِ ادب جناب شہیلہ - بی فلپس صابر بی. اے اکبر آبادی ۲۴ـــہ سالانہ

(۸) معاونۂ ادب محترمہ تصدق ایم. اے. بی. ٹی ایڈیٹر رسالہ "ادیب" دہلی ۲۴ـــہ سالانہ

(۹) معاونِ ادب جناب مولوی محبوب حسن آسی متوطن رڑکی (بمبئی) ۲۴ـــہ سالانہ

(۱۰) معاونِ ادب جناب صوبہ دار اختر علی صاحب گوالیار ۲۴ـــہ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۱) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندھری ۱۲ـــہ سالانہ

(۱۲) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ـــہ سالانہ

(۱۳) ہمدردِ ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی جمشید پور ۱۲ـــہ سالانہ

(۱۴) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب راز جوناگڈھی ۱۲ـــہ سالانہ

(۱۵) ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ شکوہ حسین خانصاحب نفیس آف بنڈو ۱۲ـــہ سالانہ

(۱۶) ہمدردِ ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سوپن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲ـــہ سالانہ

(۱۷) ہمدردِ ادب جناب سید غلام محمد شاہ صاحب رئیس اعظم رجوعہ سینوٹ ضلع جھنگ ۱۲ـــہ سالانہ

(۱۸) ہمدردِ ادب محترمہ بلقیس جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۱۲ـــہ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۹) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمٰن خانصاحب شفق ٹونکی ۶ـــے سالانہ

(۲۰) جناب عبدالمجید صاحب قمر صدیقی پھرادی بی. اے ۶ـــے سالانہ

(۲۱) جناب لالہ گنگا رام صاحب آذر پیر سندی ۶ـــے سالانہ

(۲۲) جناب سید مظفر حسین صاحب عزمی گنگوری بستی دہلی ۶ـــے سالانہ

(۲۳) جناب محمد عبیداللہ خانصاحب ترنم امروہوی ۶ـــے سالانہ

(۲۴) جناب بشیر حسن خانصاحب اثر بلکی ۶ـــے سالانہ

(۲۵) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی ۶ـــے سالانہ

(۲۶) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶ـــے سالانہ

(۲۷) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ۶ـــے سالانہ

(۲۸) جناب فائق سیدانی لدھیانوی ۶ـــے سالانہ

(۲۹) جناب سبحان خانصاحب کامل بنبولی ۶ـــے سالانہ

(۳۰) جناب بابو نظیر محمد خانصاحب عارف سبالکوٹی (کوئٹہ) ۶ـــے سالانہ

(۳۱) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶ـــے سالانہ

(۳۲) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹاہہ ۶ـــے سالانہ

(۳۳) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ۶ـــے سالانہ

(۳۴) جناب حکیم مولوی عبدالرحمٰن صاحب شاعر کاندھلوی ۶ـــے سالانہ

(۳۵) جناب علامہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ـــے سالانہ

(۳۶) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر شکوہ آبادی ۶ـــے سالانہ

(۳۷) جناب کنور فاروق علیخاں صاحب عارف رئیس منڈوت ۶ـــے سالانہ

(۳۸) جناب مقبول احمد صاحب سحر اعظم گڈھی ۶ـــے سالانہ

(۳۹) جناب مولوی مظہر الدین صاحب مظہر ماہماسی گورداسپوری ۶ـــے سالانہ

(۴۰) جناب ڈاکٹر نارائن داس صاحب استھانہ ذیب بریلوی ۶ـــے سالانہ

(۴۱) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ـــے سالانہ

(۴۲) جناب عطاء الرحمٰن صاحب عطا جالندھری دہلی ۶ـــے سالانہ

(۴۳) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب ٹرونائی اسٹیٹ ۶ـــے سالانہ

(۴۴) جناب بشیر احمد صاحب فاروق رکن ادارہ "الاسلام" کوئٹہ ۶ـــے سالانہ

(۴۵) جناب من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی. پی) ۶ـــے سالانہ

(۴۶) جناب میاں محمد مخدوم صاحب رئیس چک میانہ پنجاب ۶ـــے سالانہ

(۴۷) جناب محمد حسین صاحب خادم شملوی دہلی ۶ـــے سالانہ

(۴۸) جناب چودھری حلیم یار صاحب سندیلہ ۶ـــے سالانہ

(۴۹) جناب سید شاہ حکایت مولا صاحب تابان القادری مظفرپور (بنگال) ۶ـــے سالانہ

(۵۰) جناب جمعدار سی. بی مجاور صاحب بمبئی ۶ـــے سالانہ

(۵۱) جناب شیخ عبدالرحمان صاحب شاب دہلوی بیوارسی ۶ـــے سالانہ

(۵۲) جناب ملک قربان حسین صاحب شہید جبلی بمبئی ۶ـــے سالانہ

(۵۳) جناب عبدالرؤف صاحب فوق سکریٹری اقبال لائبریری نمدار گنج (گیا) ۶ـــے سالانہ

(۵۴) جناب ظہور عبدالرزاق صاحب ... عالمپوری ۶ـــے سالانہ

(۵۵) جناب سید یوسف پیر صاحب ... ۶ـــے سالانہ

(۵۶) جناب پنڈت ... صاحب ... ۶ـــے سالانہ

(۵۷) جناب محمد ابراہیم اللہ صاحب ... ۶ـــے سالانہ

(۵۸) جناب میاں محمد ... ۶ـــے سالانہ

شعرِ انقلاب

تم سے کچھ کہنا ہے اے اقوامِ شرق!

مشرق و مغرب میں جو تھا ایک ملکی امتیاز
مشترک تہذیب کا فتنہ ہے اس سے بے نیاز

ہے مسلط عالمِ مشرق پہ مغرب کی فضا
ایک سے اطوار ہیں اور ایک سے انداز و ناز

ہو سکے محسوس جس سے مغرب و مشرق کا فرق
اب نہ وہ صبحِ بدخشاں ہے نہ وہ شامِ حجاز

مطلعِ خورشید پر آثارِ شب چھائے ہوئے
چہرۂ ناہید پر بکھری ہوئی زلفِ دراز

دفن سب خاکسترِ ماضی میں ہو کر رہ گئیں
وہ روایاتِ کہن، جن پر رہا مشرق کو ناز

جسقدر آثار ہیں قومی، سیاسی، مجلسی
اُن میں خالص مشرقیت کا نہیں رنگ و طراز

داخلی اسباب ہیں جتنے، وہ سب ہیں مستعار
ہے زوالِ "مشرقِ اقصیٰ" کا مضمر اس میں راز

وہ خصائص، مشرقی قوموں میں جو مخصوص تھے
مسخ ہو کر رہ گئے ہیں سب بقدرِ حرص و آز

سر سے پا تک مغربی ہے آج "مردِ مشرقی"
اِس کا آئینِ تمدن اب ہے بیگانہ نواز

ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں دُور تک تاریکیاں
یہ انھیں تاریکیوں میں کر رہا ہے ترکِ تاز

ڈھونڈتا ہے راستہ اپنا چراغِ غیر سے
بُجھ گئی ہے وقت کی آندھی سے شمعِ خانہ ساز

وہ خلوص و روحِ مذہب بھی کہیں باقی نہیں
سب ہیں رسمی آرتھی، دربار، پُوجا اور نماز

درسِ گوتم ہے نہ اب تعلیم ہے زرتشت کی
کرشن بھگتی ہے، نہ پیرو کاریٔ شاہِ حجاز

دیس کی دُھن ایک مدت سے نہیں گوش آشنا
مختلف نغموں سے ہے گونجا ہو مشرق کا ساز

فی الحقیقت ہو جو تسکینِ حقیقی کی تلاش
اہلِ مشرق کیوں رہیں سرگشتہ حسنِ مجاز

اپنی سیرت میں وطن کا رنگ و بُو پیدا کرو
فطرتِ اقوام ہوتی ہے اسی سے سرفراز

رُخ بدل دو اپنے میلانات و احساسات کا
اور قلبِ ماہیت سے ہو تم کو احتراز—

آج سے تم مشرقی اپنے کو کہنا چھوڑ دو
جاؤ مغرب میں بسو، مشرق میں رہنا چھوڑ دو

سیماب اکبرآبادی

جرعات

آجکل متمدن اور بڑے شہروں میں مشاعرے اس کثرت سے ہو رہے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ دو ایک دعوت نامے نہ آجاتے ہوں۔ خیال تھا کہ جنگ کی ہوشربا پریشانیاں شاعرہ بازی کو ختم کر دینگی۔ لیکن خلاف اُمید مشاعرے جنگی مقاصد کے لئے اسقدر موثر اور کارگر ثابت ہوئے کہ جیسے دیکھو وہ حکومت کی اعانت سے ادبی اجتماعات کے اہتمام میں مصروف ہے۔ مشاعروں سے جنگ کیلئے تو کچھ نہ کچھ روپیہ فراہم ہو ہی جاتا ہے لیکن یہ امر بھی کچھ کم باعثِ مسرت نہیں کہ بعض ایسے شعرا جو شاعروں ہی کی آمدنی پر جیتے ہیں۔ اسوقت اپنے وقت اور کلام کا معاوضہ دل کھول کر وصول کر رہے ہیں۔ خیر بہرکیف کسی نہ کسی حد تک کام کے تو ثابت ہونگے۔ پھر ان ادبی اجتماعات سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ جنگی مقاصد کے تحت منعقد ہونے والے شاعروں کے علاوہ ایسے مشاعرے بھی ہو رہے ہیں جن کا تعلق صرف ذاتی ذوق و وجدان اور جذبۂ خدمت سے ہے۔ اس دور میں جبکہ کاغذ نایاب ہے۔ شاعروں کی زبان سے اُن کے تازہ کلام کا ہم تک پہونچ جانا بس غنیمت ہے۔

اس ماہ میں دو بڑے ادبی اجتماعات کی اطلاع ہے۔ ۱۹، ۲۰، ۲۱ جون سنہ ۴۳ء کو ناگپور (سی۔ پی) میں اور ۲۶، ۲۷ جون سنہ ۴۳ء کو جمشید پور (ٹاٹانگر) میں عظیم الشان کل ہند مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں۔ جمشید پور صوبہ بہار اور بنگال سے ملا ہوا ہے۔ اس چھوٹی سی آبادی کا تعلق زیادہ تر ٹاٹا آئرن کمپنی سے ہے۔ مگر یہاں ما شاء اللہ قدر دان سخن شناس اور سخن فہموں کی کمی نہیں۔ حال ہی میں جناب چودھری محبوب عالم صاحب ڈپٹی کلکٹر اور دیگر حضرات کے مشورہ سے ایک "بزم ادب" قائم کی گئی ہے جس کا پہلا کل ہند مشاعرہ ۲۶، ۲۷ جون سنہ ۴۳ء کو ہو رہا ہے۔ شاعرہ کے اخراجات کے لئے مربیِ ادب **جناب سید تفضل کریم صاحب** اور **جناب سردار بہادر اندر سنگھ** نے پانچ پانچ سو روپیہ مرحمت فرمائے ہیں۔ سید صاحب اور سردار صاحب کی ادب نوازی کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

ناگپور اور جمشید پور کے مشاعروں کی شرکت کے لئے مجھے اور علامہ سیماب (مدظلہٗ) کو بھی مجبور کیا گیا ہے۔ موسم کی ناسازگاری اور آتش سامانیوں کے باوجود شرکت کا ارادہ ہے۔ اگر کوئی امر مانع نہ ہوا تو انشاء اللہ ۱۸ جون کو آگرہ سے روانگی ہوگی۔ ان دونوں شہروں اور اطراف و اکناف کے احباب سے ملاقات کا خیال بہت مسرت بخش ہے۔

بعض حضرات کی طرف "ابتک شاعر" کا چندہ باقی چلا آ رہا ہے۔ بارہا توجہ دلائی گئی مگر بے سود مختصر یہ کہ ظلم اور طرفہ تماشا یہ کہ برداشت حد تک پہونچ چکا ہے۔ جن حضرات کے رسالہ میں سُرخ نشان لگا ہوا ہو انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ رسالہ نہ بھیجا جائیگا۔ ایسے تمام حضرات نوٹ فرمالیں۔ ہمارا بقیہ چندہ کا سوال تو وہ دل نہ لگا کر پڑھنا چاہتے ہیں۔

زیر نظر اشاعت کے مضامین نظم و نثر نسبتاً زیادہ مہتم بالشان ہیں۔ بیشتر حصہ جوالائی کے لئے محفوظ ہے جس میں بیرونی مضامین کے علاوہ مولوی کا طوفان سے بہت شائع ہوگا۔ علامہ کیفی، پروفیسر اور مختلف ...

مولانا آسی لکھنوی کے ادبی و تحقیقی مضامین۔ حضرت رشدی بھوپالی۔ جناب شوکت صدیقی اور جناب اثر کسیمی جیسے ممتاز فنکاروں کے دلچسپ ترین افسانے ذوقِ مطالعہ کے لئے زیادہ سے زیادہ کیف سامان ثابت ہونگے اور "مشاعرۂ شاعر" کا تو شاید جواب پیدا نہ ہو سکے۔ امید ہے کہ ہندوستان کے اکثر مستند اساتذہ اور مشاہیر شعرا اس میں شرکت فرمائینگے۔ مثلاً فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری۔ حضرت فانی بدایونی مرحوم۔ حضرت علامہ وحشت کلکتوی۔ حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی۔ اقبال الملک حضرت دل شاہجہانپوری۔ حضرت مولانا آسی لکھنوی۔ حضرت مولانا آرزو لکھنوی۔ حضرت نوح ناروی۔ ابو المعظم نواب سائل دہلوی۔ وحید العصر حضرت بیخود دہلوی۔ حضرت مولانا ثاقب لکھنوی۔ حضرت مولانا صفی لکھنوی۔ حضرت میکش اکبرآبادی۔ حضرت شاد عارفی۔ حضرت مظفر نگری۔ حضرت سرور کابری گیاوی۔ حضرت نشتر بنگالی۔ حضرت احسان دانش وغیرہ۔

مئی کا "شاعر" پہونچنے کی تقریباً سات سو شکایتیں دفتر میں آچکی ہیں۔ اکثر حضرات کو رسالہ دوبارہ بھیجدیا گیا ہے۔ جنہیں ابتک دوبارہ رسالہ نہ پہونچا ہو وہ ہمیں مطلع کریں۔ جن کو رسالہ نہ پہونچا کرے اپنے مقامی ڈاکخانہ کو شکایتی خط ضرور لکھدیا کریں تاکہ محکمۂ ڈاک احتیاط سے کام لے۔

ادارۂ مندرجہ ذیل ادب دوست اور "شاعر" نواز حضرات کی امداد و اعانت کا بصمیم قلب ممنون ہے اور ان حضرات کی قدر اپنی آنکھوں لگاتا ہے جو ہنوز خاموش ہیں یا جن کے وعدے وفا کے وعدوں کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔

۱۔ جناب مولانا حاجی ضیاء الاسلام صاحب ضیا کاظم پوری	۱	خریدار
۲۔ جناب عزیز اختر صاحب وارثی سرحدی کوہاٹ	۱	″
۳۔ حضرت انور بھوپالی (بہادر)	۱	″
۴۔ حضرت مہر تقوی سجے پوری	۱	″
۵۔ جناب شفیق کوٹی (بمبئی)	۱	″
۶۔ جناب بابو لکشمی نرائن صاحب فارغ اودے پور	۲	″
۷۔ جناب احسن اصلاحی۔ بمبئی	۱	″
۸۔ جناب جمیل الرحمٰن صاحب جمیل بی۔ اے ایل ایل۔ بی ایمن آباد	۱	خریدار

امدادی فنڈ

کاٹھیاواڑ سے ایک صاحب	۵؎
جناب عبد الرؤف صاحب فوق سیکرٹری اقبال لائبریری بہار گنج (گیا)	۵؎
منا پور سے ایک صاحب	۲؎
مرزا پور سے ایک صاحب	۲؎
جناب محمد کمال الدین صاحب دکنی منا پوری	۲؎

تحقیق و تصحیح

خط بنام۔ خان بہادر حافظ ولایت اللہ صاحب او۔بی۔ئی پنشنر ڈپٹی کمشنر سی۔پی

مخدوم من۔ سلام نیاز قبول کیجئے۔ گرامی نامہ موصول ہوا۔ "لہر" "دلہن" وہ الفاظ ہیں جن میں ہائے ہوز ساکن ہے۔ ہائے مخلوط ہندی نہیں۔ ہائے مخلوط کوئی مستقل حرف نہیں اہل عروض اسے حروف کے شمار میں نہیں لیتے۔ نون غنہ کی طرح حرف اقبل اسکا بھی حال ہوتا ہے دیکھئے "گھر" میں ہائے مخلوط ہے اور یہ "سر" کے وزن میں لیا جاتا ہے لیکن لہر تین حرفوں ہی کے وزن میں آئیگا۔ جن میں پہلا متحرک اور دوسرا ساکن۔ مثلاً قہر، فعل، رقص، یہی حالت "دلہن" کی سمجھئے جو بر وزن مسکن چار حرفی شمار کیا جائیگا۔ اگر اس میں ہائے مخلوط ہوتی تو بر وزن رسن ہوتا حالانکہ اسے بروزن رسن لکھنے کیلئے اگر میں بھی درخواست کروں تو آپ منظور نہ فرمائیں گے۔ مجھے تو فی الحال "دلہن" کے ساتھ ایک اور لفظ "اُلھڑ" یاد آتا ہے جس میں لام کے ساتھ ہائے مخلوط کا وجود ہے مگر غور کیجئے تو اسکا تلفظ بھی تکلف سے خالی نہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ کوئی غیر ہندی تنہا مخلوط کا تلفظ ادا کر ہی نہیں سکتا لیکن ہندستانی کے لئے بھی انھیں الفاظ میں اسے بولنا آسان ہے جن کے ساتھ دیوناگری کی بارہ کھڑی میں یہ آواز موجود ہے۔ مثلاً کھا، گھر، پھل، بھر، دھوپ، ڈھول، جھولا، چھوٹا، تھالی، ٹھیک وغیرہ۔ انکے علاوہ جن حروف کے ساتھ اردو میں ہائے مخلوط آ گئی ہے انکا تلفظ تکلف سے خالی نہیں۔ مثلاً یہی لفظ دلہن کہ بوجہ عادت آپ اسے واحد تو بول سکتے ہیں لیکن واو نون یائے نون کے ساتھ اگر جمع بنا کر بولنا چاہیں تو ہائے مخلوط کا تلفظ مشکل نظر آئیگا۔ یہی وجہ ہے کہ بیان جمع میں یا تو دال کے بعد واو کا ایزاد ہو جاتا ہے یا لام کو ساکن کرکے ہائے ہوز متحرک سے بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح واحد و جمع کے بیان میں تجنیس باقی نہیں رہتی اور یہی حالت بیان تذکیر و تانیث میں بھی ہوتی ہے کہ بی دلہن کے انگریزی سائیس صاحب کو یا ایزاد واو سے پکارا جاتا ہے یا ہائے ہوز سے۔ انسانی آواز کی فطرت ہی یہ ہے کہ جو حرف اسکی مادری زبان میں ہوتا ہے اُسے آسانی سے ادا کر لیتا ہے اور جو نہیں ہوتا اُسے یا تو بول ہی نہیں سکتا یا بڑی دقت سے ادا کرتا ہے چنانچہ عرب، ایرانی اور افغانی جو بعالم طفلی ہندوستان میں نہ رہے ہوں کسی حرف کے ساتھ ہائے مخلوط کو نہیں ملا سکتے مگر انگریز بوجہ عادت لسانی صرف "ت" کے ساتھ ملا سکتا ہے مثلاً تھرڈ، تھیوری، تھنڈر، اس کے علاوہ کسی حرف کے ساتھ ملا کر نہیں بول سکتا وہ گھر کو یا تو گر بولے گا یا گاڈ گھر ہرگز نہیں یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی اردو گفتگو میں ہائے مخلوط کے غائب ہونے سے بہت سے لطیفے پیدا ہو گئے ہیں۔ غرض یہ کہ چونکہ آپ کی زبان میں لام کے ساتھ ہندی سے ہائے مخلوط نہیں آئی اس لئے ہر صورت میں شامل کرکے بآسانی نباہنا آپ کے لئے مشکل ہے جیسا کہ اُسی لفظ دلہن کے بیان جمع کے متعلق اوپر عرض کر چکا ہوں۔ تو میری رائے یہ ہے کہ جس طرح اس لفظ کا تلفظ بلحاظ سماع ہائے مخلوط کے ساتھ درست ہے، اسی طرح بلحاظ قیاس، آسانی بیان، تجنیس تذکیر و تانیث و واحد و جمع لام ساکن و ہائے ہوز متحرک سے بھی درست ہے البتہ ایزاد واو کو میں پسند نہیں کرتا کہ لام کے ساتھ ہائے مخلوط کے ایزاد سے اس میں تکلف لسانی باقی رہتا ہے۔ خود میں نے اپنی چوالیس[44] برس کی شاعری میں اس لفظ کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ اگر لکھتا تو حرف گیری کے ڈر سے ہائے مخلوط ہی کے ساتھ لکھتا لیکن میں نے اسکے خلاف استعمال کو بھی کبھی قابل اعتراض نہیں سمجھا۔ ہٹ دھرمی میرا شعار نہیں آپ میری یہ تحریر مولانا اطہر ہاپوڑی اور مولانا آسی لکھنوی کو بھیجدیں اگر یہ دونوں حضرات میری رائے سے اتفاق نہ کریں تو میں اپنی غلطی کو تسلیم بھی کر لوں گا۔ اخیر میں میں اس پر اظہار استعجاب کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اعتراض اس گروہ کی طرف سے اٹھایا گیا ہے جس نے شاعری سے تمام قیود کو اٹھا دیا ہے تو کیا اب مجھے یہ سوال کرنے کا حق حاصل نہیں کہ جب آپ حدود لسانی کے دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں تو پھر اور ایسی کونسی قیود شاعری ہیں جنھیں آپ نے توڑ دیا ہے۔ اگر آزادروان ادب و شعر حضرات میں سے کوئی صاحب ذرا سی تکلیف فرما کر اس پر کچھ تحریر فرما دیتے تو اچھا تھا کہ ہم دقیانوسی پابندی والوں کو معلوم ہو جاتا کہ اب معیار فن یہ ہے اور نوشقان سخن اس سے فائدہ اٹھاتے، حال ہی میں حضرت حفیظ جالندھری نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ آپ حضرات اپنی قیود نظم پر قائم رہیں گے تو ہمیں شاعری چھوڑ دینا پڑیگی۔ میں نے جواباً عرض کر دیا کہ نہیں آپ ہماری حالت پر چھوڑ دیجئے اور اپنے لئے ہماری قیود سے آزاد ہو کر اصول بنا لیجئے۔ بہرحال اسے تو آپ بھی تسلیم کرینگے کہ شاعری فن ہے اور فن ہی رہیگی تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کوئی فن ہو اور اسکے لئے اصول نہ ہوں میں نے اُن سے یہ اس لئے کہا کہ حضرت حفیظ اصول پرست ہیں اور وہ بیجا پابندیوں کو پسند نہیں کرتے تھے اُن سے ایک حد تک اتفاق بھی ہے کہ میں بھی حضرت حسرت موہانی کے پیچھے احترام کے باوصف انکی اُن قیود سے جو وہ شاعری میں بڑھا رہے ہیں بیشتر متفق نہیں اگر کسی دوسرے نوجوان بزرگ نے ایسا کہا ہوتا تو میں یہ جواب بتا کر جناب جس طرح دل میں آئے کھیلئے آپ کے نزدیک اپنی بے ہنری پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ بڑا سامان موجود ہے کہ اہل فن کے خلاف دعوی سے گو آپ کا شعر مجاز ہے

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

ٹیونیشیا، سرچشمۂ امید تو ہے
دشمن کی شکست قابلِ دید تو ہے
فتحِ کامل اسے نہ کہئے نہ سہی
فتحِ کامل کی ایک تمہید تو ہے

چرچل اور روزویلٹ ہیں ہم آہنگ
اسٹالن بھی ہے ساتھ آمادۂ جنگ
ان تینوں کے اتحاد سے ثابت ہے
تثلیث میں بھی آج ہے توحید کا رنگ!

جاپان ابھی جنگ کا دلدادہ ہے
اور جرمنی اختلاف آمادہ ہے
عنوانِ سکون و امن ہے محوِ نگاہ
یعنی ابھی صلح کا ورق سادہ ہے

کاغذ کہیں دستیاب تک بھی تو نہیں
نایابی کا کچھ حساب تک بھی تو نہیں
لکھیں گے فرشتے کس طرح فردِ عمل؟
کاغذ کا بہ غیاب تک بھی تو نہیں

چوکوں پہ فرامین لکھے جائیں گے
کہساروں پہ آئین لکھے جائیں گے
دنیا میں پھر آنے کو ہے دورِ حجری
پتھر پہ مضامین لکھے جائیں گے

مانا کہ ہے آج زندگانی بھی گراں
دانہ بھی گراں ہے اور پانی بھی گراں
ہے عالمِ ہستی جو تغیر بکنار
ہو جائے گی اک روز گرانی بھی گراں

کر کے جنگ و جہاد رہ جائے گی
دنیا یونہی نامراد رہ جائے گی
افسانے سب بھلا دیے جائیں گے
لیکن یہ جنگ یاد رہ جائے گی

محکوم ہیں، لعنتِ دوامی ہے یہی
مظلوم ہیں، وجہِ خستہ کامی ہے یہی
بے جنگ کے بھگت رہے ہیں خمیازۂ جنگ
اور چپ ہیں۔ کہ حاصلِ غلامی ہے یہی

خو کردۂ تسلیم و رضا ہیں ہم لوگ
منجملۂ اربابِ وفا ہیں ہم لوگ
آلودۂ ابتلا ہیں اوروں کے لئے
اس دور کے فاضلِ فدا ہیں ہم لوگ

یہ جنگ کے ہیر پھیر، اللہ اللہ!
لاکھوں کے گلے ہیں تہِ شمشیر، اللہ اللہ!
آ پہنچی ہے آج ساری دنیا پہ گھٹا
اور تیرے کرم میں دیر! اللہ اللہ!

سیماب

شخصیات:-

حضرت سائل دہلوی

نیّر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغؔ اب ہیں یہ غنیمت ہمہ دانِ دہلی

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے اس مشہور شعر پر علامہ سیماب نے یوں مصرعے لگائے تھے ؎

ہے ادب فطرتِ دہلی میں ازل سے پنہاں　　کبھی خالی نہ رہا اہلِ ادب سے یہ مکاں
نیّر و غالب و آزردہ گئے سوئے جناں　　سائل و بیخود و شاعر تو ہیں موجود یہاں
نام لیوا یہ ترے آج ہیں مشہورِ جہاں　　وہی دہلی کی فصاحت وہی دہلی کی زباں
بہ ادب عرض کروں گا کہ غلط تھا یہ گماں　　"نیّر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں"
"داغؔ اب ہیں یہ غنیمت ہمہ دانِ دہلی"

مرزا داغ نے مندرجہ بالا شعر میں جس جذبہ کا اظہار کیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ انھیں نے وطن اور مرکزِ زبانِ اردو دہلی کے مستقبل کا [illegible] خیال تھا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ دیدِ داغ کے اہلِ علم و فن کے بعد شاید دہلی میں اندھیرا ہو جائے اور اپنی روایتی [illegible] دانی اور فصاحت قائم رکھ سکے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ ؎
نیّر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
[illegible] فطرت نے ان کے تاثرات پر یہ کی اور اس طرح دی کہ نیّر و غالب اور [illegible] انھیں کے خاندان سے زبان و ادب [illegible] ایک ایسی شمع فروزاں ہوئی جس نے [illegible] کی ظلمتوں کو جگمگا دیا اور جس طرح [illegible] اہلِ نظر کو نیّر و غالب و آزردہ [illegible] کی زیادہ محسوس نہ ہوئی۔ مرزا داغ گو شاید اپنی تیری قوتوں پر اعتماد نہ تھا ورنہ وہ اس قدر یاس انگیز بات نہ کہتے وہ نہیں جانتے تھے کہ انھوں نے اپنے دستِ فن کار سے جن تین ستونوں کی بنیاد ڈالی ہے وہ مستقبل میں زبان و ادب کے بلند ترین مینار کملائیں گے اور اپنی بلندیوں سے فصاحتوں کی ایسی روشنی پھینکیں گے جو دوسرے شعرا کے لئے مشعلِ راہ ہوگی یہ تین مینارے سائل، بیخود اور شاعر ہیں۔ آغا شاعر ادب و شعر کی مادی دنیا سے اٹھ چکے ہیں۔ لیکن سائل اور بیخود ابھی رونقِ بزمِ ادب ہیں۔ (اللہ انھیں تا دیر سلامت رکھے۔)

آج حضرتِ سائل ہی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ ایک ایسی بلند مرتبت شخصیت کو شخصیات کے باب میں پیش نہ کرنا سراسر کوتاہی ہے۔ حضرت سائل کا نام مرزا سراج الدین احمد خاں کنیت ابو المعظم اور نواب خاندانی لقب ہے۔ ۲۰ شوال ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے۔ والدِ بزرگوار کا نام مرزا شہاب الدین احمد خاں اور ثاقب تخلص ہے۔ مرزا داغ نے آزردہ اور غالب کے ساتھ جس مشہور شاعر اور ادب نواز ہستی کا ذکر کیا ہے، وہ حضرت سائل کے جدِ امجد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر و رخشاں فرمانروائے ریاست لوہارو ہیں۔ خاندانی شجرہ پر نظر ڈالئے تو مرزا غالب سائل صاحب کے والدِ ماجد کے پھوپھا ہوتے ہیں۔ مرزا داغ خسر بھی تھے اور استاد بھی۔ پھر نواب غلام حسین خاں محو

مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی۔ نواب مرزا بہاؤ الدین احمد خاں طالب جیسے حضرات کی تربیت و صحبت نصیب ہوئی۔ آخر کیوں نہ حضرتِ سائل کی زباندانی مسلّم ہو۔

مرزا غالب کی وفات کے دس ماہ بعد سائل صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سائل صاحب کی عمر چار سال اور کچھ ماہ تھی۔ چنانچہ آپ کے جدّ امجد نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں نے اپنے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھایا۔ چونکہ فرمانروائے لوہارو علم نجوم کے ماہر تھے۔ اس لئے ابو المعظم برجیس قدر نام رکھا۔ لیکن مرزا غالب نے خاندانی ناموں کے لحاظ سے سراج الدین تجویز کیا اور اسی نام سے آپ مشہور ہوئے۔ ۱۴ سال کی عمر میں عربی اور فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کر لی۔ مرزا ارشد گورگانی نے فنِ شاعری کی تعلیم دی اور سائل صاحب نے رسالہ عبدالواسع ہانسوی اور حدائق البلاغت ختم کر کے رہگذارِ شاعری میں قدم رکھا۔ نواب غلام حسین خاں محو ہم زلف و شاگرد مرزا غالب نے چند تخلص تجویز کر کے قرعہ ڈالا لیکن کسی تخلص سے قرعہ نے موافقت نہیں کی۔ اسی عالم میں ایک شریف صورت اور پریشان انسان نے آ کر سلام کیا۔ نواب صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔ اُنھوں نے کہا میں سائل ہوں۔ نواب صاحب نے لفظ سائل پر قرعہ ڈالا تو جواب ملا کہ یہ بہت مبارک ہے اور اس تخلص کا شاعر نام آور ہو گا۔

حضرتِ سائل نے حضرتِ ارشد گورگانی سے چند ہی غزلوں پہ اصلاح لی تھی کہ وہ فیروز پور (پنجاب) چلے گئے۔ لیکن سائل صاحب برابر مشق کرتے رہے۔ اس کے کئی سال بعد فصیح الملک مرزا داغ کے شاگرد ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ عقدِ ثانی فصیح الملک کی نسبتی صاحبزادی سے کیا اور مدتوں فصیح الملک کی خدمت میں رہے اور شعر و شاعری کی دشوار گذار راہوں کو آسانی کے ساتھ طے کر لیا۔

باعتبارِ سن و سال، خاندانی عظمت اور علمی و فنی وقار اس وقت حضرت سائل مغتنمات میں سے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دراز قامت۔ وجیہ چہرہ۔ دلکش خط و خال سر پر چوگوشہ ٹوپی۔ چوڑی دار پائجامہ۔ انگرکھا۔ غرض کہ وضع قطع اور کیا اندازِ گفتگو ہر طرح عظمتِ ماضی کا نمونہ ہیں۔ غزل سرائی میں تو وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جوانی کا تو ذکر ہی کیا۔ اس عالمِ ضعیفی میں بھی جب وہ غزل پڑھتے ہیں تو روح لذت گیر ہونے لگتی ہے خمخانۂ جاوید کے مؤلف نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہندوستان میں بکثرت شعراء ان کے اندازِ غزلخوانی کے پیرو ہیں۔

حضرت سائل کی شاعری اُس دور کی یادگار ہے جب اُس پر روایتی غلاف چڑھا ہوا تھا۔ اس لئے شاعری کے نئے میلانات اور رجحانات پر اُسے پرکھنا کسی طرح مناسب نہیں۔ انھیں کے دور میں پہونچ کر اُنکی شاعری پر تنقید و تبصرہ کرنا چاہئے۔ جن عناصر سے اُنکی شاعری بنی ہے اس میں نوح۔ شیرینی۔ ہمواری اور دلنشینی کے ساتھ ساتھ زبان۔ سلاست۔ روانی اور روزمرہ کی بڑی کثرت ہے اُنکے یہاں مضامین آفرینی بھی کم نہیں۔ لیکن بیشتر خیالات وہی ہیں جو قدیم عہد غزل سے اب تک چلے آ رہے ہیں۔ البتہ حضرتِ سائل کا اندازِ بیان لطف سے خالی نہیں۔ وہ معمولی خیال کو بھی بڑی دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

وہ برقِ تجلی و موسیٰ کا قصہ وہ شوقِ نظارہ وہ ذوقِ تماشہ
ہے خاموش بس اتنا فرما کے دُنیا برابر تھا جلوہ وہ دیکھا نہ دیکھا

زبوں حال جینا بھی ہے کوئی جینا پُرانہ درد دل ہے پُر از داغ سینہ
جسے دل کرے پیار رکھتا ہے کینہ، محبت کے روگی کو اچھا نہ دیکھا

یہ فرما کے انمول دل لے گئے وہ، جو مانگو گے قیمت ملے گی تجھے وہ
بہا ایسے دل کی مجھے دے چکے وہ، جو جانچا نہ تولا نہ پرکھا نہ دیکھا

سُنا جس نے سائل تخلص یہ بولا، کہ اس نام رکھنے میں ہے مصلحت کیا
بایں طلعت و جاہ نغز و زیبا، اسے لیکے کچکول پھرتا نہ دیکھا

تمنائے موسیٰ کا پاسخ ملا تھا، زبانِ عرب میں بجا لن ترانی
تجلی باری تعالےٰ نے اُس کی سر طور فرما دی شرحِ معانی

ہیولٰی مری تخمیر جب آب و گل سے تو چنگاریٔ الفت کی ملحق تھی دل سے
اُسی کی بدولت جب آئی جوانی، شرر ریز ہے آہِ سوزِ نہانی

وہ کیا لذتِ دشت گردی کو مانے، وہ کیا محنتِ عشق کی قدر جانے
جنونِ عشق کا بوالہوس کو ہو کیونکر نہ کچھ خاک چھانی نہ کچھ خاک چھانی

ساقیٔ تنگ ظرف ایک ہی جام | وہ بھی اُٹھا ہما کناروں سے
گلے ملنے کی جلدی میں کسی تھے ہیں یادار کاں | نمازِ عید میں یاروں نے اک تکبیر کم دی
معلوم نہیں کس سے کہانی مری سُن لی | بھاتا ہی نہیں اب انھیں افسانہ کسی کا
ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں بالکل سلیقہ سے | نہ قطرہ آستیں پر ہے نہ دھبہ جیب و داماں پر
ہوئے زمانہ میں مشہور، دہر میں رسوا | نگاہِ ناز سے تم، چشمِ اشکبار سے ہم
جو ہم ہیں شوق سے بیتاب تو وہ شوخی سے | قرار سے نہ وہی ہیں نہ ہیں قرار سے ہم
دیر تک اس شبہ میں دیکھا ہلال | یہ کسی کافر کی انگڑائی نہ ہو
یہ تقاضائے تصوّر ہی نہیں | تو جہاں ہو تیرا شیدائی نہ ہو
بے طلب غیر چلے آتے ہیں ڈٹ جاتے ہیں | ہم بلائے ہوئے آ آ کے پلٹ جاتے ہیں
ناوکِ ناز سے ہوتی ہے ذرا سی تسکین | دل کے پھیلے ہوئے ارمان سمٹ جاتے ہیں

اعجاز صدیقی

سرگشتۂ محبت

وہ پنہاں اور عالم آشکارا
مری بیتابیوں کا ہے سہارا

مری آنکھیں ہیں اس جلوے کا پردہ
مرا دل اسکے پردے کا اشارا

تصور کی تو ہونے دو رسائی
سمجھ لوں میں بھی کچھ نقشا تمہارا

محبت اور کفر ناگواری
گوارا ہے مجھے سب کچھ گوارا

پڑے ہیں تشنہ دونوں کفر و ایماں
زباں سے اپنی کچھ کہدو خدارا

بنایا ہے ہمیں جو کچھ بنایا
تمہیں کچھ کہدو کیا اس میں ہمارا

بقدرِ ظرفِ دل جوشِ جنوں ہے
جنوں ہے اور وہ بھی ہے تمہارا

جنوں کا جوش جب بڑھتا تھا کیفیؔ
کہا کرتا تھا مجنوں دل کا مارا

امرُّ علی جدارِ دیارِ لیلیٰ
اقبّل ذا الدیارَ وذا الجدارا
وما حُبّ الدیارِ شغفن قلبی
ولٰکن حبّ من سکن الدیارا

کیفیؔ چریاکوٹی

معلومات

فسردہ محفل کون و مکاں معلوم ہوتی ہے
کہیں روحِ محبت نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

غنیمت ہے اگر محسوس کرلوں اپنے جینے کو
مجھے تو زیست اک خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے

قفس میں ہوں مگر مشقِ تصور سے یہ عالم ہے
زمانے کی ہر اک شے آشیاں معلوم ہوتی ہے

ارے اے یاس کی ماری محبت تیرا کیا کہنا
کہ تو ناکامیوں میں کامراں معلوم ہوتی ہے

سنائی بارہا دل کی کہانی آپ کو لیکن
ابھی جیسے یہ محتاجِ بیاں معلوم ہوتی ہے

مجھے تو ہر جگہ ہنگامہ زارِ حسنِ فطرت میں
محبت ہی محبت درمیاں معلوم ہوتی ہے

خدا جانے کہاں ہو بیخودیٔ شوق میں سجدہ
جبیں بیگانۂ ہر آستاں معلوم ہوتی ہے

یہ ہے رودادِ افتادِ محبت، یا غزل قاسمؔ
ترے ہر شعر میں اک داستاں معلوم ہوتی ہے

قاسم نقوی رائے بریلوی

"پریت کے گیت" کا مصنف

اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترسیع کے حقیقی دعویدار ہماری نظر میں اس وقت تین صوبے ہیں۔ یو۔ پی۔ پنجاب اور دکن۔ بہار کو بھی اس میں شریک کیا جا سکتا ہے لیکن صوبہ بہار کی خدمات کچھ زیادہ روشن اور اعتبار آفریں نہیں ہیں۔ اُردو کی خدمت کے سلسلے میں کسی تخصیص کی ضرورت تو نہیں۔ اس لئے کہ تمام ہندوستان کم و بیش اس دلفریب اور عام فہم زبان کی اشاعت میں مصروف ہے لیکن جن تین صوبوں کا ذکر ہم نے بطورِ خاص کیا ہے وہ اس وقت سب سے آگے ہیں۔ ان میں اگر کوئی امتیاز قائم کیا جائے تو پنجاب سرِ فہرست نظر آئے گا۔ یو۔ پی کی اُردو نوازی اور خدمات بڑی مستحکم اور دیرپا ہیں۔ دکن میں اردو کا غلغلہ ابھی ابھی ہوا ہے اور آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ وہ سب سے آگے نکل جائیگا۔ یو۔ پی کے ادیب اور شاعر کتنے ہی مضمحل اور بے خبر سہی پھر بھی وہاں اب تک جتنے چاند تارے چمک چکے ہیں، اُنکی تابانیاں تک قائم رہینگی۔ ——— پنجاب اُردو کی خدمت کچھ اس انداز سے کر رہا ہے کہ دوست دشمن سبھی اس کے اعتراف پر مجبور نظر آتے ہیں۔ نہ وہاں اُردو رسائل کی کمی ہے اور نہ اخبارات کی، شعرا اور ادبا کی وہ بہتات ہے کہ الاماں و الحفیظ، ممکن ہے اسے مبالغہ سے تعبیر کیا جائے کہ اگر تمام ہندوستان کے ادیب اور شاعر ایک طرف ہوں اور پنجاب کے ادیب شاعر دوسری طرف، تو ایک حد تک توازن قائم رہے گا، لیکن صرف اعداد و شمار تک یہ توازن محدود ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا خیال غلط ہو، بہرحال یہاں پنجاب کے ادبا اور شعرا کی کثرت دکھانی مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ اس کثرت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو قلت میں ہمیں گھر بار سے غیر حاضر ملیں گے۔

پنجاب نے اقبال کو پیدا کر کے ادبی اقبال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا لیا اور اپنی سرزمین کے ذرّے ذرّے کو اس قابل بنا لیا کہ وہاں ذوقِ ادب سجدہ ریز ہو۔ اہل علم و فضل کی پیشانیاں ہیں اور دلدادگانِ شعر و ادب اپنی نگاہوں سے بوسے دیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ اقبال کے بعد بھی وہاں شعر و ادب کا آفتاب غروب نہیں ہوا اور اس نے ظفر علیخاں، حفیظ جالندھری، تاجور، اثر صہبائی، مخمور جالندھری، میاں محمد رفیق خاور، تصدق حسین خالد، یزدانی جالندھری، تابش سرہندی، وقار انبالوی، قمر جلال آبادی، راجہ مہدی علیخاں، عبدالکریم ثمر، مقبول گجراتی، ہم تکلم، ضیا فتح آبادی، یوسف ظفر، تاجور سامری، عدم، ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، غلام مصطفےٰ تبسم، حامد علیخاں، تلوک چند محروم، الطاف مشہدی، عابد، تپش، وغیرہ لاتعداد شعرا پیدا کئے۔ ان میں منتہی بھی ہیں اور مبتدی بھی۔ بزرگ کہن سال بھی ہیں اور نوجوان بھی۔

میں تو اسے سرزمینِ پنجاب کی ندرت آفرینیاں ہی کہونگا کہ وہاں ہر کام پرانی ڈگر سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ حُسن کاری، جدّت اور رومان آفرینی میں پنجاب سب سے آگے بڑھا ہوا ہے مگر وہاں ردِ عمل کی جگہ سنجیدہ انقلاب نہیں ہوتا بلکہ بغاوت ہوتی ہے اور کچھ نہیں سوچا جاتا کہ مآل کیا ہوگا۔ از خود اگر کوئی کامیاب پہلو نکل آئے تو نکل آئے ورنہ دانستہ ایسا اقدام نہیں کیا جاتا جس میں خوش آئندگی ہو۔ بہرحال پنجاب کی اختراعی قوتوں سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی وضع کی کتب کی اشاعت نئی ترتیب اور نئی راہوں کے تحت رسائل کا نکالنا پنجاب ہی کا مرہونِ منت ہے۔ ورنہ ہم نے دیکھا ہے کہ اب سے چند سال پہلے اُردو کے بلند ترین شاعر اور علی کل غالب مرزا غالب کا دیوان نہایت ردی حالت میں چھپا ہوا چار آنے میں بکا کرتا تھا۔ اب دیکھئے کہ "مرقعِ چغتائی" بھی ہے اور تاج کمپنی کا مطبوعہ مصوّر و رنگین دیوان غالب بھی ——— پنجاب کی ان نمایاں خدمات سے انکار کرنا یقیناً احسان فراموشی ہے۔

شعر و شاعری میں حسب عادت پنجاب نے انقلابی ذہنیت سے کام لیا، ایک طرف اقبال نے تدبر و تفکر کا ثبوت دیا تو دوسری طرف حفیظ نے رسیلے گیت لکھ کر دل و دماغ کو متاثر کیا۔ تیسری طرف ظفر علیخاں نے سیاست کو شاعری میں کھوکر نئی راہ پیدا کی۔ نئی پود کے شعرا اٹھے تو انھوں نے جدید شاعری کی ایک بے بنیاد دیوار کھڑی کر دی جو بادِ مخالف کے جھونکوں سے لرزاں ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب منہدم ہو جائے۔ پنجاب کے نوجوان شعرا پر اگر کسی کی شاعری کے گہرے اثرات پڑے تو وہ حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی[۱] ہے۔ حفیظ کے اتباع میں عام طور پر وہاں گیت لکھے جانے لگے اور اختر شیرانی کی تقلید نے رومانی جذبات کو برانگیختہ کر دیا اور یہی دو رنگ وہاں کے نوجوان شعرا پر گہرے ہو کر رہ گئے۔ پنجاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں غزل سے زیادہ نظم کا ذوق پایا جاتا ہے۔ مگر ایک عام بے راہ روی کسی مرکزِ بلند پر نہیں پہونچنے دیتی تو میں ایک شاعر اپنے مخصوص مقام پر پہونچ جائے تو پہونچ جائے ورنہ دو ایک رنگ کسی کے یہاں نظر نہیں آتا۔ پنجاب کے شعرا کی غیر پختگی اور منزل پر پہونچنے سے قبل

[۱] مگر اختر شیرانی پنجابی نہیں ہیں

تعلّی جانے کی ایک شعوری وجہ یہ بھی ہے کہ اہلِ پنجاب بنی ادب نوازی یا صوبائی ہمدردی کی مجبور ہو کر ہر کس ناکس کو سر پر بٹھا لیتے ہیں۔ وہاں ہر نیا شاعر ایک دو سال ہی میں صاحبِ کتاب ہو جاتا ہے خواہ پھر الہامی سلسلہ بند ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ناقدینِ پنجاب یہ سوچتے ہیں کہ اُن کی تصنیف میں دیرپا نقوش ہیں یا نہیں۔

اِس مختصر تمہید سے ہمارا مقصد پنجاب کے نوجوان شعرا کی تنقیص نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ اگر پنجاب علمی و ادبی اور فنی زاویوں سے انحراف نہ کرے اور نیم پختہ شعرا کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کرے تو اُس کے یہاں حقیقی شعرا کی تعداد بہت کافی نکل سکتی ہے۔ پنجاب کے جس مشہور اور نوجوان شاعر کا ہم ذیل میں ذکر کر رہے ہیں وہ بھی اپنے صوبے کی عام پسندی سے بہت جلد متاثر ہو گیا۔

"پریت کے گیت" کا مصنف الطاف مشہدی اپنے صوبہ سے باہر بھی کم و بیش شہرت رکھتا ہے۔ اُس کی نظمیں اور گیت اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں الطاف مشہدی کی شاعری میں حفیظ جالندھری کا غنائی عنصر اور اختر شیرانی کا رومانی تصور شامل ہے اور انھیں دونوں رنگوں کے اثرات کا اُس کے یہاں امتزاج ہے مگر اُس کے گیت اتنے جاذب نہیں جتنے حفیظ اور دوسرے شعرا کے ہیں۔ بہرحال وہ اپنی کوششوں میں ایک حد تک کامیاب ہے۔ مگر اتنا کامیاب نہیں جتنا بعض ناقدین نے سمجھ لیا ہے، اُس کی شاعری کے متعلق یہ تین رائیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) "الطاف مشہدی کی ایک ایک نظم ایک ایک دیوان پر بھاری ہے"۔

(۲) "آج ہندوستان بھر میں الطاف مشہدی کی انقلابی شاعری کا جواب نہیں"

(۳) "الطاف مشہدی عصرِ جدید کے تمام ترقی پسند شعرا کو پیچھے چھوڑ گیا"

مندرجہ بالا تینوں آرا انتہا پسندی پر دلالت کرتی ہیں اور بے ساختہ کہنا پڑتا ہے

لہ ؎　　"کوئی انسانہ بنائے کوئی انسانہ بنے"

اِس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ الطاف مشہدی ترقی پسند شاعر نہیں یا اُس کے یہاں اچھی نظمیں اور غزلیں نہیں ہیں اور ضرور ہیں لیکن ہنوز اُس کی شاعری جوش، حفیظ احسان، ماہر القادری، علی اختر، ساغر اور روش صدیقی وغیرہ شعرا کے پایے تک نہیں پہونچی ہے۔ اُس کی تیز گامی اِس کا پتہ ضرور دیتی ہے کہ وہ مستقبل میں ایک اچھا شاعر ہوگا۔ بشرطیکہ وہ بیجا تعریفوں سے متاثر نہ ہو اور غور و فکر کے ساتھ جادۂ شاعری پر چلے۔ "پریت کے گیت" میں غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی اور گیت بھی۔ غزلوں اور نظموں میں سلاست کے ساتھ روانی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومانی فضاؤں میں کھو جانا چاہتا ہے ؎

وہ آنکھوں میں جب بیکدھلے کے گزرے　　　صراحی نے رو رو کے بلونے صدا دی

مجھے ہوش میں آکے رسوا نہ کردوں　　　نگاہوں سے پھر کچھ پلاتا چلا جا

ستیاں آنکھوں کی صہبا میں ڈبو کر لئے　　　آسماں سے چاند کا ساغر اٹھا مرے لئے

اِدھر آنکھیں پڑی ہیں خشک و ویراں　　　اُدھر رونے کا موسم آرہا ہے

کچھ اس طرح لحد پہ مری آکے وہ ہنسے　　　ہر ذرّہ پھول بن گیا خاکِ مزار کا

اُتر کر رہ گئی ہیں جب نظریں اُنکی سینے میں　　　مری زخموں کو تیر دل سے محبت ہوتی جاتی ہے

اللہ رے نصیب کہ پائی ہے وہ فغاں　　　جو عمر بھر رہی ہے قریبِ اثر سے دور

جانے کو تو اس بزم میں جانا ہی پڑیگا　　　لے دوست مگر ڈر ہے کہ کچھ بھول نہ آئیں

"پریت کے گیت" کی نظموں اور غزلوں کے علاوہ اُس کی کچھ اور نظمیں بھی پیشِ نظر ہیں۔ ایک نظم ہے "میرے پری جمال" ــــــ چند بند دیکھئے۔

ساقی! مرے حسین و جواں ساقیا اِدھر
گاتی ہوئی نگاہ بہکتی ہوئی نظر
ساغر اٹھا کہ موسمِ گل ہے شباب پر
مستانہ انکھڑیوں کی جوانی بھی اِس میں ڈال
ــــــ میرے پری جمال

کالی گھٹا سے بال بکھرے ہیں دوش پر
سینے میں ولولوں کا سمندر ہے جوش پر
غلبہ ہے ملحدانہ عقائد کا ہوش پر
روزِ جزا کے وہم کو اب ذہن سے نکال
ــــــ میرے پری جمال

یہ نرم بازوؤں کی بناوٹ یہ دلکشی
باہوں میں چوڑیوں کی سجاوٹ یہ دلکشی
پلکوں کی مست مست تھکاوٹ یہ دلکشی
اِس ساعتِ جواں میں نہ رندوں کو کل پہ ٹال
ــــــ میرے پری جمال

ساون ہے تم ہو میں ہوں جوانی پہ ہے گھٹا
شیشے میں ہنس رہی ہے کوئی دخترِ بہار
اک لغزشِ حسیں کے لئے دل ہے بیقرار
ساغر میں آج بھر کے پلا دے مئے وصال
ــــــ میرے پری جمال

سوگند تجھ کو تیرے اُبلتے شباب کی
ہونٹوں کا رس ملا کے اک بوتل شراب کی
پروا کسے ہے روزِ عذاب و ثواب کی
ساغر اُٹھا کہ ہو رہی ہے زندگی وبال

———— میرے پری جمال

اس نظم سے الطاف مشہدی کے رومانی تصورات کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ نتیجہ بہت جلد مرتب ہو جاتا ہے کہ اُن کے یہاں بھی پنجاب کے دوسرے ادبا اور شعرا کا سا "جنسی ہیجان" موجود ہے جو بڑھتے بڑھتے عریانی کی حد تک پہونچ جاتا ہے اور جہاں سنجیدگی اپنا سر پیٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ذرا دوسری نظم "بوتل" کا ایک بند بھی دیکھئے ؎

بدمست جوڑوں کے اشارے ہیں محوِ رقص
لہاتے لالہ گوں کے کنارے ہیں محوِ رقص
رانوں کے گول گول سہارے ہیں محوِ رقص
یہ رقص اور موسمِ سرما کی لمبی رات
بوتل ہے میرے ہاتھ میں یا نبضِ کششِ جہات

یا یہ اشعار ؎

وہ عدو کی گود میں سوتے رہے
سسکیاں لے لے کے ہم روتے رہے
میرے پہلو میں تھا جب الطاف وہ
کیا کہوں اس رات کا کیا رات تھی

اس قسم کا تجاوز الطاف کے یہاں شاذ نہیں بلکہ جا بجا ہے اس پر علمی، فنی اور لسانی غلطیاں مستزاد ہیں جو الطاف کی شاعری کا پایہ بالکل گرا دیتی ہیں۔ اور کئی نظموں کے بندوں میں بھی کتنی خامیاں ہیں مثلاً "میرے پری جمال" کے تیسرے بند میں الطاف نے "چوڑیاں" "باہوں" میں پہنائی ہیں۔ حالانکہ چوڑی کلائی میں پہنی جاتی ہے چوتھے بند میں "ستر" کرب ہے۔ پانچویں بند میں "ملا کے اک بوتل" پر غور کیجئے۔ کیا ایک اچھے شاعر سے یہ توقع کی جا سکتی ہے؟ "رانوں کے گول گول سہارے"

———— آہ ادب و شعر کی پستیاں! یہی نمونہ ذیل کے غلط کئے خوشنما [illegible]

[illegible]

اے حسنِ بے پناہ بتائے کوئی مجھے / دنیا کی کون چیز ہے تیرے اثر سے دور
دل تو چرا چکے ہو مگر مجھ کو آپ پر / اب تک بھی اعتبار ہے معلوم نہیں کیوں
محبت کے ماروں کا کیسا ٹھکانہ / جہاں چل دیئے۔ بے نشاں جا رہے ہیں
رو کے وہ کہنے لگے الطاف شرقتِ دراع / خاک میں رنگیں جوانی مت ملا میرے لئے
چشمِ ظاہر میں چراغِ شام ہے آتش بسر / پر کہاں وہ سوزشِ پنہاں جو پروانے میں ہے
ہر جا پہ نظر آئے مجھے حسن کا عالم / اللہ مری آنکھ میں بتخانہ بنا دے
الطاف مرا عشق بھی کندہ حسیں ہے / جس جا پہ مچل جائے پریخانہ بنا دے
جاتے الطاف کی تربت پہ مت بہر خدا / اُس کے دل میں حسرتِ دیدار لینے دیجئے
وہ آئے، آکے چل بھی دیئے اور ابھی تلک / دل محوِ انتظار ہے معلوم نہیں کیوں
میں دکھلا کے زخمِ جگر کہہ رہا ہوں / کسی شوخ کی گلفشانی نے لوٹا

یہ غلطیاں سرسری طور پر سامنے آگئی ہیں

"قیاس کن ز گلستان من بہار مرا"

الطاف کے یہاں سرقہ کی ایک نمایاں مثال دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ————

حضرتِ اعجاز صدیقی کا یہ شعر "شاعر" آگرہ کے مشاعرہ نمبر ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا

چھینٹے پڑے ہیں خون کے زنداں سے باغ تک
شاید کوئی بہار کا قیدی رہا ہوا — اعجاز

یہ شعر نہ صرف میرے بلکہ سیکڑوں حضرات کے دلوں میں محفوظ ہے اس لئے کہ شعر میں جذبات اور تاثرات ہی ایسے ہیں لیکن الطاف مشہدی کے مجموعۂ کلام "پریت کے گیت" میں جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ہے یہ شعر مسخ شدہ حالت میں یوں موجود ہے ؎

چھینٹے پڑے ہیں خوں کے جو زنداں سے باغ تک
چھوٹا ہے کوئی قید سے قیدی بہار کا

ہم سمجھتے ہیں کہ جس وقت یہ شعر شائع ہوا تھا اُس وقت الطاف مشہدی کی شاعری کا آغاز بھی نہیں ہوا ہوگا، الطاف کو یہ اور اسی قسم کے دوسرے اشعار اپنے مجموعہ میں سے نکال دینے چاہئیں تاکہ دوسروں کو حرف گیری کا موقع نہ ملے

الطاف کی شاعری پر ہماری یہ تنقید انتہائی خلوص پر مبنی ہے اور ہم [illegible] لیکن اس کا مجموعۂ کلام "پریت کے گیت" [illegible] سے الطاف کی شاعرانہ شخصیت پست نظر آتی [illegible] یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ وہ ذہن جیاع اور ہونہار [illegible] اپنی شاعری کا سلک ممتاز و بلند کر سکتے ہیں [illegible]

ظرفِ تنگنائے غزل

(آل انڈیا مشاعرہ مراد آباد منعقدہ یکم مئی ۱۹۴۳ء کی غزل جس کی اشاعت کیلئے عام مطالبہ کیا گیا ہے)

بہ رسمِ انقلابِ وقت، تکلیفِ نظر کیوں ہو — قفس میں شام ہو جائے تو ہو جائے، سحر کیوں ہو
کسی کو ان مقاماتِ محبت کی خبر کیوں ہو — جہاں میں ہوں وہاں میرے فرشتوں کا گذر کیوں ہو
نہ ہو مرکز، تو پھر کوئی کہاں ہو جلوہ گر کیوں ہو — ہم آغوشِ تماشا دیدۂ ہر سو نگر کیوں ہو
اگر رستے میں موسیٰ دیکھنے کی ضد نہ کر جائیں — تو پھر گھر پہ ہو سامانِ تجلی، طور پر کیوں ہو
توجہ پر اُسی کی منحصر تاب و تبِ دل ہے — خدا نا خواستہ وہ حالِ دل سے بےخبر کیوں ہو
گریبانِ گل و دامانِ لالہ بھی ہے گلشن میں — مجھی پر التفاتِ موسمِ دیوانہ گر کیوں ہو
دو عالم کیا، مرے اک گوشۂ دل میں ہیں سو عالم — وسیع الظرف ہوں میں، میری دنیا مختصر کیوں ہو
مجھے جلدی نہیں ہے اپنی منزل پر پہونچنے کی — بغیرِ جلوۂ منزل سرِ جادہ سحر کیوں ہو
محبت میں نیاز و ناز کے رتبے برابر ہیں — تو دوشِ حسن پر کیوں سر نہ ہو اور زانوں پر کیوں ہو
اسیری اور اور ایسی بےبسی، اللہ رے مجبوری — کسی نے یہ نہ پوچھا، آج تم بےبال و پر کیوں ہو
اُمید و عزم میرے کارواں کی شاہراہیں ہیں — جو ہو مایوسِ منزل سے وہ میرا ہم سفر کیوں ہو
رہ و رہگیر آسودہ ہیں مجھ سے، وہ مسافر ہوں — جو پیچھے مجھ سے رہ جائے وہ میری رہگذر کیوں ہو
بغیرِ پرسشِ غم بھی تو ہے درمانِ غم ممکن — کرم ہو حال پر میرے تو مجھ سے پوچھ کر کیوں ہو
سب اُن کے طور پر ہیں منتظر، میں خلوتِ دل میں — جہاں سب کی نگاہیں ہیں وہاں میری نظر کیوں ہو

مرا ہم رنگ ہے سیماب رنگِ عالمِ کثرت
بغیرِ اضطراب و درد دُنیا میں بسر کیوں ہو

سیماب اکبرآبادی

تصوّرات

اُٹھو اے دل تصور کی محفل سجائیں — جہاں ہوں وہاں سے اُنھیں کھینچ لائیں
جہاں بجلیاں رقص کرتی ہیں پیہم — اُن آنکھوں میں اپنا نشیمن بنائیں
وہ راہِ محبت ہے، راہِ محبت — جہاں ہر نفس پر قدم ڈگمگائیں
وہ عہدِ جوانی، وہ مخمور راتیں — وہ دن میرے اللہ پھر لوٹ آئیں
محبت میں ایسا بھی اک وقت آئے — ہمیں وہ بلائیں مگر ہم نہ جائیں

بہت دن میں ٹوٹا ہے طرفہ کا تقوی
چلو آج نوروزِ بادہ منائیں

طرفہ قریشی بھنڈاروی

اذکارِ خواتین

سنہ ۱۲۶۳ھ

التماس

اُردو زبان میں ایک خاتون کا لکھا ہوا محذرات شاعرہ کا یہ پہلا تذکرہ ہے جو میری نظر سے گذرا۔ کتب خانہ بادریہ گوپامئو میں کرم خوردہ حالت میں تھا اسکی نقل کرلی جو لفظ پڑھے نہیں گئے عبارت کو صحیح کرنے کے لئے بڑھادیے گئے۔ مفتی محمد حسن صاحب کے ہاتھ کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ مفتی صاحب چند کتابوں کے مصنف مؤلف ذی علم بزرگ تھے انکا ذکر خمخانۂ جاوید حصۂ دوم (ذکرِ حسن) میں ہے اور راقم السطور نے "یو۔پی میں اُردو" اور مشایخ قادریہ مطبوعۂ مرتضائی پریس میں کیا ہے۔ آثار علما و علما تے گوپامئو میں بھی ذکر ہے۔

جناب خدیجہ اس گھر کی بیٹی ہیں جسکے یہاں کثیر التعداد علما گذرے ہیں آپ کے جد اعلم العلما ملا وجیہ الدین مؤلف فتاوی عالمگیری مشہور و معروف ہیں۔ آپ کی والدہ کے نانا قاضی حکیم علی بن قاضی مبارک شارح سلم تھے۔ والد بزرگوار بھی مصنف تھے آپ کے ددیہ خسر مولوی محمد اسمعیل مدراس میں قاضی القضات کے عہدہ پر سرفراز تھے آپ کے شوہر مفتی نوراللہ متخلص آباد آگرہ میں تعلقہ تاج گنج میں تھانہ دار رہے تھے۔ سنہ ۵۷ء میں نائب کوتوال رہے۔ مولوی سید احمد علی شاہ دلاور جنگ عرف احمداللہ شاہ نواب زادہ چیناپٹن کے مرید اور انکی تحریک کے معین و مددگار تھے جنکا انتقال سنہ ۱۲۷۰ھ میں ہوا۔ درگاہ سید جلال بخاری آگرہ میں دفن ہوئے۔ تہالستانِ نثار۔ تاریخ مفتیان گوپامئو میں آپ کے سوانحات ہیں۔

انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس معبود کی ذات والاصفات الہی مسبب الاسباب ہے کہ مجھ ضعیفہ ناتوان خدیجۃ النسا بنت قبلہ گاہی مولوی مفتی انعام اللہ المخاطب خان بہادر صدیقی مفتی محکم قضاۃ دہلی و حال وکیل صدر نظامت اکبرآباد کے ہاتھوں شریف اور خاندانی خواتین کا احوال تیار کرایا۔ میرے نانا مولوی معظم الحق المخاطب ذکی الدین خان بہادر صدر الصدور گوپاموی جنکے سایہ عاطفت میں پلی اور پروان چڑھی آں جناب کے توجہات سے اس کتاب میں شاعرہ بیبیوں وغیرہ کے حال و مقال کو بقدر معلومات جمع کیا ہے۔

باللہ التوفیق وھو المستعان

اختر تخلص ہے نواب اختر محل کا یہ نیک اختر تیموریہ خاندان کی بی بی ہیں ؎

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا | انکا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
تقصیر یار کی نہ قصورِ عدو ہے کچھ | اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

اختر ۲۔

واجدہ بی بی اختر بنت مفتی ابوسعید بن مفتی علیم اللہ بن مفتی عبیداللہ بن مفتی شیخ عیسیٰ محدث گوپاموی۔ باپ سے ہی علم حاصل کیا۔ فارسی اور ریختہ میں شعر موزوں فرماتی رہتی تھیں مولوی محمد شعیب خیرآبادی سے بیاہی گئیں۔ محمد شعیب سید رضوی مخدوم زادے تھے۔

اختر کی ماں کا نام نعمت بی بی تھا جو سادات رضوی خیرآبادی میں سے تھیں۔ ۱۴ ربیع الاوّل سنہ ۱۱۱۶ھ میں فوت ہوئیں۔ خیرآباد میں دفن ہوئیں۔

(شعر پڑھا نہیں گیا)

اسیر تخلص ہے اسیر بیگم نام ہے شاہ فخرالدین دہلوی کے سلسلہ شاگردی میں اسیر بیگمات چغتائی کے زمرہ میں خوش تقریر ہے ؎

خاک میں مل گئی ہو جیسے اسیر | اُن کے دل میں غبار ہے اپنا

اشک کسی شہزادی کا تخلص ہے جسکا مقام دہلی ہے اور اس طرز کا کلام ہے ؎

نہ بوسہ دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے
تجھے اے کافر ترسا فقط ترسانا آتا ہے

آمراؤ تخلص حسینی بیگم نام کسی پردہ نشین دہلوی کا یہ کلام ہے ؎

گرم منظور نہ تھی خانہ نشینی میری — تو مجھے ساکنِ ویرانہ بنایا ہوتا

بیگم۔ بہو بیگم محل خاص نواب یوسف علیصاحب رہیلے یوں گوہرفشاں ہیں۔

قطعہ

شب بزم ملاقات میں ہرچند یہ چاہا
آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس رشک قمر سے
پر خوف مرے دل میں یہی آیا کہ ہے ہے
نازک ہے نہ دب جائے کہیں تارِ نظر سے

بیگم تخلص میر محمد تقی کی بیٹی —— یوں سخن سرا ہیں۔ دیکھئے کہ بیگم اللہ اللہ کس لب و لہجہ سے گویا ہے ؎

رسول سر گیسو میں گرفتار تو رکھا — لو کہتے ہو کیا تم نے نہیں یار تو رکھا
وہ ذبح کرے یا نہ کرے غم نہیں اسکا — سر ہم نے تہِ خنجرِ خونخوار تو رکھا
اس عشق کی ہمت کے میں صدقے ہوں کہ بیگم
ہر وقت مجھے مرنے پہ تیار تو رکھا

بی بی اللہ بندی بنت حاجی احمد اللہ مفتی۔ جو مفتی محمد یحییٰ بن مفتی محمد ولی کی زوجیت میں تھیں، پڑھی لکھی بی بی تھیں۔ عابدہ زاہدہ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھیں۔ مفتی عبید اللہ یادگار سے تھے۔ سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا قرآن کی گویا ہوں ہے ؎

تونے چلکر دو قدم مردوں کو زندہ کردیا
اب تو اعجازِ مسیحا تیری ٹھوکر میں ہا

ثریا تخلص ثریا بیگم زوجہ مرزا علیخاں وظیفہ خوار شاہِ دہلی، آخر عمر اکبرآباد میں گذاری ؎

جدہر دیکھا اٹھا کر نیم بسمل کردیا اسکو — تیری مژگاں کو ہم سوفار پیکانِ قضا سمجھے

جانی تخلص بیگم جان نام نواب قمرالدین خاں کی دختر نیک اختر تھیں جو بیگمات اودھ میں بہو بیگم کے خطاب سے سرفراز تھیں ؎

نہ تھیں ٹانکے مرے زخم جگر پر — یہ اسکا خندۂ دنداں نما ہے
نہیں ٹلتی کسی عنوان سر سے — شب غم بھی کوئی کالی بلا ہے

جعفری تخلص عارفہ بیگم نام شاگردہ شاہ نصیر دہلوی کی تھیں جو اکبر شاہ ثانی کے عہدِ دولت میں سخن سرا تھی ؎

نصورِ اس صنم کا دلیل ہے جسکا جی چاہے — ہماری بات سنکر آزمائے جسکا جی چاہے

حاتم دہلوی تخلص کسی پردہ نشین حجلۂ عصمت کا ہے ؎

دشمن کا شکوہ تم نہیں سنتے نہیں سہی — میرا ہی غم سنو جو اگر ناگوار ہو

حجاب تخلص عسکری نام ہے یہ عفت پناہ ملا محمد زماں اصفہانی کی پوتی محمد علیخاں مسیحا کی شاگردہ لکھنؤ کی ساکنہ ہے۔ کبھی اپنے مکان فیض نشان پر بزم مشاعرہ آراستہ فرماتی تھی ؎

رات کو آئیں گے ہم صاف معمہ یہ ہے — وعدۂ وصل کیا اس نے دکھا کر گیسو

حیا تخلص نواب حیات النساء بیگم نام معروف بہ بھورا بیگم بنت شاہِ عالم ثانی شاگردہ شاہ نصیر صاحب۔

شاعرۂ بے نظیرہ دہلوی تھی کچھ ماہ ہوئے سفر آخرت اختیار کیا ؎

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آگیا ناقص
حیا ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو تو کوس

حرماں تخلص سیدۃ النساء بیٹی مولانا فضل حق منطقی خیرآبادی ثم دہلوی کی ہیں۔ باپ سے ہی علومِ دینی پڑھے، دنیاوی علم میں منطق بھی پڑھی۔ شعر گوئی کا شوق رکھتی تھیں۔ مجھ سے عمر میں بڑی ہیں بہن کی شادی میں ملی تھیں۔ کچھ دن ہوتے مولوی سید احمد حسین ابن سید تفضل حسین خیرآبادی کی زوجیت میں آئی ہیں۔ ایک شعر یاد ہے لکھتی ہوں ؎

دردِ دل، دردِ جگر، کاوشِ دل کاہشِ جاں
اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجہ میرا

حیدری تخلص حیدری خانم نام زوجہ نثار اللہ خاں خواص شاہِ دہلی۔ چند روز ہوئے ستر برس کی عمر میں عالمِ جاودانی کو سدھاریں ؎

حیدری نام ہے تیرا کیا خوب — جو کہ تجھ سے پھرا وہ حیدر سے

بی بی حلیمہ بنت محمد امان بن علامہ ابوسعید بن مفتی علیم اللہ بن مفتی عبید اللہ بن شیخ عیسیٰ مفتی محدث گویا ہیں۔

بی بی حلیمہ نواب ذکی الدین محمد جان بن شیخ عبدالسبحان خاں شہید جو نواب والاجاہ کے خاندان سے تھے۔ اُن سے بیاہی گئیں اُن سے حاجی معظم اسحق المخاطب بہ ذکی الدین محمد خاں صدر الصدور مدراس پیدا ہوئے۔

بی بی حلیمہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ ۲۵ رمضان سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا ؎

پہچانا ہو دل اگر اسے ماہِ کنعاں چاہئے
چپکے کیوں بیٹھے ہو کہدو کیوں نہیں ہاں چاہئے

ذلیل۔ کنیز باتمیز مرزا سلیمان شکوہ بہادر کا ایک شعر تذکرہ لکھا جاتا ہے

تم سے اللہ رکھے اپنی اماں میں تم تو
ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا لیتے ہو

رابعہ۔ شیخ زادی کسی ڈاکٹر کی بیٹی ہے نام رابعہ خانم ہے ؎

الٰہی سب گنہ سے پاک کر کر
مجھے بھیجا تو جنت کے در پر

زہرہ تخلص فاطمہ نام بنت مفتی سلیم اللہ گوپاموی مولوی محمد اسمٰعیل خیرآبادی کو منسوب تھیں۔ فارسی خواں تھیں۔ عابدہ و زاہدہ تھیں۔ مولوی صاحب نے شعر کا شوق دلا رکھا تھا راقم کی بہن ہوتی ہیں۔

نوٹ:۔ فاطمہ صاحبہ نے ۱۴ شوال سنہ ۱۲۹۶ھ میں انتقال کیا قصبہ نارنول میں قبر ہے (حسن)

یہ بھی حاضر وہ بھی ہے موجود اے جانِ جہاں
آپ کو کیا چاہئے دل چاہئے جاں چاہئے

خورشید نامی سیدزادی دہلوی نا کتخدا مرثیہ خوانی میں لکھا ہے

اے جذبۂ دل کیوں کر اجازت دوں میں تجھ کو
ہے سخت کشش تیری وہ ایسا نہ ہو ڈر جائے

دلہن۔ دلہن بیگم نام مشہور بہ نواب بہو صبیہ نواب نظام الدولہ زوجہ نواب آصف الدولہ وسرا پا سخن کی تیاری کے وقت فیض آباد میں رونق افروز تھیں یہ شعر اس شاعرہ کے مشہور ہیں ؎

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا | تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا
ایسے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جائیں | گل کی مانند جدھر جائیں مہکتے جائیں
دن کٹا فریاد میں رات آہ و زاری سے کٹی | عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

سلطان تخلص اور سلطان بیگم نام دختر نواب معتمد الدولہ بہادر لکھنوی کی تھی جو صاحب دیوان گذری ہے ؎

تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا
ملتے ہی آنکھ رہ گیا کہہ کے منہ ہائے دل

شوخ تخلص گنا بیگم نام زوجہ نواب عماد الملک غازی الدین خاں وزیر عالمگیر ثانی کی ہیں۔ یہ علی قلی خاں ششش انگشتی کی بیٹی تھیں۔ میر سوز کے بعد سودا سے اصلاح لیتی تھیں اسکے اشعار پُر مذاق ملاحظہ ہوں

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا | دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا
عندلیبوں کو وہ گلزار مبارک ہووے | ہم کو یہ سایۂ دیوار مبارک ہووے
یار پردہ میں ہے اور عیش سراپا یوں ہے | نقش پا تک بھی میرے دیکھ جاسوسی ہے

ضرورت تخلص شرف النسا نام زوجہ میرزا کوچک نسل تیموریہ سے تھیں ؎

سرسبز رہے باغ سدا دینِ نبی کا
مکی مدنی ہاشمی و مطلبی کا

ضیا تخلص ضیائی بیگم نام زوجہ حکیم انور علی لکھنوی یہ شاعرہ عربی فارسی میں بھی شعر کہتی تھیں۔ باسٹھ برس سے زیادہ عمر پا کر عازم ملکِ بقا ہو گئیں ؎

بے وجہ بو شراب کی منہ میں نہیں ضیا
چوسے ہیں تم نے ہونٹ کسی بادہ خوار کے

عالم تخلص ہے خاص محل نواب امجد علی شاہ کے لڑکے واجد علیشاہ کی۔ جو صاحبِ دیوان و مثنوی ہیں۔ ستار خوب بجاتی ہیں ؎

عالم وہ طلبگار ترے ہونگے اُسی دن
جب تازہ ستم اور کوئی ایجاد کرینگے

عزت۔ تخلص عزت النسا نام وطن مظفر نگر ہے ؎

میں اپنی آہ کے تاثیر کے فدا عزت | کہ بزم غیر سے یاں اسکو کھینچ لائی ہے

عشرت تخلص نواب عشرت محل شاہ اودھ کے محل سے ہے ؎

گرمئ عشق مانع نشو و نما ہوئی | میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

عفت تخلص نجم النسا نام باشندہ لکھنؤ شاگردہ مقصود عالم مقصود ہے ؎

ہم جو اے جانِ جہاں تم سے بچھڑ جاتے ہیں
صدمے ہوتے ہیں قلق ہوتے ہیں گھبراتے ہیں

عصمت فرزانہ خانم نام شریف بی بی ہیں۔ عربی فارسی کی عالم ہیں۔ عمر کی پختہ ہو چکی ہیں۔ ناکتخدا ہیں۔ بادا جان قبلہ مفتی انعام اللہ خاں بہادر وکیل صدر نظامت کے مکان پر مقیم ہیں۔ میری ہمشیرہ عزیزہ عمدۃ النسا بیگم سلمہا کو عربی پڑھاتی ہیں۔ عموی مولوی غلام امام شہید کی تعریف میں قصیدہ کہا ہے اسکا ایک شعر یہ ہے

در وصف شہیدے کہ شہید است قدم را
کوتاہ زبانم کہ چہ آراستے رقم را

غریب تخلص اور امیرن نام منکوحہ میر برکت علی ساکن پٹنہ کا یہ کلام ہے

گھلا نہ تا برگ سرا یہ معاملہ
رسوائے شہر مجھ کو دلِ زار نے کیا

فاطمہ بیگم نامی آگرہ میں رہتی ہیں۔
انکا شعر ہے ؎

نازک دماغ وہ ہیں تو ہم یاں بھی تمکنت
ہم خود بھی ایسے ہیں کہ منایا نہ جائیگا

قمر تخلص حیدری بیگم نام مرزا ہمایوں بخت کی بیٹی مرزا محبوب علی قوس کی ہمشیرہ فارسی کے شعر بھی کہتی تھیں۔
(نوٹ) نواب واجد علیشاہ کے محل میں آخر عمر میں آن رہیں۔ ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا (حسن)

آنکھیں پتھرا کے ہو گئی ہیں سفید
کسی بت کی جو انتظاری ہے

قمر تخلص اور قمر النساء نام زوجۂ اشرف علیخاں مسرور تھیں۔
کہتے ہیں کہ میاں بیوی میں اسقدر تعشق تھا کہ ہر دو آگے پیچھے راہی ملکِ بقا ہوگئے ؎

جسے لوگ کہتے ہیں خورشیدِ درخشاں
شرارہ ہے یہ میرے سوزِ نہاں کا

کنیز تخلص فاطمہ بیگم نام نصرت الدولہ بہادر لکھنؤ کی چھوٹی بیٹی ہیں۔
سترہ برس کی عمر میں علومِ ضروریہ کی تحصیل کی۔ تیس برس کی عمر میں یہ شعر کہا ہے ؎

نقاش نے اُس بُت کا مرے نقش جو کھینچا
ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ جو ہاتھ کو کھینچا

انتقال ۱۲۸۱ھ میں ہوا۔
نظیر تخلص باسم کسی شاعرہ کا یہ مطلع ہے ؎

جو تو اغیار کے پہلو میں یہاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

یاد تخلص کسی شہزادی نے ایک قطعہ حالتِ نزع میں لکھا تھا۔ بنظر یادگاری درج ہوتا ہے ؎

عبث فکرِ درماں ہے اے اقربا | کہ اب یاد تو یاں سے چلنے کو ہے
سرانجام غسل و کفن کر رکھو | تنِ زار سے جان نکلنے کو ہے

تتمہ

از محمد حسن متخلص بہ حسن
نوشتہ ۱۳۰۵ھ

حالات والدہ ماجدہ مسماۃ خدیجۃ النساء۔ ان کے والد مفتی انعام اللہ صاحب کا نکاح فضل النساء بنت معظم الحق عرف ذکی الدین محمد خاں بہادر فاروقی صدر الصدور مدراس کے ساتھ ہوا اونکے بطن سے ایک لڑکی مسماۃ خدیجۃ النساء متولد ہوئی انھوں نے اپنے ننہال میں تعلیم پائی اور پرورش بھی وہیں ہوئی۔ معظم الحق کے صرف دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی لڑکی مسماۃ نور جہاں بی بی جنکی شادی مولوی غلام علی خاں جیلانی فاروقی برادر کلاں افضل العلماء قاضی ارتضیٰ علیخاں کے ساتھ ہوئی تھی۔ فضل النساء نہایت سلیقہ شعار و پابند صوم وصلوٰۃ عابدہ زاہدہ تھیں بیعت کرم میاں صاحب بلگرامی سے کی تھی۔ آپ کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ آپکے بطن سے خدیجۃ النساء مصنف تذکرہ ہذا پیدا ہوئیں۔ اُسکی شادی محمد نور اللہ ولد مفتی سلیم اللہ کے ساتھ ہوئی۔ بی بی فضل النساء نے ۲۶ جمادی الاول ۱۲۸۵ھ کو انتقال کیا۔ ان کی قبر پائیں قبر اپنے باپ مولوی معظم الحق ہے۔ بی بی خدیجۃ النساء بنت مفتی انعام اللہ صاحب مرحوم نہایت صاحب سلیقہ اور فارسی کی تعلیم یافتہ تھیں انھوں نے اپنے ننہال میں اپنی ماں کے ظلِ عاطفت میں پرورش پائی تھی اسکے بطن سے دو لڑکیاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ایک لڑکی حالتِ صغر سنی میں ہی مرگئی۔ ایک لڑکی مسماۃ منیر فاطمہ اور ایک لڑکا محمد حسن (مفتی محمد حسن) پیدا ہوا مسماۃ منیرا فاطمہ کی شادی محمد بقاء اللہ خلف مولوی محمد یحییٰ خیرآبادی سے جو بطن بی بی عائشہ بنت سلیم اللہ سے تھی ہوئی۔ الغرض مسماۃ خدیجۃ زوجہ مفتی نور اللہ صاحب عارضہ ذیابیطس میں مبتلا ہوکر قریبِ ہلاکت کے پہنچی انکی ماں مسماۃ فضل النساء بی بی بقید حیات تھیں انکی تیمارداری اور دوا معالجہ میں بہت کوشش کی تمام اپنی کائنات خرچ کی مگر صحت نہ ہوئی آخرکار ۱۳ صفر ۱۲۶۴ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ مرحومہ کو ابنائے جنس کی بے اعتنائی کا نہایت صدمہ تھا۔ مرحومہ اپنے ننہال کے قبرستان میں یعنی باغ معظم الحق ذکی الدین محمد خاں میں پائیں روضہ ذکی الدین محمد خاں صاحب کے مدفون ہوئیں۔
تاریخ وفات انکی یوں ہے "والدہ ماجدہ سفر کردہ در کنیزے فاطمہ باد تاریخ او چہ خوش گفتم

گلشنِ خلد زیر پا بادا
۱۲۶۴ھ

انتظام اللہ شہابی

تاج محل

کیا کچھ سبق آموز ہیں اسلاف کے آثار　　اور سطوتِ اجداد کے شاہد در و دیوار
وہ قلعۂ احمر وہ درخشندہ عمارت　　اس تیرہ زمیں پر عجب انساں کے کمالات
وہ اکبرِ اعظم کا محل قصرِ جہانگیر　　وہ مسجدِ دہلی وہ کمالات کی تصویر
وہ مقبرۂ شاہ ہمایوں کا نظارہ　　آخر میں ظفر نے جسے سمجھا تھا سہارا
مسجد وہ مساجد وہ معابد وہ مقابر　　گذری ہوئی تاریخ کے پارینہ دفاتر
اُجڑی ہوئی دہلی کے کھنڈر اور نئی دہلی　　یہ دوسری عظمت ہے عیاں اور وہ پہلی
یہ فاتح و مفتوح کا پُر درس نظارہ　　عبرت کا سبق گنبد و دیوار و منارہ

تعمیر ہر اک خوب ہے بے مثل و بدل ہے　　اور سب میں جو ممتاز ہے وہ تاج محل ہے
ہیں یوں تو سبھی شان میں عظمت میں برابر　　دل میں جو سما جائے وہ ہے تاج کا منظر
وہ شوکتِ اسلام کی اک زندہ علامت　　اور الفت و اخلاص کی پایندہ امانت
وہ حُسنِ مجسم وہ مودت کی نشانی　　وہ زندۂ جاوید محبت کی کہانی
وہ قلبِ حزیں روحِ پر آلام کی دُنیا　　مفتوحِ محبت شہِ ناکام کی دُنیا
وہ حُسنِ مکمل وہ خیالات کی جدت　　وہ صنعتِ انساں کے کمالات کی رفعت
اوجِ فلک سعد پہ اک نجمِ سعادت　　اک جوہرِ یکتا دُرِ دریائے لطافت
اک ہیکلِ اخلاص و وفا نقشِ محبت　　اک نقشۂ الہامِ خدا پیکرِ الفت
وہ رعب فگن گنبدِ ابیض وہ منارے　　کمزوریِ ایماں کے وہ مضبوط سہارے
نقاشی دلکش بھی عجب نازک و رنگیں　　مرمر پہ وہ گلکاریِ صد پارۂ سنگیں
شرمندہ کنِ مانی و بہزاد یہ فن ہے　　ہر لوحِ حجر سنگ نہیں تازہ چمن ہے

شاداب درختوں میں وہ پُر نور عمارت　　ہے روضۂ رضواں بصد اندازِ لطافت
سبزی میں سفیدی کا عجب ایک سماں ہے　　روضے پہ بجا قصرِ بہشتی کا گماں ہے
فوارے ہیں یا ہیں فرشتوں کی قطاریں　　خوش ہو کے جو برساتے ہیں رحمت کی پھواریں

منظر شب مہتاب کا اک حُسن پُر اسرار　　اک جلوۂ معصوم سے لپٹے ہوئے انوار
کچھ روح سی کچھ جسم سا کچھ ظاہر و پنہاں　　اور چھٹکی ہوئی رات میں فردوس بداماں
خاموش اذانوں کی وہ مسجد میں صدائیں　　ہر گوشۂ تاریک سے روحوں کی دعائیں
ہے نورِ قمر نورِ زمیں سے متقابل　　اک سعیِ عبث چاند نہیں اسکا مماثل
یہ طلعتِ بے داغ وہ آغوش ہی میں محبوب　　وہ منزلِ ویراں ہے جہاں شاہ کا محبوب

مرمر پہ سیہ سنگ سے لکھا ہوا قرآں　　ہے لوحِ سماوات کا اک عکسِ درخشاں
تثلیث کے ہاتھوں میں وہ توحید کی آیات　　قبضے میں نصاریٰ کے مسلماں کی روایات
ظاہر میں یہ دیوار و در تاج ہیں خاموش　　باطن میں مگر گردشِ ایام سے پُر جوش
ہے سبزۂ خوابیدہ بھی اشجار بھی چپ ہیں　　انہار بھی چپ اور در و دیوار بھی چپ ہیں
ہے بس فقط اک تاج جو خاموش ہے ساکت　　گویا بھی ہے خاموش بھی اور ناطقِ ملت
ہے نوحہ کناں مسلمِ مغلوب یہ ہر دم　　چھینی ہوئی دولت پہ جو کرتا نہیں ماتم
جو رکھ نہ سکا اپنی حفاظت میں امانت　　اور قبضۂ اغیار میں دی کر کے خیانت
کیا پھر کبھی چمکے گا مسلماں کا ستارا　　کیا ہند کے ہم ہونگے پھر اور ہند ہمارا؟
چھائی ہوئی ظلمت میں کبھی ہوگا اُجالا　　کیا حُسنِ کبھی "تاج" کا پھر ہوگا دوبالا؟

(محمود علیخاں (بھوپال))

وفا ناشناس

جس روز جھمکی نے بھیک منگوں کی دنیا میں قدم رکھا، وہ اس کی زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ رام دین پیدائشی اندھا تھا۔ چڑھتی جوانی، بھرا بدن، اور پکا رنگ اور گلے کی نسبت تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ گلا لوچدار نہ ہو تو سورداس ہی کیا' وہ ریلوے روڈ کے چوراہے پر درخت کے نیچے بیٹھتا اور صبح سے شام تک مانگا رہتا۔ اس کے گلے میں کچھ ایسا درد تھا اور اس کی جنم کنڈلی میں کچھ اس طرح ستارے جمع ہوگئے تھے کہ بڑے بڑے کنجوسوں کی انگلیاں بھی اسے دیکھکر جیب سے ٹکرا جاتی تھیں۔

اندھے کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں جھمکی کا دل بے اختیار اس کے جانب کھنچ گیا وہ آہستہ آہستہ سمٹتی ہوئی اس کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔

"سورداس! تم کہاں رہتے ہو؟"

"مائی بھکاری کا بھی کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے، بھگت منگل داس کے باغیچے میں پڑا رہتا ہوں اور بھی بہت سے منگن وہاں رہتے ہیں۔"

"تمھیں یہاں کون چھوڑ جاتا ہے سورداس؟"

"کون چھوڑ جائیگا مائی اور کون لے جائیگا۔ ٹٹولتا ٹٹولتا صبح آجاتا ہوں اور اسی طرح شام کو چلا جاتا ہوں۔"

"اور جو کہیں ٹھوکر لگ جائے؟"

"ٹھوکریں کھانے کے لئے تو اندھے پیدا ہی ہوتے ہیں مائی۔"

"ہائے ہائے تم ایسی باتیں کیوں کہتے ہو سورداس؟"

جھمکی کا دل جذبۂ ہمدردی سے لبریز ہوگیا اور نہ جانے کب اور کیسے اس کا دایاں ہاتھ سورداس کے ابھرے ہوئے شانے پر جا ٹکا، سورداس کے بال بال پر جیسے ایک شیریں لرزش طاری ہوگئی اور جھمکی کے دل میں بھی جیسے مدتوں کی سوئی ہوئی ایک مضطرب تشنگی پیدا ہوگئی اس کا جسم غیر ارادی طور پر کھسک کر سورداس کے اور بھی قریب ہوگیا۔ اب جھمکی کا گھٹنا سورداس کے گھٹنے سے ملا ہوا تھا اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ سورداس کی کمر پر لوریاں سی دے رہا تھا۔

"آنکھیں والو اس اندھے کی طرف بھی دیکھتے جاؤ۔" سورداس رہ رہ کر اپنا یہ نعرہ لگاتے جا رہا تھا۔ آج اس کے دل میں جو امنگ موجیں مار رہی تھی اس نے اس کے گلے کے لوچ کو دوبالا کردیا تھا۔

شام کو جب سورداس ڈیرے کی طرف چلا تو جھمکی نے اس کی لاٹھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ سورداس آج جیسے ہوائی جہاز پر سوار تھا، منگل داس کے باغیچے میں آج کی شام سورداس کی خوش قسمتی کے تذکرے میں غرق ہوگئیں۔ اس تذکرہ میں خوشی اور حسد کی دو تہیں تھیں اوپر خوشی کی اور نیچے حسد کی۔

اس نے اپنی نیم آستین کی جیب سے دن بھر کی کمائی نکال کر جھمکی کے ہاتھ میں دے دی "لے ذرا گن تو کتنے ہیں؟"

"پورے دس آنے ہیں۔" جھمکی نے ان پیسوں کو گن کر جوش کے ساتھ کہا۔

اور سورداس نے اس جوش پر پالش کرتے ہوئے اس فقرے کا اضافہ کیا،

"ہے بھگوان روز تو مشکل سے آنے دو آنے ملتے تھے آج تو تیری بڑی دیا ہے"

اور اس نے ٹٹول کر جھمکی کا منہ چوم لیا۔

(۲)

صبح اٹھتے ہی جھمکی سورداس کا ہاتھ تھام کر چوراہے پر چھوڑ جاتی۔ پہلے سورداس کو تمام راستہ بچتے بچتے طے کرنا پڑتا تھا۔ وہ موٹر، یہ سائیکل، وہ تانگہ، بائیں طرف، دائیں طرف، موڑ سے ہوشیار......" لیکن اب جھمکی نے اسے راستے کی فکر سے آزاد کردیا تھا، وہ جھمکی کا چکنا اور گداز ہاتھ تھامے اس کے خیال میں غرق چلا جاتا۔

چوراہے پر پہنچ کر جھمکی اپنی بغل سے بوری کا ایک ٹکڑا نکال کر زمین پر بچھاتی اور اسے دری کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے ڈھک دیتی۔ سورداس اس آسن کو چھوکر ہاتھ پیشانی سے لگاتا "اللہ دینا گوپال" کہہ کر آسن پر بیٹھ جاتا، جھمکی کو ہاتھ سے ٹٹولتا اس کے گداز جسم کو چھونے سے اس کے دل کو ایک خاص کیف و سرور حاصل ہوتا تھا۔ اس کے سرخ ہونٹوں پر تبسم کی لہریں دوڑ جاتی تھیں۔ اور وہ اپنے نشاطی جذبات پر قابو نہ پاکر زور سے چلا پڑتا۔ "آنکھیں والو اس اندھے کی طرف بھی دیکھتے جانا۔"

"اچھا آج کیا بناؤں تمہارے لئے؟" جھمکی پوچھتی

"جو تمہارا جی چاہے مجھے تو تمہارے ہاتھ کی ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔"

"بس لگے نہ تم مجھے بنانے۔"

یہ کہکر جھمکی کھانے کا انتظام کرنے کے لئے باغ کی طرف لوٹ جاتی اور چوراہے کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ایک بار پیچھے مڑ کر سورداس کو دیکھتی۔ سورداس کی آواز دور تک اُس کے کانوں میں آتی رہتی۔

"آنکھیں والو اس اندھے کی طرف بھی دیکھتے جانا"

اور جھمکی کا بال بال کہنے لگتا کیسی رسیلی آواز ہے سورداس کی! اس کی نگاہوں کے سامنے سورداس کے اُبھرے ہوئے بازوؤں کا نقشہ پھر جاتا وہ رنگین تصورات کے سیلاب میں تیرتی ہوئی باغیچے میں پہنچ جاتی۔

"لو کھانا کھا لو سورداس تمہارا تو چلاتے چلاتے گلا دُکھنے لگتا ہوگا لوگ سمجھتے ہونگے یہ بھیک منگے دونوں وقت حرام کا کھاتے ہیں لیکن اگر ان کو ایک روز بھی یہاں بیٹھنا پڑے تو پتہ چلے کہ بھیک کی روٹیاں کیسے ملا کرتی ہیں؟"

جھمکی کی ایسی ہی دو ایک محبت آمیز باتوں سے سورداس کی ساری تھکن دُور ہو جاتی۔

"جھمکی تو بھوجن تو ایسا بناتی ہے کہ راجہ بھوج کے محل میں بھی نہ بنتا ہوگا۔ مگر یہ تو بتا روٹیاں یہاں تک گرم گرم کیسے لے آتی ہے؟"

جھمکی بھی سورداس کی پیار بھری باتیں سُن کر مسرت کے دریا میں ڈوبنے اور تیرنے لگتی۔

"گرم گرم روٹیاں اچھی طرح لپیٹ کر دوڑی ہوئی چلی آتی ہوں"!

سورداس کی بے نور آنکھوں میں گرم گرم روٹیاں لیکر دوڑتی ہوئی جھمکی کی تصویر پھرنے لگتی۔ جھمکی اپنے آنچل سے پنکھا جھلتی اور سورداس خوش خوش کھانا کھاتا۔

"کیوں سورداس شہروں میں جس کو دیکھو وہی لاٹ صاحب بنا پھرتا ہے آخر ان کو اتنی دولت کہاں سے ملتی ہے؟"

سورداس نے اپنے تجربات و تاثرات کا اظہار کیا۔ یہ لاٹ صاحب نہیں جانور ہوتے ہیں۔ جانور۔ کمبخت سوائے نصیحت کرنے کے بھکاریوں کو ایک پیسہ دینا حرام سمجھتے ہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا جھمکی کہ جب پُرانے خیال کے رحمدل اور نیک انسان اس دُنیا میں نہ رہیں گے تو ہم لاکھوں بھکاریوں کا کیا ہوگا؟"

"کبھی نہ کبھی بھگوان پیٹ بھر ہی دیں گے۔ جب سنسار میں پیدا کیا ہے تو [illegible]

[illegible] یہ تو ٹھیک کہتی ہو [illegible]

ایک روز جھمکی نے سورداس سے کہا: "تم کہو تو میں کچہری کے چوراہے پر بیٹھا کروں دو چار آنے مل ہی جائیں گے۔ کھانے پینے کے بعد چار پیسے بچ رہیں گے تو کام آئینگے معلوم نہیں آئندہ کیا وقت آئے"!

سورداس نے کہا "پگلی! کیسا ہی وقت آئے میں جو ہوں! اپنے جیتے جی بھلا میں تجھے چوراہے پر بیٹھنے دونگا میری رانی؟"

پتہ نہیں جھمکی اس تخاطب کے بعد رانی ہوئی یا نہیں۔ لیکن خود کے راجہ ہونے کے احساس سے سورداس کا دل لبریز مسرت ہو گیا۔

"ذرا اپنا ہاتھ تو لانا جھمکی"!

جھمکی نے اپنا ہاتھ سورداس کے سامنے کر دیا۔ سورداس نے چپکے سے اس پر دو پیسے رکھ دئیے۔

"جاتے سمے لئے دہی لیتی جانا"!

جھمکی نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا "میں اس طرح روزانہ دہی لیجایا کرونگی تو کتنے دن گرہستی چلے گی پھر تم کچھ کھالو تو ایک بات بھی ہے۔ سارا دن گلا پھاڑتے ہو میں کھا کر کیا کرونگی مجھے کوئی ہل بیل تو جوتنے ہیں نہیں"!

پیسوں کو اُس کی مٹھی میں دباتے ہوئے سورداس نے کہا "جا جا دہی کو جی نہ چاہے تو ملائی کی برف لیکر کھا لیجو"!

جھمکی نے اپنے دل میں سوچا۔ گویا میں کوئی بچہ ہوں جو دہی کو جی نہ چاہے تو ملائی کی برف لیکر کھا لوں۔

وہ زور سے ہنس پڑی۔

(۳)

"مائی باپ بھوکی کو ایک پیسہ دیتے جانا" کسی رسیلے گیت کی طرح شیریں اور گداز صدا سے چوراہا گونج اُٹھا اور اس نئی آواز کی لہروں میں سورداس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسکی آواز گم ہو گئی ہے۔

"یہ نئی سی کون چلا رہی ہے جھمکی؟"

"جتنی کا ہے کمبخت پری ہے بھیک مانگنے کی عادت پڑ گئی ہے کسی کوٹھے پر جا بیٹھے تو لاکھوں کی مالک بن جائے"!

جھمکی گھر چلی گئی۔

سورداس کے کانوں میں گویا وہ وہ کر یہ آواز گونج جاتی "کمبخت پری ہے اور [illegible] جس [illegible] سکتا ہے مگر آواز زور

پری جیسی ہے۔ لیکن اگر یہ پری یہاں جم گئی تو اُس کی آواز کے طوفان میں میرا تو سارا روزگار ہی ٹھپا ہو جائے گا۔ بھگوان کریں اسے آج رات ہی کو ہیضہ ہو جائے۔

سورداس نے سوچا۔ کہیں اس کی بددعا ابھی اثر کر جاتی اور ہیضے کا بھوت اُس سندر ناگن کا گلا گھونٹ دیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

سورداس اپنی لاٹھی لئے ہوئے اُٹھا اور آواز کی سیدھ پکڑ کر اس پری کی بھکارن کے پاس جا پہنچا، دوشیزہ بھکارن نے اُسے پُرحسرت نگاہوں سے دیکھا اور مچل کر رہ گئی۔

"تم تو یہاں بہت دن سے بیٹھتے ہو سورداس"۔ بھکارن بولی۔

"ہاں کتنی سال ہو گئے ——— تم کہاں سے آ رہی ہو؟"

"بھکارن کا کیا ٹھکانہ؟ یونہی پھرتی پھراتی آگئی"۔

سورداس نے اپنی جیب سے دو آنے پیسے نکالے اور بھکارن کی طرف بڑھا دیئے۔

"لے شام کو چار کچوری کھا لیجو ابھی نئی نئی آئی ہے پتہ نہیں کچھ ملا ہوگا یا نہیں ہر کام رفتہ رفتہ ہی جمتا ہے"۔

"کیوں سورداس تمہارے ساتھ یہ بڑھیا کون رہتی ہے؟"

"کون بڑھیا؟ میرے ساتھ تو کوئی بڑھیا نہیں رہتی"۔

"وہ ہے نا جو صبح کھانا لیکر آئی تھی"۔

"اچھا! جھمکی ——— کیا وہ بڑھیا ہے؟"

"بڑھیا نہیں تو کیا جوان ہے؟ اور جیسی صورت ہے ویسا ہی نام بھی ہے"۔

(۴)

سورداس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ سڑک پر خوب چہل پہل تھی مگر آج پیسوں کی طرف اُس کا دھیان نہ تھا۔ اُس کے دل و دماغ پر آج ایک نیا خیال مسلط تھا۔

"جھمکی کی جیسی صورت ہے ویسا ہی نام بھی ہے........ وہ بڑھیا نہیں تو کیا جوان ہے........ اور یہ بھکارن حُسن میں پری۔ آواز میں کوئل........ اور عمر سولہ برس کے قریب........" آج انھیں خیالات میں سارا دن گذر گیا۔ باغیچہ میں پہنچ کر جب جھمکی نے سورداس سے آج کی کمائی مانگی تو اندھا سورداس بے نور آنکھوں سے اسکی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"آج ایک پیسہ بھی نہیں آیا پہلے ہی دن اس راکشنی نے نہ جانے کیا منتر پھونک دیا"۔

پھر سورداس نے سوچا اس بیچاری پر فضول کیوں الزام رکھتا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ اس کا کوئی قصور نہیں اس کی زبان سے نکل ہی گیا۔ "صبح ہی صبح دو آنے ملے تھے وہ میں نے اس پری کو دے دیئے آج بیچاری کو کچھ نہیں ملا تھا"۔

پری تمام دن سورداس کے باغ میں چکر لگاتی رہی۔ چنانچہ اس وقت بھی بیساختہ اس کی زبان سے پری کا لفظ نکل گیا۔ جھمکی کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ "صبح ہی دو آنے ملے تھے وہ میں نے پری کو دے دیئے"۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں صرف "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"کھانا کھاتے وقت سورداس نے جھمکی سے پوچھا "تمہاری کتنی عمر ہے رانی؟"

جھمکی سمجھ گئی کہ یہ تخاطب صرف اسے فریب دینے کی غرض سے کیا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اب سورداس کے من کے سنگھاسن کی رانی جھمکی نہیں بلکہ بھکارن ہے۔ وہ بولی "مری عمر خواہ کتنی ہی ہو لیکن میں پری نہیں ہوں"۔

"میرے لئے تو تم پری ہی ہو"۔ سورداس نے اپنے لہجے پر ذرا زور دیکر کہا مگر جھمکی کے دل کی افسردگی دور نہ ہو سکی۔

(۵)

یہ آگ اندر ہی اندر برابر سلگتی رہی وہ روز بروز جھمکی کی طرف سے متنفر اور پری کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا۔ اب جھمکی کے ہاتھ دو آنے سے زیادہ نہ آتے تھے۔ پہلے سورداس جھمکی کو گھنٹوں اپنے پاس سے نہ اُٹھنے دیتا لیکن اب کھانا کھاتے ہی اُسے جھمکی کے آرام کی فکر پڑ جاتی۔ جھمکی اس کا مطلب خوب سمجھتی تھی لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ اُس پر روزانہ بے وجہ گالیوں کی بوچھار بھی ہو جاتی "لُٹاتا ہوں تو اپنی کمائی کیا تیرے باپ کا مال لُٹاتا ہوں"۔ اس قسم کی باتیں وہ روز سُنا کرتی تھی۔

بالآخر ایک روز جھمکی کا جذبۂ نسوانیت بھی مشتعل ہو گیا اور اُس نے کہا:-

"میرے باپ کا مال تو نہیں ہے لیکن گھر میں تمہارے ساتھ دن رات جو مصیبتیں بھگتتی ہوں کیا اُن کا صلہ یہی ہے؟ آج تم سے پریاں لپٹنے لگیں، لیکن وہ دن تم بھول گئے کہ گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے"۔

سورداس کی مردانہ غیرت بھی جاگ اُٹھی۔ اُس نے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا "کل سے یہاں میرے ساتھ مصیبتیں بھگتنے کی ضرورت نہیں ہے جا کر کسی راج محل میں آرتی اُتروایا کرنا۔ اور رہا میرے ٹھوکریں کھانے کی بات تو مجھے یاد رہی، لیکن یہ بھی یاد ہے کہ اس وقت تو پیسے کی صورت کے لئے ترستی تھی۔"

جو تلوار ٹوٹ کر بھی میانوں سے اُلجھا ہوا تھا وہ آج ٹوٹ کر بالکل الگ ہو گیا دوسرے روز جب جھکّی کھانا لیکر چوراہے پر آئی تو اُس نے دیکھا پری اور سورداس دونوں ایک ساتھ بیٹھے روٹی کھا رہے ہیں۔ سورداس نے اُسکا کھانا واپس کر دیا۔ جھکّی جب شام کو سورداس کو لینے گئی تو اُس نے دیکھا کہ سورداس اور پری دونوں ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں۔

اب چوراہے پر سورداس اور وہ پاس ہی پاس بیٹھتے ہیں اور کبھی تو سورداس آواز لگاتا ہے تو کبھی وہ نئی بھکارن، آجکل اس جوڑی کا شہر میں بہت چرچا ہے اور دونوں کو خوب پیسے ملتے ہیں۔ اب جھکّی بھی اسی چوراہے پر بیٹھنے لگی ہے لیکن وہ کسی سے کچھ مانگتی نہیں بغیر مانگے جو کچھ مل جاتا ہے لے لیتی ہے وہ روز بروز سوکھتی جا رہی ہے وہ مسافروں کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیتی ہر وقت سورداس اور نئی بھکارن کو دیکھتی رہتی ہے۔ کون جانے اسے پیٹ کی آگ لے آئی ہے یا جذبۂ رشک و رقابت یا محبت ——

محمد صابر ضبط کلکتہ

فسوں گری

میں فرازِ پردۂ راز ہوں مرا راز رمزِ فسوں گری
مرا دل ہے آئینۂ ازل مرا نطق نغمۂ برتری

مرے اختیار کا ماجرا یہ ہے گلستانِ حیات میں
مری شاخِ حسرت و آرزو نہ بہار میں بھی ہوئی ہری

نہیں نیک و بد کی تمیز کچھ ترا امتیاز عجیب ہے
تری بزمِ ناز میں دوستوں پہ بھی دشمنوں کو ہے برتری

تری آستاں پہ جھکا کے سر نہ کرے کسی سے کچھ التجا
تو ترے گدائے غیور کے قدم آکے چومے تونگری

مرا دل ہی کعبۂ آرزو مرا دل ہے قبلۂ دو جہاں
ہے مری نماز طوافِ دل کہ یہی ہے میری قلندری

جو یہ پیک ابر نہ آئیگا مجھے کیا خزاں میں ستائیگا
میں وہ کشتِ یاس رسیدہ ہوں کہ نہ دیکھی جس نے کبھی تری

گلۂ جفا پہ یہ سرزنش ہے سکوت لازمۂ ادب
انھیں سب روا وہ جو کر سکیں مرے لب ہو وا تو ہے خود سری

مجھے آشنائے غمِ جہاں جو کیا بھی تو نے تو کیا کیا
مرے ذوقِ درد پسند کو یہ نگاہِ لطف ہی سرسری

تو اے نکتہ چیں جو ہے دیدہ ور تو تلاشِ نقص سے درگذر
نہ ہو عیب جوئی سے بے بصر نظرِ ہنر سے ہو جوہری

یہی ذوق حاصلِ عمر ہے یہی شوق ہے ابدی مرا
یہ نہ پوچھ کب سے زعیم تو ہے مجھے مذاقِ سخنوری

زعیم بنگلوری

سادگی و پرکاری

کن مست انکھڑیوں سے مَے آج میں نے پی ہے
بھولا ہوا ہوں خود کو اس درجہ بیخودی ہے

برقِ نگاہ اُن کی کیا کام کر گئی ہے
اب تک نفس نفس میں بجلی سی کوندتی ہے

مخزن ہے رنج و غم کا مدفن ہے حسرتوں کا
کہتے ہیں جسکو انساں تصویرِ بیکسی ہے

اب اور کیا بتاؤں انجام عاشقی کا
بربادیوں پہ دل کی حسرت برس رہی ہے

ہر ہر ادا پہ انکی دانستہ مٹ رہا ہوں
وہ اُنکی شوخیاں ہیں یہ میری سادگی ہے

اب کیا مریضِ غم کا تم حال پوچھتے ہو
اک سانس آ رہی ہے اک سانس جا رہی ہے

اچھا نہیں ہے رسوا چھپ کر گناہ کرنا
ایسی بھی ایک شے ہے جو چھپ کے دیکھتی ہے

رسوا مظلومی والی پاجود (کاٹھیاواڑ)

دعوتِ نظر

منت گذار ہوں ستمِ روزگار کا
ٹوٹا طلسمِ ہستیِ ناپائدار کا

رہتا ہے جیسے تاروں سے معمور آسماں
منظر وہی ہے میرے دلِ داغدار کا

تشنہ لبانِ حُسن کو ہے دعوتِ نظر
اُلٹا ہوا نقاب ہے صبحِ بہار کا

منزل ہو دُور پاؤں میں چھالے ہوں رہ میں گم
حافظ خدا ہے ایسے غریب الدیار کا

صد شکر دل کے ساتھ دیا ساتھ دردِ عشق
جھگڑا رہا نہ کوئی غمِ روزگار کا

اللہ رے حُسنِ یار تیری سحر کاریاں
نقشہ بدل دیا دلِ اُمیدوار کا

میں کشتۂ جمالِ جہاں تاب ہوں شرف
ہر ذرہ آفتاب ہے میرے غبار کا

شرف جوناگڑھی

مصر قدیم

فراعنہ مصر کے مقبروں سے جو نادر اشیاء اور تحریریں برآمد ہوئی ہیں اُن سے بہت کچھ مصر قدیم کا حال معلوم ہوا ہے۔ علمائے آثار نے بڑی تحقیق اور غور و فکر کے بعد ان قدیم چیزوں سے اتنے واضح اور مفصل حالات بہم پہونچائے ہیں کہ آج ہم کئی ہزار سال کے بعد بھی قدیم مصریوں کی زندگی اور اُنکے طرز معاشرت سے اچھی طرح واقف ہوسکتے ہیں۔ مصر کے شمالی حصے میں شاہانِ مصر نے شہر "تھیبز" کی بنیاد ڈالی اور اسکو اتنا شاندار بنایا تھا کہ تمام مہذب دنیا میں اسکی بڑی شہرت تھی۔ شہر پناہ کے سو دروازے جو نہایت کشادہ اور بلند نظر آتے تھے اور دیکھنے والے پر اپنی ہیبت و شان کا سکہ بٹھا دیتے تھے۔ اونچے اونچے مینار عالیشان مندر، سنگ سفید کے بلند اور نظر افروز مکان دریائے نیل کے کنارے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رشکِ فردوس نظر آتے تھے۔ شہر سے باہر تھوڑی دور کے فاصلے پر دو فلک بوس مندر بنائے گئے تھے جو طرز تعمیر کے لحاظ سے عجوبۂ روزگار اور مصریوں کے فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ یہ دونوں عمارتیں بلند اور مضبوط ستونوں پر قائم تھیں درمیان میں بڑے بڑے بت رکھے ہوئے تھے۔ دروازوں پر سنہری نقش و نگار تھے اور فرش چاندی کا بنایا گیا تھا جو صنعتِ مصری کا بے مثل شاہکار تھا۔ شہر تھیبز کی سنگین عمارتوں، مندروں اور بلند میناروں کے کھنڈرات ان تمام حقیقتوں کی ناقابلِ انکار شہادتیں ہیں۔

ان دو مشہور اور تاریخی مندروں کے پیچھے اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں جن کے دامن میں ایک نہایت پُر فضا وادی ہے جس میں فطرت نے انسانی روح و نظر کے لئے سکون و آرام کے تمام غیر فانی اسباب مہیا کر دیئے ہیں۔ اس میں فراعنہ مصر کی قبریں ہیں۔ جو مضبوط چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر بنائی گئی ہیں ان میں سے بعض قبریں کھودی گئیں جن میں سے بہت سی اشیاء برآمد ہوئی ہیں۔ حقیقتاً یہی مصر کی تاریخ قدیم کو مرتب کرنے کے لئے مورخ عہدِ حاضر کی صحیح اور حقیقی مددگار ثابت ہوئی ہیں۔ ایک قبر میں سے تین سنہری کفن اور فرعون طوطان کومان کی قدِ آدم تصویریں پائی گئی ہیں۔ قدیم اہلِ مصر فنِ مصوری میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ ان تصویروں کو دیکھکر اس عہد کا مصور ان کے اصولِ فن کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ طوطان کومان کی تصویر اس طرح بنائی گئی ہے کہ اسکے ہاتھوں میں چابک اور عصائے شاہی ہے ان میں مختلف رنگوں کی آمیزش سے خط و خال کی ترتیب اس صناعی کے ساتھ نمایاں کی گئی ہے کہ دیکھنے والے کو اصل اور نقل میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

چونکہ قدیم مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد قبر میں پھر زندہ ہوجاتا ہے اور اسکو ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جنکو وہ اپنی دنیوی زندگی میں استعمال کرتا رہا ہے۔ اس لئے وہ اپنے بادشاہوں کی قبروں میں وہ تمام چیزیں رکھ دیتے تھے جو ان کے لئے لازمۂ حیات ہیں لہذا طوطان کومان کی قبر میں اسکا تمام ذاتی سامان پایا گیا، خوبصورت پنکھے، منقش تیر و کمان، سونے اور عاج کی چھڑیاں اور بیشمار دوسری چیزیں جنھیں وہ زندگی میں محبوب رکھتا تھا۔ ایک بیرونی کمرے میں نہایت خوبصورت طریق پر غلاموں کی تصویریں بنائی گئی ہیں اس لئے کہ جب مرنے والا زندہ ہوگا تو یہ سب بھی اسی کی طرح زندہ ہوجائیں گے اور اسکی خدمت کرینگے۔

تخت شاہی سونے کا ہے جس میں نہایت قیمتی جواہر جڑے ہیں۔ ایک اونچے مقام پر قرینے سے رکھدیا گیا ہے۔ اسکے دونوں طرف دو پر رعب عقابوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں جو بطور سنتری کھڑے ہیں بعض قبروں سے بچوں کے جوتے، کھلونے گڑیاں اور چھوٹی چھوٹی لکڑی کی بنی ہوئی کشتیاں برآمد ہوئی ہیں۔ بچوں کی ممی کی ہوئی لاشیں ایسی صحیح و سالم شکل میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بول اٹھینگی۔ اکثر عورتوں کی تصویریں ملی ہیں جو ناز و ادا سے بیٹھی ہوئی ایک مرتبان سے خوشبوئیں نکال کر بالوں میں لگا رہی ہیں اُن کے قریب ستار، سارنگی اور دیگر آلات موسیقی رکھے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے قدیم باشندے فن موسیقی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ بعض محرروں کی تصویریں جن کے سامنے سیاہی اور قلم رکھے ہوئے ہیں اور وہ کسی اہم مضمون کے لکھنے میں مصروف دکھائے گئے ہیں۔

عہد فراعنہ میں کاغذ موجود تھا بعض قبروں سے کاغذوں پر لکھی ہوئی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ عہدِ فراعنہ میں کاغذ موجود تھا اور اس پر کتابیں اور دوسری دیگر ضروری تحریریں لکھی جاتی تھیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ

اس عہد میں "پیاپرس" درخت سے کاغذ بنایا جاتا تھا۔ انگریزی لفظ "پیپر" اسی سے نکلا ہے۔ یہ پودا مصر کی دلدلی زمینوں میں ہوتا تھا۔ اسکی اندرونی تہ کو کاٹ کر اس میں سے ایک پتلی جھلی نکال لی جاتی تھی اور اس قسم کی کئی جھلیوں کو اوپر نیچے رکھکر جوڑ دیا جاتا تھا اور کاغذ کو کافی موٹا بنایا جاتا، اور بعد میں بیلن وغیرہ سے دبا کر خشک کر لیا جاتا تھا۔ لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ جب صفحہ بھر جاتا تو دوسرا کاغذ اُس کے نیچے جوڑتے اور اسی طرح یکے بعد دیگرے بہت سے کاغذ جوڑ دیے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ۵۰-۶۰ فٹ کا لمبا تھان سا بنجاتا تھا۔

رسم الخط

عام طور پر تو خط صوری رائج تھا مگر بعض تحریریں ایسی بھی پائی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ متبرک اور مقدس مقررہ نشانات تھے جنکے ذریعہ سے مقاصد و مطالب کو ضبط تحریر میں لایا جاتا تھا۔ درحقیقت اس قسم کے نشانات کو بھی خط صوری ہی کی ایک دوسری قسم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں تو ایک خاص تصویر صرف کسی ایک لفظ کے بجائے بنادی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں جب فنِ تحریر نے کچھ ترقی کی تو ایک تصویر جزوِ لفظ کے لئے استعمال ہونے لگی یعنی ہر صورت میں ایک لفظ کئی تصویروں سے ملا کر بنایا جانے لگا۔ مقصد یہ ہے کہ تصویروں کی مختلف حالتوں اور انکی گردشوں سے الفاظ ترتیب دیئے جانے لگے۔ اس طرح لکھنے میں اگرچہ دیر ہو جاتی تھی مگر اس مصورانہ مشاقی اور مسلسل مشغولیت نے فنِ تصویر کو ترقی بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ مصر اس فنِ خاص میں اسقدر ترقی کر گئے تھے کہ آج تک دُنیا میں کوئی قوم بھی مصوری میں انکی ہمسر نہ ہو سکی۔

ظاہر ہے کہ جب لکھتے وقت مختلف قسم کی تصویریں بنانی پڑتی ہونگی اور جلدی جلدی کام کرنا پڑتا ہوگا تو اس اندازِ تحریر سے ایک قسم کا خاص خطِ شکست پیدا ہو گیا ہوگا، جیسا کہ آجکل بھی اُردو فارسی میں خطِ شکست موجود ہے اور یہی وہ خطِ شکست تھا جسے مصری اپنے روزمرہ کے کاروبار میں چٹھیوں اور درخواستوں میں استعمال کرتے تھے البتہ مذہبی اور اہم تحریریں اس مقررہ خطِ صوری میں لکھی جاتی تھیں یہ خطِ صوری اوپر سے نیچے لکھا جاتا تھا اور قلم کی نوک بہت باریک رکھی جاتی تھی۔ تحریر کے اوپر ایک خاص قسم کا مصالحہ لگایا جاتا تھا جس سے وہ نہایت پختہ ہو جاتی تھی۔

کتابوں کے مضامین

مصر کی ان قدیم کتابوں اور کاغذوں میں زیادہ تر تاریخی حالات، دیوتاؤں کی کہانیاں اور پریوں کے افسانے لکھے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تحریریں انھیں تین قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں بلکہ کتاب کی بابت یہ تحقیق کی گئی ہے کہ وہ اہرامِ مصر سے بھی پہلے کی لکھی ہوئی ہے اور اسقدر مقدس سمجھی جاتی تھی کہ جب کوئی بڑا آدمی مرتا تھا تو اسکی ایک کاپی اسکی قبر میں رکھدی جاتی تھی۔ اس میں کچھ ایسی تحریریں ہیں کہ جنکو جنتر منتر کہا جا سکتا ہے۔ انکا خیال تھا کہ مرنیوالے کی روح کو جو چیزیں صدمہ پہنچانے والی ہیں۔ اس کتاب کے جنتر منتر ان سب کو فنا کر سکتے ہیں۔ اس میں دیوتاؤں کی تصویریں بہشت و فردوس کے نظارے بھی زیبِ قرطاس ہیں۔ جس قوم کی ذہنی اور روحانی قوتیں محض فنِ تصویر میں مدغم ہو کر رہ گئی ہوں اور جس کے ہر خیال و قیاس پر عالمِ تصویر کا گہرا اثر پڑا ہو اسکا بت پرست ہونا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مصریوں کی پُرانی تحریریں اس بات کی صاف طور پر شاہد ہیں کہ وہ سب بُت پرست تھے اور انھوں نے کئی قسم کے دیوتا بنا رکھے تھے جنکی مقررہ اوقات میں پرستش ہوتی تھی۔

مصریوں کے بعض ارباب النوع

مصریوں کا سب سے بڑا دیوتا سورج کا دیوتا تھا جسکے متعلق انکا خیال تھا کہ وہ کائناتِ ہستی میں انسانی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ جب تک اسکی پرستش نہ کی جائے انسان اپنی روحانی زندگی کی آخری بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مشرقی اقوام میں سورج کو ایک بڑے دیوتا کی حیثیت سے پوجا جاتا ہے اور اسکی پرستش اعمالِ روحانی کا مرکزِ خیال سمجھی جاتی ہے۔ قدیم یونانی بھی سورج کی پرستش کرتے تھے۔ سورج دیوتا کے بعد "اسیرس" کا درجہ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ "اسیرس" کسی زمانے میں زمین پر انسانی شکل میں ہوتا تھا۔ اس بنا پر اسکو تمام انسانی قوتوں کا دیوتا تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مصریوں میں اسیرس کے متعلق عجیب غریب کہانی مشہور تھی جو قطعی طور پر اعتقادی رنگ میں اُنکے قوائے ذہنی پر مسلط ہو چکی تھی۔ وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ "اسی رس" عہدِ قدیم میں مصر کا نہایت عادل اور انصاف پرور بادشاہ تھا۔ اسکے بھائی بہن نے بربنائے حسد اسکو ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں پھینکدیا۔ لیکن کسی طرح اسکی بیوی کو وہ صندوق ہاتھ آ گیا اُس نے جب اپنے شوہر کی لاش صندوق میں دیکھی تو گریہ و زاری کرنے لگی۔ "اسیرس" کے بھائی کو جب معلوم ہوا کہ اسکا جرم ظاہر ہو گیا تو اُس نے لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اِدھر اُدھر پھینکوا دیا۔ لیکن اسکی بیوی "آئی سس" پھر اسکی تلاش میں نکلی اور اُس نے لاش کے منتشر ٹکڑوں کو جمع کر کے دفن کر دیا۔ بالآخر جب مرحوم "اسی رس" کا بیٹا جسکا نام "ہارس" تھا جوان ہوا اُس نے اپنے باپ کے دشمن چچا کو شکست دیکر باپ کا بدلہ لیا۔ اس کے بعد تمام دیوتاؤں کی ایک کمیٹی نے زبردست

کانفرنس ہوئی اور اس میں یہ طے پایا کہ اسیرس حق پر اور اسکا قاتل بھائی ناحق پر تھا۔ اس لئے "اسیرس" کو دیوتا کا رتبہ دیا جاتا ہے اور اس کے ظالم بھائی کو شیطان کا جسکی روح ہمیشہ شدید عذاب میں گرفتار رہیگی۔ ایک دیوتا شیر کی شکل کا اور ایک دیوی بلی کی صورت پر بنائی گئی تھی لیکن جنگ کا دیوتا نہایت خوفناک اور عجیب الہیئت تھا جس کا سر مادہ چیتے کی مانند پر خوف بنایا گیا تھا۔ ایک مردہ روحوں کی حفاظت کا دیوتا تھا جسکی صورت مشہور جانور گیدڑ سے ملتی جلتی تھی ایسے ہی بہت سی قسم کے دیوتاؤں کی پرستش کے علاوہ دریائے نیل کی پوجا بھی کی جاتی تھی جب دریائے نیل میں طغیانی آتی تو یہ لوگ خیال کرتے تھے کہ "آئی سس" اپنے خاوند "اسیرس" کی یاد میں آنسو بہا رہی ہے چنانچہ دریائے نیل کی طغیانی کے وقت میلے لگائے جاتے تھے اور کئی طرح سے نیل کی پرستش کی جاتی تھی تاکہ دریا میں اچھی طرح طغیانی آئے اور ملک کی آبپاشی کافی طور سے ہوسکے۔

بازار اور خرید و فروخت کے طریقے | بعض تحریروں سے بازار مصر اور خرید و فروخت کے طریقوں کا حال معلوم ہوا ہے۔

شہر کے وسطی حصوں میں بڑے بڑے چوک ہوتے تھے اور ان میں مرد و زن اپنا اپنا سامان لیکر برائے فروخت آجاتے تھے بالکل اسی طرح جیسے آجکل بڑے بڑے شہروں میں پینٹھ لگتی ہے۔ چیزیں سکّوں کے عوض فروخت نہیں کی جاتی تھیں بلکہ اشیاء کا باہمی طور پر تبادلہ ہوتا تھا۔ اس عہد میں سکّے کا بالکل رواج نہ تھا۔ تمام ضروریات زندگی کی چیزیں تبادلہ کے طور پر مل سکتی تھیں۔ بعض تجارتی آدمی قطار در قطار محلوں میں مکانوں کے سامنے اپنا اپنا سامان لیکر بیٹھ جاتے تھے اور تبادلہ کے طور پر ہر قسم کی چیزوں کا لین دین کرتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ایک ذمہ دار حاکم خاص طور پر مقرر کیا جاتا تھا۔ جو بازاروں منڈیوں اور گدڑیوں میں گشت لگاتا رہتا تھا اور دیکھتا تھا کہ کوئی شخص لین دین میں بے انصافی تو نہیں کرتا ہے۔ اگر کبھی چیزوں کی قیمت کے متعلق کوئی جھگڑا بازار میں ہوتا تو وہ حاکم موقع پر پہنچکر فوراً قضیہ کو سمجھتا اور مناسب تصفیہ کر دیتا تھا۔ شام کے وقت خرید و فروخت کرنے والے اپنے اپنے مکانوں کو لوٹ جاتے تھے۔

ایک مدت تک تو محض اشیاء کا باہمی تبادلہ ہوتا رہا لیکن بعد میں سونے، چاندی اور تانبے وغیرہ کی انگوٹھیاں تبادلہ کے طور پر استعمال ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہ انگوٹھیاں شادی وغیرہ کے موقعوں پر بھی دی جانے لگیں۔ آجکل جو مہذب ممالک میں شادیوں کے موقعوں پر انگوٹھیوں کا رواج دیکھا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ مصریوں کی اس پرانی رسم کی یادگار ہو۔

رسم غلامی | بعض دولتمند لوگوں کی گھریلو زندگی کا حال معلوم کرنے سے پتہ چلا کہ قدیم مصریوں میں غلامی کی لعنت اگر رسم موجود تھی۔ گھر کی ملکہ اپنا تمام وقت غلاموں کی دیکھ بھال اور اُن سے کام کرانے میں گزار دیتی تھی۔ کپڑا بننا، روٹی پکانا، شراب تیار کرنا اور دیگر اسی قسم کے خانگی کار و بار غلاموں کو کرنے پڑتے تھے۔ بعض وقت غلاموں کیساتھ سختی کا برتاؤ بھی کیا جاتا تھا۔ گھر کا مالک سرکاری کام میں مشغول رہتا تھا اور اکثر زراعت کے کاموں کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ اناج تیار ہوجانے پر بڑے بڑے کروں میں بند کر دیا جاتا اور وقت ضرورت نکال کر صرف کیا جاتا تھا۔

طریقہ تعلیم | بہت سے بچوں کی ایسی کاپیاں دستیاب ہوئی ہیں جنکے حاشیوں پر استادوں کی اصلاحیں موجود ہیں۔ عام طور پر چار برس کا بچہ تعلیم کے لئے مدرسہ میں بھیجدیا جاتا تھا۔ جہاں اسکو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ جب بچہ خط صوری کو اچھی طرح سمجھ لیتا اور لکھنے میں مہارت حاصل ہوجاتی تو پھر اُس کو مذہبی مسائل کی کتابیں اور فلاسفروں کے مقولے پڑھائے جاتے تھے۔ حساب میں صرف جمع تفریق سکھاتے تھے۔ سالوں اور عمروں کا حساب قمری مہینوں سے ہوتا تھا۔ تعلیم کے وقت بچوں کو جسمانی سزا بھی دیجاتی تھی اور بعض وقت اُن سے بہت سخت کام لیا جاتا تھا۔ انکے یہاں یہ مثل مشہور تھی کہ بچے کے کان پیٹھ پر ہوتے ہیں۔ یعنی جب تک اسکو سزا نہ دیجائے وہ ہرگز پڑھنے کی طرف مائل نہیں ہوتا بعض لڑکوں کو پہلے چھوٹے چھوٹے مکاتب میں تعلیم دی جاتی تھی اسکے بعد وہ کسی مذہبی درسگاہ میں بھیج دیئے جاتے تھے۔ جہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے مذہبی پیشواؤں کی ڈگری حاصل کر لیتے تھے۔ بعض فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملٹری کالج میں جاتے تھے اور وہاں سے اپنے فن کے متعلق سندیں حاصل کرتے تھے۔

فن طب کا حاصل کرنا سب سے زیادہ مشکل تھا، کیونکہ جو کتابیں اس فن کے متعلق نصاب میں داخل تھیں وہ اکثر نہایت دقیق مسائل کی حامل تھیں۔ علاوہ ازیں ان کے متعلق یہ بھی خیال تھا کہ وہ بڑے بڑے مصنفوں نے دیوتاؤں کی مدد سے لکھی ہیں جنکا بیشتر حصہ محض جنتر منتر اور ساحرانہ مضامین پر مشتمل تھا جو اطبا بادشاہوں کا علاج کرتے تھے ان کو اجرت میں سونا چاندی دیا جاتا تھا اور جو لوگ عوام الناس کے معالج ہوتے تھے انکی اجرت کا ایک عجیب طریقہ تھا یعنی یہ کہ جب کوئی شخص بیمار ہوتا تو اُس کے سر کے بال نہیں منڈوائے جاتے تھے۔ دوران مرض میں برابر بڑھتے رہتے تھے اور مریض کے صحت یاب ہونیکے بعد بالوں کے وزن کے برابر طبیب کو اُجرت دیدی جاتی تھی ایسی صورت میں طبیب یہ خیال رکھتا تھا کہ مریض کو جتنی دیر میں آرام ہوتا ہی اس کے لئے بہتر ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ قدیم مصری اپنا سر منڈا رکھتے تھے بال صرف مریض ہونیکی حالت میں چھوڑے جاتے تھے۔ بہرحال قدیم مصریوں کی تحریریں یا تصویریں اور پرانے تہہ خانے کے کھنڈرات انکی تہذیب اور طریق معاشرت کے متعلق ہمیں بہت کچھ بتاتے ہیں جنکی بنا پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن فنون خصوصیت سے اہل مصر نے ترقیاں کی تھیں ان میں سے [illegible]

نطقِ ناطق

بادہ مستی آ کرامات ہو کے میخانے میں آ
چل پری شیشے سے اڑ کر میرے پیمانے میں آ

دیکھ ایسا چاہیئے اے دشتِ خلوت کا مقام
اپنی ویرانی کو لیکر مرے ویرانے میں آ

وحشتِ دل کی نہیں تدبیر جز افسردگی
تنگیٔ زنداں کسی پہلو سے دیوانے میں آ

کر مرتب کچھ نئے انداز سے اپنا بیاں
مرنے والے! زندگی چاہے تو افسانے میں آ

دامنِ فانوس میں اے شمع! خودداری نہیں
کسوتِ ناموس اگر چاہے تو پروانے میں آ

چل نکل جائیں ادھر سے اپنی دنیا کی طرف
ہاں تو اے تارِ نفس تسبیح کے دانے میں آ

بیل زور! آپے سے باہر ہو کے جائیگا کہاں؟
آدمی بن آدمی، آ اپنے پیمانے میں آ

ختم کرنا چاہتا ہوں پیچ و تابِ زندگی
یادِ گیسو، زورِ بازو بن، مرے شانے میں آ

ہو چلی ہے رسمِ اہلِ کعبہ ناطقؔ اب تو عام
برہمن بھی مجھ سے کہتا ہے کہ بتخانے میں آ

ناطقؔ گلاؤٹھوی

افسانۂ جمال

(ذوقافیتین)

کیا خوب ہے یہ خواہشِ دیوانۂ جمال
بن جائے موجِ آتشِ پروانۂ جمال

کافر تجلیوں کی حقیقت میں ہے نہاں
نقشِ طلسمِ نازشِ بتخانۂ جمال

جلتا رہونگا شمعِ محبت کی آگ میں
باقی ہے میں نئے سوزشِ پروانۂ جمال

ذہن و تصورات میں دھندلی سی ہیں ابھی
نقش و نگار و تابشِ کاشانۂ جمال

اوراقِ گل پہ دیکھ رہا ہوں سرِ چمن
ہر رنگ میں نگارشِ افسانۂ جمال

فتنوں کے ساتھ ساتھ قیامت بھی جھوم اٹھی
اللہ رے کیفِ لغزشِ مستانۂ جمال

ہر موج مے سے نور کی تنویر ہے عیاں
کیا کیجئے ستائشِ پیمانۂ جمال

دنیا تمام عرصۂ فلاخن بنتی گئی
اٹھی فلاخنِ شورشِ دیوانۂ جمال

دل خود بخود ہے مائلِ بادہ کشی حزیںؔ
اللہ رے کشاکشِ میخانۂ جمال

حزیںؔ قریشی احمد آبادی

ماں

"میرے علاج و معالجہ میں وقت اور روپیہ صرف کرنا بے سود ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اب میری کشتیٔ حیات منزل مقصود کے قریب تر پہنچ چکی ہے۔"

"—— اس عمر میں زندگی سے ناامیدی کفرانِ نعمت خداوندی نہیں تو اور کیا ہے؟"

"آپ کا خیال درست ہے۔ میں بھی خوشی سے سفرِ آخرت اختیار کر رہی ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ یہ نہیں جانتے کہ جب انسان طلب کرتا ہے تو جانا ہی پڑتا ہے۔"

معصوم منی نہایت خاموشی سے اپنے والدین کی گفتگو سن رہی تھی مگر "جانے" کا لفظ سن کر خاموش نہ رہ سکی اور اپنی ماں کی طرف مخاطب ہو کر بولی:۔

"ماں —— ! تم جا رہی ہو —— !! ہم بھی چلیں گے ——"

وہ معصوم کیا جانتی تھی کہ اسکی ماں کہاں کا عزم سفر کئے ہوئے ہے اور اسکے یہ الفاظ اس ماں کے دل پر جو یہ سمجھ چکی ہو کہ اب اسکے عناصر حیات عنقریب منتشر ہونے والے ہیں کیا اثر کر رہے ہیں۔ شیاما کے دل کو ان الفاظ سے سخت صدمہ پہنچا مگر سنبھلتے ہوئے اپنی پیاری منی کو جواب دیا:۔

"بیٹی —— میں دور اور بہت دور جا رہی ہوں —— اتنی دور کہ تم ابھی وہاں تک نہیں جا سکتیں —— تمہارے نرم و نازک پیر ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ تم اس دراز سفر کی کلفتیں برداشت کر سکو —— لیکن —— میں ہاں سے تمہارے لئے ایک نئی ماں بھیجونگی جو تمہیں نہ صرف اچھے اچھے کھلونے دیگی بلکہ تم کو مجھ سے زیادہ پیار اور محبت سے رکھے گی۔"

"نہیں ماں —— ! میں بھی چلونگی —— !! مجھے نئی ماں نہیں چاہئے۔"

"پگلی —— !" شیاما نے جواب دیتے ہوئے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

شیام لال بابو میں اس سے زیادہ سننے کی تاب و طاقت نہ تھی اس لئے منی کو گود میں لیتے ہوئے بولے:۔

"ہاں بیٹی —— منی ماں کو ہرگز نہ جانے دینا"

زود و ناچار ہی شیاما کی شمع حیات کو بادِ مخالف کے تند جھونکوں نے گُل کر دیا۔ مگر شیاما دیوی نے آخر وقت تک شیام لال بابو کو منی کے واسطے نئی ماں لانے کی تاکید کرتے ہوئے پیغامِ اجل کو لبیک کہا تھا۔

شیام لال اپنی ازدواجی زندگی خوبصورت اور نیک سیرت شریک حیات کی موجودگی میں لاانتہا مسرتوں کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ دن بھر کالج میں لڑکوں کو درس دیتے شام کو مکان واپس آتے تو شیاما عصمت و عفت کی دیوی مسکراتے ہوئے لبوں سے اُن کا خیر مقدم کرتی۔

مگر اب شیام لال بابو کی دنیا برباد ہو چکی تھی۔

منی بار بار شیام بابو سے کہتی:۔

"بابو جی ! ماں کہاں ہے —— وہ کہاں چلی گئی ہے؟ کیوں نہیں آتی —— بلا دیجئے۔"

شیام لال کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں طاقتِ گویائی سلب ہو جاتی اور وہ ایک سرد و طویل سانس لیکر خاموش ہو جاتے۔

منی شیام بابو کی خاموشی کے معنی نہ سمجھ کر پھر کہتی —— بار بار کہتی۔

"بابو ! بولتے نہیں —— وہ نئی ماں کو لینے گئی ہیں —— آپ خود جا کر کیوں نہیں لے آتے۔"

شیام لال کا دوسری شادی کرنے کا ارادہ قطعی نہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بچہ کی موجودگی میں دوسری شادی مسرت و شادمانی کا نہیں بلکہ ایک ایسے عذاب کا پیغام ہوگی جو اس سکون کو بھی برباد کر دیگی جو کسی قدر اسوقت حاصل ہے

لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انکے گرد و پیش کی دنیا شادی شادی پکار رہی تھی۔ احباب و اقربا نہ صرف شادی کی رائے دیتے تھے بلکہ اصرار بھی کرتے تھے منی دن میں سو سو بار نئی ماں کا تقاضہ کرتی تھی۔ ضعیف خادمہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ سب کو کہا سمجھا کر ٹال دینا اور خاموش کر دینا آسان تھا مگر ضعیف ملازمہ اور منی کو خاموش کرنا ایک امر ناممکن تھا۔

"کیوں بابو ! مجھ ضعیفہ کی ایک نہ سنو گے —— تم کو مجھ ناتواں پر بھی رحم نہیں آتا

—— تم تو کاہے چلے جاتے ہو —— میں کہاں جاؤں —— مالکن کے بغیر مکان پروحشت برس رہی ہے —— منی بغیر ماں کے ایسی بچین ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا —— کسی پہ تو رحم کرو —— کرلو بیٹا —— کرلو —— تھوڑی سی عمر اور باقی ہے —— ایسے کیوں دُکھی بناتے ہو —— مالکن بھی کہہ گئی تھیں ... ."

بالآخر شیام لال کو شادی کرنے ہی بنی۔ نئی شریکِ حیات نہایت خوبصورت چست چالاک اور دولت مند والدین کی گودوں کی پروردہ یافتہ اکلوتی لڑکی تھی نازونعم نے حکومت کرنا سکھایا تھا اور اب تو وہ خود ہی یہاں کی رانی تھی۔ حکومت کیوں نہ کرتی۔ ہر وقت بیٹھے اُٹھتے ضعیفہ کو بُرا بھلا کہتی اور اگر کسی وقت قدیمی خادمہ جواب دیدیتی تو تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ شیام بابو سے اگر شکایت کرنے کا ارادہ کرتی تو وہ پہلے ہی سے کہہ اُٹھتے کہ "بائی کو دُکھ نہ ہو —— اس نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرکے میرے گھر کی خدمت کی ہے"۔ مگر اسکا جواب ہے۔

خدمت کی ہے تو کیا مفت کی ہے —— ایسا ہی ہے تو اسکی سیوا آپ کریے۔ مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا"۔

ایک دن شیام بابو کھانا کھانے بیٹھ رہے تھے ویسے ہی انھوں نے دریافت کیا —— "بائی نے کھانا کھالیا؟"

"آپ تو کھا لیجئے —— کیا وہ بغیر کھائے مرجائیگی —— عمر خضر لیکر آئی ہے —— ایسے میرے نصیب کہاں کہ میں اس سے چھٹکارا پا سکوں ——"

شیام لال بغیر کھانا کھائے ہوئے باہر چلے گئے۔

ضعیف خادمہ سب کچھ دیکھ اور سُن رہی تھی۔ شیام بابو کو سمجھانے لگی:۔

میرے لئے کیوں اسقدر دکھی ہوتے ہو —— میں آج خود ہی جا رہی ہوں —— روزانہ آکر تم سب کو ایک نظر دیکھ جایا کرونگی —— اندر نہ سہی باہر ہی سے سہی —— یہی میرے لئے بہت ہے —— چلو کھانا کھالو ——"

ضعیفہ کے چلے جانے کے بعد شانتا دیوی کو قدرے اطمینان و سکون حاصل ہوا مگر ابھی اسکی راہ گوہر کا صرف ایک پتھر دور ہوا تھا۔ ابھی معصوم منی ایک سخت چٹان کی طرح اسکی راہ میں کھڑی ہوئی تھی جسکی فکر نے شب و روز کے سکون کو اس پر حرام کر رکھا تھا۔

ایک دن شانتا نے منی سے کہا:۔

"چھوری ذرا پانی تو لا دے"۔

منی پڑھ رہی تھی اس لئے خاموش رہی کیونکہ کل اسی قسم کے کاموں میں اسکا سبق یاد نہ ہوا تھا جسکی وجہ سے بابو ناراض ہوگئے تھے۔

شانتا دیوی میں اتنی صبر و تحمل کی طاقت کہاں تھی۔ بیتاب ہوکر بید لیکر کھڑی ہوگئی —— "تو کیوں سنے گی —— تو تو میری مالکن ہے۔ کھانے کو ڈھائی سیر کھاتی ہے اور کام کے نام سے دم چراتی ہے —— چل اٹھ —— پڑھ کر بڑا نہال کرے گی ...."

ساتھ ہی ساتھ دو چار بید بھی مار دیئے۔

ضعیفہ نے باہر سے منی کی گریہ و بکا کی آواز سُنی تو دوڑی ہوئی آئی اور منی کو بچا کر اسکے گوہرِ اشک اپنے دامن میں پوشیدہ کرنے لگی۔ اتفاق سے شیام بابو بھی آگئے۔ جنکو دیکھتے ہی شانتا دیوی نے اپنا شکوہ بیجا بشکل فغاں شروع کردیا۔

"کیا مجھ پر جو کیداری مقرر کی ہے —— کل آپ منی پر سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے ناراض ہو رہے تھے —— اس لئے میں آج پڑھنے کے لئے کہہ رہی تھی کہ یہ کمبخت آگئی "

کچھ تو وجہ بھی مناسب تھی اور کچھ عرصے کی رفاقت کا اثر شیام بابو پر کام کرچکا تھا اس لئے ضعیفہ پر سخت ناراض ہوئے اور گھر سے باہر نکالدیا۔

غریب منی کو زندگی اب اور بھی بارِ دوش ہوگئی۔ —— شانتا دیوی کا جادو آہستہ آہستہ شیام بابو پر اثر جما چکا تھا۔ جسکی وجہ سے وہ بھی اب منی کی طرف بہت کم راغب تھے۔ —— مگر دکھی ضرور تھے —— شانتا دیوی کو بظاہر اب مکمل مسرت و شادمانی حاصل تھی مگر گود خالی ہونے کی وجہ سے وہ بھی دکھی تھی۔

منی کے بخار نے کچھ عرصے ہی میں سب کو منی کی زندگی سے ناامید کردیا۔ شانتا دیوی کو تو کوئی فکر نہ تھی مگر شیام بابو بہت حیران و پریشان تھے۔ وہ ایس لالاکر سیکڑوں شیشیوں سے طاق بھر دیئے تھے مگر شانتا دیوی کی لاپرواہی کسی دوا کو فائدہ نہ ہونے دیتی تھی جسکی وجہ سے منی کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی۔ منی پر بخار کی شدت نے نیم بیہوشی طاری کر رکھی تھی۔ شیام لال ڈاکٹر کو بلانے گئے ہوئے تھے کہ منی نے اس نیم بیہوشی

کے عالم میں پانی مانگا۔ شانتا نے اٹھ کر بادلِ ناخواستہ پانی کا گلاس آگے بڑھا دیا۔ جس کو منی نے لے تو لیا مگر نہ جانے کیوں ہنسنے لگی اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پھیلا کر بولی:-

"ماں ـــــ ! ماں ـــــ میں ابھی آتی ہوں ـــــ تم بہت دن بعد آئیں ـــــ تم تو یہ کہہ کر گئی تھیں کہ میں تمہارے لئے نئی ماں بھیجونگی ـــــ جو تمھیں اچھے اچھے کھلونے دیگی ـــــ اور تم کو محبت اور پیار سے رکھے گی ـــــ لیکن کچھ نہ کیا ـــــ نہ خود آئیں ـــــ نہ ماں کو بھیجا ـــــ اب کب آؤ گی ـــــ نئی ماں کو کب بھیجو گی ـــــ ؟"

ان لفظوں نے شانتا دیوی کے دل میں طوفان برپا کر دیا اور اسکے دھڑکتے ہوئے دل نے مضطرب و بیقرار ہو کر منی کو سینے سے لگا لیا۔

"بیٹی میں آگئی ! ـــــ منی بولی !! ـــــ میں آگئی ـــ"

"ماں ! ـــــ اب تو کبھی اتنی دُور نہ جاؤ گی ـــــ بولو ماں بولو ـــــ"

"نہیں بیٹا ـــــ ! کبھی نہیں ـــــ"

اسی لمحہ شیام بابو کمرے میں داخل ہوئے اور اس منظر کو دیکھ کر اُن کو اپنی آنکھوں پر اطمینان نہ آیا اور وہ نہیں سمجھ سکے کہ شانتا منی کو اپنے سینے سے کس طرح اور کیوں لگائے ہوئے ہے۔

بشیر احمد قریشی گوالیاری

ـــــ • ـــ • ـــ • ـــ (❊) ـــ • ـــ • ـــ • ـــــ

کس کے کہنے سے؟

چلتے چلتے رُک گیا دورِ ساغر کس کے کہنے سے؟
ہوتے ہوتے ہو گیا جینا دوبھر کس کے کہنے سے؟

روتے روتے ہنس پڑتی ہوں کس کی پیاری باتوں پر؟
ہنستے ہنستے رو پڑتی ہوں اکثر کس کے کہنے سے؟

ایک مسلسل بے کیفی ہے، ایک مسلسل بے رنگی
تھم سا گیا یہ شام و سحر کا چکر کس کے کہنے سے؟

کس کے اشارے سے یہ صبحیں راتوں میں تبدیل ہوئیں؟
صبح جوانی بن گئی شامِ محشر کس کے کہنے سے؟

آنکھیں چھلکی چھلکی، بھیگی بھیگی کس کی خاطر ہیں؟
زُلفیں اُلجھی اُلجھی، ابتر ابتر کس کے کہنے سے؟

نظریں جھک جھک جاتی ہیں یہ کس کا اشارہ پا پا کر؟
آہیں رُک رُک جاتی ہیں ہونٹوں پر کس کے کہنے سے؟

توڑ سکو گے تم ہی بندھن، مجبوری لاچاری کے
میں نے کاٹے بد رسمی کے چکر کس کے کہنے سے؟

وجد کناں کونین کا ذرہ ذرہ کس کے نغموں پر؟
رقص میں ہیں یہ انجم و مہر و اختر کس کے کہنے سے؟

آٹھ پہر کی بیتابی ہے، آٹھ پہر کا رونا ہے
نجمہ کا یہ حال ہوا، او کافر کس کے کہنے سے؟

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم اے بی ٹی

میری شاعری

مرا نقشِ شعر و ادب غیر فانی — تحیّر میں ہے عقلِ بہزاد و مانی
حسیں کو حسیں تر بنایا ہے میں نے — مرا نطق ہے چشمۂ زندگانی
مرے ہاتھ میں ہے زمانے کی فطرت — میں چاہوں تو پتھر کو دیدوں روانی
مرے دم قدم سے بہارِ چمن ہے — کلی کا لڑکپن گلوں کی جوانی
رگِ گل میں شبنم کے موتی پرو کر — دکھاتا ہوں نیرنگِ حسن و جوانی
مری شاعری حسن والوں کی دنیا

اُنھیں یاد کر کر کے آنسو بہانا — نہ باتیں کسی سے نہ ہنسنا ہنسانا
تصور کی دنیا میں کھوئی ہوئی سے — کسی کے مکاں پر نہ آنا نہ جانا
نظر در پہ اور کان آہٹ پہ ہر دم — جو دھڑکا ادھر دل اُدھر چونک جانا
جو اُٹھے تو تھامے ہوئے دل کو اُٹھے — جو بیٹھے تو اُٹھنے کا ڈھونڈا بہانا
نہ آنکھوں میں دم اور نہ چہرے پہ رونق — ہوں سر تا قدم اک مکمل فسانا
مری شاعری درد والوں کی دنیا

کسی طرح فرقت میں راحت نہ پائیں — شبِ ہجر رو رو کے دریا بہائیں
امیدوں کا دیکے دل کو سہارا — غم و دردِ الفت کا خوگر بنائیں
کبھی سرد آہیں کبھی گرم نالے — کبھی کر رہے ہیں خدا سے دعائیں
کہاں چین اور نیند پھر کس کو آئے — اگر چٹکیاں دل میں لینے وہ آئیں
محبت میں کوئی نہ مونس نہ ہمدم — ہیں بیکار ٹوٹے دلوں کی صدائیں
مری شاعری شب کے نالوں کی دنیا

مرا دین و مذہب ہے صہبا پرستی — وہ صہبا ہے جس میں محبت کی مستی
شب و روز غرقِ مئے ارغوانی — نہ فکرِ بلندی نہ احساسِ پستی
ادھر پی اُدھر جام کو توڑ ڈالا — مری میکدے کی نرالی ہے بستی
نہ ڈھونی صراحی نہ ساغر کھنگالا — مرا کام پینا، ہو جنگل کہ بستی
مری نغمہ خوانی سے بیخود دو عالم — مرا شعر خیامؔ و حافظؔ کی مستی
مری شاعری مے کے پیالوں[1] کی دنیا

ہر انداز ہوگا مرا والہانہ — نگاہیں چُراتا پھریگا زمانہ
سکھا دونگا ہر نوجوانِ وطن کو — بغاوت با ندازۂ شاعرانہ
نہ لاؤ مرے سامنے نقشِ ماضی — سناؤ نہ عہدِ کہن کا فسانہ
میں شاعر ہوں اقوامِ عالم کا رہبر — ہر اقدام میرا ہے پیغمبرانہ
سمو دونگا روحِ عمل شاعری میں — بنا دونگا اک دن اسے باغیانہ
رہیگی یہ کب تک خیالوں کی دنیا

خیامؔ ہندی

[1] صاحبِ عروض معاف فرمائیں۔

مسئلۂ تقدیر اور مشاہیر عالم

"کسی شئے کا غیر مرئی ہونا اس کے عدم وجود پر دلالت نہیں کرتا۔"

(ہنری فورڈ)

"ہماری تدبیر منزل رشتۂ تقدیر سے منسلک ہے ہمارے مقاصد کے انجام کا انحصار کسی پوشیدہ قوت پر ہے۔"

(شیکسپیر)

دورِ حاضر کا متموّل ترین انسان ہنری فورڈ جس کا قابلِ رشک دنیوی اعزاز اس کی ذاتی صلاحیت اور جد وجہد کا رہینِ منت ہے کہتا ہے:-

"علائقِ حیات کی ہر کڑی مغیبات فطرت سے وابستہ ہے ہم اپنے نتائج کے حصول پر قادر نہیں مستقبل کے حالات پر تبصرہ کرنا الگ چیز ہے۔ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہم ان حالات کے استحقاق یا اندفاع کی قدرت نہیں رکھتے۔ ہمارے نظامِ حیات کے تدوین کرنے میں اُن غیر مرئی قدور کو دخل ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہیں۔"

(G. S. Vierck's Glimpse of the great)

آئنسٹن کہتا ہے:-

"ہر شخصیت کی تعمیر میں میری ذاتی جد وجہد کو دخل نہیں یہ سب کچھ کسی دوسری ہی طاقت کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ میری شخصیت کی تعمیر زندگی کے گوناگوں واقعات کی مرہون ہے۔"

(Ibid)

مسٹر ونسٹن چرچل جنھیں دورِ حاضر کا سب سے بڑا مدبر سمجھا جاتا ہے اور جن کی زندگی ہر اعتبار سے کامیاب کہے جانے کی مستحق ہے اپنی کتاب Thoughts and Adventures میں لکھتے ہیں:-

"ہماری عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ یقین بھی پختہ ہوتا جاتا ہے کہ ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں کا انحصار اتفاق (Chance) پر ہے۔ میرے نزدیک Destiny, Luck, Fortune, Chance, Fact یا Providence ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔

اختیار انسانیہ کی عناں کسی مافوق الفطرت قوت کے ہاتھ میں ہے جو ہماری نگاہوں سے پنہاں ہے۔ ہر شخص اپنی گزشتہ زندگی پر تفصیلی نظر ڈالنے سے محسوس کر سکتا ہے کہ روزمرہ کے معمولی معمولی واقعات ایسے واقعات جن سے بظاہر ہماری زندگی متاثر نہیں ہو سکتی، ہمارے مستقبل پر پوری طرح اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور قسمت یا تقدیر انھیں واقعات کی ایک کڑی ہے۔ میدانِ جنگ کی تصویر نگاہوں کے سامنے لانے سے (Chance) اتفاق کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے ایک سپاہی خیمہ سے نکلتا ہے۔ سَو قدم چلنے کے بعد اُسے یاد آتا ہے کہ وہ اپنی ماچس بھول آیا ہے۔ وہ ماچس لینے کے لئے واپس جاتا ہے۔ اس کے واپس ہوتے ہی۔ اس مقام پر جہاں سے وہ لوٹا تھا بم پھٹتا ہے۔ اُس کا ساتھی جو وہیں اس کا انتظار کر رہا ہے ہلاک ہو جاتا ہے اور یہ بچ جاتا ہے۔ اس شخص کا بچ جانا Chance کی کرشمہ سازی نہیں۔ میدانِ جنگ میں اس قسم کے سیکڑوں واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور حقیقت شناس نظریں ہر قدم پر اس قوت کا احساس کر سکتی ہیں جس کو تقدیر کہتے ہیں۔"

Leaders اپنی کتاب Rethemau of Europe میں لکھتا ہے:-

"میں اُن قوتوں کے بس میں ہوں جن کے اختیار میں میری جان ہے۔ وہی قوتیں میری تقدیر کا فیصلہ کرتی ہیں۔ وہ فیصلہ خواہ میرے حق میں اچھا ہو یا بُرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے قصد و ارادہ سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

ایک مفکر کا قول ہے:-

"روزمرہ کے مشاہدات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے تمام اعمال اسباب و علل کی کڑیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے

کہ ہماری جد و جہد کا نتیجہ یکساں نہیں ہوتا۔ ہمارا وہی طریق کار جو کبھی خوشگوار نتائج کا حامل تھا بعض اوقات بدتلخ نتائج پیدا کرتا ہے۔ ہم اپنے ہر کام میں مدرکات اور عاقبت اندیشی سے مدد لیتے ہیں لیکن عزم و احتیاط کے باوجود نتائج ہماری خواہش کے خلاف مترتب ہوتے ہیں۔"

انہیں تاثرات کے زیر اثر Robert Burns نے کہا تھا

The best laid scheme o'
mice and men
Gang aft aglay

جب ہم کسی واقعہ کے اسباب کا پتہ لگانے سے قاصر ہوتے ہیں اور باوجود ہمہ عقل و دانش یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ ایسا کیوں ہوا تو ہمیں مجبوراً کہنا اور ماننا پڑتا ہے کہ ایسا اتفاق یا chance سے ہوا۔

مسئلہ تقدیر میں مشرق اور مغرب متحد نظر آتے ہیں۔ مشرق نے اگر

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"

کہکر ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو مغرب نے ان الفاظ میں اعترافِ شکست کیا ہے:۔

man proposes God disposes

البتہ دورِ حاضر کے بعض مفکرین Freud, Dr. Schrenck Notzing, and Einsteins. کے فلسفیانہ مزعومات کی رو میں بہہ رہے ہیں وہ واقعات chance کی علت نمائی کی ٹٹول میں منہمک ہیں۔ اسی سلسلہ میں Einsteins کا نظریہ سب سے الگ ہے وہ کہتا ہے کہ بعض خفیہ غدود جن کے ذریعہ قدرت نتائج تیار کرتی ہے۔ اسبابِ علل کے خالق ہوتے ہیں۔ اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان غدودوں کو کس نے بنایا۔

مغرب کے ایک معروف اہل قلم Mr. Emile Ludwig نے روس کے ڈکٹیٹر اسٹالن سے جو مسٹر Gunther کی تصنیف In side Europe کی رو سے دورِ حاضر کا سب سے بڑا انسان ہے سوال کیا کہ کیا وہ تقدیر کا قائل ہے۔ اسٹالن نے نفی میں جواب دیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ انقلاب روس کے وقت جب وہ بے شمار خطرات میں گھرا ہوا تھا اُسے جس قوت نے اس مصیبت سے نجات دلائی کیا اسے وہ تقدیر نہ کہے گا تو اسٹالن نے جواب دیا کہ نہیں

تقدیر کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کی رہائی میں اُسکی تدبیر کا ہاتھ تھا۔

نپولین بوناپارٹ جیسے اولوالعزم انسان نے بار بار اعتراف کیا:۔

"جو کچھ لکھ دیا گیا ہے پورا ہو کر رہیگا۔ ہماری زندگی کے دن گنے چنے ہیں۔"

ہندو مفکرین نے مسئلہ تقدیر کو عجیب انداز سے سُلجھانے کی کوشش کی ہے وہ کہتے ہیں کہ "تقدیر نام ہے ہمارے گذشتہ اعمال کے نتائج کا۔ اگر ہم نے پہلی زندگی میں اچھے کرم کئے ہیں تو اس زندگی میں سکھ اُٹھائیں گے ورنہ دُکھ بھوگیں گے۔"

تقسیم روزِ ازل کے خلاف کسی رند نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا تھا:۔

نیاو نہ کین کین ٹھکرائی
انصاف کیا غیر منصفی

بن کیئے لکھ دین بُرائی
بغیر کئے ہوئے

یعنی مخلوق کے اعمال کا انفرادی حیثیت سے امتحان کئے بغیر قسامِ ازل نے کسی کو شاہ کسی کو گدا، کسی کو جنتی اور کسی کو دوزخی کیوں قرار دیدیا۔

اسی قبیل کے ایک اعتراض کے جواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا:۔

"کسی مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں اینٹیں تیار کی گئیں۔ پزاوے سے نکال کر اُن اینٹوں کی مسجد کی جائے تعمیر پر لایا گیا۔ معمار ایک ایک کرکے اُنھیں اُٹھاتا ہے اور جہاں چاہتا ہے چُن دیتا ہے۔ کوئی اینٹ محراب منبر اور پیش نماز کے سجدہ کی جگہ پر چُنی گئی اور کسی کا نمبر پاخانہ میں چُنے جانے کا آیا۔ ظاہر ہے کہ معمار کو کسی اینٹ سے پرخاش نہ تھی۔ اس کے لئے سب یکساں تھیں۔ اُس نے بالکل غیر ارادی طور پر اینٹوں کو جہاں چاہا چُن دیا۔ اب اگر وہ اینٹ جسے پاخانہ میں چُنا گیا ہے صدائے احتجاج بلند کرے تو کوئی معمار کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا ۔ ـــ تقسیم روزِ ازل کو بھی اسی اصول پر قیاس کر لینا چاہئے۔"

بہار کوٹی

صریرِ سریر

کب مرغِ سحر کے نغموں سے ساقی کا صلائے عام نہیں
ہو جائے جو سنکر مستِ طرب ایسا کوئی مے آشام نہیں

کیونکر یہ کہوں میں اے ساقی میخانے میں دورِ عام نہیں
اک مجھ پہ نگاہِ لطف نہیں اک میں ہی شریکِ جام نہیں

دنیائے محبت کا عالم عالم سے جدا ہے کیا کہئے
وہ شام ہے جسکی صبح نہیں وہ صبح ہے جسکی شام نہیں

ہر کام سے پہلے فطرت نے بخشی ہے مآل اندیشی بھی
کچھ دیدۂ بینا کے آگے آغاز سے دور انجام نہیں

انساں کی سعیٔ پیہم جب مختار بھی ہے مجبور بھی ہے
تقدیر کو کیوں بدنام کروں تقدیر پہ کچھ الزام نہیں

اے دورِ فلک مجھ پر اثرِ طومارِ حوادث کیا ہوگا
خمیازہ کشِ آرام ہوں میں آشفتۂ سرِ آلام نہیں

دزدیدہ نظر نے تیری اُدھر کیا جانے جگائے کیا جادو
دیکھا جو پلٹ کر میں نے ادھر پہلو میں دل ناکام نہیں

ہستی و عدم کی منزل کیا ہیں دونوں حدیں ملتی جلتی
کچھ دور نہیں کچھ فصل نہیں اک گام نہیں دو گام نہیں

ملتے ہی نظر چار آنکھوں میں ہو جاتی ہیں چپکے دو باتیں
مشتاق دلوں کی خاموشی کب سلسلۂ پیغام نہیں

کب سے ہے رہیگی اور کہاں تک دل میں آشفتگی دنیا
یہ ایسی کہانی ہے جس کا آغاز نہیں انجام نہیں

مانگوں بھی تو میں کیا کیا مانگوں دنیا مانگوں عقبیٰ مانگوں
کیوں تجھکو کبھی سے مانگ نہ لوں مجھکو تو کسی سے کام نہیں

ہے جوشِ سریر اک گرم نوا اقبال کا لیکن کیا کہنا
بات اتنی ہے اسکا ہر نالہ الہام ہے وہ الہام نہیں

سریر کابری گیاوی مینائی

کیفیات

یہ کس سے محبت ہوئی جا رہی ہے
کہ غم آ رہا ہے خوشی جا رہی ہے

اسے نشترِ غم کہوں یا محبت
کوئی چیز دل میں چبھی جا رہی ہے

کئے جا رہے ہیں محبت کی باتیں
خلش دردِ دل کی بڑھی جا رہی ہے

یقیں اُن کے آنے کا ہے دل کو لیکن
طبیعت پریشاں ہوئی جا رہی ہے

یہ دزدیدہ نظریں، یہ دزدیدہ نظریں!
محبت کی دنیا لٹی جا رہی ہے

دہائی تمہارے ستم کی دہائی
محبت اجیرن ہوئی جا رہی ہے

تغافل کے مغرور ہاتھوں میں یاور
محبت اذیت بنی جا رہی ہے

یاور بخاری

بے خبر

"کون ہو تم ——— ؟"
"چور ——— !"
"ایں چور ——— ؟ وہ کانپنے لگی"
"تم مجھ سے اسقدر کیوں گھبرا رہی ہو ——— میں کوئی خاندانی یا پیشہ ور نہیں ہوں"
کیا ..... کیا ..... چاہتے ..... ہو تم ؟
دھن یا دولت نہیں ——— صرف آٹا ——— اس پاپی پیٹ کے لئے مجھے صرف ایک مٹھی آٹے کی ضرورت ہے"
تم اسقدر نہ گھبراؤ۔
مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔
میں کوئی بھوت ——— یا جن تو ہوں نہیں ——— نہ کوئی پیشہ ور چور صرف اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے ایک مٹھی آٹا لیکر چلا جاؤں گا !
"کیا تم محنت مزدوری نہیں کر سکتے ؟"
کر سکتا ہوں مگر ایک مدت سے بیکار ہوں"
"اچھا اب میں جاؤنگا۔ مجھے ایک مٹھی ——— آٹا ——— دیدو"!
"تو اپنے صافے کے پلو میں باندھ لو"!
"یہ سامنے چمکدار چیز کیا ہے ؟"
"ہیرا ہے"!
"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں"!
"نہیں میں اپنے ہاتھ میں لیکر دکھا دونگی"!
"دیکھو کتنا چمکدار ہے"!
ایں۔ یہ تو میرا ہے۔ اس پر تو میرا نام کھدا ہوا ہے۔ یہ میرا ہیرا ہے۔ میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ میرا ہے جس کے لئے بڑی محنت و جانفشانی سے اپنے تمام جسم کا پسینہ نچوڑ نچوڑ کر خریدا تھا۔ مجھے دیدو ——— میرا ہیرا مجھے دیدو"
چھوڑ دے مجھے چھوڑ دے ——— میں ابھی چلاتی ہوں ——— چور کہیں کا دوسروں کے مال پر بے ایمانی سے قبضہ کرنا چاہتا ہے"!
"نہیں چھوڑوں گا"
اچھا ——— سنو سنو ——— میں یہ ہیرا تم کو خوشی سے دے سکتی ہوں مگر ایک ......
"مگر ایک کیا ——— ؟"
"ایک شرط پر ——— !"
وہ کیا شرط ہے ——— ؟
تم مجھ سے ...... میں اچھی طرح سمجھ گیا ——— !"
میں تم پر اپنی تمام خوشیاں قربان کر سکتی ہوں"
اُس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اور اپنے آپ کو اسکے حوالے کر دیا ——— !
"نہیں میں ایسا ہرگز نہیں کرونگا ———" "کیوں ؟ کیا پریم ——— پاپ ہے ——— ایک بارگی اُس نے چونک کر اپنا سر اٹھایا ——— ساز پر مضراب تک چکی تھی ——— چھن چھن ——— دیکھو اس میں سے بھی پریم کا سوتا بہہ رہا ہے ——— وہ جھوم گئی تم نے سنسار میں شاید کبھی کسی سے پریم نہیں کیا ——— وہ دیکھو باہر جھانک کر ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ ——— تارے ——— ایک دوسرے سے پریم کر رہے ہیں ——— اگر پریم پاپ ہوتا تو ——— شنکر اور پاروتی کیوں کرتے ——— دیکھو اس بوتل میں ——— پانی ——— اس پانی میں بھی محبت کی بو آ رہی ہے ——— یہ شراب نہیں ہے ——— غم غلط کرنے والا ——— امرت ہے ———" اس میں .... اُسکی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی ہے ——— تم ڈرتے ہو ——— اتنی دیر تک تو میں تم سے خائف رہی مگر اب تم مجھ سے شرما رہے ہو ——— دیکھو ——— اس نے ایک گلاس میں اونڈیلتے ہوئے کہا ——— "اس سے بڑھکر دنیا کی کوئی خوشی ——— خوشی نہیں ہے ——— اس کے ایک ہی جام میں سرور و کیف کی دنیا پوشیدہ ہے ——— لو چڑھا جاؤ ——— "نہیں ——— ! میں تو ایسی شراب کا طالب ہوں کہ جس کا نشہ تمام عمر نہ اترے ——— اس شراب کا انجام سوائے کسل و خمار

اور کچھ نہ ہوگا ——" وہ ایکبارگی جھوم کر دیوار کے سہارے کھڑی ہوگئی۔

"جسکا خمار تا زندگی نہ جائے —— ایسی شراب طوائف کے یہاں ملنا محال ہے —— لو یہ ہیرا —— میں نے تم سے وعدہ کیا تھا —— یہ محبت کی پیشکش ——"

یکبارگی اُس نے باہر جھانک کر دیکھا —— ظلمت اور روشنی کا تصادم ہو رہا ہے —— مگر دونوں میں ارتباط نہیں —— مرے قریب آجاؤ —— بالکل قریب —— اتنے قریب جیسے روشنی کے ساتھ سایہ —— جسکا نشہ دائمی ہو —— وہ شراب عورت کی ان دو کٹوریوں میں —— ان مست آنکھوں سے چھلکا کرتی ہے —— اُس نے اپنے کالے کالے ناگن جیسے بالوں کو بکھیر لیا —— دیکھو یہ بال —— عورت کی یہ زلفِ پریشاں —— ان لہراتے ہوئے بالوں میں نشہ ابدی ہے —— اس پر سکتہ طاری ہوگیا —— اُسکی آنکھیں سُرخ ہوگئیں —— جذبات بھڑک اُٹھے —— کیا سوچ رہے ہو —— ؟ آؤ —— مرے قریب آجاؤ —— اُس نے اپنا جسم اُس کے حوالے کردیا —— اور اپنا سر اسکے قوی اور مضبوط کندھوں پر رکھدیا —— وہ بالکل خاموش تھا ——

"کہو ایک بار کہ میں تم سے پریم کرتا ہوں ؟ —— وہ بے حس و حرکت مُردے کی طرح ہوگئی —— نہیں" —— وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگی ——

"تمھیں مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے ؟"

"اِس لئے کہ تم طوائف ہو —— !" وہ پہلی بار ایک شخص کے منہ سے طوائف کا لفظ سُن رہی تھی۔ نہ جانے کتنی ہی راتیں تم نے میری طرح دوسروں کی آغوش میں گذاری ہونگی —— وہ ٹہل رہا تھا —— اُس نے باہر جھانک کر دیکھا ہر طرف خموشی و تاریکی پھیلی ہوئی تھی —— طوائف کے پریم کا اعتبار ہی کیا —— تم کو تو چند چاندی کے ٹکڑوں سے محبت ہونا چاہئے —— ! وہ دیوار کے سہارے کھڑا ہوگیا ——

"میں طوائف ضرور ہوں —— مگر پیشہ ور —— یا خاندانی نہیں —— جس طرح تم اپنی اغراض پوری کرنے کے لئے "چور" کی حیثیت سے ایک مٹھی آٹے کے لئے آئے ہو —— اسی طرح میں بھی طوائف کے روپ میں —— اپنے من کی آگ —— اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے تمہارے منہ سے ایکبار —— صرف ایکبار سننا چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے پریم کرتے ہو۔

اُس نے ایک انداز کافرانہ کے ساتھ گردن کی جنبش سے بکھرے ہوئے بالوں کو پیچھے کیا —— وہ بولا "مجھے بھی شک ہے کہ ایک طوائف محبت کے نذرانے میں ہیرا —— لاکھوں —— اور کروڑوں روپے کا ہیرا کیونکر دے سکتی ہے۔ وہ قریب اُس کے بالکل قریب آکر بیٹھ گیا —— اور اپنی انگلیوں سے اُس کے بالوں میں شانہ کرنے لگا —— شاید تمھیں مری محبت پر اب بھی شک ہے —— اُس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا —— "عورت کی آنکھوں میں شراب محبت ضرور ہوتی ہے مگر —— یہ بھویں یہ ابرو تلوار کا کام بھی کرجاتے ہیں —— !" "تم پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگے —— اُس نے نیم عریاں سینے پر اپنا ہاتھ رکھدیا —— دیکھو یہ دل —— پریم کا خاص مرکز یہی ہے"! وہ بے قابو ہوگیا —— اور اُس نے زور سے —— اپنے مضبوط اور قوی بازوؤں میں اُسے بھینچ لیا ——" اچھا اب جایئے —— اور کل اسی وقت —— بالکل اسی وقت آیئے گا ——

اُس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا —— ہر طرف سیاہی مسلط تھی ساون کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی —— بادل —— تاروں پر کبھی تاروں کے اردگرد چکر لگا رہے تھے —— کل آیئنگے نا آپ ؟ —— ضرور !" وہ جا رہا تھا —— کیچڑ اور پتھر کی چٹانوں سے بچا بچا تا —— وہ کھڑکی سے دیکھ رہی تھی —— کچھ دور تک تو وہ نظر آتا رہا —— مگر —— پھر رات کی سیاہی میں غائب ہوگیا —— ! اُس نے ہیرے پر نظر ڈالی۔ اب میرے پاس دو ہیرے ہوگئے —— میں اپنی بیوی کو لیجا کر دونگا وہ خوش ہوگی —— بے حد خوش ہوگی —— پرماتما کا شکر ہے کہ مجھے تین سال کی تنخواہ سے زیادہ سرمایہ چند ہی گھنٹوں میں مل گیا —— ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اپنی دھرم پتنی کو منہ دکھاتا —— وہ خوشی سے فرطِ مسرت سے ایکبارگی جھوم گیا ——

وہ مکان کی دوسری منزل پر پہنچا —— کسی خیال میں مست —— آج وہ بہت مسرور تھا —— فرنیچر —— تھانہ بریں سب سامان بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے —— سامنے ایک آئینہ —— اُسکی نظریں اتفاقی طور پر اس پر پڑیں۔ وہ چونک سا گیا —— آج اُس نے تین سال بعد اپنا منہ آئینے میں دیکھا تھا —— ڈاڑھی گرد و غبار سے اٹی ہوئی —— ایک مشت سے زیادہ لانبی —— اُف میں نے ابھی تک ڈاڑھی نہیں بنوائی

اسکے منہ سے بے ساختہ ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی ـــــ اُس نے اسٹرسے داڑھی اور مونچھوں کو صاف کیا ـــــ اب وہ پہلے کی طرح مغربی فیشن کا شاہکار نظر آرہا تھا ـــــ اُس نے اپنی ٹائی کو درست کیا ـــــ اب وہ مجھ سے بیحد خوش ہوگی ـــــ اُس نے دل ہی دل میں کہا ـــــ وہ جا رہا تھا عہدِ پیمان کے ایفا کے لئے ـــــ رنگین تخیلات کی رَو میں بہتا ہوا ـــــ چاند بادلوں کی آڑ میں روپوش تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پُرکیف ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے ـــــ تارے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے ـــــ آگئے آپ ـــــ ؟ کسی نے نرم و نازک آواز میں کہا ـــــ اُس نے کھڑکی میں سے جھانک کر اندر دیکھا ـــــ وہ جوانی اور محبت کے مدہوش کن نشے میں جھوم رہی تھی ـــــ وہ سہم گیا ـــــ میں نے تمہارے واسطے ایک گیت تیار کیا ہے ـــــ ہم دونوں شرابِ عشق کے نشے میں چور ہو کر حُسن و عشق کے سامعہ نواز تارِ رباب پر پریم کے میٹھے ترانے گائیں گے ـــــ فانوس روشن نہیں کیا ؟ "محبت کی روشنی ماہ و پروین سے بھی بڑھ کر ہے ـــــ ہمارے دو دلوں کا ـــــ انبساط ـــــ ہمارے محبت بھرے دلوں کا اُجالا۔ حسین چاند کی دلکش شعاعوں سے کہیں زیادہ ہے ـــــ وہ سہری پر بیٹھ گئی ـــــ اُس نے یکبارگی دیوانوں کی طرح قہقہہ لگایا اور کہا ـــــ "تم نے میری خود داری کو اپنے قدموں پر جھکا لیا ـــــ مگر سنسار کی تھوڑی سی دولت کی مصنوعی چمک نے تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ـــــ تم نے مغلوبانہ ضد یا جیون کی لغزش پر اپنا ایمان بگاڑ لیا" ـــــ وہ اس کو گھور رہا تھا ـــــ ناراض ہوگئے ـــــ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے ـــــ ساتھ ہی آسمان سے ایک ستارا ٹوٹ کر گرا اور ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی ـــــ واقعی یہ میرا ـــــ یہ محبت کی پیشکش ـــــ تمہارا ہی ہے ـــــ تمہارے پتی کا نام ـــــ ؟ سروپ ـــــ درحقیقت یہ تمہارا ہی ہے ـــــ میرا نام بھی سروپ ہے ـــــ معاف کرنا اسی لئے مجھ سے وہ لغزش ہوگئی ـــــ وہ ناز و ادا اور غمزوں سے چور تھی ـــــ اُس کے کالے کالے بال ناگنوں کی طرح دوش پر پریشان تھے ـــــ اُس نے اپنے سر کو جنبش دی ـــــ اور رقص کرنے لگی ـــــ جب وہ ناچتے ناچتے تھک گئی تو اس کے پہلو میں گر گئی ـــــ اسکے تنفس کی رفتار تیز ہوگئی ـــــ اسکی آنکھوں سے شراب چھلکنے لگی ـــــ تم اپنے پتی کو چھوڑ کر ایک نووارد شخص سے پریم کیوں کرنے لگیں ـــــ ؟

اُس نے بالوں کو انگلیوں کی گرفت میں لے لیا ـــــ اُس کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں ـــــ اُسکو فسانۂ ماضی" یاد آگیا ـــــ جو شوہر تین تین چار چار سال تک اپنی بیوی کو منہ نہ دکھائے۔ تو وہ کب تک برہ کی آگ میں جلے عورت روپے یا جواہرات کی بھوکی نہیں ہوتی ـــــ پریم کی بھوکی ہوتی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے موتی گرنے لگے ـــــ واقعی عورت دھن یا دولت کی بھوکی نہیں ہوتی۔ اس کو اپنے من کی آگ بجھانے کے لئے پریم جل کی ضرورت ہوتی ہے۔

اُس نے من ہی من میں کہا ـــــ میں جاؤنگا ـــــ اپنی استری کے پاس ضرور جاؤنگا ـــــ مجھے بھی اپنی استری سے بچھڑے ہوئے تین چار سال ہوگئے ـــــ اُس کے دل و دماغ میں پریم کا لفظ گونج رہا تھا ـــــ "عورت پریم کی بھوکی ہوتی ہے" ـــــ سچ ہے ـــــ سیاہ سیاہ بادلوں کے گگھٹے خوب گھر کر آرہے تھے ـــــ اُس نے باہر دیکھا ـــــ کوئل پی کہاں پی کہاں الاپ رہی تھی ـــــ تم سمجھے ـــــ یہ کوئل کیا کہہ رہی ہے ـــــ ؟ یہ کہہ رہی ہے ـــــ "پی کہاں" ـــــ یعنی پتی کہاں ہے ـــــ آؤ ـــــ من کی آگ بجھاؤ ـــــ ہوا کے تیز جھونکے دریائے محبت میں طوفان برپا کر رہے تھے ـــــ موجیں ٹکرا ٹکرا کر عجیب شور پیدا کر رہی تھیں۔ طوفانِ محبت میں ناخدائے دل کشتیٔ حسرت کو ہچکولے دیتا ہوا لیجا رہا تھا ـــــ بارش خوب زور سے ہونے لگی ـــــ بادل گرجا ـــــ بجلی چمکی اُس نے بجلی کی روشنی میں اُسے اچھی طرح پہچان لیا ـــــ وہ کون شخص تھا ـــــ کہاں رہتا تھا ـــــ یہ کچھ خبر نہیں ـــــ مگر وہ مرتعش سی ہوگئی ـــــ اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا ـــــ ہنسنے کا انجام ـــــ رونا ہے ـــــ اور قہقہے کا مآل ـــــ فغاں ـــــ سچ ہے ـــــ وہ لرزہ براندام ہوگئی ـــــ کانپنے لگی ـــــ وہ سامنے شاید میرے پتی دیو آرہے ہیں ـــــ جاؤ ـــــ جاؤ جلدی نکل ـــــ جاؤ ـــــ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاں اور وہ مجھے ہیرا دیتے جاؤ ـــــ محبت کا نذرانہ کہیں واپس دیا جاتا ہے ـــــ وہ بارش میں بھیگ رہا تھا ـــــ آندھی زور زور سے چل رہی تھی ـــــ وہ جا رہا تھا سردی میں ـــــ برف کی طرح ٹھنڈے پانی میں بھیگتا ہوا ـــــ اُس کے تمام کپڑے تر ابور ہو رہے تھے ـــــ وہ پتھروں سے ٹکراتا ہوا ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے ـــــ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا ـــــ وہ اپنے آپ مسکرائی ـــــ میں کامیاب ہوگئی۔

اب نہیں آئیگا ـــــ ہیرا ـــــ اُف میں نے اس سے وہ ہیرا کیوں نہیں لیا ـــــ اس کا ضمیر اس سے متنفر تھا وہ دل ہی دل میں غرانے لگی ـــــ اُس کے دل پر غم کے بادل چھا گئے ـــــ اُس نے شیشے سے شراب انڈیلی ـــــ اور ایک ہی سانس میں پی گئی ـــــ

شب کی تھکان سے اُس کے شانے ابھی تک بوجھل تھے ـــــ اور آنکھوں میں کسل دِخمار ـــــ میں نے اُس کے ساتھ کھیل کھیلا ـــــ ایک بے دردانہ کھیل ـــــ اس کی نمناک آنکھیں آسماں پر تھیں ـــــ جہاں غبار آلود چاند بادلوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے ساتھ کھیل رہا تھا ـــــ وہ دیکھ رہی تھی ـــــ اسکی نم آلود آنکھیں آسمان کی ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھیں ـــــ تارے ـــــ چاند ـــــ ابر ـــــ گویا سب کے سب اسکی موجودہ حالت پر ہنس رہے تھے ـــــ اُسکا دل مضطرب تھا ـــــ اور رگیں پھولی ہوئی ـــــ اس کا گلاب سا چہرہ مرجھا گیا تھا ـــــ اور جسم عرق آلود تھا ـــــ بے کیفی بڑھتی جا رہی تھی ـــــ اور دُنیا اُسکی نگاہوں میں اندھیر ہوتی جا رہی تھی ـــــ اُس نے "وائٹ ہارس" کی شیشی ساغر میں اُلٹ دی ـــــ ساغر منہ سے لگایا ـــــ اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے آسمان پر نگاہیں جمائے ہوئے ـــــ چڑھا گئی ـــــ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح کانپ رہی تھی ـــــ جیسے کوئی پرندہ ـــــ شکاری کے دام کے خوف سے پناہ کے لئے آشیانے کی تلاش میں سرگرداں ہو ـــــ وہ اپنا کھویا ہوا آشیانہ تلاش کر رہی تھی ـــــ اُس کے شہابی ہونٹ اور مرمریں باہیں ـــــ کانپنے لگے، وہ بستر پر لیٹ گئی ـــــ نیند کوسوں دور تھی ـــــ ماضی کے اندوہناک واقعات اور مستقبل کے خطرے اُس کے سامنے طوفان اندوہ آلود لہروں کی شکل میں موجیں مارنے لگے ـــــ وہ اس معمہ کو جتنا حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اتنی ہی پیچیدگیاں بڑھ رہی تھیں ـــــ وہ ایک عقدۂ لاینحل کا حل تلاش کرتے کرتے نیند کی آغوش میں گر پڑی ـــــ

اُس نے اپنے بھیگے کپڑے اُتارے ـــــ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ـــــ اگر اسکی پتی نے دیکھ لیا ہوتا تو درگت بنجاتی ـــــ اور عشق و محبت کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ـــــ اچھا ہوا کہ میں جلدی ہی نکل آیا ـــــ شب سائیں سائیں کرتی ہوئی تاریکی کو ـــــ روشنی میں بدلنے کے لئے اپنی منزل کو سرعت کے ساتھ طے کر رہی تھی ـــــ اُس نے آج بہت پی لی تھی ـــــ شراب محبت کے نشے میں وہ چور ہو رہا تھا ـــــ اس کے تمام جسم میں کانٹے سے چبھ رہے تھے ـــــ اُس کی آنکھیں بند تھیں مگر بستر پر کروٹیں لے رہا تھا ـــــ اسکا نازک بدن ـــــ بل کھاتی ہوئی مرمریں عریاں باہیں گداز جسم اور سڈول پنڈلیاں ـــــ یہ سب اسکے سامنے تصویر کی طرح گھوم رہی تھیں ـــــ ایکبارگی ـــــ اُسکے جسم میں گدگدی پیدا ہوئی ـــــ "عورت دھن ـــــ یا دولت کی بھوکی نہیں ہوتی ہے وہ صرف پریم کی بھوکی ہوتی ہے" ـــــ واقعی اُس نے سچ کہا تھا ـــــ اُسے اپنی شریکِ حیات کا خیال آگیا ـــــ اُسکا تمام جسم کپکپانے لگا ـــــ میں جاؤنگا اور کل ہی جاؤنگا اپنے وطن اپنے پیارے وطن کے ذروں کو بوسہ دونگا ـــــ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب وہ نہیں رُکے گا ـــــ یکایک وہ خوشی سے اُچھل پڑا ـــــ اس کی بیوی اس کے استقبال کے لئے آئیگی ـــــ وہ اس طویل مفارقت کے بعد ملکر بہت خوش ہوگی ـــــ صبح وہ جلدی بیدار ہو گیا ـــــ مگر تکان اور کسل و خمار اسکی آنکھوں میں ہنوز باقی تھا ـــــ صبح بہاراں رخصت ہو گئی ـــــ آفتاب اپنی دن بھر کی ڈیوٹی ختم کر کے کسی نامعلوم گوشے میں جا چھپا ـــــ رفتہ رفتہ ہر طرف اندھیرا مسلط ہو گیا ـــــ اُس نے "وائٹ ہارس" کی بوتل گلاس میں انڈیلی ـــــ اور ایک ہی سانس میں پی گیا ـــــ اُسکی آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں ـــــ اور کثرتِ مے نوشی کی وجہ سے سُرخ سُرخ ڈورے پڑ گئے تھے ـــــ اُس کے دل میں میٹھی میٹھی گدگدی پیدا ہوئی جو ارمانوں کی دُنیا میں آگ لگا رہی تھی ـــــ آہستہ آہستہ وہ ٹیس میں تبدیل ہو گئی ـــــ اُسکی آنکھوں میں رات کے واقعات گھوم رہے تھے ـــــ اسکے کانوں میں گھنگروؤں کی آواز آ رہی تھی ـــــ وہ جھومتا ہوا اُٹھا ـــــ اور طوائف کے مکان کی طرف چل دیا ـــــ آج اُس سے میری آخری ملاقات ہے ـــــ کل میں اپنی محبوبہ کے وطن کو خیر باد کہہ دونگا ـــــ وہ چلا جا رہا تھا ـــــ جھومتا ہوا ـــــ قریب پہونچا تو مکان کو خالی پایا اور بصد یاس و حرماں واپس لوٹ آیا۔ اُسکی امیدوں کا خون ہو چکا تھا ـــــ اُسکی حسرتیں پامال ہو گئی تھیں ـــــ اُسکی آرزوؤں کا

جنازہ نکل چکا تھا ـــــ دوسرے روز وہ چلاگیا ـــــ اپنے وطن ـــــ دونوں شمع اور پروانے کی طرح ذوق و شوق سے ملے ـــــ اُس کے لبوں پر بھیکی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی ـ ہیرا کہاں ہے ـــــ؟ دیکھو ایک ہیرا میں لایا ہوں ـــــ اب ہمارے پاس دو ہیرے ہو جائیں گے ـــــ" وہ ہیرا ...... وہ تو ......اسکی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی ـــــ" !

ایں ـــــ کیا گم ہوگیا ـــــ؟ یا چوری چلاگیا ـــــ؟ وہ کانپ رہی تھی ـــــ اس کے شہابی ہونٹ تھر تھرا رہے تھے ـــــ اسکی آنکھوں سے قریب تھے آنسو ٹپک رہے تھے ـــــ اُس نے بڑی مشکل سے کہا ـــــ ہاں ـــــ وہ چوری چلاگیا ـــــ ایک طوائف اپنے یہاں مہمان کے طور پر آئی تھی اُسکے بھولاپن اور سادگی دیکھکر مجھے اس پر رحم آگیا اور میں نے اسکو ایک رات اپنے مکان میں سُلالیا ـــــ دوسرے روز وہ چلی گئی ـــــ مگر ہائے میرا ہیرا ـــــ میرا سرمایۂ حیات ـــــ جب میں نے بکس کا جائزہ لیا تو وہ غائب تھا ـــــ وہ رونے لگی ـــــ مگر اُس کے آنسو مصنوعی موتیوں سے زیادہ نہ تھے ـــــ ماحول بے کیف اور غمگین تھا فضا سہمی ہوئی ـــــ ہر طرف خموشی اور سکوت کی حکمرانی تھی ـــــ

نہ روؤ ـــــ ہمارے پاس اُس کے عوض میں دوسرا ہیرا موجود ہے ـــــ پرماتما کی دیا سے ہم کو دوسرا ملگیا ـــــ اُس کے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ـــــ وہ ہیرے کو دیکھ کر مسکرانے لگی ـــــ اُس نے زور سے قہقہہ لگایا جو بے کیف فضا میں رقص کرتا ہوا مدہم پڑگیا ـــــ وہ سوچ رہی تھی کہ اُس نے ایک حسین فریب دیا ہے اور ایک دلچسپ ـــــ کھیل کھیلا ہے ـــــ وہ قہقہے لگا رہا تھا ـــــ! "اُسکی آنکھیں ـــــ "اُس" پر جمی ہوئی تھیں ـــــ اور کہہ رہی تھیں کہ "بے خبر" ہنسنے کا انجام رونا ـــــ اور ـــــ قہقہے کا انجام ـــــ فغاں ہے ـــــ

ہزاروں ہستیاں دردِ پردہ ایسے کھیل کھیل جاتی ہیں کہ دوسروں کو خبر تک نہیں ہوتی ـ

ہلال پریمی ازکوشی

ـــــ•×(•×•)•×•ـــــ

ہم

خاک ہونے پر ہوئے آزاد ہر مشکل سے ہم — اے دلِ برباد اب نزدیک ہیں منزل سے ہم
کرلئے اشکِ ندامت خونِ ناحق میں شریک — کیا گلہ کرتے بھلا ایسے منفعل قاتل سے ہم
امتیازِ آرزو بھی عشق میں تھا اک حجاب — اور آگے بڑھ گئے اس پردۂ حائل سے ہم
دید کے قابل ہے اب تو انتہائے بیخودی — کہتے ہیں افسانۂ دل خود ہی اپنے دل سے ہم
اک مصیبت ای دلِ وارفتہ تیرا ساتھ تھا — آستانِ یار تک پہنچے بڑی مشکل سے ہم
اللہ اللہ یہ خمارِ آلودِ نظر دل کا اثر — جھومتے اُٹھے ہیں ای ساقی تری محفل سے ہم
سامنے انکے لبِ اظہار بن جاتی ہے آنکھ — جب بہت مجبور ہو جاتے ہیں اپنے دل سے ہم
شوق بڑھتا ہی گیا طے مرحلے ہوتے رہے — جب نظر اُٹھی تو دیکھا دور ہیں منزل سے ہم
کیوں نہ کہئے اک طلسمِ رازِ بحرِ عشق کو — ڈوبتے ہی اے فضاؔ تھے آشنا ساحل سے ہم

فضا جالندھری

تضمین بطرزِ نو

(بر غزل علامہ سیماب اکبرآبادی)

وہی یورشِ شبِ تار ہے وہی بارشِ غمِ یار ہے　　وہی الجھنیں وہی حسرتیں وہی غم سے سینہ فگار ہے
وہی ہر نظر میں ہے شعلگی وہی ہر نفس میں شرار ہے　　کوئی فرق ہو تو بتاؤں میں نہ قرار تھا نہ قرار ہے

نہ غرض حرم کے وقار سے نہ صنم کدے کی بہار سے　　سروکار مجھکو نہ دار سے نہ جہانِ برق و شرار سے
ترے سنگِ در پہ جو ہو جبیں تو یہی جبیں کا وقار ہے　　ہمیں کام ہے درِ یار سے درِ یار پھر درِ یار ہے

وہی صبر پاسِ تعلیاں وہی ضبط سوزِ تجلیاں　　وہی رنجشیں وہی خفگیاں وہی ناز اور وہی شوخیاں
وہی بات بات میں چٹکیاں وہی بے رخیِ نگار ہے　　نہ عنایتیں نہ تسلیاں یہ مذاقِ جلوۂ یار ہے

انھیں رہبروں کی ہمیں قسم یونہی تھوڑی دُور قدم قدم　　یونہی سر خمیدہ کئے ہوئے یونہی دل کو تھامے بہ چشمِ نم
یوں ہی چپکے چپکے چلے چلو یہ خموشی اور شبِ تار ہے　　کہ صدا آرزو زدہ کرم ابھی اور ایک مزار ہے

نہ کلی ہے وجہ نظرکشی نہ کنول کے پھول سی تازگی　　نہ ہے آب جو سے سکونِ دل نہ ہے آبشار میں دلکشی
غرض اس جہاں کی ہر ایک چیز میری نگاہ میں خار ہے　　فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے

یہ تمام شعبدے وارثی ہیں فقط نشاطِ نظر مری　　یہ لطافتیں مئے عشق کی یہ شباب و شعر ہیں عارضی
غرض اے شفیقؔ کسی کو بھی نہ قیام ہے نہ قرار ہے　　نہ خزاں پہ ہے مری دسترس نہ بہار میری بہار ہے

شفیق کوٹی

افکارِ درخشاں

کون یہ خنجر بکف مقتل میں پردہ پوش تھا　　اک جہاں شوقِ شہادت میں کفن بردوش تھا
کس نے اُلٹا تھا یہ آکر میرے مدفن پر نقاب　　ذرہ ذرہ خاکِ دل کا بے نیازِ ہوش تھا
تھی یہی صورت تو وجہِ ارتباطِ حسن و عشق　　دیکھتے ہی دیکھنے والا ترا بے ہوش تھا
ہو کے بیخود بھی رہا مصروفِ دیدِ حسنِ دوست　　میرا کیفِ بیخودی بھی حاملِ صد ہوش تھا
جراتِ اظہارِ شوق و رعبِ حسنِ بے نیاز　　جانے کیا جذبہ تھا جو مُہرِ لبِ خاموش تھا
صرف دامن تک رہی دستِ جنوں کی چھیڑ چھاڑ　　جذبۂ دیوانگی میرا بقدرِ ہوش تھا
یاد ایامے کہ جب معصوم تھے ناز و نیاز　　فکرِ فردا تھی کسے، کسکو خیالِ دوش تھا
کس سے پوچھوں بیخودیٔ شوق کی کیفیتیں　　جلوہ دارِ عالمِ امکاں مرا آغوش تھا
ایک یہ دن ہے کہ بارِ دوش ہوں سب کے لئے　　ایک وہ دن تھا کہ میں آغوش در آغوش تھا
مہرؔ ہر ذرہ مری ہستی کا روشن ہوگیا
جلوہ افگن کون یہ خورشید پردہ پوش تھا

مہر نظامی میرٹھی

کاکوری کے ۲ دو فراموش کردہ شاعر

(۱) مفتوں کاکوروی

مومن علی نام، مفتوں تخلص۔ یہ تقریباً ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ ذوالفقار علی والد کا نام تھا۔ نسباً علوی تھے۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ فطرتاً ذہین اور طباع تھے۔ بہت جلد علم و فضل میں یکتائے روزگار ہو گئے تذکرۂ مشاہیر میں ہے کہ یہ غلام مینا ساحر کاکوروی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔

لکھنؤ میں کسی عہدے پر ممتاز تھے مگر حکیم مہدی کے زمانے میں ملازمت چھوڑ دی کچھ دن کے بعد انگریزی گورنمنٹ کے صیغۂ وکالت کا امتحان دیا اور کامیاب ہو کر الہ آباد میں نہایت شان سے وکالت کرتے رہے۔ جب الہ آباد سے صدر عدالت دیوانی آگرہ میں منتقل ہوئی تو انہوں نے آگرہ ہی میں رہنا شروع کر دیا۔ اپنی نازک خیالی اپنی قابلیت سے بڑا نام پیدا کیا۔ بڑے خلیق اور اپنی خوش خلقی کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھے۔ ستر ہزار روپیہ صرف کر کے وطن میں ایک عالیشان کوٹھی بنوائی تھی۔

فارسی دیوان کے آخر میں کچھ فارسی رقعات بھی ہیں۔ یہ رقعات فارسی ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ "نگارستان سخن" میں اُنکے متعلق حسب ذیل عبارت ہے۔

"مفتوں۔ شیخ مومن علی۔ ساکن قصبہ کاکوری کلام
نمکینش و تغزل بکمال شور اشوری است از شاگردان
شیخ غلام مینا ساحر بود و با سالیب سخن ماہر۔"

تذکرۂ روزِ روشن میں ہے:۔

"مفتوں۔ شیخ مومن علی۔ ابن شیخ ذوالفقار علی کاکوروی
بر نظم و نثر فارسی قدرت کما ینبغی داشت و از شاگردان
شیخ غلام مینا ساحر کاکوروی بود و در سرکار انگریزی بوکالت
عدالت دیوانی بعیش و عشرت زندگانی می نمود۔"

اب تھوڑا فارسی کا کلام ملاحظہ ہو:۔

شعرا آنسو کو گوہر اور داغ کو اختر باندھا ہی کرتے ہیں لیکن حضرت مفتوں نے اس پامال مضمون کو اپنے اندازِ بیان سے اس درجہ دلکش بنا دیا ہے کہ بے اختیار داد نکل جاتی ہے۔

کہتے ہیں ؎

برون غلطد چو اشک از چشم من گوہر شود پیدا
فتد گر عکس داغم بر زمیں اختر شود پیدا

ایک غزل کا مطلع ہے ؎

گر بے پردہ دیدم جلوۂ رخسارِ زیبائے — کہ در عمان چشم قطرہ دارد جوش دریائے

بہار کا زمانہ ہے۔ جنوں۔ وحشت سے دست و گریباں ہے طرح طرح کے خیالی قصوں سے عاشق دل بہلا رہا ہے۔ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

بہار آمد چمن از برگِ گل۔ در بر قبا دارد — جنونم دشتِ وحشت با گریباں آشنا دارد
خیالم ہر دم از لعلِ لبت افسانہ می بندد — مگر بوسیدنِ لبہائے شیریں مدعا دارد

غربت میں وطن کی یاد پر اس طرح خامہ فرسائی فرمائی ہے ؎

ہر نوکِ زبان ست شرر در دہن آتش — آتش نفسم می چکدم از سخن آتش
مفتوں برہِ وادیٔ غربت جو گذشتم — [illegible] یاد سواد وطن آتش

اکثر شعرا یہی مضمون باندھتے ہیں کہ بہار کا زمانہ ہے کسی طرح قفس سے نکلیں تو چمن میں پہنچیں لیکن حضرت مفتوں کہتے ہیں کہ چمن کی خوشبو سے ہم زندہ ہیں اس لئے چمن میں جانے کی ضرورت نہیں ؎

نشستہ است بدل لیک یاد روئے کسے — دریں چمن نکشایم نگہ بروئے کسے
بفصل گل نکنم خواہشِ چمن مفتوں — کہ در شکنجِ قفس زندہ ام ببوئے کسے

اب ذرا اردو کلام بھی سن لیجئے ؎

ناز سے وہ تو یہ کہتے ہیں کہ لے جاتے ہیں — پاؤں یاں صبر و تحمل کے اُکھڑ جاتے ہیں
کیا خبر آمد قاتل کی ہے سوئے مقتل — سر بکف آج پری کے جو پرے جاتے ہیں
چشمِ میگوں کا عجب اُنکے تماشا دیکھا — خالی خم جتنے تھے وہ آج بھرے جاتے ہیں

دلِ شیدانے دکھایا ہے وہ جلوا مجھ کو   سب حسیں میری نگاہوں سے گرے جاتے ہیں
ایک مدت سے جو تھا آپ کے خواہاں مقتوںؔ   آپ کی جان سے دُور آج مرے جاتے ہیں

حضرت مفتوںؔ نے ۹ رجب ۱۲۷۱ھ پنجشنبہ کے دن آگرہ میں انتقال کیا اور حضرت شاہ ابو العلا نقشبندیؒ کے مزارِ مبارک کے احاطے میں مسجد کے بائیں دفن ہوئے

---

(۲) یوسفی کاکوروی

عبدالصمد نام۔ یوسفی تخلص۔ وطن کاکوری۔ رسول بخش والد کا نام تھا ۱۲۲۸ھ مطابق ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے یہ حافظ۔ عالم فاضل اور بڑے ذہین تھے۔ شاہ تقی علی قلندری کاکوری کے شاگرد تھے۔

مگر وہ فطری شاعر تھے۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے غدر میں بہت کلام ضائع ہوگیا نمونے کے طور پر کچھ فارسی اور اُردو کلام درج ذیل ہے ؎

بدورِ فلک ہر یکے راست کارے   تو و بزم دشمن من و انتظارے

دوسرا مطلع ملاحظہ ہو کس بے ساختگی سے کہا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کا شاعر کہہ رہا ہے ؎

بدرشِ صبا کی رسد بوئے یارے   چہ مرکب سبک وچہ نازک سوارے

پھر فرماتے ہیں ؎

بہ غدر جہاں از مزارم نشانے   پریشاں شدآں ہم چو مشتِ غبارے
سر زاہد و سجدہ خاک مسجد   من و بادہ ناب آرے و آرے

حضرت آتشؔ کی غزل پر خمسہ لکھا ہے چونکہ اُردو زبان میں ہے، سننے کے قابل ہے مگر افسوس کہ ایک ہی بند مل سکا۔ کیا روانی ہے ؎

سچ تو یہ ہے کہ اثر عشق کا پانی میں بھی تھا   گرنہیں مانتے ہو اس سے بھی میں رگذرا
فرق تھا یا کہ نہ تھا آنا تو میں نے دیکھا   تم نہا کر جو چلے غم سے سمٹ کر دریا
آگیا دیدہ گرداب میں آنسو ہو کر

غدر سے ایک سال پہلے اپنے والد کے ساتھ اُن کو ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں سزائے موت دی گئی۔

درد کاکوروی

(بقیہ خاصانِ ادب صفحہ ۴)

(۵۹) محترمہ بیگم روشن آرا قادری پارک سرکس کلکتہ ۶ سالانہ
(۶۰) محترمہ خورشیدی بیگم صاحبہ رپن اسٹریٹ کلکتہ ۶ سالانہ
(۶۱) جناب منشی ایم آر شاد صاحب بی۔ ایل۔ ٹی (آنرزانِ پنجابی و پشتو) انبالہ ۶ سالانہ
(۶۲) جناب خادم حسین صاحب خادم زیبائی جبلپور ۶ سالانہ
(۶۳) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور ۶ سالانہ
(۶۴) جناب شیخ محمد احمد صاحب نازش سیابی پرتاب گڈھی ولد حاجی شیخ محمد صفدر صاحب مرحوم تا مجلس ۶ سالانہ
(۶۵) محترمہ سلمیٰ خاتون صاحبہ کنیز منا پور بنگال ۶ سالانہ
(۶۶) جناب خان شری محبت خان جی آف کوٹھڑی بانٹوا (کاٹھیاواڑ) ۶ سالانہ
(۶۷) جناب ابراہیم خاں رحمت خاں صاحب اشرف جوناگڈھ ۶ سالانہ
(۶۸) جناب حبیب حسین صاحب حبیب شاہجہانپوری کوئٹہ ۶ سالانہ
(۶۹) جناب عبدالستار خاں صاحب قائم گنجوی (دہلی) ۶ سالانہ

لمحاتِ ماضی

وہ نغمہ بربطِ فطرت پہ سیمیں آبشاروں کا
وہ ٹھنڈی چھاؤں تاروں کی وہ منظر لالہ زاروں کا
نظر افروز وہ سرسبز خطہ کوہساروں کا
مجھے گذرا ہوا رنگیں زمانہ یاد آتا ہے

وہ رہ رہ کر کسی کا کپکپانا خوف سے پیہم
حیا و شرم سے کرنا کبھی سرگوشیاں باہم
تکلم بھی فدا ہو جائے جس انداز پر ہمدم
مجھے گذرا ہوا رنگیں زمانہ یاد آتا ہے

نگاہوں کو جھکا کر دفعتاً وہ مسکرا دینا
کبھی جادو جگا دینا کبھی بجلی گرا دینا
کبھی کچھ سوچ کر دھیمے سُروں میں گنگنا دینا
مجھے گذرا ہوا رنگیں زمانہ یاد آتا ہے

سکوتِ شب کے سناٹے میں چھپ چھپ کر ملاقاتیں
نیاز و ناز کے شکوے کبھی وہ پیار کی باتیں
مری بزمِ تصور میں ابھی تک ہیں وہی راتیں
مجھے گذرا ہوا رنگیں زمانہ یاد آتا ہے

حنائی ہاتھ سے چہرہ چھپانا یاد آتا ہے
وہ اُن کا مسکرا کر روٹھ جانا یاد آتا ہے
محبت کیا، قیامت کا فسانہ یاد آتا ہے
مجھے گذرا ہوا رنگیں زمانہ یاد آتا ہے

تنفس کی وہ تیزی اور وہ بے ربط سے فقرے
جُدائی کے الم انگیز اور ہمت شکن لمحے
تغافل کی اداؤں سے وہ بھڑکائے ہوئے شعلے
مجھے گذرا ہوا رنگیں زمانہ یاد آتا ہے

جہانِ عشق میں اے مہر برباد تمنا ہوں
میں اس دنیائے رنگ و بو کا اک بے رنگ خاکا ہوں
فقط اُن چند لمحوں کے سہارے پر ہی جیتا ہوں
مجھے گذرا ہوا رنگیں زمانہ یاد آتا ہے

صاحبزادہ مہر عثمانی جوناگڈھ

وعدہ

بزم کو وجد میں لاتا ہوں ذرا دیر ٹھہر
میں ابھی ساز اٹھاتا ہوں ذرا دیر ٹھہر
ہم نشیں گاتا ہوں گاتا ہوں ذرا دیر ٹھہر
پریت کے گیت سناتا ہوں ذرا دیر ٹھہر

اپنی آواز سے مردوں کو جگاتا ہوں ابھی
دلِ خوابیدہ میں سو حشر اٹھاتا ہوں ابھی
نوجوانوں کو سوئے جنگ بلاتا ہوں ابھی
تری دنیا بھی جگاتا ہوں ذرا دیر ٹھہر
پریت کے گیت سناتا ہوں ذرا دیر ٹھہر

میری کشتی ہے ابھی موت کے طوفانوں میں
گا رہا ہوں میں ابھی جنگ کے میدانوں میں
مے بھری رہنے دے ساقی ابھی پیمانوں میں
تیری محفل میں بھی آتا ہوں ذرا دیر ٹھہر
پریت کے گیت سناتا ہوں ذرا دیر ٹھہر

شیخ کہتا ہے کہ آ میرا حرم اچھا ہے
کہہ رہا ہے یہ برہمن کہ صنم اچھا ہے
رند کہتا ہے نہیں ساغرِ جم اچھا ہے
ابھی جھگڑے یہ چکاتا ہوں ذرا دیر ٹھہر
پریت کے گیت سناتا ہوں ذرا دیر ٹھہر

دیکھ دھندلائی سی جاتی ہے زمانے کی نظر
اپنی منزل کی طرف لوگ ہیں سرگرم سفر
غازیوں کو ابھی بھنے ہیں سنہرے ساغر
تیری جانب بھی تو آتا ہوں ذرا دیر ٹھہر
پریت کے گیت سناتا ہوں ذرا دیر ٹھہر

گونجتے ہیں مرے کانوں میں ابھی نالہ و آہ
قتل و غارت سے اٹھاتا ہوں میں حسرت نگاہ
اہرمن آج کئے دیتا ہے دنیا کو تباہ
سازِ عشرت بھی بجاتا ہوں ذرا دیر ٹھہر
پریت کے گیت سناتا ہوں ذرا دیر ٹھہر

نازش پرتاب گڈھی

قسط ششم

.... کی ڈائری

یکم دسمبر ۱۹۴۲ء

۴ بجے صبح بیدار ہوئے۔ ضروری سامان مرتب کیا، اسٹیشن کے لئے کار کا انتظام کل شب ہی کو ہوگیا تھا چنانچہ مع علاء الدین ملازم کے اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ یوں تو بنگلور کی کیف ساماں فضاؤں سے ہر وقت دوچار ہونے کا موقع ملا ہے لیکن بنگلور کی صبح آجتک نہیں دیکھی تھی۔ اُس صبح کا ذکر نہیں ہے جب آفتاب کی کرنیں صحت مآب ہوں اور جس سے پہلی ہی بار بنگلور کے بلند و بالا ایوان جگمگائے ہوں ایسی صبحیں تو کئی دیکھی ہیں ——— وہ کچی صبح جس کی نگاہیں آج نظارہ کش ہیں بالکل پہلی بار دیکھی ہے خنکی اور خنکی میں نم ——— تازگی اور تازگی میں مہک ——— تاروں کی اوٹ سے جھلکنے والی سیاہیوں پر سفیدیوں کا غازہ ——— ہر طرف ایک خاموشی اور ایسی خاموشی جس میں کلیوں کے چٹکنے کی آواز صاف طور پر سُنائی دے سکے ——— زمین سے آسمان تک نور ہی نور ——— ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ سبزہ زار۔ درخت۔ پودے پھول سب جاگ چکے ہیں۔ مگر کسل و خمار سے بوجھل ہو رہے ہیں ——— غرض جاتی ہوئی رات کا بےگانا ہوا عالم، شاعر کی روح سے براہِ راست اٹکھیلیاں کر رہا ہے اور عمر بھر میں پہلی بار دل و دماغ اتنے کیف اندوز ہوئے ہیں۔ چونکہ شہر کا اسٹیشن بہت دور ہے اس لئے پہونچتے پہونچتے ہر طرف آثارِ حیات پیدا ہوگئے۔

جناب غلام غوث صاحب مالک کارخانہ سورن بیڑی فیکٹری و صدر حلقۂ خیال کولار ہمیں لینے آئے ہوئے ہیں۔ انھیں کی دعوت پر کولار کے سفر کا ارادہ کیا ہے۔ موصوف کو اسٹیشن پہونچنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ ہم نے اسٹیشن پر قدم رکھا ہی تھا کہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی صدر شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی نظر آگئے۔ معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب اسی ٹرین سے میسور سے تشریف لائے ہیں۔ ابھی پروفیسر صاحب سے دو تین ہی منٹ گفتگو ہوئی تھی کہ غلام غوث صاحب بھی آگئے۔ پروفیسر صاحب ازراہِ اخلاق ہمارے ساتھ اس ٹرین تک تشریف لائے جس میں ہمیں سوار ہونا ہے چونکہ ٹرین کی روانگی میں دیر ہے اس لئے سروری صاحب سے قدرے تفصیل گفتگو رہی ہے میرے استفسار پر موصوف نے فرمایا کہ امسال بی۔ اے آنرز میں ۲ طلبہ۔ ۳ طالبات اور بی۔ اے میں چالیس طلبہ اردو کے ہیں۔ یہ اعداد و شمار بڑی حد تک امید افزا ہیں اور یقیناً میسور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کو ترقیاں نصیب ہونگی۔

ٹرین کولار کے لئے روانہ ہوچکی ہے۔ ۹ بجے کے قریب ہم بورنگ پیٹ پہونچ گئے۔ یہاں جناب نیر کولاری موجود تھے۔ یہاں کولار کے لئے ٹرین تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ میسور اسٹیٹ ریلوے کے پلیٹ فارم تک پہونچے۔ میں نے نیر صاحب دریافت کیا کہ جناب سلیم بورنگ پیٹ یہاں سے کتنے فاصلہ پر ہیں تو انھوں نے بتایا کہ قریب ہی ہیں اور وہ انھیں اطلاع دینے کے لئے چلے گئے۔ جناب نیر اور سلیم صاحب آئے ہی تھے کہ ٹرین روانہ ہوگئی اور یہ دونوں حضرات چلتی ہوئی ٹرین میں بمشکل سوار ہوئے۔ جناب سلیم علوی سے میں بہت دنوں سے واقف ہوں، اکثر خط و کتابت رہی ہے۔ علامہ محوی لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ بورنگ پیٹ کے ایک کامیاب تاجر اور صاحبِ ذوق انسان ہیں۔ شعر خوب کہتے ہیں اور طبیعت میں بڑی روانی ہے۔ حال ہی میں سلیم صاحب کے تو شعر شائع ہوئے ہیں۔ موصوف دو تین اسٹیشنوں تک ساتھ چلے چونکہ ان کے صاحبزادے علیل تھے اس لئے نہ بنگلور کے مشاعرہ اور کانفرنس میں شریک ہوسکے اور نہ ہمارے ساتھ کولار چل سکے۔ واپسی میں بورنگ پیٹ ٹھہرنے کے لئے مجبور کر رہے مگر میں اُنکی توجہ

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہئے

کی فکر میں مبتلا کر کے ایک فکر میں ہوں۔ اور مجھے اُن سے ماضی کے خلوص کی توقع ہے۔ کاش وہ بھی میرے جذبات کا احترام کریں، انھیں ملے جُلے خیالات کو لیکر میں ان سے رخصت ہوا۔ ۱۱ بجے کولار پہونچے اسٹیشن پر احباب موجود تھے۔ سب کی معیت میں ڈاک بنگلہ پہونچے۔ غوث صاحب نے یہیں قیام کا انتظام کیا ہے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد غلام غوث صاحب اپنے دولت کدہ پر لے گئے۔ وہاں کھانا کھایا پھر اُن کے کارخانہ بیڑی گئے غوث صاحب کے کارخانہ میں متعدد لوگ کام کرتے ہیں، اور کارخانہ کافی ترقی پر ہے یہاں کئی حضرات ملنے کے لئے آئے۔ محمد حسین صاحب حاذق ریٹائرڈ ٹیچر سے بھی گفتگو ہوئی۔ سن رسیدہ بزرگ ہیں مگر ذوق جوان ہے کچھ دیر بعد جناب روشن جیلانی آبادی ہار پھول لیکر آگئے۔ یہ نوجوان ہیں اور ادب آداب سے اچھی طرح واقف۔ شعر کہتے ہیں مگر ملازمتی پابندیاں کھُل کر اس پر وقت نہیں دینے دیتیں۔ بڑے پُرخلوص کردی

ہیں۔ جناب خلیل کولاری، جناب نیر کولاری، جناب تنویر کولاری اور جناب روحی فونڈمبری
جن پٹنی بھی ساتھ ہیں۔ دو بجے قیام گاہ پر پھر واپس آگئے۔ شام کو جناب حکیم سراج زیبائی
تشریف لے آئے۔ سراج صاحب کا قیام مستقلاً بورنگ پیٹ میں ہے یہ چھریرے بدن
کے بہت زیادہ بولنے والے نوجوان ہیں۔ گفتگو سے ذہانت اور طباعی آشکار ہے۔
شعر و شاعری کے رجحانات سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔ پیشۂ طبابت میں بھی
کامیاب ہیں اور شاعری میں بھی۔ خلوص و محبت کے مظاہرے میں یہ بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے
یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے سراج صاحب سے بہت قدیمی تعلقات ہیں۔ حالانکہ اس سے قبل ان سے
ملنے کا اتفاق ہوا اور نہ خط و کتابت کا۔

کولار۔ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اس کے قریب ہی چند میل کے فاصلہ پر کولار گولڈ فیلڈ
یعنی سونے کی کانیں ہیں اور بقولِ اہلِ میسور انھیں نہ دیکھنا ایک دیدنی چیز سے محروم رہنا ہے
پٹرول کی وجہ سے موٹر کار کے انتظام میں دقت ہو رہی ہے۔ مگر سراپا خلوص جناب غلام غوث
صاحب اور جناب خلیل کولاری نے اس مرحلہ کو بھی طے کر ہی لیا۔ مغرب کے وقت سے کچھ
قبل کار آگئی۔ غوث صاحب۔ خلیل صاحب۔ سراج صاحب۔ نیر صاحب اور ہم سونے
کی کانوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستہ میں بورنگ پیٹ بھی پڑتا ہے۔ اس سے گذر کر دس میل
چلنے کے بعد کانیں نظر آنے لگیں۔ قریب گئے تو کئی مقامات پر بڑی اونچی اونچی مشینیں نصب
دیکھیں۔ جہاں یہ مشینیں نصب ہیں ان کے قریب دور دور تک کھدی ہوئی مٹی کے پہاڑ سے
بنا دیے گئے ہیں۔ یہ مٹی سیاہ رنگ کی ہے اور زمین سے نکلی ہے۔ ایک صاحب نے بتلایا
کہ ماہرین کا خیال ہے کہ چند سال بعد یہ مٹی پھر سونا پیدا کرے گی۔ واللہ اعلم۔ بہر حال یہاں
کا منظر دیدنی ہے۔ مشینوں کے قریب ہی بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ جن میں سونا صاف
ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ۳ ہزار فٹ کی گہرائی تک کھدائی ہو چکی ہے۔ اس علاقہ کی آبادی
تقریباً ایک لاکھ ہے اور یہ سب لوگ انھیں کانوں میں مختلف کاموں پر معمور ہیں یہ بھی
معلوم ہوا کہ حکومت ہند ۲۳ لاکھ روپیہ سالانہ گورنمنٹ میسور کو دیتی ہے۔ چونکہ وقت کافی
ہو چکا ہے۔ اور آج شب کو کولار میں مشاعرہ بھی ہے اس لیے نصف گھنٹے بعد وہاں سے
روانہ ہوگئے۔ ابھی ڈاک بنگلہ میں آکر رکے ہی تھے کہ بنگلور سے جناب سید محمد سلیمان صاحب
پرواز آگئے۔ یہ بھی علامہ سیماب سے اصلاح لیتے ہیں۔ مگر فکرِ سخن تسلسل کے ساتھ نہیں کرتے
اس لیے ہنوز منزلِ مقصود دور ہے۔ بنگلور میں تو پرواز صاحب نے ایسی پرواز کی کہ دو دن تک
نظر نہیں آئے۔ پھر آئے تو ایسے کہ ہر وقت موجود ہیں چنانچہ خلوص و عقیدت انھیں کولار بھی
کھینچ لائی۔ پرواز صاحب عجز و انکسار اور محبت کا مجسمہ ہیں۔ اُن کی باتیں بڑی پیاری اور
دل آویز ہوتی ہیں۔ کسی زمانہ میں دولت و ثروت ان کی غلام تھی۔ اب انقلاب کی گردش سے
ہچکولے کھا رہے ہیں۔ مگر وہی آن بان ہے۔ پرواز صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ گذشتہ
شب کو "مرٹین جیٹی ٹاؤن ہال" میں خطیبۂ ہند سیدہ سردار بیگم اختر نے حضرت امام حسینؑ پر
ایسی بے پناہ تقریر کی کہ اہلِ بنگلور نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ہر جملہ پر سامعین
تحسین و آفریں کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ وہ جب چاہتی تھیں رُلا دیتی تھیں اور
جب چاہتی تھیں جذبات کو برانگیختہ کر دیتی تھیں۔ تقریر ختم ہونے کے بعد ہال میں
ایک حادثہ بھی ہوگیا۔ یعنی اوپر کی گیلری میں "لیبرا ڈی" کی چند گیس کی بوتلیں فضا میں
کی بے پناہ کثرت کی وجہ سے گر گئیں اور عورتیں بے ہوش ہو کر گرنے لگیں۔ شور ہوا کہ
آگ لگ گئی۔ سیدہ اختر بے دھڑک اُس مقام پر پہونچ گئیں۔ ابھی چند ہی خواتین کو
اُٹھایا تھا کہ خود بھی بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ صبح ۴ بجے اسپتال میں انھیں ہوش آیا
تو پوچھنے لگیں کہ سب اچھی طرح ہیں ——— یہاں بھی سیدہ اختر نے اپنی اولو العزمی
کا وہ مظاہرہ کیا کہ جس نے دل کے گوشوں میں اُن کے خلوص و محبت کو بھر دیا۔

دس بجے کولار ٹاؤن ہال پہونچے۔ سامعین گو بہت زیادہ نہ تھے پھر بھی تعداد کافی تھی
ڈائس پر کچھ مخصوص شعرا اور عمائدین بیٹھے ہوئے تھے۔ مشاعرے کے صدر وزیر احمد صاحب
ایس۔ ڈی سی۔ او کولار تھے۔ چونکہ مشاعرہ کا انتظام بڑی عجلت میں کیا گیا تھا اس لیے خاص خاص
لوگوں کو اطلاع نہ ہو سکی پھر بھی فضل اللعل مولانا سید محی الدین صاحب سرقاضی مولوی
عبدالباسط شریف صاحب۔ حافظ نور محمد صاحب پانی پتی۔ علی عباس صاحب انسپکٹر
آف پرائمری اسکولز شریک تھے۔ جناب سراج زیبائی نے علامہ سیماب مدظلہٗ کا تعارف بڑی
بلند آہنگی کے ساتھ کرایا اور علامہ کی علمی و ادبی خدمات پر اجمال کے ساتھ روشنی
ڈالی۔ پھر طلوعِ خیال کولار کے اراکین نے ایک منظوم سپاس نامہ پیش کیا۔ علامہ
سیماب نے بھی ایک مختصر تقریر فرمائی جس میں اس بات پر زور دیا کہ اہلِ میسور اردو الفاظ
کا تلفظ صحیح حروف کے ساتھ کیا کریں۔ ایسا نہ کرنے سے ایک تو زبان بگڑتی ہے دوسرے
اگر کلامِ پاک کی تلاوت کی جائے تو معنی اور مطالب میں فرق پڑتا ہے۔ مثلاً عام طور پر
میسور میں "ق" کی جگہ "خ" بولا جاتا ہے۔ میں نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی اور یہ مشاعرہ
نہایت کامیابی کے ساتھ شب کے ۲ بجے ختم ہوگیا۔

صبح ناشتہ کے بعد جناب سید یحییٰ صاحب روحی فونڈمبری اپنی "سلک سینگ فارم" میں لے گئے جہاں
ریشم کے کیڑوں اور انڈوں کی پرورش ہوتی ہے۔ ریاست میسور میں ریشم کی تجارت
بطورِ خاص فروغ پر ہے۔ دن کے ۲ بجے کی ٹرین سے واپس ہونا تھا۔ یہ وقت کٹتے نہیں
کٹتا تھا۔ روحی صاحب۔ خلیل صاحب اور علی عباس صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر
پرائمری اسکولز رخصت کرنے آئے۔ بیگم صاحبہ نے راستہ میں مجبور کر دیا تھا کہ واپسی میں ہم بورنگ پیٹ

آبِ حیات کو تلاش کرنے والے

مرد ___ عورت

اگر ناکام و نامراد اور مایوس ہو چکے ہوں قبل از وقت زندگی کے ختم ہونے کا غم جوانی میں موت سے ہم آغوش ہونے کا رنج اور شباب میں بڑھاپے کے اثرات کا احساس اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہو تو ہندوستان کے مشہور، ممتاز اور مستند

دواخانۂ عظمیٰ خندۂ حیات بمبئی

کی طرف رجوع ہوں جس نے سالہا سال کی عرق ریزی، کوشش و کاوش اور جانفشانی سے مردوں اور عورتوں کے لئے آبِ حیات کا پتہ لگایا ہے۔ تاکہ مرجھائی ہوئی جوانیاں از سرِ نو شگفتہ ہو جائیں۔ زرد چہروں پر سرخیاں پھوٹ نکلیں۔ ہانپتے، کانپتے اور دھڑکتے ہوئے دل قوی ہو جائیں۔ آنکھوں کے حلقے، چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، جسم کی پیلاہٹ اور ناتوانی دور ہو کر زیادہ دن تک زندہ رہنے کا امکان پیدا ہو جائے

مردوں کی قبل از وقت موت کا سبب جریان ہے

اور اس کی تیر بہدف دوا



ہے جس کی چند ہی خوراکیں حیرت انگیز اثر کرتی ہیں۔ پیشاب کے ساتھ دھات کا پانی کی طرح بہنا، سرعت، انزال، احتلام اور بڑھی ہوئی حس کو جڑ سے اکھیڑ دینا زنگولہ کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مادہ منویہ کو غلیظ اور گاڑھا کرنا، جسم میں تازہ خون کثرت سے پیدا کرنا۔ کھوئی ہوئی طاقت کو بحال کرنا، قبض اور ہاضمہ کی خرابی کو دور کرنا زنگولہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آج ہی زنگولہ کی ایک شیشی طلب کیجئے اور ہماری صداقت کا امتحان کیجئے۔

قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنے

جوان عورتوں کو قبر تک پہونچانے والا سیلان الرحم ہے

اور اس کی سو فیصدی کامیاب دوا



ہے۔ سفید رطوبت کا اخراج عورت کے جسم میں گھن لگا دیتا ہے۔ طبیعت مضمحل اور افسردہ رہتی ہے۔ بھوک نہ لگنا، قبض رہنا، حمل قرار نہ پانا اور قرار پانے کی صورت میں گر جانا۔ پنڈلیوں میں میٹھا میٹھا درد۔ دل گھبرانا۔ سر چکرانا، ہاتھ پیروں میں پھڑکن۔ آنکھوں میں گڑھے اور چہرہ پر زردی۔ ان تمام شکایتوں کو نیست و نابود کرنا زمامی کا ادنیٰ کام ہے۔ چند خوراکوں میں سفید رطوبت کم ہو جاتی ہے اور پندرہ دن میں بالکل فائدہ ہو جاتا ہے۔

قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنے

ایک گذارش:- اگر دنیا میں یقین و اعتماد کوئی چیز ہے تو آج ہی یہ دوائیں طلب کیجئے۔ **جریان** اور **سیلان الرحم** کا مرض جتنا عام ہے اتنی ہی اس کی دوائیں بھی عام ہیں اور جسے دیکھئے وہ ضرورتمندوں کو لوٹنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ان امراض کے لئے دوائیں منتخب کرتے وقت مستند اور مشہور دواخانوں کا خیال رکھئے۔ "**دواخانہ خندۂ حیات**" عرصہ دراز سے پبلک کی خدمت کر رہا ہے۔ رؤسا، حکام، عوام اور خواص سب اس کی دواؤں کے صحیح اجزا، عمدگی اور زود اثری سے مطمئن ہیں۔

DAWAKHANA KHNDA-E-HAYAT

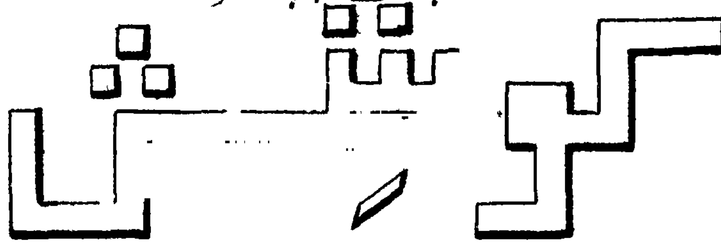
POST BOX NO. 188 (S-A) DELHI / NO. 2 60 (S-A) BOMBAY.

دواخانہ خندۂ حیات پوسٹ بکس ۱۸۸ (ایس۔ اے) دہلی / پوسٹ بکس ۲۶۰ (ایس اے) بمبئی

وقت کا یہ اہم ترین پیغام

ہے ہلاکت اختلاف و انتشار عام میں
ہستیٔ اقوام ہے جمعیت اقوام میں (سیماب)

دین پکچرز کی ناقابلِ فراموش ۔ روح پرور دلچسپ ۔ نظر فریب اور لافانی تصویر



لے کر آ رہی ہے جس کے دامن پر ندرتوں ۔ جدتوں اور رنگین سامانیوں کے سدا بہار پھول بکھرے ہوئے نظر آئینگے جس کے دلکش گانے ۔ گونجتے ہوئے مکالمے ۔ روح نواز میوزک حیرتناک عکاسی اور مستغنی داد اداکاری اقوامِ ہند کے دلوں کو آپس میں جوڑنے کا موثر ذریعہ ہونگے

اسٹوری اور ڈائریکشن :- **اے ۔ رفیق رضوی**

میوزک	مکالمے اور گانے	پروپرائٹر
پروفیسر بشیر خاں دہلوی	**کامل رشید**	**ایف ۔ دین**



مشاعرۂ شاعر :- مصرع طرح ۔ یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے

محسنِ ادب حضرت نشتر ہنگامی

تو نہ ہو تو ہیچ ہیں دنیا و دیں میرے
در حقیقت تو نہیں تو کچھ نہیں میرے لئے

مانعِ آہ و بکا ہوتا ہے کیوں سلے ضبط تو
یہ نہ کہدیں وہ کہ آہیں بھی نہیں میرے لئے

واقعی سجدوں کا سودا سر میں ہونا چاہئے
آستاں آ جائے گا اُس کا یہیں میرے لئے

دل جو کہتا ہے وہ کرتا ہوں اُدھر اس انداز سے
جیسے ہو یہ حکمِ ربُ العالمیں میرے لئے

اب کے دو دو آستینیں پیرہن میں ہوں مرے
اک جنوں کے واسطے اک آستیں میرے لئے

اس کا دینا بھی ہے مشکل اور رکھنا بھی محال
اک مصیبت ہو گئی جانِ حزیں میرے لئے

ایک نشتر کوئے جاناں کی زمیں کو چھوڑ کر
قابلِ سجدہ نہیں کوئی زمیں میرے لئے

حضرت منتظر صدیقی اکبر آبادی

عشق کی معراج ہے عین الیقیں میرے لئے
رفعتیں کیا کیا چھپا لی گئیں میرے لئے

ہیچ کر دی نعمتِ دنیا و دیں میرے لئے
کیوں دیا تو نے دلِ اندوہگیں میرے لئے

سلسلہ در سلسلہ پھیلیں جنوں کی شورشیں
عشق آیا آستیں در آستیں میرے لئے

طور ہی پر انحصارِ بارشِ جلوہ نہیں
تو جہاں چاہے چمک جائے وہیں میرے لئے

تنگ ہے دنیائے ذوقِ جبہ سائی سے کیوں
کیا نہیں گنجائشِ سجدہ کہیں میرے لئے

آجکل پھر پرورشِ افکار سے ہوں مضمحل
دے کوئی پیغام پھر نشتر آفریں میرے لئے

اب بھی اے منتظر جھک جاتی ہے [illegible] جمال
بن ہی جاتی ہے مسرت آفریں میرے لئے

حضرت انور بھوپالی

موت ہی کو بھیج دے یا رب کہیں میرے لئے
ایک آفت ہے دلِ تنہا نشیں میرے لئے

پھر اُسی کافر وطن کی یاد نے تڑپا دیا
آسماں سے کم نہیں جس کی زمیں میرے لئے

گرچہ ہے مسدود راہِ وحی لیکن وقتِ فکر
بھیجتا ہے خدا روح الامیں میرے لئے

آسماں تو آسماں ہے یہ زمیں بھی کم نہیں
بجلیاں رکھتی ہے زیرِ آستیں میرے لئے

پھر لئے جاتا ہے ظالم دل اسی کوچے میں آج
دوسرا کوفہ ہے جس کی سرزمیں میرے لئے

شکر ہے اس خالقِ کونین کا جو وقتِ فکر
کھولتا ہے درِ عرشِ بریں میرے لئے

جب کبھی انور سے منزل آشنا ہو تو قدم
دوست بن جاتے ہیں مارِ آستیں میرے لئے

حضرت ارشد صدیقی امروہوی

ذرہ ذرہ ہے قیامت آفریں میرے لئے
آسماں ہے کوئے قاتل کی زمیں میرے لئے

تا سرِ مژگاں نہیں آنے کو پی جاتا ہوں میں
ہے سرشکِ غم کی نمی انگبیں میرے لئے

سُرخیِ رنگِ شفق میں کہکشاں میں ماہ میں
جلوہ آرا ہے کوئی پردہ نشیں میرے لئے

صرف میرے دم سے قائم بزمِ ہست و بود ہے
آسماں میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے

ذرّے ذرّے میں نظر آتی ہے منزل کی جھلک
رہنما ہے جذبۂ عزم و یقیں میرے لئے

حاملِ پیغام خاموشی امینِ اضطراب
تھی کسی کی اک نگاہِ اولیں میرے لئے

جھومتا گاتا با آسانی گذر جاؤں گا میں
تنگ ارشد جادۂ ہستی نہیں میرے لئے

حضرت قمر نعمانی بہرامی

وہ زمانہ ہو گیا خوابِ حسیں میرے لئے
جب وفا میں آپ کی مخصوص تھیں میرے لئے

کیا وہ دن بھی یاد ہیں اے دشمنِ عہدِ وفا
نم رہا کرتی تھی تیری آستیں میرے لئے

دل اگر مائل نہیں تو سر رگڑنا ہے فضول
داغِ رسوائی ہے ہر داغِ جبیں میرے لئے

آج ہر افتاد پر بے صبر یوں ہوتا ہے دل
تسکینیں جیسے کبھی پہلے نہ تھیں میرے لئے

کم سے کم اتنی تو دے سجدوں کو میری آبرو
آئینہ بن جائے ہر داغِ جبیں میرے لئے

بیکسی شامِ غربت کا مری یہ حال ہے
کوئی تارہ بھی کہیں روشن نہیں میرے لئے

ظاہری اخلاق پر ہے آج بنیادِ وفا
یہ کسی صورت قمر ممکن نہیں میرے لئے

حضرت رونق دکنی (جمشید پور)

تھا جو کل تک حاملِ ذوقِ جبیں میرے لئے
یا الٰہی آج کیوں ممکن نہیں میرے لئے

ایک ہنگامہ ہے دنیا فطرتِ خاموش کو
ہے ہر اک تسکین شورش آفریں میرے لئے

جذبِ ہمدردی بھی ہے سرمایۂ فوزِ وفا
حاملِ صد پیرہن ہے آستیں میرے لئے

وہ تو کعبے کے جانثاروں میں [illegible] گئے
داستانِ خانہ ویرانیاں ہی رہ گئیں میرے لئے

بند ہو کر خلوتِ رازِ حسن میں آنکھیں کھلیں
موت آئی لے کے پیغامِ حسیں میرے لئے

یاد وہ تابِ محبت کی لطافت کچھ نہ پوچھ
[illegible] لے اور انگبیں میرے لئے

[illegible] کشت [illegible]
[illegible] دینے کی نہیں میرے لئے

حضرت مہر تقوی جے پوری

کوئی منظر بھی نشاط آور نہیں میرے لئے
ہے ہلالِ عید بھی غم آفریں میرے لئے

یہ فلک میرے لئے ہے نے زمیں میرے لئے
لیکن ان کا ایک ذرہ بھی نہیں میرے لئے

عشق کی فطرت نہ ہو مانع تو کچھ مشکل نہیں
کھینچ لینا ایک آہِ آتشیں میرے لئے

قیس کو تھا اضطراب لیلیٔ محمل نشیں
مضطرب ہے لیلیٔ محمل نشیں میرے لئے

خونِ سجدہ میں مرا ہر موئے تن ہے بیقرار
کیوں لگا دی آپ نے قیدِ جبیں میرے لئے

ہے ازل سے تا ابد زنجیرِ غم کا سلسلہ
الغرض معدوم آزادی نہیں میرے لئے

روز و شب لاتا ہی پیغامِ فطرت کا نزول
ہے تحمل مہبطِ روح الامیں میرے لئے

نجمہ تصدق صاحبہ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

اُن لبوں میں ہے شرابِ آتشیں میرے لئے
وہ حسیں بانہیں وہ جسمِ مرمریں میرے لئے

گردشِ ایام کی نبضیں یکایک رک گئیں
کس نے پھیلا دی ہے زلفِ عنبریں میرے لئے

بار جاتا ہے مجھے قوسِ قزح کے اُس طرف
منتظر ہے ایک دنیائے حسیں میرے لئے

جس نے پیشانی جہاں کی لکھ دی بعد عجز و نیاز
جاگ اُٹھے سیکڑوں فتنے وہیں میرے لئے

پھر سکونِ روح میرا آ نہ جائے وجد میں
چھڑ نہ جائے پھر کوئی نغمہ کہیں میرے لئے

دیکھ تو میری طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
یوں نہ ہو آشفتہ و اندوہگیں میرے لئے

تجھ کو زیبا ہے اگر کہہ کے تو رات دن
"یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"

جناب مولانا کیف بہاری

چند آنسو ہیں فروغِ آستیں میرے لئے
عشق کی شمعیں فروزاں ہو گئیں میرے لئے

ہو نہ یہ غم وجہِ رسوائی کہیں میرے لئے
آپ کیوں ہیں اس قدر اندوہگیں میرے لئے

ایک مشتِ خاک کی اللہ رے دلداریاں
محفلِ رنگ و نوا میں کیا نہیں میرے لئے

آپ اپنی رحمتیں مجھ پر ابھی ارزاں کریں
وعدۂ "لا تقنطوا" کافی نہیں میرے لئے

اے جنوں لے چل مجھے تو حسن کی بستی سے دور
یہ بھی اب وجہِ سکونِ دل نہیں میرے لئے

دے نہ پیغامِ جزا اے سجدہ ہائے بندگی
ہو نہ جائیں کہیں بارِ جبیں میرے لئے

کیف میں ہوں کیف میں اُنکے تصور سے ہنوز
کیا کہوں کیا تھی نگاہِ واپسیں میرے لئے

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

یہ فلک یہ چاند تارے یہ زمیں میرے لئے
آخر اتنی زحمتیں کیوں کی گئیں میرے لئے

کارزارِ رنگ و بو میں کیا نہیں میرے لئے
یا تمہیں میرے لئے ہو یا نہیں میرے لئے

اللہ اللہ منظرِ اشکِ دلِ مجبور یار
[illegible] ہو گئے اندوہگیں میرے لئے

عقل نے دکھلا دیا تھا [illegible]
اب [illegible] جبیں میرے لئے

آشکار ہے مجھی سے شانِ ربِّ ذوالجلال
اپنی ہستی کیوں نہ ہو عین الیقیں میرے لئے

میری نظروں میں ہے اک حسنِ مجسم کی بہار
کیوں نہ ہو دنیا کی ہر اک شے حسیں میرے لئے

جس جگہ طرفہ ہوئی مجھ کو تمنا دید کی
مسکراتا وہ نظر آیا وہیں میرے لئے

جناب سہا قریشی ایڈووکیٹ بھنڈ

تھی مفید وقت آہِ آتشیں میرے لئے
تیلیاں کنجِ قفس کی جل اُٹھیں میرے لئے

حسن کی تقدیر ہی تھی گو حجاب اندر حجاب
کیوں تھی قسمت کی نگاہِ دوربیں میرے لئے

شوق سے برباد کر دے تو چمن کو اے خزاں
چھوڑ جا دو چار تنکے ہی کہیں میرے لئے

"بر سبیلِ تذکرہ" بھی نام آ جائے مرا
اب انھیں منظور اتنا بھی نہیں میرے لئے

اُس نے جب پوچھا کہ ہے کس کیلئے کیا دردِ عشق؟
فطرتِ غمگیں پکار اُٹھی "نہیں میرے لئے"

ہیں شگفتِ گل کا ہوں کیا جانے کب سے منتظر
کاش اک دن مسکرا دیتے تمہیں میرے لئے

جو میسر تھیں کبھی صحنِ چمن میں اے سہا
اب وہ ہی آزادیاں ممکن نہیں میرے لئے

جناب بزم امروہوی (گیانپور)

گو ہوئے اب تک نہ تم ظاہر کہیں میرے لئے
پھر بھی ہے دنیا میں امکانِ یقیں میرے لئے

بن گیا ہوں میں فضائے سوز و سازِ عاشقی
ایک نعمت ہے دلِ اندوہگیں میرے لئے

جلوہ گر ہیں وہ مرے غم خانۂ تاریک میں
کھل گئی ہے نور تاروں کی جبیں میرے لئے

روح کی بیتابیاں دل پر اثر کرنے لگیں
آج ہے سرگرمِ نالہ وہ کہیں میرے لئے

وہ تو موسیٰ ہی تھے جن پر بیخودی سی چھا گئی
تیرا جلوہ اور حیرت آفریں میرے لئے؟

بارِ ذوقِ بندگی پر ہے یہ قیدِ آستاں
بے نیازِ دیر و کعبہ ہے جبیں میرے لئے

شوخی شوخی سی نظر آتی ہے بزمِ آرزو
ڈھونڈھ لاؤ اُن کو دلِ تنہا نہیں میرے لئے

جناب شاد اٹاوی

جب کوئی تسکین کی صورت نہیں میرے لئے
تیرا در تیرے لئے میری جبیں میرے لئے

آپ نے یوں پھیر لیں نظریں نصیبِ دشمناں
جیسے دنیا میں خدا کوئی نہیں میرے لئے

جب تو میں جانوں کہ سجدے مجھ کو راس آ گئے
وہ بھی یوں لکھنے لگیں در پر جبیں میرے لئے

پہلے جو روتے تھے میرے حال پر بے اختیار
اب تو واللہ وہ ہنستے بھی نہیں میرے لئے

دیکھنا ہو کیوں نہ صحرا ہو کے شبنم نشاں
اب وہ بے پردہ نہیں ہوتے کہیں میرے لئے

پھول، کلیاں، جام، بادہ، ابرِ مستانہ ہوا
یہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں میرے لئے

آنسوؤں سے میری بچتا ہے شاد دامن حسن کا
حسن کے دامن سے بچتی آستیں میرے لئے

جناب نذر شرکوٹی

[illegible] میرے لئے
[illegible] میرے لئے

تابکے سہتا رہوں ایفائے وعدہ کا فریب
تابکے اے دوست یہ عذرِ حسیں میرے لئے

سوزِ دل سے اپنے اب کچھ کام لینا ہے مجھے
عشق نے بخشی ہے آہِ آتشیں میرے لئے

میں تو دیوانہ تھا میری موت کا چرچا ہی کیا
آج کیوں ہے ہر زباں پر آفریں میرے لئے

آپ کو مطلب ہی کیا ہے میری جانِ زار سے
آپ کیوں ہونے لگے اندوہگیں میرے لئے

حشر ہی پر ہے اگر موقوف دادِ بیکسی
حشر کیوں برپا نہ ہو جائے یہیں میرے لئے

جسکا ہر لمحہ تھا فردوسِ مجسم اے نذیر
کیا نہ اب آئے گا وہ دورِ حسیں میرے لئے

جناب منیر نقشبندی کولاری

کچھ تو سامانِ سکوں ہو ہمنشیں! میرے لئے
وہ نہیں تو موت ہی آئے کہیں میرے لئے

سرخیِ فردِ عمل "ناکامِ الفت" کے سوا
اور کیا لکھتے کراماً کاتبیں میرے لئے

جس کی الفت پر بہر صورت تھا کل تک اعتماد
ہوگیا وہ آج مارِ آستیں میرے لئے

دیکھئے کیا رنگ لاتا ہے یہ راہِ شوق میں
دل جو ہے گاہے جناں گاہے جحیں میرے لئے

آپڑا ہے تفرقہ جذبات و احساسات میں
سازگار اب وضعداری بھی نہیں میرے لئے

رسم و راہِ عشق کے میں نے بدل ڈالے ہیں طور
اب یہ عالم مانگتا ہے نکتہ چیں میرے لئے

کیا کہوں بیگانگی اہلِ وطن کی اے منیر
پُرخطر کولار کی ہے سرزمیں میرے لئے

جناب فا رضوی جونپوری (بمبئی)

جلوہ گر ہے حسنِ حیرت آفریں میرے لئے
"یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"

اللہ اللہ سوزشِ داغِ محبت کا اثر
ہر نفس ہے اک شعاعِ آتشیں میرے لئے

میری افسردہ دلی سے ہو گئی دنیا اداس
ورنہ ہر اک شے یہاں کی تھی حسیں میرے لئے

کیا نگاہِ یاس سچ مچ کر گئی اپنا اثر؟
کیا نگاہِ حسن ہے اندوہگیں میرے لئے؟

عشق کی ناکامیاں ہی کامرانی بن گئیں
آسماں کی سازشیں ہوتی رہیں میرے لئے

بیخودی میں وہ کسی کے در پہ سجدے شوق کے
آج تک ہیں نازش افزائے جبیں میرے لئے

جب وہ آتے ہیں فنا ہوتا ہے یہ دھوکا مجھے
آرہی ہے نکہتِ خلدِ بریں میرے لئے

حضرت عزیز اختر دارنی سرحدی کوہاٹ

ہے فقط اک زندگی درد آفریں میرے لئے
موت تیرے عشق میں مشکل نہیں میرے لئے

ملتے ملتے رہ گیا وہ جلوۂ حجاب اندر حجاب
کوئی صورت تیرے ملنے کی نہیں میرے لئے

سازِ دل کے تار ٹوٹے ہیں کچھ اس انداز سے
مطربِ فطرت بھی ہے اندوہگیں میرے لئے

ہر نفس میں دیکھتا ہوں آگ سی دہکی ہوئی
لا کہیں سے ایک جامِ انگبیں میرے لئے

باغِ عالم کی حسیں شاخوں سے کلیاں توڑ کر
ہو گئی ہیں غم میں پیوندِ زمیں میرے لئے

دولتِ کونین لیکر آہ اختر کیا کروں
ہے مذاقِ شاعری ہی بہتریں میرے لئے

جناب خاور جبلپوری

بے حقیقت سے ہیں یہ دنیا و دیں میرے لئے
وسعتِ کونین بھی کافی نہیں میرے لئے

میں نے کر لی جس قدر ایذا پسندی اختیار
مشکلیں اتنی ہی آساں ہو گئیں میرے لئے

اُس کا ممنونِ کرم ہوں جس کے صدقے میں ہوا
باعثِ رحمت دلِ اندوہگیں میرے لئے

خندہ پیشانی سے بارِ غم اٹھا لینے کے بعد
رحمتیں مخصوص فرما دی گئیں میرے لئے

موت سے تسکین کی صورت ہوئی انجامِ کار
تھی وبالِ زندگی جانِ حزیں میرے لئے

دولتِ غم لیکے خاور میں نے سب کچھ پا لیا
بن گیا غم حاصلِ دنیا و دیں میرے لئے

جناب رعنا نظامی (راجوری کشمیر)

غور کرتا ہوں جہاں کیا کچھ نہیں میرے لئے
وسعتِ کون و مکاں ہے ہمنشیں میرے لئے

راز ہے صبحِ ازل کا یہ معمہ آج تک
کیوں جبینیں رہینِ سجدہ ہو گئیں میرے لئے

پُرخطر راہیں مجھے ہموار آتی ہیں نظر
رہبرِ منزل ہوا شوقِ یقیں میرے لئے

اپنی جولانگاہِ شوق اس کو بنانا ہے مجھے
تنگ کیوں ہونے لگی تیری زمیں میرے لئے

آ تو پہنچا ہوں میں ساحل تک بمشکل ہی مگر
بن نہ جائے موجِ طوفاں کہیں میرے لئے

عشق میں ملے دے کے بس اک انتہائے جذب و ضبط
رہ گئی رعنا متاعِ آخریں میرے لئے

جناب منتظر مظفرپوری ازنگولی (چمپارن)

اٹھ گیا ہے امتیازِ آن و ایں میرے لئے
عرش اتر آیا ہے اب دل کے قریں میرے لئے

اُس سے یہ امید ہوگا حشر میں وہ بے نقاب!
جو ازل سے دل میں ہے پردہ نشیں میرے لئے

ذوقِ نظارہ سلامت، وعدۂ فردا بخیر
حشر بھی ہے ایک صبحِ دلنشیں میرے لئے

طور پر میری بلا سے کوئی آئے یا نہ آئے
ہے نگاہِ شوق، جلوہ آفریں میرے لئے

نزع میں صورت دکھانے کی یہ کس نے ٹھان لی
موت بھی ہے اک تماشائے حسیں میرے لئے

شعلہ باری ہے زمینِ ہند کا منظر نہ پوچھ
اب جہنم ہے، یہ فردوسِ بریں میرے لئے

جناب بیتاب کالپوی

کیوں پریشاں ہے دلِ اندوہگیں میرے لئے
زمانہ بھی ہے مسرت کا کہیں میرے لئے

زندگی کا ہر نفس ہے آتشیں میرے لئے
غالباً جینا مقدر ہی نہیں میرے لئے

دینے آئے ہیں وہ مژدۂ زیست یا پیغامِ مرگ
کیوں وہ آزردہ ہیں قتالِ جبیں میرے لئے

زندگی ہے مست خوشی و کیف سے چھلکی ہوئی
مہرباں تم ہو تو ہے دنیا حسیں میرے لئے

آجکل ہیں وہ تصور میں مرے جلوہ طراز
کیوں نہ ہر نظارہ ہو پھر دلنشیں میرے لئے

جسکو بیتاب کہتے ہیں قرارِ زندگی
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا کہیں میرے لئے

جناب شہید جبلی

تم اگر ہوتے ترستا آسماں میرے لئے
غیرتِ فردوس ہوتی یہ زمیں میرے لئے

ہوگئے جس دن نگاہِ مست سے وہ کیف بار
خود بخود ہوجائیگی دنیا حسیں میرے لئے

سر حوادث کا کچلنا ہی پڑے گا ایک دن
اتنی خاموشی بھی کچھ موزوں نہیں میرے لئے

ہو سکے تو زندگی و موت کے عالم سے دور
کیجئے آباد اک بزمِ حسیں میرے لئے

کون وہ عیش ہے جس سے نہیں میں ہمکنار
کونسی ہے وہ مصیبت جو نہیں میرے لئے

موت شاید حاملِ صبر و سکوں ہو اے شہید
زندگی تو کچھ سکوں آگیں نہیں میرے لئے

جناب خادم شملوی از دہلی

قول انکا ہو تو کیونکر دلنشیں میرے لئے
غیر کی خاطر تو ہاں ہے اور نہیں میرے لئے

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ہر کہیں میرے لئے
ماہرو میرے لئے ہیں مہ جبیں میرے لئے

مر مٹا ہیں، بجھ گیا دل، ہوگیا قصہ تمام
فکر اب بے سود ہے ای ہمنشیں میرے لئے

اے دلِ آشفتہ تو لیکر چلا ہے پھر کہاں
چین دنیا میں نہیں ہے اب کہیں میرے لئے

رات دن میں ترے جلوے چاند سورج سے عیاں
لاکھ تو پردے میں ہے پردہ نشیں میرے لئے

رفعتِ شملہ ہوئے خادم کہ دہلی کا کشاد
اب نہیں دنیا میں گنجائش کہیں میرے لئے

جناب ہلال پریمی از کوشکی

عشرتوں کی کوئی صورت ہی نہیں میرے لئے
تو نہیں، تو ہیچ ہیں دنیا و دیں میرے لئے

یہ ہوا، یہ ابر، یہ غنچے، یہ پھول اور یہ بہار
اک ترے ہونے سے ہیں کتنے حسیں میرے لئے

صرف آنکھوں ہی میں تابِ دیدِ نظارہ نہیں
بند جلووں کی نہیں راہیں کہیں میرے لئے

میں نے تھک کر رکھدیا جس جا بھی اپنا قدم
ہوگئی پیدا نئی منزل وہیں میرے لئے

آستاں بوسی لگا ہوں سے بھی کرلیتا ہوں میں
قیدِ لاحاصل ہے یہ قیدِ جبیں میرے لئے

میں نے سمجھا تھا سکونِ دل جسے اب تک ہلال
وہ نظر ثابت ہوئی درد آفریں میرے لئے

جناب انور تہادوی

کونسی شے ہے جہاں میں جو نہیں میرے لئے
"یہ فلک تیرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"

میں وہ مختارِ ازل ہوں عالمِ ایجاد میں
محفلیں ہستی کی قائم کی گئیں میرے لئے

تیرے بام و در نگاہوں میں مری فردوس بہشت
رشکِ جنت تیری کوچے کی زمیں میرے لئے

رنگ اب دیوانگی بڑھتی چلی تیرے بغیر
اب کہاں تسکین جیب و آستیں میرے لئے

صرف اپنی بندگی ہی میرے مشرب میں روا
جب جھکی جس جا جھکی میری جبیں میرے لئے

جب سے انور عقل میں ہمسر گداز سوزِ عشق
سرد آہیں ہوگئی ہیں آتشیں میرے لئے

جناب خلیق ابولوی

میری جانِ ناتواں بھی اب نہیں میرے لئے
اے قضا جا کہ اماں بھی ہے کہیں میرے لئے؟

ہو مبارک غیر کو ایوانِ نعمت لے ندیم
ہے بہت یک پارۂ نانِ جویں میرے لئے

دل کی ویرانی صدائیں دے رہی ہے بار بار
لائیے بہرِ خدا کوئی مکیں میرے لئے

یہ سماں، یہ کیفیت اور یہ فضائے رنگ و نور
پھر یہ سب کس کے لئے ہیں گر نہیں میرے لئے

کیوں کرتا جوشِ وحشت میں اسے بھی چاک چاک
باعثِ ننگِ جنوں تھی آستیں میرے لئے

کسقدر بیدرد ہیں پیش آمدہ گھڑیاں خلیق
میں تو ہوں سب کے لئے کوئی نہیں میرے لئے

جناب ابوسعید خادم صدیقی زیبائی جبلپوری

کاش یہ صورت ہو صورت آفریں میرے لئے
دلنشیں تم ہو تو جنت ہے یہیں میرے لئے

نقشِ پائے حسن پر ہوں سر لئے میں سجدہ ریز
اس سے پوشیدہ نہ ہو منزل کہیں میرے لئے

ملتہب ہوں جیسے اک چھینٹے سے ساقی وہ جام
جا اٹھا لا تو، وہ جامِ آتشیں میرے لئے

دیکھتے ہیں سب سے محفل میری جانب دیکھکر
اب ٹھکانا ہی نہیں گویا کہیں میرے لئے

بعد زیبا فیضِ سیابؔ غنی خادم نہ پوچھ
آسمانِ شعر ہے ہر اک زمیں میرے لئے

جناب منظر کلیمی جام پوری

ہے عذابِ دو جہاں جانِ حزیں میرے لئے
ایک آفت ہے دلِ اندوہگیں میرے لئے

بیقرار و بے سکوں بیتاب اور محوِ اضطراب
میں کہیں دل کے لئے اور دل کہیں میرے لئے

کیوں نہ سمجھوں اپنے دل کو نازشِ دیر و حرم
جب تری پیغام آتے ہیں یہیں میرے لئے

میں تری ہی واسطے لایا ہوں یہ جانِ حزیں
جانے والے! اک نگاہِ واپسیں میرے لئے

پوچھتے ہو مجھ سے منظر کیا مرا حسنِ نظر
خشک کانٹے بھی چمن کے ہیں حسیں میرے لئے

جناب حکیم قیس بدنوی

تم جو بلجاؤ تو پھر کیا کیا نہیں میرے لئے
"یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"

جھکتی ہے میری جبینِ شوق زاہد جس جگہ
اٹھ کے آجاتا ہے خود کعبہ وہیں میرے لئے

کچھ تو ساماں چاہئے دلبستگی کے واسطے
غم ہی بھیجدے گر خوشی یارب نہیں میرے لئے

عار ہے دوزخ کو مجھ سے خلد کے قابل نہیں
پھر ٹھکانا ہے خداوندا کہیں میرے لئے

مٹ گئی تفریقِ دیر و حرم کی عشق میں
لائق سجدہ ہے اب تو ہر زمیں میرے لئے

جناب انجم احمد آبادی

عالمِ فانی میں اب اے ہمنشیں میرے لئے
جز غم و درد و الم کچھ بھی نہیں میرے لئے

وجہ ایجادِ جہاں ہونا کیا نہیں میرے لئے
"یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"

اب ہے کوئی جلوہ گر دیر و حرم کے درمیاں
اب ہے مشکل امتیازِ کفر و دیں میرے لئے

یہ شبابِ لالہ و گل اور یہ صبحِ بہار
درس گاہِ زندگی ہے بالیقیں میرے لئے

اُس نے لے لے انجم بنا لیا اک نگاہِ لطف سے
میرے دل کو مرکزِ حسن آفریں میرے لئے

جناب برگ باندوی

مر کے بھی ہے ایک غم زیرِ زمیں میرے لئے
آج ماتم کر رہا ہے ہر حسیں میرے لئے

کیا قیامت نعلِ گل ہے ہمنشیں میرے لئے
ہو گئے ہیں تنگ جیب و آستیں میرے لئے

پھر کے منہ یوں نہ جا رشکِ بالیں سے مری
جانے والے اک نگاہِ واپسیں میرے لئے

اور کوئی تیز و تند اس سے سوا ساقی پلا
ہے مئے کوثر شرابِ انگبیں میرے لئے

یہ بھی قسمت اپنی اپنی برگ اُن سے کیا گلہ
ہاں ہے غیروں کے لئے اور ہی نہیں میرے لئے

جناب فارغ آزادپور

نوجوانی لائی پیغامِ حسیں میرے لئے
ہر ادائے زندگی ہے دلنشیں میرے لئے

منتظر میرا کوئی تھا ایک مدت سے یہاں
صدیوں سے آراستہ تھی یہ زمیں میرے لئے

زندگی مرہونِ نظم و نسقِ الفت ہے ابھی
ہے ابھی تک زندگی کیف آفریں میرے لئے

اب زمینِ ہند کا مالک ہے کوئی اور ہی
کب اُگلتی ہے خزانے یہ زمیں میرے لئے

اتفاقاً دامنِ امید خالی رہ گیا
ورنہ اُنکے پاس فارغ کیا نہیں میرے لئے

جناب کوثر میرٹھی

آرہی ہیں جھکولوں پہ جھکا لئے ہمنشیں
مضطرب کوئی یقیناً ہے کہیں میرے لئے

کر گئی مجھکو حقیقت آشنائے حسن و عشق
کتنی پُرفن تھی نگاہِ اولیں میرے لئے

میری خاطر جلوہ گر ہیں آفتاب و ماہتاب
"یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"

جس جگہ سجدے کئے ہیں بے وفورِ شوق میں
بن گئے اُن کے نقوشِ پا وہیں میرے لئے

خوبیٔ قسمت اِدھر ہیں مبتلائے رنج و غم
وہ اُدھر ہیں منتظر نور جبیں میرے لئے

جناب آرزو اکبرآبادی

ذرہ ذرہ ہے سراپا نازنیں میرے لئے
اب تو ہے اُنکا تصور بھی حسیں میرے لئے

لے لیا جب اشکِ ناکامی کو اپنی گود میں
بن گئی اک چیز میری آستیں میرے لئے

ماتمِ ناکامی و وحشت کی گنجائش کہاں
تنگ ہے صحرائے غربت کی زمیں میرے لئے

زندگی چھوٹی تو دامن موت کا ہاتھ آ گیا
تھی اسیری ہی اسیری ہر کہیں میرے لئے

حضرتِ سیماب کا دامن ہے میرے ہاتھ میں
شعر کہنا آرزو مشکل نہیں میرے لئے

جناب ثنا ایٹی (از گوالیار)

آسماں میرے لئے ہے اور زمیں میرے لئے
وہ ہیں جب میرے لئے پھر کیا نہیں میرے لئے

روزِ اول ہی سے ہوں بیگانۂ عیش و نشاط
غم مقدر ہو چکا ہے ہمنشیں میرے لئے

ساری دنیا فیضیابِ جلوۂ بیدار ہے
دم بخود بیٹھے ہیں اک پردہ نشیں میرے لئے

اک نظر نے دل میں پیدا کر دیئے سو انقلاب
حشر تھی اُنکی نگاہِ اولیں میرے لئے

سر جہاں جذبِ محبت سے جھکایا ہے ثنا
ہو گیا جلوہ نما کعبہ وہیں میرے لئے

جناب رفیق شہادوی

تھی جنوں پروردِ بہارِ دلنشیں میرے لئے
بن گیا دامانِ صحرا آستیں میرے لئے

دیر ہو مسجد ہو کعبہ ہو کلیسا یا حرم
اُن کا سنگِ آستاں ہے ہر کہیں میرے لئے

اے مغنی مجھکو کھو جانے دے سوز و ساز میں
چھیڑ کوئی نغمۂ وجد آفریں میرے لئے

ایک مدت سے اسیرِ ظلم و استبداد ہوں
اب قفس ہی گلستاں ہے ہمنشیں میرے لئے

خانۂ دل کے لئے کب ضیا کروں رفیق
نور افشاں ہے ستاروں کی جبیں میرے لئے

جناب بقا جونپوری

کوئی بھی مشکل ہو اب مشکل نہیں میرے لئے
بن گئے ہیں یہ ہما عزم و یقیں میرے لئے

بے نیازی آپ کی خصلت سہی فطرت سہی
میں بھلا دوں دل سے یہ ممکن نہیں میرے لئے

میری شوریدہ سری کا یہ اثر تو دیکھئے
منتشر رہتی ہے زلفِ عنبریں میرے لئے

غور کر لو فیصلہ پر اپنے تم اچھی طرح
پھر کہیں ہونا پڑے نا اندوہگیں میرے لئے

دل کا اطمینان ہی سب سے بڑی دولت بقا
شامِ غربت بھی ہوا اب کیف آفریں میرے لئے

جناب سلطان نقشبندی پارولوی (الولہ)

"یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"
بات کہنے کی ہے لیکن "کچھ نہیں" میرے لئے

زندگی میری عبارت اُنکے جلووں ہی سے ہے
یہ نہ ہو تو دہر میں کچھ بھی نہیں میرے لئے

ہے ریاضِ خلد بھی میری نگاہوں میں حقیر
کتنی پیاری ہے وطن کی سرزمیں میرے لئے

مجھکو جو پینی تھی پی لی چشمِ مے گوں سے تری
اب بھرے رند جامِ آتشیں میرے لئے

کس کو اے سلطاں سناؤں ماجرائے زندگی
اک قیامت بن گئی جانِ حزیں میرے لئے

جناب نیر جہلمی

پیکرِ الطاف ہے وہ مہ جبیں میرے لئے
کیوں نہ ہو یہ سرزمیں خلدِ بریں میرے لئے

ابتدائے آفرینش سے ہوئیں وقفِ الم
اس بھری دنیا میں کیا راحت نہیں میرے لئے

ہم نشینو تم میری قسمت بدل سکتے نہیں
ہو رہے ہو کس لئے اندوہگیں میرے لئے

ہو رہا ہے کعبے کا میکدہ مجبورِ نثار
کون کہتا ہے کہ جامِ مے نہیں میرے لئے

اس طرف مسجد میں نیر ہو رہا ہے انتظار
اُس طرف ہے میکدہ اندوہگیں میرے لئے

جناب عارف سیالکوٹی

گوشہ گوشہ ہے مسرت آفریں میرے لئے
سرزمینِ دولت ہے خلدِ بریں میرے لئے

تم بہار زندگی ہو تم نشاطِ زندگی
تم نہیں پہلو میں تو کچھ بھی نہیں میرے لئے
بھول سکتا ہے کہیں وہ عالم جوش خیال
ہر نفس تھا ایک جام ساتگیں میرے لئے
میں ہوں اے عارف کسی کی یاد میں اندوہگیں
کوئی اب ہو یا نہ ہو اندوہگیں میرے لئے

جناب عاکف (علی نگر پولو)

نفی جیات افزا نگاہِ اولیں میرے لئے
دل میں آ کر بنگئی درد آفریں میرے لئے
یہ جہانِ رنگ و بو ہے ہمنشیں میری لئے
یاسمن میرے لئے ہے یاسمیں میرے لئے
اللہ اللہ سجدہ ہائے شوق کا ردِ عمل
کعبہ مقصود ہے میری جبیں میرے لئے
واہ اے اشکِ ندامت واہ کیا کہنا ترا
بنگئی دامانِ رحمت آستیں میرے لئے

جناب ارشد صدیقی ساگری (از ناگپور)

ہوگیا ہے دل ہیں وہ خلوت گزیں میرے لئے
بنگیا ہے دل مرا عرشِ بریں میرے لئے
رکھتے ہو سر پر مرے احساں کیوں چارہ گرو؟
خود ہے اک بارِ گراں جانِ حزیں میرے لئے
چاہتا ہوں اک مسلسل سوز لے برقِ جمال!
کیا تری سرکار میں یہ بھی نہیں میرے لئے
نذرِ سوزِ عشق ارشد ہو گئی ہستی مری
ایک عالم کیوں نہ ہو اندوہگیں میرے لئے

جناب عارف جونپوری

بس وہی دو ہچکیاں آئیں جو تیری یاد میں
موت کا پیغام آخر بن گئیں میرے لئے
تھی وبالِ جان کبھی میری جنوں سامانیاں
اب وہ تسکینِ دل و جاں ہوگئیں میرے لئے
آسماں کی کج روی نے لاکھ رخ بدلے مگر
اُنکی جلوہ پاشیاں ہوتی رہیں میرے لئے
بار ہے عارف اگر سر پر گناہوں کا تو کیا
اور جھک جائیگی تھوڑی سی زمیں میری لئے

جناب معصوم انصاری بیاوری

اب سکونِ زندگی باقی نہیں میرے لئے
اک مجسم درد ہے جانِ حزیں میرے لئے
رشتہ میں میری کچھ ایسا بس گیا ہے وہ دوست
بھول جانا اسکو ممکن ہی نہیں میرے لئے
مجھ سے چھپ کر بیٹھ جانا سامنے آ جا مگر
ہر ادا تیری ہے ظالم دلنشیں میرے لئے
گو بہت بیزار ہیں معصوم وہ مجھ سے مگر
بھیجتے ہیں پھر بھی پیغام حسیں میرے لئے

جناب ساقی صدیقی جبلپوری

میں قفس میں شاد ہوں مجھکو نہیں فکرِ نجات
تو نہ ہو اندوہگیں اے ہمنشیں میرے لئے
لائی ہے تاروں کے ساغر میں جوانی کی شراب
کہکشاں کی سینے والی نازنیں میرے لئے
جبکہ تمامِ جانِ ساقی دو زخ بجیں دور ہے
کم نہیں دوزخ سے فردوسِ بریں میرے لئے

جناب فوق۔ نمدار گنج (گیا)

زندگی میں جب مسرت ہی نہیں میرے لئے
شعلے برسائے نہ کیوں چرخِ بریں میرے لئے
ڈوب کر ساحل بنا دی مشکلاتِ عشق میں
کام کر اے کشتیِ جانِ حزیں میرے لئے
ہوگئی ہے خوانِ نعمت سے بھی نایاب گراں
فوق اس مہنگائی میں نانِ جویں میرے لئے

جناب جیت (از کوٹھی ریاست دھار)

غم ہی بن جائے دوا اے ہمنشیں میرے لئے
جب نہیں آرام دنیا میں کہیں میرے لئے
ساتھ اپنے لے گئی دل کا سکوں آنکھوں کا نور
کیا قیامت تھی نگاہِ واپسیں میرے لئے
دہجیاں کیوں ہوں نہ دامانِ خرد کی اے حبیب
خود سنواریں جیب و جیبِ آستیں میرے لئے

جناب کیف گلشن آبادی

زندگی کے سازو سامانِ زندگی تک رہ گئے
بعدِ مردن تھی فقط دو گز زمیں میرے لئے
یہ تو ممکن ہے کہ فرطِ غم سے اپنی جان دے دوں
شکوۂ جور و جفا ممکن نہیں میرے لئے

جناب قاضی ادونوی

پھونکدا اول عشق کی دنیا کو سوزِ عشق سے
ساقیا بھر ایک جامِ آتشیں میرے لئے
آپ کی صورت پہ میری سیکڑوں جانیں نثار
آپ کیوں ہیں اللہ اللہ غمگیں میرے لئے

جناب خیال قریشی احمد آبادی

دید ہے آسان تیری ہر کہیں میرے لئے
تو نہیں پڑے میں اے پردہ نشیں میرے لئے
میری ہی ہستی تو ہے وجہِ بنائے کائنات
"یہ فلک میرے لئے ہے یہ زمیں میرے لئے"

جناب محمود الولوی

وہ اگر آ جائیں تو پھر کیا نہیں میرے لئے
میرا گھر بن جائیگا خلدِ بریں میرے لئے
زندگی کیا زندگی کچھ بھی نہیں میرے لئے
موت ہے در اصل تسکیں آفریں میرے لئے

جناب حیدر (انڈین میوزیم کلکتہ)

صحن میخانہ بنا، چرخِ بریں میرے لئے
یہ مہ و انجم ہیں جامِ آتشیں میرے لئے
جب سے حیدر دور ہوں اس آستانِ پاک سے
میرا ہر سجدہ ہے اب ننگِ جبیں میرے لئے

جناب بیتاب پچھراونی

بیخودی میں جس جگہ بھی جھک گئی میری جبیں
ہوگیا تعمیر اک کعبہ وہیں میرے لئے
بعدِ مردن مجھ کو جس دم یاد آ جائینگی میری آنکھیں
عمر بھر رویا کرینگے ہمنشیں میرے لئے

جناب نصیر انصاری بیاوری

ہے وطن کی سرزمیں بیحد حسیں میرے لئے
بھیجدی اللہ نے جنت یہیں میرے لئے
شاعری سے ہی میں بہلاتا ہوں اپنا دل نصیر
ہے یہی اُلفت میں شغلِ بہتریں میرے لئے

جناب معصوم حقانی

ہنستا ہے اسطرح محسوس وہ رہ کر مجھے
منتظر بیٹھے ہیں جیسے وہ کہیں میرے لئے
بعدِ مردن رنگ لائی ہیں وفائیں دیکھنا
رو رہے ہیں وہ بھی معصوم حزیں میرے لئے

جناب تاباں القادری

کیوں پڑی ہے لاش تاباں میری بے گور و کفن
کیا مقدر میں نہ تھی دو گز زمیں میرے لئے

جناب ساجن انصاری جھمڑوی

دفن کیوں ہوتا نہ ساجن کوچۂ اغیار میں
اُنکے کوچے میں نہ تھی دو گز زمیں میرے لئے

جناب فروغ تابانی

اصلاحِ سخن: جناب شیدا اٹاوی مرحوم کی غزل پر حضرت مولانا احسن مارہروی کی اصلاح

(بغل میں ہو وہ رشکِ ماہ)
~~وہ رشکِ گل ہو پہلو میں~~ ہو عالم بھی جوانی کا — اگر سچ پوچھئے تو لطف ہے یوں زندگانی کا

(کسی عاشق کو خوش ... کسی کے دل کی) (کہ یکساں عمر بھر رہتا نہیں عالم)
~~کسی کو شادماں کیجے کسی کی~~ اب دعا لیجے — ~~سمجھ کر یہ سدا عالم نہیں رہتا~~ جوانی کا

سُنا ہے اب وہ اپنے عاشقوں پر مہرباں ہونگے — سُنا ہے دور اب عالم میں ہوگا شادمانی کا

(ہو لطف) (ترشح ابرِ مہربانی کا)
ترو تازہ ابھی ہو جائے کشتِ آرزو میری — جو اے ابرِ کرم ~~پڑ جائے چھینٹا کوئی پانی کا~~

خدا کی یاد بھی کرلیں گے واعظ عہدِ پیری میں — ابھی تو لطف اٹھا لینے دے عالم ہے جوانی کا

تصور جیتے جی اس زلفِ پیچاں کا نہ جائیگا — رہیگا سامنا یونہی بلائے ناگہانی کا

(یہاں وہ آ نہیں سکتے وہاں میں جا نہیں سکتا) (میں ہدف ہوں)
~~وہ آ سکتے نہیں یاں اور میں بھی جا نہیں سکتا~~ — وہ نازاں نازکی پر ~~ہیں اور ہے یاں~~ ناتوانی کا

(انا الحق کہہ کے ناحق بن گیا وہ جان کا دشمن)
~~خدا جانے کہ کیا تھا سرِ باطن پر بظاہر تو~~ — مزہ منصور نے چکھا ہے اپنی بدزبانی کا

وہ آتے تو سہی میں جان و دل بھی نذر کر دیتا — فراہم سب یہاں ساماں تھا انکی میہمانی کا

(مقدر)
~~نصیبہ~~ جاگ اٹھا شیدا کا پہلو میں وہ گل آیا
چلے اب دور اے ساقی شرابِ ارغوانی کا

توجیہہ:—

(۱) مصرع اولیٰ میں "بھی" زائد تھا
(۲) مصرع اولیٰ میں "اب" بھرتی کا تھا۔ مصرع ثانی بھی چُست نہ تھا۔ اصلاح سے برجستگی پیدا ہوگئی۔ "سدا" بھی نکل گیا جو ہمیشہ کے معنی میں اب متروک ہے اور "یہ" کا سقم بھی دور ہوگیا۔
(۴) شیدا صاحب کے دوسرے مصرع میں بظاہر کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ کامل استاد کی اصلاح سے مصرع کے تیور ہی بدل گئے۔ ابرِ کرم کی مہربانی کے معنی ہی یہ ہیں کر برسے۔ کتنا اچھا پیرایہ بیان ہے۔
(۷) پہلے مصرعے میں پھر ایک متروک لفظ "یاں" شیدا مرحوم نے استعمال کیا تھا۔ مگر کا عالمانا ضروری تھا۔ پھر "میں جا نہیں سکتا" سے مفہوم پورا ہو جاتا ہے "بھی" کی ضرورت ہی نہیں۔ اصلاح سے دونوں عیب دور ہوگئے۔ حضرت احسن مرحوم نے جو مصرع لگایا ہے وہ صاف۔ رواں۔ برجستہ اور شیدا مرحوم کے مفہوم کے مطابق ہے۔
دوسرا مصرع میں بھی "یاں" لفظِ متروک استعمال کیا تھا اصلاح سے یہ لفظ نکل گیا۔
(۸) شیدا مرحوم کا مصرع نہایت لچر۔ بے معنی اور بے ترتیب تھا۔ اصلاح سے معنی پیدا ہوگئے اور مفہوم متعین ہوگیا۔
(۱۰) "نصیبہ" سے "مقدر" زیادہ اچھا ہے۔

اعجاز صدیقی

ادب و شعر کا بہترین ذخیرہ

کمالِ داغ یہ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی مرحوم و مغفور کے چاروں دیوانوں کا ایک ایسا ستھرا اور معیاری انتخاب ہے جو اب سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا پروفیسر مولوی حامد حسن قادری کا بسیط تنقیدی مقدمہ اس دیوان کی جان ہے۔ قیمت ۶ر

گلزارِ داغ فصیح الملک مرزا داغ کا مشہور دیوان ہے جس کا ہر شعر نشتر ہے قیمت ۸ر

روحِ نظیر۔ میاں نظیر اکبر آبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ۔ جناب محمود اکبر آبادی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا بسیط اور فاضلانہ مقدمہ دیکھنے کے قابل ہے قیمت ۶ر

جگر پارہ حضرت بیدم شاہ وارثی مرحوم کا متصوفانہ اور سوز و گداز سے پُر کلام قیمت صرف ۱۲ر

مصحفِ بیدم حضرت بیدم شاہ وارثی کا متصوفانہ دوسرا مجموعہ کلام جس میں ان کا تمام کلام سحر آگیں اور داد و دل سینکڑوں ہے اس دیوان کا مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے تحریر فرمایا ہے مع تصویر مصنف قیمت ۸ر

ایاغِ بزم۔ حضرت مرزا عاشق حسین بزم آفندی اکبر آبادی کا دوسرا نو مطبوعہ دیوان جس میں محاکات و جذبات کا دریا موجزن ہے۔ قیمت ۶ر

قصائدِ بزم۔ حضرت بزم آفندی اکبر آبادی خلف حضرت بزم اکبر آبادی کی لاجواب تصنیف مع سوانح ... آلِ رسول میں بند ہائے نظمیں اور قصائد قیمت ۸ر

نقوشِ ثانی۔ حضرت آلِ حاتبی کا دیوان۔ ایک ایک شعر جذبات و واردات کا صحیح نمونہ ہے۔ قیمت صرف ۶ر

میکدہ جناب مولوی سید محمد علی شاہ میکش قادری اکبر آبادی کے جذبات حسن و عشق سے معمور متصوفانہ کلام کا بہترین مجموعہ مع تصویر مصنف قیمت ۸ر

نشترکدہ مجموعہ غزلیات بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر جنگامی ایڈووکیٹ۔ اگر آپ قدیم رنگِ تغزل کو جدید مذاقِ بلند کے ہمدوش دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ دیوان ملاحظہ فرمائیے۔ کتابت طباعت اعلیٰ حجم ۲۴۸ صفحات مع تصویر مصنف قیمت ۶ر

نورِ مشرق حضرت ضیا فتح آبادی پنجاب کے ان خوش فکر شعرا میں ہیں جنکا نام صفِ اوّل میں آتا ہے یہ انھیں کی روح افزا معیاری نظموں کا مجموعہ ہے جس میں کیف و ساز کا ایک سمندر موجیں مارتا ہوا معلوم ہوتا ہے کتاب مجلد اور طلائی بصورت گرد پوش قیمت ۸ر

صبحِ مشرق محمد صادق ضیائی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا کلیات نظم و غزل ضیا کی شاعری محض جذبات میں زندگی کی ترجمان ہو گئی ہے۔ ضیا اپنے وقت کا بہترین مصور اور فنکار ہے جسکا ہر شعر واردات و احساسات کا آئینہ دار ہے حجم ۲۰۶ صفحات مجلد مع تصویر مصنف قیمت ۶ر

مشہور مثنویاں اور دیوان

الہام منظوم حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی نے مثنوی مولانا روم کے کل چھ دفتر کا منظوم ترجمہ کیا ہے نثر کے ترجمے تو آپ نے بہت دیکھے ہونگے منظوم ترجمہ بھی دیکھئے۔ اور یہ اصل کے مطابق منظوم ترجمہ بے مثال ایک شاہکار کتاب ہے۔ قیمت فی دفتر ۶ر مکمل چھ دفتر ...

مثنوی عالم خیال مصنفہ مرزا شوق قدوائی لکھنوی مرحوم کو ہر اور ہر کی محبت آمیز داستان کا ... نیولا ایک تنکے کی چھٹی یا خوبصورت چند تصویریں ... رنگین کاغذ پر ...

... مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ یہ مثنوی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ... ہندوستان کی مکمل سیاسی تاریخ ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی اور ... مقدمے نے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں قیمت ۱۲ر

مثنوی ظہورِ رحمت مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی، یہ مثنوی ولادت نبوی کے متعلق دلکش اور عقیدتمندانہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۸ر

مثنوی زہرِ عشق بہارِ عشق۔ لذتِ عشق۔ فریبِ عشق یہ چاروں مثنویاں جداجدا بھی چھپی ہیں اور چاروں یکجا مجلد بھی قیمت صرف ۸ر

اربعہ عناصر حکیم محمود علیخاں صاحب ماہر اکبر آبادی کے سوز و نکات سے لبریز رباعیات کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر

مینائے سخن منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی مرحوم کی تمام واسوختوں کا بے نظیر مجموعہ۔ قیمت ۸ر

شبابیات۔ مصنفہ حضرت ساغر نظامی۔ موضوعِ شباب پر ۱۲۴ حسین رباعیات کا بے مثل مجموعہ قیمت صرف ۴ر

حدیثِ ناتمام۔ پنڈت دیسراج ابر پنجاب کے مشہور شاعر ہیں۔ یہ انھیں کی نظموں۔ غزلوں اور قطعات کا دلفریب اور وجد آفریں مجموعہ ہے قیمت ۱۲ر

سازِ حیات از محمود صغیر اثر اکبر آبادی۔ یہ جنگ۔ حفاظتِ وطن اور عمل و جہاد کے ولولہ انگیز جذبات سے پُر نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس کے متعلق علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا کا خیال ہے کہ دورانِ جنگ میں اسکا مطالعہ سب کیلئے مفید ہے قیمت ۶ر

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی مختلف نظمیں

شکوہ و جوابِ شکوہ ۴ر شمع و شاعر ۴ر فریادِ امت ۴ر اکبری اقبال ۳ر نالۂ یتیم ۲ر تصویرِ درد ۴ر

تصانیف حضرت مولانا حالی پانی پتی مرحوم

مسدسِ حالی (عکسی) مسدسِ حالی (سادہ) ۸ر مرثیہ مرزا غالب ۲ر مناجاتِ بیوہ ۲ر

مذہبی کتابیں

اخلاق اور فلسفہ اخلاق۔ از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ اصولِ اخلاق اور فلسفہ اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث اسلام کے ابوابِ اخلاق کی تشریح اور برتری علم و تحقیق کی روشنی میں بڑا سائز حجم ۴۴۴ صفحات قیمت للعہ

غلامانِ اسلام مؤلفہ مولانا سعید احمد ایم۔ اے (فاضل دیوبند) اس میں ان متعدد ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل تحقیق و جستجو سے جمع کئے گئے ہیں جو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کے لحاظ سے افلاک سمجھے جاتے تھے بڑا سائز حجم ۳۲۲ صفحات قیمت للعہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت مرتبہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے فاضل دیوبند۔ اس میں غلامی کی حقیقت اس کے نفسیاتی۔ اخلاقی اور اقتصادی پہلو دلپذیر بحث غلامی کا آغاز کب سے ہوا۔ اسلام نے اس میں کیا کیا اصلاحات کیں۔ غرض بہترین کتاب حجم ۲۰۲ صفحات۔ قیمت ۶ر

خلفائے راشدین قرآن مجید اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے مستند و مکمل حالاتِ زندگی۔ متفقہ فیصلہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی قیمت ۸ر

سالِ اجراء موسم بہار ۱۹۳۰ء ——— عرصۂ اشاعت ۱۳ سال

زیرِ سرپرستی ——— اعلیحضرت رسوا مظلومی والئی پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ — منظور شدہ

محکمۂ تعلیم صوبۂ ممالک متوسط و برار — حکومت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

محکمۂ تعلیم ریاست میسور — محکمۂ تعلیم ریاست کشمیر

تعارف

جلد ۱۴ | ماہنامہ "شاعر" ——— آگرہ ——— جولائی ۱۹۴۳ء | نمبر ۷

چندہ سالانہ ۳ روپے ... ششماہی ... معاونین ... محسنین ... سرپرستوں ... فی پرچہ ۶

محسنین مربی معاونین اور انیسان و ہمدردان شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسن ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰عہ سالانہ
(۲) محسن ادب جناب محترم مولوی محمد خان صاحب نیتر خورجوی ۶۰عہ سالانہ
(۳) محسنہ ادب ہز ہائینس علیا حضرت کنیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰عہ سالانہ
(۴) محسن ادب جناب وزیر زادہ شجاعت خان صاحب فہمی جوناگڈھی ۶۰عہ سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۵) مربی ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خان صاحب خلف میاں سر کرنل حشمت اللہ خان صاحب مرحوم کے۔ ٹی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵۰عہ سالانہ
(۶) مربی ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹماکیز و اسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹانگر) ۵۰عہ سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاون ادب مسٹر اے۔ بی غلیس صابر۔ بی۔ اے اکبر آبادی ۲۴عہ سالانہ
(۸) معاونۂ ادب محترمہ نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ مدیرہ رسالہ "ادیب" دہلی ۲۴عہ سالانہ
(۹) معاون ادب جناب مولوی محبوب حسن آسی متوطن رڑکی (بمبئی) ۲۴عہ سالانہ
(۱۰) معاون ادب جناب صوبہ دار اختر علی صاحب گوالیار ۲۴عہ سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۱) ہمدرد ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب بلبل جالندھری ۱۲عہ سالانہ
(۱۲) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری ۱۲عہ سالانہ
(۱۳) ہمدرد ادب جناب بابو عبدالعظیم خان صاحب آزونی دکنی جمشید پور ۱۲عہ سالانہ
(۱۴) ہمدرد ادب جناب سعیل کھوکھر صاحب راز جوناگڈھی ۱۲عہ سالانہ
(۱۵) ہمدرد ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲عہ سالانہ
(۱۶) ہمدرد ادب جناب نواب زادہ شکور حسین خان صاحب قلیش آف منڈو ۱۲عہ سالانہ
(۱۷) ہمدرد ادب جناب سید غلام محمد شاہ صاحب رئیس اعظم روہڑ ضلع جھنگ ۱۲عہ سالانہ
(۱۸) ہمدرد ادب محترمہ بلقیس جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۱۲عہ سالانہ

خاصان ادب

(۱۹) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمٰن خان صاحب شفیق ٹونکی ۶عہ سالانہ
(۲۰) جناب عبدالحمید صاحب قمر صدیقی بھاگل پوری بی۔ اے ۶عہ سالانہ
(۲۱) جناب لالہ گنگا رام صاحب آدم سرہندی ۶عہ سالانہ
(۲۲) جناب سید مظفر حسین صاحب قریشی شکوہ بستی دہلی ۶عہ سالانہ
(۲۳) جناب محمد عبیداللہ خان صاحب ترنم امروہوی ۶عہ سالانہ
(۲۴) جناب ناشر حسن خان صاحب آزر بمبئی ۶عہ سالانہ
(۲۵) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیر کوٹی ۶عہ سالانہ
(۲۶) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہی ۶عہ سالانہ
(۲۷) جناب پریم چند صاحب ترنم دہلوی ۶عہ سالانہ
(۲۸) [illegible] ۶عہ سالانہ

(۳۱) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶عہ سالانہ
(۳۲) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوہانہ ۶عہ سالانہ
(۳۳) جناب تیور شاد صاحب برق باندوی ۶عہ سالانہ
(۳۴) جناب حکیم مولوی عبدالرحمٰن صاحب شاعر کاندھلوی ۶عہ سالانہ
(۳۵) جناب علامہ سید محمد محسن صاحب ذاکر کیفی دہلوی ۶عہ سالانہ
(۳۶) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر نکوڑ دی ۶عہ سالانہ
(۳۷) جناب کنور فاروق علی خاں صاحب فارق رئیس منڈو ۶عہ سالانہ
(۳۸) جناب مقبول احمد صاحب تنویر اعظم گڈھی ۶عہ سالانہ
(۳۹) جناب مولوی مظہرالدین صاحب مظہر ماہی گوردا سپوری ۶عہ سالانہ
(۴۰) جناب ڈاکٹر آثار رشاد صاحب استعمارہ زیب بریلوی ۶عہ سالانہ
(۴۱) جناب لطیف الرحمٰن صاحب تعب آروی جمشید پور ۶عہ سالانہ
(۴۲) جناب عطاء الرحمٰن صاحب عطا جالندھری دہلی ۶عہ سالانہ
(۴۳) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب گروانی اسٹیٹ ۶عہ سالانہ
(۴۴) جناب بشیر احمد صاحب فاروق رکن ادارہ "الاسلام" کوئٹہ ۶عہ سالانہ
(۴۵) جناب من موہن لال صاحب ساگری جھنڈ وارہ (سی۔ پی) ۶عہ سالانہ
(۴۶) جناب میاں محمد مخدوم صاحب رئیس چک میانہ پنجاب ۶عہ سالانہ
(۴۷) جناب محمد حسین صاحب خادم کسولوی دہلی ۶عہ سالانہ
(۴۸) جناب چودھری علیم یار صاحب سندیلہ ۶عہ سالانہ
(۴۹) جناب سید شاہ عنایت مولیٰ صاحب نامان آتقادہری منا پور (بنگال) ۶عہ سالانہ
(۵۰) جناب جمعدار سی۔ بی محمد صاحب بمبئی ۶عہ سالانہ
(۵۱) جناب شیخ عبدالرحمان صاحب شباب دہلوی ریڈیو اسٹیشن ۶عہ سالانہ
(۵۲) جناب ملک قربان حسین صاحب شہید جبلی بمبئی ۶عہ سالانہ
(۵۳) جناب عبدالرؤف صاحب فوتی سکریٹری اقبال لائبریری نند گاؤں (سی۔ پی) ۶عہ سالانہ
(۵۴) جناب لکھو خدا داد صاحب جذب عالم پوری ۶عہ سالانہ
(۵۵) جناب یوسف میر صاحب تبسم بعید عالم ۶عہ سالانہ
(۵۶) جناب بیتاب صاحب نائم صاحب گل خادم ایم۔ ایل۔ سی جمعہ حیدر ۶عہ سالانہ

شعرِ انقلاب ـــــ شکستِ جمود

ہر طرف اک جمود طاری ہے — واہ کیا زندگی ہماری ہے
آشیاں تا قفس، ہیں سب خاموش — ہے زباں بند سانس جاری ہے
ہے بظاہر سکون چہروں پر — روح میں رنگِ بیقراری ہے
قہرِ انساں ہے اور دانستہ — جبر ہے اور اختیاری ہے
نہیں فطرت کو فرصتِ تنقید — اسے اپنا ہی کام بھاری ہے
وہی اٹھتے ہیں جھوم کر بادل — وہی گلشن کی آبیاری ہے
وہی صحنِ چمن کی سالانہ — گلفروشی و لالہ کاری ہے
رعد کی ہے وہی جواں کڑک — وہی بجلی کی شعلہ باری ہے
وہی خورشید و ماہ کا ہے طلوع — وہی تاروں کی خونکاری ہے
وہی پھولوں کی ہے شگفتہ وشی — وہی سبزے کی خوشگواری ہے
مگر انسان ہے خراب و تباہ — اسکی قسمت میں غم خواری ہے
قومیں جمع ہو گئی ہیں چند — جن پہ دنیا کی ذمہ داری ہے
اُن کے قابو میں ہیں ضعیف افراد — کوئی مفلس کوئی بھکاری ہے
شغل دن رات ان غلاموں کا — جاں دہی اور جاں سپاری ہے
شہر ویراں ہوں اور قصر آباد — یہی معراجِ شہریاری ہے

اے غلامو! جو تم میں ہمت ہو — ابھی امکانِ رستگاری ہے
تابکے یہ جمودِ بے معنی؟ — موت کیا زندگی سے پیاری ہے؟
کوششِ انقلابِ حال کرو — پھر یہ بزمِ جہاں تمہاری ہے
اپنی قوت پر اعتماد کرو — یہی ترکیب کامگاری ہے
توڑ ڈالو جمود کی زنجیر — کہ یہ زنجیر اعتباری ہے

موت انسان پر ہو کیوں طاری
خون جب تک رگوں میں جاری ہے

سیماب اکبرآبادی

اس کمپنی نے دورانِ جنگ میں اخبارات و رسائل کی جتنی خدمت کی ہے شاید ہی کسی نے کی ہو۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومت اس کمپنی کو مال منگانے کی تمام سہولتیں بہم پہونچائے گی تاکہ اس کے ذریعہ سے اخبارات و رسائل کو اپنی ضرورتوں کا ایک چوتھائی حصہ تو مل سکے۔

اس ماہ کے مضامین

حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی اور حضرت مولانا آسی کے مضامین کا اعلان اُن کے ایما سے کیا گیا تھا۔ چند در چند تقاضوں کے باوجود مضامین وصول نہیں ہوئے۔ بہرحال ہم مایوس نہیں ہیں۔ اس اشاعت میں نہیں تو آئندہ اشاعت میں ان بزرگوں کے مضامین ضرور شائع ہونگے۔ آج کئی سال بعد پہلی مرتبہ "**شخصیات**" کا پسندیدہ باب حذف کیا جارہا ہے **جرعات** کی طوالت نے ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ آئندہ اشاعت میں ہندوستان کے مشہور استاد حضرت مولانا ثاقب لکھنوی کے حالات کلام اور تصویر پیش کی جائے گی۔ "مشاعرہ شاعر" میری توقع کے مطابق شائع نہیں ہو رہا ہے۔ مگر میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی سخت علیل ہیں۔ اللہ انہیں صحتِ کلی عطا فرمائے (آمین) (ناظرین بھی دعا فرمائیں) حضرت مولانا آسی وعدہ کرکے بھول گئے اور بعض بزرگوں نے جواب تک کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ بہرحال جو محترم اساتذہ اور شعرا "مشاعرہ شاعر" میں شریک ہیں انہیں سے شاعر کے صفحات جگمگ کر رہے ہیں۔

جدید خریدار دینے والے کرم فرما

جناب حمید اللہ صاحب آذر ناگپوری	۲ خریدار
جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی	۲ "
جناب [illegible] گراری نقشبندی	۲ "
جناب مخدوم سید علی آسد نقوی البخاری احمد آبادی	۱ "
مسٹر رام سنگھ بی۔اے	۱ "
محمد یعقوب خانصاحب تبسم سیتاپوری	۱ "
محمد جلال صاحب بی۔اے کرٹیہ	۱ "

امدادی فنڈ

سمیع اللہ خانصاحب رضا نظامی	۵
[illegible]	[illegible]

مکتبۂ قصر الادب

مکتبۂ قصر الادب میں اپنی ذاتی مطبوعات کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں کی معیاری کتابیں بھی ملتی ہیں۔ چند ماہ سے دوسرے اداروں کی کتابیں ختم ہوگئی تھیں اور مکتبہ کو بڑا افسوس ہے کہ وہ اہلِ ذوق کی فرمائشیں پوری نہ کرسکا۔ کاغذ کی شدید گرانی نے کتب خانوں کے لئے جتنی مشکلات پیدا کردی ہیں۔ اُن کے تحت نئے ایڈیشنوں کی طباعت قریب قریب ناممکن سی ہوگئی ہے۔ بہم جد و جہد کے بعد مکتبۂ قصر الادب نے وہ کتابیں منگالی ہیں جن کے لئے صاحبانِ ذوق بیچین تھے۔ جن حضرات کو **نشاطِ روح**، **محسوساتِ ماہر**، **چراغِ سخن**، **بزمِ خیال**، **مشاطۂ سخن**، **معین الشعرا**، **سحرِ تبسم**، **نکاتِ شاعری** اور حضرت احسان دانش کے مجموعوں کی ضرورت ہو وہ فوراً منگالیں۔ آئندہ شاید ان کتب کے حصول میں پھر وہی دقت پیش ہو جو پہلے ہوئی تھی۔ اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ ان میں سے بعض کتابیں کسی قیمت پر بھی نہ مل سکیں۔

"مکتبۂ قصر الادب" کی مشہور مطبوعات "کلیم عجم"، "کارِ امروز"، "دستور الاصلاح" اور "علم فہم عروض" کی بھی چند کاپیاں رہ گئی ہیں ایک دو ماہ بعد ان میں سے کوئی کتاب نہیں مل سکیگی۔ لہذا جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ اوّلین فرصت میں منگالیں۔

پوسٹ ماسٹر جنرل توجہ فرمائیں

اِدھر تو کاغذ کی شدید گرانی اور نایابی پریشان کن ہے اُدھر محکمۂ ڈاک کی بد انتظامی حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔ خریداروں کو رسالہ انتہائی احتیاط کے ساتھ بھیجا جاتا ہے اور پتوں کی چٹوں کا مقابلہ کرلیا جاتا ہے تاکہ کوئی نام نہ رہ جائے مگر باوجود ہر ماہ رسالہ نہ پہنچنے کی شکایتیں بہت بڑی تعداد میں آتی ہیں۔ اس طرح نہ صرف خریداروں کو بدظنی اور تکلیف ہوتی ہے بلکہ دفتر کو بھی شدید نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ہم پوسٹ ماسٹر جنرل سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ڈاکخانہ جات کو ایک تہدیدی سرکلر بھجوا دیں تاکہ سب آفس زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیں اور ڈاکخانے کے وہ لوگ جو مفت کے رسالے پڑھنے کے عادی ہیں متنبہ ہو جائیں۔

تین باتیں

(۱) دو تین ماہ سے "شاعر" تعویق کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور یہ تعویق نہ صرف نقصان کا باعث ہے بلکہ خریداروں کے لئے بھی تکلیف دہ ہے۔ ہمیں احساس ہے [illegible] مگر [illegible] مشکلات [illegible] [illegible] [illegible] انشاء اللہ [illegible] اپنے وقت پر [illegible] [illegible] (۲) [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس سلسلے میں بارہا درخواست کی گئی ہے کہ اگر [illegible] [illegible] [illegible] (۳) [illegible]

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

انساں کی تادیب ابھی جاری ہے
خونخواری تہذیب ابھی جاری ہے
بن بن کے بگڑتے ہیں ہزاروں آلات
تعمیر کی تخریب ابھی جاری ہے

برہم یہ معاربہ نہیں ہو سکتا
تاحشر بھی فیصلہ نہیں ہو سکتا
لوہے اور تیل کا ہے امکاں جب تک
اس جنگ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا

چھوٹا سا سوال ہے بڑا ہول نہیں
کیا حکمتِ انساں میں ابھی جھول نہیں؟
دیتی ہے زمیں روز لوہا اور تیل
اسکے لئے کوئی برتھ کنٹرول نہیں

چین و رشیا میں اب وہ ہمت ہی نہیں
صرف ایک محاذ پر قناعت ہی نہیں
کس طرح نئے محاذ تیار کرے
برٹش کو معاونت سے فرصت ہی نہیں

جنرل ویول، زعیمِ بربادیِ ہند
ملنے گئے حکمرانِ آبادیِ ہند
یہ مردِ سپاہی ہیں تعجب کیا ہے
ہو جائیں شریکِ جنگِ آزادیِ ہند

جو بھارت کے سپوت کہلاتے ہیں
عبرت ہے کہ بھوکے وہ مرے جاتے ہیں
اس ملک میں آج ایک صوبے والے
املی کے بیج پیس کر کھاتے ہیں

کمیاب ہے زندگی کا ساماں یہاں
ہر شخص ہے حیران پریشاں یہاں
جاری جو یوں ہی رہیگا قحطِ اجناس
انسان کو کھا جائیگا انساں یہاں

گلشن میں اجالا، نہ بیاباں روشن
کیونکر ہو مشاہدے سے ایماں روشن
ملتا نہیں تیل جھونپڑے والوں کو
برقی فانوس سے ہیں ایواں روشن

مزدور کے گرد آگ کا شعلا دیکھ
دنیا میں جہنم کا یہ نظارا دیکھ
دن رات جھلس رہے ہیں زندہ انساں
جا غور سے "آتشکدۂ ٹاٹا" دیکھ

یارب کہیں نام کو بھلائی نہ رہی
غالب انساں پہ کبریائی نہ رہی
کیا سونپ دی تو نے خود سروں کو دنیا
کیا اب تری دنیا میں خدائی نہ رہی؟

سیماب

تحقیق و تصحیح

دُلہن — یا — دُلہن

"شاعر" بابت اپریل ۱۹۴۲ء میں بعنوان "بذیل تحقیق و تصحیح" آپ نے مجھ سے بھی دُلہن کے اعراب دریافت فرمائے ہیں۔ لہٰذا بتعمیل استفسار میری رائے یہ ہے کہ فصحائے لکھنؤ اس لفظ کو بہ ہائے مخلوط بوزن گُلشن بولتے ہیں۔ بوزن گلشن اُن کی زبان پر مستعمل نہیں۔ البتہ بعض شہری عوام الناس نیز قصباتی اشخاص کو دُلہن یا دولہن بولتے سُنا ہے۔ مگر یہ دونوں تلفظ پایۂ فصاحت سے ساقط ہیں۔ غالباً اسی بنا پر صاحب نفائس اللغات نے اپنے لغت میں اس لفظ کے دو اعراب درج کئے ہیں [۱] بضم اوّل وسکون دوم و فتح ہا و نون در آخر [۲] بضم اول و فتح ثانی مخلوط التلفظ بہا و سکون نون بمعنی عروس۔ لیکن پہلی صورت بوزن گلشن ثقات اہل شہر کی زبان پر رائج نہیں دوسری شکل بروزن کُہن مختار ثقات شعرا ہے اور میری رائے میں بھی یہی درست ہے۔

صفی لکھنوی

لفظ دُلہن تین طرح ہے جو مستعمل ہے فصحا کا ایک جمِ غفیر دہلی لکھنؤ میں بہ ہے مخلوط بروزن "صُوَر" بولتا ہے۔ مرزا داغ کے یہاں بھی اسی طرح ہے۔ لیکن خود دہلی میں "دُلہن" بفتح ہائے ہوز بروزن دشمن بھی بولتے ہیں اور اس کو غلط نہیں کہا جا سکتا اگرچہ "شاعر" کے لئے کوئی شعر اس کے ثبوت میں کسی صاحب نے پیش نہیں کیا مگر میں ضیاء الدین عبرتؔ[۱] مصنف پدماوت کا یہ شعر پیش کرتا ہوں جو انھوں نے اس جگہ لکھا ہے جہاں راجہ رتن سین اپنے گھر سے رخصت ہو کر پدماوت کے عشق میں راج پاٹ کو ٹھوکر مار کر جاتا ہے اسکی رانی اور اسکی ماں اس کو سمجھاتی ہے لیکن وہ ایک نہیں سنتا۔ مجبور ہو کر گھر والے اسکو اپنی اپنی نشانیاں دیتے ہیں۔ اسی جگہ کا یہ شعر ہے ؎

وہیں چیرا اُس نے بس بائیں جھنگلیا
جبیں پر قشقہ اُس جوگی کے کھینچا

اُسی جگہ کا دوسرا شعر ہے ؎

گلے میں اُس کے ڈالی بٹ کے سیلی
کہا سائیں ترا اللہ بیلی

اُسی جگہ کا ایک یہ شعر ہے ؎

تو جب دُلہن کے گھر جائیگا جانی ۔۔۔ یہ کنگنا اُس گھڑی ہوگا نشانی

افسوس کہ کتاب مذکور کے بعض حصے میرے دماغ میں ہیں مگر کتاب نظر کے سامنے نہیں ہے اس لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ گفتگو رانی کی ہے یا راجہ کی ماں کا کلام ہے بہر صورت شعر میں کوئی غلطی یا تبدیلی نہیں ہے۔

سوداؔ کے دو شعر جو دو مختلف مرثیوں میں ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں اور جگہ بھی اُمید ہے کہ یہ لفظ یوں ہی ہوگا ؎

ڈس گیا داماد کو نیزہ ہو ناگ ۔۔۔ مل گیا ماٹی میں دولہن کا سہاگ
پہنائیں کھانچیاں نیزوں پہ دھرلیں ۔۔۔ چلے دولہن کے گھر یوں لے مٹھائی

لکھنؤ میں عوام پوربی لوگوں کے دو لہجے ہیں جو معتبر نہیں (دُلاہن) دُولَہَن بروزن سُوجن

عبدالباری آسی

لفظ دلہن کے متعلق آخری فیصلہ اگست کے "شاعر" میں کیا جائیگا۔ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے اساتذہ اور ماہرین علم و فن بھی اس طرف متوجہ ہوں۔ علامہ کیفی چریاکوٹی۔ علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ شمس العلماء حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی۔ علامہ شفق عماد پوری۔ فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری۔ حضرت مولانا ثاقب لکھنوی سے بطور خاص استدعا ہے۔ لفظ دلہن کی تحقیق میں یہ امر ملحوظِ نظر رکھنا چاہئے کہ یہ لفظ ہندی سے ہماری زبان میں آیا ہے نیز شعرا اور ادبا نے دونوں طرح استعمال کیا ہے۔ اب یہ اساتذہ اور ماہرین فن کی آرا پر منحصر ہے کہ وہ اس کے استعمال کی دونوں طرح اجازت دیتے ہیں یا صرف ایک طرح۔

اعجاز صدیقی

---

[۱] کتاب پدماوت کو ضیاء الدین عبرت نے لکھنا شروع کیا مگر اُن کا انتقال ہو گیا تو پھر غلام علی عشرت نے تمام کی ——— آسی

بادۂ میخانۂ صفی

حضرت مولانا صفی لکھنوی کی ذاتِ گرامی مغتنماتِ زمانہ میں سے ہے۔ اُن کا رنگِ سخن لکھنوی شاعری کا ایک ایسا مجلّا اور مصفا آئینہ ہے کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہے اور آرزوئے دید کبھی ختم نہ ہو۔ موصوف بوجہ پیرانہ سالی مدت مدید سے ادبی و شعری دنیا کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے آستانۂ صفی پر اپنی جبینیں رگڑیں، کوششیں کیں مگر مولانا کا کلام حاصل نہ کر سکے۔ مجھے نہ صرف مسرت بلکہ فخر و ناز ہے کہ مولانائے محترم نے میری عرضداشت کو نہ ٹھکرایا اور اپنی تازہ ترین غیر مطبوعہ غزل اشاعت کے لئے مرحمت فرما دی ؎

ممنون ہوں تری نگہِ التفات کا

اعجاز صدیقی

بفیضِ صحبتِ صافیدلانِ میخانہ — بدل گیا ہے صفی زندگی کا پیمانہ
بنا دیا ہے تحیّر نے مجھکو دیوانہ — طلسم ہوشربا ہے یہ آئینہ خانہ
دماغ ملتفتِ رنگ و بوئے لالہ و گل — زبان ملتزمِ ہائے و ہوئے مستانہ
پسند سیرتِ یارانِ پاکباز مجھے — مذاقِ فطرتِ رندانہ پارسایانہ
بہم سموئی ہوئی بیخودی و ہشیاری — خدا کا شکر نہ دیوانہ ہوں نہ فرزانہ
جہاں جہاں نہیں انساں بمعنیٔ انساں — مری نظر میں وہ آبادیاں ہیں ویرانہ
نظارہ جوئے بہارِ مجاز رنگا رنگ — نگار خانۂ ہستی میں دل حریفانہ
شرابیں جلوہ نما سر بمہر شیشوں میں — حجاب نور میں دوشیزگانِ خمخانہ
زمانہ یونہی اُلٹتا رہیگا روز ورق — جو آج واقعہ ہے ہوگا کل اک افسانہ
خیال، قیدِ زمان و مکاں سے وارستہ — حریم ناز میں محوِ جمالِ جانانہ
شہیدِ جلوۂ وحدت، اثرِ کثرت — کہ جیسے شمع کی لَو پر ہجوم پروانہ
حباب و قطرہ و موجِ یم و کفِ سیلاب — یہ سب ہیں ایک مگر صورتیں جداگانہ

الگ الگ بھی ہے پھر ساتھ ساتھ بھی سایہ
صفی! کہو اسے اپنا کہوں کہ بیگانہ

صفی لکھنوی

"امراؤ جان ادا" پر ایک نظر

ادبی تصانیف خصوصاً ناول اور افسانے اپنے زمانے کے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی خیالات اور حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں وہ تصانیف بالکل کامیاب تصور کی جاتی ہیں جو اپنے ماحول کا صحیح نقشہ پیش کر سکیں۔ اس نظریے کے ماتحت جب ہم ڈاکٹر رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" پڑھتے ہیں تو ہمیں اُس زمانے کا ماحول جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُس وقت کے لکھنؤ کی سچی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے جب نواب واجد علی شاہ اختر کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور لکھنؤ کی قسمت کا ستارا جھلملا رہا تھا لکھنؤ کے در و دیوار پر اُس کی مٹتی ہوئی عظمت کی داستانیں شاہزادوں کی حسرتوں کے خون سے لکھی جا چکی تھیں۔ شاہی عمارتیں اپنے شاندار ماضی کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ رسوا کا قلم مٹتے ہوئے نوابوں اور دم توڑتے ہوئے رئیسوں کی ظاہری شان و شوکت کا منظر نہیں کھینچتا بلکہ اس شان و شوکت پر خونی آنسو بہاتا ہے جس کا ہم تصور بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔ مشاہدات کا دائرہ محدود ضرور ہے لیکن ماحول کی دلکشی ہمیں لکھنؤ کے گوشے گوشے کی سیر کرا دیتی ہے۔ مشاعرے۔ میلے بازار اور حیات و موت کی وہ سب رسوم ہم دیکھتے ہیں جو اب بھی کہیں کہیں پرانے لکھنؤ کی یادگار ہیں۔ یہ کامیابی رسوا کے تیز مشاہدے کی ممنونِ احسان ہے کہ چوک کی دلفریب گلیاں حُسن کی رعنائیوں کو پیش کرتی ہیں اور ہمیں وہاں پہونچا دیتی ہیں جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ "نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہیں۔ فرش پر سنہری چاندنی کھنچی ...... بڑے نقشی پاندان۔ حُسن دان۔ خاصدان...... اُگالدان اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہیں دیواروں پر جلسی آئینے عمدہ عمدہ تصویریں...... ڈوڈو بہریاں ڈو ڈو خدمتگار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں" لیکن ساتھ ہی ساتھ جب ہم بُوا حسینی کی کوٹھری کی طرف نظر اُٹھاتے ہیں تو دوسرا ہی سماں دکھائی دیتا ہے۔ ڈوپٹہ۔ چھینکے۔ سل بٹہ۔ بدقلعی ہانڈیاں۔ غرض کہ ہر وہ چیز وہاں نظر آتی ہے جو غریب طبقے کے لوگوں کے گھر کا زیور ہے۔

ہر سر مقام کا ذکر کرتے وقت رسوا کی دُور رس نگاہیں معمولی سے معمولی چیزوں پر پڑتی ہیں وہ اصلیت کو بے نقاب کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے لیکن اصلیت کی عریانی سے آرٹ کا دامن بدنما نہیں ہونے پاتا۔ وہ لکھنؤ کی ان شرمناکیوں اور تلخیوں کا عکس اُٹھاتے ہیں جو حیا سوز تھیں۔ اہل طوائف الملوکی کی ہمہ گیری پر روتے ہیں۔ جن میں لکھنؤ کے زوال کا راز مضمر تھا۔ لیکن وہ ان شاعروں کا بالتفصیل ذکر بھی کرتے ہیں جن سے یہاں کے لوگوں کا ادبی مذاق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ماحول کی اسی نظر فریب عکاسی نے رسوا کے اس ناول کو ایک تاریخی اہمیت دیدی اور اسی لئے یہ ناول رسوا کا شاہکار مانا جاتا ہے۔

مقامات اور رسوم کے علاوہ رسوا اس زمانے کے لوگوں کی روزمرہ زندگی بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس خیال پر عمل کرتے ہیں کہ "ناول نویس ان واقعات کو علی العموم تحریر کر دیتا ہے جو ہر شخص اس زمانے میں دیکھتے ہیں۔" ہر طبقے کے لوگ اپنے مخصوص لباس میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لکھنؤ کی جوانی ڈھل چکی ہے لیکن اب بھی گزرے ہوئے رئیسوں کا ایک طبقہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ اسی شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں لیکن مفلسی اُنکی حالت پر قہقہے لگاتی ہے۔ جوان اور عیش پسند طبقہ بھی ہے جو غلامی اور غلامی کی تکلیفوں کے شدید احساس کو شراب و ساقی کی مدد سے بھولنا چاہتا ہے۔ ایسے مولوی بھی ہیں جو عمامہ، عبا اور سفید داڑھی کے ساتھ ساتھ حُسن پرستی کی بدترین منزل تک پہونچتے ہیں۔ نئے بگڑے ہوئے طالب علم بھی ہیں جو اپنی مضحکہ خیز صورت اور قلندری لباس کے باوجود اپنے کو حسین سمجھتے ہیں۔ سراپا پیش کرنے میں رسوا کو کمال حاصل ہے۔ خورشید جیسی حسین طوائف کا نقشہ حیرت خیز ہے لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کرتے ہیں۔ بالکل سچی تصویر جسکو بات میں دیکھکر انسان ڈر جائے ملاحظہ ہو ——— "سیاہ جیسے توا۔ اس پر چیچک کے داغ .... لال لال آنکھیں۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ بھدی ناک۔ بڑے بڑے دانت۔ فربہ انتہا سے زیادہ اس پر ٹھنگنا قد" لیکن گدڑی کی گہرائیوں میں لعل بھی دیکھتے ہیں۔ اسکا اصل جوہر یہ ہے کہ "معلومات بہت اچھی تھی۔ موہ چھنا اُنھیں کے گلے سے نکلتے سنا"

رسوا کی فطرت نگاری کا کمال اُنکے پیش کردہ کرداروں میں نمایاں ہے جو مٹی کی خاموش و ساکت مورتیں نہیں بلکہ ہم ہی لوگوں کے سے چلتے پھرتے انسان ہیں نہ وہ اہر من ہیں نہ یزداں، نہ خباثت کے مجسّمے ہیں نہ معصومیت کے مرقعے بلکہ ان میں اچھائیاں اور بُرائیاں دونوں ہیں۔ ہر ایک کردار فطری ہے اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف ماحول ایک ہی ہے ایک ہی عورت کی سرپرستی میں دو عورتیں پرورش پاتی ہیں۔ تعلیم بھی ایک ہی قسم کی ہے اور پیشہ بھی۔ لیکن عادتیں بالکل متضاد۔ صورت میں فرق ضرور ہے لیکن زیادہ کامیاب ہونے والی ناکامیاب ہے اور کم کامیاب ہونے والی زیادہ کامیاب ہے خورشید بے پناہ حسین ہے۔ پھولوں کی نزاکت اور لطافت کا ایک مجسمہ فطرت کی تمام

زنگینیاں انسانی شکل میں جمع ہو گئی ہیں۔ ہنستی ہے تو پھول جھڑتے ہیں لیکن وہ ہنستی ہی کب ہے؟ ایک خاموش معصوم سی صورت ـــــ جس طرف نظر بھر کے دیکھے فطرت مسکرا دے ـــــ ادا سے چلے تو کائناتیں جھک جائیں ـــــ ہاتھ پاؤں سڈول، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بھرے بھرے بازو ـــــ گول کلائیاں جامہ زیبی قیامت کی۔" یہ سب صفتیں موجود اور پھر بھی ایک ناکامیاب پیشہ ور۔ خانم خفا ہونے جلنے والے رنجیدہ، خود اپنی جان سے بیزار، عشق کا بھوت سر پر سوار، ایک بیوفا سے محبت اور وہ بھی راحت کا ساتھی، مصیبت پر ہنسنے والا۔ فقیر فقرا پر کامل اعتماد۔ محبت کرتی ہے اور اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے دوسرا کردار بسم اللہ جان کا ہے یوں تو ان کی صورت اچھی بھی ہے لیکن وہ بات کہاں جو خورشید میں ہے۔ یہ ایک کامیاب عورت ہے۔ سیکڑوں اس کی نظر التفات کے خواہاں لیکن وہ التفات کا نام ہی نہیں جانتی۔ شریر، شوخ، بدمزاج اور ہنس مکھ سب کچھ ہے مگر تڑپانا خوب آتا ہے۔ محبت سب سے کرتی ہے۔ لیکن حقیقتاً کسی سے بھی نہیں کرتی۔ ادائیں قدم قدم پر ـــــ لباس بالکل بانکا اور گہنوں سے لدی ہوئی، ہر جگہ اسکی قدر ہے۔ لیکن اس کا منہ سیدھا نہیں ہوتا۔ لگاوٹ کی باتوں میں ایسی مٹھاس کہ فرشتوں کو بھی لبھائے اور آنکھوں میں ایسا جادو کہ زاہدوں کی بھی توبہ ٹوٹ جائے ـــــ شوخی ایسی کہ ستر برس کا بوڑھا پیر پر چڑھے اور خود بیٹھی ہنسا کرے اور غصہ ایسا کہ اگر کوئی بات پوری نہ ہو تو خانم کو منہ در منہ پھٹکار دے اور اسی طرح دوسرے کردار گوہر مرزا، سلطان صاحب، اور خانم وغیرہ ـــــ حیرت انگیز فنی کمال کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن امراؤ جان کا کریکٹر بہت زیادہ ضروری ہے اور سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔ یہ ناول کی ہیروئن ہیں۔ ہمارے سامنے انکا بچپن بھی پیش کیا گیا ہے۔ جہاں معصومیت، شوخی سے گلے ملتی ہے پھر انگاروں پر لوٹتی ہوئی جوانی آتی ہے۔ جب بازارِ حسن میں شوخ نگاہوں کی بےچین کشش جذبات کی دنیا میں طوفان برپا کر دیتی ہے۔ سارے شہر میں حسن کا چرچا ہوتا ہے اور آخر کار انگڑائیاں لیتے ہوئے شباب کو جواسی آتی ہے اور قابلِ نفرت بڑھاپا کسی "گنہگار" کے خواب کی طرح اسکی ہستی پر چھا جاتا ہے۔ عشرت آب ماضی کی دلخراش یادیں عاقبت کے اندیشوں سے ٹکرا کر زندگی کو وبالِ دوش بنا دیتی ہیں۔ لیکن فطرت نگاری کا کمال یہ ہے کہ ہمیں اس نفرت انگیز جذبہ کا احساس نہیں ہوتا جو ایک طوائف کے تخیل کے ساتھ وابستہ ہے۔ رسوا کی کردار نگاری اس لئے بہت زیادہ کامیاب ہے کہ اخلاقی نقطۂ خیال سے بقدر گری ہوئی عورت کے ساتھ بھی ہماری ہمدردی ہے

خورشید اور بسم اللہ کے کریکٹر کو پیش کر کے امراؤ جان کا کردار بلند کر دیا گیا ہے۔ واقعات بہت زیادہ نازک اور عریاں بیان کئے گئے ہیں لیکن آرٹ کا لطیف پردہ کریہہ منظر کو سامنے بھی آنے نہیں دیتا اور حقیقت کا خون بھی نہیں ہونے پاتا۔ کردار ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ماحول سے مجبور ہو کر شرمناک اور عبرتناک حرکتیں کرتے ہیں مگر پھر بھی ہماری ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہیں اور ہمیں اس شرافت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو رسوا کے قلم کی طرۂ امتیاز ہے۔

ناول کے زیادہ سنجیدہ پہلو پر غور کرنے کے بعد ہمیں نفسیات کے نازک اور اہم نکتے بھی نظر آئیں گے۔ حسن و عشق کے نفسیاتی پہلو پر رسوا نے بہت گہری نگاہ ڈالی ہے اس قسم کے سنجیدہ جملوں کو ہم ناول کا حاصل کہہ سکتے ہیں رسوا کے کریکٹر سب انھیں فطری خصوصیات کے حامل نظر آتے ہیں۔ انسانی زندگی خصوصاً عورت کی زندگی کا ایک عزیز لمحہ وہ ہے جسے امراؤ جان ادا یوں کہتی ہیں: "میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ اُسے کوئی چاہے ـــــ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے بلکہ عنفوانِ شباب کے ساتھ اسکی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اسکا نشوونما ہوتا رہتا ہے........" خورشید، بسم اللہ اور امراؤ کی زندگی میں یہ موقع آتے ہیں اور ان کی خواہشات بڑھتی جاتی ہیں۔ یہ عشق ظاہر سب کرتی ہیں اور اسکی متمنی بھی رہتی ہیں لیکن یہ صرف ظاہرداری پر قائم نہیں ہو جاتی ہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں اپنی جگہ چاہتی ہیں ـــــ انسانی زندگی تغیر پسند ہے اور یہ زندگی ایک سی نہیں رہتی ـــــ زمانے کے ساتھ ساتھ جوان جذبات پر بھی پیری آتی ہے اور "سن کا تقاضا بھی تو کوئی چیز ہے۔ جوشِ جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گزر جاتی ہیں۔ سن آخر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہئے تاکہ اعتدال قائم رہے۔"

اس ناول میں محبت کا نظریہ عام اور فرسودہ نظریے سے مختلف ہے۔ اس ناول کے کردار عشق ضرور کرتے ہیں۔ لیکن ناکامیابی پر جان دینے نہیں جاتے اور نہ مجنوں بنکر گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ عشق کے جذبات کا وقتی طوفان۔ دماغی توازن قائم نہیں رہنے دیتا اور تھوڑی دیر کے لئے ایک غیر معمولی کیفیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن زخم کتنا ہی کاری ہو اچھا ہو ہی جاتا ہے۔ وقت اور زمانے کے ہنگامے ان زخموں کو بھر دیتے ہیں۔ کردار اندھی محبت نہیں کرتے بلکہ اس منزل پر بھی پہونچے ہیں جہاں ایک دوسرے کی خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ خورشید دو دو دن کھانا نہیں کھاتی زندگی سے بیزار ہے۔ کسی سے ملاقات نہیں کرتی کسی کو زندگی کی امید ہی نہیں

لیکن بقول فراق ؎

چُپ ہوگئے تیرے رونے والے
دُنیا کا خیال آگیا ہے

دُنیا کی دلچسپیاں سودائے عشق کو بُھلا دیتی ہیں۔ ہم اس کو نواب کے ساتھ پھر خوش و خرم دیکھتے ہیں ——— دُنیا کی بندشوں میں اس طرح گرفتار جیسے دل پر کبھی چوٹ نہیں کھائی۔ نواب چھبن صاحب بھی عشق کے مارے وقتی جوش سے متاثر ہوکر دریا میں ڈوبنے جاتے ہیں لیکن زندگی زیادہ عزیز معلوم ہونے لگتی ہے اور کوشش کے بعد بھی نہیں مر سکتے۔ امراؤ جان گوہر مرزا سے محبت کرتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ اسکی خامی معلوم ہوجاتی ہے۔ وہ اس میں مردانہ ہمّت کی کمی محسوس کرتی ہیں۔ اور اُن کو ایسے انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو انکی ناز برداری کرسکے۔ رقابت کے انتہائی جوش میں سلطان صاحب کے ہاتھوں خانصاحب کا خون ہوتا ہے اور محبت کا معیار پست بھی نہیں ہونے پاتا۔ مرد، عورت، اور شادی کے مسئلہ پر بھی رسوا کا ایک معنی خیز جملہ اسکی معاشرتی اہمیت کو سمجھاتا ہے۔ امراؤ جان ادا کہتی ہیں ——— "مرد کی محبت میں صرف لذّت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذّت دونوں غرضیں شامل ہیں"۔ اس میں حُسن اور عارضی محبت کی رنگینیاں افسانے کا خاص حصّہ ہیں لیکن یہ حقیقت کی دنیا کی محبت نہیں بلکہ فانی اور مجازی دُنیا کی محبت ہے۔ اور اسکے بعد ہر شخص کو زندگی کی بندشوں میں جکڑ جانا ہوتا ہے۔ عمر کے ساتھ جذبات بھی سرد ہوجاتے ہیں اور ناول کے ختم ہوتے ہوتے زندگی کی تمام حقیقتیں بے نقاب ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

حُسنِ بیان کی دلکشی، بے تکلف طرزِ ادا اور لطفِ زبان اس ناول کی خاص خصوصیتیں ہیں ——— "زبان اور طرزِ بیان وہ ضروری اجزا ہیں جن کے بغیر دُنیا کی کسی زبان میں ادبی کارناموں کو اہمیت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسلوبِ بیان پر بحث کرتے وقت ہم دیکھتے ہیں کہ موضوع کے لحاظ سے اسلوب بیان مناسب ہے یا نہیں؟ اور بغور مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ زبان اور اسلوب بیان اس ناول کی کامیابی کا راز ہے۔ تحریر کی شگفتگی اس کا خاص جوہر ہے"۔ "نہ انکے یہاں سنسنی خیز باتیں، نہ انکی زبان میں غرابت زائیاں، نہ انکے الفاظ ترنّم ریز، نہ انکی ترکیبیں ارتعاش انگیز ——— زبان وہی روزمرّہ کی ستھری اور نکھری ہوئی اور بول چال وہی جو ہم آپ سب بولتے ہیں"۔ الفاظ میں وسعت ہے اور مختصر جملوں میں افسانے لکھ دیئے گئے ہیں۔ طرزِ تحریر میں شگفتگی اس حد تک ہے کہ جب "دامانِ باغباں" اور "کفِ گلفروش" کا ذکر ہوتا ہے تو نہایت شوخ اور لطف انگیز پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے لیکن جب کسی سنجیدہ مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں تو تحریر کی شوخی متانت سے بدل جاتی ہے اور طرزِ بیان کی اس خوبی کی وجہ سے اُن کے پیش کردہ مکالمے DIALOGUE بالکل فطری اور کامیاب ہیں۔ محلوں میں ایک مخصوص زبان بولی جاتی ہے۔ دیہاتی زبان میں اور لکھنؤ کی زبان میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ ہر کردار کی زبان سے وہی کلمات نکلتے ہیں جنکی اُن سے امید کی جاتی ہے۔ مولوی صاحب کانپور کی مسجد میں امراؤ جان سے فرماتے ہیں: "اس وقت تو نفس الامر کچھ نہیں ہے مگر میرا ایک شاگرد دکھانے کے آنا ہوگا"۔ اور اگر مولوی صاحب کا خاص لہجہ سننا ہے تو امراؤ جان کی ستم ظریفی دیکھئے فرماتی ہیں ——— "اللہ بغرض والتسلیم لوکان محالا۔ اگر کھانا آیا بھی تو وہ آپکی قوت لایموت کے لئے بھی کافی نہ ہوگا۔ میری شرکت اس میں چہ معنی اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار اشد الموت کا انتظار ہے ..... " اور اسی طرح لکھنؤ کی طوائفیں اپنے نازک لہجے میں گفتگو کرتی ہیں لیکن رام دئی بریلی جیسے دیہات کی ڈنڈی نفیس اپنے خاص لہجے میں بولتی ہے۔ خورشید کے متعلق کہتی ہے "خاک گانا وانا نہیں آتا، ہاں ناچتی ذرا اچھا ہے۔ راجہ صاحب اسی پر لٹو ہیں"۔ اور اپنی زبان اس حد تک استعمال کرتی ہے کہ امراؤ جان کو لفظِ "گدائی" پہ ہنسی آتی ہے لیکن وہ اپنے مخصوص انداز میں تعجب کا اظہار یوں کرتی ہے "اے لو، گدائی نہیں جانتی۔ کیسی بتیریا ہو"۔

قابل مصنف اپنی خاص انفرادی طرزِ تحریر کے ذریعہ ہم کو کسی جذبے سے یکسر خوش یا رنجیدہ نہیں رکھتا بلکہ موضوع جلدی جلدی تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ سنجیدگی جب حد سے گزر جاتی ہے تو ظرافت اسکی جگہ لے لیتی ہے۔ خورشید کی ناکامیوں سے متاثر ہوکر ہمارے چہرے زیادہ دیر تک شکن آلود نہیں رہتے بلکہ میلے کی گوناگوں دلفریبیاں ہمارے سامنے آجاتی ہیں وہ دلفریب مناظر ہم کو متوجہ کرلیتے ہیں۔ جنکو پیش کرنے میں رسوا کو کمال حاصل تھا اور عبدالماجد صاحب دریابادی اس حد تک کہتے ہیں کہ "ہر نقل پر اصل کا گمان، ہر تخیّل میں حقیقت کا نشان، تصویر پر صورت کا دھوکا، الفاظ میں معانی کا جلوہ"۔ لیکن مناظر سے زیادہ وہ جملے کار گر ہوتے ہیں جو رسوا کے اعلیٰ مذاق کا پتہ دیتے ہیں۔ میلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ——— "ایک صاحب آئے تو میلے ہیں مگر بہت کدورت میں ہیں جبیں پر کچھ بچکے بچکے تیور بدلنے بھی جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بیوی سے لڑکے آئے ہیں۔ میں

باتوں کا جواب بروقت نہ سوجھا تھا اب یاد کر رہے ہیں" اور اسی طرح کا نمونہ میں امراؤ جان مولوی کے لب لہجہ اور زبان کی ایسی نقل کرتی ہیں کہ ہم بیاختہ ہنس دیتے ہیں۔ کچھ کردار مثلاً بسم اللہ کے حسن کے دلدادہ مولوی صاحب، اور نئے آئے ہوئے طالب علم کچھ ایں مضحکہ خیز لباس اور وضع قطع کے ساتھ اسٹیج پر لائے جاتے ہیں جنکی صورتیں رسوا کے ظرافت پسند قلم کا ثبوت ہیں لیکن جب ظرافت کی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں تو مذاق غیر فطری معلوم ہونے لگتا ہے۔ ستر برس کے بڈھے کا بٹر پر چڑھنا اتنا دور از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دلچسپیاں ایک نامحسوس سی بے چینی سے بدل جاتی ہیں اور بجائے اسکے کہ ہم بسم اللہ کی اس حرکت کو شوخی قرار دیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بسم اللہ کے کریکٹر پر ایک بدنما داغ ہے۔ ہنستے ہنستے یہ واقعہ ہم دیکھتے ہیں لیکن غریب اور معذور بڈھے کو واقعی بٹر پر چڑھتا ہوا دیکھکر ایک فطری سُرخی اور مسرت آمیز چمک کے بجائے ایک غیر معمولی سنجیدگی ہمارے چہرے پر چھا جاتی ہے۔

انسان انسان ہے فرشتہ نہیں اور لغزشیں اسکا طرۂ امتیاز ہیں۔ رسوا کی ان تمام ناقابلِ فراموش محنتوں کے بعد بھی ہمیں چند افسانوی غلطیاں اس ناول میں نظر آتی ہیں۔ منشی احمد حسین کا کریکٹر شروع ناول ہی میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ آخرِ افسانہ تک خاموش ہیں اور یہ اک خاموش اور بے حس و حرکت کردار اس ناول میں غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان دو ایک خامیوں کی وجہ سے رسوا کے اس شاہکار پر کوئی دھبہ نہیں آتا۔ اُن کی عظمت ناول نویس اور تاریخ نگار کی حیثیت سے ناگزیر ہے۔ مناظرِ فطرت کے عریاں جلوے اور شادی۔ موت۔ میلے اور رسموں کے نقشے لکھنؤ کی زندگی کو زندۂ جاوید بنا گئے۔ انگریزی زبان کے اثر کے باوجود ایسی صاف، ستھری اور کوثر کی دُھلی ہوئی زبان لکھنا رسوا کے قلم ہی کا سحر ہے۔ کردار نگاری میں رسوا کی کامیابی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور ناول ہماری زندگی سے ایک خاص تعلق رکھتا ہے۔ ناول نگاری کے خصوصیات کو دیکھتے ہوئے امراؤ جان آدا ایک اعلیٰ معیاری ناول ثابت ہوتا ہے۔

سید ذکی رضا بی۔ اے (آنرز)

فکرِ جمیل

ہمتِ ذوقِ نظر کو آزمانا ہی پڑا
جلوہ گاہِ ناز کا پردہ اُٹھانا ہی پڑا

قصۂ بے کیفیٔ عالم سُنانا ہی پڑا
عشق کی خوابیدہ قوت کو جگانا ہی پڑا

کفر کی حد سے تھی ملحق راہِ ایمان و یقین
اپنے ہر نقشِ قدم پر سر جھکانا ہی پڑا

کشمکش پر منحصر تھی جنبشِ نبضِ حیات
خواہشِ تسکینِ دل سے باز آنا ہی پڑا

روح کی آزادیوں پر حرف جب آنے لگا
بجلیوں کو آشیاں تک کھینچ لانا ہی پڑا

پیش کرنا تھا یہ تحفہ بارگاہِ حُسن میں
داستانِ درد کو رنگیں بنانا ہی پڑا

دلکشیٔ ذات پر جب چھا گیا رنگِ صفات
جلوۂ بیباک سے دامن بچانا ہی پڑا

نامرادی نے بڑھا دی جراتِ عزم و عمل
حادثاتِ زندگی پر مسکرانا ہی پڑا

کس قدر ہمت شکن تھی تابشِ روئے جمیل
ہم نے جب نظریں اُٹھائیں سر اُٹھانا ہی پڑا

جمیل سیوہاروی

پیامِ جاوید

خودی ہے خالقِ آفاق عقل وقفِ سجود
خدا نصیب کرے تجھ کو عشقِ لامحدود

مری نوائے حزیں ہے مثالِ چوبِ کلیمؑ
ترا جنوں ہے اسیرِ طلسمِ نام و نمود

عطا ہوئی ہے مجھے شوکتِ خود آگاہی
نہ بادشاہتِ فرعون و سطوتِ نمرود

تری نظر ہے خرابِ جمال و زیبائی
مری نظر میں علاماتِ غایب و موجود

مرا کلام مزین بہ قدرتِ تخئیل
ترے کلام کا ہر ایک حرف زنگ آلود

مری خودی سے ہی قائم بنائے کون و مکاں
مرے جنوں نے بجھائی ہے آتشِ نمرود

شکست و ریخت کی بیہودہ خواہشوں سے گذر
جہاں تمام ہے بتخانہ اور تو محمود

مجھے یہ ڈر ہے نہ کھو جائے کاروانِ حیات
قدم قدم پہ فراز اور راستہ مسدود

مدارِ ہفت کواکب پہ اعتبار نہ کر
یہ نیل زارِ فلک بھی ابھی ہے نامشہود

سوادِ منزلِ لاہوت پر قرار نہ کر
تری نظر کو ہے لازم جہانِ لامحدود

عبودیت کی تمنا ہے عشق کی توہین
کہ عشق ہے ہمہ تن جلوہ گاہِ لاموجود

خیالِ عظمتِ رفتہ ستا رہا ہے مجھے
کہاں وہ شعلۂ سوزاں کہاں یہ موجۂ دود

قریب تر ہے اگرچہ طلوعِ نورِ سحر
میں سن رہا ہوں ابھی تک ترانۂ زحل کا سرود

کھٹک رہی ہے مرے دل میں وہ خودی جس سے
جنونِ پردہ دری ہے ہنوز نامسعود

زبانِ اہلِ حقیقت کہیں نہیں رکتی
ہجومِ دار و رسن ہو کہ آتشِ نمرود

خرد کی آگ نہیں لالہ زارِ ابراہیمؑ
اس آستیں میں ابھی بت ہیں سیکڑوں موجود

حریمِ ناز میں بیٹھا رہا تو۔ اور یہاں
نگاہِ شوق نے تخلیق کر لئے معبود

افسر احمد نگری

نقابِ سیاہ

انگلینڈ کے ایک افسانہ نگار چارلس ڈکنس کا ایک شاہکار

(۱)

بارش ہو رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ ینگ ڈاکٹر کرسی پر اطمینان سے لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا۔ اسکا دل مختلف خیالات و افکار کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ اگر وہ مفلس و قلاش ہوتا تو مکان کی عدم موجودگی اسکے لئے کس قدر اذیت رساں ہوتی۔ کبھی دل ہی دل میں یہ غور کرتا کہ جب بڑے دن کی تعطیل میں گھر جاؤنگا تو میرے خویش و اقارب مجھ کو مل کر کس قدر مسرور ہونگے۔ میری ہونے والی شریکِ حیات کو یہ سُن کر بہت مسرت ہوگی کہ اب میرے شفاخانہ میں مریض آنا شروع ہوگئے ہیں ———— وہ پھر سوچنے لگا کہ وہ دن کیسا مسرت خیز ہوگا، جب میرے پاس پہلا مریض آئیگا ———— ہاں یہ بھی تو ہوسکتا ہو کہ میرے پاس کبھی کوئی مریض ہی نہ آئے ———— بالآخر وہ اپنی ہونیوالی شریکِ زندگی کا تصور کرتے کرتے سوگیا۔ دُنیائے خواب میں پہنچ کر وہ اس کی پیاری اور مسرور آفریں آواز سننے لگا۔ اس نے اپنے دوش پر بیوی کے نرم و نازک ہاتھ کو بھی محسوس کیا۔

اسکے کاندھے پر ایک ہاتھ تھا۔ لیکن، نہ تو وہ نرم و نازک تھا اور نہ چھوٹا ———— ڈاکٹر نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ اس کے ملازم کا دستِ مبارک تھا ———— ڈاکٹر کے یہاں مریض تو آتے ہی نہ تھے اس لئے ملازم بھی بیکار پڑا رہتا تھا۔ ورنہ پیپرمنٹ کی گولیوں پر ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا۔

نوکر نے کہا:۔

"ایک عورت........"

"عورت، کون عورت ———— کہاں ہے؟"

"وہاں ———— سامنے"

سامنے شیشے کے دروازے سے لگی ہوئی ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اس پُر اسرار گاہک کی طرف دیکھ کر بہت حیران و متحیر ہوا۔ اُسکا قد کافی لمبا تھا۔ وہ ماتمی لباس میں ملبوس تھی۔ چہرہ پر سیاہ نقاب پڑا ہوا تھا۔ وہ بالکل ساکت و صامت کھڑی تھی۔

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ زیرِ نقاب آنکھیں اس کو گھور رہی ہیں

"کیا آپ مجھ سے مشورہ لینا چاہتی ہیں؟" ڈاکٹر نے دروازہ کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

دروازہ اندر کی سمت کھلتا تھا۔ اس لئے وہ عورت ویسے ہی کھڑی رہی۔ صرف سر ہلاکر اثبات میں جواب دیا۔

"براہِ مہربانی اندر تشریف لائیے۔"

عورت اندر آگئی۔ اس نے ملازم کی طرف منہ کرکے اشارہ کیا کہ وہ اُس کے سامنے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔

ڈاکٹر نے ملازم سے کہا "تم باہر چلے جاؤ۔"

نوکر باہر چلا گیا اور دیوار سے کان لگا کر باتیں سُننے لگا۔ ڈاکٹر نے آتشدان کے قریب کرسی کھینچ کر عورت کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

آگ کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ عورت کے لباس کا زیریں حصّہ کیچڑ میں بھرا ہوا تھا۔

"آپ بھیگ گئی ہیں؟"

"جی ہاں"

"آپ بیمار ہیں؟"

جی ہاں میں بیمار ہوں ———— بہت بیمار ———— لیکن بیماری کا تعلق جسم سے نہیں ہے روح سے ہے ———— اپنے لئے بھی نہیں دوسرے کے لئے۔ اگر مجھے کوئی جسمانی تکلیف ہوتی تو رات کے وقت اس بارش میں نہ نکلتی۔ ہاں اگر اب سے ٹھیک چوبیس گھنٹے کے بعد میں بیمار ہوتی تو اطمینان سے لیٹ کر موت کو یاد کرتی۔ اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار رہتی ———— میں آپ کے پاس ایک دوسرے شخص کی امداد و اعانت کی خواہش لیکر آئی ہوں۔ اگرچہ وہ دستِ انسانی کی اعانت

کی حدود سے گذر چکا ہے لیکن پھر بھی میں بغیر سعی و کوشش کے اُس کو دفنا دینے کے خیال سے لرز جاتی ہوں"۔

یہ کہتے کہتے عورت کے جسم میں دہشت آمیز کپکپی پیدا ہو گئی۔

عورت کے الفاظ سچائی و صداقت کے حامل معلوم ہوتے تھے۔ ڈاکٹر اُن پر یقین کئے بغیر نہ رہ سکا۔ ابھی اُس نے کام کی ابتدا ہی کی تھی اس لئے ابھی اس کے دل میں رحم آگیں جذبات کا چشمہ خشک نہ ہوا تھا۔

اُس نے کہا:—

"اگر اس شخص کی ایسی ہی نازک حالت ہے تو میں آپ کے ہمراہ چلا چلتا ہوں آپ نے اس سے پیشتر امداد کیوں نہیں لی؟"

"کیونکہ وہ بیکار ہوتی اور اب بھی بیکار ہے"۔

آپ بہت تھک گئی ہیں پانی کا ایک گلاس پی کر، اطمینان و سکون سے گفتگو کیجئے اور بتلایئے کہ مریض کو کیا بیماری ہے اور کب سے ہے؛ تاکہ تمام حال بغور سُن کر میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ مجھے اپنے ساتھ کیا سامان لیجانا چاہئے"۔

عورت نے گلاس اُٹھایا مگر بغیر پئے ہی نیچے رکھدیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"مجھے خبر ہے، میں جانتی ہوں۔ آپ کو میری گفتگو تمہارے مریض کی سی بُری یا مکروہ محسوس ہوتی ہوگی۔ مگر میرے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ میرے متعلق اس سے پیشتر بھی ایسا خیال ظاہر کیا جا چکا ہے۔ وہ شخص جس کے متعلق میں عرض کر رہی ہوں کل صبح امانتِ انسانی کی حدود سے گذر چکا ہوگا۔ اسوقت اسکی حیات اگرچہ ایک دہشت آگیں حادثہ سے دوچار ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ آپ اس سے ملاقات کر سکتے ہیں اور نہ امداد"۔

"میں کچھ اور سوالات کر کے آپ کو پریشان و افسردہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن ابتک میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس شخص کی موت یقینی ہے اور آج جبکہ میری معاونت سے اُس کو فائدہ پہنچنے کا امکان ہے تو میں اس کو کیوں نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کو یہ بھی خوف ہے کہ کل میری امداد بے سود ثابت ہوگی اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکے۔ مگر پھر بھی آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے کل ہی دیکھوں۔ آپ کے طرز و انداز اور تاثرات سے بصاف عیاں ہے کہ وہ شخص آپ کو بہت عزیز و محبوب ہے۔ آپ اس سے بہت محبت کرتی ہیں تو اس کو آج ہی دیکھ کر علاج کیوں نہ شروع کر دوں؟

"تو کیا آپ اس کو کل نہ دیکھیں گے؟"

نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں تو آپ سے وعدہ کرتا ہوں—

لیکن اگر آپ کی غفلت و کوتاہی سے اس شخص کی قیمتی جان ضائع ہو گئی تو آپ پر بیحد ذمہ داری عائد ہو جائیگی"۔

"ذمہ داری—ذمہ داری کسی اور پر ہوگی۔ لیکن جتنی ذمہ داری مجھ پر ہے میں اُس کا جواب دے لونگی"۔

"خیر، میں آپکی بات تسلیم کئے لیتا ہوں۔ نتیجہ کا میں ذمہ دار نہیں۔ میں اسے کل ہی دیکھونگا— کتنے بجے؟"

"نو بجے!"

اُمید ہے کہ آپ کو میری کوئی بات گراں نہ گذری ہوگی۔ کیا مریض آپ کے پاس ہے؟

"نہیں وہ میرے پاس نہیں ہے!"

"اگر میں آپ کو کچھ اطمینان و یقین دلاؤں تب بھی آپ اس کی امداد نہیں کر سکینگے۔

ڈاکٹر نے دیکھا کہ مزید گفتگو سے کوئی اور بات معلوم ہونے کی توقع نہیں ہے اس لئے اُس نے گفتگو بند کر دی۔ عورت جیسے معنی خیز و پُر اسرار انداز سے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔

(۲)

بہت سے اصحاب کو اپنی موت کا موت سے پیشتر ہی علم ہو جاتا ہے— ڈاکٹر غور کرنے لگا— شاید اس سیاہ نقاب والی عورت کو بھی اپنی موت کا پہلے ہی مکمل علم ہو گیا ہو۔ لیکن پھر فوراً ہی اس کو خیال آیا کہ [illegible] موت کا علم ہو سکتا ہے نہ کہ کسی دوسرے کی موت کا۔ دوسرے عورت نے جس یقین کامل کیساتھ گفتگو کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے علم و یقین میں اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ بالآخر ڈاکٹر اس نتیجہ پر پہنچا کہ عورت کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔ وہ تمام رات سونے کی کوشش کرتا رہا مگر نیند کہاں۔ شاید آج رات نیند اس کی قسمت میں نہیں تھی۔ وہ جس قدر سعی و کوشش کرتا نیند اسی قدر دور بھاگتی تھی۔

طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی شعاع اوّلین مسرت خیز ثابت ہوتی شہر کے جس حصہ میں ڈاکٹر کو جانا تھا وہ بہت پسماندہ تھا۔ گندہ اور نفرت خیز تھا وہاں کی روشنی کے ٹھیکیدار بھی اس [illegible] معلوم ہوتے تھے۔ کچرا اور صفائی کے ٹھیکیدار با وجود [illegible]— [illegible] نہیں تھا۔ اس سے باوجود وہاں [illegible] کوئی نہ کوئی عورت مکان کے [illegible]

کو ٹاکر کٹ باہر پھینک دیتی تھی۔

کیچڑ اور دلدل کو بمشکل عبور کر کے ڈاکٹر وہاں پہنچ ہی گیا۔ ڈاکٹر جس کسی سے بھی اس عورت کے مکان کا پتہ دریافت کرتا تو ہر شخص نیا جواب دیتا بڑی کوشش و محنت کے بعد آخر وہ مکان معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ڈاکٹر دروازہ کی زنجیر کھٹکھٹاتے ہوئے ہچکچایا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ڈاکٹر بزدل تھا۔ نہیں، بلکہ وہ مکان شہر کے خاص حصّہ سے بالکل جُدا تھا پولیس اس مقام کی نگرانی نہیں کرتی تھی۔ اس لئے یہاں غنڈوں کے حوصلے بھی بہت بلند تھے۔ وہ لوگ اپنی شرارت انگیزی کے باعث یہاں آکر پوشیدہ ہو گئے تھے ——— خیر، بالآخر ڈاکٹر نے زنجیر کھٹکھٹا ہی دی۔ زینہ پر بوٹ کی چرچر سنائی دی۔

اندر سے ایک شخص نے دروازہ کھول دیا۔ فطرت نے اس شخص کو بدصورت بنانے میں خاص طور سے کام لیا تھا۔ اُس شخص کا چہرہ اس قدر زرد تھا گویا ابھی قبر سے نکل کر آ رہا ہے۔

"اندر تشریف لے آیئے محترم"!

ڈاکٹر کے اندر آ جانے کے بعد وہ شخص اسے نشست گاہ میں لے گیا۔

"کیا میں ٹھیک وقت پر پہنچا ہوں"؟

"جی ہاں بالکل ٹھیک"!

ڈاکٹر نے دہشت آمیز تعجب سے اِدھر اُدھر دیکھا وہ شخص سمجھ گیا اور کہنے لگا

"آپ یہاں تشریف رکھئے۔ آپ کو پانچ منٹ بھی انتظار نہ کرنا پڑیگا"!

وہ شخص دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ کمرہ میں بہت سردی تھی۔ دو لکڑی کی کرسیوں اور ایک میز کے علاوہ کمرہ میں کوئی چیز نہیں تھی۔ صرف ایک شکستہ انگیٹھی میں چند انگارے سلگ رہے تھے۔ دیوار پر سیل چڑھی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سکوت و سکون کی بادشاہت تھی۔ گھر کے باہر بھی اور گھر کے اندر بھی،

تھوڑی دیر کے بعد اسے کسی گاڑی کے آنے کی آواز سنائی دی۔ گاڑی رُک گئی اور دروازہ کھلا۔ آہستہ آہستہ کچھ گفتگو ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے دو تین آدمی سیڑھیوں پر کوئی وزنی چیز اُٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر خاموشی چھا گئی

(۳)

پانچ منٹ گذر گئے۔ جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں یہاں سے کب چھٹکارا ملیگا تو وہی عورت آ گئی۔ اس عورت کی لمبائی دیکھ کر شک ہوتا تھا کہیں نقاب پوش عورت کے بھیس میں مرد تو نہیں ہے۔ لیکن زیرِ نقاب سرد آہیں اس شک کو مٹا دیتی تھیں۔

عورت آگے آگے چلنے لگی اور ڈاکٹر اُس کے پیچھے پیچھے۔ دونوں بالائی کمرہ میں جا پہنچے۔ اُس کمرہ میں لکڑی کا صندوق، دو تین کرسیاں اور ایک پُرانی چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ اس چارپائی پر ایک چادر بچھی ہوئی تھی جس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ چارپائی پر کمبل سے ڈھکا ہوا ایک آدمی پڑا تھا ——— ساکت و خاموش، بے حس و حرکت ——— اسکا سر اور چہرہ کھلا ہوا تھا ٹھوڑی سے ہوتی ہوئی سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بایاں ہاتھ سینہ پر پڑا تھا۔ عورت نے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر کہا،

"یہ تو مر چکا"

عورت ایک دم کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔

نہیں نہیں محترم! ایسا نہ کہئے بہت سے آدمی جنھیں اناڑی ڈاکٹروں نے مردہ سمجھا تھا زندہ پائے گئے ہیں۔ ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھئے۔ شاید ابھی کچھ زندگی باقی ہو خدا کے لئے ایک بار پھر دیکھئے"!

"اب کچھ نہیں ہو سکتا"!

"کیوں"؟

"نبض جا چکی ہے اچھا کھڑکی کے پردے سرکا دو"!

"میں نے کمرہ میں قصداً اندھیرا کیا ہے۔ محترم! مجھ پر رحم کرو۔ اگر یہ شخص مر چکا ہے تو اسے میرے علاوہ اور کوئی نہ دیکھنے پائے"

"یہ قدرتی موت نہیں مرا ہے۔ مجھے ذرا دیکھ لینے دو"!

ڈاکٹر نے جھٹکے سے اوپر کا کپڑا اُتار کر دیکھا تو چلا کر کہنے لگا:-

"اس پر کسی قاتلانہ طریقہ کا استعمال کیا گیا ہے"!

عورت نے جوش میں آ کر اپنا نقاب اُتار ڈالا۔ ڈاکٹر نے اُس کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کی عمر پچاس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ عورت عہدِ شباب میں بہت حسین و جمیل ہو گی۔ اُسکا چہرہ درد و الم کا ترجمان بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا معائنہ جاری رکھتے ہوئے کہا:-

اس پر کسی شدید ترین حربہ کا استعمال کیا گیا ہے"!

"جی ہاں اور بڑی بے رحمی، سفاکی اور غیر معمولی اذیت رساں طریق سے"!

ڈاکٹر نے ایک مرتبہ پھر بغور دیکھنا شروع کیا۔ مردہ آدمی کی گردن متورم تھی۔ اور اس پر ایک گول نشان بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر فوراً حقیقت حال سمجھ گیا

اور کہنے لگا:-

"آج صبح جن لوگوں کو پھانسی دی گئی ہے۔ یہ ان میں سے ایک معلوم ہوتا ہے؟"

"بیشک محترم!"

"یہ کون تھا؟"

"میرا بیٹا، میرا اکلوتا بیٹا۔ جان سے بھی زیادہ عزیز۔ آنکھوں کا نور، میری ضعیفی کا سہارا!"

"اسے پھانسی کیوں دی گئی ہے؟"

"وجہ تو کوئی خاص نہیں ہے۔ عام وجہ ہے اور بالکل عام —— جب یہ لڑکا پیدا ہوا تو اس کے والد کا انتقال ہوگیا اور میں بیوہ ہوگئی —— نہ میرا کوئی دوست و عزیز تھا اور نہ میرے پاس دولت و زر —— صرف "دل کا درد" —— میں نے چکی پیسی —— دوسروں کے جھوٹے برتن مانجھے —— صرف اس کے لئے —— بغیر باپ کے بچے اکثر بدچلن اور آوارہ ہو جاتے ہیں —— اُس نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ میں نے اسے بہت کچھ سمجھایا۔ کئی مرتبہ اُس کے سامنے اشک ریزی بھی کی —— لیکن اُس نے کوئی پروا نہیں کی —— نتیجہ آپ کے سامنے ہے —— دستِ جلاد سے موت —— انفعالِ مادر —— اور دائمی دیوانگی۔

امتیاز نسیمی

طعنۂ آذری

حوصلۂ نگاہ کو اذنِ غلط روی نہ دے | ذوقِ خلش کو فرصتِ شکوۂ بے رُخی نہ دے
خاطرِ غم پسند کو عشرتِ زندگی نہ دے | خونِ جگر ہی بخش دے بادۂ سرخوشی نہ دے
ہمتِ سرکشی نہ دے فرصتِ آگہی نہ دے | خاطرِ پُرخروش کو حوصلۂ خودی نہ دے
صحبتِ حُسن و عشق کو زندگیٔ دوام بخش | بزمِ جمال میں مجھے قربتِ عارضی نہ دے
میری جبیں کو ربط ہے تیرے حریمِ ناز سے | بندہ مجھے سمجھ مگر طعنۂ بندگی نہ دے
عالمِ ممکنات کی کشمکش اک عذاب ہے | قلبِ سکوں پسند کو شورشِ زندگی نہ دے
تیری تجلیات کو جلوہ گری سے ضد سہی | میرے جنوں کو تو مگر فرصتِ برہمی نہ دے
کرکے فریب آشنا عالمِ حُسن و عشق کو | شکوۂ دشمنی نہ کر تہمتِ دوستی نہ دے
شمعِ اُمید کیوں جلے بزمِ تصورات میں | فرصتیں میرے ذہن کو فکر و خیال کی نہ دے
دامنِ آرزو مرا حرص و ہوس سے تر نہ ہو | عشقِ مجاز دے مگر فطرتِ غزنوی نہ دے

خارا تراش ہی نہیں خارا گداز بھی ہے یہ
مردِ خلیل کیش کو طعنۂ آذری نہ دے

آذر سرحدی بمبئی

چار چمن

مئی سنہ ۱۹۴۳ء کے "شاعر" میں جناب خواجہ درد اکبرآبادی کی غزل ایک متروک بحر "کامل مسدس سالم" (شش رکنی) میں شائع ہوئی تھی۔ ترک و اختیار کا انحصار طبائع پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض متروکات میں حسن ہی حسن ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اختیارات میں فرسودگی، بھدا پن اور اسلاف پرستی یا عجز طبیعت کو دخل ہو۔ بہر حال درد صاحب نے جس ترک کو اختیار کی صورت عطا کی وہ بیحد پسند کیا گیا اور اس نے دوسرے شعرا کو بھی ہمت آزمائی کا شوق ہوا۔

ذیل کی چاروں غزلیں اسی متروک بحر میں ہیں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کہیں ردیف بدلی ہوئی ہے اور کہیں قافیہ۔ غزلیں بہر صورت اپنی جگہ جاذب نظر ہیں اور لطف یہ ہے کہ ایک ہی خاندان کے چار شاعروں کی تراوش فکر کا نتیجہ ہیں۔

اعجاز صدیقی

ہوں مقیدِ غم و انبساط نہیں نہیں — مگر آئے عشق میں انحطاط نہیں نہیں
تو ستم شعار ہے اور خوگر ضبط میں — کروں چاک پردۂ انضباط نہیں نہیں
مجھے دل ملا ہے ازل ہی سے الم آشنا — میں حریصِ بہجت و انبساط نہیں نہیں
غمِ باغباں نہیں کم جلانے کیواسطے — کروں بجلیوں سے بھی احتیاط نہیں نہیں
جو ہو تیری رحمت بے پناہ سے مطمئن — وہ کرے گناہ سے احتیاط نہیں نہیں
کبھی بیخودی میں نکل گیا تھا زباں سے — تیرا نام لوں یہ مری بساط نہیں نہیں
ہے خمار آپ کا اور آپ خمار کے — کسی اور سے اُسے ارتباط نہیں نہیں

خمار نیازی اکبرآبادی

کبھی موت اور کبھی حیات نہیں نہیں — مرے واسطے یہ تعیّنات نہیں نہیں!
میں لٹاؤں ضبط کی کائنات نہیں نہیں — کہوں اور آپ سے دل کی بات نہیں نہیں
مرے غمکدے میں وہ آئیں حسن فریب ہے — دلِ غمزدہ یہ توقعات نہیں نہیں

بہ مرادِ شوق اُلٹ دی آج نقاب رُخ
سرِ حشر بھی یہ تکلفات نہیں نہیں
مجھے مشکلات بہت زیادہ پسند ہیں
کروں تجھ سے شکوۂ مشکلات نہیں نہیں
غمِ عشق دے کہ جو کائنات کی جان ہے
مجھے چاہئے غمِ کائنات نہیں نہیں
مجھے ناز ہے کہ میں وارثِ[1] کا غلام ہوں
کبھی فنِ شعر میں کھاؤں مات نہیں نہیں

میکش صابری اترولوی

تو وفا کریگا ستم شعار غلط غلط
کروں تیرے وعدے پہ اعتبار غلط غلط
مرے دل پہ رکھدیا تم نے ہاتھ بجا بجا
مجھے لیکن اس سے ملا قرار غلط غلط
ترے کہنے سے میں کہانی اپنی سناتو دوں
مگر اس میں کرسکوں اختصار غلط غلط
مجھے جلوہ گاہ میں، آپ یاد کریں مگر
رہے ہوش پر مرا اختیار غلط غلط
تری خیر ہو ترا غم ہی وجہ حیات ہے
ہوں ستم میں مجھے سازگار غلط غلط
گلِ داغہائے جگر کو میری دوام ہے
ہو خزاں نصیب مری بہار غلط غلط
یہ رقیب کہتا ہے عیش سے ہے وہ بدگماں
ذرا تو یہ کہدے ترے نثار غلط غلط

عیش اترولوی

کوئی دہر میں ہو تیرا جواب نہیں نہیں
ہوا کیا غلط ترا انتخاب نہیں نہیں
تری ہر تڑپ نہیں بربنائے مذاقِ غم
دلِ مضطرب تو ہی کامیاب نہیں نہیں
کہیں آنہ جائے نظامِ دہر میں انقلاب
ترا حسن اور رہے بے نقاب نہیں نہیں
مری عمر بھر کی جو کوششیں ہوئیں رائیگاں
میں اسے کہونگا ترا عتاب نہیں نہیں
میں فراق میں تری شاد ہوں مجھے شاد رکھ
ترے ہجر میں مرا دل خراب نہیں نہیں
مری ہست و بود میں ہے نہاں ترا شائبہ
ہو شکیل پھر بھی ترا جواب نہیں نہیں

شکیل نیازی اکبرآبادی

[1] حضرت سیماب مدظلہٗ

اُردو شعر و ادب پر ایک طائرانہ نظر

شاعری جسکی تاریخ تہذیبِ انسانی کے تقریباً ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔ ماہرینِ فن کے نزدیک ایک آئینہ ہے جسمیں بعض کے نقطۂ خیال سے تو وہ اپنا اپنے جذبات کا عکس خلقت کے سامنے پیش کرتا ہے اور بعض کی نظر میں وہ اپنی ذات کو مجملہ فطرت کے اُس فطرت کو جسکا وہ خود بھی ایک جزو ہے دیکھتا ہے اور دکھانا چاہتا ہے۔

فنِ شاعری کی تاریخ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کا بھی قدامت میں وہی درجہ ہے جو خود تاریخ بنی نوع انسان کا۔ کیونکہ یہ ایک فطری اور وہبی ملکہ ہے اور انسان کی خلقت کے ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی ظہور ہوا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ گانا اور رونا کون نہیں جانتا۔ چونکہ شاعری بھی موسیقی کی ہی ایک قسم ہے۔ یا کم سے کم دونوں متجانس ہیں لہٰذا اس ضرب المثل کے یہ معنی ہوئے کہ ہر شخص فطری شاعر ہے یا بالفاظ دیگر اپنے جذبات کو خواہ اُنکی نوعیت کچھ ہو اور خواہ وہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہوں یا قلبی تاثرات کا حسب اقتضائے فطرت بلا تصنع ظاہر کر دینے کا نام شاعری ہے۔ اپنے ارتقائی منازل پر آنے سے پہلے ابتداً شاعری کی یہی نوعیت تھی۔ شاعری کی موجودہ صورت مع ان تمام خط و خال اور رنگ و روغن کے جو بعد میں اس کا جزو بن گئے۔ اگر اس ابتدائی شکل سے مختلف نظر آئے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی ابتدائی حالت یہ نہ تھی۔ بلکہ تہذیب و تمدن انسانی کے شکنجہ میں پڑ کر بہت سے ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد دنیا کی ہر شے اپنی اصل سے متجاوز اور مختلف نظر آئے گی جیسی کہ موجودہ شاعری مثال کے طور پر اپنے مکانات اپنے مرکب اپنے صورت حتیٰ کہ اور مشروبات تک کو دیکھئے۔ ہر شے اپنی اصل سے بہت ترقی یافتہ مگر پھر بھی مشابہ نظر آئے گی اور پھر خود حضرتِ انسان کو دیکھئے اور ڈارون کی تھیوری کی داد دیجئے۔

ہر ملک اور زبان کی شاعری اپنے داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر مختلف ہوتی ہے اور ملکی معاشرتی مذہبی حالات سے متاثر ایک متمول قوم کی شاعری ایک مفلس اور مغلوک الحال قوم سے بالکل مختلف ہوگی اور جس طرح ایک آزاد قوم کی شاعری ایک محکوم اور دوسرے کی دست نگر قوم کی شاعری سے مطلقاً جداگانہ نظر آئے گی۔ اسی طرح وحشی قبائل کی شاعری اور متمدن و مہذب اقوام کی شاعری میں بھی بیّن فرق نظر آئیگا۔ بنی نوع انسان جیسے جیسے ترقی کرتے گئے اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے لوازمات بشری ارتقا پذیر ہونے لگے۔ ویسے ہی شاعری کو بھی جلا ہوتی گئی۔

انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکے کل لوازمات و متعلقات میں تصنعات کو یوماً فیوماً زیادہ دخل ہوتا گیا یہاں تک کہ اُس نے بعض امور میں حدِ اعتدال سے متجاوز ہو کر اُس لوازمہ کی ہیئت اصلی کو بھی مسخ کر دیا اور اُس کے مقصدِ حقیقی کو بھی کھو بیٹھا۔ دیگر متعلقات انسانی کے ساتھ شاعری کا بھی قریب قریب ہر ملک میں کم و بیش یہی حشر ہوا خصوصاً ایشیائی ممالک میں جذباتی شاعری جسکو حقیقی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ مسخ ہو کر تقلید محض اور ایک مفروضہ اور خیالی شے کی حیثیت میں آگئی۔ عرب کا تمدن چونکہ مقابلتاً تصنعات و تکلفات سے بری تھا اِس لئے وہاں کی شاعری کم متاثر ہوئی۔ ایران کے حالات مختلف تھے یہاں کا تمدن و تہذیب انتہائی مدارج طے کر کے اس پایہ پر آچکا تھا جہاں تصنعات زیادہ ہوتے ہیں، درحقیقت کم لہٰذا یہاں آخر میں شاعری نے بھی یہی صورت اختیار کی جسکی مثالیں اربابِ ذوق کو بکثرت ملینگی اور جنکی صراحت کی اِس مختصر تمہید میں گنجائش نہیں اب ہماری اُردو شاعری پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں رنگ ہی دوسرا تھا اسکی ابتدا جس وقت ہوئی تو عربی فارسی اور ہندی شاعری اپنے انتہائی مدارج طے کر چکی تھی اُن میں جو حسن و قبح پیدا ہونے تھے ہو چکے تھے۔ جسقدر تصنعات مفروضات کی گنجائش تھی وہ اپنا دخل کر چکے تھے اور حقیقت سے جتنا بُعد ہونا تھا ہو چکا تھا۔ چونکہ اُردو اکثر و بیشتر انہیں تین زبانوں کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا اُردو شاعری میں بھی تینوں زبانوں کے خصوصیات کا اجتماع لازمی تھا۔ اس نے بھاشا کے گھر میں جنم لیا اور نشو و نما پا کر سرزمینِ ہند میں جب پہلی مرتبہ اسکی نقاب کشائی ہوئی تو یہ عروس نوبہار اپنے چہرۂ زیبا کو ایرانی رنگ و روغن اور خال و خط سے مزین کئے ہوئے اپنے نازک دل میں ہندی جذبات کو چھپائے ہوئے اور اپنے فرقِ ناز پر بانکپن سے عربی قصابہ باندھے ہوئے زینتِ محفل بنی۔ چونکہ امتدادِ زمانہ اور تہذیب کے اثرات سے اسکی ورثائی حقیقت سے دور جا پڑی تھیں۔ اس لئے یہ کمی یہاں بھی تھی اور یہی وجہ ہے کہ دیارِ ہند میں بیٹھے ہوئے اُردو شعرا کی حقیقی آنکھیں گنگا و جمن اور وادیٔ ورندھ کے پُر فضا مناظر اور کاشی و متھرا کے دلفریب سماں کو نہ دیکھ سکتی تھیں گمان کی مفروضہ آنکھیں دجلہ و فرات تک پہنچ جاتی تھیں اور رکنا بادِ آب رکن آباد و مصلیٰ کو

طاقت حاصل کر سکتی نہیں۔ یہی تھا متقدمین کی بزرگ ترین ہستیوں کا بدرجۂ اتم احترام کرتے ہوئے کہنا پڑیگا کہ تصنع محض اور پیشروں کی خالص تقلید!

اُردو شعرا اپنے ماحول سے بالکل بے نیاز تھے۔ قیس عامری و لیلیٰ، شیریں و فرہاد کے افسانے جو انکی سماعی تھے۔ انکی زبانوں پر تھے گنگ و جمن۔ ہیر آور راجھا کی داستانیں باوجود پیش نظر ہونے کے انکی جاذب توجہ نہیں۔ شیراز و اصفہان کے لالہ زار انکے مناظر باوجود دوری مسافت اور قدرتی حجابات کے ہر وقت اُن کی پیش نظر تھے لیکن کشمیر و پنجاب کے پُرکیف نظاروں سے باوجودیکہ وہ نگاہوں کے سامنے تھے انکی آنکھیں لطف اندوز نہ ہو سکتی تھیں۔ ہمالیہ کی ناقابل گذر چوٹیوں کو عبور کرنے کے بعد انھیں البرز اور طور سینا دکھائی پڑتے تھے۔ مگر خود ماؤنٹ ایورسٹ اور کنچن چنگا نظروں سے پوشیدہ ہو جاتے تھے آخر اس سب کا کیا باعث تھا؟ وہی حقیقت کی کمی اور جذبات کا فقدان! ابتدا اسلامی اثر سے عربی و عجمی شاعری ہی اُردو زبان کا مقتدا بنی رہی۔ جتنی اصناف شاعری عرب و عجم میں مروج تھیں۔ اُردو میں بھی رفتہ رفتہ رائج ہو گئیں۔ قصائد، غزلیات، رباعیات، قطعات، مخمسات اور مرثیات وغیرہ وغیرہ پر اُردو شعرا نے خوب خوب زور قلم دکھائے۔ مسلم سلاطین اور انکے اعیان دولت کے دربار اساتذۂ فن کے قدر داں تھے اور قصیدہ گوئی کی تشبیب گریز اور مدح کے ساتھ تغزل بھی اپنا رنگ جمائے رہا۔ اس دور کا ادب مظہر ہے اُس جمود و بے حسی بےفکری اور تغافل شعاری کا جو ملک و قوم پر اسوقت طاری تھی اس یکرنگ زندگی کی جھلک غزل کی مقبولیت اور عمومیت کی صورت میں ظاہر ہوتی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ از منۂ وسطیٰ میں عموماً اور اورنگزیب کے عہد حکومت کے بعد خصوصاً مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک میں ایسی ابتری پھیلی جسکا اثر صدیوں رہا۔ اٹھارویں صدی عیسوی نے دولت اسلام کا ہیبت ناک انتزاع اپنی نظر سے دیکھا۔ اوائل انیسویں صدی تک پرانا نظام بالکل درہم برہم ہو گیا وہ جن کے در پر بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ نان شبینہ کو محتاج ہو گئے وہ جنکے آستانوں پر شرف باریابی حاصل کرنا سلاطین وقت کے لئے باعث صد افتخار تھا ان کی نسلیں بستر زمانہ کے ہاتھوں آگ چلموں کی سلگانیوالی اور گھاس کی گٹھریاں لانے والی بن گئیں۔ ابنار ملت و قوم اس عالم بربادی و تباہی کے اسقدر خوگر ہو گئے کہ انقلاب کا کوئی احساس ہی باقی نہ رہا اور اس عام فقدان نے بالآخر مصحفی سے یہ کہلا کے چھوڑا ؎

اے مصحفی ہم رو دیں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

زمانہ روز بروز زوال کی طرف گامزن رہا قوم کی غفلتیں حد سے متجاوز ہو گئیں۔ خاندہ وہ کلام آگ میں یک لخت منہدم کر دیا جاتا یا اسکی متفرق [illegible] [illegible]

ہے کہ انتہائی پستی ابتدائے عروج ہوا کرتی ہے۔ بالآخر قوم نے انگڑائیاں لیتے ہوئے آنکھیں ملنا شروع کیں اور اسے احساس ہوا کہ اب کوئی کے جو ہیں اٹھ بکر فکر بستر کاہلی کو اٹھاؤ اور کھڑا کر دو کہ اس دور جمود میں مجاز قوم کو جو اس سوتی ہوئی فوج کیلئے بمنزلہ بیدار مغز مجاہدوں کے تھے اپنی نیند کے مارے سپاہیوں کو ابھارنے کے لئے رجز خوانوں کی ضرورت تھی اور اس کام کے لئے سوائے طبقۂ شعراء کے اور کون موزوں ہو سکتا تھا۔ آخر قوم نے مطالبہ شروع کیا کیا تم آج کل معشوق کی زلف گرہگیر کے رکھا ہی کیا تھا جو انکے سامنے پیش کیا جا سکتا اور چونکہ دوائے تغزل بیماری قوم کا درماں نہیں ہو سکتی تھی۔ اسلئے قوم نے پُرزور اپیل کیا تو وہ تشنۂ طلب کی جگہ انکے اخلاقی امراض کا ازالہ کر کے ان کو اس ورطہ اور پستی سے نکالے چنانچہ اس مرض کے علاج کو حالی طبیب حاذق بن کر پیدا ہوئے اور اقبال نے نحیف و نزار قوم پر دم عیسوی کا امتحان کیا۔ یہاں سے اُردو شاعری میں نیا دور شروع ہوا اور قومی و اخلاقی شاعری کی ابتدا ہوئی۔

اب وہ وقت تھا کہ مغربی شراب مشرقی جام و سبو میں اپنی رنگینیاں دکھانے لگی تھی اور بام ہمالیہ سے بیکراں سمکاری تک لہراتی۔ کوہ سلیمان سے راس کماری تک ہر ذی فہم جدید تہذیب کا دلدادہ ہو رہا تھا ایشیائی باد خصوصاً عجمی اثرات جو ہندوستانی دل و دماغ پر حاوی تھے رفتہ رفتہ زائل ہو رہے تھے اور تہذیب نو کی سیمابی مغلوب نوائے عملیہ میں ایک قسم کی حرکت پیدا کر رہی تھی۔ اس عام ہیجان سے ہماری شاعری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ گل و بلبل کے افسانے خواب خیال ہو گئے۔ شب ہائے فراق کی درازیاں اور ایام وصال کی مختصر کاریاں۔ رقیبان روسیاہ کی دست درازیاں اور محبوبان طناز کی عشوہ طرازیاں تنگ طبائع کو مسخر نہ کر سکیں کہا جاتا ہے کہ شعرا تلامیذ الرحمٰن ہیں اور شاعری بلا دعویٰ الہام کی پیغمبری ہے۔ شاعری جزویست از پیغمبری۔ شعرا قوم کے ہی ترجمان کہ جنکو بقول بعض کو ذوقی کہا جاتا ہے اور بقول بعض خوش نمائی تاثر تھے اور انکا اشہب قلم اب میدان عاشقی میں تیز گامی کرنے کی بجائے مناظر قدرت اور جذبات سلائق کی دلچسپ پُرفضا منازل طے کرنے لگا یعنی بالفاظ مختصر شاعری نے عشق کل شیئ یرجع الی اصلہٖ اپنی اس پرانے مرکز کی طرف رجعت کی جسکا آغاز ابتدا ہوئی تھی چنانچہ حالی، اقبال، اکبر، چکبست، سرور، جوش، سیماب اور بہت سے دیگر اساتذۂ سخن نے اس صنف میں وہ وہ نگین زیباں کیں کہ طرز قدیم کے شیدائیوں کو سوائے ہلاؤ سہلا قر جانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ جدید انگریزی شاعری جس میں اب شعرا کی طبع آزمائی کے لئے دو میدان ہیں ایک قومی اور اخلاقی شاعری۔ دوسری نیچرل و جذباتی شاعری۔ مغربی اثرات سے بخوبی متاثر ہو چکی ہے۔ مغربی تخیل اور مغربی طرز بیان اور موضوعات آہستہ آہستہ ہماری ادبی رگ و پے میں سرایت کر رہے ہیں۔ شعرائے مغرب کا کلام نہایت کامیابی سے اُردو سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور خیال ہو گیا ہے کہ آزاد بھی ایک نہ ایک دن [illegible] کہ غیر محدود [illegible] [illegible] تہذیب کے تتبع میں اپنی قدیم [illegible] [illegible] بجائے ہونے [illegible] [illegible]

ساقی

نجانے درد دل اب کیوں سکوں انجام ہے ساقی
بتا دے کیا مآلِ غم اسی کا نام ہے ساقی

تو ربِّ میکدہ ہے اور تیرا نام ہے ساقی
پلا دے زندگانی موردِ آلام ہے ساقی

تری محفل ہے یا نیرنگِ صبح و شام ہے ساقی
یہاں بھی کارفرما گردشِ ایام ہے ساقی

تری بے اعتنائی کا یہی انجام ہے ساقی
جسے بھی دیکھتا ہوں بے نیازِ جام ہے ساقی

فغانِ صبح باقی اب نہ آہِ شام ہے ساقی
محبت ہر طرح ناکام ہی ناکام ہے ساقی

خزاں کا دور دورہ ہے گلستانِ تمنا میں
جمالِ زندگانی آفتابِ شام ہے ساقی

یہ ہے بیدادِ مجسم لمحہ لمحہ زندگانی کا
محبت آزما افتادِ صبح و شام ہے ساقی

تجھے آگاہ میں کرتا ہوں لیکن راز ہستی سے
تعیّنِ راحت و غم کا خیالِ خام ہے ساقی

نہ ہوگا زندگی بھر وہ کبھی آسودۂ منزل
جو راہِ شوق میں وابستۂ انجام ہے ساقی

ان آنکھوں کے لئے جو آشنائے لذتِ غم ہیں
تصور نیند کا بھی قصدِ ہنگام ہے ساقی

پرستارانِ غم کو ہوش میں آنے نہیں دیتا
وہ ذوقِ بیخودی جو لذتِ بے نام ہے ساقی

مرا ظلمت کدہ کیونکر نہ معمورِ تجلی ہو
سرِ مژگاں ہر اک آنسو چراغِ شام ہے ساقی

شگفتہ حسن کی دنیا ہے میری گرم نالوں سے
خزاں کی آتش افروزی بہار انجام ہے ساقی

ہر اک نغمہ مکمل سوز ہے سازِ شکستہ کا
وہی ہے کامیاب شوق جو ناکام ہے ساقی

بڑی دولت ہیں یہ ٹکڑے نہ دیکھ انکو حقارت سے
بنائے میکدہ ٹوٹا ہوا ہر جام ہے ساقی

جہانِ عشق میں شام و سحر یہ کام ہوتا ہے
بنانا دل ہر اک ذرّے کو کوئی کام ہے ساقی

چمن میں گل ہیں یا لاکھوں چراغِ طور روشن ہیں
محبت کی نگاہوں کا یہ فیضِ عام ہے ساقی

فضائے عرش سے شام و سحر جلوے برستے ہیں
جہاں کا ذرّہ ذرّہ موردِ الہام ہے ساقی

زمیں سے تا فلک چھایا ہوا ہے ایک ہی جلوہ
محبت جس کو کہتے ہیں خدا کا نام ہے ساقی

آل منظور نگری

مراجعت

صبح کا سہانا وقت تھا، سوشیلا "یاسمین کالج" کے گیٹ پر جھکی ہوئی سنسان سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی، سورج کی زرد ترین کرنیں یاسمین کے پھولوں کو چوم رہی تھیں۔ سوشیلا خاموش تھی مگر کسی گہرے خیال میں مستغرق، وہ ایک پیچیدہ مسئلہ جو الجھ کر رہ گئی تھی، یہ عجیب و غریب معمہ اس سے حل نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکیہ سری سرلا بہن کے نام ابھی ابھی ایک خط دیکر گیا ہے۔ سرلا بہن نیک خوش مزاج خاتون تھی اور سوشیلا اسکو اپنی ماں سے کہیں زیادہ چاہتی تھی مگر اب وہ دنیا میں نہیں تھی۔ وہ اسکی شفقت و مہربانی سے محروم ہو چکی تھی، جب سوشیلا نے اس پر غور کیا کہ سرلا بہن کے ہاتھوں سے اسکو کیسی اچھی اچھی چیزیں ملیں تو اسکے رخساروں پر بے اختیار آنسو ڈھلک آئے۔

کالج کی نوجوان مالکہ اس وقت عجیب کشمکش میں تھی، کیا وہ سرلا بہن کے نام کا خط کھول لے؟ یہ خط کس نے لکھا ہے؟ کیا یہ اسکے فضول خرچ بیٹے نے تو نہیں لکھا جو اسکو اچانک چھوڑ کر چلا گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا تھا؟ بہر حال ایک مردہ عورت کے نام کا خط کھول لینا کچھ مناسب نہ تھا کیونکہ سوشیلا اسکی بیٹی ہی کی طرح تو تھی

سرلا بہن نے جو ایک امیر بنگالی خاندان سے تعلق رکھتی تھی، کبھی سوشیلا کے سامنے خانگی معاملات کا ذکر نہیں کیا تھا، البتہ اس نے ایک سرسری طور پر اپنے بیٹے کا ضرور تذکرہ کیا تھا جو ایک سیاسی تنازعہ میں حصہ لینے کے بعد اسکو اچانک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

اب سے تین سال پیشتر جب سوشیلا پہلے پہل کلکتہ آئی تو وہ اس دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ اس نے ٹریننگ اسکول کا امتحان پاس کیا تھا اور شہر میں ایک اسکول کے اندر معلمہ کا کام اس کے سپرد کیا گیا تھا،

ایک شام کو جب سوشیلا اپنی سہیلی پریم کماری کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی اسکی توجہ ایک خوشنما اور دلکش کالج کی طرف منعطف ہوئی جہاں یاسمین کے [illegible] پھول آسمان میں سفید سفید بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح لہرا رہے تھے اور سرلا بہن ان پھولوں کے درمیان ایک تر و تازہ پھول کی طرح کھڑی تھی۔ سرلا بہن نے یہ دیکھکر کہ دو نوجوان لڑکیاں اسکے کالج سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہیں، سوشیلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "آیئے ذرا اس ناچیز کالج میں چائے پیجئے۔" سوشیلا کو یہ جگہ بہت پسند آئی اور اسکی مالکہ تو اس سے کہیں زیادہ اچھی تھی، ضعیف خاتون نے دونوں لڑکیوں کی خوب مہمان نوازی کی اور لڑکیاں اسکے متواضع طریقے سے بہت خوش ہوئیں۔

پریم کماری کے گھر واپس آتے ہوئے سوشیلا نے یہ تبصرہ کیا "وہ ایک چھوٹے سے علاقہ کی لگتی ہے ——— مگر نہایت سادگی پسند نیک دل ———"
اس کی سہیلی نے اس سے اتفاق رائے کیا، اور اس نے تو یہاں تک کہدیا کہ "اگر یہ خاتون تمہیں اپنے یہاں کم از کم مہمان کی حیثیت سے ہی رکھ لے تو کیا ہی اچھا ہو"
"تو میں دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ہونگی"
سوشیلا نے جواب دیا۔

آج سنیچر تھا، پریما کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا چنانچہ وہ سوشیلا کے ساتھ سیر کرنے کو نہ جا سکی۔ اس نے کہا کہ وہ آج اکیلی ہی "یاسمین کالج کی خاتون" کے پاس ہو آئے، وہ سرلا بہن کو اس نام سے پکارا کرتی تھی۔ سوشیلا کو تنہا ہی جانا پڑا، سرلا بہن گیٹ پر ان کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی،

"سوشیلا! تمہاری سہیلی کہاں ہے؟" سرلا بہن نے پریما کو ساتھ نہ دیکھکر پوچھا
سوشیلا نے بتایا کہ وہ درد سر کی وجہ سے نہ آسکی اور آپ سے معذرت چاہی ہے۔

چاء پر دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں، اور ہر ایک نے ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھدیا، مگر سرلا بہن پھر بھی اس گفتگو میں کسی قدر محتاط تھی جسے سوشیلا سے کہیں زیادہ دنیاوی تجربہ تھا۔ آخر کار یہ طے پا گیا کہ سوشیلا یاسمین کالج آجائے، اس پر اسکی خوشی کا کچھ ٹھکانہ نہ رہا۔ سوشیلا پریما کے گھر واپس آتے وقت بے حد مسرور تھی۔ اس نے پہنچتے ہی کہا: "میں کل سے اپنی چچی سرلا بہن کے یہاں جا رہی ہوں" یہ سنکر پریم کماری اور اسکی ماں حیرت زدہ ہو گئیں، انھوں نے سوشیلا کو اس خوش قسمتی پر مبارکباد دی اور کہا کہ وہ اپنی "چچی" کے زیر سایہ خدا کرے ایسی ہی خوش و خرم رہے۔

دوسرے دن سوشیلا یاسمین کالج میں تھی اور ہمسائے جو سرلا بہن کے کسی قدر تحکمانہ طور طریق سے [illegible] دل سے خوش ہوئے کہ [illegible] خاتون کی ایک ہنس مکھ بھتیجی تو ان کے پاس آگئی جس سے [illegible] عورت کی متانت و سنجیدگی

کی تلافی ہو جائے گی، سرلا بہن، سوشیلا کو بہت چاہتی تھی اور اسے اپنی بیٹی کی طرح رکھتی تھی، اسکی اداس زندگی میں سوشیلا کی آمد نے پھر ایک رونق سی پیدا کر دی تھی وہ اکثر سوچا کرتی تھی " کاش رمیش یہاں موجود ہوتا اور میں سوشیلا اور اسکی شادی کو دیکھ سکتی ـــــ تو میرا پیمانۂ مسرت لبریز ہو جاتا لہذا طمانیت قلب کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتی " اُس نے لڑکی پر کبھی اپنے ان خیالات کا انکشاف نہیں کیا تھا'

سرلا بہن کی اچانک موت نے جو حرکت، قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی سوشیلا کی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا اور بیچاری لڑکی نیک خاتون کا خیال آتے ہی جو سوشیلا کیلئے ماں سے کہیں بڑھ کر تھی کیونکہ وہ خود یتیم تھی اور سیوا سدن میں اسکی پرورش ہوئی تھی، زار و قطار رونے لگی وہ اس خط کا کیا کرے؟ بہرحال اُس نے خیال کیا کہ خط کے مضمون سے واقف ہونا اسکے لئے کئی لحاظ سے ضروری تھا سوشیلا نے آخر کار خط کھولنے کا فیصلہ کیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اسکو کھول لیا' یہ سرلا بہن کے نفضول خرچ بیٹے رمیش کا خط تھا، سب سے زیادہ تکلیف دہ حصہ وہ تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ رمیش عنقریب ہی اپنی ماں سے ملنے آئیگا" ـــــ " رمیش جلدی اپنی ماں سے ملنے آئیگا" اسکو یقین نہیں آ رہا تھا کیا واقعی وہ آ رہا ہے؟ کیا وہ آ جائیگا' اسکا سر چکرانے لگا' صد ہزار افسوس بیچاری ماں اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے زندہ نہیں، لیکن خود اسکا کیا حشر ہوگا؟

اسے کاٹیج کو جائز مالک کے حوالے کر دینا پڑیگا اور وہ پھر پناہ کی تلاش میں گلی گلی ماری پھرے گی" وہ اپنی بدبختی کو کوسنے لگی، اسے اس خیال سے بڑا صدمہ ہوا کہ جس جگہ کو وہ بے حد پسند کرتی ہے اب اس سے محروم ہو جائے گی، اُس نے کاٹیج کی دیکھ بھال کس قدر سلیقے سے کی تھی۔ اُس نے چھوٹے بچے کی طرح کس اہتمام کے ساتھ اپنی ذوق کی چیزوں کو یہاں سنبھال کر رکھا تھا، عمارت کی دیکھ بھال. محصول کی ادائیگی. ٹوٹ پھوٹ کی مرمت اور ہر طرح کی صفائی کا اُس نے کیسا خیال رکھا تھا؟ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے سرلا بہن کے مرنے کے بعد کاٹیج کے سارے امور کا پورا پورا حساب اپنے پاس رکھا تھا اور جبکہ اُسکا جائز وارث آنے والا ہے وہ اسکو جائداد کے متعلق اپنا تمام حساب نہایت صفائی اور وضاحت کے ساتھ پیش کر سکے گی۔ رمیش کے خیال سے اس میں کسی قدر جذبۂ حسد اُبھر آیا اور اس خیال سے کہ وہ اس حسین کاٹیج سے جو اسے حد درجہ پسند ہے محروم ہو جائیگی اسکو رمیش سے نفرت سی ہو گئی؟

ایک ہفتہ کے بعد جب وہ کسی کی دستک سُن کر گیٹ پر آئی تو وہ ایک خوش پوش نوجوان کو دیکھ کر اُچھل پڑی۔ اُسکا دل تیز تیز دھڑکنے لگا، اُس نے سوچا کہ یہ سرلا بہن کا مُسرف بیٹا " رمیش نہیں ہو سکتا، مگر جب نوجوان نے یہ پوچھا کہ مسز سرلا بہن اسی مکان میں رہتی ہیں تو اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

" کیا آپ مسٹر رمیش ہیں؟ " سوشیلا نے تلخ لہجہ میں پوچھا۔ اجنبی نے جواب دیا " نہیں میں اسکا دوست اُمیش ہوں، رمیش نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسکی ماں کے متعلق معلومات کر دوں اور میں بیحد ممنون ہونگا اگر آپ اس بارے میں کچھ روشنی ڈالیں"

سوشیلا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

" اندر تشریف لے آیئے! " سوشیلا نے کہا جو یہ جا کر مطمئن تھی کہ یہ رمیش نہیں بلکہ اسکا واحد دوست ہے کیونکہ وہ رمیش سے متنفر تھی جو اپنی ماں کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

اُمیش ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سوشیلا سے بھی اُس نے کرسی پر بیٹھنے کو کہا جو اس وقت خیالات کی رو میں نہ معلوم کہاں بہی جا رہی تھی۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کو رمیش اور سرلا بہن کا حال بتایا اور اس کے بعد تمام معاملات پر گفتگو ہوتی رہی اُمیش یہ سُنکر بڑا غمگین ہوا کہ سرلا بہن مر چکی ہے۔

سوشیلا نے اُمیش کو بتایا کہ وہ لاپتہ مالک کی طرف سے اس کاٹیج کی دیکھ بھال کر رہی ہے اور وہ بڑی خوشی سے کاٹیج رمیش کے سپرد کر دے گی خواہ وہ کسی وقت بھی آئے۔ اُس نے کاغذات کا ایک فائل بھی پیش کیا جس میں اسمیں کاٹیج کے سارے حسابات تفصیل کے ساتھ درج تھے، اُمیش یہ دیکھکر بہت متعجب ہوا۔

رمیش کا دوست سوشیلا سے یہ کہکر رخصت ہوا کہ وہ ان سب حالات کی اطلاع ـــــ سرلا بہن کے سورگباش ہونے کی خبر اور خوبصورت لڑکی کی سلیقہ مندی کا حال جلد ہی اپنے دوست کو لکھ بھیجے گا۔ اور وہ خود ہوڑہ کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ سوشیلا ایک اجنبی کی زبان سے اپنی تعریف سُن کر شرم کے مارے دُہری ہو گئی، وہ اُمیش کی ہر ہر بات میں ایک بے پناہ کیف و مسرت کی جھلک پا رہی تھی اسکو تعجب ہوا کہ کیا واقعی اُمیش اُس کے حسن سے متاثر ہوا ہے۔ سوشیلا نے اُس سے استدعا کی کہ شام کو جب کبھی اُسے فرصت ملا کرے وہ یہاں ایک پیالی چاء نوش کرنے ضرور آیا کرے اُس نے اس پیشکش کو بخوشی قبول کر لیا، وہ دوبارہ چار مہینے آیا اور وہ دونوں ـــــ گہرے دوست بن گئے!

ایک شام جب آمیش سوشیلا کے وعدے کے مطابق نہیں آیا تو وہ ہوٹل پہونچی جس میں اُس نے اپنے قیام کرنے کا ذکر کیا تھا، وہاں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ اس نام کا کوئی شخص نہیں آیا۔

کلرک نے بتایا کہ رتیش نام کا ایک شخص ضرور آیا تھا۔ سوشیلا یہ سنکر نفرت و غصہ سے پیچ و تاب کھاتی ہوئی چلی آئی۔ وہ رتیش کی اس حرکت پر آگ بگولا ہو رہی تھی جس نے غلط نام بتا کر دھوکا دیا تھا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اگر وہ آیا تو ایک لڑکی کو فریب دینے پر اسکو وہ تلخ سبق دیگی اور کاٹیج خالی کرکے چلی جائیگی۔

دو روز بعد آمیش خوشی سے ناچتا ہوا آیا، سوشیلا کو اداس اور افسردہ پاکر اُس نے خیال کیا شاید اسکی عدم موجودگی میں کچھ تکلیف دہ بات ہوئی ہے۔ اُس نے حالات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر سوشیلا نے تیوری پر بل ڈال کر اُسے روک دیا، وہ حیران تھا۔

سوشیلا اپنی فریب خوردگی کا سارا غصہ اُس پر اُتارنا چاہتی تھی مگر اس کی زبان نہ کھل سکی، ایک لفظ بھی اسکے منہ سے نہ نکلا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز اُس کو "اظہارِ ناراضگی" سے روک رہی ہے، ایک اجنبی کے سامنے اسکو اپنی بزدلی پر غصہ آرہا تھا،

وہ جیسے ہی کچھ کہنے کے لئے "شریر نوجوان" کی طرف نظر اُٹھاتی وہ اسکو اپنی خوش مزاجی کے باعث خوبصورت اور پیارا معلوم ہونے لگتا، وہ اس آدمی کے سامنے اپنے دل کے اندر ایک عجیب تھرتھری محسوس کر رہی تھی ——— دو نام ——— وہ کیسا شوخ ہے ——— اُس نے محسوس کیا کہ وہ آمیش سے محبت کرنے لگی ہے ——— آمیش ہ لفظوں کے بجائے نظروں سے محبت کا رنگین پیغام دے رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے جا رہے تھے ———

"بہر کیف سوشیلا اس سے نام میں کوئی زیادہ فرق نہیں آتا" آمیش نے سوشیلا کو اپنے بازؤوں میں لیتے ہوئے کہا ——— "میں رتیش سے زیادہ آمیش کو چاہتی ہوں" سوشیلا نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے کہا۔

رشدی بھوپالی

نوائے اسد

صبر آزما ہیں لمحے ترے انتظار کے
دُھندلے نقوش پڑنے لگے اعتبار کے

عبرت کی ہے یہ بات جو کل تک تھے غمگسار
وہ چُن رہے ہیں ہاتھ سے تختے مزار کے

مدت میں اک پیام ملا وہ بھی دل شکن
دیکھے تھے میں نے خواب بہت لطفِ یار کے

تجزیۂ بہار نہ کر ناظرِ بہار!
ہیں مشترک یہ رنگ خزاں و بہار کے

مرنے کے بعد چھُپ گیا عیبِ برہنگی
احساں ہمارے سر پہ ہیں خاکِ مزار کے

سب عیشِ عمرِ رفتہ کے خوابِ خیال ہیں
کس درجہ جاں گداز ہیں غمِ روزگار کے

زیرِ مزار دن کو ہیں چُپ رات کو اداس
ہم بھی شریکِ غم ہیں چراغِ مزار کے

مٹی سی شے پہ رکھدی سزا و جزا کی قید
اللہ رے حوصلے مرے پروردگار کے

پھولوں سے بھر لیں جھولیاں اربابِ گلستاں
پھر سال بھر میں آئینگے یہ دن بہار کے

میعادِ قید تو نے بڑھا دی ہے جس طرح
کچھ کیف بھی بڑھا دے مرے انتظار کے

بس میں نہیں جب اپنے نظامِ جہاں اسد
شکوے ہیں پھر فضول غمِ روزگار کے

علی اسد

کاہشِ منظوم

۱۳۶۲ھ

درخشاں اقبال کے خطوط

۱۹۴۳ء

درخشاں :-

سوچتی ہوں کیا لکھوں القاب میں
فرق آجائے نہ کچھ آداب میں

آرزوئے دید کے لاکھوں سلام   حسرت و امید کے لاکھوں سلام
ہے خدا سے یہ دُعا صبح و مسا   ہوں سلامت زندگی کے ناخدا
کر رہی ہوں بعد اسکے عرضِ حال   اے زمینِ صدق کے عرشِ کمال
آپ کے آئے ہزاروں ہی پیام   ہائے مجھ بدبخت بدقسمت کے نام
دے سکی لیکن نہ میں انکا جواب   دل میں کھاتی ہی رہی بس پیچ و تاب
کیا کہوں تھا کس ستمگر کا قصور   تھا فقط میرے مقدر کا قصور
گو بظاہر خاص کچھ اسباب تھے   زیست کے سونے سبھی پایاب تھے
ذکر سے اُن کے مگر کیا فائدا   لکھتی ہوں جتنا ہے اتنا ہی بُرا
ہاں درخشاں آپ کی بیمار ہے   چلنا پھرنا بھی اُسے دشوار ہے
سانس لینے میں نکلتی ہے کراہ   تندرستی غم نے کر دی ہے تباہ
ہو رہا ہے یوں تو ہونے کو علاج   ہو گیا ٹھیک آشفتہ مزاج
دے رہے ہیں ڈاکٹر انجکشن   خشک ہے لیکن مِرے دل کا چمن
لکھ نہیں سکتیں مرے غم کا بیاں   کپکپاتی تھرتھراتی اُنگلیاں
آخری شاید ہو یہ عرضِ زبوں   غالباً پھر خط نہ کوئی لکھ سکوں
کیجئے لیکن نہ اسکا آپ غم   آپ کو میری محبت کی قسم
کون ہے ایسا جسے آرام ہے   زندگی ہی درد و غم کا نام ہے
غم رہیگا حملہ زن جبتک ہے دم   ہے مثل مشہور غم کیا تھم دم
اور پھر ہم عشق کے ماروں کا غم   یہ ہوا ہے اور نہ ہوگا حشر کم
غم سے چھٹکارا دلائے تو سہی   موت ہی اچھی ہے آئے تو سہی
غم تو یہ ہے تندرست ہو جاؤنگی   زندگانی کے تھپیڑے کھاؤں گی
ہو نہ غمگیں آپ سچ کہتی ہوں میں   اب تو پہلے سے بہت اچھی ہوں میں
لیکن آیا آپ کا جب عید کارڈ   غمزدہ دل کو ملا جب عید کارڈ
روح میں اک سرخوشی پیدا ہوئی   از سرِ نو زندگی پیدا ہوئی
زندگی کا چکھ لیا میں نے مزا   آپ بس اچھے رہیں یہ ہے دُعا
ہاں خدا سے التجا فرمایئے   ہو سکے تو یہ دُعا فرمایئے
زندگی دی ہے تو دی لولِ امتحاں   رائیگاں جائے نہ یہ سالِ رواں
اک عنایت اور بس فرمایئے   سالِ نو کا ٹائیٹل بنوایئے
چاہتی ہوں میں کروں نقش و نگار   کچھ تو رہ جائے برائے یادگار
ٹائیٹل کا جو بھی تاریخی ہو نام   مجھ کو لکھ کر بھیج دیجے والسّلام
اور کیا لکھوں لرزتا ہے قلم   غم نہ کیجے پھر دلاتی ہوں قسم

زندگانی ہو فزوں آپ کی
ہے دعا برلب درخشاں آپ کی

اقبال:—

اے مری جانِ فروزاں السلام
اے مری روحِ درخشاں السلام

صاحب اقبال ہو کر تم جیو　　دہر میں خوشحال ہو کر تم جیو
نامۂ منظوم مجھ کو مل گیا　　کتبۂ مغموم مجھ کو مل گیا
موج آئی اک تلاطم خیز سی　　برق چمکی اک شرر انگیز سی
چاند نکلا ابر کی آغوش میں　　داغ چمکا سینۂ غم کوش میں
چاندنی لائی امیدوں کا کفن　　دھوپ پھیلی بن کے سوزِ جان و تن
گل کھلا گلشن کو کھلاتا ہوا　　ساز آیا سوز برساتا ہوا
گردشِ غم میں پھنسا دل کا ایاغ　　آندھیوں کی زد میں آیا اک چراغ
اک نویدِ سوز آگیں آگئی　　مژدۂ غم بن کے حسرت چھاگئی
دیکھتا تھا راہ جس مکتوب کی　　اس نے امیدوں کی دنیا لوٹ لی
میں سمجھتا ہوں تمہارا دردِ غم　　ہے مری نظروں میں سب کچھ بیش و کم
سرو قمری سے نہ یوں کچھ بھی کہے　　پھول بلبل کے لئے گونگا رہے
شمع پروانے کے آگے ہو خموش　　چاند بھی چپ چاپ ہی ہو جلوہ فروش
حسن و الفت کے مگر راز و نیاز　　رہتے ہیں اک دوسرے کے دلنواز
تم چھپانا چاہتی ہو رازِ دل　　خود بخود بجتا ہے لیکن سازِ دل
لو سنو تم کس لئے بیمار ہو؟　　عشرتِ عالم سے کیوں بیزار ہو؟
در حقیقت کچھ تو ہے برہم مزاج　　اور غالب آگیا ہے کچھ "سماج"
لگ گئی ہیں کچھ نئی پابندیاں　　درد دل لیتا ہے دل میں چٹکیاں
ایسے لکھ سکتی نہیں مکتوب تم　　رکھتی ہو جیسا مجھے محبوب تم
پڑھ نہیں سکتی جواب ہائے ستم　　تم پہ آزادی مرے مکتوبِ غم
چھن گئیں آزادیاں مجبور ہو　　خط لکھو تو کیا لکھو معذور ہو
تم چھپاتی ہو انہیں اسباب کو　　کیا سکوں ہو پھر دلِ بیتاب کو
کاش تم رازِ نہاں لکھ بھیجتیں　　اپنی سب پابندیاں لکھ بھیجتیں
سوچ کر کچھ مشورہ دیتا تمہیں　　اس کشاکش سے چھڑا لیتا تمہیں
توڑ بیٹھیں رشتۂ تدبیر کو　　کوسنے بیٹھی ہو اب تقدیر کو
اب بھلا رنج و الم سے فائدہ؟　　شکوۂ جور و ستم سے فائدہ؟
جان پر اپنی ستم ڈھاتی ہو تم　　دل ہی دل میں کیوں گھلی جاتی ہو تم
کیا یہ ممکن ہے رہو تم محوِ غم　　اور مجھ کو کچھ نہ ہو فکر و الم
شمع سے خالی تجلی خانہ ہو　　اور پروانے کو کچھ پروا نہ ہو
رنگ سے بیرنگ ہو جائے چمن　　اور نہ ہو بلبل چمن میں نعرہ زن
غم میں رہ کر رو رہی ہو غم سے تم　　دم جدا کرتی ہو گویا دم سے تم
مانتی ہو غم کو سامانِ حیات　　کہہ رہی ہو اس کو شایانِ حیات
پھر مجھے کرتی ہو کیوں محرمِ غم　　کیوں رلاتی ہو مجھے اپنی قسم
غم سے ہو سکتی نہیں حالت زبوں　　غم حقیقت میں ہے اک گنجِ سکوں
غم سے قائم ہے اساسِ کائنات　　ہے ازل سے غم ہی بنیادِ حیات
یہ سرورِ جاودانی کم نہ ہو　　لطف جب ہے غم کا دل میں غم نہ ہو
موجبِ عشرت بنے سامانِ غم　　دل کو ہو جائے اگر عرفانِ غم
مل گئی ہے نعمتِ عالم مجھے　　ہے خدا رکھے تمہارا غم مجھے

محنت و ہمت کو کر لو ہم عناں　　اور ہو جاؤ شریکِ امتحاں
ہاں دعائیں میری ہونگی مستجاب　　کام ہمت سے ہوگی کامیاب
ٹائیٹل خود ہی بنا کر بھیج دو　　جس طرح چاہو سجا کر بھیج دو
میں لکھا لوں گا یہاں کاتب سے نام　　نام کا کیوں کر ابھی ہو اہتمام
اس محبت کا تمہاری شکریہ　　اس عقیدت کا تمہاری شکریہ
ہو درخشاں آفتابِ زندگی　　ہر طرح ہو کامیابِ زندگی

دہر میں بنکر رہو عالی وقار
حشر تک اقبال ہو تم پر نثار

صبا متھراوی

ہندوستان صنعتی ملک تھا

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے اور اسے زراعتی ملک کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہیے۔ لیکن تاریخ کچھ اور ہی کہتی ہے۔ مسٹر منگومری لکھتے ہیں:۔

"میں اس نظریہ کا مؤید نہیں کہ ہندوستان محض زراعتی ملک ہو۔ یہ ملک زراعتی ہونے کی بہ نسبت زیادہ صنّاع ہے اور جو شخص اسے صرف زراعتی کہنا اور دیکھنا چاہتا ہے اُس کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ تہذیب کے بازار میں ہندوستان کے وقار کو گرا دیا جائے۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو شریفانہ جذبات کے تحت آج سے ایک صدی قبل معرضِ تحریر میں آئے۔

مسٹر تھورنٹن نے بھی ہندوستان کی قدیم صنعتی ترقی کے بارے میں اسی قسم کی رواداری کا ثبوت دیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:۔

"اس دَور میں جبکہ سرزمین یورپ جسے تہذیبِ حاضرہ کی جنم بھومی کہنا چاہیے، غیر مہذب اقوام کا گہوارہ تھی۔ ہندوستان اپنی دولت اور صنعت کے اعتبار سے مابہ الامتیاز خصوصیت کا حامل تھا اور انہیں اسباب کی بنا پر یہ سرزمین سیاحانِ عالم کی جولانگاہ بنی ہوئی تھی۔ ہندوستان بہ اعتبار صنعت و حرفت کسی ملک سے پیچھے نہ تھا۔"

مسٹر باسو کا بیان ہے کہ:۔

"ابوالہول کے عالم وجود میں آنے سے بہت عرصہ قبل۔ یعنی جب یونان اور وہ جنھیں اپنی تہذیب پر ہمیشہ ناز رہا ہے تہذیب سے ناآشنائے محض تھے۔ ہندوستان تہذیب و تمدن کے انتہائی مدارج طے کر رہا تھا۔ اس کی آبادی بے حد گنجان تھی اور ہر طرف صنعت و حرفت کی گرم بازاری تھی۔ چابکدست صنّاع داد صنعت دے رہے تھے۔ ملک کے گوشہ گوشہ کو حسین عماروں نے مزیّن کر رکھا تھا۔"

پروفیسر ویبر لکھتے ہیں:۔

"ہندوستانیوں کی رنگ آمیزی کا ہنر۔ دھاتوں زر و جواہرات کی صنعت زمانہ قدیم سے مسلّم ہے۔"

"تاریخی حیثیت سے ہندوستان کی صنعت و حرفت کی ترقی کا سُراغ بعد مسیح ملتا ہے ہندوستان کی صنعتی اشیاء کی تجارت یورپ سے تین راستوں کے ذریعہ ہوتی تھی کہا جاتا ہے کہ لفظ سندھو سے (جو بعد میں ہندو ہوگیا) ہندوستانی کپاس مُراد ہے اس لفظ کا سراغ الیور بنی پال (۶۶۰ ق۔م) کی لائبریری سے ملا۔ چینی سکوں کی تاریخ" "ہندوستانی ہاتھیوں کا بیان۔ شالمسر ۴ - ۸۶۰ ق۔م" اور دی بویرو جاتا کا" جس میں ہندوستانی سوداگروں کے بَوِرو کے بحری سفروں کا ذکر ہے۔ ہندوستان اور بابل کے صنعتی اتحاد کا ثبوت بہم پہونچاتے ہیں۔ بیبلون ایک اہم تجارتی منڈی تھی جہاں مختلف ممالک سے صنعت و حرفت کی اشیا جمع ہوتی تھیں۔ پنجاب۔ لونین اور فینشیا کے سوداگر یہاں ہر وقت جمع رہتے تھے۔ ہندوستان میں ٹمرالیپی۔ بھروچ اور سپارا ان اشیا کی برآمد اور درآمد کی مخصوص بندرگاہیں تھیں۔ یہاں سے دوسرے ممالک کو کپاس اور ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چیزیں بھیجی جاتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی صنعت معراجِ کمال پر تھی اور ہر مہذب ملک ہندوستان کی بنی ہوئی اشیاء کا دست نگر تھا۔ جنوبی ہند اور سلطنت روم کے مابین تجارت جاری تھی۔ ہیروڈوٹس (۴۸۴ ق۔م) جو یونان کے دَور اوّل کے اہلِ قلم میں سے ہے۔ ہندوستان کا ذکر کپاس پیدا کرنے والے ممالک کے ساتھ کرتا ہوا لکھتا ہے:۔

"ہندوستان کی کپاس بھیڑ کی اُون سے بھی کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے۔"

میگاستھنیز کا بیان ہے:۔

"ہندوستانی زرق برق لباس اور زیورات کے شائق ہیں۔ اُن کے ملبوس زرکار ہوتے ہیں...... ہندوستان ہی میں سب سے پہلے میونسپلٹی کو ختیار دیا گیا تھا کہ وہ صنعت سے متعلق تمام شعبہ جات کی نگرانی کرے۔ صنعت کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ کسی صنّاع کو کام کرنے سے معذور کر دینے والے شخص کو بدترین سزا دی جاتی تھی۔"

ایک یونانی سفیر کا بیان ہے:۔

"ہندوستانی درختوں کی چھال سے بنا ہوا کاغذ استعمال کرتے تھے"۔

مینانڈر (۱۵۵ ق-م) کی کتاب "ملند اپنہا" سے پتہ چلتا ہے کہ بنارس کا علاقہ تجارت کا مرکز تھا۔ یہاں ہر دوکان قیمتی ساز و سامان سے پُر رہتی تھی۔ خرید و فروخت کا یہ عالم تھا کہ سوداگروں کو ایک لمحہ کی فرصت نہ ملتی تھی۔

نیرو کے زمانہ میں اہلِ روم کو ہندوستان کی بنی ہوئی خوبصورت اشیاء کے استعمال کا اتنا شوق تھا اور وہ لوگ ان اشیاء کی خرید و فروخت میں اتنا خرچ کر ڈالتے تھے کہ سلطنت روم کی اقتصادی حالت پر بُرا اثر پڑا۔

رگ وید کے زمانہ کے آریہ مشینوں کے استعمال سے آگاہ تھے۔ کپڑا بنتے ہتھیار بناتے اور دھاتوں سے طرح طرح کی کارآمد چیزیں تیار کرتے۔ ہندوستان کا ابتدائی ادب اس قسم کے تذکرات سے پُر ہے۔

۳۲۷ قبل مسیح میں سکندر اعظم کو مالاواس نے روئی کے کپڑوں کا بےشمار ذخیرہ اور بہت سا لوہا نذر کیا۔ سفید لوہے سے شاید اسٹیل مقصود ہو کنٹیلیا کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں ہندوستان کی تہذیب انتہائی عروج پر تھی اور تجارت و صنعت کے اعتبار سے اس ملک کا پایہ بہت بلند تھا۔

دہلی میں سمدرگپت (چوتھی صدی) کا بنایا ہوا مشہورِ عالم آہنی ستون اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس زمانہ میں اہلِ ہند دھاتوں کے استعمال میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

"تاریخ فیروز شاہی کی رُو سے اُس زمانہ میں ہندوستان میں ۳۶ بڑے بڑے صنعتی کارخانے موجود تھے۔ مارکو پولو اور ابن بطوطہ دونوں بھروچ اور کالیکٹ کو عظیم ترین تجارتی منڈیاں تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں دُنیا کے قریب قریب ہر حصہ کو تجارت کا مال آتا تھا۔ تلنگو کی کپاس اور ململ کی خوبی کے بارے میں مارکو پولو کہتا ہے:-

"یہ کپڑا مکڑی کے جالے سے زیادہ سبک اور لطیف ہوتا ہے۔ اور دُنیا کا ہر تاجدار اسے زیبِ تن کرنا فخر سمجھتا ہے"۔

مالابار کے لوگ پیدائشی تاجر تھے۔ یہ علاقہ چین۔ عرب اور سیرانت کے سوداگروں کی جولانگاہ تھا۔

ظفر نامہ شاہد ہے کہ تیمور لنگ نے کئی ہزار ہندوستانی چابکدست صناعوں کو امراء اور رؤسا میں بطور تحفہ تقسیم کیا۔

مغلوں کے دورِ حکومت میں اس ملک کی صنعت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

ملک کے مختلف حصوں سے ہوشیار اور منتخب کاریگر شاہی کارخانوں میں مہیا کئے گئے۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق لاہور۔ آگرہ۔ فتحپور۔ احمدآباد اور گجرات میں بڑے بڑے کارخانے تھے۔ اس دور کی صنعت کے نمونے دورِ جدید کے صناعوں کو بھی محوِ حیرت کر دیتے ہیں۔

کشمیر اور پنجاب کی شال کی صنعت شاہانِ مغلیہ کی توجہ کی رہینِ منت ہے۔ زیورات کی ایجاد اور رنگوں کے امتزاج کی صنعت کو شاہجہاں کے دورِ حکومت میں فروغ حاصل ہوا۔

ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود ہندوستان کی تہذیب۔ مصر میں بعض ایسی "ممیوں" کا پتہ چلا ہے جو ہندوستانی کپڑے سے ملفوف ہیں۔ ڈھاکہ کی ململ یونان میں گنجیٹیکا (گنگا سے) کہلاتی تھی۔

ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں راس امید۔ عرب۔ مصر۔ بحیرۂ روم کے علاقوں۔ لنکا جاپان۔ فلپائن اور میکسیکو کو بھیجی جاتی تھیں۔

ٹاورنیر نے چارلس ثانی کے حضور میں شتر مرغ کے انڈے کے سائز کا ناریل پیش کیا۔ یہ موتیوں سے جڑا ہوا تھا اور اُسے جب کھولا گیا تو اس میں سے ایک شملہ برآمد ہوا جس کا طول ۳۰ فٹ کے قریب تھا۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنی بیٹی سے شکایت کی کہ لباس سے اس کے اعضائے بدن جھلک رہے ہیں تو جواب دیا گیا کہ وہ سات جاموں میں ملبوس تھی۔

رابرٹ آرمی کا بیان ہے:-

"ہندوستان میں مشکل ہی سے کوئی گاؤں ملیگا جہاں ہر مرد و عورت اور بچہ کپڑا تیار کرنے میں مصروف نہ ہو"۔

ڈھاکہ اُس کے مضافات۔ مولی پٹم۔ کورومنڈی۔ گجرات۔ کھمبات اور وادیٔ سندھ کپاس کی پیداوار کے لئے خاص طور پر مشہور تھے۔

بہار کوٹی

شام کا سماں

دادر سے شادکام دھمن جا رہا تھا میں
اک اپنے ہمنشیں کے وطن جا رہا تھا میں

چہرہ اتر رہا تھا گلِ لالہ فام کا
پردہ تھا دن کے چہرۂ روشن پہ شام کا

گاڑی گذر رہی تھی چٹانوں سے دور دور
سہمے ہوئے کھڑے تھے الگ کھردرے کھجور

دامن تھا تار تار شفق کی نقاب کا
ہر تار نغمہ بار تھا دل کے رباب کا

جھانجھیں بجا رہی تھی سرنگوں میں خامشی
سانچوں میں ڈھل رہی تھی خموشی کے دلکشی

دیکر حسین پودوں کو انگڑائیوں کا روپ
دم لے رہی تھی خشک ہواؤں کی دوڑ دھوپ

سونے پڑے تھے تار کے کھمبوں پہ چہچہے
جھکا رہے تھے آنکھ سے ڈھلوان راستے

تھی گرد جھاڑیوں کے سروں پر اٹی ہوئی
تالاب کی جبیں پہ تھی کائی پھٹی ہوئی

شاداب کھیتیوں کی طرف جا رہی تھی راہ
پگڈنڈیوں کے موڑ کی الجھی ہوئی نگاہ

اک مرکزِ حسیں پہ نگاہیں مڑی ہوئی
نرغے میں جھکڑوں کے تھیں آہن کی ہوئی

طائرِ سکوتِ شب کے لئے بدحواس تھے
پانی خموش سبز نظارے اداس تھے

منہ ڈھانپنے لگے تھے دھندلکوں میں سبز کھیت
جمنے لگی تھی پٹڑی پہ راہوں کی گرم ریت

سنولا رہا تھا لالہ عذاروں کا بانکپن
رخ سے نقاب اُلٹنے کو تھی رات کی دلہن

شب کا جلوس اُٹھنے کو تھا اہتمام سے
رونے کو تھی سیاہی گلے مل کے شام سے

ناتمام

کامل رشید

دعوتِ عمل

جو ہو سکے تو نگاہوں کو کر تجلی گر
اُٹھا کے طور کی جانب نظر خراب نہ کر

بن اپنی راہگذر خود ہی خود ہی بن رہبر
کسی کے نقشِ قدم کا بھی اتباع نہ کر

اُٹھ اور وسعتِ امکاں پہ اک نگاہ تو ڈال
ترا جہاں نہیں محدود تا بحدِ نظر

وہ بحر تو ہے جو اب تک نہ ہو سکا محدود
اُٹھ اور حدِ سواحل کو کر دے زیر و زبر

ہو جلد گامزنِ شاہراہِ فکر و عمل
چمک رہے ہیں ابھی کچھ نقوشِ راہگذر

وہ دیکھ حشر خرامیِ رودِ دجلہ و نیل
پھر اپنی سستیِ رفتار پہ بھی ایک نظر

نازش پرتاب گڈھی

قصوروار کون؟

گو عدالت کا کمرہ اس بُری طرح کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہ تل رکھنے کی جگہ بھی محال تھی
تاہم خاموشی کا ہر طرف تسلط جما ہوا تھا جیسے وہاں کوئی جاندار چیز موجود ہی نہ تھی۔ سبھی
اپنی اپنی سانس روک کر پربھا کا بیان سُن رہے تھے اور ستیش کٹہرے کے اندر کھڑا
سوچ رہا تھا "کیا یہی وہ پربھا ہے جس نے اپنی گوری گوری باہیں ستیش کے گلے میں
ڈال کر کہا تھا —— دیکھنا ستیش! کام نکل جانے پر ٹھکرا نہ دینا"۔ ستیش
کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا لیکن پربھا تو وہی تھی —— اگرچہ ماں باپ کی
دھمکیوں —— سہیلیوں اور بھابھی کے لعن و طعن نے اُسکے دل اور اُس کے
خیالات کو بدل کر رکھ دیا تھا مگر پربھا وہی تھی —— ستیش کی پربھا!
سامعین تو وکلاء کے بحث و مباحثہ میں دلچسپی لے رہے تھے لیکن ستیش خیالات
کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا —— جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں!

جاڑے کی ایک شام تھی۔ ستیش کالج سے واپس آرہا تھا لیکن چوک کی بھیڑ
نے اُسے سائیکل سے اترنے پر مجبور کیا۔ وہ سائیکل سے اُتر کر ابھی دو چار قدم چلا ہوگا
کہ اُس کے کان میں "غضب" کی ایک آواز سنائی دی۔ اُس نے دیکھا تو ایک کتاب پڑی ہوئی
تھی! ابھی ابھی رکشا سے اُتری ہوئی کالج گرل کی شاید یہ کتاب ہوگی۔ وہ کتاب لیکر آگے
بڑھا۔ گلی کے موڑ پر کسی کی لانبی چوٹی اور جارجٹ کی ساری کا کنارہ جھلکا اور آنکھوں
سے اوجھل ہوگیا۔

"شاید یہ آپ ہی کی کتاب ہے؟" ستیش نے بڑھکر پوچھا۔

لڑکی رُک گئی۔ کسی مرد کے مقابل کھڑے ہونے کا شاید اسکے لئے یہ پہلا موقع تھا
شرم سے اُسکا چہرہ لال ہوگیا اور آنکھیں زمین کی طرف جھک گئیں۔ لڑکی نے اپنی کُل
کتابوں اور کاپیوں کا جائزہ لیا اور ستیش کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے کتاب لے لی
لفظ "شکریہ" بند ہونٹوں کو چیر کر نکل جانا چاہتا تھا لیکن ابھی شرم و حیا کی دیوی نے بے حیائی
کو راہ نہ دی، وہ چلی گئی اور بہت دُور تک نظریں گھما گھما کر ستیش کو دیکھتی رہی
ستیش کو "شکریہ" سے بھی کوئی بڑی چیز مل گئی تھی اُس نے سمجھا تھا کہ اُسے صرف
ایک بار "تھینک یو" سننے کا موقع ملے گا لیکن شرمیلی آنکھیں تو اُسے سو بار ——
ہزار بار —— "تھینک یو" کہہ گئیں۔ ستیش بھی پربھا سکسینہ، گنگناتا ہوا
آگے بڑھ گیا —— اُس نے کتاب پر نام پڑھ لیا تھا؟

کالج کی فضا اور مغربی تہذیب میں پلے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے
سے میل جول بڑھانے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔ ایک روز، دو روز اور پھر روز ہی
دونوں کی کہیں نہ کہیں نظریں چار ہو جاتی تھیں —— کبھی رکشا میں بیٹھنے
سے پہلے اور کبھی رکشا سے اترنے کے بعد —— ارادی یا غیر ارادی طور پر ——
اسے کون جانے؟ .... شرم و حیا کا نقاب اُٹھا تو باتیں کھُل کر ہونے لگیں
لیکن نظریں بچا کر، مکان کا پتہ معلوم ہی ہو چکا تھا۔ ستیش کو سب جگہیں اس راستہ
سے جانے پر نزدیک معلوم ہوتی تھیں۔ جب وہ اُس راستے سے گذرتا تو کھڑکی کے شیشہ
کے اُس پار دو بڑی بڑی آنکھیں ستیش کو دیکھتیں، جیسے وہ اُس کے استقبال کے لئے
منتظر تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت سی باتیں ہو جاتیں۔ لیکن وہاں جانا ستیش
کے اختیار کی بات تھی؟

عورتوں کی چالاکی کا تو لوگ لوہا مان چکے ہیں۔ پربھا نے ملاقات کا ایک اچھا
اور آسان ذریعہ ستیش کو بتایا۔ پربھا کا بھائی رتیش، ستیش ہی کے کالج میں
تھا۔ لیکن وہ فرسٹ ایر میں تھا اس لئے ستیش سے جان پہچان نہ تھی۔ مگر ایک ہی
مہینہ کے اندر اتنی دوستی بڑھی کہ ستیش، رتیش کے یہاں دن دن بھر رہتا لیکن
دونوں میں سے کسی کی طبیعت نہ گھبراتی —— بار رم گھٹنے کا تو دن ہی ہوتا ہے
اُس پر بھی کچھ وقت کالج میں صرف ہو جاتا تھا۔ بقیہ اوقات کیرم، تاش، ریڈیو اور
گراموفون میں گذر جاتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں رتیش کے یہاں کے کل لوگوں سے
ستیش کی جان پہچان ہوگئی۔ رتیش کے پتا جی بھی بہت خوش تھے وہ سوچا کرتے
تھے کہ ستیش اونچے درجہ میں پڑھتا ہے اس لئے اس کی صحبت میں رہ کر رتیش
بھی کچھ سیکھ سکے گا۔ پربھا کو شٹل کی آڑ میں شکار کھیلنے کا اچھا موقع ہاتھ لگا۔ اُسے ماں کی
طرف سے بالکل اطمینان تھا۔ ماں کی وہ بڑی ہی لاڈلی بیٹی تھی۔ رتیش اور ستیش
کی دوستی سے اُس نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ ستیش کیرم کھیلتا رہتا لیکن جب پربھا

اپنے گورے گورے ہاتھوں کو جوڑ کر "نمستے" کہتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی تو نہ جانے کیوں ستیش کے ہاتھ سے اسٹرائیکر پھسل جاتا اور وہ "شیور شاٹ" بھی "ڈیپ" کر سکتا وہ برابر ہارتا رہتا اور رمیش کے اُس پر ہنسنے۔ کئی بار تو اُس نے تاش کے غلط پتے چل دیئے اور رمیش کے ذریعہ اُس نے "پاگل" کا خطاب پایا۔ لیکن "آئی ایم سوری" کہکر ستیش بناوٹ دیتا۔ آمد و رفت کا سلسلہ برابر بڑھتا ہی گیا........!

ستیش کے لئے اب یہ ضروری نہیں تھا کہ رمیش کے مکان پر اُسکی موجودگی ہی میں جاتا بلکہ زیادہ تر تو وہ اُسکی غیر موجودگی میں جایا کرتا تھا۔ رمیش کو کہیں نٹ پاتھ پر دیکھ لیتا تو خود نظر بچا کر وہ اُسکے مکان کی طرف چل پڑتا۔ ستیش اور پربھا دونوں بیٹھ کر ریڈیو سنتے اور ریڈیو سے نکلی ہوئی آواز "بڑا پریم کا روگ" سے دونوں ہی کے دلوں کے تار ایک ساتھ جھنجھنا اُٹھتے۔

پریم کی پینگیں برابر بڑھتی گئیں، لیکن ستیش ڈرتا، جھجکتا اور سوچتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اچھا نہیں کر رہا ہے۔ اسکا نتیجہ بُرا ——— اور بہت بُرا ہوگا۔ کہاں پربھا اور کہاں وہ؟ لیکن آزاد فضا میں پلی ہوئی پربھا خیالات کی اس کچی دیوار کو توڑ پھوڑ کر رکھدیتی۔ وقت گذرتا گیا........ اب پربھا عمر کی سولہویں منزل طے کر رہی تھی۔ اسکے ماتا اور پتا دونوں ہی کو اسکی شادی کی فکر لاحق تھی۔

اب دونوں تک اس گھر میں رہنے کے لائق نہیں تھی کچھ دن اور گذر گئے۔ شادی کی بات پکی ہوگئی۔ دن میں کئی بار کے بدلے ایک بار........ پھر ہفتہ میں ایک دفعہ........ اور پھر مہینوں میں ملاقات ہوتی، لیکن ستیش کے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ آج یا کل؟ اُس نے رمیش کے گھر جانا کم کردیا۔ نوکر آتا تو کبھی "ایک ضروری کام ہے" کہکر ٹال دیتا اور کبھی "سر کے درد" کا بہانہ کردیتا لیکن وہ جاتا اُسی راستہ سے۔ وہ جب قدم اُٹھاتا تو غیر ارادی طور پر وہ اُس گلی کی طرف مُڑ جاتے۔ جیسے اُس گلی میں ستیش کے علاوہ اسکے قدموں کے لئے بھی کوئی خاص جاذبیت تھی!

ستیش تاریخ کی کتاب پر نظریں جمائے ہوئے پڑا تھا ——— چونکہ آنکھوں کا کام صرف دیکھنا ہے۔ وہ کتاب دیکھ رہا تھا لیکن دل کسی دوسری جگہ تھا ایسے میں اُسے کتنا یاد ہوتا، یہ ظاہر ہے۔ یکایک رمیش آکر کھڑا ہوگیا ——— "ستیش تم آجکل آتے کیوں نہیں؟ ——— پربھا بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ تم تو گھر کے آدمی ہو، تمہیں تو چوبیس گھنٹے میرے گھر رہنا چاہئے اور اگر تم انویٹیشن کارڈ نہ آنے کی وجہ سے بگڑے ہو تو یہ لو" کہکر اُس نے ایک لفافہ اُسکے سامنے پھینک دیا۔ ستیش پر جیسے بجلی سی گر گئی۔ اُس کے دل پر ایک زبردست چرکا لگا۔ ستیش کے دل کا ناسور نشتر لگتے ہی پھوٹ گیا۔ لیکن وہ سنبھلا۔ مگر اُس کے دل نے کہا ——— "نہیں! پربھا کی شادی ہونے والی ہے تو اُسے کیا؟ ——— کیا سماج کا قانون یہی ہے کہ مرد کو جس سے محبت ہو وہ چیز اُس سے سلوچ چھین کر دوسرے کو دیدے ——— میں وہاں نہیں جاؤنگا۔ ہوسکتا ہے کہ میں جذبۂ محبت سے مجبور ہو کر کچھ کر ڈالوں؟"

ستیش بہانہ ڈھونڈھنے لگا لیکن ناکام رہا! آخر اُس نے قمیص پہنی، جوتا پہنا اور رمیش کے ساتھ چل دیا۔ اب ستیش پہلا ستیش نہ تھا بلکہ ایک ٹھوکر ہی نے اُسے جگادیا تھا۔ اُس میں سوچنے کی طاقت پیدا ہوچکی تھی اور ہر کام کا نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت تھی۔ وہاں پہونچکر وہ فوراً ہی کام میں لگ گیا۔ دن بھر اسی طرح کام کرتا رہا۔ رات کو نو بجے جب وہ گھر جانے لگا تو رمیش نے اُسکو پکڑ لیا ——— واہ بابو صاحب! چلے کہاں؟ شادی تک آپ کو گھر جانیکی چھٹی نہیں مل سکتی۔ معلوم ہے کتنا انتظام کرنا ہے؟ ستیش مجبور تھا۔ اُسے رہنا ہی پڑا۔

اُسے ابھی اچھی طرح نیند بھی نہ آئی تھی کہ اُس نے ایک سایہ دیکھا۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ سایہ اُسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ پربھا کی حرکت اُسے بہت بُری معلوم ہوئی۔ قریب آنے پر ستیش نے اُسے پھٹکارا ——— پربھا! بھول جاؤ پرانی باتیں! اب تمہارا بندھن کسی دوسرے کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میں تم سے پریم کرتا ہوں اور شاید اس سنسار میں میرا یہ پریم پہلا اور آخری ہوگا۔ پھر بھی میں اپنے پریم کی خاطر تمہارا سونے کا سنسار اُجاڑنا نہیں چاہتا........ وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتا لیکن ہاتھوں پر گرے ہوئے آنسوؤں کے دو گرم گرم قطروں نے اُسکا منہ بند کردیا ——— "پربھا ماتا پتا کی فرمانبرداری ہی لڑکی کا سب سے بڑا فرض ہے۔ پربھا! اب تمہیں پرایا گھر دیکھنا ہے، تمہیں اسکا خیال رکھنا چاہئے۔ تم میری تصویر دل سے نکال دو ——— مجھے بھلا دو!" ستیش نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

پربھا سے بھی نہ رہا گیا ——— ستیش میں تمہیں اپنا سمجھتی ہوں اور سمجھتی رہونگی۔ ستیش! میں تمہیں بھول جاؤں؟ ——— اپنے پریم میں خود

کلہاڑی ماردوں۔ ——"ستیش! ایسا نہیں ہوسکتا" —— ستیش خاموش تھا...... "تم نہیں جانتے ستیش! —— میرا یہ بیاہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ میں بیچے سکے لئے بیچی جارہی ہوں۔ میرے پاس کافی روپے ہیں، چلو ناکہیں دُور —— بہت دُور بھاگ چلیں۔ جہاں صرف ہم ہی دونوں ہوں۔ وہ دن کتنا سُندر ہوگا ستیش! جب ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر دن اور راتیں گذار دینگے"۔ اُسکے آنسوؤں کا دھارا تھمنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ عورتوں کے آنسو کیا نہیں کرسکتے؟ ستیش سنبھل نہ سکا۔

لاہور کے ایک محلّہ میں اُس نے ایک مکان کی کچھ کوٹھریاں کرایہ پر لے رکھی تھیں اپنے محلّہ میں تو پتہ لگ جانے کا خوف تھا۔ اس کا مکان کیا تھا ایک اچھی خاصی سرائے تھی۔ ایک طرف اناج کی منڈی کے دلال رہتے، ایک طرف سود پر روپیہ دینے والے آغا، ایک طرف مل میں کام کرنے والی مزدورنیاں اور ایک طرف ستیش اور پربھا۔ ایک ماہ تو خوشی خوشی گذر گیا لیکن اب تو اخباروں میں بھی اُنکے بھاگنے کی خبریں آنے لگیں۔ دونوں کی تصویریں بھی نکلیں۔ پولیس کے ڈر سے گھر کے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی جس خوشی کے لئے اُنھوں نے ماتا پتا کی شفقت اور پیار —— جس آنند کے لئے اُنھوں نے گھر اور بھائی بہن کو چھوڑا تھا اسکا دسواں حصّہ بھی سماج کے زبردست بندھن اور قانون کے شکنجوں نے اُنھیں حاصل نہ ہونے دیا۔

اس گھر میں رہنے والے اُن پر شبہ کرنے لگے۔ کوئی کام نہ دھندا —— "دن بھر دونوں بیٹھے رہتے ہیں" —— کسی سے ملتے جلتے بھی نہیں نہ باتیں کرتے ہیں —— لوگ اُنھیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

"کیوں پربھا! جو میں پکڑا جاؤں تو؟" ستیش نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"کیوں! پکڑے کیوں جاؤگے؟" پربھا نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی تمہیں بھگانے کے جرم میں"

"واہ تم نے مجھے بھگایا کب؟ تم آہی کہاں رہے تھے؟ میں تو خود ہی تمہارے ساتھ چلی آئی!"

"لیکن پربھا! ماننے گا کون؟ تمہارے پتا نے میرا وارنٹ کٹوایا ہے۔ مجھے پکڑوا دینے کے لئے انعام رکھا ہے........"

ستیش کو بہت سی باتیں بُری معلوم ہوتی۔ جیسے ابھی کوئی گھبرا رہا تھا یہ سب باتیں سُن رہا ہو اور ابھی واپس گیا ہو۔ وہ چپ ہوگیا! اُس نے سوچا ——

"بھلا ایک بجے رات کو کون اُنکی بات سُننے آئیگا؟" بات کا سلسلہ پھر جاری ہوا۔ پربھا نے اُچھلتے ہوئے دل کے ساتھ کہا —— "ایک بات ہے ستیش! اگر میں عدالت میں یہ کہدوں کہ تم نے مجھے نہیں بھگایا۔ بلکہ میں خود تمہارے ساتھ بھاگی ہوں اور میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو تم چھوٹ سکتے ہو نا؟"

"لیکن ایسا کر سکو تب نا؟"

"تو کیا تم میرے اوپر یقین نہیں کرتے ستیش! مجھ کو اگر سزائے موت بھی دی جائے تو تمہارے خلاف ایک لفظ زبان سے نہیں نکل سکتی" یہ کہتے ہوئے پربھا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"رو دو نہ پربھا میں نے تو تمہیں آزمانا چاہا تھا۔ مجھے شک تھا کہ جب گھر جانے پر تم چاروں طرف کی بوچھاروں اور طعنوں کی شکار ہوگی اور ماں باپ ڈرا کر دھمکا کر یا شاید سمجھا بجھا کر میرے خلاف بیان دینے کے لئے تمہیں مجبور کرینگے تو شاید سکھ کی گود میں زندگی گذارنے کا لالچ تمہیں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کردے!"

"ایسا نہیں ہوسکتا تم میرے ساتھ ناانصافی کرتے ہو ستیش! میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی" پربھا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

نہ جانے کب دونوں سوگئے۔ دو دن اور گذر گئے۔ تیسرے دن نہ جانے پولیس کو کیسے پتہ لگ گیا اور دونوں گرفتار ہوگئے۔ پربھا اپنے ماں باپ کے پاس بھیجدی گئی لیکن ستیش لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں میں بند کردیا گیا۔ چلتے وقت پربھا کہہ گئی تھی —— "گھبرانا نہیں ستیش! میں تمہیں جلد ہی چھڑا لونگی"۔

لیکن اُسی پربھا کا عدالت میں اس طرح بیان ....

"سات سال کی قید بامشقت" یہ الفاظ کمرہ میں گونج اُٹھے ستیش جیسے خوابِ گراں سے چونک پڑا۔ اُسکے خیالات کے تار ایک ہی ساتھ جھنجھنا کر ٹوٹ پڑے۔

مجمع میں سے ایک آواز آئی —— "ایسے پڑھے لکھے بدمعاشوں کی یہی سزا ہے اُنکی نگاہوں میں کسی کی بہو بیٹیوں کی کوئی قیمت ہی نہیں رہتی" —— ستیش کی آنکھوں کے سامنے صرف ایک لفظ "دھوکا" رقص کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ کیا جانتا تھا کہ پربھا نہ صرف اسکے لئے بلکہ ساری دُنیا کے لئے دھوکے کی ٹٹی ہے؟

اُسی رات پربھا نے خودکشی کرلی۔ لیکن جیل کی اُن کالی کالی دیواروں میں بند ستیش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آخر ان سب کے لئے قصوروار کون ہے؟

"میں خود؟"

"پربھا؟"

"یا دونوں؟"

(ترجمہ از ہندی)

بدر اورنگ آبادی دکیا

میرے دل کا ساز

برکھا رُت کی راتوں میں جب بدلی گھر کر آتی ہے
ننھی ننھی بوندوں میں آکاش سے مے برساتی ہے
بادِ صبا جس کو پی کر ہر گام پہ ٹھوکر کھاتی ہے
ٹھوکر کھا کر جب غنچوں کے قدموں پر گر جاتی ہے
میرے دل کا ساز اُٹھا کر ایک دوشیزہ گاتی ہے

رنگ برنگی کلیوں کا جب روپ نکھرنے لگتا ہے
مست ہوا کا جھونکا ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا ہے
پھول جب اپنا دامن ریزہ ریزہ کرنے لگتا ہے
صبر و سکوں کی وادی میں جب ہوش گزرنے لگتا ہے
میرے دل کا ساز اُٹھا کر ایک دوشیزہ گاتی ہے

بادل اپنے سر پر لے کر جب میخانے چلتے ہیں
صحنِ گلستاں میں پیمانوں پر پیمانے چلتے ہیں
محفلِ دل میں حسن و محبت کے افسانے چلتے ہیں
شمع کی جانب جان ہتھیلی پر پروانے چلتے ہیں
میرے دل کا ساز اُٹھا کر ایک دوشیزہ گاتی ہے

وقتِ سحر کرنوں سے فضا جب جگمگ جگمگ ہوتی ہے
موجِ تجلی دُنیا کے چہرے کی سیاہی دھوتی ہے
کلیوں کے انجام پہ شبنم چپکے چپکے روتی ہے
سینوں میں جس وقت محبت تخمِ تمنا بوتی ہے
میرے دل کا ساز اُٹھا کر ایک دوشیزہ گاتی ہے

رات کی تنہائی میں جب ارمان مچلنے لگتے ہیں
اور آنکھوں سے اشکوں کے طوفان اُبلنے لگتے ہیں
ٹوٹے ہوئے دل کے نالے اشعار اُگلنے لگتے ہیں
درد اور غم جب نظموں کے سانچوں میں ڈھلنے لگتے ہیں
میرے دل کا ساز اُٹھا کر ایک دوشیزہ گاتی ہے

قسطِ ہفتم

.... کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں ـــــ بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرے کے بعد ریاست میسور کے تاریخی مقامات کی سیر)

ٹرین بنگلور پہنچی تو جناب تبسم علوی، جناب سراج اور دیگر حضرات موجود تھے تبسم صاحب اور سراج صاحب نے ٹرین کی تبدیلی میں بڑی مدد کی۔ ٹرین اسقدر کھچا کھچ بھرا ہوا ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں سیکنڈ کلاس تو کجا فرسٹ کلاس میں کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی ہے۔ ہندوستانی اپنی اخلاق و ثقافت میں کسی ملک سے پیچھے نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بعض ممالک سے آگے ہیں چنانچہ چند آدمیوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمیں جگہ دے دی۔ تبسم صاحب اور سراج صاحب دو تین اسٹیشنوں تک ہمارے ساتھ چلے۔ تبسم صاحب نے اپنی بیاض پر قبلہ و کعبہ سے بطور یادگار ایک شعر بھی لکھوا لیا بنگلور کے AUTOGRAPA والا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ سات بجے شام کو ہم بنگلور پہنچ گئے۔ اسٹیشن سے بیت اختر صاحبہ کا بنگلہ بہت کافی دور ہے۔ وہاں تک پہونچنے کے لئے سارا شہر پار کرنا پڑتا ہے چنانچہ ٹیکسی کرکے "گلزارِ اختر" تک پہونچے۔ یہاں کا تو معاملہ ہی عجیب ہے ہم اپنا تمام سامان مرتب کرکے کمرہ میں بند کرکے گئے تھے مگر کمرہ کھلا ہوا ہے اور حضرت مولانا محوی لکھنوی استراحت فرما رہے ہیں۔ ابوالکلام شاد بھی موجود ہیں۔ مولانا دیکھتے ہی سروقد کھڑے ہوگئے۔ پرتپاک معانقہ کیا۔ کچھ دیر بعد مولانا سیماب باہر تشریف لے گئے۔ سبزہ زار میں کرسیوں پر خانصاحب عبدالغنی، حضرت جگر مرادآبادی اور دیگر حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ خانصاحب نے فوراً چائے اور ناشتہ منگایا۔ حضرت مولانا محوی لکھنوی سے معلوم ہوا کہ جس بستر پر وہ آرام فرما رہے ہیں وہ حضرت جگر کا ہے کچھ دیر بعد مولانا محوی تشریف لے گئے۔ حضرت جگر بھی کمرہ میں ایک دو بار آئے مگر زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکے چونکہ ہمیں دو گھنٹے کے بعد ہی میسور کے لئے روانہ ہونا ہے۔ اس لئے عارضی طور پر ایک پلنگ پر بستر کرا لیا ہے نصف گھنٹہ بعد بیت اختر اور قمر صاحب آگئے۔ انکے بیان کردہ واقعاتِ مابعد مشاعرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ معلوم کرکے کہ ہم ساڑھے دس بجے کی ٹرین سے میسور جارہے ہیں، موصوفہ نے دسترخوان بچھوا دیا

آج کئی دن بعد "قصر الادب" آگرہ سے خط آیا ہے۔ سب خیریت ہے۔ لفافہ میں چار پانچ آل انڈیا مشاعروں کے دعوت نامے اور آل انڈیا ریڈیو دہلی کا "کنٹریکٹ فارم" بھی ہے۔ اسی وقت بعض ضروری خطوط کے جواب لکھ دیئے گئے ہیں۔

حکیم عبدالمنتقم خانصاحب تبسم بھی تشریف لے آئے ہیں۔ تبسم صاحب اور شاد صاحب ہمارے ساتھ ہی میسور چل رہے ہیں اور میسور چلنے کی دعوت ڈی محمد خلیل صاحب زعیم سیمابی آدمی کنٹریکٹر نے دی ہے۔ زعیم صاحب بھی دس بجے کے قریب کار لیکر آگئے اور سب اسٹیشن کے لئے روانہ ہوگئے۔ زعیم صاحب نے سیکنڈ کلاس کی کچھ نشستیں پہلے سے ریزرو کرا لی ہیں۔ یہاں یہ گفتگو درپیش ہے کہ پہلے میسور چلا جائے یا "سرنگاپٹم" کی سیر کی جائے۔ چنانچہ بالاتفاق یہی طے پایا ہے کہ پہلے غازیِ صف شکن شہیدِ حق ٹیپو سلطان کے مزار پر حاضری دی جائے اور سرنگاپٹم اتر جائے۔ رات کو بارہ بجے کے قریب نیند آئی۔ اوپر کی نشست اور بھرے راستے کے نشیب و فراز۔ رات بھر نیم خوابی کی حالت میں جھولا جھولتا رہا۔ تقریباً ۵ بجے صبح سرنگاپٹم اسٹیشن آیا اور ہم سب لوگ یہاں اتر گئے۔ چونکہ ستارۂ صبح میں ابھی روشنی باقی ہے اور اندھیروں کے ڈیرے اٹھے نہیں ہیں۔ اس لئے ویٹنگ روم میں جاکر ٹھہر گئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہوتے ہوتے پو بھی پھٹ گئی اور صبح اپنی تمام صباحتوں، چڑیوں کی چہکار اور جھنکار کے ساتھ طلوع ہونی شروع ہوگئی۔ میسور کی راتیں عموماً ٹھنڈی ہوتی ہیں اور صبحیں بھیگی ہوئی۔ حضرت مولانا سیماب اور زعیم صاحب ویٹنگ روم ہی میں ہیں۔ تبسم صاحب شاد صاحب اور میں ریلوے لائن کو عبور کرکے سامنے نظر آنے والی مسجد کو دیکھنے کے لئے چلے ہیں گو یہ حصہ سرنگاپٹم سے بالکل مختلف سمت میں ہے لیکن مجھے اس زمین کی ہر سمت "گنجۂ آزادی" اور اس کا ہر ذرہ حریت کا درخشاں آفتاب نظر آرہا ہے۔ ہر پتھر کو دیکھ کر قدم خود بخود رک جاتے ہیں۔ ویٹنگ روم سے مسجد کا فاصلہ مشکل سے سو قدم ہے۔ قریب پہونچے تو دروازہ میں قفل پڑا ہوا پایا۔ مسجد کی کہنگی اور ساخت سلطانِ شہید کے زمانہ کا پتہ دے رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے اندر سے کس طرح دیکھا جائے؟ چنانچہ اندر جانے کا دوسرا راستہ پیدا کر ہی لیا اور مسجد کی دیوار سے لگے ہوئے ایک ٹیلے پر ہم چڑھ گئے۔ اندر کی سمت جھانک کر دیکھا تو ویرانی، کہنگی اور شکستگی سے نگاہیں دوچار ہوئیں۔ مسجد کے محراب و منبر پر ابھی حسرت برس رہی ہے۔ یہ بانیِ اعظم میر جعفر کی تعمیر کردہ مسجد ہے۔ مسجد کی پشت کی طرف سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے تو کچھ بارود خانے نظر آئے اور کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے آثار عبرتِ نگاہ بنے۔ تقریباً بیس منٹ میں ہم لوگ وہاں سے واپس آگئے۔ سورج سونا بکھیر رہا ہے اور ہر طرف زندگی کے آثار بیدار ہو چکے ہیں۔ حضرت زعیم، کھانا اور ناشتہ ایک بڑے صندوق میں جو اسی کام کے لئے مخصوص ہے، اپنے گھر سے لیکر چلے ہیں سب نے ناشتہ کیا۔ یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا ہے کہ ہم گھر سے باہر ہیں۔ ناشتہ سے فارغ ہوکر تمام سامان ریلوے آفس میں رکھوا دیا اور دو تانگے کرکے سرنگاپٹم کے تاریخی شہر کی سیر کے لئے روانہ ہوگئے۔ (باقی ۔ باقی)

[illegible]از صدیقی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "اب زمیں اپنی ہے اور نہ آسماں اپنا"

دبیر الملک حضرت مرزا غالب اکبرآبادی مرحوم

ذکر اس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

ہے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُنکو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

تاکرے نہ غمازی۔ کرلیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے داناتھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

فصیح الملک حضرت مرزا داغ دہلوی مرحوم

چاہتا ہے کب مرنا کوئی سخت جاں اپنا
تجھ کو چاہئے قاتل اوّل امتحاں اپنا

جب یقین عشق آیا پھر وہ بُت کہاں اپنا
آگئے غضب میں یا ہم دیکھے امتحاں اپنا

لاکھ آفتیں آئیں، لاکھ حشر میں چائیں
اک ذرے نہ ہونے سے بھر گیا مکاں اپنا

بچ رہے گا کوئی تو برق و باد و باراں سے
ہر درخت پر باندھا ہم نے آشیاں اپنا

دل پر جس قدر ہیں داغ ہم کو کیا یقیں آئے
داغ لے نمود اپنا، زخم بے نشاں اپنا

دوست اعدا یا دوست ایک غم میں مرجائے
دل غریق رحمت ہو تھا مزاج داں اپنا

لوگ ماجرائے غم پوچھنے کو آتے ہیں
بیٹھ دو مرے در پر کوئی پاسباں اپنا

[illegible] برائی سے بھی اب تذکرہ نہیں آتا
ذکر خیر رہتا تھا، رات دن جہاں اپنا

دھوم صبح محشر کی داغ سنتے آتے ہیں
پر نہیں کچھ اندیشہ خواب ہے گراں اپنا

حضرت فانی بدایونی مرحوم

[illegible] سب پہ ہو چکا حال دل عیاں اپنا
ہر سکوت بیجا کا تھا نہیں تھا بیاں اپنا

[illegible] ہے کچھ اُمید بیابیں [illegible]
[illegible] پھر [illegible] دل ہے رازداں اپنا

[illegible] گل [illegible]
فصل گل میں [illegible] نہیں اپنا

تھا وہم ناز اُن کا دل کی آخری منزل
ہم نے اُن کو ڈھونڈا تھا مل گیا نشاں اپنا

بجلیوں سے قربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں، یعنی تھا کوئی مکاں اپنا

اُس نے دل کی حالت کا کیا اثر لیا ہوگا
دل نے کیا کہا ہوگا دل ہے بے زباں اپنا

نقشِ سجدہ گھبراکر کیوں مٹائے دیتے ہو
اس میں کیا نظر آیا سنگِ آستاں اپنا

پھر بھی نارسا ٹھہرا اور کیا رسا ہوتا
عرش سے پرے پہنچا شورِ الاماں اپنا

گھر ہے اب تنِ فانی گھر کبھی چمن بھی تھا
ہاں کبھی وطن بھی تھا اب کہاں وطن اپنا

حضرت علّامہ سیماب اکبرابادی

پہونچے تا بہ منزل کیا، سلسلہ یہاں اپنا
راستے میں سب اُن کے اور کارواں اپنا

بزم حسن میں ہوگا کون ترجماں اپنا
دل پہ کچھ بھروسہ تھا، دل مگر کہاں اپنا

درد کو خدا رکھے کروٹیں بدلوادیں
ورنہ کون شام غم تھا مزاج داں اپنا

دیکھ لیتی خوابیدہ کارواں بہاروں کے
جائزہ اگر لیتی صبح گلستاں اپنا

موج دائرہ بنکر آشنائے مرکز ہے
بن گیا یقیں آخر بھول کر گماں اپنا

اب کھلا کہ ہیں اُن کی ذات کا خلاصہ ہم
پوچھ کر پتہ میرا دے گئے نشاں اپنا

یہ غلط نشانہ کیا، طور ختم، غش موسیٰ
تم نے لیا ہوتا پہلے امتحاں اپنا

سر اٹھا کے بھی ہم کو سجدہ کرنا آتا ہے
آپ اپنے گھر دیکھیں سنگِ آستاں اپنا

تھا تھا بہ سیماب عمر بزم فانی سے
ہم بھی چھوڑ آتے ہیں نقشِ جاوداں اپنا

حضرت دل شاہجہاں پوری

دل ہوا محبت میں صرفِ امتحاں اپنا
چھا گئے زمانہ پر جب مٹا نشاں اپنا

کو یہ محبت کی ابتدا دہیں سے ہے
کھائے ٹھوکریں اکثر ہر قدم جہاں اپنا

حالِ مختصر یہ ہے، ہوچکا جو ہونا تھا
سنگِ غم سے ٹکراکر قلب ناتواں اپنا

ہم اسے محبت کا معجزہ سمجھتے ہیں
ہو گیا ہے ناصح بھی اب مزاج داں اپنا

دل ہوا خود رفتہ کھو گئیں تمنائیں
جستجو ئے منزل میں گم ہے کارواں اپنا

یاس کی [illegible] آج ترجماں [illegible]
[illegible]

وادیٔ محبت کی حشر خیزیاں دیکھیں
یہ خبر نہیں اب تک دل نشاں کہاں اپنا

اب ہر آستانے سے بے نیاز ہیں سجدے
جوشِ بندگی میں سر جھک گیا کہاں اپنا

آج تک نگاہوں میں وہ مقام ہے اے دل
لغزشوں کا مرکز تھا ہر قدم جہاں اپنا

حضرت خان بہادر سید رضا علی وحشت کلکتوی

حسن سے ترے رنگیں ہو گیا بیاں اپنا
چھا گیا زمانے پر رنگِ داستاں اپنا

ہے تری اشارے سے دشمن آسماں اپنا
باوجود مایوسی دل ہے شادماں اپنا

مدعا برآری کی اب ہوس نہیں دل میں
مدعا ترا پایا مدعا کہاں اپنا

کوئی منزلِ مقصود ہو تو اس طرف جاؤں
جائے تو کدھر جائے گم ہے کارواں اپنا

ہے تعلق باہم دونوں ہیں ترقی پر
عادت جفا تیری شیوہ فغاں اپنا

وصل کس کو کہتے ہیں ہجر کیا ہے کیا جانوں
ہے غمِ محبت ہی عیشِ جاوداں اپنا

وہ کریں جفا کب تک ہم کریں وفا کب تک
ختم بھی کبھی ہوگا یا رب امتحاں اپنا

ذکر کرتے دیتے ہیں ہمنوا گلستاں کا
یاد آ ہی جاتا ہے مجھکو آشیاں اپنا

ہائے کس قدر بدلا رنگِ شاعری وحشت
اب نظر نہیں آتا کوئی ہم زباں اپنا

حضرت مولانا ناطق گلاؤٹھوی

(سب اردو روزمرہ کے قافیے فارسی ترکیب کے بغیر)

کس کو مہرباں کہئے کون مہرباں اپنا
وقت کی یہ باتیں ہیں وقت اب کہاں اپنا

اب جہاں میں باقی ہے آہ سو نشاں اپنا
اُڑ گئے دھوئیں اپنے رہ گیا دھواں اپنا

اے خدا گلہ تجھ سے اپنی بے نیازی کا
آج حال کہتا ہے ایک بے زباں اپنا

سو کے رات کاٹی ہے بیکسی کے پہلو میں
چاندنی نے دیکھا ہے میری گھر سماں اپنا

کاٹتے ہے دن اپنے غم ہمارے گھر آ کر
خستہ حال جاتے ہیں ہو کوئی جہاں اپنا

اپنے کام کی باتیں اور اسکی محفل میں
نام لے نہیں سکتا آدمی وہاں اپنا

گھر تو اب بھی دنیا کے دھوپ ہی میں بیٹھے ہیں
کیوں اٹھا نہیں لیتا سایہ آسماں اپنا

نامراد دنیا میں رو کے خوب بھر پائے
چل نکل چلیں اے دل کچھ نہیں یہاں اپنا

جانتے ہوئے ناطق ہم وطن کی حالت کو
ڈھونڈتے پھریں جا کر کس لئے مکاں اپنا

حضرت مسکین اکبرآبادی

حسن ہو گیا آخر عشقِ رائیگاں اپنا
بن گیا نشاں انکا مٹ کے ہر نشاں اپنا

ابتدائے جادہ پر پھر پلٹ کے آ پہونچا
کامیابِ منزل ہے آج کارواں اپنا

وہ کرم کریں تو کیوں؟ وہ ستم کریں تو کیا؟
دل ہے غم نواز اپنا غم ہے جانستاں اپنا

تیرا صرف ہی کیا ہے اے حیاتِ روزِ روزہ
حسنِ لازوال انکا عشقِ جاوداں اپنا

کس طرح ہوئے رسوا حسن و عشق کیا کہئے
حسن انکا رازِ دل ۔ رازِ دل عیاں اپنا

عشق ہے فنا آغاز حسن ہے بقا انجام
تیری سمت ہر ذرہ ہے رواں دواں اپنا

میں جہاں سے اٹھا ہوں ذوقِ ننگ و بو لیکر
کیا ہوا جہاں تیرا ڈھونڈ اب نشاں اپنا

رازِ شمع کھلتا ہے آہ! غمِ پروانہ
کہہ رہا ہے افسانہ ۔ انکا رازداں اپنا

ہر قدم اٹھاتا ہے انکے چشم و ابرو پر
انکا آدمی نکلا امیرِ کارواں اپنا

حضرت منظر صدیقی اکبرآبادی

اب بروئے کار آیا جذبۂ نہاں اپنا
اُن کے دل میں گونج اٹھا نعرۂ جواں اپنا

عشق ہے رفیق اپنا، حسن قدرداں اپنا
عرش کے مقابل ہے آج آستاں اپنا

یہ بھی اک زمانہ ہے بار ہیں جہاں پر ہم
وہ بھی اک زمانہ تھا جب تھا کل جہاں اپنا

آج ہر قدم پر ہے کیوں گمان منزل کا
پہلے تو نہ ملتا تھا منزلوں نشاں اپنا

تلملا کے ڈر دیگا تو ان بجلیوں کے شعلوں سے
تو اسی اجالے میں ڈھونڈ آشیاں اپنا

اب تو آسماں بھی ہے انقلاب کا حامی
اب نہیں حقیقت میں دشمن آسماں اپنا

میری نامرادی پر آپ شادماں کیوں ہیں
رنگ لائے گی اکدن سعیٔ رائیگاں اپنا

ڈوبتے ہوئے سورج پھر ابھر ہی جاتے ہیں
رخ بدلنے والی ہے گردشِ جہاں اپنا

ہار میں ہے اے منظر راز جیت کا مضمر
نامراد رہنے میں کچھ نہیں زیاں اپنا

حضرت مولانا الم مظفرنگری

جب نہیں گلستاں میں کوئی رازداں اپنا
کیوں نہ اب قفس ہی کو سمجھیں آشیاں اپنا

نزع میں بہت دھیمی سرعتِ نفس کی ہے
ہے قریب منزل کے آج کارواں اپنا

دشت نام رکھتے ہیں اسکا کم نظر والے
جب کبھی بدلتا ہے رنگ گلستاں اپنا

کیوں نہ مغتنم جانیں کوچۂ محبت کو
اک یہی ٹھکانہ ہے زیرِ آسماں اپنا

راستے ہیں پیچیدہ منزلِ محبت کے
راستے میں ہو جائے گم نہ کارواں اپنا

رخصت اے چمن سب ہیں گزری اجازت ہو
مڑ کے دیکھ لیں صیاد ہم بھی آشیاں اپنا

بیخودی نے کی اپنی رہبری حقیقت میں
بڑھ چکا تھا منزل سے ورنہ کارواں اپنا

دونوں عالموں پا کو سجدہ اب مالِ الفت کو
ہو گیا ہے بیگانہ تھا جو رازداں اپنا

اے الم سناتے ہم کس کو داستاں اپنی
جب نہیں زمانے میں کوئی ہم زباں اپنا

حضرت رونق دکنی

دہر میں سناتے ہم کس کو رازداں اپنا
کب زمیں اپنی تھی کب تھا آسماں اپنا

پھر کہیں نہ چھوا ئے ہم سے وحشت کے تنکے
ہے زمیں کی جانب خم جو آشیاں اپنا

کیوں کسی کو دیتے ہم غور و فکر کی زحمت
بن گیا غم ہستی خود ہی ترجماں اپنا

ربط حسن و الفت کی کیوں کریں ہم کوشش
زندگی کا یہ وقفہ کیوں ہو رائیگاں اپنا

بارگاہ الفت نے سجدے کر دیئے واپس
تھا سر نیاز آگیں ننگ آستاں اپنا

کشمکش تو ہے لیکن اُن کی دید ممکن ہے
عارضی نقاب اُنکا شوق جاوداں اپنا

اشک و آہ کی یورش ہے وبال جاں دونوں
یعنی باد و باراں کی زد میں ہے مکاں اپنا

جناب نذیر سیرکوٹی

روح داغدار اپنی دل ہے خونچکاں اپنا
کام اب کرے آکر مرگ ناگہاں اپنا

بزم آب و گل فانی اسکی ہر ادا فانی
یاد ہم کریں کس کو کون ہے یہاں اپنا

ہم تو ننگ دنیا ہیں نامراد ہستی ہیں
اب ہمیں بتاتا ہے کون مہماں اپنا

موت پہلی منزل ہے زندگی باقی کی
ہو کے بے نشاں ہم نے پالیا نشاں اپنا

اب نہیں ہمیں پروا قرب و بعد منزل کی
ہم جہاں جھکا دیں سر ہے وہ آستاں اپنا

داستان غم اپنی دکھ بھری کہانی ہے
ہم بیاں کریں اسکو حوصلہ کہاں اپنا

اے نذیر منزل ہے اصل میں وہی اپنی
چلتے چلتے رک جائے کارواں جہاں اپنا

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

کیونکر اپنے مرکز پر پہنچے کارواں اپنا
ہر قدم ہے منزل میں عشق کی گراں اپنا

کس سے کہئے شام غم قصۂ نہاں اپنا
کوئی محرم اپنا ہے اور نہ رازداں اپنا

کچھ تو دل کی حالت پر رحم آئے گا اُن کو
کچھ تو رنگ لائے گا جذبۂ نہاں اپنا

مل گیا مقدر سے غم بقدر ظرف شوق
اب مذاق درد دل ہو گیا گراں اپنا

چپکے چپکے دل ہی سے شام ہجر باتیں کیں
جب نظر نہیں آیا کوئی رازداں اپنا

آ رہی ہے رہ رہ کر یاد عہد رفتہ کی
پھر رہا ہے نظروں میں دورِ رائیگاں اپنا

طرفہ ہیں ابھی تو ہم خوشہ چین باغ عشق
بام عرش پر ہوگا اک دن آشیاں اپنا

جناب عالی علی نگری

دیکھئے ترا جلوہ، حوصلہ کہاں اپنا
لٹ گیا سر منزل آکے کارواں اپنا

کیا ہوئے جوانی کے پُر فریب نظارے
جس کو دل سمجھتے تھے اب وہ دل کہاں اپنا

اپنی ہی نواؤں سے ہے بہار کی گرمی
باغباں کے دل میں کیوں کھٹکے آشیاں اپنا

کسقدر ہیں جاں پرور زندگی کے ہنگامے
ہر نفس ہے خلاق عمر جاوداں اپنا

عشق کی زمانے میں اب تو ہوگی رسوائی
حسن کو بنایا ہے ہم نے رازداں اپنا

برق سے کوئی کہدے پھر بہار آئیگی
پھر گلوں کے سائے میں ہوگا آشیاں اپنا

ہر طرف ہے عالم میں انقلاب اے عالی
چھا گیا زمانے پر رنگ داستاں اپنا

جناب نکہت نوری بی-اے ناگپور

درد دل دبانے سے ہو گیا عیاں اپنا
چشم پردہ در نکلا ضبط رازداں اپنا

کس کا لطف آمد ہے چارہ ساز جاں اپنا
منہ چھپائے پھرتی ہے مرگ ناگہاں اپنا

مر کے تیری حسرت میں ہم ہیں زندۂ جاوید
کام آگیا آخر شوق رائیگاں اپنا

ایک ناوک غم سے دو غزال ہیں زخمی
جاں ہے خستہ دل اپنی دل ہے خستہ جاں اپنا

بازوؤں میں پھر شاید آگئے پر پرواز
پھر نظر میں پھرتا ہے اپنی آشیاں اپنا

اٹھ کے کیوں نہ اُس در سے ہم جہاں سے اٹھ جائیں
اب کہاں ٹھکانا ہے زیر آسماں اپنا

مان کر کہا دل کا جان پر بنی نکہت
دوستی میں ہے اسکی دشمن آسماں اپنا

جناب رفیق انصاری شہادوی

کوئی سوزش غم کا تھا نہ رازداں اپنا
اشک بن کے بہہ نکلا درد بیکراں اپنا

برق بھی شرارہ ہے پھول بھی شرارہ ہے
شاخ گل پہ باندھا کیوں ہم نے آشیاں اپنا

غم نہیں ہے دوری کا پا ہی لینگے منزل کو
دل میں عزم باقی ہے عزم ہے جواں اپنا

خاک گلستاں پہ کی مدتوں عرق ریزی
ہر کلی کی رگ رگ میں خون ہے رواں اپنا

اوس بن کے برسے ہیں مدتوں گلستاں میں
سوزش نہاں اپنی درد بیکراں اپنا

رنج خاطر ہستی کیوں رفیق ہو ہم کو
جب نہیں ہے دنیا میں کوئی رازداں اپنا

جناب اثر واثقی بنگلوری

جادۂ محبت میں دل ہے کامراں اپنا
ہے بلند اگر ہمت عزم ہے جواں اپنا

تشنہ فنا ہوں میں باغباں کا ڈر کیا ہے
برق سے کروں روشن کیوں نہ آشیاں اپنا

فرق رات اور دن کا ہم میں اور اس میں ہے
حسن ہے عیاں اسکا عشق ہے نہاں اپنا

شام غم میں کیا دیکھوں راہ اسکے آنے کی
وقت کیوں کرے ضائع مرگ ناگہاں اپنا

خود غرض ہی پاتا ہوں ہر کسی کو دنیا میں
اے اثر بتاؤں میں کس کو رازداں اپنا

جناب آرزو اکبرآبادی

ہم اگر نہیں ہونگے، گل چمن میں کہدینگے
حال جو بھی دیکھے گی شاخ آشیاں اپنا

جا رہے ہیں منزل کا امتیاز کیا ہم کو
جس طرف بھی لیجائے میر کارواں اپنا

نقشہ سا پاتے ہیں بزمِ دوست کا عالم
حشر کر گئی بپا غالبؔ فغاں اپنا

سوگ بزمِ عالم میں تم کس کی موت پر ہوگا
کیوں نہیں زمانے میں کوئی نوحہ خواں اپنا

کر نہ دے کہیں رسوا آرزو دو عالم میں
آج رنگ لاتی ہے چشمِ خونفشاں اپنا

جناب مانیؔ ناگپوری

رازِ عشقِ غیروں پر کب ہوا عیاں اپنا
جاں تھی ہم زباں اپنی دل تھا رازداں اپنا

حسرتوں نے بنا غم ہو رہی ہے اب دل میں
لٹ رہا ہے منزل پر ہائے کارواں اپنا

ہے ترا تصور بھی وصل کا حسیں پہلو
دل شبِ الم کیوں ہو مائلِ فغاں اپنا

آگ نے گلوں کی پھر دل میں آگ بھڑکا دی
پھر رہا ہے آنکھوں میں آج آشیاں اپنا

دل اُجاڑنا تو ہے عرضِ حال کرنے پر
لیکن اے ستمگر مانیؔ حوصلہ کہاں اپنا

جناب خلیقؔ ابولوی

تم بتاؤ منزل پر کیا یہ قافلہ پہونچے
بے اصول سا ہے جب میرِ کارواں اپنا

کس کو اتنی فرصت ہے کس کو فکر ہے اپنی
کون دیکھ سکتا ہے حالِ ناتواں اپنا

وہ تو ہیں مزور اب تک مائلِ جفا لیکن
دل ہی اب نہیں ہوتا مائلِ فغاں اپنا

اے خلیقؔ کیا کہیے حال آشیانے کا
بجلیوں کی زد میں ہے آج گلستاں اپنا

جناب فوقؔ بہاری

اُن کو کیا بتائیں ہم نام اور نشاں اپنا
یعنی اب ٹھکانہ ہی ایک جا کہاں اپنا

وہ بدل گئے ہم سے یا بدل گئی دنیا
اب زمیں اپنی ہے اور نہ آسماں اپنا

روز اک نئے سر کی فکر ان کو رہتی ہے
روز وہ بدلتے ہیں سنگِ آستاں اپنا

فوقؔ چپ رہو، دیکھو لب نہ عشق میں کھولو
غیر کو بناؤ کیوں مفت رازداں اپنا

جناب حلیمؔ ارنڈوی

لے لیا مقدر نے آج امتحاں اپنا
ورنہ در کہاں اُنکا اور سر کہاں اپنا

ہم بھی اے صبا اُنکو کچھ پیام دے دیتے
حالِ دل اگر ہوتا قابلِ بیاں اپنا

شیخ و برہمن جائیں دیر اور حرم جائیں
ہم نے ڈھونڈ رکھا ہے اک الگ مکاں اپنا

جناب انورؔ شاہدوی

سینچتا ہے اب خوں سے ہم کو گلستاں اپنا
باندھنا ہے پھولوں پر آج آشیاں اپنا

جو شریک راحت تھا کیوں شریکِ غم ہوتا
ساز تھا عیاں اپنا سوز تھا نہاں اپنا

ہم بھی ہیں شریک اُنکی بزم میں تہ داماں ہیں
یعنی ایک عالم ہے یہاں وہاں اپنا

جناب شہزادؔ پشاوری

وہ مری وفاؤں کا امتحاں کیا لیں گے
سر یہ کٹ چلا تو چلے دینے امتحاں اپنا

بجلیاں بھی بدظن ہیں میری کور بختی سے
میں ہی خود جلاتا ہوں آج آشیاں اپنا

حضرت مولانا جالبؔ سہرامی

مرکزِ نظر ہے اب شاہدِ نہاں اپنا
بن گیا وہیں کعبہ سر جھکا جہاں اپنا

دشمنِ مذاقِ دل، زندگی سکوں کی ہے
بجلیوں کی زد پر ہو کاش آشیاں اپنا

سن نہیں سکے گا تو میری سرگذشتِ غم
منتہائے ہمت ہے عجزِ بیاں اپنا

رہبرِ حقیقت کو مشعلِ ہدایت ہوں
ہر قدم پہ آیا ہوں چھوڑ کر نشاں اپنا

شکریہ ترا، لیکن میں نہیں بدل سکتا
عیشِ چند لمحے سے رنجِ جاوداں اپنا

بہرِ دل کی آنکھوں میں نور ہے بصیرت کا
اور بھی نہاں کر لے جلوۂ نہاں اپنا

ترجمانِ حالِ دل لفظ ہی نہیں کوئی
منکشف کروں کیونکر جذبۂ نہاں اپنا

محرمِ رموزِ حق کوئی بھی نہیں جالبؔ
بند کر زباں اپنی، ختم کر بیاں اپنا

جناب رعناؔ نظامی۔ راجوری (کشمیر)

رازِ دل تحیر نے کر دیا عیاں اپنا
کی اُسی نے غمازی تھا جو رازداں اپنا

ایک لمحہ فرصت کا اب نہیں مقدر میں
جانے کیوں ہوا دشمن دورِ آسماں اپنا

راستے تھے ناہموار آندھیاں تھیں طوفاں تھے
جا ہی پہونچا منزل پر باری کارواں اپنا

دستبردِ باطل سے آج تک رہا محفوظ
رفعتِ ثریا سے تھا پرے نشاں اپنا

ہم لباسِ آدم میں شاہکارِ فطرت ہیں
قدسیوں کے لب پر ہے نغمۂ رواں اپنا

دیکھنا چاہئے رعناؔ یہ تضاد طینت کا
آہ بے اثر اپنی۔ نالہ جانستاں اپنا

——— ((بقیہ خاصانِ ادب صفحہ ۴)) ———

(۵۹) محترمہ بیگم روشن آرا افلودی پارک سرکس کلکتہ سے سالانہ
(۶۰) محترمہ خورشیدی بیگم صاحبہ رپن اسٹریٹ کلکتہ سے سالانہ
(۶۱) جناب منشی ایم۔ آر شاہ صاحب ایم۔ بی۔ ایل۔ ٹی (آنرز این پنجابی دلشنو) اجنالہ سے سالانہ
(۶۲) جناب خادم حسین صاحب خادم دیہاتی جبلپور سے سالانہ
(۶۳) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور سے سالانہ
(۶۴) جناب شیخ محمد احمد صاحب نازش سیالی پرتاب گڑھی ولد حاجی شیخ محمد ضمیر صاحب مرحوم رئیس پرتاب گڑھ سے سالانہ
(۶۵) محترمہ سلمیٰ خاتون صاحبہ کنیز منا پور بنگال سے سالانہ
(۶۶) جناب خان نیری محبت خان جی آف کوٹھری بانسواڑہ (کاٹھیاواڑ) سے سالانہ
(۶۷) جناب ابراہیم خان صاحب نیرؔ جونا گڑھی سے سالانہ
(۶۸) جناب حبیب محسن خان صاحب حبیبؔ شاہجہانپوری کوٹا سے سالانہ
(۶۹) جناب عبدالستار خاں صاحب قائم گنجوری (دہلی) سے سالانہ
(۷۰) مسٹر اکرم سنگھ بی۔ اے۔ پروپرائٹر بھولا رام اینڈ سنس دہلی سے سالانہ
(۷۱) محترمہ حجاب بنارسی (ناگپور) سے سالانہ

اصلاحِ سخن :- جناب شہید جبلی کی غزل پر حضرت آسی رڑکوی کی اصلاح اور اُس پر علامہ سیماب مدظلہٗ کی نظرِ ثانی

دسمبر ۱۹۳۲ء میں جب بنگلور سے بمبئی واپس آیا تو سیماب لٹریری سوسائٹی باندرہ کے ایک مشاعرہ کا علم ہوا۔ اُسی مشاعرہ کے لئے جناب شہید نے یہ غزل کہی تھی جس پر حضرت آسی اصلاح فرما چکے تھے چونکہ اُن کے استادِ محترم علامہ سیماب وہاں اس وقت موجود تھے اس لئے حضرت آسی نے اپنی اصلاح کی ہوئی غزل استاد کے سامنے رکھدی۔ آسی صاحب کی اصلاح پر علامہ سیماب کی اصلاح افادہ سے خالی نہیں اور بڑی حد تک قابلِ غور و فکر ہے۔

اثر پذیر ہے تکلیفِ نوکِ خار ہنوز ۱ گرچہ دشت نوردی مرا شعار ہنوز

صورت ہے آشکار

ہوں مثلِ فطرتِ سیماب بے قرار ہنوز ۲ جنونِ عشق ہے ~~سر پہ سوار~~ ہنوز

اصلاحِ سیماب " " " " " " "اک اضطراب ہے صورت سے آشکار ہنوز

~~ملی ہو داد [illegible] نہیں قرار ہنوز~~ ۳ ~~زبانِ شعر میں کہتا ہوں حالِ زار ہنوز~~

اصلاحِ سیماب نہیں ہے مرضِ محبت پر اختیار ہنوز " " " " " " " "

تمہارا کہیں نہیں ملتا

تمہارا نقشِ کفِ پا ~~[illegible]~~ ۴ جبینِ شوق ہے سجدے کو بے قرار ہنوز

اصلاحِ سیماب " " " " " " " " میں سجدہ ریز " "

یقین ہوا

تم آئے پاس مرے تو مجھے ~~[illegible]~~ ۵ فضائے عالمِ امکاں ہے سازگار ہنوز

جنونِ شوق اُٹھا لیتا ہے [illegible] ۶ مرے مزاج سے واقف نہیں بہار ہنوز

کسی کے کا

" اگرچہ زیست پہ اپنی کچھ اعتماد نہیں ۷ تمہارے وعدہ پہ لیکن ہے اعتبار ہنوز

خزاں نصیب ہیں جو ہیں یہ مرا عقیدہ ہے ۸ گر چمن میں ہے رنگینیِ بہار ہنوز

اصلاحِ سیماب " " " " " " " چمن ہے حال " "

بنا نہ کام کوئی احتیاط سے بھی شہید
مری نظر سے محبت ہے آشکار ہنوز

توجیہ

(۲) جنونِ عشق کا سر پہ سوار ہونا کسی قدر بھونڈا اندازِ بیان تھا۔ حضرتِ آسی کی اصلاح سے اندازِ بیان میں لطافت پیدا ہو گئی۔ مگر جنونِ عشق اور بے قراری میں کوئی گہرا ارتباط نہ تھا۔ اسی لئے علامہ سیماب نے "اک اضطراب" بنا کر شعر کو مکمل اور موثر کر دیا

(۳) حضرتِ آسی نے اس شعر کو نظری کر دیا تھا۔ حالانکہ شعر کا دوسرا مصرع پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کسی اچھے مفہوم کے ساتھ مصرع لگایا جائے علامہ سیماب نے جو مصرع لگایا ہے اُس نے پورے شعر کو جاندار اور بلند کر دیا

(۴) غزل کی ردیف کا تقاضا ہے کہ "زمانہ" سوچ سمجھ کر استعمال کیا جائے "جستجو ہے مجھے" بے محل تھا۔ اس لئے حضرتِ آسی نے "کہیں نہیں ملتا" بنایا۔ اب ردیف ٹھیک ہو گئی مگر دوسرے مصرع میں سجدے کے بعد "کو" خلافِ فصاحت تھا۔ سجدہ ریز کے لئے ہونا چاہئے۔ علامہ سیماب کی اصلاح نے اس سقم کو دور کر دیا اور مصرع بہت اچھا ہو گیا۔

(۵) فاضل استاد نے "یقین و احساس" میں جو حدِ امتیاز قائم کی ہے وہ اصلاح سے ظاہر ہے۔ صرف لفظِ یقین نے ذوقِ محبت کو مستحکم کر دیا۔

(۷) چونکہ مصرع میں "پر" "آسانی" کے ساتھ آجاتا ہے اس لئے "پہ" غلط ہے۔ مصرع ثانی میں "پر" دب رہا تھا۔ یہاں "پہ" "آسانی" کے ساتھ بن سکتا تھا لیکن چونکہ پہلے مصرع میں "پر" آچکا ہے اس لئے اب تکرار مناسب نہیں اسی لئے آسی صاحب نے "پہ" بنایا۔ رہا "تمہارے" کی جگہ "کسی کے" ــــــ تو بلاواسطہ تخاطب ہی کی یہاں ضرورت تھی

(۸) حضرتِ آسی نے اس شعر پر کوئی اصلاح نہیں دی۔ دوسرے مصرع میں "گر" زیادہ تھا بغیر "گر" کے مصرع کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے علامہ سیماب نے اصلاح فرمائی۔

اعجاز صدیقی

آبِ حیات کے تلاش کرنے والے

مرد — عورت

اگر ناکام و نامراد اور مایوس ہو چکے ہوں۔ قبل از وقت زندگی کے ختم ہونے کا غم۔ جوانی میں موت سے ہم آغوش ہونے کا رنج اور شباب میں بڑھاپے کے اثرات کا احساس اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہو تو ہندوستان کے مشہور، ممتاز اور مستند

دواخانہ اعظم خندہ حیات

کی طرف رجوع ہوں جس نے سالہا سال کی عرق ریزی، کوشش، کاوش اور جانفشانی سے مردوں اور عورتوں کے لئے آبِ حیات کا پتہ لگایا ہے۔ تاکہ مرجھائی ہوئی جوانیاں از سرِ نو شگفتہ ہو جائیں۔ زرد چہروں پر سرخیاں پھوٹ نکلیں۔ ہانپتے، کانپتے اور دھڑکتے ہوئے دل قوی ہو جائیں۔ آنکھوں کے حلقے، چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، جسم کی پیلاہٹ اور ناتوانی دور ہو کر زیادہ دن تک زندہ رہنے کا امکان پیدا ہو جائے

مردوں کی قبل از وقت موت کا سبب "جریان" ہے

اور اس کی بے بہا دوا

زنگولہ

ہے جس کی چند ہی خوراکیں حیرت انگیز اثر کرتی ہیں۔ پیشاب کے ساتھ دھات کا پانی کی طرح بہنا۔ سرعت انزال۔ احتلام اور بڑھی ہوئی حس کو جڑ سے اکھیڑ دینا زنگولہ کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مادہ منویہ کو غلیظ اور گاڑھا کرنا، جسم میں تازہ خون کثرت سے پیدا کرنا۔ کھوئی ہوئی طاقت کو بحال کرنا، نبض اور [illegible] کو دور کرنا زنگولہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آج ہی زنگولہ کی ایک شیشی طلب کیجئے اور ہماری صداقت کا امتحان کیجئے۔ قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنے

جوان عورتوں کو قبر تک پہنچانے والا "سیلان الرحم" ہے

اور اس کی شفا بخش اور کامیاب دوا

زمامی

ہے سفید رطوبت کا اخراج عورت کے جسم میں گھن لگا دیتا ہے طبیعت مضمحل اور افسردہ رہتی ہے۔ بھوک نہ لگنا۔ قبض رہنا۔ حمل قرار نہ پانا اور قرار پانے کی صورت میں گر جانا۔ پنڈلیوں میں میٹھا میٹھا درد، ہاتھ پیروں میں [illegible] آنکھوں میں گڑھے اور چہرہ بے رونق ان تمام نشانیوں کو [illegible] زمامی کا بہترین کام ہے چند خوراکوں میں سفید رطوبت کم ہو جاتی ہے اور چند دنوں میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنے

ایک گذارش: اگر دنیا میں یقین و اعتقاد کوئی چیز ہے تو آج ہی یہ دوائیں طلب کیجئے جریان اور سیلان الرحم کا مرض جتنا عام ہے اتنا اس کی دوائیں بھی عام ہیں اور سستی ہیں [illegible] لہٰذا ان امراض کے لئے دوائیں منتخب کرتے وقت مستند اور مشہور دواخانوں کا خیال رکھئے۔ دواخانہ خندہ حیات عرصہ دراز سے پبلک کی خدمت کر رہا ہے۔ رؤسا، حکام، علماء اور [illegible] کی دواؤں کے مجرب اجزا، نسخہ جات اور زود اثری سے مطمئن ہیں

DAWAKHANA [illegible] E-HAYAT
[illegible] BOX [illegible]

دواخانہ خندہ حیات
پوسٹ بکس [illegible] ایس ای دہلی

نقد و نظر

سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب غزلیں

مرتبہ ادارہ نگارستان. تقطیع ۱۷×۲۷ / ۸ حجم ۴۸ صفحات.

قیمت ۸/ ملنے کا پتہ منیجر نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی۔

غالباً سنہ ۱۹۴۱ء میں پنجاب کے ایک ترقی پسند ادارے نے منتخب نظمیں شائع کی تھیں. چونکہ یہ خیال ذرا جدت اور ندرت لئے ہوئے تھا اس لئے تقلید کا بڑی حد تک امکان تھا چنانچہ سب سے پہلے نگارستان ایجنسی نے اس کے اثر کو قبول کیا اور سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب غزلیں شائع کر دیں. یہ مجموعہ نہ صرف ستھرا اور معیاری ہے بلکہ مشاہیر شعرا کی ایک بڑی تعداد اور اُن کے بہترین کلام سے ہمیں تشکیک و متعارف کرتا ہے۔ اثر لکھنوی احسان دانش۔ علی اختر حیدر آبادی۔ جاں نثار اختر۔ اختر شیرانی۔ آرزو لکھنوی بہزاد لکھنوی۔ ثاقب لکھنوی۔ جگر۔ جوش۔ جلیل۔ حفیظ۔ روش۔ ساغر۔ سائل دہلوی سیماب۔ صفی لکھنوی۔ ظفر علی خاں۔ فراق گورکھپوری۔ کیفی دہلوی نہال مجددی. ماہر القادری۔ اسرار الحق مجاز۔ نجم آفندی۔ نوح ناروی۔ نہال سیوہاروی رضا علی وحشت۔ یگانہ چنگیزی کے علاوہ بھی چند معروف اور غیر معروف شاعر اس میں نظر آتے ہیں۔

ادارہ کا یہ کہنا کہ "ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ بلا کسی امتیاز، محض شعر کے معیار اور سخن کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے انتخاب کریں" بعید از حقیقت ہے اس لئے کہ اس مجموعہ میں بہت سی غزلیں ایسی بھی مل جائیں گی جو کم وزن۔ بے رنگ اور بے کیف ہیں یا بہ اعتبار علم و فن اُن کا پایہ گرا ہوا ہے۔ بطور مثال یہ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں.

تسکین کے بھی پہلو غم معتبر میں ہیں | ہم شاد اُن کے وعدۂ شام سحر میں ہیں
دل مر گیا جو راہ طلب میں، رفیق تھا | ہم زمرہ خوالِ عشق غم ہم سفر میں ہیں
میری اک آہ بن گئی تفصیلِ رازِ عشق | سو داستاں بیانِ غم مختصر میں ہیں

یہاں شعرا کے کلام پر اعتراض مقصود نہیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ مرتب نے وقتِ نظر سے کام نہیں لیا اور جس نے جو غزل بھیجدی وہ شائع کر دی۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ ہر شاعر سے سنہ ۱۹۴۲ء کی دس پانچ بہترین غزلیں منگائی جاتیں اور اُن میں سے ایک غزل اور غزل میں سے چند روح پرور۔ حیات آفریں اور جذبات و احساسات کو جھنجوڑنے والے اشعار شائع کئے جاتے. مرتب نے ہندوستان کے بعض مشہور متغزلین کو بھی نظر انداز کر دیا ہے اور اُن کی جگہ اپنے حلقہ کے غیر معروف لوگوں کو لے لیا ہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب غزلیں اگر انہیں شعرا کی ہوتیں جو اعلیٰ پایہ کے غزل گو ہیں تو زیادہ مناسب تھا۔ احسان دانش۔ جوش ملیح آبادی۔ علی اختر حیدر آبادی۔ ظفر علی خاں اور مجاز وغیرہ شعرا غزل میں لطیف اور ہلکے پھلکے احساسات کو نہیں سمو سکتے۔ کاش ان مقتدر شعرا کو نظم ہی کے لئے وقف رکھا جاتا۔

بہر کیف زیر نظر مجموعہ میں اثر لکھنوی۔ اختر شیرانی۔ آرزو لکھنوی۔ ظفر تاباں جگر مراد آبادی۔ روش صدیقی۔ ساغر نظامی۔ شکیل بدایونی کی غزلیں تیز تغزل کی اور سیماب اکبر آبادی اور نازاں لطیف کی غزلیں تفکر کی آئینہ دار ہیں۔ حزیں تولہ وہوی حیرت شملوی۔ زار دہلوی۔ ضیاء الاسلام ضیا۔ عرش ملسیانی۔ گوہر دہلوی۔ وامق جونپوری کی غزلیں قابلِ اشاعت نہ تھیں۔ اِن کے علاوہ جتنی غزلیں ہیں اُن میں صرف دو دو چار چار شعر اچھے ہیں۔ کتابت کی بعض غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔

اس ذاتی اظہارِ خیال کے بعد یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب غزلیں ہماری لائبریریوں میں ضرور ہونی چاہئے اس لئے کہ اس میں سنگریزوں کے ساتھ ساتھ جواہر پارے بھی ہیں۔

سلاسل

از جاں نثار اختر. تقطیع ۲۰×۳۰ / ۱۶ حجم ۱۲۸ صفحات. کھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر خوبصورت گرد پوش ہے

قیمت ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی

ہندوستان کی ایک ... جماعت، کسی غلط فہمی کے تحت بنا اور ... ہے جو آجکل پنجا ... ہر چیز ایک ... [illegible]

کون ہے منزلِ مقصود کا جو حال سکے | جو پہنچتے ہیں وہ خود ہی ہو گم جاتے ہیں

فلک کر کیا کچھ سمجھنے والو کوئی بس اتنا بتا دو ہم کو | اگر یہ حدِ نظر نہیں ہے تو کیا ہے پھر آسماں ہوگا

دراصل نیا ادب یا جدید شاعری کا اس شاعری کا نام نہیں ہے جو بلینک ورس یا نظم معریٰ کی بگڑی ہوئی شکل میں ہو رہی ہے۔ جدید شاعری کی داغ بیل تو نظیر اکبرآبادی ہی کے زمانہ میں پڑ چکی تھی حالیؔ۔ آزادؔ۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ چکبستؔ۔ اقبالؔ۔ سیمابؔ۔ جوشؔ اور ظفر علیخاں وغیرہ نے اس کے خدوخال کو اتنا ابھارا کہ جوانی کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم بھی سنبھلنے پر مجبور ہوگئے۔ بیشک ہماری تہذیب، معاشرت۔ سیاست اور زندگی کی تمام قدریں بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہی ہیں۔ کشمکش مسلسل مگر اتنی بھی نہیں جتنی ہمارے ملک میں آئی ہوں اور ناداروں کی ارزانی ہے غلامی کی زنجیریں اتنی سخت اور صبر آزما ہو چکی ہیں کہ شب کی ظلمتوں میں بھی اُن کے نشان گہرے اور اُن سے پیدا شدہ زخم تازہ نظر آتے ہیں۔ ان فطری تقاضوں سے متاثر اور مجبور ہو کر اگر ہمارا ادب رعایتی حدود سے نکل کر زندگی سے قریب تر ہوتا جاتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر ہمارے شعرا مردہ کی سلگتی ہوئی ہڈیوں کی چراند محسوس کریں تو بعید از قیاس نہیں۔ اگر ہمارے شاعر قومی و ملکی زندگی کو کچلا ہوا تصور کریں تو حیرت کی بات نہیں۔ حقیقتاً یہ دور ایسا ہی دور ہے کہ حساس انسان ایک لمحہ کے لئے اپنی پامالی سے غافل نہیں رہ سکتا پھر شاعر کے احساسات تو زندہ اور تیز ہوتے ہیں۔

جاں نثار اختر ہمارے ملک کے نوجوان شعرا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور ایسا مقام جہاں سے رفعتوں کی طرف پرواز کا امکان تو ہے لیکن پستی کی طرف آنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اختر پچھلے چند سال میں ترقی پانے والے شعرا میں سب سے زیادہ تیز گام معلوم ہو رہے ہیں اور اُن کی حیرتناک ترقی اُن کے گرم احساس ہونیکا ثبوت دے رہی ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اختر نے اپنی جمالیاتی بصیرت کو مکمل کرنے ___ "انجم" سے آنکھیں لڑانے اور معراجِ محبت حاصل کرنے کے بعد دوسرے شعبہ ہائے حیات میں قدم رکھا ہے۔ اسی لئے انہیں یہ کہنے کی جرات ہوئی کہ ؎

"زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجمؔ"

سوچ دُنیا سے الگ بھاگ کے جائینگے کہاں
اپنی جنت بھی بسائیں تو بسائیں گے کہاں
امن ایں عالمِ افکار میں پائیں گے کہاں
پھر زمانے سے نگاہوں کو چرایا کیا
عشق کی ضد میں تو الفت کو بھلایا کیا
"زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم"

تیرا افلاس سے کتنوں کے کلیجے ہیں فگار
کتنے سینوں میں ہے گھٹتی ہوئی آہوں کا غبار
کتنے چہرے نظر آتے ہیں تبسم کا مزار
اک نظر بھول کے اس سمت بھی دیکھا ہوتا
کچھ محبت کے سوا اور بھی سوچا ہوتا
"زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم"

اختر کی کوئی بھی نظم لے لیجئے۔ اس دور کے تمام تقاضوں کی گونج آپ اُس میں پائینگے۔ وہ آپ کو ایک نقاد کی حیثیت سے نظر آئینگے مگر اُن کی تنقید کی اساس کن چیزوں پر ہوگی اس کا تعلق اُن کی نظموں کے مطالعہ سے ہے وہ واعظ خشک کی حیثیت نہیں رکھتے۔ نہ اُن کے کلام میں درشتی اور سختی ہے بلکہ نقد و تبصرہ کے لئے وہ جو زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس میں زیادہ سے زیادہ لطافت۔ نزاکت اور حلاوت ہوتی ہے شگفتگی، تازگی۔ رس اور دلکشی اُن کی شاعری کا خاصہ ہیں وہ پہلے ایک رومانی اور جمالیاتی فضا تیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد کشمکشِ حیات پر تبصرہ کرتے ہیں۔

سلاسل کی قریب قریب تمام نظمیں اسی حیثیت کی ہیں۔ اختر کی شاعری میں رومانی عناصر کی طرح موسیقی کو بھی بڑا دخل ہے پھر وہ اظہارِ خیال کے لئے ایسے عام فہم اور بولتے ہوئے الفاظ لاتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ علمی و فنی اعتبار سے بھی اُن کی شاعری ممتاز ہے اور اُن کے یہاں ذرا سی بھی بے راہ روی نہیں پائی جاتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہیں کہیں اُن کی نظر چوک جائے اور کوئی ایسی غلطی ہو جائے جس کا تعلق زبان و فن سے ہو۔ جہاں تک اختر کے ترقی یافتہ رجحانات کا تعلق ہے وہ بہت زیادہ تابناک اور جاندار ہیں۔ اُن کے کلام میں تشنجی کیفیت نہیں پائی جاتی بلکہ یکسانی اور ہمواری ہے جو انہیں اس دور کے دوسرے نوجوان شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ ملک کو گرم جوشی کے ساتھ **سلاسل** کا استقبال کرنا چاہئے تاکہ ہمارا ایک حقیقی شاعر اپنی ہمتوں کو اور زیادہ بلند کر سکے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں حضرتِ جوش ملیح آبادی کا ایک مختصر "پیش لفظ" بھی ہے۔

"سلاسل" کے گردپوش پر جو تصویر دی گئی ہے وہ ہندوستانی آرٹ کی ایک بہترین مثال قائم کرتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حبشی عورت زنجیریں توڑنے کے بعد بصد غمزہ و ادا دیکھ رہی ہے۔

نئی راہیں | مرتبہ قمر تسکین۔ تقطیع $\frac{22\times29}{16}$ حجم ۱۲۸ صفحات۔ لکھائی چھپائی کاغذ اوسط۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر دیدہ زیب دو رنگا گردپوش

ہے۔ قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ حلقۂ احباب ترقی پسند موہنی روڈ لاہور

آجکل ادب کی ہر صنف میں ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے افسانوی ادب نے بھی زبردست ترقی کی ہے اب ہمارے افسانے ہماری زندگی سے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں بہ اعتبار انشا اور طرزِ تحریر بھی اس میں ترقیاں ہوئی ہیں اور ہمارے ملک میں اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔

"نئی راہیں" افسانوں کا ایک ستھرا اور معیاری مجموعہ ہے جس میں اُردو کے ۱۵ بلند پایہ افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے شامل ہیں۔ جناب قمر تسکین نے انتخاب اچھا کیا ہے۔ لمس۔ بھوگ۔ ہیرو۔ بگلی۔ سماج کے مجرم کافی اچھے ہیں۔

دل کی باتیں | از سید کاظم دہلوی مدیر "کہکشاں" تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۰۲ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ معیاری ہے۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر خوبصورت گرد پوش ہے۔ قیمت ۲؎ ملنے کا پتہ منیجر رسالہ کہکشاں بنگلی شاہ تارا دہلی۔

سید کاظم دہلوی کے متعلق یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ افسانہ نگار ہیں اس لئے کہ شہرت یافتہ افسانہ نگاروں کی فہرست میں ان کا نام کبھی نہیں آیا۔ لیکن زیرِ نظر مجموعہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف افسانہ نگاری کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ انھیں چوٹی کے افسانہ نگاروں میں شریک کیا جا سکتا ہے اور بہ اعتبار طرزِ بیان و انشا وہ انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے لئے جن ہلکے پھلکے لطیف اور سادہ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اُن سب پر سید کاظم صاحب کو قدرت حاصل ہے نفسیاتی تجزیے بھی انھوں نے خوب کئے ہیں اور رنگینی تو اُن کی ہر ہر سطر سے آشکار ہے البتہ بعض افسانوں کے پلاٹ کچھ ہلکے اور ملتے جلتے سے ہیں۔ افسانے کے لئے جہاں طرزِ تحریر میں بانکپن کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پلاٹ بھی حیرتناک ہونا چاہئے۔ حیرتناکی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ "شرلک ہومز" کے واقعات سے مماثلت کرے یا ظفر عمر کی "نیلی چھتری" بن جائے بلکہ پلاٹ میں نیاپن اور چمک ہونی چاہئے تاکہ پڑھنے کے بعد بڑی دیر تک پڑھنے والا اُن واقعات پر غور کرتا رہے۔

"دل کی باتیں" ۱۲ طبع زاد افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے اور اپنے اندر زیادہ سے زیادہ دلچسپیوں کا سامان رکھتا ہے۔ ابتدا میں خواجہ محمد شفیع صاحب بی اے دہلوی کی ایک مختصر تقریظ بھی ہے اور پھر صاحب افسانہ کا دلچسپ اظہارِ کسرِ نفسی۔

اشارات | از شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۰۸ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر دو رنگا گرد پوش ہے۔ قیمت ۲؎ ملنے کا پتہ نگارستان بک ایجنسی اُردو بازار دہلی۔

یہ حضرتِ جوش ملیح آبادی کے ۲۲ طویل اور مختصر مضامین کا مجموعہ ہے۔ جوش عصرِ حاضر کے بلند مرتبہ شاعر ہیں ایک مسلم الثبوت شاعر میں ادیبانہ صلاحیتیں بھی ہونی ہی چاہئیں۔ چنانچہ ہم بجائے نظم کے نثر میں شاعرِ انقلاب کے خیالات و رجحانات دیکھ رہے ہیں۔ اس مجموعہ کے قریب قریب تمام مضامین مطبوعہ ہیں اور اکثر "کلیم" میں شائع شدہ جس میں علمی و ادبی مضامین کے مقابلہ میں قومی۔ سیاسی اور معاشرتی مضامین زیادہ ہیں۔ سوسائٹی کے بگڑے ہوئے نظام کو استہزائی نگاہوں سے دیکھنا جوش کا خاص مشغلہ ہے۔ ان مضامین میں بھی یہ جذبہ کار فرما ہے۔ جس طرح اُن کی شاعری قوم و ملک کی نبضیں اپنی انگلیوں کی پوری قوت سے ٹٹولتی ہیں۔ اسی طرح ان مضامین میں بھی اُن کی گرفت بہت سخت ہے۔ اربابِ ذوق اس مجموعہ کو ضرور منگائیں تاکہ ملک کے ایک بڑے شاعر کو ادیب کے روپ میں بھی دیکھ لیں۔

رات کا بھولا اور دیگر افسانے | از عبدالقادر سروری ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔ صدر شعبۂ اردو ریاست جبود۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۶۸ صفحات۔ کتابت طباعت اور کاغذ معیاری خوبصورت سرورق۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ :- ادارہ ادبیاتِ اُردو۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد (دکن)

پروفیسر عبدالقادر سروری اُن فاضل ادبا میں سے ہیں جن کی تصانیف قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ سروری صاحب متعدد تنقیدی، علمی اور ادبی کتابوں کے مصنف ہیں افسانوی ادب پر بھی اُن کی تین کتابیں دُنیائے افسانہ۔ کردار اور افسانہ اور قدیم افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کتب میں موصوف نے افسانہ نگاری کے اصول اور مبادیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ گویا افسانہ نگاری کے اصول اُن کے دل و دماغ پر پوری طرح مرتسم ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت میں خود اُن کا افسانے لکھنا کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ اسکا فیصلہ ہر شخص خود کر سکتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں سروری صاحب کے ۱۱ طبع زاد افسانے ہیں اور سب کے سب بیحد دلچسپ۔ ہر افسانہ میں نفسیات کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ایک مسلسل۔ مربوط اور پُرکیف خاکہ افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ زبان وہی ہے جو افسانوں کے لئے ہونی چاہئے۔ البتہ کہیں کہیں اندازِ بیان اور محاورہ اُردو کے معیار سے گر گئے ہیں۔ اور غالباً اس کی وجہ اُن کا حیدرآبادی ہونا ہے مگر یہ چیز اُن کے کمالِ افسانہ نگاری پر اثر انداز نہیں ہوتی اور یہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں۔

اعجاز صدیقی

سالِ اجرا موسمِ بہار ۱۹۳۰ء —————— عرصۂ اشاعت ۱۳ سال

زیرِ سرپرستی —— اعلیٰحضرت رسوا مظلومی والئی پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ
محکمۂ تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار
محکمۂ تعلیم ریاست میسور

منظور شدہ
حکومت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ
محکمۂ تعلیم ریاست کشمیر

تعارف

جلد ۱۴ | ماہنامہ "شاعر" —— آگرہ —— اگست ۱۹۴۳ء | نمبر ۸

چندۂ سالانہ عوام للعہ ۴ خواص سے ۶ ہمدرد ۱۲ انیس ۱۵ معاونین ۲۴ مربیوں ۵۰ محسنین ۶۰ سرپرستوں ۱۲۵ ماہر ۱۲۵ فی پرچہ ۶/

شعرِ انقلاب ـــــ مراحل

یہ غرور و نازِ بےجا، یہ غلط نیاز مندی
کہیں ضعفِ مطلق، کہیں صرف گوسفندی

یہ تضاد سیرتوں کا، یہ نفاق نیتوں کا
جو کسی میں بیخودی ہے تو کسی میں خود پسندی

جو بہت بڑھا چڑھا تو، تو فلک کی رفعتوں تک
تری پستیوں کی مظہر، تری فکر کی بلندی

تو ہی مضطرب ابھی سی، تجھے یہ خبر نہیں ہے
کہ ہے "یک ہزار سالہ" ترا عہدِ مستمندی

قدم آزما چلیگی جو یونہی ہوائے مغرب
ابھی اور ہونگے گمراہ عربی و تاشقندی

جو مری نظر سے دیکھے تو ہوائی شعبدے ہیں
یہ نمائشِ عساکر، یہ نشاطِ قلعہ بندی

جو بقائے نوعِ انساں ہو خرابِ قتل و غارت
تو ہے اصل میں ہزیمت، یہ نہیں ہے فتحمندی

تجھے ذوقِ علم دے کر نہ مجالِ آگہی دی
تری ظرف کو مبارک یہ خرد کی نا دہندی

نہیں دل جو تیرا محرم، تو یہ دہر ہے جہنم
کہ بغیر سوزِ حکمت کسے آئی ہے سپندی

یہ تجملِ دِکم ہیں تری فنا کے ساماں
یہ نہیں حصارِ سنگیں، یہ فقط ہے شیشہ بندی

کئی قرن بعد ہوگا تجھے پھر عروج حاصل
جو یہ مرحلے ہوئے طے، بہ کمالِ ہوشمندی

سیماب اکبر آبادی

جرعات

زیرِ نظر اشاعت کے حصۂ نثر میں چودھری ابوالفضل صاحب صدیقی بدایونی کا مضمون "مختصر اُردو افسانوی ادب" خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اجمال کے باوجود افسانوی ادب پر ایک ہمہ جہتی نگاہ ڈالی ہے۔ کہیں طنز و مزاح اور کہیں سنجیدگی و شائستگی کے ساتھ موجودہ دور کی افسانہ نویسی کے گلے اور سڑے ہوئے اعضا پر نشتر زنی کی کوشش کی ہے اور باتوں ہی باتوں میں یہ بھی بتایا ہے کہ اُردو افسانہ کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ اُمید کہ چودھری صاحب کا یہ مضمون ادبی حلقوں اور خصوصیت کے ساتھ نوز اُئیدہ افسانہ نگاروں کے لئے غور و فکر اور دلچسپی کا باعث ہوگا۔ **ملک کے** مشہور ادیب عطاء اللہ پالوی ایک مدت کے بعد "شاعر" کے صفحات پر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ ہر چند "شاعر" میں شراب اور اس کے متعلقات کا ذکر بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے لیکن پالوی صاحب کا مضمون ڈرامائی کیفیت کا حامل ہے جس سے شراب کی ترویج مقصود نہیں بلکہ اُردو کے ایک مشہور شاعر کے خیالات کی تصویر کشی منظور ہے۔ مضمون بہر حال دلچسپ ہے۔ افسانوں میں "**تشنگیٔ حیات**" "شاعر" کے مخصوص افسانہ نگار جناب اعجاز نسیمی کا ایک کامیاب ترین ترجمہ ہے۔ نسیمی صاحب کے تراجم کے متعلق عام رائے ہے کہ وہ ترجمہ نہیں ہوتے اور یہی ترجمہ کی سب سے بڑی تعریف ہے۔ افسانہ بذاتِ خود اتنا دلچسپ اور انسانی آرزوؤں کا ایک ایسا مکمل خاکہ ہے کہ جس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں معلوم ہوتا۔

حصۂ نظم کے متعلق کیا کہوں، جب حضرت مولانا ناطق گلاؤٹھوی، حضرت حکیم جگر بسوانی، حضرت علامہ شفق عمادپوری اور حضرت مولانا الم مظفرنگری جیسے مشاہیر اساتذہ بیک وقت شریک ہوں، جب عبدالشہد طرح سحر کار اور کامل رشید جیسا شاہدانِ شاعر صفحاتِ "شاعر" کو نوازیں اور جب شکیل بدایونی، یادور [illegible]، فکر تونسوی، نعمان تاثیر، جوہر جوناگڈھی جیسے نوجوان آتش نفس شعرا کا کلام جنتِ نظر ہو تو [illegible] کہوں کہ یہ حصہ ناقابلِ مقابلہ ہے۔

آئندہ اشاعت میں جہاں چند اہم ترین مضامین شائع ہوں گے وہیں حصۂ نظم بھی اتنا وزنی [illegible] جائے گا کہ ذوقِ نظر بھی وجد کرنے لگے۔ مشاہیر شعرا و اساتذہ میں حضرت علامہ سیماب [illegible]، خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی، حکیم جگر بسوانی، علامہ شفق عمادپوری، مولانا کامل [illegible]، مولانا سریکاری جلالی، بیکس اکبرآبادی، صبا رشیدی، الطاف مشہدی، آغاز برہانپوری، [illegible] رادی، کامل رشید، حجاب الٰہ آبادی، خفا بالندھری، نصرہ نور کاشمیری، افسر احمدنگری [illegible] اور صابر اکبرآبادی کا تازہ اور غیر مطبوعہ کلام اشاعت کے لئے منتخب کیا جا چکا ہے۔ کاش [illegible]

صفحاتِ "شاعر" اس سے زیادہ شعر و سخن کے نورس پھول پیش کرنے کی اجازت دیں۔

انجمن دربارِ سخن کے نام سے چوپڑا مصطفیٰ آباد ضلع مشرقی خاندیش میں جناب محبوب خاں صاحب وکیل انڈول کی سعی بلیغ سے ایک انجمن قائم ہوئی ہے۔ چوپڑا مصطفیٰ آباد خاندیش میں ایک تاریخی مقام ہے جہاں کی ادبی و شعری فضاؤں پر سالہا سال سے جمود طاری تھا۔ وکیل صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے یہاں کی ادبی فضاؤں میں از سرِ نو جان ڈال دی۔ نہ صرف یہی بلکہ "انجمن دربارِ سخن" کی شاخیں بھی خاندیش میں جا بجا قائم کرا دیں تاکہ ادب، شعر اور زبانِ اُردو کا زیادہ سے زیادہ پروپگنڈا ہو سکے۔ وکیل صاحب کی کہنہ مشقی اور مسلسل ادبی خدمات سے متاثر ہو کر اراکینِ دربارِ سخن نے آپ کو "ناظم کلام" کے خطاب سے نوازا ہے۔ وہ یقیناً اس اعزاز کے مستحق تھے۔ کاش ہندوستان کے دوسرے دور افتادہ شہروں اور صوبوں میں بھی ایسے ہی بلند حوصلہ اور اُردو زبان کے سچے خدمت گزار پیدا ہوں۔

الحمدللہ یہ کرم فرمائیاں کہ ماہ جولائی میں جدید خریدار بہم پہونچانے والے شعر نواز حضرات کی تعداد تمام مہینوں سے سبقت لے گئی۔ میں مجسم تشکر و امتنان ہوں اور دوسرے بہی خواہانِ "شاعر" کی توجہ کا بھی منتظر [illegible]

(۱) جناب نعمان تاثر صاحب کراچی	۴	خریدار	(خاص)
(۲) حضرت خیام ہندی	۱	"	"
(۳) جناب ملک قربان حسین شہید جہلمی بمبئی	۲	"	(عام)
(۴) جناب بیکس نجمی بھوپالی	۲	"	"
(۵) حضرت عزیز اختر وارثی سرحدی (کوہاٹ)	۲	"	"
(۶) جناب ظہور محمد خانصاحب سیتاپوری انبالہ	۱	"	"
(۷) مکرمہ مسز اعجاز قریشی بی۔اے آگرہ	۱	"	"
(۸) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی	۱	"	"
(۹) حضرت آغاز برہانپوری	۱	"	"
(۱۰) جناب محمد یعقوب خانصاحب نسیم سیتاپوری	۱	"	"
(۱۱) جناب حبیب قریشی دہلی	۱	"	"
(۱۲) پیرزادہ قاضی محمد معین صاحب ہادی بھاولپور	۳	"	"
(۱۳) جناب سید رفیق مارہروی	۱	"	"
(۱۴) جناب قاضی محی الدین احمد شان ادیبی حمد نگر	۱	"	"
(۱۵) جناب آر۔ ایس۔ لسن صاحب بھلور	۱	"	"
(۱۶) جناب مولانا مظہر الدین صاحب مظہر رامداسی	۲	"	"

۱۵ مولانا ماہر فضل کولاری ۳۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو [illegible]

[illegible]

تحقیق و تصحیح

جناب مکرم سلام مسنون۔ "شاعر" بابتہ جولائی وصول ہوا۔ ممنون ہوں

اسکے صفحہ ۱ پر زیر عنوان "تحقیق و تصحیح" مولانا عبدالباری آسی نے "دولہن" کے متعلق اپنی تحقیقات کا نتیجہ پیش فرمایا ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے ضیاء الدین عبرت مصنف پدماوت کے چند اشعار محض یاد سے نقل فرمائے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے:-

توجب دُلہن کے گھر جائیگا جانی
یہ کنگا ؟[۱] اوس گھڑی ہوگا نشانی

جس لفظ کے بعد علامت استفہام بنا دی ہے اسکو سمجھنے میں دشواری ہوئی تو پدماوت کا نسخہ تلاش کرنا پڑا۔ میرے پاس طبع سوم کا نسخہ نکلا جس کے صفحہ ۲ پر پورا شعر یوں چھپا ہے

جوتو دولہن کے گھر جاویگا جانی
یہ کنگن اوس گھڑی ہوگا نشانی

اور یہ بجنسہ وہی صورت ہے جو مولانا آسی نے سودا کے دو اشعار میں ظاہر فرمائی ہے اور نفائس اللغات کی عبارت جو صفی صاحب نے اپنے جواب میں درج کی ہے اوس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ یہ لفظ "بودن" کے وزن پر دہلی و لکھنؤ دونوں جگہ مستعمل رہا۔ میرے خیال میں جس طرح ہندوستان اور ہندُستان یا بودن اور بُدن وغیرہ دونوں طریقوں پر استعمال میں آتے ہیں اوسی طرح دولہن اور دُلہن دونوں رائج ہیں اور صحیح ہیں۔

(مولانا) **ظفر الملک علوی ایڈیٹر "الناظر" لکھنؤ**

"دولہین"

دولہن لفظ کا استعمال چند بردائی کے پرتھوی راج راسو میں بھی ملتا ہے جو ہندی کی سب سے پرانی کتاب کہی جاتی ہے۔ اس کی زبان اپبھرنس ہے اپبھرنس زبان سورسینی پراکرت سے نکلی ہوئی بتلائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہندی شعراء نے دولہین کا استعمال جگہ جگہ کیا ہے۔ مہاتما کبیر کی ساکھی کا یہ مصرعہ بہت مشہور ہے

"دولہین گاؤ منگل چار"

کبیر کے یہاں تو اس کی بھرمار رہتی ہے۔ کبیر گرنتھاولی" ہندی ناگری پرچارنی سبھا کاشی" جو رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس کی مرتب کی ہوئی ہے۔ گوسوامی تلسی داس نے اپنی رامائن میں دولہین اور دولہا دونوں لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ اودھی زبان میں تو یہ لفظ روزمرہ میں داخل ہے۔ برج بھاشا کے شاعروں نے بھی اس لفظ کا استعمال دولہا یا دولہین کی ملتی جلتی شکل میں کیا ہے۔ حتی کہ برج بھاشا کی سب سے پرانی نثر جس میں ۸۴ ویشنوں اور ۲۵۲ ویشنو کا ذکر ہے۔ لفظ دولہین دلہن بھی جا بجا ملتا ہے۔

سید انشاء اللہ خاں نے بھی اپنی ہندی کی تینوں کتابوں میں دولہین ہی استعمال کیا ہے۔ امیر خسرو نے بھی کئی جگہ اپنی پہیلیوں میں اسے استعمال کیا ہے اور دولہین ہی لکھا ہے۔ پورب یو۔پی اور بہار میں خاص و عام عموماً دولہین ہی استعمال کرتے ہیں

اصل میں یہ لفظ پیساچی پراکرت سے نکلا ہے جو کشمیر میں اب بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اُس سے یہ اپبھرنس میں آگیا ہے۔ پیساچی پراکرت میں یہ لفظ ڈولہا تھا۔ رفتہ رفتہ ڈ گر گئی اور دال رہ گئی ڈاکٹر گریارسن جو ۲۵۵ زبانوں کے ماہر تھے انھوں نے اپنی مشہور کتاب (Linguistic Survey of India) میں اسے دولہین ہی لکھا ہے۔ ملک محمد جائسی۔ کتبن اور منجھن جو مسلمان صوفی شاعر تھے انھوں نے بھی اودھی زبان کی شاعری میں دولہین ہی لکھا ہے۔ دیکھئے ملک محمد جائسی جسے پروفیسر رام چندر شکل ہیڈ آف دی ہندی ڈیپارٹمنٹ ہندو یونیورسٹی بنارس نے مرتب کیا ہے۔　　**اے۔ بی فلپس صابر اکبرآبادی بی۔اے (جمشید پور)**

---

[۱] مولانا آسی کی تحریر کو دوبارہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرحوم نے "کنگن" ہی لکھا تھا۔ یہ کتابت کی غلطی ہے جس پر مولانا ظفر الملک علوی کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس غلطی کی طرف اشارہ فرمایا۔　اعجاز صدیقی

چونکہ ہنوز مخالف و موافق آراء وصول ہو رہی ہیں اس لئے ابھی کوئی فیصلہ ممکن نہیں۔　اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

ذلت ہی نتیجہ ہے بد آئینی کا
ہوتا ہے یہی مآل خود بینی کا
ہے جنکے دلوں میں خود پرستی و خودی
وہ دیکھ لیں انجام **مسولینی** کا

تدبیر کے ہاتھ سے سپر چھوٹ گئی
فاسزم کی تقدیر مگر پھوٹ گئی
کیا وقت نے یہ ضرب لگائی واللہ!
اس ضرب سے **محور** کی کمر ٹوٹ گئی

ناز و نخوت کے مدعی باقی ہیں
یعنی **جاپان و جرمنی** باقی ہیں
یہ بھی ہوں شکستہ تو گرے قصر غرور
دو پائے تپائی کے ابھی باقی ہیں

انسان پہ جب عروج کا وقت آئے
لازم ہے کمال پر نہ وہ اترائے
جز سایہ نہیں کچھ اور جاہ دنیا
کیا جانئے کس وقت زوال آجائے

اے **روم** سنی ہم نے کہانی تیری
لے ہو گئی ختم لن ترانی تیری
اب بھی نہ ہوئی صلح تو پھر کب ہوگی؟
دم توڑ رہی ہے سخت جانی تیری

دنیا ہوئی پر فتن، خدا خیر کرے
بدلا چرخ کہن، خدا خیر کرے
برہم نظر آتا ہے نظام شمسی
اک ماہ میں دو گہن! خدا خیر کرے!!

حکمت ہے نئی دست قضا میں کوئی
ہے عزم نیا ذہن خدا میں کوئی
آئینۂ عبرت ہے **کسوف** اور **خسوف**
مقصود تغیر ہے فضا میں کوئی

ہر دل میں عناد و جوش نفسانی ہے
ہر سینے میں اک جذبۂ حیوانی ہے
کرتا ہے مسلمان، مسلمان پہ وار
موجودہ صدی کی یہ مسلمانی ہے!

اب خیر و فلاح کارفرما نہ رہی
آسودگی چشم تماشا نہ رہی
یا آدمی قابل نہ رہا دنیا کے
یا قابل آدمی یہ دنیا نہ رہی

تسکین کا انصرام ہوتا ہی نہیں
بہتر کوئی انتظام ہوتا ہی نہیں
گو ہو گئی ختم ربع دنیا لیکن
اس جنگ کا اختتام ہوتا ہی نہیں

سیماب

شخصیات:- حضرت مرزا ثاقب لکھنوی

دیوانِ ثاقب کے مقدمہ نگار کا یہ ارشاد کہ:

"مرزا کے آبا و اجداد نے اکبرآباد میں سکونت اختیار کی شہنشاہ اکبر نے کچھ ایسی مبارک گھڑی میں اس شہر کی بنیاد رکھی تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہر علوم و فنون کا مرکز ہوگیا اور اس کثرت سے اربابِ کمال یہاں مجتمع ہوئے کہ اسکو ہندوستان میں بھی مرتبہ حاصل ہوگیا جو ایتھنز کو یونان میں حاصل ہوا تھا۔ دورِ آخر میں میر و غالب جیسے خدایانِ سخن بھی اسی مردم خیز سرزمین سے پیدا ہوئے۔ ہمارے مرزا کے لئے یہ واقعہ کچھ کم باعثِ شرف و سعادت نہیں ہے کہ انھوں نے ... اسی مبارک خطۂ ارض پر خوابِ عدم سے آنکھ کھولی۔"

حقیقت واقعیت پر دلالت کرتا ہے۔ آسمانِ اکبرآباد نے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب طلوع کئے اسکا جواب تاریخ دے سکتی ہے۔ ہرچند بعض مورخین کا اختلاف۔ جانبداری اور وطن دوستی انھیں اپنی سرزمین سے منسوب کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن حقیقت کہیں چھپائے سے چھپتی ہے اور روشن و منور کہیں عارضی گردش میں رہتی ہیں۔ کبھی نہ کبھی وہ نمودار ہوکر رہتی ہیں۔ اگر جلیل القدر علما اور فضلا کے اسمائے گرامی بھی شاہ مبارک آبرو۔ شرف الدین مضمون۔ سراج الدین علی خاں آرزو۔ مرزا جانجاناں مظہر۔ میر تقی میر۔ میرزا غالب۔ میاں نظیر۔ مہروماہ۔ مرغوب۔ آسیر۔ رئیس۔ واصف۔ نثار۔ عالی۔ بزم۔ سیماب۔ ثاقب۔ شوخ۔ نجم اور بسمل جیسے قادر الکلام ماہرینِ فن اور خدایانِ شعر و سخن کے نام خیال کرلئے جائیں تو دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کا کوئی شہر اکبرآباد کی شاعر خیزی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اُردو زبان کی نشوونما کا سہرا بھی اسی کے سر ہے اور شعر و سخن کے معیار کا تعین بھی اسی کے سپوتوں نے کیا اور ایسے رہبر پیدا کئے جن کے اتباع سے دوسروں کو منزل کا عرفان ہوا یہ کچھ کم باعثِ فخر نہیں کہ آج ہر شاعر یا تو اپنے آپ کو میر کا پیرو بتاتا ہے یا غالب کا یا دونوں کا عکس ثانی ——— بہرحال اپنے وطن کی شہرت بڑھانے کے لئے اگر کوئی غالب کو دہلوی اور میر کو لکھنوی لکھتا ہے تو یہ بھی اکبرآباد کے لئے سبب منزلت ہے۔ اگر حضرت ثاقب اکبرآباد کی خاک سے نسبت رکھتے ہوکر اپنے آپ کو لکھنوی لکھتے ہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ وطنی نسبت علی حالہٖ قائم رہتی ہے اور اس تاریخی حقیقت کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا جس طرح پچھلے ادوار میں ارضِ اکبرآباد کو نسبت رکھنے والے آبرو۔ آرزو۔ مظہر ——— میر نظیر۔ غالب ——— مہروماہ مرغوب ——— رئیس۔ واصف۔ نثار چمکے۔ اسی طرح دورِ آخر میں بزم۔ سیماب۔ ثاقب ہندوستان کی شعری فضاؤں پر اکبرآباد کی نسبت سے اپنا پرچم لہرا رہے ہیں۔ دورِ موجود میں نجم و بسمل کے ساتھ کونسا نیر اُفقِ شاعری پر چمک چکا ہے یا چمکنے والا ہے۔ یہ ہنوز پردۂ اخفا میں ہے۔

حضرت ثاقب کا نام ذاکر حسین، تاریخی نام میرزا انتظار مہدی و آغا محمد فائق ہے۔ ۲؍ جنوری ۱۸۶۹ء کو صبح صادق کے وقت اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام مولوی آغا محمد عسکری قزلباش المعروف بہ میرزا محمد حسین ہے۔ سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش ماژندرانی المعروف بہ علی قلی خاں شاملو سے ملتا ہے۔ حاجی علی قزلباش میرزا کے مورثِ اعلیٰ تھے اور شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ۔ طبرستان سے ترکِ سکونت کرکے مرزا کے آبا و اجداد نے ہندوستان (اکبرآباد) میں سکونت اختیار کی۔ ہندوستان میں بھی مرزا کے افرادِ خاندان جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے اور آجتک ہیں۔

حضرت ثاقب کی ولادت کے چھ ماہ بعد ہی سلسلۂ معاش کے سلسلے میں آپکے والد کو اکبرآباد چھوڑ کر لکھنؤ جانا پڑا۔ وہاں سے سرکاری ملازم ہوکر الہ آباد تشریف لے گئے ۱۸۸۶ء میں ملازمت سے دل برداشتہ ہوکر ریاست بھوپال میں وکالت شروع کی اور ۱۸۹۶ء تک بڑی کامیابی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہا۔ زندگی کی آخری گھڑیاں گذارنے کے لئے لکھنؤ آئے اور یہیں ۱۹۰۱ء میں انتقال فرمایا۔

حضرت ثاقب کی ابتدائی تعلیم میں قدیم اصول کے مطابق فارسی اور عربی شامل رہی اُردو تو خیر مادری زبان تھی اور مرزا کو فارسی و عربی سے لگاؤ بھی بہت زیادہ تھا محض اس لئے کہ طبیعت شاعرانہ پائی تھی۔ ادھر والد ماجد کا یہ منشا کہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم دلائیں چنانچہ انھوں نے یہ زمانۂ قیامِ بھوپال مرزا کو اُن کے وطن کی مشہور درسگاہ سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخل کرادیا اور چار سال تک مرزا نے یہاں تعلیم پائی مگر انٹرنس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ دورانِ تعلیم میں میر مہدی حسین صفی امروہوی مرحوم سے قربت رہی۔ صفی امروہوی مرحوم بلند پایہ ادیب انشا پرداز تھے اور عربی فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا ثاقب کو اُن کی قربت سے بہت فائدہ پہونچا اور دورانِ تعلیم ہی میں شاعری کے تمام ابتدائی مراحل طے ہوگئے۔ ۱۸۹۰ء میں شادی ہوگئی۔ پھر والد ماجد کی وفات۔ چڑھتا ہوا خون۔ امادہ ارادے اور حوصلے بلند۔ نئی نئی فکریں۔ ذمہ داریوں کا احساس اُس پر شاعرانہ طبیعت ۱۹۰۸ء میں تجارت شروع کی لیکن ناکامی ہوتی اور نقصانات کا منہ دیکھنا پڑا۔ تجارت ہی کے سلسلے میں حضرت ثاقب کو مہاراجہ محمودآباد مرحوم کے چیدہ نگاہ امیر الدولہ راجہ محمد امیر حسن خاں بہادر جنت آرامگاہ سے شرفِ تعارف اور رفتہ رفتہ شرفِ تقرب حاصل ہوگیا اور مرزا ریاست محمودآباد کے شاعر اور مستقل وثیقہ دار ہوگئے۔

ریاست محمودآباد کے درباری شاعر ہونے سے قبل حضرت ثاقب تلاشِ معاش میں کلکتہ تشریف لے گئے تو حسنِ اتفاق سے وہاں سفیرِ ایران سے نیاز حاصل ہوگیا اور وہ مرزا کی ذہانت و طباعی اور علم و فضل سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنا پرائیوٹ سکریٹری بنالیا۔ دو سال تک مرزا اس

منصب پر فائز رہے۔ یعنی ہر فکرِ معاش سے آزاد تھے مگر روح و دل گرفتارِ غربت تھے۔ رہ رہ کے شامِ اودھ کے دلفریب منظر تڑپاتے تھے۔ آخر یہ تڑپ رنگ لائی اور خلافِ توقع مہاراجہ محمود آباد نے ایک تار کے ذریعہ آپ کو طلب کر لیا اُس وقت سے آجتک ایک قلیل مشاہرہ پر بموصوف ریاست محمود آباد میں قناعت فرما رہے ہیں۔

حضرتِ ثاقب بہت صاف گو۔ منکسر المزاج۔ متواضع۔ خلیق اور انتہا درجہ کے خوددار واقع ہوئے ہیں۔ انکی زندگی نہایت سادہ اور تکلفات سے بَری ہے اُن کے خلوص و دلنوازی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کو مرزا سے قریبی تعلق رہا ہے۔ وہ راسخ العقائد۔ رسم پرستیوں سے دُور اور اہل بیتؑ کے سچے مدح خوان ہیں۔

مرزا صاحب کو یوں تو دس گیارہ سال کی عمر سے شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا لیکن پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکے۔ ادھر انکے والد ماجد شاعری کے سخت خلاف اُدھر جذباتِ شعری میں ہیجان۔ دسمبر ۱۸۸۴ء کی ایک شب کو مرزا قیصر بخت فروغ دہلوی ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد کے یہاں مخصوص احباب کی صحبت تھی جس میں حافظ زکریا خاں زکی شاگرد مرزا غالب۔ قاضی نجم الدین خاں صاحب برق شاگرد مومن، خان بہادر خواجہ غلام غوث بیخبر، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں دہلوی جیسے عالم و فاضل بھی موجود تھے۔ پندرہ سال کی عمر اور پھر ایسے مشاہیر کی محفل، مگر مرزا موقع پاکر داخل ہی ہو گئے۔ جب شعر و شاعری کا ذکر چھڑا تو مرزا نے بھی اپنی غزل سنا ڈالی۔ کسی نے داد دی اور کوئی بہ این خیال خاموش رہا کہ اتنی سی عمر میں بھلا ایسی غزل کیونکر کہی جاسکتی ہے۔ چنانچہ امتحان لیا گیا اور یہ مصرع دیا گیا ؎

"پر مارتے ہیں چرخ کے سینے پہ پھٹا پھٹ"

مرزا نے فوراً مصرع لگایا ؎

"ایسے ہیں مرے نالہ و افغاں کے کبوتر"

قاضی نجم الدین خاں برق نے ایک اور مصرع دیا اور مرزا نے تھوڑی ہی دیر میں ایک مرصع غزل کہہ کر سنا دی، اُس کے دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں ؎

رخ و زلف کا ہوں فسانہ خواں یہی مشغلہ یہی کام ہے — مجھے دن کا چین عذاب ہے مجھے شب کی نیند حرام ہے
نہ وہ میہمانِ حریمِ دل نہ خیال اس کا مقیمِ دل — ہوئی قطع رسمِ قدیمِ دل نہ پیام ہے نہ سلام ہے

اس غزل میں گیارہ شعر ہیں یوں تو سب اچھے ہیں۔ لیکن مندرجۂ بالا دو شعر تو واقعی بہت خوب ہیں اور یقین نہیں آتا کہ ابتدائی مشق میں اتنے اچھے شعر کہے جاسکتے ہیں۔ اگر اس غزل کو سُن کر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں دہلوی نے یہ فرمایا کہ "یہاں صاحبزادے اگر زندہ رہے تو اپنے وقت کے میر ہوں گے" ـــــ تو کچھ بیجا نہیں فرمایا۔

اگر میر نہیں تو حضرتِ ثاقب اپنی سادگی و پرکاری میں کبھی کبھی میر سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ حضرتِ ثاقب کے کلام میں "غالبیت" بھی ہے۔ کچھ اشعار اس قسم کے ضرور ملتے ہیں مگر نہ ملنے کے برابر۔ میر و غالب کے تتبع اور پیروی سے قطع نظر میں تو یہ کہوں گا کہ مرزا صاحب کا ایک مخصوص رنگ ہے اور اُن کے کلام کے مطالعہ سے اُن کی انفرادیت بیک نظر ظاہر ہو جاتی ہے وہ خود اپنی جگہ اختراعی قوتوں کے حامل ہیں اور انہیں تقلید کا الزام دینا مناسب نہیں۔ تمام عمر لکھنؤ میں گذارنے کے بعد بھی اُنکے کلام میں پوری طرح لکھنویت پیدا نہیں ہونے پائی۔ عزیز اور آرزو کے رنگ سے اُن کا رنگ بالکل مختلف ہے۔ اُن کے یہاں "یاسیت" برائے نام ہے۔ میں تو اُنکے رنگِ تغزل کو صرف اتنا سمجھ سکا ہوں کہ وہ قدیم و جدید رنگ کے ایک ہلکے امتزاج کے ساتھ شعر کہتے ہیں جس میں کسی قدر تفکر پایا جاتا ہے وہ عام خیال کو بھی ذرا سوچ سمجھ کر نظم کرتے ہیں ہرچند اُن کے اشعار میں شدید قسم کا کیف و کم نہیں ہوتا لیکن وہ پھیکا پن بھی ہمیں نظر نہیں آتا جو دوسرے پرانے کہنے والوں کے یہاں ملتا ہے پھر متانت و سنجیدگی۔ سلاست و روانی اور تناسب مل جل کر ہمیں یہ کہنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ثاقب کی شاعری قافیہ پیمائی کی حدود سے کسی قدر دُور رہی ہے اور اُس پر پوری طور پر روایتی شاعری کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر حضرتِ ثاقب اپنے مجموعۂ کلام کے انتخاب میں یکسانیت کا خیال رکھتے اور ذرا سختی کے ساتھ انتخاب فرماتے تو اور بھی بہت سے اعتراضات ختم ہو جاتے جو جدید شاعری کے دلدادہ کرتے ہیں۔ انکے ہر رنگ اشعار دیکھئے ؎

دیارِ دل میں کہیں دوست کا پتا نہ ملا — وہ بدنصیب ہوں کعبے میں بھی خدا نہ ملا
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
مری داستانِ غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں — کچھ انھیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا
اُمید و ناامیدی کا بھرم ہونا وہی جانے — کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے
بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی — میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا
قریب ہو کے نہ سُننا دلیلِ اُلفت ہے — پکارے جاؤ کوئی ہم کلام ہو کہ نہ ہو
حجاب پڑ نہیں سکتا نگاہِ الفت پر — سخن طراز ہیں آنکھیں کلام ہو کہ نہ ہو
کسی کے سامنے کیونکر کہا جائے — خود اپنا دردِ دل اپنی زباں سے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقب — کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

یوں تو حضرتِ ثاقب تمام اصنافِ سخن پر قدرتِ تام رکھتے ہیں لیکن اُنکی شہرت صرف اُنکی غزلوں سے ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ علمی و فنی اعتبار سے انکا پایہ بہت بلند ہے اور مسائلِ ادب میں گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ لکھنؤ کے آخری دور کی شاعری کو نکھارنے اور سنوارنے میں مرزا کا بھی ہاتھ ہے۔ ہندوستان کے مشاہیر شعرا میں شمار ہوتا ہے اور عام طور پر ان کا کلام پسند کیا جاتا ہے! وہ بہر اعتبار اُردو زبان کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔

اعجاز صدیقی

زندگی کا راگ

راہ گم کردہ وجودِ تفرقہ پرداز کے
ہم ہیں محوِ جستجو کھوئے ہوئے ہمراز کے

نالۂ مبہم ہے اندازِ سکوتِ اہلِ درد
ہیں کہاں پہچاننے والے مری آواز کے

لے گیا کوئی بہارِ زندگی کو لوٹ کر
اب نہ وہ ہم ہیں نہ وہ چرچے نیاز و ناز کے

ہچکیوں پر ہو رہا ہے زندگی کا راگ ختم
جھٹکے٭ دیکر تار توڑے جا رہے ہیں ساز کے

اے مصیبت یہ کمال ایسا کمال اتنا کمال
انتہائے بیکسی ہے اور دن آغاز کے

کیا قیامت ہے کہ صحنِ باغ سے گل اُڑ گئے
رہ گئے ہم کٹ گئے پر حسرتِ پرواز کے

لیجئے ہیں دوست ناطق ہمکو بزمِ ساز میں
واسطے دیکر ہماری خاطرِ ناساز کے

ناطق گلاوٹھوی

رعنائی خیال

رعنائی بہارِ گل و گلستاں گئی
وہ کیا گئے کہ رونقِ بزمِ جہاں گئی

ملتے ہی ان سے کشمکشِ جسم و جاں گئی
ہوش آ گیا تو وحشتِ خوابِ گراں گئی

آخر غبارِ راہِ محبت بھی چھپ گیا
کچھ دور تو نگاہ پسِ کارواں گئی

وہ آج مطمئن نظر آتے ہیں بزم میں
شاید کسی کی سعیِ وفا رائگاں گئی

اعلانِ ترکِ شوق تو لے دل بجا مگر
اُن تک اگر یہ بات زبان در زباں گئی

غم ہو کہ انبساط کسی کو نہیں قرار
فصلِ بہار آئی تو فصلِ خزاں گئی

اب اس فریب خوردہ تمنا کو کیا کہوں
جو تیری انجمن سے بہت شادماں گئی

لب پر ہنسی نہ آنکھ میں آنسو یہ کیا ہوا
وہ غم کہاں گیا وہ مسرت کہاں گئی ؟

اے کامیابِ سعیِ مداوا خطا معاف
پھر کیا رہا جو لذتِ دردِ نہاں گئی

شکیل بدایونی بی۔اے (علیگ)

٭ یہ مصرع مولانا ناطق ہی کا ہے۔

مختصر اُردو افسانوی ادب

باوجود تخالفِ آرا، تجرباتِ گوناگوں اور متضاد دلائل و براہین کے اس نظریے میں بڑی حد تک حقیقت کا شائبہ ہے کہ ادب زندگی کا عکاس ہے اور انسانیت کا نقاد۔ دُنیا کو شاہراہِ ترقی پر گامزن کرتا ہے، پند و نصیحت کے جارح یا بیں طریقے سے نہیں، موسیقی کے ہلکے اور میٹھے سروں میں زندگی کے رموز کہانی اور نغموں کی شکل میں انسانوں کو سمجھاتا ہے۔ خصوصاً افسانوی ادب پر اس نظریے کا اطلاق اگر کلیتاً نہیں تو جزوی طور پر ضرور مسلّم ہے۔ انسان جب دُنیا میں آیا تو اُسے سب سے زیادہ دلچسپی اپنی ذات سے محسوس ہوئی اور سب سے زیادہ شیریں چیز اپنی زندگی معلوم ہوئی اور پھر اسی اثر کے ماتحت اُس کے متعلقات سے، بہ الفاظِ دیگر اسے اپنی ذات یا اپنے نفس کے ساتھ اپنا ماحول بھی عزیز تھا۔ یہ دائرہ بتدریج ترقی کرتا چلا گیا اور مشاہدے سے متجاوز ہو کر دیگر ذرائعِ احساس تک بھی پہونچا۔ یعنی جو کچھ آنکھوں سے دیکھتا تھا اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ اب وہ سُنے ہوئے واقعات و حالات میں بھی جو اُسکی یا اُسکے ہم جنسوں کی ذات یا متعلقاتِ زندگی سے وابستہ تھے دلچسپی لینے لگا۔ اس دلچسپی کے ماتحت تاریخ یا افسانے کی ابتدا ہوئی۔ جس میں ابتداءً صرف پیرایۂ بیان کا فرق رہا ہوگا۔ اگرچہ بعد میں تاریخ تو صرف مشاہدے تک محدود رہی لیکن افسانے نے اسی مشاہدے میں بتدریج قیاس و تخیل کو دخل دیکر اپنے موضوع کو زیادہ دلچسپ، وسیع اور جامع بنا لیا۔ اس صورت میں افسانوی ادب کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود بنی نوعِ انسان کی۔ رفتہ رفتہ اس شعبے نے اس حد تک ترقی اور عمومیت حاصل کی کہ اس کا ذخیرہ قلمبند ہونے کی حد سے متجاوز ہو گیا۔ کیونکہ یہ ذہنی تفریح کا ایک ذریعہ تھی لہذا اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور اس کو اس زمانے میں جبکہ تحریر کو زندۂ جاوید کرنے کی اتنی آسان صورتیں موجود نہیں قلم دوات اور کاغذ کے استعمال کے معیار سے نیچی سطح پر رکھا گیا۔ چنانچہ افسانہ گوئی ایک علیحدہ صنعت بن گئی اور علم سینہ بسینہ کی صورت رواج اور ترقی کر چلی گئی۔ دیہاتی زندگی میں جاڑوں کی لمبی راتوں میں بیٹھ کر گانوں کے قصے کہنے والوں کی لمبی کہانیوں سے لیکر دہلی اور لکھنؤ جیسے شہروں کے آبائی پیشہ ور داستان گویوں کے طویل پیچ در پیچ، افسانہ در افسانہ قسم کی کہانیاں اور گھر کی بڑی بوڑھیوں کی چڑیا چڑے کی کہانی سے لگا بادشاہ اور وزیر، شہزادہ اور شہزادی کے زبان زدِ عام قصوں تک ہر چیز اپنی تناور درخت کی شاخ و بُن اور برگ و بار شمار کرنے چاہئیں۔

یہ ایک طویل بحث ہے اور ہمارے موجودہ مبحث سے خارج کہ کس قسم کے قصوں کی ابتدا کس وقت اور کس بنا پر ہوئی۔ لیکن جس قسم کے افسانے جس وقت مروّج ہوئے وہ اپنے اس عہد کی زندگی کی حقیقت پر روشنی ضرور ڈالتے ہیں اور بڑی حد تک عام سماجی ذہنیت اور نظام کی آئینہ داری کرتے ہیں مثلاً "الف لیلیٰ" بتاتی ہے کہ اس کا دورِ عیش پسند فکرِ معیشت سے آزاد خیالی دُنیا میں مزہ لینے والا، فیاض، عالی ہمت اور بلند حوصلہ تھا۔ اسی طرح "بوستانِ خیال" اور "طلسمِ ہوشربا"، "آرائشِ محفل" وغیرہ قسم کی تصانیف علاوہ مذکورہ بالا امور کے اپنے زمانے کے موجود تعطّل اور ضعیف الاعتقادی کی بھی غماز ہیں۔ خواہ اُن کا دور فکرِ معیشت سے آزاد ہو یا نہ ہو مگر اس خصوص میں بے پروا اور صاحبِ فرصت ضرور ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں لمبے افسانے کا قدرے مفقود ہونا اور مختصر افسانے کا اسکی جگہ لینا، قصائد اور مثنویات کی جگہ چھوٹی نظم کا آنا اس دور کے قارئین اور مصنفین کی قلیل الفرصت، کثیر الاشغال اور متفکرانہ مگر ایک قطرہ آب طلب کے لئے تشنہ زندگی کا پتہ دیتی ہے۔ آج جس طرح زندگی کے ہر شعبے پر مشین کی کارفرمائی ہو چکی ہے۔ اسی طرح ادب پر بھی "میکانکیت" کا دور دورہ ہے اور جس طرح مشین کے تصرف میں اختصارِ عمل، تقلیلِ وقت، تقلیلِ زمانہ، مماثلتِ عمل و نتائج کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح مشین سے متاثر دماغوں سے نکلے ہوئے ادب میں بھی یہ صورت ایک تھوڑے سے فرق کے ساتھ رونما ہے۔ مشین کا ایک خاص عمل یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ پُرانی استعمال شدہ اشیا کو دوبارہ خام حالت میں تبدیل کر کے ایک نئی چیز بار بار پیش کرتی ہے۔ اسی طرح فی زمانہ ہمارے نوجوان افسانہ نویس اٹھارویں صدی کے لٹریچر کو تناسخ کی خراد پر رکھکر پیش کرتے ہیں اور کوٹ پتلون پہنا کر مختصر اور طویل افسانوں کی شکل میں "باغ و بہار"، "آرائشِ محفل"، "زہرِ عشق"، "قلق اور میر حسن" وغیرہ وغیرہ ہندوستان کے دورِ انحطاط کی پیداوار لٹریچر کو بار بار پیش کر کے تشنہ کامانِ ادب کی لذتِ کام و دہن کو دعوت دیتے ہیں۔ ان میں جو پیشہ ور ہیں وہ آج بھی بادشاہوں اور نوابوں کے گھروں سے نکلنے کے بعد تجارت اور سرمائے کے پیچھے ترادیاں پڑھتے ہیں اور "توبۃ النصوح" کے ہیرو میاں کلیم کی طرح مجلس کے محافظوں کی فرمائش پر نتھن خاں، بدھن خاں، جمن خاں کا سیج مجبوراً تصنیف فرماتے ہیں یعنی دوزخِ شکم پُر کرنے کی غرض سے جاسوسی فلم کمپنیوں اور جاہل مطبعوں کے ہاتھ ادب کی ضمیر فروشی کرتے ہیں۔ جو تو نہ لکھتے ہیں۔ اُن میں بالعموم ہمارے مدرسوں کے طلبا ہیں۔ وہ نہ زندگی کو

زندگی سمجھتے ہیں اور نہ اپنے ہی شاہانہ دور میں سمجھنے کے اہل ہوتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال رح ؎

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

جس طرح وہ اپنی چال ڈھال، وضع قطع میں تقلیدِ مغرب سے زبوں و بدحواس نظر آتے ہیں، اسی طرح ان کا ادب بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا تمام اثرات کے تحت مدرسوں سے نکلے ہوئے اسّی فیصدی افسانے ہندوستانی مخمل میں لپٹا ہوا مغربی مال مسروقہ ہوتے ہیں۔ جن کے نیچے وہ ترجمہ یا کم از کم ماخوذ کا لفظ اس لئے نہیں لکھتے کہ اس سے اُن کی ادیبانہ شان میں فرق آجائیگا۔ اور ترجمہ کو اس حد تک اپنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو طبع زاد کی شکل میں پیش کر سکیں اور جدید ادب کے علمبرداروں کی صف کے پانچویں سواروں میں کھڑے ہو سکیں۔ افسوس کہ ان کے دماغوں پر یہ چیز اس حد تک قابض ہو چکی ہے کہ اگر وہ کوئی چیز واقعی طبع زاد کی شکل میں دماغ سے پیدا بھی کرتے ہیں تو وہ بھی اس سے بقدر متاثر ہوتی ہے کہ مستعار معلوم ہوتی ہے۔ کاش یہ لوگ سمجھیں اور دیکھیں کہ ہماری زبان کے لئے جس کے متعلق ایک مجددِ وقت کا قول ہے ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

ترجمہ بھی لبشرطیکہ وہ ترجمہ ہو اور ہم اُس زندگی کو اپنے ماحول میں دیکھ سکیں اور اس کو اُردو کی روشنی میں دیکھکر ہمارا دماغ مطمئن ہو سکے اور جو ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان کے ادب میں پوری پوری طرح منتقل کرتا ہو ایک تجدید سے کم نہیں۔ زبان کی اس کمی کو منشی پریم چند کے ہم عصر سید سجاد حیدر یلدرم۔ نیاز فتحپوری اور ظفر علیخاں وغیرہ نے پورا کیا اور بہت سی مغربی زبانوں کے ادب سے اُردو زبان کو روشناس کرکے ترجمہ و اخذ کے ذریعہ مختصر افسانوں سے زبان کا دامن مالامال کیا۔ ان کی تقلید میں حامد علیخاں۔ بطرس۔ مجنوں گورکھپوری اور منصور احمد نے بھی زبان کی خدمت کی، کاش اگر بہرام جیسا ڈاکو، رانی کملا جیسی قاتل۔ حیدر خاں جیسا پولیس آفسر، پروفیسر سعید جیسا استاد اور مسعود جیسا طالب علم ہماری ہندوستانی سوسائٹی میں ایک بھی نظر آجاتا تو ہم یہ کہتے کہ مولوی ظفر علی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بھی "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" کو خوب اپنایا۔ ہاں اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شاہد احمد، سعادت حسن منٹو۔ طاہر قریشی۔ عطاء اللہ کلیم وغیرہ حضرات نے دیگر زبانوں کے شاہکار کو بعض بعض جگہ بہت کامیاب ہندوستانی جامہ پہنایا اور بعض جگہ نقل کو اصل سے بڑھکر دکھا دیا البتہ اگر ہندوستان کا مزدور سال کے گیارہ مہینے زیرِ آسمان زندگی بسر کرتا ہو تو ہم شاہد احمد صاحب کے افسانے "کھڑکی" کو اُردو کے آسمان میں تھگلی نہ سمجھتے۔ آج بھی جبکہ پریم چند کا فن نہایت ہمہ گیری کے ساتھ عوام و خواص پر قابض ہو چکا ہے یہ تراجم مع اپنی

فنی باریکیوں کے ہمارے مختصر افسانوی ادب کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کا کام بدرجہ احسن انجام دے رہے ہیں۔ خواص سے ہٹکر عوام پر آتیے۔ طبع زاد افسانہ نویسوں میں ایک عنصر بہت غالب ہے وہ زندگی کو ایک ہی عینک سے دیکھتے ہیں جیسا کہ راقم الحروف نے بیان کیا، ہندوستان کے دورِ انحطاط کی یادگار ؎

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس میں شک نہیں کہ یہ پس منظر ایک ایسے ملک کے افسانوی ادب کے لئے موزوں ہے جہاں عورت اور مرد عام سوسائٹی کو یکساں سطح پر ہوں اور جہاں کی ادنیٰ ترین سوسائٹی بھی فرزندوں کے معیار سے بلند ہو۔ ہمارے ملک کی سفید پوش درمیانی سوسائٹی میں عورت کا وجود عنقا۔ نیچی سوسائٹی سب سے کسی گنتی ہی میں نہیں اور نہ آجکل کے نوجوان ادیب کی نظر تنگ و تاریک جھونپڑوں میلے کچیلے بدبودار لباس اور فاقہ اور دھوپ سے جھلسے ہوئے چہروں پر ہوتی ہے۔ اب رہا اونچی اور درمیانی سوسائٹی کا سوال جو آجکل ہمارے نوجوان ادب کا مطمح نظر اور تختۂ مشق ہے۔ اس کے متعلق کچھ لکھکر ادب کے ذریعہ زندگی کی آئینہ داری کرنا یا سچا اور ملک کی خدمت کرنا طلبِ مجہول۔ کیونکہ بقول مولانا حالی ؎

"وہ اک نوع نوعِ بشر سے جدا ہے"

افسوس کہ ہمارے افسانہ نویس کا ایک مدت سے یہی آلۂ کار ہے کاش آج بھی ہمارے ملک کا وہ نوجوان ادیب جو اپنے اندر ایک رسالہ کا ڈیڑھ صفحہ کالا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اُسے ادب و صحافت میں کچھ بھی دخل ہے، دیکھے کہ علاوہ ایک جنسی بھوک کے ملک میں اور کتنی قسم کی بھوکیں ہیں۔ اگر ذرا بھی آنکھیں کھول کر فضا کو دیکھے تو اُسے معلوم ہوگا کہ ایک غلام ملک کی کم آمیزیوں میں بھی روٹی۔ کپڑا اور فرزندوں کے بیشمار پہلو اور شیخ ڈراما کی سائیکی موجود ہیں۔ ضرورت بیان کے خلوص اور مشاہدے میں گہرائی کی ہے۔ یہاں ہر نگاہ ایک زندگی سے مختلف قسم کا افسانہ تصنیف کرنے کے لئے کافی مواد ہے۔ راقم الحروف نے مدت سے اسکرین پر کوئی افسانہ سوا اس پلاٹ کے کسی اور پلاٹ کا حامل نہیں دیکھا کہ ایک نوجوان خوبصورت لڑکے کو ایک نوجوان حسین لڑکی سے محبت۔ درمیان میں کسی رقیب یا اہل خاندان کی دراندازی، نتیجہ شادی خانہ آبادی یا رات کے بارہ بجے کی ٹرین سے فراری، منھ کالا وغیرہ اور اگر افسانہ نویس کا توسن بے لگام کہیں ریجدی کی جانب مائل ہو گیا تو پرانی چال کی ہیرے کی کنی کے بجائے نئے فیشن کی "پوٹیشیم سائنائڈ"۔ یا مذرہ سایانکھ ایسڈ وغیرہ قسم کی خودکشی۔ غرض الٹ پلٹ کر وہی پرانا جنسی بھوک کا اظہار، پہلے بادشاہ، وزیر، امیر اور تاجر کے الفاظ میں ہوا کرتا تھا۔ اب کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ہوسٹلوں۔ زنانہ اسکول کی ماسٹرنیوں اور کالج کے پروفیسران۔ ماموں زاد، چچا زاد، خالہ زاد، بھاوج بہنوئی یا دوستوں کی عزیز لڑکیوں کی گرد

ان کے افسانے گھومتے رہتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ایک ایسے گرم ملک میں جو طولِ غلامی سے بے حس ہو چکا ہو۔ جسکی غلامی کے بندوں کی سختی کی نظیر آج افریقہ اور سائبریا جیسے غیر متمدن خطوں میں نہ ملتی ہو جس کی عمر کا اوسط ۲۳ سال ہو۔ اگر ان ۲۳ سال میں سے ۱۳ سال جنسی جذبات پر پھونکیں مارتے گذر جائینگے تو اگر نصف ہی صدی میں یہ اوسط تیرہ ہی کے منحوس عدد پر آ کر ٹوٹ جائے تو کیا تعجب ہے۔ اور ایسے ادب سے سوا اس کے اور کیا امید ہو سکتی ہے کہ ہر کسے جنسی جذبات کو ہمہ وقت بیدار رکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سُلا دے۔ افسوس کہ ہمارا افسانہ نویس بالعموم اور ڈرامہ نویس قریب قریب کلیتاً اپنا خام مواد اُن جگہوں سے تلاش کر کے لاتا ہے جہاں قوم مٹی ہوئی شکل میں جہاں زندگی مسخ شدہ صورت میں ہے۔ اُن مقاموں سے نہیں جہاں زندگی فی الواقعی زندگی ہے ——— خالص اور مصفا زندگی تا حدِ نظر ——— اسکو سر بفلک پتھر اور سیمنٹ کی عمارتوں کے اندر جگمگاتی چھتوں، نیچے نرم گدوں، سرسراتے ہوئے ملبوس اور جام و مینا کے تصادم میں تو حیات کا نغمہ سنائی دیتا ہے مگر افسوس کہ ان کھیتوں میں زندگی کی آہیں سننے سے اسکے کان معذور ہیں۔ جن میں علاوہ اور چیزوں کے انسانی پسینے کا بھی کھاد پڑتا ہے۔ ان ٹوٹی ہوئی جھونپڑوں میں حیات کی جھلک بھی نظر نہیں آتی جہاں مہینے میں چار مرتبہ ہانڈی چڑھتی ہے اور چھتیس روز پتھر کی سل کے ارد گرد جوار اور جوار کی روٹی اس سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کھائی جاتی ہے جتنی کہ جھکی ہوئی لکڑی کی کرسیوں پر سیاہ و سپید فرعونی ملبوس میں گول میز کے ارد گرد۔ اس کو سچی چینی اور کچی چاندی کے اتصال میں زندگی کا ارغنوں سنائی دیتا ہے مگر تاریک خاک اور سیاہ لوہے کے تصادم میں نہیں۔ افسوس کہ ہمارا ادیب نہیں دیکھ سکتا کہ باوجود "شاہین" اور "وہسکی" کی بوتلیں خالی کر دینے کے بھی یہاں اتنا سرور محسوس نہیں ہوتا جتنا کہ وہاں کچے کنوئیں کے تازہ پانی سے ——— ہمارا ادیب زندگی سے قریب افسانہ اس لئے نہیں لکھ سکتا کہ وہ اسکا سانچا صحیح مقام پر تلاش کرنے نہیں جاتا۔

افسانہ نویسی ہمارے ادب میں بہت مقدم حیثیت رکھتی ہے اور اُردو افسانے کی سب سے پہلی کتاب غالباً "رانی کیتکی" ہے مگر فی الحال ہمارا مقصد مختصر افسانے سے ہے۔ جو اُردو ادب میں پرانی چیز نہیں ہے اور ہمارے خیال میں جملہ مشاہیر اس پر متفق ہیں کہ منشی پریم چند اس کے موجد ہیں۔ حالانکہ منشی جی خارجی عناصر سے قطعاً متاثر نظر نہیں آتے اور ان کے افسانوں کے کردار سولہ آنے ہندوستانی ہیں۔ لیکن انھیں اگر فنی کسوٹی پر رکھئے تو اس میں "چیخوف" اور "کاؤنٹ ٹالسٹائی" کے اثرات ملتے ہیں۔ منشی جی نے شعوری طور پر غیر زبان کی افسانہ نگاری کا اثر نہیں لیا اور ان کے افسانہ نویسی کی منزل بُحرانِ اصلاح ہوتی تھی اور وہ بالعموم معاشرتی زمین پر کھڑے ہو کر کہانی کہا کرتے تھے۔ مگر بڑی چیز جو انھوں نے اُردو افسانے میں داخل کی وہ کردار کی اہمیت ہے۔ اُن کا فن آج بھی اتنا ہی زندہ ہے جتنا کہ روزِ اوّل اور درحقیقت اُن کا فن ابدیت سے ہم آغوش ہے۔

آج جبکہ جنسی بھوک کے عریاں اظہار کا نام جدید ادب ترقی پسند لٹریچر ہے۔ منشی جی کے افسانے "نئی بیوی" اور "مالکن" زندگی میں بالکل مدغم نظر آتے ہیں۔ وہ نہ کہنے کی باتیں جس خوبصورتی اور آسانی سے ادب میں ڈھال گئے ہیں وہ ہمارے بیباک نوجوان ادیب کو باوجود انتہائی آزادی اور عریانیٔ طبع کے نصیب نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا مختصر افسانہ بڑی حد تک مختصر افسانوی ادب سے اثر پذیر ہوا اور چلا بھی اس کو وہیں سے ملی مگر دیکھنے ہی دیکھتے مغربی مختصر افسانے میں اور اس میں خصوصاً نمایاں فرق ہو گیا وہ تعجب انگیز بھی ہے اور ساتھ ہی دلچسپ بھی۔ اس کی وجہ ماحول کا فرق ہے اور دوسری وجہ ہمارا دماغی رجحان۔ ہم اُن کی طرح آزاد قوم نہیں ہیں۔ ہماری ذہنیت غلامی نے پست کر دی ہے۔ ہمارے دماغوں پر مستقل قنوطیت کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ معاشرتی کشمکش نے نہ جانے کتنی بھوکیں بیدار کر دی ہیں متضاد پیشوں اور رملک پر اینگلو انڈین قوانین کے دور دورے کی وجہ سے کبھی ملک کا سب سے اہم عنصر کسان زمین کی پیداوار کی قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ایک عقدۂ لاینحل بن جاتا ہے اور کبھی قلم چلانے والا منشی طلوعِ آفتاب سے غروب آفتاب تک خامہ فرسائی اور دماغ سوزی کرنے کے بعد بھی پورے دو وقت اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ کالج سے نکلنے کے بعد بیکار نوجوان خود کو P.C.S اور I.C.S کے رنگین خواب میں مبتلا نہیں رکھ سکتا۔ جنگ کی ملازمت وہ اس لئے نہیں کرتا کہ غلام کو جان بڑی پیاری ہوتی ہے اور ماحول نہایت عزیز۔ ایک خاص صفت غلام کی یہ بھی ہوتی ہے کہ اُس کو مستقبل نہایت روشن نظر آتا ہے اور خود غرضی اُس کے اصولِ خاص سے متجاوز ہو کر اسکی عادت بن جاتی ہے۔ لہٰذا ان تمام داخلی حالات کے گریز میں زیادہ تر افسانے طربیہ نکلتے ہیں اور یہی چیز عوام میں مقبول ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں ہمارا مِل میں کام کرنیوالا مزدور دفتر میں بیٹھ کر قانون جیسے خشک مضمون سے سر دھننے والا منشی یا سڑک پر پہرہ لگا کر ڈیوٹی دینے والا سپاہی اور دوکان پر بیٹھ کر سکوں اور سامان میں اُلٹ پلٹ کرنے والا تاجر، سینما کا ایک ٹکٹ یا کم از کم چوراہے پر بکتا ہوا ایک رنگین سرورق والا رسالہ خرید کر تھوڑی دیر کو خود فراموشی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جس طرح ایک جامِ شراب پی کر خود کو کسی دوسری دُنیا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح ایک رومانی افسانہ یا ایک رنگین فلم کی چھوٹی بڑی گھُوپ میں کھو جاتا ہے۔

مختصر افسانے کی تعریف ایک فاضل افسانہ نگار نے یوں کی ہے کہ مختصر افسانہ ایک

ایسی نثری داستان ہے جس کو ہم آسانی سے آدھ گھنٹے سے لیکر دو گھنٹے تک میں پڑھ سکیں اور جس میں اختصار تحریر و سادگی کے علاوہ اتحادِ زبان، اتحادِ مکان اور اتحادِ کردار بدرجۂ اتم موجود ہوں اگرچہ یہ تعریف بھی تشنہ اور ناکمل سی ہے اور جامع نہیں مگر افسوس کہ عام لکھنے والوں کے افسانے عام طور پر اس معیار پر بھی پورے نہیں اُترتے۔ درا صل ادب بقول ایک جمیل القدر ادیب کے کسی رہبری کا محتاج نہیں۔ وہ بہتے پانی کا ایک دریا ہے جو اپنی سطح خود تلاش کرتا ہے۔ ضرورت احساس کی صداقت اور مطالعے کے خلوص کی ہے۔ افکار کی قید اور موضوعات کی تخصیص لاحاصل چیزیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یکے تانگے والے، قلی کباڑی، تھانیدار وں اور عرائض نویسوں اور ٹھیاداروں کے معیاری رسالوں کے فسانہ نویس اگر ذرا کوشش کریں تو اُن کے فسانے اُن جملہ فنی خصوصیات کے حامل ہو سکتے ہیں نہ صرف یہی بلکہ زندگی سے زیادہ قریں نظر آسکتے ہیں۔ درا صل سرمایہ داروں کو گالیاں دینا اور اُن کے مال لوٹنے کا پروپیگنڈا کرنا مزدور و کسان کی جا و بیجا حمایت اور طرفداری کرنا ہی فیشن ایبل افسانہ نویسی نہیں ہے۔ نہ روس اور فرانس اور انگلینڈ کے فسانہ نویسوں کے تتبع میں لکھنا ترقی پسند ادب ہے بلکہ زندگی کی صحیح ترجمانی سماج کی ذہنیتوں کی عکاسی انسانی دماغوں کی تشریح اور ضمیر کی گہرائیوں کی عریانی کا نام جدید فسانہ نویسی ہے جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس صلاحیت سے مالامال کیا ہے وہ اگر تصنع کو بالائے طاق رکھکر لکھے تو ان چیزوں کو زیادہ آسانی سے لکھ سکتا ہے فسانہ نویس کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی علمی قابلیت کا حامل ہو یا کسی یونیورسٹی کا سند یافتہ ہو درا صل قدرتی صلاحیت کے ساتھ ضرورت مشاہدہ کی گہرائی اور بیان کے خلوص کی ہے اگر ذرا احتیاط کے ساتھ لکھا جائے تو ہر وہ شخص جو ایک بے سر و پا عشقیہ یا جاسوسی افسانہ لکھ سکتا ہے نہایت کامیاب افسانہ بھی لکھ سکتا ہے سب سے پہلے وقت کی شرط کو لیجئے وہ افسانہ جسکے پندرہ بیس منٹ پڑھنے کے بعد باقی آئندہ پر نظر ٹھہرتی ہے تو وہ اس سے گذر کر کہاں پہنچتا ہے۔ کیا وہ طویل مختصر یا مختصر افسانے کے حدود کے اندر رہ جاتا ہے دوسری چیز اتحادِ زمان و مکان جو ترجمہ ہے UNITY OF TIME AND PLACE کا ہماری عام افسانہ نگار سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ اسکرین پر تو ان چیزوں کا کوئی لحاظ بھی نہیں نہیں کیا جاتا اور نہ کوئی اہمیت ہوتی ہے اور عام مصنف ان چیزوں سے خود کو بالکل کورا سمجھتا اور جو جاننے والے ہوتے ہیں وہ دُوآنہ والے درجے کی فہم کے معیار پر ادب کی قربانی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سینما کے آلۂ کار ہیں اور دوسرا فرقہ یا تو کسب زر و رنہ کسب شہرت کی ہوس میں عامیانہ مذاق کے رسائل پر ادب کا گلا گھونٹتا ہے۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ہمارے ایک افسانہ نویس کے ایک ہیرو نے پہلے تو دربار بغداد میں کارہائے نمایاں دکھا کر عزت حاصل کی اور وہاں سے معتوب ہو کر دربار اندلس کی راہ فرار اختیار کی اور تھوڑے ہی عرصے میں وہاں وہ کارہائے نمایاں دکھائے کہ بغداد سے زیادہ عروج و منصب حاصل کیا۔ افسوس کہ یہ معلوم کر کے بے انتہا رنج ہوتا ہے کہ فاضل افسانہ نگار نے اپنے اس فسانے میں علاوہ فسانہ نویسی کے تاریخ دانی کی بھی داد دی ہے۔ اس فسانے کے ہیرو کو جن دو بادشاہوں کے دربار میں عروج و زوال حاصل ہوا اُن کے عصر میں صرف تین چار صدیوں کا فرق ہے فاعتبروا یا اولی الابصار!

ایک افسانہ نگار صاحب جو بچوں کی خوش قسمتی سے اسکول ماسٹر بھی واقع ہوئے ہیں اپنے فسانے میں نینی تال کے لئے ریلوے اسٹیشن دہرہ دون قرار فرماتے ہیں اور اپنے ہیرو کو دہرہ دون لاری پر سوار کرا کر نینی تال پہنچاتے ہیں اور نینی تال کے موٹر اسٹینڈ سے نینی تال کی کوتوالی تک تانگے پر پہنچاتے ہیں۔ اب دیکھئے داداِن کی جغرافیہ دانی اور ان کی تاریخ دانی کی اور پیٹئے سر دونوں کی معلوماتِ عامہ اور دونوں کی فسانہ نویسی پر اور سمجھئے اندازہ ان ایڈیٹروں کی آنکھوں کی جسامت کا جن کے زرّیں جریدے کے تین تین چار چار صفحے اس لٹریچر نے کالے کئے ہ

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

یہ دُو فسانے پڑھکر مجھے بے اختیار ایک تاریخی لطیفہ یاد آگیا شہزادہ دارا شکوہ کو ایک سادھو سے جو دہلی کے مضافات میں جنگل میں اقامت گزیں تھا بہت عقیدت تھی۔ ان سادھو کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ان کی کئی ہزار سال کی عمر ہے اور صدیوں سے نہیں بولے ہیں۔ شہزادہ اکثر سادھو جی کے حضور میں نہایت عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتا شہنشاہ کے مزاج میں شہزادہ کو جو در خور حاصل تھا وہ تاریخ سے اچھی طرح ثابت ہے۔ شہزادہ یہ محض سادھو جی ہی کی نظر عنایت سمجھتا تھا کہ شہنشاہ کی زندگی میں دہلی کا تاج و تخت حاصل تھا اور ایام شہزادگی ہی میں اس کے نام کا سکہ رواں تھا۔ چنانچہ کچھ اپنے اثر اور کچھ شہنشاہ کی درویش صفت و درویش دوست طبیعت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دارا نے شہنشاہ کو سادھو جی کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ ایک روز شہنشاہ شاہجہاں مع شہزادہ دارا شکوہ و سعد اللہ علامی وزیر اعظم اور تھوڑے سے خدم و حشم کے ساتھ جا پہنچے۔ درا صل سادھو فقیر و قیر کچھ بھی نہ تھا بلکہ پکا دنیا دار بہروپیہ تھا اور رعایا پر اپنا رعب جا رکھا تھا اور دارا کی عقیدت سے کسب شہرت اور کسب زر کرتا تھا۔ شاہجہاں کو دیکھکر ایسا مرعوب ہوا کہ تعظیم کے لئے کُٹیا سے باہر نکل آیا اور شہنشاہ کو زمین بوس ہو کر آداب کہا۔ سادھو کا یہ خلاف معمول طرزِ عمل دیکھکر دارا شکوہ تو متعجب ہوا مگر شہنشاہ مکدر ہو گیا اور جو عقیدت دارا نے ایک مدت میں شہنشاہ کے دل میں قائم کی تھی وہ شہنشاہ کے دل سے بڑی حد تک ختم ہو گئی۔ بھلا فقیر دنیوی جاہ و حشم سے مرعوب ہو جائے تو اسکا فقر ہی کیا، سوچتا ہوا "قہر درویش برجانِ درویش" شہنشاہ فقیر کے ساتھ کُٹیا کے اندر گیا چند منٹ

بیٹھنے کے بعد شہنشاہ نے اندازہ کیا کہ سادھو جی کا انداز مائل بہ تکلم ہے تو سوال کیا "سادھو جی جناب کی عمر کیا ہے" تو خلافِ معمول سادھو جی گویا کئی صدیوں بعد بول اُٹھے اور فرمایا:-
"جہاں پناہ جب سکندر حملہ کرنیں (ذوالقرنین) اور امیر تیمور گرگانی سے جنگ (لڑائی) ہوئی ہے تو میں امیر تیمور گرگانی کی طرف سے لڑ رہا تھا"۔ اور پیشتر اسکے کہ حاضرین میں سے کوئی کچھ حیاہنکہ بار بار کرے برجستہ کہا "اور اس سے پہلے جب امیر تیمور گرگانی اور محمد صاحب سے معرکہ ہوا تھا تو بھی میں امیر تیمور کی طرف سے لڑ رہا تھا"۔ شہنشاہ بدظن تو پہلے ہی ہو چکا تھا اپنے جدِ امجد کے متعلق اتنا کفر آمیز کلمہ سن کر جذبۂ مذہبی سے بیتاب ہو گیا۔ غصہ ضبط کرکے وزیر کی جانب دیکھا اور کہا "آپ دیکھتے ہیں؟ یہ مردود میرے دادا اکو کافر بتاتا ہے"۔ وزیر نے شہنشاہ کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے یا سادھو کے جملے پر چل کر کہا "جی ——— جہاں پناہ ——— علاوہ کافر بتانے کے ابدولت نے یہ بھی غور فرمایا کہ علاوہ تصوف کے سادھو جی کو علم تاریخ دانی میں کسقدر ملکہ ہے"۔ وزیر کے اس جملے پر شہنشاہ کو بے اختیار ہنسی آگئی اور غصہ فرو ہو گیا۔

ملک کی ایک مشہور فسانہ نویس خاتون کے چند افسانے بھوت اور چڑیل اور روح اور حیات بعد از مرگ وغیرہ قسم کی چیزوں سے متعلق ایسے احمق پلاٹ و کردار کے حامل دیکھے کہ مسجد کی فصیل پر مردہ اور مسجد کا ملّاں تمام رات گویا کشتی لڑے اور مُردہ مسجد کی دیوار پھاند کر بھاگ گیا لیکن دیوار پر لٹکا رہ گیا اور مردہ ملاں جی کو مسجد کی فصیل پر بیہوش چھوڑ کر فرار ہو گیا ایک فسانہ میں کچھ اس قسم کا اظہارِ خیال فرمایا ہے کہ اپنے مرنے سے چھ مہینے بعد ایک خاتون نے اپنی زندگی والے مکان میں آکر تمام رات مہمانوں کی خاطر تواضع کی اور صبح کو کافور ہو گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد اُن کے مہمانوں کو پتہ چلا کہ ان کی میزبان کو اس دنیائے ناپائدار سے کوچ کئے ہوئے چھ مہینے ہو چکے ہیں اور یہ اُن کی روح تھی جس نے تمام رات میزبانی کے فرائض انجام دیئے اپنی آمد کی خبر انہوں نے بذریعہ تار دی تھی دوسرے ایک موٹر ڈرائیور کو کفن دفن سے پیشتر پہنچا تھا وہ ان خاتون کو ساٹھ ستر اسی نہ معلوم کتنے میل فی گھنٹے کی رفتار سے لیکر موٹر پر اُڑا اور پیشتر اسکے کہ اسکے جنازے کو لوگ قبر میں اتار پائیں موٹر پہنچ گیا اور حادثہ موٹر کے اُلٹ جانیکا ہو گیا۔ ڈرائیور جو رات کو مر چکا تھا غائب پایا گیا۔ موٹر اُلٹ گئی تھی خاتون بیہوش تھیں۔ اور ڈرائیور کا بھوت یا روح اُن کو دفن سے قبل موٹر پر بٹھا کر غائب ہو گئی تھی وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اس قسم کے افسانہ نویسوں سے یہ شکایت ہے کہ بیسویں صدی میں روحیں موٹر پر دوڑا کرتی ہیں۔ مہمانوں کے تار وصول کیا کرتی ہیں اور میزبانی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ اس لٹریچر کا کیا مقصد ہے۔ یہ ادب برائے ادب ہے یا ادب برائے زندگی! سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا سترھویں اٹھارہویں صدی کا لٹریچر نمایاں کرداروں اور پلاٹوں سے تشنہ ہے! جو اب بیسویں صدی میں بھی اس کی تلافی کی ضرورت ہے۔ مجھے ان ادیبہ سے اس لئے خاص شکایت ہے کہ وہ ہمارے ادب میں ایک نمایاں پوزیشن رکھتی ہیں۔ ورنہ شاید اسقدر تفصیل کے ساتھ میں انکا تذکرہ نہ کرتا۔

کیا اس متمدن زمانے میں وہ اپنے قارئین کے گلے میں بھوت پریت وغیرہ قسم کی چیزوں کے وجود کو اتار کر ادب کے ذریعہ سماج کی ذہنیت کی خدمت کر رہی ہیں؟ ایک خاص قسم کا انحراف ناول میں کبھی کبھی اور بھی دکھائی پڑتا ہے۔ وہ ہے ہندو مسلم سوال بعض مصلح قسم کے افسانہ نویس ملک و قوم کی اس ذریعہ سے اصلاح کرنا چاہتے ہیں یا اپنے مخصوص دائرے میں دوسرے مذہب یا رواج پر چوٹ کرکے شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اکثر عام پڑھنے والوں کی ذہنیتوں پر اسکا برعکس اثر ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ اپنے افسانے کی ایک نقل انگریزی میں ترجمہ کراکے مسٹر چرچل کے پاس اور ایک سنسکرت میں ترجمہ کراکے گاندھی جی کے پاس بھیجدیں۔ بجائے اسکے کہ پریس کو بھیجیں۔ افسوس کہ ایک خاص موضوع ہمارے افسانوی ادب میں بہت تشنہ ہے اور میں معاف کیا جاؤں اگر یہ کہوں کہ ہماری سوسائٹی کے اس مذموم رواج پر ابھی تک بہت ہی کم قلم اٹھا ہے۔ اہلِ ہنود میں تعداد ازدواج کسی صورت جائز نہیں ہے مگر اسلام نے اسکو انصاف حقیقی کے ماتحت جائز کیا ہے۔ افسوس کہ سوسائٹی اسکو جس طرح غلط طریقے پر استعمال کر رہی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ہندو اہلِ قلم اس خصوص میں آزاد تھا مگر انھوں نے بھی قرار واقعی ادب کے ذریعہ اسکی خدمت نہیں کی اور ان کی بہت کم چیزیں اس موضوع پر ملتی ہیں اور جن شرائط و قیود کے ساتھ اسلام جیسے وسیع النظر مذہب نے روا رکھا ہے اسکو نظرانداز کرتے ہوئے جس بُری طرح سے ہندوستان کے مسلمانوں نے اسکی مٹی پلید کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور عام مصنفین اس سے مجتنب کیوں رہے؟ تمام مسلمان تو یوں رہے کہ اس سے اُن کے پاک مذہب پر حملہ ہے اور مسلم کردار اور پلاٹ کے ساتھ ہندو مصنفین اس لئے گریزاں رہے کہ اس قسم کے لٹریچر کو تعصب پر محمول کرکے ان کو بجائے نکتہ چینی اور دل بغض و عناد کا موردِ الزام قرار دیا جائیگا۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اُردو مختصر افسانے کی ایجاد کا سہرہ منشی پریم چند کے سر ہے اور اُن کے افسانے اب بھی اتنے ہی زندہ ہیں جتنے اب سے ۲۵ پچیس سال پیشتر تھے اور پچاس سال بعد رہینگے۔ مگر جس چیز کو منشی جی نے روز اول پکڑا تھا اُس کو ہمارا نوجوان آج پکڑ پایا ہے۔ منشی جی کے متعلق اس مختصر اور محدود وقت میں کچھ لکھنا نہ لکھنے کے برابر ہے ؂

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کیلئے

تاہم منشی جی کے بعد بھی اردو افسانے نے حیرت انگیز ترقی بھی کی اور تھوڑی بہت تبدیلی۔

ے ساتھ ساتھ محرومیت بھی حاصل کی۔ منشی جی نے جو کچھ لکھا ہے جیسا کہ اوپر ہم ظاہر کر چکے ہیں اس میں تھوڑی طور پر غیر زبان کی خوشہ چینی نہیں ہے گو دوسرے مصنفین کے ادب میں غیر زبانوں کا فنی عنصر نہایت خوبصورتی کے ساتھ نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ منشی جی کا مسلک ادب برائے زندگی تھا اس کے فوراً ہی بعد ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جو اصلاح کے ساتھ ساتھ ادب کی لطافتوں اور لٹریچر کی رنگینیوں کو بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا چنانچہ رومان کے ساتھ واقعات نگاری فسانے میں داخل ہوئی سلطان حیدر جوش لطیف الدین احمد، حکیم احمد شجاع اور عظیم بیگ چغتائی وغیرہ وغیرہ زعما کے علاوہ بہت سے فن کاروں کے اسمائے گرامی اسوقت راقم الحروف کے ذہن میں ہیں۔ اب اگر اس مقالے میں مختصر فسانے کے مختصر دور پر ایک مجموعی نظر نہ ڈالی جائے تو سخت کمی رہ جائیگی۔ آیئے اب دیکھیں کہ پریم چند سے شروع ہو کر ہمارے مختصر افسانے کا زینہ کونسا رہا اور کس کس سیڑھی پر کیا کیا حالت رہی۔

پریم چند کے زمانے کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے ڈرامے افسانے وغیرہ کے ترجموں کا آغاز ہوا نیاز فتحپوری۔ ظفر علیخاں۔ عبدالمجید، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نے ترکی افسانوں کا ترجمہ شروع کیا اس کے بعد منصور احمد، قاضی عبدالغفار، حامد علیخاں۔ مجنوں گورکھپوری، لطرس۔ شاہد احمد عطا، اللہ کلیم وغیرہ حضرات نے ترجمہ کی بنیادوں پر اردو افسانے کی نئی تعمیر کو مضبوط کیا خارستان وگلستان سیب کا درخت، ساحرہ، ناکام، قبرستان وغیرہ تراجم کے وہ چند عنوانات ہیں جن کی بدولت غیر ملکی مصنفین کے فن کارانہ تخیل ہماری زبان میں تبدیل ہوتے اندر فسانہ فن کی دولت سے مالامال ہوا۔ اب کچھ عرصے سے جدید چینی افسانے اردو زبان میں منتقل کئے جا رہے ہیں جناب تمنائی یہ خدمت بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ ان تراجم نے ہمارے ذہنوں میں مخصوص تبدیلی پیدا کر دی ہے اور ہم اپنے طبع زاد افسانوں میں بھی فن تلاش کرنے لگے ہیں۔ ہمارے مذاق میں ندرت پیدا ہو گئی اور تھوڑے ہی زمانے میں فنِ افسانہ نویسی نے اپنی ترقی کے بہت سے درجے طے کر لئے اور آج ہم فخر کے ساتھ اپنے فسانے اہلِ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور کم از کم اس چیز میں ہم کسی متمدن ملک سے اسنے پیچھے نہیں ملینگے جتنے اور صلاحیتوں میں کم مایہ نظر آتے ہیں۔

پریم چند کے فنی افسانوں اور جدید افسانوں کی کڑیوں کو ہمارے چند فن کاروں کی تصانیف باہم جوڑ دیتی ہیں۔ ان کے لکھنے والے کسی خاص مقصد کے پابند نہیں ہے مگر معاشرتی اور خالص اصلاحی دائروں کے اندر گھوم گھوم کر رہنا نہیں چاہتے بعض کے انداز میں بیباکی اور آزادی تھی مگر بالعموم ان میں رومانی رنگ بدرجہ اتم جھلکتا تھا۔ یہ لوگ افسانے کے ٹیکنیکل لوازم کی تکمیل کو اشد ضروری سمجھتے تھے اور ان حضرات میں عظیم بیگ چغتائی کو اگر امام کہا جائے تو لطیف الدین احمد، سلطان حیدر جوش، سالک، حفیظ اور شجاع وغیرہ وغیرہ کو بھی ان کا دستِ راست کہنا پڑیگا۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی بہت سے قابل قدر افسانے لکھے جو سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اہم خصوصیات کے حامل ہیں۔

اس دور کے آخر اور موجودہ دور کے پہلے افسانہ نگاروں کے خیالات ورجحانات مختلف تھے لیکن اُن کے بعض افسانے بھی دل سے محو نہیں کئے جا سکتے۔ رفیقی اجمیری قیس رامپوری، اعظم کریوی۔ ناکارہ حیدرآبادی اور حسن عزیز جاوید وغیرہ کے اسمار خاص طور سے نمایاں ہیں۔ فرحت اللہ بیگ اور پطرس کے مزاحیہ افسانے بھی بلا شبہ اوّل درجے کے چیز ماننے پڑینگے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ زمانے کے ساتھ جب زمانے کا نظام بدلا تو اسکے ساتھ ساتھ افسانے میں بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ معاشرتی حالت بدتر ہونے لگی فراغت اور سکون کی جگہ تنگ حالی اور اضطراب ددوں نے لے لی بیکاری نے جنسی بھوک کو تیز کر دیا۔ مشرقی عورت نے مغرب کی تقلید میں پاؤں نکالنے چاہے اور مرد پر حاوی ہونے لگی۔ اسکے نتیجے میں بازاری عورت سے ہٹکر افسانوی ادب فیشن پرست بے پردہ بیبیوں کے گرد گھومنے لگا اور جس طرح سوسائٹی میں طوائف کی دلچسپ کرسی پر حسن درون پردہ نظر آنے لگا اسی طرح افسانوں میں بھی یہ چیز نمایاں ہونے لگی گویا انقلاب نے پبلک کی لگام حقیقت کی جانب پھیر دی اور معاشقہ بازاری کردار نگاری کے سانچے میں ڈھلنے لگا اور ہوا کا چلنا اور سورج کا چمکنا۔ بازاروں کی چہل پہل اور جنگلوں کی ہو۔ کلیوں کا بکھرنا اور گاڑیوں کا گھڑگھڑانا۔ دماغی خیالات کا ہجوم افسانے کی شکل میں ڈھلنے لگے۔ غور کیا جائے تو ہماری خیالات کا ہر قدم ایک افسانے کے عنوان کی جانب اٹھتا ہے۔ ہمارے احساسات وجذبات بذاتِ خود ایک مستقل افسانے کا رنگین عنوان ہوتے ہیں اس لئے ہم جذباتی دنیا میں وہ سب کچھ پا لیتے ہیں جو ہمیں واقعاتی دنیا میں میسر نہیں ہوتا۔ اور یہی چیز مختصر افسانے میں ہماری کردار نگاری کی ذمہ دار ہے۔ افسانہ نگاری کا یہ انداز ۳۱ء وسنہ ۳۲ء سے ہمارے ادب میں نہایت تاباں اور درخشاں ہے اور اب تک برابر مائل بہ ترقی ہے۔ سماج کے ہاتھوں زخم خوردہ لوگ خود یا ایسے لوگوں کا دل میں درد رکھنے والے نوجوان ادیب اس میدان میں بڑی آن بان سے اترے اور سماج کے ہر زہر کا اچھی طرح تجزیہ کیا۔ اس دور نے فسانہ نویسی کے فن میں بھی بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں اس گروہ کے بعض ادیب کارل مارکس کے اصولوں کے زیر اثر جوہرِ قلم دکھاتے تھے اور بعض سگمنڈ فرائڈ اور ڈی۔ ایچ لارنس کے نظریوں کی تلقین کرتے تھے۔ اس لئے افسانے کے بعض پہلو ہماری پرانی تہذیب کے تربیت یافتہ لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کا یہ طرز بیک قت

روانی اور حقیقت پرست ہے اور ان دونوں حالتوں کے درمیان کی جدوجہد اس نئی جماعت کی تخلیق اور نئی افسانہ نویسی کی ایجاد کی ذمہ دار ہے۔ اس صورت میں ہمارے جدید افسانہ نگار ایک جماعت کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں انھوں نے ادب میں بہت نمایاں انقلاب پیدا کیا ہے اگرچہ ۱۹۳۲ء سے اب تک زمانے کی تبدیلیاں بڑی حد تک ان کے احساسات پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔ تاہم ان میں ایک ہی قسم کے عوامل کا دور دورہ رہتا ہے۔ افسانے کی نئی ٹیکنک انھوں نے مغرب سے لیکر اس میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ شعوری طور پر کی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے مغربی فن کے مطالعے سے متاثر ہو کر ہی یہ صورت اختیار کی مگر پھر بھی ان کے افسانے سولہ آنے ORIGINALITY کے حامل ہیں۔ ان میں بالعموم سب کے سب سنہ ۱۹ء اور سنہ ۱۹۲۲ء کے درمیان کی پیدائش ہیں اور سب کے سب جوان عمر سے زیادہ جوان نظر ہیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمان، کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی، اختر حسین رائے پوری، دیوانہ مصطفیٰ آبادی، حسن عسکری، حیات اللہ انصاری، اپندر ناتھ اشک راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عاشق حسین بٹالوی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ وغیرہ بہت سے حضرات ہیں جن کے اسمائے گرامی سے یہ مختصر اور ناقص فہرست خالی ہے۔ خواتین میں رشید جہاں اور عصمت چغتائی ہیں۔ عصمت چغتائی کا نام خواتین میں لکھ کر دل میں چوٹ سی لگتی ہے۔ کاش اگر بجائے بہن کے وہ ہماری بھائی ہوتیں تو ہم آج بڑے فخر کیا تھا ان کے ادب کو بین الاقوامی سبھا میں پیش کر سکتے۔ ان کے نفسیاتی تجزئے زندگی سے اسقدر محو ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی حد تک سے گذر جاتے ہیں اور اُن کو بہن کے منہ سے سنکر مشرقی حجاب دامنگیر ہوتا ہے۔

یوں تو ہر دور میں ہر فن کو ترقی ہوتی رہی ہے لیکن راقم الحروف اس فن کو ترقی نہیں سمجھتا جس میں فنی خصوصیات زائل ہو کر خالص حصول مقصد نہایت عریاں اور واضح نظر آنے لگے آجکل کے بعض فسانہ نویس اپنے فسانوں کو اشتراکیت کے پروپیگنڈے کی حد تک پہنچا دیتے ہیں اور چونکہ پروپیگنڈا بذات خود ایک جداگانہ فن ہے۔ لہٰذا جب یہ اسکا پروپیگنڈا ادب کے لباس میں کرتے ہیں تو فوراً ظاہر ہو جاتا ہے اور فن رسمی طور پر نقالی بن کر اپنی خصوصیات کھو دیتا ہے۔ فن کار لیڈر نہیں ہوتا وہ آرٹسٹ ہوتا ہے۔ زندگی کا آئینہ دار لہٰذا جو جذبات و حسیات اپنے ہوں انھیں اپنے فن کے جوہر دکھانے چاہئیں لہٰذا ہر وہ ادب جو زندگی کی ہزاروں کیفیتوں میں کسی ایک حقیقت کی صحیح ترجمانی کرے وہی ترقی پسند ادب ہے اور خالص فن۔ صرف پیٹ کا دکھڑا اور افلاس زدہ لوگ ان کی طرفداری کرکے دولتمند اور جاگیردار کو ملک کی سازش کرنا، عورت کو جمہور کی ملکیت ثابت کرنا اور جنسی خواہشات کی عریاں اور حیا سوز طریقے پر ظاہر کرنے کا نام ہی جدید و ترقی پسند ادب نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شعبے بھی ایک حد تک اسکے ذیل میں آتے ہیں مگر اسکے یہ معنی سمجھنا کہ جدید و ترقی پسند افسانوی لٹریچر انھیں تک محدود ہے غلطی ہے زندگی کے چاروں طرف ادبی جواہر ریزے بکھرے پڑے ہیں۔ تھوڑی سی شناوری کی گہرائی کے ساتھ ادب و آرٹ خود آپ کو زندگی کے پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیگا۔ چنانچہ ہمارے کامیاب جدید فسانہ نگاروں میں باوجود اختلاف نقطۂ راہ کے چراغ منزل ایک ہی ہے اور وہ ہے زندگی کی ترجمانی اور یہ حضرات زندگی کے ایک شعبے کے پہلو پر روشنی ڈالکر جزوی طور پر فسانہ بناتے ہیں لیکن کرشن چندر صاحب اور عاشق حسین بٹالوی صاحب زندگی کے وہ خدوخال جنھیں خوردبین دکھانے سے عاجز ہے۔ نہایت ہمہ گیری کے ساتھ پیش نظر کرنے میں اکثر اوقات کامیاب رہتے ہیں۔

اب باوجود بحث کے اسقدر طویل ہو جانے کے ہمیں ایک چیز ظاہر کرنا نہایت ضروری ہو گئی۔ جدید فسانہ نویس حضرات زبان کی غلطیوں کی جانب بہت کم توجہ دیتے ہیں افسوس کہ وہ فن کاری میں اسقدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ وہ اصل مغز کی جانب توجہ نہیں کرتے اگر اس جانب بھی یونہی ماں والی عدم توجہی رہی تو ہمارا جدید ادب آنے والی نسلوں کو ایسے راستے پر لیجائیگا جہاں زبان نجی و داغدار ہونے کے بعد کلیتاً مسخ ہو چکی ہوگی کاش یہ حضرات سمجھیں کہ جسقدر وہ زباں کو فن سے مالامال کر رہے ہیں اسی قدر لسانی غلطیوں سے صدمہ پہنچا رہے ہیں اگر ذرا بھی توجہ کریں تو اپنے فن کے کمال کے ساتھ ساتھ زباندانی کا بھی کمال دکھا سکتے ہیں۔

راقم الحروف کا مدعا اس مختصر خامہ فرسائی سے صرف ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار کرنا ہے۔ نہ کہ اپنی قابلیت کا ادعا مقصود ہے جس سے میں کوسوں دور ہوں اور نہ کسی صاحب اہل قلم پر بیجا نکتہ چینی یا عیب جوئی مقصود ہے۔ ناظرین کرام اور نکتہ رس اصحاب متعلقہ اسکو بے لوث اور خالص تنقید متصور فرمائیں۔ اگر تنقید کا کوئی پہلو نظر انداز یا دل شکن ہو گیا ہو (کیونکہ میں ہمہ دانی کا مدعی نہیں) تو اسے ایک ہیچمداں بشر کے سہو و خطا پر محمول فرمائیں۔

چودھری محمد ابوالفضل صدیقی۔ بدایونی

مشاعرۂ شاعر مصرع طرح برائے ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء

"آج پھر حسنِ حقیقت کو نمایاں کر دیں"

نمایاں۔ فروزاں وغیرہ قوافی۔ کر دیں ردیف

نوٹ: غزلیں ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک آنی چاہئیں۔ مشاعرہ کے لئے صرف مستقل خریدار غزلیں بھیج سکتے ہیں۔ غزل پر نمبر خریداری ہونا ضروری ہے —— منیجر

نفیرِ فطرت

اے کہ تری نگاہ ہے جلوہ پرستِ رنگ و بُو
اے کہ فریبِ عیش کو عیش سمجھ رہا ہے تُو

دیکھ ذرا کہ منظرِ جہاں منظرِ حشر کوش ہے
وقت کا ہر معاملہ عبرتِ چشم و گوش ہے

کتنے عظیم و پرشکوہ سلطنتوں کے کارواں
خاک سے رونما ہوئے خاک میں ہوگئے نہاں

کتنی حسیں عمارتیں پس کے غبار ہوگئیں
کتنی جمیل صورتیں مٹ کے مزار ہوگئیں

کتنے نجوم ٹوٹ کر فرشِ زمیں پہ آرہے
کتنے حسین و خوبرو کنجِ عدم میں جارہے

کتنے سکندروں کے سیل چڑھ کے اُتر گئے یہاں
کتنے ثمود و عاد کے راز بکھر گئے یہاں

کتنی گرج کے رہ گئیں آندھیاں انتشار کی
کتنے اُلٹ چکیں نظامِ گردشیں صبح و شام کی

فلسفہ کائنات کا مرحلۂ عظیم ہے
جنبشِ ساز و برگ بھی سانحۂ عظیم ہے

محشر سوز و ساز ہے آئینۂ شش جہات کا
سہل نہیں نگاہ پر درک صفات و ذات کا

سینۂ مرز و بوم میں دفن ہیں راز سینکڑوں
گم ہیں سکوت زار میں صور نواز سینکڑوں

شام کی تیرہ ناکیاں مخرجِ سیلِ نور ہیں
بن کی عمیق پستیاں رشکِ سوادِ طور ہیں

درخورِ آفتاب ہے ذرۂ کم سواد بھی
لائقِ استناد ہے مور کا اجتہاد بھی

شمع فسردہ ہے ہر اک محشرِ ضو لئے ہوئے
ہر گل نودمیدہ ہے جنّتِ نَو لئے ہوئے

کہنہ و ریختہ کھنڈر محفلِ ہفت رنگ ہیں
سہمے ہوئے فناکدے جلوہ نگارِ جنگ ہیں

آتش و آب و خاک میں جوشِ نمو پذیر ہے
ایک تغیّرِ عظیم سب میں بشان گیر ہے

زندگی دے رہی ہے خود آج ثبوتِ زندگی
تیرے بہشت زار میں اُف یہ سکوتِ زندگی!

خواہشِ جنگ و ذکر ہے۔ غایتِ زندگی نہیں
"عیش و نشاط" معنیٔ آیتِ زندگی نہیں

زندگی ایک جذبۂ عزم و عمل کا نام ہے
عزم و عمل پہ جنّتِ خواب و سکوں حرام ہے

زندگی کوہسار کی چوٹیوں پر علم گشا
زندگی زیرِ خاک ہے موت سے جنگ آزما

زندگی کو دوام ہے تیر و تبر کی چھاؤں میں
زندگی شاد کام ہے شعلہ فشاں فضاؤں میں

زندگی کے لوازمات آگ کی وادیوں میں ڈھونڈ
زندگی رعد و برق کی تند منادیوں میں ڈھونڈ

عارضی زندگی کے اس کسل و جمود پر نہ جا
غایتِ زندگی سمجھ۔ رنگ و نمود پر نہ جا

اپنے زجاجِ قلب کو اُٹھ کے حریفِ سنگ کر
سامریانِ وقت کی شام و سحر پہ جنگ کر

پیشِ نظر نہ ہوں اگر ٹھوس مقاصدِ حیات
نقشِ خرد بھی بے ثبات۔ نقشِ جنوں بھی بے ثبات

عبداللہ مضطر گجراتی

تشنگیٔ حیات

رسے مو نہ صرف یہ کہ ایک عالم کا بیٹا تھا بلکہ وہ خود بھی بہت بڑا عالم تھا۔ اُسے مارگاریٹ نامی ایک لڑکی سے ایامِ طفولیت ہی سے محبت تھی اور اب اسکے ساتھ اسکی شادی ہونا بھی قرار پا چکی تھی ——— مارگاریٹ بھی بجان و دل اس پر فریفتہ تھی اور اس کی علمیت قابلیت پر بہت فخر کرتی تھی۔ اگرچہ وہ مذہبیات کی ابجد سے بھی واقف نہ تھی۔

رسے مو اپنی محبوبہ کے عدیم النظیر حسن و جمال پر بے اندازہ فخر و مسرت محسوس کرتا تھا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ایسی حسین و جمیل دوشیزہ پیرس کے گلی کوچوں میں شاذونادر ہی نظر پڑتی تھی۔

بدقسمتی سے رسے مو صرف مذہبیات ہی کا عالم نہیں تھا بلکہ وہ فنِ کیمیا اور سحر کا ماہر ہونے کے علاوہ سائنس اور نجوم و رمل کا بھی زبردست عامل و عالم تھا ——— اب وہ "سنگ اسرار نما" کی جستجو اور حیاتِ غیر فانی کے حصول کی غرض سے "آبِ حیات" کی سعی ایجاد میں شب و روز منہمک رہنے لگا۔

مارگاریٹ کے چچا اور معلم و سرپرست شہر کے ایک گرجے میں پادری تھے۔ وہ رسے مو کے ان تمام غیر ممکن الحصول مقاصد اور ناقابلِ کامیابی امور کا "دیوانگی محض" کہہ کر مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔

ایک روز رسے مو اسرارِ فطرت کے موضوع پر ایک نئی شائع شدہ کتاب کو بآواز بلند پڑھ رہا تھا۔ مارگاریٹ کے چچا اُسے سن کر آتش زیر پا ہو گئے اور انہوں نے اپنے دل میں اسی وقت اس جادوگر سے تمام تر تعلقات منقطع کر لینے کا فیصلہ کر لیا اور گھر واپس آکر مارگاریٹ سے کہہ دیا:۔

"اب تم رسے مو کا خیال دل سے نکال ڈالو اور اس سے رسم و راہ اور ملاقات بھی ختم کر دو۔"

مارگاریٹ نے جواب دیا:۔ صرف ایک بار ملنے کی اجازت چاہتی ہوں چچا!

انہوں نے اوّلاً اس بات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا مگر پھر اُن کے عمیق تعلق کے پیشِ نظر اُس کو اجازت دے دی۔

چنانچہ دونوں میں آخری ملاقات ہوئی۔

مارگاریٹ کا خیال تھا کہ رسے مو کا دل اُس کے ہاتھ میں ہے۔ بیک جنبشِ لب وہ اپنے تمام علمی و عملی مشاغل اُس کے قدموں پر نثار کر دے گا۔ اسی لئے اُس نے اعتماد و یقینِ کامل کے ساتھ کہا:۔

"پیارے! یہ اپنے موجودہ مشاغل تم کو چھوڑنے ہی پڑیں گے ورنہ ہم لوگ خوش نہیں رہ سکیں گے۔"

رسے مو نے جواب دیا:۔

"علم کے بغیر سکون و راحت کہاں ہے؟"

مارگاریٹ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ اُس نے پھر کہا:۔

"مسرت کے لئے علم کی ضرورت ہی کیا ہے اور اُسے حاصل کر کے تمہیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

رسے مو بولا: "کیا تم نہیں جانتی ہو کہ میں نے ایک عظیم الشان کام شروع کر رکھا ہے؟"

معصوم دوشیزہ نے جواب دیا:۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے چچا ان موضوعات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور ان کے متعلقات پر کوئی علم بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی جگہ مسرور و مطمئن ہیں ——— خدا ان کو عمر طویل عطا فرمائے۔"

رسے مو نے کہا:۔

"او نہ عمر طویل ——— اگر ایک روز مرنا لازمی ہے تو عمر طویل سے کیا حاصل؟"

"لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ . . . . ."

"تمہیں یہی معلوم ہوتا ہے نا کہ میں موت سے یکسر آزاد ہو نگا؟ "فنا" کو دنیا کے لئے ایک مہمل و لایعنی لفظ بنا کر چھوڑوں گا۔ انسانوں کو بقائے دوام میرے ہی ہاتھوں نصیب ہوگی اس لئے کہ یہی میرا مقصدِ حیات ہے۔"

مارگاریٹ ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے ہوش و حواس اور فہم و ادراک سے تہی داماں سمجھنے میں پس و پیش کرنے لگی۔ کیونکہ وہ اس سے بے حد محبت کرتی تھی۔

رسے مو مضطرب سا ہو گیا وہ سوچنے لگا کہ ——— سائنس کے ساتھ وہ کس قدر زبردست جد و جہد میں مصروف ہے۔ چراغ کی تمثالی بھری روشنی کے سامنے بیٹھے

کتنی راتیں بیدار رہ کر گذاری ہیں۔ اسرارِ فطرت کی تلاش و جستجو میں وہ کب سے بھٹک رہا ہے سرگرداں،

مارگاریٹ بولی: "اور ہم لوگوں کی شادی"؟

"کیا اس کے لئے ہم انتظار نہیں کر سکتے ہمارے سامنے تو ایک لامحدود زندگی پڑی ہوئی ہے"۔

مارگاریٹ نے مسکرا کر آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر طنزاً کہا: "وہیں نا؟"

اس وقت مارگاریٹ صرف اتنا ہی سمجھ سکی کہ اس کا سکونِ حیات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ وہ رونے لگی اور پھر بولی:-

"اچھا تو کہو اب کیا کرنا چاہئے"

رستے مو نے جواب دیا:-

"وعدہ کرو کہ میرے علاوہ تم کسی دوسرے کی نہ ہوگی"

"اچھا میں وعدہ کرتی ہوں"

"میری منتظر رہوگی!"

"ہاں"

"تا حیات"

"ہاں! کم از کم ایک طویل مدت تک"

اب میں کسی علیحدہ کمرہ میں تنہا رہ کر اپنا کام کر سکونگا۔ اب شاید مجھے کئی سال تک آگ کی بھٹی کے سامنے بیٹھا رہنا پڑے گا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی میں اپنے امتحان میں کامیاب ہونگا اور اسکے بعد تمہارے پاس آؤنگا۔ پھر ہم دونوں ایک غیر فانی سکون و راحت کی زندگی گذار سکیں گے"

یہ سُن کر مارگاریٹ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں تبسم رقص کرنے لگا۔

"کون جانے کہ وہ دن کب آئیگا۔ ممکن ہے اس وقت تک ہم سے دورِ شباب بھی رخصت ہو جائے"

"کیا پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ جب زندگی غیر فانی ہو جائیگی تو جوانی بھی غیر فانی ہوگی"

"اچھا تو جاؤ تمہارے یہ عمل میرے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ میں صرف اتنا ہی سمجھ رہی ہوں کہ میری قسمت پھوٹ گئی ہے۔ خیر تم جلد واپس آنا ——— لیکن بہر حال تم جلد واپس آؤ یا دیر میں، یہ یقین رکھو کہ میں تمہاری ہوں اور تمہاری ہی ہونگی"

اس کے بعد دونوں میں جدائی ہو کر باہمی ملاقات کا سلسلہ ختم ہو گیا ——— ایک طویل عرصہ تک سائنٹیفک تجربات کی تکمیل کے لئے، اور پھر دوران تجربہ میں مختلف قسم کے لوازمات عمل فراہم کرنے کے لئے رستے مو نے زمین کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک سفر کیا۔ اور پھر پیرس آکر ایک غیر آباد کوچہ میں ایک مختصر سا مکان کرایہ پر لیکر رہنے لگا۔ اس کے ایک کمرہ کو اس نے دار العمل بنا لیا۔ وہ قدیم کتابوں کے ڈھیر، پارچمینٹ پیپر اور بے شمار سائنٹیفک آلات سے نشست روز گھرا ہوا رہ کر نہایت استقلال و پامردی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اسکی ایک خادمہ تھی جو اپنی خواہش و مرضی کے مطابق اس کی بھوک پیاس کا خیال رکھتی تھی ——— وہ صرف بند دروازہ کھٹکھٹا کر انتظار کر سکتی تھی۔ کمرہ میں داخل ہونے کی اسکو اجازت نہ تھی۔

اس طرح اس نے متعدد سال تک تنہائی میں رہ کر وقت گذار دیا۔ نہ اُسے یہ معلوم تھا کہ اس کمرہ میں ریاضت کشی کو کتنا زمانہ گذر گیا ہے اور نہ یہ پتہ تھا کہ اب اسکی عمر کیا ہے؟

اس عجیب زندگی میں کتنی تکالیف و مصائب اور شکوک و ناامیدی سے اس کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ کون بتا سکتا ہے؟

بالآخر ایک روز اسکی خواہش پوری ہوئی اور اس کی سعی و محنت بار آور ہو کر رہی۔ وہ ایک ایسے عرق کا موجد بننے میں کامیاب ہو گیا جس کو یقیناً آبِ حیات کہا جا سکتا ہے اور آبِ حیات بھی اتنا غیر مشکوک کہ اس کا تجربہ اُس نے اپنے جسم پر کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی ——— اس سے پہلے اُس نے جانوروں پر بھی تجربات کئے تھے مگر کوئی بھی تجربہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا تھا۔ وہ اکثر جب کسی کے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا تو اسکو موت اپنے آغوش میں لے لیتی تھی مگر اب کوئی شک باقی نہ رہا تھا۔ زندگی کا آغاز و انجام کہاں ہے؟ ——— وہ اس راز کی دریافت میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب موت کے مقابلہ میں اُس کی حیثیت فاتحانہ تھی۔

اس ایجاد کردہ "آبِ حیات" کو پیتے ہی اُس نے اپنے جسم میں جوش و ولولہ اور طاقت و قوت کو یقینی طور پر محسوس کیا۔ وہ کافی عرصہ تک سعی و جانفشانی کی وجہ سے خود کو تھکا محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ اسکا سر بار بار دوش کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہو جاتا تھا لیکن اب بے پناہ گرم اور تازہ خون اسکو اپنی رگوں میں دوڑتا معلوم ہوتا تھا۔ عالمِ فرطِ مسرت میں اس نے [illegible] "ماضی زندہ باد" کا نعرہ بلند کر

لیکن شدّتِ مسرت نے اسکے جسم میں ایک لرزش سی پیدا کردی اور ایسی حالت میں اسکے ہاتھ سے آبِ حیات کی شیشی نیچے گر کر ٹوٹ گئی۔ وہ بڑی تیزی سے دیوانہ وار ٹوٹی ہوئی شیشی پر جھپٹا۔ قریب کی روشن بھٹی کی نیلگوں چمک میں اُس نے دیکھا کہ ٹوٹی ہوئی شیشی میں آبِ حیات کا صرف ایک قطرہ باقی ہے۔

"ایک بوند ـــــ صرف ایک بوند ـــــ یہ بوند مارگاریٹ کے لئے ہے اب دُنیا ختم ہو جائے۔ ہمیں اسکی کوئی پروا نہیں۔ ہمارے لئے تو غیر فانی زندگی یقینی ہو چکی ہے۔

یہ کہہ کر وہ مکان سے باہر نکل پڑا اور پاگلوں کی طرح سڑکیں طے کرتا ہوا، شہر سے گذر کر مارگاریٹ کے چچا ـــــ یعنی اس گرجے کے بڈھے پادری کے مکان تک دوڑا ہوا گیا۔

ان کی جستجو کرنے پر وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ ان کے انتقال کو تیس برس گذر چکے ہیں۔

"اچھا ـــــ لیکن مارگاریٹ"

اس سے ملنے میں بڑی دشواری پیش آئی کیونکہ اس محلے میں اس سے کوئی واقف نہ تھا ایک ضعیفہ نے صرف اتنا بتلایا کہ وہ مارگاریٹ نام کی ایک دوشیزہ سے پہلے واقف تھی اب اس کے ذہن میں اُس کا ایک دھندلا سا عکس باقی رہ گیا ہے

یہ ضعیفہ مارگاریٹ کی جستجو میں رستے مو کی معاونت پر آمادہ ہو گئی ـــــ اگر یہ رستے مو کی معاون نہ بنتی تو مارگاریٹ تک اس کی رسائی ناممکن تھی

وہ بڑھیا کی رہنمائی میں سڑک پر کچھ دور چل کر ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان کے سامنے رک گیا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی مارگاریٹ کا نام سُن کر کسی نے اندر سے جواب دیا:-

"یہاں نہیں جی!"

رستے مو گھر میں داخل ہو گیا اور چاروں طرف مضطربانہ دیکھتا ہوا پکارنے لگا۔

"مارگاریٹ جینبر! ـــــ مارگاریٹ جینبر!"

ایک زرد رو، ضعیف و ناتواں اور نحیف الجثہ بڑھیا آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی کانپتی ہوئی بدقت تمام اُٹھی اور کہنے لگی:-

"مارگاریٹ جینبر تو شاید میں ہی ہوں!"

"تم بڑھیا! کیا تم پاگل ہو گئی ہو! میں مارگاریٹ کی جستجو میں ہوں، وہ حسین ہے، خوبصورت ہے ـــــ جوان ہے ـــــ اُس کے بال سُنہرے ہیں۔ اُس کے لب سُرخ ہیں"

اس کے بعد دیوار پر آویزاں ایک بڑی بڑی آنکھوں والی حسینہ کی تصویر دیکھ کر "یہی ہے میری مارگاریٹ ـــــ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اسی نے مجھ سے انتظار کا وعدہ کیا تھا"

مارگاریٹ نے ابتداءً تصویر پر ایک یاس آگیں اور حسرت خیز نظر ڈالی اور پھر اُس کے چہرہ پر ایک غم آمیز تبسم کی لہر دوڑ گئی۔

"میں وہی ہوں ـــــ میں تمہیں دھوکا نہیں دے رہی ہوں ـــــ میں اُس وقت سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں ـــــ مگر تم نے بہت دیر کر دی۔ تمہارے آنے سے پیشتر ظالم و بے رحم زمانہ نے آکر میرے اس خوبصورت چہرہ کو اس بھدی شکل میں بدل ڈالا"

"تم ہی مارگاریٹ ہو ـــــ تمہاری یہ حالت ہے"

بڑھیا کے چہرہ پر اب بھی وہی یاس آمیز تبسم کھیل رہا تھا۔

"لیکن رستے مو تم کیا سوچ رہے ہو ـــــ کیا تم میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا، ذرا ایکبار اپنے چہرہ کو آئینہ میں دیکھو تو سہی میرے دوست!"

یہ کہہ کر مارگاریٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر آئینہ کے سامنے لے گئی۔

رستے مو آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھا ـــــ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا وہ ایک جوانی کے عالم میں سویا تھا اور اب سُست بڑھاپے کے عالم میں بیدار ہوا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"کیا میری شبانہ روز ریاضت و محنت کا یہی نتیجہ ہے"

"نہیں دوست! ـــــ یہ تو اقتضائے عمر ہے!"

"اچھا یہ بتاؤ ہماری آخری ملاقات کو کتنی مدت گذر چکی ہے!"

"تقریباً نصف صدی"

رستے مو دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا ـــــ "اوہ نصف صدی ـــــ کیا یہ ممکن ہے؟"

اُس کے دل میں وقتی طور پر جذبۂ یاس پیدا ہوا ـــــ لیکن وہ فوراً ہی ایکدم کھڑا ہو گیا ـــــ اسکی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی۔ وہ کہنے لگا۔

"جو شخص حیاتِ ابدی کا مالک ہے اسکے لئے نصف صدی کوئی اہمیت نہیں رکھتی!"

یہ کہہ کر اس نے اپنی اُنگلی میں سے ایک سونے کی انگوٹھی نکالی جس کے نگینہ میں آبِ حیات کا ایک قطرہ موجود تھا ـــــ اُس نے انگوٹھی مارگاریٹ کے ہاتھ

میں دیدی اور بولا:-

"پی لو، اسے پی لو ــــ میں تمھیں غیر فانی بنا رہا ہوں"۔

مارگاریٹ نے انگوٹھی ایک طرف رکھدی اور قمیص پھاڑ کر اپنا بے گوشت و پوست سینہ دکھلایا۔

رستے مو چونک پڑا۔ مارگاریٹ نے کہا:-

"خداوند عالم ہر ایک موسم بہار میں کائنات کو کس طرح نئی جوانی سے آراستہ کرتے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ تمہاری طرح علم و قابلیت مجھ میں نہیں ہے مگر میں بیوقوف بھی نہیں ــــ یہ جسم تو استخوان و گوشت کا ایک مجموعہ ہے اسے کبھی نہ کبھی فنا ہونا ہی چاہئے ــــ صرف روح ہی غیر فانی ہے۔ خدا نے روح ہی کو حیاتِ ابدی کا مالک بنایا ہے۔ اس موضوع پر میرے چچا جو کچھ کہتے تھے بالکل درست تھا تم نے فضول وقت برباد کیا ہے"۔

"خیر ــــ بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ ــــ اگر تم مجھ سے پیشتر ہی کہتیں تو ....."

اتنا کہہ کر رستے مو نے انگوٹھی نیچے گرا دی اور اسے پاؤں سے کچل ڈالا ــــ

"آبِ حیات کی وہ بوند بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی اور "کائنات" ہست و نیست کے اسرار کی بنیادوں میں اپنی قوتِ حیات واپس کر کے آغوشِ فنا میں پہنچ گئی

ایک سال بعد رستے مو نے سنا کہ مارگاریٹ فوت ہو گئی ــــ وہ نہایت عقیدت و محبت کیا تھا اس کے کفن دفن میں شریک رہا۔ اسکے بعد ایک بے یار و مددگار، محروم محبت و دوستی، اور شکاری کے قبضہ میں آئے ہوئے مظلوم پرندکی طرح تنگ قفس میں سرگراں رہنے لگا ــــ امید، تمنا، اور راحت ــــ یہ سب اسکی زندگی سے رخصت ہو چکے تھے ــــ اور اب تا حدِ نظر و خیال اس کی دنیا میں ایک بھیانک اور عمیق مایوسی و ویرانگی مسلط ہو گئی تھی ــــ اس طرح وہ اپنے ایامِ زندگی پورے کر رہا تھا۔

روح اور جسم کا تعلق اسکو اب ایک ناقابلِ برداشت بار محسوس ہو رہا تھا۔ اسکا دل "ہنوز بین" کا درجہ حاصل کر چکا تھا ــــ وہ اب لذتِ غم سے بھی محروم تھا ــــ زخم خوردہ قلب، یاس زدہ روح، افسردہ دماغ اور ضعیف و ناتواں جسم کو لئے ہوئے آج وہ دیکھ رہا تھا کہ حصولِ سکون کے لئے اب اسے ایک تنکے کا سہارا بھی میسر نہیں ہے۔ ایک لامحدود زندگی اسکے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ ایک کے بعد ایک دن آ جا رہا

تھے۔ سکون و قیام کے بغیر ان کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

اب اس کے دل کو تقویت دینے والا کون ہے! ــــ اب کون اسے تسلی دیگا؟ کس کی خاطر وہ ان تمام مصائب کو انگیز کریگا ــــ اب اسے زندگی کی کیا ضرورت ہے؟ ــــ اس محصور و مقید اور تاریک و خوفناک زندگی کے بھیانک ویرانے میں اس نے موت کو پکارا ــــ لیکن اس کے مایوس دل کی آواز موت کے لئے بھی قابلِ سماعت ثابت نہ ہوئی ــــ جو موت کمزور اور طاقتور سب کے لئے ہے جس کا دروازہ ہر ایک ذی حیات کے لئے کبھی نہ کبھی وا ہونا یقینی ہے جہاں انسان کے تمام مصائب و تکالیف کا خاتمہ ہو جاتا ہے جس کے اس پار سکون و محبت کی روشن و منور حکومت ہے ــــ وہی موت آج رستے مو کی دعوت پر لبیک نہ کہہ سکی۔

آج وہ ایک غیر معلوم اور نئی مصیبت کے راز سے واقف ہو گیا تھا کیونکہ اس کا دکھ عام انسانوں کے دکھوں سے جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے نزدیک سب ہی لوگ بچے تھے اور ان بچوں کے نزدیک اس کی حقیقت ایک بوڑھے پاگل سے زیادہ نہ تھی۔ جب وہ عالمانہ باتیں کرتا تو راہ چلتے لوگ کھڑے ہو جاتے۔ ان کو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی دوسری دنیا کا باشندہ ہے۔ وہ اس سے کہتے:-

"بوڑھے انسان! ــــ تمہارا وقت پورا ہو چکا۔ اب تم دوسروں کے لئے جگہ خالی کر کے بھاگ نکلو"۔

ایک روز بوڑھا رستے مو باغی ہو کر سائنس کے عیوب و نقصانات پر تقریر کرنے لگا۔ اور ثبوت کے طور پر اس نے اپنی زندگی اور تجربات پیش کئے۔ لوگوں میں اسکے خلاف ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا۔ پولیس نے گرفتار کر کے اسے پاگل خانہ میں بند کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد خاموش اور بے ضرر پاگل سمجھ کر رہا کر دیا گیا۔

لیکن پاگل خانہ سے نجات پا کر وہ کیا کرے؟ ــــ اس نے از سرِ نو اپنے دار العمل میں کام شروع کر دیا وہ بارہ سال تک ــــ آبِ حیات نہیں بلکہ اس کے برعکس زہر کی ایجاد میں مشغول رہا اس نے ہزاروں قسم کے زہر تیار کئے ــــ کوئی زود اثر اور کوئی دیر اثر ــــ اس کے ایجاد کردہ تمام مہلک زہر ڈاکٹروں کے کام آنے لگے۔ لیکن خود اس پر کسی نے کامیاب اثر نہ ڈالا ــــ بالآخر اسکی سمجھ میں یہ بات آئی کہ جو زہر عام انسانوں کی ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے، وہ میرے لئے سودمند نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میرے لئے وہی زہر قاتل ثابت ہو سکتا ہے جو عام انسانوں کے لئے

باعثِ حیات ہے۔

اب وہ اپنی ذات پر ایک زہر کا تجربہ کرکے سخت قسم کی تکالیف میں مبتلا ہوگیا تھا۔ ہر چند کہ اس کے جسم نے موت سے نجات حاصل کرلی تھی۔ لیکن تکالیف و مصائب سے اُسے چھٹکارہ نہ ملا تھا۔ دُکھ درد کی وجہ سے اس کا جسم ٹیڑھا ٹیڑھا ہو جاتا تھا۔ اسکے کراہنے کی آواز دُور سے سُنائی دیتی تھی ——— لیکن پھر ہر دفعہ لحظہ تکلیف گذر جانے پر اسکی زندگی کی مشین تیزی سے چلنے لگتی تھی ——— بالآخر وہ مایوس ہوگیا۔

اس حالت سے پیشتر وہ ایک عظیم الشان ماہر سائنس کی بہت کچھ تعریف سُن چکا تھا۔ اب مجبوراً اُس نے اُس کی طرف رجوع کرنے کا قصد کیا۔ مگر جب یہ وہاں پہنچا تو ضعیف العمر سائنسداں بسترِ مرگ پر دراز تھا۔

رسّے مو اجازت پاکر گھر میں داخل ہوا۔ آنے والے کے چہرہ پر کوئی انسانی علامت نہ پاکر گھر کی عورتیں اور بچے خوفزدہ ہوگئے۔ رسّے مو نے سائنسداں کے پاس پہنچکر کہا:-

"میرا علاج کیجئے!"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں موت کا خواہشمند ہوں!"

"کل طلوعِ آفتاب سے پیشتر آنا، میں تم سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میری زندگی ختم ہو رہی ہے موت میرے قریب تر ہے"

"اسکی وجہ سے آپ کو کوئی افسوس تو نہیں؟"

میرا کام ختم ہوچکا ہے"

دوسرے روز رسّے مو نے جاکر دیکھا کہ بوڑھا باپ سائنسداں بالکل قریب المرگ ہے۔ شدتِ درد سے بیتاب ہو رہا ہے تاہم اُس نے پوری قوت سے اُٹھکر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:-

کل سے میں اس امر پر غور کر رہا ہوں۔ سینکڑوں نتائج اخذ کئے ہیں لیکن میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔ خالق کی مرضی یہی ہے تمہیں تاابد زندہ رہنا پڑے گا ——— لیکن تم ناامید نہ ہو، میری بات آخر تک سُن لو جو کام ایک آدمی انجام نہیں دے سکتا وہ کئی آدمیوں کے ذریعہ انجام پذیر ہو سکتا ہے سائنس ایک آدمی، ایک پشت، یا صرف ایک زمانہ کے لئے نہیں ہے۔ میری تمام کتابوں کو پڑھکر تم حقیقت کا صرف ایک جزو پا سکوگے ——— میں نے عوام کے فلاح و بہبود کے لئے ہی کوشش کی تھی، اس لئے کچھ مفاد حاصل کر سکا ہوں۔ تم میرے زمانہ سے پیشتر کی تصنیف شدہ کتابوں کا مطالعہ کرو اور میری موت کے بعد جتنی تصانیف ہوں ان کو بھی دیکھنا اور تم بذاتِ خود بھی تجربات میں مصروف رہنا ——— اگر خوش قسمتی سے تم کبھی عوام کی فلاح کے کاموں کو آگے بڑھا سکے تو تم پر "صداقتِ عظمیٰ" ظاہر ہوگی"

رسّے مو نے کہا:- کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ابتک خاموش بیٹھا رہا ہوں؟"

"ہاں تم نے اپنی ذات کے لئے جدوجہد کی ہے عوام کے مفاد کی خاطر کچھ نہیں کیا۔ اس لئے اسکا کوئی بہتر نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اگر تم مخلوق کی بھلائی کے لئے کوشش کرتے تو اپنی محنت کی مناسب قیمت حاصل کر لیتے"

یہ کہتے کہتے بوڑھے سائنسداں کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ اسکے اعزا اور اقارب جو اس سے محبت کرتے تھے، رونے لگے۔

یہاں رسّے مو کو کسی قدر سکون ضرور ملا، مگر نتیجتاً اداس اور بے چین ہی واپس آنا پڑا۔ اسے ابھی ایک غیر معلوم مدت تک مصائب برداشت کرنے پڑیں گے

مگر اب اس کا دل پُرامید تھا۔ مرحوم سائنسداں کی آخری گفتگو اس کے لئے مطمئن کن ثابت ہوئی۔ وہ اب زندگی کے آخری دور کا یقین و توقع کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔

لیکن اسکے آنے میں ابھی بہت دیر ہے۔ ابھی اسے بہت عرصہ تک کام کرنا پڑیگا وہ اپنی تمام تر تمناؤں کے ساتھ عالمگیر مفاد سے تعلق رکھنے والے سائنس کے کاموں میں منہمک ہوگیا۔ علمائے قدیم نے سائنس کے کشت زار میں جو بیج بویا تھا۔ اپنی انتھک مساعیٔ جمیلہ کی بدولت ایک مقدس و سعید لمحہ میں اس بیج کو بارآور دیکھ کر وہ بے ساختہ پکار اُٹھا۔

"تاریکی دُور ہوگئی ——— اب روشنی کا ظہور ہے"

اتنی طویل مدت کے بعد اُس نے زندگی کے نعم البدل کے طور پر موت پائی ——— وہ اپنے سنگِ قبر پر ذیل کی عبارت کندہ کر دینے کی وصیت کرکے مرگیا:-

"روشنی جس طرح تاریکی کو ختم کر دیتی ہے، علم اُسی طرح برائیوں کو دُور کرتا ہے۔ انسان اسرارِ فطرت کی تلاش و جستجو میں نہیں، بلکہ فرضِ عبدیت کی ادائیگی اور پرستشِ معبود ہی میں قربِ خداوندی حاصل کرتا ہے ——— اور روح دنیوی تعلقات، لاعلمی اور توہمات سے نجات پاکر اس مقدس و عظیم عالم میں پہنچ جاتی ہے جو غیر منتہی ہے"

(فرانسیسی از مصنف:- یوجین مرے)

ترجمہ
امتیاز نسیمی

جامِ مینائی

کافرِ عشق بتِ دشمنِ ایماں ہم ہیں
کفر کو ناز ہے ہم پر وہ مسلماں ہم ہیں
تم نہیں عہد شکن کہتے تو ہیں ہاں ہم ہیں
تم نے کی وعدہ خلافی تو پشیماں ہم ہیں
تیری بخشش کی کوئی حد نہیں دینے والے
دونوں ہاتھوں سے سنبھالی ہوئی داماں ہم ہیں
آہ یہ کہہ کے نکلتی ہے دلِ پُرغم سے
ایک افسانۂ غم کا عنواں ہم ہیں
بال بکھرائے ہوئے کون اِدھر سے نکلا
دیر سے سوچ میں بیٹھے ہیں پریشاں ہم ہیں
وہ تھا انساں جسے سجدہ ملائک نے کیا
شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے انساں ہم ہیں
کچھ گلہ ہم کو نہیں خون کا دعوےٰ کیسا
اپنے قاتل پہ سرِ حشر بھی قرباں ہم ہیں
ہم بھی کافر ہیں جو ہے وہ بتِ کافر کافر
وہ مسلمان اگر ہے تو مسلماں ہم ہیں
دیکھنا ہے جگر انجامِ محبت کیا ہو
یار ہے کافرِ بدکیش مسلماں ہم ہیں

جگر مینائی بسوانی

تیرے کہنے سے

زندگیٔ گذراں کا ہے یہ عالم تیرے کہنے سے
عینِ سکونِ دل ہے سوزِ پیہم تیرے کہنے سے
آنکھیں سوزاں، دردِ جگر ہیں، دل افسردہ افسردہ
ہے دُنیائے محبت برہم برہم تیرے کہنے سے
کیف نہیں ہے دن ہیں باقی راتیں ویراں ویراں ہیں
صبحِ مسرت ہو گئی شامِ پُرغم تیرے کہنے سے
خوابیدہ جذبات، اُمنگیں افسردہ، دل آزردہ
میری جوانی ہے خوشیوں کا ماتم تیرے کہنے سے
تیرا اشارہ پاتے ہی بڑھ جاتی ہے دل کی بیتابی
دردِ جگر ہونے لگتا ہے کم کم تیرے کہنے سے
سوزشِ دل جب بڑھتی ہے آنسو بھی ٹپکنے لگتے ہیں
شعلہ و شبنم ہو جاتے ہیں باہم تیرے کہنے سے
تیری توجہ سے ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے
نشتر اکثر بن جاتا ہے مرہم تیرے کہنے سے
اپنی تباہی پر بھی اکثر تیرے لیے ہنس پڑتا ہوں
خشک شدہ آنکھیں ہو جاتی ہیں نم تیرے کہنے سے
دل کا سکوں آنکھوں کی نیند آرام جوانی لطفِ حیات
یاور نے کیا کیا کھو یا لے شبنم تیرے کہنے سے

یاور بخاری

"ش" اور "ش"

اس مضمون کا عنوان "دو شین" دیکھ کر عام طور سے لوگ "شعر و شاعری" "شیب اور شباب"۔ "شاعر اور شاہد"۔ "شباب اور شہاب"۔ "شاعر اور شادی"۔ "شعر اور شراب"۔ غرض جانے کیا کیا خیال آرائی اور طبع آزمائی کرینگے۔ اس لئے کہ آجکل لوگ بالعموم ایسے ہی عنوانات پر مضامین لکھا کرتے ہیں۔ مگر میں قارئین کو اُلجھانا نہیں چاہتا۔ درحقیقت اس مخفف سرخی کا مکمل عنوان ہے:-

"شاد اور شراب"

اور شاد سے مراد شاد عظیم آبادی ہیں۔ ابجد کے قاعدے پر "شاد" کے اعداد (۳۰۵) آتے ہیں اور "شراب" کے (۵۰۳) گویا اس حساب سے جس طرح "شاد" اور "شراب" کا ابتدائی حرف ایک ہے۔ اسی طرح اُن کے اعداد کے اشکال بھی باہم مماثل ہیں اور اگر ان دونوں کو باہم ممزوج کر دیجئے تو ان کی مجموعی تعداد ہر حال میں ایک ہی آئیگی (۸۰۸) یعنی وہی "ش اور ش"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "شاد" اور "شراب" باہم شیر و شکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عربی شاعری میں ابو نواس، فارسی شاعری میں حافظ اور اُردو شاعری میں ریاض نے "شراب" کی وہ بھٹی بہائی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ان کے دواوین دیکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب انھوں نے اس عنوان پر اور کسی کے لکھنے کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے مگر اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ ان ہر سہ زبانوں کے تقریباً ہر شاعر کے قلم سے کاغذ کی سادہ بساط پر رنگین شراب ضرور ٹپکی ہے۔ ایسا ہونا بھی ناگزیر ہی تھا۔

اُردو شاعری چونکہ فارسی شاعری کا چربہ ہے جہاں ادب کے ساتھ شراب کا تعلق عربوں کے آنے سے ہزاروں برس پہلے ہو چکا تھا "ژند" جو ایرانیوں کے زردشتی مذہب کا بہت گراں قدر صحیفہ ہے، شراب ہی کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ جب "زردشت"[1] کا انتقال ہو گیا اور اسکے متبعین و مقلدین کو اسکے احکام منضبط طور پر نہ مل سکے تو انھیں بہت ہی پریشانی ہوئی اور انھوں نے خود زردشت کے اس قول کے پیش نظر کہ، حالت سکر میں ذہن سے نکلی ہوئی تمام باتیں دوبارہ آجاتی ہیں، اُن تمام ارباب صحبت کو اکٹھا کیا جنھیں بارگاہ زردشت میں زیادہ سے زیادہ رسوخ حاصل تھا۔ جب سب اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے سبھوں کو خوب شراب پلائی یہانتک کہ جب سب کے سب مست ہو گئے تو ان سے زردشت کے احکامات کے متعلق پوچھا گیا چنانچہ اُدھر سبھوں نے اپنی اپنی واقفیت کا اظہار شروع کیا اور اِدھر انھیں منضبط کیا جانے لگا۔ یہانتک کہ جن جن مسائل پر تمام صحبت یافتہ زردشت نشہ بازوں کا اتفاق ہوا انھیں یکجا کر کے کتاب "ژند" مرتب کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت سے ایران میں ادب کے ساتھ عربوں سے بہت پہلے شراب کا گہرا تعلق ہو چکا تھا پھر جب وہاں عرب پہنچے اور اُن کے ساتھ ایک لیے بناؤ اور شراب میں شراور سرمایۂ شعر پہنچا تو شراب نے ادب پر اور بھی اپنا گہرا رنگ جمایا۔ یہانتک کہ جس وقت عباسی خلفا کا دور ہوا ہے شراب اور شعر کا باہم کچھ اس طرح تعلق ہو چکا تھا کہ کوئی شاعر شراب کے بغیر شعر کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر اس کے بعد اس شعر و شراب نے گھل مل کر ایران میں جو سرمستیاں رنگینیاں اور رنگ رلیاں مچائی ہیں ان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ سعدی و جامی کے سے صوفی پاکباز بھی اس سے دامن کش نہ رہ سکے نہ صرف اتنا ہی بلکہ انھوں نے ایران و ہندوستان کو ایک کر ڈالا۔ پھر اُردو شاعری اُس سے کب محفوظ رہ سکتی تھی؟ یہاں بھی شعر و ادب نے پہنچکر ہر رنگین مزاج کو اپنا لیا۔ ایسی صورت میں بیچارے شاد عظیم آبادی اپنا دامن کیسے بچا سکتے تھے یہ بھی اس سمندر میں کود پڑے اور خوب خوب نہائے۔ یہ بھی اس رنگ میں ڈوبے اور خوب خوب ہولیاں کھیلیں۔

شاد کے ایک ممتاز شاگرد (جناب اختر کاکوروی) نے "شاد کا رنگ تغزل"

---

[1] "زردشت" اور "زرتشت" دونوں صحیح ہیں یہ آتش پرستوں کا پیغمبر مانا جاتا ہے زردشت مشہور یونانی حکیم فیثاغورث کا بہت مشہور شاگرد تھا۔ اسے منوچہر کی نسل سے بتایا جاتا ہے اس نے گشتاسپ کے زمانے میں نبوت کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ اسے بعض آتش پرست ابراہیم بھی کہتے ہیں۔ زردشتی اسکے اقوال و احکام کے مجموعہ کو جو "ژند" کے نام سے مشہور ہے۔ آسمانی صحیفہ کا سا مرتبہ دیتے ہیں —— عطاء اللہ

کے عنوان نے علی گڑھ میگزین کے "تعلیمات نمبر" میں شاد کی شاعری پر ایک گرانقدر اور بسیط مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ:-

ایک جگہ فرماتے ہیں:-

" مرے شعروں میں جلوہ شاہد معنی کا پیدا ہے
نظر آتا ہے لفظوں کا فقط ہلکا سا اک پردہ

اس لئے بادہ و ساغر، جام و مینا، خم و پیمانہ، رند و ساقی وغیرہ سے مجازی رنگ مراد نہیں بلکہ اصل حقیقت بطور استعارہ منظور ہے اور بقول غالب اسکے بغیر چارہ کار بھی نہیں"

یہ بالکل صحیح ہے کہ شاد کے یہاں یہ جوہر بھی نظر آتا ہے اور ان کے بہت سے اشعار میں اس قدیمی بدمذاقی کی رسم اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ کارفرما نظر آتی ہے مگر یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جنکو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بذاتہ شراب امڈی چلی آتی ہے۔ فی نفسہٖ نشہ چڑھا چلا آتا ہے اور یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بادہ و ساغر، جام و مینا، خم و پیمانہ اور رند و ساقی استعارتاً نہیں بلکہ اپنے اصلی معنی میں جلوہ فرما ہیں۔ اب اگر بعید حیلہ شرعی اور دور دراز کار تاویلات مذہبی کے ذریعے اسے بھی "بادہ و ساغر" کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو" ہی سمجھا اور کہا جائے تو پھر تب بھی وہی کہونگا جو نیاز نے ایک ایسے ہی خداپرست معتقدِ حافظ مضمون نگار کی ایسی ہی تاویلات کے جواب میں کہا تھا یعنی:-

"اگر حافظ نے واقعی یہ سب کچھ اسی معنی میں کہا ہے جو صاحب مضمون ظاہر کرتے ہیں تو شاید ہی حافظ سے بدتر کوئی شاعر دنیا میں پیدا ہوا ہو۔ لیکن اگر اس غریب نے الفاظ کے وہی معنی لئے ہیں جو عام ہیں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سے زیادہ حافظ کی توہین کوئی اور ہو سکتی ہے جو صاحبِ مضمون نے ان تاویلوں سے کی ہے"

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس عنوان کے بعض شعر شاد کے یہاں ایسے نظر آتے ہیں جنکا تعلق تقلید، تتبع یا نقل سے معلوم ہوتا ہے اور میں انھیں صرف میخانۂ قدیم کا فیض کہہ سکتا ہوں مثلاً

شاد

ساقی نے آنکھ بھر کے جو دیکھا رہی نہ تاب
کانپا یہ اپنا ہاتھ کہ مینا چھلک پڑا

سودا

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

شاد

یہی ٹوٹے سبو مٹی کے ہیں کافی، قناعت کر
بلوریں جام سے اے رندِ آشام کیا ہوگا

غالب

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

پلا دے ایسی تو ساقی کہ بیخودی آجائے
بلائے جاں یہی کمبخت ہوشیاری ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

زاہد اگر پلائیں وہی تجھ کو جام سے
تجھ سے تو بے پئے ہوئے ہرگز نہ بن پڑے

یقین[1]

منت سے وہ کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اسوقت قبلہ آپ کو بندہ کرے سلام
گر آپ خوف کیجئے روزِ حساب کا

مگر ساتھ ہی ساتھ ایسے اشعار بھی بہ کثرت ہیں جو نہ دوسروں کے افکار سے ماخوذ کہے جا سکتے ہیں اور نہ اُن کی کوئی تاویل کی جاسکتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے اصلی معانی و مفاد میں بہ پاکیزگی تمام نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ دیوان کے صفحے و محفل سینے پر اس ادا کے ساتھ جلوہ فرما ہیں کہ دیوان ایک تختۂ گل و گلزار ہی نہیں بلکہ ایک پُربہار بتکدہ بنا ہوا ہے اور مرے نزدیک اسکی اس بیّن خصوصیت کو نظر انداز کر دینا یا ان کی لایعنی تاویلات کرنا یا تو صرف پاکبازِ طبیعت کی افتاد کا اثر ہے یا شاد کی بیان کردہ اس معجزانہ چال کا کرشمہ کہ:-

کچھ اس طرح سے چھپائے ہوں اپنی مستی شاد
کہ میکدہ میں کسی نے نہ امتیاز کیا

بہرکیف میرا اصل مقصد اس مقام پر اس موضوع پر بحث کرنا نہیں بلکہ صرف ایک لطیف فسانہ سنانا ہے جسکا تعلق "ش اور ش" یعنی "شاد اور شراب" سے ہے اس لئے کہ اگر یہ کہانی سُنائی نہ گئی تو شاد کی اس پیشگوئی کے تحت کہ ؎

اجل سُلا دے گی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر
نہ ہم رہینگے، نہ تم رہوگے نہ شاد یہ داستاں رہے گی

یہ سینہ ہی میں رہ جائیگی، اور لوگ اس کے لطف سے بے بہرہ رہ جائینگے۔

ایک پُربہار رات میں جبکہ زہرۂ فلک اپنی نیلگوں زرنگار ساڑی میں ملبوس

---

[1] یقین کا ایک پورا قطعہ ہے جسمیں ایک زاہد سے گفتگو کا ذکر ہے۔ اس قطعہ کے آخری دو شعر یہ ہیں۔

اپنے سیاہ بالوں میں افشاں چُنے اور اپنی پُرجمال پیشانی میں چاند لگائے ہوئی محوِ خرام تھی اور ساری کائنات اس کے حسنِ درخشاں سے تکیف و مسرور ہو کر دریائے نور میں غوطے کھا رہی تھی۔ فراق زدہ، محزوں دل اور ہجر نصیب و ملول شاد اپنے ایوانِ شعر میں بڑی بیتابی کے ساتھ ٹہل رہے تھے یکایک انھیں کچھ خیال آیا اور وہ ؎

یہ سمے سنگیں دردِ فراق ہے اے شاد — جو ایک گھونٹ ہی پی لے تو دل ٹھہر جائے

گنگناتے ہوئے گھر سے نکل پڑے۔ کچھ ہی دور گئے ہونگے کہ میخانہ مل گیا۔ ادھر اُدھر نظر دوڑائی اور داخل ہوگئے۔ اندر پہنچے تو دیکھا کہ میخانہ سونا پڑا ہے۔ نہ خم ہے نہ سبو۔ نہ مینا ہے نہ پیمانہ، صرف ایک ساقی ہے جو خاموش بیٹھا ہے۔ ساقی کی نظریں میکدے میں جو شاد پر پڑی تو وہ حیرت زدہ سا ہوگیا۔ شاد تاڑ گئے کہ ساقی کیوں محوِ حیرت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ڈرے کہ ایسا نہ ہو یہ کچھ زور سے بولے یا مرا نام لے ڈالے۔ لہٰذا بڑے دلنواز انداز میں فرمانے لگے کہ:—

میں فدائے ساقیٔ سرلقا، یہی میکشی کا ہے مسئلہ
وہی حکم دے تو حلال ہے، وہی روک دے تو حرام ہے

ساقی نے مسکرا کر انھیں ایک طرف بہ تعظیم بٹھایا اور پوچھا کہ حضرت آخر کیا ارادہ ہے؟
شاد نے فوراً جواب دیا، ارادہ کیا، بس یہی خیال ہے کہ:—

لُنڈھاتے موسمِ گل میں خموں پہ خم ساقی
یہ وقت کام کا تھا کچھ تو کام کر لیتے

ساقی نے مسکرا کر اشارہ کیا کہ ٹھہرئیے سب کچھ انتظام ہو جائیگا۔ شاد باطمینان تمام بیٹھ گئے، مگر گھنٹوں گزر جانے کے بعد بھی نہ خم آیا نہ پیمانہ۔ حد یہ ہے کہ ساقی اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں، شاید وہ اور رندوں کا منتظر تھا۔ یہ رنگ دیکھکر شاد بہت گھبرائے اور بڑی بے صبری کے ساتھ فرمانے لگے:—

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوبؑ اے ساقی!
خم آئیگا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

ساقی اس والہانہ بیتابی اور سرمستانہ وارفتگی پر ہنس پڑا اور ایک ادائے خاص سے اُٹھکر اُس نے شنجرف گوں شراب سے بھرا ہوا مینا اور اُس کے ساتھ ساتھ ایک بلوریں پیمانہ لاکر رکھ دیا۔ شاد سمجھے کہ اب دور چلے گا لہٰذا مزے میں آگئے اور ساقی سے فرمانے لگے:—

نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

مگر ساقی خاموش اپنی جگہ پر بیٹھا رہا یکایک ایک اور صاحب بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے یہ دیکھکر کہ ایک رند بیٹھا ہے اور اسکے سامنے پیمانہ کے ساتھ سربمہر مینا دھرا ہوا ہے۔ شاد کو اشارہ کیا کہ بیٹھے کیا ہو دَور چلے۔ شاد نے بڑی بیچارگی سے جواب دیا:—

کوئی مینا سے قطرہ ڈھال لیں بے اذن کیا ممکن
یہ میخانہ ہے ساقی کا یہاں کیا اختیار اپنا

مگر یہ پُر حسرت منظر زیادہ دیر تک قائم نہ رہا، یکے بعد دیگرے دو چار میخوار اور پہنچ گئے جنھیں دیکھکر ساقی اپنی سادگی اور رنگینی سمیت اٹھلاتا ہوا مینا و پیمانہ کے نزدیک پہنچا اور مینا کی مہر توڑ کر گلاس اسکے منہ سے لگا دیا۔ قلقل کی آواز کانوں میں جاتے ہی شاد پھڑک اُٹھے اور بیساختہ فرمانے لگے:—

جام کی بزمِ دہان نے تو مارا تھا مجھے
جی گیا میں قلقلِ مینا تری آواز سے

سچ پوچھئے تو یہ نغمۂ قلقل بھی ایک خاص کیف رکھتا ہے جبھی تو مولانا جامی علیہ الرحمۃ اس سماں کو دیکھکر ایک مرتبہ بیساختہ پکار اُٹھے تھے کہ:—

از صراحی دو بار قلقل مے
پیش جامی بہ از چہار قل است

بہر کیف۔ ادھر ساقی نے بھرا ہوا سُرخ پیمانہ گورے گورے ہاتھ میں اٹھایا۔ ادھر شاد کو یہ خدشہ ہوا کہ ساقی کہیں یہ جام دوسرے کی طرف نہ بڑھا دے لہٰذا پرسنل ٹچ PERSONAL TOUCH کے نفسیاتی اصول کو کام میں لاکر بیساختہ پکار اُٹھے کہ:—

"نثار ہاتھ کے اور ساغرِ لبالب کے"

ساقی بھی چلتا ہوا تھا مطلب سمجھ گیا اور ایک لطیف تبسم کے ساتھ اُس نے جام شاد کی طرف بڑھا دیا۔ شاد بڑی بیتابی کے ساتھ پیالہ لیکر چڑھا گئے اور پھر منہ پونچھ اظہارِ تشکر میں فرمانے لگے:—

ہزار شکر تری اس عطا پہ اے ساقی
جو ایک جام دیا، لاکھ کیا کروڑ دیا

پھر تو دَور پہ دور چلنے لگے۔ یہاں تک کہ مینا ختم ہونے پر آیا۔ "وڈّے پُردُرد" کا آخری پیالہ پھر شاد کا حصہ قرار پایا۔ سب لوگ شاد کی طرف دیکھکر طنزاً مسکرانے لگے۔ شاد اس رندانہ گُر کو کیا سمجھ سکتے تھے وہ اس مسکراہٹ کو طنز سمجھے اور فرمانے لگے

دُرد دیتا ہے جو ساقی تو تردد کیا ہے — جام پر دامنِ تر رکھ کے ذرا چھان لیا

مگر جب پیالہ شاد کو ملا تو شاید چھاننا بھول گئے یا پھر چھاننے کے بعد بھی ذرد تہہ جام اپنا کام کر ہی گیا۔ کیونکہ ایک گھونٹ سے زیادہ شاد سے نہ پیا گیا۔ بڑی خفت کے ساتھ پیالہ منہ سے ہٹایا تو دیکھا کہ ساقی ندارد ہے۔ شاعر تھے نا۔ فوراً بات سوجھ گئی۔ ندیموں کی طرف دیکھکر فرمانے لگے:—

ساقی نہیں کیونکر نہ پڑیں حلق میں پھندے
ہم لاکھ پئیں گھونٹ اُترتے ہی نہیں ہیں

اتنے میں ساقی مینا کو دوبارہ بھر کرلے آیا، دیکھا تو شاد ہاتھ میں جام لئے ابھی تک بیٹھے ہیں۔ لہذا اُس نے مسکرا کر خم کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ بس اتنے ہی میں یہ حال ہوگیا۔ ابھی تو وہ خم جوں کا توں بھرا دھرا ہے۔ شاد اس اشارہ کو سمجھ گئے فرمانے لگے:—

خم نہ دکھلا کہ یہ بیہودہ طبیعت میری
ساقیا! ٹوٹ کے آئیگی جدھر آئے گی

بڑے بول کا سر نیچا۔ وہ پیالہ تو خیر جوں توں شاد نے پی لیا مگر جب دوسرے مینا کا پہلا جام شاد کی طرف پھر ساقی نے بڑھایا اور دور کی ابتدا حسب سابق شاد سے کرنی چاہی تو شاد گھبرا اٹھے اور لینے کو تو ساقی کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا مگر مبہوت تھے لہذا منہ سے لگانے بھی نہ پائے تھے کہ لڑکھڑا کے گر پڑے۔ جام ہاتھ سے چھوٹ کے پاش پاش ہوگیا "جام"۔ شاعر کا دل" نہ تھا کہ اسکی شکستگی میں آواز نہ ہوتی۔ سارا کمرہ جھنجھنا اُٹھا۔ شاد نے چونک کر سنبھالا لیا تو دیکھا جام ٹکڑے ٹکڑے پڑا ہے اور ساقی مسکرا رہا ہے۔ شاد حساس تھے لہذا ساقی کا یہ تبسمانہ طنز نشتر کا کام کر گیا۔ بڑی ندامت کے ساتھ فرمانے لگے:—

نہ دے الزام بدمستی کا اک افتادتھی ساقی
مرا گرنا بھرے ساغر کا چھلک جانا چور ہو جانا

ساقی کو یہ عذر گناہ بھا گیا۔ اُس نے دوسرا جام حاضر کر دیا اور بات آئی گئی ہو گئی نیا دور شروع ہونے پر پہلا نمبر شاد کا آیا۔ نشہ زوروں پہ تھا۔ ہاتھ بڑھا کہ پیالہ لینا چاہا مگر نہ لے سکے۔ دماغ پر قابو پانا چاہا مگر نہ پا سکے۔ تاہم بڑی ہوشیاری کر گئے۔ ساقی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے:—

مینا ہے سر آنکھوں پہ مگر آج تو ساقی
تو آپ پلا دے کہ مجھے ہوش نہیں ہے

ساقی بھی رنگیلا تھا نتے اور سوز رند کی بات کیسے ٹال دیتا چنانچہ ساقی نے جام منہ سے لگا دیا۔ مے کچھ حلق سے اُتری اور کچھ باہر گر پڑی ہم صحبتوں نے جو شاد کا یہ کچا پن دیکھا تو مسکرائے ایک ستم ظریف نے آواز دی مولوی صاحب! نماز پڑھئے۔ آپنے ناحق شراب پینے کا حوصلہ کیا ہے۔ شاد نشہ میں چور تھے۔ سمجھے کہ شاید نماز کا وقت آگیا ہے ادہر اُدہر دیکھ کر بڑی سادگی سے فرمانے لگے کہ:—

کہیں تو جام دھرا ہے کسی جگہ مینا　　کدہر جھکائے سر انساں کدہر نماز کرے

اس جواب پر تمام ہم صحبت بیساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ شاد اس بیہودگی پر چراغ پا ہوگئے اور نہایت برہمی کیساتھ ساقی کو مخاطب کر کے گرج اُٹھے:—

اہلِ ہوس بھی ہوگئے آ کے حریف مے کشاں　　پیر مغاں لُٹ دے خم بند شراب خانہ کر

لوگوں نے اب جو یہ رنگ دیکھا تو بیحد گھبرائے اور دام چکا چکا کر آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ یہانتک کہ ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے۔ ساقی نے بھی سامان لپیٹا اور اپنا راستہ لیا۔ اب جو شاد کا غصہ تھما تو دیکھتے ہیں کہ:—

میکدہ میں وہ ساغر ہیں نہ خم ہے نہ وہ جام　　چل بسے یار، رہے ہم تن تنہا باقی

ظاہر ہے کہ پھر یہ کاہے کو ٹھہرتے۔ لہذا بادل ناخواستہ شاد بھی یہ کہتے ہوئے میخانہ سے سدہارے کہ ؎

افراط سے پی جانے میں جو کچھ نہ ہو کم ہے
شرمندہ بہت میکدہ و جام سے ہم ہیں

عطاء اللہ پالوی

(بقیہ خاصان ادب صفحہ ۴)

(۵۹) جناب منشی ایم۔ آر شاہ صاحب ایچ۔ پی۔ ایل۔ ٹی (آنرز ان پنجابی و پشتو) انبالہ سے ۶ سالانہ
(۶۰) جناب خادم حسین صاحب خادم ریاستی جیلپور سے ۶ سالانہ
(۶۱) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور سے ۶ سالانہ
(۶۲) جناب شیخ محمود احمد صاحب نازش سیالی ہزاریباغ ولد حاجی شیخ محمد عمر صاحب مرحوم بنش تانگدہ سے سالانہ
(۶۳) محترمہ سلمیٰ خاتون صاحبہ کنیز مناپور۔ بنگال سے ۶ سالانہ
(۶۴) جناب خان شیری محبت خان جی آف کوٹھری بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے ۶ سالانہ
(۶۵) جناب ابراہیم خان صاحب شرف جونا گڈھ سے ۶ سالانہ
(۶۶) جناب عبداللہ رضا خاں صاحب قائم گنجری۔ دہلی) سے ۶ سالانہ
(۶۷) جناب حبیب خانصاحب حبیب شاہجہانپوری کوئٹہ سے ۶ سالانہ
(۶۸) مسٹر اتم سنگھ بی۔ اے پروپرائٹر جوالا رام اینڈ سنس بلی سے ۶ سالانہ
(۶۹) محترمہ حجاب بنارسی (ناگپور) سے ۶ سالانہ
(۷۰) محترمہ مس تیمورنہ صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۱) محترمہ مس اسماء اے علوی صاحبہ۔ کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۲) محترمہ مس فضہ جی لوٹیا صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۳) جناب یحییٰ بھائی محمد علی صاحب راولپنڈی سے ۶ سالانہ
(۷۴) جناب عارف ابراہیم یوسف برکاتی قادری بانکوٹی سے ۶ سالانہ
(۷۵) جناب خانصاحب انور خاں جی آف ناگڑہ۔ دربار گڑھ بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے ۶ سالانہ
(۷۶) جناب سید ظہیر حسین صاحب ظہیر سندی سے ۶ سالانہ

دھوبی گھاٹ

آثارِ سحر کے پیدا ہیں اور صبح کا تارا ٹوٹا ہے
تابندہ اُفق کے ہاتھوں سے ظلمات کا دامن چھوٹا ہے

ہنگامِ سحر کے کوڑوں سے راتوں کے لٹیرے بھاگے ہیں
بیدار ہیں کلیوں کی آنکھیں سرسبز نظارے جاگے ہیں

شبنم کی چمکتی بوندوں سے پھولوں کے کٹورے چھلکے ہیں
فطرت کے روپہلی شانوں پر زرّین دوشالے ڈھلکے ہیں

چلبل کی اونچی پھننگوں پر کرنوں کا تانا بانا ہے
ہر ذرّہ ہے فردوسِ نظر افسانہ در افسانہ ہے

لہروں کی روانی سے کامل دل کا دامن لہرایا ہے
جمنا کے کنارے پھر شاعر تفریح کی خاطر آیا ہے

ککڑی کے ٹھنڈے کھیتوں میں شاداب تراوت رقصاں ہے
ملاحوں کے دھندھلے چہروں پر کیف حلاوت رقصاں ہے

وہ دیکھو جمنا کالج کے ٹاور کی گھڑی میں آٹھ بجے
خاور کی سنہری کرنوں سے بازار کے دھندھلے روپ سجے

دیکھو تو ذرا کتنا ستھرا، پیارا جمنا کا پاٹ ہے یہ
وہ ایگری کلچر کالج ہے، وہ پل ہے دھوبی گھاٹ ہے یہ

سائے میں کگاروں کے دھوبی کچھ میلے کپڑے دھوتے ہیں
چہرے تو ہر اک کے خنداں ہیں لیکن دل سب کے روتے ہیں

مخصوص کچھ انکی آوازیں ساحل سے پرے ٹکراتی ہیں
دھارے میں نہا کر اٹھتی ہیں گرداب میں چکر کھاتی ہیں

ان غمخواروں ناداروں کے سینوں میں خراشِ آز نہیں
فطرت کے راز ہیں یہ لیکن ان میں فطرت کے راز نہیں

"چھو چھو" رہ کو اے نادارو! اک بات میں تم سے کہتا ہوں
شاعر ہوں خود اپنے پاکیزہ جذبات کی رو میں بہتا ہوں

یہ ستھرے پیراہن والے مکر اور ریا کے بندے ہیں
تن کے اُجلے آتے ہیں نظر لیکن من سب کے گندے ہیں

سینوں میں دبائے بیٹھے ہیں ہامان و یزیدی افسانے
شعلوں سے جفا کے روشن ہیں دل کے دھندھلائے کاشانے

رانگے کا سپیدہ پیتل پر دن رات چڑھایا جاتا ہے
اشکوں کے لرزتے پانی میں طوفان اُٹھایا جاتا ہے

ہاں! اے اُمید کے شعلوں کو دامن کی ہوا دینے والو
ممکن ہو اگر تو تم ان کے اب گندے من بھی دھو ڈالو

جب نور کے ستھرے ہاتھوں سے ظلمت کی جبیں دُھل جائیگی
عالم روشن ہو جائیگا، ساری قلعی کھُل جائیگی

کامل رشید -

کوئی بتائے؟!

وہ اپنے کالے کالے دراز لیکن بھیانک بال بکھرے ہوئے، ننگے پاؤں جون کی تپتی ہوئی وسیع شاہراہوں پر دھوپ کی سخت تمازت سے ٹکراتا ہوا پسینہ میں تر اور ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور آج سے نہیں بلکہ ایک طویل مدت سے اسکو اسی دہشت خیز حالت میں دیکھا گیا ہے اُسے سب جانتے ہیں، لیکن یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ آخر زندگی کو موت بنائے ہوئے وہ کیوں جی رہا ہے۔

دُنیا والے کہتے ہیں پاگل ہو چکا ہے۔ اور واقعی وہ اکثر دیوانہ وار اپنے بال نوچنے لگتا ہے اور خود بخود کہنے لگتا ہے کب آؤ گی؟ ——— کب آؤ گی؟ ——"

لوگ اسکی زبان سے یہ جملے سنتے ہیں اور دیوانہ کی بڑ سمجھ کر ہنس دیتے ہیں لیکن آہ کوئی کیا جانے کہ "کب آؤ گی" کی تہ میں کسقدر یاس انگیز یاں آرزوئیں اور حسرتیں پوشیدہ ہیں ——— !

ایک چاندنی رات میں ——— میں اسٹیشن سے بازار کچھ خریدنے کے لئے جا رہا تھا۔

راستے میں ایک سنسان گوشہ میں بیٹھا ہوا وہ کہہ رہا تھا کب آؤ گی؟ امتحان کب ختم ہوگا؟ ——"

میں نے اُسے دیکھا ——— اور اپنے ضروری کام کو نظرانداز کر کے اسکی جانب بڑھا ———

"تم کیا کہہ رہے تھے؟" ——— میں نے جرأت کر کے اس سے پوچھا

میری آواز سُن کر اُس نے اپنے بکھرے ہوئے بال منہ پر سے ہٹائے اور سر اوپر کو اُٹھا کر دیکھا۔

اُف! اسکی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ——— اور چاندنی اُن قیمتی آنسوؤں کو چمکانے کی کوشش کر رہی تھی ——— میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ خود بخود ——— اور پھر بولا ——— تم روتے کیوں ہو؟ میری آواز جانے کیوں کانپ رہی تھی۔

"میں روتا کیوں ہوں؟ اُس نے میرا سوال دُہراتے ہوئے کہا زمانہ نے جسکی زندگی کو ایک مستقل آہ میں تبدیل کر دیا ہے کیا اس بدنصیب انسان کو اتنا بھی حق نہیں کہ وہ اپنی حیاتِ تباہ کو آنسو بنا بنا کر آنکھوں کی راہ سے بہا سکے"۔

مجھے اس سے اسقدر برجستہ جواب کی اُمید نہیں تھی۔ واقعات کی ژولیدہ گتھی کو سلجھانے کے لئے میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے سوال کیا:-

"کیا کوئی تمہارا امتحان لے رہا ہے"؟

"ہاں ہاں" اُس نے کہا ——— "لیکن آپ میرے آنسوؤں سے تر ابو رحالات کیوں پوچھنا چاہتے ہیں"؟

"میں نے تمہیں کئی بار گرم گرم سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتے دیکھا اور ہر بار چاہا کہ تمہارے حالات دریافت کروں لیکن تم سمجھ سکتے ہو بازار کے ہنگامے اس چیز کے لئے موزوں نہیں ہیں ——— ؟"

"ہاں آپ سچ کہتے ہیں" اُس نے کہا" بازار میں مجھ سے گفتگو کرنا لوگ اپنی توہین خیال کرتے ہیں ——— لیکن میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ سے اسوقت ملنا گوارا کیا"

"تم مجھ سے آج کچھ کہہ ڈالو وقت مناسب ہے" ——— میں نے التجا کی۔

"کچھ کہہ ڈالوں؟ مگر کس زبان اور کس دل سے ——— میں اپنے میں افشائے راز کی جرأت نہیں پاتا مگر آپ کی پرسشِ حال کا تقاضا ہے کہ میں کچھ کیا بلکہ سب کچھ کہہ ڈالوں۔ شاید میری جراحتوں کا آپ کے پاس کوئی علاج ہو"

"میں نگہت سے محبت کرتا تھا۔ ایسی بے پناہ اور پاکیزہ محبت جس کے اثرات زندگی کے آخری لمحہ تک باقی رہینگے ——— وہ بھی مجھ سے پریم کرتی تھی ہماری محبت مسرت کی آغوش میں پروان چڑھ رہی تھی" ——— اتنا کہکر وہ خاموش ہوگیا۔

نگہت کون ہے؟ میں نے ایک خاص سبب سے دریافت کیا ———

وہ چونکا ——— پھر بولا ——— "نگہت! نگہت! وہی اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی" ———

یہ جواب سنکر میں سر سے پاؤں تک تھرتھرا اٹھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے

—— پسینہ آنے لگا۔ —— "میں خود اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ نگہت میری لڑکی تھی —— میری نگہت جگر سے محبت کرنے والا؟ —— نگہت تو مرچکی ہے —— " میں انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا —— کہ اس نے پھر کہنا شروع کیا —— میں خاموش تھا اور حیرت کا پتلا ——

" ہاں تو میں اور نگہت ایک رومانی چاندنی رات میں ملے"

اس رات ہم دونوں میں محبت کے قائم رکھنے کے بہت سے عہد پیمان ہوئے —— میں نے نگہت سے کہا،

" نگہت! اظہارِ محبت تصنع ہے —— مگر آج میرے جذبات کچھ کہنے کیلئے بیتاب ہو رہے ہیں۔ میں تمہیں پوجتا ہوں دیوانہ وار —— میری یہ پاکیزہ محبت میری زندگی کے آخری لمحات تک باقی رہے گی —— اور نگہت...... ......؟"

نگہت میری بات کاٹ کر بولی:۔

" اچھا میں تمہارا سخت امتحان لونگی —— یعنی اس طرح کہ ایک طویل عرصہ تک تم سے دُور رہونگی مگر مجھے تمہارے حالات کا علم رہیگا۔ اگر تم نے میرے پیچھے کسی دوسری ہستی سے محبت نہ کی اور میری پرستش پر قائم رہے تو میں تمہاری محبت کو صادق اور تمہارے جذبۂ پرستش کو راسخ سمجھونگی"

" کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو نگہت! میں تمہارا ہی ہوں اور تمہارا ہی رہونگا میں اس آزمائش کے لئے تیار ہوں —— اگرچہ مجھے تمہاری جدائی بہت ستائے گی! اس کے بعد ہم دونوں جدا ہو گئے —— اور آہ اس رات کے بعد وہ مجھے نہ ملی ——؟

" مجھے پورا پورا یقین ہے کہ نگہت میرا امتحان لے رہی ہے —— ورنہ وہ مجھ سے اتنی مدت تک بغیر کسی وجہ کے دُور نہیں رہ سکتی تھی" —— اتنا کہکر وہ خاموشی کے ساتھ چاند تاروں کو دیکھنے لگا ——

"کیا دیکھ رہے ہو چاند تاروں میں؟ میں نے ویسے ہی سوال کیا۔

" نگہت کو" اس نے بیتابی کے ساتھ جواب دیا۔

" ارے بھئی نگہت تو مرچکی ایک سال ہوا" —— میں نے ذرا پرسکون لہجہ میں کہا۔

وہ پاگلوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا —— دیوانوں کی طرح آنکھیں گھمانے لگا —— اسکی عجب کیفیت ہوگئی —— " سچ کہتے ہیں آپ نگہت مرگئی؟ ؟" اس نے پاگلوں کی طرح پوچھا —— وہ تھرتھرا رہا تھا —— اور اس سوال کا جواب میری پشیمان خاموشی تھی!

"نگہت تو میرا امتحان لے رہی ہے —— وہ مری نہیں —— جھوٹ بالکل جھوٹ —— آپ غلط کہتے ہیں" —— اسکے بعد —— وہ قہقہہ پر قہقہہ لگاتا ہوا درختوں کے جھنڈ میں غایب ہوگیا۔

"کوئی بتائے" کہ کیا وہ پاگل تھا۔ اس رات کے بعد اُسے کسی نے شہر میں پھرتے نہیں دیکھا ——

شمس نوید دیوبند

تاثرات

حرم و دیر کی عظمت کو دوبالا کرتے — نام لیکر ترا، در پر ترے سجدا کرتے
کیوں بھری بزم میں اظہارِ تمنا کرتے — تھی یہ توہینِ محبت، تمہیں رسوا کرتے
یوں محبت کے تاثر کو دوبالا کرتے — وہ ہمیں اور کبھی ہم انہیں دیکھا کرتے
یاد میں انکی بہاتے نہ اگر کچھ آنسو — لے غمِ عشق بتا اس کے سوا کیا کرتے
دل کی دنیا تو ہے مانوسِ جراحت بخشی — اُن سے کس طرح تمنائے مداوا کرتے

وہ بھی تاثیر تڑپ اُٹھتے وفورِ غم سے
یوں محبت میں لبِ آہ کو ہم وا کرتے

نعمان تاثیر

پیامِ رنگ و بُو

ہستیٔ بے ثبات کا ہمنفسو! شمار کیا؟
چلتی ہوئی بھی سانس کے چلنے کا اعتبار کیا؟

شام سے منتظر نگاہ دیکھتی ہے اجل کی راہ
صبح کا آسرا ہمیں اے شبِ انتظار کیا؟

حشر کے وعدے پر کوئی مر کے جئے تو کیا جئے
آج ہی کی خبر نہیں کل کا ہے اعتبار کیا؟

دیکھ تسلیاں مجھے چھیڑ نہ میرے ہمنشیں!
صبر پہ زور جب نہیں، جبر پہ اختیار کیا؟

گر کے زمیں سے اٹھ سکے۔ دوشِ ہوا پہ چل سکے
ہمتِ مشتِ خاک کیا۔ حوصلۂ غبار کیا؟

پیرہنِ خرد ہے جب دستِ جنوں سے چاک چاک
تجھکو رفو کی احتیاج دامنِ تار تار کیا؟

جب ہے تڑپنے پر ترے اپنا مدارِ زندگی
مانگیں سکون کی دعا اے دلِ بیقرار کیا؟

چیں بجبیں ہے کس لئے دامنِ ناز کی شکن؟
راہگذر میں مل گیا اُن کو مرا مزار کیا؟

جینے ہی کی ہوس رہی اہلِ ہوس کو عمر بھر
کہتے رہے زبان سے زیست کا اعتبار کیا؟

گھر سے نکل کے دو قدم آ نہ سکے مزار تک
یاد کریگی آپ کو خاکِ وفا شعار کیا؟

عطر میں ہیں بسے ہوئے جھونکے نسیم کے شفقؔ
لیکے "پیامِ رنگ و بُو" آگئی پھر بہار کیا

شفقؔ عمادپوری

فکر و نظر

وہ نشہ نہ دائم ہے نہ قائم نہ مکمل
رکھی نہ گئی جس کی مئے سوز پہ بنیاد

سینے میں تموج ہو تو ابلیس بھی یزداں
آسودہ طبیعت ہو تو یزدانی بھی الحاد

کب نبھتی ہے مجھ سے تری میخانۂ دانش!
میں بندۂ لاحد ہوں، تو زندانیٔ اعداد

آدم کی ذہانت میں ہے سنگینی ابھی تک
میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کہیں تیشۂ فرہاد

دستور میں غفلت ہو تو صدیوں میں اک "انساں"
اور محکمی ترتیب کی "شداد بہ شداد"

فکرؔ تونسوی

خطبۂ صدارت

(آل انڈیا مشاعرہ ناگپور (سی۔ پی))

معزز اراکین بزم و گرامی سامعین!

مجھے بڑی مسرت ہے کہ میں اپنی عمر میں پہلی مرتبہ سیاحتِ **ناگپور** سے متکیف یا مکدر ہوا ہوں۔ یہاں آنے کے بعد اس مشاعرہ کی صدارت کا جو اعزاز آپ نے مجھے تفویض کیا ہے اگر اسکی پذیرائی سے میں اپنی نااہلیت کا اعلان کروں تو یقیناً یہ آپ کے ذوقِ انتخاب کی توہین ہوگی۔ اس لئے اس عزت بخشی کا شکریہ ہی ادا کرنا اولیٰ تر ہے۔

مشاعروں کی صدارت اپنے اندر جو علمی و ادبی قوتیں پوشیدہ رکھتی ہے وہ دوسری ملکی مجالس سے یکگونہ ممیز اور مختلف ہیں۔ میرا نظریہ صدارت سالہا سال سے یہ ہے کہ مشاعروں اور ادبی مجالس کی صدارت صرف انہیں لوگوں کو ملنی چاہئے جو شعر و ادب کے صحیح ذوق سے بہرہ مند ہوں اور جو ادبی و علمی رجحانات کے اس جادۂ نو میں جس پر نوخیز نسلیں گامزن ہیں کسی نہ کسی نوعیت سے ہماری رہنمائی کر سکیں۔ میں اپنا یہ نظریۂ صدارت سینکڑوں مشاعروں میں علی رؤس الاشہاد پیش کر چکا ہوں۔ اور اب بھی میرا نظریہ یہی ہے کہ مشاعروں کی صدارت صاحبانِ دولت و جاہ سے زیادہ اُن سادہ زندگی گذارنے والے اہلِ علم و ادب کو سزاوار ہے جو تختِ صدارت پر خاموش بیٹھنا پسند نہ کریں بلکہ اپنے علمی تجارب سے ہمیں مستفید و مستفیض ہونے کا بھی موقع دیں۔

میں نے ابھی اپنے متعلق "متکیف و مکدر" دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ میں ان الفاظ کو بغیر تشریح و تفصیل اپنے ذہن میں چھپا کر لے جانا نہیں چاہتا بلکہ بالوضاحت کہہ دینا چاہتا ہوں کہ سیاحت ناگپور سے مجھے کیف کم اور تکدر زیادہ حاصل ہوا ہے۔ کیف تو صرف اتنا کہ میں نے کل اسی ہال میں اور آج محمود الحسن صاحب کے یہاں بعض جوان شعرا کی زندہ نظمیں اور غزلیں سن کر اپنی روح کو تازہ کیا اور مجھے یقین ہے کہ آج بھی یہ تازگی نصیب ہوگی۔ اور تکدر یہ کہ یہاں کی غیر شعری فضاؤں میں چل پھر کر میں نے اپنی توقعات کو بے حد مجروح محسوس کیا۔ جہالت اور مادیت یہاں کی فضاؤں پر اسقدر غالب ہے کہ ہر شعبۂ زندگی سکے زیر اثر مغلوب نظر آتا ہے۔ سی۔ پی اور یو۔ پی میں کچھ ایسا بُعد نہیں۔ لیکن یہ حقیقت کسقدر افسوسناک ہے کہ **بنگلور** اور **میسور** میں جو شمالی ہند سے نسبتاً زیادہ دُور ہیں ناگپور سے کہیں زیادہ ادبی زندگی پائی جاتی ہے۔

میں ناگپور کے اس ادبی جمود و خمود کے اسباب پر ابھی اچھی طرح غور نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور سمجھا ہوں کہ ارباب ناگپور نے غالباً علمی و ادبی ترقیوں کے لئے اپنے وطن کے ظرف کا کبھی جائزہ نہیں لیا۔ سیاسی تحریکیں یہاں ادب کے مقابلے میں ممکن ہے زیادہ کامیاب ہوں، لیکن اگر اربابِ علم و ادب کوشش کریں تو اسی جمود سے ادبی بیداری بھی انگڑائی لے سکتی ہے۔ اس لئے کہ ادب روح کی طرح ہر شعبۂ حیات کی رگ و پے میں محفوظ ہے۔ فکر و توجہ کی قوتیں اسے جب چاہیں اور جہاں چاہیں اُبھار سکتی ہیں اور یہ ہر وقت ابھر سکتا ہے۔

مجھے یہ سنکر واقعی مایوسی ہوئی کہ ناگپور میں مسلمانوں کی آبادی صرف ۵ فیصدی ہے اور اس ۵ فیصدی میں بھی جاہل اور مزدور پیشہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ناگپور ادبی و علمی ترقی نہیں کر سکتا۔ اقتصادیات اور معاشیات کے ماہر اتنی تکلیف کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ معاشی اصلاح کے ساتھ ادبی و علمی بیداری کی تدابیر سوچنے کی زحمت بھی فرمائیں۔ اس لئے جہاں معاشیات کی حکومت ہو وہاں ادبیات کی کس مپرسی لازمی سمجھئے۔

لیکن آج دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو غور و فکر کے بعد حل نہ ہو سکتا ہو۔ اس لئے ناگپور کے علمی و ادبی جمود کا سوال بھی مقامی مفکرین کی ہمت سے ضرور حل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ فکر و غور کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

میرے ذہن میں اسوقت ناگپور کی ادبی زندگی کے لئے کوئی خاص لائحہ عمل نہیں ہے۔ اسلئے کہ میں اس کے لئے اپنے مستقر سے تیار ہو کر نہیں آیا تھا اور سچ یہ ہے کہ میں ناگپور کی ادبی فضاؤں کو اتنا پست اور جمود انگیز سمجھا بھی نہ تھا۔ جتنا یہاں آکر میں نے محسوس کیا۔ بہرحال میں ضرور چاہتا ہوں کہ بمبئی، بنگلور، میسور اور دوسرے متمدن شہروں کی طرح یہاں بھی ادبی و علمی بیداری پیدا ہو، اس عنوان کے ساتھ کہ جب شمالی ہند اور جنوبی ہند کے شعرا کا کہیں ذکر کیا جائے تو وسطی ہند میں ناگپور کے شعرا کا نام بھی ضرور لیا جائے۔

اس جمود اور بے حسی کو دور کرنے کی جو تدبیر اس وقت یعنی ہنگامی طور پر اس وقت میرے خیال میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ ناگپور کی جماعت اہلِ علم کو اطرافِ شہر میں چھوٹی چھوٹی کر متعدد ادبی مجلسیں قائم کرکے ادب کی ترویج میں کوشش کرنی چاہیے میں نے دیکھا کہ ناگپور کی قدیم آبادی میں جتنا انتشار اور گھٹن ہے اتنی نئی آبادی میں نہیں ہے۔ آپ کو بھی ایک نئی "ادبی کالونی" بنانی ہے۔ جس میں زندگی اور بیداری کے آثار بیشتر از بیش موجود ہوں۔ جو ادب کے نئے رجحانات اور نئی قدروں سے کما حقہٗ واقف و آگاہ ہو اور جو اپنی ادبی ریاست کے سلسلے ہندوستان کے اُردو مرکزوں سے باقاعدہ ملا سکے۔

ناگپور کے دامن پر ایک یونیورسٹی اور متعدد کالجوں کا وجود یہاں کی علمی و تعلیمی وسعتوں کی دلیل ہے لیکن غالباً ان اداروں کا اثر شہر کی عام زندگی پر بالکل نہیں ہے عام مقامی زندگی سے تعلیمی اداروں کا بچا بچا رہنا۔ اُن کی شانِ درس و تدریس کے خلاف ہے انھیں بھی اپنا پَرتو عام مقامی زندگی پر ضرور ڈالنا چاہیے۔ میں نے شہر کار مشاعرہ کے مجمع میں کل بھی بہت سی صورتیں اور نقوش ایسے دیکھے تھے جن میں تعمیری صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ آج بھی مجھے کچھ نقوش ایسے نظر آرہے ہیں جنکے خد و خال سے علمی و ادبی شغف کی روشنی پھوٹی پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان نفوسِ مقدس کے دل و دماغ انوارِ علم و فن سے معمور ہیں مگر کوئی تماشہ ہو، نغمہ ایسا بھی ہے۔ جو ان لوگوں کو ادبی کوششوں سے روکے ہوتے ہے۔ ان موانعات کو توجہ اور فکر کی کوششوں سے دُور کیا جاسکتا ہے اور ناگپور میں ایک ایسی نئی اور خوشگوار حیات افروز اور زندگی آموز فضا پیدا کی جاسکتی ہے جو شمالی ہند سے آنے والوں کے لئے عشرتِ نظر اور جنتِ سماعت کا سبب بن سکے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس مشاعرہ کا تعلق یونیورسٹی سے کچھ نہیں ہے مگر یہ بے تعلقی ایسی ہی ہے۔ جیسے کسی حصۂ زمین کو آفتاب سے بے تعلق کہہ دیا جائے۔ یونیورسٹی میں اگر علمی و ادبی قوتوں کا مرکز ہے تو اُسکا اثر شہر کی عام ادبی حالات پر کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے۔

حضرات! میں نے جو کچھ عرض کیا یہ کوئی خطبۂ صدارت نہ تھا بلکہ صرف اظہارِ خیال تھا۔ جو چیز میں نے محسوس کی وہ ہی بے تکلف آپ حضرات کے سامنے پیش کردی خطبوں میں زبان اُردو یا شاعری کی تاریخ دہرانے سے زیادہ اچھا یہ ہے کہ موجودہ اقتضا پر اظہارِ خیال کیا جائے اور یہی یہاں مقصود تھا۔

اُردو ادب میں ترقی کرنے کی صلاحیت فطرتاً موجود ہے۔ آپ کی ذرا سی کوشش سے اسکے نئے نئے انداز تمام شہر اور اسکے اطراف میں پھیل سکتے ہیں۔ ناگپور کی خوش قسمتی ہے یہاں ارباب فضل و کمال کی بھی کمی نہیں۔ متعدد بیرونی حضرات ایسے موجود ہیں۔ جنکی عمریں خدمتِ علم و فن میں گذری ہیں۔ ان کی موجودگی میں مقامی ادبی جمود یا ادبی رجحانات کا فقدان دو ہی نتیجے پیدا کرتا ہے یا تو ناگپور کے تعلیم یافتہ نوجوان ان سے مستفید ہونا کسرِ شان سمجھتے ہیں یا ان حضرات کو فیض اور فائدہ پہونچانے میں بخل و احتراز ہے۔

لیکن خدمتِ ادب کا جذبہ جن دلوں میں فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے اُن کا بخل میرے یقین کی حدود میں نہیں آتا۔ اور میں کسی طرح باور نہیں کرسکتا کہ جو لوگ خادمِ ادب کہلاتے ہیں وہ کسی طرح بھی خدمتِ ادب سے جی چُرا سکتے ہیں۔ رہا دوسرا سبب یعنی عدمِ استفادہ تو اس کا سبب کوئی مقامی سیاست ہو تو ہو ورنہ ادب سے ذوق رکھنے والے تو انسانوں سے کیا، آبشاروں، کوہساروں اور ندی نالوں سے بھی اپنی ادبی تشنگی بجھا لیتے ہیں۔

ایک بات اور عرض کردوں۔ ادب و شعر کی منزل بڑی دشوار گذار منزل ہے یہاں منزل رسیدہ اور آسودۂ منزل حضرات بھی نا آشنائے منزل سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں ایک منتہی جب تک اپنی حیثیت میں طالب علمانہ جذبہ پیدا نہ کرلے باوجود منتہی ہونے کے گمراہ ہوجاتا ہے۔ پھر میں اُن مسافرانِ ادب کو کیا کہوں جو ابھی جادۂ منزل پر نمودار ہوکر ہیں۔ منزل سے کوسوں دُور ہیں۔ مگر خود کو منزل رسیدہ سمجھے ہوئے ہیں۔

ادب و شعر کا لامحدود سمندر آج تک کسی نے پار نہیں کیا۔ یہ دریا نہیں کاربندِ ساحل۔ یہی سبب ہے کہ منصبِ نبوت ختم ہوگیا۔ مگر منصبِ شاعری کی تکمیل ہنوز نہیں ہوئی۔ خاتم الانبیا پیدا ہوچکے مگر خاتم الشعرا کوئی پیدا نہ ہوا۔

ایک ایسے لامتناہی، لامحدود، اور بے کنار سمندر میں غواصی کرنے والوں کو نئی نئی موجوں سے محظوظ و مسرور تو ہونا چاہیئے مگر ادعائے شناوری اور زعمِ ناخدائی سے محفوظ ہی رہنا چاہیے ؎

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

خدا جانے موجودہ کشتیاں بھی کب اُلٹ جائیں اور دوسری کشتیاں ان کی جگہ لے کر اس بحرِ بے پایاں میں اپنے لئے کون سے اور کتنے نئے راستے پیدا کرلیں۔

وقت بہت گذر چکا ہے اس لئے زحمتِ سماعت کی معافی چاہتے ہوئے متوقع ہوں کہ میں نے جو کچھ گذارش کیا ہے اس پر اس شہر کے اربابِ علم و عقد اپنی اپنی جگہ غور فرمائینگے۔ اور جب میں دوبارہ کبھی ناگپور آؤنگا تو یہاں کی ادبی بیداری مجھے مجبور کردیگی کہ میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ناپس لے لوں۔

سیماب اکبرآبادی

۱۳ر جون ۱۹۴۳ء

محرابِ خودی

نہیں دامانِ رنگ و بو میں کوئی چیز بھی اپنی
بیاباں میں نہ خار اپنا نہ گلشن میں کلی اپنی

سہارے سے اسی کے کٹ رہی ہے زندگی اپنی
محبت میں بہت کام آ رہی ہے بیکسی اپنی

وہ ان کا سجدہ اپنا اور محرابِ خودی اپنی
نرالی سب سے الفت میں ہے طرزِ بندگی اپنی

توجہ صرف کرتا ناخدا گر واقعی اپنی
تو کیوں ساحل سے یوں ٹکرا کے کشتی ڈوبتی اپنی

نہ ہنسنے میں مزا ہے اب نہ رونے سے تسلی ہے
مٹا جس دن سے دل جاتی رہی سب دل لگی اپنی

خجل ہو کر جھکا لیتے ہیں گردن دیکھنے والے
مرقع عبرتوں کا ہے شبیہِ زندگی اپنی

عنایت مجھ پہ منزل کی نہ احسانِ خضرِ منزل کا
میں خود روزِ ازل سے کر رہا ہوں رہبری اپنی

یونہی بڑھتی رہیں گر وسعتِ زندانِ وحشت کی
ترے دیوانے اک دنیا بسا لیں گے نئی اپنی

میں اب واقف ہوا ہوں ہے کمالِ عشق وہ منزل
جہاں انسان کو محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

دو عالم ہیں نہ ہم ہیں اور نہ انکی یاد باقی ہے
نہ جانے اور بھی کیا رنگ لائے بیخودی اپنی

مرتب کیں ہزاروں داستانیں اس سے دنیا نے
حقیقت میں تھی گویائی سراپا خامشی اپنی

یہاں بھی نامرادوں کو فغاں کرنے نہیں دیتے
سمجھتے ہیں وہ کوئے حشر کو شائستگی اپنی

مرے ظلمت کدے میں ہے کہاں گنجائشِ عشرت
یہاں لائے نہ شمعِ طورِ سینا روشنی اپنی

حقیقت منکشف ہو جائیگی اک دن زمانے پر
کہاں تک اے الم چالیں چلے گا مدعی اپنی

الم مظفر نگری

نغمۂ مہر

(زیرِ طبع مجموعۂ کلام کی ایک جھلک)

گریہ بے اختیار ہو کے رہا
رازِ دل آشکار ہو کے رہا

اُن کی نظروں کا کچھ قصور نہیں
مجھکو ہونا تھا خوار ہو کے رہا

رہ گیا اشک جو سرِ مژگاں
ضبط کا شاہکار ہو کے رہا

جو رخ کی سطح پر شفق بنکر
خونِ دل آشکار ہو کے رہا

تیری جادو بھری نگاہوں کا
ایک عالم شکار ہو کے رہا

اے صنم عشق تیرا کیا کہنا
دل مجسم بہار ہو کے رہا

مہر جب یاد آ گئی اُن کی
ہر نفس نغمہ بار ہو کے رہا

(وزیر ناظہ) مہر عثمانی جوناگڈھی

جمنا سے ہُگلی تک

اکثریت کی تمناؤں اور آرزوؤں کو ٹھکرانا بھی ایک قسم کا گناہ ہے عام طور پر یہ مطالبہ تھا کہ میں **ناگپور** اور **جمشید پور** کے "ال انڈیا" مشاعروں کے سلسلے میں ایک رنگا رنگ سفرنامہ پیش کروں۔ میں ذاتی طور پر بھی کچھ اسی قسم کے ارادے رکھتا تھا اس لئے کہ بعض مخلصین نے ان مشاعروں کے متعلق بڑے خوش آئند خیالات کا اظہار کیا تھا اور یہاں تک لکھ دیا تھا کہ **جنوبی ہند** کے سفر کے بعد میرا یہ سفر بھی یادگار رہے گا۔ مسافر کو اس کی کیا خبر کہ راستہ پُرخار ہے یا شاداب، منزل میں مسافر نوازوں کی اہلیت ہے یا نہیں، اور مسرت بخش محرکات ملیں گے یا یاس انگیز ۔؟

۱۸ جون ۴۳ء کو شفق کی نو طلوع سرخیوں سے کھیلتا ہوا گھر سے نکلا اور شام کے دھندلکوں میں مدراس میل سے علامہ سیماب مدظلہ کی معیت میں روانہ ہو گیا، سیکنڈ کلاس کی چونکہ صرف ایک نشست مل سکی اس لئے مجھے مجبوراً انٹر کلاس کو نعمت غیر مترقبہ سمجھنا پڑا اور وہ بھی ملازم کی انتہائی بھاگ دوڑ کے بعد۔ بارے اوپر کی ایک نشست مل گئی جہاں پسینے سے تر اوپر کپڑوں اور جسم کے سوکھنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اگر غریب ہندوستانیوں کی ایک جماعت اس گھماگھمی میں دروازہ کھولکر کھڑے ہونے پر مجبور نہ ہوتی۔ جھانسی اسٹیشن پر برادرم نظم قادری کو اُدھر ہی سے ٹنگے ٹنگے نظروں سے تلاش کیا اس لئے کہ وہ بھی میرے ساتھ ناگپور چلنے والے تھے، کچھ دیر بعد وہ آئے مگر آج نہیں کل چلنے کے ارادے سے، اس لئے کہ ان کے چھوٹے بھائی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی تھی۔

میں جس کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا تھا اُسی میں جناب تبسم نظامی بھی تھے۔ یہ وہی تبسم صاحب ہیں جن کا ذکر میں بنگلور کی ڈائری کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ اس مرتبہ اُن کا رویّہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ دوسرے دن دوپہر کا کھانا بھی ہم نے مل جل کر کھایا۔ راستہ میں کافی گرمی تھی لیکن جوں جوں ناگپور سے قریب ہوتے گئے اس میں کمی ہوتی گئی۔ راستہ میں کہیں کہیں بارش بھی ہوئی۔ ۱۹ جون کو شام کے چھ بجے ناگپور پہونچ گئے۔ اسٹیشن پر سکریٹری مشاعرہ کمیٹی جناب حیرت لدھیانوی۔ جناب ظریف قریشی۔ جناب آذر ناگپوری۔ حضرت آغاز برہانپوری اور حضرت مولانا راغب برہانپوری موجود تھے۔ مولانا راغب کی عمر تقریباً ستر سال ہے۔ برہانپور سے مشاعرہ کے مہمان ہوکر تشریف لائے تھے مگر ان کی محبت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ جب تک اسٹیشن نہ آئیں ؎ پھر کہاں لوگ اہل محبت کے؟

حضرت آغاز بھی برہانپور سے آئے تھے مگر استاد کی محبت انہیں اسٹیشن تک کھینچ لائی سکریٹری صاحب کے علاوہ بقیہ حضرات سے بھی روحانی علاقہ تھا لیکن مشاعرہ کی طرف سے آئے تھے۔ ہار اور پھول پہنانے کی رسم کے بعد ایک کار میں قیام گاہ تک لیجایا گیا۔ تمام شعرا کے قیام کا ایک ہی جگہ مختلف کمروں میں انتظام تھا مگر بڑی بے سروسامانی تھی جس نے اور علامہ سیماب نے وہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا۔ چنانچہ سکریٹری صاحب کے ساتھ ساتھ دو گھنٹے کی مسلسل ذاتی دوڑ دھوپ کے بعد ایک اوسط درجہ مگر صاف۔ ستھرے اور ہوادار ہوٹل میں قیام کا انتظام ہو سکا۔ چونکہ دو گھنٹے کے بعد ہی مشاعرہ کی پہلی نشست تھی۔ اس لئے علامہ سیماب تشریف نہ لے جاسکے۔ البتہ میں شریک ہوا۔ ہال بہت وسیع و عریض تھا اور کافی خوبصورت لیکن سامعین صرف دو ڈھائی سو کے قریب تھے اور شاعر بھی معدودے چند۔ نواب عبدالوحید خانصاحب غازی آف گوردھا بحیثیت صدر تھے۔ یہ نشست نظموں کے لئے مخصوص تھی۔ چند نظمیں مجوزہ عنوان "مقام دوست" پر پڑھی گئیں اور باقی مختلف عنوانات پر نظمیں میں پردفیسر شور۔ جاں نثار اختر۔ آغاز برہانپوری۔ ادیب مالیگانوی اور تبسم نظامی کے نام نمایاں تھے۔

دوسرے دن ۲۰ جون کو مصرع طرح پر مقامی شعرا نے اپنی غزلیں پڑھیں اور بیرونجات کے شعرا نے غیر طرحی کلام سنایا۔ اس نشست میں حضرت علامہ سیماب۔ حضرت مولانا ناطق گلاؤٹھوی۔ حضرت راغب برہانپوری اور دیگر مقامی و غیر مقامی شعرا شریک تھے اور گذشتہ شب سے نسبتاً اجتماع بھی اچھا تھا مگر مقامی غزلیں بہت پست اور غیر معیاری تھیں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہاں کے شعرا شاعری سے کوسوں دور ہیں۔ ناگپور میں مولانا ناطق جیسی بالغ نظر اور صاحب فن ہستی موجود ہے اس کے باوجود مقامی شعرا کی یہ حالت قابل افسوس ہے۔ کاش ناگپور کے شعرا مولانا ناطق یا کسی دوسرے استاد سے استفادہ کامل کریں اور اردو کے ترقی یافتہ اُدبا کے علاوہ اُردو کی اعلیٰ تصانیف کو اپنی ترقیوں کے لئے راہبر بنائیں۔ مقامی شعرا کے بعد باہر سے آئے ہوئے شعرا جاں نثار اختر تبسم نظامی۔ ادیب مالیگانوی۔ نظم قادری اکبرآبادی۔ آغاز برہانپوری اور علامہ سیماب نے اپنا غیر طرحی کلام سنایا۔

۲۱ جون کو آخری نشست خاص تھی۔ خاص میں نے اس لئے کہا کہ مصرع طرح پر

مخصوص مقامی اور غیر مقامی شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ علامہ سیماب صدر تھے اور ہال بھی سامعین سے تقریباً پورا بھرا ہوا تھا۔ بعض بہت اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں۔ جناب حیرت لدھیانوی کی غزل حاصلِ مشاعرہ تھی۔ ۲½ بجے یہ طرحی مشاعرہ ختم ہوا اس کے بعد پروفیسر شور، جان نثار اختر اور میں نے نظمیں سنائیں۔ تین بجے اس ادبی ہنگامہ سے نجات ملی۔

۲۰ جون کو حضرت مولانا ناطق گلاؤٹھوی ہوٹل میں تشریف لائے۔ بہت دیر تک موصوف سے علمی و فنی گفتگو رہی۔ مولانا ناطق کی ذاتِ گرامی سی۔ پی کے لئے خصوصاً اور تمام ہندوستان کے لئے عموماً باعثِ فخر ہے اُن کا رنگِ سخن سب سے الگ اور اُن کا علمی و فنی مرتبہ بہت بلند ہے۔ نواب عبدالوحید خاں صاحب غازی آف گوردھا اسٹیٹ بھی دو مرتبہ تشریف لائے۔ ریاست و امارت کے باوجود انتہائی منکسر المزاج اور خوش اخلاق بزرگ ہیں۔ خود شاعری سے بڑا شغف ہے اور ادب نوازی حصہ خصوصی۔

ناگپور کے مشاعرہ میں بانیانِ مشاعرہ نے مہمانوں کے ساتھ جس بداخلاقی کا برتاؤ کیا اس کا گمان بھی نہ تھا۔ بہرحال مشاعرہ ختم ہو گیا اور حاصلِ مشاعرہ یہ رہا کہ بعض دوستوں، بزرگوں اور معنوی بھائیوں سے ملاقات ہو گئی۔ جناب حیرت لدھیانوی۔ جناب طرفہ قریشی۔ جناب آذر ناگپوری اور دیگر نوجوانوں نے ہمارے آرام و آسائش کا ایک حد تک خیال رکھا۔ اور میں ان سب کا ممنون ہوں۔

۲۱ جون کی شام کو جناب محمود الحسن صاحب بی۔ اے سابق مدیر "ندیم" بھوپال نے بیرونجات کے شعرا کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا۔ محمود صاحب بڑے علم دوست اور شاعر نواز ہیں۔ میں پہلے بھی بھوپال میں ان کی نوازشوں سے بہرہ مند ہو چکا ہوں۔ محمود صاحب کے یہاں شعرا نے اپنا اپنا منتخب کلام سنایا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں مشاعرہ سے زیادہ روح کو کیف حاصل ہوا۔

ناگپور میں بابا تاج الدین اولیاؒ کے مزارِ مبارک پر بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ ابھی مزار ابتدائی حالت میں ہے۔ تعمیر جاری ہے اور خیال ہے کہ دس سال میں مزار مبارک کا علاقہ ایک آباد و شاداب علاقہ ہو جائے گا۔ چرسی۔ اوباش اور بڑے قسم کی مخلوق کی یہاں کثرت ہے۔ کاش بزرگوں کے مزار ان بدعت پھیلانے والوں سے پاک ہوتے۔

ارا کینِ مشاعرہ کی کوتاہیوں، شعرا کی کسمپرسی، بعض دوسرے اساتذہ اور شعراء کے ساتھ سامعین کا غیر مہذب سلوک اور شہر کے عام علمی و ادبی جمود نے طبیعت کو اس قدر مکدر کیا کہ ہم ۲۲ جون کو صبح دس بجے جمشید پور کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستہ بہت پرفضا تھا اور خوب بارش ہو رہی تھی۔ یہ ایک دن اور ایک رات کا سفر موسم کی خوشگواریوں کی وجہ سے بہت پُرلطف رہا۔ ۲۳ جون کو صبح جمشید پور پہنچے۔ اسٹیشن پر مسٹر اے۔ بی فلیس صابر بی اے اکبرآبادی۔ جناب سید علی حیدر عابدی اور مسٹر بشیر موجود تھے۔ یہ لوگ ۶ بجے شب سے اسٹیشن آئے ہوئے تھے۔ جمشید پور میں اس وقت بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ بانیانِ مشاعرہ میں سے اسٹیشن پر کوئی نہ آیا حالانکہ ان کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی چونکہ مشاعرہ میں تین چار دن کا بُعد تھا اور ہم فی الحال مشاعرہ کے مہمان بھی ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے زیادہ خیال نہ ہوا لیکن اخلاقاً بانیانِ مشاعرہ میں سے کسی کو ضرور آنا چاہئے تھا۔ حضرت صابر نے ہمارے لئے ایک صاف ستھرا اور ہوا دار مکان پہلے سے آراستہ کر رکھا تھا۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز ہمارے مذاق کے مطابق موجود تھی۔ پھر صابر صاحب کا انتہائی خلوص، محبت اور عقیدت اُنکے اہتمام کے حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔ اُن کے عزیز شاگرد مسٹر بشیر کی ہمہ وقت موجودگی اور بڑے انہماک سے تمام کاموں کی انجام دہی بھی بھولنے والی چیز نہیں۔ مشاعرہ سے قبل تین دن ہم نے صابر صاحب کے یہاں قیام کیا اور بلاشبہ اپنے گھر کا سا آرام پایا۔ گویا ناگپور کی تکالیف کی یہاں تلافی ہوئی۔ صابر صاحب نے اپنے امکان سے زیادہ خاطر مدارات کی۔ صابر صاحب کے یہاں دورانِ قیام میں بہت سے حضرات ملنے آئے ان میں حضرت مولانا کمالی۔ جناب محبوب عالم صاحب اور جناب عشرت مالیگوری کے نام یاد رہ گئے ہیں۔

۲۶ جون کو بانیانِ مشاعرہ کے مجبور کرنے سے ہم مشاعرے کے مہمان ہو گئے اور دو دن تک مشاعروں کی روایتی بدنظمی کا شکار بنے رہے۔ ہر چند برادرم عجیب آروی کو ہماری نگہداشت کے لئے مقرر کیا گیا تھا مگر وہ غریب بھی کیا کرتے اس لئے کہ اُن پر دوسرے کاموں کا بوجھ بھی فطرتاً آپڑا تھا وہ جس طرف سے بھی چشم پوشی کرتے تھے اسی طرف جھول پیدا ہو جاتا تھا۔ جمشید پور کے مشاعرہ کے لئے دو مصرعے دیئے گئے تھے۔ ۲۶ جون کو پہلے مصرع پر مشاعرہ ہوا۔ ہال کسی قدر چھوٹا تھا مگر بالائی حصوں اور ڈائس کو ملا کر ایک بڑے ہال کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ پورا ہال اور ڈائس مع بالائی حصوں کے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مشاعرے میں اکابر اور عمائد بہت زیادہ تو نہ تھے پھر بھی اُن کی تعداد کافی تھی۔ شب کے چار بجے تک مشاعرہ بڑے سکون کے ساتھ ہوتا رہا۔ مشاعرے کے صدر مسٹر کھوسلا (ڈبل ایم۔ اے) پرسنل اسسٹنٹ ٹو ڈی جنرل منیجر ٹاٹا آئرن کمپنی تھے۔ مسٹر کھوسلا سے میں آج سے تین سال قبل بھی مل چکا تھا۔ اُن سے دوبارہ مل کر اور یہ دیکھ کر کہ وہ بھولے نہیں ہیں بڑی مسرت ہوئی۔ مسٹر کھوسلا کاشمیری ہیں اور فارسی زبان و ادب میں اعلیٰ استعداد رکھتے ہیں۔ مشاعرہ کی پہلی نشست میں شعرا کی تعداد بہت کافی تھی۔ مقامی شعرا کے علاوہ کلکتہ۔ آرہ۔ کھڑگپور اور صوبہ بہار کے دیگر نوجوان شعرا کثیر تعداد میں شریک تھے۔ حضرت مولانا ناطق گلاؤٹھوی بھی ناگپور سے تشریف لائے تھے۔ اجتماع بہر حال اچھا تھا اور

غزلیں بھی بہت کامیاب تھیں۔ مگر بعض بھرتی کے شعرا کی وجہ سے مشاعرے کے ابتدائی دو گھنٹے بڑی بے لطفی سے کٹے۔ اختتام مشاعرہ پر حضرت مولانا کما کی متعدد مرتبہ علامہ سیماب سے گلے ملے اور فرمانے لگے کہ "کاغذ پر جو کچھ ہوا اس کا خیال نہ فرمائیے"۔ مولانا کی کا یہ اقدام مصالحت نہ صرف میرے لئے بلکہ اربابِ جمشید پور کے لئے بھی بہت مسرت کن ثابت ہوا اور اُن کے بزرگانہ اخلاق کا ایک نقش ہمارے دلوں پر مرتسم ہوگیا۔

۲۷ جون کو صبح ۹ بجے حضرت مولانا سریر کاری گاڑی سے یعنی ملنے کے لئے تشریف لائے۔ گو مولانا سریر سفر کی تکان سے چور چور ہو رہے تھے مگر یہ اُن کی محبت تھی کہ سیدھے ہماری طرف چلے آئے مولانا سے خط و کتابت تو اکثر ہوتی رہتی ہے مگر شرفِ نیاز کبھی حاصل نہیں ہوا تھا جس طرح میں اُن سے ملنے کا آرزومند تھا اسی طرح وہ بھی بیتاب تھے۔ غرض یہ ملاقات بڑی مسرت بخش ثابت ہوئی۔ کاش ان صفحات میں کچھ گنجائش ہوتی تو میں مولانا کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کر سکتا۔

شب کو بوقتِ مقررہ پھر مشاعرہ ہوا اس میں بیرونجات کے شعرا نے دوسری طرح پر اپنی غزلیں پڑھیں۔ مقامی حضرات کو پڑھنے کی اجازت نہ تھی جمشید پور کے ترقی یافتہ شعرا اس تشدد آمیز پالیسی سے بہت دلگیر تھے حالانکہ بعض بندی شعرا کو اس خیال سے موقع دے دیا گیا تھا کہ انھوں نے کل مشاعرہ میں غزل نہیں پڑھی تھی۔ سامعین پر بانیانِ مشاعرہ نے بڑا ظلم کیا اس انتشار اور بے لطفی کو دیکھ کر بہت سے سامعین اٹھ کر چلے گئے۔ آج کا مشاعرہ کل سے بہت پھیکا رہا اگر دو چار شعرا اپنے غیر طرحی کلام سے لطف اندوز نہ کرتے تو یہ نشست بالکل ہی ناکام رہتی۔ دوسری نشست کے صدر "مربی ادب" سید تفضل کریم صاحب تھے۔ سید صاحب خود شعر نہیں کہتے لیکن بڑے سخن فہم اور ادب نواز ہیں۔

محض اس خیال سے کہ ہمیں اور بانیانِ مشاعرہ کو زیادہ زحمت نہ ہو ہم مشاعرہ ختم ہونے کے بعد اسی شب کو چار بجے اپنی عارضی قیام گاہ سے سید تفضل کریم صاحب کی کار میں پھر صابر صاحب کے یہاں آگئے سید صاحب سے راستہ میں خاصی گفتگو رہی۔ بڑے بلند اخلاق بزرگ ہیں۔

جمشید پور کے قیام میں برادرِ گرامی حضرت رونق دکنی نے بھی انتہائی خلوص کا ثبوت دیا کھانے پر بھی مدعو کیا اور دوسرے طریقوں سے بھی نوازا۔ رونق صاحب کا خلوص تو وہ نمائش سے بہت دور ہے۔ مولوی سید علی حیدر صاحب عابدی کی محبت اور عقیدت ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ جس کے مظاہرہ کی وہ کوشش بھی کرتے ہیں اور کر نہیں پاتے۔ انتہائی نیک اور زود احساس آدمی ہیں۔ انہوں نے بھی پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ برسنگر کے عزیز برادرم عبدالرؤف فوق لودھی ناپور سے برادرم نشاط الفاروقی اور برادرم تمکین دکنی بھی ملاقات کی غرض سے جمشید پور آئے۔ مجھے اپنے ان معنوی بھائیوں سے ملنے کی بڑی آرزو تھی اور میں اُن کا جوشِ ارادت و عقیدت اور خلوص دیکھ کر بہت مسرور ہوا۔ برادرم نشاط الفاروقی نے بطورِ خاص [illegible] سے بھی کام لیا۔

جناب محبوب عالم صاحب ڈپٹی کلکٹر سکریٹری مشاعرہ اور لفٹننٹ چودھری عبداللہ خاں صاحب اختر سے چند بار ملاقات ہوئی۔ محبوب عالم صاحب ایک نوجوان پُرجوش اور باعمل شخصیت کے مالک ہیں مگر افسوس کہ انکے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے والے کچھ زیادہ موزوں ثابت نہ ہوئے ورنہ مشاعرہ میں اتنی بدنظمی نہ ہوتی۔ چودھری عبداللہ صاحب کو بھی شعر و سخن سے بڑی دلچسپی ہے آپ آنریبل سر ظفر اللہ کے حقیقی بھائی ہیں۔ چودھری صاحب اور محبوب عالم صاحب ہی کی مساعی سے اس مشاعرہ میں کچھ زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔

آخر میں اپنے عزیز بھائی حبیب آرزوی کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ جو "اُن کمپنی" کی زبان میں "لوہے کے آدمی" ہیں۔ مجھے اُن پر غصہ بھی آتا ہے اور پیار بھی۔ بہرحال ان کے باعمل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ہمارے لئے اس مرتبہ خلوص محبت کا اتنا بھی مظاہرہ نہ کر سکے کہ ہمیں رخصت کرنے اسٹیشن تک آتے۔ پچھلی مرتبہ تو مجسم محبت ثابت ہوئے تھے۔

۲۸ جون کی شب کو جمشید پور سے روانہ ہو کر ۸ بجے صبح کلکتہ پہونچے۔ ہوڑہ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد ہی ہگلی کا پُل "ننگا ہو کر گویا اپنا سینہ تانے" ہوا سامنے آیا۔ یہ پل نیا نیا بنا ہے اور کئی سال میں تعمیر ہوا ہے اور میرے خیال میں فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے اس پل کی بلندی کشادگی اور تعمیر کا ذوق کلکتہ کے شایانِ شان ہیں۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ پل کلکتہ کے لئے وجہ زینت ہے یا کلکتہ اس کے لئے۔

برادرم محمد صادق صاحب ضیا ہمیں لینے اسٹیشن آئے تھے لیکن چونکہ ٹرین کئی گھنٹے لیٹ تھی اس لئے واپس چلے گئے۔ پھر ہم خود اُن کے یہاں پہنچ گئے۔ اُن کی مسرتوں کا پھر کیا ٹھکانا تھا دو دن اُن کے ساتھ ہنستے بولتے گذر گئے۔ ضیا صاحب علامہ سیماب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اُن کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں ان میں اس قدر شاعرانہ خوبیاں ہیں کہ اگر وہ اُن سے صحیح طور پر کام لیں تو مشاہیر شعرا کی صفِ اوّل میں نمایاں جگہ حاصل کر سکتے ہیں مگر وہ اپنا پروپگنڈا کرنا نہیں جانتے نہ انفرادی طور پر کلام چھپوانے کے عادی ہیں۔ جب جذبات میں جوار بھاٹا اٹھتا ہے تو کاغذ پر کچھ [illegible] بکھر جاتی ہیں اور سال دو سال میں وہ ایک مطبوعہ مجموعہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ کلکتہ میں اپنے برادرِ معظم محمد امین صاحب کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ امین صاحب بھی خلوص و محبت کا مجسمہ ہیں۔ امین صاحب اور ضیا صاحب نے حتی الامکان آرام و آسائش کا خیال رکھا۔ کلکتہ پہونچنے میں کئی مقاصد پنہاں تھے ایک تو یہ کہ ضیا صاحب، حضرت وحشت کلکتوی، جناب محمد صابر ضبط ایم اے اور برادرم نشاط سعید سے ملاقات ہو جائے دوسرے یہ کہ دوائی مالش کے ساتھ ٹرین میں جگہ مل جائے۔ افسوس کہ مقصد کی تکمیل صرف اس حد تک ہوئی کہ ضیا صاحب کے یہاں رہنے کی مسرت حاصل کر لی۔ حضرت وحشت کے مکان پر حاضری دی تو ملاقات نہیں ہوئی۔ مسٹر ضبط اور برادرم نشاط سعید کے تیے کہیں گم ہو گئے۔ ہاں مسٹر خورشید کی دوڑ دھوپ سے آگرہ آنے کے لئے ٹرین میں جگہ ضرور مل گئی۔ مجھے اسکا اعتراف ہے کہ اگر مسٹر خورشید نہ ہوتے تو شاید کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ملتی۔ جنگ کے تین سال بعد میں نے ایک طائرانہ نظر سے کلکتہ کو دیکھا [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ جنگ کے خطروں سے قریب ہے۔ وہی چہل پہل وہی خرید و فروخت اور وہی دوکانوں کی آرائش [illegible]

[illegible]

قسط ہشتم (گذشتہ سے پیوستہ)

.... کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں ___ بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرے کے بعد سیاحت میسور کے تاریخی مقامات کی سیر)

مدت ہوئی لارڈ کارنوالس کے اسٹاف آفیسر میجر ڈیرام کی یہ تحریر پڑھی تھی:-

"اسوقت قلعہ سے لیکر لال باغ تک آبادی ہی آبادی ہے جس کا مشرقی حصہ گنجام کہلاتا ہے جو ایک کچی مٹی کی دیوار سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر جو شہر ہے وہ برابر برابر مربعوں میں منقسیم ہے اور مربع کے چاروں طرف وسیع و فراخ اور خوشنما سڑکیں ہیں جن پر عمدہ سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔

گنجام سے مشرقی جانب وہ مشہور باغ ہے جو "لال باغ" کے نام سے موسوم ہے۔ باغ نہایت خوش وضع ہے۔ انواع و اقسام کے میوہ دار درخت لگے ہوئے ہیں روشوں کے دونوں طرف بلند و خوبصورت شمشاد کے درخت سایہ افگن ہیں۔

شہر کی مغربی جانب قلعہ کی سفید دیواریں ہیں۔ جن کے اوپر سے قدیم مندروں کی اونچی چوٹیاں اور مسجد کے بلند و بالا مینار نظر آتے ہیں۔ اُن کو دیکھتے ہوئے لال باغ پر جو خوبصورتی اور خوشنمائی کا ایک دلفریب منظر ہے۔ نظر کی جلئے اور اُن کے ساتھ ساتھ قلعہ اور اُس "لال باغ" کے درمیانی حصّہ کی گنجان آبادی کے مکانات کو بھی دیکھا جائے تو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کا یہ عروس البلاد اس زمانہ میں سب سے زیادہ متمول سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ سکون بخش خطۂ زمین ہے۔"

مگر آہ ___ صرف ۱۴۶ سال ہی میں سرنگا پٹم کی تمام جمال آرئیاں اور دلفریبیاں خاک میں مل کر رہ گئیں۔ اب تا حدِ نظر ویرانیاں ہی ویرانیاں ہیں اور ماتم گساری کے لئے چند کھنڈر ابھی تک باقی ہیں۔ چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک بورڈ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا جس پر انگریزی زبان میں DUNGEON لکھا ہوا ہے۔ یہیں سے قلعہ کی فصیل شروع ہوتی ہے یہ شمالی فصیل ہے فصیل کے قریب پہونچے تو اس سے ملحقہ چند تہ خانے دیکھے اور فصیل کے دامن میں کاویری ندی کو زعفرانِ ماہی پایا۔ ان تہ خانوں کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ ٹیپو سلطان اس میں انگریز قیدیوں کو رکھا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی ساخت بتا رہی ہے کہ یہاں فوج کے سپاہی اور اُن کے گھوڑے وغیرہ عارضی طور پر رہتے تھے۔ ہتھیار وغیرہ رکھنے کے لئے محراب بنے ہوئے ہیں۔ تہ خانوں کے سامنے وسیع صحن ہے۔ روشنی اور ہوا کا کافی گذر ہے۔ ایک بہت خفیف ڈیوڑھی ہے [illegible] یہاں بڑی ہوتی ہے۔ قلعہ کی فصیل بہت کافی [illegible] وسیع و عریض ہے اور میلوں چلی گئی ہے کہیں اونچی کہیں نیچی، کہیں سالم اور کہیں شکستہ۔

واپس ہوتے تو سمتِ جنوب ایک عالیشان مندر نظر آیا، کھنڈر کے باوجود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی نگہداشت کے لئے کافی انتظام ہے۔ دوسری قومیں اسے نہیں دیکھ سکتیں۔ پورے قلعہ کے حصار میں تین مندر ہیں۔ یہ مندر سری رنگ ناتھ کا مندر کہلاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج ہی تعمیر ہوا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سلطان شہید کے محل سے بالکل قریب ہے محل کے مشرقی حصہ میں بھی ایک مندر ہے۔ آگے بڑھے تو پتھر اور لوہے کا ایک مینار دیکھا۔ اسی جانب کچھ فاصلہ پر قلعہ کی فصیل ہی میں جو کاویری ندی سے ملحق ہے Water Gate لکھا ہوا ہے یعنی اس دروازے سے ندی میں سے پانی لیا جاتا تھا۔ قریب ہی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے The body of Tippu Sultan was found here. (ٹیپو سلطان کی لاش یہاں پائی گئی) حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ غلط ہے، سلطانِ شہید کی لاش جنوبی حصّہ میں پائی گئی تھی۔ قلعہ کے آخری دروازے کے پاس ایک مٹی کے ڈھیر کو باغیٔ اعظم میر صادق کا مزار بتایا جاتا ہے جو شکستہ اور قریب قریب زمین دوز ہے۔ آثار قائم نہ رہنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہاں آکر لوگ جوتے مارتے ہیں گویا میر صادق کی بغاوت کا انتقام لیتے ہیں۔ مشرقی دروازے کے قریب ہی ایک بہت بڑا پہیا لگا ہوا ہے۔ جس کے چلانے سے حصار سے ملحق کھائی میں پانی بھر آتا تھا اور سڑک ٹوٹ جاتی تھی۔ قلعہ کے سیکڑوں حصّے مسمار ہو چکے ہیں اور اُس کے اندر کی مشہور عمارتوں میں بھی چند عمارتیں شکستہ حالت میں رہ گئی ہیں۔ سلطان شہید کے رہنے کا خاص محل تو قریب قریب بالکل ہی منہدم ہو چکا ہے۔ حالانکہ مشہور سیاح بیجانن کی زبان میں ___

"سلطان کا محل ایک عالیشان سنگین عمارت ہے گو باہر سے یہ بالکل حقیر معلوم ہوتی ہے مگر اندر سے نہایت خوشنما ہے۔ سلطان جس حصہ میں رہتا تھا وہ محل کے ایک جانب ہے اور باقی تین جانب گودام ہیں۔ زنانہ خانہ میں جانے کے راستے میں شیر بندھے ہوئے تھے۔"

یہی نہیں بلکہ سلطان کے خاص کمرہ میں چاروں طرف ایک فٹ چوڑی اور لمبی عربی الفاظ میں قرآنی آیات کندہ تھیں اور اُن پر سونے کا پانی یا ورق چڑھے ہوتے تھے۔ سلطانی محل کے انہدام کے بعد اس کا بہت سا سامان فروخت کر دیا گیا ہے اور اسکے نصف سے زیادہ حصہ کے ستون [illegible]

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "جب تک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

محسنِ ادب حضرت نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اورئی

کاہش کبھی رہی کبھی دل کو خوشی رہی
انسان کی بھی کیا روشِ زندگی رہی —

ہم نے خزاں خزاں کو نہ سمجھا خدا گواہ
جب تک چمن میں ایک بھی پتی ہری رہی —

جب مُزدِ عاشقی کی تمنا ہے آپ کو
کہئے یہ عاشقی میں کونسی عاشقی رہی

کسکو خدا کا خوف تھا کس کو خدا کی یاد
دنیا تمام مستِ شرابِ خودی رہی

کیا کیا نہ عاشقی میں میسّر ہمیں رہا
صدمے رہے ملال رہا بیکسی رہی

نشتر شریک حال جو فضلِ خدا رہا
ہم کو کمی کبھی نہ کسی بات کی رہی

حضرت مولانا آلم مظفر نگری

گو یہ مصیبتوں کے بھنور میں گھری رہی
ساحل سے پھر بھی کشتیِ دل کھیلتی رہی

میرا مقام دونوں جہاں میں کہیں نہ تھا
تیری نگاہ مجھ کو کہاں ڈھونڈتی رہی

سازِ حیات میں گرچہ [illegible]
تا دیر پھر قفس کی طرف کیوں جھکی رہی

دل کی فنا کے سوگ کا عالم نہ پوچھئے
تا دیر اُن کی بزم میں بھی خامشی رہی

ہے آشیاں بخیر تو پھر کیوں تمام رات
صحنِ چمن سے تا بہ قفس روشنی رہی

کیا مرتبہ [illegible] در یار کا آلم
برسوں یہاں جبینِ محبت جھکی رہی

حضرتِ منظر صدیقی اکبرآبادی

سوزِ غمِ فراق میں جب آگ سی لگی رہی
اے دوست کر یقین، بڑی بیکلی رہی

ہر بات ہے مرے لئے گو مشکلات سے
لیکن وہ مہرباں ہوں یہ ایک ہی رہی۔

میری شکست پر مجھے طعنے نہ دیجئے
میں یوں بھی خوش ہوں جیت اگر آپ کی رہی

ہے زندگی بجائے خود اک قہقہے کی گونج
شبنم کیوں کریں نباہ اگر زندگی رہی

جھک کر کسی کے در پہ نہ اٹھی جبین شوق
شایانِ شانِ عشق مری بندگی رہی

منظر نگاہِ دوست میں رہتا ہوں آجکل
یہ فتح تو مرے دلِ ناکام کی رہی

حضرتِ آغاز برہانپوری

[illegible] فلک سے جان [illegible] رہی
اک آس تھی کہ سانس کی حد تک لگی رہی

[illegible]
دل میں اُتر کے اپنی نگہ ڈھونڈتی رہی

[illegible]
جاں زہر کی رہی بھی تو کیا زندگی رہی

پہنچا مجھے پیام وداعِ جمال کا
جب ہلکی ہلکی آخرِ شب چاندنی رہی

جبتک قریب ساقیِ مینا بدوش آئے
سائے میں سلسلے کے مجھکو گھٹا جھومتی رہی

دو پاکیا ادھر میں اُدھر دو جہاں کئے
دل کی لگی کے ساتھ عجب دل لگی رہی

حضرت آسی رڑکوی

محویتِ جمال میں جب تک کمی رہی
نا آشنائے امن و سکوں زندگی رہی

احساسِ بیکسی ہے حیاتِ خودی کی موت
اب زندگی بتائے کس کام کی رہی

اللہ رے فریفتگیٔ عالمِ مجاز
مرکز سے اپنے دُور حقیقت پڑی رہی

حیرت اثر ہے یہ تری جلوہ گری عام
اب تک مری نگاہ کسے دیکھتی رہی

آسی وہ کام کر جو رہے یادگارِ عمر
اب تک ہر اک بات تری عارضی رہی

حضرت جالب مظاہری سہسرامی

پیغامِ غم مدام نویدِ خوشی رہی
مجبورِ گریہ دہر میں میری ہنسی رہی

عقلِ فریب کار نے گمراہ کر دیا
ناکامیاب کوششِ منزل رسی رہی

پہنچا نہ کوئی قولِ "انا الحق" کی کنہ تک
وہ تیری معرفت کی حدِ آخری رہی

اُمیدِ دستگیریِ اہلِ جہاں غلط
دنیا تباہیوں کو مری دیکھتی رہی

عرفانِ حق نتیجۂ عرفانِ نفس تھا
آدم پہ بھی حقیقتِ آدم مخفی رہی

جالب کرو نگاہ زیرِ قلم صورتِ بہار
یوں ہی جو ملتفت نظرِ دلبری رہی

حضرت جمیل سیوہاروی

جب تک مری نگاہ میں خود آگہی رہی
بیگانۂ زوال مری زندگی رہی

جھلکا گیا جمال بہ قدرِ نیازِ عشق
کس درجہ کامیاب مری بندگی رہی

سمجھا بیانِ درد کو اظہارِ عاشقی
برسوں اس اعتبار پہ شرمندگی رہی

تھی تابناک سوزِ دروں سے مری نظر
دنیا چراغِ طور ہی کو دیکھتی رہی

تھی آتشِ ہوس کہ بھڑک کر ہوئی تمام
وہ شمعِ عشق تھی کہ جلی تو جلی رہی

میں خیر خود کو ہیچ سمجھتا رہا جمیل
فطرت مرے وجود سے کیوں کھیلتی رہی

---

[1] حضرتِ استاذی علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی

جناب نازش پرتابگڈھی

پیشِ حضورِ حسن عجب بیخودی رہی
اپنی جبینِ شوق جھکی تو جھکی رہی

دل میں شگفتگی نہ لبوں پر ہنسی رہی
نازش یہ زندگی بھی کسی کام کی رہی

وحشت رہی جنوں رہا دیوانگی رہی
اے دوست تو رہا تو عجب زندگی رہی

یا اب جلا رہی ہے مجھے آتشِ چمن
یا آگ میرے واسطے گلشن بنی رہی

اے دوست یہ جہاں یہ ستارے یہ ماہتاب
جب تو رہا تو ان میں بڑی دلکشی رہی

کیا جانے مجھ سے کنجِ قفس نے یہ کیا کہا
نازش اب آرزو بھی نہ پرواز کی رہی

جناب شاعر کاندھلوی

کچھ بھی خبر نہیں کہ وہ کب آئے کب گئے
مجکو جنونِ عشق میں وہ بے خودی رہی

دیوانہ اپنا ہم ہی بنا لیں گے حسن کو
دیوانگی جو اور کوئی دن یونہی رہی

کر دیتی خاک پھونک کے دنیا کو برقِ طور
اچھا ہوا کہ دل میں ہمارے دبی رہی

ابرِ کرم زمانے پہ برسا تو کیا ہوا
ہم کو تو آج تک وہی تشنہ لبی رہی

آنسو بہائے آتشِ دل پر تمام عمر
روزِ ازل جو دل میں لگی تھی لگی رہی

رکھدیگا سارے بھیدِ حقیقت کے کھول کر
شاعر کو شاعری سے جو وابستگی رہی

جناب پریم شیدائی دہلوی

محویتِ خیال میں مستی چھپی رہی
مجھکو تو بیخودی میں بھی اک آگہی رہی

ہر لمحۂ حیات مرا صرفِ آہ تھا
اس درجہ غم نواز مری زندگی رہی

ناقوس کی صدا میں نہاں تھی اذانِ عشق
یوں آشنائی دیر و حرم بندگی رہی

جسکی تپش نے پھونک دیا کوہِ طور تک
وہ آگ کس طرح مرے دل میں دبی رہی

لے اے جنونِ عشق، یہ دنیائے دل سنبھال
یہ ہوش، یہ خودی، یہ مری بیخودی رہی

کیوں پریم تھی یہ حسن و محبت میں کشمکش؟
کیوں موت زندگی کا تماشہ بنی رہی؟

جناب نسیم سیتاپوری

یوں عشق کی حیات معمہ بنی رہی
دیوانگی کے روپ میں فرزانگی رہی

وہ کیا شگفتِ گل سے جو آتا طراوتیں
جس کو بہار میں بھی خزاں آ گھری رہی

غم بھی کسی کی دین، خوشی بھی اسی کی دین
یہ کیوں کہوں کہ غم سے مجھے بیکلی رہی

شامِ غمِ فراق بھی صبحِ نشاط تھی
اس درجہ تیری یاد سے وابستگی رہی

غم بھی تو ایک نعمتِ جاوید عشق ہے
اچھا ہوا کہ وقفِ الم زندگی رہی

آنسو بھی اس کو کر نہ سکے سرد اے نسیم
جس طرح آگ دل میں لگی تھی لگی رہی

جناب مولانا خلیل از سگولی

کہئے تو اُسکی زندگی کس کام کی رہی
جس کو نہ اپنے آپ سے بھی آگہی رہی

چھپتے رہے ہزار وہ پردوں میں ناز کے
لیکن نگاہِ شوق انھیں دیکھتی رہی

اوراقِ گل ہیں چاک پریشان برگ و بر
پہلی سی اب نہ باغ میں وہ دلکشی رہی

بزمِ جہاں میں صبح نہ موزوں کوئی ملی
موقوف صبحِ حشر پہ جلوہ گری رہی

شاید اسی کا نام ہے معراجِ حسن و عشق
جب تک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی

دو دن کی زندگی تھی قفس کی مگر خلیل
حسرت سے مجھ کو برقِ چمن دیکھتی رہی

جناب شہید جہلمی

سوزِ غمِ فراق سے حالت بری رہی
سینے میں ایک آگ سی ہر دم لگی رہی

تیری نظر سے دل نہ اگر فیض یاب تھا
میرے حریمِ شوق میں کیوں روشنی رہی

اب ہو چکی درست مری حالتِ جنوں
اب تو مرے مزاج میں شوریدگی رہی

اے پیکرِ جمال ترے حسن کی قسم
تیرے بغیر زندگی بے کیف سی رہی

ہر چند مجھ کو تابِ نظارہ نہ تھی مگر
میری نگاہِ شوق اُسے دیکھتی رہی

اہلِ خرد کے واسطے محویتِ شہید
بعدِ فنا بھی ایک معمہ بنی رہی

جناب کلیم شمس آبادی

جبتک تمہاری چشمِ عنایت پھری رہی
میرے لئے عذاب مری زندگی رہی

خود سوچتا ہوں کٹ گئی کیونکر شبِ فراق
اے ہمنشیں نہ پوچھ جو حالت مری رہی

اُنکی نگاہِ مست کا اللہ رے اثر
"جبتک وہ سامنے رہے اک بیخودی رہی"

آتی رہی چمن سے مسلسل شمیمِ گل
مجھکو قفس میں بھی وہی دیوانگی رہی

غنچہ نے ہنس کے دل کو ہمارے مسل دیا
اچھا رہا مذاق، عجب دل لگی رہی

دل میں نہ ایک بار بھی دیکھا اُسے کلیم
اور سوئے طور آنکھ تمہاری لگی رہی

جناب ارشد صدیقی ساگری از ناگپور

دل پر کبھی رہی، تو جگر پر کبھی رہی
تم کو کہاں کہاں یہ نظر ڈھونڈتی رہی

ہم مر مٹے مگر نہ مٹی دل سے تیری یاد
مرنے کے بعد بھی وہی دیوانگی رہی

اب وقتِ صبح دیکھئے کیا ہو مآلِ عشق!
شب بھر تو ایک آگ سی دل میں لگی رہی

کاندھا دیا نہ تم نے جو آکر تو کیا ہوا!
آخر کسی غریب کی میت پڑی رہی؟

وہ حدِ اختیار سے آگے نکل گئے
پھر بھی نگاہِ شوق انھیں دیکھتی رہی

ہونا پڑے گا دامنِ صحرا سے ہمکنار
ارشد اگر یہ حالتِ دیوانگی رہی

حضرت عزیز اختر برصدی

سامانِ زندگی میں بہت ابتری رہی
دل پر محیط موت کی افسردگی رہی

کوئی خوشی بقدرِ خوشی کب ملی مجھے
ہر وقت مبتلائے الم زندگی رہی

جب تک چمن میں میرا نشیمن بنا رہا
بجلی فضا میں شام و سحر کوندتی رہی

گرچہ تمام عمر کٹی رنج میں مگر
میرے لبوں پہ پھر بھی ہنسی کھیلتی رہی

اختر فروغِ داغِ جگر کچھ نہ پوچھئے
میری لحد میں روشنی ہی روشنی رہی

جناب رعنا نظامی۔ راجوری (کشمیر)

دل وقفِ رنج و یاس رہا بے کلی رہی
جب تک رہی۔ رہینِ الم زندگی رہی

اب ہے سرِ نیاز میں تخلیقِ نازِ نو
ہم آپ کے بنے رہے جب تک بنی رہی

ہر اشک دلگداز تھا۔ ہر آہ شعلہ ساز
دل اور جگر میں آگ یہ کیسی لگی رہی

تنہائی کا نہ بھول کے آیا مجھے خیال
راہِ طلب میں ساتھ مرے بے کسی رہی

رعنا جب ان کی دل میں جگہ تھی تو کس لئے
اپنی نظر سرابِ تماشا بنی رہی

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

کل اُن کی انجمن میں عجب دل لگی رہی
بیٹھے رہے وہ پاس نظر ڈھونڈتی رہی

ساقیٔ کیف ساز کی انگڑائیاں نہ پوچھ
طاری دل و دماغ پہ اک بیخودی رہی

سُلجھی سکا نہ کوئی محبت کی گتھیاں
تقدیر میں گرہ جو پڑی تھی پڑی رہی

سارا زمانہ اُن سے ہوا ہمکلامِ شوق
میرے لبوں پہ مہرِ خموشی لگی رہی

ہم کرتے طرفہ خدمتِ سیماب کس طرح
ہر وقت اپنے ساتھ یہاں بے بسی رہی

جناب بیتاب کالپوی

رہینِ نشاطِ عشق مری زندگی رہی
بے کیفیٔ حیات میں بھی بیخودی رہی

منزل سے دُور دُور ہی رکھا نصیب نے
ناکام و نامراد مری زندگی رہی

ہوگی نہ ختم بزمِ جہاں کی تباہیاں
کچھ روز اور اگر یہی غارت گری رہی

ہم ہی بدل گئے ہیں طلسمِ روزگار سے
دُنیا ازل سے جیسی تھی ویسی بنی رہی

کیا کیا ملے ہیں ہوش و خرد کے سبق مجھے
بیتاب کام کی مری دیوانگی رہی

جناب خاور شہادوی مالیگانوی

تابِ جمالِ حسن سے وارفتگی رہی
"جب تک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

دیر و حرم کی سمت اُٹھائی نہ آنکھ بھی
جب تک ترے خیال سے وابستگی رہی

مجھ کو بنا گئی ہمہ تن شعلۂ شرار
وہ آتشِ فراق جو دل میں دبی رہی

پامالِ غم بہ مصلحتِ عشق میں رہا
ہر چند منزلوں سے مجھے آگہی رہی

خاور بنے گا خاورِ گردونِ شاعری
اس پر نظر جو حضرتِ سیماب کی رہی

جناب باقی اعظمی

جذباتِ عشق میرے ابھی تک بخیر ہیں
گو اُن کے التفات میں بیحد کمی رہی

اہلِ نگاہ سر بگریباں رہے مدام
لیکن حقیقت اُنکی چھپی کی چھپی رہی

وہ حادثاتِ دہر کہ اللہ کی پناہ!
کس طرح میری شاخِ تمنا ہری رہی

سو رنگ بدلے حُسنِ تلوّن مزاج نے
لیکن نیازِ عشق کی فطرت وہی رہی

محشر میں منفعل تھا میں بارِ گناہ سے
اور رحمتِ تمام مجھے ڈھونڈتی رہی

جناب وقار جون پوری (بمبئی)

صحنِ چمن کی ساری فضا خوشگوار تھی
لیکن ترے نہ ہونے سے پھر بھی کمی رہی

حُسنِ ستم شعار کی بدلی نہ کچھ روش
برسوں مزاجِ عشق پہ آشفتگی رہی

تھا ہوش ہی کہاں کہ ہوں سیرابِ دید ہم
"جب تک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

تھی ایسی سازگار ہوائے قفس مجھے
صحنِ چمن میں فکرِ قفس کی لگی رہی

عیش و نشاطِ دہر کا کیا اعتبار ہے
دُنیا میں کب کسی کی وقار ایک سی رہی

جناب عالی علی نگر پور

دیر و حرم ہوں صومعہ ہو یا ہو خانقاہ
ہر سو نظر نواز تجلی تری رہی

دھوکے دیئے خرد کو جنوں ساز عشق نے
شورش سے کھیلتی ہوئی فرزانگی رہی

رعنائی جمالِ جہاں تاب کے سوا
ہر چند پر نگاہ مری سرسری رہی

جلووں سے اُنکی یاد نے معمور کر دیا
میری شبِ سیاہ میں بھی چاندنی رہی

ایک بار پائے ناز سے اُٹھا سرِ نیاز
عالی تمام عمر کو شرمندگی رہی

جناب جلیس مالیگانوی

منزل پہ آکے حسرتِ منزل وہی رہی
کس درجہ پائے شوق میں وارفتگی رہی

دل کو کسی کی یاد سے اس طرح تھا لگاؤ
شبنم کو جیسے پھول سے وابستگی رہی

مغموم دل، فسردہ طبیعت، شکستہ حال
کتنی اداس شامِ الم زندگی رہی

آئینۂ خودی میں تھا منصور خود نگر
اپنا سا عقل و ہوش میں کیوں برہمی رہی

یہ تو جلیس اُنکی نگاہوں کا فیض تھا
مجھکو مذاقِ شعر میں جو برتری رہی

جناب خلیق اولوی

کچھ تو نہیں ملال جو دم بھر خوشی رہی
یہ زندگی بھی اپنی عجب زندگی رہی

جیسے نہ آسکے گا کوئی اس میں انقلاب
ایسی مرے خیال کی دُنیا بسی رہی

گھر تھا کہیں نہ کوئی ٹھکانہ تھا دشت میں
کیا کیا تلاشِ دوست میں آوارگی رہی

ان مست [illegible]
طاری دل و دماغ پہ اک بیخودی رہی

ناکامیوں کا ساتھ رہا اگرچہ اے شفیق
لیکن مری اُمید ہمیشہ بندھی رہی

جناب برگ باندوی

احساس دل بہار میں اک تازگی رہی
جب تک رہا شباب عجب زندگی رہی

کب اعتبار گلشن ہستی کا تھا مجھے
سیر چمن لنظر میں مری عارضی رہی

جلوے تھے گل جمال کے نگاہوں کے سامنے
ہشیاریوں سے بڑھ کے مری بیخودی رہی

اے برگ غم نے لوٹ لی دُنیائے آرزو
جذبات دل رہے نہ وہ اب شاعری رہی

جناب اثر دانکی بنگلوری

جلوؤں کو ان کے میری نظر ڈھونڈھتی رہی
اور اُنکی میرے دل ہی میں جلوہ گری رہی

جبتک جمال یار نظر دیکھتی رہی
دل میں سرور روح میں بالیدگی رہی

یوں تو خیال یار سے میں بھاگتا رہا
پھر بھی مجھے اسی کی کشش کھینچتی رہی

کیا کہئے التفات دل دوستاں اثر
صحبت ہماری باعث افسردگی رہی

جناب اکرم حنیفی دھولوی

غم سے مجھے نشاط الم سے خوشی رہی
ہر طرح کامیاب مری زندگی رہی

تو دلنواز تھا، تو محبت شناس تھا!
پھر کیوں مجھے عذاب تری دوستی رہی

عالم تمام میری نظر سے گذر گیا!
ایسی ترے خیال میں وارفتگی رہی

دل کو ملی نہ آتش جذبات سے نجات
اکرم عذاب میرے لئے شاعری رہی

جناب انور شہادوی

تاثیر عجز یا کشش بندگی رہی
میری جبیں جھکی تو جھکی کی جھکی رہی

پھولوں کے رنگ میں کبھی تاروں کے نور میں
جلوے ترے، نگاہ مری دیکھتی رہی

یا تیری جلوہ گاہ پہ میری نگاہ تھی
یا میری آنکھوں میں تیری جلوہ گری رہی

انور ہوا فراق میں کچھ کم نہ اضطراب
باقی دل و جگر میں وہی بے کلی رہی

جناب شنا ایٹی از گوالیار

قربان اُن پہ دل بھی رہا جان بھی رہی
اُن کی خوشی کیساتھ ہماری خوشی رہی

بری نگاہ شوق کی بیباکیاں نہ پوچھ
جلوؤں کو دیکھنے کی طرح دیکھتی رہی

بالیں سے وقت نزع وہ یہ کہکے چلدیے
جاتے ہیں، پھر ملیں گے اگر زندگی رہی

گستاخ میں وقت سکوں بیچ لے شنا
دُنیا کو دیکھئے کہ مجھے دیکھتی رہی

جناب فوق نمدار گنجوی

بجلی نفس نفس میں مرے کوندتی رہی
نیچی نگاہ آپ کی جب تک اُٹھی رہی

کس کا نظارہ کیسی خوشی اور کہاں کی بات
"جبتک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

دکھ دو نگاہ چاک کرکے میں دامان عقل و ہوش
کیفیت جنوں جو کوئی دن بھی رہی

جبتک نگاہ لطف رہی مجھ پہ اُنکی فوق
وابستہ نشاط مری زندگی رہی

جناب فیق شہادوی

تھا اُنکے رعب حسن کا محفل میں یہ اثر
طاری حواس و ہوش پہ وارفتگی رہی

گلچیں کا خوف برق کا ڈر خطرۂ خزاں
دہشت زدہ چمن میں مری زندگی رہی

مجھ سے جنون عشق کی وارفتگی نہ پوچھ
"جبتک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

ناکامیوں میں کٹ گئے دن زیست کے رفیق
افسوس کام کی نہ میری زندگی رہی

جناب بقا جونپوری

محروم التفات مری بیکسی رہی
شاید مری ہی جذب اثر میں کمی رہی

رونا یہ ہے کہ تم نے نہ پوچھا کبھی مجھے
دُنیا تباہ حال مجھے دیکھتی رہی

کس کس ادا کو اُن کی کہوں داستاں بقا
جب ہر ادا ہی جان تمنا بنی رہی

جناب شوق شہادوی

جبتک تیرے خیال سے وابستگی رہی
تاروں کی روشنی میں بھی اک دلکشی رہی

جبتک نظر کو فرصت آسودگی رہی
میری نگاہ شوق تجھے ڈھونڈتی رہی

اُن کو تو شوق طرز خموشی تھی ناگوار
مانا کہ خامشی میں تری بات بھی رہی

جناب نیر ازبمبئی

افسوس اُن سے راز محبت نہ کہہ سکا
"جبتک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

گلشن سے احتراز، بیاباں سے احتراز
شاید یہی جنوں کی حد آخری رہی

نیر بر آئے کار نہ آئی کوئی امید
ناکام و نامراد مری زندگی رہی

جناب معصوم انصاری بیاوری

کچھ اس ادا سے اُنکی نظر دیکھتی رہی
"جبتک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

قدموں پہ تیرے جان نکل جاتی کاش کے
اے دوست عمر بھر مجھے حسرت یہی رہی

معصوم ہم کو نسبت والائے عشق ہے
ملکر رہینگے اُن سے اگر زندگی رہی

جناب ہلال بریمی ازکوکشی

ہرگز نہ تیرے فیض کرم کی کمی رہی
کوتاہی صرف میرے ہی دامان کی رہی

کچھ دن ترے فراق میں یوں زندگی رہی
آنکھوں میں اشک اور لبوں پر ہنسی رہی

جیسے خدا کو بھول گیا ہوں مرا ہلال
ایسی بتوں کی یاد میں وارفتگی رہی

جناب سلام ساگری

ظرف نظر پہ مجھ کو بہت ناز تھا مگر
"جبتک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

عکسِ جمالِ دوست سمجھ کر شبِ فراق — تاروں ہی سے نگاہ مری کھیلتی رہی
رُخ کیا کسی نے پھیر لیا مجھ سے اے سلام — مشقِ سخن رہی نہ مری شاعری رہی

جناب سلطان لقشبندی پارولوی

اُن کی نگاہ جس پہ پڑی کام کر گئی — اک ایسا کام جسکی حقیقت چھپی رہی
لاؤں کہاں سے حوصلۂ عیش و انبساط — اب دل میں میرے آہ کہاں زندگی رہی
سارا جہاں شکارِ مصائب ہے آجکل — سلطاں کہاں وہ پہلی سی اب زندگی رہی

جناب شمیم زیدی کیتھلوی

میرے مذاقِ شعر سے آئیگا انقلاب — اب تک تو لذتوں کے لئے شاعری رہی
جاں پر بنے شمیم تو شاید ہو مہرباں — دل کی لگی تو اُس کے لئے دل لگی رہی

جناب فدا از بمبئی

وہ بات آج ہو گئی خود مجھ پہ منکشف — کل تک مرے لئے جو معمّا بنی رہی
تا عمر اُسکی دید سے محروم ہی رہا — افسوس میری زندگی ناکام ہی رہی

جناب فردوس شہادوی مقیم مالیگاؤں

اس خوف سے نہ کر سکا تعمیر آشیاں — برقِ تپاں قریبِ چمن کوندتی رہی
مل جائیگی پناہ جہنم کی آگ سے — فردوس بے ریا جو تری بندگی رہی

جناب مَن ساگری

آتا دیا نہ ساتھ کسی غمگسار نے — جتنی ہمارے ساتھ یہاں بیکسی رہی
اعمال کی نہ اپنے ہوئی باز پرس تَن — اپنے کئے کی آپ ہی شرمندگی رہی

جناب غافل از بیتول

اللہ رے اُنکے حسن کی وہ کیف باریاں — "جبتک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"
صحرا کی خاک چھانتے گذری تمام عمر — غافل ہماری زندگی کیا زندگی رہی

جناب خاور حیدرآبادی

اشکوں نے کی بجھانے کی کوشش بہت مگر — فرقت کی آگ دل میں لگی تھی لگی رہی

جناب نصیر انصاری بیاوری

مجھکو شرابِ حسن نے مخمور کر دیا — "جب تک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

جناب ساجن انصاری بھیمڑوی

اُس بُت کی اور اپنی گراں نہ کس طرح — ساجن جہاں میں کسکی ہمیشہ بنی رہی

جناب سوہن لال تیرتا از شملہ

احوالِ ہجر کیسا اگر اسکو کیا کر دل — "جب تک رہے وہ سامنے اک بیخودی رہی"

اصلاحِ سخن :- حضرت حکیم محمد افتخار علی صاحب جگر صدیقی وارثی مینائی بسوانی کا خط ایڈیٹر "شاعر" کے نام

"آبر گنوری کی ہیچ و پوچ تحریریں مشاہیر اساتذہ ، ماہرِ فن اور اہل الرائے طبقہ میں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کا اندازہ حضرت جگر بسوانی کے مندرجۂ ذیل کتوب سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ایسے خطوط بڑی تعداد میں شائع کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں صرف ایک ہی خط پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ گنوری کو اپنی سفاہت اور بے علمی کا کچھ اندازہ ہو اور وہ شرم سے اپنی گردن نیچی کر لیں ——— مگر اس کی اُمید کم ہے اس لئے کہ گنوری جی اب تو مارو" کہنے کے عادی ہیں اور اُن کا وجود "زمانۂ جاہلیت" کا مجسم مرقع ہے ——— جب ان "ادبی فنڈوں" کے لیڈر کا یہ حال ہے تو احسنی جماعت کے دوسرے صاحبزادگان سے جن کے منہ سے ہنوز دودھ کی مہک آ رہی ہے۔ طفلانہ حرکات کا سرزد ہونا فطری امر ہے۔"

اعجاز صدیقی

محترم و مکرم مدیر صاحب تسلیم۔

رسالہ فصاحت مطبوعہ جولائی ۱۹۴۲ء صفحہ ۲ زیرعنوان "سیماب صاحب کی اصلاحوں پر ناقدانہ نظر" کمترین جگر صدیقی کی نظر سے گذرا بے حد افسوس کے ساتھ گذارش ہے کہ شعرائے زمانۂ حاضرہ میں اکثر حضرات نے سخنورانِ صاحب کمال پر جا و بیجا تنقید کرنے کو ذریعۂ شہرت بنا لیا ہے تنقید و تبصرہ کے مقاصد کو پس انداز کر کے ذاتیات پر اُتر آتے ہیں جو دنیائے ادب میں بدترین کم ظرفی ہے۔

آبر گنوری شاگرد حضرت احسن مرحوم مارہروی نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے کہ جناب سیماب نے غلط پروپگنڈا کر کے دنیائے شاعری میں اعتبار حاصل کیا ہے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے ـــ کیا دنیائے سخن میں بغیر مشق کامل۔ استعدادِ علمی زورِ طبیعت صرف پروپگنڈا کے ذریعہ شہرت حاصل ہو سکتی ہے۔

میری ستاؔئیس سال کی مشق مجھے نفی میں جواب دیتی ہے

جناب آبر گنوری سے مجھے صرف اسی قدر واقفیت ہے کہ آپ خلد مکاں حضرت احسن مرحوم کے شاگرد ہیں اور آپ کی مشقِ سخن تخمیناً بیس سال سے تجاوز کر گئی ہوگی۔ آپ حضرت سیماب کی اصلاح پر تنقید فرماتے ہیں۔ سیماب ساٹھ سال سے دریائے سخن کی شناوری کا لطف اُٹھا رہے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی حضرت آبر کی تنقید اور تنقید سے بیشتر ذاتیات کا پستول کلام میں لانا کسی دلی کاوش کو صاف طور پر ظاہر کر رہا ہے اگر کچھ کبیدگی تھی تو سیماب صاحب سے رفع ملال کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا جو شانِ اسلام کے خلاف ہے۔

فنِ شاعری وہ سحر آفریں فن ہے جو ہیجان طبیعت والے شاعر کے دماغ میں جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے کو تیر و بیمار سمجھتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے دماغ تو وقتِ نظم پر تیار رہتا ہے۔ لیکن آنکھیں بند رہتی ہیں۔

اگر دو شاعروں میں ایک کی مشق دس سال کی اور دوسرے کی "گیارہ" سال کی ہے تو گیارہ سال والا بہتر سمجھے گا۔ یہاں آبر و سیماب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دس بیس سال کی مشق ابتدائی کہی جاتی ہے۔ پچاس ساٹھ سال کی مشق کمال کی حد پر پہنچا دیتی ہے کسی کلام میں (؟) تغیر و تبدل کرنا مبتدی کے لئے مشکل اور منتہی کے لئے آسان ہے جناب آبر نے سیماب صاحب کی اصلاح میں جو اصلاحی لفظ استعمال کئے ہیں وہ منتہی ہونے کا ثبوت دینے سے قاصر ہیں۔

منظر سیانوی سیابی کا مطلع ہے ؎

یا نظر میں جرأت نظارہ پیدا کیجئے | یا نہ پھر بے فائدہ تقلیدِ موسیٰ کیجئے

مطلع میں سیماب صاحب نے بحرِ خدا قلم زد کر کے بے فائدہ جائز رکھا ہے۔ آبر صاحب کا کہنا ہے ایک حشو نکال کر دوسرا حشو کلام میں لایا گیا ہے اور خود یوں اصلاح فرماتے ہیں ؎

"یا دمِ جلوہ گری تقلیدِ موسیٰ کیجئے" لیکن

آبر صاحب "بے فائدہ" کو حشو فرماتے ہیں۔ "دمِ جلوہ گری" کو برائے بیت کہا جائے تو ذرا خلافِ انصاف نہ ہوگا۔ اب مطلع کو سمجھ لیجئے۔

یا جرأتِ نظارہ پیدا کیجئے یا تقلیدِ موسیٰ کیجئے۔ دمِ جلوہ گری کی ضرورت نہیں باقی رہتی مضمون ختم ہو گیا ایک مشاق کے کلام سے کوئی لفظ نکال کر اس سے اچھا لفظ لگانا مشقِ شاعری ذریت اللہ سے باہر ہے۔ جناب آبر کی اور بھی اصلاحیں اسی انداز کی ہیں جنکو پبلک میں لانا فضول ہے۔

دعاگو **جگر صدیقی وارثی از بسوا**

ادب و شعر کا بہترین ذخیرہ

کمالِ داغ - یہ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی مرحوم و مغفور کے چاروں دیوانوں کا ایک ایسا نکھرا اور معیاری انتخاب ہے جو اب سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر مولوی حامد حسن قادری کا بسیط تنقیدی مقدمہ اس دیوان کی جان ہے۔ قیمت ۸؍

گلزارِ داغ - فصیح الملک مرزا داغ کا مشہور دیوان — جس کا ہر شعر نشتر ہے قیمت ۱؍۸

روحِ نظیر - میاں نظیر اکبرآبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ جناب مخمور اکبرآبادی بی۔ اے ایل ایل۔ بی کا بسیط اور فاضلانہ مقدمہ دیکھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۸؍

جگر پارہ - حضرت بیدم شاہ وارثی کا متصوفانہ اور سوز و گداز سے پُر کلام قیمت صرف ۱۲؍

مصحفِ بیدم - حضرت بیدم شاہ وارثی کا دوسرا متصوفانہ مجموعۂ کلام جس میں اُن کا تمام کلام سنہ وار اور تاریخوں سے درج ہے۔ اس دیوان کا مقدمہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے تحریر فرمایا ہے مع تصویرِ مصنف قیمت ۱؍

ایاغِ بزم - حضرت مرزا اعاشق حسین بزم اکبرآبادی کا دوسرا نو مطبوعہ دیوان جس میں محاکات و معاملات کا دریا موجزن ہے قیمت ۸؍

قصائدِ نجم - حضرت نجم آفندی اکبرآبادی خلف حضرت بزم اکبرآبادی کی لاجواب تصنیف مدحِ رسول و آلِ رسول میں بلند پایہ نعتیں اور قصائد قیمت ۱؍

نقوشِ مانی - حضرت مانی جائسی کا دیوان۔ ایک ایک شعر جذبات و واردات کا صحیح نمونہ ہے قیمت صرف ۸؍

میکدہ - جناب مولوی سید محمد علی شاہ میکش قادری اکبرآبادی کے جذباتِ حسن و عشق اور متصوفانہ کلام کا بہترین مجموعہ مع تصویرِ مصنف قیمت ۱؍

نشترکدہ - مجموعۂ غزلیات بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر نیگامی ایڈووکیٹ۔ اگر آپ قدیم رنگِ تغزل کو جدید مذاق کے ہمدوش دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ دیوان ملاحظہ فرمایئے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ حجم ۳۶۸ صفحات مع تصویرِ مصنف قیمت ۸؍

نورِ مشرق - حضرت ضیا فتح آبادی پنجاب کے خوش فکر شعرا میں سے ہیں جن کا نام صفِ اوّل میں آتا ہے یہ انھیں کی بلند اور معیاری نظموں کا مجموعہ ہے جس میں کیف و اثر کا ایک سمندر موجیں مارتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کتاب مجلد اور مکلّف مع خوبصورت گرد پوش ہے قیمت ۱؍

صبحِ مشرق - محمد صادق ضیا بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کا کلیات نظم و غزل۔ ضیا کی شاعری مُردہ جذبات میں زندگی کی روح پھونکتی ہے۔ ضیا اپنے وقت کا بہترین مصور اور فنکار ہے۔ جس کا ہر شعر تاثرات و احساسات کا جیتا جاگتا مرقع ہے حجم ۲۵۶ صفحات مجلد مع تصویرِ مصنف۔ قیمت ۸؍

مشہور مثنویاں اور دیوان

الہامِ منظوم - حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی نے مثنوی مولانا روم کے مکمل چھ دفتروں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ نثر کے ترجمے تو آپ نے بہت دیکھے ہونگے منظوم ترجمہ بھی دیکھئے اور پہلی فرصت میں خریدیئے اس کا ترجمہ یہ کتاب ایک شاہکار کتاب ہے قیمت فی دفتر ۲؍ مکمل چھ دفتر ۱۲؍

مثنوی عالمِ خیال - حضرت مرزا شوق فدائی لکھنوی مرحوم کی مشہور مثنوی محبت آمیز جذبات منظوم نہایت دلکش طرز پر خوبصورت چکنا پر مزین قیمت مجلد مع رنگین تصاویر ۱؍

مثنوی مادرِ ہند - مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ یہ مثنوی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی ہے اس میں ہندوستان کی مکمل سیاسی تاریخ ہے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی اور رشید احمد صدیقی کے مقدمے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں قیمت ۱۲؍

مثنوی ظہورِ رحمت - مصنفہ حضرت شاد عظیم آبادی۔ یہ مثنوی ولادت نبوی کے متعلق دلکش اور عقیدت مندانہ پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۸؍

مثنوی زہرِ عشق - بہارِ عشق۔ لذتِ عشق۔ فریبِ عشق۔ یہ چاروں مثنویاں جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور چاروں یکجا مجلد ہیں قیمت صرف ۱؍

اربعہ عناصر - حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی کی رموز و نکات سے لبریز رباعیات کا مجموعہ۔ قیمت ۸؍

مینائے سخن - منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی مرحوم کی تمام دواوینوں کا بے نظیر مجموعہ قیمت ۱؍

شبابیات - مصنفہ حضرت ساغر نظامی۔ موضوع شباب پر ۲۴۰ حسین رباعیات کا بے مثل مجموعہ قیمت صرف ۲؍

حدیثِ ناتمام - پنڈت دبرانچ آبر پنجاب کے مشہور شاعر ہیں۔ یہ انھیں کی نظموں، غزلوں اور قطعات کا دلفریب اور وجد آفریں مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۲؍

سازِ حیات - از محمد منیر اکبر اکبرآبادی۔ یہ جنگ، حفاظتِ وطن اور عمل و جہاد کے ولولہ انگیز جذبات سے پُر نظموں کا مجموعہ ہے جس کے متعلق علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا کا خیال ہے کہ یہ میدانِ جنگ میں اسلامی سپاہیوں کے لئے مفید ہے۔ قیمت ۱؍

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی مختلف نظمیں

شکوہ، جوابِ شکوہ ۴؍ شمع و شاعر ۳؍ فریادِ امت ۴؍ اکبری اقبال ۳؍ ترانہ خیبر ۳؍ تصویرِ درد ۳؍

تصانیف حضرت مولانا حالی پانی پتی مرحوم

مسدس حالی (عکسی) مسدس حالی (سادہ) ۸؍ مرثیہ مرزا غالب ۲؍ مناجات بیوہ ۲؍

مذہبی کتابیں

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق - از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ اصولِ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث اسلام کے ابوابِ اخلاق کی تشریح اور برتری علم و تحقیق کی روشنی میں بڑا سائز حجم ۴۴۰ صفحات قیمت ۱؍۸

غلامانِ اسلام - مولفہ مولانا سعید احمد ایم۔ اے (فاضل دیوبند) اس میں ان مقدس ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل تحقیق و جستجو سے جمع کئے گئے ہیں۔ جو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کے فلکِ الافلاک سمجھے جاتے تھے۔ بڑا سائز حجم ۵۲۲ صفحات قیمت ۱؍

اسلام میں غلامی کی حقیقت - مولفہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم۔ اے فاضل دیوبند۔ اس میں غلامی کی حقیقت اُس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث۔ غلامی کا آغاز کب سے ہوا۔ اسلام نے اس میں کیا کیا اصلاحات کیں۔ غرض بہترین کتاب حجم ۲۷۲ صفحات قیمت ۱؍

صحابہ کے خلفائے - قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے مستند و مکمل حالاتِ زندگی۔ مستند تصنیف ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ حجم ... صفحات قیمت صرف ...

(... منیجر ...)

سالِ اجرا موسمِ بہار ۱۹۳۰ء ——— عرصۂ اشاعت ۱۳ سال

زیرِ سرپرستی ——— اعلیحضرت رسوا مطلومی والئی پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ
محکمۂ تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار
محکمۂ تعلیم ریاست میسور

منظور شدہ
حکومت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ
محکمۂ تعلیم ریاست کشمیر



تصویر: خطیبۂ ہند "زہرۂ سخن" سیدہ نواب سردار بیگم صاحبہ اختر حیدرآبادی

ناگزیر

نقادکار کا جائزہ لیتے ہوئے میں مطمئن تھا کہ ستمبر ۱۹۴۳ء کا "شاعر" زیادہ سے زیادہ ۲۰-۲۲ تاریخ تک شائع ہو جائیگا مگر طباعت میں غیر متوقع طور پر اتنی دیر ہوگئی کہ یہ مہینہ اپنے نقطۂ آخر پر آ گیا [illegible] کے ساتھ وقت پر "شاعر" کی اشاعت کے بعد موجودہ تاخیر، خریداروں کی زحمتِ انتظار، ایجنٹوں کی گھبراہٹ، "شاعر" سے محبت کرنے والوں کے شکایتی خطوط اور شدید نقصان کا خیال [illegible] آغازِ جنگ سے اس وقت تک شدید مشکلات کے باوجود "شاعر" کو پابندی کے ساتھ شائع کیا گیا، مشکلات کی آندھیاں اٹھیں، طوفان آئے، کاغذ کے لئے شہر شہر گھومنا پڑا، موت اور زندگی کے واقعات رونما ہوئے [illegible] سفر کرنے پڑے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ "شاعر" کسی ماہ شائع نہ ہوا ہو۔ "شاعر" کی مکمل خدمات اور پابندیوں کے پیش نظر مجھے یقین و اعتماد ہے کہ ناظرین اس اتفاقی اور تمام عمر میں پہلی بار پیدا ہونے والے اختلال [illegible] نمبر کے بہ تاخیر شائع ہونے سے پیدا ہوا ہے محسوس نہ فرمائینگے۔

اس غیر معمولی تعویق و تاخیر کے بعد "شاعر" کو وقت پر لانے کی صرف یہی صورت ہے کہ زیرِ نظر اشاعت کو "ستمبر اور اکتوبر" کا **مشترک نمبر** سمجھ لیا جائے۔ میں ذاتی طور پر مشترک اشاعت کا ہمیشہ مخالف رہا ہوں حالانکہ اس دور کی مشکلات کے تحت اکثر مقتدر رسائل ایسا کر رہے ہیں۔ اب **نومبر ۱۹۴۳ء کا "شاعر"** اکتوبر کی آخری تاریخوں میں یہاں سے پوسٹ کر دیا جائیگا تاکہ پہلی تاریخ تک ناظرین کے ہاتھوں تک پہونچ جائے اور آئندہ بھی ہر نمبر ہمیشہ اسی طرح شائع ہوا کرے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ نومبر کے "شاعر" میں کافی صفحات کا اضافہ کر دیا جائے گا تاکہ اس مشترک نمبر سے پیدا شدہ کمی پوری ہو جائے اور خریدار نقصان میں نہ رہیں۔

جن حضرات کا زرِ سالانہ ستمبر اور اکتوبر میں ختم ہو رہا ہے انھیں نومبر ۱۹۴۳ء کا "شاعر" وی۔ پی بھیجا جائیگا۔ **مشاعرۂ شاعر** کے لئے جو مصرع طرح اس نمبر میں دیا جا رہا ہے وہ [illegible] کے لئے بھیجا جائے۔ اب غزلیں یکم نومبر ۴۳ء تک بھیجی جا سکتی ہیں۔

۲۴ ستمبر ۱۹۴۳ء

اعجاز صدیقی مدیر "شاعر"

چندہ سالانہ عوام ۴ روپے، خواص ۶ روپے، ہمدردوں ۱۲ روپے، انیسوں ۱۵ روپے، معاونین ۲۴ روپے، محبوں ۵۰ روپے، محسنین ۶۰ روپے، سرپرستوں ۱۲۵ روپے

محسنین، مربی، معاونین اور انیسان و ہمدردانِ شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ سالانہ
(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۶۰ سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ
(۴) محسنِ ادب وزیر زادہ شجاعت خانصاحب اظہر جوناگڈھی ۶۰ سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۵) مربی ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں سرکرنل حشمت اللہ خانصاحب مرحوم کے۔ ٹی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵۰ سالانہ
(۶) مربی ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز و اسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹانگر) ۵۰ سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاون ادب مسٹر اے۔ بی فلیس صابر بی۔ اے اکبرآبادی ۲۲ سالانہ
(۸) معاونۂ ادب محترمہ کمر تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ایڈیٹر رسالہ "ادب" دہلی ۲۲ سالانہ
(۹) معاونِ ادب جناب مولوی محمد حسین حقانی سی سی توطن ٹنڈکی (بمبئی) ۲۲ سالانہ
(۱۰) معاونِ ادب جناب صوبہ دار اختر علی صاحب گوالیار ۲۲ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۱) ہمدرد ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندھری ۱۲ سالانہ
(۱۲) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب تسیم گوالیار ۱۲ سالانہ
(۱۳) ہمدرد ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی جمشید پور ۱۲ سالانہ
(۱۴) ہمدرد ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب ممتاز جوناگڈھی ۱۲ سالانہ
(۱۵) ہمدرد ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲ سالانہ
(۱۶) ہمدرد ادب جناب نواب زادہ شکور حسین خانصاحب تمکین آف ہنڈو ۱۲ سالانہ
(۱۷) ہمدرد ادب جناب سید غلام محمد شاہ صاحب رئیس اعظم رجوعہ چنیوٹ ضلع جھنگ ۱۲ سالانہ
(۱۸) ہمدرد ادب محترمہ بلقیس جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھ ۱۲ سالانہ

خاصانِ ادب

(۱۹) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ۶ سالانہ
(۲۰) جناب عبدالحفیظ صاحب قمر صدیقی چھرادی بی۔ اے ۶ سالانہ
(۲۱) جناب لالہ گنگا رام صاحب ابد سرہندی ۶ سالانہ
(۲۲) جناب سید مظفر حسین صاحب قرشی غازی آبادی ۶ سالانہ
(۲۳) جناب محمد عبداللہ خانصاحب بزم امروہوی ۶ سالانہ
(۲۴) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیر کوٹی ۶ سالانہ
(۲۵) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر بمبئی ۶ سالانہ
(۲۶) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶ سالانہ
(۲۷) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ۶ سالانہ
(۲۸) جناب طالق ہمدانی لدھیانوی ۶ سالانہ
(۲۹) جناب سبحان خانصاحب فلک چیل ۶ سالانہ

(۳۱) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶ سالانہ
(۳۲) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹا ہ ۶ سالانہ
(۳۳) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ۶ سالانہ
(۳۴) جناب حکیم مولوی عبدالرحمٰن صاحب شاعر کاندھلوی ۶ سالانہ
(۳۵) جناب پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ سالانہ
(۳۶) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر شکوہ آبادی ۶ سالانہ
(۳۷) جناب کنور فاروق علی خاں صاحب عارف رئیس ہنڈو ۶ سالانہ
(۳۸) جناب مقبول احمد صاحب سحر اعظم گڑھی ۶ سالانہ
(۳۹) جناب مولوی نظیر الدین صاحب نظر راماس گورداسپوری ۶ سالانہ
(۴۰) جناب ڈاکٹر ماہر شاہ صاحب استعانہ زیب بریلوی ۶ سالانہ
(۴۱) جناب حبیب الرحمٰن صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ سالانہ
(۴۲) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب بروانی اسٹیٹ ۶ سالانہ
(۴۳) جناب من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی۔ پی) ۶ سالانہ
(۴۴) جناب میاں محمد مخدوم صاحب رئیس چک جانہ پنجاب ۶ سالانہ
(۴۵) جناب محمد حسین صاحب خادم شبلوی دہلی ۶ سالانہ
(۴۶) جناب چودھری حلیم یار صاحب ندیلہ ۶ سالانہ
(۴۷) جناب سید شاہ عنایت مولیٰ صاحب ناباں القادری دناپور (بنگال) ۶ سالانہ
(۴۸) جناب جمعدار سی۔ بی مجاور صاحب بمبئی ۶ سالانہ
(۴۹) جناب شیخ عبدالرحمان صاحب شباب دہلوی لیواوی ۶ سالانہ
(۵۰) جناب ملک قربان حسین صاحب شہید جہلمی بمبئی ۶ سالانہ
(۵۱) جناب عبدالرؤف صاحب فوق سکریٹری اقبال لائبریری نمدار گنج (گیا) ۶ سالانہ
(۵۲) جناب دگمبر راؤ صاحب جذب عالپوری ۶ سالانہ
(۵۳) جناب یوسف پیر صاحب پیر سیکھمی عبدالحلیم ۶ سالانہ
(۵۴) جناب پنڈت تریمبک ناتھ صاحب کول خادم ایم۔ ایس۔ سی جودھپور ۶ سالانہ
(۵۵) جناب محمد اکرام اللہ صاحب تمنا قریشی ایڈووکیٹ ہنڈو ۶ سالانہ
(۵۶) جناب میاں محمد خانصاحب کمال ایس ٹرکہ ضلع گوجرانوالہ ۶ سالانہ
(۵۷) [illegible] ۶ سالانہ
[illegible] سالانہ

شعرِ انقلاب ——— اپنی اپنی جگہ……

الا اے خُردہ گیر و نکتہ چیں، کم بیں و کم مایہ! — سمجھتا ہوں تری فکرِ دنی کی پست مفہومی

زمین و آسماں کا ہے تفاوت تجھ میں اور مجھ میں — مجھے عرفاں میسر ہے، تجھے دانش کی معدومی

ہے تیرا مولد و ماحول دہقانی و قصباتی — مگر "مینو سوادِ تاج" ہے میری جنم بھومی

مری تقدیر میں شہرت بھی، عظمت بھی، قیادت بھی — تری قسمت میں ناکامی و گمنامی و محرومی

قلم سے میں حکومت کر رہا ہوں قلبِ انساں پر — کسی کو بھی نہیں محسوس لیکن اپنی محکومی

ابھی تو یاد ہوگا تجھ کو، وہ سجدہ عقیدت کا — کہ تو نے حیلۂ لغزش سے میری کفش پا چومی

سُن اے نوحہ گرِ بد اختری و سعیِ لا حاصل — کسی تدبیر سے جاتی نہیں تقدیر کی شومی

ہوئی حاصل نہ تیری روح کو تسکین و یکسوئی — بنا کر مادّی محور، بہت ناچی بہت گھومی

درخشانی بھلا کیونکر ہو ضربِ برق سے پیدا — مزاجِ ابر میں ہے فطرتاً اک تیرہ معصومی

دوامی گریہ افشانی ہے، رونا عمر بھر کا ہے — گلوگیری کی شاہد ہے یہ تیری خستہ حلقومی

تری ہیئت سے ظاہر ہے خباثت تیرے باطن کی — فریبِ اتقا ہے تیری ریشِ نیل معصومی

ترے ہم مشرب و ہم سلسلہ ہیں بوم اور احمق — مرے ہم مجلس و ہم مرتبہ شیرازی و رومی

تو جسکا نام لیوا ہے۔ مٹا جاتا ہے نام اُس کا — حماقت ہے یہ تیرا ادّعائے حیّ و قیّومی

کوئی سُنتا نہیں تیری، مگر بّرا رہا ہے تُو — ہنسا دیتا ہے مجھ کو، یہ ترا اندازِ مظلومی

جو خادم ہے، وہ ہے مخدوم اپنے ملک و ملت کا — بغیرِ خدمت و طاعت، کہیں ملتی ہے مخدومی!

جُھکا دے اپنا سر، قصرُ الادب کے آستانے پر
نہیں اِس کے سوا درمانِ محرومی و مغمومی

۱۰؍ستمبر ۱۹۴۳ء

سیماب اکبرآبادی

جرعات

آہ بھابی جان، میں انتہائی رنج و افسوس، نمناک آنکھوں اور لرزتے ہوئے قلم سے یہ اندوہناک اطلاع دے رہا ہوں کہ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۳ء مطابق ۱۲ رمضان ۱۳۶۲ھ بروز دوشنبہ شب کے وقت برادرِ معظم حضرت منتظر صدیقی مدیر اخبار "ایشیا" آگرہ کی اہلیہ نے ایک سال اور چند ماہ مرضِ "دق" میں مبتلا رہ کر رائے بریلی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ موت اور جوانی کی ـــ آخری سانس!! اور ایک وفا پرست کی ـــ ڈوبتی ہوئی نبضیں اور وہ بھی ایک سلیقہ شعار، تعلیم یافتہ اور خوبصورت شریکِ حیات کی!!! سُننے والے ماتم پر مجبور ہیں تو گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ مرحومہ کی یادگار سے ایک پانچ سالہ بچہ "یوسف اختر" ہے اللہ اس کی عمر دراز کرے، وابستگانِ شعر و ادب اور ناظرینِ "شاعر" دُعا فرمائیں کہ ربّ العزت مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو عموماً اور برادرِ معظم حضرت منتظر صدیقی کو خصوصاً صبرِ جمیل کی توفیق دے، مرحومہ کی خصوصیات ادب احترام، خلوص اور دلنوازی بھولنے کی چیزیں نہیں۔

"تازہ شاعر" آپ کے سامنے ہے اور اس کے مطالعہ سے شاید تاخیرِ اشاعت کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے میں حادثات و موانعات کی آڑ لینا نہیں چاہتا اور نہ کوشش و کاوش سے قدم تھکے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔ ایک نہ ایک دن "شاعر" ابتدائی تاریخوں میں شائع ہو کر رہے گا ہر چند یہ امر بھی اس دور میں کچھ کم قابلِ تشکر و امتنان نہیں کہ وہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ دوسرے رسائل کی طرح ایک دو اشاعتیں ضم کر کے اُس وقت پر لے آؤں۔

مضامینِ نظم و نثر کی رنگا رنگی، کثرت اور معیار کے پیشِ نظر یہ کہنا خلافِ واقعہ نہیں کہ محدود صفحات میں اتنا مواد بھر دینا صرف "شاعر" کا حصہ ہے "بزمِ شاعر" میں کیسے کیسے جلیل القدر اور کہنہ مشق ادبا اور شعرا شریک ہیں اس کا جواب آپ کی نگاہِ مطالعہ دے سکتی ہے۔ علیحدہ علیحدہ ہر نظم و نثر پر تبصرہ کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ فی الوقت دل و دماغ میں یکسوئی و قوت۔ ہاں مجھے اس کا ضرور افسوس ہے کہ حسبِ اعلان بعض متعدد شعرا کا کلام اس اشاعت میں شائع نہ ہو سکا۔ یہ صرف صفحات کی کمی کا سبب ہے کاش "شاعر" کا دامن وسیع ہو جائے اور میں ہر ماہ درجنوں معیاری نظمیں اور غزلیں شائع کر سکتا۔ بہر حال آئندہ اشاعت میں علامہ سیماب، علامہ کیفی، علامہ شفق عماد پوری، حضرت احسن دانش، حضرت آل احمد مشہدی اور دوسرے مشاہیر شعرا کا تازہ ترین کلام شائع ہوگا۔ علمی و ادبی مضامین اور افسانے بھی زیادہ سے زیادہ معیاری اور دلچسپ ہونگے۔

سرودِ غم اور رازِ عروض جو علامہ سیماب اکبرآبادی کی مشہور تصانیف ہیں اور جن کے لئے ہزار ہا لوگ بے چین تھے۔ ان کی طباعت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے "سرودِ غم" کا دوسرا اور "رازِ عروض" کا تیسرا ایڈیشن اس ماہ کے آخر تک شائع ہو کر اربابِ ذوق کے ہاتھوں تک پہنچ جائیگا۔ سب سے پہلے یہ دونوں کتابیں ان لوگوں کو بھیجی جائیں گی جن کے آرڈر محفوظ ہیں۔ علامہ سیماب کے تازہ سلاموں شہادت کے متعلق ولولہ انگیز اور پُرجوش اصلاحی نظموں اور رباعیات کا نیا مجموعہ **نفیرِ غم** بھی اس ماہ کے آخر میں شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعہ میں علامۂ محترم کا ایک خطبۂ صدارت بھی ہے جو ہر صحیح العقیدہ مسلمان کے لئے قابلِ مطالعہ ہے "سرودِ غم" "نفیرِ غم" اور "رازِ عروض" اگر جلد نہ منگائیں گئیں تو اندیشہ ہے کہ ان کے نئے ایڈیشنوں کا انتظار کرنا پڑے۔ اس لئے آج ہی اپنا آرڈر دیدیجئے۔

ادارہ بیحد ممنون ہے کہ مندرجہ ذیل حضرات نے توسیعِ اشاعت اور امدادی فنڈ میں فراخ دلی سے حصہ لیا نیز ناظم الکلام جناب **محبوب خانصاحب** وکیل صدر دربارِ سخن چوپڑہ ضلع مشرقی خاندیش بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ موصوف نے "شاعر" کی ہمدردی قبول فرمائی۔

(۱) جناب نعمان تاثیر صاحب کراچی	۲ خریدار	(خاص)
(۲) " " " " "	۱ "	(عام)
(۳) جناب نشاط القادری مرزاپور	۱ "	(خاص)
(۴) جناب مخدوم سید علی اسد نقوی البخاری احمدآبادی	۱ "	"
(۵) محترمہ شیریں صاحبہ (نابھہ)	۱ "	"
(۶) فدائے سخن جناب خروش سرحدی	۱ "	(عام)
(۷) جناب عارف بانکوٹی	۱ "	"
(۸) محترمہ شیریں صاحبہ (نابھہ)	۱ "	"
(۹) جناب اکرام اللہ صاحب بہار قریشی ایڈووکیٹ بھنڈ (گوالیار)	۱ "	"
(۱۰) جناب جری ہوشنگ آبادی	۱ "	"
(۱۱) جناب فقیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی	۲ "	"

امدادی فنڈ

(۱) جناب قاضی محی الدین احمد صاحب شان اویسی احمد پور شرقیہ (بہاولپور) صہ/
(۲) جناب مولانا سید شاہ حامد علی القادری مرزاپور عہ/
(۳) جناب حبیب الرحمٰن صاحب حبیب مرزاپور عہ/
(۴) جناب محمد یونس صاحب لنگی پوسٹ ماسٹر مرزاپور صہ/
(۵) جناب مطیع اللہ خانصاحب رعنا نظامی راجوری مہ

اعجاز صدیقی

تحقیق و تصحیح

"دُلہن" کے اعراب پر آخری محاکمہ

گذشتہ چند ماہ سے "شاعر" میں یہ دلچسپ مسئلہ چھڑا ہوا ہے کہ "دُلہن" بروزن چمن لکھنا چاہئے یا بروزنِ گلشن؟ مندرجۂ ذیل حضرات نے اپنی تحقیق کے مطابق "دلہن" کو بروزن چمن لکھنے پر زور دیا ہے:-

(۱) حضرت مولانا صفی لکھنوی (۲) علامہ شفق عماد پوری۔
(۳) حضرتِ دلؔ شاہجہانپوری (۴) حضرت جوشؔ ملیح آبادی
(۵) اعجاز صدیقی (۶) حضرت رمزی بھوپالی (۷) عزیز اختر وارثی
(۸) ہلال رضوی۔

اور ان حضرات نے اپنے فیصلے کے مطابق مندرجۂ ذیل اشعار بطور سند پیش کئے ہیں۔

امیر مینائی لکھنوی ؎ نہیں پلکوں کی اوجھل میں وہ پتلی
دلہن چلمن میں شرمائی کھڑی ہے (اعجاز)

" " " ؎ نہیں اس تیغ کے قبضے میں چھلّا
دلہن کے کان میں انتی پڑی ہے (دلؔ)

" " " ؎ تلوار اُدھر موڑ دی ہے منہ بسمل اُدھر پھیرے ہے رُخ
روٹھے ہیں یہ دولہا دلہن ایک اُس طرف اک اِس طرف (دلؔ)

آتشؔ لکھنوی ؎ عشرت کدۂ عاشق و معشوق نہیں باغ
دولہا بنی بلبل تو اک شب نہ دُلہن پھول (رمزی)

ذوقؔ دہلوی ؎ دولہا دُلہن کی ہے یہ علامت سہاگ کی
آیا ہے اک سہاگ پُرا بن کر آسماں (رمزی)

" " ؎ یارب ہمیشہ دولہا دُلہن میں رہے سہاگ
جب تک کہ ہو وے نیچے زمیں اوپر آسماں (رمزی)

مومنؔ دہلوی ؎ اگر غنچہ نارسیدہ دُلہن
تو دولہا نہایت ہی نازک دماغ (رمزی)

امیر مینائی لکھنوی ؎ ہیں چشم و دل ٹھکانے جب تک یہ دُم تن میں
کیا صحبت آرسی ہو دولہا میاں اور دُلہن میں (رمزی)

" " " ؎ بسمل کو تیری تیغ سے کرتی ہو کیا جُدا
دولہا سے کہہ دے چھین قضا ہی دُلہن کو چھوڑ دے (عزیز اختر)

نامعلوم ؎ گلوں کو کیوں نہ ہو تشبیہ دُولہن کی سی
بہار آج مرے گھر میں ہے چمن کی سی (عزیز اختر)

فانیؔ بدایونی ؎ ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دُلہن بنائے ہوئے (عزیز اختر)

میر انیسؔ لکھنوی ؎ بھائی کے واسطے قاسم کی دُلہن روتی ہے
پکڑے دامانِ قبا چھوٹی بہن روتی ہے (ہلال)

" " " ؎ کہتا تھا کوئی لوٹ کے اسباب دکھا کر
مقنع یہ دُلہن کا ہے یہ بانو کا ہے زیور (ہلال)

" " " ؎ ہو ساتھ سواری کے ہجوم اہلِ وطن کا
آگے ہیں ہوں اور پیچھے محافہ ہو دُلہن کا (ہلال)

امداد علی بحرؔ لکھنوی ؎ ہم نے جو یار میں دیکھی ہے بساوٹ شبِ وصل
کوئی دولہا نہ یہ دیکھے گا دُلہن میں خوشبو (ہلال)

صاحبِ "مبادی اللغات" اور "فیروز اللغات" نے "دُلہن" بروزن کہن اور چمن" لکھا ہے۔

(عزیز اختر)

"نفائس اللغات" میں اس لفظ کے دو اعراب درج ہیں (۱) بضم اوّل و سکون دوم و فتح ہا و نون در آخر (۲) بضم اول و فتح ثانی مخلوط التلفظ بہ ہا و سکون نون۔ لیکن پہلی صورت ثقات اہلِ شہر کی زبان پر رائج نہیں دوسری صورت بروزن کہن "مختار ثقات" شعرا ہے اور میری رائے میں بھی یہی درست ہے (صفی لکھنوی)

علامہ شفق عمادپوری فرماتے ہیں "اکثر شعرائے متاخرین کے دواوین میں "دُلہن" ہم قافیہ "چمن" ہے خال خال مثالیں متقدمین کی "دلہن" بروزنِ "گلشن" کو ترجیح کا خلعت پہنا سکیں گی۔

مخالف آرا میں صرف ایک رائے حضرت ناطق گلاؤٹھوی کی اور ایک جناب آسی لکھنوی کی ہے۔ آسی صاحب نے دو سندیں پیش کی ہیں:—

نیاز الدین عبرت ؎ تو جب دُلہن کے گھر جائیگا جانی
یہ کنگنا اُس گھڑی ہوگا نشانی

سودا دہلوی ؎
ڈس گیا داماد کو سینہ ہو ناگ ۔۔۔ مل گیا ماٹی میں دولہن کا سہاگ

سودا دہلوی ؎
بنائیں کھاجیاں نیز دل پہ دھرلیں ۔۔۔ چلے دولہن کے گھر یوں لے مٹھائی

حضرت ناطق گلاؤٹھوی کا ارشاد یہ ہے کہ "چونکہ اُردو میں لام کے ساتھ ہندی سے ہائے ہوز نہیں آتی۔ اسی لئے ہر صورت میں شامل کر کے بہ آسانی بنا بنا آپ کے لئے مشکل ہے۔ خود میں نے اپنی چوالیس برس کی شاعری میں اس لفظ کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ اگر لکھتا تو حرف گری کے ڈر سے ہائے مخلوط ہی کے ساتھ لکھتا لیکن میں نے اس کے خلاف استعمال کو بھی کبھی قابل اعتراض نہیں سمجھا۔"

حضرتِ آسی لکھنوی بھی فرماتے ہیں کہ "فصحا کا ایک کثیر گروہ دہلی لکھنؤ میں بہ ہائے مخلوط بروزنِ "صور" بولتا ہے۔ مرزا داغ کے یہاں بھی اسی طرح ہے لیکن خود دہلی میں "دلہن" بفتح ہائے ہوز بروزنِ دشمن بھی بولتے ہیں۔"

مولانا ظفر الملک علوی فرماتے ہیں:—

"میرے خیال میں جس طرح "ہندوستان" اور "ہندُستان" "پابودن" اور "تبدل" وغیرہ دونوں طرح تلفظ پر استعمال میں آتے ہیں۔ اسی طرح دُلہن اور دُلہَن دونوں رائج اور صحیح ہیں۔"

ان تمام آرائے پر ایک غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "دُلہن" بروزنِ "چمن" اور "کفن" لکھنے پر سب کا اتفاق ہے۔ آٹھ متفق علیہ آرائے کے مقابلہ میں فقط تین مخلوط رائیں یہ ہیں کہ دُلہن کو بروزن دشمن استعمال کرنا بھی قابلِ اعتراض نہیں۔ "دلہن" بروزنِ دشمن بھی بولا جاتا ہے۔ اور دلہن بروزن دشمن بھی رائج و صحیح ہے۔ ※ اساتذہ دہلی و لکھنؤ کی جو سندیں "دلہن" بروزنِ "چمن" کے متعلق پیش کی گئی ہیں وہ مقابلتاً قطعی اور زیادہ ہیں۔ اس لئے فیصلہ صحیح یہی ہو کہ "دلہن" بروزنِ "چمن" لکھا جائے۔ اور یہی قرینِ احتیاط ہے۔

مولانا ناطق گلاؤٹھوی کا یہ ارشاد کہ "اُردو میں لام کے ساتھ ہندی سے ہائے مخلوط نہیں آتی"۔ میرے خیال میں مشتبہ ہے۔ اُردو میں ایسے الفاظ بکثرت نہ سہی متعدد موجود و مستعمل ہیں جن میں لام کے ساتھ ہائے مخلوط آتی ہے۔ مثلاً چولہا، دولہا، کولہا، آلھا۔ گلہڑ۔ کولھو۔ کلہاڑی۔ لہار وغیرہ یہ لفظ سنسکرت سے برج بھاشا میں آئے۔ وہاں ان کی یہ صورت ہو گئی اور پھر اسی صوت اور تلفظ کے ساتھ اُردو میں منتقل ہو گئے۔ چولہا سنسکرت میں چولھی चुल्ल تھا۔ برج بھاشا میں چولھا ہو گیا۔ کولھا سنسکرت میں क्रोड (کروڈ) تھا۔ برج بھاشا میں کولھا ہو گیا۔ وقس علیٰ ہذا

ایک یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ "دلہن"، "دولہا" کا مونث ہے اور "دولہا" میں لام کے ساتھ ہائے مخلوط ہے۔ متحرک نہیں ہے۔ اس لئے "دلہن" میں بھی لام ہائے مخلوط کے ساتھ رہنا چاہئے۔ دولہا سے "دولہن" بنا۔ کثرتِ استعمال سے واؤ حذف ہو گیا۔ "دلہن" رہ گیا۔ جب آپ "دولہا" کو "دُلَہا" نہیں بولتے تو "دُلہن" کو "دُلَہَن" کیوں بولیں؟

جناب صابر اکبر آبادی بی۔ اے نے اپنے مضمون میں لفظ "دلہن" کے قدیم استعمال پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔ اُن کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ پیساچی پراکرت سے نکلا ہے۔ اور رہا تا کبیر، تلسی داس، سید انشاء اللہ خاں امیر خسرو۔ ملک محمد جائسی۔ کتبن اور منجھن وغیرہ قدیم شعرا نے دلہن کو "دولہین" لکھا ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ "دولہین" کا "ی" اگر حذف کر دیا جائے تو "دولہن" رہ جاتا ہے اور واؤ حذف کرنے کے بعد "دُلہن"۔ فہو المقصود۔

اب بھی بعض دیہات میں دولہن کو "دُلہنیا" میں نے خود کہتے سنا ہے۔ "یا" حرفِ تصغیر یا پیار کی علامت سمجھ لیجئے۔ جیسے "ملنیا"، "دھنیا" وغیرہ یہ الفاظ ہندی اور فلمی گیتوں میں بکثرت اب بھی مستعمل ہیں۔ "یا" جو زائد ہے اگر حذف کر دیا جائے تو "دُلہنیا" سے "دُلہن" بروزنِ "چمن" ہی باقی رہتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

سیماب اکبر آبادی

※ چونکہ ان مخلوط آرائے میں ہر رائے "دُلہن" بروزنِ "چمن" کی تائید میں بھی ہے۔ اس لئے اختلافِ رائے کمزور ہو جاتا ہے اور اتفاقِ رائے قوی تر ——— علاوہ بریں

شخصیات: خطیبۂ ہند زہرۂ سخن سیّدہ نواب سردار بیگم اختر حیدرآبادی

ہر دور کی خواتین نے جہاں تمدن، تہذیب، معاشرت اور سیاست میں حصہ لیا ہے وہیں زبان و ادب اور شعر و شاعری میں بھی انھیں برابر کا نہیں تو کم از کم ایک حد تک شریک ضرور دیکھا گیا ہے۔ یورپ ہو یا ایشیا، چین ہو یا جاپان، ہندوستان ہو یا ایران ہر ملک نے اپنے مذاق اور ماحول کے مطابق ایسی خواتین پیدا کیں جو ادب و شعر کے گلستاں کو سدا بہار بنانے میں کوشاں رہیں —— یوں بھی عورت میں فنونِ لطیفہ

ہوتی ہے وہ خواتین میں بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں، مگر افسوس کہ ہمارے طرزِ معاشرت نے ہماری خواتین کے ان جذبات کو بہت کم ابھرنے دیا ہے اور جہاں یہ جذبات ابھر کر ہیں وہاں رنگ و نور۔ رس اور پریم کے بوٹے بنتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ہندوستان کے عہدِ قدیم اور دورِ وسطیٰ کی شاعر خواتین کا ذکر یہاں ضروری تھا لیکن عدم گنجائش مانع ہے۔ بہرحال اس دور میں ہم مسرت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں بھی لکھنے والیاں



سے لذت گیر ہونے کے جذبات مرد سے کسی قدر زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُسے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع نہ ملے۔ مصوری کے لئے انگلیوں کے لوچ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ لوچ عورت کی انگلیوں کو فطرتاً ودیعت کیا جاتا ہے۔ موسیقی کے لئے سُریلے گلے کا ہونا ضروری ہے، عورت کے گلے کا سُر دنیا کے تمام سازوں سے زیادہ موثر اور سریلا ہوتا ہے۔ اسی طرح ادب و شعر کے لئے جن نازک جذبات کی ضرورت

پیدا ہو چکی ہیں۔ اگر مسلمان خواتین کا تعلیمی ذوق اسی طرح ابھرتا رہا تو وہ دن دور نہیں ہے جب ایک بڑی تعداد میں ادیب اور شاعر خواتین ملک میں نظر آنے لگیں گی۔ حیا لکھنوی، حیا میرٹھی، حنیفہ شمیم ملیح آبادی، ادا بدایونی، رابعہ پنہاں، زیب عثمانیہ، مضطر رضویہ، حجاب امتیاز علی، شیریں، سحاب آغا شاعر، نجمہ تصدق، شائستہ اختر سہروردی، عصمت چغتائی اور سیدہ اختر وغیرہ چوٹی کی لکھنے والیاں ہیں۔

آج سیدہ اختر حیدرآبادی ہی کو "**شخصیات**" کے باب میں پیش کرنا ہے ۔۔۔ پہلی بار ان صفحات میں ایک شاعرہ کے حالات شائع ہو رہے ہیں ورنہ یہ باب مردوں کے لئے مخصوص ہے "بنگلور" کی کانفرنس کے ملال انگیز اشاعت کے بعد سے اب تک بعض لوگ برابر مصر ہیں کہ سیدہ اختر کا جلسہ میں شعر اور اُن کے تفصیلی حالات شائع کئے جائیں زیر نظر تذکرہ اسی اصرار اور اشتیاق کی ایک تعمیل ہے

سیدہ اختر کا نام سردار بیگم اور نواب خاندانی لقب ہے ۹ مئی ۱۹۱۸ء کو مملکت محبوبیہ حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئیں والد ماجد کا نام سید امیر حسن ہے جدِ امجد نواب سید کریم حسن خاں سفر لکھنوی مرزا دبیر کے تلامذہ میں سے تھے اور صاحبِ دیوان بھی ۔۔۔ ددھیال کی طرح سیدہ اختر کی ننھیال بھی نیشاپوری بزرگی اور برتری میں کسی طرح کم نہیں اور لکھنؤ میں یہ خاندان اب تک عزت و تعظیم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے سیدہ کبیسا کہیں ہیں سیدہ اختر کا آبائی وطن لکھنؤ ہے جب لکھنؤ کی بہاروں پر خزاں آ گئی اور عیش و نشاط کے ہنگامے ختم ہو گئے اور اودھ کے آخری تاجدار کو مٹیا برج کے محبس میں قید کر دیا گیا تو سیدہ کے آبا و اجداد نواب سید قطب الدین (کلکٹر) وغیرہ ترک سکونت کر کے حیدرآباد آنے پر مجبور ہو گئے اب بھی لکھنؤ میں "لال محل" اور "موتی محل" ان کی یادگار ہیں۔ حیدرآباد آنے کے بعد یہاں بھی اس خاندان کو اعزاز نصیب ہوا اور سیدہ کے افرادِ خاندان اب تک عزت و آسودگی سے زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ چار سال کی عمر میں سیدہ اختر شفقتِ پدری سے محروم ہو گئیں اور اُن کی تعلیم و تربیت اور حفاظت و پرورش ان کے حقیقی خالہ زاد چچا محبوب صاحب صحف الصدق مولوی چراغ علی المخاطب نواب اعظم یار جنگ بہادر نے اپنے ذمہ لی۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سیدہ کو محبوبیہ گرلس اسکول میں داخل کر دیا گیا اور وہ بہت جلد فارغ التحصیل ہو گئیں ۱۹۳۲ء میں جناب منشی علی گوہر جمینٹ آرمی کمشنر بیگم رئیس نصیر آباد (راجپوتانہ) سے شادی ہو گئی۔

کچھ تو وراثتاً اور کچھ ذاتی ذوق و وجدان کی بدولت ابتدائی عمر ہی میں سیدہ کو ادب و شعر سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی شادی ہونے کے بعد جب زندگی کی تمام مسرتیں اور خوشی کا سامان نصیب ہوئیں ماحول میں آزادی اور مزاج میں حکمرانی پیدا ہوئی تو ادب و شعر کے ذوق نے نئی انگڑائی لی۔ ایسی انگڑائی جو ہستیوں سے بے جھل دشوار ہیں تو دبی ہوئی اور لشکر میں چور تھی، چنانچہ جذبات اور واردات کا اظہار اس انداز میں ہونا شروع ہوا ۔

خدا رکھے محبت حاصلِ عمرِ زندگانی ہے　　تبسم ہی تبسم ہے جوانی ہی جوانی ہے
یہی لب مختصر بیانِ غم کی کہانی ہے　　ٹھہر جاتی تو دانگارہ جو بجھ جاتی تو پانی ہے
کہاں تک عشق کی افسانہ کا عالم　　خاموش بھی رہنے میں ہے فریاد کا عالم

اُف رے آئینِ محبت لب ہلا سکتے نہیں　　نالہ کر سکتے نہیں نغمہ سُنا سکتے نہیں
واہ رے جذبِ محبت اُف ری مجبوریِ حُسن　　بھول جانے پر بھی وہ مجھ کو بھلا سکتے نہیں

مختصر ہے بس یہ اختر شرحِ آدابِ وفا
آگ سی دل میں لگی ہے اور بجھا سکتے نہیں

مرد ہو یا عورت سب پر کسی نہ کسی وقت خدمت کا ایک جذبہ طاری ہوتا ہے خواہ وہ خدمت شوہر کی ہو یا ہمسایہ کی حُسن کی ہو یا عشق کی قوم کی ہو یا ملک کی مذہب کی ہو یا سیاست کی ادب کی ہو یا زبان کی ۔ اگر حالات مساعد اور جذبات حقیقی ہوتے ہیں تو جذبہ خدمت یقیناً بالیدگی اختیار کرتا ہے ۔ سیدہ اختر کے دل میں بھی قوم و ملک اور اپنی صنف کی خدمات کا جذبہ پیدا ہوا اتفاق وقت دیکھئے کہ سیدہ کو دامے درمے سخنے اور قدمے غرض ہر طرح خدمت کا موقع ملا سیدہ نے مختلف پلیٹ فارموں سے اپنی درد میں ڈوبی ہوئی آواز قوم و ملک تک پہونچائی پھر کیا تھا ہر طرف سیدہ کا استقبال ہونے لگا قوم و خواص اُن فقروں کو محسوس کرنے لگے جو سیدہ اپنی تقاریر سے بے حس اور خوابیدہ قوم کے دماغوں پر لگا رہی تھیں ۱۹۳۶ء میں پراونشل مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جس وقت سیدہ اختر پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کر رہی تھیں اُس وقت پنڈال کے ہر گوشے سے صدائے تحسین و آفرین بلند ہو رہی تھی۔ تمام لوگ حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوئے تھے اور معترضین انگشت بدنداں تھے ۔ حاضرینِ جلسہ کی نگاہیں سیدہ کی طرف اٹھیں اور پھر بعد عقیدت جھک گئیں اعترافِ حقیقت کے لئے مولانا عبدالحامد بدایونی کھڑے ہوئے ۔ سیدہ کی تعریف و توصیف کے بعد مولانا نے فرمایا کہ میں تمام مسلمانانِ ہند کی جانب سے سیدہ کی خدمت میں "خطیبۂ ہند" کا خطاب پیش کرتا ہوں ۔ مولانائے محترم کا یہ اعلان کرنا تھا کہ تمام ہال "خطیبۂ ہند" زندہ باد اور نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھا۔ تقریباً دس منٹ تک یہی عالم رہا۔

سیدہ اختر اب بھی اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ خواتین کی اصلاح کرتی رہتی ہیں اور اُن میں بیداری اور تعلیمی ذوق پیدا کرنے کی جانکاہ کوششیں اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ اپنے تجربہ اور مطالعہ کو وسیع کرنے کے لئے ۱۹۳۸ء میں سیدہ نے "مشرقِ بعید" کا سفر کیا اور وہاں بطورِ خاص خواتین کی زندگی کا مطالعہ اور ہندوستانی خواتین سے موازنہ کیا۔ وہ لکھتی ہیں کہ میں نے ہندوستان کی خواتین کو ہر طرح پست اور بے عمل پایا اس سفر نے اُنکے ارادہ و عمل کو اور تقویت بخشی اُنکے دل کی تڑپ اور کسک میں اور اضافہ ہوا ۔ واپسی کے بعد انھوں نے زیادہ تیزی کے ساتھ اصلاحِ خواتین کے لئے قدم بڑھایا۔ مشرقِ بعید میں بھی سیدہ نے اکثر مقامات پر تقریریں کیں وہاں کے اداروں اور اخباروں نے سیدہ کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور سیدہ کے مضامین سے اپنے اخبارات کے کالم سیاہ کئے۔

[illegible]

وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتیں اور اعلائے کلمۃ الحق میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ اُن کا قول ہے کہ ایک مصلح میں خلوصِ عمل اور بے غرضی ہونی چاہئے۔ وہ گولیوں کی بوچھار کے سامنے بھی سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہیں، یہ تعلّی نہیں بلکہ امرِ واقعہ ہے۔ سیّدہ مجاہدانہ جذبہ کی مالک ہیں، ایک زمانہ میں موجودہ سیاسی پارٹیوں میں خاکسار تحریک سے ذہنی طور پر انھیں لگاؤ پیدا ہو گیا تھا چنانچہ وہ اس تحریک میں شریک ہو گئیں اور اپنے عزم و عمل سے اس تحریک میں بھی چار چاند لگا دیے۔ پُرخلوص خدمات کے سلسلے میں سیدہ کو پہلے سالارِ تبلیغ اور پھر "سالارِ محاذِ لکھنؤ" بنا دیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں جس وقت حکومت اور خاکساروں کے مابین ٹکر ہوئی تو سیّدہ اختر مردانہ وار میدانِ جنگ میں "سالار محاذ یو۔ پی" بن کر آ گئیں اور چند ہی دنوں میں علامہ مشرقی نے انھیں اپنے یہاں کا سب سے بڑا عہدہ "ناظمِ جنگ محاذ یو۔ پی" دیدیا۔ موصوفہ نے اپنے عہدہ کا چارج لیتے ہی محاذِ لکھنؤ کے نظام کو بیحد مضبوط کر دیا اور ہزارہا خاکساروں کو احکام دینے اور سب کا مکمل انتظام کرنے کی تنہا ذمہ دار بن گئیں۔ جب خاکساروں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تو سیدہ نے کانپور کو خاکساروں کا ہیڈ کوارٹر قرار دیدیا۔ حکامِ شہر اس سے بہت گھبرائے اس لئے کہ نقضِ امن کا اندیشہ تھا۔ کانپور میں دفعہ ۱۴۴ ابھی قائم تھی۔ اس کے باوجود سیّدہ تمام خاکساروں کے ساتھ بیلچے لیکر شہر کا گشت کرتی تھیں چنانچہ کانپور کے کلکٹر صاحب بہادر، سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک ہزار مسلح پولیس اور گورہ پلٹن لئے سیّدہ کی کوٹھی "فردوسِ اختر" پر آئے اور سیّدہ سے جو اُس وقت جرنیلی لباس میں تھیں مطالبہ کیا کہ وہ فوراً خاکساروں کو کانپور سے باہر بھیجدیں اور "بیلچے" پولیس کے حوالے کر دیں۔ سیدہ نے اس حکم کے ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ خاکساروں کی جماعت ایک پُرامن جماعت ہے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی خدمت گذار ہے وغیرہ وغیرہ۔ حکام نے سیّدہ کو گرفتاری کی دھمکی دی اُس پر سیّدہ نے جو کچھ جواب دیا وہ قابلِ غور و فکر ہے کہنے لگیں :-

"بسم اللہ، میں گرفتاری کے لئے تیار ہوں۔ آپ اپنی مشین گنوں کو حرکت میں لائیے۔ سینہ حاضر ہے۔ مجھے گرفتاری تو کیا مرنے سے بھی انکار نہیں لیکن نتائج کی ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

واقعہ بہت طویل ہے، دکھانا یہ ہے کہ سیّدہ کا جذبۂ خدمت کتنا جوان اور پُرجوش ہے اور ان میں کسقدر حوصلہ مندی ہے۔ آجکل سیّدہ اختر آل انڈیا زنانہ مسلم لیگ کی صدر ہیں — قومی اداروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ غریبوں کی امداد۔ یتیموں کی پرورش اُن کا خاص شیوہ ہے۔ اُنکی زندگی کا ہر لمحہ انہماک میں کٹتا ہے اور وہ مصروفیت ہی کو زندگی کا حاصل سمجھتی ہیں۔

قومی اور ملّی خدمات کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ ادب و شعر پر صرف ہوتا ہے جس طرح قومی خدمت کے سلسلے میں سیدہ کو شہرت حاصل ہے اسی طرح ادبی اور شعری دُنیا میں بھی وہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں مشاعروں میں اُن کا کلام پسند کیا جاتا ہے۔ نثر و نظم پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء میں سیّدہ نے ریاست میسور کے دارالسلطنت بنگلور میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی جس کے آخری اجلاس میں حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی نے سیدہ کو "زہرۂ سخن" کا خطاب عطا فرمایا۔ جب سے سیدہ نے قوم و ملک کی خدمت اپنے ذمہ لی ہے اُس وقت سے شاعری کا رنگ بھی بدل گیا۔ تغزل میں بھی سنجیدگی پسند کرتی ہیں۔ چنانچہ کہتی ہیں ؎

جن کو سمجھا تھا کبھی سینہ عالم گداز		مجھ کو سنا دیجئے پھر وہ نواہائے راز
ذوقِ طلب ہے تو پھر سود و زیاں سے گذر		راہِ وفا میں نہ کر فکرِ نشیب و فراز
آ ہی گئی آج نیند سنگِ درِ یار پر		بیخودیٔ آرزو، عمر ہو تیری دراز

سیّدہ اختر نے نظمیں بھی بکثرت کہی ہیں۔ جن میں رومانی بھی ہیں، اصلاحی بھی اور سیاسی بھی "نوردِ مجاہد" سیدہ کی طویل نظم ہے۔ چند شعر سنئے :-

سامنے سے مرے ہٹ جاؤ مجاہد ہوں میں		خاکپائے عمرؓ و حیدرؓ و خالدؓ ہوں میں
مردِ مومن کیلئے ہر اک شے مری آنکھ میں ہے		برشِ تیغ مری ہر نگہِ پاک میں ہے
آسماں پر ہے مری جرأت و ہمت کا دماغ		میں نے دُنیا میں جلایا ہے شجاعت کا چراغ
جان دینے پہ مجھے ناز ہے اللہ اللہ		موت اک زندگیٔ راز ہے اللہ اللہ
زندگی تیغ و تبر میں ہے نہ تلوار میں ہے		زندگی ایک مسلمان کے ایثار میں ہے
آتشِ وادیٔ ایمن مری تعمیر میں ہے		خدمتِ ضربِ کلیمی مری تقدیر میں ہے
دل پُرجوش میں اک آگ دبی رکھتی ہوں		خلشِ عشقِ حسینؑ ابنِ علیؓ رکھتی ہوں
مجھ کو سب یاد ہے اسلاف کا افسونِ جہاد		موجزن ہے مری رگ رگ میں وہی خونِ جہاد

ایک اور نظم کے دو بند دیکھئے :-

جاگ اُٹھا ہے ذرہ ذرہ اور تم ہو محوِ خواب
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب!

آسماں پر مہرِ تاباں ہو گیا ہے جلوہ گر
رات کی تاریکیوں پر چھا چکا نورِ سحر
ہائے تم اب تک طلوعِ صبح سے ہو بے خبر
حیف اُن ذرّوں پہ جو ہیں ناشناسِ آفتاب
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب

خواب سے بیدار ہو اے نوحہ خوانِ ہست و بود
دعوتِ فکر و عمل ہوتا ہے شاعر کا وجود
لعنت ایسی زندگی پر جس کا مقصد ہو جمود
زندگی تو در حقیقت ہے مسلسل اضطراب
انقلاب اے شاعرانِ عہدِ حاضر انقلاب!

معقولات

کہیں ایسا نہ ہو حد سے سوا بیداد ہو جائے
لبِ خاموشِ عاشق محشرِ فریاد ہو جائے

اسیری سے اُسے دشوار تر ہو بارِ آزادی
اگر دل دامِ گیسوئے ترے آزاد ہو جائے

پہنچ جاؤں تڑپتا لوٹتا میں اُسکے قدموں تک
اگر اے اضطرابِ دل تری امداد ہو جائے

بڑی مشکل ہے، یہ ہے طور اگر نازک مزاجی کا
کہ میری خامشی اُنکے لئے فریاد ہو جائے

خرامِ ناز مستغنی ہے فکرِ خستہ حالاں سے
کوئی پامال ہو جائے کوئی برباد ہو جائے

دلِ اندوہگیں محتاج ہے اُنکی توجہ کا
جو وہ چاہیں یہ ناشادِ ازل بھی شاد ہو جائے

تغافل سے نہ مارو اپنے بیمارِ محبت کو
یہ بہتر ہے ہلاکِ خنجرِ بیداد ہو جائے

قفس میں صید آہ و نالہ کرتا ہے، کرے، لیکن
نہ اتنا بھی کہ بارِ خاطرِ صیاد ہو جائے

کئے کیا کیا تصرف شعر میں جدت پرستوں نے
ہے وحشتؔ مدعا اُنکا یہ فن برباد ہو جائے

(خان بہادر) رضا علی وحشتؔ کلکتوی

سلام و عذرِ سلام

کر کے خرابِ عشق کو کیا کوئی کام اور ہے
بعد نگاہِ مست کے لغزشِ گام اور ہے

حشر و بہشت میں بھی خیر، وقفۂ خندہ آہ اور
ورنہ ابھی تو عشق کو ذوقِ خرام اور ہے

ناز و نیاز سے الگ ہجر و وصال سے بلند
ان کی حریمِ خاص میں میرا مقام اور ہے

پھر نہ کر تمام ابھی بات ہے ناتمام ابھی
بعد سلامِ شوق کے عذرِ سلام اور ہے

اے کہ تری نگاہ سے کارِ زمانہ ہے تباہ
آ، کہ دلِ تباہ میں اک ترا نام اور ہے

کھوئے مدعا کہاں پائے مدعا کہاں
شانِ نگاہ اور ہے طرزِ کلام اور ہے

زاہدِ پاکباز ہوں میکشِ مے نواز ہوں
عشق کے ہر مقام میں میرا پیام اور ہے

میکش اکبرآبادی

نواب شیفتہ دہلوی نئے روپ میں

ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی مگر حسنِ اتفاق سے اس آخری دور میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دارالخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہوگئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے مراد۔ آزردہ۔ علوی مومن۔ نیر۔ دہشت۔ تجمر۔ غالب۔ صہبائی۔ شیفتہ (حسرتی) سے ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں فارسی ادب کو چار چاند انھیں نے لگائے اور معاصر متاخرین میں گوئے سبقت لے گئے۔

نواب شیفتہ باکمال لوگوں میں سے تھے جو آج بھی علمی دنیا میں عزت کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں، فارسی میں تو صاحب کمال تھے ہی اردو میں بھی استادانہ کلام چھوڑ گئے۔ اس جگہ نواب شیفتہ کا تذکرہ ذرا تفصیل سے پیش ہے۔

گو آپ کے سوانح کلیات حسرتی کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں مگر بعض واقعات پر ابھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس جگہ اُن پر بھی روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ شیفتہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ اپنے عہد کے محبانِ ملت و وطن سے بھی تھے۔

ولادت و خاندانی حالات

عمدۃ الدولہ سرفراز الملک نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ۱۸۰۶ء میں دلّی میں پیدا ہوئے ان کے والد نواب مرتضیٰ خان بہادر مظفر جنگ جہانگیر آباد ضلع دہلی کے رئیس تھے اور والدہ مرزا اسمٰعیل بیگ ہمدانی مشہور سپہ سالار کی بیٹی اور اعتشام الدولہ محمد بیگ ہمدانی کی نواسی تھیں۔

اجداد بنگش ات سے عہدِ فرخ سیر میں وارد ہند ہوئے۔ نواب مرتضیٰ خاں اور نواب محمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد کے بھی تھے۔ نواب مرتضےٰ خاں کا قیام بھی فرخ آباد میں تھا۔ یہی وہ وقت تھا کہ سلطنت دہلی کی بنا متزلزل ہو چکی تھی۔ مرتضیٰ خاں نے مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مردم شناس راجہ نے انھیں سپاہ اندور کا افسر اعلیٰ مقرر کیا مگر اندور بھی اس وقت غیر مطمئن حالت میں تھا نواب ملازم ہوتے ہی لارڈ لیک گورنر جنرل کی مدافعت کے لیے مامور کئے گئے۔ جو حکومت کمپنی کی طرف سے مہاراجہ کے استعمال پر متعین ہوئے تھے۔

عرصہ تک مقابلہ رہا بہت سے آدمی طرفین کے نذر جنگ ہوئے۔ آخر نواب مرتضیٰ خاں کی اصابت رائے اور موقع شناسی کی بدولت باہم صلح ہوگئی۔

لارڈ لیک کو اس موقع پر نواب مرتضیٰ خاں کے جوہر قابل ہونے کا پورا تجربہ ہو چکا تھا۔ مضافات دہلی میں پرگنہ پلول علاقہ گوڑگانوہ تین لاکھ روپیہ سالانہ محصول کا اُن کو عنایت کیا مگر نواب صاحب نے اس جاگیر پر قناعت نہ کرتے ہوئے جہانگیر آباد کا علاقہ اپنے خلف الرشید نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام خریدا۔ نواب مرتضیٰ خاں کے انتقال کے بعد علاقہ پلول گورنمنٹ نے واپس لے لیا اور اراکین خاندان کی پنشن مقرر کر دی جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں بند ہوگئی۔

تعلیم و استعداد

نواب شیفتہ نے ماں باپ کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی۔ فارسی عربی اور علوم مروجہ کی تعلیم میاں جی مالا مال دہلوی سے پائی حدیث و قرات میں مولانا حاجی نور محمد دہلوی نقشبندی۔ شیخ عبداللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منورہ سے استفادہ کیا۔ علاوہ انکے مولوی کرام اللہ محدث سے بھی بعض علوم پڑھے فی الجملہ تمام علوم رسمی اور فنون متداولہ سے بخوبی واقف تھے۔

تصنیف و تالیف

ترغیب السالک الی احسن المسالک اور تذکرہ گلشن بیخار اور دیوان ریختہ و فارسی رقعات شیفتہ ان کی علمی یادگاریں ہیں۔ سفر حج کے حالات فارسی میں لکھے جو ۱۲۵۵ھ میں "رہ آورد" کے نام سے طبع ہوئے۔

شاعری

فارسی ادب میں شیفتہ کو پوری دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی زبان میں اُن کی نظم و نثر کا درجہ کسی مشہور فارسی ادیب سے کم نہیں ہے۔ دہلی کی علمی صحبتوں اور شیفتہ کی فطری مناسبت طبع کا اقتضا تھا کہ سن شعور کے شروع ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آپ فکر شعر کرنے لگے تھے ؂

اب شیفتہ اس فن کا ہوں میں پیر طریقت
گو عمر ابھی ہے مری اکیس برس کی

فارسی اور دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے، تذکرہ ہمیشہ بہار میں مولوی نصیر اللہ خاں خویشگی

اور مولوی اکرام اللہ شہابی تصویر الشعرا حصۂ دوم میں لکھتے ہیں:۔

"نکتہ سنج زماں داں در نظم و نثر یکتائے زمان فصاحت و بلاغت از طرز کلامش پیداست و دست خاطر و جودت طبع از ریختۂ قلمش ہویدا اعیم الثنائ کرم اکمضال داناۓ رموز معانی بنیاۓ غوامض نکتہ دانی۔ ......

آں بزرگ فارسی خوش گفتہ گویا کہ در شگفتہ چیہ۔ دریں جزو زماں شخص از امرار ہندوستان چنیں بی نظیر برشگاستہ خدائے تعالی گرامی ادرا پایندہ دارد۔"

سر سید احمد خاں مرحوم آثار الصنادید میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"مسند آرائے جاہ و جلال زیب دہ مکنت و اقبال عمدہ اراکین دولت اسوہ اساطین حشمت ...... صاحب مرتبہ عالی رحمہما انوا۔ سواد ... لی مورد ... راحم ... ی بنفس شناس شخص سخن فہمی بہ سخندانی ... دان ... دہ ... نکتہ سنجی وکتہ ... نی حاتم کرم عطارد رقم رستم توان نواب محمد مصطفی خاں صاحب۔"

ریختہ میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے

فارسی ادب میں کامل دستگاہ رکھنے کے باوجود اردو ادب سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے مگر شعر عموماً کم کہتے تھے اس کم سخنی کی وجہ سے لوگوں کو ان پر تکبر و غرور کا گمان ہوتا تھا لیکن ان کی بے تکلفی کے جلسے مہذب ظرافت سے خالی نہ ہوتے تھے۔ سخن فہمی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اصلاح سخن میں بھی ملکۂ خاص تھا۔ مرزا غالب سے مشورہ سخن کیا مگر اُن کو بھی ٹوک دیا کرتے۔ مرزا غالب نے ایک قصیدہ لکھا جسکے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے ؎

"عید اضحیٰ لب آغاز زمستان آمد"

مرزا صاحب نے اوّل عید قرباں لکھا تھا، نواب شیفتہ کے ٹوکنے سے عید اضحیٰ بنایا۔[1]

مولانا حالی ایک جگہ یادگار غالب میں لکھتے ہیں:۔

"اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد انکے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل اُن کی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھی اور شعر کا جیسا صحیح مذاق اُنکی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آتا ہے لوگ اُنکے مذاق کو شعر کے حُسن و قبح کا معیار جانتے تھے اُنکے سکوت سے شاعر کا شعر خود اسکی نظر سے گر جاتا تھا اور اُن کی تحسین سے اسکی قدر بڑھ جاتی تھی۔ مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

غالب بہ فن گفتگو ناز د بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد[1]

نواب ممدوح کی شان میں مرزا صاحب کا ایک قصیدہ بھی ہے اس کا ایک شعر ہے۔

آں ہماۓ تیز پروازم کہ بال
در ہواۓ مصطفیٰ خاں می زنم

ایک جگہ اور مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل
چوں او تلاش معنی و مضموں نکرد کس

ایک رقعہ میں نواب صاحب کی غزل کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"زہے غزل و خوشا غزل پایۂ ایں زمیں را بہ آسمان بردہ اند و سخن را بنوازش مینیاں از آسماں فرود آوردہ۔ سخن سرودن حق شما است اگر آبروۓ ستودن داشتہ باشم بہ خود نازم تو انم کرد زیادہ زیادہ۔"

حکیم مومن خاں مومن اپنے قابل شاگرد کی استادی پر فخر اور اُنکی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے شیفتہ کے "گلشن بیخار" کی تقریظ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

آں شیفتہ کز خرد گرامی باشد   سر خیل سخنوراں نامی باشد
اکنوں چہ بماند الا العدم   محمود سنائی و نظامی باشد

مومن ایک شعر میں شیفتہ کی سخن فہمی کی داد اس طرح دیتے ہیں ؎

ز تحسین او حسن معنی نیاز
ہزار آفریں بر چنیں امتیاز

کلام نواب شیفتہ کے کلام میں گرمی اور لذت کے علاوہ شکوہ الفاظ اور چستی ترکیب نمایاں نظر آتی ہے۔ تلاش الفاظ اور ترکیب کی روش میں غالب اور مومن کا رنگ پایا جاتا ہے وہ اپنے کلام میں میر تقی میر کی پیروی اور سادہ بیانی پر فخر کرتے ہیں ؎

شیفتہ سادہ بیانی نے بہت چمکایا
ورنہ صنعت میں تو لوگ ہیں بہتر ہم سے[2]

۱؎ یادگار غالب صفحہ ۹۰

۱؎ یادگار غالب صفحہ ۹۴

۲؎ نواب شیفتہ مرحوم "زمانہ" دسمبر ۱۹۲۱ء از حضرت نظامی بدایونی۔

تذکرۂ شعرا

تذکرۂ گلشن بیخار" ۱۲۴۸ھ میں لکھا گیا اس زمانہ کی رسم کے مطابق شعرا کے کلام کے ساتھ ساتھ اُن کا مختصر حال لکھنے کے لئے فارسی زبان اختیار کی گئی لیکن اپنی اس خصوصیت کے لحاظ سے کہ شعرا کے کلام پر آزادانہ نکتہ چینی کی گئی ہے اردو شعرا کا یہ سب سے پہلا تذکرہ ہے۔ جس میں تنقید کی طرف قدم بڑھایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے جو تذکرے اردو شعرا کے لکھے گئے ان میں تعریف کے سوا تنقیدی پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

مگر اس وقت کے طبائع عادی اس امر کے تھے کہ تعریف و توصیف کے سوا شعر کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا اخلاقی جرم سمجھا جاتا تھا۔ صاحبؒ "ہمیشہ بہار" اس تذکرہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"تذکرہ گلشن بیخار بعبارت شستہ و رفتہ والا ازیادگاہ است
اما خالی از خار نیست چہ گلشن را خار لازم و آں لزدم
تعصب است الحق کہ جز ذات حق از عیب خالی نیست"

ان سے زیادہ حکیم غلام قطب الدین خاں باطن اکبر آبادی نے زہر اگلا ہے۔ نغمۂ عندلیب گلشن بیخار کے مقابلہ میں لکھا ہے۔

نواب شیفتہ نے نظر اور اُنکے شاگردوں کی کچھ زیادہ قدر نہ کی یہ بگڑ بیٹھے۔ شیفتہ اردو مومن غالب کی دل کھول کر مذمت کی۔ عبارت نغمۂ عندلیب (گلشن بےخزاں) کی اردو ہے اور نو رتن مہجور کی وضع پر ہے۔ وہی التزام ضلع۔ مثلاً کہیں جولاہوں کا ضلع کہیں صرف کا کہیں نحو کا کہیں فتوی فرائض کا رعایت لفظی سے بھرا ہوا ہے حکیم مومن خاں کا ذکر جولاہوں کے لوازمات بافندگی کے ضلع میں ہے جو نہایت مضحک ہے۔

غرضکہ ایک طرف تذکرہ۔ کی یہ قدر دانی تھی دوسری طرف اسکی بے حد قدر ہوئی اور تذکرہ نویسوں نے نواب شیفتہ کو سراہا بلکہ جتنی تعریف کی ہے وہ میری خیال سے کم ہے۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی اپنے تذکرہ شمع انجمن میں لکھتے ہیں۔

"اکثر عمر در مشق فن سخن بسر بردہ در مراتب نظم و نثر ادائے خاص داشت و بپارسی ریختہ طبع اوچناں مناسب افتادہ کہ بہر شیوہ سخن خوش و حرف دلکشے میگزارد اگر مجموع منظوم و منثور او بینی ایں معنی را مسلم داری"

نواب نور الحسن خاں کلیم "طور کلیم" میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت شیفتہ از آواں مجبا بمشق سخن معروف بود عمرے دریں شغل بسر بردہ و در مراتب نظم و نثر ادائے خاص دارد و بہر دو زبان ریختہ و پارسی سحرے کہ می طراز د ازمن بریں کہ دستے بہ روش او حرف گزارہ ام نیفے کہ صفت او معنوی یافتہ ام"[۱]

شیفتہ کی سیاسی زندگی

تذکرہ نویسوں نے شاعرانہ حیثیت سے زیادہ شیفتہ کو دیکھا اور اُنکے دسترس سے بھی یہ سوانح باہر تھے۔ آپ کے کلیات میں جو سوانح لکھے گئے اس میں بھی نواب شیفتہ کی سیاسی زندگی پر تبصرہ نہیں کیا گیا۔ نواب اپنے عہد کے ملک و ملت کے بہی خواہ تھے اور ان شخصیتوں میں سے تھے۔ جنھوں نے اپنی کرنے میں کسر نہ رکھی مگر قوم کی قسمت بگڑ چکی تھی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی۔ عمال کمپنی بہادر نے جو روش اختیار کی تھی ملک گیری کے اعتبار سے اپنی جگہ صحیح مگر آزادی کے اعتبار سے بےچینی کا سبب بنی۔ جاگیروں کی ضبطی نے ارباب ثروت و جاگیر میں ایک مخالفت کی لہر پیدا کردی تھی۔ ادہر ہنگامہ جو برپا ہوا تمام جاگیردار بادشاہ دہلی کے ہمنوا بن گئے۔ نواب شیفتہ کے ہم رشتہ رئیسوں نے نواب کو اپنا آگوا کیا۔ رؤسا میں سب سے بڑی شخصیت ولی داد خاں رئیس مالاگڈھ کی تھی اُن کے پرچم کے تلے غلام حیدر خاں زمیندار بونڈری۔ مہدی بخش بہادر نیورکر قاضی وزیر علی بلند شہری۔ عبد اللطیف خاں رئیس خان پور۔ اسمٰعیل خاں اعظم قطل نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد وغیرہ جمع تھے۔ ولی داد خاں مذکور کی بھانجی بادشاہ دہلی کے ایک شہزادے سے بھی منسوب تھی۔ شیفتہ کے متعلق بادشاہ سے خط و کتابت کرنا تفویض تھی۔ چنانچہ ہنگامہ ہونے پر ولی داد خاں نے اپنے علاقہ میں بڑی سرگرمی دکھائی، مگر پانسہ اُلٹا پڑا۔ بعد تسلط ہر ایک باغی قرار دیا گیا کسی کو حبس دوام ہوا کوئی ۷ برس کے لئے قید ہوا۔ شیفتہ کو بھی ۷ برس کی قید فرنگ ہوئی۔ نواب صدیق حسن خاں بہادر شوہر نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیٔ بھوپال نے بڑی کوششوں کے بعد اُن کو رہا کرایا اس مصیبت سے نجات پانیکے بعد نواب مصطفےٰ خاں نے جو خط نواب صدیق حسن خاں کے نام لکھا ہے یہاں بہ لفظ نقل کیا جاتا ہے:۔

"خط سامی کہ در زمان مبتلا بودن مخلص بہ بند بلا بنام صدر الصدر صاحب بہادر رسیدہ بود بر طبق آں صاحب ممدوح آں خان سامی

---

[۱] نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ از اکمل دہلوی (رسالہ "تسنیم" آگرہ)

جمیلہ و کوشش ہائے جمیلہ و کوشش ہائے جلیلہ فرمودند کہ صورت نجات مخلص بظہور رسید۔ آرے مقتضائے محبت ہائے سامی ہمیں بود۔ این احسان فراموش شدنی نیست، اکنون نجات صوری روداد لیکن نجات معنوی باقی ست یعنی جائداد و غیرہ وجود معاش ہنوز معلق و واگذاشت نہ شدہ این مقدمہ ہم باجلاس صدر الصدور صاحب موصوف رسید لیس ضرورت افتاد کہ بہ جناب اطلاع کنم تا بنام خان خط سفارش چنانکہ سابق نوشتہ اند ترقیم فرمایند و نخور این معنی کہ بظہور این امر شکر گزار سامی خواہم شد فضول است کہ میان ما و شما گنجائش ہیچ امور نیست کہ یاد آوری کنم... از بیگانگی ہا سید و ظاہر است کہ بار این منت بس عظیم خواہد بود"

مورخہ یکم شعبان ۱۲۶۱ھ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے میر مومن علی خاں صدر الصدور ساکن سندیلہ کو ایک سفارشی خط لکھا اور بڑی جدوجہد کے بعد نصف جاگیر واگذاشت ہوئی۔"

اخلاق و عادات

نواب صاحب پابندِ وضع، خوش اخلاق اور مذہب الفت کے دلدادہ نہایت صابر و مستقل مزاج بزرگ تھے۔ تسلیم و رضا کی دولت خصوصیت سے عطا ہوئی تھی، ہر حال میں خوش رہنا اُن کی زندگی کا نمایاں ترین وصف تھا۔ طبیعت میں استغنا بہت تھا۔ مہمان نوازی اور فیاضی میں مشہور تھے۔ مجددی نقشبندی خاندان سے بیعت تھی۔ شریعت کے بڑے پابند تھے۔ بھول کر بھی کسی ناجائز یا غیر مشروع امر کا ارتکاب نہ کرتے تھے۔

ڈر ہے کہ ہو نہ شوق مزامیر شیفتہ
ورنہ کبھی سماع مجرد سنا کروں

مرض الموت اور وفات

۶۳ سال کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں بمقام دہلی وفات پائی حضرت شاہ نظام الدین محبوب الٰہی کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔

انتظام اللہ شہابی

فکرِ کامیاب

ابتک ہے سلامت مرا یقیں مقصد میں کبھی ناکام نہیں — تم پر بھی کوئی الزام نہیں دل پر بھی کوئی الزام نہیں
دیوانہ مزاجی تو ہی بتا کیا فیصلہ، دل خام نہیں — میں کہتا ہوں ناکام ہوا دل کہتا ہے ناکام نہیں
دل کا سودا مشکل ہے بہت آساں کوئی یہ کام نہیں — انجام بلا آغاز سہی، آغاز بلا انجام نہیں
جب لذتِ چارہ گر سے ملے کوشش کی پھر کام نہیں — جس چارہ گری سے درد بڑھے وہ چارہ گری کا کام نہیں
وہ ہم سے جدا جس دن سے ہوئے جینے کا نیا اک باب کھلا — تیور کے اشارے ختم ہوئے آنکھوں سے کوئی پیغام نہیں
بے کیفی جب سے طاری ہے ہر سانس ہماری بھاری ہے — مرنے کے لئے بدنام ہیں ہم جینے کے لئے بدنام نہیں
دل مجرم عشق و الفت ہے پھر مجھ پر کیوں یہ تہمت ہے — دل مورد صد الزام سہی، مجھ پر تو کوئی الزام نہیں
گر عقل و خرد کی محفل میں پہنچی نہیں رہبری اُن سے — خاموش ہیں کیوں منہ سے کہہ دیں یہ اگلی نظر کا کام نہیں
مایوس سمجھ اتنا نہ مجھے، بیزار سمجھ اتنا نہ مجھے — دل اب بھی سمجھتا ہے کہ ابھی الفت میں کوئی ناکام نہیں
انجام سے اپنے بے بہرہ آغاز سے اپنے بے پروا — ناکام ہے منزل کا رہرو گو ذوقِ طلب ناکام نہیں

مفہوم صبر و سکوں سے غرض جو کچھ بھی ہو لیکن اے صابر

اپنے دن اور اپنی راتیں

خونیں ہے آکاش کی رنگت دھرتی تھر تھر کانپ رہی ہے
دولت کی دیوی ہاتھوں سے سینہ پکڑے ہانپ رہی ہے
بندوقیں کاندھوں پر رکھ کر باغی ہر سو گھوم رہے ہیں
اونچے اونچے میناروں پر سُرخ پھریرے جھوم رہے ہیں
زندانوں کی دیواروں کو توڑ دیا ہے دیوانوں نے
انسانوں کے آگے جھکنا چھوڑ دیا ہے انسانوں نے
چاروں جانب پھیل رہا ہے خون کے فواروں کا منظر
خون کے فواروں کا منظر، جلتے انگاروں کا منظر
آگ کے شعلے، خون کے چھینٹے تیر رہے ہیں سرخ فضا میں
چیخوں کا طوفان بپا ہے بھڑ بھڑ کرتی گرم ہوا میں
مذہب کی فرسودہ عظمت راکھ بنی ہے خاک ہوئی ہے
گانے باجے کے جھگڑوں سے دیش نگر پاپاک ہوئی ہے
کنگلوں نے مل کر قانونی زنجیروں کو توڑ دیا ہے
تدبیریں حیران کھڑی ہیں قسمت نے منہ موڑ لیا ہے
جھونپڑیوں نے اونچے ایوانوں کی گردن توڑ کے رکھ دی
مظلوموں نے ظالم انسانوں کی گردن توڑ کے رکھ دی
بھوک کے ماروں کی رگ رگ میں آگ کے طوفان جاگ اٹھے ہیں
فطرت جن پر نازاں ہے وہ کامل انساں جاگ اٹھے ہیں
مزدوروں کی آنکھوں میں ہیں کڑوی تحریروں کے فقرے
شریانوں میں دوڑ رہے ہیں خونیں تقریروں کے فقرے
اُبھرے شانوں والے دہقاں شہروں میں چنگھاڑ رہے ہیں
زرداری کے سینے پر افلاس کا پرچم گاڑ رہے ہیں

باغی انسانوں کا لشکر شاہی ایوانوں کو دوڑا
ہاتھوں میں پرچم، پرچم پر ایک درانتی ایک ہتھوڑا

دوشیزائیں بک نہ سکیں گی عصمت اب نیلام نہ ہوگی
بھوکی بیواؤں کی عزت زرداروں پر عام نہ ہوگی
کالی آنکھیں، نیلی آنکھوں کے آگے اب جھک نہ سکیں گی
سرمایہ کی گیہوں سے مزدور کی سانسیں رک نہ سکیں گی
مزدوروں کے سر پر اینٹوں کو ترجیح نہ دی جائے گی
اُبھرے شانوں چوڑے سینوں کی توہین نہ کی جائیگی
پتلے ہونٹوں لمبی آنکھوں کا اب سے بیوپار نہ ہوگا
کاغذ کے ٹکڑوں سے اچھا قسمت کا بیمار نہ ہوگا
باتوں پر اب قید نہ ہوگی لب سینے کا حکم نہ ہوگا
بھورے رنگ کی موت کے سائے میں جینے کا حکم نہ ہوگا

آج سے جیون اپنا ہوگا اپنے دن اور اپنی راتیں
میٹھی بولی، مست ترانے انم نغمے سندر باتیں

الطاف مشہدی

کشمکش

فطرت کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ سورج زمین کے سینے سے لپٹ کر سو جانے والا تھا۔ ہوائیں گرمی کی آہنی گرفت میں بے چینی سے کسمسا رہی تھیں اور فضا ایک آخری انگڑائی کے بعد گھنٹوں کے لئے خاموش ہو جانے والی تھی ـــــ دریا ـــــ خاموش، سست اور تاریک ـــــ ایک مخصوص انداز بے نیازی سے بہہ رہا تھا۔ کتوں کی کرخت آوازیں رات کا سناٹا بیدردی سے چھین رہی تھیں۔ تاریک لیکن دلفریب زلفیں کائنات کے چہرے پر بکھر جانے والی تھیں کہ ہم لوگ گاؤں کے بڑے دروازے پر پہونچ گئے۔

نیچر کے گرم گرم بازوؤں سے نکلکر ہم ابھی آبادی سے ہم آغوش ہونے ہی والے تھے کہ شادی کے شادیانوں نے ہماری رہنمائی کی ـــــ ہم لوگ کھیٹے کے دروازے پر پہونچ گئے۔ جہاں راستے کی طرح موت کا سناٹا نہ تھا بلکہ زندگی ہی زندگی تھی۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ آتش بازیوں کی روشنی گاؤں کی منڈیروں کو روشن کر رہی تھی۔ باجوں کی آوازیں یونان کے "عروسی ترانوں" کی طرح دل میں ایک جولان اور روحانی جذبہ پیدا کر رہی تھیں۔ ہم لوگوں کی آمد نے محفل کی رونق میں چار چاند لگا دیئے۔ غریب دیہاتیوں کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمک اٹھیں۔ انھوں نے خلوص اور محبت کا اظہار بہت معصوم انداز میں کیا ـــــ انھوں نے ہم لوگوں کو بھینچ بھینچ کے گلے لگانا شروع کیا۔ میرے لئے یہ منظر مضحکہ خیز ضرور تھا اس میں بیسویں صدی کی ظاہرداری نہ تھی، لیکن رمیش نے دیہات کی روح کو محسوس کیا تھا۔ اس نے دیہاتیوں کی نبضوں پر ہاتھ رکھکر دیکھا تھا اور انکے دلوں کی دھڑکنیں سُنی تھیں

ہیرا اور جھنگی چمار آئے۔ شیر سنگھ، دلاور خاں اور بہادر پانڈے بلائے گئے۔ کرشن کمار، نصدق اور انصاری بھی آموجود ہوئے۔ غرضکہ ذات اور پات کا فرق ایک نقشِ ناتمام کی طرح مٹتا ہوا نظر آیا۔ بڑی بڑی سفید داڑھیاں، گھٹنوں سے اونچی لنگیاں اور میلی قمیصیں جو شاید آج ہی صبح گاؤں کے کنوئیں پر دھولی گئیں تھیں اور بڑے بڑے پھٹتے ہوئے جوتے ـــــ لیکن اسکے بعد بھی چہروں پر مسکراہٹ، دلوں میں ایک مسرت آمیز جذبہ اور خلوص سے چمکتی ہوئی آنکھیں، یہ محسوس کرنا مشکل تھا کہ شادی کس کے گھر میں ہے۔

سب گاؤں والے جمع ہوئے اور رمیش کو ساتھ لیکر مہمانوں کی پیشوائی کو چلے۔ ایک چھوٹی سی جماعت بد انتظامی کے ساتھ بڑھی ـــــ لچکتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی ـــــ جیسے رات کی تاریکی میں کیوپڈ کا تیر ـــــ دیکھتے دیکھتے گاؤں کا میدان آدمیوں سے بھر گیا ـــــ مشعل جلائی گئی ـــــ برات کے ساتھ آئے ہوئے مہمانوں کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور تمام عزت و حشمت کے ساتھ شادی کی یہ جماعت گاؤں کی گلیوں میں آ گئی۔ شہر کے چند سفید پوش ـــــ آنکھوں پر عینکیں لگائے، ٹیڑھے ٹیڑھے بال سر پر ایک مخصوص انداز سے رکھے ہوئے ـــــ پائجامہ اٹھائے ہوئے چل رہے تھے کہ خاک انکے کپڑوں کو گندا نہ کر دے۔ ایک بڑے سفید گھوڑے پر دولہا سر جھکائے ہوئے مستقبل کا حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ گاؤں کی نوجوان لڑکیاں سہمی سہمی سی گاؤں کے کوٹھوں سے آدھا سر نکالے ہوئے جھانک رہی تھیں ان معصوم ہستیوں کے لئے یہ نظارہ کچھ کم تعجب خیز نہ تھا۔ انکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ بالکل مدہوش تھیں۔ وہ اپنے مستقبل کے خوابوں میں کھو گئیں۔ انکے خواب بظاہر کتنے حسین تھے کتنے کیف آفریں، لیکن حقیقتاً کس قدر دلدوز اور صبر آزما ـــــ برات دروازہ پر پہونچی ہی تھی کہ لوگوں کی نگاہیں یکایک ایک نازک چہرے پر جاکر جم گئیں۔

سرورج ایک دلفریب لوچ کے ساتھ بڑھی ـــــ بزرگ بڑی بڑی ڈاڑھی والوں کی آنکھیں ایک خاص قسم کی روشنی سے چمک اٹھیں ـــــ عشرت بدامن ماضی کے تصور سے مردہ جذبات میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی۔ جنسی بھوک کے مارے ہوئے نوجوانوں نے چمپئی سنہرے کنارے کی ساڑھی میں چھپے ہوئے صندلی جسم کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ ہرے رنگ کی نازک سی چپل، سبز آویزے، رفتار میں مصنوعی ٹھوکریں، نوجوانوں کے دل و دماغ پر چھا گئیں اس نے دولہا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں اور گانا شروع کیا ـــــ "بڑی دھوم سے آیا بنڑا امیروں کا" ـــــ اور دولہا رومال سے منہ چھپا کر مسکرا دیا۔ شرم سے جھکی ہوئی گردن فخر سے بلند ہو گئی، تھوڑی دیر کے لئے وہ بھول گیا کہ دن بھر کی کتنی جانفشانیوں کے بعد اسکو شام کا کھانا نصیب ہوتا ہے۔ اسوقت وہ امیر تھا

گھر کا دولہا تھا، دنیا کی دولت اسکی ٹھوکروں میں تھی۔ کائنات کی مسرتیں اسکے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی تھیں، فضا لہراتے ہوئے نغموں سے گونج رہی تھی۔ سروج نے محسوس کیا کہ قریب ہی کھڑے ہوئے ایک انسان کی نگاہیں اسکے بدن میں چھبی جا رہی ہیں۔ اُس نے ساری کے آنچل کو سر پر ڈالا، اعضا میں تھوڑا سا ارتعاش پیدا کیا، اور جسم کے لطیف حصوں میں بجلیاں بھر دیں۔ عزیز کی طرف بغور دیکھا اور گانا شروع کیا ؎

ترا سہرا سوا لاکھ کا کنا ہزاروں کا

اور عزیز نے محسوس کیا کہ گویا دولہا وہی ہے اور ایک رئیس دولہا، اسکی باچھیں کھل گئیں، اُس نے اپنی سمجھ کے مطابق انتہائی دلکش طریقے سے مسکرانے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے تیل سے چکتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ایک رات کے لئے اُدھار مانگی ہوئی گھڑی پر سے آستین ہٹائی، جو مشعل کی روشنی میں کسی غریب دولہا کی قسمت کی طرح چمک کر رہ گئی ——— سروج اسکی معصوم حرکتوں پر مسکرا دی۔ عزیز کا دل بلیوں اُچھلنے لگا گاؤں کے جوانوں کی رشک آمیز نگاہیں عزیز پر جم گئیں ——— عزیز کو یاد آیا کہ وہ بنیائن جو اُس نے سام میں بنوائی تھی سب سے زیادہ بیش قیمت ہے اُس نے دامن سے عرق آلود چہرے کو ہوا دینے کے لئے اُٹھایا اور روشنی میں چمکتی ہوئی ریشمی بنیائن کو دیکھکر اسکے ساتھیوں کے دلوں پر سانپ لوٹ گیا۔

بزرگوں کی بھوکی نگاہیں سیر اب ہو چکی تھیں، اُنھوں نے رسوم ادا کرنے کیلئے جلد شروع کی۔ مولوی صاحب آموجود ہوئے، ہاتھ میں تسبیح، ماتھے پر سجدے کا نشان، بالکل سیاہ، لیکن غریب اور سیدھے سادے دیہاتیوں کی نظروں میں آفتاب کیطرح چمکتا ہوا ——— محفل پر ایک مذہبی رعب غالب ہو گیا، فضا حجازی نغموں سے گونج اٹھی ——— رحمت کے فرشتوں نے مسرت کے گیت گائے اور مبارکباد کی صدائیں تمام گاؤں پر چھا گئیں۔ دولہا کے باپ نے سکون کی دیوی کے آگے سر جھکا دیا اور ماں کی آنکھیں فرط مسرت سے چمک اُٹھیں ——— دولہا کی یہ رات صبح حیات سے زیادہ قیمتی تھی۔

ابھی محفل پر قہقہوں کی آوازیں لہرا رہی تھیں کہ ایک کونے سے ایک شخص نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ سیاہ رنگ کا ایک دیہاتی سا آدمی ——— بڑے بڑے پشت کی طرف مڑے ہوئے بال، قلم ایکٹر کی طرح سے ترشی ہوئی مونچھیں۔ دیہات کے قدرتی رنگ پر شہر کا رنگ چڑھ چکا تھا، پتلون کے اوپر ایک سفید قمیص جس میں ایک سیاہ فام ٹین پن لگا ہوا تھا۔ اُس نے پتلون کی جیب میں ایک خاص انداز سے ہاتھ ڈالا اور تمام جسم ایک غرور آمیز انگڑائی سے اکڑ کر رہ گیا۔ وہ دولہن کا بہنوئی تھا جن سال بیکار رہنے کے بعد اسکو کانپور میں نوکری مل گئی تھی۔ اب وہ تہبند کے بجائے پتلون، زری کے جوتے کے بجائے باٹا کمپنی کا بوٹ، اور بیڑی کے بنڈل کے بجائے سگریٹ کا ڈبہ استعمال کرتا تھا۔ اُس نے اپنے دیہاتی لہجے اور تلفظ میں ایک بڑی تبدیلی محسوس کی تھی۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اب وہ اپنی مکمل دیہاتی قسم کی بیوی کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اُس کو ضرورت تھی ایک ایسی رفیقۂ حیات کی جو نسیم، کانن، اور لیلا چٹنس کی طرح اُس سے محبت کی باتیں کر سکے وقت پر چاء سامنے لاکر رکھ دے اور اُس کے ساتھ ایک نواز لے میں گنگنا سکے۔ اُس نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا کہ جنگ کے بعد جنگی کارخانوں کا کام ختم ہو جانے پر اسکا کیا حشر ہوگا۔ اسوقت وہ بڑا آدمی تھا۔ اسکو ساٹھ روپیہ ماہوار ملتے تھے اُس نے پُر زور الفاظ میں طلاق کا مطالبہ کیا۔

گاؤں والوں کے چہرے غصے سے سُرخ ہو گئے۔ پٹھانوں کی تیوریاں چڑھ گئیں نوجوانوں کا خون جوش مارنے لگا اور گاؤں کے مضبوط اور طاقتور جوانوں کے ہاتھ ایک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے اپنے ڈنڈوں پر پہونچ گئے۔ رنجش کا سمجھا ہوا مادہ غصے سے سلگتے ہوئے ہزاروں دماغوں کے لئے کافی تھا۔ ایک طویل بحث و تکرار کے بعد طلاق کا مسئلہ طے ہو گیا۔ چمکتی ہوئی سُرخ سُرخ آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ فخر سے اُٹھی ہوئی گردنیں جھک گئیں۔ وہ گھر جس میں سکون و مسرت کا دور دورہ تھا گریہ و زاری کی دردناک آوازوں سے گونجنے لگا۔ نئی دولہن نے اُس سال قبل کی دلہن سے لپٹ کر رونا شروع کیا اُسکا مستقبل ——— سیاہ اور بھیانک ——— اسکی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا گرم گرم آنسو موتیوں کی طرح، گاؤں والوں کی پلکوں پر چمک رہے تھے ——— لیکن ——— سروج کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں وہ چاہتی تھی کہ سماج کے رسم و رواج پر زور دار قہقہے لگائے کہ اسکی ہنسی میں گریہ و زاری کے شور پر غالب آجائے۔ وہ ان لوگوں کو بتلائے جو آج تک نہ سمجھ سکے اور جو سمجھ کر بھی نہ سمجھے جنھوں نے اسکو گناہ کی زندگی پر مجبور کیا تھا۔ اور جو صرف دھوکہ دیکر اسکو اپنی بیوی بنانے سے انکار کرتے تھے ——— وہ محفل سے واپس ہوئی ——— اپنے دل میں ایک بڑی کشمکش لیکر ——— دو طرح کی زندگیوں کا نقشہ اسکے سامنے تھا ——— ایک وہ زندگی جسکا بندھن قہقہوں اور نغموں کے درمیان باندھا جاتا ہے اور ہزاروں سسکیوں اور آنسوؤں کے درمیان ٹوٹ جاتا ہے ——— اور ایک وہ زندگی جسکا رشتہ ہر شام کو جوڑا جاتا ہے اور کرن پھوٹنے سے قبل ہی ختم ہو جاتا ہے ——— وہ زندگی کی پہلی پر اپنے قدم رکھ رہی تھی، اسکی رفتار میں ایک غیر معمولی تیزی آگئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی اپنی مسہری پر لیٹ گئی ——— وہ مسہری جس سے اسکی زندگی کے تمام افسانے وابستہ تھے۔ دل کی بڑھتی ہوئی اُلجھن تھی کہ ایک زبردست مسئلہ حل کر رہا تھا ——— یہ اصل زندگی کی پہلی کشمکش تھی کا... اسکی ... برسوں گذر گئے تھے لیکن آج بھی جنگلی کبوتر کا جوڑا مرزا کی کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہی خلوص وہی محبت اور وہی وفاداری، اُن دونوں کی معصوم نگاہیں اسکی زندگی پر طعنہ زن تھیں اور شہ جوڑا

گلبانگِ بہار

عشق تو خیر عشق ہے حسن بھی دیدہ ور نہیں / لٹ گیا کاروانِ ہوش اور انھیں خبر نہیں
جلوۂ حسن کے لیے وسعتِ شش جہات تنگ / اور جنونِ عشق کو رخصتِ یک نظر نہیں
دامِ قفس تو چیز کیا صحنِ چمن بھی لے اڑا / طوفِ حریمِ رنگ و بو غایتِ بال و پر نہیں
عشق کے عکدے میں ور برق و شرر کی یورشیں / حسن کی بارگاہ میں آہ کا بھی گذر نہیں
کعبہ کنشت میکدہ زانوئے ناز و نقشِ پا / اس کے لئے سب ایک ہیں سرحدِ رنگ در نہیں
کون نشانِ راہ دے کون دلیلِ راہ ہو / راہگذارِ عشق میں کوئی بھی خود نگر نہیں

دیدہ و دانش و خرد صبر و سکون و ضبط و ہوش
دل کے معاملات میں ایک بھی معتبر نہیں

بہار کوٹی

رودادِ محبت

محبت کی روداد ہیں بس ہمیں تم / کہیں عشق ہم، حسن کافر کہیں تم
تصور نے دیکھے ہیں جلوے تمہارے / نظر میں بھی ہو اک حجابِ حسیں تم
میں آوارہ ہوں جوں نسیمِ صباحی / ہو جانِ چمن، بوئے غنچہ نشیں تم
حجابوں پہ بھی یہ نگاہوں کی وسعت / سمائے ہوئے ہو نظر میں تمھیں تم
ادھوری کہانی مری کچھ نہ پوچھو / اسے رہنے دو بس یہیں کی یہیں تم
مجھے کرمکِ شب کی قسمت ملی ہے / تپش آفریں شمعِ پروانہ چیں تم
میں تارِ شکستہ کو پھر چھیڑتا ہوں / سنو پھر وہی نغمۂ آتشیں تم
وہ رومانِ ماضی کا رنگیں فسانہ / جمال آفریں ہم تھے عشق آفریں تم
تڑپتی ہیں چنگاریاں ہر نفس میں / نہ چھیڑو مرا سازِ سوز آفریں تم

صبا پر کبھی پیار آتا تھا تم کو
کبھی تھے وفا کے پیامِ حسیں تم

صبا رشیدی

زبان کی وسعت اور نگہداشت

(افصح الفصحا علامہ شفق عمادپوری مقیم الہ آباد کے افادات سے)

اُردو کی عمر دراز کتنی وسیع نشو و نما پا کر اگلی زبانوں سے پیچھے نہ رہی۔ برج بھاشا کی راجکماری قلعہ معلی سے نکل کر سارے ہندوستان پر چھا گئی اور دوسرے ملکوں پر بھی سایہ ڈالنے کو اپنا دامن بڑھانے لگی۔ مغرب کے جواہر پارے بھی اسکے مشرقی نواز خزانے میں داخل ہونے لگے۔ اُردو کا مشترک سرمایہ ایسے دو سپوتوں کی بدولت ہے جو مادرِ ہند کی تربیت کو بھول گئے ہیں۔ اختلافی بکھیڑوں کو کیا چھیڑوں۔ دیس کی دھن اپنے زبان کا ساز اس طرح نہ چھیڑیں کہ بے سُرے راگ نکلنے لگیں۔

وسعت اور نگہداشت میں چولی دامن کا ساتھ رہے تو خلعت شاہجہانی راس آئے اور زبان دانی کا سہرا سر چڑھے۔ "گلزار نسیم" کے پھول آج تک کس باغبانِ سخن کی آبیاری سے شاداب ہیں کیا منقارِ ہزار داستاں کے نغمے کانوں کو بھلے نہیں لگتے، کہتا ہے ؎

یارب مرے خامے کو زبان دے
منقارِ ہزار داستاں دے

کثیر الاشاعت اخبار موقت الشیوع رسالے زبان کی وسعت میں بقدر استطاعت حصے لے رہے ہیں۔ نگہداشت ان خدامِ ادب کا کام ہے جو نثر و نظم کا معیار ہاتھوں میں رکھتے ہیں۔ ہندستان نثر سے زیادہ نظم کا رد عمل ہوتی ہے۔ نام کے ناظم بہت کام کے کم ہیں۔ ظریف لکھنوی سو مبالغہ شاعرانہ مگر باندازِ ناصحانہ کہتے ہیں ؎

شاعر استی فی صدی تعلیم سو میں سات کی

کیا ماہرین فن کاملین سخن انگلیوں پر گنے جانے سے زیادہ ہیں۔ نگہداشت کے ساتھ شاہراہ عمل کو وسعت دی جائے۔ بے مرکز کا دائرہ نہ بنایا جائے کتنا ہی بُرا ہو لکھنؤ، دہلی مرکز نہ سہی فصحا کی جماعت مرکز سہی ؎

ہم ہند کے لئے لغت میں امیر
فصحا کی زبان لیتے ہیں
(جامع امیر اللغات)

فصحا کی جماعت کا تعین اعتدال کے نقطۂ نظر سے ہو۔ دائرہ ساری دنیا کو گھیر لے مرکز سے قدم نہ ہٹے ؎

پرکار کی طرح ہوں مرکز پہ اپنے چلکر
اک پاؤں ہے سفر میں اک پاؤں ہے وطن میں
(شفق)

بے راہ چلنے والوں کی نہ پوچھئے۔ راہ پر چلنے والوں کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں ماحول ہی ایسا ہے۔ سنبھالنے والا سنبھال لیگا منزل دُور نہیں ؎

پہونچ رہا ہوں میں شاید قریب منزل کے
قدم قدم پہ، قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
(محشر الہ آبادی سلمہ)

نگہداشت ہی مدِ نظر رکھتے ہوئے شاید مدیر رسالہ "شاعر" نے زبان و محاورات پر خامہ فرسائی کی فرمائش مجھ سے کی ہے۔ کیا عرض کروں:-

"کاغذی خانقاہوں میں بسنے والی روحوں کے ارشادات گلدستۂ طاقِ نسیاں، اپنا حیات کدہ یعنی کتب خانہ منتشر، نقل اوراق پریشاں، نقل سماعت عارضی کا عذر بارد۔ کافی معلومات سے بے بہرہ ہونے کی معذرت سہی۔ مالکان تحریر "آزاد کنندۂ پیر" کی التجا کو بھی رسم ہی سمجھ لینگے۔ دست و قلم کی جنبش اُس بیاری تحریک کا کچھ تو جواب دے ؎

پہونچا منزل پہ عاب کہتا ہوا آمدم بہ مطلب

محاورات سے پہلے الفاظ، مفردات کے بعد مرکبات ہوں۔ مشترک زبان کے بڑے میں عربی، فارسی کے جواہر ریزے بقدرِ ضرورت آچکے ہیں اور آتے رہینگے۔ کسی زبان کا لفظ صحت سے دُور زبان عوام پر ہو تو جواہر ریزے کے بدلے سنگریزہ ہی غلط العوام صحیح اجماعی حیثیت سے کسی زبان کا لفظ متصرف فیہ ہو کر فصحا میں مستعمل ہو تو جوہری کے ہاتھ کا تراشا ہوا نگینہ ہے غلط العوام فصیح۔ پوچھئے غلط العوام صحیح" کیوں نہیں کہا گیا۔ اس لئے کہ غلط اور صحیح اجماع ضدین، ادب میں کسی زبان کے قاعدے کا لحاظ نہ رکھنا خلاف ادب ہے ؎ ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجا ست

ایک استاد کا مصرع ؎ "درد درماں سے الضاف ہوا"

مورد اعتراض ٹھہرا۔ دو چند کے لئے الضاعف ہے۔ الضاف تو محتاج مضاف الیہ کا ہوگیا۔ لفظ ہی نہیں معنی بھی بدل گیا، فصحا نے ناجائز قرار دیا، انفرادی حیثیت اور ایسے موقع پر معتبر نہیں، لغزش بشر سے ممکن ہے۔ اُسی استاد کا صحیح تصرف سنئے ؎

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے (آتش) میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

بیگم بہ تشدید میم پر بھی اعتراض کیا گیا کہ ترکی زبان میں بگم بکاف فارسی مضموم ہے، بتادیا گیا خواص کی زبان پر بھی بیگم بفتح گاف ہے اور یہی فصیح ہے۔ قلعۂ معلی میں بھی بیگم کو بگم کوئی نہ کہتا ہوگا۔ تصرف جائز و ناجائز دونوں کی مثالیں ہوسکتی ہیں یا نہیں۔

آجکل کی عام گرم بازاری میں شاعر پیسے دھڑی، ہر جنس سے ارزاں بھی رقم ہے کھوٹے کھرے کو کون جانچے۔ لوگ عربی الفاظ کو بغیر تشدید سے مشدد۔ مشدد سے غیر مشدد ساکن سے متحرک متحرک سے ساکن نظم کئے جاتے ہیں۔ فارسی الفاظ کو بھی ادل بدل کر بے جوڑ بے محل لائے جاتے ہیں، نامانوس ترکیبیں منافی ذوق سلیم گڑھ لی جاتی ہیں۔ سب کی مثالیں تصیح و تغلیط کے ساتھ آگے آتی ہیں۔

عربی مہینوں کے نام واقعات سیر وغیرہ نظم کرنے میں آہی جاتے ہیں۔ رجب سا تواں قمری مہینا بفتح جیم تازی غیر مشدد ہے۔ دورحاضرہ کے ایک مشہور شاعر نے مشدد جیم سے نظم کر لیا ہے۔ جس زبان کی صحت کا مدار اعراب پر ہے اس میں تصرف کس طرح جائز قرار دیا جاسکے۔

راقم اپنے مسدس معراجیہ کا ایک بند سند کے لئے نہیں ضمناً اس لئے نقل کرتا ہے کہ شب معراج آج ہی ہے اور جلسہ رجبی شریف بھی۔

معراج کی رات آگئی جب ماہ رجب میں　　دن پھر گئے تاروں کے سرا پردۂ شب میں
جبریل لئے قرب کا پیغام طلب میں　　حاضر ہوئے کاشانۂ سلطان عرب میں
دیکھا کہ ہے آرام میں وہ فرش زمیں پر　　رب جسکا ہے مشتاق لقا عرش بریں پر
(شفق)

رمضان بفتح میم صحیح، بسکون میم غلط نظم کر دیا جاتا ہے۔ اعراب قرآنی شاہد ہے شَہْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ۔ کلام فصحا میں تمام بفتح میم ہی پائیے گا دو مثالیں جو ادبی دعوت نگاہ سے خالی نہیں ملاحظہ ہوں۔

آسی مینائی ؎　قحط روزی یہ جہاں میں ہے کہتے ہیں ہنود
　　رمضاں خوب مہینا ہے مسلمانوں کا

رمضان کی تعریف کس کی زبان سے کرائی گئی ہے یہ دیکھئے پھر دیر وزہ نہیں امروزہ کے مطابق یہ فال حال ہے یا نہیں۔

حفیظ جونپوری ؎　تیس دن خوب رہا فاقہ کشی کا پردہ
　　ہوگئی عید جو روزے رمضاں کے ٹوٹے

"فاقہ کشی" کا پردہ کتنا معنی خیز ہے "پھر ہوگئی عید" کے ٹکڑے کو دیکھئے تکلم پرور مضمون سے کچھ غریب پرور کیا عید آپ ہی کے لئے ہے۔

تَعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِالْاَضْدَادِ ۔ عامیانہ شاعری کا بسکون میم رمضان کیوں خالی جائے، سنئے قاضی جی کی طرح نہ پوچھئے کس کا ہے

تو چلا اے ماہ رمضان الوداع　　وائے اے ماہ رمضان الوداع

سکون میم نے رگِ جاں کو حرکت دی تھی بے ہائے ہوز والے قافیئے نے دل ہلا دیا واکھول یا واسے الوداعِ رمضان پر یہ حسرت!

جمادی الاولی، جمادی الاخری دونوں صحیح، جمادی الاوّل، جمادی الثانی نہیں واد یہ کیا؟ جو کوئی نہ بولے صحیح۔ جو سب بولیں وہ غلط؟ اہل تحقیق بولنے کو نہیں سنتے بنظر تصحیح دیکھتے ہیں۔ جمادی مونث اسکی دونوں صفتیں بھی بصیغہ مونث ایک اولیٰ دوسری اخریٰ۔

آپ کہدینگے ایک شاعر کہتا ہے ؎

جو تھی تاریخ اسکی ہے مانی　　ہے یہ ماہِ جمادی الثانی

اسی کا نام شعر ہے تو شاعر کا نام کون پوچھے، سنئے صحیح ایک مصرعے میں بات آجاتی یہ من مانی قافیہ بندی نہ رہتی یوں کہنا تھا ؎

"ہے یہ چوتھی جمادی الاخریٰ کی"

آیئے صحت الفاظ کی بحث میں صحت و مرض کو بھی دیکھتے ہی چلیں۔ صحت بہ تشدید جائے حطی صحیح بہ تخفیف غلط۔ مرض بفتح رائے مہملہ صحیح بہ سکون ثانی غلط شاعری کا مرض بہ سکون بڑھا جائے تو کیا علاج ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی　　مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

دائم المریض نہیں دائم المرض لکھئے۔ بتلائے مداومت بادہ نوشی کو جیسے دائم الخمر کہتے ہیں، اکثر مبتلائے مرض کو دائم المرض کہئے۔

آجکل ہر بات کو نظم ہی میں لکھنے کی خو پڑگئی ہے۔ مجھے ایک مہربان نے لکھا ؎

سنتے ہیں دائم المریض ہیں آپ　　مرض سے جلد تر صحت ہو جائے

جواب میں لکھدیا "تشدد حائے حطی والی صحت درکار ہے، مرض کا سکون دفع ہو تو راحت کا سکون نصیب ہو" اور کیا لکھتا۔

استفادہ یہ لفظ بلاشبہ صحیح اسکا سخأ استعمال غلط کر دیا جاتا ہے جیسے فائدہ حاصل کرنے کے بدلے استفادہ حاصل کرنا باب استفعال کی خاصیت سے حاصل کرنا ہی معنی ہے۔

ازدیاد۔ باب افتعال کا جدید مصدر بنکے ازدیاد کی جگہ پر آگیا ہے۔ لغت عرب میں نہیں۔ ازدیاد۔ زیادت۔ مزید۔ سب کا مادہ ز۔ ی۔ د اور اسکا مادہ ی۔ ز۔ د دیکھئے ایجاد بندہ میں فرق پڑ گیا یا نہیں۔ قیاسی طور پر خلاف قاعدہ الفاظ بنا لینے سے

احتراز واجب ہے۔

مشکور۔ یہ لفظ ممنون کا ہمزاد بنکر نثر کیا نظم تک میں آجاتا ہے جس پر احسان کیا گیا ممنون ہے جسکا شکر ادا کیا گیا مشکور پھر شکر گذار لکھئے۔

آبِ رواں۔ بہ سکون بائے حطہ ململ کی قسم ایک باریک کپڑا۔ فارسی نہیں اس لئے باضافت فارسی بمعنی "آبِ رواں" ناجائز۔ محرم کو بھی جنبد سمجھئے (عرب میں یہ لباس کہاں ؟) چادرِ آبِ رواں بھی اسی مفہوم پر ناجائز۔ البتہ وہاں جائز ہے جہاں باضافتِ تشبیہی پانی کی چادر مراد ہو جیسے

فرش ہے سیلاب کا سطحِ زمیں پر ہر طرف
خوشنما ہے چادرِ آبِ رواں برسات میں

پہلے مصرع میں سیلاب دوسرے میں برسات سے صاف عیاں ہے نہ کوئی اوڑھنے والا ہے نہ کپڑے والی چادر، موقع نازک محل باریک تھا فہم

(محلِ استعمال الفاظ پر میر انیس کا ایک بند یاد آگیا)

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے | تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لئے | سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لئے

"داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد" | "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد"

دیکھئے فصاحت کی تعلیم دی جاتی ہے اور کس حسنِ بیان کے ساتھ، آزاد شاعری والے کہہ دیتے ہیں اگلوں کی مقصد شاعری میں کیا ہے اور اُسی میں سب کچھ ہے۔

"موسمِ برسات" (لیجئے آگیا وہی سبق) برسات ہندی اور فارسی اضافت کے ساتھ "موسمِ باراں" رہتے ہوئے نوشتِ قافیہ میں لاتا ہے۔

ہے گھٹا گھنگھور کالی رات ہے | سانپ کیا موسمِ برسات ہے

کالی رات بھی آگئی، اندھیری رات نہ آسکی۔ ذرا یہ بھی لکھدوں اندھیاری رات بھی فصیح نہیں، گھوڑے کے منہ پر ڈالی جانے والی جالی (شدید کی اندھیاری) نظم میں لائی جاچکی ہے۔ التباس کا احساس بھی چاہئے۔ فصحا کے متروکات بے سبب نہیں۔

"قمر زائی" اور اُسکی جمع "قمر زائیاں" آپ کہیں گے اندھیری میں یہ چاند کدھر سے نکلا، ادبِ لطیف کی روشنی میں اندھیر ہوا سنئے ہنسی روکے ہوئے ؎

غضب ہے تری جوانی کا جذبۂ تخلیق | یہ بار بار قمر زائیاں معاذ اللہ

"قمر زائیاں" پر تو شاعر خود معاذ اللہ کہہ چکا، جذبِ تخلیق پر بھی ارے توبہ! یہ دونوں سخن تکئے آجکل غزل تک میں کہے جاسکتے ہیں۔

"زمزمہ چکانی" اتنی بے تکلفی سے ٹپک پڑی کہ سازِ تغزل بیکار اُٹھا۔ اور انوکھی ترکیبیں گڑھتے عجائب اللغات زیر تالیف ہے۔

"گل چکاں" بجائے گلفشاں نظم کرنے پر کہا جاتا ہے اس میں جدت ہے اب یہ کون بتائے تھوے کی فارسی گلچکاں ہے۔ شاخِ گل پر کبھی تھوے چپنے لگی۔

ہندوستاں سے واو الگ کرکے ہندستاں نئی دنیا میں لایا جاتا ہے تو ہندوستانی بھی جو لابد لکر ہندستانی ہو جاتی ہے بے واو کی مثال شعرائے فارس کے کلام میں ڈھونڈنے والے کو شیرازی کا یہ شعر ملتا ہے ؎

گل آورد سعدی سوئے بوستاں | بہ شوخی چو فلفل بہندوستاں

ارے یہ شوخی کیسی ؟ واو نکلی ہوئی مثال چاہئے۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی گویا بزبان حال بولتے ہیں:-

"کھلینگے اور بھی گل یہ ابھی کلیوں کا جلوا ہے"

"تماہی" یہ سہ ماہی کا بگڑا ہوا خاکہ ہے بقول انشا (نہ ہندی نہ فارسی، نہ ترکی) پر پاگ والے جنم بھوم میں چھ ماہی سے پیدا ہوئی ہے (دیکھو قطعۂ غالب)

رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک | خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات | اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

وہاں مُردے کی "چھ ماہی" سال میں دو بار یہاں زندہ سالے کی تماہی سال میں چار بار کیا ترقی ہوئی ہے بس سالے کو تو لے۔ سہ روزہ کو ترونزہ۔ سہ شنبہ کو تشنبہ بھی بنا ڈالئے، ترمیم ہو تو پوری ادھوری کیوں" بڑے کہوری" والی مثل جھوٹی نہ ہونے پائے۔ انشا نے مسدس کا ترجمہ کیا چھکڑا (خالص ہندی) آپ نے سہ ماہی کا ترجمہ کیا تماہی، لیجئے ماہی جال سے نہ نکل سکی فارسی کے دام سے خود نہ نکل سکے۔ بیچارے غریب اردو پر بھی کیا کیا آفتیں آئیں خدا حافظ۔

مضمون تمام کرنے سے پہلے قلم کی ترکی تمام ہوتی جاتی ہے، خطوط کے جواب باقی فرمائشیں باقی، اور سرقانی باقی، محاورات پر بشرطِ فرصت آئندہ لکھونگا۔ اس وقت "شاعر" کا جولائی نمبر صفحہ ۱۰ سامنے آگیا ہے تحت عنوان تحقیق و تصحیح اور حضرات کے علاوہ مجھ ناچیز سے بھی "دُلہن" کے لفظ کو پوچھا گیا ہے کس وزن پر رکھا جائے کون سا پلہ بھاری رہے۔ تیر عرض کرتا ہوں:-

"دُلہن" لکھنؤ کی رنگین شاعری میں اتنی روپوش حجاب نہیں کہ حجلۂ قرطاس پر جلوہ گر نہ ہو۔ اکثر شعرائے متاخرین کے دواوین میں "دُلہن" بمقافیۂ چمن" ہے۔ خال خال مثالیں متقدمین کی "دُلہن بروزن گلشن" کو ترجیح کا خلعت نہ پہنا سکیں گی۔ "دُلہن" بوزن چمن" کی مثالیں کم نہیں یہاں وقت ہی کم ہے۔ ایک واقعاتی سند پیش کردں وہ اس سے بہتر ہوگی

کر سکتا نہیں ڈھونڈھوں یہ کام سب کر لینگے۔

جناب حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی مغفور اپنے مرحوم کے علاوہ حضرت قبلہ امیر مینائی سے بھی مستفید تھے۔ جب وہ گیا میں بسلسلۂ مطب قیام پذیر تھے میری ابتدائی مشق کا زمانہ تھا۔ صوبہ بہار کے ذوقِ شعر رکھنے والے ان سے مستفید تھے۔ ایک غزل طرحی "گلشن، دامن" والی تھی جس میں کسی نے دلہن ہمقافیہ گلشن کا شعر بھی لکھا تھا مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ شعر مرحوم حضرت کوثر نے قلمزد کر دیا۔ مجھ سے پوچھا تم اپنی غزل میں یہ قافیہ لوگے یا نہیں میں نے دیوان مرزا غالب کا حوالہ دینے کے بعد کہا کہ بحر مفاعیلن مفاعیلن فعولن میں جناب کا مصرع ہے سے

"دلہن ہوتی ہے پہناتے دوشالہ"

فرمانے لگے میں نے دُلہن بوزن چمن (یا سمن) اساتذہ سے سُنا اور لکھنؤ میں یونہیں بولتے ہیں۔ مستفید ہوں نے شاید بوزن گلشن نظم کیا ہو۔ (المختصر ایک دلہن کو دو پلے پر نہ رکھا جائے)

ایک محاورہ حسب محل اسی دلہن کے متعلق بنظر تحقیق لکھ دوں مضمون ختم ہوتا ہے۔ دُلہن نے ہاتھوں میں مہندی رچائی صحیح نہیں مہندی لگائی یا دُلہن کے ہاتھوں مہندی رچی صحیح ہے۔

صوبہ بہار کے ایک شاعر نے مہندی رچائی لکھا وہیں کے محقق علامہ شوق نیموی نے اعتراض کیا وہ زمانے حضرت قبلہ امیر مرحوم اُس وقت بقید حیات تھے ان سے خط لکھکر پوچھا گیا "ہاتھوں میں مہندی رچائی صحیح ہے یا نہیں؟" جواب آیا گو سادہ رنگین نہ تھا "یہ محاورہ اس طرح میری نظر سے نہیں گزرا" معترض علیہ کو تسکین نہ ہوئی وہ سمجھتے تھے مہندی رچنا صحیح ہے تو اسکا متعدی رچانا کیوں صحیح نہ ہوگا! ان سے پوچھا گیا تمہاں رچنا کا مفہوم بتائیے وہ بول اٹھے "مہندی کا رنگ پکڑ کر خوشنما ہو جانا" پھر کیا تھا کہا گیا ایسے لازمی کا متعدی خلاف محاورہ زبان ہی نہیں خلاف قیاس بھی ہے۔ حالانکہ محاورے میں قیاس کا دخل ہی نہیں۔

"شادی رچائی" غلط نہیں، شادی ایک تقریب کا نام ہے، جیسے اُس نے دھوم دھام سے بیٹے کی شادی رچائی۔

چار صفحے رنگین کرنے کا جُرم شفق کے ہاتھوں ہوچکا، اب قلم معافی مانگتا ہے

(خزینۂ رباعیات مطبوعہ کی چارسو رباعیوں سے ایک رباعی)

سامان امیری ہے فقیری کے لئے　　کتنے خادم ہیں ایک پیری کے لئے
رعشہ بھی ہے ہاتھوں ہاتھ لینے کو قدم　　حاضر ہے عصا بھی دستگیری کے لئے

(کہدیجئے سب لغزشیں معاف اور ہاتھوں ہم کچھ نہیں چاہتا)

شفق مینائی عماد پوری

برق و خرمن[1]

یہ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں، "تو ہے کہ مَیں"　　بس کہ اک نکتہ نمایاں ہے نظر کے سامنے
زندگی ہے سر بسر اک سعیِ پیوستہ کا نام　　ایک ہی منزل کہاں عزمِ سفر کے سامنے
دیدنی تھا بندگانِ عشق کا ذوقِ سجود　　جھک گئیں لاکھوں نگاہیں اک نظر کے سامنے
آہ ان سے چھن گئی ہے سطوت و شانِ خودی　　گھر کے مالک لٹ رہے ہیں آج گھر کے سامنے
عشق نے بخشا ہے کچھ ایسا کمالِ ذوقِ دید　　اب کوئی پردہ نہیں حائل نظر کے سامنے
ہے ہمارا بھی تو آخر قبلۂ ذوقِ نظر　　روز و شب جھکتے ہیں ہم بھی ایک در کے سامنے
دل میں لاکھوں آرزوئیں لے کے جاتے ہیں مگر　　چُپ سی لگ جاتی ہے حُسنِ بے خبر کے سامنے

دیکھئے پرواز کیا گذرے خرد کی جان پر
چل پڑے ہیں ہم کسی دیوانہ گر کے سامنے

الطاف پرواز
(رکن ادارہ "نیرنگِ خیال" لاہور)

[1] زیر ترتیب کتاب "متاعِ کلیم" کا ایک ورق

دوست

جب ہجوم بے کسی سے تنگ آجاتا ہے دل — خود بخود جب بیٹھے بیٹھے اپنا گھبراتا ہے دل
جب نظر آتی ہے رنجوں کی گھٹا چھائی ہوئی — زندگی پھرتی ہے جب خلوت میں گھبرائی ہوئی
ٹھہر ٹھہر اٹھتے ہیں لب آہ و فغاں کے واسطے — راز جب ہوتے ہیں مضطر رازداں کے واسطے
جب مچلتی ہیں تمنائیں نکلنے کے لئے — کروٹیں لیتے ہیں ارماں رُخ بدلنے کے لئے
آرزوئیں کسمسا کر دل میں ہو جاتی ہیں جب — حسرتیں اپنا کفن خود سی کے لے آتی ہیں جب
جب کسی عنوان دل کو سرخوشی ملتی نہیں — زندگی میں جب ادائے زندگی ملتی نہیں
خود بخود بازنگاہ قہ سمن ہو جاتی ہیں جب — دن کے جلوے رات کی تاریکیوں میں پھول سب
ذرہ ذرہ مسکراتا ہے ستانے کے لئے — گوشہ گوشہ دوڑتا ہے کاٹ کھانے کے لئے

ہوتی ہے اس وقت پھر اک دوست کی دل کو تلاش
صاحب محمل کی خود ہوتی ہے محمل کو تلاش

دوست یعنی وہ دوست دل کی دھڑکنوں کا رازدار — مونس و ہمدرد و ہم احساس مخلص جاں نثار
دوست یعنی دوست آڑے وقت کا سچا رفیق — خوش ادا خوش کام خوش خو خوش نظر خوش دل خلیق
دوست یعنی دوست ہر بگڑی بنی کا کارساز — بے غرض بے حرص بے آزار دلبر دلنواز
دوست یعنی وہ دوست سچا یار یکتا آشنا — بے نمود و بے نمائش بے تکلف باوفا
دوست یعنی وہ دوست ہر درد و الم کا چارہ گر — بامروت با محبت با ارادت با اثر
دوست یعنی وہ دوست گلزار عقیدت کا گلاب — خوش مذاقی کا ستارا خوش دلی کا آفتاب
دوست یعنی وہ دوست لطف و جود کا ابر رواں — خلق کا دریا خلوصیت کا بحر بے کراں
دوست یعنی وہ دوست جس کی ہر نظر میں ہر گھڑی — موجزن ہو صدق کی اک گونجتی گاتی ندی
دوست یعنی وہ دوست جس کے ہر نفس میں بے حجاب — مہر اور اخلاص کے بجتے رہیں ساز و رباب

دوست یعنی وہ دوست جس کی جنبش لب زرنثار — راست گفتاری کے موتی صدق گوئی کی بہار
دوست یعنی وہ دوست جس کی دوستی ہو استوار — کوہ کی مانند جو محکم ہو اور عالی وقار
دوست یعنی وہ دوست جو ہو ہم مذاق و ہم مزاج — دوستی کی رکھ سکے تا حشر جو دنیا میں لاج

حلقۂ تزویر عالم میں نہ ہرگز گھر سکے
جو نہ بہکانے سے بہکے جو نہ پھیرے پھر سکے

دوست تو ملتا ہے لیکن بے وفا بے اعتبار — چار دن کو گلستاں میں جیسے آجائے بہار
دوست تو ملتا ہے لیکن حرص و مطلب کا غلام — پھول کے رس کے لئے بھونرا ہو جیسے تشنہ کام
دوست تو ملتا ہے لیکن دشمنی کے واسطے — موت منہ پھیلائے جیسے زندگی کے واسطے
دوست تو ملتا ہے لیکن خود نما و خود ستا — جس طرح اک ظرف خالی سے نکلتی ہے صدا
دوست تو ملتا ہے لیکن پُر فریب و پُر دغا — روشنی دینے لگے جس طرح جادو کا دیا
دوست ملتا ہے مگر بیکار لاحاصل فضول — جیسے سلمیٰ کا ستارا کاغذی جیسے ہو پھول
دوست ملتا ہے مگر ذوق نمائش سے خراب — جیسے آوارہ فضائے عصر حاضر کا شباب
دوست ملتا ہے مگر رنگ طبیعت کے خلاف — سوگ کی جیسے ہو چادر بزم عشرت کے غلاف
دوست ملتا ہے مگر ہمدردیوں سے دور دور — شب کو جیسے غول صحرائی کی مشعل کا ہو نور

رنج دل کو بخشتا ہے سرخوشی کی آڑ میں
دشمنی کرتا ہے اکثر دوستی کی آڑ میں

کاش ملتا دوست ساز صدق پر گاتا ہوا — ہر قدم پر نغمۂ اخلاص برساتا ہوا
کاش ملتا دوست فردوس وفا کی بزم میں — پھیلتیں رعنائیاں صدق و صفا کی بزم میں
کاش ملتا دوست لیکر خلق کے رنگین پھول — زندگی کے کینے پڑتے پھر تو کانٹے بھی قبول

غنچۂ امید کھلنا چاہئے کھلتا نہیں
دوست مل سکتا ہے دنیا میں مگر ملتا نہیں

صبا متھراوی

بے غیرت

اب وہ افیون کے استعمال کا عادی ہو چکا تھا، لیکن اس کی عام زندگی میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوا تھا۔ لباس کی صفائی، ہم ذوق احباب کے ساتھ بزمِ میلاد اور اسی نوع کی دوسری مذہبی محفلوں کی شرکت، مقبروں کی قرآن خوانی اور امامت کے فرائض وہ حسبِ سابق نہایت ذوق و شوق کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔

اسکی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ مضبوط قویٰ، چہرے پر سرخی، موزوں خد و خال بھرا ہوا جسم یہ تھی اسکی ظاہری ہیئت! وہ دنیاوی ذمہ داریوں کے بوجھ سے عرصہ ہوا آزاد ہو چکا تھا۔ ماں باپ اور ایک بہن جو لے دیکے اپنے خاندان میں بچے تھے ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے ——— اور اب وہ اپنے ایک دور کے رشتہ دار کے یہاں رہتا تھا جو اُس سے مثلِ بیٹے کے محبت کرتا تھا۔

اسکی آمدنی معقول تھی ——— لیکن فضول خرچی کی عادت نے کبھی اس کے پاس اتنا روپیہ جمع نہ ہونے دیا کہ وہ شادی کا بار اُٹھا سکے۔ جب اسکے عزیز اور احباب اُس سے شادی کا تذکرہ کرتے تو وہ کچھ دیر سوچتا ——— سوچتا رہتا اور اس کے بعد صرف اسقدر کہہ کر "جب قسمت میں ہوگی، خود ہو جائیگی" اپنا پیچھا چھڑا لیتا ——— اور اب جبکہ وہ افیون کثرت سے کھانے لگا تھا، دن اور رات کے بیشتر لمحات میں اسکو تنہائی کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا اور اسکے دل میں بھی حسین قرب کی خواہش انگڑائیاں لینے لگتی۔ اُس نے فضول خرچی سے اجتناب کرنیکا تہیہ کیا، دو چار مہینہ میں کچھ پس انداز بھی کیا، مگر افیون کی زیادتی نے اسکے قویٰ پر گہرا اثر ڈالنا شروع کیا جسکے باعث وہ آئندہ ایک پیسہ بھی جمع نہ کر سکا!

ایک سال کے بعد اسکے عزیز نے کسی طرح اسکی شادی کر دی اور تین سال میں وہ تین بچوں کا باپ بن گیا ——— ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ اسکی عام روش میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا وہ اپنے متعلقہ فرائض اُسی تندہی، محبت اور جانفشانی سے بخوبی انجام دے رہا تھا ——— البتہ افیون کی تعداد روز بروز ترقی جاری تھی جسکے نتیجہ میں اس کی صحت بد سے بدتر ہو گئی تھی۔ وہ اب رات کے علاوہ دن میں بھی افیون کا استعمال کرنے لگا تھا، کثرت سے چائے پینا شروع کر دی تھی اور ایک پیکٹ سگرٹ کے بجائے دو دو اور تین تین پیکٹ دن اور رات میں پی جاتا تھا۔ چار سال میں اسکی سفید پوشی بھی رخصت ہو چکی تھی۔ وقت کے تیز بہاؤ کے ساتھ اسکی زندگی کے دھارے بھی تیز گامی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ تھکی ہوئی موجوں کی طرح اُس کی تغیر پذیر زندگی بھی شل ہو گئی۔ اُسکے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو گیا، چال میں سستی آ گئی مقبروں کی قرآن خوانی اور امامت کے فرائض میں بھی کوتاہی ہونے لگی ——— محفلِ میلاد کی شرکت میں جو کہ اسکا محبوب مشغلہ تھا، فرق آ گیا۔ اسکے احباب جو عام طور پر اُسی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اُس سے مایوس ہو کر کسی نئے دوست کی تلاش میں مصروف ہو چکے تھے ——— اور وہ ——— وہ خود بھی ہر چیز سے بے نیاز ہو کر رہ گیا تھا۔

زندگی اسکی نظر میں لذت و نشہ، کیف و سرود اور مستی و خود فراموشی بن گئی تھی۔ اُسے بیوی بچوں کی بھی کوئی فکر نہیں رہی تھی ——— کیونکہ اسکے رشتہ دار اُن کے کفیل تھے۔ زمانہ نے کچھ اور نئی کروٹیں لیں، دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں، اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے رہے لیکن وہ دُنیا کے ہنگاموں سے بے پروا، زندگی کی روندی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلتا رہا ——— چلتا رہا ——— بھٹکے ہوئے راہی کی مانند ——— ! اور اب اسکی ساری تنخواہ افیون، چائے اور سگرٹ کی نذر ہونے لگی مقبروں کی عدم حاضری، امامت کے فرائض میں کوتاہی کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دونوں جگہوں سے دو ایک بار تنبیہ کئے جانے کے بعد علیحدہ کر دیا گیا۔

چھ ماہ کے بعد اسکو پہچاننا مشکل تھا، نشہ خواہ وہ کیسا ہی ہو، ہر حالت میں انسان کے دماغی توازن پر اثر انداز ہوتا ہے اور جب نشہ کرنے والے کی خواہش بروقت پوری نہ ہو تو وہ مذموم سے مذموم فعل سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ بھی افیون کے نشہ کی پیاس کو اول اول تو اپنے رشتہ دار کے پیسوں سے بجھاتا رہا اور جب وہ بھی زیادہ عرصہ تک اس بار کے متحمل نہ ہو سکے تو اُس نے بیوی کے دو چار چاندی سونے کے زیوروں کو ٹھکانے لگا کر افیون کھائی۔ بے زبان عورت صبر و شکر کے ساتھ اپنے دوزخ کو دوسروں کے ٹکڑوں سے بھرتی رہی اور خدا کا شکر ادا کرتی رہی ——— لیکن ایک روز جب اُس نے پہلی بار اپنے ہی عزیز کے برتن بھانڈے چرا کر فروخت کر ڈالے تو اسکی بیوی ندامت کے ناقابل برداشت بوجھ سے دب کر رہ گئی، اسکے عزیز

نے اسکی ڈھارس بندھائی، اور جب شام کو اسکا شوہر گھر آیا تو انھوں نے صاف الفاظ میں اس سے کہدیا کہ وہ اب آئندہ اس گھر میں قدم نہ رکھے ــــــ اُسنے خاموشی سے اپنے عزیز کی لعنت و ملامت کو برداشت کیا اور چپ چاپ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

اب اُسکی حالت اور بھی پتلی ہوگئی۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی، چہرہ پر سیاہی، آنکھوں میں بھیانک نشیلی کیفیت، اعضا میں اضمحلال اور سستی دل و دماغ پر جمود ــــــ اور بے حسی کا خمار، ایسا خمار جو صرف افیون کے مسلسل اور باقاعدہ استعمال ہی سے اثر سکتا ہے۔ اُسکے بدن پر چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے، گھر سے نکل کر وہ معمولی محنت و مزدوری سے افیون کی کچھ نہ کچھ تعداد مہیا کرکے کھاتا رہا اور راتوں کو کھانس کھانس کر اور بلغم تھوک تھوک کر کہیں نہ کہیں وقت گذارنے لگا۔ وہ اب مستقل محنت، یا ملازمت کا قطعی عادی نہیں رہا تھا اُسکی راتیں خصوصاً جاگتے ہوئے بسر ہوتیں، دن چڑھے تک وہ سوتا رہتا اور دوپہر کے موت کے سے خاموش اور اداس لمحوں میں گلیوں، سڑکوں اور عام گذرگاہوں پر گھوم پھر کر دو چار آنے بھیک مانگ لیتا تھا، اُسے اب بھیک مانگنے میں بھی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی، سڑکوں کی اٹھائی ہوئی بیڑیوں اور سگرٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑوں سے اسکے پھیکے اور بے رونق دن اور تیرہ و تار راتیں بسر ہو رہی تھیں۔ زندگی میں اب وہ کسی تبدیلی یا تغیر کا خواہشمند نہیں تھا۔ بیڑی اور سگرٹ کے گری ہوئی چنگاری کی طرح اسکی زندگی کے خواب روشن تھے ــــــ اور وہ اس پر مطمئن تھا۔ وہ دن کی روشنی میں اپنا چہرہ دنیا کو دکھانا نہیں چاہتا تھا، وہ تو صرف تاریک لمحوں کی چاہ میں اور افیون کی پینگ میں ہمیشہ مست و خراب حال رہنا چاہتا تھا۔ وہ دُنیا کے تلخ تجربوں کے باوجود دُنیا سے بیزار نہیں تھا۔ احباب کی ابن الوقتی اور مطلب پرستی سے واقف ہوکر بھی اُسے اُن سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ بیوی بچوں کی بھوک پیاس کا احساس ہونے پر بھی اُسے اُنکی چنداں فکر نہیں تھی ــــــ اسکے عزیز کا سخت رویہ بھی اُسکے دل و دماغ پر کسی طرح اثر انداز نہ ہوا ــــــ اُسے فکر تھی تو صرف افیون کی فراہمی کی ــــــ پہلے تو وہ دونوں وقت افیون کھاتا تھا اور اب ــــــ اب اُسے ایک وقت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ پہلے وہ افیون کھانے کے بعد چائے کی چار چار، چھ چھ پیالیاں بیک وقت پی جاتا تھا اور اب ایک پیالی بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ اِدھر اُدھر سے دو چار روٹیاں اور کچھ ترکاری مانگ کر وہ اپنے پیٹ کی آگ کو دبایا کرتا تھا ــــــ اور کبھی دو دو تین تین وقت اُسے فاقہ کرنا پڑتا تھا ــــــ لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھا، گھر سے باوجود نکال دیئے جانے کے ــــــ وہ اب بھی کبھی کبھی اپنی لاأبالی زندگی کے کچھ لمحے بیوی بچوں میں جاکر گذار لیتا تھا۔ اُسکی متغیر حالت پر سب نے اسکو لعن طعن کی، لیکن اُس پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ اُسکے عزیز اُس سے قطعی مایوس ہوچکے تھے۔ اسکی بے غیرتی، بے حسی اور نشہ کی وارفتگی نے اُس کو دُنیا کی ہر ذمہ داری سے بے نیاز سا کر دیا تھا۔

اُس کے عزیز جب اُسکی بدلی ہوئی حالت اور غیر ذمہ دارانہ روش سے پریشان ہوگئے۔ اور اُسکے بیوی بچوں کا بار بھی اُن کے بس کا نہ رہا تو کسی طرح ایک روز اُنھوں نے اُسکی موجودگی میں بیوی کو طلاق دلوادی اور اس طرح بے زبان سا جانوروں کو قفس کی قید سے رہائی مل گئی۔ چونکہ اُسکے عزیز نہایت شریف طبع تھے، طلاق ہونے ہی اُنھوں نے انتظام کرکے اُس کی بیوی کا عقد ثانی کرا دیا ــــــ لیکن وہ ــــــ وہ ان سب حالات سے واقف ہوکر بھی کسی طرح متاثر نہ ہوا ــــــ اُسکی رگوں کا خون سرد ہوچکا تھا، اُسکا جذبۂ حمیت مرچکا تھا، اُسکا دل و دماغ بجز افیون کے تصور کے ہر تصور سے عاری تھا ــــــ اُس کے اعضا شل ہوچکے تھے، بالکل اُس ماندہ اور تھکے ہوئے کسان کی طرح جسکی فصل تیار ہو اور اُس سے کام کرنے کی طاقت سلب کرلی جائے ــــــ چھین لی جائے!

عزیز کے دروازے کے علاوہ اب اُس کے لئے ایک نیا دروازہ بھی کھل گیا تھا ــــــ اسکی بے حس فطرت، اُسکا بے غیرت جذبہ اور اُسکا کسی چیز کے نشیب و فراز سمجھنے سے عاری دماغ ایک روز اُسکو مطلقہ بیوی کے دروازے پر بھی لے پہنچا ــــــ اور نشہ کے لئے وہ بطور بھیک کچھ نہ کچھ مانگ لایا ــــــ اب وہ اکثر و بیشتر اُس فرشتہ خصلت عورت کے رحمدل جذبوں، ہمدردیوں اور پیار بھری طبیعت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا ــــــ اٹھاتا رہا اور افیون کے نشہ میں خوابیدہ رات کے بیشتر حصے میں کھوں کھوں کی مسلسل آوازوں کے ساتھ جلے ہوئے بیڑی اور سگرٹ کے ٹکڑوں کے لاشوں کے کشتوں میں اپنی بے غیرت زندگی اِدھر اُدھر کہیں نہ کہیں گذارتا رہا ــــــ حتیٰ کہ ایک روز جبکہ وہ اُسی نئے دروازے پر رات کی افیون کے لئے کچھ ــــــ مانگنے پہنچا تو اسکی بیوی کا شوہر آپہنچا اور اُس نے اپنی بیوی کو پیسے دیتے ہوئے دیکھ لیا ــــــ وہ بلا کسی خوف یا ڈر کے پیسے لیکر چلنا ہی چاہتا تھا کہ اُس کے شوہر نے اسکے گال پر ایک بھرپور طمانچہ رسید کیا اور پیسے چھین کر کہا ــــــ "اگر جیل کی ہوا کھانا نہیں چاہتا تو پھر آئندہ اس دروازہ پر ہرگز نہ پھٹکنا ــــــ سُن لے بے! میں پٹھان ہوں ــــــ کھرا پٹھان اور پولیس کا ملازم! آج تو تجھے چھوڑتا ہوں ــــــ کمینے، رذیل، بدمعاش، بے غیرت ــــــ" اور یہ کہکر دھکے مار کر اُس کو اپنے محلے سے نکال باہر کیا وہ اپنی بیوی سے کچھ نہ کہہ سکا ــــــ کیونکہ وہ سب کچھ جانتا تھا ــــــ!!

نوادرات

شبِ غم کی درازی زلفِ جاناں کون دیکھے گا　　لگا کر تجھ سے دل خوابِ پریشاں کون دیکھے گا

وہ کہہ کر گزریں گے تو منہ پھیر کر گذر جائینگے رستے سے　　ٹھہر کر جانب گورِ غریباں کون دیکھے گا

لیا اگر آنکھ تجھ سے تیر کھاتے ہیں کلیجے پر　　ہماری طرح تجھ کو دشمنِ جاں کون دیکھے گا

جو ہنگامِ سحر تم ہو کے رخصت گھر کو جاتے ہو　　ہمارا دم نکلتے شامِ ہجراں کون دیکھے گا

ہمیں بھی ساتھ لے لو جلوہ گاہِ ناز تک موسیٰ　　جو غش آئیگا تم کو حسنِ جاناں کون دیکھے گا

پڑے ہیں تو پڑے رہنے دو میرے خون کے دھبے　　تمہیں دیکھیں گے سب محشر میں داماں کون دیکھے گا

جگر اب میکدے میں آگئے ہو تو مناسب ہے　　الگ چھپکے سے تم پی لو مسلماں کون دیکھے گا

(حکیم) جگر صدیقی وارثی بریلوی

نہ جانے کیا ہوا؟

آج دونوں کو سرِ محفل نہ جانے کیا ہوا　　ہے جگر قابو سے باہر، دل نہ جانے کیا ہوا

دیکھتے ہی دیکھتے قاتل نہ جانے کیا ہوا　　دل ابھی سینے میں تھا اب دل نہ جانے کیا ہوا

عین منزل پر ہمارا دل نہ جانے کیا ہوا　　تھا وہی اک رہبر کامل، نہ جانے کیا ہوا

آج ہے بے کیف سی محفل، نہ جانے کیا ہوا　　آئے تھے جس دل سے ہم وہ دل نہ جانے کیا ہوا

لطف جینے کا جو تھا حاصل نہ جانے کیا ہوا　　وہ محبت کے دنوں کا دل نہ جانے کیا ہوا

چل پڑا ہوں میں جو منزل پر خدا کا لیکے نام　　اب وہ خوفِ دوریِ منزل نہ جانے کیا ہوا

شمع تک جاتے ہوئے دیکھا سبھوں نے بزم میں　　بعد ازاں پروانۂ محفل نہ جانے کیا ہوا

ہر قدم پر اب تو ہے منزل کے ملنے کا یقیں　　وہ ہراسِ دوریِ منزل نہ جانے کیا ہوا

مجھ کو بحرِ عشق میں رکھنا قدم تو یاد ہے　　پھر سمندر کیا ہوا، ساحل نہ جانے کیا ہوا

بارہا کھائے ہیں غوطے میں نے ساحل کے قریب　　تھا یہیں ساحل، مگر ساحل نہ جانے کیا ہوا

درد ہی سے تقویت رہتی تھی دل کو عشق میں　　درد ہی تھا آشنائے دل نہ جانے کیا ہوا

کیف وہ محفل میں آج آیا کہ سب چلا اٹھے　　دل کو جانے ہو گیا کیا، دل نہ جانے کیا ہوا

عمر بھر انسان سرگرمِ حصولِ زر رہا　　چھوڑ کر سب چل دیا، حاصل نہ جانے کیا ہوا

رات ہی بھر کے لئے تھیں بزم کی رنگینیاں　　صبحدم ہنگامۂ محفل نہ جانے کیا ہوا

ہو نہ ہو دل لے لیا نشتر انھیں نے آپ کا　　[illegible]

[illegible]

حکیم الامتؒ

حال میں دُنیائے اسلام کے بہت بڑے محقق رحلت فرماگئے۔ آپ کا نام نامی **اشرف علی** صاحب تھانویؒ تھا۔ آپ نے ۱۹، ۲۰ رجولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب کو اس عالم ناسوت کو چھوڑ دیا۔ یہاں حضرت علامہؒ کے کچھ حالات سپرد قرطاس کئے جاتے ہیں۔ حضرت والاؒ کو امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہر فرد جانتا ہے۔ دوآبہ ہند سے لیکر دجلہ و فرات تک آپ کی شہرت ہے۔

آپ جامع کمالات، صاحبِ تکمیل قطب ارشاد و شیخ وقت تھے جو دُنیا کو دینی تعلیمات سے منور و شاداب فرمانے آئے تھے اپنا کام کیا اور رخصت ہوگئے۔ آپ کے کن کن اوصاف کو بیان کیا جائے۔ قرنِ آخری میں قرن اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھے جنھوں نے آپ کے مستقر خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون کو دیکھا ہے وہ اس امر کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ خانقاہ کا ماحول اسلامی کلچر کا آئینہ دار ہے۔ آپ کا جو قدم بھی پڑتا تھا، انسانی کوشش کے مطابق سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے نقشِ قدم پر پڑتا تھا۔ جادۂ سنت پر کوہ استقلال بنکر قائم رہنے والے بزرگ تھے دنیا میں سینکڑوں طوفان آئے۔ زمین کا نقشہ بدل گیا۔ ہزاروں حادثات رونما ہوئے۔ صدہا چکا چوند پیدا کرنے والی تحریکات نے سر اُٹھایا مگر آپ اپنے مرکز سے ایک سینٹی میٹر بھی نہ ہٹے یوں تو ناسبینِ سالت کو فہم و ذکاوت خاص طور پر غیب سے عطا ہوتی ہے مگر آپ کو مشکوٰۃ نبوت سے وہ نور فراست اور وہ ذہن ثاقب ملا ہوا تھا کہ جہاں چمکا اور جہاں پھیلا آسمانی چراغوں نے شرم سے آنکھیں بند کرلیں۔ آپ شروع سے بلا کے ذہین و فریس تھے بڑے بڑے فلاسفر اور منطقی مقدمات قائم کرکے آتے تھے اور آپ بفضل ایزدی اُن کے ہی الفاظ سے ان کو ایک منٹ میں گونگا بنا دیتے تھے اور زعم طلاقت و ذلاقت کے سپر خود بخود حریف سامنے ڈالدیتا تھا۔ ندامت اطاعت میں تبدیل ہوجاتی اور برآں مزید حضرت کا گرویدہ ہوکر واپس جاتا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاءُ۔ آپ اپنے اساتذہ اور مشایخ کا بڑا احترام و ادب کرتے تھے اور اُٹھتے بیٹھتے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ان بزرگوں کی جوتیوں کا طفیل ہے کہ ناکارہ کو کچھ شد بد آگئی ہے ورنہ میرے پاس کیا دھرا ہے۔ نہ علم ہے نہ عمل ہے۔

حکیم الامت کا لقب دیکھ کر بہت سے قارئین کو دھوکا ہوا ہوگا اور اُن کا ذہن ڈاکٹر اقبال مرحوم کی طرف منتقل ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر مرحوم شعر و شاعری کے امام بنکر چمکے اور حکیم الامتؒ جملہ علوم و فنون کے ماہر تھے اور چمکنے کے مقابلہ میں دوسروں کو چمکانے کی فکر میں رہتے تھے لہٰذا عرصہ دراز سے قلوب مومنینؒ اللہ تعالیٰ نے یہ لقب القا فرمادیا بعدازاں ادب نواز طبقہ اقبال مرحوم کو بھی حکیم الامت لکھنے لگا

حکیم الامتؒ مجدد ملت حضرت مولانا مرحوم نے اپنی تمام زندگی امت کی اصلاح کے لئے وقف کردی تھی۔ چنانچہ اپنی عمر تربیت اور تالیف قلوب میں گذار دی اور اسی کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے۔ آپ لندن۔ پیرس کی یونیورسٹیوں میں نہ پڑھے تھے نہ آپ نے کسی پروفیسر یا لیکچرار کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا۔ نہ آپ نے مغربی پروپگنڈے کو منہ لگایا تھا نہ افرنگی ملمع کاریوں سے کام لیا تھا نام و نمود سے احتراز و اجتناب فرماتے تھے۔ خلوص سادگی کے پتلے تھے۔ نور معصومیت تقدس و تقوی کے ساتھ یں چہرہ پر پھیلا رہتا تھا اور پیرانہ وقار اور متین شگفتگی ڈاڑھی سے جھانکتی تھی۔

آپ نے جامعہ اسلامیہ دیوبند میں تعلیم پائی۔ ۱۹۔ ۲۰ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے اور بڑے بڑے علما و حکما کو آپ سے شرفِ بیعت حاصل ہوا۔ سیاست فاروقی آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ چنانچہ عالم۔ حافظ۔ قاری۔ واعظ۔ محدث مفسر۔ مناظر اور طبیب سبھی کچھ تھے۔ آپ کی استعداد فطری کا کیا احاطہ کیا جائے۔ اللہ جل شانہٗ نے اُن اوصاف جمیلہ سے ممتاز فرمایا تھا۔ تدبر۔ تیقظ۔ دقتِ نظر۔ شجاعت محبت استقلال۔ عدل۔ حق گوئی۔ حق پسندی۔ عبدیت۔ جفاکشی۔ گرانیِ نفس۔ بصیرت۔ انتظام۔ اصابت رائے وغیرہ وغیرہ۔ جن حضرات کو شوق ہو خواجہ عزیز الحسن صاحب کی تالیف کردہ "اشرف التوایخ" ملاحظہ فرمائیں۔

آپ کے یہاں "ڈسپلن" یعنی انتظام اور انضباطِ اوقات کا بڑا اہتمام رہتا تھا روزانہ کی ڈاک کا جواب اُسی روز ختم کرکے اُٹھتے تھے اور مکتوبات سیکڑوں کی تعداد میں آتے تھے۔ ہر کام اپنے وقت پر بلاناغہ ہوتا تھا۔ بہتے دریا کی مانند شب روز کام میں مصروف رہتے تھے۔ بہت کم بیمار ہوتے تھے کیونکہ ہر بات میں اعتدال ملحوظ تھا زیادہ تر تندرستی اچھی رہتی تھی آپ نے بیاسی سال کی عمر پائی۔

آپ ترتیب و سلیقہ کے دلدادہ تھے۔ یہانتک کہ آپ کو بے ترتیب تحریروں سے

ہمیں ہوتی تھی ایسی تقریریں کرنا یا سننا دونوں پسند نہ فرماتے۔ آپ مسلسل چھ چھ ساعات گھنٹہ تک تقریر فرمایا کرتے تھے مگر پھر تقریر میں بے ربطی یا کمزوری نہ پیدا ہوتی۔ منزہ کے فنی ماہرین خطابت یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ ہم نے ایسا بولنے والا شخص کہیں نہیں دیکھا اور وہ بھی بغیر کسی تیاری کے۔ ہر وعظ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہلے سے سودہ تیار کر لیا گیا ہوگا۔ جیسے جیسے الفاظ موزونیت کے ساتھ استعمال فرماتے تھے جنہیں سخنور شاعر بھی حیران رہ جاتے تھے کہ اس مولوی کو ایسی فصیح و بلیغ تقریر کرنا کہاں سے آگئی۔ نکات و اسرار کا نادیدہ خزانہ کہاں سے ہاتھ آگیا۔ آپ کے دینی کارناموں کو ہم رتبہ شخص ہی پہچان سکتا ہے آپ نے ۸۰۲ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جنکی قیمت کا اندازہ لاکھوں روپے تک پہنچتا ہے مگر آپ نے کسی تصنیف کا حق محفوظ نہ رکھا سب رفاہ عام کے لئے وقف ہیں جس کا جی چاہے چھپوائے ہزاروں مقالے اور سیکڑوں مواعظ کے آپ مالک ہیں۔ جن میں سے بیشتر قلمبند ہو کر چھپ چکے ہیں جو سب کے سب علم و عرفان کے نکات سے لبریز ہیں (قارئین کرام ان کا مطالعہ فرمائیں ان شاء اللہ بہت نفع ہوگا) آپ کے شائع شدہ وعظ کی پیشانی پر یہ عنوان ہوتا ہے۔

وعظ کا نام

متی	این	کیف	کم	ماذا	لم
کب ہوا (فلاں روز)	کہاں ہوا (فلاں مقام پر)	کس طرح ہوا (بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر)	کتنی دیر ہوا (اتنے منٹ اور گھنٹے)	کیا مضمون تھا (فلاں مضمون تھا)	کیوں ہوا (فرمائش پر یا تحریک پر یا خود مرضی سے)

من ای شان	مستمعون	من ضبط	اشتات
کس کے لئے نافع ہے (صوفیوں کے لئے سننے تعلیم یافتہ کے لئے یا عوام کے لئے)	سننے والوں کی تعداد کتنی تھی (غیر حاضرین کا)	کس نے قلمبند کیا (مختصر نویس کا نام)	متفرقات (دوسری باتوں کا ذکر)

شاعروں کا نازک خیال اور بد دماغ گروہ اکثر تعلّی پسند ہوتا ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں خود کو خوش فہم و ذہین سمجھتا ہے اور اکثر کا گمان فاسد تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ان مولویوں کے پاس دھرا کیا ہے یہ تو صرف "ملّا مسجد" ہوتے ہیں۔ کاش وہ اس بات پر غور کرتے کہ جن عمدہ الفاظ کا ذخیرہ اُن کے قبضے میں ہے وہ کہاں سے آیا؟ یقیناً یہی جواب ہو سکتا ہے کہ عربی و فارسی سے اور عربی فارسی تو مولویوں کے گھر کی لونڈی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے زیادہ شیریں گفتار فصیح اللسان اور جامع الکلم کون ہو سکتا ہے۔ یہ اُن کے ادا شناس، مرضی داں ہوتے ہیں اُن کی حدیثوں کو یاد کرنے والے شعور و حکمت کے موتیوں سے مالا مال نہ ہونگے تو کون ہوگا؟ حقیقت امر یہ ہے کہ علمائے ربانی شاعروں کی طرح درخشاں و خوبصورت الفاظ کے فاضلانہ استعمال کو مورث نفاق سمجھتے ہیں۔ بیجا لفاظی اور سخن پروری ان کو پسند نہیں سیدھی سچی بات عام فہم زبان میں ان کو پسند ہے۔ اور شاعری جیسی غیر ضروری امور کو "متاعِ غرور" سمجھ کر اُس کے پیچھے نہیں پڑتے۔ وہ "الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت وذکروا اللہ کثیرا" "لم تقولون ما لا تفعلون" کی تصویر ہوتے ہیں مگر ما شاء اللہ سب ایسے نہیں ہوتے۔ اولیاء اللہ کے یہاں کسی بات کی کمی نہیں۔ ایسے حضرات کو علم سے کورا اور عالموں کو بے خبر سمجھنا بے خبری کی دلیل ہے دنیوی امور میں حصہ نہ لینے سے اُن کی استعداد میں نقص نہیں ثابت ہو سکتا کیونکہ کسی چیز کا عدم ظہور اسکے عدم وجود کو مستلزم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں اور روز بروز ترقی کر رہے ہیں۔ اُن کے ذاکر قلوب مشغول بحق ہیں۔ اپنے محبوب حقیقی کی یاد سے تھوڑی دیر کے لئے غافل ہو جانا اور دوسری طرف متوجہ ہونا ان کو گوارا نہیں بلکہ اُن کے لئے بار خاطر اور باعثِ خلجان ہوتا ہے۔

آپ بہت ذکی الحس تھے اور شاعرانہ مزاج پایا تھا۔ جس طرح اکثر اولیاء اللہ کسی غلبہ کے طریان سے شعر کہہ لیتے ہیں اسی طرح آپ بھی کہہ لیتے تھے کیونکہ جب کبھی جوشِ محبت موجزن ہوتا ہے تو سوز و گداز شعر کی صورت میں اُبل پڑتا ہے۔ جب آپ طالب علمی کے زمانہ میں بیماری کی حالت میں مدرسہ سے رخصت لیکر وطن تشریف لائے تو بطور مشغلہ مثنوی "زیر و بم" فارسی میں تصنیف فرمائی۔ اس وقت آپ کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی نمونہ کلام ملاحظہ ہو:—

ہست از اضداد ترکیب جہاں   گوش کن از من دو سہ امثالِ آں
نیستی و ہستی و نقص و کمال   اُلفت و کیں پائداری و زوال
ناتوانی و تواں رنج و سرور   پستی و بالائی و نزدیک و دور
شکر و کفراں عدل و ظلم و علم و جہل   خلق و بد اخلاقی و دشوار و سہل
یار و بد خواہ و قریب و اجنبی   دوستی و دشمنی نیکی بدی
تا کجا با تو دہم تفصیلِ آں   ہمچنیں داں جملہ ترکیبِ جہاں

یہ مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ یوں تو شاہزادہ اور شاہزادی کا قصہ ہے مگر علوم و حقائق سے پُر ہے اسکا ترجمہ منظوم اردو میں ترانۂ غم کے نام سے ہو چکا ہے۔

مثنوی مذکورہ کا یہ شعر ؎ جان من جانانِ من سلطانِ من
اے تو ئی اسلام من ایمانِ من

صوفیا میں بہت مقبول ہے اُن کے مرید خاص حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب حضرت والا کو جب خط لکھتے تو القاب کی جگہ یہ شعر لکھدیا کرتے۔ خواجہ صاحب موصوف علی گڈھ کے گریجویٹ ہیں۔ طلب صادق نے انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ آپ شاعر بھی ہیں اور مجذوب تخلص فرماتے ہیں۔ پہلے انسپکٹر آبکاری پھر ڈپٹی کلکٹر ہوئے بعدازاں اپنی مصلحت کی بنا پر محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر ہو جانا قبول فرمالیا اور اب تو صحیح معنوں میں "مجذوب" ہی ہیں۔

حضرت والا کے بعض فقرے بڑے چُست اور شاعرانہ ترکیب کے ہوتے تھے ان فقرات پر غور فرمائیے۔

(۱) مولوی کافر نہیں بناتے کافر بتاتے ہیں
(۲) یہ سائنسداں مدعیان فہم وفراست عاقل نہیں آکل ہیں
(۳) مولویوں میں خشکی ہوتی ہے مگر ایسی بھی تری کس کام کی کہ ان کو ڈبودے۔
(۴) یہ نوجوان ابتک کھیلتے ہیں عمر بچپن میں ہے اور قدم بچپن میں ہے
(۵) آپ شجرہ مانگتے ہیں گو بے ثمرہ ہی ہو۔
(۶) مجھ میں شدت نہیں ہے حدت ہے۔ یہ درشتی نہیں ہے درستی ہے۔

فقرات محولۂ بالا حضرت والا کے فقرات کی بجنسہ نقل نہیں ہیں صرف وہ مخصوص الفاظ جو شاعرانہ خوبیوں کے حامل ہیں احقر کو یاد رہ گئے ہیں۔ آپ کے بعض مضامین اور کتابوں کے نام بھی ایسی ہی شاعرانہ ترکیب کے ہیں مثلاً "ارمغانِ عید" "نشر الطیب" بعض کتابوں کے نام مقفیٰ ہیں "الرفیق فی سواء الطریق" "التشرف بمعرفت احادیث التصوف" "التعدیات برفع التلبیات" "المصالح العقلیہ للاحکام نقلیہ"

آپ کی تقریروں میں جابجا اُردو عربی فارسی کے بے شمار اشعار پائے جاتے ہیں جو اپنے مناسب موقع پر چسپاں کئے گئے ہیں۔ ایک صاحب نے ان اشعار کو شمار کیا تو اُن کی تعداد تقریباً ایک ہزار نکلی یہاں "اشرف التواریخ" سے چیدہ چیدہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) کانپور میں ایک وعظ کے بعد ایک معزز وکیل صاحب نے حضرت والا کو مخاطب کرکے بہت ہی جوش کے ساتھ یہ شعر پڑھا ؎

تو مکمل از کمال کیستی؟ تو منور از جمالِ کیستی؟

حضرت والا نے اس کو نقل فرماکر فرمایا کہ میرے بھی جی میں تو آیا تھا کہ اسکے جواب میں کہدوں ؎ من مکمل از کمال حاجیم
من منور از جمال حاجیم

لیکن شرم آئی کہ کیوں خواہ مخواہ کمال اور جمال کا دعوی کروں۔ ایک بے تکلف وکیل صاحب نے ایک وعظ کے بعد کہا کہ آپ بھی کہاں مولویوں میں جا پھنسے۔ آپ اگر وکالت پاس کر لیتے تو وکیلوں میں آپ کا کوئی نظیر نہ ہوتا۔

(۲) اس داستانِ غم کو شروع کرنے سے قبل خود صاحب واقعہ یعنی حضرت والا کا ایک نہایت برمحل شعر زیب عنوان کرتا ہوں وہ شعر یہ ہے ؎

نوش ما دیدی بہ بیں ہم نیش ما عیش ما دیدی بہ بیں ہم ریش ما

(۳) (جب آپ کو حج کے سفر میں دریائے تلاطم وطوفان کی خبر ملی) والد صاحب نے فرمایا کہ بھائی اب تو ہم جا ہی رہے ہیں۔ اللہ مالک ہے دعا کیجئے یہ تو حضرت والا کے والد صاحب نے فرمایا اور حضرت والا نے نہایت جوش کے ساتھ یہ شعر پڑھا ؎ چہ غم دیوار اُمت راکہ باشد چوں تو پشتیباں
چہ باک از موج بحر آں را کہ دارد نوح کشتیباں

(۴) دوران قیام مکہ معظمہ میں تو حضرت والا پر توحید کا اسقدر غلبہ تھا کہ اس زمانہ میں ایک نہایت پُرکیف غزل بھی لکھی تھی جس میں سرتاسر توحید وجودی ہی کے مضامین تھے ...... احقر نے اس غزل کے صرف دو سادہ شعر اس جگہ لکھنے کی اجازت طلب کرلی ہے وہ یہ ہیں ؎

خودی جب تک رہی اسکو نہ پایا | جب اسکو ڈھونڈ پایا خود عدم تھے
حقیقت کیا تمہاری بھی میاں آہ | یہ سب امداد کے لطف وکرم تھے

اس غزل میں اپنا تخلص آہ تجویز فرمایا اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حضرت والا پر کسقدر غلبہ سوز وگداز تھا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ غزل بوجہ حسب حال ہونے کے اس قدر پسند آئی تھی کہ بعض مشایخ کو جو زیارت کے لئے حاضر ہوتے تھے حضرت والا سے فرمائش کرکے خاص طور سے سنوائی اور جب حضرت والا سنا چکے تو حضرت حاجی صاحب نے اُن سے فرمایا کہ یہ محض قال نہیں ہے اُن کا حال ہے۔

الغرض یہ آفتاب ہدایت ۱۲۸۰ھ میں طلوع ہوا اور تقریباً ایک صدی تک انوار کی بارش فرماکر ۱۳۶۲ھ میں غروب ہوگیا مولانا سوز ناروی نے اس مصرع میں تاریخ وفات کہی ہے "مولوی اشرف علی تھانوی کامل بدرے" خداوند ہمیں ان جیسا دوسرا رہبر عطا فرمائے۔ اب سوائے صبر وشکر کے ہم کیا کرسکتے ہیں؟ آہ! حکیم الامت آہ"

رمزی اٹاوی

محبت کے چند دور

کوئی اُلفت کا یہ سے سامنے جب نام لیتا ہے
تو میرا دردِ دل اُٹھ کر کلیجہ تھام لیتا ہے

تصور کے دھندلکوں میں شرارے سے چمکتے ہیں
کسی کی یاد آتی ہے پیامِ زندگی بنکر

وہ کیف آور زمانہ یاد آتا ہے محبت کو
جوانی سر پہ چھائی تھی خمارِ بیخودی بنکر

مری نظروں میں چھا جاتی ہے عہدِ رفتہ کی حسرت
اُبھرتے ہیں نقوشِ دردِ رنگِ بیکسی بنکر

مجھے اب بھی وہ دلچسپ نظارے یاد آتے ہیں
وہ جب آئے تھے میری زندگی میں زندگی بنکر

تجھے بھی اے حسینہ! یاد ہیں وہ دن محبت کے؟
کہ جب اُمید ابھری تھی حیاتِ دائمی بنکر

نویدِ زندگی بخشی تھی جب تو نے محبت کو
سمائی تھی مری نظروں میں جب تو روشنی بنکر

بناتے تھے تصور میں اُمیدوں کے محل ہم نے
تجھے دیکھا تھا بے خود ہو کے جب پہلے پہل ہم نے

ربط و محبت:-

ترے احساسِ نظارہ کو کچھ کچھ آشنا پا کر
وہ میرا رفتہ رفتہ مائلِ ذوقِ نظر ہونا

تجھے بھی ہو گئی باور ہیں رازِ عشق کچھ پا کر
مرا خود منفعل ہیں جرأتِ بیباک پر ہونا

حجاب آلود نظروں سے عتاب انگیز باتوں سے
ہر اک لحظہ ترا وہ مجھ سے کچھ نزدیک تر ہونا

اچانک میری عرضِ آرزو پر مضطرب ہو کر
وہ تیرے سینۂ شفاف کا زیر و زبر ہونا

پھر اک خاطر نشیں انداز سے میری جسارت پر
وہ تیرا مسکرانا اور میرا بے خبر ہونا

نشاط و عیش کے لمحوں کو کیفِ جاوداں دیکر
شبابِ شوق کی راتوں کا مستی میں بسر ہونا

زہے تقدیر تیری خلوتوں کا رازداں بننا
جوانی کا حسیں ہونا محبت کا جواں بننا

ہنگامِ گل گشت:-

نہیں بھولا ابھی تک وہ حسین و دلربا منظر
کہ جب ہم سیرِ گل کو دامنِ گلشن میں جاتے تھے

نسیمِ گل کی صورت نوجواں پھولوں کے جھرمٹ میں
تبسم کے شگوفوں سے نرالے گل کھلاتے تھے

کہیں معصوم کلیاں مسکراتی تھیں جوانی پر
کہیں سرسبز تھے شوق کا بربط بجاتے تھے

کہیں [illegible] چھپتی تھیں جوشِ مستی میں
کہیں تازہ شگوفے بانکپن اپنا دکھاتے تھے

حسینہ! [illegible] منظر میں ہم دونوں
شبابِ شوق و سرمستی کے رنگیں گیت گاتے تھے

[illegible] کو
گلابی کنج میں خاموش جا کر بیٹھ جاتے تھے

نسیمِ عہدِ گل سیرِ چمن کی دعوت دیتی تھی
بہارِ رنگ و بو آ کر مبارکباد دیتی تھی

برسات:-

وہ عہدِ بادہ و باراں وہ سرور و کیف کا منظر
گھٹاؤں کا گرجتے گونجتے گاتے ہوئے آنا

اندھیری کیف پرور جانفزا ساون کی راتوں میں
وہ تیرا رات کے پردے میں شرماتے ہوئے آنا

کبھی تھم تھم کے پانی کا برسنا ابرِ باراں سے
ہواؤں کے خنک جھونکوں کا اٹھلاتے ہوئے آنا

وہ تیرا صرف میری دلدہی کو خواب سے اُٹھکر
نشیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

محبت کی ادا سے مجھ کو دادِ آرزو دینے
جوانی کے اثر سے رقص فرماتے ہوئے آنا

عرق آلودہ رُخ پر گیسوئے خمدار لہرائے
یکایک خوفِ بدنامی سے گھبراتے ہوئے آنا

حسینہ! میں ابھی تک وہ ملاقاتیں نہیں بھولا
نہیں بھولا وہ ساون کی حسیں راتیں نہیں بھولا

لبِ آبِ جو:-

تجھے وہ دلنشیں لمحے ابھی تک یاد تو ہونگے
وہی لمحے جو ہم دونوں نے دریا پر گذارے تھے

حسیں لہروں میں عکسِ ماہ و انجم جھلملاتا تھا
فلک پر بھی ستارے [illegible] تھے

حبابوں کا تماشا موجِ دریا کی وہ آویزش
عجب رنگیں مناظر تھے عجب دلکش نظارے تھے

سنہری چاندنی شفاف دریا پرسکوں ساحل
کنارِ آب میں بہتے ہوئے چاندی کے دھارے تھے

جوانی کا تقاضا تھا کہ کھو جائیں جوانی میں
یہ ہم دونوں سے باہم موج و ساحل کے اشارے تھے

ترے رنگین عارض کو تمنا نے نکھارا تھا
ترے گیسوئے برہم بھی محبت نے سنوارے تھے

پریشاں ہوں مثالِ موجِ مضطر شدتِ غم سے
وہ دریا آج تک بہتا ہے میری چشمِ پرنم سے

عہدِ آخر:-

پھر اسکے بعد ربط و ضبط کے وہ مستقل وعدے
وہ عہدِ حسن پہ ہے میرے جنوں کو اعتبار اب تک

مرے دن آج بھی اُنکے تصور میں گذرتے ہیں
میری بے کیف راتوں کو ہے انکا انتظار اب تک

میری ویران نظروں میں ابھی تک انکے جلوے ہیں
خزاں کی وحشتوں میں مسکراتی ہے بہار اب تک

حسینہ! گو زمانہ ہو چکا ترکِ محبت کو
مرے سر میں مئے اُلفت کا باقی ہے خمار اب تک

مری خاکسترِ ہستی میں ہے اب تک شررِ پنہاں
میں ہوں سرتاپا عہدِ جنوں کی یادگار اب تک

حسینہ! آج بھی سر پر نثارِ اُلفت ہے ترا دیوانگی
غمِ ماضی سے اسکی زندگی ہے سوگوار اب تک

چھپا سکتا ہے دل کی طرح ہر رازِ محبت کو
بھلا سکتا نہیں میں عہدِ آغازِ محبت کو

وجدی الہ آبادی

فروگذاشت

خط لکھتے لکھتے ایکبار نگاہ جواوپر اٹھائی تو سامنے دروازے کی دہلیز پر وہ کھڑی نظر آئی۔ وہ کچھ گھبراسا گیا۔ کرسی پر سے اٹھ کر الگ ہٹ آیا

"اندر چلی آیئے میں باہر چلا جاؤنگا"

اور کرسی کا بازو تھام کر وہ خاموشی سے انتظار کرنے لگا کہ وہ دروازے سے ہٹے تو وہ باہر چلا جائے مگر وہ دروازے ہی پر کھڑی رہی۔

"بیٹھے رہیئے نا"

"ہاں! ہاں، بھیا آپ اپنا کام کرتے رہیئے"

پیچھے سے شوبھا نے کہا جو وہیں ذرا آڑ میں کھڑی تھی، اس پر نظر پڑتے ہی وہ سہم سا گیا اور جھکی ہوئی نظروں سے کمرے میں ایک چھلتی سی نگاہ ڈالی، کچھ ڈھارس بندھی۔ بیٹھے رہنے میں ہرج ہی کیا ہے وہ ادھر میٹھی باتیں کرتی رہینگی اور میں یہاں میز پر بیٹھا لکھتا رہونگا۔ ڈر تھا تو ذرا شوبھا کا اور اب تو وہ خود ہی اسکو وہاں بٹھانے پر مجبور کر رہی تھی اسکی تو خواہش ہی تھی کہ وہ وہاں موجود رہے۔ اب تک اسے ٹھیک سے دیکھا ہی کہاں تھا حالانکہ اس سے قبل بھی وہ دو بار آچکی تھی کچھ تو شوبھا کی موجودگی کے خیال سے اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ وہ اسکے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا اور یہ بری بات تھی کہ کوئی بھر کے لئے کسی کے سامنے جائے تو گھور گھور کر تکنے لگے اور وہ بھی ایک لڑکی کو۔ نہ جانے اپنے دل میں کیا خیال کرے جب بھی وہ آئی اس سے مڈبھیڑ ضرور ہوئی۔ یہی ایک ایسا کمرہ تھا جو گھر کے ماحول سے الگ تھلگ تھا۔ سلیقے سے سجا ہوا، بڑی نفاست برتی جاتی تھی، گھر کی ہر اچھی چیز وہاں موجود رہتی، سچ تو یہ ہے انھوں نے اسے ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا۔ جو کوئی بھی گھر میں آتا دہیں بٹھایا جاتا اندر تو بڑی بوڑھیوں کا راج تھا جنکو نہ اپنے بننے ٹھننے کا شوق تھا نہ گھر کی ٹیپ ٹاپ سے غرض۔

سب سے پہلی مرتبہ جب اس نے اسے دیکھا تو وہ اسی کمرے میں تھی، نہ معلوم کس ضرورت سے اسے کمرے میں جانا پڑا غالباً اس وقت باہر سے آیا تھا، دھوپ میں تھکا ہارا، پریشان حال، کمرے میں داخل ہوتے ہی بوکھلا سا گیا۔ اندر اور کوئی تھا نہیں وہ تنہا بیٹھی تھی، اس کو دیکھتے ہی کرسی پر کسمسا کر رہ گئی۔ ادھ اٹھ اور وہ الٹے پیروں پلٹ پڑا۔ دروازے ہی پر شوبھا مل گئی جھینپ مٹانے کے لئے کہنے لگا "تم بھی عجیب ہو مجھے بتایا بھی نہیں، وہ ہنسنے لگی "کیا ہوا کیا؟" مگر وہ وہاں نہ ٹھہرا، سیدھا گھر کے اندر گیا اور اس کوٹھری میں جو اندھیری بھی تھی اور خالی بھی۔ اسکا دل دھڑک رہا تھا اور ہاتھ پیروں میں کپکپاہٹ، جیسے وہ کوئی جرم کرکے بھاگا ہو۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس کے متعلق سوچنے لگا۔ یہ لڑکی کون تھی، کیسی ہے، اس نے اس طرح ہونق جانے پر کیا خیال کیا ہوگا۔ نہ جانے کیا سمجھا ہوگا وہ گیا بھی تو کس حالت میں، گھبرایا ہوا، پریشان حال۔ چہرے پر ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کیا کہتی ہوگی؟ اس کے دل پر ایک بوجھ سا معلوم ہوا — کوٹھری کی تاریکی اور بڑھ گئی۔ کالی کلوٹی دیواریں جیسے اس پر جھکنے لگیں، دم گھٹنے لگا تو باہر آگیا، لیکن کرید لگی رہی، آخر اسی روز اس نے شوبھا سے سب کچھ پوچھ لیا۔ شوبھا! یہ تھیں کون۔ تم بھی خوب ہو! بیچاری کو ایسا چھیڑ کر چلی آئیں۔ وہ مسکرانے لگی، تم نہیں جانتے بھیا یہی تو سدھا ہیں۔

"کون سدھا؟"

"اتنے بھولے نہ بنو جیسے جانتے ہی نہیں" وہ پتلیاں نچانے لگی" وہی جس کے ساتھ پنڈت جی تمہارے بیاہ کی بات چیت کر رہے تھے اور اسے یاد آگیا کہ کچھ روز پہلے ایسا ایک تذکرہ چھڑا تھا مگر نہ جانے کیوں بات خود بخود دھیمی پڑ گئی احساس بات کو جاننے کے لئے وہ عرصہ سے منتظر تھا، سوائے شوبھا کے اسے کسی سے یہ حال معلوم ہی نہ ہو سکتا تھا اس نے شوبھا کو ٹالا "اچھا تو یہ ہیں شوبھا دیوی مگر یہ کچھ اور وہ سوچنے لگا کہ آگے کیا کہے شوبھا نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ اچھی نہیں" بھیا مجھے بھی کچھ پسند نہیں۔

اسے بھی یقین ہوگیا کہ وہ اچھی نہ ہوگی، کچھ یونہی سی ہوگی مگر پھر بھی اسکا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھے، بات کرے اور اسکا یہ اشتیاق اور بھی بڑھ گیا جب وہ تیسری دفعہ آئی تو شوبھا نے باتوں باتوں میں بتایا بھیا "سدھا اچھی خاصی تو ہے پتلا پتلا نقشہ، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، بس ایک رنگ ذرا دبتا ہوا ہے" اور اس روز کوشش کرکے وہ اسکے سامنے کئی بار ٹہلتا ہوا گزرا مگر دیکھنے کی ہمت نہ پڑی اور اسے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ [illegible]

کر رہی تھی، گو یہ بات اُسے بعد میں معلوم ہوئی لیکن نہ جانے کیسے اسکے دل میں یہ خیال گھر کر گیا تھا۔ اُس روز کی باتیں کرید کرید کر پوچھنے پر اُسے سدھا کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوا۔ شوبھا اُس سے کچھ بدظن نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگی بھیّا! یہ سدھا تو کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتیں۔" وہ گھبرا گیا، اسکے دل کی بات تو شوبھا نے نہیں پکڑ لی "کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ لو فر سی معلوم ہوتی ہیں"

"لوفر سی؟"

"ہاں! بس ایسی ہی ہیں، کچھ ٹھیک نہیں"

وہ اور چوکنا ہوا کہیں اسکے ارادے پھیروں سے تو وہ کچھ سنک نہیں گئی اُس نے بات پر زور دیا "کیوں بات کیا ہوئی"، مگر وہ ٹال گئی "کچھ نہیں"، لیکن وہ اڑا رہا۔ اُس نے دیکھا یہ یوں نہ بتائے گی خود ہی بات چھیڑ دو تو اُگل دیگی اور اسطرح اسکی ان تمام ساتھی لڑکیوں کے متعلق معلوم کر لیا کرتا تھا جو کبھی کبھی گھر پر آیا کرتیں یا خط و کتابت کیا کرتیں، اُس نے ایسا ہی کیا کہنے لگا:-

"اک بات تو ہے شوبھا، اور اُس نے اپنے دل میں سمائے ہوئے اس خیال کی طرف اشارہ کیا" میں بھی آج غور کر رہا تھا کتنے زور زور سے ہنستی ہے یہ بھی خیال نہیں کرتی کہ کوئی بیٹھا ہے۔ اور شوبھا اُسکی بات میں آگئی، لگی کہنے "یہی نہیں بھیّا! ماں جی کے سامنے پوچھنے لگی، شوبھا کے بھیّا کی شادی کب کیجئے گا، ہم کو بھی بلائیگا جیسے کچھ جانتی ہی نہیں بڑی بھولی ہے نا، بس تو اُسکا منہ دیکھتی رہ گئی، ماں جی بھی چپ رہ گئیں، ایک بات ہو تو کہوں۔ مجھ سے پوچھا "یہی بھائی ہیں، ابھی پڑھ رہے ہیں، بیچارے بہت سیدھے معلوم ہوتے ہیں اور پھر وہاں سے اُچک کر گھر دیکھنے کے بہانے آپ کی طرف آگئیں، جیسے میں اُسکی یہ چالاکی جانتی ہی نہیں، بڑی وہ ہے" اور خوشی سے اُسکے دل میں گدگدی ہونے لگی۔

"اچھا کیا جو بتا دیا، انکار کر دیا"

"میں نے ہی تو اُن سے کہا تھا، دیکھنا کیسی سُندر بھابی لاتی ہوں"

اُسکی خوشی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ نظروں میں کتنے ہی خوبصورت چہرے پھر گئے، وہ خوب جانتا تھا کہ شوبھا جو کچھ کہہ رہی ہے ایسا ہی ہوگا۔ اُسکے ساتھ بڑی خوبصورت ... پڑھتی ہیں ... وہ خود بھی حسین تھی، اُسکا انتخاب بھی حسین ہوگا، اسی لئے اُس نے اپنی پسند بہن پر چھوڑ دی تھی۔ جس کے لئے اسکو پورا پورا یقین تھا کہ وہ اُس کے تصور سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی سے اسکی شادی کرا دیگی۔ سدھا سے تو وہ ... دھوکا نہ ہو نہ چاہتا تھا اور نہ بظاہر اسکی کوئی امید تھی مگر اسکو جی بھر کے دیکھنے

بات کرنے اور گھل مل جانے کی تمنا ضرور تھی، یہ تو وہ شروع ہی سے طے کئے ہوئے تھا۔ شوبھا سے جو اُس نے اتنی باتیں سُنیں تو سمند شوق پر ایک اور تازیانہ ہوا۔ اُس نے اُسی وقت سوچ لیا کہ وہ اب کمرے سے باہر نہ جائیگا وہ باتیں کریں اور وہ خط لکھے اور اسی دوران میں نظریں بچا بچا کر اُس کی طرف دیکھ ہی لے۔ وہ بھی اسکی طرف ضرور دیکھے گی یہ اسکو یقین ہی تھا، یہ بہکی بہکی نظریں اور اُنکا تصادم، اُسکے جسم میں ایک جھرجھری سی ہوئی۔ اُس نے ایک بار نظریں اُٹھا کر سدھا کی طرف دیکھ ہی تو لیا، وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی، فوراً نظریں جھکا لیں لیکن وہ ذرا رُک کر دیکھتا ہی رہا، اُس وقت شوبھا بولی:-

"یہاں کیوں کھڑی ہو، اندر کیوں نہیں چلتیں"

شوبھا کی موجودگی اسوقت اسکو بہت شاق گذری، اگر اسوقت یہ نہ ہوتی تو؟ اسکے سینے کے پاس ایک بگولہ سا لرز کر رہ گیا اور ہونٹوں کے گوشے پھڑکنے لگے، اُسکا جی چاہا کہ شوبھا کو دھکا دیکر گھر میں ڈھکیل دے اور جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہونے لگیں تو اُسے باہر جانا ہی پڑا وہ جانتا تھا کہ شوبھا نے یہاں بیٹھنے کو جو کہا ہے وہ صرف دکھاوا ہی دکھاوا ہے، ورنہ حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے اگر اسوقت وہ نہ جائے گا تو وہ کیا خیال کرے گی جب کہ وہ اسکی موجودگی میں گھر سے باہر کسی کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی، کبھی باتوں باتوں میں اُسکے کسی دوست کے متعلق پوچھ لیا، وہ بھی اس بُری طرح "بھیّا! یہ موٹا کچھوا سا روز کون پھٹی پھٹی آواز سے تم کو پکارا کرتا ہے"! تو وہ اس پر بھی جھلا اٹھتا "ہوگا کوئی" وہ پھر کہتی "بھی تو سر کش ہے نا" وہ بہت روکھے پن سے چیخ پڑتا "ہاں! پر تم کہو" اور جو کہیں وہ دو ایک بار اُسکا تذکرہ کر دیتی تو اُسکے آگ ہی لگ جاتی، غصے سے گرج کر بولتا "تم روز کیوں پوچھا کرتی ہو، ہوگا کوئی!" تو وہ سہم کے رہ جاتی "لو! میں نے کیا کہا" انھیں سختیوں کی وجہ سے وہ اسکا بھی لحاظ کیا کرتا تھا۔

جیسے ہی وہ دروازے پر سے ہٹیں وہ کمرے کے باہر چلا گیا اور چھجے کے نیچے سائے میں ایک چارپائی کھینچ کر ڈال لی اور اُسی پر سر کے نیچے ہاتھ رکھکر لیٹ گیا اس طرح وہ سدھا کو کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ دروازہ بالکل اُسکے سامنے تھا،

سدھا اُس روز زیادہ دیر نہ ٹھہری، جلدی ہی کمرے سے باہر آگئی۔ لیکن دروازے پر رُک کر وہ شوبھا سے پھر باتیں کرنے لگی مگر اُس نے غور کیا کہ شوبھا اُسکی باتوں سے کچھ ناخوش سی نظر آ رہی ہے اور ایسی ہی لئے اُس نے اُس طرف

نہ دیکھا۔ وہ چلنے لگی تو بولی،

"سیتلا کہاں ہے؟ میں اکیلی نہ جاؤں گی، گلی میں اسوقت بڑا سناٹا رہتا ہے"۔

اسوقت گھر میں سوائے اُسکے کوئی تھا نہیں، شوبھا بولی "وہ تو ہے نہیں اور بھیا کے ساتھ تو تم جاؤ گی نہیں"۔

"بس یہ گلی ہی تو گزارنی ہے، پھر تو سڑک اور میرا گھر آگیا"۔

"تم تو بڑی بہادر ہو جہاں کسی نے ترچھی نظر کی اور تم نے سینڈل سیدھی کی کیوں ہے نہ ٹھیک تم تو یوں چلی ہی جاتی ہو"۔

وہ جھنجھلانے لگی "نہیں نہیں"

وہ لیٹے لیٹے اٹھکر بیٹھ گیا۔ دل نہ مانا تو بول اُٹھا "آپ چاہیں تو گلی کے نکڑ تک چھوڑ آؤں"۔

شوبھا اسکا منہ تکنے لگی، سدھانے دبی زبان سے کہا "اچھی بات ہے"۔

وہ اُٹھکر دروازے پر آگیا، وہ پیچھے پیچھے ہو لی۔ شوبھا کی موجودگی کا اسکو ضرور احساس تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اسکو باتیں بنا کر بہلا لینا کونسی بڑی بات ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اُسے بیوقوف بنا ہی لیا کرتا تھا، وہ اُسکی بات بھی مان لیا کرتی تھی صرف اسکو دکھانے کی غرض سے یا وہ ابھی تھی ہی اتنی معصوم

دونوں آگے پیچھے چلتے رہے اور چلتے چلتے اُس نے محسوس کیا کہ سُدھا رک گئی ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ ایک مکان کے چبوترے پر پیر لٹکائے سینڈل کا بند ٹھیک کر رہی ہے وہ اُس کے پاس لوٹ آیا۔ اور جب وہ چلنے کے لئے کھڑی ہوئی تو اُس نے کتابوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیے جو پاس ہی رکھی تھیں۔

"یہ مجھے دیدیجئے آپ تھک گئی ہونگی"۔

"رہنے دیجئے، میں لئے رہونگی"

وہ شرمندہ ہوکر رہ گیا۔ "آپ کی مرضی، میں نے تو یونہی آپ کے آرام کے لئے کہا تھا"۔

"میری تو یہ روز کی مصیبت ہے، آپ کو کیوں تکلیف دوں"۔

وہ مسکرادی تو وہ ذرا بیباک ہوگیا۔ آج ہی تو کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ کالج کا ایک نمبر چھٹا ہوا لڑکا جو ابتک گھر کے لحاظ سے خاموش تھا بھلا کہاں چوکنے والا تھا، جھٹ سے بولا،

"تکلیف! آپ تو مجھے روز ایسی تکلیف دیا کریں میری تو یہی خوشی ہے"۔

وہ چپ ہوگئی مگر وہ اس خاموشی سے مطلق متاثر نہ ہوا اسے یقین تھا کہ اس نے [illegible] پیش نظر اس نے جھک کر رومال اُٹھا لیا اور جب اُسے نہ دیا تو وہ اُسکی طرف دیکھنے لگی وہ مسکرانے لگا۔

"یہ رومال تو میں نہ دونگا"

"کیوں؟ یہ تو بہت میلا ہے"۔

"آپ نے پسینہ ہی تو پونچھا ہے نا؟

"جی"

"تب میں کبھی نہ دونگا"

وہ مسکراتا رہا وہ پھر خاموش ہوگئی اور سر جھکا کر بجائے ساتھ ساتھ چلنے کے پیچھے ہٹ کر ایک طرف چلنے لگی۔ اُس نے اسکی یہ حرکت دیکھی تو وہ کھسیانا سا ہوگیا۔ شاید اُسے یہ بات ناگوار گذری، ساری خوشی کافور ہوگئی اور تمام خواب بکھر کر تار تار ہوگئے

"آپ نے میری بات کا بُرا مانا"

"نہیں تو" اُس نے اسکی طرف دیکھا اور سر جھکا دیا "لیکن یہ سب کچھ ٹھیک نہیں"۔

اُس نے چپ چاپ جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالا اور سامنے کر دیا۔ "معاف کیجئے گا"

"رہنے دیجئے"۔

"اب کیا کرونگا، آپ بُرا مان گئیں"۔

"میں نے تو بُرا نہیں مانا، ہاں آپ ضرور بُرا مان گئے۔ وہ مسکرائی "ٹھیک بات ہے نا"

اور اُسوقت اُس نے اُس کے چہرے کی طرف ٹھیک سے دیکھا تو وہ اسکو بہت بھلی معلوم ہوئی۔ بہت حسین، وہ پھر بے تکلف ہوگیا۔

"تو آپ کل گھر آرہی ہیں؟"

"کیوں؟"

"مجھے پہونچانے کے لئے جو آنا ہے"۔

"تو میں نہ آؤنگی"

"بالکل جھوٹ"

"دیکھ لیجئے گا"۔

اور اس "دیکھ لیجئے گا" کا مطلب وہ جانتا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں وہ ضرور گھر آئیگی اور نہیں تو راستے میں وہ کسی دیوار کے پاس اُسکے انتظار میں کھڑا ہوگا لیکن شوبھا؟ اور شوبھا کے خیال سے وہ ایک سوچ میں پڑ گیا۔

شوکت صدیقی

صریرِ تیر

تنکا بھی کوئی اجڑے نشیمن میں نہیں تھا
اس طرح تھا گلشن میں کہ گلشن میں نہیں تھا

ناحق مرے صیاد نے باندھے مرے بازو
میں کنجِ قفس میں تھا نشیمن میں نہیں تھا

آئی ہے جوانی تو ہیں بدستِ جوانی
لڑکے تھے تو کچھ ہوش لڑکپن میں نہیں تھا

ہم سینکتے تھے برقِ تجلی سے نگاہیں
موسیٰؑ کوئی جس وادیِ ایمن میں نہیں تھا

کر سکتا تھا کیا حشر میں مَیں خون کا دعویٰ
دھبہ بھی تو قاتل ترے دامن میں نہیں تھا

معصوم لڑکپن کی تھی معصوم ادا بھی
سحر آنکھوں میں جادو تری چتون میں نہیں تھا

پھیلی ہوئی تھی روشنیٔ داغِ تمنا
صد شکر اندھیرا مرے مدفن میں نہیں تھا

اللہ رے ناداریِ بازارِ قیامت
اشکوں کے سوا کچھ مرے دامن میں نہیں تھا

قطعہ

انسانیتِ عام کا اک دور تھا وہ بھی
دشمن سے بھی کینہ دلِ دشمن میں نہیں تھا

تھے رشتۂ زنار میں تسبیح کے دانے
جھگڑا ہی کوئی شیخ و برہمن میں نہیں تھا

محدود نہ تھی طائرِ آزاد کی پرواز
صیاد کا کھٹکا مرے گلشن میں نہیں تھا

جس کو نگہِ گرم سے دیکھے کبھی بجلی
ایسا کوئی تنکا بھی نشیمن میں نہیں تھا

پھولوں کو نہ تھا کچھ خلشِ خار کا شکوہ
بلبل تپشِ نالہ و شیون میں نہیں تھا

آزاد تھا ہر سروِ چمن دامِ بلا سے
یہ طوق تو قمری کی بھی گردن میں نہیں تھا

بارش میں اجڑتے تھے نہ طائر کے نشیمن
یہ ظلم برستے ہوئے ساون میں نہیں تھا

رنگین فضا تھی نہ غریبوں کے لہو سے
اک حشر بپا ملک کے دامن میں نہیں تھا

پہونچا دیا فاقے نے زمانے کو لبِ گور
جو گھر میں عذاب آج ہے مدفن میں نہیں تھا

گھر بیٹھے اڑا لے جو سکونِ دلِ عالم
جادو یہ کسی غمزۂ پُرفن میں نہیں تھا

تھا دردِ بشر دل میں بنی نوعِ بشر کے
ٹکراؤ کوئی شیشہ و آہن میں نہیں تھا

لٹ جاتا نہ کیوں قافلۂ منزلِ ویراں
رہزن کا کچھ انداز تو رہزن میں نہیں تھا

ہے قحط کے پردے میں ترا آج قیامت
عالم ہے جس انجمن میں اس انجمن میں نہیں تھا

ہاتھ آیا نہ کچھ مزرعِ امید کا حاصل
دانہ مری تقدیر کا خرمن میں نہیں تھا

سریر کابری گیاوی مینائی

دھلی اور نواح آگرہ میں اُردو

بعض علما جنوں نے شاہ ولی اللہ دکنی کو زبان اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر لکھا ہے. مثلاً آب حیات وغیرہ میں۔

اور مصنف کتاب "**دکن میں اُردو**" نے وجدی کی مثنوی تحفہ عاشقاں کو سنہ ۱۰۱۵ھ کی تصنیف کرتے ہوئے اُردو کا صاحب کتاب پہلا شاعر وجدی کو قرار دیا ہے لیکن ہمارہ مظہر ہیں وجدی مسمی وجیہ الدین قوم شیخ کرنولی کی تحفہ عاشقاں کو جو مثنوی گل و ہرمز شیخ فریدالدین عطار جس کو گل و خسرو یا خسرو نامہ بھی کہتے ہیں سنہ ۱۱۵۲ھ کی تصنیف اور پنچھی نامہ یا پنچھی باچھا جو منطق الطیر فریدی کا ترجمہ ہے سنہ ۱۱۴۶ھ اور باغ جانفزا کو سنہ ۱۱۴۴ھ کی تصنیفات وجدی تحریر کیا ہے. تحفہ عاشقاں کا ایک شعر یہ ہے ؎

کروں پاک دل ہو زبان پاک سوں
ثنا پاک اُس عاشق پاک سوں

اور "**جواہر سخن**" مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں اُردو کا پہلا شاعر وجہی دکنی کو لکھا ہے، جنھوں نے کتاب سبرس نثر بزبان دکنی سنہ ۱۰۴۵ھ میں لکھی اور "**تاریخ ادب اُردو**" میں پہلا شاعر اُردو کا محمد علی قطب شاہ متوفی سنہ ۱۰۲۲ھ کو لکھا ہے جسکا شعر ہے ؎

کرتے ہیں دعویٰ شعر کا سب اپنی طبع سوں
بخشا فہم شعر معانی کے تئیں خدا

اور حسب تحقیق ولی اللّٰہی **حضرت شیخ رزق اللّٰہ دہلوی** متوفی سنہ ۹۸۹ھ مدفونہ عقب عیدگاہ شمسی جنکا فارسی میں تخلص مشتاقی اور ہندی میں راجن تھا انھوں نے بہت سے اشعار ہندی میں تحریر فرمائے ہیں اور رسالہ پیماں و جوت نرنجن وغیرہ بھی لکھے ہیں جو بقول حدیقۃ الابرار قلمی وغیرہ بہت مشہور و مقبول ہیں (واضح رہے کہ مثنوی واقعات امامیہ میں اُردو کو ہندی سے نامزد کیا ہے جس طرح دکن والوں نے دکنی کو اُردو لکھا ہے)

اور **حضرت شاہ مولانا محمد اشرف** المتخلص بہ منعم عمرانی القرشی بجاروی برادر زادہ حضرت شاہ غلام رسول بجاروی مصنف واقعات امامیہ اُردو نے دیوان اردو تحریر فرمایا جو سنہ ۱۰۹۱ھ کا لکھا ہوا لائبریری خلیلی بزبانخ کتبخانہ مجیدی واقع خانقاہ شعیبی بجارہ راج الور راجپوتانہ میں موجود ہے (بجارہ پہلے توابع آگرہ دہلی وبھرتپور بھی رہ چکا ہے) دیوان منعم میں حسب ذیل الفاظ بھی قدامت کا ثبوت دیتے ہیں:-

مل گئے. یانام. مان. داک. انند. نداب. بسرام. بسر. اٹکلا. لک. سین جاگیں. سیتی. زور. کوں. سوں. جوں. بتاں. لباں. کھوتا. گلے ہار باج. بوجھ. تیں. نیں. نین. تئیں. لس پی. سجدار. تدا. جد. بھیر (پھیر) جھک تک. جیت. اگیر. جھلکا. راے. دی. دکھو. صحبت برار جگ. آباداں. دوہیں آنکھاں. بربت. باوتی. بھینگی. سرخوشی. چڑھیں. کبھو. بووتے. ہوتے (ہت) جامارہ. دیکو (دیکھے) تجھ اوپر جاکہا. پٹرو. جیو. من لگن. اگن. تیکھی نین جیٹ. بھنک. بڑھ. خوش نین. لکھن. گہل مل. اتے اینا. کیدہی. اوڈگے وسکا. جس. تدہی. اور. جلیں. جلیں. سجن. ساجن. جھکیو رہے. چھپے.

اور دیوان منعم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:-

دیکھکر اس قد موزون کوں بس شرم کیا ہے ۔۔۔ گڑ گیا خاک میں سرو آج گلستان کے بیچ
منعم ہے پیچ و تاب میں سنبل کا دل بی دیکھ ۔۔۔ سُنکر صبا سیں طرہ دستار کی خبر
شمع اس یار کے رخسار کوں دیکھ ۔۔۔ ہوتی فانوس میں جلکر ہے روپوش
مالک اک تو جیت مت کھو عمر ضائع ۔۔۔ نہیں بہتر ہے منعم خواب خرگوش
رونق نہیں ہے صفحہ کی جدول بغیر دیکھ ۔۔۔ ایسے ہی حُسن کے سیں درہے بہار خط
کون سا معشوق ہی جگ میں جو عاشق کب تجھ ۔۔۔ اسقدر عاشق نواز کوں نری چھاتی ہی شمع
ابر ہے سبزہ ہے اور خنداں ہے گل گلشن کے بیچ ۔۔۔ حیف ہے اسوقت میں ساقی نہیں دیتا ایاغ
رات دن ہے شوق سیں گلگے چمن میں پانچ بند ۔۔۔ سب غلط ہے جو کوئی کہتا ہی سرو آزاد ہے
منعم ہو عاشقاں میں اسوقت کا سلیماں ۔۔۔ دیتو گر اپنی اسکوں انگشتری نشانی

اور حضرت شاہ غلام رسول قریشی بجاروی برادر حضرت شاہ حافظ منور معمر بایزید ثانی نے سنہ ۹۳۶ھ میں مثنوی "واقعات امامیہ" بزبان اُردو لکھی جسکی اسوقت

ہندی کہتے تھے ۔ اسی مثنوی میں ہے

ہمایوں شہ آں شاہ جمشید جاہ ۔ جو ہے حکمراں اب بلا اشتباہ
غلام رسول است ایں خاکسار ۔ شہا شہریارا اگر ادشش برار
تجارہ شہر وطن مالوف اوست ۔ دریں ملک میوات معروف اوست

یہ مثنوی بھی لائبریری فضیل براہنچ کتبخانہ مجیدی واقع خانقاہ نجیبی مملوکہ و مقبوضہ حضرت سجادہ نشین صاحب خانقاہ نجیبیہ تجارہ آفتاب میوات میں موجود ہے ۔ جسکو ملاحظہ فرماکر عالیجناب میجر سی ۔ ڈبلو ۔ ایل ہاروے صاحب بہادر او ۔ بی ۔ ای ایم ۔ سابق پرایم منسٹر راجکوٹ وٹونک وغیرہ و چیف منسٹر راج الور نے اس کو عجائبات میں شمار کرتے ہوئے میوزیم فنڈ سے بمنظوری کونسل برائے حفاظت کتب وغیرہ ایک سو بیس روپیہ مرحمت فرماکر علمی قدر دانی کا ثبوت دیا ہے۔

اس مثنوی میں حسب ذیل الفاظ بھی ہیں :-

جلن ۔ آپ روپ ۔ ہاہا ۔ سر پر بھاگ ۔ بالی (یعنی لڑکی) بالا ۔ آگا ۔ دُلہنی ۔ راکھے ساریاں ۔ چوک ۔ دونوں بل ۔ ہموں ۔ تہوں ۔ پریں ۔ دہن دہرو ۔ ننگا ۔ بچن سوہا ۔ لاگو ۔ بنگوڑا ۔ کارنے ۔ کہا ۔ آنچھواں ۔ سِن ۔ کہو ۔ دی ۔ موتے ۔ سُنن ۔ کنے کوں ۔ سوں ۔ جوں ۔ گڈا ۔ بدا ۔ سیتی ۔ پھٹ ۔ اوکھت ۔ نپٹ ۔ کپٹ ۔ چپٹ ۔ کہاں آوتی ۔ جاوتی ۔ روتی ۔ دہوتی ۔ بوتی ۔ بہرے (بڑے) بہوت (بہت) بہجلنا (بہونا) بہجانا ۔ جل (پانی) اوذر ۔ ندان ۔ بل گئے جہول اور ۔ تردار سوگند ۔ بانگ (نگام) کنے ۔ کنے ۔ سور سانونت ۔ وسواس ۔ پہر لیہ (پہن لیا)

انیچ کر ۔ انوں لک ۔ جوب (جوم) انکہیاں ۔ تجھ بنا ماتھ چین ۔ نکھ ۔ دیدیل آپنا ۔ سنگاتی ۔ گلے لاگ ۔ چاچا بچن ۔ تپا سا ۔ نراسا ۔ کہلا ۔ کھونمرندی ۔ دادینے پیچھوں کٹک ٹمک ۔ کچھے آونا ۔ لاوتا ۔ ہوں ۔ جگ ۔ بوتا ۔ لڑن ۔ ان سوں سورماں ۔ مکیاں (مکہ والے) کہل بل ۔ بلادن ۔ جھڑی ۔ تینے ۔ جدی ۔ کرتیاں ملن ۔ بلن ۔ رانے ۔ اپنا ۔ ایتے ۔ بیاہل ۔ بجاون ۔ روس ۔ بچل جھیلں ۔ کللا ۔

اور مثنوی واقعات امامیہ کے چند اشعار بطور نمونہ یہ ہیں :-

الٰہی ترا فضل جو یار ہو ۔ فلک اور ملک سب مددگار ہو
میرے دل میں ہے آرزوئے تمام ۔ حقیقت لکھوں واقعات امام
بہندی زباں بعض در فرس ہم ۔ نگارش نمودیم ترتیب نظم
کتھا درد دکھ کی جگر سوز ہے ۔ دل افسردہ گاں شعلہ افروز ہے
رضائے خدا اگر نبودی چنیں ۔ ستمگر نہ لیتے میاں ہیر کیں
زمیں پٹ پھٹ کھاتی جاتی بدم ۔ فلک ٹوٹ پڑتا نہ یا ایں ستم
غلام رسول آدسر کر سخن
کھڑی خلق تیرے سخن کو سنن

رشید احمد قریشی تجاروی

(بقیہ خاصان ادب صفحہ ۳۰)

(۵۹) جناب منشی ایم ۔ آر شاہ صاحب ایچ ۔ پی ۔ ٹی (آنرز ان پنجابی و پشتو) انبالہ سے ۶ سالانہ
(۶۰) جناب خادم حسین صاحب خادم زیبائی جبلپور سے ۶ سالانہ
(۶۱) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور سے ۶ سالانہ
(۶۲) جناب شیخ محمد احمد صاحب نازش بڑہانگڈھی ولد حاجی شیخ محمد صنو صاحب مرحوم رئیس ٹانگڈھ سے ۶ سالانہ
(۶۳) محترمہ سلمیٰ خاتون صاحبہ کنیز مدنا پور بنگال سے ۶ سالانہ
(۶۴) جناب خان شہری محبت خاں جی آف کوٹھری بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے ۶ سالانہ
(۶۵) جناب ابراہیم خاں صاحب شرف جوناگڈھی سے ۶ سالانہ
(۶۶) جناب عبدالستار خاں صاحب قائم گنجوی (دہلی) سے ۶ سالانہ
(۶۷) جناب حبیب خانصاحب حبیب شاہجہانپوری کوٹہ سے ۶ سالانہ
(۶۸) مسٹر آتم سنگھ بی ۔ اے پروپرائٹر بھولارام اینڈ سنس دہلی سے ۶ سالانہ
(۶۹) محترمہ حجاب بنارسی (ناگپور) سے ۶ سالانہ
(۷۰) محترمہ مس اسماء علوی صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۱) محترمہ تیمور صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۲) محترمہ مس فضہ جی ونشا صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۳) جناب یحییٰ بھائی محمد علی صاحب راولپنڈی سے ۶ سالانہ
(۷۴) جناب عارف ابراہیم یوسف برکار قادری بانکوٹ سے ۶ سالانہ
(۷۵) جناب خانصاحب انور خاں جی آف ناکرہ دربار گڑھ بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے ۶ سالانہ
(۷۶) جناب سید ظہیر حسین صاحب ظہیر ہندی سے ۶ سالانہ
(۷۷) جناب رفیق احمد صاحب رفیق شاہ آبادی ملکنوی ۔ صدر نخشی لعن ہوڈہ سے ۶ سالانہ
(۷۸) جناب اکبر علی غلام حسین صاحب سخنے والے کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۹) محترمہ بتول نور الدین پٹیال ۔ کراچی سے ۶ سالانہ
(۸۰) مسٹر ممتاز کھوکھراتی جرنلسٹ ۔ ننکر مخدوم (پنجاب) سے ۶ سالانہ
(۸۱) محترمہ لیڈی سر رحیم بخش ۔ ساہا (ضلع انبالہ) سے ۶ سالانہ

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

سنتے ہیں اطالیہ نے ہمّت ہاری
ڈالے ہتھیار، ملک کی پت ہاری
اقبال گیا پہلے مسولینی کا
برٹش سے اب اٹلی کی حکومت ہاری

محور کا مآلِ سعیٔ ناکام بھی دیکھ
اے جرمنی، اٹلی کا یہ انجام بھی دیکھ
تمہید ہے یہ زوالِ مستقبل کی
آثارِ سحر دیکھ چکا۔ شام بھی دیکھ

محور ٹوٹا، شکستہ پائے کی طرح
اپنے نظر آتے ہیں پرائے کی طرح
اب دھوپ سمٹ رہی ہے مرکز کی طرف
برطانیہ بڑھ رہا ہے سائے کی طرح

طولیشہ و رُوم کے کھوٹ بدلے
لشکر نے چلن، فوج نے گھونگھٹ بدلے
رُخِ جنگ کا بدلا ہوا آتا ہے نظر
ممکن ہے فرانس کوئی کروٹ بدلے

فاقوں سے تمام دیس بے حال ہے آج
ہے کال کا ذکر کیا۔ جہا کال ہے آج
پہلے مشہور "بھوکے بنگالی" تھے
بھوکا سارا دیارِ بنگال ہے آج

اجناس سے یہ نفع کمانے والے
بھوکوں کی مصیبتیں بڑھانے والے
کچھ خود غرض اور کچھ شکم سیری ہیں
بنگال کو کنگال بنانے والے

غارت کئے تسکین کے پہلو کس نے؟
ہر چیز پہ کر لیا ہے قابو کس نے؟
کایا پلٹتی ہوئی نظر آتی ہے
یہ کر دیا بنگال پہ جادو کس نے؟

یہ وقت ہے آزمائشِ ہمّت کا
موقع ہے یہی مروّت و شفقت کا
اے خود غرضو! بھوک کی پیشانی پر
لیبل نہ لگاؤ مذہب و ملّت کا

بھوکا نہیں، اک پیش کشِ فطرت ہے
کس میں اس کے قبول کی ہمّت ہے
تھوڑا سا کر کے خرچ بہت سا لے لے
بھوکے کی دعا تو اک بڑی دولت ہے

وہ چین کا پاس ناک عالم نہ رہا
جاپان کا پہلا سا وہ دم خم نہ رہا
کے روز یہاں جم کے رہیگا کوئی
دنیا میں جب اقبالِ کے و جم نہ رہا

سیماب

۱۰ ستمبر ۱۹۴۳ء

(مستقل):-

مکتوبات

اعجاز صاحب سلمہٗ - دُعاؤں کے بعد دعا نگار ہوں تمہارا خط مجھے ملا اس خبر پرسی کا شکریہ کہاں تک ادا کیا جائے میں پہلے سے اچھا ضرور ہوں لیکن ابھی ضعف و نقاہت کے سبب سے چل پھر نہیں سکتا۔ اس درمیان میں مختلف و متعدد مقاموں سے کئی سو حضرات میری عیادت کے لئے آئے اور گئے۔ بیماری میں مہمانوں کی خاطر مدارات آسان نہ تھی نورِ چشم مجید احمد سلمہٗ نے تاہم بہت سنبھالا اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا۔ یہ پہلا خط ہے جو میں لکھوا کر تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تم کو خوش رکھے کہ تم نے خط بھیج کر میرا حال پوچھا۔ بھائی سیماب سے سلام کہنا فقط ۳۱ جولائی ۱۹۴۳ء

دُعاگو نوح از ناروہ ضلع الہ آباد

مورخہ ۵ جون ۱۹۴۳ء
مولوی گنج۔ لکھنؤ

عزیز محترم

سلام مسنون و دُعا۔ کارڈ ملا۔ طرحی غزل اور تازہ غزل غیر طرحی کلام کی آپ نے فرمائش کی ہے۔ غالباً آپ کو یہ معلوم نہیں کہ مدت سے میں نے مشاعروں کی شرکت طرحی غزلوں، فرمائشی نظموں کا کہنا یک قلم ترک کر دیا ہے۔ سِن بیاسی کے پیٹے میں ہے لہذا پیرانہ سالی، خرابیٔ صحت، اضمحلالِ قوٰی، ہجومِ آلام و افکار سے اب دل میں وہ جوشِ باقی نہیں۔ بالخصوص زمانۂ حاضرہ کے تاثرات بجائے غزل شہر آشوب بلکہ دہر آشوب کے لئے محرک ہیں مگر خموشی قرینِ مصلحت ہے

زگفتن لب چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

مرسلہ مصرع میں ایک عروضی سقم ہے ممکن ہے کہ اسی بنا پر بزمرہ دیگر اساتذۂ فن و مشاہیر شعرا میرا بھی خیال آگیا ہو۔ اسی بحر مزاحف (ہزج مثمن۔ اشتر) میں ہمطرح غالب مرحوم میری ایک غزل موجود ہے۔ جنس معانی پر طبع ناساز کا کنٹرول اگر ہوتا تو اس طرح میں بھی چند شعر لکھکر بھیجدیتا۔ غیر طرحی تازہ کلام آئندہ جو کچھ ہوگا بھیجدونگا۔ بالفعل غیر مطبوعہ کلام سے ایک غزل لکھوا کر آپ کے موقر رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔ محض اس غرض سے کہ آپ کی فرمائش کسی حد تک پوری ہوجائے۔ زیادہ نیاز۔

نیاز کیش خیر اندیش
صفی عفی عنہ

اورنگ آباد
۳۰ جولائی ۱۹۴۳ء

برادر محترم! السلام علیکم

"شاعر" میں گنوری کے متعلق مضمون دیکھکر سخت افسوس اور ملال ہوا میرے خیال میں آپ ان کم ظرفوں کو جواب دیکر اُن کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ اس ذریعہ سے مخالفین نام و نمود چاہتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ بعض معترضین کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے رفتہ رفتہ وہ خود خاموش ہوجائینگے۔ خس و خاشاک کی صورت بہہ جائیں گے۔ قبلہ محترم کی ذات گرامی سے جن وجوہ کی بنا پر وابستہ ہوا ہوں۔ اُسے اہلِ نظر بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کوئی راز نہیں جسکا انکشاف کیا جائے۔ اُمید ہے کہ آپ بخیر ہونگے۔ والسّلام

زکی اورنگ آبادی

نگارستکدہ بھوپال
۳ اگست ۱۹۴۳ء

اعجاز پیارے!

عطوفت نامہ نظر نواز ہوا، تمہاری بیمار آنکھوں کا حال معلوم کر کے "نرگسِ بیمار" کو بھی بھول گیا۔ "مصروفیت کو بھی تو کبھی فرصت" دیدیا کرو۔ کام کی شدت کے باعث آنکھوں پر ایک دم بوجھ سا آپڑا ہے۔ اور پھر ہماری تمہاری آنکھیں ویسے ہی نزاکت مآب ہیں۔ تمہیں تو کام کے آگے اپنی صحت کی ذرا پروا نہیں رہتی۔ شب و روز کے یہ گھسان کام زندگی سے اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ چھٹا ہی نہیں چھوٹتے۔ ذرا بھائی آرام بھی کر لیا کرو۔ خدا کرے کہ اب آنکھوں کی تکلیف دور ہوگئی ہو۔

جمشید پور میں نے خط اس پتہ پر ڈالا تھا :—

اعجاز صدیقی ایڈیٹر "شاعر" معرفت سید تفضل کریم صاحب
جمشید پور ٹاکیز۔ ٹاٹا نگر۔

اس پتہ پر تمہیں خط یقیناً مل جانا چاہیئے، اس میں ملاقات نہ ہوسکنے پر میں نے معذرت لکھی تھی کہ جس وقت ہم لوگ صبح کے دھندلکوں میں اسٹیشن پر پہونچے تو،
"گاڑی گذر چکی تھی، پٹری چمک رہی تھی"
اور خط میں خوب یاد آیا یہ بھی تو لکھا تھا کہ ناگپور میں قدم قدم پر لہراتی ہوئی ناگنوں نے تمہارا سواگت کیا ہوگا! کیوں یہ مسکراہٹ!

سی۔ پی بھیّا کچھ بے بھی بے ڈھنگے ہی لوگوں کا ملک ہے شاید کبھی وہ لوگ شائستگی کے سبق سیکھ سکیں۔

افسانوں کا مجموعہ ہاں میں بھی سوچ رہا ہوں ——— اسے کاش مجھے "مجسم افسانہ" بنانے کی تمہاری آرزو جلد پوری ہوسکے ——— مگر میں تو ابھی "افسانۂ زندگی" کے عنوان ہی کی تلاش میں سرگرداں ہوں ——— !

بھابی جان کی خدمت میں سلام اور بچوں کو پیار!

یہ خط ختم ہی کر رہا تھا کہ برادرم فرید انصاری سابق ایڈیٹر "فانوس" بنگلور تشریف لے آئے، انھوں نے "..... کی ڈائری" کی بیحد تعریف کی اور وہ اس سے خوب "لطف اندوز" ہوئے ہیں۔

اُن کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اس ادبی شہ کو جلد از جلد کتابی صورت میں جلوہ گر ہوکر اعجاز نمائی کرنا چاہیئے۔ آپ کو سلام کہہ رہے ہیں!

تمہارا
رشدی

تاریخ ۱۰ اگست ۴۳ء

سخنور با امتیاز اعجاز صاحب سلمہ اللہ۔ خیریت ست و باد

قحط القرطاس کے عہد میں خدا کرے "شاعر" کوتاہ داماں نہ ہو۔ انشاء اللہ الرحمٰن نہ ہوگا۔

مضمون کا عنوان وسعت اور نگہداشت ہے۔ دورِ حاضر کے حالات پر نظر رکھتے ہوئے ناچیز تحقیقات کے ساتھ نثر کو بھی دیکھیئے گا، مجھے نثر نظم کوئی لکھنا نہیں آتی۔ عام و خاص دونوں کی دلچسپی ادبی چاشنی کا خیال کچھ مزہ آئے۔ ستمبر نمبر میں شائع کر دینا جلد موقع نکال لیں ورنہ باسی کڑھی ہو جائیگا، پھر اُبال نہ آسکے گا۔ بے تکلفی کو معاف کرنا، کیا کروں ؎

جوانوں میں جواں بڈھوں میں بڈھا لڑکوں میں لڑکا

حضرت سیماب کو سلام و نیاز کے بعد اگر موقع ملے تو مضمون بھی دکھا دینا اور یہ خط بھی۔ کاتب یعنی کاپی نویس پڑھ لینگے صاف و خوشخط لکھوایا گیا ہے۔ کاتب صاحب نے ایک ہفتہ دیر کر دی اس لئے دیر سے مضمون جاتا ہے۔ "شاعر" کے چار صفحے سے کم نہ لیگا۔ کاپی نویس سے حفظ جلی کا لحاظ اور صحت کتابت کا خیال رہے۔

"بساطِ سخن" کے متعلق کیا لکھوں دو نمبر نیم گنج میں سرسری نظر سے گذرنے کے بعد شریر سعنت نظر ہوکر غائب ہوگیا۔ یاد آتا ہے کمالِ مشق کا نمونہ وہ نظم تھی آپ نے تو شیرازہ بندی شعرائے اسلاف کی ہے کہ گویا مجھ سے چھین لیا اور شوق سے بڑھکر نظم میں جو کچھ لکھ دینا تھا لکھ دیا ؎

زندہ باشی تا ابد کارِ مسیحا کردہ ئی

میری نسبت بھی تھا اس لئے دعا کے سوا اور کیا لکھوں۔

کیا کہوں موقع ملے تو بضرورت علاج نہیں محض ادبی یا شاعرانہ ملاقات کا ذریعہ نکالوں گا۔ خدا زندہ رکھے آمین "شاعر" با خاطر شائع ہوتا رہے آمین ثم آمین۔

ایک صاحب نے مجھ سے بھی کہا تمہارے دو شاگردوں کو سیماب صاحب نے اڑا لیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہاں نظریہ یہ ہے ؎

متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد

بہت خوب ہوا میں کثرت اپنے سے اور کسی کو نہیں سمجھتا وہ تو بہتر ہیں میں اُن شاگردوں سے خوش ہوں جو مجھ سے نہ ہوسکے دوسرا بھی اسکو نہ کرسکے اُنکی اصلاح کا کیا کہنا! "دستور الاصلاح" میں جو کچھ ہے خوب ہے۔ حرف بحرف بر آمنا صدقنا کہنا بھی حد اعتدال سے بڑھی ہوئی تعریف ہے۔ حضرت احسن مرحوم نہایت نیک نفس تھے۔ مجھ سے پہلے پڑھنے کی سبقت ایک شاعری میں نہ کی۔ میں شرما گیا۔ "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں" اب کہاں احسن اور کہاں حسن۔ میرا نام تو حسن مرتضیٰ ہے شاید معلوم نہ ہو۔ خیر یہ کے خلاف باتیں ہیں وقت میں گنجائش نہ مقدور قرطاس میں آجکل یہ بھی بیش قیمت کیا نایاب ہو گیا ہے۔ شرعیات کی الامنی بحث کہیں پھر چھڑی تو شروع ہوکر واعدے جمع ہو جائیگی بندہ کے لئے تو اچھا قرینہ یہ ہے بند رہے۔ واضح ہو کہ جمعیا الجموع کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا تھا مگر جمعیت کے شیرازے سے بکھر کر کیا جانے کیا ہوگیا، یہاں فرصت نہ طاقت، ضعف بصر و آلائش کے سبب بات رات کر دو لکھنا بھی دشوار۔

طالب دعا۔ شفق بے نوا عفی عنہ

قسط نہم (گذشتہ سے پیوستہ)

.... کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں — بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرے کے بعد ریاست میسور کے تاریخی مقامات کی سیر)

محلات کے قریب ہی "مسجد اعلیٰ" واقع ہے۔ یہی مسجد میں سلطان شہید پانچوں وقت نماز ادا کیا کرتے تھے۔ محل سے مسجد میں آنے کے لئے ایک مخصوص راستہ تھا۔ صدر دروازہ سے صرف اس لئے داخل نہیں ہوتے تھے کہ نمازیوں کو ادب و احترام کرنا پڑیگا اور اس طرح اُن کے ذوقِ عبادت میں خلل واقع ہوگا، لہٰذا اُس مخصوص دروازہ سے داخل ہونے کے بعد قریب ہی جہاں جگہ ملتی وہیں سلطانِ والا کھڑے ہو جاتے۔ اب یہ دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ یہی وہ مسجد ہے جس کے قریب ہزاروں مسلمان شہید جنگِ آزادی ہوئے اور جن کے خون کے فوّاروں سے مسجد کی دیواریں ایک مدت تک سُرخ رہیں —— مسجد کے دو حصّے ہیں ایک زیریں اور دوسرا بالائی۔ حصّۂ زیریں کی درمیانی محراب پر یہ کتبہ کندہ ہے:-

کہ حضرتِ سلیماں اندر زمانِ ماضی — تعمیرِ مسجدے کرد نامش نہاد اقصیٰ

دراین زمان فرخ سلطانِ دیں بنا کرد — آں مسجدے کہ اسمش ملہم گذاشت اعلیٰ

طاق است چوں سہ نو طاقش بحسن و خوبی — رو حش چو روح باشد تحریک و فیض بیرا

دار دنشانِ زمرّد ان صفوۂ صفائش — محرابِ دلکش او آئینہ دارِ لیلیٰ

مانند زر چو جویا گشتم برائے تاریخ

طاعت برائے ثابت۔ ہاتف نمود القا

اس مسجد میں چار کتبے اور بھی ہیں، ایک میں اسمائے حسنیٰ دوسرے میں رسول مقبول صلعم کے ننانوے نام۔ تیسرے میں احکام جہاد فی سبیل اللہ اور چوتھے میں غزواتِ پیغمبر کے متعلق احادیث مرقوم ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مسجد اپنی مثال آپ ہے۔

مسجد کے مینار بھی کافی بلند ہیں اور آخری منزل پر جانے کے لئے باقاعدہ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ حکیم عبدالمنتقم خانصاحب تبسم اور شاد صاحب کے ساتھ ایک مینار کی آخری منزل پر پہونچا، گو سیڑھیاں بہت چھوٹی ہیں اور راستہ بھی بہت تنگ تھا مگر ہم لوگ چڑھ ہی گئے ہاں بالائی منزل قدرتی تنگ تھی کہ بھائی تبسم کو اپنی جسامت کا احساس [illegible] ساتھ لطف نظارہ میں شریک ہوئے [illegible] صاف نظر آتی ہے۔ [illegible]

"دریا دولت باغ" پہونچے، یہ باغ کاویری ندی کے کنارے بنایا گیا ہے، کسی قدر سرسبز و شاداب بھی ہے۔ صرف اس لئے کہ پھولوں اور پودوں کی غور و پرداخت کی جاتی ہے۔ لیکن جو عمارت باغ کے لئے وجہ نازش ہے اُسے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس پر توجہ کم صرف کی جاتی ہے۔ یہ سلطانِ شہید کا ایوانِ عام ہے اسی میں بیٹھ کر وہ امورِ سلطنت انجام دیا کرتے تھے اور یہیں سے عدل و انصاف کے فیصلے صادر ہوتے تھے۔ عمارت دو منزلہ ہے بالائی حصّے میں ایک کشادہ چھجّہ کا ہے اور نیچے وسیع ہال، یہی چھجّہ کہ سلطان کی نشست گاہ تھا۔ وزرا اور عمّالانِ سلطنت کے لئے سامنے ایک برآمدہ ہے۔ پوری عمارت منقش ہے اور طلائی نقوش بہت زیادہ ہیں۔ ان نقش و نگار اور بعض تصاویر سے سلطان کے زمانہ کی مصوّری کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ مغربی دیوار پر درباری اور امراء کی تصاویر ہیں مثلاً نانا فرنویس پیشوائے پونا۔ محمد علی والا جاہ۔ نظام الملک۔ بابا بنو۔ نواب کرڈپہ۔ شاہنواز وغیرہ۔ ایک تصویر میں حیدرآباد کی فوج کی واپسی دکھائی گئی ہے۔ ہاتھیوں کی دو قطاریں ہیں۔ جن کی عماریاں خالی ہیں۔ اسی طرح مختلف مناظر پیش کئے گئے ہیں —— یہ وہی عمارت ہے جس کے متعلق ڈیوک آف ولنگٹن نے اس میں کئی سال قیام کے بعد لکھا تھا کہ:-

"جنّتِ ارضی یہیں ہے"

اس عمارت کو دیکھنے کے بعد ایک خاص تاثر لے کر وہاں سے چلے اور **کاویری** کے کنارے آئے مگر نہ اُس میں وہ شور تھا اور نہ وہ طغیانی جو کبھی سلطان شہید کے عہد میں تھی، یہ سُست رفتاری بھی کچھ کم باعثِ عبرت نہیں۔

(باقی۔ باقی)

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر

مصرعِ طرح :- "جاگ اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے"

محسنِ ادب حضرت نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اورئی

باعثِ دردِ دل و دردِ جگر ہوتی ہے
جانے کیا چیز حسینوں کی نظر ہوتی ہے

کیا بتاؤں میں کہاں تک ہیں نگاہیں میری
وسعتِ دل میں کہیں حدِ نظر ہوتی ہے

سادگی سے تری اے حُسن کسے ہے انکار
میری ہر بات میں اک بات مگر ہوتی ہے

مٹ گئے ہم تو محبت میں ہمیں کیا معلوم
شام ہوتی ہے کہ دُنیا میں سحر ہوتی ہے

سفرِ ملکِ عدم بار گزرتا ہی نہیں
دیر لگتی ہے نہ تکلیفِ سفر ہوتی ہے

مست و بیخود جو تری یاد میں ہیں کیا جانیں
شام ہوتی ہے کہاں صبح کدھر ہوتی ہے

بسر ہوتی ہے جو محبت میں کسی سے نشتر
شام بھی میری بہ اندازِ سحر ہوتی ہے

جناب مرزا عالم پوری

بےخودی میں بھی خودی پیشِ نظر ہوتی ہے
ہاتھ اُٹھتے ہیں تو دامن کو خبر ہوتی ہے

آنکھ وہ ہے جو غمِ دوست میں تر ہوتی ہے
زندگی وہ ہے جو مر مر کے بسر ہوتی ہے

بند آنکھوں میں تو ہوتے ہیں ہزاروں جلوے
آنکھ کھلتی ہے تو محدود نظر ہوتی ہے

صبح بننا شبِ غم کا کوئی آسان نہیں
مرد انجم کی ہلاکت سے سحر ہوتی ہے

چشمِ بےنور بھی ہو جاتی ہے روشن اک بار
حُسن والوں کی نگہ ساز نظر ہوتی ہے

ہم نے باندھا ہے سرِ شام ہی رختِ سفر
دیکھیے کتنی مسافت پہ سحر ہوتی ہے

خوار تم پہلے محبت میں ہوئے تھے مرزا
کیا وہی پھر غلطی بارِ دگر ہوتی ہے

حضرت جذب عالم پوری

مستقل عالمِ ظلمت میں بسر ہوتی ہے
شام ہوتی ہے قفس میں نہ سحر ہوتی ہے

جب مرے گھر سے وہ ہوتے ہیں سحر کو رخصت
کیا بتاؤں جو قیامت مرے گھر ہوتی ہے

زندگی عشق کی ہوتی ہے عبارت جس سے
کہیں وہ آہ بھی ممنونِ اثر ہوتی ہے

عمر بھر اہلِ خبر کو نہیں ہوتی وہ نصیب
آپ کے بےخبروں کو جو خبر ہوتی ہے

بڑھ ہی جاتی ہے تصور میں ترے دل کی خلش
چاہتا ہوں کہ نہ ہو چھیڑ مگر ہوتی ہے

جی نہیں چاہتا سجدے سے اٹھاؤں سرِ شوق
جب تصور میں تری راہ گذر ہوتی ہے

جھلکیں بنتی ہیں پھولوں کی شفق میں اے جذب
کتنی رنگین گلستاں کی سحر ہوتی ہے

جناب شفا گوالیاری

حُسن والوں کی نظر خاص نظر ہوتی ہے
یہ جدھر ہوتی ہے دُنیا بھی اُدھر ہوتی ہے

سہل کر دو مری مشکل کو شبِ غم آکر
موت آتی ہے، نہ کمبخت سحر ہوتی ہے

اپنے انجام کی پروا نہیں ہوتی اسکو
کتنی معصوم محبت کی نظر ہوتی ہے

شکریہ پرسشِ احوال کا، تو شاد رہے
کیا کہیں عشق میں کس طرح بسر ہوتی ہے

ایک جنبش میں اُلٹ دیتے ہیں دُنیا کا نظام
حُسن والوں کی ہمہ گیر نظر ہوتی ہے

تیری قسمت میں شبِ غم ہے تجھے کیا اے دل
جنکی ہوتی ہے سحر اُنکی سحر ہوتی ہے

چھپ نہیں سکتی عیاں ہوکے رہتی ہے شفا
ہائے کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے

حضرت ارشد صدیقی امروہوی (کوٹہ)

ایک حالت میں تری عمر بسر ہوتی ہے
"جاگ اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے"

جاگ اب دورِ مساوات و اخوت آیا
اُٹھ، کہ دُنیائے ستم زیر و زبر ہوتی ہے

اب بدلنے کو ہے دُنیا کا نظامِ کہنہ
یعنی تشکیلِ جہاں بارِ دگر ہوتی ہے

دیکھتی ہے دلِ مظلوم کی جو حالتِ زار
ہم نظر کہتے ہیں اسکو وہ نظر ہوتی ہے

دل سے جو درد میں ڈوبی ہوئی اُٹھتی ہے کبھی
کہیں وہ آہ بھی ناکامِ اثر ہوتی ہے

اب تو وہ جلوہ ہر اک شے میں نظر آتا ہے
ارشد الحمد کہ تکمیلِ نظر ہوتی ہے

[illegible]

جناب خلیل ازسگولی

اُن کے دیوانوں کی یوں عمر بسر ہوتی ہے
شام گلشن میں تو زنداں میں سحر ہوتی ہے

جلوۂ حُسن سے سیراب ہوں کیا اہلِ نظر
بےخودی قابلِ امکانِ نظر ہوتی ہے

عشق کامل نہ سہی عشق مجازی ہی سہی
شام ہی باعثِ تخلیقِ سحر ہوتی ہے

یہ مری مادی آنکھیں وہ سراپا انوار
چشمِ باطل بھی کہیں جلوہ نگر ہوتی ہے

کیا اُٹھے جانبِ گلزار، نگاہِ حسرت
ہر رگِ گل میں نہاں موجِ شرر ہوتی ہے

جسکی تعمیر میں مضمر تھی نویدِ فردا
کیوں وہ ترتیبِ چمن زیر و زبر ہوتی ہے

[illegible] زار خلیل
انکی الفت میں یہ ترکیب اثر ہوتی ہے

جناب قدیر محشر فرخ آبادی

شام ہوتی ہے ہماری نہ سحر ہوتی ہے
ایک ہی حال میں اب عمر بسر ہوتی ہے

دن گذرتا ہے لئے دوش پہ فکرِ فردا
یادِ ایامِ گذشتہ میں سحر ہوتی ہے

ظلمتِ غم کو جنوں خیز سمجھنے والے
شام ہی اصل میں تمہیدِ سحر ہوتی ہے

شکوۂ بے اثری عشق میں ہے بے معنی
وہ دُعا کب ہے جو ممنونِ اثر ہوتی ہے

خلوتِ دل میں بُلانا تھا انھیں اے موسیٰ
یوں کہیں بات سرِ راہ گذر ہوتی ہے

کیوں نگاہوں سے ہو ظاہر مری یاسِ حسرت
دل تہ کہدیں کہیں توہینِ نظر ہوتی ہے

انقلاباتِ جہاں کا ہے یہ مطلب محشر
اب کوئی دن میں زمیں زیر و زبر ہوتی ہے

حضرت شفیق کوٹی

کوئی شے ہو مجھے فردوسِ نظر ہوتی ہے
تیرے کوچے کی عجب شام و سحر ہوتی ہے

میری تنہائی سجا دیتی ہے محفل اُن کی
حسن ہوتا ہے اور آغوشِ نظر ہوتی ہے

ششدر آئینہ تھا حیران تھا میں وہ مبہوت
کتنی کافر یہ اچٹتی سی نظر ہوتی ہے

کیا خبر اس کو جو لذت کشِ بیداد نہ ہو
کیف آور خلشِ دردِ جگر ہوتی ہے

کھل ہی جاتا ہے محبت کا شکوہ اک روز
بات منہ پر بھی تو آتی ہے اگر ہوتی ہے

کس نے افسانۂ غم ان کو سنایا ہو شفیق
کس کی تعریف بہ اندازِ دگر ہوتی ہے

جناب نیّر کھیمی

کوئی ممنونِ وفا ہے کوئی مقتولِ جفا
شعبدہ بازیٔ نگاہ دو اثر ہوتی ہے

کاش ہم مزاجِ ہستی یہ نوازش کی نظر
روز آماجگہِ برق و شرر ہوتی ہے

آج مہمان ہے وہ روحِ چمن جانِ بہار
کیا تعجب مرے گھر عید اگر ہوتی ہے

نورِ منزل کا اُدھر روشنی داغوں کی اِدھر
اک تجلی سی سرِ راہگذر ہوتی ہے

پھونکدے پھونکدے اے برقِ محبت مجھ کو
زندگی اب مری مشکل سے بسر ہوتی ہے

موہ لیتی ہے نظر شامِ اودھ کی نیّر
جاذبِ روحِ بنارس کی سحر ہوتی ہے

جناب سہا قریشی ایڈووکیٹ بھنڈ (گوالیار)

عاشقوں کے دلِ مجروح سے کوئی پوچھے
آہ کیا چیز وہ دزدیدہ نظر ہوتی ہے

بے نقاب آپ کے جلوے جو کبھی ہوتے ہیں
ضوفگن چاندنی تا حدِ نظر ہوتی ہے

چھاؤں میں تاروں کی، کلیوں کی تبسم ریزی
موجبِ چاکِ گریبانِ سحر ہوتی ہے

حسن آزاد ہے وہ کچھ بھی کہیں کچھ بھی کریں
ذمہ داری تو فقط عشق کے سر ہوتی ہے

تھا جب آزاد نہ آیا تھا خیالِ پرواز
ہوں جو محبوس تو خواہشِ پر ہوتی ہے

کچھ انھیں لوگوں کو حاصل ہے مذاقِ ہستی
زندگی جن کی محبت میں بسر ہوتی ہے

جناب آذر ناگپوری

پھر مری سمت قیامت کی نظر ہوتی ہے
آج دُنیائے سکوں زیر و زبر ہوتی ہے

پردۂ جلوۂ رنگیں کو الٹ دیتا ہوں
جب دُعا میری ہم آغوشِ اثر ہوتی ہے

کس قدر سلسلۂ شامِ شبِ غم ہے دراز
صبح ہوتی ہے نہ کمبخت سحر ہوتی ہے

لالہ و گل مہ و انجم شرر و برقِ جمال
کہیں ان جلوؤں سے تسکینِ نظر ہوتی ہے

اپنا ہی عکسِ مقابل نظر آتا ہے مجھے
جب کبھی آئینۂ دل پہ نظر ہوتی ہے

جاگ اُٹھا عشق کی قسمت کا ستارہ آذر
زندگی حسن کے پہلو میں بسر ہوتی ہے

جناب سالک ہاشمی ناگپوری

آج یہ آہ جو مرہونِ اثر ہوتی ہے
کیا مری شامِ مصیبت کی سحر ہوتی ہے

دردِ دل حد سے گذرتا ہے نہ کم ہوتا ہے
ٹیس رہ رہ کے باندازِ دگر ہوتی ہے

دن تو ہم کاٹ ہی لیتے ہیں کسی طرح مگر
شب تری یاد میں مشکل سے بسر ہوتی ہے

میری دُنیا سے الگ ہے وہ بنا کر جہاں
شام ہوتی ہے کبھی اور نہ سحر ہوتی ہے

گھر سے نفرت ہی بیاباں سے ہے وحشت مجھ کو
اب کہاں دیکھئے یہ عمر بسر ہوتی ہے

بے پیے جھومنے لگتا ہوں میں سالک اکثر
جب مری سمت وہ پُر کیف نظر ہوتی ہے

جناب شوق شہادوی

اس طرح زندگیٔ عشق بسر ہوتی ہے
دیر میں شام تو کعبہ میں سحر ہوتی ہے

دیکھو دُنیائے سکوں زیر و زبر ہوتی ہے
"چونک اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے"

ایک مرکز پہ ٹھہرتا ہے نگاہوں کا ہجوم
فرصتِ جلوہ بھی ہنگامہ اثر ہوتی ہے

درد کا عالمِ تسکیں نہ بدلتے دیکھا
شام ہوتی ہے یہاں اور نہ سحر ہوتی ہے

دن جدائی کا تو گذرا ہے بڑی مشکل سے
رات اب دیکھئے کس طرح بسر ہوتی ہے

حاصلِ وعدہ بھی شوق غنیمت سمجھو
وعدۂ شام کا آغاز، سحر ہوتی ہے

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

مبدءِ درسِ حقیقت وہ نظر ہوتی ہے
تربیت جس کی بہ آغوشِ سحر ہوتی ہے

پوچھ اس اشک کے قطرے کا مقدر مجھ سے
عمر جس کی ترے دامن میں بسر ہوتی ہے

کوئی منزل ہو گذرتی ہی چلی جاتی ہے
کس قدر اُٹھتی جوانی بھی نڈر ہوتی ہے

دیکھ لیتا ہے وہی لیلیٔ فطرت کا جمال
جس کی اپنے ہی گریباں پہ نظر ہوتی ہے

بھاگ اسی محفلِ[1] آئین شکن سے طرفہ
اس میں ناقدریٔ اربابِ ہنر ہوتی ہے

---

[1] موجودہ دَور کے شاعروں کی طرف اشارہ ہے۔ طرفہ

جناب ساقی صدیقی جبلپوری

زخمِ دل پر جو کبھی اُن کی نظر ہوتی ہے
چارہ جوئی بھی بہ اندازِ دگر ہوتی ہے

دیدۂ شوق میں بینائی اگر ہوتی ہے
ساری دُنیا کی نظر اپنی نظر ہوتی ہے

یوں تو ہیں وسعتِ عالم میں ہزاروں جلوے
وجہِ تسکیں مگر اُن کی ہی نظر ہوتی ہے

کیا تجھے اب بھی نہیں میری محبت کا یقیں
جبہ سا در پہ ترے میری نظر ہوتی ہے

کیا تعجب جو لبوں پر ہے ترے میری نگاہ
رندِ میخوار کی ساقی پہ نظر ہوتی ہے

جناب منتظر کلیمی جام پوری

لذتِ درد کی کچھ اُن کو خبر ہوتی ہے
زندگی جن کی محبت میں بسر ہوتی ہے

ہوش میں رہ کے تجھے کوئی نہیں پا سکتا
کچھ ترے بے خبروں ہی کو خبر ہوتی ہے

آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے وہ دُنیا کو
جن کی نظروں میں محبت کی نظر ہوتی ہے

وہ بھی راتیں تھیں کہ نغموں میں بسر ہوتی تھیں
اب تو رو رو کے مصیبت سے سحر ہوتی ہے

منزلِ عشق کا ہو جاتا ہوں رہبر منتظر
دوست کی یاد جو ہمراہِ سفر ہوتی ہے

جناب وفا رضوی جونپوری

شبِ فرقت مری اس طرح بسر ہوتی ہے
دل سے باتیں کبھی تاروں پہ نظر ہوتی ہے

ہو گیا شمع پہ پروانہ فدا یہ کہہ کر
زندگی کیا ہے جو بے فیض بسر ہوتی ہے

دردِ دل، دولتِ دیں، جذبۂ اخلاص و وفا
انھیں اوصاف سے تکمیلِ بشر ہوتی ہے

سب پہ ساقی کی نظر خاص ہے لیکن مجھ پر
جب بھی ہوتی ہے بہ عنوانِ دگر ہوتی ہے

ترکِ اُلفت کو وفا ایک زمانہ گذرا
کیوں فزوں پھر خلشِ دردِ جگر ہوتی ہے

جناب پریم شیدائی دہلوی

جس پہ اے برقِ نظر تیری نظر ہوتی ہے
اُسکی دُنیائے سکوں زیر و زبر ہوتی ہے

سوزشِ شمع کی کس کس کو خبر ہوتی ہے
موت پروانے کی تکلیفِ نظر ہوتی ہے

اس طرح شامِ الم ہے مری ہستی پہ محیط
یہ بھی احساس نہیں ہے کہ سحر ہوتی ہے

دیکھ تو جذبۂ دل جلوہ گہِ دوست نہ ہو
کیوں ہر اک قید سے آزاد نظر ہوتی ہے

پریم آنکھوں میں سما کر وہ چھپے جاتے ہیں
پردہ داری بھی بہ اندازِ دگر ہوتی ہے

جناب اثر ذوقی بنگلوری

عشق کے حق میں نہ کیوں حسن ہو خلاقِ نشاط
جو ادا ہوتی ہے فردوسِ نظر ہوتی ہے

دیکھتے بھی نہیں وہ جانبِ پستی مڑ کر
جنکی معراجِ ثریا بہ نظر ہوتی ہے

بےخبر تو سفرِ عرصۂ محشر سے ہے کیوں
"چونک اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے"

خاطرِ دوست میں پنہاں ہے تسلی دل کی
جلوۂ دوست سے تسکینِ نظر ہوتی ہے

پردۂ لالہ و گل سے مجھے کیا کام اثر
دوست کی آنکھ فقط دوست نگر ہوتی ہے

جناب بیتاب کالپوی

جب بھی بدلی ہوئی کچھ ان کی نظر ہوتی ہے
فطرتاً حالتِ دل زیر و زبر ہوتی ہے

اک نئے عالمِ پُرکیف میں ہوتا ہوں میں
جب بھی تصویر تری پیشِ نظر ہوتی ہے

کچھ بتا تو مجھے اے میرے دلِ آزردہ
کیا کبھی شامِ الم کی بھی سحر ہوتی ہے؟

بے نیازی بھی وہ کیتا بھی ہیں بے درد بھی ہیں
دردِ دل کی مری کب اُن کو خبر ہوتی ہے

ٹھوکروں سے نہیں بیتاب نوازا اُس نے
یوں بھی توقیرِ سرِ راہگذر ہوتی ہے

جناب شان بہاولپوری

روز و شب ہوتی ہے اور شام و سحر ہوتی ہے
دل میں پیہم خلشِ تیرِ نظر ہوتی ہے

شبِ فرقت ہوئی ختم اور ہے نالہ باقی
کس کو راحت تہِ دامانِ سحر ہوتی ہے

بزمِ عالم میں کسی کو کوئی مطلب ہی نہیں
عمرِ بے مایہ کچھ اس طرح بسر ہوتی ہے

نالۂ نیم شبی ہو کہ فغانِ سحری
ہر ادا عشق کی محرومِ اثر ہوتی ہے

شان الفت کا تقاضا ہے کہ مجبور ہوں میں
راحتِ حسن مرے پیشِ نظر ہوتی ہے

جناب وکیل ارنڈوی (مشرقی خاندیش)

اسی اُمید میں اب عمر بسر ہوتی ہے
دیکھیں کب ہم پہ عنایت کی نظر ہوتی ہے

مبتلائے غمِ فرقت کو نہیں ہوش اتنا
شام کب ہوتی ہے کس وقت سحر ہوتی ہے؟

دن دہاڑے دلِ عاشق جو چرا لیتی ہے
ان حسینوں کی وہ دزدیدہ نظر ہوتی ہے

پیشِ حق حشر میں کیا دیگا جواب اے غافل
"چونک اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے"

چھوڑ کر اُنکو رہوں کس کے سہارے میں وکیل
وہ جدھر ہوتے ہیں مخلوق اُدھر ہوتی ہے

جناب اکرم حنفی دھولیوی

عمر ساری اسی حسرت میں بسر ہوتی ہے
اب نفس ہوتی ہے اب دل کی خبر ہوتی ہے

تابکے موت کی آغوش میں آرام کشی
"چونک اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے"

جس سے طوفان زمانے میں اُٹھا کرتے ہیں
وہ ابلتی ہوئی اُلفت کی نظر ہوتی ہے

شدتِ ہجر کا عالم تو وہی ہے جس میں
دل کی فریاد بھی محرومِ اثر ہوتی ہے

ہائے کیا چیز ہے معراجِ تخیل اکرم
غور کرتا ہوں تو جنت میں بسر ہوتی ہے

جناب خاور شہادوی

دل پہ جب حسن و محبت کی نظر ہوتی ہے
حالتِ جوشِ جنوں نوعِ دگر ہوتی ہے

نقشِ پا سے ترے پاتا ہے ہر اک ذرہ ضیا
رشکِ خورشید تری راہ گذر ہوتی ہے

پردۂ گل میں نہاں جب سے ہیں اُن کے جلوے
جو کلی کھلتی ہے تسکینِ نظر ہوتی ہے

اُن کے جلوے جو ہیں اب ذہن و نظر میں مستور — خلد سا ہاں مری ہر شام و سحر ہوتی ہے
تا بکے فکر و عمل سے یہ تغافل غاؔور — "چونکہ اب خوابِ سحر سے کہ سحر ہوتی ہے"

جناب تمنا اٹاوی

صبح کے تارے بھی جھپکانے لگے ہیں آنکھیں — دیکھئے کب شبِ فرقت کی سحر ہوتی ہے
موت آجاتی ہے ہوتی ہے مگر ایسی بھی — مُردے جی اُٹھتے ہیں ایسی بھی نظر ہوتی ہے
اک نہیں ہوتی مرے حال ہی کی اُن کو خبر — یوں تو ہونے کو زمانے کی خبر ہوتی ہے
کشمکش میں ہے شبِ ہجر مری جانِ حزیں — نہ ادھر ہوتی ہے ظالم نہ اُدھر ہوتی ہے
اے تمنا آپ ذرا قلب و جگر سے ہشیار — صرف جنبش نہ نگاہ دو اثر ہوتی ہے

جناب ہلال رہیمی ازکوٹی (ریاست دھار)

دیکھئے کب ہمیں منزل کی خبر ہوتی ہے — روز اک صبح سرِ راہگذر ہوتی ہے
عمر یوں خستہ نصیبوں کی بسر ہوتی ہے — رات ہو جائے تو مشکل سے سحر ہوتی ہے
دل کے پردوں پہ ہیں بیکار نگاہیں سب کی — دید تو اُن کی فقط طور ہی پر ہوتی ہے
چاک کر لیتے ہیں دامانِ تمنا اپنا — جب اسیروں کو بہاروں کی خبر ہوتی ہے
دل اُنھیں دے کے ہم اس راز کو سمجھے ہیں ہلال — زندگی عشق میں رو رو کے بسر ہوتی ہے

جناب موج شیدائی دیوبندی

دسترس آہ کی گو تا بہ اثر ہوتی ہے — جراتِ آہ و بکا کس کو مگر ہوتی ہے
منزلِ عشق پہ جب دل کی نظر ہوتی ہے — یاس میں ڈوبی ہوئی نبضِ سحر ہوتی ہے
جادۂ شام پہ یوں تھک کے ٹھہر جاتا ہوں — دُور کوسوں رہِ امیدِ سحر ہوتی ہے
کیفیت پوچھ نہ معراجِ جنونِ دل کی — بے نیازِ غمِ کونین نظر ہوتی ہے
موج گردابِ محبت ہی میں لے چل کشتی — بحرِ اندوہ میں ہو غرق اگر ہوتی ہے

جناب کلیم شمس آبادی (بمبئی)

ہوں وہ سرشارِ محبت کہ نہیں مجھکو خبر — شام کب ہوتی ہے کس وقت سحر ہوتی ہے
درد بڑھ جاتا ہے شدت سے بجائے تسکیں — پرسشِ حالتِ بیمار اگر ہوتی ہے
وہ فضاؤں میں ہوا شورِ قیامت برپا — اے خوشا وقت، شبِ غم کی سحر ہوتی ہے
حال کیا آپ کو معلوم نہیں ہے میرا — اب میں کیا عرض کروں کیسے بسر ہوتی ہے
کس کے جلووں نے کلیم آج پھر انگڑائی لی — ہستیِ کون و مکاں زیر و زبر ہوتی ہے

جناب رفیق شہادوی

برسے اشکوں پہ زمانے کی نظر ہوتی ہے — اب ندامت سے مجھے لے دیدۂ تر ہوتی ہے
شور نے کر دیا ہنگامۂ محشر برپا — "چونکہ اب خوابِ سحر سے کہ سحر ہوتی ہے"
دل کی دُنیا میں اندھیرا سا ہوا جاتا ہے — کیا اسی طرح شبِ غم کی سحر ہوتی ہے
دیکھتا ہوں جو نگاہوں سے ملا کر دل کو — روشنی طور کی تا حدِ نظر ہوتی ہے
زخمہائے دلِ مجروح پہ راتوں کو رفیق — مسکراتے ہوئے تاروں کی نظر ہوتی ہے

جناب نسیم سیتاپوری

یوں محبت میں شب و روز بسر ہوتی ہے — قلب سے ایک خلش تا بہ جگر ہوتی ہے
دل کی رگ رگ سی ہے اک درد کا عالم پیدا — کیا بتاؤں میں اُنھیں ٹیس کدھر ہوتی ہے
بے پیے نشہ سا محسوس مجھے ہوتا ہے — ملتفت جب تری مخمور نظر ہوتی ہے
عشق سمجھے اسے یا عشق کی نظریں سمجھیں — حسن کی بات بہ اندازِ دگر ہوتی ہے
دیر و کعبہ ہو، کلیسا ہو کہ بتخانہ نسیم — ہر جگہ اہلِ محبت کی بسر ہوتی ہے

جناب جلیس مالیگانوی

کیف افزا خلشِ دردِ جگر ہوتی ہے — ہائے کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے
گریۂ غم کو مرے چشمِ حقارت سے نہ دیکھ — انھیں اشکوں میں نہاں آبِ گہر ہوتی ہے
خونِ پروانۂ جانباز کا دیکھا ہے اثر — زندگی شمع کی رو رو کے بسر ہوتی ہے
جلوہ افروز ہے جب سرو وہ جمالِ رنگیں — ہر کلی باغ کی فردوسِ نظر ہوتی ہے
یہ حقیقت ہے کہ میں نازشِ ہستی ہوں جلیس — حیرت افزا مری پروازِ نظر ہوتی ہے

جناب عصمت قریشی بلاسپوری

جس سے برہم تری زردیدہ نظر ہوتی ہے — زندگی چین سے کب اسکی بسر ہوتی ہے
مسکراتا ہے حسینوں کا تغافل جس پر — ترجمانِ دلِ مضطر وہ نظر ہوتی ہے
کوئی سنتا ہی نہیں میرے دکھے دل کی صدا — تم جدھر ہوتے ہو دُنیا بھی اُدھر ہوتی ہے
عشق کیوں خاک نشینوں ہی کے سر ٹھہرائے — یہ مصیبت تو غریبوں ہی کے سر ہوتی ہے
حضرتِ طرفہ سے ہو فیض کی عصمت امید — دیکھیں کب لطف و عنایت کی نظر ہوتی ہے

جناب ارشد صدیقی ساگری (ناگپور)

لطف تو دیکھئے، جو دشمنِ جاں ہے اپنا — حاصلِ زیست اُسی بُت کی نظر ہوتی ہے
اشکِ غم آتشِ اُلفت کو بجھا دیتے ہیں — شدتِ درد سے تسکینِ جگر ہوتی ہے
نامرادی بھی ہے گھر میری، ناکامی بھی — کیوں دلِ زار اب اچھی تو بسر ہوتی ہے؟
اُنکی محفل میں چلو ہم بھی چلیں آج ارشد — دیکھیں پھر کس پہ عنایت کی نظر ہوتی ہے

جناب فوق ندار تنجوی، گیاوی

نالۂ و آہ کی شورش میں سحر ہوتی ہے — کس مصیبت سے شبِ ہجر بسر ہوتی ہے
شکر صد شکر مسلسل شبِ آلام کے بعد — اب مرے عالمِ غربت کی سحر ہوتی ہے

کرچکا ہوں یوں دعا ترکِ محبت کی مگر
دیکھئے کب یہ ہم آغوشِ اثر ہوتی ہے

تجھے دیتی ہے صدا فرقتِ تنہائی وطن
چونک اب خواب سے اپنے کہ سحر ہوتی ہے

جناب عالی علی نگری

جب انھیں اپنی اداؤں کی خبر ہوتی ہے
قدر نظارگی اہلِ نظر ہوتی ہے

کیا کہوں کیا تری دزدیدہ نظر ہوتی ہے
سب ادھر ہوتے ہیں عالم یہ جدھر ہوتی ہے

مُردنی پھرتی نظر آتی رُخِ انجم پر
کتنی جانسوز مری آہِ سحر ہوتی ہے

سلے رہے دردِ جدائی زہے حرمانِ وصال
اس طرح حضرتِ عالی کی بسر ہوتی ہے

جناب انور شہادومی

منزلِ عالمِ تقدیس کو طے کرتا ہوں
میری معراجِ نظر تیرے بسر ہوتی ہے

شامِ غم لاکھ مصائب ہو گوارا کر لے
راحت افزا شبِ ماتم کی سحر ہوتی ہے

اڑکے آتے ہیں ادھر حسن کے رنگیں منظر
میرے تخیل کی پرواز جدھر ہوتی ہے

شامِ غربت میں جہاں بیٹھ گیا میں انور
تا سحر بس وہی منزل مرا گھر ہوتی ہے

جناب تاباں القادری مدناپوری

اشک آنکھوں میں ہیں لب آہ و فغاں کے ہمدم
گفتگو ان سے بہ انداز دگر ہوتی ہے

دن تو شبہائے مصیبت کی نہیں کوئی سحر
زیست روشن کے تصور میں بسر ہوتی ہے

اُن کے پھرنے سے ہوا آج یہ ہم کو معلوم
وہ جدھر ہوتے ہیں دنیا بھی ادھر ہوتی ہے

کیا ہوئی وہ مری خودداریِ الفت تاباں
اب تو غیروں پہ عنایت کی نظر ہوتی ہے

جناب فدا جہلمی

محرمِ رازِ حقیقت جو نظر ہوتی ہے
اس کو رفتارِ زمانہ کی خبر ہوتی ہے

تونے سوچا بھی کبھی عیش میں رہنے والے
دلِ مہجور کی کس طرح بسر ہوتی ہے

وہ حقارت سے جہاں کو نہیں دیکھا کرتے
جنھیں ہستی کی حقیقت کی خبر ہوتی ہے

میں نے دیکھی تو نہیں اپنی نگاہوں سے فدا
لوگ کہتے ہیں شبِ غم کی سحر ہوتی ہے

جناب برگ اڑ باندہ

موت کی نیند سرِ شام سے سونے والے
"چونک اب خوابِ لحد سے کہ سحر ہوتی ہے"

دیکھ لیتے ہیں یہ دل لاکھ چھپائے کوئی
کسقدر تیز حسینوں کی نظر ہوتی ہے

بے خبر عشق میں رہتے ہیں جو ہستی سے مدام
ساری عالم کی انھیں برگ خبر ہوتی ہے

جناب کیف رائے بریلوی

دل کو میری نہ مجھے دل کی خبر ہوتی ہے
اس طرح گم ترے جلووں میں نظر ہوتی ہے

بڑھ سے انداز سے صورتِ مژگاں ہوتی ہے
آہ کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے

یاد آجاتے ہیں جو ناوکِ مژگاں مجھ کو
کیف جس دم خلشِ دردِ جگر ہوتی ہے

جناب غافل ازبٹول

نہ سہی آج کسی دن تو مگر ہوتی ہے
لطف کی ایک نہ اک روز نظر ہوتی ہے

رحم کر کچھ تو غمِ ہجر کے دینے والے
شبِ فرقت مری مشکل سے بسر ہوتی ہے

اُن کو ہے شوق جفا میں ہوں وفا کا خوگر
عمر غافل اسی جھگڑے میں بسر ہوتی ہے

جناب محی دکنی

یار کے حسن تصور میں سحر ہوتی ہے
مجھ گنہگار کی یوں عمر بسر ہوتی ہے

وہ بھی کیا دن تھے کہ نظروں سے نہ ہوتے تھے جدا
یہ بھی کیا دن ہیں کہ فرقت میں بسر ہوتی ہے

جناب معصوم النعمانی پشاوری

تو تو رخصت کی بھی مدت سے ہوا ہے معصوم
"چونک اب خواب لحد سے کہ سحر ہوتی ہے"

اب تو معصوم مجھے کچھ نظر آتا ہی نہیں
اُنکی صورت ہی فقط پیشِ نظر ہوتی ہے

جناب طالب قریشی بھیا ٹاپاردی

فرشِ رہ آنکھوں کو اپنی میں بنائے ہوں
اُنکے آنے کی اگر مجھ کو خبر ہوتی ہے

قولِ طالب کا رکھیں یاد یہی اہلِ نظر
بعد مرنے کے ہی کچھ قدرِ بشر ہوتی ہے

جناب شہزاد قریشی پشاوری

کبھی کوچہ میں ترے اور کبھی صحرا میں
ترے دیوانوں کی یوں عمر بسر ہوتی ہے

اُٹھی رحمت کی گھٹا جھوم کے دیکھو شہزاد
کتنی پُردرد تری آہِ سحر ہوتی ہے

جناب حسن ساگری

جس نے موسیٰ کو سرِ طور کیا تھا بیخود
دیکھئے کب وہ ادا بارِ دگر ہوتی ہے

جناب آزاد جہلمی

دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں
تیرے وحشی کی یوں ہی عمر بسر ہوتی ہے

مشاعرہ شاعر مصرع طرح برائے ماہ نومبر ۱۹۴۳ء

"عشق کو حسن کے آداب سکھائے نہ گئے"

سکھائے۔ بنائے وغیرہ قوافی نہ گئے ردیف

نوٹ غزلیں ہر ماہ کی ۸ تاریخ تک آنی چاہئیں۔ مشاعرے کیلئے صرف مستقل خریدار غزلیں بھیج سکتے ہیں۔ غزل پر نمبر خریداری کا ہونا ضروری ہے۔ — منیجر

اصلاحِ سخن

جناب ظفر ناگپوری کی غزل پر حضرت علامہ ناطق گلاؤٹھوی کی اصلاح

موت سے پہلے مر کے یہ
~~حاصلِ رونقِ جہاں~~ زندگیٔ دوام ہے ۱ کہتے ہیں جسکو زندگی ذوقِ فنا کا نام ہے

دیکھئے یہ
کارگہِ حیات کا ~~بگڑا ہوا~~ نظام ہے ۲ صبحِ نشاطِ دل مری رہنِ سوادِ شام ہے

بزم سرور میں تری ہر کوئی
~~محفلِ میکدہ میں آج رندِ تو~~ شاد کام ہے ۳ قیدِ محن میں مبتلا، ایک شکستِ جام ہے

خیال
رہگذرِ ~~حیات~~ میں دیر و حرم کا ذکر کیا ۴ یہ تو نگاہِ فکر کی منزلِ ناتمام ہے

رنج بھی دیں تو رنج کیا، رنج سے کچھ واسطہ نہیں
~~اُن کی رضا پہ مرٹے ملنا کی رضا پہ مرٹے~~ ۵ اپنی خوشی کا ذکر کیا آپکی خوشی سے کام ہے

کام کی بات تو یہ ہے حُسنِ سلیقہ چاہئے　　یعنی حصولِ مدعا طرز
~~اب یہ حصولِ مدعا تیرے کرم پہ منحصر~~ ۶ ~~صحبتِ مدعا مری~~ سعیٔ عمل کا کام ہے

دلِ حزیں
کیوں ہے ~~حریم دل~~ سے دُور کیوں ہے حریم ناز میں ۷ یہ بھی ترا انعام ہے وہ بھی ترا انعام ہے

اب مری آرزو نہ پوچھ
~~پیکرِ آرزو ہے عشق~~، مقصدِ آرزو نہ پوچھ ۸ میری نگاہ سے عیاں دل کا مرے پیام ہے

چاہتے ہم کو
بادۂ شوق پی مگر ~~یعنی~~ بقدرِ ظرفِ دل ۹ بزم شراب عشق میں جام ہوس حرام ہے

کیفِ نگاہِ شوق سے حُسن کی بارگاہ کیا ۱۰ شانِ شبابِ حسن کیا دیدہ کا اک نظام ہے

لفظ، الست کے سے کچھ کان میں آ رہی تو ہیں
گر
~~باتیں تو کرو ہیں پردہ دارے گر~~ ۱۱ اس کی ہمیں خبر نہیں کس سے وہ ہمکلام ہے

آنکھوں میں اشک لب پہ آہ، شکل اُداس اجی نڈھال
دم بہ سکونِ دل ظفر ~~پھر~~ اب بھی اسی کا نام ہے ۱۲

توجیہہ:-

(۱) "زندگیٔ دوام" کو "حاصلِ رونقِ جہاں" کہنا بے معنی تھا۔ "موت سے پہلے مر کے" نے مصرع میں زور پیدا کر دیا اور مطلع اچھا ہو گیا۔ مگر میری رائے میں دونوں مصرعوں میں "زندگی" کا رہنا مطلع کے حُسن کو کھو رہا ہے۔ اگر پہلے مصرع میں سے زندگی نکل جاتا تو بہت اچھا تھا، موجودہ صورت میں بھی مطلع بُرا نہیں ہے۔

(۲) "بگڑا ہوا نظام" اپنی جگہ اچھا تھا لیکن اصلاح میں حرفِ اشارہ رکھ کر دوسرے مصرع کو زیادہ موثر کر دیا گیا۔

(۳) "محفلِ میکدہ" صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مصرع سُست تھا۔ اصلاح سے چست ہو گیا۔

(۴) شعر بھی اچھا ہے اور اصلاح بھی۔ یہ مصرع ثانی کے اعتبار سے حیات کی جگہ خیال ہی ہونا چاہئے

(۵) ظفر صاحب کا مصرع، مصرع ثانی سے زیادہ مربوط نہ تھا۔ حضرت ناطق کی اصلاح نے لطف پیدا کر دیا۔ اب ذرا مصرع کے تیور دیکھئے۔

(۶) یہ شعر کچھ اُلجھا ہوا تھا۔ اصلاح سے مفہوم زیادہ واضح ہو گیا

(۷) ایک ہی مصرع میں دو جگہ "حریم" کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے دلِ حزیں بنا دیا گیا۔

(۸) ظفر صاحب کا مصرع غلط نہ تھا مگر اصلاح نے زیادہ زور پیدا کر دیا۔

(۹) پہلے مصرع میں "یعنی" بے معنی اور زائد تھا۔ اصلاح نے اس عیب کو دُور کر دیا اور مصرع صاف ہو گیا۔

(۱۰) شعر کے معنی و مفہوم سے قطع نظر "شبابِ حسن" کی ترکیب سے مجھے اختلاف ہے ممکن ہے بعض لوگ اسے صحیح سمجھیں مگر میری رائے میں "حسن" ایک ایسا جامع لفظ ہے، جس میں شباب، جوانی، رعنائی غرض سب کچھ پایا جاتا ہے اگر حسن کا شباب ہو سکتا ہے تو پھر حسن کا بڑھاپا بھی ہونا چاہئے۔ ہاں حسن و شباب یا شباب و حسن لکھا جا سکتا ہے۔

(۱۱) شعر میں تنافر یہ تھا یعنی پہلے مصرع میں "کر رہے ہیں وہ" اور دوسرے میں "ہمکلام ہے" تھا اصلاح سے یہ بڑا عیب دُور ہو گیا۔ اگر سوءِ ادبی نہ ہو تو اتنا عرض کروں کہ مصرع اولیٰ کی اصلاح میں "تو" خلافِ محل ہے۔ دوسرے مصرع میں "ہیں" کی جگہ "گر" بہت خوب ہے۔

(۱۲) "پھر بھی" اور "اب بھی" میں کوئی خاص فرق نہیں "اب بھی" زیادہ سلیس ہے۔

اعجاز صدیقی

عالمی ادب میں بانی تعلیم ــــــ وقف ادبیات ۱۳ سال
زیر سرپرستی ــــ اعلیحضرت رتھوا منظور حسین والئی پاجوڑ (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ
حکومت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ
محکمۂ تعلیم ریاست کشمیر

منظور شدہ
محکمۂ تعلیم صوبۂ ممالک متوسط و برار
محکمۂ تعلیم ریاست میسور



جلد ۱۴ | ماہنامہ "شاعر" ــــ آگرہ ــــ نومبر ۱۹۴۳ء | نمبر ۱۱

چندہ سالانہ عوام سے ۴ خواص سے ۶ ہمدردوں سے ۱۲ انیسوں سے ۱۵ معاونین سے ۲۵ مربیوں سے ۵۰ محسنین سے ۱۰۰ سرپرستوں سے ۲۵۰ فی پرچہ ۶؍

محسنین، مربیان، معاونین، خاصان و ہمدردانِ شاعر

محسنینِ ادب و شعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی نقد ۶۰ سالانہ
(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیّر خورجوی نقد ۶۰ سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کیانہ دالی بیگم صاحبہ آف جوناگڑھ اسٹیٹ نقد ۶۰ سالانہ
(۴) محسنِ ادب وزیر زادہ شجاعت خانصاحب مہر جوناگڑھی نقد ۶۰ سالانہ

مربیانِ ادب و شعر

(۵) مربیِ ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں سر کرنل حشمت اللہ خانصاحب حو منکے۔ بی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵۰ سالانہ
(۶) مربیِ ادب جنابِ محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز و اسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹا نگر) ۵۰ سالانہ

معاونینِ ادب

(۷) معاونِ ادب مسٹر اے۔ بی خلیس صابر بی۔ اے اکبرآبادی ۲۴ عہ سالانہ
(۸) معاونۂ ادب محترمہ بیگم تصدق ایم اے۔ بی۔ ٹی مدیرہ رسالہ "ادیب" دہلی ۲۴ عہ سالانہ
(۹) معاونِ ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی (بمبئی) ۲۴ عہ سالانہ
(۱۰) معاونِ ادب جناب صوبیدار اختر علی صاحب گوالیار ۲۴ عہ سالانہ
(۱۱) معاونِ ادب جناب سید یوسف پیر صاحب تنویر حکیم۔ حیدرآباد ۲۴ عہ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلطان جالندھری ۱۲ عہ سالانہ
(۱۳) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب تسنیم گوالیاری مرحوم ۱۲ عہ سالانہ
(۱۴) ہمدردِ ادب جناب ابو عبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی جمشید پور ۱۲ عہ سالانہ
(۱۵) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب آرزو جوناگڑھی ۱۲ عہ سالانہ
(۱۶) ہمدردِ ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲ عہ سالانہ
(۱۷) ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ مشکور حسین خانصاحب قیس آف ہینڈو ۱۲ عہ سالانہ
(۱۸) ہمدردِ ادب جناب سید غلام محمد شاہ صاحب رئیس اعظم دجور ضلع جھنگ ۱۲ عہ سالانہ
(۱۹) ہمدردِ ادب محترمہ بلقیس جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۱۲ عہ سالانہ
(۲۰) ہمدردِ ادب جناب محبوب خانصاحب ذکی صدر دربارِ سخن۔ چوپڑہ (اسٹرن خاندیش) ۱۲ عہ سالانہ

خاصانِ ادب

(۲۱) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ۶ ؎ سالانہ
(۲۲) جناب عبدالحمید صاحب قمر صدیقی پھپراوی بی۔ اے ۶ ؎ سالانہ
(۲۳) جناب لالہ گنگا رام صاحب آہ سرہندی ۶ ؎ سالانہ
(۲۴) جناب سید مظفر حسین صاحب فرحتی غازی آباد ۶ ؎ سالانہ
(۲۵) جناب محمد عبید اللہ خانصاحب بزم امروہوی ۶ ؎ سالانہ
(۲۶) جناب نذیر احمد صاحب نذیر سرکوٹی ۶ ؎ سالانہ
(۲۷) جناب ناصر حسن خانصاحب اثر بمبئی ۶ ؎ سالانہ
(۲۸) جناب حفیظ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶ ؎ سالانہ
(۲۹) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ۶ ؎ سالانہ
(۳۰) جناب فائق صاحب لدھیانوی ۶ ؎ سالانہ
(۳۱) جناب نذیر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (ڈنگہ) ۶ ؎ سالانہ
(۳۲) جناب سبحان خانصاحب فاضل جتول ۶ ؎ سالانہ
(۳۳) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶ ؎ سالانہ
(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹاہہ ۶ ؎ سالانہ
(۳۵) جناب بشیشور پرشاد صاحب برگ باندوی ۶ ؎ سالانہ
(۳۶) جناب حکیم مولوی عبدالرحمٰن صاحب شاعر کاندھلوی ۶ ؎ سالانہ
(۳۷) علامہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ ؎ سالانہ
(۳۸) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر شکوہ آبادی ۶ ؎ سالانہ
(۳۹) جناب کنور فاروق علی خاں صاحب عارف رئیس ہینڈو ۶ ؎ سالانہ
(۴۰) جناب مقبول احمد صاحب سحر اعظم گڑھی ۶ ؎ سالانہ
(۴۱) جناب مولوی منظور الدین صاحب فکر مدراسی کورو اسپوسی ۶ ؎ سالانہ
(۴۲) جناب ڈاکٹر ابار شاد صاحب استعانہ زیب بریلوی ۶ ؎ سالانہ
(۴۳) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ ؎ سالانہ
(۴۴) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب لیگوانی اسسٹنٹ ۶ ؎ سالانہ
(۴۵) جناب من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی۔ پی) ۶ ؎ سالانہ
(۴۶) جناب محمد حسین صاحب خادم شکوہ دہلی ۶ ؎ سالانہ
(۴۷) جناب چودھری حلیم یار صاحب سندیلہ ۶ ؎ سالانہ
(۴۸) جناب سید شاہ عنایت رسول صاحب تاباں القادری مناپور (بنگال) ۶ ؎ سالانہ
(۴۹) جناب جمعدار سی۔ پی مجاور صاحب بمبئی ۶ ؎ سالانہ
(۵۰) جناب شیخ عبدالرحمان صاحب شباب دہلوی ریاستی ۶ ؎ سالانہ
(۵۱) جناب ملک قربان حسین صاحب شہید جہلمی بمبئی ۶ ؎ سالانہ
(۵۲) جناب عبدالرؤف صاحب فرقی سکریٹری اقبال لائبریری نصار گنج (گیا) ۶ ؎ سالانہ
(۵۳) جناب رگھونندن راؤ صاحب مجذوب عالمپوری ۶ ؎ سالانہ
(۵۴) جناب پنڈت بے چند لعل صاحب کول خادم ایم۔ ایس۔ سی جودھپور ۶ ؎ سالانہ
(۵۵) جناب محمد اکرام اللہ صاحب تمہا قریشی ایڈوکیٹ بجنور ۶ ؎ سالانہ
(۵۶) جناب میاں گل محمد خانصاحب کلیم رئیس فرید کوٹ ضلع گوردھا ۶ ؎ سالانہ
(۵۷) محترمہ بیگم روشن آرا صاحبہ ودیا پارک سرکس کلکتہ ۶ ؎ سالانہ
(۵۸) محترمہ خورشید بیگم صاحبہ ریپن اسٹریٹ کلکتہ ۶ ؎ سالانہ

(بقیہ صفحہ ۔۔۔ ملاحظہ ہو)

تحقیق — بعض الفاظ کے اعراب

ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو عام طور پر ہماری بول چال میں آتے رہتے ہیں نیز ادبا اور شعرا اپنے کلام اور مضامین میں بھی بکثرت استعمال کرتے ہیں لیکن اکثر تلفظ میں اختلاف ہوتا ہے مثلاً کوئی مَحبّت کہتا ہے تو کوئی مُحبّت۔ کوئی فِضا کہتا ہے تو کوئی فَضا کیوں نہ آپ "شاعر" میں ایسے الفاظ کے صحیح اعراب بعد تحقیق شائع کر دیں جو عام طور پر سب کے کام آتے ہیں تاکہ ناواقف حضرات کو تلفظ میں آسانی ہو۔

افسر احمد نگری

الفاظ کے اعراب کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی متعدد حضرات توجہ دلا چکے ہیں۔ مگر میری بے پناہ مصروفیتوں نے اس سلسلے کو چھیڑنے کی آج تک اجازت نہ دی۔ گو اعراب کی توضیح زیادہ وقت طلب نہیں ہے۔ لیکن اتنی آسان بھی نہیں کہ قلم برداشتہ لکھتا چلا جاؤں۔ بہر حال اس اشاعت سے یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے ۔ لیے چند مخصوص الفاظ ہی تک محدود نہ کیا جائے گا بلکہ ارادہ ہے کہ الف سے یے تک جتنے الفاظ ایسے ملیں جن کے اعراب میں غلطی کا امکان ہو ان سب کے صحیح اعراب لکھ دیے جائیں۔ ذیل میں آ الف اور الف ممدودہ کی تقطیع شروع کی جا رہی ہے۔ اس میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن کے تلفظ میں شاید بہت کم لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لیکن امکانِ غلطی ضرور ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے الفاظ بھی ملیں گے جن میں اعراب کے ذرا سے اختلاف سے معنی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ محققین اور مشاہیر اساتذہ بھی اس سلسلے پر نگاہ رکھیں گے اور میں بیحد ممنون ہونگا اگر وہ اس سلسلے میں رہ جانے والی کسی کوتاہی یا غلطی سے آگاہ فرمائیں گے ——— مدیر

غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح	غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح
آتَش	آتِش	بکسر تا۔ بعض لوگ "ت" بالفتح بھی بولتے اور لکھتے ہیں لیکن "ت" کو زیر ہی کے ساتھ زیادہ بولا جاتا ہے	آہَنی	آہَنی	ہ۔ بالفتح
آجار	آچار	الف ممدودہ	اِبتَہاج	اِبتِہاج	ت۔ بالکسر
آخَر	آخِر	خ بالکسر	اِبَاد		بالکسر۔ رواکرنا
آخَرت	آخِرت	″ ″	آبَاد		بالفتح۔ ابد کی جمع
آزردگی	آزُردَگی	د ساکن نہیں ہے بلکہ بالفتح ہے	اَبلاغ	اِبلاغ	بالکسر
آسودگی	آسودَگی	د ″ ″ ″ ″ ″ ″	اَتلاف	اِتلاف	″
آفِت	آفَت	ف۔ بالفتح	اَتمام	اِتمام	″
آفرِینَش	آفرِینِش	ن بالکسر	اِتہام	اِتّہام	بالفتح
آگہی	آگَہی	گ۔ بالفتح	اِثبات		ثبوت۔ اقرار۔ ثابت کرنا
آلائَش	آلائِش	ی۔ بالکسر	اَثبات		ثبت کی جمع
آصِفیہ	آصَفیہ	ص۔ بالفتح	اِجتَہاد	اِجتِہاد	ت۔ بالکسر
			اجرام		جُرم کرنا

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر دیکھئے)

شخصیات :۔ فصاحت جنگ امام الفن حضرتِ نواب جلیل مانکپوری

شبلی کا یہ قول کہ :۔

" شاعری زوردار احساسات کا قدرتی بہاؤ ہے اس کی ابتدا اُن جذبات سے ہوتی ہے جو حالتِ سکون میں اُبھریں"۔

قدیم اُردو غزل پر کلیتاً منطبق ہوتا ہے، جہاں تک "سکون و اطمینان" کا تعلق ہے اسکا اندازہ ہم ہندوستان کے دورِ زوال سے اچھی طرح لگا سکتے ہیں۔ وسیع و کشادہ قصر و ایوان۔ دیواروں پر نبت کاری۔ دروازوں میں حریر و پرنیاں کے پردے۔ کہکشاں کو شرمانے والے جھاڑ اور فانوس رنگا رنگ و گلکار ایرانی قالین زرنگار صحنیں عود و عنبر کی بھینی بھینی لپٹیں کچی کلیوں، نیم شگفتہ غنچوں اور مہکتے ہوئے پھولوں سے نقشین گلدان بھرے ہوئے۔ گنگا جمنی عماصدان، زرق برق پوشاکیں ——— یہ شاہد ——— وہ مینا ——— سانسوں میں کیف، نگاہوں میں مستی، لبوں پر مسکراہٹیں، قدموں میں لغزش اور دلوں میں بھرے ہوئے جذباتِ نشاط ——— ایسے عالم میں تغزل کا رنگ نہ نکھرے! بھلا یہ کیونکر ممکن تھا؟

کیا متقدمین، کیا متوسطین اور کیا متاخرین! اُردو شاعری کے ہر دور میں مخصوص شعرا سلاطین کی محفلوں میں "گرمئ محفل" بنکر رہے اور ماحول کی رعنائیوں اور طرب سامانیوں میں اپنے جذباتی اشعار سے وہ آگ لگائی کہ ہر شخص پکار اُٹھا ؎

"ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"

درباری شاعری کا سلسلہ ہمارے شعرائے متاخرین امیر مینائی۔ داغ دہلوی۔ میر شکوہ آبادی وغیرہ ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس دور کے بعض اساتذہ کو بھی ادب نواز اور علم دوست روسا نے نوازا۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم۔ بزم اکبرآبادی۔ جام دہلوی۔ نجم اکبرآبادی۔ مانی جائسی۔ ثاقب لکھنوی وغیرہ مدت العمر درباروں سے منسلک رہے اور ان میں سے بعض اب تک ہیں۔ آج جس مقتدر و محترم ہستی کا ذکر مقصود ہے وہ بھی بادشاہِ دکن کی بارگاہ کا ایک "رتن" ہے اور ایسا "رتن" جس کی خاموشیوں میں گویائیاں اور پیری میں شباب کی رنگینیں مضمر ہیں۔

اس سے قبل کئی بار میں نے کوشش کی کہ حضرتِ جلیل کے تفصیلی ذہنی حالات اور اُن کی تازہ ترین تصویر "شخصیات" کے لئے حاصل کروں مگر ہر بار "عدم التفات" کا شکار رہا۔ شکوہ کا عادی نہیں اور شکایت بزرگوں کی جناب میں روا نہیں، بہر حال جو کچھ ادہر اُدہر سے مل سکا ہے وہی پیش کر رہا ہوں۔

حضرتِ جلیل کا نام جلیل حسن اور والدِ بزرگوار کا نام حافظ عبدالکریم ہے۔ سنہ ۱۲۸۳ھ میں مانکپور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ والدِ مرحوم چونکہ حافظ تھے اور پہلے زمانہ میں حفظِ قرآن کا دستور بھی عام تھا اس لئے ۱۱ سال ہی کی عمر میں حافظِ قرآن ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مزید فارسی اور عربی کی تعلیم بیشتر لکھنؤ میں ہوئی تعلیم سے فراغت پائی تو سخن گوئی کے شوق نے انگڑائی لی جو بچپن ہی سے دامنگیر تھا بیس سال کی عمر میں حضرتِ امیر مینائی مرحوم سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ استاد اور شاگرد میں کچھ ایسا رابطۂ شفقت و خلوص پیدا ہوا کہ حضرتِ جلیل تا دمِ واپسیں شفیق استاد کے قدموں سے جدا نہیں ہوئے، کچھ تو ذوق سلیم پایا اور کچھ استاد کی شفقت و توجہ غرض "مسِ خام" تھے "کندن" بن گئے۔ عروض و قوافی اور جملہ نکاتِ شعری سے کما حقہٗ واقفیت حاصل ہو گئی۔ رامپور میں جب امیر اللغات کی ترتیب و تدوین ہوئی تو جلیل صاحب ہی کو اس کی ادارت کا فخر حاصل ہوا، پھر بنارس اور بھوپال وغیرہ کے سفر میں بھی حضرت امیر کے ساتھ رہے۔

۱۰ جمادی الاوّل سنہ ۱۳۱۸ھ کو حضرت امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد پہنچے تو یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شادؔ کی اعانت و ہمدردی بطورِ خاص شاملِ حال ہوئی اور اُن کے سپرد دو رسالے "محبوب الکلام" اور "دبدبۂ آصفی" کئے گئے اور اس کام کو جلیل صاحب نے بڑے حُسن و خوبی سے انجام دیا۔ سنہ ۱۳۲۳ھ میں بعض احباب کے اصرار سے "تذکیر و تانیث" پر ایک مبسوط کتاب تصنیف فرمائی، جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث نہایت واضح اور تحقیقی طور پر بتائی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے لکھا تھا۔ پھر جناب اختر مینائی کے اشتراک سے دکن کی ایک ضخیم تاریخ سرکارِ نظام کے حکم سے مرتب کی جو طبع بھی ہوئی۔ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی مرحوم کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۲۳ھ میں حضرتِ غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر سابق تاجدارِ دکن نے جلیل کو استادی کا شرف بخشا اور جلیل القدر کے خطاب سے سرفراز فرمایا [illegible]

نئی زمانہ کی یادگار ہے۔ حضور پُر نور نواب میر عثمان علی خاں بہادر
آصف سابع خلد اللہ ملکہٗ جب سریر آرائے سلطنتِ دکن ہوئے تو انھوں نے بھی اپنی
استادی کا فخر و شرف بخشا اور نواب فصاحت جنگ بہادر کے خطاب سے عزت افزائی فرمائی
ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا ہے کہ بادشاہ دکن نے حضرت جلیل کو "امام الفن" کے خطاب
سے بھی نوازا ہے جو یقیناً اُن کے حسبِ مراتب ہے۔ شہزادگان اور دوسرے رؤسائے
دکن بھی انھیں سے مشورۂ سخن فرماتے ہیں۔

حضرت جلیل کا دوسرا دیوان **جانِ سخن** ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا اور تیسرا
دیوان **روحِ سخن** شائع ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ **سرتاجِ سخن** قصائد
قطعات اور تاریخوں کا مجموعہ **معراجِ سخن** نعتیہ کلام اور سلاموں وغیرہ کا مجموعہ
"تعلیم الصلوٰۃ" دینیات کا رسالہ "اُردو عروض" "گلِ صد برگ" (رباعیوں کا مجموعہ)
"سوانح حضرت امیر مینائی" اور "معیارِ اردو" (محاورات کا مجموعہ) بھی تیار ہے۔

تصانیف کی یہ خاصی طویل فہرست اس پر دلالت کرتی ہے کہ جلیل مانکپوری
"درباری مصروفیتوں" کے باوجود ذاتی ذوق و شوق کی بھی تکمیل فرماتے رہتے ہیں اور
انھیں زبان و ادب کی خدمت نیز طالبانِ فن کا بھی خیال ہے۔ حضرت جلیل کے
تلامذہ کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ گویا اُن کا فیض ایک مخصوص ماحول کا پابند ہوتے
ہوئے بھی جاری ہے۔

جلیل کی شاعری پر تنقید و تبصرہ کی چنداں ضرورت تو نہ تھی اس لئے کہ اس مضمون
کے ابتدائی حصّے سے واضح ہو سکتا ہے کہ اُن کا "تغزل" کس رنگ کا حامل ہوگا، پھر بھی
ایک اچٹتی سی نظر ڈال رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جلیل کی شاعری نے ایسے آسمان اور
ایسی زمین کے مابین اپنی آنکھیں کھولیں جہاں آہوں کے بجائے مسکراہٹیں اور
نالوں کے بجائے نغمے تھے۔ اتنا دیکھئے تو سرکار و دربار کے قصیدہ خواں، خود دہلی
کے جشنِ "بلبلِ ہزار داستان" کی جگہ ملازم ہوئے وہ بھی حیدر آباد اور رامپور
کی طرح سرا پیر کج کلاہوں کی صحبت، شہزادوں، وزیروں اور جاگیرداروں کے ساتھ
اور رہا ملنا۔ لہذا تغزل میں بھی معاملاتِ نشاطیہ اور خارجی رنگ قائم رہنا فطری امر
ہی تھا چنانچہ دمِ آخر تک بھی یہ رنگ باقی ہے۔ لیکن اس روایتی تغزل میں
بھی انھوں نے ایسی شانِ انفرادیت پیدا کی ہے کہ اُن کا کلام دُور سے پہچانا
جا سکتا ہے۔ دوسرے متقدمین کی طرح جہاں بھی آورد تخیل سے کام لیں تو یہ دوسری
بات ہے ورنہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضرت جلیل اپنے رنگ کے تنہا مالک ہیں
جدید تغزل کے سراہنے والوں کو بھی جس نے جلیل کے کلام کی سادگی۔ بے تکلفی۔

روانی اور حلاوت کا معترف پایا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شاعر مومن کی طرح دقت پسند
اور غالب کی طرح فکر و خیال کی وادیوں کا رہرو ہو۔ یا ہر شاعر اقبال۔ سیماب۔ فانی
اور حسرت وغیرہ کے رنگ میں کہنے لگے۔ تنقید کا یہ کس قدر غلط اصول ہے۔ میں
کہتا ہوں جو شاعر جس رنگ میں کہتا ہے اُس کے معائب و محاسن کا انھیں حدود
میں جائزہ لینا چاہئے۔

مولانا نیاز فتحپوری، حضرت مولانا حسرت موہانی کے متعلق فرماتے ہیں کہ
"حسرت کے یہاں نہ فلسفہ ہے نہ تصوف نہ معنی آفرینی کی کوشش ہے
نہ ماورائیات پیدا کرنے کی کاوش، لیکن یہ تمام باتیں اُس کے لہجۂ تغزل
پر قربان ہیں۔ حسرت کی غزل کا ترنم۔ نرم و لطیف اندازِ بیان۔
الفاظ کی شیرینی۔ فارسی ترکیبوں کی حلاوت اور متوازن خیالات
سے پیدا ہونے والی ہم آہنگی، یہ سب مل کر کچھ ایسی چیز بن جاتی
ہیں جو ہمیں اس وقت کسی اور کے کلام میں نہیں ملتیں۔ حسرت کا کلام
سادگی و پرکاری کے لحاظ سے اتنی حسین و دلکش چیز ہے کہ بجائے
سُننے کے اُسے کلیجے میں رکھ لینے کو جی چاہتا ہے۔"

اب مولانا نیاز کا ارشاد حضرت جلیل کے متعلق دیکھئے:۔
"اگر امیر زندہ ہوتے تو وہ خود ان (جلیل) کے حق میں غزل گوئی
سے دستبردار ہو جاتے۔ جناب جلیل کے یہاں سلاستِ بیان کا یہ عالم ہے
کہ گویا ایک نرم و سبک رو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہا چلا جا رہا
ہے۔ ان کا لکھنوی رنگِ سخن اس قدر نکھرا ہوا اور دلنشیں ہو کر تھوڑی
دیر کے لئے انسان اُس کے سامنے سب کچھ بھلا دینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔
جلیل کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ، نہ کوئی مضمون آفرینی
ہے۔ نہ فکر و خیال کی بلندی۔ لیکن اُن کے کلام کی سادگی، روانی
بے تکلفی اور خیالات کا سلجھا ہوا ہونا اُس گلاب کا سا حُسن ہے جس کی
قبا کو گل بوٹے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جلیل اس وقت اپنے
رنگ کے تنہا کہنے والے ہیں۔"

مندرجہ بالا اقتباسات کو دیکھنے کے بعد شاید کوئی بتائے کہ جلیل و حسرت کی شاعری
میں کیا فرق ہے؟ بقول مولانا نیاز فتحپوری (۱) دونوں کا رنگِ تغزل قدیم ہے۔
(۲) فلسفہ۔ تصوف اور معنی آفرینی دونوں کے یہاں نہیں (۳) دونوں کے یہاں نرم و
لطیف اندازِ بیان ہے اور ترنم بھی۔ اگر اُن الفاظ کو جو نیاز صاحب نے دونوں اساتذہ

کی تعریف میں استعمال ہوسکتے ہیں بہ امعانِ نظر دیکھا جائے تو نتیجہ ایک ہی مرتب ہوگا۔ بہر حال یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا حسرت موہانی کو تو "امام المتغزلین" کا خطاب دیا جائے اور وہ نیاز صاحب کی نظر میں اس دور کے سب سے بلند غزل گو سمجھے جائیں اور اُن کا کوئی ہمسر نہ ہو یا بقول اُنکے حسرت کی شاعری ایک ایسا آفتاب ہے جو بغیر کسی دلیل کے اپنی روشنی و حرارت ساری دُنیا سے تسلیم کرا لیتا ہے۔ لیکن حضرتِ جلیل کو فاضل ناقد نے آج تک صفِ اوّل کا غزل گو نہیں کہا حالانکہ تعریف و توصیف دونوں کی قریب قریب یکساں کی ہے۔ کاش ہندوستانی نقادوں کے اصول و نقد میں کوئی ترمیم ممکن ہو ـــــ

مولانا نیاز فتحپوری نے حضرتِ جلیل کے کلام کی جو خصوصیات بیان فرمائی ہیں انہیں کے مطابق ایک مختصر انتخاب بطور نمونہ کلام پیش کر رہا ہوں، میری ذاتی رائے ہے کہ اودھ کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہوئے بھی جلیل کے کلام میں دہلوی "رنگِ سخن" کی ایک نمایاں جھلک ہے۔ اُنکے کلام میں ابتذالِ خیالات میں اوچھا پن اور الفاظ میں سوقیت نہیں پائی جاتی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں ایک توازن اور مناسبت کے ساتھ کہتے ہیں۔ وہ فن اور متعلقاتِ فن کا بھی پوری طرح خیال رکھتے ہیں۔ البتہ اُن کا قدیم کلام کسی قدر پھیکا اور رعایانہ ہے۔

(انتخاب کلام)

نہ اشارہ۔ نہ کنایہ، نہ تبسم نہ کلام — پاس بیٹھے ہیں مگر دُور نظر آتے ہیں
اظہارِ حال پر بھی مجھے قدرت نہیں رہی — اُن کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی
اک شمع ہے مزار پہ وہ بھی بجھی ہوئی — کیا دیکھ کر بلاؤں نسیمِ سحر کو میں
او آنکھ چُرا کے جانے والے — ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں
چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے — نگہِ شوق پردہ در بھی ہے
مشیت جب یونہی ٹھہری تو میری کیا خطا ہے — حرم کو ڈھونڈتا ہوں سامنے بتخانہ آتا ہے
ابر اُٹھا تھا بڑے دعوے سے — دیکھ کر دیدۂ تر لوٹ گیا
ماہ و انجم پر نظر پڑنے لگی — اُن کو دیکھے اک زمانہ ہوگیا
تیرے جلووں کا میں عالم کیا کہوں — ایک عالم اور پیدا ہوگیا
تم نے آکر مزاج پوچھ لیا — اب طبیعت کہاں سنبھلتی ہے
منہ پھیر کے یوں چلی جوانی — یاد آگیا روٹھنا کسی کا
نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں — وہ آدمی ہیں مگر دیکھنے کی تاب نہیں
آتے آتے آئیگا اُن کو خیال — جاتے جاتے بے خیالی جائیگی
تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں — دو قدم کو بھی رسائی ہے

اعجاز صدیقی

(بقیہ تحقیق و تصحیح [illegible])

غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح
آجرام		جرم کی جمع۔ بمعنی علاج۔ چارہ
اِجلال		بزرگی۔ شکوہ۔ منزلت
اَجلال		جل کی جمع
اُفتادگی	اُفتَادگی	د۔ بالفتح
اِلتبَاس	اِلتبِاس	ت۔ بالکسر
اِلتفَات	اِلتفِات	" "
اِلتہَاب	اِلتہِاب	ت "
اِلماس	اَلماس	الف بالفتح
اَلمیہ	اَلمَیہ	ل۔ مجزوم نہیں ہے بلکہ اُس پر فتح ہے
اَلوف	اُلوف	ل۔ بالضم۔ الف کی جمع
اُلوہیت	الوہیّت	ی۔ مشدد ہے
اِمارت		امیری۔ حکومت۔ بالکسر
اَمارت		نشان۔ علامت۔ بالفتح
اَمالہ	اِمالہ	الف بالکسر
امتَزاج	اِمتِزاج	ت۔ بالکسر
اِشتال		بالکسر۔ ناک۔ کان کاٹنا
اَمثال		مثل کی جمع

(باقی آئندہ)

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ جو "شاعر" کا مقبول ترین صفحہ ہے اس مرتبہ شائع نہیں ہو رہا ہے۔ حضرت قبلہ علامہ سیماب مدظلہ ۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء سے سفر میں ہیں اور اس مہینہ کے آخر تک واپس تشریف لائینگے۔ - ادارہ

مشاعرۂ شاعر۔ مصرعِ طرح برائے ماہ جنوری ۱۹۴۴ء

"کہ یہ غمِ عشق اختیاری ہے"

اختیاری۔ بیقراری وغیرہ قوافی ہے ردیف [illegible] بھیجی جا سکتی ہیں۔ مشاعرہ کے لئے صرف مستقل خریدار غزلیں [illegible] ہے۔ مشاہیر اس قید سے آزاد ہیں۔ منیجر

آثارِ اتحاد

لاہور سے کیمبل پور جاتے ہوئے

حد سے باہر گرچہ تھا گرمی کی دوری کا غبار
کر رہی تھی ریل تو دینے بیاباں کو عبور
گھاٹیوں کے پیچ و خم مضبوط ٹیلوں کے کٹاؤ
سنگ پاروں پر دھوئیں کے زرد سائے کا بہاؤ
[illegible] دشتِ ناہموار کی حالت سقیم
جس طرح برہم طوفانوں کے آثارِ قدیم
زیست بلتے ہوئے لوہے کی نغماتِ بلند
جیسے جلتے تھے تپتے کوہساروں پر سمند
دھوپ سے ذرے گلابی کوندتی کرنوں میں دھار
جھاڑیوں کے زرد پتوں پر بگولوں کا غبار
یوں نظر آتے تھے برساتوں کے نقشِ رہگذر
جیسے دلدل کے فوارے رہ گئے ہوں سوکھ کر

(۲)

ایک مہاجن اور اس کے ساتھ اک اسکالر
اتفاقاً تھا اسی گاڑی میں میرا ہم سفر
توند جیسے ریچھ کا کھدر کے دامن میں مزار
فربہی میں گم بدن کی استخوانوں کا ابھار
سود خوارانہ تنفس میں وہ ترتیبِ زبوں
جس طرح سانپوں کی پھنکاریں سپیرن کے فسوں
پیاس کی شدت سے بچہ سر بسر تصویرِ یاس
خشک ہوتے ہونٹ جلتی کنپٹی چہرہ اداس
دمبدم معصوم کا اصرار پانی کے لئے
باپ کی تلقین بہم سخت جانی کے لئے
آ چلی غالب جو بچے کے تقاضہ پر بھی پیاس
میں نے آخر اپنے ہاتھ سے دیا بھر کر گلاس
باپ چلایا کہ یہ پانی مسلمانوں کا ہے
جو اچھوتوں سے بھی بدتر ہیں ان انسانوں کا ہے
تھر تھرا کر ہاتھ سے بچے کے پانی گر گیا
میرے خوابوں سے خیالِ ہمنوائی گر گیا

(۳)

الاماں والحذر یہ جذبۂ تفریق زاد
اس چمن میں کیسے سنکے گی نسیمِ اتحاد؟
یہ تو ایمانوں کی خامی ہے دلوں کا کھوٹ ہے
ناقصوں کی کیا خطا ہے کاملوں کا کھوٹ ہے
اہلِ مذہب ہیں پرستش کے ستوں بہ سکتے نہیں
آدمی پیدا تو ہو جاتے ہیں رہ سکتے نہیں
جذبۂ تحقیر و نفرت کا ہو جن میں التزام
میری نظروں میں وہ ارکانِ مذاہب ہیں حرام
تخم جو مہر و وفا کا بو نہیں سکتے کبھی
وہ مشکلات آسانی ہو نہیں سکتے کبھی
جو اٹھا دے زمانے میں محبت کے علم
وہ پیمبر ہی نہیں آلِ پیمبر کی قسم!
میں تو ہر مذہب کے بانی کو سمجھتا ہوں امیں
کیا استغفار اور مذہب؟ نہیں ہرگز نہیں!
جب سے [illegible] زر و زبوں
تب سیاست کے یہ منبر ہیں تقاضے کے زبوں
[illegible] لب سے بیت المال ہیں!
دل [illegible] پاپ کے پنڈال ہیں

[illegible] وقت کے تیور قیامت کی نشین
[illegible] بھوک ہے جہاں کی سرزمین

احسان دانش

ادب و احتساب

"آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک"

(از مولانا سیماب اکبر آبادی)

گمراہ کن ادبی رجحانات کے خلاف ایک مؤثر قدم اٹھانے کے لئے اُردو ضلع ادبی کانفرنس کا ایک جلسہ ۔ اگست ۱۹۴۳ء کو "انجمن اسلامیہ ہال بمبئی" میں منعقد ہوا ۔ جسکا افتتاح راجہ صاحب محمود آباد نے فرمایا اور صدارت حضرت ماہر القادری نے کی۔

اس جلسے میں ترقی پسند ادب پر حسب ذیل پانچ اعتراضات کئے گئے :-

(۱) مغرب زدہ ، گمراہ ترقی پسند ادب "اخلاق و کردار" کو برباد کر رہا ہے۔

(۲) زبان میں بیجا تصرفات کر کے ادب کو تباہ کر رہا ہے۔

(۳) فواحش کی اشاعت کر رہا ہے۔

(۴) بلینک ورس (آزاد نظم) کی سی ناموافق مزاج اُردو چیز کو جو بہت ہی گھٹیا اور مضحکہ خیز ہے رواج دے رہا ہے۔ اور

(۵) خدا و مذہب کی توہین کر کے لوگوں کی دل آزاری کا ارتکاب کر رہا ہے۔

ان پانچوں اعتراضات کے جواب حضرت جوش ملیح آبادی نے بڑے کر و فر اور انتہائی آزاد خیالی کے ساتھ رسالہ "ایشیا" پٹنہ کے اگست نمبر (موصولہ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۳ء) میں دیے ہیں۔

(۱) جوش صاحب نے پہلے اعتراض کا جو جواب دیا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ "اخلاق و کردار" محض ایک اضافی چیز ہے ...... زمانہ اپنی ملتِ جاریہ کے تحت بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار کے معاییر و قیمتات کو بھی ہمیشہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا اور جب جلیل کا تغیر وقت کی ایک مستقل رفتار اور محکم اعتقاد مزاج ہے تو عصر حاضر کے بدلتے ہوئے اخلاق و کردار سے دانشمندی یہی ہے کہ مصالحت کر لی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ "اخلاق و کردار" اضافی حوادث ہیں۔ جو ضرورت و تقاضائے وقت کے تحت دُنیا کے عظیم الکمال انسان بنی آدم کی اصلاح و فلاح کے لئے معین کرتے ہیں۔ اور ان میں تنسیخ و ترمیم کا امکان بھی ہمیشہ رہتا ہے۔ لیکن بعض اصلاحی و اضافی کردار اتنے مستحکم ہو کر متعین کئے جاتے ہیں کہ تمدن و معاشرت میں [illegible]

ان کا اثر و نفاذ عملی حالت قائم رہتا ہے۔ انسانی نفسیات میں طبعی اور غیر طبعی بہت سی ایسی باتیں ہیں جن سے اگر روکا نہ جائے تو انسان گمراہ اور رفتہ رفتہ ہلاک ہو سکتا ہے جس طرح اشیاء کی ماہیت ازلی اور ابدی ہے اور طور تخلیق سے اس وقت تک اپنے فطری اثرات کی حامل ہے بالکل اسی طرح بعض "اخلاق و کردار" بھی اپنے متعینہ مقام پر اٹل اور حقیقی ہیں۔ جو بہت سوچ سمجھ کر قائم کئے گئے ہیں۔ مثلاً فواحش ، جنکی فہرست بہت طویل ہے ، انسانی کردار کا حیا سوز اور شرمناک جزو ہیں۔ معلمین عالم نے ان کے ارتکاب سے انسان کو روکا ہے لیکن "نیا ادب" یا "ترقی پسند ادب" آج آزادی کے ساتھ اپنے منظومات میں ان کا ابلاغ اور ارتکاب کر رہا ہے۔

ترقی پسند شاعر ، ایک بیوہ کو دیکھتا ہے کہ وہ اپنی بجھی ہوئی شمع کو تسکین دینے کے لئے کسی مندر میں پوجا کو جا رہی ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ اسے دیوی تو میری آغوش میں آ جا میں تیری جوگی کو سہاگ سے بدل دونگا اور تیری پوجا کرونگا۔

وہ ایک جوان بھترانی کو دیکھتا ہے جو ناریل کی چھاؤں میں اپنا فرض منصبی پورا کرنے کے لئے سڑک پر جھاڑو دے رہی ہے تو بیقرار ہو کر اسکی جھاڑو چوم لیتا ہے اور اسے بے باکانہ خلوت کی دعوت دینے لگتا ہے۔

وہ ایک دوشیزہ بھکارن کو اپنے ایمان جوش کی ٹکر دلانے میں نہیں جھجکتا۔ وہ دنیا بھر کی جوان عورتوں سے کھیلنا اور محظوظ ہونا چاہتا ہے۔ ایک طوائف بھی اس کی نگاہ تاویل میں نیک اور معصوم عورت معلوم ہوتی ہے "نئے ادب" کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں پچاس فیصدی موضوعات ایسے ہی ملینگے جن پر نفس پرستی اور جنسی بھوک کا مظاہرہ ہوگا۔ تو کیا انسانی "اخلاق و کردار" کی یہ بد ترین تبدیلی نہیں ہے؟ اور کیا کسی دور میں کا انسانی غیرت ایسے جائز کہہ سکتی ہے کہ ایک بیوہ ، ایک بھترانی اور ایک بھکارن سے [illegible] گوارا کی جائے [illegible] بازاری عورت کو فرضی نادیدہ [illegible]
[illegible]

"تہذیب و ثقافت انسانی زندگی کے ہر شعبے کی مکمل عکاسی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن جب تک فحاشی کی حدود متعین نہیں کی جائیں گی تو حال اور مستقبل کا قاری اُسے کبھی معاف نہ کرے گا۔ کاش کوئی سخت تعزیری قانون بنے اور تہذیب و تمدن کو حق ہو گا کہ اُسے ہر قسم کی لغویت سے باز رکھے۔" (روز اول)

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اخلاقی فضائل و رذائل کے نظریات، تعینات اور مفاہیم اب وہ باقی نہیں رہے جو پہلے تھے، لیکن ابھی اُن پر شکست و ریخت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی ایسے منچلے اور گستاخ ہم میں پیدا نہیں ہوئے جو ان بھاری پردوں کو یک وقت اُٹھا دیں اور سوسائٹی کو اُس کے اصل روپ میں نمایاں کر دیں۔ ابھی گناہ ہوتے ہیں مگر چھپ چھپ کر، شراب پی جاتی ہے لیکن لیلیٰ شب کے ہاتھوں سے دھکے دیئے جاتے ہیں۔ جھوٹ بولا جاتا ہے لیکن سچ کے پردے میں۔ جوئے کھیلے جاتے ہیں۔ ڈاکے ڈالے جاتے ہیں لیکن ڈر ڈر کر۔ جس دن انسان میں اتنی آزادی اور اتنی جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ گناہ کا نام نیکی رکھ کر ہر قسم کے گناہ کو بے پردہ اور علی الاعلان اشتہار کرنے لگا، جس دن قانون، سماج اور مذہب تعلق کے اجزاء سے عاری نہ رہے اُس دن یقین مانئے کہ یہ اعتراضات خود بخود اٹھ جائیں گے لیکن جب تک ان الفاظ ثلاثہ کا دنیا میں وجود ہے، فواحش کی ترویج نہیں ہو سکتی ---- کبھی نہیں ہو سکتی۔

(۲) دوسرے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ "ہر زندہ اور رو بہ ترقی زبان میں آئے دن تصرفات اور اضافوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جس زبان میں اضافہ و تصرف رک جائے سمجھ لینا چاہیے اب اس کی حرکتِ قلب بند ہونے والی ہے۔"

میں اس جواب سے حرف بحرف متفق ہوں۔ صرف اتنی سی ترمیم کے ساتھ کہ جو تصرف یا اضافہ ہو وہ علمی اور لسانی حیثیت سے غلط نہ ہو۔ مثلاً اگر نیا ادب جوتے کی جمع "جوتیات" کہنے لگے تو کوئی لکھا پڑھا شخص اسے پسند نہ کرے گا۔ لیکن جو اضافے معقول ہوں اُن کے ماننے اور اُن کو رواج دینے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ تمام ترکیبیں، الفاظ اور محاورے جو آج ادبِ اُردو میں مروج و مستعمل ہیں کسی نہ کسی نے کبھی وضع کئے ہیں۔ وضعِ الفاظ و مصطلحات اور محاورات و تراکیب کی تخلیق زبان و ادب میں برابر جاری رہنی چاہیے اور جاری رہے گی۔

(۳) تیسرے اعتراض کا الزامی جواب جوش صاحب نے اپنے خاص لہجے میں ذرا کھل کر دیا ہے۔ اس لئے کہ انھیں فحاشی کی مثالیں شعرائے سلف کے کلام میں مل گئی ہیں جنکی موجودگی میں وہ نہایت جارحانہ انداز میں یوں فرماتے ہیں۔

"جس قوم کے شیخ سعدی، [illegible] فغانی اور ملا عبید زاکانی وغیرہ اور جس قوم کے ولی، سودا، میر، نظیر، غالب، انشا، داغ اور مفتی امیر احمد صاحب مینائی لکھنوی وغیرہ اور جس قوم کے جان صاحب، امانت، رنگین اور تقریباً تمام مثنوی گو شاعر فحش نگار گذرے ہیں، جنہوں نے ہمیشہ گندگی اچھالی ہے اور فحش کو فروغ دیا ہے ...... اور اس تمام گندگی و فحاشی کی بنا پر صدیوں ہمارے آباؤ اجداد سے خراجِ داد و امداد حاصل کیا ہے، آج ہم اُن اسلاف کے خلاف اور اُن شاعروں کے موجودہ مداح و وارث، نئے ادب کی فحاشی کا دکھڑا رونے بیٹھے ہیں!"

اس کے بعد حضرت جامی، مفتی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی، جان صاحب، حضرت جلال الدین رومی، میر تقی میر، سید انشاء اللہ خاں انشا اور حضرت داغ دہلوی کے کلام سے چند اشعار منتخب کئے ہیں جو بہ اعتبار الفاظ و مفہوم رکیک و عریاں ہیں۔

خدا جانے جوش صاحب نے سعدی، علی حزیں، عرفی، قاآنی اور زاکانی کے رکیک اشعار کیوں پیش نہیں کئے؟ اور اسی طرح ولی، سودا، نظیر، غالب، امانت اور رنگین کے ذکر کرنے کے بعد اُن کے فحش اشعار سے ناظرین "ایشیا" کو کیوں محروم رکھا؟ خیر اس میں اُن کی کوئی مصلحت ہو گی۔ مولانا جامی کو چھوڑ کر جو فارسی کے شاعر ہیں، اُردو شعرا کی طرف سے میں یہ بیان صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ہر شاعر کے ذخیرہ کلام میں کچھ اشعار پرائیویٹ یا ذاتی بھی ہوتے ہیں۔ میر اور امیر و داغ کا کلام شائع کرنے والے اس غلطی کے ذمہ دار ہیں۔ انھیں لازم تھا کہ اس قسم کے دس پانچ اشعار اُن کے مجموعہ کلام سے حذف کر دیتے تاکہ اُن پر سخیف اور رکاکت کا الزام عائد نہ ہوتا۔ لیکن ان شعرا کی بدقسمتی سے ان کا کلام ایسے جاہل پبلشروں کے ہاتھ پڑ گیا جن کا مقصد اُن کے کلام کی اشاعت سے محض جلبِ منفعت تھا اور انھوں نے رطب و یابس سب کچھ شائع کر دیا۔ اب بھی اگر کوئی ترقی یافتہ ادارہ میر و سودا، آتش و ناسخ، مصحفی و انشا اور امیر و داغ کا کلام بطور انتخاب شائع کر دے تو آئندہ نسلوں تک ان اعتراضات کے پہنچنے کا راستہ بند ہو سکتا ہے۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعرائے سلف کے کلام میں رکاکت و ابتذال انتہا پر بھی، اگرچہ وہ چند ہی سہی موجود ضرور ہیں۔ یہ کلام اُس دورِ عیش و نشاط کی یادگار باقی ہے، جب ہندوستان میں اسلامی سلطنت تھی اور مسلمان اپنے عروج و کمال سے غافل اور [illegible] سے [illegible] مشغول ہوں کی محفلیں شراب و [illegible] سے [illegible]

جو اس دَور میں تہذیب سے قریب تھے جس کی اس ماحول میں ضرورت تھی۔ چنانچہ عہد واجد علی شاہ تک جہاں تک لکھنؤ پر نظر جاتی ہے، اسی قسم کی شاعری کا رواج رہا۔ بعض شعراء نے اس میں زیادہ حصہ لیا اور بعض نے کم۔ مگر اثر زیادہ حصہ کا سب پر ہے۔ اس کے بعد جب مغل سلطنت کا زوال ہوا تو شعراء کے رجحان اور ان کے احساسات بھی بدل گئے اور وہ سرخوشی و سرمستی شاعری میں باقی نہ رہی جو ماضی کی روایتی خصوصیت تھی۔ چنانچہ آتش، ناسخ، داغ اور غالب و مومن کے کلام میں جو سنجیدگی، متانت اور اس کے بعد رجائیت پائی جاتی ہے یہ اسی دور زوال کا اثر و نتیجہ ہے۔

موجودہ دور بھی مسلمانوں کا انتشار و انحطاط ہے۔ لہٰذا اس دور میں بھی ادب ازمنہ کے تہذیب کی تقلید بلکہ قبر کی رجعت ہی ہے اور اس میں سب سے زیادہ ترقی پسند ادب ہے۔ ادب کا تعلق اگر زندگی سے ہے تو موجودہ انسانی زندگی سے ہونا چاہئے۔ نہ کہ گذشتہ سے۔ لہٰذا معترضین کا اعتراض ایک حد تک صحیح ہے کہ اگر ترقی پسند ادب جذبات اور شہوانیات کی تبلیغ و ترویج کا ترک کر کے زندگی کے دوسرے ضروری شعبوں اور زندگی کی دوسری دلکش ہوتی رنگوں کو بہ انداز موزوں پیش کرے تو پھر خیال میں بھی اس پر کوئی انگشت نمائی نہیں ہو سکتا۔

جوش صاحب کا یہ خیال کہ نئے ادب کی فحاشی دراصل فحاشی نہیں بلکہ انسان کے جنسی رجحانات کی تحلیل ہے جس سے ناواقفیت خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ ... ... اسلاف کی تباہ کن روش کے نتائج پیدا کرے کہ جنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بچوں کو اتنا ہی سمجھاؤ "آگاہی" کی روشنی میں رکھنا چاہئے کہ زندگی کے حقیقی میدان میں جب وہ جائیں تو ناقص واقفیت [illegible] جنسیاتی "علم و آگاہی" [illegible] کے نہایت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے یہ علم و آگہی [illegible] کے ماحول کے ذریعہ نوجوانوں کو حاصل [illegible] "اللہ رے یہ شوق" جیسی جذباتی نظموں [illegible] علم و آگہی میں [illegible] روشن خیال لوگوں نے اس علم و آگاہی کی آل انڈیا تبلیغ کی۔ [illegible] "علم و آگہی" کے عادی [illegible] ان سب کے بعد [illegible] رسائل و اخبارات [illegible] [illegible]

ہو جاتا ہے۔ اور اس نتیجے کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کی عمومی [illegible] اگر دو تین سو سال پہلے [illegible] تو اب [illegible] سال یا اس سے بھی کم ہے [illegible] لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی آزاد مزاج بنا دیا ہے۔ وہ جنسی لذتوں سے واقف ہو گئی ہیں۔ ان کے عمل نتائج دیکھنے ہوں تو کسی عدالت کا ریکارڈ ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو کیا خبر ہے کہ گنگا اور جمنا کی پوتر لہروں میں، ہگلی اور راوی کی کشادہ آغوش میں موسیٰ ندی اور بحر ہند کی چوٹی تک لپک لپک کر آنے والی پرجوش موجوں میں گومتی اور گوداوری کی خطرناک گہرائیوں میں کتنے ناقص اور نامکمل ناجائز بچے ہر سال دفن کئے جاتے ہیں! یہ اسی علم و آگہی کے پھل سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے ماں باپ پھر بھی کنوارے ہی رہتے ہیں۔

نظر بریں جنسیاتی علم و آگہی نوجوان عورتوں اور مردوں کے لئے درس تعمیر نہیں بلکہ وجہ تخریب ہے۔ اس لئے ایسی "علم و آگہی" کا سلسلہ جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہئے۔ مگر اب [illegible] ایسے ہیں کہ اگر [illegible] ادب اس سے دستکش بھی ہو جائے تو اس "علم و آگہی" کے اور سینکڑوں ذرائع مسدود نہیں ہو سکتے۔ تو پھر نئے ادب کے ہاتھ اس "خودکشی" میں معاون و ملوث کیوں ہوں؟

(۳) تیسرے اعتراض کا جواب حضرت جوش نے بہت معقول دیا ہے۔ "کہ ہر نئی چیز پہلا اٹھان کوئی اچھی ذہنی علامت نہیں ہے۔ ہر حقیقی شاعر اپنے ساتھ ایک نیا پیمانہ لاتا ہے۔ اگر آجکل کے نوجوان بھی ایک نئی راہ کی داغ بیل ڈال رہے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی ہمت افزائی کریں۔"

آگے چل کر وہ ایک دوسرا اور متفق علیہ نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ "اسکے علاوہ دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آجکل کا نوجوان مجبور اور سخت مجبور ہے۔ کہ وہ "بلینک ورس" ہی کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بنائے۔ یہ خطا نوجوان کی نہیں ان کے آباء اور اصول تعلیم کی ہے۔ کہ وہ اپنی مادری زبان کا علم نہیں رکھتا۔ اور فارسی سے قطعی بیگانہ ہوتا ہے جبکہ انگریزی زبان آ ہی نہیں سکتی۔ اس ناواقفیت اور عدم قدرت کے بعد ظاہر ہے کہ اس کے واسطے بلینک ورس کے سوا اور کوئی دوسری صنف سخن ہے ہی نہیں جسے وہ اختیار کرے۔"

جوش صاحب کے اس بیان کو اگر صحیح مان لیا جائے اور وہ یقیناً صحیح ہے تو ترقی پسند ادیبوں پر حسب ذیل الزامات چسپاں ہوتے ہیں۔

(۱) ان کا اصول تعلیم غلط ہے۔

(۲) یہ لوگ مادری زبان پر قدرت نہیں رکھتے۔

(۳) فارسی سے قطعاً بیگانہ ہوتے ہیں۔
(۴) ان کو اُردو زبان نہیں آتی۔
(۵) ان کی ناواقفیت اور عدمِ قدرت مسلّم ہے۔

جب ترقی پسند ادیبوں کی یہ تمام جہالتیں مسلّم ہیں تو پھر خدا جانے جوش صاحب نے انہیں "حقیقی شاعر" کا خطاب کس طرح دیدیا؟ بے شک اگر کوئی حقیقی شاعر اپنے ساتھ ایک "نیا پن" لاتا ہے تو ہمیں اسکی ہمت افزائی کرنی چاہئے۔ لیکن یہ جماعت جو حقیقی شاعری کی شاہراہ سے کوسوں دُور ہے (اس لئے کہ حقیقی شاعری بعض قواعد و ضوابط کی پابند ہے) ہمت افزائی اور پذیرائی کی مستحق کیونکر ہوسکتی ہے؟ بجائے اس کے کہ عوام اسکی ہمت افزائی کرکے اسے اور بھی گمراہ کریں کیا اس جماعت کو اس طرف متوجہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اپنے اصولِ تعلیم کو بدل ڈالے۔ مادری زبان پر قدرت حاصل کرے۔ دوسری زبانوں کے ساتھ فارسی زبان سے بھی مستفید ہو۔ اُردو زبان سیکھے اور ناواقفیت و عدمِ قدرت کو واقفیت اور قادر الکلامی میں تبدیل کردے؟ جس جماعت کا حامی و مؤیّد جوش سا قادر الکلام شاعر، اُردو، فارسی اور عربی کا ماہر ہو تعجب ہے کہ وہ جماعت ان الزامات کی مورد بنے۔ اور اپنی اصلاح نہ کرسکے! فتدبّروا

"بلینک ورس" (نظم آزاد) بھی آجکل دو قسم کی مروّج ہے۔ ایک وہ جس کے ٹکڑوں یا جملوں کا کوئی وزن ہوتا ہے اور ایک وہ جس کے ٹکڑوں میں کوئی وزن نہیں ہوتا۔ یا تمام ٹکڑے آپس میں ہم وزن نہیں ہوتے۔ پھر ان لوگوں کو مجبور کیوں نہ کردیا جائے کہ وہ بلینک ورس (نظم معرّیٰ) بغیر قوافی و ردیف کہیں لیکن کسی وزن میں کہیں؟

اگر آزاد نظم لکھنے والوں میں اتنی ہی تبدیل پیدا ہوسکے تو عوام انہیں کم از کم "شاعر" زبان ہی سے کہہ سکتے ہیں اور اُن کی نظم کو "نظم" تو کہا ہی جاسکتا ہے۔ لیکن بحالتِ موجودہ وہ شاعر ہیں اور نہ اُن کی نظم "نظم" ہے۔ بلکہ انہیں "متشاعر" اور اُن کی نظم کو "تک بندی" کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے وہ جوش صاحب کے "حقیقی شاعر" والے نظریئے پر پورے نہیں اُترتے اور شائستۂ ہمت افزائی و پذیرائی نظر نہیں آتے۔

(۵) پانچویں اعتراض کا جواب حضرت جوش نے بہت مفصّل اور اپنے پورے زورِ قلم کے ساتھ دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون لکھنے کی زحمت صرف اسی اعتراض پر قلم اٹھانے کے لئے اُٹھائی گئی ہے۔ یہ سلسلہ کہ "خدا و مذہب" کی توہین اور مسلمانوں کی دل آزاری کا الزام ادعائے [illegible] ہے۔ اور اُن کے لئے اپنی صفائی پیش کرنے کا اس سے بہتر [illegible] تھا۔ حضرت اس اعتراض کا جواب [illegible]

میں دیا گیا ہے۔

(الف) سب سے پہلے "نئے ادب" کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے جوش صاحب فرماتے ہیں کہ "وہ معروف خدا اور مذہب کے باب میں عام راستے سے بالکل مختلف راہ رکھتا ہے لیکن جہاں تک توہین اور دل آزاری کا تعلق ہے اُس سے اپنی شدید بے تعلقی و بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ البتّہ نیا ادب "خدا و مذہب" کے معروف خیال کے خلاف آواز ضرور بلند کرتا ہے ۔ .. .. اس آواز کی پشت پر [illegible] وہ شریف ترین اور پاکیزہ ترین جذبہ ہے جسے رشد و ہدایت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ...
اسکی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اُس کے زبان پر آتے ہی بلا ارادہ و نیّت خود بخود اُن حضرات کی دل آزاری ہوجاتی ہے جو تحقیق و تفکر کی جانب میلان نہیں رکھتے۔ آج سے تیرہ سو برس پیشتر جب ایک مافوق البشر انسان نے فاراں کی چوٹیوں پر لات و ہبل کے خلاف آوازۂ حق بلند کیا تھا اُس وقت اہلِ عرب کی بھی دل آزاری ہوتی تھی لیکن یہ کس کی مجال ہے جو کہہ سکے کہ فاراں کی اس آواز کے پس پردہ دل آزاری کی نیّت کارفرما تھی"؟

اس بیان سے جوش صاحب اور اُن کے رفقائے کار "ترقی پسند ادیبوں" کی ایک نئی ملحدانہ اور باغی ذہنیت سامنے آجاتی ہے۔ جوش صاحب تمام عالمِ اسلام کو تحقیق و تفکر سے عاری سمجھ کر اور "نئے ادب" کو "رشد و ہدایت" کا ڈپلومہ دے کر اُسے پیغمبرِ عرب کا [illegible] کی طرح نصب کردینا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح پیغمبرِ عرب نے "لات و ہبل" کے خلاف کوہِ فاراں پر آواز بلند کرکے عالمِ انسانی کو توحید و خدا پرستی کا پیغام دیا تھا۔ اسی طرح "نیا ادب" پیغمبرِ اسلام کے لائے ہوئے اور سکھائے ہوئے "خدا و مذہب" کے خلاف علمِ بغاوت بلند کررہا ہے۔ یعنی "نیا ادب" مسلمانوں کے "خدا و مذہب" کے خلاف ایک ایسا "دوسرا خدا" پیدا کرنا چاہتا ہے جو قطعاً غیر شخصی، عاقلانہ، حکیمانہ اور سائنٹیفک، نیز معیاری ہو، جو اُوہی وسعت، اُوہی حکمت، اُوہی معدلت و بصیرت اور اُوہی سنجیدگی کے معیار پر پورا اترے۔ کیونکہ اس دنیا کا خدا ہرگز اتنا چھوٹا نہیں ہوسکتا جتنا چھوٹا خدا، اہلِ مذاہب نے پیش کیا ہے"؟

یہ ہے "نئے ادب" کا حقیقی نصب العین؟ اور اس نصب العین تک پہنچنے کی کوشش شروع ہوئی ہے دریں فحاشی اور شہوانیات سے!! نتیجہ ظاہر ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ فحاشوں اور نفس پرستوں کا خدا کیا ہوگا؟ ———

"لات و ہبل" کے زوال کے بعد اب اگر کوئی اور اپنی ہستی کو خدا منوانے کا دعویدار باقی رہ گیا ہے تو وہ صرف "شیطان" ہے۔ غالباً یہ الوہیت کا تاج "نئے ادب" کے ہاتھوں اسی کے سر پر رکھا جائیگا۔ یونان کے اصنام پرست خبطیوں نے بھی سینکڑوں خدا بنالئے تھے اور ہندو مذہب میں بھی لاکھوں خدا اب تک موجود ہیں۔ اگر ہندوستان کے

یہ نام نہاد ترقی پسند شعرا بھی برتراشیدہ جات کا الگ الگ ایک خدا اور بنالیں۔ تو کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ بلکہ وہی رجعت کہلائے گی جسکا الزام انھیں ان کی کوششوں کے بار آور ہونے سے پہلے دیا جا رہا ہے:

حضرت جوش اور ترقی پسند شعرا کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کو تو حقیقی خدا آج سے تیرہ سو برس پہلے مل چکا ہے اور نہ صرف وہ اسکی الوہیت و ربوبیت کے قائل ہو چکے ہیں بلکہ کم و بیش ساری دنیا اسکے آگے سرِ عبودیت جھکا چکی ہے۔ اب اگر ترقی پسندوں کو کسی نئے خدا کی ضرورت ہے تو وہ مسلمانوں کے خدا کی بنائی ہوئی کائنات، زمین و آسمان سے نکل کر کسی دوسری فضا میں نئے خدا کو تلاش کریں۔ اس لئے کہ یہ زمین و آسمان تو مسلمانوں کے خدا کی ملکیت ہیں۔ "ولله ملك السموات والارض" مسلمانوں کے خدا کی زمین پر اور اسی کے خدا کے آسمان کے نیچے رہ کر وہ اپنا کوئی دوسرا خدا تلاش نہیں کر سکتے۔

فلیخرج من تحت سمائی ولیطلب ربّ سوائی۔ لیکن یہ ایک ایسا خواب ہے جو قیامت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ گمراہی قرآن کو سمجھ کر نہ پڑھنے کا نتیجہ ہے، ورنہ اسلام نے جس خدا کو دریافت کر لیا ہے۔ اسکی الوہیت و کبریائی کی موجودگی میں "لا الٰہ" کہنے والوں کو بھی "الا اللہ" ہی کہنا پڑتا ہے۔ نیا ادب جو بقول جوش صاحب کے فارسی زبان سے بھی ناآشنا ہے، عربی قرآن کے حقائق و بصائر کیا سمجھ سکتا ہے؟

(ب) جوش صاحب نے ایک اعتراض خدا کے ماننے والوں پر یہ کیا ہے کہ اگر وہ خدا کے ماننے والے ہیں اور زبان ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی خدا کو مانتے ہیں تو وہ آج بیمار، جاہل، نادار اور محکوم کیوں ہیں؟ یہ سوال اپنی جگہ قابلِ فکر و غور ضرور ہے۔ اس دور کا مسلمان واقعی مسلمان نہیں ہے وہ خدا کو زبان سے خدا کہتا ہے مگر دل سے نہیں مانتا۔ اسکی نمازیں، اسکے سجدے اور اسکی تمام عبادتیں ریاکارانہ، نمائشی اور وقتی ہیں۔ وہ اسی لئے بیمار، جاہل، نادار اور محکوم ہے۔ لیکن اس سے "خدا" کا عدم وجود کہاں ثابت ہوتا ہے؟ یہ تو بجائے خود وجودِ خدا کی ایک دلیل مبرہن ہے کہ اس کے قول و حکم کے مطابق جو قوم اپنے اعمال و افعال کی اصلاح نہیں کرتی وہ دنیا کی سرداری اور فلاح و بہبود کی مستحق نہیں رہتی۔ جب تک مسلمان، مسلمان رہے انھوں نے تمام کرۂ ارض پر حکومت کی۔ تمام دنیا پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ بادیہ نشینوں، فاقہ مستوں، اور کمبل پوشوں نے بڑے بڑے سلاطینِ عالم کے سر جھکا دیے۔ ان کے تخت و تاج چھین لئے اور ساری دنیا خدا کے نام پر فتح کر لی۔ ان لوگوں نے "ان کنتم مؤمنین" کی شرط کو سمجھ لیا تھا وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے خدا پر بھروسہ رکھتے تھے اسی لئے اپنی زندگی میں کامیاب ہوئے اور اسلام کے مستقبل کو بھی ایک ابدی زندگی دے گئے۔

مگر جب مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں انحطاط و زوال پیدا ہوگیا تو وہ وراثتِ ارض اللہ کی خلافت و سرداری سے محروم کر دیے گئے بلکہ اپنی ہی غلطیوں کے محکوم و غلام بنا دیے گئے اور آج بھی محکوم ہیں یہ سب کچھ صحیح لیکن مسلمان اسقدر پستی میں اتر جانے کے بعد بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اسکے سامنے خدا کو کوئی گالیاں دے، اسکے خدا کا بھری محفلوں میں استہزا کیا جائے اور اسکے خدا کا عوام کے سامنے مذاق اڑایا جائے۔ ایک بزرگ باپ کا ناخلف بیٹا اپنے باپ سے کتنا ہی باغی کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ بھی کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی اسکے منہ پر اسکے باپ کو گالیاں دے۔ پھر یہ تو بندے اور خدا کا معاملہ ہے۔ مسلمان ریاکار، بیمار، جاہل، نادار اور محکوم سہی "بے غیرت" نہیں ہے۔ احساسِ غیرت ابھی اس میں موجود ہے اور فیصدی ۱۰ مسلمان آج بھی ایسے مل سکتے ہیں جو خدا کو خدا اور اسکے احکام کو فرض مان کر سچے دل سے ان کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر ۹ کروڑ مسلمانوں میں ۲۔۳ کروڑ بھی سچے مسلمان ہندوستان میں موجود ہیں تو ان کے سامنے "نئے ادب" کا یہ علمِ بغاوت کتنے دن اپنا پھریرہ اڑا سکتا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے "خدا و مذہب" کا مضحکہ اڑانے والے ترقی پسند ادبا کیا خود کسی مذہب و خدا کے سچے پجاری اور بے ریا مسلمان ہیں؟ اگر نہیں تو پھر انھیں کیا حق ہے کہ وہ دوسروں کو الزام دیں؟ ایک حمام میں جب سب ننگے ہوں تو ایک کا دوسرے کو الزامِ برہنگی دینا حماقت اور پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟

(ج) جوش صاحب کی اس رائے سے بھی مجھے پورا اتفاق ہے کہ سائنس اور فلسفہ، جو مدت سے خدا کی تلاش میں ہے اور جسے اسوقت تک تحقیق کرنے سے یہ پتہ چلا ہے کہ "مادے کی پشت پر ایک توانائی بھی ہے، جو مادے پر تصرفات کرتی ہے" حقیقتاً کفر کے پردے میں اسلام ہی کا کام کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان بے دینوں سے مل کر کچھ کام کریں۔ ان کی تحقیقات میں مدد دیں۔ ان کی مشکلات میں آسانیاں پیدا کریں۔ ایک انجمنِ تحقیقات بنائیں۔ وجودِ خدا اور حقانیتِ مذہب کے ثابت کرنے کے لئے تصنیف و تالیف اور ترجمے شروع کر دیں اور ایک پرچہ "عقلی جوابات" کے نام سے جاری کر کے تمام منکرانِ خدا کو انتہائی نرمی و شفقت کے ساتھ دعوت دیں تو بہت ممکن ہے کہ دینداروں اور بے دینوں میں جو کشمکش آج پائی جاتی ہے باقی نہ رہے۔ اور خدا کے متعلق انسانی تصورات میں بہت کچھ افہام ہو کر دونوں میں کوئی سمجھوتے کی صورت نکل آئے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک فلسفہ ہے جس پر اب تک سینکڑوں بلکہ ہزاروں نہایت ہی ضخیم و جامع کتابیں بھی تصنیف یا تالیف ہو چکی ہیں اور "عقلی عبادات" بھی دیئے جا چکے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ کام منظم طریقہ پر انجام نہیں ہوا۔ ماتحت فلسفہ کے نام سے دو رسالے بھی جاری کئے گئے لیکن ان میں شاید ہی کبھی "خدا" پر کوئی بحث ہوتی ہو۔ میری رائے میں اگر ایک رسالہ "الٰہیات" کے نام سے جاری ہو اور ایک "معقولات" کے نام سے، جس میں الٰہیات کے متعلق سوالات کے جواب اور ان کے حل دیئے جائیں اور جسے آیات و روایات سے کوئی تعلق نہ ہو تو فلسفہ اور اسلام میں تصادم بھی دور ہو جائے گا بلکہ باہم توازن اور تطابق پیدا ہو سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی صاحب توفیق بزرگ اس تحریک کو عملی صورت میں لے آئیں۔ تاکہ اس عہد کے فلسفیوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کے نئے ادیبوں اور ترقی پسندوں کے لئے بھی ایک سبیلِ رشد و ہدایت پیدا ہو جائے اور وہ یہ شور و غوغا مچانے کے بجائے نتائج تحقیق کے انتظار میں خاموش ہو جائیں۔

(ن) اس اعتراض کا جواب کہ "نیا ادب" مذہب اور خدا کی توہین اور بندوں کی دل آزاری کرتا ہے۔ دوسرے پہلو سے یہ دیا گیا ہے کہ:-

"آغاز اسلام سے لے کر آج تک کے تقریباً نوے ۹۰ فیصدی مسلمان شعرائے ایمان و اسلام کی بہشتی اثلاثہ صوم و صلوٰۃ اور تمام دیگر ارکانِ اسلام پر ہمیشہ پھبتے اڑاتے رہے ہیں۔ مذہب سے اپنی بیگانگی اور کفر سے وابستگی کا ہمیشہ فخریہ اعلان کیا ہے۔ تمام گناہوں کی طرف بالعموم اور بادہ خواری کی طرف بالخصوص ہمیشہ دعوت دی ہے۔ بازاری عورتوں سے اپنے جنسی جذبات اور جسمانی تعلقات کو "عشق" کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ اور اس عشق کو مذہب و شریعت پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ شیخ کو دھتکارا اور برہمن کو پکارا ہے۔ خدا سے دشنام لڑا اور بتوں سے جوڑا ہے۔ زنار پہنا ہے۔ قشقے لگائے ہیں۔ بت پرستی کی ہے۔ ناقوس بجایا ہے۔ بھبوت ملی ہے۔ ریاکار اور مخلص دونوں قبیل کے اربابِ تقویٰ کو گالیاں دی ہیں اور ان کی داڑھیاں نوچی ہیں ـــــ اور اس سے بھی آگے گئے ہیں۔ فرشتوں کو ذلیل کیا ہے۔ اپنی داشتاؤں اور اپنے لونڈوں کے بالمقابل جلیل القدر پیغمبروں کی توہین کی ہے ـــــ اور صرف یہیں تک نہیں رکے ہیں۔ وہ اور بھی آگے بڑھے ہیں اور انھوں نے خدا کو بھی ہدفِ لعن و طعن بنا کر دم لیا ہے۔"

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فارسی اور اردو شاعری کا عام رجحان ہے اور بلا استثنا کسی شاعر کا کلام ان لغویات اور کفریات سے مبرا نہیں ہے اور اردو میں یہ سب فارسی شاعری سے منتقل ہوئی ہے۔ خیام نیشاپوری کی رباعیات اور حافظ شیرازی کی غزلیں بالخصوص الحاد، تضحیکِ الٰہیات اور شراب نوشی کے کھلے ہوئے اجازت نامے ہیں۔ اردو شاعری نے انھیں کے سہارے "خدا و مذہب" کے خلاف اور شراب و شاہد کے موافق آوازیں بلند کی ہیں۔

اس کے بعد اپنے دعوے کے ثبوت میں میر تقی میر کے بیس اشعار، غالب کے ۱۰، ڈاکٹر اقبال کے ۱۵ اور جگر مرادآبادی کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ ان تمام اشعار میں وہی موضوعات نظم ہوئے ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان اشعار کی توجیہ و تعبیر سے واضح کیا گیا ہے کہ میر تقی میر، غالب اور اقبال نے بھی اسلام کا استہزا کیا ہے اور خدا کا مذاق اڑایا ہے۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد جوش صاحب کہتے ہیں کہ "اس انجمن اصلاح ادب بمبئی کے قیام، اس ساتویں اگست کے جلسے کے انعقاد اور اس جلسے کی تجویزوں کی منظوری سے صاف طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس انجمن کے بانیوں، اس جلسے کے مقرروں، ان تجویزوں کے محرکوں اور ان تجاویز کو بہ اتفاق آرا منظور کرنے والے حاضرینِ جلسہ کو اس سانحۂ عظیم کا زندگی میں پہلی بار دفعتاً پتہ چلا ہے کہ ہمارا ادب فحاش اور ناخدا شناس ہے۔"

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

"ہاں تو وہ حضرات جو صدیوں سے اس فحاش، گستاخ اور دل آزار مشرقی لٹریچر کو صرف برداشت ہی نہیں کرتے چلے آئے ہیں بلکہ سر آنکھوں پر جگہ دیتے رہے ہیں اور اگست ۴۳ء کی چھٹی تاریخ تک اس لٹریچر کو دعوتوں (؟) اور مشاعروں میں سنتے اور سر دھنتے رہے ہیں ساتویں اگست کو ترقی پسند ادب کی مغرب زدہ گمراہیوں پر ماتم کرتے نظر آ رہے ہیں .... مشرقی علوم کے فضلا اور مغربی علوم کے ماہرین کو زندگی میں بالکل پہلی بار اس بات کا یکایک پتہ مل گیا کہ ہمارا ادب گمراہ ہو گیا ہے۔"

اس کی خوبی بیان کے متعلق میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ جوش صاحب نے لاعلمی و بے خبری سے کام لیا ہے لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ انھوں نے حقائق سے دانستہ یا نادانستہ چشم پوشی ضرور کی ہے۔

یوں تو اُردو ادب اور اُس کے متعلقات پر احتساب ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور اُردو شاعری کے گندہ ماحول اور مصنوعی و فرضی جذبات کی نقادوں نے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ لیکن بعض احتجاج، مخالفتیں اور تردیدیں ایسی بھی ہیں جنکو تاریخی حیثیت دی جاسکتی ہے اور جنکی موجودگی میں ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ کسی انجمن کو بالکل پہلی بار اور یکایک اس ادبی فحاشی کے احتساب کا احساس ہوا ہے۔

مثلاً مولانا حالی پانی پتی نے ۱۲۹۶ھ میں (آج سے ۶۶ سال یا قریب قریب ایک ثلث صدی پہلے) "مدوجزرِ اسلام" کے نام سے جو مسدس لکھا ہے۔ اُس کے یہ اشعار اُردو شاعری کی رکاکت، ابتذال، گندگی و پراگندگی کے خلاف چند احتسابی تازیانے ہیں۔ جو شعرا کے ضمیر پر ثلث صدی سے برابر پڑ رہے ہیں۔

یہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جسکا قاضی خدا ہے — مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائینگے سارے
جہنم کو بھر دینگے شاعر ہمارے

سخن جو ہے یاں آج حصہ ہمارا — نہیں قوم کو ظاہرا جس سے چارا
ہر اک کذب و بہتاں ہے جسمیں گوارا — مجسم ہوا اسکا اگر جھوٹ سارا
بنے ہند میں اُس سے اک اور ہمالہ
ہمالہ سے ہو جس کی چوٹی دوبالا

جو سقے نہ ہوں جی سے جائیں گذر سب — ہو میلا جہاں، گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب — جو مٹ جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

گزشتہ ۶۶ سال میں مولانا حالی مرحوم کے ان اصلاحی خیالات کی ترجمانی و ہمنوائی وقتاً فوقتاً برابر ہوتی رہی ہے۔ مولانا حالی کے بعد ۲۲ مئی ۱۹۳۲ء کو بمقام [illegible] ضلع [illegible] کے ایک "آل انڈیا مشاعرے" میں جوش نے ایک خطبۂ صدارت پڑھا اور اُس میں ایک طویل تمہید و توضیح کے بعد اعلان کیا کہ میں آج سے شراب اور اس کے متعلقات، اور زاہد و واعظ پر تبرا بازی کے موضوع کو اُردو شاعری سے ہمیشہ کے لئے حذف کرتا ہوں۔"

اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری کثیر جماعت کے ہزاروں افراد نے (جو تمام ہندوستان اور ماورائے ہندوستان، عراق اور بغداد تک پھیلے ہوئے ہیں) فوراً ارادہ کر لیا کہ وہ آئندہ شراب، ساقی، اسکے متعلقات اور زاہد و واعظ کی توہین و تضحیک کو موضوعِ کلام نہ بنائینگے ——— چنانچہ آگرہ اسکول کی گذشتہ پنج سالہ تاریخ میں اُس کے تبعین اور پیروکاروں کا کوئی ایک شعر بھی ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا جس میں شراب پینے پلانے کا خالص مفہوم موجود ہو۔

جوش صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اسلام فنونِ لطیفہ کے فروغ کی اجازت نہیں دیتا"۔ یہ اسلام پر کس قدر غلط، کمزور، بے بنیاد، اور غیر معقول الزام ہے ہمیں دوسرے فنونِ لطیفہ سے اسوقت بحث نہیں، لیکن جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے، ہم علی وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ جناب رسولِ کریمؐ اور صحابہؓ نے اخلاقی و اصلاحی شاعری کے لئے کبھی منع نہیں فرمایا۔ عہدِ نبویؐ میں شعر کا معیار "الشعر کلامٌ حسنہ حسنٌ وقبیحہ قبیحٌ" تھا۔ جو شعرا حقیقی شاعر تھے وہ "تلامیذ الرحمٰن" کہلاتے تھے اور شاعری حکمت اور سحرِ حلال سمجھی جاتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ عہدِ نبویؐ میں دوسرے فنون کی تعلیم و ترویج پر زیادہ زور نہیں دیا گیا اور تعلیم و تدریس کا دائرہ صرف قرآن مجید تک محدود رہا۔ لیکن آپ کے بعد صحابہؓ نے دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرف بھی توجہ کی، اور جو مکاتب قائم ہو چکے تھے اُن میں ادب، لغت، اور شعر کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ خود حضرت عمر فاروق رضؓ فرماتے تھے "علّموا اولادکم الشعر" (تم اپنی اولاد کو شعر کی تعلیم دو) حضرت عبداللہؓ بن عباس کی درسگاہ میں قرآن کے الفاظ کی تشریح، اسرارِ حکم، اور مسائل و احکام کے علاوہ تاریخ و شعر اور قصص و ایامِ عرب کا درس بھی ہوتا تھا اور مرد تو مرد عورتیں بھی مروجہ فنونِ عرب میں مہارت و بصیرت رکھتی تھیں، چنانچہ حضرت عائشہؓ قرآن، حدیث، فقہ، اسرارِ دین و تصوف کے علاوہ طب، انساب، ایامِ عرب اور شعر و شاعری میں بھی بڑی دستگاہ رکھتی تھیں۔

صحابہ میں متعدد اصحاب ایسے تھے جو خود صاحب دیوان شاعر تھے اور شعر فہمی کا ذوق تو کل، مرد اور عورتوں میں یکساں پایا جاتا تھا [illegible] کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام شعر و شاعری کا کیسا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔

لہ [illegible] صفحہ [illegible]

عہدِ صحابہ کے بعد بھی خاندانِ بنو امیہ کے اکثر خلفا نے فنونِ لطیفہ کی عموماً اور فنِ شاعری کی خصوصاً خدمت و عزت کی۔ عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز، مروان بن الحکم، ہشام بن عبدالملک کے عہد میں بھی شعر و شعرا کی قدر افزائی بدرجۂ اتم ہوتی رہی۔ خلفائے بنو عباس نے بھی اس فن کو بحدِ کمال نوازا۔ غرضکہ عہدِ نبوی سے لے کر اسلام کے عہدِ وسطیٰ اور عہدِ آخر تک فنونِ لطیفہ کی ترویج، تحفظ اور ترقی میں برابر کوشش ہوتی رہی۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے فنونِ لطیفہ پر جو توجہ بطورِ خاص مبذول کی اس سے تاریخِ ہند کا ہر طالبِ علم تک واقف ہے۔ تاریخی حقائق کی موجودگی میں یہ کہنا کہ "اسلام فنونِ لطیفہ کے فروغ کی اجازت نہیں دیتا" کسقدر غلط اور جھوٹ ہے۔

قرآن نے سورۂ شعرا میں شاعروں کی جو مذمت کی ہے وہ ایک استثنا کے ساتھ ہے یہ استثنا ہی اس کا محرک ہوا کہ عہدِ نبوی میں کم اور عہدِ صحابہ میں پوری قوت کے ساتھ ایسے شعرا کی ہمت افزائی کی گئی جن کے یہاں مضبوط ایمان اور اعمالِ صالح تھے جو خدا کا ذکر کرتے تھے۔ اور مظلوموں کی مدد کرتے تھے۔ کیا ایمان کی پختگی، اعمال کی درستی، خدا کا ذکر اور بیکسوں، غریبوں، مزدوروں، غلاموں، بیماروں، اسیروں، یتیموں، مسکینوں کی اعانت آج بھی تمدن و معاشرت کے مکارمِ اخلاق میں داخل نہیں ہے؟ اور کیا اردو شاعری، خصوصاً وہ احساس جو بیسویں صدی عیسوی یا چودھویں صدی ہجری میں اشتراکی شاعری کا خالق ہوا، اسی استثنا سے اثر گیر نہیں ہے؟ حضرت جوش خود اپنے کلام کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اُن کی بیشتر نظمیں صلاحِ اعمال اور مظلوموں کی حمایت کے عنوان پر اسی اخلاقی معیار پر پوری اترتی ہیں یا نہیں؟ اُن کی ایسی ہی نظموں نے انھیں "شاعرِ انقلاب" بنایا ہے اسکے علاوہ بھی اگر وہ اپنی نگاہ کو وسعت دیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ موجودہ دور میں متعدد جوان اور معمّر شعرا ایسی ہی اخلاقی نظموں کی وجہ سے مشہور و مقبول ہو رہے ہیں اور یہی وہ شاعری ہے جو قرآن کے استثنا کے تحت جائز و محمود ہے اور جسکی ترقی و ترویج عہدِ سلف سے آج تک ہو رہی ہے۔

آگے چلکر جوش صاحب نے ایک سوال کیا ہے کہ "آغازِ اسلام سے لے کر کم سے کم چھٹی اگست ۱۹۴۳ء تک کسی ایک مسلمان شاعر نے بھی اسلامی حدود کے اندر رہ کر شاعری کی ہے؟" پھر خود ہی اس سوال کا جواب بلا خوفِ ابطال دیتے ہیں کہ "کسی ایک مسلمان شاعر نے کبھی ایسا نہیں کیا ہے۔"

یا تو یہ جوش صاحب کا تجاہلِ عارفانہ ہے یا شاید انھیں علم ہی نہیں کہ عہدِ نبوی کے مسلمان شعرا حضرت حسان بن ثابت، حضرت حمزہ بن عبدالمطلب، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عمرؓ بن خطاب، حضرت کعبؓ بن مالک، سید الشعرا حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی، حضرت عامر بن اکوع، حضرت کعبؓ بن زہیر وغیرہ نے کبھی کوئی شعر ایسا نہیں کہا جو اسلامی حدود سے باہر ہو۔ یعمری نے بعض شعرائے اسلام کے اسما و کلام کو ایک رسالہ میں جمع کیا ہے جسکی تعداد قریباً دو سو ہے۔ ان میں صحابہ اور صحابیاتؓ دونوں تھے۔ حضرت زین العابدینؓ اور حضرت غوث الاعظمؒ کے تمام اشعار بھی ایسے ہی ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ ہر دور کے فارسی اور اردو شعرا کی ایک طویل فہرست ایسی تیار کی جا سکتی ہے جن کے کلام میں اسلامیات کی حدیں قائم رہتی ہیں لیکن یہ ایک مستقل مضمون کا موضوع ہے۔ جسکی یہاں گنجائش نہیں۔

"آگرہ اسکول" کی تاسیس بھی انھیں خیالات پر کی گئی ہے کہ اردو شاعری سے اگر مبالغہ اور غلو کو حذف نہ کیا جا سکے تو کم از کم "فواحش و تجاوز" سے ضرور گریز کیا جائے اور موضوعاتِ شاعری کم از کم اتنے مہذب اور شائستہ ہوں کہ ہر غزل اور ہر نظم بہو بیٹیوں، ماں بہنوں، اور باپ یا بھائی کے سامنے بغیر کسی جھجک کے سنائی جا سکے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ "آگرہ اسکول" کی شاعری قطعی "اسلامیات" تک محدود ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اسمیں "تجاوز" کو دخل نہیں ہے۔

غالب اور اقبال کے یہاں بے شک تجاوز ہے اور یہ لوگ "و اذا مرّوا باللغو مرّوا کراما" کی ذیل میں محسوب ہو سکتے ہیں لیکن اگر ان کے کلام سے ایسے چند اشعار نکال دیے جائیں جن میں "خدا و مذہب" کے ساتھ استہزا کیا گیا ہے تو سینکڑوں اشعار ایسے باقی رہ جاتے ہیں، جو درسِ اصلاح اور پیامِ تہذیب کے حامل ہیں۔ غالب اور اقبال پر مسلمانوں کے انحطاط و زوال کے احساس سے یگونہ قنوطیت اور یاسیت طاری تھی۔ اس لئے "کمر اذا مسّ الانسانُ طال لسانہ" کے مطابق اُن کے کلام میں کہیں کہیں خدا اور مذہب کے "بغاوت" کا جذبہ پیدا ہو گیا اور خصوصاً "خدا" کے خلاف اُن کی زبانیں دراز ہو گئیں۔ غالب کے متعلق سب جانتے ہیں کہ اُن کی زندگی مغموم و مغلوب، اور یاس و پراندیشہ گزری ایسی حالت میں انسان ہر اس چیز سے بددل اور بدگمان ہو جاتا ہے جس سے باوجودِ توقع و یقین اسکی مقصد براری نہیں ہوتی۔ رہے اقبال، تو چونکہ وہ خود منادِ خودی تھے۔ اس لئے اپنی خودی میں کہیں کہیں خدا سے بھی الجھ گئے۔ لیکن ان شعرا کے جستہ جستہ اشعار سے ان کے تمام کلام پر "تجاوز" کا حکم لگا دینا میرے خیال میں زیادتی ہے۔

آخر میں حضرت جوش اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ صرف دو ہی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔

(۱) یا تو شاعروں کو اُن اقوال و افعال میں حسبِ سابق آزاد چھوڑ دیا جائے۔

(۲) یا پھر ایک زبردست اور آفاق گیر شعبۂ احتساب قائم کر کے مسلمان شاعروں کو

قطعی مجبور کر دیا جائے کہ وہ اسلامی حدود سے یک سرِ مو بھی تجاوز نہ کریں اور جو شاعر تجاوز کرے اُسے برادری سے خارج کر دیا جائے۔ اور آغازِ اسلام سے لیکر آجتک کے تمام مسلمان شعرا کے دواوین، کلیات اور تذکرے نذرِ آتش کر کے دنیا کو گندگی اور پریشانیٔ اسلام کو اُن کے داغ سے پاک کر دیا جائے۔

میں عرض کرونگا کہ یہ دونوں فیصلے حالتِ غضب میں ارتجالاً صادر فرمائے گئے ہیں اور دونوں ناممکن العمل ہیں۔ شعرا پر ہمیشہ احتساب ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ فنِ تنقید افلاطون کے زمانے سے دنیا میں موجود ہے۔ اور وقتی تبدیلیوں کے ساتھ ہمیشہ باقی رہے گا تنقید شعرا کے محاسن و معائب کلام کو اجاگر کرتی رہے گی شاعری اسلامی حدود میں محدود بھی نہیں کی جاسکتی۔ اسلام خود ایک عالمگیر اور غیر محدود شعبہ ہے۔ اور اسی طرح شاعری بھی۔ دو غیر محدود ایک دوسرے کی حدوں میں محدود نہیں ہوسکتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اسلام کے شعبۂ اخلاقیات کی طرف مسلمان شعرا کو زیادہ سے زیادہ متوجہ کیا جاتا رہے۔ تو یہ آجکل ہو رہا ہے۔ جوشؔ صاحب خود واقف ہیں کہ بعض مقامات پر (مثلاً علیگڈھ اور امرتسر کے دو مشاعروں میں) مسلمانوں کو ان کفریات اور لغویات کے سننے کی تاب نہیں رہی تھی جو اُن کے کانوں میں ٹھونسی جا رہی تھیں اور بہت سے خدا شناس مسلمان بطورِ احتجاج اٹھ کر چلے گئے تھے۔ کیا یہ احتجاج کسی کو برادری سے خارج کر دینے کے برابر نہیں ہے؟ ان مجلسوں کے علاوہ جہاں جہاں "خدا اور مذہب" کے خلاف شاعرانہ مظاہرے کئے گئے، وہاں بھی جوشؔ صاحب نے دیکھا ہوگا کہ لوگوں نے قہقہوں، سیٹیوں اور شور و غل کے تمام اسی قسم کے اشعار کی داد دی۔ سنجیدگی کے ساتھ کسی نے نہیں سُنا۔ قہقہوں اور سیٹیوں کو اگر شاعر حقیقی دادِ کلام سمجھ لے تو یہ اور بات ہے ورنہ ان باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سامعین شاعر کا مضحکہ اُڑا رہے ہیں اور شور و غل مچا کر اپنی تفریح و ہنر از کا ثبوت دے رہی ہیں۔

شعرا کے دواوین اور کلیات کو نذرِ آتش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اُن پر سخت نظرِ انتخاب ڈالکر از سرِ نو شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ترقی پسند ادبا اور شعرا جو آجکل "خدا و مذہب" کے خلاف علم بغاوت بلند کئے ہوئے ہیں تنقید کی مسلسل ضربِ احتساب سے گھبرا کر اور اپنی لاحاصل کوششوں سے تھک کر ایک دن "خدا اور مذہب" کے سامنے اپنے علم کے ساتھ اپنے سروں کو بھی نگوں کر دینگے۔ اور وہ دن اُردو شاعری کے لئے "فتحِ اکبر" کا دن ہوگا۔

آنکہ فکرش گرہ از کارِ جہاں بکشاید
گو دریں نکتہ بفرما نظری بہتر ازیں

۲۲ ستمبر ۴۳ء

سیماب اکبرآبادی

کمالاتِ کمالی

آج رو بہ تسکیں ہے صدمۂ نہاں اپنا
کام کر گئی شاید رات کی فغاں اپنا

بے نیازِ منزل ہو، قافلہ گزرنے دے
مٹ کے گردِ رہ بن جا چھوڑ کچھ نشاں اپنا

کوچۂ وفا میں کل اُن کے نقشِ پا نکلے
داغِ سجدہ سمجھا تھا میں جہاں جہاں اپنا

جذبۂ طرب! کم ہے سازِ گرمیٔ محفل؟
کچھ کسی کی دلسوزی کچھ گدازِ جاں اپنا

موجبِ جاہت ہو خواہ وجہِ رسوائی
سن رہا ہوں افسانہ میں جہاں تہاں اپنا

باریاب ہو کر بھی کسمپرسی کیا کرتا
رکھ لیا بھرم، تو نے سعیٔ رائیگاں اپنا

شرمِ نامرادی پر خود تڑپ گئی بخشش
دیدنی تھا خمیازہ وقتِ امتحاں اپنا

ریت کا گھروندہ کیا خلد بن نہ جائیگا
کھیل ابھی بگاڑے تو مرگِ ناگہاں اپنا

کہہ گئے کمالی ہم کچھ کہے سے ناطق کے
لطف اُسی کو آئیگا ہو جو ہم زباں اپنا

کمالی گلاؤٹھوی (بمبئی)

حیرانیاں

رنگِ جہاں بطرزِ دگر دیکھتا ہوں میں
یہ انقلابِ شام و سحر دیکھتا ہوں میں

جب انتہاءِ سوزِ جگر دیکھتا ہوں میں
دل تھام کر کسی کی نظر دیکھتا ہوں میں

جلووں کو اب محیطِ نظر دیکھتا ہوں میں
وہ میرے سامنے ہیں جدھر دیکھتا ہوں میں

اشکوں کو آج تک نہ ہوئی آبرو نصیب
ترسا کے سوئے دامنِ تر دیکھتا ہوں میں

ہنگامِ انتظار نگاہوں کا ہے یہ حال
دیوانہ وار جانبِ در دیکھتا ہوں میں

اب ترکشِ ستم میں کوئی تیر ہی نہیں
گھبرا کے چاکِ قلب و جگر دیکھتا ہوں میں

اب دل ہے کس چمن کی ہوا سے اثر پذیر
زخموں کو غیرتِ گلِ تر دیکھتا ہوں میں

اک جلوۂ لطیف ہے نظروں کے سامنے
حسنِ بہارِ شام و سحر دیکھتا ہوں میں

ہر سو تجلیوں کی تڑپتی ہیں بجلیاں
اے حیرتِ نگاہ کدھر دیکھتا ہوں میں

یعنی جو تھیں عروج و ترقی کے چرخ پر
ان ہستیوں کو خاک بسر دیکھتا ہوں میں

ناکامیاں امید سے اے دل بدل گئیں
ظلمت میں اب تو نورِ سحر دیکھتا ہوں میں

دل شاہجہانپوری

بھول گئے

یہ سرخوشی تھی کہ سود و زیاں کو بھول گئے
ملی خوشی تو غمِ جاوداں کو بھول گئے

چمن سے کیم لطفِ غمِ باغباں کو بھول گئے
قفس میں آ کے بہار و خزاں کو بھول گئے

کچھ ایسے لوگ بھی تو رہ نوردِ منزل تھے
جو چل سکے چار قدم کارواں کو بھول گئے

یہاں پہنچ کے وہی ربط و ضبطِ فطرت تھا
گماں یہ تھا کہ ہم اپنے مکاں کو بھول گئے

قفس کے نام سے ڈرتے تھے ہم گلستاں میں
یہاں وہ چین ملا آشیاں کو بھول گئے

ہمارا دل بھی تو اک رازدانِ فطرت تھا
کمال تم نے کیا رازداں کو بھول گئے

ضیا بنے ہی تھے سجدے ابھی جبیں کیلئے
کہ بندگانِ صنم آستاں کو بھول گئے

ضیا میرٹھی

اندھیرے میں؟

"زہرہ! جلدی سے پان تو بنادو" شوکت نے اپنی بہن سے گھبراہٹ کے لہجے میں کہا۔

زہرہ نے ادھ سلی قمیص کو ایک طرف رکھ کر پاندان اپنی طرف گھسیٹا۔

"کیا سو سو کر رہی ہو جلدی کرو میرے ایک دوست باہر بیٹھے ہیں" شوکت نے دوبارہ تیوریاں چڑھا کر کہا۔

"یا اللہ بھائی جان! آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے ہیں بنا تو رہی ہوں" زہرہ نے ڈلی کترتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔

شوکت یہ کہتا ہوا باہر کے کمرے میں چلا گیا کہ دروازہ کھٹکھٹا دینا میں آکر پان لیجاؤنگا۔

زہرہ نے جلدی جلدی پان کی گلوریاں بنائیں اور تھالی میں سجا کر مردانے کمرے کا دروازہ تھپتھپایا۔ شوکت پان لیکر باہر چلا گیا۔

زہرہ کے دل میں ایک خواہش نے کروٹ لی کہ دیکھوں تو سہی کون آیا ہے اور اس نے چپکے سے درز سے جھانکا۔ سامنے کی کرسی پر ایک سانولا سا نوجوان بیٹھا تھا۔ زہرہ دیکھکر ہٹنے ہی والی تھی کہ آواز آئی،

شوکت صاحب! میں آپ کے اس خیال کو قابلِ تردید سمجھتا ہوں کہ عورت کا دائرہ عمل گھر کی چاردیواریوں تک محدود ہونا چاہیے۔

زہرہ نے اس قسم کے جملے آج تک کسی کی زبان سے نہ سُنے تھے۔ اس کی زندگی تو ایک ایسے ماحول میں بسر ہو رہی تھی جہاں عورت کی وقعت لونڈی سے زیادہ نہ تھی۔

اُسکے دل میں ایک نئی اُمنگ پیدا ہوئی اور اُس نے دوبارہ اپنی آنکھ درز سے لگا دی۔ اس بار اُس کی نظریں نوجوان پر اتنہائی دلچسپی سے پڑ رہی تھیں۔ اب شوکت بول رہا تھا۔

"تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی عورت بھی یورپ کی عورت کی طرح آزاد ہو کر [illegible] کرے؟

[illegible] لیکن [illegible] تھی۔

نوجوان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ وہ کہنے لگا۔

"اگر آپ ہندوستان اور یورپ کی خانگی زندگی کا موازنہ ہی کرنے بیٹھے ہیں تو کیا میں یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ ہندوستان میں کتنے ایسے گھرانے ہیں جن کی خانگی زندگی پُرلطف کہی جاسکے؟

زہرہ کے سامنے اپنے ماں باپ کی حالت آئینہ تھی۔ اماں ابا میں تُو تُو میں میں ہوکر ابا تو روٹھ کر باہر چل دیتے اور اماں دوپٹہ منہ پر ڈال کر رویا کرتیں، اور ایسا ہی اُس کے گھروں میں ہوا کرتا تھا۔

"اوہ!" شوکت بولا "لیکن یہاں ہر روز طلاق کا مسئلہ تو درپیش نہیں ہوتا؟"

کیوں ہوگا؟ جبکہ عورت ایک پالتو کتے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ اُسے مار کر دھتکاریں لیکن وہ آپ کے بچے کھچے ٹکڑوں کی خاطر پھر آپ ہی کے قدموں میں لوٹتی نظر آئے گی۔ برعکس اسکے اگر اسے روٹیوں کا کال نہ ہوتا تو وہ آپ کے جھڑکنے پر آپ کو نیچا دکھا ڈالتی اور پھر آپ بیٹھے کفِ افسوس ملا کرتے۔

آپ عورت کو اس قدر مظلوم کیوں دکھاتے ہیں؟

"اس لئے کہ وہ ہر حیثیت سے مظلوم ہے۔ ہندوستانی بیوی جانتی ہے کہ اُس کا شوہر اتنی رات گئے کیوں آتا ہے لیکن وہ نہایت صبر و سکون سے اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ کھانا کھلاتی ہے، پاؤں دباتی ہے۔ لیکن منہ سے اُف نہیں کرسکتی۔ اسکے برعکس اگر کوئی یوروپین شوہر اپنی بیوی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے تو اسکا منہ توڑ جواب بھی پاتا ہے۔ اس لئے کہ یورپ کی عورت کو معاشرتی اور اقتصادی آزادی حاصل ہے"

شوکت کچھ غور میں غلطاں کرنے لگا اور زہرہ دل ہی دل میں شوکت کی شکست پر کھِل اُٹھی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ نوجوان اس قسم کی باتیں کئے جائے اور وہ یوں ہی دروازے سے لگی کھڑی سنتی رہے۔

کتنا حسین تھا اُس کے لئے نوجوان کی فرسودہ اور رٹی ٹی سی باتوں میں

کسی کے پاؤں کی چاپ تھی کہ وہ جلدی سے دروازے کے قریب سے ہٹ گئی اگر [illegible] تو اس نے [illegible] ہی کردی۔ نگوڑی کنواری ہاں ہوکر غیر [illegible] وہ جلدی سے تخت پر بچھی ہوئی چادر کی سلوٹیں مٹانے لگی

[illegible] لگی۔

"یہاں [illegible] چل رہی ہوگی"

زہرہ [illegible] کرنے لگی۔

دل ہم بیچارے کی چھوٹی سے کتنی ہمدردی رکھتا ہے۔ ابھی وہ دو جانے اور کیا کیا کہتا۔ بھائی جان کی ایک نہ چلی۔ ہمیں سے آگے دل تو چاہتا تھا کہ اُن کی پوری باتیں سنتی۔ لیکن میں وہاں اتنی دیر تک کیسے کھڑی رہ سکتی ہوں۔ اماں تو ویسے ہی جلایا کرتی ہیں۔

وہ چولہے کے قریب دیوار سے ٹکی ہوئی بیٹھی تھی۔ باورچی خانے میں گیلی لکڑیوں کا بدبودار دھواں گھٹ رہا تھا۔ آج وہ وہاں بیٹھ کر سخت ناگواری محسوس کر رہی تھی۔ عمر میں پہلی بار وہ اپنے گھر کو قیدخانہ سمجھ رہی تھی اور دھوئیں سے کالے باورچی خانے کو کال کوٹھری اور بھائی باپ اُسے اپنے نگراں معلوم ہو رہے تھے جو آٹھوں پہر اپنی زبان کے کوڑوں سے اسکے ننھے سے دل پر ضربیں مارا کرتے تھے اور ماں! وہ بھی تو بیچاری عورت تھی جو پالتو کتے کی طرح بچے ہوئے ٹکڑوں کی خاطر گھٹ گھٹ کر زندگی بسر کر رہی تھی۔ بھیگا باپ بھی تو اکثر ماں سے لڑ جھگڑ کر چلا جاتا اور پھر بہت رات گئے واپس آتا۔

زہرہ روٹی پکا کر باہر نکلی تو دیکھا شوکت آنگن میں پلنگ پر لیٹا ہے وہ بھی آہستہ سے اُس کی پائنتی بیٹھ گئی۔ اس اُمید پر کہ وہ حسبِ معمول اپنے دوستوں کا تذکرہ کرے تو اس سلسلے میں اس سانولے سے نوجوان کے متعلق بھی کچھ کہے جس نے آن کی آن میں اُس کے سوئے ہوئے احساسات کو جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ لیکن شوکت نہ جانے کس خیال میں ڈوبا کھوئے خیالوں میں جیسے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ زہرہ کا دل چاہا کہ اُس سے پوچھے کہ آج کون آیا تھا لیکن فوراً ہی خیال آیا اگر شوکت نے اُلٹے سوال کر دیا کہ تم کیوں پوچھتی ہو تو کیا جواب دوں گی۔

باپ اپنے بھاری جوتوں سے بخت زمین کو کوٹتا ہوا گھر میں آیا۔ زہرہ جلدی سے اٹھ کر کھانا نکالنے لگی۔ ساتھ ہی اُسے خیال آگیا، بڑا عجیب انوکھا سا، اگر کبھی میں اس نوجوان کے سامنے کھانا لے جاؤں تو ـــــ پھر وہ اپنے اس موہوم خیال پر خود بخود مسکرا اُٹھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اُسکے سفید سفید دانت چمک اُٹھے۔

اُس رات اس سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ کھایا گیا اور وہ جلد ہی تمام کاموں سے فرصت پاکر اپنے بستر پر چلی گئی۔ وہ سب سے الگ تھلگ ہو کر اس نوجوان کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچنا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے علاوہ کچھ بھی نہ جانتی تھی کہ وہ ایک قبول صورت آدمی ہے جو شاید اسکے بھائی کے ساتھ ہی پڑھتا ہوگا۔ اور وہ اپنے دل میں مظلوم عورتوں کی طرف سے بے پناہ ہمدردی رکھتا ہے اور بس ـــــ لیکن وہ تو اُسے ایک دوسرے ہی رنگ میں اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ ہندوستان کی کنواری اگر کسی مرد کے متعلق کچھ سوچے گی تو اُسے اپنا شریکِ حیات تصور کر کے ـــــ وہ دل ہی دل میں [illegible] ـــــ ؟

اس "اگر" میں اسکے لیے کتنی وسعت تھی۔ وہ اندھیری رات کی خاموشی میں اپنے پلنگ پر پڑی آئندہ زندگی کا تصور باندھ رہی تھی۔

ایسا مرد اپنی بیوی سے کس قدر محبت کریگا جو اس کے دردِ دل سے بھی واقف ہو کتنی پُرمسرت زندگی ہوگی، پھر اُسے اپنا تمام دن باورچی خانے کی کالی کلوٹی فضا میں چولہے ہنڈیا سے چھیڑ چھاڑ کرنے نہ گذارنا پڑا کریگا۔ بلکہ وہ ایک آزاد پرند کی طرح ڈال ڈال پر بیٹھے گی۔ پتے پتے سے کھیلے گی، پھولوں کو گدگدائے گی اور پھر خوب اونچی اُڑے گی اپنے سانولے ساتھی کے ساتھ۔ کتنی عجیب سی زندگی ہوگی۔

زہرہ خیالات سے چھیڑ چھاڑ کرتی خوابوں کی انوکھی دنیا میں نکل گئی۔

خوبصورت سُرخ سُرخ پھول بالکل دہکتے ہوئے انگارے جیسے اسکے گرد جھوم رہے تھے۔ جن پر رنگ برنگی تتلیاں بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ ان بے شمار پھولوں میں پھولوں بنی گھومتی پھر رہی تھی۔ آسمان پر سنہرے بادل دوڑ رہے تھے جن میں سے عجیب قسم کی شعاعیں نکل نکل کر ہر طرف سونا برسا رہی تھیں، اور پھر ایک دم سب پھول مرجھا گئے، تتلیوں کے رنگین پر جھلس گئے اور آسمان پر کالے کالے خوفناک بادل دوڑنے لگے۔ وہ اکیلی اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر پڑی۔

پھر وہ دیکھنے لگی ـــــ

ایک بہت بڑے مجمع میں وہ اور اس کا نوجوان ساتھی کھڑے ہیں، سامنے سجے سجائے اسٹیج پر ایک مولانا بھی داڑھی سے مزین گھرٹ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے ہیں

"برادرانِ ملت! کتنے شرم کی بات ہے کہ تم نے خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف اپنی عورتوں کو شترِ بے مہار کی طرح آزاد کر دیا"

زہرہ نے اتنا ہی سنا اور جیسے اُسکے ذہن میں چنگاریاں بھڑک اُٹھیں وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنے ساتھی کے ساتھ انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں گرتی پڑتی اسٹیج تک پہونچ جاتی ہے اور مقرر کو اُس جگہ سے دھکیل کر کچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ اسکا ساتھی اسکی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور جیسے زہرہ کی قوتِ گفتار اس کے ساتھ فرار ہوگئی۔ مجمع ایک خوفناک شور کے ساتھ بڑھ رہا تھا ـــــ زہرہ کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ وہ اپنے پلنگ پر پسینے میں شرابور پڑی تھی کچھ نہیں محض خواب! وہ بڑبڑائی۔

رات بھیگ چکی تھی اور تارے جھپکے ٹوٹنے چاہ رہے تھے وہ دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کیونکہ وہ اس خواب کو بھولنا چاہتی تھی۔ اُس نے نوجوان کا تصور جگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اُس نے پھر ایک خواب دیکھنا شروع کیا۔ سنہرا، روپہلا، پیارا سا خواب ——
وہ نوجوان اُسکے خواب کی دلکش بنیاد تھا۔

اب وہ آرام کی نیند سو رہی تھی۔

حسبِ معمول سویرے ہی اُسکی آنکھ کھلی۔ لیکن اُس نے فوراً ہی دوبارہ آنکھیں بند کرلیں تاکہ اپنے دلفریب خواب کے مزے چپکے چپکے لے سکے۔

زہرہ! باپ کی کرخت آواز اُسکے کانوں پر ہتھوڑے کی طرح پڑی اور وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔

"اب تک سو رہی ہے تو! کیا آج بغیر کھانا کھائے دفتر جانا ہوگا!" باپ نے کہا، اور جیسے اسکے خواب منتشر ہوگئے۔ وہ پھر اُسی دنیا میں تھی جہاں صبح سے اُٹھکر کھانا پکانا جھوٹے برتن صاف کرنا اور دوپہر پھر پرانے کپڑوں پر رفو کرنا ہی زندگی کا حاصل تھا۔ اور وہ جس سے اُکتا رہی تھی۔ زندگی کی یکسانیت بھی کتنی وبالِ جان ہوتی ہے۔

"اُٹھو جلدی سے" باپ نے اُسے مضمحل بیٹھے دیکھ کر زور سے ڈانٹا۔ اور وہ چپ چاپ بستر چھوڑ کر کھڑی ہوگئی لیکن اسکے دل میں طوفان اُٹھنے لگا کہ دیکھو بھائی جان کیسے مزے میں سو رہے ہیں۔ انھیں کوئی نہیں اُٹھاتا چاہے جب تک سوئیں۔ کیا مجال جو کبھی کام کاج کر دیں۔ اگر کبھی کہہ دوں کہ بھائی جان ذرا بازار سے پان ہی لا دو تو شان میں بٹہ لگ جائے گا۔ سوائے کالج جانے کے دن بھر پڑے پڑے پلنگ کے بان توڑا کریں گے یا پھر سیر سپاٹا کرینگے۔ ایک بار ابا نے کہا تھا کہ "تم دو سال سے برابر فیل ہو رہے ہو محنت نہیں کرتے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ کماتا جاؤں اور تمہارے بھاڑ میں جھونکتا جاؤں" بس اتنا ہی سُن کر کیسی آگ لگی تھی، گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی پھر اماں نے رو رو کر انھیں جانے سے باز رکھا۔ لیکن میں چاہے دن بھر سب کے جوتے بھی اُٹھاؤں تو بھی وہی ڈانٹ ڈپٹ پلے پڑتی ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں تاکہ میں کہیں بھی تو نہیں جا سکوں گی۔ اگر میں بھی ڈپٹی صاحب کی زکیہ کی طرح کالج کی پڑھی ہوتی اور اسکول کی پڑھی استانی ہوتی تو آج گھر میں یہ سب بھی میری عزت کرتے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ زہرہ کے دل میں اس قسم کے خیالات جگہ پا رہے تھے۔

اُس دن وہ کئی بار شوکت کے کام جلدی نہ کرنے پر جھنجھلائی اور باپ کی ڈانٹ ڈپٹ پر بجائے سر جھکا کر رو دینے کے اُسے کڑوی کڑوی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ پہلی بار بغاوت پر دل ہی دل میں گنگنا اُٹھی۔

زہرہ کے پڑوس کی سہیلی رابعہ جب اسکے پاس سے نمک مانگنے آئی تو زہرہ نے اُس کو جان بوجھ کر تیز مزاجی جتلاتے ہوئے پوچھا ——

"اے رابعہ! آج تمہارے ابا کیوں چیخ رہے تھے؟"

رابعہ نے اپنے میلے اُلجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں ڈال کر سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

"دال میں نمک تیز ہوگیا تھا مجھ سے۔"

"تو کیا ہوا غلطی انسان سے ہی ہوجاتی ہے۔"

"انسان سے ہو تو ہو لیکن لڑکیوں سے نہیں ہونا چاہئے۔" غریب رابعہ باپ کی خوفناک جھڑکیاں یاد کرکے رو پڑی۔

ہشت پگلی، کیا لڑکیاں انسان نہیں ہوتیں؟ زہرہ، رابعہ کے آنسو دیکھکر کھسیانی ہنسی ہنس دی، پھر بولی "ہم لڑکیاں ناحق بھیگی بلی بنی رہتی ہیں۔" اُس نے جلی ہوئی چپاتی ڈلیا میں پھینکتے ہوئے رابعہ کی زرد اور اُداس صورت کی طرف دیکھا۔

ارے بہن! رہنے بھی دے۔ جب تک بچہ رہے بھائی کی مار کھائی۔ ہوش سنبھالا تو چولہے ہنڈیا میں جوت دیئے گئے اور جب جوان ہوئے تو ——
اس کے آگے وہ چپ ہوگئی۔ اور دیوار پر ناخن سے لکیریں کھینچنے لگی۔

زہرہ نے انتہائی بے باکی سے اُس کی بات پوری کردی۔

"اور جب جوان ہوئے تو کسی مرد کی خدمت میں ایک لونڈی کی طرح سونپ دیا گیا۔ ٹہل خدمت کی تو صبح و شام پیٹ بھرا اور یوں ہی ایک دن مر کر چلے گئے۔"

رابعہ کے منہ سے ایک دبی ہوئی آہ نکل گئی اور وہ بڑی حسرت سے کہنے لگی۔

"پھر ہم لڑکیاں جو کریں؟"

"اونھ! تم کیا جانو، نری بیوقوف ہو۔ جانتی ہو یورپ کی عورت کیسی ہوتی ہے ——" زہرہ جلدی جلدی اس نوجوان کی کہی ہوئی باتیں دہرانے لگی۔ لیکن رابعہ ڈبے سے نمک نکال کر جلدی سے بھاگ گئی کیونکہ وہ گوشت پکتا چھوڑ آئی تھی۔

"پان لگاؤ زہرہ" شوکت نے بڑی ہی ملائمت سے کہا، کیونکہ آج دن میں کئی بار جوان بہن کی جھڑکیاں کھا چکا تھا۔

"ابھی لیجئے" زہرہ کھلی جا رہی تھی۔ شوکت باہر چلا گیا، وہ جلدی سے لالٹین باہر رکھکر پان بنانے بیٹھ گئی۔ کتھا، چونا بڑی احتیاط سے لگا کر باریک کٹی ہوئی چھالیہ اور الائچی ڈال کر بڑی نفاست سے گلوریاں بنائیں اور رکابی میں چن کر اسی عقیدت سے مردانے کمرے سے ملحق کمرے میں گئی جیسے کوئی معصوم پجارن اپنے دیوتا کی پوجا کی خاطر جا رہی ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن وہ دروازے سے آتی ہوئی روشنی کے سہارے بیٹھک کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جانے ہی والی تھی کہ اُس نے جھانکا [illegible] نوجوان

تھا تھا۔ اس کا چہرہ کھِلا ہوا تھا۔ جیسے وہ بہت خوش ہو۔
شوکت کہہ رہا تھا
"کیا آپ کا فیصلہ آپ کے والدین کے لئے بھی قابلِ قبول ہوگا؟"
زہرہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔
نوجوان کہنے لگا: "ہاں انھیں میرے فیصلہ کے آگے جھک جانا پڑا!"
تو ——— تو ——— شوکت کچھ کہنا چاہتا تھا۔
"اب ہماری شادی ہوگی" نوجوان نے اپنے فقرے پر اچکا کر ہنستے ہوئے کہا، اور زہرہ کو اب معلوم ہوا کہ دروازے کی دراز سے روشنی کے بجائے اندھیرا اُمڈ رہا تھا۔ پاؤں کی تھالی ایک جھٹکے کے ساتھ زمین پر گر پڑی اور وہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر اندھیرے میں سہارا تلاش کرنے لگی۔
اندر سے ماں لالٹین لئے کمرے میں داخل ہوئی اور باہر سے شوکت۔
"کیا ہوا؟" شوکت نے دیوار سے لگی ہوئی زہرہ کو دیکھ کر پوچھا۔
"اندھیرا تھا ٹھوکر کھا گئی" زہرہ کے پھڑکتے ہوئے لبوں سے نکلا۔
"اندھیرے میں بغیر روشنی کے آؤ گی تو یونہی ٹھوکر کھا پاؤگی۔"
ماں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا۔
زہرہ کی نظریں شوکت کے جوتے سے مسلی ہوئی پان کی گلوریوں پر تھیں اور وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ درزوں سے آنے والی روشنی کا اعتبار کیا تھا لیکن کیا معلوم تھا کہ کسی کے سامنے آجانے سے ہی درزیں اندھیرا اگلنے لگیں گی۔
"اور پان بنا لاؤ" شوکت باہر جاتے ہوئے کہہ گیا۔
اور زہرہ ایک فرمانبردار بہن کی طرح تھکی تھکی سی پان بنانے جا رہی تھی۔

ہاجرہ مسرور

عشق و مستی

یہ خرد کی سادہ کاری یہ مری ادق پسندی — مرے دل کو خوش نہ آیا ترا ذوقِ فکر سندی
نہ وہ تابِ خسروانہ نہ وہ سوزِ عارفانہ — ہے زوالِ مردِ مومن مری وجہِ غم پسندی
تری زندگی پہ طاری ہے نشاطِ نغمہ خوانی — کہیں تشنہ رہ نہ جائے مری خوئے سوز مندی
مری آبرو خودی ہے مری جستجو خودی کر — تو قتیلِ دولتِ نہادی میں ہلاکِ سربلندی
ترا دردِ جاوداں ہے ترا ہجر بیکراں ہے — تو خود آشنا ہو مومن کہ ہے کفر خود پسندی
تری فکر اور عمل کا یہ تضاد کیا بلا ہے؟ — نہ نظر میں کامیابی نہ خبر میں ہوشمندی
مری چشمِ منتظر میں شب و روز تو ہی تو ہے — تجھے سرگراں نہ کر دے یہ نگاہ کی بلندی
مرا دل دکھا ہوا ہے مرے شرکدے ہیں — مجھے چپ نہ کر سکیگا ترا حکمِ نطق بندی
ترا سجدہ راہبانہ مرا سجدہ غازیانہ — میں حریصِ شاہبازی تو اسیرِ گوسفندی
نہ خودی کی خلوتوں میں نہ خودی کی جلوتوں میں — مرا نغمہ جنوں ہے سبزہ مستی کا
تو خودی کی زندگی سے ابھی آشنا نہیں ہے — یہی فصلِ گلفشانی یہی عہدِ تیغ بندی
دو جہاں لرز رہے ہیں مرے نعرۂ خودی سے — ہو لیا امامِ غنیمت نہ کہ عہدِ گوسفندی

خد و خالِ عشق و مستی وہ علی کرم کی ضربِ کاری
تب و تابِ عشق و مستی یہ حنا کی لالہ بندی

افسر سیمابی احمد نگری

راہزن سے

اُٹھ کہ موجودہ تمدن کی فضا تاریک ہے
منزلِ مقصود اس منزل سے اب نزدیک ہے
زر کے ناگوں کو کچل ڈالیں اگر تو ٹھیک ہے

غیرتوں پہ ہے جوانی جرأتیں بیدار ہیں
ہم زمانے کو اُلٹنے کے لئے تیار ہیں

مذہب و قانون کی بوسیدہ عظمت کی قسم
آندھیوں کا رُخ بدلنے والی ہمت کی قسم
گولیوں میں اینٹھنے والی شجاعت کی قسم

ہم بغاوت کی نشیلی آنکھ سے سرشار ہیں
ہم زمانے کو اُلٹنے کے لئے تیار ہیں

یہ گلستاں یہ مناظر یہ فضائیں سب فضول
بادلوں کے جھنڈ اور ٹھنڈی ہوائیں سب فضول
میکدے، ساغر، سبو، ساقی، گھٹائیں سب فضول

زندگی کے رُخ سے ظاہر موت کے آثار ہیں
ہم زمانے کو اُلٹنے کے لئے تیار ہیں

کشمکش یہ نوجوانانِ وطن کو راس ہے
مرد ہیں مسلم ہیں ہم مردانگی کا پاس ہے
زندگی کی سانس رُکنے کا ہمیں احساس ہے

بھوک کے مارے ہوئے ماحول سے بیزار ہیں
ہم زمانے کو اُلٹنے کے لئے تیار ہیں

خون پی پی کر پنپنے والے انسانوں کو ہم
موت کا ہر روپ بخشنے والے شیطانوں کو ہم
آسماں سے باتیں کرنے والے دیوانوں کو ہم

راکھ میں تبدیل کر ڈالیں تو بڑی یار ہیں
ہم زمانے کو اُلٹنے کے لئے تیار ہیں

راہزن! اُجڑا وطن آباد کرنا ہے ہمیں
اک نیا عالم یہاں ایجاد کرنا ہے ہمیں
دورِ استبداد کو برباد کرنا ہے ہمیں

ظالموں کے واسطے ہم موت کا آزار ہیں
ہم زمانے کو اُلٹنے کے لئے تیار ہیں

بن پڑے تو زر کے بندوں سے جوانی چھین لیں
یہ منابعِ کبر و نخوت ناگہانی چھین لیں
زندگی کے دشمنوں سے زندگانی چھین لیں

ہے یقیں ہم کو کہ یہ سب آستیں کے مار ہیں
ہم زمانے کو اُلٹنے کے لئے تیار ہیں

الطاف مشہدی

سیاسی ادب

جنگِ عظیم کے آغاز سے لیکر موجودہ جنگِ عمومی تک دُنیا نے سائنس کی علمی و عملی کوششوں سے جسقدر حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ آپ اپنا جواب ہے۔

اگر ہم اس ربع صدی کے اعجوبہ طراز کارنامہ حیات اور تحیر آفریں نظریات پر نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی کوشش کریں تو ہمیں اشہبِ فکر و نظر کو عجیب عجیب میدانوں میں دوڑانا پڑیگا۔

حیات و موت کا کوئی نظریہ، معیشت و معاشرت کا کوئی سا زاویہ نگاہ، حکومتی نظم و نسق کا کوئی سائنٹفک ایسا نظر نہیں آتا کہ جس میں زبردست انقلابِ عظیم الشان تغیر اور بڑی بڑی تبدیلی نمایاں نہ ہو۔

علوم و فنون کے ارتقا اور سلسلۂ رسل و رسائل کی وسعت نے قوموں اور ملکوں کے تفرقہ کو دور کر دیا ہے خشکی و تری کی درمیانی خلیجوں کو بہت حد تک پاٹ دیا گیا ہے اور سارا عالم ایک مسلسل آبادی کے مختلف محلوں اور اہلِ عالم ایک خاندان کے مختلف افراد کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ جسقدر بُعدِ مکانی ختم ہوتا جا رہا ہے اُسی قدر بُعدِ روحانی زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ جسقدر مسافتوں اور فاصلوں کا تفرقہ مٹتا جا رہا ہے۔ اسی مناسبت سے تعلقات میں اختلاف بڑھتا جا رہا ہے۔ بہ الفاظ دیگر دل و دماغ میں باہمی تصادم، مادیت و روحانیت میں باہمی کشمکش برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ جسکی بنا پر ہمارا تمدن، ہماری تہذیب، ہمارا نظامِ تعلیم، ہماری ذہنی و فکری زندگی کشاکشوں کی چکی کے دونوں پاٹوں کے بیچ میں پستی چلی جا رہی ہے۔

جب حیات و معاشرت پورے طور پر اس سے متاثر ہو رہی ہو تو ادبِ عالم کا اس سے متاثر ہونا ناگزیر ہے کیونکہ ادب زندگی ہی کا تو پرتو ہے اور حیات ہی کا آئینہ ہے۔ جب زندگی ہی پورے طریقہ پر انقلابات کی آئینہ دار بن رہی ہے تو زندگی کے ترجمان (یا ادب) میں اسکی جھلکیوں کا نمودار ہونا ضروری ہے۔ جہانتک حیات و لاز مۂ حیات (ادب) کی تاثر پذیری کا تعلق ہے۔ ہم بھی اس میں ہم آہنگ، ہمزبان اور ہمنوا ہیں۔

لیکن اس ربع صدی کا سب سے عجیب کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے علوم و فنون کے احیاء و ترقی کے سلسلہ میں جہاں اپنی بے پایاں مساعی سے اہلِ عالم کو مرہونِ منت بنا لیا ہے۔ وہاں یہ چیز بھی ناقابلِ برداشت ہے کہ اس نے جملہ علوم و فنون کو اپنا آلۂ کار بنا کر خود علوم و فنون کی عظمت و رفعت اور اہمیت کو کھو دیا ہے۔

انقلابِ فرانس کے حریت و مساوات کا لگایا ہوا پودا اس عہد میں۔ اس موسم میں اور ان فضاؤں میں ضرور نمو پذیر ہوا لیکن اس طرح کہ وہ اپنی شگفتگی و شادابی کو ختم کر چکا اپنی جڑوں کے رگ و ریشہ کی حیات و نشو و نما سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اپنے برگ و گل کی رعنائی و خوشنمائی کھو چکا۔

سیاسیات و معاشرت کے تنادر درخت نے فنونِ لطیفہ خاصکر ادب کو اپنے وسعت اور پھیلاؤ میں لیکر نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ وہی فن جو طلوعِ سیاست سے پہلے ہماری مصنوعی زندگی، ہمارے مصنوعی نظام کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں "جادۂ کہکشاں" بن کر نمودار ہوتا تھا۔ اب رداسے ظلمت کی فصل میں ساری فضائے حیات پر چھانے لگا وہی حسن جو ہماری غیر فطری طرزِ زندگی کے پیدا کردہ زخموں کے اندمال میں مرہم شفا کا کام دیتا تھا وہ اب انقلابی گردشوں کے زیرِ اثر انھیں زخموں پر نشتر تیز اور نمک فشانی کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

چنانچہ سیاسی ضرورتوں اور تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ادب نے رنگ بدلنا شروع کیا اور معاشی تقاضوں کے اشارۂ چشم و ابرو پر آرٹ اور فن بھی رقص کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ علوم و فنون اپنی مستقل قدروں، اپنی مستقل حیثیتوں کو چھوڑ کر معیشت و سیاست کی بھنور میں نہ صرف جذب کر رہ گئے بلکہ اکثر اقتصاد و معاش کی ادھوری زبردست ہولناک تھپیڑوں کی وجہ سے اپنے مرکزِ ثقل سے ہٹ جانا پڑا۔ یہیں سے اس مسئلہ نے کہ "ادب برائے ادب" صحیح نظریہ ہے کہ "ادب برائے زندگی" بحث و نظر کے دریچہ سے سر نکالا۔

یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر بہت کافی خامہ فرسائی کی جا چکی ہے۔ موافق و مخالف دونوں پہلوؤں کو مختلف طریقہ سے اجاگر کیا جا چکا ہے۔ ہر فریق نے اپنے مدِمقابل کے دلائل کا تجزیہ کر کے بزعم خود فیصلہ بھی صادر فرما دیا ہے۔

لیکن نگاہِ حقیقت میں ابھی بحثِ مذکورۃ الصدر تشنۂ تحقیق ہے۔

سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمارے صاف و سادہ ادب کو اُسوقت سے اُسی خشک و بنجر وادی میں گھسیٹنے کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔ جبکہ اسکو بہارِ چمن، سرسبز و شاداب گلزار

نظر افروز مناظر سے دامن نگاہ کو برشگل بنانا تو کیا ؟ گوہر دامن کو بھرنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ ایک شستہ ادبی زبان کے لئے تو زندگی ہی کو دائرۂ فکر و خیال بنانا سزاوار ہو سکتا ہو جس نے عنفوانِ جذبات کی رنگین بہاریں دیکھکر دورِ سنجیدگی میں قدم رکھا ہو، لیکن جس زبان کو آغازِ طفولیت ہی سے غم و اندوہ کی داستان سرائی اور اپنی ثقہ علمی بہنوں (زبانوں) سے مقابلہ زبانی کی فکر دامنگیر رہی ہو جسکی سرتوں، شادمانیوں، خندہ و قہقہہ کی گرم بازاریوں کے اندر بھی دم توڑتی ہوئی حکومتوں کی تلخیاں شامل ہوں۔

وہ زبان جس نے جب سے آنکھیں کھولیں اپنے چاروں طرف انحطاط و ادبار کی گھٹاؤں کو چھایا ہوا، بیکسی و کس مپرسی کا سماں بندھا ہوا دیکھا ہو، جسکو کبھی باوقار و مستحکم سرپرست کا سایہ کبھی نصیب نہ ہوا اس کے لئے تھوڑی سی خوشحالی و فراغ خاطری کے دور میں یکدم مصلحانہ لبادہ اوڑھا دینا کس طرح موزوں و مناسب ہو؟ اسکے ادب کو سیاسی و معاشی جکڑ بندیوں میں گرفتار کر دینا کہاں تک شایانِ شان ہو سکتا ہے ؛ — لٹریچر اقوام کی دو گونہ حیات و موت کے کمل پہلوؤں کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے بلکہ ملک کی کمل معاشرت، زندگی کے پُرانے نقشہ کی رنگ آمیزی بھی ادبیات کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

حیات انسانی کے تمام مراحل کی تکمیل، فلسفہ و اخلاق اور تہذیب و تمدن کی تخلیق میں جتنا بھی تعلق لٹریچر کا ہوتا ہے وہ اسکے عالمگیر اثرات سے واضح ہے

ادب نہ صرف افراد کے عقائد و خیالات میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے بلکہ جماعتوں اور گروہوں کے نقطۂ نظر میں بھی اسقدر عظیم الشان تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے کہ اُن کی نگاہوں میں زندگی کی بجلیاں کوندتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں

"ادب برائے ادب" بھی انسانی خیالات میں انقلاب آفرینی کا دعویدار ہے لیکن جب اس میں ہنگامی تقاضوں کی کاربرآری کا جذبہ شریکِ عمل ہو جاتا ہے۔ جب اس میں وقتی ضروریات کی انجام پذیری کا عنصر شامل ہو جاتا ہے تو آرٹ کی صداقت، فن کا خلوص اور خود ادیب کی روحانی ہمدردی رخصت ہو جاتی ہے، سچی دلنوازی کا خاتمہ ہو جاتا ہے جب ادب میں ہنگامی عناصر بروئے کار آ رہے ہوں تو ہم کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم کے ذہنی سوتے خشک ہو چکے ہیں، دماغی سرچشمے سوکھ گئے ہیں اور ایجادی قوتیں مغلوب ہو چکی ہیں۔ طبائع میں ابداعِ خیال کا مادہ موجود نہیں رہا جسکی بنا پر وقتی چیزوں کو لٹریچر میں شامل کرکے مردہ جذبات میں زندگی کی لہر دوڑائی جا رہی ہے ؛ پژمردہ کلیوں میں بادِ تند و تیز سے تازگی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ زنگ خوردہ احساسات میں [illegible] کی سعی ہو رہی ہے۔۔ [illegible]

برپا ہو جاتا ہے، لیکن اندرونی سطحیں ویسے ہی سکون پذیر رہتی ہیں بلکہ طبیعتوں میں جذبات کی روشنی اور مدھم پڑ جاتی ہے۔ خوابیدہ میلانات اور بھی خوابِ گراں میں کھو جاتے ہیں کیونکہ لٹریچر میں الفاظ و عبارات مستعار لئے جا سکتے ہیں، خوبصورت نئی تراکیب کو دوسری زبانوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن ادب کی روح کو ادھار نہیں لیا جا سکتا۔ پیکرِ الفاظ میں بڑی حد تک تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے لیکن سچی مشرقی روح کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں سیاسیات و اقتصادیات کے روح فرسا مسائل سے نبرد آزما ہونا ضروری ہے لیکن سپر انداز ہو کر نہیں بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے لٹریچر میں انقلاب کی روح ضرور ہونا چاہئے لیکن من مانی تبدیلیاں کرکے طوائف الملوکی (انارکزم) کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے نئے نئے تصورات، نئی نئی باتیں تخلیق کرنا، ادیب کا فریضۂ حیات ہے۔ لیکن ضرورت اور سیاستِ وقت کے ماتحت ادب میں تبدیلی کرنا غالباً سب سے بڑا گناہ ہوگا کیونکہ لٹریچر زندگی ہی کا دوسرا نام ہے۔

کیا آپ زندگی کو بے کیف اور آرٹ کی حیثیت سے گرے ہوئے سکوں کا گندگاہ بنانا چاہتے ہیں؟ اس قسم کی تحریکات کے قلعے تو زندگی کی شاہراہ پر ہزاروں پیدا ہوتے اور غائب ہوتے رہتے ہیں جنکو پائے استقلال و ثبات سے گامزن ہونے کی نعمت کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

حیات انسانی کی سیماب پائی اور تلون مزاجی کے متعلق اور کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے اس میں ہر صدی ہر سال ہی نہیں، بلکہ ہر لحظہ، ہر لمحہ ایک نیا تصور اخذ کیا جا سکتا ہے ادب میں ٹھہراؤ ضرور ہوتا ہے لیکن جمود پسندانہ نہیں بلکہ متانت مآبانہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیائے ادب کا کوئی شہپارہ بھی آج انتخاب فطری یا بقائے اصلح کے قانون کے مطابق ہمارے اندر زندہ نہ رہتا۔

آج ہم تک سعدی کی حقیقت نگاری، حافظ کی جذباتی عکاسی، عمر خیام کی رنگین خیالی یا میر و درد کی سوز مندی، نظیر کی جزئیات نویسی اور غالب کی بلند پروازی مومن کی نازک خیالی کے زندۂ جاوید شہپارے نہ پہنچ سکتے۔

حافظ و سعدی اور غالب نے کسی سیاسی مسلک کے پیامبر کی حیثیت سے ہمارے دلوں کو مسخر نہیں کیا ہے بلکہ صرف فنکارانہ ژرف نگاہی، عالمگیرانہ ہمدردی کے اثر نے ہم کو اُن کے اعتراف کمال پر مجبور کر دیا ہے

[illegible] خوشنما الفاظ [illegible] سرمایہ دار [illegible] سیاسی مسلک کے اثر کو رنگکر ہمارے سامنے آئے ہیں [illegible]

گزشتہ دلگداز منظر کی تصویر بھدی نظروں میں کھنچ جاتی ہے۔ کیوں ؟ مزدور طبقہ کے جب محنت و سرمایہ کا تصادم اقتصادی تنازعہ کی شکل میں ہمارے سامنے آیا تو وہ پروپگینڈا بن کر رہ گیا۔ آرٹ کی بلند چوٹیوں سے لڑھک کر تلقین کے گہرے گڑھے میں جا پڑا، اور ادب میں جتنے تلقینی رنگ نا گوار ہوا کرتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

حالانکہ ادبی حیثیت سے مزدور کا مقام اسقدر بلند ہے کہ وہاں کسی سیاست داں کا خیال بھی نہیں پہونچ سکتا۔

ادیب کا کام زندگی افروز مناظر کی تصویر کشی ہے۔ حیات آفریں نظاروں کی عکس ریزی ہے لیکن جب وہ کسی سیاسی لیڈر کی طرح سیاسی اصول کو ثابت کرنے کے لئے وجہ جواز ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگے تو ہمیں یقین کرنا پڑیگا کہ وہ اپنے درجہ کو بھول کر ناہموار وادیوں میں بھٹک رہا ہے۔

کون کہتا ہے کہ معاشرت کے گھناؤنے ناسوروں کو منظر عام پر نہ لانا چاہئے؟ نسدیت معیشت کے ڈھکے چھپے زخموں کو برملا نہ ظاہر کرنا چاہئے؟

کس کی مجال ہے ؟ کہ انقلاب آفرینی کی پکار کو بادِ گوش قرار دے؟ ایسا کون غفلت پیشہ ہے جو روح العصر کی نواؤں سے ناآشنا رہنے کی جرم عظیم کا مرتکب ہوا ہو۔ بھلا اس تاریخی مادی دور میں عوام کے جذبات رجحانات کو نظر انداز کرکے ہم کہانتک سرخرو ہوسکتے ہیں ؟

لیکن کہنا صرف یہی ہے کہ کورانہ تقلید یا انقلابی جبلت ہم کو بام عروج تک کبھی نہیں پہونچا سکتی۔

ادب اور معاشرت کی تاثر پذیری بالکل مسلم ہے لیکن سراسر نقالی یا بیجا ہنگامہ آرائی بھی ہمارے طریقہ کار میں مخل انداز ہوکر خود معاشرت کو پس پشت پھینکدیتی ہے

بقول حضرت کیفی معقول استدلال اور چیز ہے اور فراوانی جذبات شئے دیگر۔ اگر ہم ان دونوں میں امتیازی خطوط نہیں کھینچ سکتے۔ اگر ہم ملکی خصوصیات اور ناموسِ اخلاق کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے تو ہم کو اپنی عقل وخرد کا ماتم کرنا پڑیگا۔ ہمارے ادب میں پہلے بعنوانات تصوری اور خیالی تھیں جنکی تردید کے لئے قلم کیف میدان میں آنا پڑا تو اب بھی یہ عنوانات تلقین اور اثبات جو اسکے لئے ہو رہی ہیں۔

اگر گل و بلبل اور زلف و گیسو کی شاعری کو اس لئے ناقص قرار دیا گیا تھا کہ وہ ایران و مضافات ایران کی شاعری تھی۔ مقامی خصوصیات سے عاری تو مغرب کی دریوزہ گری کو بھی کسی طرح قابل فخر نہیں کہا جاسکتا۔ آرٹ کا نظریہ اگر عالمگیر نظریہ ہے تو وہ صرف یورپ کی تقلید میں گم ہوکر نہیں رہ سکتا، بلکہ خود ہم کو اپنا نیا آسمان بنانے کی ضرورت ہے اور اپنی نئی زمین — جس پر نئے نئے ستارے اپنی رنگین شعاعوں سے زندگی کو رنگین بنا رہے ہوں۔

جسکے مطلع پر نیا چاند طلوع ہو جو اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنوں سے مسرتوں کے دریاؤں میں مد و جزر پیدا کر رہا ہو۔ اور جس کے افق پر ایک نیا آفتاب نئے انداز پر ضیا پاش ہو جو ہم پر شعاعوں کی طرح زندگیوں کو بکھیر رہا ہو۔

یعنی ہمیں ادب عالی (کلاسیکل لٹریچر) پیش کرنے اور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ قوم میں اس سے زندگی کی لہر خود بخود پیدا ہو جائے گی۔

ادیب کا کام زندگی کی نشو و نما اور تخیل کی جدت طرازی ہے۔ تو پھر اس سے فائدہ اٹھائینگے یا نقصان یہ سوچنا خود اسکا کام نہیں۔ سورج کی شعاعوں کا کام صرف چمکنا اور جگمگانا ہے۔ کائنات میں بعض چیزیں ان شعاعوں سے جلکر خاکستر ہوجائینگی اور بعض زندگی کی حرارت محسوس کرینگی۔

حسین گلدستہ کے پھولوں کا کام خوشبوؤں کا بکھیرنا ہے کوئی اس سے تسکین ہو یا بے لطف اس سے کوئی غرض نہیں،

اسی طرح ایک باریاضت فن کار کا کام تخلیق ادب ہے۔ قوم کے تاثر و عدم تاثر سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ اپنے مشاہداتِ فطری اور محسوساتِ فطری کو بلا کم وکاست روئے احساس سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا مجاز ہے اور بس اسی میں آرٹسٹ کی ایمانداری اور دیانت کیشی ہے۔ کیونکہ آرٹ کا اخلاق تمام تر اخلاص پر مبنی ہے۔

کائنات ہر موسم کی ہواؤں، بہار کے جھونکوں، یا خزاں کے تھپیڑوں سے تبدیلیاں لحظہ لحظہ بہ لمحہ ہوتی رہتی ہیں۔ بادل آیا، آسمان پر چھا گیا۔ گرجا، برسا اور نکل گیا، ان تغیرات، ان انقلابات سے ادیب کے ذہن میں جو تاثرات مرتسم ہونگے وہ کمال دیانتداری سے آپکے روبرو پیش کردیگا خواہ اس آئینہ میں بہار کی جلوہ آرائیوں کا عکس ہو یا خزاں کی ہلاکت سامانیوں کا پرتو۔ وہ ان کشمکشوں سے آزاد رہتے ہوئے فطرت کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتا ہے۔

یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض دماغوں میں یہ خلش پیدا ہو کہ جب ادب کی بساط زندگی کے لئے اور وہ بھی عوام کی زندگی کے لئے بچھائی گئی ہے۔ اسکا تمام تر تعلق جبکہ سماج اور سوسائٹی کی نمائندگی ہی سے ہے تو ادیب اگر عوام کے تقاضوں اور ضرورتوں سے بے نیاز ہوکر صرف اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگے تو پھر ادب قوم کا نمائندہ کہاں رہتا ہے ؟ کیونکہ ادب کی رفیع الشان بارگاہ میں جب عوام کا گذر ہی نہیں تو

حیاتِ معاشرت کے مسائل کی رہنمائی ادب کے ذریعہ سے کس طرح ہوگی؟ حالانکہ عصرِ حاضر نے ان تمام سرمایہ دارانہ دیواروں کو (جو ادب اور عوام کے درمیان حائل تھیں) توڑ کر برابر کر دیا بلکہ آرٹ کو سراسر سماج کے لئے وقف کر دیا ہے۔ پھر ادب برائے ادب کے پرانے فرسودہ نظریہ پر جما رہنا کہاں تک صحیح ہے؟

اس نظریہ کی مخالفت میں سب سے زیادہ کامیاب یہی حربہ ہے لیکن "ادب برائے ادب" کی تشریح یہ نہیں ہے کہ ہم عوام سے بیگانگی اختیار کر کے ایک ایسے خیالی گنبد میں جا بیٹھیں جہاں خود اپنی صدائے بازگشت کے علاوہ اور کوئی آواز نہ سنائی دے ۔ بلکہ بجنوری مرحوم کے الفاظ میں وہ دل کے پُرشور کوچے اور گلیوں والی دنیا ہے۔ جہاں زندگی کی ہفت رنگ شعاعیں منتشر ہوتی رہتی ہیں اور جس دنیا کے خارجی واقعات ہی نے ایک شاعر (غالب) کے ذہنی احساسات کی شکلیں اختیار کر لی ہیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ صنعت کار کو اپنی صنعت کاری کے لئے کسی خارجی دباؤ کی پابندی غیر ضروری و مضر ہے بلکہ اسکو خود نفسِ واقعہ کے اثرات کا رہینِ منت ہونا چاہیے۔ اگر آرٹسٹ کسی اوپری دباؤ سے مجبور ہو کر قلم کو جنبش دے رہا ہے تو اپنے فن اپنے ارمان کا خون کر رہا ہے، اپنے دماغ پر ظلمِ عظیم کرنے کا مرتکب ہو رہا ہے اسکو اپنی صنعت کی کامیابی کی توقع فضول ہے کیونکہ بقول میکائیل آنجلو "نقاش اپنے ہاتھوں سے نہیں بلکہ دماغ سے تصویر کھینچتا ہے" جب وہ توازنِ دماغی ہی کو پہلے کھو بیٹھا تو صرف اسکے ہاتھوں سے کسی زندہ جاوید شاہکار کی اُمید بے سود ہے۔

ایک حقیقی فن کار، ایک سچا ادیب ہمیشہ ان پابندیوں سے آزاد رہیگا۔ لیکن کیا وہ بنی نوعِ انسان کی ہمدردی سے بھی دست کش ہو سکتا ہے؟

نہیں! ہرگز نہیں، اگر وہ واقعی ادیب ہے، واقعی آرٹسٹ ہے تو کبھی بھی عوام کے جذبات و احساسات سے نابلد نہیں رہ سکتا بلکہ عالمگیر ہمدردی اور وسیع محبت و الفت کے پیامی ہونے کی حیثیت سے تمام کائنات کا درد اسکے سینہ میں موجزن ہے پریم اور پیار کی آگ اسکے ہر ہر رگ میں شعلہ ریز ہے پھر بھی اُسے عوام کی ترجمانی کا حق نہیں پہونچیگا؟ کسکو پہونچیگا؟ اس کے کلام میں زندگی کی دھڑکنیں نہیں محسوس ہونگی تو اور کس کے کلام میں ہو سکینگی۔

جب ایک صاحبِ ذوق انسان جمہور عوام میں پیدا ہوا انھیں کے درمیان نشو و نما، تعلیم و تربیت پائی اور جوان ہوا تو کیا وہ عوام کے اندر رہتے ہوئے بھی اس قدر دُور رہیگا کہ عوام کی نفسیات سے بھی روشناس نہ ہو سکے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہم کو اسکی سلیم الفکری اور خوش مذاقی سے دست بردار ہونا پڑیگا۔

اپنے ماحول کو سمجھ لینا، اُسکی پہنائیوں اور گہرائیوں تک پہونچنا ادب کے لئے شرطِ اولیں ہے۔ ایک صاحبِ ذوق انسان کے دل میں لطیف احساسات کا ہجوم کسی نہ کسی شکل میں اپنا راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ اس چشمہ کی طرح جسکا ابلتا ہوا سیال پانی سخت سنگلاخ چٹان کے سینہ کو چیر کر پھوٹ نکلتا ہو۔ جو زور و شور اور جو روانی اس پانی میں ہوگی وہ میدانی خود ساختہ نہروں اور جدولوں میں کہاں آ سکتی ہے؟

میرے نزدیک یہی معنی ہیں ادب برائے ادب کے خواہ اسکو ادب برائے زندگی سے تعبیر کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر شہری آزادی سے میں جمہوری مساوات کی طرح ادبی آزادی ادبی مساوات کا بھی قائل ہوں۔ اسی کے ساتھ ادب کو زندگی کا آئینہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں اس لئے ہمیں اپنی زندگی کو اسقدر حسین و جمیل، اسقدر پاکیزہ و دلکش بنانا پڑیگا کہ اسی میں ادب اور فن کی جھلک نظر آ سکے۔ اگر ہماری زندگی کا آئینہ غبار آلود اور مکدر ہے تو ہمارا ادب بھی حسن و جمال کی جلوہ باریوں سے محروم رہیگا اگر ہماری سیرت، ہمارا کردار پستیوں میں گھرا ہوا ہے تو ہم کبھی بھی بلند ادب نہیں پیدا کر سکتے۔

جب ادب کا سرچشمہ (ادیب) ہی غلیظ اور گندہ ہوگا تو اس سے صاف و شفاف پانی کی توقع کبھی بھی نہیں کی جا سکتی۔

پس مذکورہ بالا نظریات کا اختلاف نزاعِ لفظی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور ان سیاسی جماعتوں کے بالآخر ایک اور نقطۂ نظر ہے، "نوعِ انسان کی خدمت"

وجدی الحسینی

جوانی

جوانی کیا ہے نظاروں کی جھلک ہے
جوانی کیا ہے پھولوں کی مہک ہے
جوانی ہے ستاروں کی [illegible]
[illegible] بجلی کی چمک ہے

رباعی

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

کلامِ محبت

نہ دم توڑ اے تشنہ کامِ محبت — ابھی صرف گردش ہے جامِ محبت
کریگا وہ کیا احترامِ محبت — سمجھتا نہیں جو مقامِ محبت
نفس در نفس موج در موج پیہم — چلا آرہا ہے پیامِ محبت
ترا پاس ہونا، ترا دور رہنا — یہ صبحِ محبت وہ شامِ محبت
مقاماتِ احرار سے بے خبر ہے — تڑپتا ہے جو زیرِ دامِ محبت
تری ذات سے ابتدائے تمنا — ترے نام پر اختتامِ محبت
حقیقت میں وہ بے نوا بانوا ہے — جو سب کچھ لٹا دے بہ نامِ محبت
کوئی طائرِ زہد سے کاش کہدے — تری زد سے اونچا ہے بامِ محبت
نثارِ فدا کار کی شاعری کیا
زبانِ تمنا، کلامِ محبت

نثار اٹاوی

آسرے

اپنی خوشیوں کے عارضی جذبات — غم میں تحلیل کر رہی ہوں میں
کوششیں ہیں کہ غم سہے جاؤں — خود کو تبدیل کر رہی ہوں میں
زندگی ڈھال کر مصائب میں — اپنی تکمیل کر رہی ہوں میں
تیری رحمت کا آسرا لے کر — اپنی تذلیل کر رہی ہوں میں
کہہ رہی ہوں ترے ستم کو کرم — خوب تاویل کر رہی ہوں میں
موت کی وادیوں میں جانا ہے — کتنی تعجیل کر رہی ہوں میں
کل ارادوں میں جان ڈالونگی — آج تشکیل کر رہی ہوں میں
زندگی کی حقیقتیں نجمہ
صرف تخئیل کر رہی ہوں میں

نجمہ تصدق

ماحبیت

میری بپتا خود میرے لئے ایک معمہ ہے! پیاری سہیلی! تمہیں بتاؤ، کوئی کس طرح زخمی دل کے اسرار کی ترجمانی کرے۔ میری حالت کیا پوچھتی ہو ایک صحرائے سودا پناہ ہے جس میں رواں دواں رہتی ہوں۔ خشک قبر دل کا ایک اتھاہ ساگر ہے جس میں میری زندگی کی کشتی کبھی ڈوبتی ہے کبھی تیرتی ہے۔ کوئی میرا مونس نہیں، دم ساز نہیں اور کوئی مونس ہوتا تو کیا کرتا۔ میرا درد خود بھی تو چارہ گری نہیں چاہتا۔ میں اپنے درد ہی کو اپنی دوا بنانا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ جس آگ میں جل رہی ہوں، ہمیشہ جلتی رہوں اور ہر اس چیز کو جلا دوں، جو مجھ سے چھو جائے! کتنے ناقص تصورات تھے جو اس آگ میں بھسم ہو گئے! کان سے نکلا سونا کندن نہیں ہوتا، کندن اسی وقت بنتا ہے، جب آگ میں تپایا جاتا ہے۔ خام اجزا، خاکستر بن جاتے ہیں، جوہر باقی رہ جاتا ہے۔ آنچ سہہ کر ہی جوہر صورت نکھرتی ہے۔

میں کبھی نہیں بھول سکتی وہ رات، جب تم نے لمبا سانس لیتے ہوئے حسرتوں میں ڈوبی ہوئی ایک آہ کھینچی تھی، کیسی دلدوز تھی تمہاری وہ آہ سرد۔ جیسے پانی میں کنکری پھینکی جائے اور وہ نہر کی تہ کی جانب تیزی سے اترتی چلی جائے، تمہاری وہ آہ میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے بے چین ہو کے تم سے پوچھا تم نے کہا: "کچھ نہیں" اور اپنی نظریں اس طرح زمین میں پیوست کر دیں گویا زلزلہ شناس ہو اور زلزلہ کی آہٹ پا کے زمین کی تہوں میں گھس رہی ہو، مگر تم چھپا نہ سکیں، میں نے تمہاری لمبی لمبی پلکوں پر رخساروں پر آنسو ٹپکتے دیکھے۔ میں نے تمہاری گردن میں بانہیں ڈال کے اپنے سوال کو دہرایا۔ تم نے "اوہ ——— آہ ——— وہ ——— کہاں ——— ہیں ——— اوہ ——— وہ" اور نہ جانے اسی قسم کے اور کتنے مبہم سے اشارے کئے۔ اس وقت تو مجھے ہنسی آگئی تھی اور میں خوب ہنسی تھی۔ میری ہنسی تم کو ناگوار بھی گزری۔ اس وقت یہ بامعنی اشارے میرے لئے بے معنی تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ "اوہ"، "کہاں" اور "وہ" کے کیا معنی ہیں؟ جہالت انسان کو قہقہوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جہالت نے مجھے بھی قہقہوں میں تبدیل کر دیا تھا!

تھوڑی دیر بعد تم نے خلا میں دیکھتے ہوئے ایک نئی دنیا کی خبر دی، عشق، پریم، محبت! میرے دل کے لئے یہ الفاظ بالکل نئے تھے۔ یہ بات نہیں کہ میں نے اس سے پہلے یہ الفاظ سنے ہی نہ تھے۔ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز چشم و گوش کے لئے نئی نہ ہو، دل کے لئے بھی فرسودہ ہو۔ تمہاری زبان سے ... نے کر میرے لئے جیتی جاگتی حقیقت بنا دیا۔ میں نے اپنے دل میں خفیف سی چبھن محسوس کی!

"چاہنا" ——— "چاہا جانا" میں ان دونوں کی معنویت سے بالکل نا آشنا تھی۔ میری زندگی اندھے کنوئیں کی مانند تھی، جس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ہو، جس کی زمین زاہد کے دل کی طرح خشک اور کھردری ہو۔ میرا دل ——— صاف کیوں نہ کہوں ——— ایک "زو" تھا جس میں تمام انواع مخلوقات کے لئے جگہ تھی، اور جگہ نہ تھی تو صرف انسانیت کے لئے، لطیف اور موہنے خیالات کے لئے! محبت کے معنی میرے نزدیک صرف یہ تھے کہ محبت وہ چیز ہے جس کے بہت سے حصے دار ہوں؛ ماں باپ، بھائی بہن، نانی دادی، خالہ ممانی، گھر کی قدیم خادمہ، انا ددا، پالتو بلی اور کتا!! آہ کیسی بے معنی تھی میری وہ زندگی۔ میرا دل برق آسا جذبات کے لئے چینی کی چٹان بنا ہوا تھا!

لیکن تمہاری اس دن کی کیفیت سے معلوم ہوا کہ محبت اس کے سوا کچھ اور بھی ہوتی ہے، جس میں رنگت نکھر جاتی ہے، بدن کے نیچے روح جھلکنے لگتی ہے، جس میں ایک لطیف گھبراہٹ، ایک شیریں اضطراب دمساز بن جاتا ہے، آنکھوں میں دلکش معنویت پیدا ہو جاتی ہے لیکن کیا میں بھی کسی کو چاہتی تھی؟ نہیں؛ بالکل نہیں۔ میری نگاہ و دل کا کوئی مرکز نہ تھا۔ نگاہیں منتشر تھیں، تو مرتبی ہوئی تھی۔ محبت کی معنویت کو کیا سمجھتی اور کیسے سمجھتی؟

تمہارے وہ بول اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، جو تمہاری زبان سے بہت رک رک کر نکلے تھے۔ تم نے کہا تھا: "صبح کی معصوم سفیدیوں میں، شفق کی آتشیں رنگینی میں، چاند کی مدھ بھری کرنوں میں، کہکشاں کی بجلی اور شہاب ثاقب میں میری نگاہیں اسی کا ڈھونڈتی اور اسی کو پاتی ہیں۔ وہ میرے خیال و تصور پر اس طرح چھا گیا ہے کہ خواب میں بھی اسی کو دیکھتی ہوں۔ ہر خوشنمائی میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ مجھے بہت پیارا ہے، ہر وقت اسی کے خیال میں غرق رہتی ہوں۔ اس نے میرے خیالات کو نئے دار بنا دیا ہے، میرے تصورات میں قوس و قزح کے رنگ بھر دیئے ہیں۔ آہ، میں اسے بہت چاہتی ہوں"!

یہ باتیں تمہارے دل سے نکلی تھیں، دل میں گھر کر گئیں؛ میں بھی ایک خیال میں گم رہنے لگی۔ میں نے ایک مورتی بنائی، پریم اور چاہ کی مورتی؛ اور اس کو اپنے دل کے مندر میں رکھ لیا۔ اب میرا دل گنہگار کے دل کی طرح تاریک نہ تھا، وہ مورتی خندہ و نوازش سے میرے تصور کو دوام روشن رکھتی۔ اس کے خیال نے میرے سارے وجودِ معنوی کو مسخر کر لیا، تھی تو یہ دیوانگی، لیکن اس دیوانگی میں زندگی کا کیفِ تمام تھا جس سے فرزانگی کی زندگی خالی ہوتی ہے۔

میرا دل دیپک راگ گانے لگا۔ جیسے آتش نفس مغنی کا نغمہ، خفتگانِ محفل کو یکایک بیدار کر دے۔ میرا دل دفعتاً زندہ اور بیدار ہو گیا۔ من کی لگن نے زندگی کا ایسا احساس پیدا کر دیا، جس میں خودی کے ساتھ بے خودی اور بے خودی کے ساتھ خودی دامن او رگریباں تھی، میرے روز و شب اس طرح گزرنے لگے کہ کبھی اس کی پرچھائیاں دیکھتی اور کبھی اس کا سراپا، وہ بت کدہ کا صنم نہ تھا، دل کے مندر کا صنم تھا، جان دار اور جان نواز، اس میں بولنے اور چھونے کی قوت تھی، وہ شہابِ ثاقب کی طرح روشن تھا؛ اس کے سراپا میں بھی مقناطیسی کشش تھی اور اس کی پرچھائیوں میں بھی۔ آنکھیں اسکی پرچھائیوں سے کبھی چھو جاتیں تو سارے جسم میں سنسنی پیدا ہو جاتی، اور ایسا رعشہ جس میں اضطراب آمیز تسکین ہوتی، نگاہوں کے چھونے اور ٹکرانے سے ایک دل نواز بے دلی پیدا ہو جاتی!

مجھے امید ہے کہ تمہاری روح میری روح کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوگی، اس لئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پریم اور مودہ کے اس کاروبار میں جسم کی ادنیٰ خواہشوں کو مطلق دخل نہ تھا، یہ سب تصور کی کارفرمائیاں تھیں، باوجودیکہ یہ میرا تصوری محبوب میری روح اور جان تھا، لیکن میں نے اس کو کبھی اجازت نہیں دی کہ اسکی انگلیاں میرے جسم تک پہنچیں، میرا پیراہن بھی کبھی اس کے پیراہن سے مس نہیں ہوا۔ شاید یہ تعلیم و تربیت کا اثر تھا۔

رات اپنے پروں پر، دنیا جہان کے لئے نیند کا تحفہ لاتی، لیکن میرے لئے راتیں دن بن گئی تھیں، دن کے شور و ہنگامہ میں میرے لئے سناٹا تھا اور رات کے سکون میں طوفان ——— سمندر کی موجیں صرف چاندنی راتوں میں دشت پیمائی کرتی ہیں، لیکن میرے جذبات کے لئے ہر رات، چاندنی رات تھی۔ سورج کی کرنیں تو مضطرب تھیں اور چاند کی کرنیں پیامِ نشاط!

اس دورِ جنوں نے مجھے بہت سی فرزانگیاں سکھائیں۔ میرا طرزِ نظر بدل گیا، زندگی کے متعلق تصورات بدل گئے۔ رد و قبول کی پروا نہ رہی، توجہ کو یک سو کرنے اور ہمہ وقت ہمہ رہنے کا گر ہاتھ آ گیا۔ خوبیِ زیست کی حقیقی قدر و قیمت دل نشیں ہو گئی۔ اب میں اپنے آپ کو تول سکتی ہوں۔ پہلے میں اپنے آپ کو کاہ سے بھی حقیر تر سمجھتی تھی، لیکن اب کوہ سے بھی گراں تر سمجھتی ہوں کہ خدا نے مجھے انسان پیدا کیا ہے۔ گھر بھر میں کسی کو میرے اس ذہنی انہماک، میری اندرونی تبدیلی کا پتہ نہ چل سکا۔ پتہ چلتا بھی کیسے؟ میں کتابوں کا کیڑا بن گئی تھی۔ پہلے بھی میرا زیادہ وقت سینے، کاڑھنے، بننے اور لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا، اب اور زیادہ اپنے آپ کو مشغول ظاہر کرنے لگی۔ کاڑھنا بننا تو گم گشتگی کی غمازی کر دیتا، شروع میں زیادہ وقت کتابوں سے کھیلنے میں صرف کرتی۔ کتاب ہاتھ میں ہے اور دل تصوری پریتم کے دھیان میں، کوئی کیا جان سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں، کیا کرتی ہوں اور کیا سوچتی ہوں؟ لیکن اب کاڑھنا اور بننا بھی میرے ذہنی انہماک کی پردہ دری نہیں کر سکتا۔

میں اپنے انھیں تصورات میں گم تھی کہ آہستہ آہستہ وسوسوں نے مجھے گھیرنا شروع کیا، اور میری روح میں گتھیاں ڈلنے لگیں۔ اب تصورات میں جسم کے تقاضے دخیل ہو رہے تھے۔ اس کشمکش کی وجہ سے رگ رگ میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ درد و کرب دامن گیر ہو گیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے اور ان کے جلو میں ہچکیاں ہم نفس بنتیں۔ بیچ بچاؤ کر میں آنسوؤں کو ضبط کرتی اور سانس روک کر ہچکیوں کو موقوف دیتی۔ بیکلی بڑھتی گئی، ایک آواز تھی جو میرے نفس کے انجان گوشوں سے اٹھتی، ہر رگ و پے سے ٹکراتی اور اسکی صدائے بازگشت سے میرے جسم کا رواں رواں کانپ جاتا۔ یہ آواز پہلے نرم تھی، پھر تلخ ہوئی، تلخی میں کرختگی پیدا ہوئی اور بالآخر آتش بن گئی۔ وہ آواز کیا تھی؟ ——— "تصور اللہ صورتگری کرے، پھر تصور رہے — تو، جو اپنے خیالی پریتم کی پجارن بنی ہے یہ جنون ہے، خامِ خیالی ہے باز آ، اپنی جان رائیگاں نہ کر، تو زمین کی رہنے والی ہے، زمین پر رہ، بادلوں کی دنیا میں نہ جا، تیری آتما اصنامِ خیالی سے تسکین نہیں پا سکتی۔"

کتنے ہفتے اسی حال میں گزر گئے۔ تصورات اور وسوسے ٹکراتے رہے، اب میں اپنے آپ سے وحشت کرنے لگی، میری روح اوہام کے اندھیرے میں بھٹک رہی تھی! پہلے میں سونا ہی نہیں چاہتی تھی، لیکن اب میں کوشش کرتی کہ سو جاؤں مگر کسی طرح نیند نہ آتی۔ پلک سے پلک ملنے کی کوشش میں کبھی کامیاب ہو بھی جاتی تو ایک بجلی سی کوندتی، دل دھڑکنے لگتا، ایسا محسوس ہوتا کہ میرا جسم بجلی کے تاروں سے مس ہو رہا ہے، میرا دم رکنے لگتا!

بیکلی کے یہی دن تھے کہ دلوں کے ٹوٹے ہوئے ناتے جوڑے، ایک تقریب میں

میں نے دیکھا کہ میرے دل کے مندر کی مورتی نے روح و قالب اختیار کر لیا ہے۔ وہ ہماری گورنٹ کا ایک کشیدہ قامت نوجوان تھا، بہت تندرد، بہت البیلا، اس کے تبسم میں اس کا دل جھلکتا تھا، وہ خاندان کے تمام نوجوانوں سے زیادہ شائستہ تھا اور شاعر بھی۔ میں اس کو دیکھکر ششدر رہ گئی۔ یہ اندازہ نہیں کر سکتی کہ اس کو دیکھکر خوشی زیادہ ہوئی یا حیرانی؟ حیرت کے ساتھ خوشی، خوشی کے ساتھ حیرت لازمی تھی؛ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میں اس سے بے خبر تھی، وہ مجھ سے۔ اس بات پر مسرت آمیز حیرت کیوں نہ ہوتی کہ تصور نے بہت کمل صورتگری کی۔ شاید تمہارا خیال اس طرف جائے کہ مجھے خوشی اس بات پر ہوئی کہ میں نے اپنے تصور میں پریتم کو دیکھ لیا، نہیں، یہ بات نہیں۔ مجھے خوشی اس بات پر ہوئی کہ وہ بھی مجھے دیکھکر حیران رہ گیا۔ غیر متوقع کامیابی کی مسرت اس کے چہرہ پر نمایاں ہوئی، آنکھیں مسکرائیں، خوشی کے آنسو نکلے اور اس کے رخساروں میں جذب ہو گئے۔ اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ شاید اس کے تصور نے بھی کوئی صورتگری کی تھی!

میں اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور تھی۔ مسرور کیوں نہ ہوتی۔ مجھے میرا تصوری پریتم مل گیا تھا۔ اب میں بھی آسمانی دنیا میں تھی، جس میں پہنچ کر تم نے مجھے پریم کا گیت سنایا تھا لیکن پیاری سہیلی! تم خوش نصیب نہیں اور میں بدنصیب ہوں، تم نے چاہا اور تمہاری چاہ پوری ہوئی، مگر میری چاہ میرے لئے شجر ممنوعہ ہے! میری چاہ کو خوش کامی نصیب نہ ہوگی بلکہ جلا دیں۔ میری چاہ کو اپنی پسند کی بھینٹ چڑھا کر میرے مجھے شادی کے بازار میں میری مرضی کے خلاف بیچا جائیگا میرے دل کا خون کر کے مجھے دلہن بنایا جائیگا، کتنے سبک، دبلا اور الجھے ہوئے ہیں ہماری سماجی زندگی کے تار!—— میں سوچتی ہوں، پہروں سوچتی رہتی ہوں، کیا میری زندگی اس دریا کی مانند ہے، جو اس لئے نہیں بہتا کہ سمندر میں جا ملے بلکہ اس لئے بہتا ہے کہ ریگزار میں جا کے خشک ہو جائے! اب میں بالکل ایسے مندر کی پجارن ہوں جس کی مورت چھین لی گئی ہو، چھیننے والے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے صنم خانہ کو صنم سے محروم کر دیا، لیکن ہر شخص محمود نہیں ہوتا، اینٹ اور پتھر کے صنم خانہ کو ویران کیا جا سکتا ہے، دل کے صنم خانہ کو ویران نہیں کیا جا سکتا۔ جسم کی پوجا کا طریق اور ہے، دل کی پوجا کا طریق اور، زبان کو بولنے سے روکا جا سکتا ہے، آنکھوں کو بے نور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دل کو پریم سے نہیں روکا جا سکتا، پھول اور نکہت کی طرح ہم دونوں الگ نہیں کئے جا سکتے، ہم دونوں کی زندگی ایک ہے، ایک ہی رہے گی۔ میں نے محبت کی بلندیوں پر چڑھ کے ایک سندر پریتم کو پایا ہے، میں محبت کی توہین نہیں کر سکتی۔ میں اس کی خاطر تیکھی نظروں اور خاموش جھڑکیوں کو برداشت کر رہی ہوں، برداشت کرتی رہوں گی یہ نہیں ہو سکتا کہ طاقتیں میرے خط سفر کو بدل دیں اور میں ادھر نہ جاؤں، جدھر مجھے جانا چاہئے اور ادھر چلی جاؤں، جدھر مجھے نہیں جانا چاہئے۔ کوئی ناگ چھپا کر پالا جا سکتا ہے، میں اپنے آپ کو چمگادڑ نہیں بنا سکتی، جو تاریکی میں رہتی ہے اور جب اڑتی ہے تو الٹی!

یہ ہے میری بپتا، مجھیں پیاری سہیلی! اس ابتلا، اس بحران بے پایاں اس اندوہ محبت نے مجھے غم کا لباس پہنا دیا ہے۔ صرف ایک آرزو ہے کہ وہ مجھے مل جائے جس کو میں نے دل اور عقل کے مشورہ سے اپنا جیون ساتھی بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں تمہاری ہوں، میری اور تمہاری زندگی ایک ہے لیکن کیا میری آرزو پوری ہوگی؟ آہ، نہیں جانتی، کچھ نہیں جانتی۔ یہ سست تو یہی خیال زندگی کا سہارا ہے کہ دل جیت لیا اور دل ہار دیا۔

جلیب اشعر

سرودِ ازل

مری لغزشوں نے گرا دیا، مجھے خاکدانِ خراب میں
میں وگرنہ خلد کی روح ہوں جو ہے اک کی جلب میں

یہ میں کن حدود میں آگیا! کہ عدم سے بود میں آگیا
قفسِ شہود میں آگیا، فقط ایک کن کے جواب میں

جسے اصلِ بندگی کہہ سکوں، جسے عینِ زندگی کہہ سکوں
کوئی ایسا سجدہ نہ مل سکا مری پوری عمرِ حساب میں

مجھے ایسا اشک بھی کر عطا، یہ ترے کرم سے ہے التجا
کہ میں ڈوب جاؤں مع خطا، اسی ایک قطرۂ آب میں

جسے کہہ رہا ہے بہار ہے، وہ سراب شعبدہ کار ہے
یہ فریب نقش و نگار ہے جو بپا ہے عالمِ خواب میں

ابوالاسرار رمزی اٹاوی

بھولے بچھڑے خواب

یہ سہانی کہکشاں اور یہ مہ و انجم حسیں، یہ مرے اشکوں کے شاہد میرے رازوں کے امیں
دن کے ہنگامے میں کتنی تلخیاں سہتی ہوں میں شب کی تنہائی میں اِن سے دردِ دل کہتی ہوں میں
کِس قدر بیرنگ و محزوں، کس قدر بیکار دن مانگ لاؤں کِس سے یارب کیف زا دو چار دن!
جلوۂ بے رنگ بنکر سامنے آتا ہے دن کتنے پھیکے نقش دل پر چھوڑ کر جاتا ہے دن!
جب غروبِ مہر سے رنگین ہو جاتی ہے شام جیسے پھاگن رُت میں ہولی یا شرابِ لالہ فام
میکدہ بردوش سائے جب بڑھاتے ہیں قدم جیسے کوئی کھول کر بدلی میں رکھ دے جامِ جم
اس طرح شب کی پری آتی ہے پَر تولے ہوئے جیسے کوئی نازنیں زُلفِ رسا کھولے ہوئے
رات کے دامن سے جسدم جھانکتا ہے ماہتاب جس طرح دُلہن اُٹھا دے اپنے چہرے سے نقاب
بادِ شب کی سرسراہٹ ہے کہ آوازِ رباب جیسے عاشق کا تصور، جیسے اک شاعر کا خواب
سارا عالم نیند کے افسوں میں کھو جاتا ہے جب ذرّہ ذرّہ دہر کا مدہوش ہو جاتا ہے جب
یہ ہوائیں آتشیں نغمے سُناتی ہیں مجھے اپنی بُھولی داستانیں یاد آتی ہیں مجھے
عہدِ رفتہ کی کہانی دل میں دہراتی ہوں میں گاہے کچھ کھوتی ہوں میں اور گاہے کچھ پاتی ہوں میں
کیوں بھٹکتی ہیں نگاہیں چار سُو دیوانہ وار رُوحِ مضطر کو ہے جانے کِس کا پیہم انتظار
الحذر اے یادِ ماضی کیوں ہے اتنا انتشار! الحذر اے سوزِ پنہاں کیوں برستے ہیں شرار!
ہمت اے بیتاب دل، ہشیار اے تمکین و ہوش! حوصلہ اے نامرادی، ضبط چشمِ غم فروش!
کیا نہیں ہے یاد تم کو پیرِ ہندی کا پیام سینکڑوں سجدے اُسے اور روح کو اُس کی سلام!
"ہستیٔ عالم میں ملنے کو جُدا ہوتے ہیں ہم عارضی فرقت کو دائم جانکر روتے ہیں ہم"
سوزِ فرقت ہی سے روشن ہے شرارِ زندگی بُجھ نہیں سکتی کبھی شمعِ مزارِ زندگی!

منکشف اب دل پہ رازِ منزلِ مقصود ہے
ڈھونڈتی تھی جسکو وہ تو دل ہی میں موجود ہے

شیریں

ہمارا ترقی پسند ادب

گذشتہ جنگِ عظیم کی ہولناکیاں ختم ہونے پر دُنیا بھر نے ایک نئی کروٹ لی۔ ہر شعبۂ زندگی میں ایک بےچینی اور ایک خلش سی محسوس کی جانے لگی۔ جیسے یہ اپنا چولا بدلنے کے لئے گھبرا رہی تھی۔ نئی نئی اصلاحات کا مطالبہ شعوری و غیر شعوری طور پر کیا جانے لگا۔ سیاسیات، ادبیات اور اخلاقیات غرض ہر شعبۂ زندگی میں نئے نظام کی تخلیق ہونے لگی۔ نئی چیز عموماً نامکمل ہوتی ہے۔ زمانے کے مسلسل مدوجزر اُس میں پائداری اور تکمیل کے تیور پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حال جنگِ عظیم کے بعد نئے نظاموں کا ہوا۔ چونکہ جنگِ عظیم کے بعد فاتح قوموں کی طرف سے انتہا پسندی کا رویہ ظاہر ہوا اس لئے مفتوح قوموں میں بھی انتہا پسندی کا ردِ عمل انتہائی درجہ میں پیدا ہو گیا۔ چونکہ یہ دونوں نظام —— فاتح و مفتوح قوموں کے —— ایک قسم کی ضد، غلط غرور اور تشدد پسندی پر قائم کئے جا رہے تھے اس لئے کسی قسم کی دور اندیشی سے کام نہ لیا جا سکا بلکہ صرف موجودہ حالت کو بدل دینے کی تدبیریں زیرِ غور رہیں۔ یہ سوچنے کا موقعہ نہ تھا کہ انکے آئندہ نتائج کیا ہونگے۔ یہی عجلت پسندیاں اور تشدد دکبر موجودہ جنگ کی ہولناکیوں کے ذمہ دار ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کے دوش بدوش ادبیات میں بھی عجلت پسندی سے کام لیا گیا —— حالانکہ ادب ایک مستقل چیز ہے اور اسکی بنیادوں میں ذاتی اغراض کو شامل کر دینا اُسے تباہ کر دینے کے مترادف ہے۔ "ذاتی اغراض" سے میرا مطلب "ذاتی پروپیگنڈا" ہے

روس نے سب سے پہلے ادب کو اپنا ذریعۂ تبلیغ بنایا۔ چونکہ اس کا پس منظر بہت پُرفضا اور تابناک تھا اور خدمتِ خلق کے لئے یہ آواز اُٹھائی گئی تھی۔ اس لئے ہمدردی کے بھوکے ملکوں نے اسکو سر آنکھوں پر جگہ دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اگر واقعی روس محض ننگے بھوکے انسانوں کی خدمت اور امداد کا علم بلند کرتا تو آج یہ جنگِ عالمگیر ظہور پذیر نہ ہوتی۔ وجہ یہ تھی کہ یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح روس دُنیا کی حمایت کا خواہش مند تھا اور اُس کے لئے ضروری تھا کہ وہ دُنیا کے سامنے ایک ایسے لبادے میں لپٹا ہوا آئے جس پر نشتر پیوند لگے ہوں، وہ جانتا تھا کہ جنگِ عظیم کی مسلسل تباہیوں سے تھکی ہوئی آنکھیں آرام لینے کی کوشش کر رہی ہیں اور وہ اس قابل نہیں کہ خستہ لبادے کو چیر کر چیرہ ویرانیاں کو دیکھ سکیں۔ روس کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح تھا لیکن —— اس میں پائداری نہ تھی۔

دوسرے غریب غلام ممالک کی طرح ہندوستان نے بھی روس کی ہمدردنظروں سے ایک فوری اثر قبول کیا، یوں تو ہر شعبۂ زندگی میں نامکمل و مکمل طور سے اسکی آؤ بھگت لی گئی۔ لیکن ہندوستانی ادب نے عموماً اور اُردو ادب نے خصوصاً روسی ادب کی بہت سی خصوصیات اپنے آپ میں جذب کر لیں۔ ادب کی دو قسمیں کر دی گئیں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ آیا "ادب برائے ادب" کبھی تھا بھی یا نہیں بلکہ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ادب اُردو نے موجودہ دور میں "ادب برائے زندگی" کا نظریہ اپنے پیشِ نظر رکھا۔ یہ تین الفاظ واقعی بہت خوبصورت ہیں اور عام طور پر ان کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر ملک کے ادب میں اس ملک کی معاشرت اس طرح دکھائی جائے کہ اُس کے حقیقی خدوخال واضح اور نمایاں ہو جائیں۔

نہیں کہا جا سکتا کہ "ادب برائے زندگی" کے نظریے کے موجد کے دماغ میں ان الفاظ کے معنٰی بھی یہی تھے جو موجودہ اُردو ادب میں لئے جاتے ہیں یا اور کچھ لیکن اگر ان الفاظ پر دل و دماغ کو دعوتِ فکر دی جائے تو مذکورہ بالا معنٰی کے علاوہ بھی کچھ اور نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ ادب اور زندگی ایک دوسرے کے لئے اُس وقت ناگزیر ہو سکتے ہیں جب دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہو۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ زندگی ادب کے لئے کہاں تک ضروری ہے اور پھر ادب زندگی کو کہاں تک متاثر کرتا ہے۔

زندگی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ کچھ اتنی متضاد حیثیت رکھتی ہے کہ ہمیں ایک ہی جگہ مثبت و منفی عناصر کا اجتماع مل جاتا ہے۔ یہ متضاد عناصر جب محسوسات پر اثر انداز ہوتے ہیں تو آدمی کے منہ سے ایک چیخ نکل جاتی ہے چاہے وہ خوشی کی ہو یا رنج کی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر ہم ایک چیز کو ایک پہلو سے دیکھتے ہیں تو ہنسی چھوٹ جاتی ہے اور اگر دوسرے پہلو پر نظر جاتی ہے تو آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگتا ہے۔ یہی وہ حالتیں ہیں جن میں بے اختیارانہ طور پر خیالات شعر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم ہر چیز کو ایک پیہم کشمکش میں دیکھتے ہیں اور ہمیں اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ ہمدردی ہمیشہ کے لئے قائم رہتی ہے اس کے برخلاف کبھی کوئی چیز ہمیں مسکرانے کی دعوت دیتی ہے ہم ہنسنے لگتے ہیں اور ہنستے چلے جاتے ہیں اور یہ خوشی عرصے تک دل میں باقی رہتی ہے۔ تیسری صورت میں ہم دونوں کا لطف

مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم انسان کو بحیثیت انسان کے دیکھتے ہیں۔ ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ایک آدمی زندگی بھر نہیں رو سکتا۔ ہمیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم ہمیشہ خوش بھی نہیں رہ سکتے۔ قہقہوں کے بعد آنسو بہنا ضروری ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو زندگی میں جمود پیدا ہونے لگے۔ ہمیں رونے کے بعد ہنسنا چاہیئے چاہے وہ زہرخند ہی کیوں نہ ہو۔ میر قنوطی شاعر مشہور ہیں —— لیکن وہ بھی ہنستے ہیں۔ دُنیا سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں اور انھیں نیم باز آنکھوں میں "ساری مستی شراب کی سی" دکھائی دینے لگتی ہے۔ سودا ہنسنے ہنسانے والے مشہور ہیں لیکن کیا انکے قہقہوں کے پیچھے ایک کسک سی نہیں معلوم ہوتی؟ یہیں آکر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور ادب کا کتنا گہرا تعلق ہے اسی سے ہمیں اسکا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ ایک ادیب کو —— جو "ادب برائے زندگی" کا قائل ہے —— زندگی کے دونوں متضاد پہلوؤں پر نظر ڈال کر انھیں نہایت ایمانداری سے الفاظ کا جامہ پہنانا چاہیئے۔ تاکہ فطرت نگاری جو ادب کی شہ رگ ہے، قطع نہ ہونے پائے۔ کسی مرض کے علاج کے لئے مریض کے حالات سے پوری واقفیت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ جب ہم زندگی کی کمزوریاں دُور کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کمزوریوں سے واقف ہونا پڑتا ہے تاکہ صحیح علاج ہو سکے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اصل مرض کی تحقیق کر بھی لی جائے تو علاج کا کیا طریقہ ہو؟ یہاں آکر دوسری بحث کا آغاز ہو جاتا ہے لیکن گھبرانا نہ چاہیئے کیونکہ "ادب برائے زندگی" کے نظریہ میں اسکا بھی جواب پوشیدہ ہے ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ زندگی جتنی ادب کے لئے ضروری ہے۔ اتنا ہی ادب زندگی کے لئے ضروری ہے۔

ابھی تک ہم نے ادب کے لئے زندگی کی ضرورت پر بحث کی تھی اب ہمیں بتانا ہے کہ زندگی کو ادب کی کتنی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں جھجک نہیں ہے کہ ادب زندگی کے لئے کہیں زیادہ مفید ہے۔ گو زندگی ہی سے ادب کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس ادب کو ہم "ادب برائے زندگی" کہتے ہیں اسکی خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ زندگی کو فائدہ پہنچائے۔ دراصل "ادب برائے زندگی" کا کام مرض کی تشخیص کرنا نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے رستے ہوئے ناسوروں کے لئے پھایا، روتی ہوئی آنکھوں کے لئے رومال، دردکش بے بس ہستیوں کے لئے دستِ شفقت ثابت ہوتا ہے وہ ایسے طریقے بتاتا ہے جس سے دُنیا کی بدنصیب آبادی کی تسکین و تسلی ہو سکے۔ اسکا کام یہ ہے کہ زندگی کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنائے۔ لیکن اس کے ساتھ اسکی نظر میں یہ حقیقت بھی رہنی چاہیئے کہ انسان فرشتہ نہیں اس کے پیش کردہ طریقے اس قدر آسان اور مطابق فطرت ہونے چاہئیں کہ جنھیں عمل میں بھی لایا جا سکے۔ غرض جب زندگی ادب پر صحیح واقعات کا عکس ڈالتی ہے تو ادب ان حقائق کے پیشِ نظر مناسب ردّ و بدل کرتا ہے۔ گویا زندگی مریض ہے اور ادب طبیب۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا موجودہ اُردو ادب میں ادب برائے زندگی کے دونوں اصولوں یعنی تشخیص و تجویز پر پوری طرح غور و فکر کیا جاتا ہے یا نہیں۔ ہمیں یہ دیکھکر سخت مایوسی اور اُس کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے کہ یہاں صرف [illegible] پر اب تک عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ اور وہ ہے تشخیص۔ ہمارے ادیب جس چیز کو جس حالت میں جس جگہ دیکھتے ہیں اُسکا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں اور وہ بڑی حد تک کامیاب ہوتا ہے لیکن دوسرا پہلو —— علاج —— شاید اب تک مستحق توجہ نہ سمجھا جا سکا۔ وہ مظلوم عورتوں کی آبروریزی کا نقشہ نہایت پُردرد الفاظ میں کھینچ سکتے ہیں وہ سنگدل سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں کی پول کھولنے میں ماہر ہیں لیکن نہ جانے کس وجہ سے ان زیادتیوں کے سدِ باب سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

ایک عام شخص اور ایک ادیب میں یہی فرق ہے کہ عام آدمی کسی حالت سے متاثر ہو کر رہ جاتا ہے لیکن ادیب اس حالت کے وجوہ۔ اسکے نتائج اور اُسکی تعمیر یا تخریب کے ذرائع پر بھی غور کرتا ہے اور پھر اپنا نتیجہ دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے "سلطنتوں کو اُلٹ دینے کے لئے اور ذہنوں میں انقلابی رَو دوڑا دینے" کے لئے ایسے ہی ادیبوں کی ضرورت ہے اور درحقیقت یہی لوگ "ادب برائے زندگی" کے علمبردار کہے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا، ادب ایک مستقل چیز ہے اس کے لئے نہایت غور و فکر کی ضرورت ہے وہ پُرجوش ادیب جو "ادب برائے زندگی" کا نام سُن کر غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں دراصل ادبِ اُردو کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں، وہ صرف ایک پہلو کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں اور چونکہ یہ پہلو بغیر دوسرے پہلو کے نامکمل اور بے تکا ہے اس لئے سنجیدہ طبقہ اس سے غیر مطمئن ہے۔ ہمارے نادان اطبائے ادب نے پھوڑے میں نشتر لگا کر چھوڑ دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں عفونت اور گندا خون کے سوا کچھ حاصل نہیں اگر یہ پھوڑا اس طرح رہا تو ایک دن ناسور بن کر ناقابلِ علاج ہو جائیگا۔ ضرورت ہے کہ اس پر عمل جراحی کیا گیا ہے تو مرہم کا بھی انتظام کیا جائے ورنہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی حالت پر رہے۔

سید محمد منتظر رضوی اکبرآبادی

مقام دوست

آسماں خود ترے کوچے کی زمیں ہے اے دوست
اے زہے اوج کہ تو عرش نشیں ہے اے دوست

یہ سماں اور دو عالم میں کہیں ہے اے دوست
ہر نظر کے لئے اک نقش حسیں ہے اے دوست

پائے اقدس پہ ترے میری جبیں ہے اے دوست
میں قریں تیرے ہوں تو میرے قریں ہے اے دوست

نقش تعمیر یہاں نقش دگر ہے کہ نہیں
یہ زمیں مرکز صد حسن و نظر ہے کہ نہیں

رنگ لاتا ہے یہیں شام و سحر کا عالم
دیکھتے رہئے یہاں شمس و قمر کا عالم

ہر طرف اور ہی الفت کے اثر کا عالم
دل کے عالم سے جدا گانہ نظر کا عالم

نظر افروز ہے ہر جلوۂ معصوم یہاں
دیکھنے والا نہیں دید سے محروم یہاں

زندگی باقی ہے ہر ہستیٔ موہوم یہاں
موت کیا ہے یہ کسی کو نہیں معلوم یہاں

کھینچ لایا ہے مجھے جذبۂ کامل اے دوست
بن گئی اب مری منزل تری منزل اے دوست

ذرّہ ذرّہ ہے محبّت کا پرستار یہاں
ایک اک شے سے عقیدت کا ہے اظہار یہاں

خارج از بحث ہے خود ہستیٔ اغیار یہاں
جو ہیں نااہل وہ پاتے ہی نہیں بار یہاں

کس کی سرکار سجانے کو ہے دربار یہاں
ہر نظر حسن کی ہے غاشیہ بردار یہاں

کعبہ و طور شرف پائیں جو یکجائی کا
یہیں موقع ہے دو عالم کو جبیں سائی کا

امتحاں اپنی نگاہوں کا ہے منظور یہاں
یوں ہی لہراتی رہے برق سر طور یہاں

چشم نظارہ ہے اور جلوہ مستور یہاں
لاکھ پردے سہی چھنتا ہی رہے نور یہاں

عام ہے میکدۂ عشق کا دستور یہاں
جو بھی ہے جرعہ کش بادۂ منصور یہاں

ہاں سجائی ہے یہیں بزم حقیقت میں نے
ہاں یہیں پائی ہے معراج محبت میں نے

مانگی ہیں اس کے لئے کتنی دعائیں میں نے
بارہا دی ہیں محبت کو صدائیں میں نے

دیکھے جب اپنے قریں خلوت و ایواں میں نے
خود اٹھائے ہیں حجابات درخشاں میں نے

پھر بسی کیوں نہ رہے عشق کے دیوانوں کی
یہیں آباد ہے دنیا مرے ارمانوں کی

تو مرا کعبۂ جاں ہے تری عظمت کی قسم
تجھ پہ قربان ہوں ایمانِ محبت کی قسم

یہ عنایت کہ نگاہوں کو جوانی دے دی
پہلے ہی دل کو محبت کی نشانی دے دی

رابطہ جتنا ہے اے دوست ترے دل سے مجھے
اس سے بڑھ کر ہے تعلق تری منزل سے مجھے

اپنے دل کو یہیں آسودۂ منزل کر لوں
مقصدِ زندگیٔ عشق کو حاصل کر لوں

حرزِ جاں کر ہی لیا ہے ترا نام اب اے دوست
نقش دل ہو کے رہے تیرا مقام اب اے دوست

آغا ز برہانپوری

تمثیلچہ

رشید یائی

ہارا کون؟

افراد:-

شاہد ـــــ ایک لااُبالی قسم کا انسان، کالج کا پروفیسر، نیا شادی شدہ۔
ثریا ـــــ شاہد کی بیوی۔ تعلیم یافتہ۔
ارشد ـــــ شاہد کا شیرخوار بچہ۔
جمیل ـــــ شاہد کا بے تکلف دوست
شیخانی ـــــ ماما اور کھلائی۔

(منظر:- ایک آراستہ کمرہ ـــــ شاہد اور ثریا یوں گفتگو کا آغاز کرتے ہیں)

شاہد۔ ثریا، کیا کھانا تیار ہے۔ مجھے آج کالج ذرا جلدی جانا ہے!

ثریا۔ کھانا بس تیار ہی ہوا چاہتا ہے۔ کیا کوئی خاص کام ہے؟

شاہد۔ ہاں خاص ہی سمجھو ـــــ کیا پکوایا ہے آج؟

ثریا۔ ماش کی دال اور بینگن کا بھرتہ ـــــ

شاہد۔ ماش کی دال کی بابت تو خیر میں نے ایک مرتبہ افغانی پٹھان کو کہتے ہوئے سُنا تھا کہ اگر ہندوستان میں کوئی قوت بخش شے ہے تو وہ ماش کی دال ہے ـــــ لیکن یہ بینگن کا بھرتہ آخر تم کیوں پکایا کرتی ہو۔

ثریا واہ! آپ کو معلوم نہیں کہ بینگن میں بہت کافی "پروٹین" پائی جاتی ہے

شاہد (مذاق کے لہجہ میں) کیا خوب؟ تمہاری ہائجین دنیا سے نرالی ہے۔ یہ تم سے کس نے کہدیا کہ بینگن میں "پروٹین" پائی جاتی ہے؟!

ثریا۔ اچھا ـــــ دیکھو ـــــ یہ "عصمت" کا تازہ پرچہ ـــــ اس میں دیا ہوا ہے کہ نہیں!

شاہد۔ لاحول ولا ـــــ "عصمت" کا تازہ پرچہ ـــــ کیا خوب ـــــ بھلا یہ بھی کوئی قابلِ قبول دلیل ہو سکتی ہے۔ ارے تم کو تو ہائجین کی کوئی انگریزی کتاب دیکھنا چاہئے تاکہ صحیح واقفیت ہو سکے۔

ثریا۔ تو کیا اتنے بڑے رسالہ میں جس بہن کا مضمون ہے وہ بغیر تحقیق اور معلومات ہی کے شائع ہو گیا ہے!

شاہد۔ استغفراللہ ـــــ مجھے مضمون نگار پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ـــــ غالباً ـــــ اس میں ولایتی بینگن ہونا چاہئے ـــــ لفظ ولایتی رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ ٹماٹر ایک ایسی چیز ہے جس میں بہت کافی حیاتیں ہوتی ہیں۔

ثریا ولایتی بینگن اگر مقصود ہوتا تو ٹماٹر زبان زدِ خاص و عام ہے ـــــ ٹماٹر ہی لکھا جاتا لیکن ـــــ!

شاہد (بات کاٹکر) اچھا ـــــ کل میں ایک کتاب لاؤنگا ـــــ اس میں دیکھکر یہ قصہ طے ہو جائیگا۔ ارے شیخانی ـــــ او شیخانی۔

شیخانی (آتے ہوئے) جی سرکار!

شاہد۔ ارشد سو گیا؟

شیخانی۔ سو تو گئے ہیں سرکار ـــــ لیکن ابھی افیون دینا باقی ہے۔

شاہد۔ (متعجب ہو کر) ہائیں ـــــ یہ افیون کیسی؟ ثریا کیا تم نے ارشد کو افیون دینا شروع کر دی ہے؟

ثریا کیا کیا جائے ـــــ آجکل خدا جانے کیوں بہت روتا ہے ـــــ رو رو کر اپنی جان بھی آدھی کر لیتا ہے اور مجھے بھی پریشان کرتا ہے ـــــ اجابت پانی جیسی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں دانت نکل رہے ہیں یا کیا عذر ہے؟

شاہد۔ بھئی یہ افیون وفیون دینا تو ٹھیک نہیں۔ یہ کس کتاب میں تم نے دیکھا؟

ثریا۔ لیکن پھر گھر بار کیونکر کیا جائے۔

شاہد۔ شیخانی کس مرض کی دوا ہے؟

شیخانی۔ حضور میرا حساب کردیں اور کہا سنا معاف کریں۔ ہم سے یہ تیوں دن کی چیخ پکار نہیں سُنی جاتی سرکار۔ بچہ کا کھلانا عذاب ہوگیا ہے اور پھر حضور افیون دینا بھی بند کردیں گے تو نہ معلوم اسکی کیا حالت ہوجائیگی۔ ایک تو دن بھر کپڑے دھونا —— اوپر سے ——

شاہد (بگڑ کر) کیا بکتی ہو؟ اچھا اگر تجھے نوکری نہیں کرنا ہے تو کل تیرا حساب ہوجائیگا۔

ثریا آخر افیون دینے میں نقصان ہی کیا ہے۔ ہم نے تمام بڑے گھروں میں دیکھا ہے اور مجھے یاد پڑتا ہے —— شاید کسی رسالہ میں بھی میں نے ——

شاہد اچھا رسالوں کی بات تو تم رہنے دو —— کسی نے خوب کہا ہے کہ عورت کے اگر ناک نہ ہوتی تو ——

ثریا۔ (بات کاٹ کر) یہ کیا آپ کہتے ہیں۔ عورتوں ہی کی بدولت تو مردوں کی نشوونما تعلیم و تربیت اور عادات و اخلاق عالم وجود میں آتے ہیں —— عورت ——

شاہد (بات کاٹ کر) بس بس تم نے میرے دل کی بات کہدی۔ واقعی عورت ہی اپنے بال بچوں کی پرورش و پرداخت کی تمام تر ذمہ دار ہے اور یہی چیز تم پر واضح کرنا چاہتا تھا۔

(۹ بجتے ہیں)

اوہ —— نو ۹ بج گئے —— اچھا بھئی کھانا نکالو ——

آخر دیر ہو ہی گئی —— مجھے جلد پہنچنا ہے۔

——(اُسی روز شام کو)——

شاہد۔ ثریا —— لو یہ کتاب۔ اس میں پڑھکر تم کو معلوم ہوگا کہ کھانے کی چیزوں میں فیصدی کتنی قوت پائی جاتی ہے اور کون کون سی چیزوں کی کیا کیا تاثیر ہے —— یہ دیکھو (کتاب کے اوراق اُلٹ پلٹ کرنے کی آواز)

انڈا —— جس میں بہت زیادہ قوت دار عناصر پائے جاتے ہیں

یہ مچھلی —— یہ چاول —— یہ مونگ کی دال —— یہ ٹماٹر ——

دیکھو کہیں بھی اس میں بینگن کا ذکر ہے۔

ثریا۔ لیکن میرے خیال میں بہت سی چیزیں اس کتاب میں لکھنے سے رہ گئی ہیں

شاہد۔ کیا خوب! اس سے بہتر یقین پر دوسری کتاب نہیں، میں نے تمام لائبریری چھان ڈالی ہے، تب یہ کتاب دستیاب ہوئی ہے۔

ثریا۔ ایک مرتبہ میرے چچا ایک پرچہ "نگار" کا لاتے تھے جس میں باب الاستفسار میں اکثر کھانے کی چیزوں کا تذکرہ تھا۔

شاہد۔ ان رسالوں پر مت جاؤ —— میں نے تم سے بیسیوں بار کہا ہے کہ اُردو صحافت اسقدر تنگ و تاریک فضا میں پرورش پاتی رہی ہے کہ اسکی تیلیوں میں وہ جسارت نہیں کہ وہ زیادہ روشنی کی متحمل ہوسکے۔

ثریا۔ یعنی اس سے مراد کیا ہے —— آپکی؟ کیا اُردو دُنیائے صحافت توبہ توبہ محض بیکار اور لغو چیز ہے؟

شاہد۔ بیشک —— یقیناً اُردو جرنلزم کو ازسرِ نو اوور ہال OVER HAUL کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

(شیخانی داخل ہوتی ہے)

شیخانی بیگم صاحب، ارشد میاں کو لے لیجئے تاکہ میں نہا لیجے اور گدّے دھو ڈالوں۔

شاہد ثریا —— ارشد روز بروز دبلا کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ کیا اسکی شکایات ابتک رفع نہیں ہوئیں؟!

ثریا۔ آپ نے جو دوا لا کر دی تھی اُسکا استعمال تو برابر کیا گیا —— لیکن اُس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

شاہد۔ اچھا آج میں پھر ڈاکٹر سے حال کہونگا۔ لیکن تم نے پرہیز نہیں کیا ورنہ دوا —— یہ دوا تو بچوں کی بیماری کے لئے اکسیر ہے

اچھا ہاں —— میں بھول گیا —— دیکھو یہ ایک کتاب اور ہے —— زیادہ صفحات نہیں ہیں۔ اس میں تم کو بچوں کی پرورش و پرداخت کے ایسے اچھے اصول ملیں گے —— تم اسکو ضرور پڑھ ڈالو اور جہانتک ہوسکے گہرا مطالعہ کرتی رہا کرو —— ساتھ ہی ساتھ مضامین بھی لکھنا شروع کردو —— ملک و قوم کی یہ بھی ایک بڑی خدمت ہے سمجھیں۔ اس طرح تمہاری معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور قابلیت بھی بڑھیگی!

ثریا۔ بہتر ہے۔

——((دوسرے روز صبح))——

شاہد۔ ارے شبخانی — کھانا تیار ہے؟

شبخانی۔ سرکار ابھی چولہا جلایا ہے — اب ہانڈی چڑھانے جا رہی ہوں۔

شاہد۔ ہائیں — چولہا جلایا ہے — ۹ بج چکے ہیں اور ابھی تک کیا سو رہی تھی — تیرا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے۔

شبخانی۔ سرکار میرا قصور نہیں ہے — کیا کروں سویرے سے کپڑے دھو رہی تھی — پھر ارشد میاں کو نہلایا دھلایا — جب دودھ پیکر وہ سو گئے تو چولہے پاس آئی۔

شاہد۔ اور بیگم کہاں ہیں۔

شبخانی۔ مہمانوں والے کمرہ میں ہیں سرکار۔

(شاہد جاتا ہے)

شاہد۔ کیا ہو رہا ہے ثریا — ؟!

ثریا۔ مضمون لکھ رہی ہوں۔

شاہد۔ اچھا میں تو اب کالج جا رہا ہوں — سوا نو بج چکے ہیں۔

ثریا۔ کھانا کھا لیں نا — ۔

شاہد۔ کھانا ابھی تیار نہیں ہے۔

ثریا۔ سویرے سے تو آپ نہ معلوم کہاں چلے گئے تھے — ورنہ ارشد کو ذرا بہلا لیتے تو کھانا شبخانی تیار کر لیتی۔ میں تو صبح سے آپ کے کہنے کے مطابق مضمون لکھ رہی ہوں۔

شاہد۔ اچھا — ہاں — خیر ٹھیک ہے — آج جمعرات ہے پہلے دو گھنٹے میرے خالی ہیں۔ بہت ٹھیک ہے — تو میں جاتا ہوں — ہانڈی دیکھے لیتا ہوں —

(شاہد جاتا ہے)

شاہد۔ ارے شبخانی — کیا کر رہی ہو — مصالحہ وغیرہ تیار ہے!

شبخانی۔ جی ہاں تیار ہے — لیکن ابھی گوشت نہیں دھویا ہے۔

شاہد۔ گوشت کو مت دھویا کرو — دھونے سے اس کا ذائقہ جاتا رہتا ہے — سمجھیں —

شبخانی۔ جی — سمجھ گئی۔

شاہد۔ گھی کہاں ہے

شبخانی۔ اے حضور — آپ کاہے کو تکلیف کر رہے ہیں — میں ابھی تیار کئے دیتی ہوں — کہئے تو بیگم صاحب کو بلاؤں — ؟

شاہد۔ نہیں نہیں — بیگم صاحب مضمون لکھ رہی ہیں — لہذا میں نے یہ سوچا کہ خود ہی دیکھ بھال کر لوں!

شبخانی۔ جیسی آپ کی مرضی — یہ لیجئے گھی کا مرتبان — پیاز تو کاٹ لوں؟

شاہد۔ پیاز کا کیا ہوگا — پیاز سے گوشت نہیں بگھارا جاتا ہے — ونگ سے یا میتھی سے بگھارا کرو — آئندہ ہرگز ایسا نہ کرنا — اچھا بتاؤ ترکاری کونسی لائی ہو۔

شبخانی۔ ٹماٹر ہیں سرکار۔

شاہد۔ ٹھیک ہے — لیکن گوشت جب تیار ہو جائے تو ٹماٹر کاٹ کے ملا دینا — —

شبخانی۔ کچے نہ رہیں گے حضور

شاہد۔ کچے — کچے ہی تو رہنا چاہئیں — تاکہ اس کا اثر زائل نہ ہو —

(بچہ کے رونے کی آواز)

شاہد۔ اچھا شبخانی میں پھر آؤنگا — ارشد اٹھ بیٹھا ہے ذرا اس کو باہر لئے جاتا ہوں — اور ہاں دیکھو تم میرے کہنے کے مطابق سب کام کرنا —

شبخانی۔ بہت اچھا سرکار

(شاہد جاتا ہے)

شاہد۔ راجہ میاں اٹھ بیٹھے — آؤ آؤ — روتے کیوں ہو چلو تمہیں سیر کرائیں —

(دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے)

شاہد۔ اس وقت کون آ دھمکا —

(بچہ کو گود میں لئے باہر جاتا ہے)

جمیل۔ ہلو شاہد

شاہد۔ اوہ — جمیل — تم کب آئے — جھانسی سے آ رہے ہو کیا؟

جمیل۔ ہاں بھئی مجھے آج ہی دوپہر کی ٹرین سے فیض آباد جانا ہے۔ بہت ضروری کام ہے میں نے سوچا ٹرین میں دیر ہے جبتک تم سے ملاقات کر لی جائے

کچھ دلچسپی رہے گی ——

شاہد- اور کہو —— سب خیریت ہے۔

جمیل- خدا کا شکر ہے —— تمہارا بچہ بہت کمزور دکھائی دیتا ہے کیا بات ہے؟

شاہد- کچھ اس طرف بیمار ہو گیا تھا —— اچھا آؤ —— دیکھو میں کمرہ کھولتا ہوں ——

(اندر جاتا ہے)

شاہد- ثریا ثریا —— ذرا تم ہٹو تو یہاں سے —— دیکھو جمیل بھائی بھی آگئے ہیں، فیض آباد جا رہے تھے —— تھوڑی دیر یہاں قیام کرینگے —— اور ہاں دیکھو کھانا بھی یہیں کھائیں گے —— تم ذرا جلدی تو جاؤ باورچی خانہ میں —— دیکھو کھانے میں کیا دیر ہے!

ثریا- (انہماک کے عالم میں) ذرا ٹھہریئے —— ایک پیراگراف اور باقی ہے —— بس یہ آخری ہے۔

(سکوت)

شاہد- ارے ڈرائنگ روم میں جا کر لکھ لو —— جمیل باہر کھڑے ہوئے ہیں۔

ثریا- دیکھئے ابھی گئی —— ذرا خاموش رہئے —— ورنہ میں سب کچھ بھول جاؤنگی ——

(سکوت)

شاہد- ارے بھئی کسی کا کچھ خیال بھی ہے کہ نہیں ——

ثریا- اُفوہ —— وہی ہوا نا آخر —— سارے خیالات خبط ہو گئے —— میں نے کیا کیا سوچا تھا اور ——

(شاہد باہر جاتا ہے)

شاہد- ہاں تو بھئی جمیل —— کہو کیسی گذر رہی ہے۔ شادی تو تمہاری ہو گئی ہے نا —— کوئی بچہ!

جمیل- ہاں بھئی شادی کے سال بھر بعد ہی ننھے میاں کا ورود مسعود ہو گیا ہے لیکن دوست سچ تو یہ ہے کہ صاحبزادے کا شانِ نزول میرے لئے نوع بہ نوع آلام اور تفکرات کا باعث بن گیا ہے ——

(شاہد کا قہقہہ)

شاہد- بھئی خوب —— کیوں خیریت تو ہے؟

جمیل- خیریت دیریت تو سب کچھ ہے —— لیکن وہ برخوردار تنگ بہت کرتے ہیں۔ تمہارے صاحبزادے کی طرح سیدھے سادے نہیں کہ کاندھے سے لگے سوتے رہیں۔

شاہد- ارے یہ نہ کہو —— یہ بھی بڑے حضرت ہیں —— بڑی مشکل سے ابھی ابھی سوئے ہیں!

جمیل- خیر —— یہ حرکت تو میں کرتا نہیں کہ خود سلئے لئے پھروں —— لیکن ساری پریشانی تمہاری بھابھی کو ہے —— نہ کھانا پکانے دیتے ہیں —— نہ دوسرا کام کاج کرنے دیتے ہیں بس دن بھر گودی میں سوار رہتے ہیں۔

شاہد- میرے یہاں تو ماما ہے —— کھانا وغیرہ پکا لیتی ہے —— میں بھی اکثر دیکھ لیتا ہوں —— لیکن ہاں ان حضرت کی وجہ سے تمہاری بھابھی کو مضمون نگاری میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

جمیل- (قہقہہ) —— خوب —— خوب —— بہت خوب —— تو یوں کہو کہ تم نے کام کی تقسیم کر لی ہے یعنی تم کھانا دیکھتے ہو —— بچہ کو بہلاتے ہو اور بھابھی مضمون لکھتی ہیں اور غالباً مطالعہ بھی کرتی رہتی ہونگی ——

(شاہد اور جمیل دونوں ہنستے ہیں)

شاہد- (سنجیدہ پیرایہ میں) بھئی اسکی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے کہ امورِ خانہ داری اولاد کی پرورش اور تربیت اور دیگر گھریلو معاملات اکثر عورتوں کو قطعی نہیں معلوم ہوتے —— اگر کچھ عورتیں ان سب چیزوں سے واقف بھی ہوتی ہیں تو وہ اصولی طور پر غلط ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں محض لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں —— لہذا عورتوں کی تربیت اور اصلاح نہایت ضروری ہے —— تم خود بھی اسکی اہمیت کو ——

جمیل- (بات کاٹ کر) ہاں ہاں —— میں اسکی اہمیت کو خوب سمجھتا ہوں —— تو گویا بھابھی اپنا بیشتر وقت مطالعہ اور مضمون نگاری میں صرف کرتی ہیں —— اور تم ——

شاہد- (چونک کر) ارے —— اللہ —— میں ابھی آیا ——

(اندر جاتا ہے)

شاہد۔ ارے ثریا تم ابھی تک یہیں ہو ——— اب چلو تو یہاں سے ———

ثریا۔ ایک منٹ ——— ایک ——— ایک ——— منٹ ———

شاہد۔ کچھ نہیں ——— معلوم ہے کہ باہر جمیل کھڑے ہیں ——— پھر بھی تم ان کے لئے کرد میں دھرنا دیئے بیٹھی ہو ——— چلو بس اب یہاں سے فوراً جاؤ ———

ثریا۔ ارے ——— ارے ——— دوات ——— دیکھو گر پڑی ——— لو آخر سارا صفحہ خراب ہو گیا نا ——— جاؤ ہٹو بھی ——— ساری محنت پر پانی پھر گیا ———

(ثریا جاتی ہے) (شاہد دروازہ کھولتا ہے)

شاہد۔ آؤ بھئی جمیل ——— اندر آؤ ———

(جمیل داخل ہوتا ہے)

جمیل۔ بھئی شاہد ——— اب تو وقت بہت تنگ ہے ——— (گھڑی دیکھکر) صرف ڈیڑھ گھنٹہ گاڑی میں باقی ہے ———

شاہد۔ اچھا تو بہتر یہ ہوگا کہ آؤ ریسٹورانٹ چل کر کچھ کھا پی لیں ——— میں نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے اور شاید تم بھی ——— !

جمیل (بات کاٹ کر) کیوں ——— کیا بات ہے ——— کیا ماما موجود نہیں ——— ؟

شاہد۔ نہیں ماما تو موجود ہے ——— لیکن سچی بات یہ ہے کہ ثریا مضمون لکھتی رہیں اور میں بچہ کو کھلا رہا تھا ——— کچھ دیکھ بھال نہ ہو سکی شیخانی ابھی تک کھانا تیار نہیں کر سکی ہے !

جمیل۔ اچھا شیخانی ہو کر کھانا جلد تیار نہیں کر سکتی ——— عورتوں کا کام تو خود عورتیں ہی بہت ہوشیاری، اطمینان اور عجلت سے کرتی ہیں تعجب ہے کہ ———

شاہد۔ (بات کاٹ کر) یہ ٹھیک ہے ——— لیکن شیخانی ابھی نوشق ہے کھانا پکانا نہیں جانتی ——— اگر پکاتی وکاتی بھی ہے تو کچا پکا

جمیل۔ تو کیا بھابی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں ؟

شاہد۔ اُن کو مضمون نگاری سے فرصت نہیں ملتی

جمیل۔ (ہنسکر) خوب۔ عورت کو مضمون نگار ہونے کے بجائے امور خانہ داری کا منتظم اور نگران ہونا ضروری ہے ———

شاہد ارے بھئی ——— امور خانہ داری، پرورش اولاد اور دیگر باتوں کے اصول بھی تو پہلے معلوم ہونا چاہئیں ——— بھلا بیوی کریگی تو کیا ——— یہی وجہ ہے کہ میں نے اُن کو کتب بینی اور مضمون نگاری پر توجہ دلائی ہے تاکہ اُنکی اصلاح ہو سکے ——— اور وہ ایک سلیقہ مند بیوی بن سکیں۔

جمیل۔ نہیں ——— یہ تمہارا خیال غلط ہے شاہد ——— ایک عورت خوب جانتی ہے کہ اپنی حسب حیثیت اور ضرورت کھانا کس طرح پکایا جاتا ہے اور ایک ماں خوب جانتی ہے کہ اپنے بچہ کی پرورش اور تربیت کس طرح کی جاتی ہے ——— قدرت خود اُس کو سب کچھ سکھا دیتی ہے ——— مرد کا کام بچہ کھلانا اور باورچی خانہ میں حکمرانی کرنا نہیں ——— مضمون نگاری، کتب بینی فرصت کی چیزیں ہیں ——— عورتوں کا گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر مضمون نگاری کرنا کوئی احسن فعل نہیں ہے۔ بہتر طریقۂ زندگی کو رواج دینا مردوں کا فرض اوّلیں ہے ——— تم نے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ تمام تر مہمل اور لغو ہیں۔ اچھا ——— بھئی شاہد ——— آؤ چلیں ——— اس لئے کہ مجھے کہیں دیر نہ ہو جائے ———

شاہد۔ ہاں ——— اچھی بات ہے ——— میں کپڑے پہن کر ابھی آیا ——— !

———(اُسی روز شام کو)———

ثریا ذرا ارشد کو لے لیجئے ——— مجھے ایک مضمون کے لئے کچھ نکات نوٹ کرنے ہیں۔

شاہد۔ مجھے یہ کتاب ختم کرنی ہے ——— اور ابھی یہ دونوں کتابیں بھی دیکھنی باقی ہیں۔

ثریا اچھا وہ میرا مضمون آپ نے دفتر میں دیدیا تھا ———

شاہد۔ وہ مضمون جب میں کالج جا رہا تھا ——— نہ معلوم کہاں کاپی سے نکل کر گر گیا۔

ثریا۔ ایں ——— کیا کہا آپ نے ——— مضمون گر گیا ——— دیکھئے تو کس مشکل سے ———

(ارشد روتا ہے)

شاہد۔ دیکھو ارشد کو بہلاؤ ——— زیادہ رونے نہ دیا کرو ——— بچے اس طرح چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ ابھی ابھی میں نے اس کتاب میں ایک جگہ پڑھا ہے۔

ثریا۔ اچھا میں ذرا دیکھ لوں کہ مضمون کی نقل میرے پاس ہے کہ نہیں ——— !

شاہد۔ ثریا ——— ثریا ——— دیکھو مجھے کپڑے بدلنے ہیں ———

ذرا کپڑے تو بکس سے نکال دو اور ہاں ـــــ قمیص میں بٹن وغیرہ بھی لگا دینا ـــــ دیکھو ـــــ ایک بات اور ہے کل صبح میرے ایک دوست کھانا یہیں کھائیں گے ـــــ لہذا تم ابھی سے سامان وغیرہ منگوا کر رکھ لو ـــــ اور سنو ـــــ دیکھو ـــــ دیر ـــــ !

ثریا (بات کاٹ کر) میں یہ سب کچھ بعد میں کرونگی ـــــ آپ خود دیکھ لیجئے گا ـــــ میں اپنا مضمون ـــــ

شاہد۔ اور ہاں ـــــ یہ کنجی لو ـــــ صندوقچہ سے دام نکال لاؤ۔

ثریا لیکن مجھے کل والا مضمون مکمل کرنا ہے ـــــ

شاہد ہاں اور سنو ـــــ میٹھے چاول کے ساتھ بالائی ضرور منگوا لینا ـــــ

ثریا (جھنجھلا کر) بھئی میری جان نہ کھایئے ـــــ میں کچھ نہیں ـــــ

شاہد۔ شیخانی ـــــ او شیخانی!

شیخانی (داخل ہوتے ہوئے) جی سرکار

شاہد۔ دیکھو کل ایک صاحب کھانا کھائیں گے ـــــ تم ثریا سے دام لیکر جو کچھ وہ کہیں ابھی جاکر بازار سے سامان لے آؤ ـــــ ورنہ رات ہو جائیگی تو دوکانیں ـــــ ـــــ

ثریا۔ دوکانیں گئیں چولہے میں ـــــ میرا مضمون ـــــ

شاہد لاحول ولاقوۃ ـــــ اچھا شیخانی تم جاؤ ـــــ

(شیخانی جاتی ہے)

لاؤ ـــــ کہاں ہے تمہارا مضمون ـــــ میں دیکھوں ـــــ

ثریا (کچھ کتابیں اُلٹ پلٹ کرتی ہے) یہ رہا ـــــ یہ ہے اسکی نقل ـــــ ادہر اُدہر کٹا ہوا ہے ـــــ خیر ـــــ آپ کو پڑھنے میں زحمت ہوگی ـــــ پڑھکر کیا کیجئے گا ـــــ

شاہد۔ نہیں ـــــ جمیل کہتے تھے کہ تمہارے مضامین میں ابھی سخت اصلاح کی ضرورت ہے۔ بغیر نظرِ ثانی کے اور بلا کسی کو دکھائے ہوئے کہیں بھی مضمون نہ بھیجنا چاہیے۔ اس سے بڑی بدنامی اور خفت ہوتی ہے ـــــ میں شروع کر تم سے کہتا آیا ہوں ـــــ لیکن تم ـــــ

ثریا۔ اچھا ـــــ ذرا ارشد کو لے لیجئے ـــــ میں آپ کو دکھاؤں۔

شاہد ذرا دیر کے لئے ـــــ بھئی خدا کے واسطے ـــــ مجھے یہ کتاب پوری کر لینے دو۔

ثریا۔ لیکن پھر میں کھانے وغیرہ کا انتظام کیونکر کر سکتی ہوں ـــــ ابھی سارا مضمون بھی لکھنا باقی ہے ـــــ تھوڑی دیر کے لئے لے لیجئے ـــــ

شاہد اچھا تو یہ مانا ـــــ لیکن شیخانی کے واپس آنے تک ـــــ

ثریا۔ ہاں ہاں بس شیخانی کے واپس آنے تک ـــــ میں اُسے دوم دیکر روانہ تو کر دوں ـــــ (اندر جاتی ہے)

(شاہد بچہ کو کھلاتا ہے ـــــ بچہ رونا شروع کرتا ہے ـــــ شاہد پریشان ہو کر آواز دیتا ہے)

شاہد ثریا ـــــ اے ثریا ـــــ لو وہ اُس نے پھر رونا شروع کر دیا ـــــ

ثریا۔ اُسے تھوڑی دیر بہلایئے ـــــ چُپ ہو جائیگا ـــــ اچھا ہاں شیخانی تو تم ذرا جلدی سی چلی جاؤ ـــــ دیکھو بیٹھ نہ رہنا ـــــ بس چاول شکر اور گھی لیتی آؤ ـــــ جلدی جاؤ! ـــــ (بچہ برابر روتا رہتا ہے)

شاہد (تنگ آکر) بھئی ثریا ـــــ یہ اپنے بس کے نہیں ـــــ لو سنبھالو انہیں نہیں تو میں انہیں جھولے میں لٹاتا ہوں ـــــ اے ـــــ اے ہاں ـــــ بس اب میں بالکل آزاد ہوں ـــــ تم جانو ـــــ تمہارا کام جانے۔

ثریا ہائیں ہائیں ـــــ بچہ بلکتا ہے اور آپ لٹا کر چلے۔ اُسے گودی میں لیکر ذرا باہر ٹہلا لایئے۔ میں اتنی دیر میں اس مضمون کو صاف کئے لیتی ہوں ـــــ!

شاہد بخشئے ـــــ! یہ کام اب مجھ سے نہیں ہونیکا۔

ثریا۔ (تعجب سے) نہیں ہونیکا ـــــ کیا مطلب؟ آپ نے کبھی کیا نہیں کیا؟

شاہد۔ کیا تو ہے ـــــ مگر اب نہیں ہوگا۔ کیونکہ بچہ کھلانا عورتوں کا کام ہے یہ انھیں سے خوب ہوتا ہے۔

ثریا رسّٰد مذاق کو چھوڑیئے۔ ذرا اسے لے لیجئے۔ بھلا پھر مضمون نگاری مجھ سے کیسے آئیگی وہ تو مردوں کا کام ہے نا؟

شاہد۔ جی ـــــ کیا کہنے آپ کی مضمون نگاری کے ـــــ بہتر ہے آپ اب مضمون نگاری چھوڑ دیں ـــــ

ثریا واہ ـــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے ـــــ بھلا میں اور مضمون نگاری چھوڑ دوں۔ جس نے مجھے بہترین خانگی امور اور تربیتِ اطفال کی تعلیم دی ـــــ

شاہد تمہارا خیال بالکل غلط اور سراپا جہل ہے!

ثریا وہ کیسے؟ ـــــ آپ تو کہتے تھے کہ اصلاح کا یہ بہترین طریقہ ہے

شاہد (گھبرا کر) اچھا بھئی ـــــ اب میری جان کھاؤ ـــــ مجھے کتاب ختم کرنا ہے۔ لہذا میں چلا۔

ثریا ارے ارے ـــــ ذرا سنئے تو ـــــ

شاہد۔ میں سب کچھ سُن چکا ـــــ اب فقط اتنا کہنا اور باقی ہے کہ تم بجائے کتب بینی اور مضمون نگاری کے گھر کی دیکھ بھال اور خدمت کے پیدائش وغیرہ جیسی چیزیں لو ـــــ تمہارے لئے اب یہی بہتر ہے۔

(صدا رفتہ رفتہ ہلکی ہو کر غائب ہو جاتی ہے)

کنور پریمی

افکارِ عالیہ

کسی جا پھر نظر آجا مآلِ آرزو ہوکر — دلوں کو لوٹنے والے نظر کے روبرو ہوکر
رواں ہیں آنکھ سے آنسو خلوصِ شوق تو دیکھو — کسی کو یاد کرتا ہوں ہمیشہ باوضو ہوکر
یہ عالم ہے کہ ہر داغِ تمنا گلشنِ غم ہے — چلا ہوں میں گلستاں سے خرابِ رنگ و بو ہوکر
مداوائے دیدۂ خوں ریز میری بات رہ جائے — حضورِ داورِ محشر میں پہنچوں سرخرو ہوکر
ارے او محوِ رعنائی حجابِ مستقل کب تک — کہیں میں خود نہ کھو جاؤں خرابِ جستجو ہوکر
فروغِ مہر و انجم سے مجھے تسکیں نہیں ہوتی — مزا جب ہے کہ تم جلوہ دکھاؤ روبرو ہوکر

بتاؤ تو سہی سرورؔ یہ آخر ماجرا کیا ہے
بتوں کو پوجتے ہو تم ہمیشہ قبلہ رو ہوکر

(اعلیحضرت) سرور والیٔ ریاست کورداٸی

تحیّرات

ہر نظر اک کلام ہے ہر نفس اک پیام ہے — پردہ بہ پردہ حسن یوں عشق سے ہم کلام ہے
حسن کی رہگذار میں ایسا بھی اک مقام ہے — کفر ہے جنبشِ نظر، جنبشِ لب حرام ہے
سرخوشِ حسنِ دوست ہوں بزم میں دورِ جام ہے — اب مری صبح صبح ہے، اب مری شام شام ہے
حسنِ نظر نواز کا آج یہ فیضِ عام ہے — ہر نفس ایک میکدہ، ہر نظر ایک جام ہے
منزلِ دل ہی کی طرف اٹھتے ہیں خود بخود قدم — رہگذرِ نیاز میں ایسا بھی اک مقام ہے
دونوں میں امتیاز کیا، فرقِ نیاز و ناز کیا — حسن اگر تمام ہے، عشق بھی تو تمام ہے
رقص میں ہیں تجلیاں کوندرہی ہیں بجلیاں — اے دلِ مضطرب ٹھہر تجھ سے کچھ آج کام ہے
ٹوٹ رہے ہیں بار بار سازِ نفس کے تار تار — شرحِ درازِ زندگی اب سرِ اختتام ہے
دشت میں جانِ قیس لی، کوہ پہ جانِ کوہکن — طور پہ منحصر نہیں، حسن کا ظلم عام ہے
غم کو سکوتِ دل بنا، غمکدۂ حیات میں — عیشِ دوام کی ہوس ایک خیالِ خام ہے
یا وہ چمن کی روشنی، یا یہ قفس کی تیرگی — ہائے وہ کیسی صبح تھی، ہائے یہ کیسی شام ہے
طالبِ غم جو تجھ سے ہوں اس سے مراد ہے سکوں — عشق کی اصطلاح میں غم ہی خوشی کا نام ہے
صبحِ ازل کی بیخودی، شامِ ابد کی خامشی — وہ مری صبحِ عیش تھی یہ مرے غم کی شام ہے

عظمتِ عشق کی قسم عصمتِ حسن کی قسم
حیرتؔ اک آفتاب کا دل میں مری مقام ہے

حیرت بہاری

پوسٹ آفس

پوسٹ آفس کا اکاونٹ پہلے پہل ۱۵۵۳ء میں دیکھنے میں آیا ۱۵۴۲ء میں ایک پوسٹ آفس جسکی ڈاک لندن سے اڈنبرا چار دن میں پہنچتی تھی بعرض وجود میں آیا لیکن یہ زیادہ وقت تک قائم نہ رہ سکا غیر ممالک سے مراسلت اور مکاتبت کا انتظام پہلے پہل ملکہ ایلزبتھ کے دور حکومت میں "سوسائٹی آف فارن مرچنٹس" کے ذریعہ کیا گیا اور اس قسم کے سب سے پہلے پوسٹ آفس کا قیام ۱۵۶۸ء میں ہوا۔

چارلس اوّل نے ایک فرمان مجریہ ۱۶۳۲ء کے ذریعہ ممالک غیر کی ڈاک پوسٹ آفس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے بھیجنے کی ممانعت کردی۔

سب سے پہلا پوسٹ آفس ۱۶۳۵ء میں قائم ہوا اس اثناء میں مراسلات بشرطیکہ مسافت میں تین دن سے زیادہ کی نہ ہو" چھ پینی میں ڈاک کے ذریعہ بھیج سکتے تھے۔ کسی شخص کو اجازت نہ تھی کہ نجی ذرائع سے خط وکتابت کر سکے اور پوسٹ آفس کی تمام آمدنی سرکاری خزانہ میں داخل ہوتی تھی۔

سترھویں صدی عیسوی کی سول وار نے پوسٹ آفس کے انتظام کو کچھ عرصے کے لئے درہم برہم کردیا لیکن قیام امن کے فوراً بعد ہی متعدد اصلاحات عمل میں لائی گئیں

پینی پوسٹ کی ابتدا شہر پیرس میں ۱۶۸۳ء میں ہوئی ولیم سوم اور کوئین اینی کے دور حکومت میں وقتاً فوقتاً اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ ولیم پٹ نے تقسیم مراسلات کے لئے "میل کوچیز سسٹم" کو رواج دیا۔ اس تمام عرصہ میں محصول بُعد مسافت کے لحاظ سے محسوب ہوتا تھا۔ لندن سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہونے والے مقامات کی مراسلات کے تین پنیس لئے جاتے تھے۔ اس سے زیادہ فاصلہ والے کے لئے بشرطیکہ وہ انگلینڈ میں واقع ہوں۔ چار پنیس لئے جاتے تھے۔ اڈنبرا اور ڈبلن جانیوالے مراسلات کے ۶ پنیس لئے جاتے تھے۔

شرح محصول میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہیں اور بالآخر ۱۸۱۴ء میں یعنی جنگ واٹرلو کے ایک سال قبل حسب ذیل شرحیں مقرر کی گئیں:-

۷ میل سے کم فاصلے کے لئے ۲ پنیس
۷ سے ۱۵ میل کے درمیانی فاصلہ کے لئے ۴ پنیس

ہر اضافی دس میل کے لئے ۶۵ میل تک ایک پنیس زیادہ لیا جاتا تھا۔
۶۵ میل سے ۹۵ میل کے درمیانی فاصلہ کے لئے ۹ پنیس
۹۵ اور ۱۲۰ کے درمیانی فاصلہ کے لئے دس پنیس
۱۵۰ سے ۲۰۰ میل کے فاصلہ کے لئے ایک شلنگ
۲۵۰ میل سے ۳۰۰ میل کے فاصلہ کے لئے ایک شلنگ ۲ پنیس
اور ہر اضافی سو میل کے لئے ایک پنیس۔

مارٹینو کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ کالرج اپنی جوانی کے ایام میں لیک ڈسٹرکٹ میں سیر کر رہا تھا۔ اس نے کسی پوسٹ مین کو ایک جھونپڑے میں ایک عورت کو خط دیتے ہوئے دیکھا۔ عورت نے الٹ پلٹ کر خط کو دیکھا اور پیکھتے ہوئے واپس کردیا کہ وہ ایک شلنگ کا پوسٹیج ادا کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھی ــــ کالرج نے یہ معلوم کرکے کہ یہ خط اسکے بھائی کا تھا (بعض نے بیٹا لکھا ہے) محصول اپنی جیب سے ادا کردیا۔ پوسٹ مین کے جانے کے بعد عورت نے بتایا کہ اسکی رقم کس طرح ضائع ہوئی۔ اس میں اور اس کے بھائی میں یہ طے پاچکا تھا کہ وہ ہر چوتھے مہینے ایک سادہ کاغذ ملفوف کردیا کریگا اور اس طرح وہ (بہن) بلا ادائیگی محصول اسکی خیریت معلوم کرلیا کریگی۔

رولینڈ ہل جسے "پینی پوسٹیج سسٹم" کا بانی کہنا چاہئے۔ اس داستان سے بہت متاثر ہوا اس نے ۱۸۳۷ء میں پینی پوسٹیج کے متعلق جدوجہد شروع کردی۔ ابتدائے کار میں اسکو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا اور اسکی تحریک کو مجنونانہ بتایا گیا۔

پہلے محصول مکتوب الیہ دیا کرتا تھا اور محصول فاصلہ اور مراسلے کے وزن کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا۔ پارلیمنٹ کے ممبر اپنے اور اپنے احباب کے لاتعداد خطوط بلا محصول بھیج سکتے تھے اور سرکاری ملازمین کے خطوط کا بھی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔

رولینڈ ہل نے اس طریقہ کار کی شدید مخالفت کی اور ۱۸۳۷ء میں ایک پمفلٹ معنون بہ "پوسٹ آفس ریفارم" شائع کیا جس میں طریقہ قدیم کی مذمت اور اپنی جدید سکیم کے محاسن کو بڑی وضاحت سے پیش کیا اور اسکا مطالبہ تھا کہ (۱) محصول مرسل کو ادا کرنا چاہئے۔ (۲) مراسلہ کا محصول وزن کے اعتبار سے

ہونا چاہئے نہ کہ باعتبار فاصلہ (۳) پینی پوسٹیج کے طریقہ کو تمام سلطنت متحدہ میں رواج دینا چاہئے۔ پارلیمنٹ میں اس تحریک کی موافقت میں بے شمار درخواستیں گذریں۔ اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک کمیشن بٹھایا گیا۔ جنرل پیجفیلڈ نے تحقیقات کے دوران میں بیان کیا کہ انھوں نے اس تحریک سے زیادہ لغو اور بیجا تحریک نہ کبھی سُنی اور نہ پڑھی۔

۵ جولائی سنہ ۱۸۲۹ء کو مسٹر اسپرنگ رائس نے جو ایکسچکر کے چانسلر تھے اپنا بجٹ منظر عام پر لاتے ہوئے ظاہر کیا کہ یہ بیحد ضروری ہے کہ مراسلات کا محصول گھٹا کر ایک پنس پر لایا جائے۔ پارلیمنٹ کو بلا محصول مراسلات بھیجنے کا حق حاصل نہ رہے۔ نیز سرکاری مراسلات کی بلا محصول ترسیل پر سخت نگرانی کی جائے

سنہ ۱۸۴۰ء میں مسٹر روجون رسل نے پینی پوسٹیج کے طریقہ کو رائج کیا جو انگلستان ہی میں محدود رہا جس مراسلہ کا وزن ½ اونس سے زیادہ نہ ہوتا ایک پینی میں جا سکتا تھا اب اس دستور پر باقاعدہ عملدرآمد ہونے لگا اور مسٹر رولینڈ ہل کی تحریک پروان چڑھی

اسی سلسلہ میں ایک قدم اور بڑھا دیا گیا یعنی ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۳۰ء سے ڈاک ریل گاڑی کے ذریعہ بھیجی جانے لگی۔

پارلیمنٹ کے ممبر سنہ ۱۶۶۰ء سے اپنے مراسلات بلا محصول بھیجا کرتے تھے۔ اب سنہ ۱۸۴۰ء میں ایک قانون بنایا گیا جس کی ردیسر پارلیمنٹ کا کوئی ممبر بلا محصول خط نہ بھیج سکتا تھا۔

سنہ ۱۸۶۱ء میں سیونگ بینک ڈیپارٹمنٹ اور سنہ ۱۸۷۰ء میں ٹیلیگراف سروس کا اجراء ہوا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں پوسٹ کارڈ عالمِ وجود میں آیا۔ ۷ سال کے بعد خطوط کا وزن ایک اونس تک کر دیا گیا اور اس طرح نیا محصول ایک پینی فی آونس ہو گیا۔

پوسٹل آرڈر کا رواج سنہ ۱۸۸۰ء میں ہوا انگلینڈ اور نوآبادیات میں پینی پوسٹیج کا رواج سنہ ۱۸۹۸ء اور آسٹریلیا میں سنہ ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ مراسلات کے محصول میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہینگی۔

بہار کوٹی

میخانے میں آ

کیف برساتا ہوا ہستی کے میخانے میں آ
ساغرِ مہتاب میں آ گُل کے پیمانے میں آ

پھر نئے سر سے ہو تازہ قصۂ طور و کلیم
صبح کے جلووں کی تابانی کے افسانے میں آ

ہو یہیں سے تا کہ پھر آغازِ صبحِ وصلِ عیش
لیکے جلوے اپنی، فرقت کے سیہ خانے میں آ

مضطرب ہیں جذبۂ تعمیرِ نو سے روز و شب
از سرِ نو عشق کے برباد کاشانے میں آ

خاکِ محفل سے اٹھیں شمعیں ہزاروں دفعتاً
سوزشِ غمہائے پنہاں بنکے پروانے میں آ

آ اٹھا دے امتیازِ دشت و گلشن کے حجاب
وحشتوں کا راز بنکر اپنے دیوانے میں آ

ہے لبِ خاموش ہر ربِ صوتِ حسنِ طلب
لے ادائے حسن کی تصویر بتخانے میں آ

پھوٹ نے ہر ذرہ سے پیدا ہوں لاکھوں گلستاں
خالقِ رنگینیِ کونین ویرانے میں آ

تیرے دیوانوں میں جاگ اٹھے شباب آرزو
نالۂ زنجیر کی صورت جنوں خانے میں آ

ذوقِ الفت چاہتا ہے پھر نئی اک زندگی
بنکے اعجازِ مسیحا دل کے افسانے میں آ

زہد کی آگاہیاں ہو جائیں نذرِ بیخودی
لے شعورِ زندگی تسبیح کے دانے میں آ

تری صورت سے دکھا دوں تجھکو لاکھوں تو سہی
ایک دن تو میرے دل کے آئینہ خانے میں آ

واقف اسرارِ وحدت تا ہوں افرادِ جہاں
بے حجابانہ خدائی کے جلو خانے میں آ

الم مظفر نگری

تجدید

اُلجھی اُلجھی سی یہ سانسیں یہ بجھا سا لہجہ
یہ ٹپکتی ہوئی حسرت سی تری باتوں سے
ڈوبی ڈوبی سی یہ نظریں یہ تھکی سی آنکھیں
جیسے تو سو نہ سکی آج کئی راتوں سے

تو اداس اس درجہ مرے عہدِ وفا سے مایوس
کچھ بھی ہو تجھ کو تو ناشاد نہ ہونے دونگا
دیکھی جائیں گی نہ مجھ سے تری آنکھیں نمناک
تیری نظروں کو تو فریاد نہ ہونے دونگا

ترا دُکھتا ہوا دل اور نہ دُکھ جائے گا
کیا ترے دُکھ کا بھی احساس نہ ہوگا مجھکو
یہ ترا لطف یہ مخصوص وفائیں تیری
اِن وفاؤں کا بھی کیا پاس نہ ہوگا مجھکو

کیا لُبھا لیگی مجھے حسن کی رنگین ادا؟
لوٹ لے گا مجھے کیا شوخ نگاہوں سے کوئی؟
توڑ دے گا کوئی کیا، مہر و وفا کے رشتے؟
باندھ لیگا مجھے کیا نور کی بانہوں سے کوئی؟

اب کوئی تجھ سے جدا کر نہیں سکتا مجھکو
چھین سکتی نہیں تجھ سے تو زلیخا مجھکو

جاں نثار اختر

طوفاں سے کھیلئے

کچھ اور بڑھ کے عالمِ امکاں سے کھیلئے
انجم سے کھیلئے مہِ تاباں سے کھیلئے

کچھ اور بھی بلند ہو بازیچہ گاہِ شوق
اورنگِ شاہ و افسرِ سلطاں سے کھیلئے

رنگینیِ خیال ہے رعنائیِ حیات
عہدِ خزاں میں یادِ بہاراں سے کھیلئے

جب دوست کا بھی گوشۂ داماں نہ ہاتھ آئے
پھر خود ہی اپنے گوشۂ داماں سے کھیلئے

جس نے نگاہِ شوق کو بخشی ہیں جرأتیں
اُسکی نگاہِ وصل ساماں سے کھیلئے

رنگِ بہار و جلوۂ نوخیز چھوڑ کر
کبتک جنوں میں خاکِ بیاباں سے کھیلئے

اُسکی نظر کو پہلے پشیماں بنائیے
پھر دلکشیِ چشمِ پشیماں سے کھیلئے

نغماتِ مضطرب بھی نکل آئیں گے ضرور
بیتاب دل کے سازِ پریشاں سے کھیلئے

اب فرش کے ہیں تیر ہواؤں میں پرفشاں
کبتک کسی کے ناوکِ مژگاں سے کھیلئے

سوزِ دروں سے آپ جو کھیلا کئے تو کیا
ہمت اگر ہو شعلۂ عریاں سے کھیلئے

وسعت سمٹ کے تارِ نظر بن چکے تو پھر
صحرا طرازِ تنگیِ زنداں سے کھیلئے

ساحل پہ بیٹھ کر بڑی موجوں سے کھیل چکے
اب آگے بڑھ کے ورطۂ طوفاں سے کھیلئے

اچھا نہیں ہے حسن کی رسوائیوں کا کھیل
مجبور ہے شوقِ پشیماں سے کھیلئے

اقبال ماہر

شکستہ گھڑی

کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر، کچھ دیر تک مجھے تکتے ہوئے، مسرت و انبساط کے لہجہ میں اُس نے کہا:—

"اچھا آپ اس طرح کام کیا کرتے ہیں؟"

میں نے عجز و انکسار کے انداز میں مسکرا کر جواب دیا:— "جی ہاں!"

"کیا آپ کافی عرصہ سے یہ کام کر رہے ہیں؟"

"صرف چار سال سے۔"

"میں نے بھی کچھ لکھنے کی سعی و کوشش کی ہے۔"

میں نے کسی قدر درشت انداز میں کہا:— "کیا آپ نے کچھ لکھا بھی ہے؟"

"ہاں ہاں — میں اپنا مضمون اپنے ہمراہ لایا ہوں۔ آپ اسے یقیناً پسند فرمائیں گے اور شائع کر دیں گے۔"

"کیا آپ مضامین بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں؟"

"نہیں صاحب! میرے دل میں نہ معلوم کتنے عرصہ سے تاثرات و تخیلات مجتمع تھے۔ اب وہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی شریکِ حیات کو گاؤں بھیج دیا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنا وقت کاٹوں تو کس طرح کاٹوں — اسی لئے تو میں نے لکھنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ ابھی میں نے عرض کیا ہے نا کہ میں اپنا مضمون اپنے ساتھ لایا ہوں۔ میں اسے طبع کرانے کے لئے آپ کو دونگا۔ آپ دو چار لائن پڑھتے آپ یقیناً دل ہی دل میں کہیں گے کہ گویا بائرن کی روح نے دوبارہ جنم لیا ہے۔"

"بہت خوب! مگر مجھے اس مضمون میں اصلاح و ترمیم کر کے ابھی ابھی پریس کو دینا ہے۔" — میں نے اپنے روبرو بیٹھے ہوئے اس مضمون نگار کو اپنا عدیم الفرصت ہونا صاف صاف جتا دیا۔

وہ ایک شاندار اور بھڑکیلی پوشاک زیبِ تن کر کے آیا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ سکون و اطمینان سے بھی نظر کئے بیٹھا رہا، مگر اُس نے مجھے دو منٹ سے بھی ... سکون سے کام نہ کرنے دیا۔

... زندگی بھی تو ... ... صاحت کی زندگی ہے، آپ کے لکھتے ہیں ... ... دولت ... ہے۔"

اپنے کام میں بدستور مشغول و منہمک رہتے ہوئے میں نے جواب دیا:— "مضمون نویسی اسقدر آسان نہیں ہے جسقدر کہ آپ خیال کر رہے ہیں۔"

اُس نے کہا:— "آسان نہیں؟ — کیا آپ مذاق کر رہے ہیں؟ — میں تو ٹیبل پر جا کر بیٹھا اور جسقدر تیزی سے قلم چل سکا لکھنا شروع کر دیا۔ الفاظ پر الفاظ نکلنے شروع ہو گئے۔ میں نے کوئی گھنٹہ بھر میں یہ مضمون لکھ ڈالا ہے۔"

میں نے اپنا ضروری کام ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے آپ کا وہ مضمون؟"

"یہ ہے — یہ میری مشقِ اوّلیں ہے — میں اسے بہت تھوڑی اُجرت میں دیدونگا۔ آپ چار آنہ فی لائن کے حساب سے دیدیجئے گا، آئندہ مضامین کے متعلق ہم لوگ پھر طے کر لیں گے۔"

"بہت بہتر — دو ہفتے کے اندر اندر، اس مضمون کے متعلق آپ کو میری رائے معلوم ہو جائے گی!"

میں نے اس مضمون کے مسودہ کو اپنے سامنے رکھ کر اُس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ میں اُس سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"دیکھئے صاحب! یہ پہلی لائن — غروب ہوتا ہوا آفتاب، اُفقِ مغرب میں نہایت آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا — یہ تو بالکل ناممکن ہے۔"

اُس نے مسرت آگیں انداز میں مسکرا کر کہا:—

"آپ جو چاہے تغیر و تبدل کر دیجئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ میری مشقِ اولیں ہے۔ خیر میں اب آپ کا قیمتی وقت زیادہ خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

اُس نے اپنی جیب سے ایک گھڑی نکالی:— "ملعون — پھر بند ہو گئی۔"

"کیا آپ کی گھڑی کچھ خراب ہو گئی ہے؟"

"ارے صاحب! ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا کہ اسے درست کرا کے لایا تھا پریشان کر دیا صاحب — پریشان کر دیا!"

"جی ہاں یہ تمام گھڑی ساز .... اچھا، لائیے دیکھوں میں آپ کی گھڑی — شاید میں اسے درست بھی کر دوں۔"

مجھ پر تیز انہ نظر ڈال کر اُس نے کہا :- "کیا آپ گھڑی سازی جانتے ہیں؟"

"نہ جاننے کے برابر!"

اُس نے میرے ہاتھ میں گھڑی دیدی۔ میں نے اپنی مرضی کے قطعاً خلاف طوعاً وکرہاً گھڑی کا ڈھکن کھولا، پھر اپنے چاقو کو گھڑی کے پرزوں میں ڈال دیا، کئی پرزے نکل کر میری ٹیبل پر منتشر ہوگئے۔

میں نے بڑبڑا کر کہا :- "معاملہ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا!"

یہ کہہ کر گھڑی کے باریک سے ہیر اسپرنگ کو دونوں انگلیوں سے کھینچ کر باہر نکال ڈالا۔

اُسی کے ساتھ دو تین پرزے اور نکل کر میز پر منتشر ہوگئے۔

کرسی پر بیٹھا ہوا وہ شخص نہایت تشویش و پریشانی اور بددلی و کراہت کے ساتھ میرے کام کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس نے بڑے اضطراب اور فکرمندانہ انداز میں کہا :-

"کیا بات ہے؟"

گھڑی میں سے چند پرزے اور نکالتے ہوئے میں نے کہا :- "اس گھڑی کے اندر اسقدر پرزوں کی بھرمار کر دی گئی ہے کہ اب یہ کہنا دشوار ہے کہ گھڑی کس وجہ سے بند ہوگئی"

وہ شخص ایک ہلکی سی جست کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ اُس نے ایک نظر پرزے نکالی ہوئی گھڑی پر ڈالی، پھر چلّا کر کہنے لگا :-

"آپ گھڑی کے متعلق کچھ جانتے بھی ہیں؟"

میں نے نرم لہجہ میں جواب دیا :- "جانتا بھی ہوں . . . . اور نہیں بھی"

"کیا اس سے پیشتر آپ نے کسی گھڑی کی مرمت کی ہے؟"

"اگر میں صفائی کے ساتھ عرض کردوں تو . . . . . یہ میری مشقِ اولیں ہے!"

اُس نے گھڑی کے تمام پرزوں کو ایک ایک کرکے جمع کرتے ہوئے طیش و تشویش کے انداز میں کہا :-

"آپ جس کام سے بالکل واقف نہیں ہیں اُس میں دست اندازی کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

اب میرے ناراض ہونے کا نمبر تھا۔ میں کسی قدر بلند آواز سے کہا :-

"آپ کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ کس بل بوتے پر اپنا مضمون شائع کرانے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک گھڑی کے پرزے کھول کر دوبارہ فٹ کرنے کی آرزو دشوار و مشکل ہے اور بہترین ادبی مضامین لکھنا سہل و آسان!"

ہم دونوں ایک دوسرے کو لمحہ بھر تک نفرت خیز انداز سے دیکھتے رہے ——

بعدازاں ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔

اُس نے کہا :- "اگر میرا یہ مضمون درست نہیں لکھا گیا ہے تو میں آپ کو کوئی دوسرا مضمون لادونگا"

میں نے جواب دیا :- "بہتر ہے لیکن اگر آپ کے پاس کوئی دوسری گھڑی ہو تو وہ بھی ہمراہ لیتے آیئے گا۔ اسی طرح مشق کرتے کرتے شاید ہم دونوں سیکھ جائیں"

روسی مصنف
"آکارڈی اوردِش شینکو"

مترجمہ
امتیاز نسیمی

——— • (بقیہ) • ———

(بقیہ خاصانِ ادب صفحہ ۴)

(۵۹) جناب منشی ایم۔ آر شاہ صاحب ایچ۔ بی۔ ٹی (آنرزان پنجابی ورنیکلر) انبالہ سے ۶ سالانہ

(۶۰) جناب خادم حسین صاحب خادم زیبائی جہلم سے ۶ سالانہ

(۶۱) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور سے ۶ سالانہ

(۶۲) جناب شیخ محمد احمد صاحب آرٹس پرتاب گڈھ ۔ دل حاجی شیخ محمد امین صاحب مرحوم مرحوم میونسپل کمشنر پرتاب گڈھ سے ۶ سالانہ

(۶۳) محترمہ سلمٰی خاتون صاحبہ کیئر مدنا پور بنگال سے ۶ سالانہ

(۶۴) جناب خان شری محبت خاں جی آف کوٹھری بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے ۶ سالانہ

(۶۵) جناب ابراہیم خاں رحمت خاں صاحب شرف جوناگڈھی سے ۶ سالانہ

(۶۶) جناب عبدالستار خاں صاحب قائم کنجوی (دہلی) سے ۶ سالانہ

(۶۷) جناب حبیب خانصاحب حبیب شاہجہانپوری کوئٹہ سے ۶ سالانہ

(۶۸) مسٹر اتم سنگھ بی۔ اے پروپرائٹر بھولارام اینڈ سنز دہلی سے ۶ سالانہ

(۶۹) محترمہ حجاب بنارسی (ناگپور) سے ۶ سالانہ

(۷۰) محترمہ اسماء اسے علوی صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ

(۷۱) محترمہ میمونہ صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ

(۷۲) محترمہ نعمت جی لوٹیا صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ

(۷۳) جناب یحییٰ بھائی محمد علی صاحب راولپنڈی سے ۶ سالانہ

(۷۴) جناب عارف ابراہیم یوسف پرکار قادری بانکوٹی سے ۶ سالانہ

(۷۵) جناب خانصاحب انور خاں جی آف ناگرہ دربارگڈھ بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے ۶ سالانہ

(۷۶) جناب سید ظہیر حسین صاحب ظہیر سہندی سے ۶ سالانہ

(۷۷) جناب رفیق احمد صاحب رفیق نشاط کلکتوی صدر بخشی لین ہوڑہ سے ۶ سالانہ

(۷۸) جناب اکبر علی غلام حسین صاحب شکتے والے کراچی سے ۶ سالانہ

(۷۹) محترمہ بتول نورالدین ٹپال کراچی سے ۶ سالانہ

(۸۰) مسٹر ممتاز صحرائی یونمٹ لنگر مخدوم (پنجاب) سے ۶ سالانہ

(۸۱) محترمہ لیڈی سر رحیم بخش۔ ساہا (ضلع انبالہ) سے ۶ سالانہ

(۸۲) جناب محمد عادل صاحب ضیا سرٹھی۔ سے ۶ سالانہ

(۸۳) جناب [illegible] صاحب [illegible] (پنجاب) سے ۶ سالانہ

نغمۂ دلِ آویز

مبارک باد! اے آہِ اثر خیز — کہ چشمِ دل ہوئی ہے اشک آمیز
میں بھر لوں، آج اپنا ظرفِ تقدیر — نگاہِ مستِ ساقی ہے کرم ریز
ٹھہر! اے دامنِ بادِ سحرگاہ — ہوئی جاتی ہے آتشِ شوق کی تیز
کہاں لے جاؤں یارب! دیدۂ دل — کہ حسن پردہ در ہے عشق انگیز
یہی ہے فرصتِ بیماریٔ دل — کہ اُس کو زندگانی سے ہے پرہیز
نزاکت میں شبِ غم کی کہوں کیا؟ — کہ دامن اس کا ظالم ہے سحر ریز
بنی ہر سانس، سولی زندگی کی — کہ ہر اُمید بری ہے دل آویز
مدد! اے حسن کی سادہ مزاجی — کہ عشقِ فتنہ خو ہے فتنہ انگیز

محبت کی فقط نام آوری ہے
کہاں فرہاد؟ کیفی! کیا ہے پرویز

(علامہ) کیفی چریاکوٹی

جواہر پارے

جلوے کسی کے شام و سحر دیکھتے رہے — ہر رنگ میں برنگِ دگر دیکھتے رہے
سب جس طرف کہ وہ تھے اُدھر دیکھتے رہے — ہم اُنکا انتخابِ نظر دیکھتے رہے
مالک تھے وہ اگرچہ سیاہ و سپید کے — پھر بھی مزاجِ شام و سحر دیکھتے رہے
وہ لاکھ دور دور رہے چشمِ شوق سے — لیکن ہم اُن کو پیشِ نظر دیکھتے رہے
تھیں کسقدر مہیب وہ راتیں فراق کی — تارے بھی انتظارِ سحر دیکھتے رہے
وہ آئے، وہ گئے، وہ ہنسے، وہ خفا ہوئے — شب بھر یہی فریبِ نظر دیکھتے رہے
سچ ہے کسی کی آگ میں گرتا نہیں کوئی — دل جل رہا تھا دیدۂ تر دیکھتے رہے
ناصح کچھ اُسکو ہم نے خدا تو نہیں کہا — کیا ہوگیا گناہ اگر دیکھتے رہے

پیش آئے ایسے وقت بھی جوہر حیات میں
دُنیا کو جن میں زیر و زبر دیکھتے رہے

جوہر ڈبائیوی

مستقل:-

مکتوبات

دفتر "عالمگیر" لاہور
۱۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء

برادرِ محترم اعجاز

سالنامہ "خیام" بذریعہ رجسٹرڈ پیکٹ ارسال خدمت ہو چکا ہے۔ امید ہے ملاحظہ ہوگا۔ "عالمگیر" قدرے لیٹ تھا، بہر حال اب تک پہنچ گیا ہوگا۔ دراصل پچھلے مہینے مذبذبین ذالک کی عملی تفسیر بنا رہا۔ اس لئے کام بروقت نہ ہو سکا اور دونوں پرچے چند یوم کی تاخیر سے شائع ہوئے۔

اب "عالمگیر" کا خاص نمبر ۱۹۴۴ء زیرِ ترتیب ہے۔ از راہِ نوازش علامہ سیماب مدظلہٗ اور اپنا تازہ کلام ۳۰ اکتوبر تک بھیج دیجئے۔ تاکہ نومبر کی اشاعت میں اعلان ہو سکے اس کے علاوہ دہری طرف "تحریک" آپ کی توجہ کی مستحق ہے۔ مجھے امید ہے آپ ضرور حصہ لیں گے اور دوسروں کو بھی شرکت کی دعوت دیں گے۔ قبلہ حضرت سیماب سے بھی دو تین کالم کا مضمون لکھوائیے۔ کسی شاعر پر ہی سہی، آپ تو اس ضمن میں متعدد مضامین لکھ چکے ہیں۔ اس لئے تین چار کالم "گھسیٹنا" چنداں دشوار نہ ہوگا۔

اس مہینے سے "خیام" کی ترتیب و تدوین میں انقلاب پیدا کر رہا ہوں، لیکن "تنگیٔ داماں" کے باعث شاید میرے ارمان پورے نہ ہو سکیں۔ بہرحال اس جنگ کے زمانہ میں جو کچھ بھی ہو جائے غنیمت ہے۔ سب سے بڑا قدم "شاعروں" کے خلاف اٹھا رہا ہوں۔ چنانچہ "مشاعرہ خیام" تک قلم منسوخ کر دیا ہے۔ بھئی میں تو تنگ آگیا ہوں ان شاعروں سے۔ عجیب قسم کی مخلوق ہے۔ ننانوے فیصدی نوجوان شعرا "بے استادے" ہیں اس لئے ساٹ لکھتے ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ اصلاح و ترمیم میں وقت ضائع کروں نہ "شاعرگر" ہوں لیکن میں "نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری" کا قائل ہوں۔ میں کسی وہ افلاطون کا حامی ہوں جس نے لکھا تھا کہ اگر میری "مثالیہ جمہوریہ" قائم ہو گئی تو میں ان شاعروں کے لئے کوئی گنجائش نہ رہے گی! میں "افلاطونِ وقت" تو بننا نہیں چاہتا۔

اس لئے اُن شاعروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جن میں شاعرانہ جذبہ قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن جو شاعر محض "اخباروں میں چھپنے کے لئے" شعر کہتے ہیں اُن کے لئے "شاعر کش گولیوں" کی تلاش میں ہوں۔ کیا اس سلسلہ میں میری مدد کر سکو گے؟ تم جمنا کے کنارے آباد ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ہندوستان کے تمام شاعروں کو قصر الادب میں دعوت دیتا اور اُن کے ساتھ وہی سلوک کرتا جو ملکہ مصر نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا تھا یعنی ایک سرنگ کے ذریعہ سے سب "مہمانوں" کو جمنا کی لہروں کے سپرد کر دیتا اور تاج محل کے مینار پر کھڑے ہو کر پورے زور سے چلا اٹھتا: "خس کم جہاں پاک"

معاف کرنا "شاعروں" کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا ہے اور اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ آجکل تمام شاعروں نے غالباً ایکا کر لیا ہے کہ "خیام" و "عالمگیر" کے دفتر پر ٹڈی دل بن کر جس لفافہ کو اٹھاتا ہوں اس میں ایک عدد غزل ہوتی ہے۔ نیاز نے تو مولویوں کے متعلق کہا ہے، لیکن میں شاعروں کے متعلق کہتا ہوں کہ سانپ کی طرح شاعروں کی بھی کئی قسمیں ہیں ——— الخ

اچھا چھوڑو اس بکواس کو۔ آمدم برسرِ مطلب۔ خاص نمبر کے لئے غزلیں بھجوا دو اور "میرا پسندیدہ ادیب یا شاعر" پر بھی ایک مضمون لکھ بھیجو۔ اور دوسروں سے بھی لکھواؤ کیوں منظور ہے؟

آنکھیں تو اب ٹھیک ہیں نا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صحت و عافیت سے رکھے!

شبلی

ارشاد منزل لکھنؤ

اعجاز بھائی۔ عید مبارک ہو،

باجرہ مسرور کا خط آیا ہے۔ انشاء اللہ عید بعد وہ "شاعر" کے لئے فسانے روانہ کریں گی۔ غالباً آپ کے خط کے جواب میں ہی انھوں نے بھی تحریر کیا ہوگا۔ یقین ہے یہ افسانے غیر مطبوعہ ہونگے، میں نے تاکید کر دی ہے۔

صبح ورشتی کا مراسلہ ملا۔ آجکل بہت معروف ہیں۔ لکھا ہے۔ "اب کے عید نمبروں نے مجھ پر بہت ظلم کیا، ساری سویاں پہلے ہی ہضم کرالیں۔ ایک ہی وقت میں آمد و رش بھی

---

۵ سگرٹ کے لئے دیا سلائی سلگانے لگا تھا تو ایک چنگاری یہاں گر پڑی۔ آجکل جس طرح خط لکھا جاتا ہے۔ عجیب مصیبت ہے!

تنبل بنتی خلافت اور سہاگ لاہور کے عید نمبروں کے لئے افسانہ روانہ کرتا ہیں۔
خدا نظرِ بد سے بچائے اسدفعہ ناگپور کی خوب تعریف کی ہے بہت خوش ہیں شاہدہ بیگم" کی
آمد آمد ہے جب ہی تو اصرار ہے ؎

مری دُنیا منتظر ہے آپ کی
اپنی دُنیا چھوڑ کر آجایئے

آپ نے میرا افسانہ اس شمارے میں آخر شائع کر ہی دیا۔ آپ کی مرضی۔ حالانکہ
اس کے لئے تو میں آپ کو اور رشدی کو بھی لکھ چکا تھا، پھر ناگوار ہونے کا کون سا سوال؟
دوسرے شمارے کے لئے انشاء اللہ افسانہ بھیجونگا۔ ستمبر کا شاعر ابھی تک نہیں ملا۔
نہ معلوم اسدفعہ تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔

ذکی رضا صاحب سے میں واقف نہیں۔ اسدفعہ یونیورسٹی نہیں جوئن
کی پرائیویٹ اسپر ہو رہا ہوں۔ امراؤ جان ادا پر ان کا مضمون دیکھنے کا اشتیاق ہے
اس سے قبل شاہکار میں "ادا اور رسوا" پر تمکین کاظمی کا ایک مضمون دیکھا تھا۔ بہت
خوب لکھا ہے، دیکھنا ہے ذکی صاحب نے کون کون سے تاریک پہلوؤں پر روشنی
ڈالی ہے۔

بھابی سے میرا سلام عرض کر دیں۔

احسان دانش کے "بیتے ہوئے دن" آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے شاعرے
میں سنے تھے۔ اب آپ کے "بیتے ہوئے لموں کی یاد" دیکھنے کے لئے بے چینی سے
انتظار کر رہا ہوں —— !! —— آپ کا شوکت صدیقی
۲۸ ستمبر ۱۹۴۳ء

معرفت بیکرہ ادب بھوپال۔
۱۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء۔

محترمی تسلیم

"شاعر" بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء عین عالمِ انتظار میں موصول ہوا ——
شکریہ! سچ تو یہ ہے کہ ایسے نامساعد حالات میں جبکہ اچھے اچھے رسالے آخری سانس
لیکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، شاعر کا زندہ رہنا اعجاز سے کم نہیں ——
یہ تو کھوا اعجاز کا اعجاز ہے جو "شاعر" کو سینہ سے لگائے ہوئے ہے اور اس حوصلہ شکن
دور میں ناموافق حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اسکو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ خدا کرے "شاعر"
آئندہ بھی حسبِ سابق اپنی روایات کو برقرار رکھ سکے۔ آمین!
اُمید ہے آپ مع بھابھی بیگم بعافیت ہونگے ——

کیا ابھی کوئی غنچۂ معصوم —— دلبستگی کے لئے —— نہیں ——
اس ماہ کا شاعر بہ اعتبار معیار مضامین نظم و نثر بہت بلند ہے! بیک وقت
ہندوستان کے اساتذہ اور مشاہیر کو یکجا جمع کرکے اربابِ ذوق کی تشنگی کو بجھا دینا
—— صرف آپ کا کام ہے؟ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو تھوڑا سا شکوہ سن لیجئے ——
اس ماہ کے پرچہ میں کتابت کی بیشمار غلطیاں ہیں اور یہ شکایت مجھے صرف اس ماہ کے ہی
پرچہ کے مضامین نثر سے ہے۔ غالباً آپ مجھ سے اتفاق کرینگے —— ہوسکے تو
ایک غلط نامہ شائع کر دیا کیجئے یا اسکی نوبت ہی نہ آنے دیکئے تاکہ "شاعر" ہر اعتراض
سے محفوظ رہے۔
ایک ریڈیائی ڈراما بہ عنوان "ہار اکون" "شاعر" کے آئندہ نمبر کے لئے
ارسال کر رہا ہوں —— اُمید کہ آپ اسے بہ اعتبار زبان اور پلاٹ
پسند فرمائیں گے —— اُردو ادب میں ریڈیائی ڈراموں کا فقدان ملتا ہے
—— میں سمجھتا ہوں کہ بجز گنے چنے اور محدود ریڈیائی ماحول کے
افراد کے دیگر ادبا نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ ضرورت ہے کہ مختصر
ڈراموں کا ایک سلسلہ قائم کرکے اس میں وسعتِ خیال، ندرتِ بیان اور شستہ
زبان کو سمویا جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
میں اب بعافیت ہوں —— ہم دونوں کا سلام ——
آپ کا —— کوثر چاندپوری

دہلی - دفتر "کہکشاں"

مکرمی و محترمی! سلام مسنون

"شاعر" نظر سے گذرا۔ سچ جانیے مسرت ہوئی۔ آپ نے اچھے نقادوں کی
زبان میں جچی تُلی باتیں کہی ہیں اور سخن گسترانہ قسم کے برمحل اشارے بھی کئے
ہیں۔ میرے بھائی، شہرت یافتہ افسانہ نگاری کی فہرست پر کنٹرول ہے منہ دیکھکر
نام لکھے جاتے ہیں۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ آغاز اچھا ہوا ہے۔ خدا نے چاہا تو
انجام بھی اچھا ہوگا۔ آپ دوستوں کی دُعا اور ہمدردی شاملِ حال رہنی چاہیے۔
تازہ پرچہ ارسالِ خدمت کیا جا رہا ہے۔ نئی کتاب "اپنے خواب" تیار ہو رہی ہے
مولانا محترم کی خدمت میں سلام نیاز۔ توقع ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام
خادم
سیّد کاظم علی دہلوی

آوازِ ضمیر

عیش ہے، لطف ہے، مسرت ہے
آپ کی یاد کی عنایت ہے

حُسن کا کام دلربائی سہی
عاشقی مقتضائے فطرت ہے

اب تو آ ہی گیا وہ حشر خرام
اب قیامت کی کیا ضرورت ہے؟

ہر جگہ، ہر گھڑی اُنھیں کی یاد
اب تو جلوت بھی مجھ کو خلوت ہے

آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیا میں نے
کہ مجھے آپ سے محبت ہے!

مقصدِ زندگی ہے آپ کی یاد
آپ کا تذکرہ "عبادت" ہے

ہر گھڑی آپ کے تصور میں
ہر جگہ میرے حق میں جنت ہے

ضمیر البرکاتی

جذباتِ فضا

چارۂ چشمِ فتنہ زا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

وہ تجاہل سے پوچھنا اُن کا
عشق کیا چیز ہے وفا کیا ہے

مائلِ التفات ہے کوئی
سوچتا ہوں یہ ماجرا کیا ہے

دیکھتی ہے اُسے تو اک دُنیا
آئینے میں وہ دیکھتا کیا ہے

سب ہیں بیہوش اک جلوے سے
کس سے پوچھوں کہ ماجرا کیا ہے

دیکھ لو لطف کی نگاہوں سے
یہ نہ پوچھو کہ مدعا کیا ہے

کوئی پہلو سکون دل کا نہیں
جانے تقدیر میں لکھا کیا ہے

ہائے آغازِ عشق کا وہ سکوں
ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے

آج چہرہ ہے کیوں اُداس بہت
کچھ تو کہئے کہ ماجرا کیا ہے

لب تک آتا نہیں کوئی نالہ
بات یہ حضرتِ فضاؔ کیا ہے

فضا جالندہری

تجلیاتِ مہر

ایک رنگیں نگاہ نے مارا
جلوۂ بے پناہ نے مارا

حُسن کا اس میں کچھ قصور نہیں
مجھکو میری نگاہ نے مارا

تیری عصیاں نوازیوں کی قسم
انفعالِ گناہ نے مارا

ستمِ خاص کا تو کیا کہنا!
کرمِ گاہ گاہ نے مارا

حُسن کی دلکشی معاذاللہ!
فرصتِ یک نگاہ نے مارا

پوچھ اُس سے نزاکتیں دل کی
جس کو تیری نگاہ نے مارا

حسن پرچھائیوں کے روپ میں تھا
جلوۂ مہر و ماہ نے مارا

مہرؔ ہوتا کبھی نہ راز عیاں
اہتمامِ نگاہ نے مارا

عزیززادہ مہر عثمانی (جونا گڑھی)

قسط دہم　　(گذشتہ سے پیوستہ)

……… کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں۔ بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرے کے بعد ریاست میسور کے تاریخی مقامات کی سیر)

وقت کم ہے اور ابھی سلطان شہید کے مزار پر بھی حاضری دینی ہے اس لئے تانگوں کا رُخ مشرقی سمت پھروا دیا گیا۔ چند منٹ کے بعد گنبدِ اعلیٰ نظر آنے لگا۔ اسی کے نیچے بادشاہِ حریت سلطان ٹیپو آسودۂ خاک ہیں۔ بیرونی حصّہ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت باغ ہے۔ جہاں سے مقبرہ صاف نظر آتا ہے اور جلال و جبروت کا ایک بالا عکس پیشِ نظر ہوتا ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف برآمدہ ہے جس کی چھت سنگِ سیاہ کے ستونوں پر رُکی ہوئی ہے۔ مقبرہ کے مغربی دروازہ پر دائیں بائیں تاریخیں کندہ ہیں۔ مشرقی دروازہ سے اندر داخل ہوتے تو پہلی قبر سلطان کی والدہ ماجدہ کی نظر آئی۔ اسی طرح جنوبی دروازے کے مقابل نواب حیدر علی اور مغربی دروازے کے مقابل سلطان شہید کے مزارات ہیں۔ سلطان کے مزار پر سُرخ غلاف پڑا ہوا ہے۔ گویا آزادی کی راہ میں سلطان نے جو خون بہایا تھا اُس کی یادگار ہے۔ ہر طرف یاس و قنوط اور افسردگی چھائی ہوئی دیکھی، پھر سنگِ سیاہ اس کثرت سے مقبرہ میں لگایا گیا ہے کہ ماحول خود بخود ماتمی ہو جاتا ہے۔ دروازوں پر جابجا قطعات کندہ ہیں۔ ان کے کواڑ بھی سیاہ لکڑی کے بنائے گئے ہیں جن پر ہاتھی دانت کا کام ہے۔

مقبرہ کے صحن سے ملی ہوئی مسجدِ اقصیٰ ہے جسے اب مسجدِ احمدی کہتے ہیں سلطان کے مزار کی زیارت کرکے دل و دماغ مطلق افسردہ ہو کر رہ گئے اور سب پر ایک خاموشی سی طاری ہو گئی۔ جی گھبرانے لگا اور وہاں سے جلد ہی اُٹھ کر اسٹیشن واپس آگئے۔ ٹرین آنے والی ہے اور نگاہیں آخری بار تاجدارِ آزادی ٹیپو سلطان کی دیارکو سلام کر رہی ہیں۔

سرنگا پٹم سے میسور کی مسافت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم شاید ایک گھنٹہ میں میسور پہونچ گئے تھے۔ سر بفلک عمارتیں، کشادہ سڑکیں، صاف گذرگاہیں، اس کے باوجود بنگلور کی سی تازگی و زندگی اور دلفریبی اس میں نہیں۔ حالانکہ مہاراجہ میسور کا یہاں ایک عالیشان محل، کئی باغ اور ایک چھوٹی سی پہاڑی بھی ہے۔

سامان کتنا ہی بے سر و سامان کیوں نہ ہو لیکن تھوڑا بہت "زحمتِ دسر" ضرور ساتھ ہوتا ہے۔ چونکہ صرف شام تک قیام کا قصد ہے اس لئے خاموشی کے ساتھ اسے کہیں ایک جگہ رکھ دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہاں کی شاعر نواز مخلوق کو اطلاع ہو گئی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائیگا۔ چنانچہ زحیم صاحب کے ایک دوست کے یہاں پہونچے۔ اتفاق سے وہ بھی موجود نہ تھے مگر ایک کمرہ ہمیں ضرور مل گیا۔ سامان رکھا۔ کھانا کھایا۔ کچھ دیر کسل دُور کیا اور پھر سیر کیلئے نکل گئے۔ سب سے پہلے میسور کے بڑے محل کو دیکھنے کی کوشش کی گئی، مگر جنگ کے خطرات کے تحت پاس نہ مل سکا۔ گویا یہ ہندوستانی شاعروں کی جماعت بھی حریفوں کی جماعت تھی۔ بہرحال محل کے بیرونی حصے اپنی وسعت اور طول و عرض کے اعتبار سے اسکی شہادت دے رہے ہیں کہ محل واقعی محل ہے۔ محل کے کئی بڑے دروازے ہیں جہاں ہم پہونچے ہیں وہ غالباً صدر دروازہ ہے اور بجلی کے ہزار ہا قمقموں کا ایک تخیل پیش کر رہا ہے۔ ہمیں بتایا بھی گیا کہ خاص خاص مواقع پر ان "برقیوں" میں قمقمے لگا دیتے جاتے ہیں اور محل رنگینیوں کا مجسمہ بنا دیا جاتا ہے۔

مہاراجہ میسور کے محل کی دید سے محروم ہو کر "جگن موہن پیلیس" پہونچے۔ اسے دیکھنے کی عام اجازت ہے اور ٹکٹ کے ذریعہ داخلہ ہوتا ہے۔ اس محل کی عمارت تو خیر ایسی کوئی خاص نہیں ہے۔ لیکن اس میں جن نوادرات اور اعجوبۂ روزگار چیزوں کو جمع کیا گیا ہے وہ واقعی قابلِ دید ہیں۔ تفصیل تو خیر ممکن نہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ظروف۔ تصاویر۔ چھڑیاں۔ چنگ و رباب اور ہر قسم کے ساز، مجسمے۔ صناعی کے نادرالوجود شاہکار۔ تلواریں اور خدا جانے کیا کیا کچھ یہاں موجود ہیں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز عجائباتِ عالم میں سے کہی جا سکتی ہے۔ حیرت و استعجاب اور لذتِ نظارہ سے ہر قدم پر دوچار ہونا پڑ رہا ہے، وقت کم اور اپنی طرف کھینچنے والی لذتیں زیادہ! ایک حساس شاعر کے لئے ہر صنعت ہزار دل خوبیوں کی حامل ہوتی ہے۔ جس طرح وہ ایک شعر کے لئے جگر کاوی کرتا ہے اسی طرح اُسے دوسرے صناعوں کی عرق ریزی کا بھی پوری طرح احساس ہوتا ہے پھر مصوری اور شاعری میں تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تصاویر پر نگاہیں جمیں تو جم کر ہی رہ گئیں —— اور پھر یہاں محل کی تصاویر! گویا مانی و بہزاد کی روحیں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ ہندوستان کے قریب قریب تمام باکمال مصوروں کی قلمکاریوں کے بہترین نمونے یہاں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ چغتائی آرٹ کی بھی متعدد تصاویر آویزاں ہیں۔ (باقی۔ باقی)

اعجاز صدیقی

جدید اردو شاعری میں سلام و مراثی اور نوحہ و سوز کے دو عدیم النظیر مجموعے

سرودِ غم

(دوسرا ایڈیشن)

شہدائے کربلا کی سیزدہ صد سالہ برسی پر شاعرِ مشرق کا ہدیہ پیام و سلام

(از حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی)

یہ دل نشیں رباعیات، دلدوز سوز، دلکش نظموں، دل ہلا دینے والے سلاموں اور دل انگیز پیاموں کا وہی مجموعہ ہے، جسکا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل جانے کے بعد سو روپیہ میں بھی ایک نسخہ نہ مل سکا۔ اب عقیدتمندانِ امام علیہ السّلام کے بے حد اصرار پر بمشکل دوسرا ایڈیشن کثیر روپیہ صرف کرکے چھپوایا گیا ہے۔ یہ ایڈیشن بعد نظرِ ثانی خاص اہتمام سے چھپا ہے۔ اسکی قبولیت دیکھتے ہوئے کچھ تعجب نہیں کہ محرم الحرام ۱۳۶۳ھ سے پہلے ہی سب جلدیں ختم ہو جائیں۔ اور پھر کسی قیمت پر تیسرے ایڈیشن تک کوئی نسخہ نہ مل سکے۔ اس لئے اگر یہ مجموعہ آپکے پاس نہیں ہے تو آج ہی اسکی ایک جلد طلب فرمالیجئے۔ حجم یکصد صفحات۔ سائز ۲۹ × ۲۲ / ۱۶

قیمت فی جلد عہ محصول ۶

نفیرِ غم

"سرودِ غم" کے بعد روح افروز نظموں، دلگداز سلاموں اور اصلاحی رباعیوں کا مجموعہ

(از حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی)

اب یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ ہر سال شہیدِ کربلا کے حضور میں **قصر الادب** سے جو نذرِ عقیدت پیش کی جاتی ہے۔ وہ ناقابلِ مقابلہ ہے آپ "**سرودِ غم**" میں علامہ سیماب مدظلہ کی قوتِ قلم ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اُن کی عزائی نظمیں، اور اُن کے سلام بیک وقت دلوں میں لرزش بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ رُلا بھی دیتے ہیں اور سُننے والوں میں جوش و ولولہ بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ اب **نفیرِ غم** میں اُن کی اجتہادی ادبی قوتیں اور حُسنِ عقیدت ملاحظہ فرمائیے اِس کی انوکھی نظمیں، نئے سلام، نئے خمسے اور نئی رباعیاں آپ کی مجالس کو کیف و اثر اور وجدان و درد مانی سے بھر دینگی۔ اس کے علاوہ "**نفیرِ غم**" میں ایک بصیرت آفریں **خطبۂ صدارت** بھی ہے، جس کا مطالعہ اضافۂ معلومات کے علاوہ مسلمانوں میں ایک جذبۂ عمل اور ایک نیا طریقہ کار پیدا کر دیگا۔

حجم یکصد صفحات، "سرودِ غم" سائز۔ نہایت نفیس گرد پوش۔ قیمت باوجود گرانیِ کاغذ وہی عہ، محصول ۲ر

پہلا ایڈیشن بہت کم چھپا ہے۔ اس لئے اس ہدیہ کو جلد از جلد حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔

ملنے کا پتہ:- **مکتبۂ قصر الادب دفتر "شاعر" آگرہ**

مشاعرۂ شاعر

مصرعِ طرح :— ”آج پھر حسنِ حقیقت کو نمایاں کر دیں“

حضرت مولانا ناطق گلاؤٹھوی

جان دینی ہے تو لاؤ اسے قرباں کر دیں
منت کا ہم بھی کسی شخص پہ احساں کر دیں

آ، ابھی ترکِ طلب سے دلِ ناداں کر دیں
کام ہوتا ہے تو بے منتِ حرماں کر دیں

دوست گذرے ہوئے ایام کو لے آئیں گے کیا؟
مشکل ایسی نہیں میری جسے آساں کر دیں

کلفتیں بڑھ کے حریفِ غمِ ہستی ہو جائیں
دل کو اتنا تو کریں تنگ کہ زنداں کر دیں

نالہ ساماں ہے اگر تنگیٔ دامانِ سحاب
برق آ، تجھکو رگِ دیدۂ گریاں کر دیں

شامِ غم کو تو ابھی دیر ہے آنے کے لئے
ڈھلتی ہی دن ہو نہ ہم کو تو کام تمام کر دیں

لے گیا چھین کے بت کو تو خدا اے ناطق
اب مسلماں مجھے چاہیں تو مسلماں کر دیں

حضرت برق صدیقی فتحپوری

دلِ برباد کے ذروں کو پریشاں کر دیں
اپنے افسانۂ غم کا انھیں عنواں کر دیں

خواب ہو سازِ طرب اے دلِ ہنگامہ طلب!
سازِ غم چھیڑ کے ہستی کو غزلخواں کر دیں؟

عمر بھر میں ہمیں اب لطفِ حیات آیا ہے
نشتر آپ اور بھی پیوستِ رگِ جاں کر دیں

شرطِ بارانِ کرم ہے یہی اے ابرِ کرم؟
اپنے دامن کو ہم آلودۂ عصیاں کر دیں

یہ تو ہوگا کہ اندھیرا نہ رہے گا دل میں
لاؤ پھر شمعِ تمنا کو فروزاں کر دیں

ساتھ کر دوں شبِ غم ٹوٹے ہوئے دل کی دعا
ٹوٹ کر تاری جو دم بھر بھی چراغاں کر دیں

خاکِ ناچیز سے انساں جو بنا دیتے ہیں
برق کو بھی وہ اگر چاہیں تو انساں کر دیں

حضرت نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اورئی

دل کے جلووں کو ہم اپنے جو نمایاں کر دیں
ہر ستارے کو فلک کے مہِ تاباں کر دیں

حسرتِ دید تو رکھتا ہوں مگر ڈرتا ہوں
پھر نہ محروم کہیں دیدۂ حیراں کر دیں

رات کو آتے ہیں وہ گورِ غریباں کی طرف
جگنوؤں سی کوئی کہدو کہ چراغاں کر دیں

نالۂ دگل سے وہ کس طرح اٹھا دیں پردہ
کیوں زمانہ کو پرستارِ گلستاں کر دیں

جب بقدرِ گنہ تنگی ہے رحمت اس کی
کیوں فراخ اور نہ ہم دامنِ عصیاں کر دیں

متفق ہو کے رہیں یہ، تو خدا شاہد ہے
جنت اس ملک کو ہندو و مسلماں کر دیں

وسعتِ ذوقِ نظر اپنی سلامت نشتر
جتنا محدود کہو عالمِ امکاں کر دیں

جناب محشر فرخ آبادی

الحمد کہ مسا دیہ قصر او ریہ ایواں کر دیں
بانیٔ ظلم کا شیرازہ پریشاں کر دیں

تاجِ نخوت کو جھکا دیں درِ مظلوم پہ
سر بلندوں کو بھی اب سر بگریباں کر دیں

قصرِ نمرود ہے کیا، کنگرۂ کسریٰ کیا
ہم وہ ہیں زیر و زبر عالمِ امکاں کر دیں

آ، کریں شاہدِ مقصود کو مجبورِ وصال
مختصر قصۂ طولِ شبِ ہجراں کر دیں

تلبکے خواب کا عالم یہ رہے گا طاری
صبح کو شام کے پردوں سے نمایاں کر دیں

ہمیں احساسِ اسیری ہی نہیں ہے ورنہ
ایک ٹھوکر میں شکستہ درِ زنداں کر دیں

کام لیں آج بھی گر عزمِ جواں سے محشر
ہم ہر اک منزلِ دشوار کو آساں کر دیں

حضرت مہر تقوی بجے پوری

وہ اگر اپنی تجلی کو نمایاں کر دیں
ہر نظر کو نظرِ موسیٰ عمراں کر دیں

وہ فرما ہوں اگر دشت میں آثارِ جنوں
سرِ ہر خار گریباں ہی گریباں کر دیں

فرطِ عصیاں سے ہے وابستہ یہ مقصد اپنا
کہ تری شانِ کرم اور نمایاں کر دیں

تہمتِ دل پہ مری حرف نہ آجائے کہیں
دمِ رخصت کوئی تسکین کا بھی ساماں کر دیں

سن کے روداد پریشانی کی گیسو بکھیر
یہ کہیں بزمِ جہاں کو نہ پریشاں کر دیں

ذوقِ دیدار کی ہر سمت جلا کر شمعیں
زاویے حسن کی محفل کے نمایاں کر دیں

کام لیں جذبۂ صادق سے اگر مہر اے مہرؔ!
دشتِ تجرید کا ہر ذرہ درخشاں کر دیں

جناب سہا قریشی ایڈووکیٹ بنڈ

اک نئے ڈھنگ سے آغازِ بہاراں کر دیں
لاؤ ہم اپنے گریباں کو گریباں کر دیں

جذب کرتے ہیں جنھیں دامنِ صد پارہ میں
انھیں قطروں کو اگر چاہیں تو طوفاں کر دیں

ہائے بے بالی و پری قوتِ پرواز نہیں
باغباں کہتا ہے ”کیا داورِ زنداں کر دیں“؟

جب تو سمجھونگا کہ کام آبلہ پا آتے ہیں
کہ یہ آسودگیٔ خارِ مغیلاں کر دیں

لیجئے قیدِ قفس بھی ہے مجھے راس آہی گئی
شوق سے آپ نشیمن مرا ویراں کر دیں

بس مداوا ہے یہی اک غمِ تنہائی کا
آپ خاموش فضاؤں کو غزلخواں کر دیں

لذت افزا بھی ہو جائے سہا کی ہستی
ایک نشتر بھی جو وہ دقفِ رگِ جاں کر دیں

جناب وفا جون پوری (بمبئی)

کبھی نالاں، کبھی حیراں، کبھی گریاں کر دیں
آپ مختار ہیں جب چاہیں پریشاں کر دیں

منظرِ شام و سحر کو ابھی یکساں کر دیں
گیسوئے روشن پہ جو زلفیں وہ پریشاں کر دیں

زحمتِ چارہ گری میں نہیں دیتا اُن کو
ہاں وہ چاہیں تو فروغِ زخم پنہاں کر دیں

ڈر یہ ہے عصمتِ نظارہ پہ حرف آئے گا
ورنہ ہم حسنِ حقیقت کو نمایاں کر دیں

صرف آئینہ پہ موقوف نہیں حیرانی
وہ اگر چاہیں تو دنیا کو بھی حیراں کر دیں

نہیں پروائے ستم مجھکو مگر فکر یہ ہے
خود انھیں اُن کی جفائیں نہ پشیماں کر دیں

جلوۂ حسن نظر آئے گا ہر سمت وفا
چشمِ نظارہ کو ہم دیدہ کے شایاں کر دیں

جناب پریم شیدائی دہلوی

جمع بیعانوں کے اجزائے پریشاں کر دیں
شمع بے نور ہے پھر اس کو فروزاں کر دیں

جادۂ عشق میں ظلمت کا نشاں ہی نہ رہے
کیوں نہ ہم داغِ محبت کو نمایاں کر دیں

اپنے ہر ذرۂ ہستی میں ہے اتنی تابش
جلوۂ طور جہاں چاہیں نمایاں کر دیں

ہو گئیں اور بھی دشوار وفا کی راہیں
یہی سوچا تھا کہ لاؤ انھیں آساں کر دیں

موسمِ گل ہی پہ موقوف نہیں وحشتِ دل
تیرے دیوانے ابھی چاک گریباں کر دیں

قوتِ ذوقِ نظر پر ہے مجھے اپنی یقیں
اب جہاں چاہیں وہ جلووں کو نمایاں کر دیں

پریم کے بعد نہ پھر کوئی رہِ گیر وفا
بند اس راہ کو اب تا حدِ امکاں کر دیں

جناب رعنا نظامی۔ راجوری

آؤ پھر عالمِ امکاں میں بھریں رنگینی
آؤ ہر ذرہ کو ہم رنگِ گلستاں کر دیں

چشمِ معنیٰ نگر و سوزِ یقیں ہو جو نصیب
تو ہم اس غمکدے کو آئینہ ساماں کر دیں

دلکشی صبح کو اور شام کو دیں تابانی
اس خرابے کو بھی فردوس بداماں کر دیں

جلوۂ منزلِ محمود کو دیں ذوقِ ایاز
مٹ چکے ہیں جو نقوش انکو نمایاں کر دیں

جل کے ہو جائیں ابھی خاکستر
ہم اگر سوزِ نظر اپنا نمایاں کر دیں

ہوں وہ کیفیتیں احساس میں پیدا رعنا
کہ جو شیرازۂ افکار پریشاں کر دیں

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

ایک ہنگامۂ ایمن تہِ داماں کر دیں
دل کی رگ رگ کو تجلی گہہ عرفاں کر دیں

حسن کو عشق کی صورت سے نمایاں کر دیں
اک تماشا سا سرِ عالمِ امکاں کر دیں

منتشر مہرِ جہاں تاب کی کرنیں کیوں ہوں
ان خدنگوں کو بھی پیوستِ رگِ جاں کر دیں

جذب ہے ضبط کے دامن میں جو ہر شبِ غم
پھر انھیں اشک کے قطروں سے نمایاں کر دیں

تا بکے شکوۂ تاریکیٔ بزمِ ہستی!
دل کے فانوس میں اک شمع فروزاں کر دیں

بیٹھ سکتے نہیں پھر چین سے وہ اے طرفہ!
ہم اگر اپنی تمنا کو پریشاں کر دیں

جناب خلیل از سکولی

آؤ دل مل کے یہ اک کارِ نمایاں کر دیں
منزلِ عشق ہے دشوار اسے آساں کر دیں

لطف آجائے اسیری میں کبھی فصلِ گل کا
شامِ زنداں کو جو ہم صبحِ گلستاں کر دیں

دل سے اٹھتی ہی نہیں موجِ صبا صبحِ وفا
ورنہ اک روز انھیں ہم بھی پریشاں کر دیں

صحنِ گلشن میں ابھی آئی نہیں موجِ نسیم
اے جنوں پہلے ہی کیوں چاک گریباں کر دیں

ہیں ہمارے دل میں ہر اک قطرۂ طوفاں پنہاں
جب کبھی چاہیں اسے خالقِ طوفاں کر دیں

محفلِ عشق میں خاموش ہیں کیوں آپ خلیل
حسن کو سازِ محبت پہ غزلخواں کر دیں

جناب عصمت قریشی بلاسپوری

وحشتِ عشق کو عالم پہ نمایاں کر دیں
چاک دل، چاک جگر، چاک گریباں کر دیں

سوز کو ساز کے پہلو سے نمایاں کر دیں
ایک ہنگامہ سرِ محفلِ امکاں کر دیں

آئے ایسا بھی کوئی دن کہ ترے دیوانے
اپنی صورت تری صورت سے نمایاں کر دیں

ہو تو جاؤں میں کسی طرح ہم آغوشِ چمن
گل بداماں نہ سہی خار بداماں کر دیں

میں سمجھا ہوں کہ زلیخا بھی نہ اک مجھ سے بنے
وہ جسے چاہیں اسے یوسفِ کنعاں کر دیں

کیا صفت حضرتِ طرفہ کی بیاں ہو عصمت
وہ جسے چاہیں اسے صاحبِ دیواں کر دیں

جناب بیتاب کالپوی

کچھ دیکھو تو وہ مرے حال پہ احساں کر دیں
زندگی کا نہ سہی موت کا ساماں کر دیں

طور پر آئیں وہ، یا دل کو ہوں میرے ظاہر
ہے یہ مقصد کسی صورت مجھے حیراں کر دیں

بیکسی رنج و الم خواب کی باتیں ہو جائیں
ہم اگر مرحلۂ زیست کو آساں کر دیں

پھر کریں عام مساوات و اخوت کا چلن
پہلے ہم دورِ کے انسان کو انساں کر دیں

چھیڑ کر حشر میں روداد محبت اپنی
کیوں نہ اُن زود پشیماں کو پشیماں کر دیں

ہم اگر نغمہ نو چھیڑ دیں اپنا بیتاب
ذرہ ذرہ کو گلستاں کے غزلخواں کر دیں

جناب بخت اکبر آبادی

اپنے اعمال زمانے پہ نمایاں کر دیں
آج ہم کل کے لئے کچھ سر و ساماں کر دیں

پھر کسی فکر و تردد کی ضرورت ہی نہیں
ہم اگر آج مسلماں کو مسلماں کر دیں

کیوں غریبوں کو گراں بار پریشانی ہو
اہلِ سرمایہ جو ہر جنس کو ارزاں کر دیں

در پے امن آج کہیں ہے نہ کہیں صلح کا درس
عاقلِ انساں کمینہ دنیا کو نہ ویراں کر دیں

باغباں روک دیں بربادی و ویرانی کو
کرم و لطف سے آباد گلستاں کر دیں

فیضِ تلامذہ سیماب سے کچھ دور نہیں
بخت کو آلِ محمد کا ثنا خواں کر دیں

جناب عارف سیالکوٹی

آؤ پھر ذوقِ محبت کو غم افزا اں کردیں
اس فنا زار کو فردوس بداماں کردیں

آؤ پھر پردہ فضاؤں میں بھریں شرحِ حیات
آؤ پھر سازِ محبت کو غزلخواں کردیں

بے حجاب آکے وہ ایوانِ تصور میں کبھی
پھر سے تاریک خیالوں میں چراغاں کردیں

مسلکِ عشق میں جمعیتِ خاطر کے لئے
کیوں نہ شیرازۂ ہستی کو پریشاں کردیں

آنکھ حسرت سے ہے آنکھ کبھی کی محروم
اتنا اس فطرت کو بہلائیں کہ طوفاں کردیں

جناب شنکر لال وفا اکبرآبادی

خوگرِ عشقِ مجازی پہ یہ احساں کردیں
خود ہی وہ حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں

کون کہتا ہے نہیں دردِ محبت کا علاج
وہ اگر چاہیں نظر ڈال کے درماں کردیں

ہم نہیں ہوتے وفا اپنی بدلنے والے
وہ جفا کرتے ہیں لاکھ پریشاں کردیں

فطرتِ چرخِ کہن خود ہی بدل جائے ابھی
سوزِ پنہاں کو اگر ہم شرر افشاں کردیں

دیکھے ہم درسِ وفا وسعتِ عالم کو وفا
ستم و جور کو پھر صاف یہ میداں کردیں

جناب شان اویسی۔ احمد پور شرقیہ (بھاولپور)

ذرے ذرے میں وہ جلووں کو نمایاں کردیں
دونوں عالم کے اندھیروں میں چراغاں کردیں

دلِ بیتاب کی تسکین کا ساماں کردیں
ایک مجبور کو شرمندۂ احساں کردیں

غمِ ایامِ محبت کی تلافی کرکے
غمِ واماندہ کو فردوس بداماں کردیں

زندگی باعثِ تکلیفِ دل و جاں کیوں ہو
زندگی وقفِ نشاطِ طرب افشاں کردیں!

فیض ہے حضرتِ سیماب کا جاری اے شان
وہ اگر چاہیں تو گونگوں کو غزلخواں کردیں

جناب اثر ذائقی بنگلوری

دل اگر راہِ محبت میں گیا جانے دو
جان نکلی ہی ہم اس راہ میں قرباں کردیں

چشمِ دیدارِ طلب کو نہ رہی حسرتِ دید
اسقدر جلوہ گری حسن کی ارزاں کردیں

ہم سرِ بزم ہی اظہارِ تمنا کرکے
کیوں نہ اس شوخ دلستاں کو پشیماں کردیں

جوشِ وحشت کو ہمارے ابھی دیکھا کیا ہے
ہم ہر اک ذرہ کو چاہیں تو بیاباں کردیں

اے اثر ساز میں ہر گونہ رہے راز پنہاں
وہ اگر حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں

جناب منظر رحمانی مظفرپوری

دیدنی نزع میں ہے کشمکشِ یاس و امید
کاش وہ آکے یہ مشکل مری آساں کردیں

شمع کا کون شبِ غم ہے جہاں میں منت
تابشِ داغ ہی سے گھر میں چراغاں کردیں

تو اگر جوشِ جنوں اب بھی مدد فرمائے
منزلِ عشق کو ہم اور بھی آساں کردیں

دیکھ لیں غنچے اگر باغ میں تیرا عالم
موسمِ گل کی قسم چاک گریباں کردیں

فطرتِ عشق کو منظور یہ گوارا ہی نہیں
کہ انہیں ہم سرِ محشر بھی پشیماں کردیں

جناب صغیر اثر اکبرآبادی

آپ کے دم سے ہے ترتیبِ بہارِ عالم
آپ چاہیں تو بیاباں کو گلستاں کردیں

قوتِ نظمِ گلستاں ہے مکمل ان میں
گل کو مہکائیں کہ کلیوں کو غزلخواں کردیں

پرتوِ حسن سے ہو جائینگی آنکھیں روشن
منعکس قلب پہ وہ جلوۂ تاباں کردیں

جان و دل کی تو محبت میں حقیقت کیا ہے
دین بھی تجھ پہ فدا دشمنِ ایماں کردیں

کاش پیکر ہی اثر آئے وہ مرے گھر میں
اور سرزمیں پہ مرا خانہ ویراں کردیں

جناب عالی۔ علی نگر پولور

وہ بت خانہ میں سجدوں سے چراغاں کردیں
اسقدر کفر کو چمکائیں کہ ایماں کردیں

کیوں نہ تکمیلِ جنوں کا کوئی ساماں کردیں
ان کے دامن ہی کو آج اپنا گریباں کردیں

ناقص ہے محبت میں ابھی سوز و خلش
درد کو اتنا بڑھائیں کہ وہ درماں کردیں

نہ رہی عشق میں جمعیتِ خاطر نہ رہی
کیوں نہ شیرازۂ ہستی کو پریشاں کردیں

کفر و ایماں میں نہ کچھ فرق رہے گا عالی
وہ اگر اپنی تجلی کو نمایاں کردیں

جناب انور نوحی اپلوی

درد دیکر وہ مرے درد کا درماں کردیں
عشق کی منزلِ دشوار کو آساں کردیں

طالبِ دید ہوں دیدار کی خواہش ہے مجھے
حسنِ مستور کو وہ اب تو نمایاں کردیں

گریۂ نوح سے کچھ کم نہیں رونا اپنا
ہم اگر چاہیں تو برپا ابھی طوفاں کردیں

شبہ کی بات نہ رہ جائے کسی کے دل میں
آپ اگر حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں

ڈال کر بہرِ خدا ایک عنایت کی نظر
وہ تمنائے دلِ انور کو فروزاں کردیں

جناب سلطان نقشبندی

بزم کی بزم کو وہ طور بداماں کردیں
"آج پھر حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں"

دمِ آخر ہی وہ آجائیں مری بالیں پر
کاش اتنا تو مرے حال پہ احساں کردیں

دل تو ہم رہِ نیاز دے ہی چکے ہیں انکو
اب جو وہ آئیں تو یہ جان بھی قرباں کردیں

بجلیاں مجھ پہ گراتے ہو تبسم سے مگر
نہیں شعلے مرے دل کے نہ پریشاں کردیں

داغِ دل داغِ جگر داغِ جبیں ان سب کو
دے کے وہ حسنِ قبول اور درخشاں کردیں

جناب انور شہادوی

پرتوِ حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں
دل کے آئینہ کو آئینۂ عرفاں کردیں

درد کو راحت و آرامِ دل و جاں کردیں
خود ہی پیدا کوئی تسکین کا ساماں کردیں

نہیں آتا ہے اگر آپ کو تسکیں دینا
درد اور کرب کو کچھ اور فراواں کردیں

اپنی نظروں میں ہے وہ جلوۂ صد رنگِ ازل
جس پہ پڑ جائیں نگاہیں اسے حیراں کردیں

خلوتِ شوق میں اک جا ہی رہیں ناز و نیاز
آپ آؤ تو کبھی ہمرازِ شبستاں کردیں

جناب شوق شہادوی

جلوۂ طور سے نظروں کو پریشاں کردیں
"آج پھر حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں"

کچھ نہ کچھ یاد تو باقی ہی رہے گی دل میں
محفلیں آپ سجا کر مری ویراں کردیں

ظرفِ موسیٰؑ کا ہزاروں کو یہاں دعویٰ ہے
وہ تجلی کو سرِ طور نمایاں کردیں

حسرتیں ناز کریں تنگیِ داماں کا گلہ
دل کے ہر ذرے کو وسعت میں بیاباں کردیں

پھر اٹھا شوقؔ وہ اک نغمۂ کیف و مستی
دل کے بھی سازِ شکستہ کو غزلخواں کردیں

جناب ثاقب بڑدوانی

یہ تو ممکن ہے علاجِ دلِ سوزاں کردیں
عشق ایسی نہیں مشکل جسے آساں کردیں

امتحاں ہو جو مری ذوقِ نظر کا مقصود
اپنے جلووں کو ذرا تا حدِ امکاں کردیں

کسی صورت سے تو ہو دور یہ تاریکیِ غم
آؤ پھر بزمِ محبت میں چراغاں کردیں

مجھے یہ ضد کہ نہ بر آئے کوئی دل کی امید
انھیں ارمان کہ پوری مرے ارماں کردیں

اور در ہی کوئی ثاقبؔ نہیں سجدوں کے لئے
کس لئے سر کو نہ وقفِ درِ جاناں کردیں

جناب ارشد صدیقی ساگری

وہ اگر حسن کے جلووں کو پریشاں کردیں
اہلِ نظارہ کو آئینۂ حیراں کردیں

تابِ نظارہ زمانے کو رہے یا نہ رہے
آپ تو شمعِ حقیقت کو فروزاں کردیں

عشقِ ناکام سے کہہ دو کہ ابھی صبر کرے
ہم ذرا فطرتِ غم کو تو نمایاں کردیں

ذوقِ نظارہ دکھانے پہ جو ہم آئیں کلیمؑ
جلوۂ طور کو اک شعلۂ عریاں کردیں

چھیڑ کر سازِ ہوا پر کوئی نغمہ ارشدؔ
موجۂ گل کی لطافت کو نمایاں کردیں

جناب خلیق ایولوی

ایسے دیوانے بھی ہیں عالمِ امکاں میں ابھی
ایک ٹھوکر سے جو برپا حشر کا طوفاں کردیں

چھیڑ کر نغمۂ جاں بخش ربابِ دل پر
بزمِ کونین کے ہر ذرے کو رقصاں کردیں

شاید امید کے ساحل سے ہو اس طرح قریب
ہم تمنا کی ہر اک موج کو طوفاں کردیں

اب نہ پوچھیں دلِ مایوس سے رودادِ الم
آپ اتنا ہی مری حال پہ احساں کردیں

سلب ہو سکتی نہیں طاقتِ پرواز خلیقؔ
مرغِ آزاد کو گر داخلِ زنداں کردیں

جناب فارغ اودے پور

منہ اگر پھیر لیں ہم باغ کو ویراں کردیں
دیکھ لیں ہنس کے تو سر سبز بیاباں کردیں

پھول پتوں میں چھپاتے پھریں اپنے چہرے
حسنِ پوشیدہ کو ذرے پہ نمایاں کردیں

عمر بھر سوزنِ تدبیر رفو کر نہ سکے
تیرے دیوانے اگر چاک گریباں کردیں

عمر بھر عیش کے ساماں کئے جن کے لئے
وہ ہی اس طرح ہمیں بے سر و ساماں کردیں!

جورِ گلچیں کو جو ہم دیکھتے ہیں اے فارغؔ
دل میں آتا ہے کہ اس باغ کو ویراں کردیں

جناب موج دیوبندی

جلوۂ حسن کو کچھ اور فراواں کردیں
یعنی ہر ذرے کو فردوس بداماں کردیں

تیرے دیوانے اگر چاک گریباں کردیں
دل کے ہر داغ کو صد رنگِ گلستاں کردیں

ہیں جو ہشیار انھیں پر قیدِ غم بندِ حیات
کیوں نہ دیوانہ کو آزادۂ زنداں کردیں

پھول مرجھا گئے کمھلا گئیں ساری کلیاں
اور کیا نذرِ خزاں اہلِ گلستاں کردیں؟

آج فردوسِ تخیل کو سجا کر اپنے
حسن کو عشق کے پردوں سے نمایاں کردیں

جناب ممتاز ازکھنڈوہ

ہم ہیں واقف اثرِ آہ و فغاں سے اپنے
آج چاہیں تو بپا حشر کا طوفاں کردیں

کیا کہیں اہلِ محبت کو، یہ وہ لوگ ہیں جو
جان کر جان کو نذرِ صنمِ جاناں کردیں

یہ بھی جینے کا ہے مقصد کوئی جینے والو
خود پریشان ہوں عالم کو پریشاں کردیں

سب کچھ آسان ہے انکے لئے ایماں ہے مرا
وہ اگر چاہیں تو مشکل مری آساں کردیں

میں تو محشر میں یہی اُن سے کہونگا ممتازؔ
اپنی رحمت کے حوالے مرے عصیاں کردیں

جناب انجام کاشمیری از بنارس

آپ یہ دردِ محبت پہ اک احساں کردیں
میری بیچارگیِ عشق کا درماں کردیں

دونوں عالم کا سکوں کیوں نہ اُسے مل جائے
آپ جس سوختہ ساماں کو پریشاں کردیں

اپنی آنکھوں کا انھیں مرتبہ معلوم نہیں
جس جگہ چاہیں وہیں طور کا ساماں کردیں

شرطِ الفت ہے یہی موت کو ہم دیں آواز
اس سے پہلے کہ وہ تسکینِ دل و جاں کردیں

شاعری کا ابھی آغاز ہے لیکن انجامؔ
لطف فرمائیں جو استاد، غزلخواں کردیں

جناب نازش برناب گڈھی

فرصتِ سیرِ چمن ہم کو نہیں ہے نہ سہی
کیوں قفس ہی کو نہ ہم رنگِ گلستاں کردیں

اُف یہ ویران کدہ عشق، یہ تاریکیِ غم
ٹوٹ کر عرش سے تارے ہی چراغاں کردیں

اب بھی باقی ہے وہی جرأتِ ایمانِ خلیلؑ
آگ کو آج بھی چاہیں تو گلستاں کردیں

طورِ وادیِ ایمن کی کوئی قید نہیں ہے نازشؔ
اُن کو جب چاہیں جہاں چاہیں نمایاں کردیں

جناب خادم تراہوی از جبلپور

موج در موج عیاں دیدۂ گریاں کردیں
ہم مچل جائیں تو ہر قطرے کو طوفاں کردیں

آپ لیلائے دو عالم ہوں میں سودائے جمال
آئیے شانِ محبت کو نمایاں کردیں

نامناسب ہے یہ ہنگامۂ الفت میں جمود
پھر مرے خون کے قطروں کو وہ فغاں کر دیں
کاش وہ اپنی نگاہوں کی کبھی اسے خادم
میرے ہر تارِ رگِ جاں کو غزلخواں کر دیں

جناب ناظم از چکدرین

نورِ عرفاں سے وہ سینے کو فروزاں کر دیں
داغِ دل کو مرے خورشیدِ درخشاں کر دیں
میری مشتاق نگاہوں میں ہے تاریک جہاں
آئیں اور آ کے سرِ طور چراغاں کر دیں
منتظر طور پہ پھر چشمِ تماشائی ہے
کاش وہ برقِ فضاتاب کو عریاں کر دیں
ناظم اب حضرتِ سیماب کے شاگرد ہیں ہم
وہ اگر چاہیں تو پتھر کو غزلخواں کر دیں

جناب رفیق انصاری شاہدہ

سوزِ ہستی کو زمانہ پہ نمایاں کر دیں
ظلمتِ دہر میں اشکوں سے چراغاں کر دیں
آپ ہی نے مجھے آزارِ خلش بخشا ہے
آپ ہی اب مرے ہر درد کا درماں کر دیں
تو صلابت نہ کر دے کہیں قربِ ساحل
دل یہ کہتا ہے کہ ہر موج کو طوفاں کر دیں
تا بکے تنگیٔ صحرا کا جنوں کو شکوہ
کیوں نہ ہر ذرے کو پھیلا کے بیاباں کر دیں

جناب منظر کلیمی جام پوری

قیدیو آؤ قفس میں بھی چراغاں کر دیں
سرد آہوں کو یہاں شعلہ بداماں کر دیں
آج پھر طور پہ ہے دیکھنے والوں کا ہجوم
"آج وہ حسنِ حقیقت کو نمایاں کر دیں"
ان پہ موقوف ہے وہ پھول یا پھر دیں کانٹے
ہم پہ ہے فرض کہ ہم سامنے داماں کر دیں
لطف آتا ہے پریشانی، دل میں منظر
ہاں ذرا اور وہ زلفوں کو پریشاں کر دیں

جناب کلیم شمس آبادی از بمبئی

ایک مدت سے ہے اجڑی ہوئی دل کی بستی
آپ چاہیں تو اسے رشکِ گلستاں کر دیں
وہ تو کیا انکا تصور بھی نہ لاؤں دل میں
مجھ کو مجبور نہ میرے اگر ارماں کر دیں
ٹوٹ سکتی ہے یہ زنجیرِ غلامی کی ابھی
خونِ مسلم کو اگر آج ہم ارزاں کر دیں
اپنی آنکھوں سے پلا کر وہ کسی روز کلیم
زاہدِ خشک کو بھی کاش مسلماں کر دیں

جناب رفیق نشاط۔ سالبنی (بنگال)

اک نظر آپ جو اے مرشدِ دوراں کر دیں
مجھ گنہگار کو بھی صاحبِ عرفاں کر دیں
روئے روشن کو وہ گر اپنے نمایاں کر دیں
خلق کو کثرتِ انوار سے حیراں کر دیں
سجدۂ شوق مسلسل کا تقاضہ یہ ہے
غیر کے در کو بھی سنگِ درِ جاناں کر دیں
عشق کے سوز کو محفل میں چھپا کر تیری
دل کے داغوں کو چراغِ تہِ داماں کر دیں

جناب وحشت انصاری املنیری

جلوۂ حسنِ ازل وہ جو نمایاں کر دیں
ذرے ذرے میں عیاں طور کا ساماں کر دیں

آج ہر داغِ محبت کو فروزاں کر دیں
دلِ تاریک میں اس طرح چراغاں کر دیں
عشق کے درد کو پیوستِ رگِ جاں کر دیں
اس فسانہ کو مکمل بہ سرِ عنواں کر دیں
ساتھ آتے ہیں بہاروں کو وہ لیکر وحشت
آج وحشی نہ کہیں چاک گریباں کر دیں

جناب اسعد السدیدی از اپولہ

تیرہ بختی کا کبھی کاش وہ درماں کر دیں
شامِ ظلمت کو مری صبحِ درخشاں کر دیں
عہدِ ماضی کا اعادہ جو مسلماں کر دیں
ساری دنیا میں بپا شورش و ہیجاں کر دیں
فصلِ گل آ گئی کلیوں پہ نکھار آیا ہے
کیوں نہ وحشی تری پھر چاک گریباں کر دیں
دیکھ جنبش میں ہیں افلاک و زمیں اے اسعد
تیری آہیں نہ کہیں عرش کو لرزاں کر دیں

جناب ضیا انصاری

لذتِ عشق میں کچھ اور اضافہ ہو جائے
اپنی ہستی کو جو نذرِ غمِ جاناں کر دیں
میرے دیدہ و دل وادیٔ ایمن بن جائیں
کاش بے پردہ وہ اپنا رخِ تاباں کر دیں
تپشِ دل کا پسِ مرگ بھی باقی رہے لطف
گاہے گاہے جو وہ تربت پہ چراغاں کر دیں
نبضِ جذبات میں آ جائے حرارت جو ضیا
ساری دنیا کو ابھی شعلہ بداماں کر دیں

جناب عارف ابراہیم بانکوٹی

جلوۂ طور کے اسرار ہیں پنہاں دل میں
"آج پھر حسنِ حقیقت کو نمایاں کر دیں"
جان دے کر تری الفت میں مٹا کر ہستی
اپنے افسانے کا قائم کوئی عنواں کر دیں
خانۂ دل مرا مدت سے پڑا ہے ویراں
آپ اس گھر میں کبھی آ کے چراغاں کر دیں
دل جو دینا تھا دیا، جان ہی باقی ہے سو
تیرے صدقے، تری دارائی ترے قرباں کر دیں

جناب زخمی

سجدہ ریزی کی ضرورت حرم و دیر کو ہو
دل کو اس طرح تجلی گہِ جاناں کر دیں
اس میں پیدا ہی نہ ہو حسرت و ارماں کا خیال
خود ہی یوں ہم دلِ آباد کو ویراں کر دیں
زندگی پلتی رہے موت کی آغوش میں کیوں
شدتِ درد ہی سے درد کا درماں کر دیں
فصلِ گل آئے تو ہم جوشِ جنوں میں زخمی
جیب و دامن کو بھی ہم شکلِ گریباں کر دیں

جناب خلش دردی بڑودوی

دل کے داغوں کو جو دیوانے نمایاں کر دیں
گوشہ گوشہ کو بیاباں کے گلستاں کر دیں
دفعتاً وہ رخِ انور سے الٹ دیں جو نقاب
ذرہ ذرہ کو ابھی مہرِ درخشاں کر دیں
جنھیں ساحل نہ نوازے جنھیں موجیں چھوڑیں
رخ وہ کشتی کا نہ کیوں جانبِ طوفاں کر دیں

جناب آزاد دھمی

گلشنِ ہند کو صد رشکِ بہاراں کر دیں
دفعِ تفریق اگر گبر و مسلماں کر دیں

فصلِ گل آئی ہے پھر چاک گریباں کردیں
دھجیاں اُن کی فضاؤں میں پریشاں کردیں

کاش آجائیں وہ جانِ گل و غنچہ بن کر
اور دل کو مرے فردوس بداماں کردیں

جناب قاضی ادونی

کافرِ عشق ہوں وہ مجھ کو مسلماں کردیں
"آج پھر حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں"

آہِ سوزاں سے اگر کام جگر سوختہ لیں
آتشیں پھونک دیں گلشن کو بیاباں کردیں

ہے یہ اچھا کہ نہ منت کشِ عیسیٰ ہوں ہم
درد ہی سے وہ مرے درد کا درماں کردیں

جناب ساجن انصاری بھیمڑوی

آبلہ پائی کا اعجاز نمایاں کردیں
یعنی ہر خار کو صد رشکِ گلستاں کردیں

سامنے آ مرے بجلی سی نقاب اُٹھ جو کر
تری جلوہ گری نظر دل کو نہ حیراں کردیں

اُن کو منظور ستانا ہی اگر ہے ساجن
نشترِ عشق کو پیوستِ رگِ جاں کردیں

جناب محمود ابولوی

ہم اگر داغِ محبت کو نمایاں کردیں
ذرے ذرے کو جوابِ مہِ تاباں کردیں

کبھی تڑپیں، کبھی روئیں، کبھی فریاد کریں
حالِ دل منکشف اُن پر کسی عنواں کردیں

دیر بس اُن کی نوازش کی ہے ورنہ فرہاد
وہ اگر چاہیں تو محمود کو سلطاں کردیں

جناب غافل ازبتول

داغ ہم دل کے اگر اپنے نمایاں کردیں
جگمگاتے ہوئے تاروں کو بھی حیراں کردیں

حسنِ محفل ابھی ہو جائے دوبالا گر ہم
دل کے داغوں کو سرِ بزم چراغاں کردیں

عالمِ جوشِ جنوں حد سے فزوں ہے غافل
دل میں آتا ہے گلستاں کو بیاباں کردیں

جناب تمنا ازگوالیار

چارہ ساز اُن کو سمجھتی ہے تو دنیا سمجھے
جب میں جانوں کہ مرے درد کا درماں کردیں

آجکل جوش پہ ہے مشقِ تصور اپنی
ہم قفس کو ابھی چاہیں تو گلستاں کردیں

نزع کا وقت ہے آجائیں وہ پرسش کو تمنا
اپنی قسمت پہ مجھے آج تو نازاں کردیں

جناب کامی ویلوری

دل تمناؤں کا مرکز ہے امیدوں کا چمن
اسے برباد کریں آپ کہ ویراں کردیں

لاکھ ممکن نہیں سوزِ تپشِ دل کا علاج
وہ اگر چاہیں تو کامی سرِ عنواں کردیں

جناب قسیم ترمذی کیتھلوی

بادِ صبا اپنی یہ کہدیں کہ نہ آئے دل میں
آپ اتنا ہی مرے حال پہ احساں کردیں

ہو محبت کی نظر سے اگر زبانِ غم سے
سوزشِ دل کا ادا کس عنواں کردیں

جناب محی دکنی

گلشنِ دہر میں ہر سمت چراغاں کردیں
"آج پھر حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں"

سامنے اپنے جو آجائے کبھی آئینہ
ہم وہ آئینہ ہیں آئینے کو حیراں کردیں

جناب خاور انصار مالیگاؤں

چند اجزائے پریشاں ہی تو ہے قسمت مری
آپ جب وقت مجھے چاہیں پریشاں کردیں

حالِ دل کہتے ہوئے آن کے زباں رکتی ہے
کیا تماشا ہوں کہ نمایاں غمِ پنہاں کردیں؟

جناب کیف کوثی

یوں تو ہے باعثِ حیرانیٔ دل اُن کا خیال
اپنے جلووں سے مجھے اور وہ حیراں کردیں

شبِ غم چاند ستارے بھی نہیں ہیں روشن
آنسوؤں ہی سے نہ کیوں جشنِ چراغاں کردیں

مندرجہ ذیل غزلیں مسودات میں دبی رہ گئی تھیں اس لئے خلاف ترتیب شائع کی جارہی ہیں

حضرت مولانا الم مظفرنگری

زخم کو کرکے گراں درد کو ارزاں کردیں
دھری زندگیٔ عشق کا ساماں کردیں

گل تو ہیں مستِ مئے رنگِ بہارِ گلشن
خار ہی شرحِ سرانجامِ گلستاں کردیں

قیدیوں پر ہیں گراں بادِ چمن کے جھونکے
بند ہر سمت سو سب روزنِ زنداں کردیں

نہیں آدابِ جنوں سے یہ بہاریں واقف
ورنہ گل باغ میں یوں چاک گریباں کردیں؟

سوزِ الفت کے جو نباض ہوں اہلِ محفل
خاکِ پروانہ سے دنیا میں چراغاں کردیں

کاش بخشیں وہ مجھے لذتِ آزارِ خلش
میرے ہر زخمِ محبت کو نمکداں کردیں

جی میں ہے تذکرۂ زلفِ رسا کرکے الم
آج ہم دفترِ امکاں کو پریشاں کردیں

جناب نسیم سیتاپوری

اور تھوڑا سا غمِ عشق فراواں کردیں
ایسی صورت سے علاجِ دلِ سوزاں کردیں

[illegible] ہے کرم
یا وہ دشوارئ محبت کو وہ آساں کردیں

[illegible] نسیم
وہ ذرا حسنِ حقیقت کو نمایاں کردیں

جناب پیارے لال ایم۔ اے

[illegible] ویران وطن ہے اپنا
آؤ [illegible] اسے رشکِ گلستاں کردیں

[illegible]
تیرے [illegible] کو پریشاں کردیں

اصلاحِ سخن

:- جناب ابو محمد زکریا صہبا گیاوی کی غزل پر حضرت سرکار بری مینائی کی اصلاح۔

(اے موت تجھ کو زیست)
آبِ حیاتِ عشق سے پئے جا رہا ہوں میں ۱ ~~شرمندہ موت کو~~ بھی کئے جا رہا ہوں میں

(ارزاں ہے یا گراں ہے یہ سودا)
~~ارزاں ہے سودا یا کہ گراں یہ~~ خبر نہیں ۲ دل دے رہا ہوں درد لئے جا رہا ہوں میں

(کرے کون)
تریاق ہے کہ زہر ~~نہیں اسکا~~ امتیاز ۳ جو مجھ کو مل رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں

(سودا تھا ایک وہ بھی کہ دامن)
~~وہ بھی تھا اک جنوں کہ گریباں~~ ہو چاک چاک ۴ یہ بھی ہے اک جنوں کہ سئے جا رہا ہوں میں

(بھی کیا ہے)
دنیا ~~ہے کتنی~~ عالمِ اضداد دیکھنا ۵ جینا ہے ناپسند جئے جا رہا ہوں میں

(ڈرتا ہوں وسعتِ دلِ عالم نہ تنگ ہو)
~~ڈر ہے مجھے جہاں نہ ہو جائے ناپسند~~ ۶ اتنا بلند ذوق کئے جا رہا ہوں میں

(تو دیکھئے) (جد و جہد)
عریاں مآلِ زیست ہے ہمت کی ~~داد ہو~~ ۷ اپنی سی ~~کشمکش~~ تو کئے جا رہا ہوں میں

ہر ذرہ سر بلند ہے آغوشِ باد میں ۸ پستی سے درسِ اوج لئے جا رہا ہوں میں

ہیں جان دے کے بھی یہ پشیمانیاں ~~مری~~ مجھے ۹ جیسے کسی کا خون کئے جا رہا ہوں میں

کعبہ کدھر ہے دیر کدھر کچھ خبر نہیں ۱۰
صہبا شرابِ شوق پئے جا رہا ہوں میں

توضیح:-

(۱) مصرع ثانی میں موت کو شرمندہ کرنے کو بھی ایک مفہوم تو پیدا ہو رہا تھا لیکن اصلاح نے مصرع کے مفہوم ہی کو کچھ اور کر دیا ہے۔ "موت کو زیست کرنا" کیا خوب اصلاح ہے۔

(۲) اصل مصرع میں "سودا" کا الف دب رہا تھا۔ اصلاح سے یہ عیب دور ہو گیا اور مصرع بھی چست ہو گیا۔

(۳) "نہیں اسکا" میں وہ بے ساختگی نہ تھی جو "کرے کون" میں ہے۔

(۴) دونوں مصرعوں میں "جنوں" محلِ نظر تھا اس لئے فاضل استاد نے ایک مصرع میں سے لفظِ جنوں نکال دیا اور اس خوبی کے ساتھ کہ مفہوم میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی۔

(۵) "کتنی عالمِ اضداد" صحیح نہ تھا اس لئے "دنیا بھی کیا ہے عالمِ اضداد" بنا دیا گیا مگر ایک ہی مصرع میں "دنیا" اور "عالم" کا اتنے قریب واقع ہونا مناسب نہیں معلوم ہوتا مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا ؎ "اک یہ بھی رنگِ عالمِ اضداد دیکھنا"
یا ؎ "ہے یہ بھی رنگِ عالمِ اضداد دیکھنا"

(۶) صہبا صاحب کا مصرع اولیٰ پست اور اس کا مفہوم غیر واضح تھا ـــ اصلاح کر مصرع میں بلندی اور مفہوم میں مطابقت پیدا ہو گئی۔

(۷) شعر کا مفہوم نہ قبلِ اصلاح واضح تھا اور نہ بعدِ اصلاح واضح ہو سکا! البتہ اصلاح کر "ہمت کی داد ہو" اور "کشمکش" کا نقص دور ہو گیا میری حقیر رائے میں صہبا صاحب کا مفہوم اس طرح واضح ہو سکتا تھا ؎

یہ جانتے ہوئے کہ فنا ہے مآلِ زیست ۔ اک جد و جہدِ زیست کئے جا رہا ہوں میں

(۹) "مری" کی جگہ "مجھے" ہی کی ضرورت تھی۔

اعجاز صدیقی

سالِ اجرا محرم ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء —— مدتِ اشاعت ۱۴ سال
زیرِ سرپرستی —— اعلیٰحضرت راؤ منظور محمد والئی پاجود (کاٹھیاواڑ)

منظور شدہ
محکمۂ تعلیم صوبہ ممالک متوسط و برار
محکمۂ تعلیم ریاست میسور

تعارف [illegible]

منظور شدہ
حکومتِ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ
محکمۂ تعلیم ریاست کشمیر

جلد ۱۴	ماہنامہ "شاعر" —— آگرہ —— دسمبر ۱۹۴۳ء	نمبر ۱۲

چندہ سالانہ عام للعہ خواص سے ۶ ہمدردوں سے ۱۲ انیسوں سے ۱۵ معاونین سے ۲۴ مربیوں سے ۵۰ محسنین سے ۶۰ سرپرستوں سے ۱۲۵ ماہانہ فی پرچہ ۶

محسنین مربی معاونین و انیسان و ہمدردان شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسن ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۶۰ سالانہ
(۲) محسن ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۶۰ سالانہ
(۳) محسنہ ادب ہر ہائینس علیا حضرت کیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ سالانہ
(۴) محسن ادب وزیرزادہ شجاعت خانصاحب مہر جوناگڈھی ۶۰ سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۵) مربی ادب جناب محترم میاں نعمت اللہ خانصاحب خلف میاں کرنل حشمت اللہ خانصاحب مرحوم کے. ٹی ہوم منسٹر ریاست گوالیار ۵۰ سالانہ
(۶) مربی ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز و اسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹا نگر) ۵۰ سالانہ

معاونین ادب

(۷) معاون ادب مسٹر اے. بی نفیس صابر بی. اے اکبر آبادی ۲۴ سالانہ
(۸) معاون ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسی متوطن رڑکی (بمبئی) ۲۴ سالانہ
(۹) معاونہ ادب محترمہ محمد تصدق ایم. اے. بی. ٹی. مدیرہ رسالہ "ادیب" دہلی ۲۴ سالانہ
(۱۰) معاون ادب جناب صوبہ دار افضل علی صاحب گوالیار ۲۴ سالانہ
(۱۱) معاون ادب جناب سید یوسف پیر صاحب نیر شمسی حیدرآباد ۱۲ سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۲) ہمدرد ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندھری ۱۲ سالانہ
(۱۳) ہمدرد ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ سالانہ
(۱۴) ہمدرد ادب جناب ابو عبدالعظیم خانصاحب رونق دکنی جمشید پور ۱۲ سالانہ
(۱۵) ہمدرد ادب جناب اکمل کھوکھر صاحب راز جوناگڈھی ۱۲ سالانہ
(۱۶) ہمدرد ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲ سالانہ
(۱۷) ہمدرد ادب جناب نوابزادہ مشکور حسین خانصاحب قیس آف بلند شہر ۱۲ سالانہ
(۱۸) ہمدرد ادب جناب سید غلام محمد شاہ صاحب رئیس اعظم بروہ چنیوٹ ضلع جھنگ ۱۲ سالانہ
(۱۹) ہمدرد ادب محترمہ بلقیس جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۱۲ سالانہ
(۲۰) ہمدرد ادب جناب محبوب خانصاحب کیل صدر دربار سخن پوڑہ (مشرقی خاندیش) ۱۲ سالانہ

خاصان ادب

(۲۱) جناب صاحبزادہ شفیق الاحسان خانصاحب شفق ٹونکی ۶ سالانہ
(۲۲) جناب عبدالحمید صاحب آخر صدیقی پھلواری بی. اے ۶ سالانہ
(۲۳) جناب لالہ گنگا رام صاحب آدرش ہندی ۶ سالانہ
(۲۴) جناب سید مظفر حسین صاحب قریشی کمازی آباد ۶ سالانہ
(۲۵) جناب محمد عبداللہ خانصاحب بزم امروہوی ۶ سالانہ
(۲۶) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیر کوٹی ۶ سالانہ
(۲۷) جناب ماسٹر حسن خانصاحب آذر بمبئی ۶ سالانہ
(۲۸) جناب حضرت الله صاحب آرشد صدیقی امروہوی ۶ سالانہ
(۲۹) جناب [illegible] صاحب [illegible] ۶ سالانہ
(۳۰) [illegible] ۶ سالانہ

(۳۲) جناب سبحان خانصاحب فاضل جیول ۶ سالانہ
(۳۳) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶ سالانہ
(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹا ہبہ ۶ سالانہ
(۳۵) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ۶ سالانہ
(۳۶) جناب حکیم مولوی عبدالرحمٰن صاحب ثنا کاندھلوی ۶ سالانہ
(۳۷) علامہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ سالانہ
(۳۸) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر منٹوردی ۶ سالانہ
(۳۹) جناب کنور فاروق علیخاں صاحب عارف رئیس بیٹہ ۶ سالانہ
(۴۰) جناب مقبول احمد صاحب محو اعظم گڈھی ۶ سالانہ
(۴۱) جناب مولوی مظہرالدین صاحب مظہر باداسی گوروا سپور ۶ سالانہ
(۴۲) جناب ڈاکٹر تارا پرشاد صاحب استھانہ زیب بریلوی ۶ سالانہ
(۴۳) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ سالانہ
(۴۴) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب بردوانی اسٹیٹ ۶ سالانہ
(۴۵) جناب من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی. پی) ۶ سالانہ
(۴۶) جناب محمد حسین صاحب خادم شملوی دہلی ۶ سالانہ
(۴۷) جناب چودہری حلیم یار صاحب فتح پور ۶ سالانہ
(۴۸) جناب سید شاہ عنایت مولیٰ صاحب تاباں القادری مدنا پور (بنگال) ۶ سالانہ
(۴۹) جناب جمعدار سی. پی مجاہد صاحب بمبئی ۶ سالانہ
(۵۰) جناب شیخ عبدالرحمان صاحب شتاب دہلوی ملوا اٹری ۶ سالانہ
(۵۱) جناب ملک قربان حسین صاحب فہمید جہلی بمبئی ۶ سالانہ
(۵۲) جناب عبدالرؤف صاحب فوق سکریٹری اقبال لائبریری نوار گنج (گیا) ۶ سالانہ
(۵۳) جناب دکھو رندر داؤ صاحب مجذوب عالم پوری ۶ سالانہ
(۵۴) جناب پنڈت بے ناتھ صاحب کول خادم ایم ایس بسی بودھی ۶ سالانہ
(۵۵) جناب محمد اکرام اللہ صاحب تہا قریشی ایڈووکیٹ ۶ سالانہ
(۵۶) جناب میاں [illegible] خانصاحب [illegible] ضلع گوردا سپور ۶ سالانہ
(۵۷) محترمہ بیگم [illegible] ۶ سالانہ
(۵۸) محترمہ [illegible] بیگم صاحبہ [illegible] ۶ سالانہ

شعرِ انقلاب

بھوکا ہندوستان

آج زباں پر ہے دُنیا کی " بھوکا ہندوستان" مرا
بات یہ ہے ایمان کی، ہندوستان مرا اک "دولت" ہے
بھوکا ہندوستان کو کہنا، آگاہی کی شان نہیں
قطب منارہ - جامع دہلی - اور ہو باقی تاج جہاں
امرتسر کا گوردوارہ ہو، بندرابن کے مندر ہوں
ابتک ہوں تاریخ کی رونق ایلورا کے غار جہاں
شاہی قلعے، دہلی، لاہور، آگرہ میں باقی ہوں جہاں
جس خطے میں دودھ کے دریا، شہد کی نہریں جاری ہوں
سینما ہالوں میں جسکے اک بھیڑ ہمیشہ رہتی ہو
علم کی اور صنعت کی دولت سے گھر ہوں معمور جہاں
کھیتوں سے سونے چاندی کی پیداوار ہو عام جہاں

بھوک کے قصے سُنتے سُنتے، کانپ گیا ایمان مرا
بھوکا اس کو کہنا ایک توہین ہے اور اک تہمت ہے
بھوک ہی یہ روحانیت کی، بھوکا ہندوستان نہیں
ماضی کی عظمت کا گوشے گوشے میں ہو راج جہاں
جہاں مساجد اور شوالے اندازے سے بڑھ کر ہوں
اب بھی دولت باغ جہاں ہوں اور ہوں شالامار جہاں
جمنا - گنگا - راوی - جہلم کیف آگیں ساقی ہوں جہاں
عشق کے ہوں مواج سمندر، حسن کی لہریں جاری ہوں
سیر کی اور تفریح کی جس میں روحِ رنگیں بہتی ہو
شعر اور گیت کے رس ساگر سے پھیل رہا ہو نور جہاں
غلے اور میوے سے بھرے ہوں کوٹھے اور گودام جہاں

کیا اُس مُلک کو بھوکا کہنے والے تنگ نگاہ نہیں؟
کیا وہ اپنی تنگ نگاہی سے ابتک آگاہ نہیں؟

ہند کو بھوکا کہنے والے خود افلاس کے مارے ہیں
ان کو اپنی بھوک کے اصلی راز کی خود پہچان نہیں
بھول گئے ہیں یہ مذہب کو دل میں خدا کی یاد نہیں
ان پہ غلامی کی اک لعنت، صبح و شام برستی ہے
دان اور پُن خیرات اور صدقہ دینے کا احساس نہیں
جو اپنے رزّاق کو بھولے، رزق اُسے دے کون یہاں
میلے ٹھیلے، کھیل تماشے اب بھی قائم ہوتے ہیں
بھوک ہی ہے اک آخری چارہ، بیکاروں بدکاروں کا
بھوک ہی کیا اب موت بھی ان پر اپنا رنگ جمائے گی

روحانی افلاس نے پایا، اپنے پاؤں پسارے ہیں
بھوکے ہیں خود ہندوستانی بھوکا ہندوستان نہیں
قرآں، وید، گرنتھ سے یعنی ان کے گھر آباد نہیں
یہ محکوم ہیں۔ امن و سکوں کو ان کی روح ترستی ہے
دولت تو ہے اب بھی۔ لیکن ایماں اِن کے پاس نہیں
جسکے پاس نہیں کھانے کو وہ بھی ہے فرعون یہاں
شاہد اور شراب سے ہو کر مست ہزاروں سوتے ہیں
بھوکا رہنا ہی بہتر ہے، غفلت کے بیماروں کا
یہ تو مٹی کھا نہیں سکتے۔ مٹی ان کو کھائے گی

چہرے ہیں مرجھائے ہوئے اور ہاتھ میں دل کی قاشیں ہیں
اُٹھتے بیٹھتے مُردے ہیں یہ، چلتی پھرتی لاشیں ہیں!

سیماب اکبرآبادی

جرعات

سالِ رواں کی دھوپ سمٹنے والی ہے اور ۱۹۴۴ء اُفقِ عالم سے جھانک رہا ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ آنے والا سال ہمارے لئے مسکراہٹیں لائے گا یا آنسو ــــــ بنگال کے فاقہ زدوں کی خونیں داستان۔ سیلاب کی تباہ کاریاں۔ اجناس کی گرانی۔ بیماریوں کے حملے۔ **اٹلی کا انجام**، **روس** کی بڑھتی ہوئی ہمتیں۔ برطانیہ کا عزم بلند۔ جرمنی کی مشکلات اور جاپان کی خاموشیاں سب ہمارے سامنے ہیں۔ ستاروں کی چالیں اور فضائے عالم میں پنپنے والے منصوبے۔ بیش از بیش خطرات کا پیش خیمہ ہیں۔ خدا اپنا فضل و کرم کرے۔

"شاعر" نے اس سال اُردو زبان و ادب کی بُری یا بھلی جیسی بھی خدمت کی وہ نزاکتِ وقت کو دیکھتے ہوئے بسا غنیمت ہے۔ حالات کی ناسازگاری کے باوجود وہ برابر منزلِ ادب میں راہ پیما ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی رہے گا۔ ہر چند **کاغذ** کے سلسلے میں اُسے روح فرسا مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ۱۹۴۳ء میں اس کی اشاعت میں تقریباً چھ سَو کا اضافہ ہوا ہے اور آئندہ اس سے زیادہ کی امید ہے۔ امسال "شاعر" سے محبت کرنے والوں نے "شاعر" کو **جدید خریدار** دے کر جتنا نوازا ہے اُس کی مثال پچھلے سالوں میں نہیں ملتی۔ اب نیا سال آرہا ہے اور ادارہ کو تمام خریدارانِ "شاعر" سے توقع امید ہے کہ وہ ایک ایک دو دو خریدار دیکر اور مکتبۂ قصر الادب سے کتابیں منگا کر اُسے تقویت پہنچائینگے۔ نئے خریداروں کے **چندے** یا **وی۔ پی** کی فرمائشیں ۲۰ دسمبر تک بھجوا دی جائیں تاکہ جنوری کا "شاعر" ضرورت کے مطابق چھپوایا جاسکے۔ امسال "شاعر" کی مانگ اتنی زیادہ رہی کہ پچھلی اشاعتوں کی ایک کاپی بھی دفتر میں نہیں ہے۔

ایک خصوصی گزارش اُن حضرات سے ہے جن کا زرِ سالانہ دسمبر ۱۹۴۳ء (اس تازہ اشاعت کے ساتھ) ختم ہو رہا ہے۔ ایسے تمام حضرات اپنا زرِ سالانہ منی آرڈر سے روانہ فرمادیں اور اگر یہاں سے وی۔ پی جائے تو اُسے وصول فرمالیں۔ اگر نئے سال سے خریداری منظور نہ ہو تو ازراہِ کرم ایک کارڈ کے ذریعہ اطلاع دیدیں تاکہ "شاعر" نقصان سے بچنے۔ امید کہ اس کا بطور خاص خیال رکھا جائے گا۔ **نومبر کی پچھلی اشاعت** بہت پسند کی۔ حضرت علامہ سیماب کا مضمون "ادب اور انقلاب" ہندوستان کے نام اہلِ عقول

بلکہ محتاط ترقی پسند ادبا اور شعرا، میں بھی زیادہ سے زیادہ پسند کیا گیا۔ اسی سلسلے میں ملک کے مشہور فسانہ نگار حضرت قیسی رامپوری کا ایک مضمون زیرِ نظر اشاعت میں شائع ہو رہا ہے اور آئندہ بھی اس موضوع پر "شاعر" میں دوسرے مشاہیر کے مضامین کی اشاعت متوقع ہے۔ اس مرتبہ بعض مضامین کی طوالت کی وجہ سے **ڈائری** اور **مکتوبات** کا سلسلہ روک لیا گیا۔ ناظرین اس کمی کو محسوس تو ضرور کرینگے لیکن مجبوریوں کو کیا کیا جائے۔

جنوری ۱۹۴۴ء کا "شاعر" اپنی ترتیب، حسنِ کتابت و طباعت اور مضامین کے اعتبار سے بہت وزنی اور اہم ہوگا۔ ملک کے اچھے اچھے لکھنے والے جنوری کے "شاعر" میں نظر آئینگے۔ علمی و ادبی مضامین میں (۱) اردو شاعری پر ایک ترقی نظر (۲) ہندی اور مسلمان (۳) انگریزی کا ایک بدقسمت شاعر۔ بائرن (۴) اردو کے چند جواں مرگ شاعر اور افسانوں میں رشدی بھوپالی۔ خدیجہ مستور۔ مظہر رضوی۔ اختر ملیح آبادی وغیرہ کے افسانے ذوقِ مطالعہ کو رقص کرنے پر مجبور کر دینگے۔

جن مخصوص احباب کی طرف اس سال کا چندہ باقی ہے وہ فوراً روانہ فرمادیں تاکہ دفتر کی طرف سے کوئی تقاضہ کا خط انھیں نہ پہونچے نیز نئے سال سے رسالہ کی روانگی بھی بند نہ ہو۔

"شاعر" نوازیاں

(۱) جناب نشاط القادری مدناپور (بنگال)	۱	خریدار	(خاص)
(۲) جناب ابن بشیر احمد صاحب فاروقی کوٹہ	۲	"	(عام)
(۳) جناب پیرزادہ قاضی معین الدین احمد صاحب آرزو احمد پور شرقیہ	۳	"	"
(۴) ابو الفکار جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی	۱	"	"
(۵) جناب لکشمی نرائن صاحب فارغ ادے پور	۲	"	"
(۶) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب قاطر بروانی	۱	"	"
(۷) جناب قمی دکنی مدناپور	۱	"	"
(۸) جناب سید امیر حیدر صاحب نجت اکبرآبادی کانپور	۱	"	"
(۹) جناب کلیم کریمی ڈھولپوری (اجین)	۱	"	"

امدادی فنڈ

اعجازہ ... عمر

تحقیق و تصحیح

بعض الفاظ کے اعراب

(قسط دوم)

الفاظ کے غلط اعراب کا سلسلہ توقع سے زیادہ پسند کیا گیا اور ہر طرف سے زور دیا جا رہا ہے کہ اسے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا جائے۔ مجھے یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ شاہیرادبا اور شعرا بھی اس سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ اشاعت میں "آتش" کے غلط اعراب شائع ہوجانے پر متعدد حضرات نے ٹوکا۔

"آتَش" بالفتح صحیح ہے اور بالکسر غلط۔ فصحائے اُردو اسے (زبر) کے ساتھ ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔ زیر کے ساتھ (آتِش) صحیح نہیں۔ ہر چند "فرہنگ آصفیہ" میں مولانا روم علیہ الرحمۃ کا ایک شعر ایسا بھی موجود ہے جس میں "آتِش" بالکسر قافیہ میں آیا ہے لیکن ایک مثال قابلِ قبول و سند نہیں ہوسکتی

غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح
اسلُوب	اُسلُوب	الف۔ بالضم
امراض		بالکسر۔ بمعنی بیمار کرنا
اَمراض		بالفتح۔ مرض کی جمع
اَمزَجہ	اَمزِجہ	مزاج کی جمع۔ ز۔ بالکسر
اَمساک	اِمساک	م۔ بالکسر
اِملاک		بالکسر۔ مالک کردینا
اَملاک		الف۔ بالفتح مِلک کی جمع
اِعراف	اَعراف	الف۔ بالفتح
امَن	اَمْن	م۔ مجزوم ہے۔ بروزن زَرد
اَمُور	اُمُور	الف۔ بالضم
اُمہاتُ	اُمَّہَات	م۔ بالفتح
اناس	اُناس	الف۔ بالضم
اِنَتباہ	اِنتِباہ	ت۔ بالکسر
اِنتِجاب	اِنتِخاب	ت۔ بالفتح
انتَداب	اِنتِداب	ت۔ بالکسر
اِنتَشار	اِنتِشار	" "
انتَظار	اِنتِظار	" "
انتَقاد	اِنتِقاد	" "
انتَقام	اِنتِقام	" "
انتَہا	اِنتِہا	" "
اندَمال	اِندِمال	" "

غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح
اِنعَام		نعمت دینا
اَنعَام		نعم کی جمع
اِنفَاس		عمدہ اور نفیس ہونا
اَنفَاس		نفس کی جمع
اِنقَضاء	اِنقِضا	ق۔ بالکسر
اِنقَطاع	اِنقِطاع	" "
اَنگریز	اِنگریز	الف بالکسر
اُولیٰ۔ اُولا		پہلی مونث چیز
اَولا۔ اَولیٰ		بہتر
اَہانت	اِہانت	الف بالکسر
اِہتَزاز	اِہتِزاز	ت۔ "
اِہتَمام	اِہتِمام	" "
اِہلیت	اَہلیّت	الف۔ بالفتح۔ ی مشدد
		اس لفظ کے تلفظ میں لغات سے بھی غلطی ہوجاتی ہے۔ کوئی بالکسر بولتا ہے تو کوئی بغیر تشدید۔
اِہلیہ	اَہلیہ	الف۔ بالفتح
اِہرمن	اَہرمن	" "
اِیزدی	ایزَدی	ز۔ بالفتح

اعجاز صدیقی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

خطرے میں جو لبنان کی آزادی ہے
یہ ایک نیا حیلۂ بربادی ہے
مصر و عرب و عراق میں ٹرکی میں
اس چھیڑ نے اک آگ سی بھڑکا دی ہے

گہرائیاں جنگ کی چھلک اٹھتی ہیں
سوئی ہوئی ظلمتیں چمک اٹھی ہیں
چنگاریاں جو دبی ہوئی تھیں اب تک
اب تیز ہواؤں سے بھڑک اٹھی ہیں

اندیشوں کی ہر طرف گھٹا چھائی ہے
اطرافِ جہاں میں سنسنی پھیلی ہے
ہے عالمِ نزع سا فضا پر طاری
یہ جنگ کی شاید آخری ہچکی ہے

بنگال میں بھوک کا وہی عالم ہے
ارزانیٔ غارتِ بنی آدم ہے
جس ملک میں انقلاب کی آمد ہو
اُس ملک میں ہو جتنی قیامت کم ہے

پُرساں نہیں کوئی بھی گراں جانوں کا
ہے زور یہاں غرض کے دیوانوں کا
"انسانیت" آج ان کا منہ تکتی ہے
بنگال میں اب قحط ہے انسانوں کا

کس درجہ غلط کار ہیں اہلِ بنگال
سرمائے میں سرشار ہیں اہلِ بنگال
عصمت ہی نہیں عورتیں ہوتی ہیں فروخت
اور ان کے خریدار ہیں اہلِ بنگال

ہر ملک بھکاری ہے اب اسکے در کا
اخلاق جہانگیر ہے میرے گھر کا
بھوکا نہ رہے کیوں یہ مرا ہندوستاں؟
بھرتا ہے اب اس سے پیٹ دنیا بھر کا

ہو کر ناشاد و شاد رہ جائے گی
دنیا یونہی نامراد رہ جائے گی
یہ دور رہیگا نہ زمانے کا مگر
اس دور کی دل میں یاد رہ جائیگی

کیا جانئے مستقبلِ بیداد ہو کیا
ماحولِ ستم سے ستم ایجاد ہوگیا
افسانۂ سالِ حال تو ختم ہوا
اب دیکھئے سالِ نو کی روداد ہو کیا؟

محکوم نہ ہوں دستِ غلامی سے تباہ
عمرِ بیچارگی ہو یارب کوتاہ
رخصت اے شامِ حال ای شامِ ملال
لبیک صباحِ سالِ نو، بسم اللہ!

سیماب

شخصیات

شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی

مدت ہوئی کسی رسالہ میں علامہ تاجور کی یہ چند سطور نظر سے گذری تھیں:۔

"چونکہ میرا مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہ ہوسکا اس لئے جدید دور کے نام نہاد نقادوں کے دائرۂ تعارف سے آجتک خارج ہوں"۔

علامہ تاجور کا یہ احساس اپنی جگہ بجا، لیکن اس دور کے نقد و تبصرہ کی عجوبہ کاریوں پر اگر موصوف غور فرماتے تو یہ احساس بھی پیدا نہ ہوتا۔ "اردو تنقید میں جانبدارانہ عنصر اس بُری طرح شامل ہوگیا ہے کہ "گدھے کو گھوڑا" بنا دینا کچھ مشکل ہی نہیں۔ جسے چاہا اس دور کا بہترین غزل گو بنا دیا گیا اور جسے چاہا اُسے اقبال۔ فانی۔ سیماب۔ حسرت۔ جوش وغیرہ سے بلند و بالا ثابت کر دیا گیا۔ نہ قلم پر کچھ پابندیاں ہیں اور نہ زبان پر۔ رہا "معیار" تو "پسند اپنی اپنی" والا مضمون ہے۔ بہر حال اردو تنقید کی بیلغلانہ شوخیاں نقات کے لئے موجب ملال نہیں ہونی چاہئیں۔ موجودہ دور کا دستورِ نقد کسی طرح باکمال شخصیتوں کو اپنی ژولیدہ نگاری کا شکار نہیں بنا سکتا۔ باطل کی ملمع کاریاں ایک دن ضرور ماند ہو کر رہینگی، اور علامہ تاجور جیسی فاضلِ اجل ہستیوں کے کمالات کا اعتراف کیا جائے گا۔

علامہ تاجور کا پورا نام احسان اللہ خاں ہے۔ ۱۸۹۴ء میں نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ نسباً درانی افغان ہیں۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے برادرِ معظم سے حاصل کرنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی۔ ۹ سال تک علوم مشرقیہ کی تعلیم حاصل کی اور درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ ۱۹۱۴ء میں لاہور آئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۵ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۱۶ء میں منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ تاجور کی زیرِ نگرانی لدھیانہ سے "آفتاب اُردو" شائع ہوا۔ لاہور آنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں "مخزن" کی ادارت کی اور ۱۹۲۱ء میں دیال سنگھ کالج میں فارسی اور اُردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ کالج کے اوقات کے بعد تمام وقت اُردو علم و ادب کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔ اسی سال رسالہ "ہمایوں" لاہور میں مدیرِ معاون کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں اپنا ذاتی رسالہ "ادبی دنیا" نکالا جو انتہائی کامیابی کے ساتھ نکلتا رہا اور ادبی دنیا میں ایک خاص معیار کا حامل ہوا۔ اس سے قبل ۱۹۲۶ء میں "اردو مرکز" کے نام سے ایک ادارہ تصنیف و تالیف کی بنیاد ڈالی۔ جو اس وقت تک قائم ہے۔ اور جس کے ذریعہ علامہ تاجور اُردو کی بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایک بچوں کا رسالہ بھی اسی ادارہ سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔ "ادبی دنیا" کچھ مدت کے بعد علامہ تاجور کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ہرچند موصوف کو اس سلسلے میں شدید نقصان ہوا اس کے باوجود اپنے ذوقِ خدمت سے مجبور ہو کر ۱۹۳۴ء میں رسالہ "شاہکار" جاری کیا جو اِس وقت تک نکل رہا ہے۔ لیکن بعض مضامین کی اشاعت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "شاہکار" سے بھی علامہ تاجور کے اثرات کم ہوتے جا رہے ہیں۔

علامہ تاجور کی پوری زندگی خالص علمی و ادبی رہی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پنجاب کی ادبی فضاؤں میں اُن کے ٹھوس اور تعمیری کاموں کے کارگر اثرات پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف وہ بہترین فن داں ہیں تو دوسری طرف نکتہ رس استاد۔ عالم بھی ہیں اور ادیب بھی۔ نثر و نظم پر یکساں قدرت حاصل ہے متعدد کتابیں تصنیف فرما چکے ہیں۔ "انجمن اربابِ علم پنجاب" کے ذریعہ اُردو شاعری کی اصلاح و ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کی اور ایک اصلاحی پروگرام پیش کیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پنجاب کے بعض شعرا کی بے راہ روی میں علامہ تاجور کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترقی پسند نوجوان شعرا میں علامہ تاجور کے تلامذہ کی تعداد کافی ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ موصوف کے ایمائے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے درس و تدریس کا مقصد ہرگز علم و فن سے روگردانی نہیں بلکہ وہ تو اِن حدود میں رہ کر ترقی پسندی کی تلقین فرماتے ہیں۔ "شاہکار" کے ذریعہ بھی غلط الفاظ و محاورات وغیرہ پر روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اُردو شاعری کے لئے پُرانی جکڑ بندیوں کے قائل نہیں۔ لیکن ان کی ترقی پسندی اُسی حد تک محدود ہے جہاں تک علمی صلاحیتوں کا خون نہ ہو۔ اُردو شاعری میں خوشگوار اذواق کی ترویج ——— بے قافیہ نظموں کا رواج (لیکن بحر و وزن کے ساتھ) محبوب کے لئے مونث ضمیر کا استعمال۔ خیالات و تلمیحات کے اعتبار سے اُسے ہندوستانی شاعری بنانا۔ غیر فطری خیالات سے پاک کرنا۔

زبان میں رس اور روح پیدا کرنا اُن کا مطمحِ نظر ہے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں حکومتِ ہند نے علّامہ موصوف کی خدمات اور علم و فضل کے اعتراف میں "شمس العلماء" کا خطاب عطا کیا۔ اس خطاب کے ملنے کے بعد اعترافِ کمال کے طور پر جو خطوط "شاہکار" میں شائع ہوئے۔ اُنھیں دیکھنے کے بعد موصوف کی شخصیت کا صحیح عرفان ہوتا ہے۔ یوں بھی جو لوگ علّامہ کو قریب سے جانتے ہیں۔ انھیں اُن کے علم و فضل اور ادبی دسترس قوتوں کا اچھی طرح علم ہے۔ اصنافِ سخن میں کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس پر اُنھیں کامل عبور حاصل نہ ہو۔ کچھ تو اپنی خاموش فطرت کچھ دوسروں کی "نوازشِ بے جا" اور کچھ علمی مشاغل نے آجتک اُنھیں تسلسل کے ساتھ شاعری کے میدان میں آنے کی اجازت نہ دی اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعرانہ قوتوں کے اعتراف میں لوگ جھجک محسوس کرتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جس کے رشد و ہدایت کی روشنی سے اِس دَور کے بیشتر ترقی یافتہ نوجوان شعرا کے سینے روشن ہوگئے ہوں وہ بذاتِ خود کیا ہوگا۔ جہاں تک مجھے علم ہے علّامہ تاجور کے پاس کافی سرمایہ کلام ہے۔ جس میں نظمیں کم اور غزلیں زیادہ ہیں۔ اُن کی غزل کا رنگ قدیم اور جدید کا ایک درمیانی عکس ہے وہ بالکل سپاٹ نہیں ہوتے بلکہ ندرتِ الفاظ کے ساتھ ندرتِ خیال بھی ہوتی ہے اور بعض اشعار تو زیادہ سے زیادہ جذب و اثر کے حامل ہوتے ہیں۔ سادگی اُن کے کلام کا حُسن ہے۔ چونکہ اُن کی حیثیت صرف شاعرانہ ہی نہیں بلکہ وہ بحیثیت ادیب بھی ایک ممتاز اور بلند درجہ کے حامل ہیں۔ اس لئے اِن دونوں حیثیتوں کو تنقید کے وقت سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف غزل ہی کا ہو کر رہ جائے اور اُسے دوسرے علمی و ادبی شعبوں سے کوئی تعلق نہ ہو وہ اگر غزل میں انفرادیت پیدا کر لے تو یہ دوسری بات ہے لیکن ایک ایسے شخص کی غزل میں انفرادیت کی تلاش بے معنی ہے جو ایک طرف خوشگو شاعر بھی ہے اور دوسری طرف کامیاب ادیب بھی۔

میں ذیل میں علّامہ تاجور کی غزلوں سے جو انتخاب پیش کر رہا ہوں۔ اُسے دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک اچھے غزل گو نہیں ہیں:-

غم کی تنہائی میں جب وہ خواب میں آتا ہے یاد ۔۔۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے دل کو جانے کیا ہو جاتا ہے
وہ کافر ہوں کہ یادِ خدا میں بھی دوست کی پکار اٹھو ۔۔۔ کیا کیجیے ہر پھر کے اُسی کا نام زباں پر آتا ہے

محرومِ نظر ہے دل میرا اے حُسنِ اتم اے بحرِ کرم
اس ذرّے کو خورشید بنا، اس قطرے کو دریا کر دے

محفلِ حشر بھی سُونی نظر آتی ہے مجھے ۔۔۔ ڈھونڈتی ہیں جسے نظریں وہی محشر میں نہیں

خفائے دوست بنی رہنمائے منزلِ دوست ۔۔۔ وہ کھو رہے ہیں مجھے اُن کو پا رہا ہوں میں
محبّت! آہ محبّت کی زندگی مت پوچھ ۔۔۔ بڑی مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں میں
ہے میری خاک کے ذرّوں میں پھر نمودِ حیات ۔۔۔ کہیں اُنھیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں

نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی نہ وہ بدلے ۔۔۔ میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں
سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میری رونے کا ۔۔۔ الٰہی ساری دُنیا کو میں کیونکر راز داں کر لوں

کیا دیکھئے کہ دیکھ ہی سکتے نہیں اُسے ۔۔۔ اپنی نگاہِ شوق حجابِ نظر ہے آج
کل تک تھی دل میں حسرتِ آزادیِ قفس ۔۔۔ آزاد آج ہیں تو غمِ بال و پر ہے آج!

مٹا نہ مجھ کو محبّت کی خود فراموشی ۔۔۔ کہ اپنے بھولنے والے کی یادگار ہوں میں

طاقِ کسریٰ نے کہا

قافلہ منزلِ مقصود سے تھا دُور ابھی
کہتی تھی بانگِ جرس اور ذرا دُور ابھی

میں ٹہلتا ہوا صحرا کی طرف جا نکلا
یعنی بازیچۂ کسریٰ کی طرف جا نکلا

چاند کی زرد شعاعیں تھیں عنان گیرِ حیات
مل گئی مجھ کو غمِ کاہشِ فردا سے نجات

کون تھا میرے سوا دشت کے میخانے میں
تھی ابھی تک مئے باقی مرے پیمانے میں

زلفِ دوشیزۂ مریخ کا پھیلا ہوا جال
صید کر لیتا تھا اک لحظے میں شاہینِ خیال

روح کو چین نہ تھا قلب کو آرام نہ تھا
تھا کوئی پارۂ لرزاں دلِ ناکام نہ تھا

طاقِ کسریٰ کے مناروں نے کیا مجھ سے خطاب
کس قدر نغمہ فشاں ہے تری فطرت کا رباب

تو نے ذرّوں کو بتائے ہیں رموزِ الوند
ڈال دی گردنِ اہریمن و یزداں میں کمند

تو سمجھتا ہے جسے بادۂ دوشیں کا خمار
اس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں قوموں کے مزار

کیا مری عظمتِ رفتہ تجھے معلوم نہیں؟
کیا وہ کیفیتِ رفتہ تجھے معلوم نہیں؟

مشعلِ مہرِ جہانتاب ستاروں کے محل
رودِ کہسار میں بہتے ہوئے نورستہ کنول

اوس کا قطرۂ ناچیز ہو یا ہو مہِ نو
روزِ اوّل سے ہیں سب تیری خودی کے پیرو

کارفرما ہے خودی پردۂ زنگاری میں
شمعِ ایوانِ محبت کی ضیاباری میں

"تازہ کاری" سے عیاں گلشنِ جنت کی بہار
تازہ کاری میں نہاں عالمِ نو کے اسرار

کیا عجب، ہو تپشِ خونِ رگِ کوہ و دمن
ارضِ مشرق سے ابھرتی ہوئی سورج کی کرن

سینۂ لالہ صدف ہے گہرِ شبنم کا
جس طرح خاک بھی اک جزو ہے جامِ جم کا

لطفِ ماحول پہ چھا جاتا ہے جس کا سودا
قلبِ فطرت میں بناتا ہے نشیمن اپنا

وہ "طلسماتِ منظّم" ہے ضمیرِ تقدیر
کہتے ہیں اہلِ نظر جس کو طلائی زنجیر

ہو گیا سوزِ کہن کب سے اساطیرِ فسوں
اور پائندہ ہوا قصرِ غلامی کا ستوں

کون کہتا ہے جہاں تودۂ خاشاک نہیں
زندگی موت ہے گر شعلۂ بیباک نہیں

لوحِ تدبیر پر اک حرف بھی تحریر نہ کر
یا "مکافات" کو تقدیر سے تعبیر نہ کر

افسر احمد نگری

"اذکارِ خواتین" پر ایک نظر

رسالہ "شاعر" آگرہ ماہ جون سنہ ۱۹۸۳ء میں جناب مولانا مفتی انتظام اللہ شہابی کا ایک مضمون "اذکارِ خواتین" جب میری نظر سے گذرا تو مجھے معاً اسی موضوع پر اپنے کتب خانے کا ایک قلمی نسخہ یاد آگیا۔ بڑی تلاش و جستجو سے میں نے اُسے نکالا۔ یہ میرے حقیقی برادرِ معظم شریعت پناہ حق آگاہ جناب قاضی سراج الدین احمد سند یافتہ دینیات حال قاضی دھولپور کا دستخطی ہے جس کو میرے والد بزرگوار شریعت مآب عالیجناب قبلہ قاضی جلال الدین احمد مرحوم مغفور سابق قاضی دھولپور نے اپنے والد قبلہ جناب والا ماحافظ مولوی قاضی فصیح الدین احمد قادری مرحوم مغفور قاضی دھولپور نبیرہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رح کے ایک قلمی نسخہ سے جو پرانا ہونے کی وجہ سے صد درجہ بوسیدہ ہو چکا تھا، بخیال سعادت و یادداشت محفوظ کرا یا تھا۔

صاحب المذکور عربی فارسی کے بڑے جید عالم تھے۔ آپ کو صرف نحو منطق فلسفہ فقہ اور حدیث میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ بہت لوگ آپ سے مستفید و مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ حکمت اور شاعری سے بھی اچھا لگاؤ تھا۔ آپ کا کلام میرے مختصر سے آبائی کتب خانے کی زینت ہے محقق بھی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ آپ نے بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ تذکرۂ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رح کو نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے ترتیب دیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ بہا نسخہ میری عدم توجہی اور غفلت سے ضائع ہو گیا۔ فارسی میں آپ نے فقہ کی ایک مبسوط و ضخیم کتاب تالیف فرمائی جو عربی فارسی کی ایک سو دس مستند کتابوں کا نچوڑ ہے۔ فاضل مؤلف نے ان تمام کتب ہائے محولہ کی ایک مکمل فہرست آغازِ کتاب میں درج کر دی ہے۔ عربی میں آپ کی تصنیف سے ایک رسالہ ہے جس میں منطق کے دقیق و پیچیدہ مسائل کو بالوضاحت نہایت آسان طریقے سے حل کر دیا گیا ہے۔ قواعد میں میزان منشعب پنج گنج اور زبدہ کا منظوم ترجمہ آپ کی یادگار ہے ایک صاحب کے بیاض جنکے والد میرے دادا قبلہ مرحوم کے ہمعصر تھے۔ آپ کی مرتبہ جنتری واقعات مشہورہ مرتبہ سے مزین موجود ہے جس میں بعض امور تو ایسے عجیب غریب درج فرمائے گئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب موصوف کو حساب پر کس درجہ عبور حاصل تھا۔ آپ مہاراجہ سندھیا عالیجاہ بہادر کے یہاں ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ مہاراجہ جیواجی راؤ بیکنٹھ باشی آپ سے بہت مانوس تھے اور استاد کہکر مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ آپ ریاست دھولپور کے قاضی مجلس مقننہ اور ممبر اور درباری اعزاز کے حامل تھے جو شاہی وقت سے موروثی طور پر ہمارے خاندان میں چلا آتا ہے۔

نسخہ زیرِ نظر انصیب ما یہ ناز قابلِ قدر بزرگ کے قلمِ فیض رقم کی لکھی ہوئی ایک پرانی یادگار سے منقول ہے۔ اس میں فاضل مؤلف نے کم و بیش دو سو شاعرہ خواتین کا تذکرہ قلمبند فرمایا ہے اور نمونۂ کلام کے سلسلے میں ہر خاتون کے متعدد اشعار مہیا کرکے کلام کی نسبت کوئی مستحکم رائے قائم کرنے کی کافی گنجائش رکھی ہے۔ نسخہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبِ تالیف نے بڑی تحقیقات و جانفشانی سے کام لیا ہے۔ تا حدِ امکان معمولی معمولی شاعرہ کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ فارسی میں کہنے والی خواتین کے حالات بزبان فارسی حیطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں اور اگر شاعرہ کے متعلق کسی قسم کی حاضر جوابی یا برجستہ گوئی کا کوئی نادر لطیفہ ہاتھ لگ گیا ہے تو اسکو بھی بسلسلۂ حالات الفنا ظامیں لے آیا گیا ہے تاکہ شاعرہ کی فطری ذہانت اور طباعی پر بھی کما حقہٗ روشنی پڑ سکے۔ غرض یہ کہ کسی حیثیت سے بھی نسخہ ہذا کو ایک اعلیٰ درجہ کی سند اور قابلِ اعتماد تالیف تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

سطور زیرِ قلم میں اس نسخہ کے حوالے سے "اذکارِ خواتین" پر روشنی ڈالنا میرا مقصود ہے تاکہ ایک مفید علمی مقالہ بر تاصد رسائی و معلومات تشنۂ تکمیل رہنے اور غلط واقفیت بہم پہنچانے کا الزام عائد نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ مستثنیات سے اختر ثانی۔ بی بی الہ بندی۔ جرمان حلیہ زہرا اور عصمت کے جو صاحبِ اذکار کے خاندان سے متعلق ہیں۔ نسخہ زیرِ نظر اور مضمون محولہ صدر میں کیا بلحاظ ترتیب اور کیا بلحاظ متن بہت کچھ موافقت و یکسانیت نظر آتی ہے البتہ دونوں کو بنظرِ غائر مطالعہ کرنے پر کہیں کہیں خفیف تفاوت پایا جاتا ہے۔ جبکہ نسخہ اذکار کی بوسیدگی اور کرم خوردگی نیز صاحبِ مضمون کی جنبشِ قلم پر محمول کیا جانا ممکن ہے۔ میں ان اختلافات کو ذیل میں بہ تفصیل بیان کروں گا۔

صاحبِ مضمون نے بیگم جان جانی کے والد کا نام قمر الدین خاں لکھا ہے جبکہ نسخہ زیرِ نظر میں اُن کا نام فخر الدین خاں درج ہے۔ اسی طرح حیدری خانم حیدری کو زوجۂ انشاء اللہ خاں تحریر فرمایا ہے جو بشارت اللہ بیگ جو ناجاہت تھے (المنجم دلہن کو بجائے انتظام الدولہ کے بجائے اذکار میں حبیبہ نظام الدولہ لکھا گیا ہے اُنکے دوسرے شعر کی ردیف بعد مطلع درج کی گئی ہے اور تیسرا شعر صاحب اذکار کی

ذاتی واقفیت پر مبنی ہے۔ ضیائی بیگم ضیا کو زوجہ حکیم امداد علی بتایا ہے جو نسخہ ہذا زوجہ حکیم لوہ علی ہونا پایا جاتا ہے۔ قریب بنگو مہر کرامت علی ہیں جنکو مضمون صدر میں میسر برکت علی درج کیا ہے ——— نام بھی انکا امیر النساء ہے جن خاتون کو فاضل مولانا مضمون نگار نے دانیہ لکھکر کسی ڈاکٹر کی بیٹی بتایا ہے۔ اسکو مولف نسخہ زیر نظر نے رادیہ داد کے ساتھ لکھا ہے اور کسی چھیپے کی دختر باڑہ سیتا رام دہلی کی رہنے والی درج کیا ہے۔ اختر اوّل کے دوسرے مصرعہ میں "دل یہی نے ہم کو جلا دیا" والا اصلی شدہ ٹکڑا نسخہ ہذا میں "دل نے ہمیں کو جلا دیا" تحریر ہے اور اسیر کے مقطع کے دوسرے مصرعے میں ان کے بجائے ضمیر اُس کا استعمال ظاہر کیا ہے۔ اشک کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں جس جگہ تجھے اسے کا فرزسا لکھا ہے وہاں اس نسخہ میں "میں تجھے تو اسے بت کرسا" پایا جاتا ہے۔ اذکار میں سلطان بیگم دختر نواب معتمد الدولہ بہادر لکھنوی ہے کے شعر کا دوسرا مصرعہ اس طرح تحریر ہے ؎

"ملتے ہی آنکھ رہ گیا منھ تککے ہائے دل"

اس میں منھ کی جگہ نسخہ موجودہ میں "میں" ہے۔ ان کا نام سلطان بیگم نہیں بلکہ سلطانی بیگم درج ہے۔ بہو بیگم محل خاص نواب یوسف علیخاں صاحب کا تخلص صاحب اذکار نے بیگم ظاہر کیا ہے اور نسخہ ہذا میں لاعلمی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اُنکے قطعہ کے پہلے شعر کا دوسرا مصرع "آنکھیں میں لڑا آؤں کہیں اُس رشک قمر سے"

ہونا چاہتے اور تیسرے مصرعے میں جہاں دل کا استعمال کیا گیا ہے وہاں جی کا استعمال ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چوتھے مصرعے میں تار نظر سے دب جانے کی عجیب تصویری پیش کی گئی ہے۔ اس مقام پر بار نظر صاحب نسخہ ہذا نے تحریر کیا ہے۔ بیگم صاحبزادی میر محمد تقی کے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ نسخہ موجودہ میں

"اب کہتے ہو کیا تم نے ہمیں مار تو رکھا"

درج ہے جس کو صاحب اذکار

"لو کہتے ہو کیا تم نے نہیں مار تو رکھا"

لکھتے ہیں۔ جعفری تخلص رکھنے والی بی بی کا اصلی نام عارفہ صاحب اذکار کا نتیجہ تحقیق ہے۔ حیدری خانم حیدری کے مقطع کا دوسرا مصرعہ مضمون مورخ بحث میں

"جو کہ تجھ سے پھرا وہ حیدر سے"

لکھا گیا ہے اور نسخہ زیر نظر میں

"جو کہ تجھ سے پھرا حیدر سے پھرا"

تحریر ہے۔ ذیل کا شعر مرزا سلیمان شکوہ کے محرم ثانی میں بتا دیتے ہو درج ہے جسکو اذکار میں بنا لیتے ہو لکھا ہے

یا الٰہی یہ کس سے کام پڑا
دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

اس شعر کو شہر سے منسوب کیا گیا۔ نسخہ ہذا میں یہ جینا بیگم جینا زوجہ جہاندار شاہ کے نام کے ساتھ درج ہے۔ شہرت سے منسوب کئے ہوئے باقی دو شعروں کے اندراج کی ذمہ داری کا بار بھی صاحب اذکار کی معلومات پر ہے ضرورت کا اصل نام اس نسخہ میں شریف النساء اور اذکار میں شرف النساء تحریر ہے۔ یاد صاحبہ کا قطعہ جسکو انھوں نے بحالت نزع کہا ہے اذکار میں بہ تغیر ردیف درج ہوا ہے۔ اسکی ردیف بجائے "کو ہے" کے "لگی" ہونا چاہئے۔ ان بی بی کا انتقال سنہ ۱۲۹۲ھ میں ہوا ہے۔ نہیں معلوم ان کو اذکار خواتین میں جو سنہ ۱۲۶۳ھ کی تالیف بتائی جا رہی ہے۔ کیونکر جگہ مل گئی۔ اسی طرح فاطمہ بیگم کنیز دختر محمود نصرت الدولہ بہادر سنہ ۱۲۸۰ھ میں انتقال کرنے والی دوسری بی بی معہ سن انتقال اذکار میں موجود ہیں۔

اگر وقت نے مساعدت کی تو انشاء اللہ کسی فرصت کے موقعہ پر ان باقیماندہ خواتین کے حالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرونگا

آخر میں میں اپنے محقق فاضل مضمون نگار جناب شہابی سے مستدعی ہونگا کہ وہ براہ کرم میرے اس مضمون کو کسی اور روشنی میں ملاحظہ نہ فرمائیں۔ خدا گواہ ہے کہ اس سے میری مراد صرف یہ ہے کہ اہل ذوق کے سامنے زیادہ سے زیادہ صحیح واقفیت پیش کر دوں۔ معلومات اور امکان ہوتے ہوئے اس سے قطع نظر کرنا میرے نزدیک گناہ عظیم اور بخل کے مرادف ہے۔ البتہ مجھے اسکا تعجب ہے کہ ایک ہی موضوع پر دو مختلف گھرانوں میں دو یکساں قلمی نسخوں کا پایا جانا کیونکر ممکن ہوا۔

معذرت خواہ

(قاضی زادہ) **معراج الدین احمد معراج دھولپوری**

مشاعرہ شاعر:- مصرع طرح برائے ماہ فروری ۱۹۴۴ء

"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

بیکلی۔ زندگی وغیرہ قوافی سمجھے ردیف

نوٹ:- غزلیں یکم جنوری ۱۹۴۴ء تک آ جانی چاہئیں۔ شاعر کے صرف مستقل خریدار غزلیں بھیج سکتے ہیں۔ غزل پر نمبر خریداری ہونا ضروری ہے۔ نشانہ بہ نمبر خریداری ترقیکا آداب۔ **منیجر**

فتنۂ معصوم

ہے میرا رازِ جنوں ایک فتنۂ معصوم
ترا ہی ذکر ہے لیکن تجھے یہ کیا معلوم

کسے خبر کہ تو کس وقت باخبر ہو جائے
سرِ مژہ پہ رکھوں دل کی عرض بے مفہوم

ابھی چمن میں ترے خار ہیں نہ نکہتِ گل
ترا ستم بھی ہے محفوظ لطف بھی موہوم

ہے میری توبہ بھی عزمِ گناہ کی صورت
ترا گناہ بھی موہوم عزم بھی معصوم

حیات و موت ہے تفریق سادگی کو تری
مری حیات بھی افسردہ موت بھی مغموم

رہے اس طرح سے تری خستگی میں آمدِ گل
پسِ غبارِ شفق جیسے فوجِ ماہ و نجوم

کبھی ہیں دل میں وہ سادہ نگاہیاں تیری
نظر میں گھوم رہی ہے وہ شوخیٔ معصوم

تو ہی ہے درد، تو دل کا علاج نامنظور
تو ہی دوا ہے، تو دل کی شفا ہی نامعلوم

تری نگاہ میں اپنا مقام کیا ڈھونڈوں
نہیں ہے خود بھی مجھے اپنی حیثیت معلوم

معاف کر جو میں اظہارِ عشق کر نہ سکوں
نہیں ہیں راس محبت کو اس جہاں کے رسوم

ترا تپاک بھی ہے دل کی مصلحت کے خلاف
ترے نثار! تو میکشؔ کی نظم سن کے نہ جھوم

میکشؔ اکبر آبادی

تاثیرِ محبت

زبانِ شمع سے اظہارِ دردِ دل تو کیا ہوگا
اگر آنسو نکل آئے سرِ محفل تو کیا ہوگا

ستم کی ہر ادا اب تک تو ہمدوشِ قیامت ہے
ستم میں سادگی بھی ہوگئی شامل تو کیا ہوگا

جہنم کی طرف لے جانے والے اہلِ عصیاں کو
کسی کی شانِ رحمت ہوگئی حائل تو کیا ہوگا

سکوتِ حسن و تاثیرِ محبت اے معاذ اللہ
اگر طوفاں کی جانب کھنچ گیا ساحل تو کیا ہوگا

بجھے ڈر کاروانوں سے خضر کی منت بجا لیکن
جو نکلے خضر بھی گم کردۂ منزل تو کیا ہوگا

نیازِ عشق کی مجبوریوں سے ماورا ہو کر
سمجھ لوں اپنے دل کو آپ ہی کا دل تو کیا ہوگا

محبت میں وہ کام آساں ہے جو دشوار ہو جائے
بآسانی اگر حل ہوگئی مشکل تو کیا ہوگا

ہے یادِ عشرتِ رفتہ پہ قائم زندگی اپنی
نہ ہو ماضی شریکِ حال و مستقبل تو کیا ہوگا

غرور اتنا شکیلؔ اس شوخ کی بے اعتنائی پر
کہیں تم کو سمجھ لے وہ کسی قابل تو کیا ہوگا

شکیلؔ بدایونی
(بی اے علیگ)

شامِ زندگی!

وہ ایک چھوٹے سے کمرہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، سہ پہر کا وقت تھا۔ سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں اسکے چہرہ پر پڑ رہی تھیں اور وہ اداس نظروں سے سامنے والی عمارتوں کی خالی دیواروں کو دیکھ رہی تھی، دور ——— کہیں باغ میں پھول کھل رہے تھے ——— لالہ کی سُرخی اور چمک آنکھوں میں اُتری جا رہی تھی اور بنفشہ کے پھول ——— شفق کے ارغوانی رنگ کو اُڑا رہے تھے۔ اب سے تین سال پیشتر اُس نے فرحت بخش لالہ کو جھومتے ہوئے دیکھا تھا، گلاب کی لطیف خوشبو ابھی تک اُسے محسوس ہو رہی تھی، اسکے شوہر کو مرے ہوئے تین سال ہو چکے تھے، تین طویل ——— تنہا ——— اور اُداس سال!

اُس کے چار بیٹے تھے ——— اور سب کامیاب زندگی بسر کر رہے تھے، بڑا ناگپور میں وکیل تھا، ترلوک دہلی میں ڈاکٹری کر رہا تھا، گنگا بمبئی میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا اور آتما لکھنؤ میں ایک ریسٹوران چلا رہا تھا، سب خوش حال اور مسرور تھے۔ اب سے تین سال پیشتر صورتِ حال بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اُسکا شوہر زندہ تھا۔ مگر اسکی موت کے بعد سب نے اسکو بھلا دیا تھا، دن اس اُمید پر گذرنے گئے کہ ان میں سے کوئی ضرور اسکو یاد رکھیگا، مگر یہ احمقانہ اُمید تھی، وہ اپنے کاموں میں بیحد مصروف تھے، خیر یہ کوئی خاص بات نہ تھی، وہ بالکل بوڑھی عورت تھی، مگر انھوں نے ایک بوڑھی عورت سے اپنی کامیابیوں کے زعم میں منہ ہی موڑ لیا تھا۔ انھیں اسکا احساس ہی نہ تھا کہ بوڑھا ہونا کتنا کٹھن ہے ——— اور زندگی کو تیزی سے گذرتے ہوئے دیکھنا اور پھر بے بسی کے عالم میں پیچھے رہ جانا کسقدر الم ناک ہے، اُن سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ بڑھاپے کی تنہا زندگی کو سمجھ سکیں گے یہ کسقدر بے کیف اور اکتا دینے والی زندگی ہوتی ہے،

اس نے اپنے شوہر کی زندگی میں بوڑھی ہونے کی کوئی پروا نہیں کی تھی، اسکے شوہر کی محبت اور قربت اس کے لئے باعثِ طمانیت اور مسرت تھی اُسکے مرجانے کے بعد وہ ایک ایسی دُنیا میں جو اُس کے لئے بہت بڑی، بالکل نئی اور تنہائی انگیز تھی، تنہا، حیران و پریشان رہ گئی تھی۔

وہ خوش [illegible] کو معلوم نہیں ہو سکا، اُسکے شوہر کو اسکا یقین تھا کہ اسکے مرنے کے بعد وہ برابر مسرور زندگی بسر کرتی رہیگی۔ اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا "بچے تمہاری دیکھ بھال کریں گے، تم تنہا نہیں ہوگی۔ بچے تم سے محبت کرینگے اور وہ تمہیں آرام پہونچائیں گے" اُسے یقین تھا کہ واقعی وہ خوش رہ سکے گی۔

سب سے پہلے وہ آتما کے یہاں ٹھہری اور پھر ترلوک کے یہاں، ازاں بعد گنگا کے یہاں اور اب وہ بڑے کے یہاں تھی، ان سب نے اپنا فرض ادا کیا تھا، لیکن بہر حال اب وہ اسکے بچے نہیں تھے ——— وہ اب اسکے بیٹوں کی طرح ——— اسکے لختِ جگر معلوم نہیں ہوتے تھے، اُنھوں نے اپنے گھروں میں اسکے ساتھ ایک اجنبی کا سا سلوک کیا تھا۔ ایک ایسا اجنبی جو اُن سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو مگر جسکو طوعاً و کرہاً برداشت کیا جائے۔

اس طرزِ عمل سے اس کو بڑی وحشت ہوئی۔ کسی شدید احساس نے اسکے دل کو ہلا دیا، اسکا دل محبت آرام اور طمانیت کا متمنی تھا وہ چاہتی تھی کہ اسکے لڑکے اپنی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر اُس کے پاس آئیں، اُس سے باتیں کریں اور اس سے خوش ہو لیں، جس طرح وہ بچپن میں دوڑ دوڑ کر اسکے پاس آیا کرتے تھے، مگر اُس نے آج تک اسکا اظہار نہیں کیا تھا، تین طویل سالوں نے اسکو اچھی طرح یہ سکھا دیا تھا کہ سب سے بہتر طریقہ خاموش اور بے تعلق رہنا ہی ہے، وہ بیحد مصروف، تیز اور بیقرار تھے ماں کی طرح وہ ہمیشہ انھیں اپنے دل میں معاف کر دیا کرتی تھی، لیکن کیا وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اسکی پچھلی زندگی کس طرح گذری ہے؟ بسا اوقات اسکے چہرے پر افسردگی چھا جاتی اور اسکی آنکھوں میں آنسو آجاتے ——— لیکن کسی کو اسکی پروا نہیں تھی وہ ہمیشہ اُن کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی، تاکہ اسکی تنہائی کی گھڑیاں بھیانک معلوم نہ ہوں، جہاں وہ کسی کام میں انکی امداد کرنا چاہتی، جھڑک دی جاتی اور اسکی ساری آرزوئیں خاک میں مل جاتیں اور اُسے یہ محسوس ہونے لگتا کہ غیروں جیسا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ کئی بار گفتگو کے دوران میں اُس نے اپنے کو غیر ضروری، بیکار، بے وقعت اور نکما محسوس کیا۔ وہ چُپ چاپ اپنے چھوٹے سے تاریک کمرہ میں بیٹھ جاتی اور آنکھیں بند کرکے عہدِ ماضی کے خواب دیکھا کرتی اور اکثر آنسو اسکے [illegible] ہوئے گالوں پر ڈھلک آتے، ایکا ایکی اسکے [illegible]

کانپنے لگتے ــــــ ہاں وہی ہاتھ جو بچوں کے لئے کام کرنے کے بعد مشتاق رہتے تھے اب وہ ہاتھ بھدّے، ننگے، غیر ضروری اور ناکارہ تھے۔

اُس کے تصور میں باغ، کھیت اور خوبصورت مکان پھر گئے جہاں اسکے چاروں لڑکے پیدا ہوئے تھے اور اُنکی پرورش ہوئی تھی، اُسے اپنے سونے کا کمرہ نظر آیا جہاں وہ انتہائی کرب و اذیت سے اپنے بچوں کو پردۂ شکم سے عالمِ وجود میں لائی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ خوبصورت، تندرست اور مستعد ہے اور کپڑے دھو رہی ہے، کھانا پکا رہی ہے، صفائی کر رہی ہے اور اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دے رہی ہے، اور انھیں صبر و تحمل، عزت، کریم اور جود و سخا کی نصیحت کر رہی ہے ــــــ اس سے بالکل بے خبر ہو کر کہ وہ ناکام رہے گی، اُسے یاد آیا کہ کس طرح اُسکے شوہر اور اُس نے کفایت شعاری سے کام لیکر، بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے روپیہ پس انداز کیا تھا۔ اُسے پھر اپنے شوہر کے الفاظ سنائی دئے، "وہ ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کر کے کام کریں گے۔ ایک دن ہمیں اُن پر فخر ہوگا، جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے تو وہ ہمیں آرام پہونچائیں گے" اُس وقت اُسے اپنے شوہر کے الفاظ پر یقین تھا اور وہ اور زیادہ محبت، خوشی اور سرگرمی سے کام کرتی تھی۔

وہ بڑے ہوئے اُنھوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور یکے بعد دیگرے اپنے بوڑھے والدین کو چھوڑ کر چلے گئے کیونکہ وہ خوش حال، معروف اور مالدار ہو گئے تھے۔ اس لئے انھوں نے ماں باپ کو بھی بھلا دیا۔

رہے اُن کے پوتا پوتی تو وہ بالکل ہی نئے طرز کے تھے وہ اُنھیں کھلا بھی نہیں سکتی تھی۔ انھیں ہمیشہ اُس سے دُور رکھا جاتا تھا ــــــ ایک دن ہیرا کی چالاک بیوی جمنا کی آواز اُسکو سنائی دی "اسے کہیں بھیجدو نا؟ وہ ہر بات میں دخل دیا کرتی ہے"!

وہ حیران تھی کہ جمنا کسکو بھیجنا چاہ رہی ہے؟ نئی ماما یا ملازمہ کی لڑکی کو؟ اس کے بعد اُسے ہیرا کی آواز سنائی دی "میں خود بھی اسکو یہاں رکھنا پسند نہیں کرتا مگر جمنا تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ بہر حال وہ میری ماں ہے"!

جمنا نے فوراً کہا "تم اسکو گنگا کے پاس بھیجدو، وہ اس بوجھ میں کوئی حصہ نہیں لیتا؟"!

وہ اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے، اُسے بھیجنے کے منصوبے ہو رہے تھے۔ اُس نے آہستہ سے اپنا سر جھکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں، گنگا کو خط لکھا گیا اور اُس نے جواب دیا کہ اگر ضروری ہو تو اُسے بھیج دیا جائے۔ ہیرا نے تار دیا کہ وہ اُسے بھیجنا چاہتا ہے اب اسے محسوس ہوا کہ کسی بیٹے کو اسکی ضرورت نہیں، اسکا رنج کرنا فضول تھا، اُسکا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور پیہم صدمات سے پاش پاش ہو چکا تھا۔

وہ ٹرین میں سوار ہو گئی، سفر کی تکان سے اسکا سارا جسم ٹوٹا جا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر وہ اکیلی کھڑی تھی، اُسے کوئی لینے نہیں آیا تھا ــــــ وہ کسی کے پاس بلا وجہ جانا پسند نہیں کرتی تھی۔

دُور - ایک ضعیف عورت ریلوے کی پٹری کے پاس جاتی دیکھی گئی۔ اُس کے نحیف پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔

رشدی مدیر "ندیم" بھوپال

(بقیہ خاصانِ ادب صفحہ ۴)

(۵۹) جناب منشی ایم۔ آر شاہ صاحب ایم۔ بی۔ ٹی (آکزا ان پنجابی ڈسپنسری) انبالہ سے سالانہ
(۶۰) جناب خادم حسین صاحب خادم زیبائی جبلپور سے سالانہ
(۶۱) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور سے سالانہ
(۶۲) جناب شیخ محمد احمد صاحب نازش پرتابگڑھی ولد حاجی شیخ محمد احسن صاحب مرحوم رئیس پرتابگڑھ سے سالانہ
(۶۳) محترمہ سلمیٰ خاتون صاحبہ کٹیہر مدناپور بنگال سے سالانہ
(۶۴) جناب خان کبری محمد خان جی آف کوٹھری بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے سالانہ
(۶۵) جناب ابراہیم خان و محمد خان صاحب شرف جوناگڑھی سے سالانہ
(۶۶) جناب عبدالستار خان صاحب قائم گنجوری (دہلی) سے سالانہ
(۶۷) جناب حبیب خان صاحب حبیب شاہجہانپوری کوئٹہ سے سالانہ
(۶۸) مسٹر اختر شاکر بی۔ اے پروپرائٹر بھولارام اینڈ سنس دہلی سے سالانہ
(۶۹) محترمہ حجاب بنارسی (ناگپور) سے سالانہ
(۷۰) محترمہ اسماء [illegible] کراچی سے سالانہ
(۷۱) محترمہ نمونہ صاحب کراچی سے سالانہ
(۷۲) محترمہ مفتیہ جی ابتہاج صاحبہ کراچی سے سالانہ
(۷۳) جناب یحییٰ بھائی محمد علی صاحب راولپنڈی سے سالانہ
(۷۴) جناب عارف ابراہیم یوسف پرکار قادری باکوئی سے سالانہ
(۷۵) جناب خان صاحب انور خان جی آف ناکرہ دربار گڑھ بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے سالانہ
(۷۶) جناب سید ظہیر حسین صاحب ظہیر ہندی سے سالانہ
(۷۷) جناب رفیق احمد صاحب رفیق ن۔ا کلکتوی صدر تخشی لین ہوڑہ سے سالانہ
(۷۸) جناب اکبر علی غلام علی صاحب تختے والے کراچی سے سالانہ
(۷۹) محترمہ قبول نورالدین ٹپال کراچی سے سالانہ
(۸۰) مسٹر ممتاز صحرائی برنلسٹ نگر مخدوم (پنجاب) سے سالانہ
(۸۱) محترمہ لیڈی سر رحیم بخش۔ سپالا (ضلع انبالہ) سے سالانہ
(۸۲) جناب محمد ولی صاحب ضیا [illegible] سے سالانہ
(۸۳) جناب [illegible] (پنجاب) سے سالانہ

عورت اور موسمِ گرما

جس طرح فصلِ نمو میں نوشگفتہ صبح و شام — یا چمن کے لالہ زاروں کی بہارِ سرخ فام
جس طرح صبحِ گلستاں میں سمن خانوں کی دھوپ — پھول کلیوں کو عطا کرتی ہے اک رنگین روپ
جس طرح ہر قطرۂ شادابِ نیسانِ بہار — بخشتا ہے ہر صدف کو اک حیاتِ آبدار
اپنے فطری جوشش و مستی میں عورت بھی یونہی — با ادائے سادگی و باشگفت و تازگی
جرأتِ نظارہ کو کرتی ہوئی کفر آشنا — ہو کے رہ جاتی ہے فصلِ گل میں جانے کیا سے کیا
رات کا پچھلا پہر ہو، چاندنی بکھری ہوئی — اور ہوا کے نرم رو جھونکوں میں خنکی ہو بھری
مسکراتی ہوں فضائیں خواب کی آغوش میں — ظلمتیں روپوش ہوں مہتاب کی آغوش میں
باغِ جنت سے چرا لائی ہو خوشبو کائنات — ہر نفس پر جھوم کر انگڑائی لیتی ہو حیات
کوہ و صحرا، باغ و میداں، سبزہ و گل، آبشار — ساحل و دریا، درخت و نخل، بام و رہگذار
نوبہار و نوشگفتہ، پرجمال و پرضیا — زندگی ہنستا ہوا اک پھول ہو فردوس کا
اور پھر ایسے مناظر میں بہ شانِ دلبری — اک کشادہ اور نورانی مسہری ہو بچھی
چاندنی کا فرش ہو ہم صورتِ حسنِ سحر — ناشگفتہ اس پہ کلیاں جابجا ہوں منتشر
عورت ان رنگینیوں میں اپنی رعنائی کے ساتھ — اک لطیف و سادہ تر اندازِ زیبائی کے ساتھ
قابلِ برداشتِ نظارہ نہیں ہوتی کبھی — بے سکوں کر دیتی ہے جذبات کی آسودگی
اس کی جانب سرسری سی بے محابا اک نگاہ — دامنِ نظارہ میں بجلی کو دیتا ہے پناہ
باوجود اسکے بھی عورت کا وجودِ جلوہ گر — شبنمی آرام گاہوں میں ہے فردوسِ نظر
کاش عورت! تو بھی ہوتی پھول کلیوں کی طرح — باغ میں کھلتے ہوئے شاداب غنچوں کی طرح
مرمریں جلوے ترے ہوتے ہم آغوشِ نگاہ — لطفِ نظارہ اٹھاتے تجھ سے ہم شام و پگاہ
جس طرح کلیوں سے لطفِ لمس ہے اک ناقص تلاش — ہوتی تیری ذات بھی ناقابلِ آغوش کاش!
آہ لیکن غنچہ و گل کی لطافت بھی تو خود — نازنیں کلیوں کی دوشیزہ صباحت بھی تو خود

وقف ہے ننھی سی نزہت اپنی کھونے کے لئے
گرمیِ آغوش میں پامال ہونے کے لئے

شفق ٹونکی

ترقی پسند ادب پر

چند سطور اور

ادبِ جدید کی سخیف جسارت پر بارہا ثقہ پیشانیوں پر بل تو پڑے ہیں مگر اب تک اسکے خلاف کوئی منظم آواز بلند نہیں کی گئی تھی۔ بارے شکر ہے بمبئی نے پیش قدمی کی اور اردو و اصلاحِ ادب کانفرنس نے اسکے دجل کو (جہانتک تقاریر کا تعلق ہے) سب پر ظاہر کر دیا۔ لیکن ادبِ جدید کب خاموش بیٹھنے والا تھا۔ اسکے ایوان سے بھی تیر اسے نکلنے لگے۔

"اردو و اصلاحِ ادب کانفرنس" نے بقول رسالہ "شاعر" پانچ اعتراضات نئے ہیں (میری نظر سے چونکہ اس کانفرنس کی کارروائی نہیں گذری ہے۔ اس لئے رسالہ "شاعر" کی رہنمائی پر چل رہا ہوں) اعتراضات حسب ذیل ہیں:-

(۱) مغرب زدہ گمراہ ترقی پسند ادب اخلاق و کردار کو برباد کر رہا ہے۔

(۲) زبان میں بیجا تصرفات کرکے ادب کو تباہ کر رہا ہے

(۳) فواحش کی اشاعت کر رہا ہے۔

(۴) بلینک ورس کی سی ناموافقِ مزاجِ اردو چیز کو جو بہت ہی گھٹیا اور مضحک ہے۔ رواج دے رہا ہے۔

(۵) خدا و مذہب کی توہین کرکے لوگوں کی دل آزاری کا ارتکاب کر رہا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ رسالہ "ایشیا" میں جوش صاحب ملیح آبادی نے ان پانچوں اعتراضات کا جواب دیا ہے میرے سامنے نہ "ایشیا" ہے اور نہ جوش صاحب کے جوابات ہاں رسالہ "شاعر" بابت ماہ نومبر اتفاقاً ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس اشاعت میں حضرت سیماب اکبر آبادی کا ایک مضمون بعنوان "ادب و احتساب" میری نظر سے گذرا۔ جس میں جوش صاحب کے الزامی جوابات (ان اعتراضات کے جوابات جو اردو و اصلاحِ ادب کانفرنس ——— عجب نام ہے۔ اصلاحِ ادب، اردو کی ترکیب ذرا اصلی معلوم ہوتی ہے ——— بہرنوع اس کانفرنس کے اعتراضات کے جوابات) کے سیر حاصل جوابات دیئے گئے ہیں۔

میں ان تمام چیزوں پر کچھ لکھنے سے قبل کانفرنس کے اعتراضات کو نظر ثانی کا محتاج سمجھتا ہوں۔ کانفرنس نے اپنے پہلے اعتراض میں لفظ "مغرب زدہ" لکھکر یہ تو نہیں کہونگا کہ ترقی پسند ادب کے غیر دقیع "افراد" میں مبالغات کا اضافہ کیا ہے ہاں یہ ضرور کہونگا کہ مغربی ادب کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ یہ نام نہاد پسند ادب جو پیدا ہوا ہے یا پیدا کیا جا رہا ہے۔ اسکا تعلق مغرب کے بہترین ادب سے بھی نہیں ہے یہ تو بالکل خانہ ساز چیز ہے اور مغربی ادب کی عدم تفہیم یا غلط تفہیم کا نتیجہ ہے۔ مغرب کے جو چند عریاں نگار گذرے ہیں انکا شمار وہاں نہ تو ادبی جواہر میں ہے اور نہ انکو کسی ترقی پسندانہ ذہنیت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ بلکہ وہ محض تجارتی پرچے ہیں جو حقائق نمائی کا حیلہ اختیار کرکے چل رہے ہیں اور بک رہے ہیں

میں خود اس نام نہاد ترقی پسند ادب کا مخالف ہوں اور اسکی ابہام نگاری پر کافی لکھ چکا ہوں۔ مگر بڑی ہی مسرت ہوتی اگر یہ کانفرنس کچھ اور وزنی اعتراضات کرتی مثلاً نام نہاد ترقی پسند ادیب بیشتر بہت کم پڑھے لکھے ہیں اور صرف اپنے چند بزعم خود علامہ انقلاب پسند آقاؤں کی تقلید میں سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کے مزخرفات پر قدغن قائم کرنے کی کوئی اسکیم سوچی جاتی۔ وہ قیادت کی حرص میں سکون کو انتشار سے بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں ضرورت تھی کہ "انہیں" کو انکی صحیح جگہ بتائی جاتی وغیرہ وغیرہ۔

خیر اعتراضات ہو چکے انکا جواب جوش صاحب دے چکے (یا شاید اور دینے والے ہوں) مگر مولانا سیماب نے اپنے مقالہ "ادب و احتساب" میں جوش صاحب کے جوابات پر جو خامہ فرسائی فرمائی ہے وہ اپنی جگہ مکمل ضرور ہے لیکن موصوف جواب دہندہ کے عاری از روشنی جوابات کے باب میں ایک دو مقام پر مغالطہ میں آگئے ہیں۔ یہ مقالہ بر بعض جوش صاحب کے چابکدستی سے دیئے ہوئے غلط جوابات کے ازالہ کیلئے سپردِ قلم کر رہا ہوں اور حیران ہوں کہ سیماب صاحب اس تغابن کا اندازہ کیوں نہ لگا سکے انہوں نے جوش صاحب کے ہر اعتراض کو اعتراض سمجھ کر اور قبول کرکے جس غلط پیرایہ میں اعتراض کیا گیا تھا اتنا ہی غلط انداز میں جواب کس طرح دیدیا۔

چونکہ رسالہ "ایشیا" میرے سامنے نہیں ہے اسلئے میں جوش صاحب کا جواب اور سیماب صاحب کا جواب الجواب (جو "شاعر" میں شائع ہوا ہے) سامنے رکھکر گفتگو کرنے پر مجبور ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر سیماب صاحب کے جواب الجواب میں کوئی [illegible] ہو (جسکا امکان صرف جوش صاحب کر سکتے ہیں)

تو اسکا حامی سمجھ نہ سمجھا جائے۔ آگاہی حقیقت کا ذریعہ میرے پاس بجز نمبر کے "شاعر" کے اور کچھ نہیں ہے جسکو سامنے رکھکر میں یہ سطور سپرد قلم کر رہا ہوں۔

اُردو اصلاح ادب کا لفرنس کے پہلے اعتراض کا جواب جوشؔ صاحب نے یہ دیا ہے جسکی تلخیص حسب ذیل ہے۔

"اخلاق و کردار محض ایک اضافی چیز ہے ——— زمانہ اپنی سنتِ جاریہ کے تحت بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار کے مفاہیم و تعینات کو بھی ہمیشہ بدلتا رہیگا"

اس کے جواب میں حضرت سیمابؔ فرماتے ہیں ۔

"اس میں شک نہیں کہ اخلاق و کردار اضافی عوامل ہیں جو ضرورت و تقاضائے وقت کے تحت دنیا کے عظیم اور کامل انسان بنی آدم کی اصلاح و فلاح کے لئے معین کرتے ہیں اور ان میں ترمیم و تنسیخ کا امکان بھی ہمیشہ رہتا ہے ——— الخ"

اسی اعتراض میں حضرتِ جوشؔ سے لغزش ہوئی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں مولانا سیمابؔ اس غلط جواب کا غلط جواب بجواب دے گئے ہیں۔ "اخلاق" کو "سماجی اخلاق" SOCIAL MANNERS اور "کردار" کو "اطوار" کے معنی میں سمجھکر اگر بحث کی گئی ہے تو یہ لغزش کسی قدر ہلکی کہی جا سکتی ہے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ جوشؔ و سیمابؔ دونوں حضرات اُردو کے کہنہ مشق شاعر و ادیب ہیں وہ "مراسم تہذیب" کو (یہ ہیں دراصل اضافی) اخلاق و کردار کے معنی میں استعمال نہیں فرما سکتے۔ جب انھوں نے "اخلاق و کردار" الفاظ استعمال کئے ہیں تو انکا مفہوم یقیناً ETHICH AND CONDUCT ہے جو ہرگز اضافی نہیں بلکہ طلقی ہیں میں حیران ہوں کہ یہ ہر دو بزرگ اخلاق و کردار کو اضافی کس طرح کہتے ہیں جبکہ فلسفہ کا مجھ جیسا ناچیز طالب علم اُن کو طبعی و خلقی جانتا ہے اور جسکی تائید دنیا کے تمام معروف فلاسفروں نے کی ہے۔ جان۔ ایس میکینزی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ لٹ ڈی کی کتاب سے جو اخلاقیات کی تعریف کی ہے وہ ملاحظہ فرمائیے۔

"Ethics conseders the activities of human beings with reference to their "rightness and wrongness it discusses man's habits, in other words his conduct and principles on which he habitually act."

"اخلاقیات کا تعلق بنی نوع انسان کے عمل نکوکاری و غلط کاری سے ہے وہ آدمی کی عادتوں (Habits کا مفہوم دراصل طبعی خواص سے ادا ہوتا ہے) سے بحث کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اُن کردار و اصول سے وہ متعلق ہے جنکا انسان طبعاً عامل ہے"

اب Conduct کیا چیز ہے اسکو کینٹ نے Will (نیت) اور Desire (خواہش) سے مرکب بتایا ہے۔ لیکن اب بھی یہ امر محلِ نظر رہ جاتا ہے کہ کردار (Conduct) اضافی ہے یا طبعی تو اسکا جواب Methew Arnold (میتھو آرنلڈ) یہ دیتا ہے

"Conduct is three fourth of life"

"کردار تین چوتھائی زندگی ہے" اور جان میکینزی نے تو اسکو پوری Life (حیات) مانا ہے کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ اخلاق و کردار اضافی چیز ہے؟ یہ تو تمام کی تمام حیات ہے اور حیات ہرگز اضافی نہیں۔

اسی غلط رو میں مولانا سیمابؔ بھی اسکو "اضافی عوامل" فرما گئے ہیں۔ کردار و اخلاق عامل نہیں بلکہ ودیعت ہیں۔ اگر یہ دونوں الفاظ اِن صاحبان نے غلط استعمال کئے ہیں تو اسکے وہ ذمہ دار ہیں۔

بہت طویل بحث ہے جس سے خطرہ ہے کہ مبحث سے کہیں دُور نہ ہو جاؤں اس لئے اسکو یہیں ختم کرتا ہوں۔ واضح رہے کہ کردار و اخلاق نہ صرف اضافی ہی نہیں ہیں بلکہ یہ وجدانی شئے بھی نہیں ہے۔ بیشک حالات و وجدان بدل جاتے ہیں مگر ان کے سریان کی رو میں اخلاق کا بدلنا ناممکن ہے اور اسکے ساتھ ہی نکوکاری و بدکاری کہئے، خوب و زشت کہئے یا بُرائی بھلائی کہئے اپنے فلسفیانہ تجزیہ کے ساتھ فعال کے کرکٹر میں ہمیشہ یکساں رہینگی۔ یہاں سے نکوکاری و بدکاری کی بحث چھڑ جاتی ہے جسکو چاہتا ہوں کہ اسی نشست میں ختم کر دوں مگر ترقی پسند ادب پر کچھ لکھنے سے رہ جاؤنگا۔

یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند ادب نے جسقدر جنسیات کو رنگ دیا ہے اسقدر کسی دوسرے موضوع پر توجہ صرف نہیں کی ہے وہ ایک بدکار کی بوعین یک لخت سناؤ برد تباہ کرنے والے کے گناہ کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ مزدور عورتوں کی کارخانہ داروں کے ہاتھوں عصمت دری کا نوحہ کرتا ہے، وہ ایک جوان عورت کی بنجالی تلذذ کیلئے اپنی جنسی آگ کے بجھنے کو تقاضائے بشریت بتا کر اسے معصوم گردانے کی تلقین کرتا ہے

وہ مزدور کی اجیرن زندگی پر خون کے آنسو بہاتا ہے اور سرمایہ دار کی خود غرضانہ ذہنیت پر ہتھوڑا اٹھاتا ہے، غرض وہ فطرت و مظلومیت پر آتشیں مضامین لکھتا ہے لیکن کبھی اُس نے اس پر بھی غور کیا کہ اسکا یہ اقدام محمود انسانیت کو کتنی ٹکڑیوں میں تقسیم کر رہا ہے؟ وہ چپکے چپکے آدمی کو آدمی کا دشمن بنا رہا ہے اور اس ہیجان، کشاکش، رستخیز اور دشمن آباد فضا سے پھر بھی ایک جہانِ نو پیدا کرنے کی توقعِ باطل کی پرورش کر رہا ہے کیا اُس نے مسٹر فورڈ (دنیا کا متمول ترین انسان) کی محرومی غذا (یہ غریب ایک بسکٹ بھی ہضم نہیں کر سکتا ہے) کا بھی کبھی خیال کیا. کیا ترقی پسند ادب نے کسی سیٹھ کی مرضی کے خلاف تقسیم املاک کے پیدا کردہ آلام کا بھی اندازہ لگایا، کیا اُس نے کسی باحیا، عفیف دوشیزہ کے خاموش جذبات پر بھی کان دھرے. کیا اُس نے کبھی جابر ماسٹروں، سخت گیر آقاؤں، تشدد پسند پروفیسروں پر بھی تبرّہ کیا؟ کیا اُس نے حریص و مغرور ڈاکٹروں اور حکیموں کی بھی خبر لی اور کیا اُس نے اس زمانہ کے ملتی و احتکار کے مجرموں سے بھی اجناس اگلوائیں؟ محض نیچے طبقے کی چند عورتوں کو جنسی بھوک کا سہل تحصیل نوالہ عریانی کے پورے کمال سے بنا دینا ادب میں ترقی نہیں ہے. آلاتِ جراحی کے فقدان کے باوجود مزدور کی قانع زندگی میں ایک پھوڑا پیدا کر دینا تو ادب کا ترقی کی طرف قدم اٹھانا نہیں ہے. ادب کیا ہے؟ عام انسانیت کی چیخ کو سننے والا گوشِ شنوا جو بلا امتیاز طبقات تمام انسانوں کے دلوں کی دھڑکنیں سُنتے. اگر آپ نے ایک جلاد کے دل پر بھی ٹھنڈا، ملائم ملائم سکون بخش ہاتھ رکھ دیا تو یہ ادب ہے. ناممکن ہے کہ جلاد کا بے جو سفاکی اسطرح ادب کے قدموں پر نہ آ جائے. ادب ایک تادیب پسند شفیق باپ ہے جسکے تیور پر خشم ہیں لیکن دل میں پیار ہی پیار بھرا ہوا ہے. کیا ترقی پسند ادب محدود جماعت کی جانبداری سے عام حمایت کا بوسہ اپنی پیشانی پر پا سکتا ہے؟ اگر وہ جماعتوں میں انتشار پیدا کرتا ہے تو وہ ادب نہیں ہے بغاوت ہے، اگر وہ انسانی محبت کی شمع کو گل کرنے اٹھتا ہے تو وہ ادب نہیں ہے شر ہے. اگر وہ بھائی چارے کو مٹانے کو اٹھتا ہے تو وہ ادب نہیں ہے فتنہ ہے. اگر وہ عصمت و طہارت کی بستیوں میں عریانی و فحش کی سڑاندھ پھیلانے کو نکلتا ہے تو وہ ادب نہیں ہے سنڈاس ہے.

جوش صاحب کے دوسرے اعتراض کے جواب اور سیماب صاحب کے جوابُ الجواب سے میں بھی متفق ہوں بلکہ جناب جوش سے زیادہ اتفاق کرتا ہوں. الفاظ کا تصرف و اضافہ سیماب صاحب علمی و لسانی حیثیت سے کس طرح فرمائینگے. موصوف کے پاس اسکا کیا معیار ہے. اگر تصرف و اضافہ کو جمہور تسلیم کرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ورنہ زبان کو یو۔پی، پنجاب و حیدرآباد کا ہمیشہ دست نگر رکھنا اس کے لئے سودمند نہیں حیدرآباد میں بہت سے جدید الفاظ وضع ہو چکے ہیں جو ہماری حمایت کے مستحق ہونے چاہئیں.

تیسرے اعتراض پر پھر یہ دونوں بزرگ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں. اعتراض یہ ہے کہ ترقی پسند ادب فواحش کی اشاعت کر رہا ہے. اس کے جواب میں جوش صاحب کا ارشاد ہے کہ تمہارے ہاں بھی تو اسی قسم کے فواحش موجود ہیں. مولانا سیماب نے جواباً فرمایا ہاں ہیں تو مگر آپ اُن کو درخورِ اعتنا نہ سمجھئے. ان دونوں حضرات کے جواب اور جواب الجواب کو اگر اپنی جانب سے ایک چھوٹے سے مکالمہ میں درج کر دوں تو شاید یہ مسئلہ کچھ حل ہو جائیگا. سُنئے حضرتِ جوش اور مولانا سیماب کی کہیں ملاقات ہوئی ہے. جوش صاحب سیماب صاحب سے دکھ بھرے لہجہ میں کہتے ہیں:-

"مولانا! ان تنگ نظر و کور چشم لوگوں کو کیا کہوں، کمبخت میرے لباس کو میلا بتلاتے ہیں"۔

"حضرت آپ کا لباس ہے تو میلا اس میں شک نہیں" سیماب صاحب جواب دیتے ہیں.

"اچھا یہ بات ہے! تو معاف کیجئے ذرا اپنے کپڑے بھی تو دیکھئے کس قدر کثیف ہیں" جوش صاحب کہتے ہیں.

"میرے! نہیں تو ایسے زیادہ کثیف نہیں ہیں" سیماب صاحب گھبرا کر فرماتے ہیں.

"جی؟ یقیناً آپ کا لباس صاف نہیں ہے اور یہ جو آپ کے ہاتھ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں ہیں (قدما کے دواوین) انکے اندر سے بھی کسقدر میلے کپڑے جھانک رہے ہیں"۔

"ارے یہ؟ اوہ یہ؟" سیماب صاحب چند گٹھڑیاں پھینک کر فرماتے ہیں.

"یقین مانئے میں آئندہ انکے ہاتھ بھی نہیں لگاؤنگا. میں نے تو ان کو اب تک قدما کا ورثہ سمجھ کر اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا"۔

اس کے بعد یہ دونوں بزرگ جدا ہو جاتے ہیں

مولانا سیماب نے یہاں پھر جوش صاحب کا غلط (یا الزامی) جواب سُنا اور اُسکی پذیرائی کرتے ہوئے اسکا جواب دے گئے. موصوف کو کہنا یہ لازم تھا کہ جناب جوش میرا لباس [illegible] گٹھڑیاں ہزار کثیف سہی مگر بندہ نواز آپ کے

جدت پسند نفیس جسم پر یہ میلا لباس کیوں؟ ارے صاحب آپ تو ترقی پسند ہیں۔ آپ کو تو پرانی قطع و برید کے گندے لباس کو دفن کر دینا لازم تھا۔ آپ نے اپنے پیشرو کی کثافت کو کیوں اختیار کیا۔ یہ اگر ہمارا لباس تھا اسکو ہمارے لئے چھوڑ دیتے۔ ایک ترقی پسند ادیب کے کپڑے تو سفید براق ہونے چاہئیں۔ اسکے جسم سے تو خوشبو کی لپٹیں آنی چاہئیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے جسم و لباس سے اسی تعفن کے بھبکے اُٹھ رہے ہیں جو آپکے خیال میں ان گتھڑوں والے لباس کی متاع ہے۔

کیا جوش صاحب اس ثانی اعتراض کا جواب دے کر خود بھی مطمئن ہیں؟ میں موصوف ہی سے دریافت کرتا ہوں۔ آپ نے شیخ سعدیؔ۔ علی حزیں۔ ولی۔ سودا۔ غالب۔ انشا۔ داغ وغیرہ وغیرہ کے کلام کی رکاکت کی جانب اشارہ کرکے اپنے نام کے تمام ترقی پسند ادب کو گنگ شاستر تسلیم کر لیا ہے۔ مولانا سیماب کو تو اسکے جواب میں اتنی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہ تھی

اسکے بعد کا جتنا جواب الجواب ہے میں سیماب صاحب سے متفق ہوں اور موصوف نے ان سب پر پوری روشنی ڈالدی ہے اور معقول جواب دیا ہے۔

ترقی پسند ادب کا اسکوپ دراصل بہت وسیع ہونا چاہئے اگر ہمارے ترقی پسند ادبا نے نہ صرف اسکو ژولیدہ بنا دیا ہے بلکہ بہت محدود کر دیا ہے ان کے ادب کی جان محض اشتراکیت ہو کر رہ گئی ہے۔ اوّل تو اشتراکیت کی وسعت ہی محل نظر ہے اور اس جنگ نے اسکو بھینچ کر اب تو اتنا تنگ کر دیا ہے کہ وہ اپنی دہلیز کے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ اسکے اندر سے بین الاقوامیت کو خارج کر دیا جا چکا ہے۔

اشتراکیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میرے ضعیف قلم سے بھی "نظامِ عالمگیر" کے نام سے ایک کتاب زیر طبع ہے جسکی روح پچھلے ہفتے کے موقر اخبار "مسلمان" لاہور میں آ چکی ہے۔ اس لئے اب اشتراکیت پر زیادہ لے دے کرنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ صرف اتنا سمجھ لیجئے۔ کہ یہ تحریک (میری مراد کاول مارکس کی تحریک سے ہے) محض تصوری ہے۔ جب بھی اس نے پریکٹس کی طرف سے قدم بڑھایا غیر ممکن العمل و ناسازگار ارکان کی وجہ سے چند قدم سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسکے برعکس اسلام پر عمل ہے۔ اُس نے کئی سال تک عمل کی کسوٹی پر چڑھکر اپنے تمام و کامل ارکان کو کندن

ثابت کر دیا۔ اگر مجوسیت کی نظر اسکو نہ لگ گئی ہوتی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ پوری آب و تاب سے رشد طلب دنیا کی تیرگی کو مٹاتا رہتا۔

ترقی پسند ادب مجھے بتائے کہ اُس نے اپنے اندمال اثر دم سے کتنے اجتماعی امراض کا خاتمہ کیا، کس حد تک عام مساوات کی داغ بیل ڈالی۔ دو سروں کی خاطر کتنے اپنے عزیز اقارب کٹوائے۔ کتنے فحش کاروں کی پیشانیوں کو عرق ندامت و انفعال سے نمناک کیا اگر اسکے جواب میں یہ کہا جائے کہ یہ ادیب کا فعل نہیں ہے کہ اپنی کارکردگی کے نتائج کی مساحت کرتا پھرے تو بلند ہی بتا دیجئے کہ خود اپنے اندر کس قدر غیرتِ نفس، شریف النفسی، خود اعتمادی و خودداری پیدا کرنے میں ترقی پسند ادیب کامیاب ہوا ہے۔

ترقی پسند ادب نے اب تک صرف یہی تو کیا ہے کہ وہ ہر قدیم اصولِ مسلمہ کی جڑیں ہلا دینے کے لئے آگے بڑھا ہے۔ وہ دُنیا کی تعمیر نو چاہتا ہے لیکن اُس کو اس سے غرض نہیں کہ خشتِ اوّل کی کجی کا عمارت پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ تقلید عامہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے، وہ دیرینہ نظریات سے بغاوت کی تلقین کرتا ہے تاکہ اسکو اپنے قوانین کے استقرار میں سہولت ہو، تاکہ وہ ایک ہیجانی عالم پیدا کرکے انسان میں ایک حرصِ ابدی پیدا کر دے، ہر وقت ہنگامہ بپا رہے۔ اسکے خیال میں سکون پیش خیمہ ہے جمود کا اس لئے مکر، ہلڑ، انتشار، افتراق، دہشت، کشت و خون اور ایک عام سنسنی سے ہر وقت دار و گیر کی فضا قائم رہے یہاں تک کہ بقائے صلح کا قانون سب جگہ پھیل جائے کیا یہ ادب ہے؟ کیا یہی ادب کا فرض ہے۔ اسکا جواب سوئیل یہ دیتا ہے:—

"ادب دل کا سکون، روح کا قرار اور ایک عام پیار ہے"

کتنا اچھا ہو اور کیسی دل کے گوشے سے نکلی ہوئی تمنا ہے کہ ترقی پسند ادب اپنے کفریات، تو بیخ فواحش اور ایک عام الجھاؤ کے بدنما داغ کو اپنی وسعت میں سمیٹ کر جھاڑ کر پھینکدے اور انسان کے اسی ماؤف حصۂ جسم پر انگلی رکھے جہاں درد ہو، درد میں ٹیس اور کچوکے دینے کو نہیں بلکہ راحت پہنچانے کو اور کاش جوش جیسا قادر الکلام، جادو بیان و آتش نوا شاعر اس مقدس مشن کی تکمیل کردے جسکی ہمارے زمانے سے ذرا قبل حالی نے ابتدا کی تھی اور اقبال نے اس میں جان ڈالی تھی۔ جوش کے ہاتھوں اسے کاش وہ مکمل ہوتا۔ کیا اچھا ہوتا کہ سحر کار جوش کے ہاتھ سے یہ ایمان سوز شرارے نہ نکلتے:—

"بارگاہِ ایزدی میں ایک اشتراکی بندہ کا شورہ" وہ مشورہ یہ ہے:—

سعدی، علی حزیں۔ ولی۔ سودا۔ غالب۔ انشا۔ داغ کا کلام ترقی پسند ادب کے ذیل میں کہاں آ سکتا ہے؟ (ایڈیٹر)

دامنِ تر کو بنا حائل برق و آتش | کہ نکلتی نہیں اب جامۂ احرام سے آگ
نہ رہا کوثر و تسنیم کے چھینٹوں میں اثر | اب دل و جاں میں لگا بادۂ گلفام سے آگ
آج اُسے کفر کے جھونکوں سے فروزاں کردو | کل لگائی تھی کلیجوں میں جو اسلام نے آگ

کاش جوش کا قلم اِس قسم کی دادخواہ اور دادطلب قسم کی شاعری کے لئے وقف نہ ہوتا بلکہ اسکے ہونٹ کپکپاتے اور یہ منظوم جملے اُن سے نکلتے ؎

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست | بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

یا بکمال رقت و سوز اسکی زباں پر یہ مناجات ہوتی ؎

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے | جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

یا وہ کلمۂ توحید کی یوں تبلیغ کرتا ؎

تا عصائے لا الٰہ داری بدست | ہر طلسم خوف را خواہی شکست
خوف را در سینۂ او راہ نیست | خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

مسلم قوم کے برف سے زیادہ سرد جمود کو جوش صاحب کی آتش نوائی پگھلا سکتی ہے۔ وقت ہے کہ وہ اپنی قوم پر احسان فرمائیں ہر ذی ہوش اور درد مند شاعر اپنے رنگ کو ترک کرکے قوم کو زندگی کی گھونٹیں پلا رہا ہے۔ کیا آپ کو اپنی قوم سے ذرا محبت نہیں، کیا آپ کو اسکی عظمتِ رفتہ کا مطلق پاس نہیں۔ ادب وہی زندہ رہتا ہے جو خود زندگی کا حامل ہو کیا خوب کہا ہے کسی انگریز مفکر نے ؎

Literature that does not last is journalism and journalism that losts is literature.

(جو ادب زندہ نہ رہے وہ محض صحافت ہے اور جو صحافت زندہ رہ جائے وہ ادب ہے۔) جوش صاحب کا ادب زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ صحافت نگاری سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اقبال کی صحافت زندہ ہے اس لئے وہ ادب ہے۔

قیسی رامپوری

اس مضمون میں بعض الفاظ کے مفہوم و معنی اور بعض دوسری باتوں میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُسے زائل کر دوں۔ قیسی صاحب نے جوش صاحب کے دو الفاظ "اخلاق و کردار" کے محلِ استعمال پر اعتراض کیا ہے

اخلاق ۔ خلق کی جمع ہے۔ اور خلق کے معنی متداول لغات میں یہ ہیں۔

"بالضم و بضمتین۔ خوئے و عادت و مروت۔ واکثر اطلاق آں بدون قید برنیک آید۔ وگاہے بقید بد در کہ بمعنی خوئے بد آید (غیاث) وہ علم جس میں تہذیبِ نفس اور معاد و معاش وغیرہ کی بحث ہے (فیروز)

بضم۔ خوئے و عادت و مروت و دین۔ (منتخب) خو، عادت، خصلت خوش مزاجی (فیروز) عادت۔ مروت۔ سبھاؤ (فرہنگ عامرہ)

کردار ۔ فارسی لفظ ہے اسکے لغوی معنی یہ ہیں:—

بالکسر۔ طرز و روش۔ (غیاث) کار و عمل و فعل (جہانگیری و برہان) طرز، طریق، قاعدہ، شغل، کام۔ خصلت (فیروز) اس تصریح سے معلوم ہوا کہ اخلاق، کو ساجی اخلاق، اور کردار کو "اطوار" کے معنی میں سمجھا نہیں گیا ہے بلکہ حقیقتاً اخلاق و کردار کے معنی ہی "عادت و اطوار" ہیں۔

اب ان دونوں الفاظ کے انگریزی معنی سنئے:—

اخلاق۔ manners, disposition, virtues, morality,

کردار۔ Action, Labour, art.

یہ معنی بھی مندرجہ بالا معانی سے ہم آہنگ ہیں مگر ان کا مفہوم Ethics اور Conduct سے پورا نہیں ہوتا Ethics علم اخلاق اور اصولِ اخلاق کا نام ہے اور Conduct چال چلن۔ سلوک اور رہنمائی کو کہتے ہیں۔

جب "اخلاق و کردار" کے معنی "عادت و اطوار" مسلّم ہیں تو قیسی صاحب کا یہ کہنا کہ یہ اضافی نہیں بلکہ خلقی ہیں اور ان کا بدلنا ناممکن ہے۔ کسقدر غلط ثابت ہوتا ہے۔ "عادت و اطوار" یا "اخلاق و کردار" بنائے جاتے ہیں۔ بدیہی و فطری نہیں ہوتے۔ اگر اخلاق کی تعمیر و تشکیل ناممکن ہوتی تو مخبرِ صادق کا سب سے بڑا فلاسفر اور انسانِ کامل جسکے سامنے کسی مغربی فلاسفر کو ترجیح نہیں دی جا سکتی، یوں ارشاد نہ فرماتا کہ ؎

"تخلقوا باخلاق اللہ"

اس ارشاد ہی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اخلاق اکتسابی ہیں۔ بنائے جاتے ہیں اور اُن کا اچھا یا بُرا بنانا انسان کے اختیار میں ہے۔ یعنی اُن میں ہر گونہ تبدیلی کا امکان ہے۔

قیسی صاحب کے ذہن میں ان الفاظ کے مطالعہ کے وقت غالباً فطرت یا

NATURE تھی۔ اسی لئے وہ ان کے اضافی ہونے سے منکر ہوئے فطرت البتہ نہیں بدلتی۔ "پہاڑ اپنی جگہ سے منتقل ہو سکتا ہے مگر فطرتِ انسانی تغیر پذیر نہیں ہو سکتی"۔ یہ بھی کسی فلسفی اعظم کا قول ہے۔ لیکن کہاں انسانی فطرت اور کہاں انسانی اخلاق و کردار؟ ——— اخلاق بنائے جاتے ہیں۔ کردار معین کئے جاتے ہیں اس لئے دونوں اضافی ہیں اور دونوں میں امکانِ ترمیم ہے۔

اخلاق یعنی عادتیں اچھی اور بری دونوں قسم کی ہوتی ہیں۔ اسی لئے لوگوں کو "خوش اخلاق" اور "بد اخلاق" کہا جاتا ہے۔ ایک خوش اخلاق شخص بد اخلاق ہو سکتا ہے اور ایک بد اخلاق، خوش اخلاق بن سکتا ہے۔ اسی طرح "انسانی کردار" بھی بدلتا رہتا ہے۔ آج قیسی صاحب اپنے معاشی احوال کی وجہ سے "بابو" اور "کلرک" کہلاتے ہیں۔ اگر وہ کل "کلکٹر" ہو جائیں تو اُن کے کردار کے ساتھ اُن کا یہ امتیاز بدل جائیگا اور سب انھیں "کلکٹر" کہنے لگیں گے پھر اگر وہ صرف "ادیب" ہو جائیں تو اُن کا کردار پھر بدل جائیگا اور کوئی انھیں کلکٹر نہ کہے گا۔ سب ادیب کہنے لگیں گے وقس علیٰ ھذا۔

اب قیسی صاحب تسلیم کرینگے کہ انسانی اخلاق و کردار محض اضافی ہوا کرتے ہیں۔ ودیعت نہیں ہیں۔ ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور ہمیشہ بدلتے رہیں گے۔

قیسی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ جوش صاحب کا جواب نہ تو عامیانہ ستر پوشی ہے نہ اُس میں کسی چابکدستی سے کام لیا گیا ہے اور نہ کہیں تغابن ہے بلکہ جوش صاحب نے ہر اعتراض کا جواب اپنی ذہنی دیانت داری کے ساتھ دیا ہے اور جس طرح اُن کے کسی اعتراض کا پیرایہ غلط نہیں ہے اسی طرح میرے جواب کا انداز بھی غلط نہیں۔ صحیح اور غلط کا اندازہ لگانے میں قیسی صاحب سے خود غلطی ہوئی ہے اور اس کے وہ خود ذمہ دار ہیں اپنے بزرگوں پر اعتراض کرنے سے پہلے معترضین کو اپنے مبلغ علم و عقل کا جائزہ لے لینا چاہئے۔

قیسی صاحب پوچھتے ہیں کہ "الفاظ کا تعرف و اضافہ سیماب صاحب علمی و لسانی حیثیت سے کس طرح فرمائیں گے؟ موصوف کے پاس اس کا کیا معیار ہے؟" ("الفاظ میں تعرف و اضافہ ہونا چاہئے") جواباً گزارش ہے کہ تعرف و اضافہ کی بحث زبان کے ساتھ تھی نہ کہ الفاظ کے ساتھ۔ پھر الفاظ کا تعرف و اضافہ کیا معنی؟ میں نے عرض کیا تھا کہ جو تعرف و اضافہ ہو وہ علمی اور لسانی حیثیت سے غلط نہ ہو۔ اسکی مثال بھی دیدی تھی، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قیسی صاحب کا سوال کیا معنی رکھتا ہے؟ تعرف و اضافہ کا معیار "علمی و لسانی حیثیت" کہنے کے بعد علم و لسان ہی کو سمجھ لینا چاہئے تھا۔ اور معیار کیا ہوگا؟

قیسی صاحب نے "قدامت پسندی" پر جو مختصر مکالمہ لکھا ہے وہ نہایت سُوفیانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ میں مکالمہ کا جواب مکالمہ سے دے کر جواب مضمون کو گھناونا بنانا نہیں چاہتا۔ لیکن قیسی صاحب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ قدیم موضوعاتِ شاعری کا ترک سب سے پہلے میں نے کیا ہے۔ جو کثافت اور میل انھیں نظر آ رہی ہے وہ صرف اُن کی تنگ نگاہی اور کم نظری کی کثافت اور میل ہے وہ بہ امعانِ نظر میرے تمام کلام کے مطالعہ کی زحمت اُٹھائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ سیماب نے قدما کے علی الرغم اُردو شاعری میں کتنے جدید انقلاب پیدا کر دیئے ہیں۔ نظم تو نظم غزل میں بھی میں نے اسقدر موضوعاتی تبدیلیاں کر دی ہیں کہ غزل اپنے درجۂ معین سے بلند تر، اور غزل سے ماورا کوئی اور چیز معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں مجھے بہ افسوس یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ وہ معترض جو حضرتِ جوش کے کلام میں آرزوئے مسلکِ شبیرؑ، مناجات، زندہ تمنائی، اور تبلیغ توحید دیکھنا چاہتا ہے خود "ادب اُردو" کی بحث میں مغربی فلاسفروں میکنزی، کینٹ اور آرنلڈ کی الکش کا رہینِ منت اور مقلد نظر آتا ہے اور اُسے مثال دینے کے لئے مفکرینِ مشرق کے اقوال بھی نہیں مل سکتے۔ یہی وہ "مغرب زدگی" ہے جسکا الزام "نئے ادب" پر ہے۔ اور جسکا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے نوجوان مضمون نگاروں کو عربی اور فارسی الفاظ کے معنی و مفہوم میں بھی مغالطے ہو رہے ہیں۔ فتدبّر۔

سیماب

رُباعی

تمہیں امداد کی اُمید ہے کرسی نشینوں سے
طلب کرتے ہو پانی پتھروں کے خشک سینوں سے
تمہارا کام چل سکتا نہیں ہے ایسے طوفاں میں
اپاہج ناخداؤں اور بوسیدہ سفینوں سے

حجاز فیروز آبادی (از جودھپور)

"اُس" کے نام

مری آرزوؤں کی حسرتیں تری حسرتوں پہ نثار ہوں
مری روز و شب کی یہ خلوتیں تری جلوتوں پہ نثار ہوں
یہ مرے خیال کی پستیاں تری عظمتوں پہ نثار ہوں

خلشِ انتظار کی دیدنی ہو اگر تو تجھ کو دکھاؤں میں
مرے دل پہ بیت رہی ہے جو کبھی سن سکے تو سناؤں میں

ترا عہدِ طفلی و سادگی قلمِ ازل کا کمال تھا
ترے خدّ و خال کے زاویوں میں محبت کا جال تھا
نہ ابھی مذاقِ نظر ہی تھا نہ تجھے کسی کا خیال تھا

مرے اختیار میں ہو اگر تو تجھے وہ وقت دکھاؤں میں
مرے دل پہ بیت رہی ہے جو کبھی سن سکے تو سناؤں میں

تری زہد پاش اداؤں نے مرے دل میں حشر اٹھا دیا
تری مست مست نگاہ نے مجھے اور مست بنا دیا
مجھے دے کے درس پریم کا مرے دل کا سوز بڑھا دیا

تو کہے تو پریم بھرے وہ گیت زبانِ عشق پہ لاؤں میں؟
مرے دل پہ بیت رہی ہے جو کبھی سن سکے تو سناؤں میں

وہ شریعِ عالمِ عشق کی کبھی وارداتیں تو یاد کر
وہ ہی ذوق و شوق کی کر سکے کبھی بازآتیں تو یاد کر
تو جو کہتی تھی کہ "نہ بھولوں گی" ذرا اپنی باتیں تو یاد کر

مجھے تو نے دل سے بھلا دیا، تجھے کیوں نہ دل سے بھلاؤں میں؟
مرے دل پہ بیت رہی ہے جو کبھی سن سکے تو سناؤں میں

ترے غم میں "حاصلِ زندگی" نہ سکون ہے نہ قرار ہے
مرے دل میں تیری ہی یاد ہے ترے عشق ہی کا خمار ہے
میں نہ اس کو پہلے سمجھ سکا ترا دو ہی دن کا یہ پیار ہے

مرے اختیار میں ہو اگر، تو تجھے بھی خوب جلاؤں میں
مرے دل پہ بیت رہی ہے جو کبھی سن سکے تو سناؤں میں

ترا رنگ روپ بلا کا تھا، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
میں شکار تیری ادا کا تھا، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ترا عہد مجھ سے وفا کا تھا، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ترے عہدِ "ماضی" کے راگ پھر کبھی سازِ حال پہ گاؤں میں
مرے دل پہ بیت رہی ہے جو کبھی سن سکے تو سناؤں میں

[illegible] البخاری

ریڈیائی تمثیل :-

حرم سرا

شاپور۔ (آہستہ سے، رُک رُک کر) فردوس ـــــ اے فردوس!
اٹھو فردوس۔

(کسمسانے، ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹیں پھر لمبی لمبی سانسیں)

فردوس۔ (سہمی ہوئی آواز) کون؟

شاپور۔ گھبرا گئیں، میں ہوں۔

فردوس۔ تم۔؟ شاپور،

شاپور۔ ہاں! ہاں!! میں ہوں

فردوس۔ تم یہاں کیسے آئے؟

شاپور۔ یہ بھی بتا دوں؟ کمند لگا کر، اس دریچے سے، ملنا جو تھا۔

فردوس جانتے ہو تم اسوقت کہاں ہو۔

شاپور۔ ملکۂ عالم کے حضور میں۔

فردوس۔ اچھا اب تم جاؤ۔

شاپور۔ (حیرت سے) فردوس۔

فردوس۔ ہاں ہاں تم یہاں سے چلے جاؤ ـــــ (عاجز ہو کر) جانے کیوں نہیں؟ کیا مجھے تباہ کرنے پر تلے ہو؟

شاپور۔ میں اور تمہیں تباہ کر دوں، کبھی اس پر غور بھی کیا؟ ذرا میری طرف دیکھو ـــــ دیکھتی کیوں نہیں؟

فردوس۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

شاپور۔ شاید کچھ بدصورت ہو گیا ہوں۔

فردوس۔ کیسی باتیں کر رہے ہو شاپور۔

شاپور۔ اچھا اب میں جا رہا ہوں۔ معاف کرنا فردوس تمہیں بہت تکلیف پہونچائی۔ قبائل نے ادہر پھر سر اُٹھایا ہے اب کی آکی سرکوبی کو میں جا رہا ہوں یہ مہم میرے سپرد کی گئی ہے۔ کل چلا جاؤنگا۔ تم سے ملنے کو جی چاہتا تھا مل لیا۔ ارمان پورا ہو گیا۔

(قدموں کی چاپ آئی۔ غم آگیں نغموں کی آوازیں اُبھریں)

فردوس۔ جا رہے ہو شاپور۔

شاپور۔ کہیں تمہیں تباہ نہ کر دوں۔

فردوس۔ یہ تم کہہ رہے ہو؟ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہو۔

شاپور۔ شاید۔

فردوس، کیا صرف جلانے کے لئے آئے تھے۔

شاپور۔ کاش میں ایسا کر سکتا۔

فردوس۔ تم بھی مجھ سے ناراض ہو گئے (بھرائی ہوئی آواز) اچھا ـــــ!؟

(لحظہ بھر سکوت)

شاپور۔ (آہستہ آہستہ چلکر نزدیک آتے ہوئے) تم سے تو میں ناراض ہی نہیں ہو سکتا فردوس۔

فردوس۔ شاید

شاپور۔ نہیں فردوس مجھے اب جانے دو، یہ شاہی محل ہے میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں

فردوس۔ واہ تو غنیمت ہوا، آج میں نے سب کنیزوں کو ہٹا دیا تھا۔ صبح ہی سے طبیعت کچھ سست تھی۔ اُکتا جاؤں، جاؤں میں تو اور بھی دم گھٹتا ہے۔

شاپور۔ شہنشاہ، شکار سے کب تک لوٹیں گے؟

فردوس۔ کئی روز میں آئینگے، کل ہی تو گئے ہیں۔

شاپور۔ تم یہاں اچھی طرح ہو فردوس؟

فردوس۔ بہت!! مجھے یہاں تکلیف ہی کس بات کی ہو سکتی ہے۔ چھوٹے سے بڑے تک سب پر میرا حکم چلتا ہے اور وں کا کیا ذکر، خود شہنشاہ ہر وقت میری نظریں دیکھتے رہتے ہیں، ادہر میری زبان سے کچھ نکلا اور ادہر فرمائش پوری ہوئی۔ وہ تو ہر وقت اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ میں ان سے اپنی کوئی خواہش ظاہر کر دوں۔ تم نہیں جانتے شاپور وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ جلا بتاؤ مجھے اب کیا چاہئے۔

شاپور۔ پھر تمہاری یہ حالت کیوں ہے؟ پیلا ہلدی سا رنگ جیسے برسوں کی

بیمار ہو

فردوس۔ ادہر میری طبیعت ہی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

شاپور۔ طبیعت کیوں نہیں ٹھیک رہتی

فردوس۔ میں کیا بتاؤں؟

شاپور۔ (سرد آہ) دُنیا نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

فردوس۔ میری ایک بات مانو گے؟

شاپور۔ میں نے انکار ہی کب کیا۔

فردوس۔ تو تم اس مہم پر نہ جاؤ۔

شاپور۔ کیوں؟ شہنشاہ کے حکم کی میں کیسے حکم عدولی کر سکتا ہوں۔ پھر انہوں نے اتنے بڑے سرداروں کے ہوتے ہوئے اسقدر ذمہ داری مجھ کو دی ہے۔

فردوس۔ اُف! تمہیں تو کچھ بھی پتہ نہیں۔

شاپور۔ کس بات کا؟

فردوس۔ یہی کہ آخر شہنشاہ نے تمہارا ہی انتخاب کیوں کیا؟ اور بھی تو لوگ موجود تھے۔

شاپور۔ یہ اُنکی عزّت افزائی ہے۔

فردوس۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ بادشاہ سلامت تم سے خوش نہیں۔

شاپور۔ ہاں! یہ میں غور کر چکا ہوں

فردوس۔ آخر یہ کیوں؟

شاپور۔ یہ کیوں؟ (ذرا رُک کر) میں تم سے محبت جو کرتا ہوں؟ مگر انھیں اسکی کیا خبر

فردوس۔ انھیں سب کچھ خبر ہے۔

شاپور۔ (گھبرا کر) انھیں معلوم ہے۔

فردوس۔ ہاں!

شاپور۔ تو پھر

فردوس۔ تم اس مہم پر نہ جاؤ

شاپور۔ اب تو میں مجبور ہوں

فردوس۔ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ اچھا ہوا تم آگئے ورنہ میں تو تمہیں خود ہی اطلاع بھجوانے والی تھی۔

شاپور۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟

(پردہ سرکنے کی سرسراہٹ، قدموں کی چاپ)

کنیز۔ ملکۂ عالم

فردوس۔ کون؟ سارہ (گھبرا کر) یہ۔ یہ۔ شاپور۔

کنیز۔ مجھے سب کچھ پتہ ہے۔

فردوس۔ تم بہت گھبرائی ہوئی ہو۔ خیر تو ہے۔

کنیز۔ غضب ہو گیا ملکۂ عالم۔ عالیجاہ، شکار سے واپس لوٹ آئے۔ آپ کے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ کنیز کا دل نہ مانا اپنی جان پر کھیل کر چلی آئی۔

فردوس۔ اچھا تم جاؤ

(قدموں کی آواز آتی ہے)

شاپور۔ میں جا رہا ہوں۔

فردوس۔ اچھا! دیکھو وہاں نہ جانا

(قدموں کی چاپ)

شاپور۔ کوشش کرونگا۔

فردوس۔ رُک کیوں گئے؟

شاپور دریچے کے نیچے سپاہی کھڑے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔

فردوس۔ (رک کر)۔ اچھا میرے ہمراہ آؤ۔

خواجہ سرا۔ (دُور سے) گلشن۔ اری سنبل۔ او سوسن کمبختو عالیجاہ تشریف لا رہے ہیں۔

(گھنگھرو کی جھنجھناہٹیں، بھاری قدموں کی آواز نزدیک آتی جا رہی ہے۔)

فردوس۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا

شاپور۔ اچھا تو میں دریچے ہی سے جاتا ہوں۔

فردوس ٹھہر جاؤ

(قدموں کی آوازوں میں ملی جلی پردہ سرکنے کی سرسراہٹیں۔

بادشاہ۔ کون؟ شاپور اور حرم سرا میں؟ یہ کیا فردوس؟ اچھا [illegible]

نکلتی ہے، سرسر کی آواز ہوتی ہے) محبت دیکھی ہے تو بادشاہت کا عتاب بھی دیکھ لو فردوس

شاپور۔ عالیجاہ! مجرم تو میں ہوں۔

بادشاہ۔ شاپور، ہمارے حضور میں اور یہ جسارت۔ کیا تم سزا سے بچ جاؤ گے۔ اچھا نکالو تلوار۔

شاپور۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے عالیجاہ! شاپور اپنے شہنشاہ کے حضور میں کیسے تلوار اٹھا سکتا ہے۔

بادشاہ۔ باتیں نہ بناؤ شاپور۔ ہم جانتے ہیں تمہیں ہمارا کسقدر خیال ہے۔ ہمارے ناموس پر ڈاکہ ڈالو، عزت کو کچل ڈالو، منہ پر تھوک کر کہتے ہو میں عزت کرتا ہوں۔ خاک جھونکنے کی کوشش مت کرو

شاپور۔ لیکن عالیجاہ!!

بادشاہ۔ میں نے آجتک کسی نہتے پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ میری تلوار کو آج اس پر مجبور مت کرو

شاپور۔ عالیجاہ!!

بادشاہ۔ خاموش! اگر تمہیں ہمارا خیال ہے تو تلوار کیوں نہیں اُٹھاتے۔ ہم حکم دے رہے ہیں۔

(تلوار نکالنے کی سرسراہٹ)

شاپور۔ عالیجاہ، شاپور کو غدار نہ بنایئے۔

بادشاہ۔ لو سنبھلو

(تلوار چلنے کی کھٹ، کھٹ)

بادشاہ۔ وار کیوں نہیں کرتے؟

شاپور۔ میں تو صرف حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔

بادشاہ۔ موت سے بھاگ رہے ہو شاپور، بزدل مت بنو تم سپاہی کی توہین کر رہے ہو۔

(تلوار چلنے کی کھٹ کھٹ جاری —

شاپور۔ مجھے خوف ہے کہیں میری تلوار نہ اُٹھ جائے عالیجاہ ... میرا خون دیکھکر اندھا ہو جاتا ہے۔ میرے سر سے یہ بہتی ہوئی خون کی دھار میری نظروں کو دھندلا بنا رہی ہے۔ میں بھولتا جا رہا ہوں کہ میرے مدِ مقابل کون ہے۔

بادشاہ۔ کوئی ارمان رہ نہ جائے — بچو

شاپور۔ آہ (چیخ کر) عالیجاہ، سپاہی اندھا ہو گیا۔

(چھن، ن، ن۔ شیشہ گر کر ٹوٹنے کی آواز آتی)

فردوس۔ (چیخ کر) کیا کر رہے ہو شاپور؟

(فردوس کی دلدوز آہ)

شاپور۔ یہ کیا کیا تم نے فردوس؟ میری ہی تلوار کے سامنے آنا رہ گیا تھا۔

فردوس۔ فیصلہ یونہی ہونا تھا تم نے تو سلطنت کا چراغ ہی بجھا دیا تھا۔ یہ میں کیسے دیکھ سکتی تھی!

شاپور۔ عالیجاہ! اب تو جھگڑا مٹ گیا، شاپور کو معاف کر دیجئے

بادشاہ۔ فردوس، فردوس —!

شوکت صدیقی

اندازۂ وقت

حقیقت کی جہاں میں نور باری ہوتی جاتی ہے
فضا کی تیرگی، باطل پہ طاری ہوتی جاتی ہے

لطافت بڑھتی جاتی ہے ضیائے ماہِ تاباں میں
سگِ دیوانہ کی آواز بھاری ہوتی جاتی ہے

سیماب اکبر آبادی

فکرِ بلند

جو اُن کے در پہ جبینِ نیاز مند نہیں
نیاز مند زمانے میں سربلند نہیں

عجیب شے ہے محبت میں خود فراموشی
جو ہوشمند یہاں ہے وہ ہوشمند نہیں

پہونچ اسی کے سہارے سے بامِ مقصد تک
جو ٹوٹ جائے محبت کی وہ کمند نہیں

جو ہوش ہے تو اجل کی پکار سُن غافل
سنبھل سنبھل کہ ابھی بابِ توبہ بند نہیں

نہاں رہا نہ زمانے سے رازِ عشق مرا
میں کیا کروں کہ زبانِ نگاہ بند نہیں

چمن میں خطرۂ صیاد کی شکایت کیا
ہماری شاخِ نشیمن ہی جب بلند نہیں

جہاں میں حسنِ مداوا بکفت تو ہے موجود
مگر ہنوز ترا دل ہی درد مند نہیں

سمجھ گئے جو نشیب و فرازِ جادۂ عشق
اب اُن پہ کچھ اثر اندازِ قید و بند نہیں

حقیقتاً ہے محبت ہی زیورِ انساں
وہ دل ہی کیا جو محبت سے بہرہ مند نہیں

عجیب شخص ہے ارشدؔ کو جانتے ہیں ہم
وہ انکسارِ مجسم ہے خود پسند نہیں

ارشد صدیقی امروہوی

نوائے آزاد

بس کیجئے، بہار کا عرفان ہو چکا
دامن ہزار بار گریبان ہو چکا

للہ اب تو پردۂ محمل اٹھائیے
تا حدِ اشتیاق میں حیران ہو چکا

دستِ جنوں نے اُنکے بھی دامن کی لی خبر
جب تار تار میرا گریبان ہو چکا

اب ابتدائے عشق کے وہ ولولے کہاں
میں تو گئے پہ اپنے پشیمان ہو چکا

اب سر و بال دوش ہر دو جا بغداد
سمجھے گا یہ بھی مرحلہ آسان ہو چکا

آئے بھی وہ تو زلف پریشاں کئے ہوئے
یعنی ہماری موت کا سامان ہو چکا

آزادؔ لاکھ بار رہا ہے صنم پرست
آزادؔ لاکھ بار مسلمان ہو چکا

آزاد شیرازی الہندی

الطاف مشہدی اور رسالہ "شاعر"[۱]

جون سنہ ۴۲ء کے رسالہ "شاعر" آگرہ میں بعنوان "پربت کے گیت کا مصنف" ایک مضمون نظر سے گذرا، صاحبِ مضمون ہیں جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی، آپ نے مضمون کی ترتیب و تدوین میں کافی حزم و احتیاط سے کام لیا ہے اور اپنی حق پسندی و رواداری کا اظہار بھی کرتے گئے ہیں لیکن حقیقت پس پردۂ مجاز روشن و بے نقاب ہو رہی ہے جو اعلان کر رہی ہے کہ اردو کے مشہور انقلابی شاعر جناب سید الطاف مشہدی کی روزافزوں شہرت و قبولیت اور ان کی ہندوستان گیر عظمت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو تنقیص و تعریض کے خس و خاشاک سے روکنے کی عبث کوشش کر رہے ہیں۔

طرفہ صاحب کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے صرف مشہدی صاحب کو ہدفِ تنقیص بنانا کافی نہیں معلوم ہوا اس لئے انھوں نے پورے پنجاب کو نشانے پر رکھ لیا جس سے مشہدی صاحب کا وطنی تعلق ہے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اردو کی خدمات کے اعتبار سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں باہم مقابلہ کر کے کسی کو گھٹایا اور کسی کو بڑھایا ہے، ان کے اس طرزِ عمل کو کسی طرح محمود و مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا وہ اپنے کسی معینہ مقصد کے آگے تعریف کے ساتھ تعریض و توہین کے ساتھ تعریف کرتے گئے ہیں تاکہ تکمیلِ مدعا بھی ہو جائے۔ اور ان پر عناد و نفاق کا الزام بھی عائد نہ ہو۔ یو۔ پی کے شعراء کو معطل اور بے خبر بنایا تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ "وہاں اب تک جتنے چاند تارے چمک چکے ہیں ان کی تابانیاں ابد تک قائم رہیں گی"۔ پنجاب کی تعریف کی کہ وہاں شعراء و ادباء کی اتنی کثرت ہے کہ جتنے شعراء و ادباء تمام ہندوستان میں ہوں گے اتنے صرف پنجاب میں ہیں تو اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ "پنجاب کے شعراء و ادباء کی کثرت دکھانی مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ اس کثرت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو قلت میں بھی کچھ گہر پارے ضرور مل جائیں گے"۔[۲] دیکھئے کس خوبی سے تعریف تنقیص میں منتقل کر دی گئی ہے۔ اسی طرح جناب طرفہ کا قلم جا بجا پنجاب کے متعلق گہر افشانی کرتا گیا ہے، چنانچہ پنجاب کی ندرت آفرینیوں اور جدت طرازیوں کی تعریف کے بعد ارشاد فرماتے ہیں

"وہاں ردِ عمل کی جگہ سنجیدہ انقلاب نہیں ہوتا، بلکہ بغاوت ہوتی ہے اور کچھ نہیں سوچا جاتا کہ مآل کیا ہوگا، بالفاظِ دیگر طرفہ صاحب کے نزدیک اہلِ پنجاب مآل نااندیش ہیں۔"[۳]

---

[۱] جناب ضبط ایم۔ اے کا مضمون اس قابل نہ تھا کہ شائع کیا جاتا لیکن ادارہ کی غیر جانبدارانہ روش کا تقاضا یہی ہے کہ مخالف و موافق دونوں آوازیں ناظرین کے کانوں تک پہنچا دی جائیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ضبط صاحب نے اپنا پورا جوابی مضمون اس روشنی میں مرتب کیا ہے کہ جناب طرفہ قریشی کے تمام اعتراضات "پنجاب دشمنی" پر مبنی ہیں اور جناب ضبط کا جذبۂ دوستی اتنا بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے طرفہ صاحب کا ہر لفظ غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ ادارۂ "شاعر" بھی صوبوی تعصب کا شکار ہے اور اسے اچھی بُری تنقیدوں کی تمیز نہیں۔ کاش ضبط صاحب صوبوی اختلاف کی خلیج کو وسیع کرنے کی کوشش نہ فرماتے اور وہ موجودہ ادبی دور کے حالات و واقعات، معیارِ کلام اور شعراء کے [illegible] مسلسل ہونے والی تنقیدوں سے کماحقہٗ واقف ہوتے۔ ان کا جوابی مضمون بے خبری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور اس سے مترشح ہے کہ وہ ایسی تنقیدیں پسند کرتے ہیں جن میں یا تو صرف محاسن سے بحث کی جائے یا پھر معائب ہی معائب گنائے جائیں۔ معائب و محاسن کا امتزاج جو تنقید کا اصول بہترین ہے انھیں پسند نہیں۔ ضبط صاحب لکھتے ہیں کہ طرفہ صاحب نے "صوبوں کا مقابلہ کر کے کسی کو گھٹایا اور کسی کو بڑھایا" ——— گویا ان کی نظر میں تمام صوبے یکساں اور سب کی خدمات مساوی ہیں! کیا خوب! ضبط صاحب معاف فرمائیں میں نے محض اسی وجہ کی بنا پر جابجا اپنے خیالات کے اظہار کی ضرورت محسوس کی ہے تاکہ جناب طرفہ [illegible] فرماتے رہیں ——— اعجاز صدیقی

[۲] میرے خیال میں یہ کوئی گالی نہیں ہے بلکہ امرِ واقعہ ہے۔ اگر مجھ سے کوئی یہ کہے کہ جتنے اچھے اور زیادہ افسانہ نگار پنجاب نے پیدا کئے یو۔ پی آج تک پیدا نہ کر سکا تو میں اس روشن حقیقت کو کیونکر جھٹلا سکتا ہوں؟ اس سلسلے میں میرا اظہارِ ناراضگی یقیناً بیجا اور حماقت کے مترادف ہوگا۔ صوبوی نفاق کو بنیادِ انتقاد بنانا گناہِ عظیم ہے۔ لیکن اظہارِ حقیقت گناہ نہیں ——— اعجاز صدیقی

[۳] اگر جناب ضبط لفظِ بغاوت پر غور فرماتے تو وہ یقیناً طرفہ صاحب کی تائید کرتے۔ جدید نسیم کی شاعری، عریانی کا اشتہار و اعلان اور علم و فن سے روگردانی آخر کیا معنی رکھتی ہے؟ بطورِ تیم اردو زبان و ادب، علم و فن اور پامالی ہوس اردو کی ترقی یافتہ شاعری کو دن بدن جو نقصان پہونچ رہا ہے اور ذوقِ بلند و صحیح جس بُری طرح مجروح ہو رہا ہے کیا اس کے ذمہ دار ضبط صاحب جیسے کوئی اور؟ ——— اعجاز صدیقی۔

مشہدی صاحب کے خلاف خامہ فرسائی کے لئے اس طرح بتدریج ماحول تیار کیا جاتا ہے جس کی تکمیل یوں فرمائی جاتی ہے کہ پہلے تو ڈاکٹر اقبال مرحوم کا اعتراف کمال اور ان کے بعد کے مشاہیر شعرا کا ذکر ہوتا ہے پھر ارشاد ہوتا ہے "پنجاب[۴] کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں غزل سے زیادہ نظم کا ذوق پایا جاتا ہے مگر ایک عام بے راہروی کسی مرکز پر پہنچنے نہیں دیتی۔ ننو میں ایک شاعر اپنے مخصوص مقام پر پہنچ جائے ورنہ دوامی رنگ کسی کے یہاں نظر نہیں آتا، پنجاب کے شعرا کی غیر پختگی اور منزل پر پہنچنے سے پہلے تھک جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اہل پنجاب اپنی ادب نوازی یا صوبائی ہمدردی سے مجبور ہو کر ہر کس و ناکس کو سر پر بٹھا لیتے ہیں، وہاں ہر نیا شاعر ایک دو سال ہی میں صاحب کتاب ہو جاتا ہے خواہ پھر الہامی سلسلہ بند ہی کیوں نہ ہو جائے نہ ارباب پنجاب یہ سوچتے ہیں کہ اس کی تصنیف میں دیرپا نقوش ہیں یا نہیں"۔ اس طرح پنجاب کی مدح و ذم کی حکیمانہ آرائش و نمائش کے بعد الطاف صاحب کی شاعری کی جانب توجہ مبذول ہوتی ہے، فرماتے ہیں:-

"پنجاب کے جس مشہور اور نوجوان شاعر کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں
وہ بھی اپنے صوبے کی عام پسندی سے بہت جلد متاثر ہو گیا......
پریت کے گیت کا مصنف الطاف مشہدی اپنے صوبے کے باہر بھی
کم و بیش شہرت رکھتا ہے، اس کی نظمیں اور گیت اخبارات و رسائل
میں شائع ہوتے رہتے ہیں، الطاف کی شاعری میں حفیظ جالندھری
کا غنائی عنصر اور اختر شیرانی کا رومانی تصور شامل ہے اور انھیں
دونوں رنگوں کے اثرات کا اس کے یہاں امتزاج ہے مگر اس کے
گیت اتنے جاذب نہیں جتنے حفیظ جالندھری اور دوسرے شعرا
کے ہیں"

مجھے حیرت ہے کہ طرفہ صاحب نے مشہدی کے متعلق ایسی محدود واقفیت رکھتے ہوئے ان کے خلاف قلم اٹھانے کی جرأت کیسے کی؟ آپ مشہدی کی شاعری پر لکھتے ہیں تو عنوان مضمون قائم کرتے ہیں "پریت کے گیت کا مصنف" گویا مشہدی کی یہی ایک تصنیف ہے۔ حالانکہ اس کتاب کے علاوہ تین کتابیں "تصویر احساس"، "ریحانہ"، "تازیانے" اور شائع ہو چکی ہیں اور چوتھی تصنیف "فرزین نغمے" مراحل اشاعت طے کر رہی ہے۔ اگر طرفہ صاحب کا سرمایۂ اطلاع و خبر مکمل ہوتا اور مشہدی صاحب کی یہ تصانیف اُن کی نظر میں ہوتیں تو ان کو معلوم ہوتا کہ مشہدی صاحب کا رنگ خاص وہ نہیں ہے جو "پریت کے گیت" سے مترشح ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری کا حقیقی اسلوب انقلابی اختراع ہے اور اس اسلوب خاص کا مظہر اُن کی دوسری تصنیفات ہیں جن کی طرفہ صاحب کو شاید خبر بھی نہیں اور اگر انھوں نے دانستہ اپنی تنقید و تبصرہ کو "پریت کے گیت" تک محدود رکھا ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُن کی اس سعی کو عناد و نفاق جیسے جذبات نامحمود کے سوا اور کس چیز کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے[۵]۔

واقعہ یہ ہے کہ "پریت کے گیت" میں جو غزلیں اور گیت ہیں وہ کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی انارکلی لاہور[۶] کے لئے اس کمپنی والوں کو دیے ہوئے مصرعوں اور عنوانوں پر کہے گئے ہیں۔ بنا بریں ان غزلوں اور گیتوں کو مشہدی کا اصل رنگ قرار دیکر اُس کی شاعری پر بحث کرنا نہ صرف اس کے ساتھ صریح بے انصافی ہے بلکہ خود اپنی حق پرستی اور انصاف پسندی کو رسوا کرنا ہے۔ چونکہ طرفہ صاحب کے آرا کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اس لئے اُن کی یہ رائے بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی کہ "الطاف مشہدی کی شاعری میں حفیظ جالندھری کا غنائی عنصر اور اختر شیرانی کا رومانی تصور شامل ہے ... ." مشہدی انقلابی شاعر ہے اور حفیظ و اختر کو انقلاب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں[۷]۔

---

[۴] ضبط صاحب نے اس الزام یا اعتراض کا جواب مدلل کیوں نہ دیا اور کیوں نہ ایسے شعرا کے نام گنائے جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں مشہور و مقبول ہو چکے ہیں جن سے کوئی مشاعرہ، کوئی اخبار اور کوئی رسالہ خالی نہیں رہتا۔ ناقدین جن کے ذکر پر مجبور ہوتے ہیں اور جن کے کلام کے مجموعے کئی کئی بار چھپ کر صاحب ذوق اور تعلیم یافتہ طبقوں کی لائبریریوں کی زینت بن چکے ہیں؟ اعجاز صدیقی

[۵] عناد و نفاق پر تو جناب ضبط ہی زور دے رہے ہیں۔ ورنہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ایک کتاب کو سامنے رکھ کر بھی تنقید و تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی مصنف کی تمام تصانیف سامنے ہوں تو سبحان اللہ، لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ ہاں مصنف کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بازار ادب میں معیاری چیز ہی پیش کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اُسے سخت قسم کی تنقیدوں سے بھی ناراض نہ ہونا چاہئے۔ اعجاز صدیقی

[۶] یہ عذر لنگ سے زیادہ نہیں۔ جناب الطاف مشہدی ہر اس مجموعہ کے ذمہ دار ہیں جو ان کے نام سے شائع ہو۔ کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی کے لئے جو چیزیں لکھی گئی تھیں۔ اُن کی اشاعت ہی کی کیا ضرورت تھی؟ اعجاز صدیقی

[۷] یہ صحیح ہے کہ حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی انقلابی شاعر نہیں لیکن ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ حفیظ اور اختر کے بعد آنے والے شعرا نے گیتوں میں حفیظ اور رومانی نظموں میں اختر کو... بقیہ صفحہ ۴۱ پر دیکھئے

بقیہ صفحہ ۴۱ پر دیکھئے

طرفہ صاحب کی طرح صوبوں اور شاعروں کو باہم ٹکرا کر حصولِ مدعا کی سعی میرے نزدیک مستحسن نہیں، اس لئے میں صرف اتنا کہونگا کہ حفیظ و اختر کچھ اور ہیں اور الطاف کچھ اور، ان کو ہمرنگ قرار دینا ہی سرے سے درست نہیں۔

طرفہ صاحب نے مشہدی صاحب کا کلام پیش کرنے سے پہلے ان کے متعلق حسبِ ذیل تین رائیں پیش کی ہیں:—

(۱) "الطاف مشہدی کی ایک ایک نظم ایک ایک دیوان پر بھاری ہے"

(۲) "آج ہندوستان بھر میں الطاف مشہدی کی انقلابی شاعری کا جواب نہیں"

(۳) "الطاف مشہدی عصرِ جدید کے تمام ترقی پسند شعرار کو پیچھے چھوڑ گیا"

طرفہ صاحب نے اوپر اہلِ پنجاب کی شکایت کی ہے کہ وہ صوبوی ہمدردی سے مجبور ہو کر ہر کس و ناکس کو سر پر بٹھا لیتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن آرار کو طرفہ صاحب نے اوپر نقل کیا ہے۔ کیا وہ سب اہلِ پنجاب ہی کی ہیں؟ اگر طرفہ صاحب اربابِ آرار کے نام بھی بتا دیتے تو یہ حقیقت خود بے نقاب ہو جاتی لیکن انھوں نے قصداً ایسا نہیں کیا۔ اب یہ مجھے بتانا پڑ رہا ہے کہ پہلی رائے علامہ پنڈت کیفی کی ہے جو پنجابی نہیں دہلوی ہیں اور دوسری رائے علامہ محوی کی ہے اور وہ لکھنوی ہیں، صرف تیسری رائے اخبار "احسان" لاہور کی ہے، اس کے مقابلہ میں علامہ تاجور نجیب آبادی کی رائے ملاحظہ ہو، آپ "شاہکار" میں رقمطراز ہیں:—

"اقبال کے بعد زمانے نے ایک اور کروٹ بدلی اور شعرار کے نوجوان طبقے میں جوش اور الطاف جیسے نبض شناس شاعر پیدا ہوئے"

دکن کی ایک رائے بھی ملاحظہ کیجئے، ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے رسالہ "سب رس" میں تحریر فرمایا ہے:—

"ہندوستانی زبان اس وقت تک پوری طرح جلوہ آرا نہ ہو سکے گی جب تک الطاف مشہدی جیسے شاعر اور ادیب اس کی طرف متوجہ نہ ہونگے"

ان آرا کو دیکھ کر آپ طرفہ صاحب کی نسبت کیا فرمائیں گے؟ اگر پنجاب اپنے ہر کس و ناکس کو سر پر بٹھا لیتا ہے اور الطاف مشہدی صاحب ہر کس و ناکس میں ہیں تو طرفہ صاحب کے نزدیک اہلِ پنجاب سے کہیں زیادہ علامہ کیفی دہلوی، علامہ تاجور نجیب آبادی، علامہ محوی لکھنوی اور ڈاکٹر زور حیدر آبادی مجرم قرار پانے چاہئیں۔

"پریت کے گیت" میں طرفہ صاحب کو سب سے پہلے جو چیز کھٹکی ہے اس کو خود انھیں کے الفاظ میں سنئے "غزلوں اور نظموں میں سطحیت کے ساتھ روانی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رومانی فضاؤں میں کھو جانا چاہتا ہے"

ملاحظہ فرمایا آپ نے کتنا طرفہ اعتراض ہے، کوئی طرفہ صاحب سے پوچھے کہ کسی کلام میں روانی کا ہونا کب داخل معائب ہو گیا؟ اور غزل اور گیت کے لکھتے ہوئے رومانی فضاؤں میں کھو جانا کونسا جرم ہے۔[۵۹]

(بقیہ صفحہ ۳۰ ملاحظہ ہو)

٭ سنوارنے میں اختر شیرانی کی شاعری کو سامنے رکھا۔ یہ طرفہ صاحب ہی کا خیال نہیں بلکہ پنجاب کے ہر باخبر ناقد کی کھلی ہوئی رائے ہے۔ دیکھئے جناب یوسف ظفر بی اے اپنے ایک تنقیدی مضمون میں لکھتے ہیں:—

"اس صنف کا سب سے پہلا شاعر اختر شیرانی ہے اس کی سلمیٰ اور ریحانہ رومانی شاعری کی الف۔ ب ہے ....
حفیظ نے آتے ہی رومان میں لغز کی آمیزش کے ساتھ ایک نیا رنگ دکھانا شروع کیا۔ اس نے ایک طلسماتی قلعہ تعمیر کیا جہاں شب و روز نغمے کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ نئی بحریں نئے اوزان۔ جدتِ تخیل اور اندازِ بیان نے چاروں طرف آگ لگا دی .... اردو نظم میں گیت حفیظ کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں .... حفیظ نغمے کا امام ہے"

غالباً ضبط صاحب اردو کے تنقیدی مواد سے ناآشنا ہیں یہ بھی غلط ہے کہ طرفہ صاحب نے حفیظ، اختر اور الطاف مشہدی کو ہمرنگ قرار دیا۔ ضبط صاحب طرفہ صاحب کا مضمون دوبارہ دیکھیں۔ اعجاز صدیقی

۵۸ یہی کہ طرفہ صاحب نے ناموں سے مرعوب ہوئے بغیر انتہا پسندی کے خلاف احتجاج کیا (۱) "ایک ایک نظم ایک ایک دیوان پر بھاری ہے" کے یہ معنی ہوئے کہ تمام شعرا نے ابتک جھک مارا ہے اور اگر کچھ کہا بھی ہے تو وہ الطاف کی ایک نظم کے برابر ہے (۲) گویا ہندوستان کا سب سے بڑا انقلابی شاعر جوش ملیح آبادی کسی اور ملک کا شاعر ہے اور اگر اسی ملک کا ہے تو بیچارے کی شاعری الطاف مشہدی کی شاعری کے مقابلے میں بالکل چوتھے درجے کی چیز ہے!! (۳) ترقی پسند شعرا میں سیماب۔ جوش۔ احسان دانش۔ روش صدیقی۔ مجاز اور دیگر متعدد شعرا کے نام آتے ہیں گویا یہ سب راستہ کی خاک چھانتے رہے ہیں۔ صرف جناب الطاف کو منزل رسی نصیب ہوئی ہے؟!! علامہ تاجور اور ڈاکٹر محی الدین زور کی آرا انتہا پسندی پر دلالت نہیں کرتیں۔ ان بزرگوں نے جچی تلی بات کہی ہے اس لئے طرفہ صاحب نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

۵۹ جناب ضبط نے طرفہ صاحب کا مقصد کیا خوب سمجھا ہے!! —— ذرا پھر مطالعہ کی زحمت گوارا کریں، وہاں تو سطحیت کو عیب اور روانی اور رومانی فضاؤں میں کھو جانے کو حسن بتایا گیا ہے۔ لیکن ضبط صاحب ہیں کہ ان دونوں خوبیوں کو عیب میں شامل کئے لیتے ہیں۔ ذرا اس حصہ کے تیور ہی دیکھے ہوتے —— اعجاز صدیقی

یہ دونوں چیزیں تو اس صنفِ شاعری کی بہترین محاسن میں سے ہیں، رہی سطحیت کی بات تو یہ تو ظرفہ صاحب جانتے ہی ہونگے کہ سطحیت کا کوئی کھلا ہوا معیار تو ہے نہیں، جس کے کلام پر بھی چاہا یہ کہہ کر الزامِ سطحیت کا حکم لگا دیا، لیکن میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی سطحیت سے ظرفہ صاحب کسی شاعر کے کلام کو پاک ثابت نہیں کر سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام دنیا کی شاعری سطحیت کے ارتکاب کی مجرم بن کر رہ جائے گی۔ ظرفہ صاحب نے زیرِ گفتگو اعتراض کے تحت متعدد اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اشعار قارئینِ کرام بھی ملاحظہ فرمائیں اور ظرفہ صاحب کی رائے کی اصابت کا اندازہ لگائیں ؎

مجھے ہوش میں آکے رسوا نہ کر دو ۔۔۔ نگاہوں سے پھر کچھ پلاتا چلا جا

اُتر کر رہ گئیں ہیں جب نظریں اُنکی سینے میں ۔۔۔ مرے زخموں کو تیروں سے محبت ہوتی جاتی ہے

اللہ رے نصیب کہ باقی ہے وہ فغاں ۔۔۔ جو عمر بھر رہی ہے قریبِ اثر سے دور

کچھ اس طرح لحد پہ مری آکے وہ ہنسے ۔۔۔ ہر ذرہ پھول بن گیا خاکِ مزار کا

بتائیے ان شعروں میں کون سی خرابیاں ہیں؟ اور بات ہے کہ یہ اشعار کسی کو پسند نہ آئیں تو کوئی شاعر اس کا ذمہ دار نہیں کہ اس کے کلام کا ہر حصہ ہر شخص کو پسند ہی آئے، اگر ظرفہ صاحب کو رومانی کلام پسند نہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ رومانی کلام کو معیوب قرار دیدیا جائے، وہ مراقی اور ناجہائے توریت سے شوق فرما سکتے ہیں[۱۰]۔

اس کے بعد ظرفہ صاحب نے مشہدی صاحب کی ایک نظم بعنوان "میرے پری جمال" کے چند بند پیش کئے ہیں، اس نظم کے متعلق بھی معترض کو سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ "اُس (الطاف صاحب) کے یہاں بھی پنجاب کے دوسرے ادبا اور شعرا کا سا "جنسی ہیجان" موجود ہے۔

ظرفہ صاحب گفتگو تو فرما رہے تھے مشہدی صاحب کے کلام پر، انھوں نے انکے ساتھ پنجاب کے دوسرے شعرا کو بھی کیوں سمیٹ لیا۔ یہ راز شاید قارئینِ شاعر کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس خیال سے کہ مقصدِ تنقیص و تعریض بھی پورا ہو جائے اور آپ کی رواداری اور حق پسندی پر حرف نہ آئے۔ آپ نے ایک جگہ پنجاب کی تعریف میں درجن بھر پنجابی شاعروں کے نام لکھ ڈالے ہیں، اب یہاں اس اندیشے سے کہ کوئی یہ نہ کہہ دے کہ جناب دوسرے شعرا کے کلام میں بھی تو ایسے عناصر موجود ہیں، مشہدی صاحب کے ساتھ دوسرے شعرائے پنجاب بھی جنسی شاعری کے مجرم گردان لئے گئے۔

ظرفہ صاحب نے اس اعتراض کے سلسلے میں مشہدی صاحب کی ایک نظم "بوتل" کا ایک بند اور کہیں کہیں کے دو مختلف شعر بھی پیش کئے ہیں جن میں سے ایک شعر یہ بھی ہے ؎

میرے پہلو میں تھا جب الطاف وہ
کیا کہوں اس رات کی کیا رات تھی

اگر اس قسم کے شعر کو بھی جنسی ہیجان کا باعث قرار دیا جائے تو کسی شاعر کے کلام کو اس عیب سے پاک قرار نہیں دیا جا سکتا۔

معلوم نہیں شاعروں سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ ان کے افکار و خیالات خطیبِ مسجد کے خطبے سے ہم رنگ ہونگے؟ ظرفہ صاحب دانستہ یا نادانستہ اس حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھنا چاہتے کہ شاعر کا کلام اور بالخصوص اس شاعر کا جو مقلد نہیں موجد ہو اپنے زمانے کا آئینہ دار ہوتا ہے[۱۱] بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایسا شاعر خود اپنے عہد کی تعمیر کرتا ہے۔ مشہدی بھی ایک ایسا ہی شاعر ہے جو بجا طور پر انقلاب پسند شعرا میں شمار کیا جاتا ہے وہ خود اپنے ایک قطعہ میں جس کا عنوان "شاعرِ تخریب" ہے اپنی نسبت کہتا ہے۔

مجھے گر شاعرِ تخریب کہتے ہیں تو کہنے دو ۔۔۔ کہ مجھ کو نظامِ سیم و زر برباد کرنا ہے

ملے جس میں صلہ مزدور کو محنت کی نسبت کا ۔۔۔ جہاں میں وہ نیا عہدِ جواں ایجاد کرنا ہے

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے ایسے شاعر سے یہ امید کرنا کہ وہ اسی دائرے میں چکر کھاتا رہے گا جسے اب سے سو سال قبل کے شعرا تعمیر کر گئے ہیں اور فرسودہ ماضی کی پامال لکیروں کو پیٹتا رہے گا اُس پر کتنا بڑا ظلم ہے۔

ظرفہ صاحب اور اُن کے ہم نوا انقلاب و تغیر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک نہیں سکتے جس طرح سیاسی، معاشی، اقتصادی اور معاشرتی افکار و خیالات میں انقلابِ عظیم برپا ہو چکا ہے۔ ادبی و شعری رجحانات بھی تغیر پذیر ہو چکے ہیں جو لوگ ان تغیرات و انقلابات سے اضطراب و پریشانی محسوس کرتے ہوں ان کے لئے دنیائے ادب و شعر میں کہیں جائے امن و سلام نہیں مل سکتی۔ معترض نے مشہدی صاحب پر بعض علمی، فنی اور لسانی اعتراضات بھی کئے ہیں

---

[۱۰] افسوس کہ ضبط صاحب نے ہر بات کو اُلٹا سمجھا ہے۔ ظرفہ صاحب نے تو رومان اور رومانی کے مطابق ایک اچھا اور معیاری انتخاب پیش کیا ہے۔ مگر ضبط صاحب سمجھ رہے ہیں کہ ان اشعار پر بھی اعتراض کیا گیا ہے۔ حالانکہ جن اشعار پر ظرفہ صاحب کو اعتراض تھا اُن پر انھوں نے نشان لگا دئیے تھے ——— اعجاز صدیقی

[۱۱] اس شعر سے موجودہ دور کی کیا آئینہ داری ہو رہی ہے؟ اگر شاعر خطیب نہ بنے تو کم از کم خود کی داستانِ خلوت میں تو نہ دہرائے۔ الطاف مشہدی کی انقلاب پسندی مسلّم۔ مگر ضبط صاحب خود ہی میرے پہلو میں ..... الخ سے کونسی انقلابی شان ٹپکتی ہے۔ یہ شعر تو یقیناً الطاف صاحب نے تیس سال پہلے ہی کا کہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُس پر اعتراض ہوا ——— اعجاز صدیقی

جو میرے خیال میں اس لئے چنداں قابلِ اعتنا نہیں کہ وہ بہت پس پھسے ہیں۔ زیرِ تعریض اشعار میں ایک شعر ہے ؎

میں دکھلاکے زخمِ جگر کہہ رہا ہوں
کسی شوخ کی گلفشانی نے لوٹا

اس شعر کے مصرعہ اوّل میں "دکھلا" آیا ہے جو داخلِ متروکات ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ تمام متروکات ہر شخص کے لئے قابلِ تسلیم ہوں اور اس درجہ کہ وہ ان میں سے کسی کے استعمال کو بھی قطعاً حرام سمجھے۔ ایک شخص کا ذوق یہ ہے کہ وہ دکھا کی نسبت دکھلا کو زیادہ فصیح سمجھتا ہے تو کسی کو حق نہیں کہ اسے غلط گو قرار دے۔ بعض اہلِ علم اور ادبا تو نثر تک میں اس کا استعمال پسند کرتے ہیں۔ ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

چشمِ ظاہر میں چراغِ شام ہے آتش بسر
پر کہاں وہ سوزشِ پنہاں جو پروانے میں ہے

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں بجائے مگر کے "پر" آیا ہے اور چونکہ یہ بھی متروکات میں شمار ہوتا ہے بس چلئے یہ شعر بھی ہدفِ تیرِ اعتراض بن گیا، لیکن طرفہ صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس موقع پر بعض ممتاز زین ادبا مگر اور لیکن بجائے "پر" استعمال کرتے ہیں اور اس میں ان کو ایک خاص حلاوت محسوس ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں "پر" اور پروانے کی "پر" کی تکرار سے شعر میں کتنی شیرینی پیدا ہو گئی ہے، اس صورت میں یہ شعر ہرگز قابلِ اعتراض نہیں قابلِ صد تعریف ہے افسوس کہ طرفہ صاحب تنقید تو کرنے بیٹھ گئے لیکن اُن کی نظر دوربیں نہیں، مشہدی صاحب کو بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ مگر کی جگہ پر استعمال کریں، اسی طرح اگر طرفہ صاحب اس کا استعمال حرام سمجھتے ہیں تو ان کو بھی مرتکب حرمت ہونے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔[۱۲]

اور ملاحظہ ہو،

غیر مانوس ترکیب کے استعمال کے ثبوت میں یہ شعر پیش کیا گیا ہے ؎

پھر چھلکنے کو ہے گلرنگ پیمانے میں ہے
آج شاید شیخِ پنہاں نوش میخانے میں ہے

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں "شیخِ پنہاں نوش" کی ترکیب واقع ہے جو طرفہ صاحب کے نزدیک نامانوس ہونے کے باعث ناقابلِ استعمال ہے۔ سوال یہ ہے کہ "نامانوس ترکیب"

۱۲؎ علمی و فنی مباحث میں اس قسم کی تاویلیں کام نہیں آتیں۔ متروکات کا استعمال اگر کسی کے نزدیک جائز ہو تو ہو لیکن ایک ناقد کا فرض ہے کہ وہ اس کی طرف اشارہ ضرور کرے۔ اعجاز صدیقی

کی تعریف کیا ہے؟ نامانوس تو ہر وہ ترکیب قرار دی جا سکتی ہے جو نئی وضع کی جائے اور اوّل اوّل استعمال ہو۔ اس لحاظ سے ہر نئی ترکیب کی ایجاد اور اس کے استعمال کو ناجائز قرار دینا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس طریقے کو کبھی روا نہیں رکھا جا سکتا، کیونکہ اس طرح زبان کی توسیع و ترقی کا امکان ہی ختم ہو جائیگا، اب میں طرفہ صاحب سے نہایت ادب کے ساتھ پوچھتا ہوں کہ الطاف مشہدی نے نئی ترکیب ایجاد و اختراع کر کے اردو زبان کو ترقی دی ہے یا اُسے تنزل کی طرف لے گئے ہیں۔ کیا وہ موردِ الزام و تعریض ہیں یا قابلِ تعریف[۱۳]؟

مشہدی صاحب کی ایک مشہور نظم "میری پری جمال" کے ایک بند میں ہے ؎

ساون ہے تم ہو میں ہوں جوانی پہ ہے نکھار
شیشے میں ہنس رہی ہے کوئی دخترِ بہار[۱۴]

اس شعر میں "جوانی پہ ہے نکھار" بندھا ہے جسے طرفہ صاحب نے شترگربہ بتایا ہے لیکن اس کی تشریح نہیں کی۔ لفظ "کوئی" کے معنی میری سمجھ میں بھی نہیں آئے لیکن شترگربہ سے

۱۳؎ جن نئی تراکیب کو جمہور کا ذوق و وجدان اور علم و فن کی صلاحیتیں قبول کر لیں وہی صحیح اور مانوس ہیں۔ "شیخِ پنہاں نوش" اپنے معنی و مفہوم اور ترکیب کے اعتبار سے بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ اعجاز

۱۴؎ یا تو ضبط صاحب "شترگربہ" کی تعریف سے واقف نہیں یا پھر دانستہ چشم پوشی سے کام لے رہے ہیں۔ یہاں بھی جواب کی وہی شان ہے جو دوسرے اعتراضات کے سلسلے میں تھی یعنی صحیح اعتراض کو غلط کر کے پیش کرنا اور جواب اس سے زیادہ غلط دینا، دیکھئے الطاف صاحب کا پورا بند یوں ہے ؎

ساون ہے "تم" ہو، میں ہوں جوانی پہ ہے نکھار
شیشے میں ہنس رہی ہے کوئی دخترِ بہار
اک لغزشِ حسین کے لئے دل ہے بیقرار
ساغر میں آج بھر کے "پلا دے" سے وصال
——— میری پری جمال

یعنی پہلے مصرعے میں "تم" اور آخری مصرع میں "پلا دے" ——— کہئے یہ شترگربہ ہے یا نہیں؟
امید کہ ضبط صاحب اس معمولی بات کو سمجھ گئے ہونگے ———

اعجاز صدیقی

طرفہ صاحب کا کیا مقصد ہے۔ معلوم نہیں ہو سکا۔

جہاں تک علمی، لسانی اور فنی اغلاط سے متعلق طرفہ صاحب کے اعتراضات کا تعلق ہے۔ اسکی حقیقت ایک حد تک قارئین کرام کے ملاحظے میں آچکی، اب میں صرف دو باتیں عرض کرکے اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں، ایک بات تو یہ کہ کوئی انسانی کلام معیوب و اسقام سے کلیتاً پاک نہیں ہو سکتا، اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے تو وہ ہرگز درخورِ اعتبار نہیں مشہدی تو بہرحال ایک نوجوان شاعر ہے۔ اسلاف اور موجودہ اکابر میں کتنے ہیں جن کے کلام میں عیوب اور اسقام نکالے نہیں جا سکتے ہیں اور طرفہ صاحب کی طرح اگر کوئی اس خوشگوار فرض کی ادائیگی کی سعادت حاصل کرنا چاہے تو کس کہنہ مشق اور معتمد علیہ شاعر کے کلام میں اسکی گنجائش نہ نکل آئے گی؟ اور دوسری بات یہ کہنی ہے کہ شعرا رکے ایک طبقے کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ جذبات و خیالات کے مقابلے میں چھوٹی چھوٹی لفظی قیدوں کو چنداں قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا اگر برائے نام لفظی سقم کے ساتھ بھی کوئی عمدہ اور اچھوتا خیال بندھ رہا ہو تو وہ اُسے باندھ لیتا ہے۵۔

محمد صابر ضبط ایم۔ اے (کلکتہ)

۵ اسی کا نام عجزِ طبیعت ہے۔ آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ ضبط صاحب میرے ان اشاروں کی تہ میں نہ جائیں جو کچھ عرض کیا ہے اُسے خلوص کی نظر سے دیکھیں۔ جنوری ۱۹۴۲ء کے "شاعر" میں الطاف مشہدی کی شاعری پر میرا ایک مضمون آرہا ہے وہ الطاف کی شاعری کا صحیح مقام متعین کریگا اور اُسے دیکھ کر ضبط صاحب بھی یقیناً خوش ہونگے۔ طرفہ صاحب کے مضمون سے ضبط صاحب کو فقط مغالطہ ہوا ہے اور کوئی بات نہیں ——— **اعجاز صدیقی**

غمگین شام

چاند کی اُنتیسویں تاریخ ہے اور شام ہے
دُور باغوں میں کھڑے ہیں ظلمتوں کے کارواں

روئے گیتی پر ہے ایک افسردگی چھائی ہوئی
انتہائی فکر میں ڈوبا ہوا ہے آسماں

بھر گئے سادہ فضاؤں میں دھندلکوں کے ہجوم
ہیں شفق کی سرخیوں میں بادلوں کی دھاریاں

سامنے کھیتوں میں ہیں تاریکیاں محوِ خرام
آشیانوں کو رواں ہیں طائروں کی ٹولیاں

جھونپڑوں میں عورتیں کرنے لگیں روشن دیے
گاؤں کی چوپال سے اُٹھنے لگا نیلا دھواں

سبزۂ شاداب سانسیں لے رہا ہے سرد سرد
دم بخود ہیں جنگلوں میں لہلہاتی جھاڑیاں

گلہ بانوں کے ترانے گونجتے ہیں دشت میں
راستوں پر آ رہی ہیں آگے پیچھے گاڑیاں

سو گئیں سورج کی کرنیں اوڑھ کر کالی ردا
دھیمے دھیمے گا رہی ہیں نیند کی شہزادیاں

دن کے شہزادے کا داب خسروی جاتا رہا
کر چکی ہے گلستانوں پر شفق زرپاشیاں

رفتہ رفتہ آسماں پر جم گئی بزمِ نجوم
خود بخود دیوار و در میں چھڑ گئیں سرگوشیاں

راستوں کے پیچ و خم پر پیچ و خم کھاتی ہوئی
آ رہے ہیں سادہ رو دہقاں اُٹھا کر گٹھڑیاں

میری آنکھوں میں زمانہ ہے سیہ پوش و خموش
گھر پہ اُس جانِ تمنا کے ہے شادی کا سماں

ہاتھ سے جانے کو ہے اب عشق کا جزوِ لطیف
آنسوؤں میں ڈھل رہی ہے آرزو کی داستاں

محمد اسحاق خاں شور

یاد

پھر وہ حیرت گاہِ غمہائے کہن یاد آگئی — شامِ غربت میں مجھے صبحِ وطن یاد آگئی
بلبلِ رنگیں نوا کو دفعتاً دور از چمن — رونقِ رنگینیٔ صحنِ چمن یاد آگئی
گلستاں در گلستاں ہیں میری رنگیں خلوتیں — پردہ در پردہ کسی کی انجمن یاد آگئی
جب کسی صبحِ مسرت سے ہوئی دوچار میں — مجھ کو نادانستہ اک شامِ محن یاد آگئی
زندگی کے والہانہ دور کی گذری ہوئی — اک شبِ نغمہ طراز و نغمہ زن یاد آگئی
آگیا جب مجھکو آرامِ وطن کا کچھ خیال — تلخیٔ بے مہریٔ اہلِ وطن یاد آگئی

دیکھ کر پردیس میں نجمہ یہ توقیرِ ادب
دیس کی ناقدریٔ اربابِ فن یاد آگئی

نجمہ تصدق
ایم۔اے۔بی۔ٹی

آگ پانی

ستاروں سے یہ بارش کیف و مستی، یہ بھیگی ہوئی شب سہانی سہانی — جو ایسے میں اے بے وفا تو بھی ہوتا تو ملتی ہمیں عشرتِ زندگانی
جو دیکھے گا میرا جنونِ محبت، سنے گا جو میری غم افزا کہانی — مجھے ہم نفس یہ یقیں ہے، کبھی پھر کرے گا نہ وہ آرزوئے جوانی
یہ دورِ جنوں اور یہ فصلِ بہاری، کوئی تاکے راہ دیکھے تمہاری — نکلنے کو ہے جسم سے جاں ہماری، گذرنی کو اب سر سے اونچا ہے پانی
کہاں مجھ میں باقی ہے اب اتنی جرأت کروں تجھ سے میں شکوۂ رنج و کلفت — جو کچھ مل گیا، مل گیا میری قسمت، نوازش، عنایت، کرم، مہربانی
نہ مینا، نہ ساغر، نہ جام و سبو ہے، نہ اب بزمِ رنداں میں ہاؤ ہو ہے — تغیر یہ اس واسطے چار سو ہے، کہ چھوڑی ہے میں نے مئے ارغوانی
ادھر تیز ہے آتشِ جذبۂ دل، ادھر آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی ہے — تحیر ہے میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ ہیں متحد کس طرح "آگ پانی"
وہ زلفیں بکھیرے جو گلشن میں آیا، لگے پھول کھلنے کلی مسکرا دی — گھٹاؤں نے بھی اس کو اٹھ کر دعا دی، مگر بات کیا تھی کسی نے نہ جانی

تڑپنے لگے آسماں پر ستارے، فسردہ ہوئی شمعِ بزمِ محبت
یقیناً سرِ بزمِ اشعر کسی نے سنا دی ہماری غم افزا کہانی

اشعر ہاشمی ملیح آبادی

بھکاری

انقلابِ فرانس کے ایام میں کوئی بھی خود کو مامون و محفوظ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ چاروں طرف قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا۔ کسی کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا جاتا، اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نذرِ دار و رسن کر دیا جاتا تھا۔

آندرے خالی سڑکوں پر چہل قدمی کرتے کرتے تھک کر سین ندی کے کنارے آ بیٹھا۔ ندی سے اُس پار سامنے والی پہاڑی پر مشہور و معروف جیل خانہ تھا۔ اس نے جیل خانہ کی زبوں حالی دیکھ کر آہِ سرد بھری ——— وہاں اُس کی شریکِ حیات "لوسی" مقید تھی۔ وہ "لوسی" سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ گویا لوسی اُس کی روحِ رواں تھی۔

——— ندی پر آفتاب کی شعاعیں سنہرے رنگ کی تخلیق کر رہی تھیں ———

آندرے نے اس قدر طمانیت و سکون کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ کپڑے اتار کر پانی میں گھس گیا۔ نہانا اُس کے دل و دماغ کے لئے فرحت و مسرت کا باعث ثابت ہوا۔ اب وہ بخوبی غور و خوض کرنے کے قابل تھا ——— یکایک وہ کھڑا ہو گیا ——— شاید وہ کسی نتیجہ پر پہنچ چکا تھا۔

اب وہ شاہی محل کے قریب ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا ——— میز پر جیلخانہ سے پھانسی دیے جانے والوں کی فہرست پڑی ہوئی تھی۔

اُس نے بڑے اطمینان و سکون سے کھانا کھانا شروع کیا۔ ہاتھ دھو کر اُس نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ لباس کچھ زیادہ خراب و خستہ نہ تھا۔ شکل بھی وحشت آفریں نہ تھی ——— پھر اچھی طرح مطمئن و مستعد ہو کر اُس نے سڑک کی جانب قدم بڑھائے۔ دوسرے چوراہے کے بعد ہی وہ بڑا مکان تھا۔ آندرے نے دروازہ پر لگی ہوئی گھنٹی دبائی۔ یہ مکان چالان کرنیوالے لارڈ ایلن کا تھا۔ انقلابی عدالتِ عالیہ کا رکن ہونے کی وجہ سے وہ کافی معزز و محترم تھا۔

لارڈ ایلن نے اوپر سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں یہ کوئی دشمن تو نہیں ہے ——— بیچارہ مجسٹریٹ ہونے کے باوجود ہر وقت خوفزدہ رہتا تھا کہ نہ معلوم کب اور کس سے تختۂ دار پر لٹکا دیا جاؤں۔ اُس کا چوڑا ماتھا اور چمکدار آنکھیں لمبی مونچھوں کے ساتھ مل کر وہ خاصا خوبصورت بن گئی تھیں۔ بہ ظاہر وہ نیک اور بشاش معلوم ہوتا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر آندرے کو اندر بلا لیا۔

کمرہ میں میز پر دو آدمیوں کے لئے کھانا لگا ہوا تھا۔ زمین پر ڈلیا میں کچھ بوتلیں رکھی تھیں۔ الماری میں مربہ جات اور پھل وغیرہ رکھے تھے۔ ہلکی شراب کی بوتلیں بھی کافی تعداد میں موجود تھیں۔

"مسٹر لارڈ ایلن!" ——— آندرے نے کہنا شروع کیا ——— "میں آپ سے ایک بھیک مانگنے کے لئے آیا ہوں۔"

"بھیک؟ میں دینے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ اس کی وجہ سے عوام کو کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

"جی ہاں، میں آپ سے ایسی ہی چیز کا خواہشمند ہوں جس کی وجہ سے آپ کو اور آپ کے عوام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا" ——— آندرے کی آنکھوں میں ایک عجیب کشمکش تھی۔

لارڈ ایلن نے آندرے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"مجسٹریٹ صاحب!" ——— اُس کی آواز میں ایک خاص زور تھا ——— "اس سے تو آپ بخوبی واقف ہیں کہ دو سال سے میں نظامِ حکومت کے خلاف تحریکات کا محرک رہا ہوں۔ اور میں ہی "معلمِ دہشت انگیزی" نامی کتاب کا مصنف ہوں۔ کیا آپ مجھے مقید و محبوس کر کے اظہارِ تشکر کا موقع نہیں دے سکتے؟ ——— خیر یہ تو آپ کا فرضِ منصبی بھی ہے۔ میں تو آپ سے کسی اور چیز کی بھیک مانگنے کے لئے حاضر ہوا ہوں ——— سنئے! میں ایک پریمی ہوں اور میری محبوبہ قید خانہ میں مقید ہے۔"

لارڈ ایلن نے اظہارِ ہمدردی کے طور پر سر ہلایا۔

آندرے نے پھر کہنا شروع کیا:—

"میں جانتا ہوں کہ آپ میرے نہاں خانۂ دل کے رازِ سربستہ کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ مسٹر لارڈ ایلن! ——— مجھے میری محبوبہ کے پاس پہنچا دیجئے۔ مجھے "پورٹ لیبرے" جیل میں قید کر دیجئے جہاں میں مسرور و مطمئن رہ سکوں گا ——— مسٹر لارڈ ایلن! مسٹر لارڈ ایلن! بس میری صرف یہی بھیک ہے۔"

لارڈ ایلن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا:—

" آندرے! تم تو زیست سے کہیں زیادہ قیمتی شے کے طالب ہو۔ تم تو دائمی راحت انبساط چاہتے ہو؟"

پھر وہ کھڑا ہو کر پکارنے لگا:۔ " ای نا! ای نا!!"

ایک دراز قد، مغرور و خوبصورت عورت کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ نیلے رنگ کی پوشاک زیب تن کئے ہوئے تھی۔

" اینا پیاری" ——— لارڈ ایلن نے اُسے قریب بٹھاتے ہوئے کہا:۔ اس شخص کو کبھی نہ بھولنا۔ ہم لوگوں کی طرح یہ بھی نہایت خوش قسمت ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ لمحات جدائی کتنے اذیت رساں ہوتے ہیں۔ یہ اپنی محبوبہ کے پاس جیل میں جانا چاہتا ہے۔ تاکہ دونوں ایک ساتھ پھانسی پر لٹک سکیں ——— اینا! کیا اسکو یہ بھیک نہ دی جائے؟"

" کیوں نہیں!" اینا نے نرمی کے ساتھ کہا۔

تم سچ کہتی ہو پیاری! ان دونوں پریمیوں کی استمداد و اعانت ہمارا فرض ہے آندرے! مجھے اپنا پتہ دیدو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم آج رات جیل میں سوؤ گے۔"

" آپ پختہ وعدہ کرتے ہیں"۔ آندرے نے قدرے لرزیدہ آواز میں کہا۔

"ہاں"

آندرے کی آنکھوں میں تشکر و احسان مندی کے آنسو چھلکنے لگے۔

لارڈ ایلن نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:۔

" آندرے! جب تم اپنی محبوبہ سے جاکر ملو تو اُس سے کہدینا کہ آج لارڈ ایلن اور اینا بھی تمہاری طرح بہت خوش ہیں"۔

آندرے اظہار تشکر کے طور پر کچھ بھی نہ بول سکا۔ اسکی آواز بھرا اٹھی تھی۔ لارڈ ایلن نے پھر کہا:۔ " کسی اجرت و نذرانہ کا خواہشمند ہونا انسانیت کا اقتضا نہیں ہے"۔

پھر اُس نے اینا کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا:۔ " کون جانتا ہے کہ اس طوائف الملوکی کے زمانہ میں ہمارا نمبر کب آجائے۔ آؤ اس مبارک کام کی خوشی میں ہم لوگ کچھ کھائیں پئیں۔ آندرے تم بھی شریک ہو"۔

" آندرے اب مسرور تھا ——— شام کو لوسی اور کل صبح اس کے ساتھ ساتھ تختۂ دار ———

(فرانسیسی مصنف "آکتیب میرلو")

مترجمہ امتیاز نسیمی

التماسِ رفعت

(۱)

اے حسنِ ازل دیدہ ادراک عطا کر نظّاروں کو میرے نگہِ پاک عطا کر
روشن رہے جلوؤں سے حریمِ دل و دیدہ آنکھوں کو مری سُرمۂ لولاک عطا کر

(۲)

کمزور ہوں میں جرأتِ بیباک عطا کر دنیا نہ دکھا، مسکنِ افلاک عطا کر
دے عزم و عمل کی تو مجھے قوّتِ باقی پروازِ سبک، فطرتِ چالاک عطا کر

(۳)

عالی نظر و جرأت بیباک عطا کر پھر خاصیتِ شیرِ غضبناک عطا کر
روباہِ ہوس دشتِ محبت میں ہو زخمی تو عشق کا وہ جذبۂ چالاک عطا کر

(۴)

آنکھوں کو مری شعلۂ نمناک عطا کر آتش کو کرے آب وہ خاشاک عطا کر
ہر ذرّے کو خورشید کی آنکھوں میں بٹھادے اُڑ جائے جو افلاک تک وہ خاک عطا کر

ابتہاج دری ([illegible])

پیغامِ سحر

اقوامِ جہاں کی ہے بقا عزم و عمل سے
فرمانِ "فتحنا" میں یہی راز نہاں ہے

تو مردِ شناور ہے، سنبھال اپنا سفینہ
پر شور و خطرناک بہت سیل رواں ہے

کیوں تیری نظر کو ہے ہوسِ تاجِ شہی کی
"الفقر" کی شمشیر مسلماں کا نشاں ہے

ہے میری نگاہوں میں کوئی اور ہی عالم
اور تیری نظر میں ابھی یہ کہنہ جہاں ہے

تھی قوت و انجاح پہ جس نظم کی بنیاد
آمادہ نگلنے پر اسے برقِ تپاں ہے

جینے کی تمنا ہے تو کر دیں کی حفاظت
قومِ عربی کا یہی تارِ رگِ جاں ہے

اے خوگرِ غفلت! مرا پیغامِ سحر سُن
درماں ترے دُکھ کا مرے نالے میں نہاں ہو

آباد شاہ پوری

آجکل

پھر نظر میں حسن کی جلوہ گری ہے آجکل
سر بسر رومان میری زندگی ہے آجکل

یہ فضا، یہ پھول، یہ تارے، یہ ہلکی چاندنی
عمرِ رفتہ پھر صدا میں دے رہی ہے آجکل

اہلِ محفل کے لئے افسانہ بنکر رہ گئی
کتنی معنی خیز میری خامشی ہے آجکل

اب کہاں وہ عشرتِ دل کی طرب افزائیاں
بیکلی وجہِ سکونِ زندگی ہے آجکل

آ گئے پھر نقرئی جلوے لٹاتے آ گئے
میری آغوشِ نظر ویران پڑی ہے آجکل

اللہ اللہ پرتوِ حسنِ ازل کی شوخیاں!
ذرے ذرے سے عیاں دوشیزگی ہے آجکل

دو دلوں میں ہو رہی ہے گفتگوئے حسن و عشق
ایک مرکز پر یہ دنیا رُک گئی ہے آجکل

آہ لب پر، دل پریشاں، اشک آنکھوں سے رواں
منتشر سا کاروانِ زندگی ہے آجکل

چل رہی ہیں کیفِ اُلفت کی ہوائیں تیز تیز
ہر نفس گویا پیامِ سرمدی ہے آجکل

مستقل اک کیف بنکر روح میں لہرا گئے
پھر محبت کی فضا بے کیف سی ہے آجکل

پھر خراج اشک لیتا ہے غمِ دردِ نہاں
قمر پھر برہم سکونِ زندگی ہے آجکل

([illegible]) قمر عثمانی جوناگڈھی

کراچی سے اعظم گڑھ تک

عریضہ فقیر قادری مخفی بنام حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اعظم گڑھ

جامع قادریہ کراچی
۱۲ مئی ۱۹۴۳ء

محترمی و معظمی حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم

سلام مسنون

عرض آنکہ راقم حقیر آج چند سطور سپردِ قلم کر رہا ہے۔ اُمید کہ زیر نظر فرما کر ممنون فرمائینگے۔

پچھلے دنوں "شاعر" آگرہ میں مولانا درد صاحب کاکوروی کا ایک مضمون علامہ اقبالؒ سے متعلق "خودی اور اسکا صحیح مفہوم" شائع ہوا تھا جو مجھ دور افتادہ کی نظر سے بھی گذرا۔ درد صاحب نے "خودی" کے قدیم اختلافات کے ساتھ مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کے بعض اُن مسائل کا بھی جواب دیا جن سے تصوّف یا حلقۂ صوفیہ" پر اثرات پائے جا رہے تھے۔ میں نے بھی بعد میں "فلسفۂ خودی" کے متعلق اپنے ناچیز سے خیالات کا اظہار کیا جو "شاعر" ہی میں اظہار میں آچکے ہیں۔ اس میں خصوصی توجہ کے قابل حضرت حافظ شیرازیؒ کا واقعہ تھا۔ اتفاقاً کچھ عرصہ ہوا کہ میرے "کتب خانۂ علمیہ" کے بوسیدہ اوراق میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا ایک طویل مضمون "سِرِ اسرارِ خودی" بھی دیکھنے میں آیا تھا جس میں اقبالؒ کے زاویۂ نظر پر سخت تنقید کی گئی تھی اور حافظؒ کے متعلق چند حقائق کا بھی اظہار کیا گیا تھا۔ اب وہ میرے پاس موجود نہیں۔ پھر کچھ دن ہوئے کہ کتاب "جوہرِ اقبال" دیکھنے میں آئی اور مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کا مضمون مکمل طور پر پڑھا گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہمارے مشہور مورخین میں سے مولانا شبلی نعمانیؒ کی تصانیف متعلقۂ حافظؒ سے بھی جداگانہ خیالات ظاہر کئے گئے تھے۔ تاہم اس سے بھی مسرت ہوئی کہ آپ نے اقبالؒ کو اقبال کی نظر سے دکھا کر صحیح استفادہ بخشا ہے میں بھی اسی نظر سے اقبال کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو عنقریب ایک بسیط مقالہ اس سلسلے میں "اقبالؒ کا نظریۂ تصوّف" سپردِ قلم کرونگا "جوہرِ اقبال" سے کچھ کچھ میرے نظریۂ فکر کا سرمایہ بھی ہاتھ آیا اور اس سلسلے میں خصوصی طور پر میں آپ کے افادات کے لئے بہت ممنون ہوں۔ حافظؒ کے متعلق میرے پاس "شرح لسان الغیب" مولفہ میر ولی اللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل۔ ایبٹ آباد موجود ہے نیز اسکے لئے بھی اقبالؒ و حافظؒ کے خیالات کا موازنہ پیش کرنا چاہتا ہوں اس سلسلے میں آپ سے بھی متمنی ہوں کہ مندرجہ ذیل امور کے متعلق اپنے خیالاتِ عالیہ سے استفادہ بخشیں بہت ممنون ہونگا فقط والسّلام

(۱) کیا حضرت حافظ شیرازیؒ کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ آپ "شراب نوش" تھے؟
(۲) حافظؒ کی فکر و نظر مجاز و حقیقت میں کیا جمود و رہبانیت کی آئینہ دار ہے؟
(۳) حافظؒ کا پایہ محض شاعرانہ نظریہ سے بلند تھا یا روحانی حقائق کی بدولت؟
(۴) اقبالؒ کا حافظؒ سے اختلافی نظریہ کن اسباب پر مقصود تھا؟

جواب

دار المصنفین اعظم گڈھ
نمبر ۱۰

مکرم السلام علیکم

عنایت نامہ اور مضمون پڑھکر خوشی ہوئی کہ بحمد اللہ کچھ لوگ اور بھی سوچنے والے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ تصوّفِ عامیانہ یا ملحدانہ کے متعلق جو کچھ کہا جائے وہ درست ہے مگر خواص جس تصوّف کے قائل ہیں وہ تو روحِ دین اور سِرِ اخلاص ہے۔ اربابِ ظاہر کا اس باب میں کہنا قلتِ نظر کی دلیل ہے۔

اقبال کوئی صاحبِ وحی نہیں کہ اُن کے قول و عمل میں خطا نہیں ہو سکتی، نہ وہ عالمِ شریعت اور واقفِ علومِ دین تھے وہ بے شبہ مخلص اور بہت مخلص اور دینِ اسلام اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرِ ملّت کے شیدا تھے۔ حضورؐ سے ان کو عشق تھا۔ دینِ اسلام کی بڑی غیرت تھی ایک متکلم کی حیثیت سے بھی اُن کا ایک پایہ ہے مگر اُن کے قول پر مسائلِ دین کی بنیاد ڈالنا فساد کی راہ ہے۔ جن لوگوں میں

امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ کی قدر نہیں جیسے چراغ چوری صاحب وغیرہ بھلا وہ اقبال کو کب خاطر میں لانے والے ہیں۔ اگر ان کے اہوا و آراء سے ڈاکٹر اقبال مرحوم کے خیالات سے بظاہر مطابقت کہیں کہیں نہ ہوتی ہے۔

اقبال اگر ابتداً تصوف کو نہ مانتے تو مولانا رومؒ کے گرویدہ کیوں ہوتے وہ قادریہ خاندان میں مرید تھے اور خود مجھ سے اس بات میں مشورہ چاہتے تھے کہ وہ کس کی صحبت سے مستفید ہوں۔ چنانچہ میں نے ایک دو نام بتلائے تھے۔ اب آپ کے سوالات کے جواب ہیں۔

(۱) حافظؒ کی شراب نوشی پر استدلال انکے اشعار سے کرنا صحیح نہیں۔ صوفیہ نے شراب کا لفظ عشق اور جوش و مستی کے معنی میں استعمال کیا ہے اور اسکو ان لوگوں نے بھی استعمال کیا ہے جنکا نہ پینا مسلّم ہے۔ غالب جیسے اقراری مے خوار کو بھی یہ کہنا پڑا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہمارے زمانے میں ریاض خیرآبادی خمریات کے سب سے بڑے شاعر تھے مگر انھوں نے عمر بھر نہیں پی۔

(۲) حافظ کی فکر و نظر عشق و مستی پر مبنی ہے جو کام کیا جائے اسی جذبہ سے کیا جائے وہ خواہ خدا پرستی ہو یا دنیا پرستی ہو شاعر کے الفاظ دو جہتیں رکھتے ہیں یہ سامع کے اختیار میں ہے کہ وہ کس چیز کو اختیار کرتا ہے۔

(۳) دونوں حیثیتوں سے

(۴) اقبال کا خیال تھا کہ حافظ بیخودی کی شراب پلاتے مست ہیں اور اس سے قوم کے قوائے عمل میں افیون کی سی سستی اور بے عملی پیدا ہوتی ہے اور اقبال خودی کی تعلیم دیتے تھے جس میں قوائے عمل کے جد و جہد اور طوفانِ آب و باد سے ستیزہ کی خاصیت ہے۔

والسّلام سید سلیمان
۲۴ مئی ۱۹۴۳ء

(دوسرا مکتوب)

عریضۂ نقیر محمد حسین القادری علی کراچوی

مورخہ یکم جون ۱۹۴۳ء

محترمی و معظمی حضرت مولانا صاحب زاد فضائلہم

سلام مسنون

گرامی نامہ صادر ہوا۔ مجھ دور افتادہ پر آپ کی خصوصی کرم فرمائی باعث افتخار ہے۔ آپ کے گرانقدر خیالات سے مستفید ہونگا۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ حضور نے عریضہ ارسال خدمت کرنے سے قبل اپنے سوالات کی نقل کرلی تھی لیکن وہ کہیں ضائع ہوگئی۔ اب وہ سوالات مکمل طور پر میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہیں۔ اس لئے ملتمس ہوں کہ آپ تکلیف فرما کر میرے ان سوالات کی نقل ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔ میرے خیال میں چند امور توضیح طلب ہیں۔

(۱) قادریہ خاندان میں کس بزرگ سے اقبال شرفِ نسبت رکھتے تھے اور آپ نے کن بزرگوں کے اسماء بتائے تھے؟

(چونکہ میرے نانا بزرگوار علیہ الرحمۃ بر سبیل تذکرہ اقبال کے متعلق ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اقبال کو آپ کے مرشد بزرگ شیخ اکمل حضرت مولانا الحاج سید گل حسن شاہ صاحب قبلہ قلندر قادری پانی پتیؒ سے شرفِ عقیدت و ارادت حاصل تھا۔ جیسا کہ میں نے اپنے مضمون "اقبال کی خودی" "شاعر" آگرہ بابت ماہ فروری ۱۹۴۳ء میں لکھا ہے۔)

"شاعر" آگرہ میں میرا مضمون "اقبال کا نظریۂ تصوف" شائع ہوا ہے جس میں چند ایسے ارشادات بھی آئے ہیں۔ میں اس سلسلے میں ایک مبسوط مقالہ لکھنا چاہتا ہوں لیکن فی الحال بخوف طوالت ملتوی کرنا ہوگا۔ جوہر اقبال میری نظر سے گذر چکی ہے فی الحال صبا صاحب رشیدی سے میرا مذاکرہ صوفی شعرا کے فرسودہ نظریے اور مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق ہے۔ چونکہ میں اس سلسلے میں مصنف "صبغۃ اللہ" مولانا غلام محمد ایم۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ او (عربی)، مولوی فاضل سب جج مجسٹریٹ درجہ اوّل جموں سے متفق الخیال ہوں کہ اسلامی تصوف میں پنتھی ازم "وحدت الوجود" قرآنی حقائق سے موجود ہے اور یونانی و ویدانتی سرمایوں سے نہیں لیا گیا یہ مستشرقین یورپ کی غلط فہمیاں ہیں ان مسائل میں مجھے ایک مرتبہ ڈاکٹر عبد الغنی لقمان صاحب نے لاہور سے مولانا عبید اللہ سندھی صدر جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کی جانب سے لکھا تھا کہ "مولانا سلیمان ندوی صاحب ہماری فکر کے مخالف ہیں وہ وحدت الوجود پنتھی ازم کا سرچشمہ اندلس کے عیسائیوں سے مانتے ہیں کہ یہ خیال ان سے

سلمانوں میں آیا" (مولانا عبیداللہ سندھی سے ان مسائل تصوف کو سیاسی زاویۂ نگاہ سے پیش کرنے پر مجھے اصولی اختلاف رہا ہے جس کا اظہار میں اپنے خط میں جو ڈاکٹر عبدالقوی صاحب کے نام لکھا گیا تھا کر چکا ہوں کہ اسلامک صوفی ازم کے اثرات کسی حیثیت سے بھی پالٹکس سے وابستہ نہیں کئے جا سکتے) غیر یہ جدا بحث ہے میں اس کے متعلق کسی اور وقت میں اظہارِ خیال کرونگا۔ آپ نے لکھا ہے کہ "نہ وہ (اقبال) عالم شریعت اور واقف علوم دین تھے"۔ موجودہ اقبالیات سے تعلق رکھنے والے تو مُصر ہیں کہ اسلام کا نظام نو یعنی (Islam as a new world order) اقبالیات سے مرتب ہو، کیونکہ اقبال علوم قدیم و جدید سے آگاہ تھے۔ اقبالؒ تو "اقتدار بر رفتگان محفوظ تر" کے قائل تھے یہی نظریہ درست ہے میرے خیال میں تو "خودی" بھی فلسفیانہ اجتہادی نظریہ ہے جو صوفیانہ فلاسفی ہی سے لیا گیا ہے میں نے تو حافظ کے ارشادات ایسے بھی دیکھے جو زندہ عمل و روحانیت اور قرآنی تعلیمات کے داعی ہیں بلکہ ایک مدت تک اقبالؒ حافظ کے بھی پیرو ہیں۔ شروع کے دور میں اقبالؒ اس راہ پر گامزن تھے۔ بعد میں بانگِ درا میں حافظ کی عقیدت میں نظم بھی لکھی ہے ؎

ہوائے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی
کیا ہے حافظِ رنگیں نوا نے راز یہ فاش

کسی صحبت میں "حافظؒ کی بیخودی" سے "اسرارِ خودی" کے رموز بتانے کی کوشش کرونگا تاکہ .... حافظؒ کی شراب کے مزے سے آشنا ہوں اقبالؒ تو خود علوم دین کی بلند مرتبتی کے والا و شیدا تھے۔ زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا آپ کی کرم فرمائی کا بہت بہت شکریہ فقط والسلام

راقم اثم محمد بشیر احمد القادری علمی جامع قادریہ کراچی

جواب

نمبر ۱۲۶
دارالمصنفین اعظم گڈھ

مکرم السلام علیکم

مجھے یہ علم نہیں کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم قادریہ سلسلہ کے کس بزرگ سے مرید تھے ممکن ہے کہ آپ کے نانا صاحب مرحوم کا بیان صحیح ہو۔

مسئلہ وحدۃ الوجود اور مسئلہ وحدۃ الشہود دو چیزیں ہیں عامۃ صوفیہ ان دونوں مسئلوں میں فرق نہیں سمجھتے لیکن محققین اس بارہ میں پورا امتیاز کرتے ہیں۔ مسلمان صوفیہ نے "وحدۃ الوجود کو مانا ہے" "وحدۃ الموجود" کو نہیں۔ میں تو اس راہ کا ناتواں مسافر ہوں میں کیا اور حقیقت اس کی کیا بہرحال میرے نزدیک تو وحدۃ الوجود ایک حال ہے۔ قال نہیں جس پر یہ حال طاری ہو جائے وہ معذور ورنہ نہیں۔

اکبر کا یہ شعر پڑھنے کے قابل ہے ؎

حضرتِ منصور کہتے ہیں اَنا بھی حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں جو اتنا ہوش ہے

حافظؒ صرف رندِ میخوار نہ تھے حکیم بھی تھے اور ان کی شراب بھی ہر جگہ ایک ہی شراب نہیں والسلام

سید سلیمان
۲۴ جون ۱۹۴۳ء

نوٹ:۔ اس مکتوب کے بعد ایک عریضے میں فقیر نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے عرض کیا تھا حقیقت میں "حال و قال" کا امتیاز صوفیۂ اسلام نے برقرار رکھا ہے مگر یورپ کے مستشرقین کے فلسفیانہ خیالات کے پیش نظر ہمیں اس مسئلہ کو "علمی پوزیشن" میں ظاہر کرنا ہے اور یہ مسئلہ تو خود ہی "قال را بگذار مردِ حال شو۔ پیش مردِ کاملے پامال شو" کا آئینہ دار ہے۔ جیسا کہ میرے نانا بزرگوار علیہ الرحمۃ اپنی مثنوی "عالمِ فیض" (حصہ اوّل) میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

اُٹھے جو پردہ دوئی کا تو ایک ہی ہے نور | دگرنہ تو یہ انا الحق کہاں۔ کہاں منصورؒ
نہیں خودی میں کسی نے کبھی خدا پایا | خدا کو پایا تو اپنا نہ کچھ پتا پایا
بغیر علم و عمل کے ہے قیل و قال محال | بغیر عشق حقیقی کے ہے وصال محال
جو اصل راز ہے ہوگا نہ قال سے معلوم | وہ ہوگا ذوق سے اور کشفِ حال سے معلوم

نہ دفتروں میں ہے وہ اور نہ قیل و قال میں ہے
وہ نورِ ذاتِ خدا قلب اہلِ حال میں ہے

یہ تصوفِ اسلام کا امتیازی ذوقی کشفی اور وجدانی نظریہ ہے۔ سرمدؒ کیا کہتا ہے ؎

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند | سوزِ غم پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار | ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

مخفی القادری علمی کراچوی

طشت از بام

جی تو نہیں چاہتا کہ "شاعر" کے قیمتی صفحات میں اُن جاہل اور کندۂ ناتراش صاحبزادوں کا ذکر کیا جائے جو اپنے آپ کو حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم کا شاگرد بتلاتے ہیں اور جن کی ہرزہ سرائیوں سے مرحوم کی بھی مٹی پلید ہو رہی ہے لیکن دو چار ماہ بعد کچھ ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ لطافت کو کثافت میں تبدیل ہی کرنا پڑتا ہے۔ جولائی ۱۹۴۳ء کے "جرمات" میں میں نے ان چکوہ بازوں سے چند چٹکیاں لی تھیں۔ بس کچھ نہ پوچھئے اب تک اُس کی تڑپ اور کسک محسوس کی جا رہی ہے اور اتنی کہ سیکڑوں صفحات میرے مجھے اور علامہ سیماب کو گالیاں دینے کے باوجود ہنوز دو زخم ہرے ہیں جو میری چند سطور سے اُن کے دلوں میں پڑ گئے تھے اب طرح طرح کی تاویلیں کی جا رہی ہیں۔ عجیب شاکی جاری ہے اور اصرار کیا جا رہا ہے کہ علامہ سیماب یا مدیر "شاعر" ہماری بکواس کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ قصّہ یہ ہے کہ یہ صاحبزادے اپنی جگہ سمجھے ہوئے تھے کہ ان کی ہرزہ سرائیوں کا جواب قصر الادب سے ضرور دیا جائیگا اور اس طرح ان کا مقصدِ شہرت پورا ہو جائے گا مگر اس میں انھیں ناکامی ہوئی اور یہی خیال اب جلانے جان بنا ہوا ہے۔ ذرا کوئی ان سے پوچھے کہ کس بات کا جواب دیا جائے اور کسے دیا جائے ——— کیا سہوان کے عرائض نویس کو ——— کیا نواده بدایوں کے ساحری لگانے والے منشی کو ——— اور کیا منظر نگر میں تعلیم کی خامی کی مجسم عکاسیاں رگڑنے والے لونڈے کو ——— پھر نہ کوئی معقول اعتراض ہے اور نہ کوئی سنجیدہ بات۔ اعتراض تو وہ کر سکتا ہے جو دماغِ علم و فن رکھتا ہو۔ کہیں جاہل بھی پڑھے لکھوں پر اعتراض کر سکتے ہیں! شروع سے آخر تک انھیں اعتراضات کی جگالی کی گئی ہے جو اب سے پہلے بعض لوگ کر چکے ہیں اور جن کا معقول جواب دیا جا چکا ہے۔ مجھے اور زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، میں تو اب سے بہت پہلے لکھ چکا ہوں کہ مولانا احسن مرحوم کے یہ نادار و نامراد تلامذہ عمر بھر قصر الادب کے خلاف اپنے قلم رگڑیں اور تجربہ کر کے دیکھیں کہ قصر الادب میں بسنے والوں پر اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ انشاء اللہ انھیں اپنی تحریروں کی بے اثری کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔ رہا یہ سوال کہ سہوانی یا نوری یا منظر نگری کس ڈھب مشاعرہ میں کھڑے ہو کر اپنی جہالتوں کا ثبوت بطورِ اعتراض دینگے تو انھیں اس سلسلے میں صرف اتنی بات یاد رکھنی چاہئے کہ مشاعرہ گاہ سے انھیں بھاگتے گھر تک کوتوالی اور اس کے بعد جیلخانہ کی ہوا کھانی پڑے گی ——— خیر یہ تو انھیں وقت پر معلوم ہو جائیگا کہ کس کو گالی دینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے! ہاں اب ذرا جی چاہتا ہے کہ ان کے ایک اور تازہ چٹکی لوں اور ایسی چٹکی جو نہ صرف حواس باختہ کر دے بلکہ اُس کی جلن اپنے استادِ مرحوم کے قریب پہونچ کر بھی کم نہ ہو جسے "لو خود ہی اپنے دام میں صیّاد آ گیا"

چند دن کے لئے جناب احمق پھپھوندوی ادارۂ "شاہکار" لاہور میں شامل ہو گئے تھے پھر کیا تھا "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"۔ فوراً گنوری نے ایک لمبا چوڑا خط جناب احمق کو لکھ مارا جس میں التجائیں بھی کیں اور خوشامد بھی، گنوری کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ خط قصر الادب تک پہونچ جائیگا ورنہ غریب اس حماقت کا مرتکب کبھی نہ ہوتا۔ ایسے اور بھی چند خطوط آئے ہوئے ہیں۔ مصلحتاً وہی خط شائع کر رہا ہوں جو احمق صاحب کے نام لکھا گیا ہے۔ اس سے ساری قلعی کھل کر رہ جاتی ہے۔ گنوری کی شکست، بے بسی، بے کسی، بے مائگی، بے تابی اور قصر الادب کی قوتوں کا اعتراف خود اُس کی زبانی سُنئے۔

"ہو نہ مجبورِ التجا کوئی"

اعجاز صدیقی

نواده بدایوں

20 - 8 . 43

اخی محترم۔ دام ظلکم

زندگی کی مسلسل تباہ کار ساعتوں میں کوئی ساعت ایسی بھی آجاتی ہے، جب ایک پریشان دل و دماغ انسان کسی حقیقی مسرت سے ہم آغوش ہو کر چند لمحات کے لئے خود کو زندوں میں سمجھنے لگتا ہے آج کا دن میرے لئے ایسا ہی مبارک و مسعود دن ہے جس میں اپنے محترم بزرگ قابلِ فخر بھائی کا افوت نامہ فردوس نظر بنا کر خوشی میں نہا رہا ہوں، جھوٹ بولتا ہوں تو کافر، تکلف کر رہا ہوں تو مرتد ——— کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

کیوں بھائی! شفقتِ بزرگانہ کا یہی تقاضا تھا کہ اپنے چھوٹوں کی یاد کو حرفِ غلط کی طرح لوحِ دل سے مٹا دیا۔ صدیوں میں خبر لی۔ ——— استاد کے بعد تو آپ کا فرض تھا ہی کہ ہمارے مجروح دلوں پر مرہمِ شفقت لگا کر ہماری دلجوئی کرتے آخر ہماری خطا کیا تھی۔ کیا ہم آپ کے چھوٹے نہ تھے یا آپ ہمارے بڑے نہ تھے؟

بالخصوص میں تو دہ دیوانہ ہوں کہ ہمیشہ استاد بھائیوں کو ہی حقیقی بھائی سمجھا اس لئے کہ قدرت نے کوئی برادر مادر زاد مرحمت نہیں فرمایا تھا۔ خیر۔

اب بھی پوچھا تو مہربانی کی، مگر خدا کے لئے اب نہ بھولجانا کیونکہ اب ہمیں زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے کہ سب بھائی متحد ہوکر رہیں۔

تقریباً ڈہائی برس سے سیماب صاحب مجھ سے الجھ پڑے ہیں، میں بھی ان سے پہلے بھرا بیٹھا تھا، اس لئے کہ اُن کی علائی کے غلط پروپیگنڈے نے جہاں اُنکی ادبی تجارت کو فروغ دیا، وہاں زبان کے ساتھ سوتیلی ماں کا بھی سلوک کیا ہے، اور مزید برآں یہ کہ جملہ اکابر ملک پر جن میں آپکے پیرے استاد مرحوم بھی شامل ہیں، وہ وہ ناروا حملے اپنے ڈنڈے سے کرائے کہ بیان نہیں کئے جاتے، صبر کی حد ہوتی ہے، میں بھی خدا کے بھروسے پر اُنکے سامنے آگیا، اور ایک میدان مار چکا ہوں یعنی "شروعات" جو برو سے لغت و قواعد غلط ہے، بوجوہ میں نے اسکو جائز ثابت کیا۔ وہ اسکے خلاف تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ مری مخالفت میں ۱۷ آرار تھیں اور میری موافقت میں ۵۸ جن میں نوح، سائل۔ جوش ملسیانی، دلگیر۔ طیش، جگر، دل تاجور۔ حسن نظامی۔ دتاتریہ کیفی۔ عبد الحق۔ زور، رشید احمد صدیقی۔ محوی صدیقی، وغیرہم کے علاوہ شہزادہ ارشد گرگانی۔ خواجہ ناصر فراق دہلوی مرحومین کی آرار، واستاد شامل تھیں۔

یہ سلسلہ رہنمائے تعلیم لاہور، رام گلی میں جاری رہا۔ اب اُنکی زہریلی تصنیف "دستور الاصلاح" پر مسلسل تنقید رہنمائے تعلیم میں کر رہا ہوں۔ اُن کے تازہ کلام پر تنقید "سیماب کسوٹی پر" کے عنوان سے "نرالی دنیا" لاہور میں جاری ہے اور یہ چھوٹا پرچہ اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ عوام میں اُن کی علائی کی قلعی کھلے۔ رسالہ "فصاحت" حیدر آباد میں (جسکے ایڈیٹر جلیل کے بیٹے صدیق احمد ناز ہیں) اُنکی اصلاحوں پر اصلاحیں مسلسل دینی شروع کردی ہیں، یہ سب سلسلے ملک میں بڑے شوق سے پڑھے جارہے ہیں، اور حسب مراد نتائج مرتب کر رہے ہیں، ادہر برادرم راز احسنی سہوانی نے "کلیم عجم" پر اخبار "پارس" لاہور میں مسلسل تنقید جاری کر دی ہے اور برادرم صغیر احسنی جلال آبادی نے رسالہ "دستگیر" دہلی میں رسالہ "شاعر" کے باب "تحقیق و تصحیح" کی پول کھولنی شروع کردی ہے۔

ملک کے اور بھی متعدد مضمون نگار ہمارے ساتھ ہیں اور اپنے تنقیدی مضامین سے علامہ صاحب کی مزاج پرسی کر رہے ہیں، یہ ہے رودادِ مختصر۔ اب چاہتا ہوں کہ یہ سلسلہ بہت زیادہ ترقی کرے اور بڑی تعداد میں رسائل ہمارے ہم نوا ہوں۔

اس وجہ سے بھی آپ کے لاہور تشریف لیجانے میں بہت مسرور ہو رہا ہوں کہ اب ہماری اسکیم آپ کی امداد سے بہت چلے گی۔

اور آپ ہمیں اس کام کے لئے بہت سے رسالوں کو آمادہ کر سکیں گے۔ دقت یہ ہے کہ ان کا ملک پر اتنا اثر چھایا ہوا ہے، کہ لوگ اِنکے خلاف مضامین کی اشاعت سے ڈرتے ہیں، بہر حال خواہ آپ موافق ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن اس خیال سے کہ آپ کے چھوٹے ایک کام جاری کر چکے ہیں۔ لامحالہ آپ کو اُن کی مدد کرنی ہی ہوگی، ورنہ آپ کے چھوٹے بھائی شکست پا جائینگے، جسکو غالباً آپ کی غیرت گوارہ نہ کرے۔ ممکن ہے علامہ تاجور "شاہکار" میں یہ چیز پسند نہ کریں۔ لہٰذا ان کو موافق ضرور بنایئے۔ تاکہ کوئی صاحب اس میں ان کے متعلق کوئی سلسلہ جاری کر سکیں۔

جواب کا بےچینی سے منتظر ہوں، ایک نظم و غزل تازہ وغیرہ ارسال خدمت ہے۔ سعید میاں نے آپ کی ملاقات کی خبر دی تھی، میں تو آپ کے گرامی نامہ کا منتظر تھا۔ ہاں بھائی دیوان شاہ خوب اچھا چھپا ہے۔

آپ کا

ابر احسنی گنوری

[illegible]

مشاعرۂ شاعر
مصرع طرح :- "عشق کو حسن کے آداب سکھائے نہ گئے"

حضرت نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اورئی

ہم سے آنسو غمِ الفت میں بہائے نہ گئے
دُرِ شہوار تھے، مٹی میں ملائے نہ گئے

گو رہِ عشق میں ہیں چھینک کے سب لوٹ آئے
اور دو ایک قدم اپنے بڑھائے نہ گئے

اُن کی تخلیق نہ ہوتی تو بہت اچھا تھا
جو محبت کے سزاوار بنائے نہ گئے

چل دیا چھوڑ کے بسمل کو تڑپتا قاتل
اور دو ہاتھ دگے ہاتھ لگائے نہ گئے

یاد آنے لگے وہ جتنا بھلایا اُن کو
ہم نے ہر چند بھلایا وہ بھلائے نہ گئے

کبھی خودداریوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا
اُن کی محفل میں بغیر اُن کے بلائے نہ گئے

فاتحہ خوانی کی اُمید تھی جن سے نشتر
اُن سے دو پھول بھی تربت پہ چڑھائے نہ گئے

حضرت ضیا فتح آبادی ایم۔اے

دل کے ٹکڑے کسی عنوان سنائے نہ گئے
کام جو بگڑے ہوئے تھے وہ بنائے نہ گئے

چھا گئیں چاند پہ گھنگھور گھٹائیں لیکن
اس طرح حسن کے انوار چھپائے نہ گئے

دی ہوا عشق نے سینے میں جن انگاروں کو
وہ مرے گریۂ پیہم سے بجھائے نہ گئے

کوچہ گردی کا ہماری ہے جہاں میں چرچا
مفت بدنام ہوئے ہم کہیں آئے نہ گئے

ہے وہی تذکرۂ شاہدِ مے بعد شباب
ہو گئی صبح مگر شام کے سائے نہ گئے

عشق سے ہو گیا عرفانِ حقیقت مجھ کو
عقل سے پردۂ اسرار اُٹھائے نہ گئے

اے ضیا اور تو موجود وہاں سب تھے مگر
اک ہمیں انجمنِ ناز میں پائے نہ گئے

جناب بیتاب کالپوی

کاہشِ غم کی مصیبت سے چھڑائے نہ گئے
ہم سے بگڑے ہوئے حالات بنائے نہ گئے

عشق کے نقش کسی طرح مٹائے نہ گئے
ہم بھلاتے رہے وہ دل سے بھلائے نہ گئے

یوں تو ہر طالبِ دیدار کی قسمت جاگی
اک ہمیں آپ کی محفل میں بلائے نہ گئے

گو نہ انسان ہوا واقفِ اسرارِ نہاں
پھر بھی کچھ راز نظر سے کہ چھپائے نہ گئے

دورِ گردوں کے حوادث تو سہے صبر سے لیکن
جو ستم تم نے کئے تھے وہ بھلائے نہ گئے

آپ آزردہ نہ ہوں میری پریشانی سے
رونے والے کبھی دنیا میں ہنسائے نہ گئے

اور بھی ہیں جو ہیں محرومِ نوازش بیتاب
خاک میں تیرے ہی ارمان ملائے نہ گئے

جناب ارشد صدیقی ساگری

چمن میں آثارِ نسیمِ عشق کے پائے نہ گئے
سازِ فطرت پہ وہ نغمے کبھی گائے نہ گئے

میرے نزدیک تو دل ہی اُسکا ہے گناہ
جسکو اندازِ محبت کے سکھائے نہ گئے

بیٹھے ہی بیٹھے نظر آگیا وہ روئے حسیں
اے تصور ترے قربان کہیں آئے نہ گئے

لطف یہ ہے کہ تجھے ناز سکھائے ہم نے
قہر یہ ہے کہ ترے ناز اُٹھائے نہ گئے

ناز تھا ظرفِ نظر پر ہمیں اپنے لیکن
آپ جب آئے تو ہم آپ میں پائے نہ گئے

ہائے اُس خاطرِ مجبور کی سادہ لوحی!
جس سے دھوکے بھی ترے عشق میں کھائے نہ گئے

صفحۂ دہر پہ تھے نقش ہی ایسے ارشد
جو غمِ عشق کے ہاتھوں بھی مٹائے نہ گئے

جناب انجم حسینی تریاتوری

عشقِ بیباک کو کیا درس پڑھائے نہ گئے
مگر اک حسن کے آداب سکھائے نہ گئے

مٹ گیا پھر بھی ہے باقی اثرِ سوزِ دروں
بجھ گیا دل تو مگر داغ بجھائے نہ گئے

دل یہ پہلو میں کہاں سوختہ سامانوں کے
ہیں وہ غنچے جو کسی رُت میں کھلائے نہ گئے

پھر فروزاں نہ ہوئی دل میں تپِ ارماں کے
کس نے یوں ان کو بجھایا کہ جلائے نہ گئے

بے حقیقت نظر آئی تھی ہمیں آتشِ دل
شعلے ایسے بھڑک اٹھے کہ بجھائے نہ گئے

عہدِ رنگیں کے مزے محو ہوئے دل سے انجم
مگر ایسے بھی ہیں اب تک جو بھلائے نہ گئے

جناب خلیل از سگولی

جن سے امید تھی چاہت و وفا کی ہم کو
وقت پر وہ بھی کسی کام کے پائے نہ گئے

جانے کیا چیز تھی اس شوخ نظر میں پنہاں
ہم سے افسانۂ شبِ غم کے سنائے نہ گئے

انجمِ صبح سے انجامِ شبِ ہجر کے پوچھ
بے سبب لطفِ محبت کے گنوائے نہ گئے

حسن کے آتے تھے اندازِ وفا کے نغمے
بربطِ دل پہ وہ ہم سے کبھی گائے نہ گئے

تھک گئی ڈھونڈ کے رگ رگ میں نگاہِ حسرت
چھپ رہے دل میں کہاں آپ کہ پائے نہ گئے

برق سے باز نہ ہو شانِ نشیمن کو خلیل
چند تنکے بھی کہیں باغ میں پائے نہ گئے

جناب حکیم آسی تریاتوری

وہ تصور میں تو آتے گئے پاتے نہ گئے
یعنی آئے بھی گئے بھی مگر آئے نہ گئے

اُن کے ترکش میں ابھی اور بہت باقی ہیں
حسن والوں سے کماں کے چلائے نہ گئے

دور ہوتا ہے کہیں یاد سے اُنکا عالم
وہ تو ایسے ہیں کہ بھولے سے بھلائے نہ گئے

جام صہبا نہ دیا ہاتھ سے مجھ کو نہ سہی
تم سے دو زہر کے بھی گھونٹ پلائے نہ گئے

مشقِ نظر بعتِ مکرر نکلے
ہم سے اچھے رہے جو ہوش میں آئے نہ گئے

ضبط اچھا ہے مگر اپنے محل پر آسی
ہم کو رونا ہے کہ کیوں اشک بہائے نہ گئے

حضرت برق قیصوری

ہم نے رکھے تھے ابھی راہِ تجسس میں قدم
ایسے کھوئے گئے ڈھونڈے سے بھی پائے نہ گئے

بند کی آنکھ جہاں، دیکھ لیا حسن نہاں
چین سے گھر میں رہے ہم کہیں آئے نہ گئے

اُنکی رفتار کی شوخی میں ہیں محفوظ ہنوز
ایسے فتنے جو زمانے میں اُٹھائے نہ گئے

مجمعِ غیر سے محفل تری محفل نہ ہوئی
جبتک اک ہم تری محفل میں بلائے نہ گئے

دسترس عشق کے جذبات پہ اے برق نہ تھی
جب اُبھر آئے دبانے سے دبائے نہ گئے

جناب طرفہ بنڈاروی

لب پہ شکوے تری بیداد کے لائے نہ گئے
دل کے حالات کسی طور سنائے نہ گئے

سامنے اُنکے کبھی اشک بہائے نہ گئے
غم کے افسانے نگاہوں سے سنائے نہ گئے

دل کے ارمان رہے بنکے حوادث کا شکار
یہ سفینے کبھی ساحل سے لگائے نہ گئے

ہمتِ آہ کبھی، جراتِ نالہ کبھی!
شامِ غم آنکھ سے آنسو بھی بہائے نہ گئے

بات بگڑی ہوئی محشر میں بھی طرفہ نہ بنی
ایسے کچھ ہم سے وہ روٹھے کہ منائے نہ گئے

جناب سلیم سہروردی گوالیاری

جن سے اسرارِ حقیقت کے چھپائے نہ گئے
کب وہ منصورؔ صفت دار پہ لائے نہ گئے

جن میں پائی گئیں الجھنیں سرمستی کی
پھر وہ بدمست کبھی ہوش میں لائے نہ گئے

گرمئ بزم کی خاطر سے کئے ہم نے نالے
مطربِ بزم سے نغمے جو سنائے نہ گئے

شکوۂ دوریِ منزل ہے سراسر مہمل
جب قدم جانبِ منزل ہی بڑھائے نہ گئے

شدّتِ یاس سے یہ حال ہوا اپنا سلیم
دل میں اُمید کے نقشے بھی جمائے نہ گئے

جناب منیر نقشبندی کولاری

سجدۂ شوق جو کرتے تو کہاں ہم اے دوست
جب ترے نقشِ قدم راہ میں پائے نہ گئے

ہمنشیں! جلوہ گہِ حسن کا دستور نہ پوچھ
اک ہمیں ہیں جو کبھی ہوش میں لائے نہ گئے

بت پرستی میں بھی ناکام رہا دل میرا
حق پرستی کے بھی آئین سکھائے نہ گئے

جن سے ہو جاتی تھی خود دردِ محبت تازہ
انجمن میں ہمیں وہ گیت سنائے نہ گئے

کیا ہوا، چھلکے اگر محفلِ عالم پہ منیر
اس ستمگر کی نظر میں تو سمائے نہ گئے

جناب ہلال برہمی از کوکشی

سلسلے ہم سے محبت کے مٹائے نہ گئے
زخم بخشے تھے جو اُس نے وہ دکھائے نہ گئے

دل یہ کہتا ہے کہ دامن کو پکڑ اُٹھ کے
اور وہ بزمِ تصور میں نہ آئے نہ گئے

ہم نے تو بارہا زمانے کو بنایا لیکن
مٹ گئے ہم تو زمانے سے بنائے نہ گئے

کاش تم سازِ محبت پہ وہ چھیڑو نغمے
بربطِ دل پہ ازل سے جو سنائے نہ گئے

ہائے یہ جبرِ محبت کہ محبت میں ہلال
بھول جانے پہ بھی وہ ہم سے بھلائے نہ گئے

جناب کلیم شمس آبادی

حشر تک راہِ محبت میں اُٹھائے نہ گئے
کتنے فتنے ترے ایما سے جگائے نہ گئے

ہم کو بے راہ روی پر کوئی الزام نہ دے
اپنی مرضی سے ہم اس دہر میں آئے نہ گئے

روٹھ کر تجھ سے بنے ملحد و کافر کتنے
تیرے بندے تھے مگر تجھ سے نبھائے نہ گئے

کتنے دعوے تھے انا الحق کے جو باطل ہو کر
کتنے منصورؔ سرِ دار چڑھائے نہ گئے

حق تو یہ ہے ہمیں ممنونِ کرم ہونا تھا
منحرف تجھ سے ہوئے بھی تو مٹائے نہ گئے

جناب شان اویسی احمد پور شرقیہ

اُن سے آثارِ محبت کے چھپائے نہ گئے
ضبط کے بار مرے دل سے اُٹھائے نہ گئے

محو گریہ بھی رہا حائلِ نالہ بھی ہوا
حسن سے پھر بھی مرے ناز اُٹھائے نہ گئے

آرزو دل میں رہی اور سنائی نہ گئی
کام بگڑے ہی رہے اور بنائے نہ گئے

پاسِ آدابِ محبت تھا مقدم اے شان
اُنکے شکوے لبِ اظہار پہ لائے نہ گئے

ابوالبیان جناب نازش پرتابگڈھی

تیرے ہونٹوں سے ابھی "اپنے پرائے" نہ گئے
یہ تعصب کے حجابات ہٹائے نہ گئے

میں ہمیشہ رہا ناکامِ محبت ہمدم
پریت کے گیت مرے ساز پہ گائے نہ گئے

کیا سناتے انہیں رودادِ محبت آخر
یہ بڑے درد بھرے گیت تھے گائے نہ گئے

دارئ دہر میں حاصل ہو بلندی کیونکر
اُن سروں کو جو ترے در پہ جھکائے نہ گئے

جناب وفا جون پوری

اک جھلک دیکھ کے ایسا کھوئے کہ پائے نہ گئے
تیرے دیوانے کبھی ہوش میں لائے نہ گئے

اللہ اللہ یہ گم کردگیِ منزلِ زیست
کھوئے یوں گردِ حوادث میں کہ پائے نہ گئے

یہ گلہ تجھ سے ہے اے دیدۂ خونبار مجھے
میرے اسرارِ محبت بھی چھپائے نہ گئے

سلب تھی قوتِ گریہ دمِ بربادیِ دل
لاکھ کی سعی مگر اشک بہائے نہ گئے

---

[1] مراد حضرت علامہ سیماب مدظلہ العالی

جناب نسیم سیتاپوری

بے خودِ عشق تھے ہم ہوش میں لائے نہ گئے
کھوئے یوں اُنکی تمنا میں کہ پائے نہ گئے

داغِ دل معلق اُن کو دکھائے نہ گئے
ہم سے وہ اور پشیمان بنائے نہ گئے

طورِ موسیٰ پہ نہ آج آئی، بڑی حیرت ہے
میری دانست میں جلوے ہی دکھائے نہ گئے

منفعل آج نہ ہوتا میں سرِ بزم نسیم
عشق کو حسن کے آداب سکھائے نہ گئے

جناب ثاقب ساطر بڑوانی

اُن کو نغماتِ الم ہائے سنائے نہ گئے
عشق کے گیت کسی لے میں بھی گائے نہ گئے

کبھی صیاد کا ڈر تھا تو کبھی بجلی کا
فصلِ گل آئی مگر لطف اٹھائے نہ گئے

اذن تو بار ملا بھول کو پروانے کو
اک ہمیں آپ کی محفل میں بلائے نہ گئے

جذبۂ عشق کو ہم اپنے کہیں کیا ثاقب
لاکھ کوشش پہ بھی وہ دل سے بھلائے نہ گئے

جناب قاصر راوری

اشک آنکھوں سے بھی تو آگھوڑے گرائے نہ گئے
خاک میں گوہرِ نایاب ملائے نہ گئے

کر دیا تیری تجلی نے نمایاں اے دوست
بار سے داغِ جگر مجھ سے چھپائے نہ گئے

کیوں ترے عشق میں ہیں حضرتِ قاصر بدنام
تیرے کوچے میں کسی روز نہ آئے نہ گئے

جناب خیال قریشی احمد آبادی

حسن کے ناز زمانے کی روش چرخ کے دور
کیا وہ انداز تھے جو تم کو سکھائے نہ گئے

کیسے کا کسی ناکام کا بگڑا ہوا کام
تم سے ٹوٹے ہوئے دل بھی تو بنائے نہ گئے

ان سے تاثیرِ محبت کا گلہ ہے بیکار
دل کو خود درد کے آداب سکھائے نہ گئے

جناب طالب جاگیردار سندیرا

رعب تھا حسن کا یہ۔ سامنے جا کر اُنکے
اپنی روداد کے دو لفظ سنائے نہ گئے

زندگی خاک میں ملنے کا صلہ خوب ملا
ہم سے دو پھول بھی تربت پہ چڑھائے نہ گئے

صُورِ محشر کی صدا سے بھی نہ اُٹھے ہم لوگ
لبِ جاں بخش سے مُردے جو جِلائے نہ گئے

جناب عالی علی نگری

ضبط کی لاج، محبت کا ادب، پاسِ وفا
خشک ایسے ہوئے آنسو کہ بہائے نہ گئے

پردہ رکھ تری رحمت نے ہر یہ کارواں کا
ہر پرسش جو دمِ حشر بلائے نہ گئے

ان اماناتِ گراں کا ہوں میں حامل عالی
قدسیوں سے بھی ازل میں جو اُٹھائے نہ گئے

جناب انجام کاشمیری

محویت کا ہے وہ عالم کہ الٰہی توبہ!
ہوش میں آکے بھی ہم ہوش میں آئے نہ گئے

زندگی اُنکی نہیں موت سے کم دنیا میں
تیرے ہاتھوں سے جو کمبخت ستائے نہ گئے

وہ تبسم وہ اچٹتی سی نظر اور وہ حیا
اُف وہ لمحے جو کسی طرح بھلائے نہ گئے

جناب خلیق ایولوی

اُن سے پردے رخِ زیبا کے اُٹھائے نہ گئے
طالبِ دید کو جلوے بھی دکھائے نہ گئے

خود سمجھ لیتے وہ رودادِ محبت، لیکن
اُنکو اشعار کبھی میرے سنائے نہ گئے

خامیاں دیکھ چکے ہم تری آوازِ درا
تجھ سے سوئے ہوئے رہرو بھی جگائے نہ گئے

جناب نصرت آروی

ٹکڑے ٹکڑے جو نہ ہوتا تو یہ پھر کیا ہوتا
دل کے دو حرف ازل ہی سے ملائے نہ گئے

بس وہی داغ ہیں حسن کے تزئین کا سبب
دامنِ عشق سے نصرت جو مٹائے نہ گئے

جناب سلطان باروی

حال کی جلوہ طرازی تھی نظرکش اتنی
نقشِ ماضی پہ قدم ہم سے جمائے نہ گئے

رہروانِ عدم آباد کا عالم، توبہ!
ایسے روٹھے کہ کسی سے بھی منائے نہ گئے

جناب کفیل ازسگولی

میری ہستی تو زمانے سے مٹا دی تو نے
کیوں مرے نقشِ وفا تجھ سے مٹائے نہ گئے

ہو نہ جائیں وہ کہیں حشر میں بدنام کفیل
اس لیے داغِ جگر ہم سے دکھائے نہ گئے

جناب محمود ایولوی

ہیں بہاریں ترے اندازِ تبسم پہ نثار
ایسے گل، بادِ بہاری سے کھلائے نہ گئے

جناب اسعد السدیدی لکھنوی

لغزشیں ہونے لگیں دیکھ کے جلوہ اُن کا
عشق کو حسن کے آداب سکھائے نہ گئے

اصلاحِ سخن

:- جناب مولانا حافظ سید شاہ عنایت مولی صاحب تاباںؔ القادری کی غزل پر حضرت علامہ خان بہادر سید رضا علی وحشتؔ کلکتوی کی اصلاح

ہو بھی سکتا ہے کہیں برقع
~~نقاب بے معنی ہوئی ثابت~~ نقابِ حسنِ دوست ۱ چھوٹی پڑتی ہے شعاعِ آفتابِ حسنِ دوست

ہے حریفانہ تقابل، دبنے والا میں نہیں
~~اب عوض اُنکے جہاں میں جلوہ فرما ہوں میں~~ ۲ عشقِ صادق بنگیا میرا جوابِ حسنِ دوست

خودنمائی پردہ آمادہ ہے لیکن کیا کروں
~~بے حجابی کے تو ہیں پہلو پر اسکا ایک علاج~~ ۳ رُعبِ حسنِ دوست ہی مجھکو نقابِ حسنِ دوست

عبرت آگیں حالتِ شبنم سے یہ ظاہر ہوا ۴ بن نہیں سکتا کبھی ہرگز خرابِ حسنِ دوست

کرتے جاتے ہیں شکایت تشنگیٔ ذوق کی ۵ پیتے جاتے بھی ہیں آنکھوں سے شرابِ حسنِ دوست

تھا مثالِ قطرۂ شبنم جہاں میں ایک رات ۶ چھو گئی مجھکو شعاعِ آفتابِ حسنِ دوست

دیکھنا ہے پھر مجھے تاباںؔ تماشہ عشق کا
۷ از سرِ نو چھیڑتا ہوں پھر ربابِ حسنِ دوست

توجیہ :-

(۱) مصرع اولیٰ بے ربط تھا اصلاح نے دونوں مصرعوں میں ربط پیدا کر دیا "چھوٹ پڑتی ہے" بھی غلط تھا "چھوٹی" ہی ہونا چاہئیے تھا اگر پہلا مصرع یوں "ہو نہیں سکتا کبھی برقع" بنا دیا جاتا تو بہتر تھا۔

(۲) تاباںؔ صاحب کا مصرع کسی حد تک "جوابِ حسنِ دوست" کی تفسیر و توضیح تھا لیکن اصلاح میں "جواب" کی رعایت سے "حریفانہ تقابل" رکھا گیا اور مصرع ثانی اچھا ہو گیا۔ گو لطافت اور شعریت کم ہو گئی۔

(۳) تاباںؔ صاحب کے مصرع میں بھرتی کے الفاظ تھے حالانکہ مفہوم صحیح تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے "پر" بمعنی "مگر" استعمال کیا ہے۔ اسکا بدلنا ضروری تھا۔ اصلاح بہت خوب دیگئی ہے۔ "بے حجابی" سے "خودنمائی" کہیں اچھا ہے۔

(۴) حضرت علامہ وحشتؔ مجھے معاف فرمائیں اس شعر میں اصلاح کی ضرورت تھی اوّل تو مصرع ثانی کا مفہوم مکمل نہیں دوسرے "کبھی ہرگز" محلِ نظر ہے یا تو صرف "کبھی" [illegible] "ہرگز" [illegible] مصرع [illegible] ظاہر ہوا" [illegible] مطلب ہے۔ میری ناچیز رائے میں مصرع کچھ اس طرح ہوتا تو مناسب تھا ؎

عبرت آگیں حالتِ شبنم ہے میرے واسطے

اور دوسرا مصرع اس انداز سے ؎

بھول کر میں ہو نہیں سکتا خرابِ حسنِ دوست

(۵) اس شعر کے دوسرے مصرع میں "بھی" کا محل بالکل غلط ہے۔ "پیتے" کے بعد "بھی" کو واقع ہونا چاہئیے تھا۔

یا ایسے یوں بنایا جا سکتا تھا ؎

کرتے جاتے ہیں شکایت تشنگیٔ ذوق کی　　پیتے جاتے ہیں نگاہوں سے شرابِ حسنِ دوست

اُمید کہ علامہ وحشتؔ میری اس معروضہ توجیہ کو اعتراض پر محمول نہ فرمائیں گے بلکہ اختلافِ رائے کی صورت میں مجھے غلط فہمی سے آگاہ فرمائیں گے۔

اعجاز صدیقی

سالِ اجرا موسمِ بہار ۱۹۳۰ء ——— عرصۂ اشاعت ۱۴ سال

قصر الادب کا خالص علمی و ادبی ماہنامہ

جلد ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۴۴ء نمبر ۱

تعارف

شاعر آگرہ

زیرِ سرپرستی

اعلیحضرت رسوا مظلومی والیٔ پاجود (کاٹھیاواڑ)

عالیجناب سردار صدیق محمد خاں صاحب۔ ریونیو منسٹر (نابھہ)

منظور شدہ

محکمہ ہائے تعلیم صوبہ پنجاب، صوبہ ممالک متوسط و برار

ریاست میسور، ریاست کشمیر، حکومت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

چندہ سالانہ

عوام سے	۴ر	معاونین سے	۲۴ر
خواص سے	۶ر	مربیوں سے	[illegible]
ہمدردوں سے	۱۲ر	محسنین سے	۶۰ر
انیسوں سے	۱۵ر	سرپرستوں سے	۱۲۵ر

ششماہی ۸ر — فی پرچہ ۶ر

اشاعت گاہ

مکتبۂ قصر الادب آگرہ

محسنین، مربی، معاونین، خاصان و ہمدردان شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہر گوبند دیال صاحب نشترؔ ہنگامی ۵۶ سالانہ
(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیّرؔ خورجوی ۵۶ سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۵۶ سالانہ
(۴) محسنِ ادب وزیر زادہ شجاعت خانصاحب مہرؔ جوناگڈھی ۵۶ سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۵) مربیِ ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز و اسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹانگر) ۵۰ سالانہ

معاونین ادب

(۶) معاونِ ادب بیرسٹر۔ بی لطیف صابرؔ بی۔اے اکبر آبادی ۲۴ سالانہ
(۷) معاونِ ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسیؔ متوطن رڑکی (بمبئی) ۲۴ سالانہ
(۸) معاونِ ادب محترمہ تجمل تصدق ایم۔اے۔ بی ٹی مدیرہ رسالہ "ادیب" دہلی ۲۴ سالانہ
(۹) معاونِ ادب جناب صوبہ دار اختر علی صاحب گوالیاری ۲۴ سالانہ
(۱۰) معاونِ ادب جناب سید یوسف پیر صاحب نیّرؔ کہمی بھدرا چلم ۲۴ سالانہ
(۱۱) معاونِ ادب جناب مخدوم سید علی اسد صاحب نقوی النجاری، احمد آباد جھنگ ۲۴ سالانہ

ہمدردان ادب

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبد الغفور صاحب سلیمان جالندھری ۱۲ سالانہ
(۱۳) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیمؔ گوالیاری مرحوم ۱۲ سالانہ
(۱۴) ہمدردِ ادب جناب بابو عبد العظیم خانصاحب رونقؔ دکنی جمشید پور ۱۲ سالانہ
(۱۵) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب زارؔ جوناگڈھی ۱۲ سالانہ
(۱۶) ہمدردِ ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲ سالانہ
(۱۷) ہمدردِ ادب جناب نوابزادہ تسکور حسین خانصاحب قیسؔ آف ٹونڈو ۱۲ سالانہ
(۱۸) ہمدردِ ادب جناب غلام محمد شاہ صاحب رئیس اعظم دجوہہ ٹینوٹ ضلع جھنگ ۱۲ سالانہ
(۱۹) ہمدردِ ادب محترمہ بلقیس جہان آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۱۲ سالانہ
(۲۰) ہمدردِ ادب جناب محبوب خانصاحب کیل صدر دربار سخن چوپڑہ (مشرقی خاندیش) ۱۲ سالانہ

خاصان ادب

(۲۱) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمٰن خانصاحب شفقؔ ٹونکی ۶ سالانہ
(۲۲) جناب عبد الحفیظ صاحب ترؔ صدیقی پھرادی بی۔اے ۶ سالانہ
(۲۳) جناب لالہ گنگا رام صاحب ایڈیٹر بندنی ۶ سالانہ
(۲۴) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشیؔ غازی آباد ۶ سالانہ
(۲۵) جناب محمد عبید اللہ خانصاحب آزمؔ امروہوی ۶ سالانہ
(۲۶) جناب نذیر احمد صاحب نذیرؔ لہرکوٹی ۶ سالانہ
(۲۷) جناب بادشاہ حسن خانصاحب آرزؔ ببی ۶ سالانہ
(۲۸) جناب حفیظ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶ سالانہ
(۲۹) جناب پریم چند صاحب پریمؔ دہلوی ۶ سالانہ
(۳۰) جناب [illegible] بہوانی لدھیانوی ۶ سالانہ
(۳۱) [illegible] ۶ سالانہ

(۳۳) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶ سالانہ
(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثرؔ نقوی کوٹہ ۶ سالانہ
(۳۵) جناب شیو پرشاد صاحب برقؔ باندوی ۶ سالانہ
(۳۶) جناب حکیم مولوی عبد الرحمٰن صاحب شاعرؔ کاندھلوی ۶ سالانہ
(۳۷) علامہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفیؔ دہلوی ۶ سالانہ
(۳۸) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعرؔ شہسوردی ۶ سالانہ
(۳۹) جناب کنور فاروق علی خاں صاحب عارفؔ رئیس ٹونڈو ۶ سالانہ
(۴۰) جناب مقبول احمد صاحب سحرؔ اعظم گڈھی ۶ سالانہ
(۴۱) جناب مولوی مظہر الدین صاحب مظہرؔ بامداسی گورداسپور ۶ سالانہ
(۴۲) جناب ڈاکٹر ماما پرشاد صاحب استمانہ زیبؔ بریلوی ۶ سالانہ
(۴۳) جناب حبیب الرحمٰن صاحب حبیبؔ آروی جمشید پور ۶ سالانہ
(۴۴) جناب عبد الرؤف صاحب ثاقبؔ جرجانی اسٹیٹ ۶ سالانہ
(۴۵) جناب من موہن ولی صاحب ساگری چھندواڑہ (سی۔پی) ۶ سالانہ
(۴۶) جناب محمد حسین صاحب خادمؔ شلوی دہلی ۶ سالانہ
(۴۷) جناب چودہری حلیم یار صاحب فتحپور ۶ سالانہ
(۴۸) جناب سید شاہ عنایت مولیٰ صاحب تاباںؔ القادری مناپور (بنگال) ۶ سالانہ
(۴۹) جناب جمعدار سی بی مجاہد صاحب بمبئی ۶ سالانہ
(۵۰) جناب شیخ عبد الرحمٰن صاحب شبابؔ دہلوی ریواڑی ۶ سالانہ
(۵۱) جناب ملک قربان حسین صاحب شہیدؔ جہلی بمبئی ۶ سالانہ
(۵۲) جناب عبد الرؤف صاحب ذوقیؔ سکریٹری اقبال لائبریری نواد گنج (گیا) ۶ سالانہ
(۵۳) جناب رگھو وندر راؤ صاحب جذبؔ عالیپوری ۶ سالانہ
(۵۴) جناب پنڈت شمبے ناتھ صاحب کول خادمؔ ایم۔ایس۔سی جودھپور ۶ سالانہ
(۵۵) جناب محمد اکرام اللہ صاحب سہاؔ قریشی ایڈووکیٹ بجڈ ۶ سالانہ
(۵۶) جناب میاں گل محمد خانصاحب کھارا رئیس زدکو ضلع گوجرانوالہ ۶ سالانہ
(۵۷) محترمہ بیگم روشن آرا قادری پارک سرکس کلکتہ ۶ سالانہ
(۵۸) محترمہ محمدی بیگم صاحبہ رپن اسٹریٹ کلکتہ ۶ سالانہ
(۵۹) جناب منشی ایم۔ آر شاہ صاحب ایم۔ پی۔ ٹی (آرزدانِ پنجابی و پشتو) انبالہ ۶ سالانہ
(۶۰) جناب غلام حسین صاحب خادمؔ ربانی ۶ سالانہ
(۶۱) [illegible] لائبریری ۶ سالانہ

شعرِ انقلاب

نوروزِ مشترک
سالِ ہجری و عیسوی کی ہم آغازی

ایک ہم "نعمتِ نوروز" کی تحدیث ہے — صرف سہ روزہ تفاوت۔ مظہرِ "تثلیث" ہے
ہے مگر رجحان میں دو ملتوں کے انتشار — عید ہے صحنِ "کلیسا" میں، "حرم" ہے سوگوار
اک طرف افکارِ رنگیں میں اُمنگ آئی ہوئی — اک طرف تخئیل پر خونیں گھٹا چھائی ہوئی
سرخوشی و ساقی و نغمہ فشانی اک طرف — ماتم و تشنہ لبی و نوحہ خوانی اک طرف
مست آنکھوں میں سُرورِ بادۂ رنگیں اُدھر — اور اِدھر مظلومیت کا خون تکلیفِ نظر

دو نئے سالوں کا یکجا جلوۂ آغاز دیکھ
اور پھر دونوں میں یہ تفریقِ سوز و ساز دیکھ

ہیں نمودار آج دو صبحیں اُفق پر پاس پاس — ایک کے لب پر تبسم — ایک کا جلوہ اُداس
دو بہاریں آئی ہیں باغِ جہاں میں ساتھ ساتھ — پھول اِسکے ہاتھ میں، اُسکا گریباں پہ ہاتھ
"جنوری" کا آفتاب، افسانۂ نوروز ہے — چاند آغازِ "محرم" کا پیامِ سوز ہے
اپنی نظریں جذب کر کے صبح کے انوار میں — حدِ ممکن تک رسا ہونے دے انساں زار میں
دورِ حاضر کی تجھے ہر صبح آئے گی نظر — خاک بر سر، شعلہ در دل، خونِ تازہ تا کمر
یہ تصرف ہے "محرم" کا جو عالمگیر ہے — کائناتِ اسلام کے "نوروز" کی تصویر ہے
چار سو پھیلے ہوئے ہیں واقعاتِ کربلا — یعنی ہے انسان کا ہاتھ اور انساں کا گلا

آج اک انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے
خون میں "تہذیب" کیا "انسانیت" بھی غرق ہے

"جنوری" کی صبح اک نوروز لائی بھی تو کیا — لے کر اک وقتی پیامِ عیش، آئی بھی تو کیا
شام سے ہے پھر وہی صبحِ قیامت کا طلوع — دفعتاً ہو روشنی میں جیسے تاریکی شروع
عشرتِ یک لمحہ کیا، جب ہو مصیبت دائمی — ہے شگفتِ زندگی گویا شکستِ زندگی

بے سکونی بیشتر ہے، عافیت کم ہے یہاں
سال بھر اب تو محرم ہی محرم ہے یہاں

کاش یہ انسان اپنی قوتوں سے کام لے — اپنے ہاتھوں میں نظامِ گردشِ ایام لے
کاش ہمت اس میں ہو تجدید اور ترمیم کی — فکرِ تازہ سے بدل دے کہنگی تقویم کی
منضبط "انسانیت" کا اک نیا آئین ہو — ہو سکوں آغاز میں، انجام میں تسکین ہو
ختم ہوں جھگڑے یہ سب تخریب اور تعمیر کے — ہو حقیقت، رُونما باطل کا سینہ چیر کے

زندگی کی روح سے انساں کیف اندوز ہو
کاش اس دنیا میں ایسا بھی کوئی "نوروز" ہو

۲۸ دسمبر ۱۹۴۳ء

سیماب اکبرآبادی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

تقویم میں "نوروز" سرافراز ہوا
لیکن نہ درِ امن و سکوں باز ہوا
جس روز یہ جنگ ختم ہو جائیگی
سمجھونگا کہ "عہدِ نو" کا آغاز ہوا

تھی صورتِ ایّامِ گذشتہ اچھّی
نوعیّتِ آرامِ گذشتہ اچھّی
لتھڑی ہوئی خون میں ہے صبحِ نوروز
اس سے تو مری شامِ گذشتہ اچھی

ہر چند کہ زار و ناتواں ہیں ہم لوگ
حیرت سے بہ ہر سو نگراں ہیں ہم لوگ
حیراں ہیں ہستی کی کسی منزل میں
لیکن یہ خبر نہیں کہاں ہیں ہم لوگ

دُنیا میں ہے زعمِ حکمرانی سب کو
سب کو ہے غرورِ لن ترانی سب کو
ذہنِ فطرت سے آگ جب بھڑکے گی
کر جائے گی اک آن میں پانی سب کو

تدبیر کی یہ اُمنگ۔ اللہ اللہ!
یہ عقل و خرد کا رنگ۔ اللہ اللہ!
ممکن نہیں امنِ حال توبہ توبہ!
فکرِ مابعدِ جنگ، اللہ اللہ!

دُنیا نے خودی میں خود نمائی کر لی
انسان سے قوت آزمائی کر لی
اس جنگ کے پردے میں عیاذاً باللہ!
"سائنس" نے کچھ دنوں خدائی کر لی

مانا یہ بساطِ رزمِ تاریخی ہے
اسکی بھی نشاطِ بزمِ تاریخی ہے
ہے آگ کے شعلوں میں مسلسل قائم
"ٹرکی" کا ثبات و عزمِ تاریخی ہے

انسان، بنا تھا عیش و عشرت کے لئے
اور اب محتاج ہے مسرت کے لئے
یہ چاند، یہ سورج، یہ زماں اور مکاں
سب اس کے لئے۔ یہ جنگ و غارت کے لئے!

بے عزم و عمل، حقیقت الفاظ کی ہے
کانوں پہ فقط حکومت الفاظ کی ہے
ہوگا اسکا اثر حکومت پر کیا
دل کی نہیں، یہ بغاوت الفاظ کی ہے

"بنگال" میں بھوک بھی ہے بیماری بھی
پھیلی ہوئی ہر طرف ہے بیکاری بھی
یہ روگ ہی کیا کم ہیں فنا کرنے کو
اور ان پہ ہے "مستزاد" "بم باری" بھی

سیماب

جرعات

کبھی سالِ نَو کی مبارکباد دیتے ہوئے ایک لذّت، ایک کیف اور ایک سرخوشی سی محسوس ہوا کرتی تھی لیکن اب آغازِ سال کے خیال ہی سے دل دھڑکنے لگتا ہے کہ خدا جانے کن خطرات اور تباہیوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے آئے۔ بہر حال صلح د امن کی اُمیدوں کے ساتھ ہم اسکا استقبال کر رہے ہیں۔ خدا کرے یہ سال ساری دُنیا کے لئے سکون و اطمینان لائے اور جنگ سے پیدا شدہ حالات اعتدال پر آجائیں۔

سالِ نو کا پہلا شمارہ آپ کے سامنے ہے "شاعر" اپنی زندگی کے پندرہویں سال میں قدم رکھ رہا ہے، کسے اُمید تھی کہ یہ اپنے بچپن کی منزلیں طے کرکے جوانی کے دن رات دیکھے گا۔ خدائے لم یزل کا ہزار ہزار شکر ہے کہ یو۔ پی کا یہ ماہنامہ دوسرے صوبوں کے دوش بدوش علم و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ جہاں اُس نے روح کے لئے سامانِ کیف بہم پہونچایا وہیں زبان اور علم و فن کے نہ مٹنے والے نقوش بھی آہستہ آہستہ اُردو داں طبقے کے دلوں پر ثبت کر دیئے اور آج ہر طبقہ میں "شاعر" کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ جنوری ۱۹۴۴ء کی یہ تازہ اشاعت ایک متنوع ترتیب کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔ اُمید کہ ناظرین پسند فرمائینگے۔ اس اشاعت میں نظم و نثر مضامین کا ایک ستھرا انتخاب نظر آئیگا۔ کاش ہمیں کاغذ کے سلسلے میں آسانیاں میسر ہوتیں تاہم اس سے زیادہ مضامین پیش کر سکتے۔ "مدیرِ شاعر" کا مطمحِ نظر بہت بلند ہے، اب نہیں تو کچھ مدّت کے بعد "شاعر" ضرور اُس ادبی بصیرت کا آئینہ دار ہوگا جو نگاہ و دل میں محفوظ ہے۔ اس مرتبہ مضامین کسی قدر طویل ہیں اسی لئے حصّۂ نظم کے لئے زیادہ گنجائش نہ نکل سکی۔ "ڈائری" اس مرتبہ بھی شائع نہیں ہو رہی ہے۔ خیال ہے کہ فروری کے "شاعر" میں اسکو مکمل کر دیا جائے۔

"**شاعر**" ہندوستان کا شاید پہلا ماہنامہ ہے جس کی خدمات کا اعتراف اور قدر افزائی ملک کے صاحبِ ثروت طبقہ نے زیادہ سے زیادہ کی ہے، یہ کچھ کم باعثِ مسرت نہیں کہ وہ عوام اور خواص دونوں میں یکساں مقبول ہے۔ نیا سال "شاعر" کے لئے ترقیوں کامیابیوں کا مژدہ اپنے ساتھ لیکر آیا ہے۔ ناظرین بھی اس اطلاع سے یقیناً مسرور ہونگے کہ اُس کے سرپرستوں میں ایک نہایت علم دوست و ادب نواز ہستی کا اضافہ ہو رہا ہے۔ محترمی سردار صدیق محمد خاں صاحب ریونیو منسٹر ریاست نابھہ اُن بزرگوں میں سے ہیں جن سے گھرانے سے دامے، درمے اور سخنے اُردو زبان کو مدد ملتی رہی ہے۔ موصوف نے "شاعر" کی سرپرستی قبول فرماکر جس معارف پروری کا ثبوت دیا ہے وہ نہ صرف ادارہ بلکہ تمام ادبی دنیا کے شکریہ کا مستحق ہے۔

"شاعر" تعلیمی حلقوں میں زیادہ سے زیادہ [illegible]

ریاستوں کے محکمہ ہائے تعلیم اُسے اسکولوں اور کالجوں کے لئے منظور کر چکے ہیں اور منظور کر رہی ہیں۔ اس سال کے آغاز سے ہندوستان کے ایک بڑے اور اُردو نواز صوبے نے بھی اُسے منظور کر لیا ہے ڈائرکٹر صاحب محکمہ اطلاعات صوبہ پنجاب اپنے خط ع۶۳۵۶۲ مورخہ ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۳ء کے ذریعہ مطلع فرماتے ہیں کہ "شاعر" صوبہ پنجاب کے تمام مڈل اسکولوں۔ ہائی اسکولوں اور کالجوں کے لئے منظور کر لیا گیا ہے۔ ادارہ سررشتۂ تعلیم پنجاب کی اس "شاعر" نوازی کے لئے ممنون ہے۔ اُمید کہ پنجاب کے تعلیمی ادارے "شاعر" کو بیش از بیش جاری کرائینگے اس لئے کہ وہ طلبا اور اساتذہ دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ پنجاب کے مختلف شہروں اور قصبات میں "شاعر" سے محبت کرنے والے حضرات بھی اس ذیل میں کوشش فرمائیں اور اپنے مقامی اسکولوں کو خریداری کی ترغیب دیں۔

جناب مخدوم سید علی اسد نقوی البخاری احمد آبادی "شاعر" کے بڑے سرگرم مددگار ہیں۔ موصوف بذاتِ خود اس سال سے "شاعر" کے "معاونین" میں شریک ہو رہے ہیں۔ ادارہ ان کی ادب نوازی کا بھی ممنون ہے۔

میں کئی ماہ سے بے پناہ مصروفیتوں کا شکار رہوں۔ ادھر ساتھ آٹھ ماہ سے آنکھوں میں تکلیف ہے، کاروباری کام کاج، مشاعروں اور ادبی جلسوں کے سلسلے میں پے در پے سفر اس کے علاوہ ہیں، انھیں وجوہ کی بنا پر بعض دوستوں اور کرم فرماؤں کو خطوط کے جواب بھی نہ جا سکے۔ محبت کرنیوالے ناراض ہیں اور کرم فرما شکوہ سرا ـــــ خطوط کے پلندے میری نگاہوں کے سامنے ہیں ان شاء اللہ جلد از جلد سب کی شکایتیں رفع ہو جائینگی "شاعر" بھی اسی وجہ سے بہ تاخیر شائع ہو رہا ہے۔

نئے خریدار دینے والے کرم فرما

۱۔ جناب نعمان تاثر صاحب کراچی	۳ خریدار	(خاص)
۲۔ جناب مطیع اللہ خاں صاحب رضا نظامی راجوری ۲ خریدار		″
۳۔ جناب شمس زبیری مراد آبادی	۱ خریدار	(عام)
۴۔ جناب کلیم شمس آبادی	۱ ″	″
۵۔ جناب عارف ابراہیم یوسف برکار انعامدار بانکوٹ	۱ ″	″
۶۔ جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور	۱ ″	″
۷۔ جناب خادم صدیقی زیباتی جبلپور	۱ ″	″
۸۔ جناب نسیم سیتاپوری	۲ ″	″
۹۔ جناب دیا پرکاش سرور ایڈیٹر اخبار شانِ ہند ملتان	۱	خریدار عام
۱۰۔ جناب پیرزادہ قاضی معین الدین احمد صاحب ہادی احمد پور شرقیہ	۴ ″	″
۱۱۔ جناب [illegible]	۱ ″	[illegible]

ہندی اور مسلمان

ان مفروضات کے رسوخ و استحکام کی سعی ہیں کہ اُردو عہد شاہجہانی کی پیداوار ہے۔ یا یہ کہ دکن یا پنجاب اس کے مولد ہیں کتنے ہی دفاتر کیوں نہ سیاہ کئے جائیں یہ حقیقت حقیقت ہی رہے گی کہ اُردو اور ہندی دو مختلف نام ہیں صرف ایک زبان کے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی بات کی پچ میں زبان اور بولی کے فرق کو نظر انداز کر دیں۔

فریاد از درازئ خواب گرانِ ما

ملکشوں کے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ وہ سنسکرت کے بھاری بھرکم۔ ثقیل اور پرشکوہ الفاظ کے صحیح تلفظ پر قدرت حاصل کر سکیں۔ الفاظ کی ساخت پر جغرافیائی قدود کا بھی معتدبہ اثر پڑتا ہے۔ ایک ہی لفظ مختلف ممالک میں تخالفِ آب و ہوا کے زیر اثر مختلف صوتی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ملکشوں کے منہ لگ کر سنسکرت کی قلب ماہیت ہو گئی۔ اور تلفظ کے تناقص و غرابت نے ایک دوسری ہی زبان کا سنگِ بنیاد رکھدیا۔ اس زبان کو عرفِ عام میں" پالی کہا جاتا ہے"

کچھ عرصہ بعد پالی کو عوام کی زبان قرار دے کر ثقات نے سنسکرت کی دوسری بیٹی کو "پراکرت" کا درجہ بخشا اور پتنجلی جیسے متبحر نے پراکرت کی گرامر کی تدوین سے اسکو اصل زبان کا اعزاز سپرد کر دیا۔ مرورِ ایام سے پراکرت نے بھی چولا بدلنا شروع کیا اور بالکل فطری طور پر ایک اور نئی زبان جنم لینے لگی۔ اس زبان کو عرفِ عام میں ہندی کہا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ وہی زبان ہے جسکو عہدِ شاہجہانی میں اردوئے معلیٰ کا لقب دیا گیا۔

آب از شرار سنگ خورد گلستانِ ما

اس نئی زبان کی ارتقا کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:۔

سنسکرت	پراکرت	نئی زبان
کرپٹ	کپڑو	کپڑا
شتھل	سڈھل	ڈھیلا
اشرو	انسو	آنسو
سپت	ست	سات
سرپ	سپ	سانپ
کرم	کم	کام
ہست	ہتھ	ہاتھ
کرن	کن	کان
مکھ	مہو	منہ

اُردو کو عہدِ شاہجہانی کی پیداوار کہنا یا اس کا ڈانڈا دکن یا صوفیائے اسلام یا کسی مخصوص جماعت سے ملانا اُردو پر ظلم ہے ——

فغاں از غالِ ہندویت کہ کافر کرد غازی را

اگر اُردو نام ہے پراکرت میں عربی اور فارسی الفاظ کے تداخل و آمیزش کا تو پرتھوی راج کے عہد کی زبان کو کیا نام دیا جائیگا جبکہ اُس کا درباری شاعر چند بردائی بلا تکلف عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرتا ہے دیکھئے:۔

ستھین ساتھ کھیلت پھریں محلن باغ نورس
کیر اک دشٹے نین تب من بھیو ہولاس
سنگن سُدہ گن چڑھہ زنجیر
چکّے نہ سبد بیدھنت تیر
جاوں سکھ برات گے تادن گئے پرتھی راج
تاہی دن تیاہ کول بھئی گجّنے آواز
سُن گجّنے آواز چڑھیو صاحب دین بہ
خراساں سلطان کاس کا بلیئی بیر دھر
جنگ جرت ظالم جبار بیج سار بجار ہو
گھر دھکک بیج سبس گگن روی لپ دین ہو

محلن - باغ - زنجیر - تیر - آواز - سلطان - جنگ - ظالم - الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہ الفاظ بے تکلف خواص میں بولے جاتے تھے۔ عہدِ شاہجہانی اور پرتھوی راج کے دورِ حکومت میں صدیوں کا تفاوت ہے۔ پھر عربی اور فارسی الفاظ کی پراکرت میں آمیزش کے آغاز کو عہدِ شاہجہانی سے منسوب کرنا تاریخی بے خبری نہیں تو اور کیا ہے! اس تمام کاوش کا و خامہ فرسائی سے میرا مقصد یہ ثابت کرنے کے سوا کچھ نہیں

اُردو سنسکرت کے زوال کے بعد ہی معرض وجود میں آگئی تھی۔ اس کو ابتدا میں ہندی کہتے رہے اور دورِ شاہجہانی میں اس کو اردوئے معلّیٰ کے لقب سے مُلقب کیا گیا۔ خلطِ مبحث سے بچنے کے لئے میں آئندہ سطور میں اِس نوزائیدہ زبان کو "ہندی" ہی کے نام سے یاد کرونگا۔

خود ہندو مبصّرین کو چندربردائی کو ہندی کا پہلا شاعر ماننے میں تامّل ہے اس لئے کہ اس کے یہاں پراکرت شبدوں کی بھرمار ہے اور پراکرت بھی ایسی کہ جسے آج کل معدودے چند پنڈت سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ کبیر صاحب، نانک۔ تلسی داس، راداس۔ ملک محمد جائسی وغیرہ ہندی کے پہلے دَور کے شاعر شمار کئے جاتے ہیں اور ان سب کے کلام میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ یہ سب عہدِ اکبری کے شاعر ہیں۔ جو ہندی شاعری کی تاریخ میں ہندی کا "دورِ زرّیں" کہلاتا ہے۔ اکبر کا دربار ہندی شعرا کا مرجع تھا۔ اکبر خود ہندی میں فکرِ سخن کرتا تھا۔ مندرجۂ ذیل چھند اکبر کی فکر کا نتیجہ بتائے جاتے ہیں۔

جاکو جس ہے جگت میں جگت سراہے جاہ
تاکو جیون سپھل ہے کہت اکبر شاہ
شاہ اکبر اک سمے چلے کانہہ دلوذ ملوکن بالھیں
آہٹ تے ابلا نرکھیو چک چونک چلی کری اتر چلیں
تیوں بل بینی سدھار دھیری سو بھتی چھب یوں للنا اَرلاہی
چپک چار دکمان چڑھاوت کام جیون ہاتھ لئے اہ ماہیں

اکبر نے سلیم کو بھی ہندی کی تعلیم دلائی۔ خسرو (پوتہ) کو تو چھ سال ہی کی عمر میں ہندی سیکھنے کے لئے بجودت بھاچاریہ کے حوالہ کردیا۔ شاہجہاں ہندی میں دستگاہِ کامل رکھتا تھا۔ اُس کے دربار سے متعدد ہندو شعرا وابستہ تھے۔ دارا ہندی سنسکرت کا جیّد عالم تھا۔ اُس نے اُپنشد کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ عالمگیر جسے ہندوکش کہا جاتا ہے۔ ہندی لکھنا اور بولنا بہت پسند کرتا تھا۔ ایک دفعہ شاہزادہ اعظم نے کچھ آم اُس کے پاس بھیجے اور درخواست کی کہ آموں کے نام تجویز کر دیجئے۔ عالمگیر نے جواب میں لکھا "تم سو تین ودوان ہوکر بوڑھے باپ کو کیوں کشٹ دیتے ہو۔ تمہاری پرسنتا کی خاطر آموں کے نام میں نے "سدھا رس" اور "رس بلاس" رکھے ہیں"۔

مغلیہ دربار میں ہندی گویّوں کی بھی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اکبر نے تان سین کو پہلے ہی مجرے میں ایک کروڑ کا انعام عطا فرمایا۔ بیرم خاں خانخاناں نے بابا رامداس کو ایک دن میں ایک لاکھ روپے دے ڈالے۔ شاہجہاں نے جگناتھ کوی رائے ترشولی کو اُس کے ہموزن روپے عنایت فرمائے۔ یہ اُسی قدردانی کا نتیجہ تھا کہ شاہانِ مغلیہ کے دربار میں گویّوں کا ٹھٹھہ لگا رہتا تھا اور مسلمان گوئیے بھی ہندی راگ راگنیاں الاپتے تھے۔ بلکہ آج تک اچھا گویا وہی سمجھا جاتا ہے جو ہندی راگ راگنیوں کا ماہر ہو۔

مسلمان حکمرانوں نے ہندی کے ساتھ کیا سلوک کیا مسٹر رام نریش ترپاٹھی مؤلف کوتا کومودی کی زبان سے سُنئے:۔

"مسلمانی راجوت کا اتہاس اور ہندی کا اتہاس یدی ملاکر دیکھا جائے تو یہ دیکھکر بڑا آشچریہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اُنتی کے ساتھ ہندی کی اُنتی ہوئی ہے اور اُن کے ادھ پتن کے ساتھ ایکبار ہندی کا بھی رنگ پھیکا پڑگیا ہے۔ جب مسلمانی شاسن کا سورج اُنتی پر تھا ہندی کے بڑے بڑے پربھاشالی کوی اُسی سمے میں ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے اُنتی کے سمے ہندی اس طرح پھلی پھولی کہ اُس کے سُمدھر سگندھ اور سواد سے آج کل ہم لوگ بہت آنند پارہے ہیں ہندی کے اس ناتے سے مسلمانوں کے ساتھ ہمارا پریم بڑھ جاتا ہے۔ ہندی کی اِس اُنتی سے مسلمانوں کو گرَو ہونا چاہیے"۔

دراصل مسلمان بادشاہوں نے ہندی کی نہیں بلکہ اُس دور کی دیسی زبان کی پرداخت میں (جسے میں اُردو کہتا ہوں) پُرجوش حصّہ لیا۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر ہندو عربی، فارسی الفاظ کی بھرمار کی تاب نہ لاکر اسے اپنا لیں گے۔ اس زبان کا عروج رہینِ منّت تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ مساعی کا۔ یہاں ایک نازک اور مابہ النزاع مسئلہ پر لب کشائی نامناسب نہ ہوگی۔ ہمارا تمام و کمال تاریخی سرمایہ اکبرِ اعظم کی سیاست فہمی پر شاہد ہے۔ سلطنت مغلیہ کے فروغ کو اکبر کی ہندو دوستی پر محمول کیا جاتا ہے اور اُس کے زوال کے منحوس اسباب سے عالمگیر کے دامنِ تقدس و تقشف کو داغدار کیا جاتا ہے۔ مجھے اس نظریہ سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ میں نے اکبر کی ہندو دوستی کو کبھی ٹھنڈے دل سے نہیں دیکھا۔ مجھے ہمیشہ اکبر کی ہندو دوستی میں سلطنت مغلیہ کے زوال کا سرِرشتہ نظر آیا۔ میرے نزدیک اکبر نے راجپوتنیوں سے شادی کر کے (جہاں تک جہانداری اور جہانبانی کا تعلق ہے) بڑی سخت غلطی کی تھی۔ ایک راجپوت اپنی بیٹی کسی مسلمان حکمران کو بطیب خاطر و بخندہ پیشانی نہیں دے سکتا تھا۔ انھوں نے

سلطنت مغلیہ کے جبروت سے مرعوب ہو کر ایسا کیا اور اُن کے سینوں میں محبت کے جذبات کی جگہ مسلمانوں کے خلاف کینہ اور انتقام کے جذبات پرورش پاتے رہے۔ وہ منتظر تھے اُس دن کے جب وہ اپنی بے ناموسی کا انتقام لے سکیں۔ اُن کی بیٹیوں نے "گھر کا بھیدی لنکا ڈھاوے" کا کام دیا اور بالآخر ایک زمانہ ایسا آیا جب وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے ——— وہ زمانہ تھا عالمگیرؒ کے برسرِ اقتدار آنے کا ——— عالمگیرؒ نے محض مدافعانہ طور پر اس بغاوت کی سرکوبی کرنی چاہی لیکن اُسے تو "ہندوکش" مشہور ہونا تھا ——— یہیں سے ہندو مسلم تخلیج۔ تفریق اور انشقاق کی نیو پڑتی ہے اب ہندو صرف مسلمانوں کے مذہبی عقائد۔ اعمال و عواطف مراسم و عوائد۔ مسالک و مناسک ہی کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ وہ ہر معاملہ میں مسلمانوں سے الگ ہٹ کر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناتے ہیں۔ ہندی اور اُردو یہیں سے دو مختلف زبانیں بن جاتی ہیں ——— اور اسی تاریخ سے اُردو میں عربی اور فارسی اور ہندی میں سنسکرت الفاظ کا تغلب شروع ہوتا ہے ———

اس سے قبل مسلمان شعرا نے ہندی کی جو خدمت انجام دی اُظہر من الشمس ہے ——— "شاعر" کی تنگ دامانی اجازت نہیں دیتی کہ میں اُس دور کے مسلمان ہندی شعرا کا نمونہ کلام یا حالاتِ زندگی پیش کروں۔ اس فہرست میں صرف اُن کے نام اور اُن کی تصانیف کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

نام شاعر	نام تصنیف
امیر خسرو	متفرقات
ملک محمد جائسی	پدماوت۔ اکھراوٹ
اکبر	متفرقات
عبدالرحیم خانخاناں	رحیم ستسی۔ بروے نائکا بھید۔ رس پنچادھیائی شنگر سورٹھ۔ مدناشٹک
عثمان غازیپوری	چترا ولی
مبارک	متفرقات
احمد	ویدانت گیتا
وہاب	بارہ ماسا
عبدالرحمٰن	یمک تنک
جلیل	متفرقات
یعقوب خاں	رسک پریہ کی ٹیکہ
انور خاں	انور چندرکا
پریمی یمن	انیکارتھ نام مالا
اعظم	نکھ شکھ
سید غلام نبی	رس پربودھ۔ انگ درپن
طالب علی	نکھ شکھ
نبی	متفرقات
عالم	متفرقات

متحدہ قومیت کے علمبرداروں اور آرزومندوں کے لئے اُردو اور ہندی کا دو مختلف زبانیں بن جانا ایک سانحۂ عظیم تھا اور یہ حقیقت ہے کہ یا تو جب تک یہ دونوں زبانیں شیر و شکر نہ ہو جائیں جو ناممکن ہے یا ہندو اُردو اور مسلمان ہندی نہ سیکھیں ہندو مسلم اتحاد محال ہے یہ ملک کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ متحدہ زبان کا مسئلہ باوجود شور و غوغا اب تک حل نہ ہو سکا۔

دریغ رخشِ خرد ماند در روز بیگہ شد

دریں سفر کہ بہر گام رہزنیست مرا

ملک کے بہترین دماغ اس گتھی کو سلجھانے میں منہمک ہیں۔ مگر

درونِ بیت احزاں پیرِ نابینا چہ میداند

کہ شہرے بر سرِ سودائے یوسف میکند غوغا

جس رسالہ میں دیکھئے ہندی یا ہندوستانی سے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے۔ جس ادیب کو دیکھئے اس مسئلہ میں رائے زنی کر رہا ہے۔ ایک فریق کہتا ہے۔

دفترِ شعرِ تر با لبس بود گلزار را

تو دوسرا فریق چلا اٹھتا ہے:—

بجز یکی نمیداند لغت ہائے مجازی را

کوئی "متحدہ زبان" کے خیال میں مگن ہو کر الاپتا ہے۔

خاکروبِ در میخانہ کنم مژگاں را

لیکن اس تمام شور و غوغا کا ماحصل کیا ہے ——— وہی ———

چہ داند مردِ صحرائی طریقِ کارسازی را

ہندو ادیب اُردو کی فارسیت و عربیت کا شاکی و رنجیدہ ہے وہ کہتا ہے ز۔ ذ۔ ض ظ۔ ہ۔ ع۔ گ اور غ کا صحیح تلفظ اُس کے بس کی بات نہیں لہذا ص اور س کی جگہ صرف "س" ز۔ ذ۔ ض۔ ظ کی جگہ صرف "ز" گ اور غ کی جگہ صرف "گ" ک اور ق کی جگہ صرف ک کا استعمال روا رکھا جائے۔ اس کے دن کہے کہ

گل را قصور نیست ترا گر زکام است

بعض مسلمان ادبا اس کوشش میں جٹے ہوئے ہیں کہ اُن کے مقالات میں عربی اور فارسی کے کم از کم الفاظ استعمال ہوں۔ بعض ٹھیٹھ ہندی گیت لکھ رہے ہیں اور اُسے اُردو سمجھتے ہیں۔

افغاں کہ کردم دوزخ گلزار ابراہیم را

بعض "مہاجنک" نئی قسم کی اُردو یا ہندوستانی گڑھ رہے ہیں۔ اُن کا اصرار ہے کہ مالک متحدہ کو آئندہ "جنت صوبہ" کہا جائے۔

در سر زلف ندانم کہ چہ سودا داری
کہ بہم برزدہ گیسوئے پرافشاں را

جہاں تک میں نے غور کیا ہے تمام بحثیں فضول ہیں۔ نہ اب اُردو کو کوئی مٹا سکتا ہے اور نہ ہندی کو۔ نہ اُردو سے عربی اور فارسی کے لغات نکالے جا سکتے ہیں اور نہ ہندی سے سنسکرت کے۔ دونوں زبانیں زندہ ہیں اور دونوں زندہ رہیں گی۔ دونوں زبانوں کے باغبانانِ ادب نے ان میں بلا کا رس بھر دیا ہے۔

آں جا کہ لب زرشحۂ مے پاک کردہ اند
گل مشکبوئے کردہ ردائے شمیم را

اگر واقعی ہندو مسلم اتحاد کوئی ضروری چیز ہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندی پڑھیں اور اسی طرح ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اُردو لٹریچر کا مطالعہ کریں۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یو۔ پی کے تعلیم یافتہ طبقوں میں دونوں زبانوں کے جاننے والوں کی معقول تعداد موجود ہے —— البتہ بعض متعصب مسلمانوں کو میں نے یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ ہندی اُجڈوں کی زبان ہے۔

ترسم آں قوم کہ بر دُرد کشاں مے خندد

یہ مطالبہ کہ اُردو کو ادق نہ بنایا جائے بے ڈھنگی اور کم نظری پر دال ہے۔ اُردو اگر علمی زبان ہے اور یقیناً وہ علمی زبان بن چکی ہے تو اُس کا دامن وسیع ہوگا اور یہ فراخ دامانی منت پذیر ہوگی۔ عربی اور فارسی بلکہ انگریزی اور سنسکرت الفاظ کی۔ اسی طرح اگر ہندی کو علمی زبان بننا ہے تو اُسے دوسری زبانوں سے استفادہ کرنا ہوگا۔

ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان زندہ نہیں رہ سکتا —— میرے نزدیک اب متحدہ زبان کی رٹ بیکار ہے اور اتحاد کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ہندو مسلمانوں کی زبان سیکھیں اور مسلمان ہندوؤں کی۔ صرف سیکھیں ہی نہیں بلکہ اپنی زبان سمجھیں۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہماری قوم کے ادیب دنیا بھر کی زبانیں سیکھ لیں گے مگر نہ سیکھیں گے تو اپنے پڑوسی کی زبان۔ وہ دوسری زبانوں سے بے تکلف استفادہ کر سکتے ہیں لیکن نہیں سمجھتے تو اپنے بھائیوں کی زبان۔

ہر ملک کا ادب مخصوص ملکی رجحانات کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہر ملک کے ادب میں ماحول کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ پھر جب ہمارے اور انگریزوں کے طرزِ معاشرہ و تمدن میں کوئی تطابق نہیں تو اُن کا ادب ہمیں کس حیثیت سے فائدہ پہونچا سکتا ہے اور انگریزی ذخائر کے اُردو میں منتقل کرنے سے ہم کیا استفادہ کر سکتے ہیں۔ انگریزی تراجم کی بھرمار سے کہیں زیادہ ضروری ہندی کتب کا اُردو میں منتقل کیا جانا ہے۔

میرا ذاتی تجربہ شاہد ہے کہ پچاس فیصدی تعلیم یافتہ ہندو اُردو لکھ اور پڑھ سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کا بیشتر حصہ ہندی سے نابلدِ محض ہے۔

تاریخ اُن ہندو شعرا اور ادبا کو محو نہیں کر سکتی جنہوں نے اُردو ادب کے دامن کو اپنی کاوشوں سے مالا مال کیا —— رتن ناتھ سرشار۔ نسیم۔ سرور۔ چکبست۔ سدرشن۔ تلوک چند محروم اور فراق گورکھپوری کے جواہر ریزے ہمیشہ اُردو کے تاج کو جگمگاتے رہیں گے۔ پھر قدیم مسلمان ہندو شعرا کے علاوہ کتنے مسلمان ہیں جو ہندی کی خدمت کا دعویٰ کر سکیں —— صرف دو چار وہ بھی افسانہ نگار۔ اس لئے کہ علمی مضامین کے لئے جس قدر ہندی کا جاننا ضروری ہے شاید وہ نہیں جانتے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ متحدہ قومیت کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ مسلمان ہندی پڑھیں۔

بہار کوٹی

اُردو شاعری پر ایک ترچھی نظر

کلیم الدین احمد صاحب کی کتاب "اُردو شاعری پر ایک نظر" عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے پہلی مرتبہ اسکا مطالعہ کیا گیا تو بعض مباحث نہایت اہم نظر آئے۔ لیکن کتاب ختم کرنے پر محسوس ہوا کہ اسے ایک خاص زاویۂ نگاہ کے ماتحت لکھا گیا ہے اور شروع سے آخر تک اسی ایک اصول کو ملحوظ رکھا ہے یعنی "ایشیائی شاعری کی تنقید مغربی ادب کے اصول پر" بادی النظر میں یہ چیز بڑی مہمل معلوم ہوتی ہے۔ پرانا مقولہ ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، یعنی مشرق کے تصورات، میلانات مغرب کے تصورات اور میلانات سے بالکل مختلف ہیں شاعری جو براہ راست انسانی زندگی سے وابستہ ہوتی ہے ملکی خصوصیات، طبعی حالات، قومی ضروریات سے متاثر ہوتی ہے اس لئے اگر انگلستان کی شاعری کو فارسی شاعری کے اصولِ تنقید سے اور فارسی شاعری کو ولایتی اصول تنقید سے پرکھا جائیگا تو دونوں ملکوں کی شاعری مہملات کا مجموعہ ثابت ہوگی۔

یہی حشر کلیم صاحب کے ہاتھوں اُردو شاعری اور اُردو شعراء کا ہوا ہے اپنے نظریہ کی وضاحت کلیم صاحب نے جابجا اِن الفاظ میں کی ہے :-

"اُردو شاعری کی تاریخ اپنا موضوع۔ یہاں اُردو شعراء اور اُن کے کلام کی قائم کردہ معیار سے تنقید منظور ہے۔ اس لئے صرف چند مشاہیر کے رنگِ تغزل پر روشنی ڈالنے سے یہ مقصد حاصل ہو جائیگا۔ میر، سودا، درد متقدمین میں تو غالب، مومن، ذوق، متوسطین میں اس کام کے لئے مناسب ہیں۔ ان شاعروں کی غزلوں سے یہ حقیقت صاف عیاں ہے کہ ان میں اعلیٰ پایہ کے شاعر ہونے کی صلاحیت موجود تھی۔ اگر یہ کسی مغربی ادب سے واقف ہوتے، نظم کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوتے تو آج اُردو شاعری دُنیائے ادب میں اسقدر پست و جنزل حالت میں نظر نہ آتی؟"

"اگر میر نظم کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوتے اور بجائے غزل نظمیں لکھتے تو وہ دُنیا کے ایک بہترین شاعر ہوتے؟"

"کاش اُردو شعراء اس قسم کی نظموں کی طرف متوجہ ہوتے، اپنی قوتِ ایجاد ان پر صرف کرتے، واقعۂ کربلا کو ایک مسلسل و مربوط نظم میں بیان کرنا ممکن تھا لیکن اس کی بھی اُردو شعراء میں نہ ہمت تھی نہ طاقت۔"

"(اُردو کی بے بضاعتی کی) دوسری وجہ اُردو شعراء کی مغربی ادب سے ناآشنائی ہے وہ نظم کے صحیح مفہوم سے واقف ہی نہ ہوسکے اگر وہ اپنی محنت و کاوش، اپنی قوتِ حاسہ اپنے تخیل کے جوہر صورتِ نظم میں جلوہ گر کرتے تو آج یہ اُردو شاعری اعلیٰ مرتبہ پر نظر آتی۔"

"اگر ترقی کی خواہش ہے تو اب کسی مغربی ادب کی طرف میلان کی ضرورت ہے .... اگر کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے تو اسی طرح پر کہ اُردو شعراء کسی مغربی ادب سے شناسائی پیدا کریں ... . بحر و اوزان کی پسند میں لکیر کے فقیر نہ بنیں بلکہ اس میں قوتِ اختراع سے کام لیں۔ نئے نئے بند ایجاد کریں۔ یا کسی مغربی ادب سے حاصل کریں۔"

"اگر حالی کسی مغربی ادب سے واقف ہوتے تو اس غلط خیالی کے مرتکب نہ ہوتے۔ حالی و آزاد مغربی ادب سے ناآشنائی کی وجہ سے کوئی ایسا کارنامہ پیش نہ کر سکے۔ جو اُن کے خیالات کی صحت و اہمیت کو قلوب پر نقش کر دیتا۔"

"ضرورت تھی تو ایسے "انگریزی داں" کی جسے مشرقی و مغربی علوم میں برابر دستگاہ حاصل ہو جو حقیقی شاعر ہو، جو انگریزی نظم کے خیالات ہی نہیں بلکہ انگریزی اصنافِ شاعری، جو نظموں بند، اوزان یا مختلف اوزان کے بدل کو اُردو میں مشرقی ماحول، اقتضاءِ زندگی مذاقِ سلیم کا لحاظ رکھتے ہوئے اخذ کر سکے۔"

"آزاد و حالی مغربی ادب سے ناواقف ہونے کے سبب بعض خیالات و نکات سے محروم ہے۔"

"اپنی لاعلمی کی وجہ سے وہ مغربی ادب کے محاسن کو مفصل و موثر پیرایہ میں بیان کرنے پر قادر نہ تھے۔"

"اس قسم کے تجربہ کو ایک مشہور انگریزی نظم میں ۲۴ سطروں میں بیان کیا گیا ہے لیکن اختر ۸۹ اور ۱۱۰ مصرعے لکھتے ہیں۔"

"اس طوالت کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ حسنِ خیال کو اقبر "جوگن" کے آخری بند میں گیارہ مصرعوں میں بیان کرتے ہیں۔ اسی خیال کی ترجمانی ہیں انگریزی نظم میں کمال جامعیت و حسن کے ساتھ صرف دو سطروں میں کی گئی ہے۔"

کتاب کے سرسری مطالعہ کے بعد چند فقرے منتخب کئے گئے ہیں ان سے ناظرین کو محسوس ہونے لگا ہوگا کہ کلیم صاحب نے اردو شاعری کو کن اصولوں پر جانچا ہے لیکن کلیم صاحب غور فرمائیں کہ خود ایک انگریز ناقد اس اصول کے مخالف ہے۔

کہتا ہے کہ کسی شاعری کو ایسے اصولوں سے نہ پرکھا جائے جن کو مدنظر رکھ کر وہ نہ لکھی گئی ہو۔

Fairy Queen R. Hurd

Letter on chivalry and Romance

T. worton. observation on the Fairy queen.

"اردو شاعری پر ایک نظر" کا یہ پہلا نمایاں پہلو تھا۔ اب دوسری خصوصیت ملاحظہ ہو۔ اسے پڑھکر ناظرین بے ساختہ تسلیم کریں گے کہ ع

"نادک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں"

میر۔ (۱) "میر کی قوت عاسہ مخصوص و محدود قسم کی تھی یا یوں کہئے کہ میر کی دنیا تنگ تھی۔"

(۲) "انکے خیالات عمیق و بلند نہیں سطحی اور معمولی ہیں۔"

(۳) "دماغی طاقت کی طرح اُن کے تخیل میں بھی اعلیٰ درجہ کی قوت پرواز نہ تھی۔"

(۴) "اگر میر نظم کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوتے اور بجائے غزل کے نظمیں لکھتے تو وہ دنیا کے ایک بہترین شاعر مانے جاتے۔"

(۵) "اصل نقص لیکن انکے کلام کی ناہمواری ہے۔ اسکا معتدبہ حصہ نہایت ہی پست و مبتذل ہے۔"

(۶) "رعایت لفظی، مصنوعی خیال، دونوں نقص موجود ہیں تاثیر درد کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔"

درد (۱) "جس انسانی جذبہ سے، اس زور، اس کیفیت سے درد کی شاعری خالی ہے۔"

(۲) "اس کے علاوہ عشقِ حقیقی کچھ اُن کی جاگیر نہیں۔ میر و سودا کے کلام میں بھی اسکی چاشنی موجود ہے۔"

(۳) "درد بھی کسی خاص تجربہ کا واضح بیان نہیں کرتے بلکہ منفرد اثرات و ناکمل تصورات کی جھلک دکھاتے ہیں۔"

(۴) "جن تجربات کی درد ترجمانی کرتے ہیں وہ غیر مانوس ہیں۔"

(۵) "درد کی دنیا بھی میر کی دنیا جیسی محدود و تنگ ہے۔ عشق حقیقی اور اسکے لوازمات کے علاوہ دوسرے انسانی جذبات و کوائف، خیالات و احساسات درد کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔"

سودا (۱) "ان میں بھی اتنی جذبات و قوت اختراع نہ تھی کہ اپنے لئے کوئی نیا رستہ تجویز کرتے۔"

(۲) کاش سودا کا مذاق اعلیٰ پیمانہ کا ہوتا تو وہ ایک بلند پایہ ہجو گو کا مرتبہ حاصل کرتے۔"

ذوق (۱) "اس لفظی خوبصورتی کا بھی ان کے اشعار میں وجود نہیں جو سودا کے کلام میں تمام ملتی ہے۔ اصل کمی یہ ہے کہ جن کوائف نفسی، جن تصورات خیالی کی یہ ترجمانی کرتے ہیں، وہ اُن کے دل و دماغ میں کچھ بھی آتش افروزی نہیں کرتے اس لئے تاثیر بھی گویا ایک قلم مفقود ہے۔"

(۲) "ان کے اشعار میں اصلیت اور واقعیت کی کمی ہے۔"

(۳) (قصیدہ گوئی میں) "اشعار کی ترتیب بھی ناقص ہے۔ ارتقائے خیال فطری نہیں مصنوعی ہے۔ ہر شعر مکمل ہے اور ایک دوسرے سے بے نیاز۔ ان اشعار میں سے چند اشعار کو حذف کر دیا جا سکتا ہے اور مطلب فوت نہیں ہوگا۔ اسی طرح چند اشعار کا اضافہ بھی ممکن ہے اور کوئی فرق محسوس نہ ہوگا اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ ہر شعر لازمی نہیں اور آپس میں ربط مکمل بھی نہیں۔ طرز ادا صاف فصیح پر زور اور ستھرا ہے۔ لیکن کہیں بھی تازگی و شگفتگی کا وجود نہیں۔ بہار کا ذکر ہے لیکن ہر جگہ خشکی ہی خشکی نظر آتی ہے۔"

غالب (۱) "غالب کے کلام میں چند مخصوص نقائص بھی ہیں۔ ایک تو انکے کلام کی ناہمواری ہے۔ میر و درد کی طرح انکا بھی کوئی خاص انداز بیان نہیں وہ کم از کم تین طرز سے اظہار خیالات کرتے ہیں۔ پہلے رنگ میں فارسیت کا غلبہ ہے۔ الفاظ اور بندشوں سے فارسیت صاف نمایاں ہے۔ صرف کہیں چند الفاظ اردو کے جوڑ دیتے ہیں اور اکثر نہایت بے موقعہ طریقہ پر۔"

(۲) "غالب کے اشعار صرف بہ اعتبار طرز ناہموار نہیں، یہی ناہمواری اُن کے مضامین میں بھی موجود ہے"

مومن (۱) "مومن کی دُنیا بھی محدود ہے۔ غالب و سودا کی دنیا کی طرح وسیع و فراخ نہیں۔ مومن کبھی اس تنگ دُنیا سے باہر ہونا بھی نہیں چاہتے اس لئے اُن کے اشعار میں مضامین کے لحاظ سے اتنا تنوع بھی نہیں جو غالب و سودا کو میسر ہے"

میر حسن (۱) "اسے دیکھکر ہر ذی فہم یہی سمجھے گا کہ ایسے کامل جانور دنیا میں نظر نہیں آتے" ذکرِ شاہزادہ بے نظیر" جہاں ہیرو ایسے کمالاتِ ظاہری و باطنی کا مجموعہ ہو تو پھر معشوق کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ سراپا میں وہ تکلف و تصنع کا استعمال ہوا کہ جسکی حد نہیں"

(۲) "مثنوی میں اکثر اس قسم سے تفصیل وار سراپا کی تعریف ہوتی ہو جو کثر مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ عموماً تشبیہیں فارسی سے اخذ کی جاتی ہیں۔ مضمون، اظہار مضمون کا پیرایہ دونوں پامال ہیں"

(۳) "نفسِ قصہ نہایت ہی پتلا ہوتا ہے"

(۴) بیان تعمیر باغ: "شاعر نے پھولوں کا معطر گلدستہ مرتب کیا ہے جس سے دل و دماغ مسرور ہوتا ہے لیکن پھر بھی یہ پھول مصنوعی ہیں۔ جو خوبصورتی کسی دیہاتی پھول کی سادگی میں ہوتی ہے وہ سارے باغ کو میسر نہیں"

مرثیہ کا بیان :-

(۱) "انیس و دبیر کے مراثی میں وہ عام نقائص موجود ہیں جو عموماً صنفِ مرثیہ میں پائے جاتے ہیں"

(۲) "سیرت نگاری تو ان دو شعرا میں سراسر مفقود ہے ان کے مراثی میں بھی اسکا وجود نہیں"

آزاد (۱) "آزاد کی شاعری صرف حسن عشق کی قید سے آزاد نہیں، یہ ماحول کے اثرات سے بھی بیگانہ ہے"

(۲) "طرز ادا کی سادگی اکثر بیرنگی کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے جس سے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ صرف بیرنگی ہی نہیں اکثر نثریت کی ضرورت سے زیادہ آمیزش ہوتی ہے۔ یہ نثریت محاسنِ نثر کی حامل نہیں ہوتی بلکہ عیوب کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لئے خیالات کی ترجمانی میں ایک بھدا اور بدنما داغ نظر آتا ہے۔ ترتیب الفاظ فطری نہیں ہوتی ہے جس سے اس داغ کی بدنمائی میں اضافہ ہوتا ہے"

(۳) "آزاد محض معمولی دماغ اپنے ساتھ لائے تھے"

(۴) "خیالات سطحی ہیں۔ اور طرز ادا سے شعریت یک قلم معدوم"

(۵) "شاعر جو مجدد ہو، جو ایک نئے دَور کی بنیاد قائم کر سکے۔ آزاد ایسے شاعر نہ تھے۔ نہ قوتِ ایجاد کسی جگہ نظر آتی ہے اور نہ کہیں تنوع ہی موجود ہے۔ آزاد نے کوئی صنف ایجاد نہ کی۔ مثنوی میں مناظر قدرت کی تصویر کشی کوئی نئی بات نہ تھی۔ میر و سودا میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ اگر کوئی نئی چیز ہے تو یہ کہ مثنوی میں یہ اخلاقی مضامین کو استعارہ کے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ لیکن صرف اس وجہ سے انھیں مجدد نہیں کہا جا سکتا۔ آزاد کم پایہ اور محدود قسم کے شاعر تھے اور ضرورت تھی ایسے شاعر کی جو لطیف شاعرانہ اوصاف کا بدرجۂ اتم حامل ہو، جو قوت ایجاد رکھتا ہو، جسکی نظر ایسی وسیع ہو کہ مشرقی و مغربی ادب اس کے لئے یکساں ہوں۔ جس میں ایسی آزادیٔ فکر ہو کہ مشرقی ماحول اور مذاق سے واقف ہو کر بھی اپنے ماحول کا بندہ بن جائے۔ آزاد میں یہ اوصاف مفقود تھے"

حالی (۱) "عبارت حالی کے مخصوص سادہ طرز میں ہے لیکن شعریت کا پتہ نہیں"

(۲) "مسدس حالی میں بھی نقص ہے کہ یہ نظم قصداً لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس میں ہر جگہ آورد کی جلوہ گری ہے اور آمد نے آمد کی صورت اختیار نہیں کی ہے"

(۳) "مسدس حالی مثل ریگستان کے ہے جس میں کبھی کبھی کوئی مختصر سی سرسبز و شاداب جگہ نظر آ جاتی ہے"

(۴) "مسدس میں ایک اہم نقص اسکی یکرنگی بھی ہے"

(۵) "آزاد۔ حالی، شبلی کسی میں مجدد شاعر ہونے کی صلاحیت نہ تھی"

اسمٰعیل (۱) "حالی و شبلی کا اثر اسمٰعیل کی دو ایک نظموں میں ملتا ہے لیکن اس رنگ میں اسمٰعیل نے کوئی قابل ذکر کارنامہ پیش نہیں کیا"

(۲) "اسمٰعیل کا تخیل وہ جو ہر شاعرانہ بلند پرواز اس لئے انکی نظموں میں کہیں شان و شوکت نظر نہیں آتی۔ انکا تخیل دور و نزدیک کی چیزیں یکجا جمع نہیں کرتا، جو نقوش پیش کرتے ہیں انکا دماغ پر کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ اُن کا تخیل مختلف نقوش سے ایک مکمل نہیں تیار کر سکتا۔ مختلف نقوش الگ ہی الگ رہتے ہیں"

اکبر "ان کا میدان بہت وسیع ہے اس لحاظ سے وہ سودا سے بڑے ہیں لیکن سودا کا زور انھیں میسر نہیں اور ان کی نظمیں نسبتاً نہایت ہی مختصر ہوتی ہیں۔

سوداؔ کی طرح وہ طویل نظمیں نہیں لکھتے اور اگر لکھتے بھی تو غالباً زیادہ کامیاب نہ ہوتے۔"

شوق قدوائی (۱) "شوقؔ کی مخصوص سادگی یہاں موجود ہے لیکن اس میں وہ زرخیز شادابی اور معصومیت نہیں جو اسمٰعیل کا حصہ ہے۔"

(۲) "اگر غور سے دیکھا جائے تو کہیں فلسفۂ حیات پر عمیق و باریک نظر نہیں۔"

(۳) "اصل یہ ہے کہ شوقؔ میں ڈرامہ نگاری کی قوت کی کمی تھی۔"

اقبال (۱) "(خضر راہ) اگر اس نظم پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ ہر جگہ خیالات کا اظہار ایک ہی شاعرانہ معیار پر نہیں۔ صرف یہی نہیں جیسے جیسے خیالات کا عمق اور جذبات کا جوش و خروش ترقی پذیر ہوتا ہے اُسی قدر شاعرانہ حسن کی طرف سے بے توجہی بڑھتی جاتی ہے۔"

سیماب (۱) "اس طرز کی نظموں میں تمام وہ نقائص موجود ہیں۔ جنکا بیان ہو چکا ہے۔"

(۲) "وہ نہایت کاوش سے اپنے اشعار موزوں کرتے ہیں۔ ان اوصاف کے باوجود بھی ان کی نظموں میں عموماً شاعرانہ تاثیر نہیں ملتی۔ سبب یہ ہے کہ سیمابؔ میں قصد آورد، تصنع کا مادہ زیادہ ہے۔ وہ ان موضوعات کو جس پر اقبالؔ نے طبع آزمائی کی تھی حقیقی موضوعاتِ شاعری سمجھتے ہیں۔"

(۳) "اسی طرزِ خیال اور افتادِ طبیعت کا نتیجہ ہے کہ اُنکی اخلاقی، سیاسی و قومی نظموں میں شاعری کا خارجی چھلکا تو ملتا ہے لیکن کہیں مغز کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔"

(۴) "جذبات کی اصلیت موجود ہے لیکن کمل نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی تصنع اور قافیہ پیمائی سے کام لیا گیا ہے۔"

چکبست (۱) "سوائے الفاظ کے اور کیا رکھا ہے۔ یہی عالم تمام نظر آتا ہے۔"

(۲) "تقلید انیسؔ کی ہے لیکن نتیجہ دبیرؔ کی ثقالت سے مشابہ ہے۔"

(۳) "اقبالؔ کا رنگ عیاں ہے لیکن جذبات و تصورات محض سطحی ہیں۔"

حفیظ (۱) "شاہنامۂ اسلام میں اعلیٰ پیمانہ کی شاعری کہیں نہیں ملتی۔ ہاں بعض ٹکڑے ہیں جن میں شعریت موجود ہے لیکن ان چند ٹکڑوں کے لئے ایک وسیع و خشک بیاباں کی رہروی کی ضرورت ہے۔"

اُردو شاعری پر ایک نظر کی یہ دوسری خصوصیت تھی اسکا جواب بھی کلیم صاحب ایک مغربی نقاد کی زبان سے سنیں:

"وہ ناقد جو مجھے یہ بتاتا ہے کہ کسی آدمی کے کارنامہ میں کیا کیا نقائص ہیں مجھے کوئی ایسی بات نہیں بتاتا جو اُس کے بتلائے بغیر میں پہلے ہی سے تسلیم نہ کرتا، لیکن وہ جو کسی کارنامہ کی خوبیاں بتاتا ہے اور ان کی تشریح کرتا ہے وہ بیشک مجھے ایسی دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے جو صرف تجربہ بھی مجھے حاصل کرنے میں مدد نہ دیتا۔

S. T. Coleridge.

Biagrephia Literaria

تیسرا پہلو کلیم صاحب کی شعر فہمی ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

" رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

کیا ہوا اگر یار نے شراب نہ دی۔ رات زمزم پر پی اور صبحدم جامۂ احرام سے داغِ میکشی مٹا دیا۔ معلوم نہیں یہ میکشی عالمِ خیال میں نصیب ہوئی یا شاعر نے ہند سے عرب پہونچکر اپنی کرامت کا ثبوت دیا۔ اب بھی اگر معشوق نظرِ التفات نہ کرے تو اسکی کم نصیبی ہے کہ ایسے صاحبِ معجزہ کی قدر و منزلت نہ کی اور کم ظرف رقیبوں کو سر چڑھایا۔ اس شعر کی جگہ مضمون کے لحاظ سے مطلع کے بعد تھی

دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر — یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

حلقہ میں ایک دل آویزاں ہے لیکن شاعر اسپر ہے تو آنکھوں کا یہ بھی گویا دامِ گیسو کر کم نہیں۔ زمزم، جامۂ احرام، مے دھبے ان چیزوں سے اور دل، آنکھوں دام کے حلقوں سے کوئی ظاہری و باطنی لگاؤ نہیں۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

اس شعر میں ایک واقعہ کا بیان ہے۔ شاعر نے راتِ زمزم پر میکشی کی اور صبح کو جامۂ احرام پر جو دھبے پڑ گئے تھے اُنہیں دھو کر صاف کیا۔ اب چند سوالات رونما ہوتے ہیں۔ شاعر کی میکشی واقعی ہے یا خیالی؟ شاعر نے کیوں اس فعل کا ارتکاب کیا؟ اگر میکشی کی تھی تو جامۂ احرام کے دھبے کیوں مٹائے گئے؟ کیا شاعر کو ندامت ہوئی اپنی حرکتِ ناشائستہ پر؟ مخاطب کون ہے۔ ان سوالات میں سے کسی سوال کا بھی جواب نہیں ملتا یہ محض ایک فعل کا بیان ہے جسکی وجہ اور غایت سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے ذہن و تخیل پر پراگندگی کے علاوہ اور کوئی اثر نہیں ہوتا۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

کام کے آدمی تھے۔ اِس ٹکڑے کا مطلب واضح نہیں کس کام کے تھے؟ کن معیار پر پورے اُترتے تھے؟ مذہبی یا دنیا دی؟ اخلاقی سیاسی یا قومی؟ عشق نے کیوں نکما کر دیا؟ قصور عشق کا ہے یا اپنا؟"

شعر فہمی کے اس پہلو پر نظر کرتے ہی محسوس ہونے لگتا ہے کہ کلیم صاحب "تجاہل عارفانہ" یا تجاہل عامیانہ سے کام لیتے ہیں یا پھر مغربی شعر و ادب کے مطالعہ نے جسکا دعویٰ ان کی تحریروں میں جابجا ملتا ہے انھیں مشرقی شاعری سے اتنا دور کر دیا ہے کہ وہ اس کے سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔

ایک عجیب دعویٰ اس کتاب میں یہ ہے کہ "گل نغمہ" کی اشاعت سے اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ میں نے کلیم صاحب کی اس بشارت سے پہلے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ان کے مطالعہ سے جو تاثرات مرتب ہوئے وہ انشاء اللہ اگلی قسط میں پیش کئے جائینگے۔

میں نے قصداً کلیم صاحب کے خیالات کے اظہار پر اکتفا کی تھی لیکن بعض حضرات کی فرمائش ہوئی کہ ان کے متعلق میں اپنے تاثرات بھی قلمبند کر دوں چنانچہ اپنی مختصر رائے عرض کرتا ہوں:—

(۱) سب سے نمایاں چیز مجھے کلیم صاحب کی تنقید میں یہ نظر آئی کہ وہ مشرق کو مغرب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اُردو شاعری کا ماحول مغربی شاعری کے ماحول سے مختلف ہے۔ دونوں جگہ شعر و شاعری کا نظریہ اسکا مقصد اور غایت علیحدہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ کلیم صاحب ان خوبیوں کو جو انھیں بعض انگریزی نظموں میں نظر آتی ہیں، اُردو میں ڈھونڈتے ہیں اور نہ پاکر انھیں مایوسی ہوتی ہے تو اُردو شاعری کے دامن کو خالی اور اُس کے مستقبل کو تاریک سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اُردو شاعری کے اتنے محاسن ہیں جو مغربی ادب میں نہ نکلیں گے۔

(۲) دوسرے وہ تنقیدی اصطلاحیں جو کلیم صاحب بار بار استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ربط و تسلسل۔ ذہنی انتشار۔ ابتدا، ترقی اور انتہا، اتفاق اور توازن، سب مغربی ادب کی تنقید سے مستعار لی گئی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ انگریزی ادب میں بھی مختلف دور گزرے ہیں اور نہ صرف شاعری بلکہ تنقید بھی سولویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی تک مختلف نظریوں کی ترجمان رہی ہے پھر جدید ترین نظریوں پر اب سے دو سو سال پہلے کی شاعری کو پرکھنا نہ معلوم کہاں کی تنقید یا انصاف ہے۔

(۳) ایک اور نمایاں کمزوری کلیم صاحب کی یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعروں کے لکھے ہوئے تذکرے اور متقدمین کا کلام غالباً بغور نہیں پڑھا ہے یا پڑھا ہے تو تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے مثلاً اُردو شاعری پر تنقید کرتے ہوئے اُسے فارسی کی تقلید میں گرفتار بتاتے ہیں لیکن کتاب میں شروع سے آخر تک کئی سو سال کی اُن شاعرانہ کاوشوں کا ذکر نہیں جو دکن میں ہوئیں اور جہاں اُردو شعر و شاعری پہلے پروان چڑھی، دکھنی شاعری اپنی بیشتر خصوصیات میں فارسی کی تقلید سے آزاد ہے، مثلاً وہاں طالب عورت ہے اور مرد اسکا مطلوب ہے۔ عورتوں کے جذبات اور ان کے خیالات بڑی خوبی سے ادا ہوئے ہیں۔ کلیم صاحب ان سب سے بیگانہ ہیں یا جان بوجھ کر انجان بنے ہیں۔

اسی طرح تذکروں کو وہ "مشاعرے کی واہ واہ" سمجھتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ میر تقی میر جن کی بددماغی ضرب المثل ہے وہ بغیر سوچے سمجھے محض وقتی طور پر متاثر ہو کر رائے دیں یا مصطفیٰ خاں شیفتہ جن کی شعر فہمی کا اعتراف حالی نے بھی کیا ہے اور خود کو انکا مرہون منت بتایا ہے بے سوچے سمجھے بیت کی تنقید لکھ دیں

کاش کلیم صاحب ان تذکروں کو غور سے پڑھتے لیکن وہ تو "تحقیق" ان ناکاموں کا کام بتاتے ہیں جو تنقید کے میدان میں بازی ہار چکے ہیں۔ خدا کرے کلیم صاحب بھی اپنی شکست کا اعتراف کر کے تحقیق کی طرف متوجہ ہوں تاکہ ان کی صلاحیتیں واقعی بروئے کار آسکیں۔ ان تذکروں کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ اُردو شاعری کی روح کیا ہے۔ کن اصولوں پر ہمارے ناقدین نے شعر کو پرکھا ہے اور کس نظریہ کے تحت شعر گوئی اختیار کی ہے۔ یہ سب باتیں ایک بالغ نظر مصنف کے لئے ضروری ہیں۔

(۴) جابجا کلیم صاحب نے تنقید میں مزاح اور ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے اسکا اندازہ آپ غالب کی غزل کی تنقید اور اس کی تشریح کو دیکھ کر کر سکتے ہیں۔

(۵) مجھے کلیم صاحب کی شعر فہمی میں شبہ ہے۔ مثلاً اس شعر میں ؎

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

کلیم صاحب اسے عاشق کی طرف منسوب کرتے ہیں یعنی جب معشوق نے شراب نہ دی تو زمزم پر پی لی۔ حالانکہ اس شعر میں ریاکاروں کی طرف صاف اشارہ ہے۔ اسی طرح اس شعر کے متعلق

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ کہنا "کام کے آدمی تھے" اس ٹکڑے کا مطلب واضح نہیں، کس کام کے تھے کس معیار پر پورے اُترتے تھے؟ مذہبی یا دنیاوی؟ اخلاقی، سیاسی یا قومی؟ عشق نے کیوں نکما کر دیا؟ قصور عشق کا ہے یا اپنا؟ بتاتا ہے کہ ان کے تنقیدی والا ذوق شعر فہمی :

بلند، جو قطعی وجدانی ہے بالکل بے بہرہ ہے۔ غالباً ایسے ہی موقع پر شاعر نے کہا ہوگا کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" زبان و بیان کی جسقدر غلطیاں اس کتاب میں ہیں انھیں ہم اس لئے قابل معافی سمجھتے ہیں کہ یہ کلیم صاحب کی مصنف بننے کی پہلی کوشش ہے۔ نقش اوّل ناقص ہوا ہی کرتا ہے حکم ہے نقش ثانی بہتر ہو ——

محمد ... الدین صدیقی

اردو کے چند جواں مرگ شاعر

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں
(اقبال)

ہر بڑا شاعر ایک پیغامبر ہوتا ہے۔ اسکا پیغام نہ صرف کسی قوم، ملت، مذہب یا وطن ہی تک محدود ہوتا ہے بلکہ وہ تمام بنی نوع انسان تک اپنا پیغام پہونچاتا ہے اور ان کو ایک نئی دنیا کی دعوت دیتا ہے جہاں عدم و وجود کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں شاعر چونکہ کسی مخصوص دائرے سے تعلق نہیں رکھتا اس لئے ہر دلعزیز ہوتا ہے۔ اس کی میٹھی میٹھی آواز ہر دل میں گھر کر لیتی ہے اور اس کے شیریں نغمے ہر وقت کائناتِ قلب میں گونجا کرتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر کے شباب کی کلی کھلنے بھی نہیں پاتی کہ گلچینِ اجل اسے مسل ڈالتا ہے اور ہزاروں اُمیدیں خاک میں مل کر رہجاتی ہیں۔ یہ شاعر کی موت نہیں ہوتی بلکہ قوم کے شیدائی، وطن کے پرستار اور بنی نوع انسان کے ایک پیغامبر کی موت ہوتی ہے۔ وہ جوانمرگ شاعر جو "قوم کا ارمان" اور ملک کی "اُمید" ہو کیا اسکی سوانح حیات خونی لفظوں میں لکھے جانے کے قابل نہیں؟ بالخصوص اُردو جیسی کم مایہ زبان ان ناقابلِ تلافی نقصانات کو کیونکر برداشت کر سکتی ہے؟ اُردو ادب کا مرقعہ اس قسم کی درد انگیز تصویروں سے خالی نہیں جب ہماری نظریں غالب، انیس، اقبال وغیرہ پر پڑتی ہیں تو ہمارا سر خوشی اور فخر سے اونچا ہونے لگتا ہے لیکن جب چکبست جیسے جواں مرگ شاعر ہماری نظر سے گذرتے ہیں تو افسوس کے ساتھ ہماری پلکیں نم آلود ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح چند اور ممتاز ہستیاں اپنے عالمِ شباب میں دُنیائے ادب سے رخصت ہو گئیں۔ اُردو کی نہ معلوم اُن سے کیا کیا اُمیدیں وابستہ تھیں؟ لیکن موت کی آندھی آئی اور ان تمام چراغوں کو گل کر گئی۔ کیا کبھی نسیم، چکبست، سرور، رواں، اور نادر وغیرہ جیسے ہونہار لیکن جوانمرگ شاعروں کی کمی پوری کی جا سکتی ہے؟ آج یہ ہستیاں ہمیں خاموش نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کی بلند و شیریں آواز اب بھی فضائے عالم اور خصوصاً ہندوستان میں گونج رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اُن کی زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔

نسیم لکھنوی

سنہ ۱۸۱۱ء تا [illegible]

پنڈت دیا شنکر متخلص بہ نسیم، آتش کے شاگرد اور مشہور مثنوی "گلزارِ نسیم" کے مصنف تھے سنہ ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور عین عالمِ شباب میں سنہ ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔ ابتدا میں فارسی پڑھی شعر و شاعری سے قدرتی طور پر لگاؤ تھا۔ تمام اُردو فارسی شعراء کا کلام پڑھا اور بیس سال کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے۔ آزاد، شوخ طبع، ذہین اور غیور شخص تھے اس زمانے میں مثنوی "سحر البیان" کی بڑی دھوم تھی چنانچہ اس کے جواب میں گلزارِ نسیم" لکھی۔ لیکن بالکل نئی راہ نکالی اور اُردو ادب میں قابلِ فخر اضافہ کیا جس کو قبولِ عام نے شہرتِ دوام بخشی۔

مثنوی گلزارِ نسیم اپنی اچھوتی تشبیہوں۔ استعاروں اور لفظی مناسبتوں کے لئے مشہور ہے۔ روانی۔ فصاحت۔ اختصار، شستگی اور محاورے کی صفائی اسکی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس سے قابل مصنف کی نازک خیالی۔ جودتِ طبع اور بلند پروازی پر مہرِ تصدیق ثبت ہوتی ہے اس میں تصنع زیادہ ہے اور تاثیر کم۔ چکبست نے دیباچہ گلزارِ نسیم میں لکھا ہے:-

"میر حسن سخن آفریں ہیں، نسیم معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں۔ استعارہ و تشبیہہ نسیم کا حصّہ ہے...... نسیم کی زبان نہایت سلیس و پاکیزہ ہے اور اُسے لکھنو کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہئیے۔"

دراصل سحر البیان اور گلزارِ نسیم کا مقابلہ کرنا درست نہیں۔ دونوں کا طرز جُدا اور راستے مختلف ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اُردو مثنوی کو انسان تصور کر لیا جائے تو گلزارِ نسیم اُسکا دماغ ہوگی اور "سحر البیان" اسکا دل۔ دماغ "گلزارِ نسیم" سے اور دل "سحر البیان" سے مزا پاتا ہے۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مناسب نہیں۔ سادگی فصاحت اور تاثیر میں سحر البیان یادگار ہے اور اختصار۔ تصنع نازک خیالی اور جودتِ طبع میں گلزارِ نسیم آپ اپنی مثال ہے۔ عام و خاص کی مقبولیت نے گلزارِ نسیم کو وہ بہارِ جاوداں بخشی جس پر خزاں کو دسترس نہیں اور اس جواں مرگ شاعر کو اُردو ادب میں "حیاتِ جاوید" عطا کی۔

سرور جہاں آبادی

سنہ ۱۸۷۳ء تا سنہ ۱۹۱۰ء

درگا سہائے نام۔ سرور تخلص تھا۔ جہاں آباد ضلع پیلی بھیت آپکا مولد و مسکن تھا سنہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد

مولوی سید کرامت حسین بہار مرحوم سے فارسی کا اکتساب کیا اور انھیں کی شمعِ علم سے اکتسابِ نور ضیا کیا۔ تمام شعرائے متقدمین کا کلام بہ امعانِ نظر مطالعہ کیا۔ اس سے ان میں شعر فہمی کی قوت پیدا ہوگئی اور اُن کا ذوقِ شعری بھی تربیت پاگیا۔ وہ شاعر پیدا ہوئے تھے اُنکا گلدستۂ شاعری قدیم وجدید دونوں زمانوں کے رنگ کے پھولوں سے آراستہ ہے۔

اُن کا کلام موجودہ دور کے بلند، اچھوتے اور نازک خیالات سے مملو ہے جس سے درد وحسرت سوز وگداز اور وطن کی محبت آشکار ہوتی ہے۔ بایں ہمہ انکے یہاں قدما کی سی لطافت رنگینیٔ تخیل اور شان وشکوہِ الفاظ بھی موجود ہے۔ حالانکہ وہ شہرت کے طالب نہ تھے، لیکن سحر نگاری کے باعث بہت جلد اُن کی شہرت تمام ادبی فضا میں خوشبو کی طرح پھیل گئی۔ سرور فنافی الشعر تھے اُن کا سارا وقت شعر گوئی میں گذرتا۔ اس کے سوا اُن کو کچھ کام نہ تھا۔ آزاد مزاج، رند مشرب اور فکرِ فردا سے آزاد تھے۔ عادت میں سادگی تھی اور مزاج میں تعصب کا شائبہ بھی نہ تھا۔ طرزِ زندگی بھی نہایت سادہ اور نمود ونمائش سے پاک تھا۔ مے نوشی کی بُری عادت تھی۔ سُنا ہے کہ انھوں نے اپنا کلام فروخت کیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مرتے دم تک اُن کو اپنے کلام کے چھپنے کی خواہش رہی۔ مرنے کے بعد اُن کا کلام دو مجموعوں "خمخانۂ سرور" اور "جامِ سرور" کے نام سے شائع ہوا۔ لیکن یہ برگشتہ بخت شاعر اپنی زندگی میں اپنا کلام چھپا ہوا نہ دیکھ سکا اور ۳ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو ادبی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔

سرور کا کلام گوناگوں محاسن کا مجموعہ ہے اور بعض خصوصیات کے باعث وہ ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ جذبات نگاری میں اُن کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ خصوصاً غم آگیں اور درد بھرے جذبات کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ آہ نکل جاتی ہے ان کو ابوالاثر کہا جا سکتا ہے۔ خیالات کو درد بھرے لہجے اور ندرتِ بیان سے ادا کرتے۔ حب الوطنی کے خیالات بڑی شیرینی، بلند آہنگی زور اور اثر کے ساتھ بیان کئے ہیں اُن کا پیغام کسی خاص قوم یا مذہب کے لئے نہیں۔ وہ سارے ہندوستان بلکہ ساری دُنیا کو حب الوطنی کا درس دیتے ہیں۔ اس ذیل میں اُنکی نظمیں "خاکِ وطن" "مادرِ ہند" "حسرتِ وطن" وغیرہ یادگار ہیں۔ اُن کے یہاں تاریخی اور مذہبی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ جن میں درد، خلوص، زور، روانی اور شیرینی کے دریا بہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کو انگریزی نظموں کے ترجمہ کرنے میں بھی خاص قدرت حاصل ہے عبارت میں بھاشا اور ہندی کے میٹھے میٹھے الفاظ بڑی خوبی سے سموتے ہیں۔

بلندیٔ تخیل، رنگین بیانی، لطیف و دلکش تشبیہیں، درد واثر اُن کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ کلام میں تنوع بھی ہے۔ طبیعت قدرتی طور پر غم ورنج سے مانوس تھی۔ اس لئے اُن کی آواز ایک ٹوٹے ہوئے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ خیال کی رنگینی، درد واثر کے ساتھ شیر وشکر ہوگئی ہے جس سے ایک نیا لطف اور نرالا مزا پیدا ہو جاتا ہے۔ دل کے گہرے جذبات کی ترجمانی منظر نگاری اور حب الوطنی کے خیالات ظاہر کرنے میں اُنھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا ان کے کلام میں بعض خامیاں بھی ہیں لیکن صرف ان خامیوں کی وجہ سے پورے کلام پر کوئی دھبہ نہیں آتا۔ ان کی شاعری مجاہدانہ نہیں اور پیغام کے لئے انکا لہجہ بھی مناسب نہیں۔ اُنکی شاعری، انقلابی شاعری بھی نہیں کہی جاسکتی ہے اس لئے کہ نظموں میں حرکت، جنبش اور حیات بہت کم ہے۔ البتہ گرمیٔ جذبات ضرور ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود، دورِ حاضر کے ممتاز شعرا میں سرور کو جگہ دی جاسکتی ہے۔

نادر کاکوری

وفات سنہ ۱۹۱۲ء

نادر علی خاں متخلص بہ نادر طرزِ جدید کے بہترین لکھنے والوں میں سے ہیں ان کی نظموں میں جوش درد واثر۔ اعلیٰ تخیل اور شگفتگی ہے۔ تاریخ ادبِ اُردو میں لکھا ہے کہ وہ بائرن (BYRON) اور تھومس مور (THOMOS MORE) کے اچھے طالب علم تھے وہ چاہتے تھے کہ مغربی خیالات کو اُردو نظموں میں شیرینی اور سلاست کے ساتھ ادا کریں۔ اُردو ملکی زبان ہے اس میں وسعت پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دوسری زبانوں کا لٹریچر بھی ڈھالا جائے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اُردو میں صرف فارسی کے خیالات ہی ادا کئے جائیں۔ اور مغرب کے اعلیٰ خیالات کو اُردو کا جامہ پہنایا جائے۔ نادر مغربی اور مشرقی خیالات کو اُردو نظموں میں سمونا چاہتے تھے۔ نادر خاکِ وطن کے پُرجوش فرزند تھے۔ اسی لئے انھوں نے حبِ وطن کے خیالات کو سادہ پُرجوش اور میٹھی زبان میں ادا کیا ہے "شمع و پروانہ" "شعاعِ اُمید" "فلسفۂ شاعری" اُن کی چند یادگار نظمیں ہیں۔ وطنی اور قومی نظموں میں "مقدس سرزمین" اور "مادرِ ہند" اُن کی شاہکار نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔ پینتالیس ۴۵ سال کی عمر میں سنہ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔ افسوس ہے کہ عمر نے انکا ساتھ نہ دیا ورنہ اُنکا مشق بہت بلند تھا اور مطمحِ نظر اعلیٰ۔

چکبست لکھنوی

سنہ ۱۸۸۲ء تا سنہ ۱۹۲۶ء

کشمیر بڑا مردم خیز خطہ ہے۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے شاعر، حکیم، فلسفی اور سیاسی پیدا کئے۔ نسیم، اقبال، جواہر لال نہ

سرتیج بہادر سپرو اسی سرزمین کے مبارک فرزند ہیں۔ چکبست بھی اس کے ایک روشن ستارے تھے اور بجا ہے انھیں بجا طور سے فخر تھا۔ ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ لکھنؤ "شیرازِ ہند" کہلاتا ہے اُس کی خاک میں عجیب مقناطیسی کشش ہے کہ تمام کاملینِ فن کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ چکبست کو بھی اس مبارک سرزمین نے اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور وہ مستقل طور سے وہیں مقیم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت پاکر کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہو گئے جہاں سے بی۔اے پاس کیا۔ ایل۔ایل۔بی کی ڈگری لیکر وکالت شروع کردی۔ رائے بریلی کے اسٹیشن پر جبکہ وہ ایک مقدمے سے واپس ہو رہے تھے۔ یکایک فالج گرا، فالج چکبست کی موت کا پیغام لایا تھا۔ چکبست نہایت متین سنجیدہ پُرخلوص اور ملک و قوم کے سچے دوست تھے۔

اُنکا عقیدہ تھا کہ "محض خیالات کو توڑ مروڑ کر نظم کردینا شاعری نہیں بلکہ خیال میں خیال کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور تاثیر کا جوہر ضروری ہے" اسی اصول کو انھوں نے نظم و نثر دونوں میں پیشِ نظر رکھا۔

چکبست کی نثر میں سنجیدگی، متانت، رنگینی، زور اور استدلال ہے۔ عرصہ تک ایک معیاری رسالہ "صبحِ اُمید" کے نام سے نکالتے رہے۔ "عطرِ سخن" کے عنوان سے غالب اور آتش کے منتخب اشعار پیش کیا کرتے تھے۔ اس سے اُن کے صحیح مذاقِ شعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کے مضامین کا وسیع مجموعہ "مضامینِ چکبست" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نثر میں وہ کوئی صاحبِ طرز نہیں بلکہ حالی اور آزاد کے خوشہ چیں معلوم ہوتے ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے بھی اُنکا درجہ کافی بلند ہے لیکن حالی، شبلی اور دیگر ممتاز نقادانِ سخن کی صف میں انکا پتہ نہیں ملتا۔

اُن کی غزلوں پر آتش اور غالب کا رنگ ہے۔ زبان دلکش، روزمرہ اور مترنم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ انکا لہجہ بلند ہے۔ غزلوں میں قومی جذبات۔ نکاتِ اخلاق اور پند و نصائح بھی ہیں۔ اخلاقی اور اصلاحی نظمیں بھی کافی ہیں لیکن بانکپن اور شیرینی سے خالی نہیں ہیں۔ غزلوں میں نظمیاتی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ فلسفیانہ خیالات بھی کہیں کہیں ملتے ہیں لیکن یہ زیادہ عمیق اور وسیع نہیں۔ سائنٹفک مسئلوں پر بڑی صراحت سے غزلوں میں روشنی ڈالی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود چکبست کی غزلوں میں کسک، چبھن اور خلش نہیں ہے۔ اُنکی آواز ٹوٹے ہوئے دل کی آواز معلوم نہیں ہوتی وہ نہ گھل کر ہنس سکتے ہیں اور نہ رو سکتے ہیں بلکہ ایک عجیب متفکرانہ سنجیدگی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

نظموں میں وہ انیس کی تقلید کرتے ہیں لیکن اکثر وہ ناکامیاب سے معلوم ہوتے ہیں (گو وہ کبھی کبھی کامیاب بھی ہوتے ہیں) اس لئے کہ دبیر کی نقالت ظاہر ہونے لگتی ہے بعد کی نظموں میں اقبال کا اتباع کیا ہے جس میں وہ کافی کامیاب ہوئے ہیں اور اُنکی یہی سعی مشکور ہوئی۔ چکبست شرابِ وطن سے مخمور تھے۔ اِس شراب کی سُرخی اُنکی ساری نظموں سے جھلکتی ہے۔ چکبست کی قومی و وطنی نظمیں اکثر میٹھی، سادہ، رواں اور پُرتاثیر ہوتی ہیں۔ "خاکِ ہند"، "وطن کا راگ"، "ہمارا وطن" اس قسم کی مشہور اور اچھی نظمیں ہیں۔ چند نیچرل نظمیں بھی اُن سے یادگار ہیں۔ مناظرِ فطرت کی تصویر کچھ اس طرح کھینچتے ہیں کہ نظم کی سادگی، شیرینی اور روانی سے دل و دماغ کو وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو اصل منظر سے، گویا اُنھیں منظر نگاری میں ملکہ حاصل تھا" [illegible] — "بہارستانِ کشمیر" اس قسم کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ ان سے مناظر کی تصویر کشی کی خوبی ظاہر ہوتی ہے۔ مذہبی نظموں میں "رام چندر کی رخصت" اُن کی شاہکار نظم ہے۔ جس کا ہر ہر لفظ، درد و اثر اور خلوص و محبت کی داستان ہے۔

غرض اُن کی نظموں میں روانی، شیرینی، اثر اور شان و شکوہِ الفاظ سب کچھ موجود ہے۔ اِن خوبیوں کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ وہ کسی غیر معمولی ادراک کے مالک نہ تھے اور نہ وہ صاحبِ طرز ہی تھے۔ البتہ قومی شاعری کو آب و رنگ سے اور مناظرِ فطرت کی خوش اسلوبی سے تصویر کشی میں وہ کمال رکھتے تھے اور تسلسل کی کڑی کبھی نہیں ٹوٹنے دیتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ روانی کا دریا بہہ رہا ہے لیکن ان کے یہاں میر کا درد، انیس کی سی قادر الکلامی اور اقبال کا سا فلسفیانہ عمق مفقود ہے اگر موت اُنھیں مہلت دیتی، تو شاید اُنکی شاعری ان چیزوں کو حاصل کر لیتی۔ قطعِ نظر اسکے، دورِ حاضر کے شاعروں میں وہ صفِ اوّل میں جلوہ گر ہیں۔ اُن کی خدمات اُردو ادب میں ہمیشہ فخر و عزت کی نظر سے دیکھی جائینگی۔

اے کاش! وہ کچھ اور زندہ رہتے!

جگت موہن رواں

رواں تخلص، جگت موہن نام تھا۔ ۱۸۸۹ء میں کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آئے۔ خداداد ذہانت اور شوخی پائی تھی۔ بی۔اے امتیازی خصوصیت سے پاس کرکے ایم۔اے کی ڈگری بھی نمایاں کامیابی سے حاصل کی پھر ایل۔ایل۔بی پاس کرنے کے بعد اُناؤ میں وکالت شروع کردی۔ شعر و شاعری سے خداداد مناسبت تھی۔ ذوقِ شعری کی آگ بچپن سے سینے میں مشتعل تھی جو چشمہ بنکر بہہ نکلی، عزیز لکھنوی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اُردو کے علاوہ فارسی پر بھی کافی عبور تھا۔ اُردو میں غزلیات کے ساتھ ساتھ نظمیں اور رباعیاں بھی ملتی ہیں۔ ندرتِ بیان سے نظم میں ایک خاص طور کی آب و تاب آجاتی ہے جس سے دل میں کسک اور دماغ میں کیف و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ خیال کی بلندی، شاعرانہ نکات سے مل جل کر

بڑا لطف دیتی ہے۔ سائنٹیفک خیالات سادہ اور صاف مگر رنگین لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ فلسفیانہ مضامین بھی روانؔ کی شاعری میں کہیں کہیں جھلکتے ہیں وہ کبھی کبھی مغرب کی مے ہندی شیشہ و ساغر میں پیش کرتے ہیں۔ سلاست اثر اور جذبات کی رنگینی سے اُن کی شرابِ سخن میں کیف و سرمستی کا عالم پیدا ہوگیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس ہونہار شاعر کی کشتیٔ عمر قبل از وقت موت کے بے پناہ سمندر کی گرجتی ہوئی لہروں میں نظروں سے پوشیدہ ہوگئی۔ اب تک اُردو ادب کے اُفق سے ایسے ہونہار شاعروں کی یاد میں خون ٹپکتا ہے۔

مولانا حالیؔ نے "حیاتِ سعدی" میں سچ کہا ہے۔ "علم و فن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ عمر پانی ضروری ہے .... شاعر جسقدر بوڑھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے .... جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے گو کہ اُن کی قابلیت و استعداد اعلیٰ درجہ کی تھی مگر اُن کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا" پھر بھی جن چند شاعروں کا ذکر مختصراً کیا گیا اُن میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کو دُنیائے ادب بہت جلد فراموش نہ کر سکے گی۔ اُن کی شاعری کو ستاروں نے چمک، پھولوں نے تر و تازگی، چشموں نے ترنم، آفتاب نے بلندی، چاند نے نور اور فطرت نے حیاتِ ابدی بخشی ہے۔ اُنھوں نے شاعری کے رنگین پھولوں سے ادب کی محفل سجائی تھی۔ اس لئے جب وہ آزاد کے سجائے ہوئے بقائے دوام کے دربار میں جلوہ گر ہونگے تو عرفیؔ شیرازی ہاتھ بڑھا کر اُن کا استقبال کرینگے۔ چیٹرٹن (THOMAS CHATTERTON) اور بائرن (BYRON) مسکراتے ہوئے قریب بیٹھنے کی دعوت دینگے!

حقیقت یہ ہے وہ بزمِ ادب ہے جس کے لئے اُردو ادب کو ابد تک دست بدعا رہنا پڑے گا ؎

شلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا!
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

تسنیم برنی

نذرِ میرؔ

رات اور فکرِ نارسائی کی — انتہا ہے شکستہ پائی کی
جس کے رہنے کا گھر سلامت ہو — وہ کرے کوششیں رہائی کی
نالۂ دل سے کیا کروں شکوہ — اسے عادت ہے نارسائی کی
خارِ صحرا نے دعوتیں دیکر — شرم رکھ لی برہنہ پائی کی
شام بھی مضطرب ہے آنے کو — دھوپ سمٹی نہیں جدائی کی
یہ سمن زار، یہ گھٹا، یہ بہار — ہے کمی اُنکی جلوہ زائی کی
لب سے روکا تو آنکھ سے چھلکیں — سوزشیں ضبطِ انتہائی کی
ربط و ضبطِ قفس کو کیا کہیے — کوششیں لاکھ کیں رہائی کی
جیسے ہوگی کبھی سحر نہ طلوع — شام دیکھے کوئی جدائی کی
چھا گیا حسن دونوں عالم پر — جب محبت نے ہمنوائی کی
نہیں عمرِ ابد قرار سے کم — اک گھڑی آپ کی جدائی کی
آنکھ سے بھی ہے بندگی ممکن — کیا ضرورت ہے جبہ سائی کی
یہ تو راہگیر و راہبر جانیں — رہزنی کی کہ رہنمائی کی
بندگی وجہِ ناز ہو کہ نہ ہو — بات تو رہ گئی خدائی کی

رُک سکے اشکِ غم نہ اے اعجازؔ
ہم نے کوشش تو انتہائی کی

اعجاز صدیقی

افسانہ :-

اندھیرے میں

قُل قُل قُل .... قُل قُل .... ثریا باجی نہارہی تھیں۔

کھر، کھر، کھرر، کھر، کھرر ...... کمرے میں ارشد بھیا بیٹھے لاہور اسٹیشن کیچ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

چھن، چن، چن، چھن .... اماں باورچی خانہ میں کچھ نمکین چیزیں تل رہی تھیں۔

ثریا باجی ارشد بھیا کو منگی تھیں۔ یہ دعوت دراصل ثریا باجی ہی نے کی تھی۔ لیکن میرے نام سے کل رات کو ثریا باجی نے مجھ سے کہا کہ ارشد بھیا کو میں خط لکھکر چار پر بلالوں۔ پیسے سب ثریا باجی نے دیئے تھے۔ اس میں ثریا باجی کی ایک چال تھی وہ ارشد بھیا کو گھر میں بلاکر چار پیالا چاہتی تھیں خود بلا نہیں سکتی تھیں کیونکہ بقول اُمی کے یہ بے شرمی بے حیائی اور نہ جانے کیا کیا تھی۔ بجیا نے اُمی کو دھوکا دیا اور اُمی دھوکا کھاگئیں۔ بڑی بوڑھیوں کو بقول شخصے جبتک دھوکا نہ دو وہ کوئی بات مانتی ہی نہیں ہیں —— ارشد بھیا بھی یہی جانتے تھے کہ دعوت بجیا نے کی ہے!

ریڈیو سے عجیب آواز نکلی جسے سُن کر میں زور سے ہنس دی جب قہقہے اور ریڈیو کی گونج کم ہوئی تو اُمی کی کرخت آواز اور ثقیل الفاظ کانوں میں پہنچے اُمی کہہ رہی تھیں "اری آج تو دیوانی ہوگئی ہے کیا مردار .... جتنی لوتھڑ ہوتی جاتی ہے اتنی ہی بے شرمی اختیار کرتی جاتی ہے ...... دوپٹہ ٹھیک کر ......" لیکن میں ہنستی رہی اب بھیا کو اسٹیشن مل گیا تھا، اتفاق کی بات غزل وہی تھی جسے بجیا بہت پسند کرتی تھیں اور جسے خود بھی گنگناتی رہتی تھیں۔ جوش کی غزل تھی ؎

سچ سچ بتانا اے دل تونے کبھی کہیں بھی
سرسبز ہوتی دیکھی اُلفت کی سرزمیں بھی

حمام سے آواز آئی کھٹ، کھٹ .... کھٹ، کھٹ، کھٹ ...... بجیا نے درار سے مخصوص اشارے کئے اور میں کمرے کی طرف دوڑی تاکہ بھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھدوں اور ثریا باجی دوسرے کمرے میں چلی جائیں۔

میں جوں ہی کمرے کی طرف دوڑی کہ اُمی چیخنے لگیں "اری ڈوپٹہ اتار ڈال کیا ضرورت ہے یوں ہی ننگی گھوم!" اُمی کی باتوں پر میں نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔

اُمی کو تو یہی دھڑکا کھائے جاتا تھا کہ سر کھلا ہے، سینہ ڈھانپ، یوں نہ ہنساکر، ہونٹ سی لے۔ یوں ہاتھ اور آنکھیں نہ مٹکاپاکر اور نہ جانے کیا، کیا!

"کہو کیا ہے"! میں جوں ہی کمرے میں گئی بھیا پوچھ بیٹھے جواب، میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھدیئے اور آنکھیں چھپالیں اور پکار کر کہا "نکل آیئے بجیا" بجیا نکل کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں، بھیا چپ، چاپ بیٹھے رہے۔ میں نے جھک کر دیکھا تو وہ انگلیوں کے خلا سے بجیا کو دیکھ رہے تھے مجھے بڑا غصہ آیا اور بھیا زور زور سے ہنسنے لگے میں کمرے سے نکل گئی۔ بھیا ابھی تک اپنی فتح پر ہنس رہے تھے!

بجیا کمرے میں کنگھی کر رہی تھیں آج انھوں نے بہت اچھے کپڑے پہنے تھے بجیا بہت حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے پیالیاں صاف کرکے میز پر لگادیں اور بجیا کا انتظار کرنے لگی۔ فوراً ہی بجیا نے تالی بجائی میں کمرے کی طرف چلی گئی تاکہ دروازے بند کردوں۔ ارشد بھیا بولے :-

"ذرا سی دیا ر رکھنا"

"نہیں، نہیں"

"کیوں ——"

"ایک دن تو آپ بجیا کو دیکھ ہی لیں گے۔ ذرا سا صبر بھی نہیں ہوتا"

"چل باتیں بناتی ہے"

"اچھا کچھ دینے کا وعدہ کیجئے۔

"جو مانگو"

"قیمتی ساڑی"

"منظور، کل ہی لادوں گا"

میں نے دروازہ تھوڑا کُھلا رہنے دیا۔ درار سے آنگن کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا، بجیا کا ارشد بھیا سے پردہ تو تھا نہیں ہاں کا نا پردہ ضرور تھا اور وہ بھی اُمی کی وجہ سے ورنہ بھیا جب بھی آتے بجیا کو دیکھ ہی لیتے تھے —— اور بجیا کو بھی خود کو دکھانے میں مزہ آتا تھا یہ دعوتیں اسی لئے ہوتی تھیں!

بجیا آنگن میں آگئیں، بجیا ہلکی ریشمی گلابی رنگ کی شلوار پہنے تھیں جس پر بڑے بڑے پھول بنے تھے ویسی ہی قمیض تھی۔ جسکی پشت، گلے اور کفوں پر سنہرے پھول کڑھے تھے اور گلابی ہی رنگ کا بھاپ ایسا دوپٹہ کندھوں پر پڑا تھا۔ سینٹ میں بسی پڑی تھیں۔ بالوں میں سُرخ رنگ کا فیتہ تھا۔ نازک کلائیوں میں باریک چوڑیاں تھیں، کانوں میں لمبے لمبے آویزے ہل رہے تھے۔ ناک میں مہین سی کیل تھی ——— بجیا کبھی میز کے اس سرے پر آتیں اور کبھی دوسرے سرے تک جاتیں کبھی پیالیاں ٹھیک کرتیں تو کبھی شکردان، بجیا اس فن میں ماہر تھیں ——— اور دراز سے بھیا کی آنکھیں جھک رہی تھیں۔

بجیا نے میز پر آخری نگاہ ڈالی اور کہنے لگیں "پہلے کچھ کھلانا پھر تم خود چار بنا کر دینا، تکلف نہ کرنے دینا، خوب کھلانا۔" یہ کہکر بجیا تو کمرے میں ہو گئیں اور بھیا باہر نکل آئے، میں نے بھیا پر چوٹ کی "آئیے آپ کو بھوک لگ رہی تھی۔"

"اور بجیا ——— ؟"

"آ جائیں گی۔ آتے ہی اعتراض کرنے لگیں گی۔"

"اچھا بھئی کونسی چیز سب سے اچھی ہے؟"

"جو آپ کو پسند ہے وہ کھائیے۔"

"نہیں جو تم کہو؟"

"پہلے ——— کیک۔"

"نہیں بھئی بسکٹ۔"

"اور میں کھجوریں کھاؤں گی۔" میں نے بھی بھیا کی مخالفت کی، پھر میں نے بھیا کو چار بنا دی۔ کمرے میں بجیا نے لکھنؤ اسٹیشن لگا دیا۔ بجیا کبھی کبھی دروازے کے پیچھے سے جھانکتی تھیں، اُن کا جی بیقرار تھا کہ وہ بھی آکر چار میں شریک ہو جائیں لیکن بیچاری مجبور تھیں۔ مجھے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے پاکر بھیا نے بھی مڑ کر دیکھا، بجیا جلدی سے ہٹ گئیں ہم دونوں ہنسنے لگے۔ بجیا کی تاکید کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے بھیا کو خوب کھلایا یہاں تک کہ اب زیادہ کھانے سے بھیا نے انکار کر دیا اور مجھے مجبور ہونا پڑا ———!!

ثریا باجی کی شادی ہونے والی تھی گھر میں کئی مہمان بھی آ گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد بجیا بھیا کی ہو جانے والی تھیں۔ آجکل بجیا بہت خوش تھیں بات، بات پر ہنسا کرتی تھیں اور روشن مستقبل کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔

جاڑوں کی ایک رات کو جب سب باورچی خانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے صرف بھیا کمرے میں تنہا بیٹھے تھے۔ مجھے حکم ہوا کہ بھیا کے پاس جاکر بیٹھوں۔ مجھے دیکھ کر بھیا کہنے لگے "واہ بھئی پان تک کو نہ پوچھا؟"

"آپ نے مانگ لیا ہوتا؟"

"کس سے مانگتا کوئی یہاں تھا ہی نہیں۔"

میں پان لینے باورچی خانہ کی طرف گئی، بجیا، بھیا کے لئے پان بنانے لگیں۔ امی جان خالہ سے نہ معلوم کہاں کہاں کی باتیں کر رہی تھیں، امی آجکل کی لڑکیوں کی بے شرمی کی داستان کہہ رہی تھیں، اس پر خالہ جان نے چبا چبا کر کہا "اری اور نہیں تو کیا بہن۔ اب تو زمانہ ہی بدل گیا۔" پھر ٹھنڈی سانس لی اور چپڑ چپڑ کرکے پان کھانے لگیں۔

میں نے ٹوکا "خالہ جان یوں پان کھانا بدتمیزی ہے۔"

"اری دور ہو بیٹا سے مردار ——— بڑی تمیز دار بن کے آئی ہے کل کی چھوکری۔"

میں پان لیکر کمرے کی طرف چلی اب کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں جوں ہی دروازے کے پاس گئی ——— مجھے اندھیرے میں دو سائے نظر آئے میں نے جلدی سے بجلی کھولدی، کیا دیکھتی ہوں ارشد بھیا نازو کے منہ پر جھکے کھڑے تھے ——— مجھے دیکھتے ہی نازو چلی گئی، لیکن بھیا کھڑے رہے ——— نادم سے!

نہ جانے اسوقت کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آنے لگے۔ ایک سنسناہٹ تمام جسم میں دوڑ گئی، ارشد بھیا اور نازو ——— میں نے جو کچھ دیکھا تھا اسکا مجھے خود یقین نہ تھا ——— الٰہی میں نے کیا دیکھا ———؟

تمام رات مجھے اُلجھن سی رہی جو کچھ میں نے دیکھا تھا بجیا کو بتانا ضروری تھا، لیکن اس خیال سے رک جاتی کہ بجیا کا نہ معلوم کیا حال ہو لیکن بجیا کو آگاہ نہ کرنا اُن کے ساتھ دشمنی کرنا تھا آخرکار صبح کو میں نے بجیا سے وہ سب کچھ بتا دیا جو کل رات کو اندھیرے میں میں نے دیکھا تھا، بجیا نے نہایت اطمینان سے سُنا اور کہنے لگیں :-

"ممکن ہے شادی کے بعد یہ بات جاتی رہے اور مجھے یقین ہے کہ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا، لیکن ہم مجبور ہیں، عورتوں کو مرد پر پورا قابو نہیں ہے، لیکن عورت کا فرض ہے کہ مرد کو اس سے روک دے۔"

یہ کہہ کر بجیا نے اس معاملہ کو ٹالدیا اور یہی اچھا بھی ہوا وہ کر بھی کیا سکتی تھیں ——— وہ ایک عورت ہی تو تھیں!

کچھ دنوں بعد بجیا کی شادی ہو گئی اور بجیا اپنی سسرال چلی گئیں۔ ایک گھر

میں اندھیرا اور دھندلے میں روشنی ہو گئی تھی وہی ایک میرا گھر میں بھی منگا لیکن رفتہ رفتہ یہ بات بھی جاتی رہی۔ ہماری زندگی اندھیرے ہی میں کٹ جاتی ہے اور ہم خود کو بھی پہچان نہیں پاتے۔ نہ ہمیں زندگی کی گذشتہ باتوں ہی کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہم آنے والے واقعات ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔ ارشد بھیا میں سب خوبیاں موجود تھیں کھاتے پیتے تھے۔ خوبصورت اور زندہ دل تھے، پھر تعلیم یافتہ بھی۔ خیال تھا بجیا کے ساتھ اچھا برتاؤ کرینگے اور بجیا تمام زندگی مسرور رہیں گی لیکن ——— ؟

سنہرے خواب مٹ گئے، زندگی کے سپنے مبہم پڑ گئے اور بجیا کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک عذاب بن گئی، شادی کے تین ہی ماہ بعد انکی زندگی دُکھ کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گئی ——— !

تین مہینے تک جو کمرہ بجیا کے جانے سے خالی پڑا رہا تھا اب بجیا کے آنے سے بس تو گیا تھا لیکن اب اسکی نوعیت دوسری تھی۔ پہلے بجیا کمرے میں بیٹھ کر اپنے خوشگوار مستقبل کے خواب دیکھا کرتی تھیں لیکن اب وہ دن رات اپنی قسمت کو کوسا کرتی تھیں۔ کمرے میں سناٹا چھایا رہتا تھا۔ کمرے کی خاموشی مسلسل ہچکیاں لیا کرتی تھی۔ کمرے میں جانے کو دل نہ چاہتا تھا۔

بجیا بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ ہر عورت اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے لیکن بھیا نے بجیا کی محبت کی قدر نہ کی اُنھوں نے بجیا کی بے پناہ محبت کو ٹھکرا دیا۔ بجیا سب کچھ سہہ سکتی تھیں لیکن شوہر پر دوسری عورت کا قبضہ نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

محبت جب بٹ جاتی ہے تو اپنی جاذبیت کھو دیتی ہے۔ بھیا اب اوروں سے دل بہلایا کرتے تھے۔ بجیا کو بالکل بھول چکے تھے ——— بھیا بھی تو آخر مرد تھے ——— ایک ظالم مرد ——— !!

پھول کو شاخ سے توڑ دو فوراً اسکا رنگ بدل جاتا ہے۔ بجیا کا سب رنگ روپ پھیکا پڑ چکا تھا، آنکھیں اپنی دلکشی کھو چکی تھیں۔ اب نہ بجیا گنگناتی تھیں نہ کبھی مسکراتیں۔ بجیا اب بناؤ سنگھار بھی چھوڑ چکی تھیں۔ بجیا کے ارمان، اُمنگیں، اُمیدیں اور آرزوئیں مر چکی تھیں۔ اب انکا دل اس بنجر زمین کی طرح تھا جس پر نہ کبھی کچھ پیدا ہوتا ہے نہ کچھ اُگتا ہے۔

ایک دن بجیا کے پاس میں بیٹھی تھی، بجیا بہت خاموش تھیں تھوڑی دیر بعد میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور دھیرے دھیرے دباکر کہنے لگیں۔

”تم نے دیکھ لیا مردوں کو وہ پھول سونگھنے کے لئے بیقرار رہتے ہیں وہ کھلے ہوئے پھول کو شاخ سے توڑ لیتے ہیں اور پھر سونگھ کر مردہ پتیوں کے ڈھیر پر ڈال کر چلتے بنتے ہیں اور کسی اور پھول کی طرف ہاتھ بڑھا دیتے ہیں ——— عورتیں محبت کے لئے پیدا ہوتی ہیں، لیکن مرد اُن کو ستانے کے لئے۔ مرد، عورتوں کو بے جان کھلونوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں ....

تم نے جو کچھ اندھیرے میں دیکھا تھا وہ آنیوالے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔ مجھے تو اُسی وقت سمجھ لینا تھا لیکن اپنی قسمت پر صابر رہی کیونکہ ہمارے ملک کی یہی ریت ہے ——— کاش اندھیرے سے میں نے روشنی حاصل کی ہوتی۔ ہمارے ملک کی لڑکیوں کی قسمت، اُن کی خوشیاں اندھیرے ہی میں رہتی ہیں اس طرح اُن کی زندگی اندھیرے ہی میں گذر جاتی ہے ——— کتنی بُری معاشرت ہے ہمارے ملک کی کہ اگر لڑکیاں اندھیرے سے نکلنے کی کوشش کریں تو وہ بدنام ہو جاتی ہیں اور اگر قسمت پر صابر رہیں تو انکی زندگیاں دُکھ کے انبار بن کر رہ جاتی ہیں ....“

یہ کہہ کر بجیا نے اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اب اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میں بھی رونے لگی اور میں نے بجیا کو چمٹا لیا، بجیا کی طرح اور ہزاروں لڑکیاں ہونگی جن کو اپنی بہشت دی، مستقبل اور زندگی سے اندھیرے میں رکھا جاتا ہوگا اور وہ یونہی گھٹ گھٹ کر جان دیتی ہونگی۔

آسمان پر اندھیرا چھایا تھا، چاند نہ جانے کہاں منہ چھپائے رو رہا ہوگا صرف تارے جگمگا رہے تھے لیکن اُن کی ٹمٹماہٹ بھی مبہم تھی بجیا کے کمرے میں بھی اندھیرا تھا مجھے وہ دن یاد آیا جب میں نے بجیا اور نازو کو پاس پاس کھڑے دیکھا تھا۔ اندھیرے کے واقعات میری آنکھوں میں پھر رہے تھے ——— کاش وہ دن ہی نہ آیا ہوتا ——— کاش بجیا کی زندگی پر اندھیرے کا سایہ تک نہ پڑتا اور آج وہ اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر اس طرح نہ رویا کرتیں ——— کاش ——— !!!

اختر ملیح آبادی

افسانہ:-

تین ملاقاتیں

طبیہ کالج کی خوبصورت عمارت، سامنے وسیع باغ اور پشت پر سکھوں کا قبرستان یہ سب دیکھتے دیکھتے طبیعت اکتا گئی کسی کسی وقت تو قبرستان دیکھ کر اپنی زندگی بانی کا بلبلہ معلوم ہوتی اور گھنٹوں سر تھامے یہ سوچا کرتی کہ دنیا کتنی بے ثبات ہے دنیا میں انسان رہنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا لیکن پھر وہی حاصلِ زندگی ویرانے کا ایک کونہ ہے۔ منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے رہو اور اپنے کرتوت اپنے ساتھ، کوئی دعا کو ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے والا بھی نہیں۔ پھول چڑھانا تو بڑی بات ہے۔ چھٹی کے بعد لڑکے کہیں لڑتے قبرستان کے پاس سے نکل جاتے اسوقت وہ بھول کر بھی یہ نہ سوچتے ہونگے کہ کبھی ہمارا انجام یہی ہوگا، لاؤ ان شہر خموشاں کے مکینوں کا حالِ زار دیکھتے چلیں۔

میں نے ایک دن بے حد پریشان ہوکر اماں سے صاف کہدیا کہ "یا تو مکان تبدیل کر دیجئے ورنہ مجھے گھر سے نکال دیجئے میں ایک دن بھی اس گھر میں نہ رہونگی۔ ان کا بھی صاف جواب تھا کہ جہاں دل چاہے چلی جاؤ مجھے یہ مکان پسند ہے کم ازکم یہاں شور وغل تو نہیں، چاہو تو کچھ دن کے لئے اپنے چچا کے پاس دہلی چلی جاؤ۔ میں اُن کے اس معقول جواب سے بے حد خوش ہوئی کہ چلو تفریح کی تفریح رہی اور اس روح فرسا نظارے سے بھی فرصت ملی، میں نے فوراً ہی چچا قبلہ کو تار دیدیا کہ میں آرہی ہوں، اسٹیشن پر ملئے گا، دوسرے دن سوار ہوگئی۔ چچا اسٹیشن پر موجود تھے اور ہزاروں دعاؤں کی بوچھار مجھ ناتواں پر کرتے ہوئے گھر لے گئے، خدا کا شکر کہ راستے میں بھی کوئی تکلیف نہ ہوئی تھی اور یہاں بھی ایک سجا سجایا کمرہ رہنے کو مل گیا۔ کوٹھی شہر سے کافی دور تھی اور گرد وپیش کا ماحول بھی سازگار معلوم ہوتا تھا، کوٹھی کے آگے ٹہلنے کے لئے پائیں باغ دیکھ کر میری طبیعت مسرت سے جھولے جھولنے لگی، میں نے گھوم گھوم کر گھر کا کونہ کونہ دیکھ ڈالا اور پھر آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں آنکھیں بند کرکے لیٹ گئی۔ نیند ایسی آئی کہ صبح دس بجے ہوش آیا، قبلہ چچا پیارے مار مار کر جگا رہے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں چچا چچی سے بچھا چھڑا کر چپکے سے چچا کے مطالعے کے کمرے میں کھسک گئی۔ چمکتی ہوئی مجلد کتابیں دیکھ کر دل یہی چاہتا تھا کہ سب ایک سا تھ پڑھ ڈالوں کہ چچی صاحبہ نے آکر فوراً ہی کھانا کھانے کو حکم صادر کردیا۔ کھانا کھانے کے بعد آرام کرنا بھی ضروری تھا، اسی لئے ایک کتاب لیکر اپنے کمرے میں پلنگ پر دھر رہی، گرمیوں کی دوپہر بھی کس قدر حواس باختہ کردینے والی ہوتی ہے شدت کی لو چل رہی تھی میں نے سب دروازے بند کرلئے اور کتاب پڑھنے لگی پڑھتے ہی پڑھتے خدا جانے کس وقت سوگئی، جب جاگی ہوں تو پانچ بج رہے تھے غسل کرکے سیدھی پائیں باغ پہنچی، مالی پانی دے کر جا چکا تھا، میں ہرے ہرے پتوں اور رنگین پھولوں میں قدرت کی رنگینیٔ طبع کا جلوہ دیکھنے لگی کہ ایک دم سائیکل گرنے کی آواز سے چونک کر میں نے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ ایک بیس بائیس سالہ خوبصورت سا لڑکا اپنی سیاہ شیروانی سے خاک جھاڑ رہا تھا۔ سائیکل چڑھنے والوں کی بھی کیا گت بنتی ہے، مجھے ہنسی آگئی اس نے مجھے دیکھا اور فوراً ہی سائیکل اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا لیکن ذرا ہی دیر میں وہ حضرت پھاٹک کے چکر شان سے لگاتے نظر آئے اور خوبی یہ کہ دونوں ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلائی جا رہی تھی، یعنی گرنے کے بعد بھی وہ اپنی بہادری کا ثبوت دے رہے تھے میں ٹہلتی جاتی اور کن انکھیوں سے ادھر بھی دیکھ لیتی۔ ایک بار جو نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ پھاٹک کے پاس سائیکل تھامے شان سے کھڑے تھے اور مجھے اس طرح گھور گھور کر دیکھا جا رہا تھا جیسے اُن کے باپ کی جائداد ہوں۔ مجھے اس حرکت پر سخت طیش آیا لیکن کچھ کہہ کر گستاخ نہ بنانا چاہتی تھی لیکن جیسے ہی میرا منہ اس کی طرف ہوا وہ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔ اب تو واقعی مجھے سخت غصہ آگیا۔ یعنی کوئی شریف لڑکی اپنے باغ میں بھی نہیں ٹہل سکتی؟ کہ راہ چلتے آوارہ لونڈے کھڑے ہوکر اپنی بےحیائی کا ثبوت دیں گے، میں نے بڑی مشکل سے غصہ ضبط کرکے نظریں جھکا لیں اور ٹہلتی رہی، میں نے ایک بار پھر دیکھنے کے لئے اس طرف دیکھا کہ وہ گیا یا نہیں لیکن وہ اور بھی مستعدی سے گھور رہا تھا اور نظریں چار ہوتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا اب تو میرے ضمیر نے مجھے مجبور کردیا کہ کم ازکم اسے ایسی سزا تو دو کہ آئندہ کسی سے یہ گھورنے والی حرکت نہ کرے، میں تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور دانت کٹکٹا کر کہا:-

"کیوں جی یہ کیا حرکت ہے کیا تمہاری اماں بہنیں نہیں ہیں؟"

" اماں۔ بہنیں تو ہیں لیکن بیوی نہیں ہے؟"

"شرم نہیں آتی بدتمیز" میں اُس کے جواب سے جل گئی۔

"شرم کاہے کی؟ نہ تم یہاں ٹہلو نہ میں دیکھنے پر مجبور ہوں"۔

"بے شرم!" میں غصے سے کانپ ہی تو رہی تھی اور غضب یہ کہ اُس نے تم سے مخاطب کیا۔ یہ میری کس قدر توہین تھی۔

"کہہ تو دیا کہ شرم کاہے کی، اچھی چیز کو سب ہی دیکھتے ہیں!"

"گستاخ!" میرے ہونٹ تک کانپنے لگے اگر مالی ہوتا تو پٹوا کر چھوڑتی۔

"کاش میں یہ حسین گستاخی روز کرتا رہوں!" اُس نے جھوم کر کہا،

"شاعر معلوم ہوتے ہو؟" میں نے اُس کا مضحکہ اُڑانے کے لئے طنزیہ کہا،

"اور تم ناصح؟" اُس نے فوراً جواب دیا۔

"کیا بکواس ہے فوراً چلے جاؤ یہاں سے!" میں نے جھنجھلا کر کہا لیکن یہ سمجھ گئی کہ یہ تیز لڑکا ضرور کسی کالج کا اسٹوڈنٹ ہے زیادہ کچھ کہا تو قطعاً سر پر سوار ہو جائیگا۔

"یہ کون سی شرافت ہے کہ مجھے سڑک پر کھڑا ہونے سے بھی روکتی ہو، کوئی تمہارے باغ میں تو نہیں آ رہا ہوں، پھر تمہیں کیا حق ہے کہ چلے جانے کا حکم دو؟" اُس نے سنجیدگی سے کہا لیکن چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ تمہارے جیسے آوارہ لڑکے گھروں سے نکالے ہوئے ہوتے ہیں پھر سڑک پر نہ کھڑے ہو تو کیا کرو"۔ اب میں نے اُس کا مضحکہ اُڑانا شروع کیا تاکہ کچھ تو غیرت آئے۔

"یقین کرو کہ ابھی تک تو گھر سے نکالا نہیں گیا ہوں لیکن اب تمنا ہے کہ نکالا جاؤں تو اسی پھاٹک کے پاس رہ پڑوں"۔ اُس نے آنکھیں گھما کر برجستہ کہا اور میں تپنے کے بجائے اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اچھا بک بک بند کرو!"

"خوب! یعنی کہ میں نے تم کو باتیں کرنے کے لئے بلایا تھا، خود ہی آ گئی تھیں، چلی جاؤ"۔

میں پھر تپ گئی کتنی تلخ حقیقت اُس نے کہی آخر مجھے اس پاجی کو تنبیہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چپکی ٹہلتی رہتی آپ ہی تھک کر چلا جاتا لیکن اب اس کے ڈھیٹ پن سے ہار کر چلا جانا بھی گدھا پن تھا۔

"جاتے ہو یا مالی کو بلاؤں؟" میں نے دھمکایا

"مالی ------؟" وہ قہقہہ لگا کر کہنے لگا، "کیا پٹوانے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں تمہارے جیسے آدمیوں کی یہی سزا ہے کہ ایک ذلیل آدمی سبق دے"۔

"خیر! اگر مجھے پٹوانا ہی چاہتی ہو تو بسم اللہ لیکن یہ تو بتاؤ کہ مجھے پٹتا دیکھ سکو گی؟"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور مجھے نظریں جھکانی ہی پڑیں۔

"دیکھنا کیا، اگر میرا بس چلے تو تمہاری بوٹیاں نوچ ڈالوں"۔ میں غصے سے دیوانی ہو رہی تھی۔

"بس چلنے کی کیا بات ہے، میں تیار ہوں لیکن تمہیں باہر میرے پاس آنا پڑیگا یا پھر اندر آنے کی اجازت دو، بولو تیار ہو؟"

"بدمعاش" اُس کی باتوں سے میں کانپی جا رہی تھی۔

"اب تم میں کیونکر یقین دلاؤں کہ میں بدمعاش نہیں ہوں اور میری شرافت کا ننھا سا ثبوت یہ ہے کہ اب میں چلا کیونکہ تم بہت پریشان ہو رہی ہو، لیکن دیکھو کہیں رات کو مجھے یاد کر کے اپنی نیند نہ برباد کرنا، کیونکہ شام کا حسین حادثہ رات کی نیند ضرور ختم کر دیتا ہے"۔

وہ جانے بھی نہ پایا تھا کہ میں ہاری بٹیر کی طرح بھاگ کھڑی ہوئی غم و غصے سے بار بار منہ سے بدمعاش نکل رہا تھا۔

"بٹیا اتنا مت ٹہلا کرو، دیکھو منہ سرخ ہو رہا ہے"۔ چچی نے یہ کہکر مجھے گلے لگا لیا، وہ واقعی مجھے بے حد چاہتی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے بھانجے کے ساتھ مجھ غریب کی لٹیا ڈبونا چاہتی تھیں۔ ان حضرت کو میں دیکھ بھی چکی تھی بس یہ معلوم ہوتا کہ کسی وحشی قبیلے کے سردار نے بطور سزا کان پکڑ کر نکال دیا ہے اور یہ یہاں پناہ گزیں ہیں۔

میں چچی کے گلے سے اپنا گلا چھڑا کر چپکی بستر پر لیٹ گئی، کھانے کو پوچھا گیا تو صاف انکار کر دیا۔ بھوک لگی بھی کس کافر کو تھی اور غضب یہ کہ اس کمبخت کے آخری کہے ہوئے الفاظ بالکل درست ہو رہے تھے۔ نیند گم اور عجیب عجیب خیال ستاتیں، کبھی اس کی باتوں کو سوچ کر غصہ آتا اور کبھی ہنسی، اس کا شریر سا بھولا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم کر غائب ہو جاتا اور میں نہ معلوم کس جذبے کے تحت پھر اسے اپنے سامنے لاکر کھڑا کرتی، اسی عالم میں صبح ہو گئی۔

دوسرے دن میں نے تہیہ کر لیا کہ باغ نہ جاؤنگی، کہیں وہ کمبخت پھر نہ آ جائے لیکن چار بجے سے کچھ ایسی گرمی ہوئی کہ مجبور ہو گئی اور کھلی فضا میں جانے کے لئے دل تڑپ اٹھا، لیکن اس خیال سے کانپ گئی کہ اگر وہ آ گیا تو پھر کیا ہوگا۔ میں

دیکھوں کیوں، جو اُس کی ہمت بڑھے، جبکی ٹہلتی رہونگی، آخر ایک شریر لڑکے کے لئے کوئی اپنا دم تو گھوٹنے سے رہا۔ اس خیال کے تحت نہا کر سیدھی باغ پہنچی اور سر جھکا کر ٹہلنا شروع کر دیا، نگاہیں غیر ارادی طور پر بار بار ادھر اُٹھ جاتیں ایک بار جو نظر پھاٹک سے ٹکرائی تو وہ ٹھاٹ سے کھڑا مسکرا رہا تھا، آنکھیں چار ہوتے ہی اُس نے چلا کر کہا،

"اجی آداب عرض، مجھے یقین تھا کہ آج بھی ضرور آؤگی!"

میں خاموشی سے ٹہلتی رہی اور کوئی جواب نہ دیا، آج اُسے دیکھ کر دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"ارے سُنئے بھی، کوئی آپ کے در پر کھڑا ہے۔"

اُس نے اور بھی چیخ کر کہا میں گھبرا گئی کہ یہ آوازیں کہیں کوٹھی تک نہ پہنچ رہی ہوں اور اکبر بھی کیا سمجھتے ہونگے۔ میں اُسے چیخنے سے روکنے کے لئے اُس کی طرف بڑھی، وہ فوراً خم ہو گیا۔

"خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو، کیا مجھے بدنام کرنے کی ٹھانی ہے؟"

"خوب! تم اتنا بھی نہیں سمجھتی ہو کہ بچہ جس کھلونے کو پسند کرتا ہے۔ دوسرے کو دیدیگا یا پھینک کر چکنا چور کر دیگا؟"

"لیکن بچہ نادان ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن نادان کی غلطیاں حسین بھی ہوتی ہیں، اگر ہم بدنام ہو گئے تو ضرور ایک دن ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔" اُس نے پیشانی سے گھونگھر والے بال ہٹا کر کہا۔ میں اُس کی باتوں سے بے حد گھبرا رہی تھی کہ یا اللہ اب کیونکر پیچھا چھڑاؤں یہ تو مجھے گرمی میں سڑا کر مار دیگا، وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں یہاں آئی۔

"آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟" میں پسینے سے تر ہو رہی تھی۔

"یہ تو آپ میرے دل سے پوچھیں!" اُس نے سکون سے جواب دیا۔

"اچھا تو جناب کا دل ہی کچھ ارشاد کرے۔" میں مضطرب ہوئی جا رہی تھی۔

"اچھا تو دیکھئے میرا دل بولتا ہے اور میری زبان اس کی ترجمان ہوگی بگڑ نہ جائیے گا۔ ہاں تو میرا دل کہتا ہے کہ جب تم کو پہلی بار غور سے دیکھا تو جنت آچھی لگیں اور پھر ناصح کی حیثیت سے مجھ میں آ بسیں، پہلے میری دنیا بالکل اجاڑ تھی اب خدا کا شکر ہے کہ بڑی پُر رونق ہے۔"

"خدا کی مار ہے تمہارے دل پر" میں نے کہا گو اُس کے الفاظ بڑے میٹھے لگ رہے تھے۔

"میرے دل پر خدا کی مار نہیں آپ پر ہے، جو کسی کے دل میں چپکے سے دھڑا دیکر پیچھا چھڑائے۔" اُس نے بھی جل کر ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور میں یہ سوچنے لگی عجیب لڑکا ہے جو اپنی چرب زبانی سے کسی کو رام کرنا چاہتا ہے اور میں ہمہ تن ہی ہوں۔

"بڑے گستاخ ہو تم!" میں نے کہا،

"اور تم بھی تو ہو!" اُس نے شریر آنکھیں سکا کر کہا،

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" میں نے بڑی ہی جوش سے کہا،

"میری دوست بن جاؤ!"

"اچھا بن گئی دوست!" میں نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہدیا۔

"یوں نہیں ہاتھ ملاؤ!" اُس نے اپنا ہاتھ پھاٹک کی سلاخوں سے اندر ڈال دیا۔ میں عجیب اُلجھن میں پڑ گئی کہ کیا کروں ہاتھ ملا کر اپنے کو بدنامی کے گڑھے میں ڈھکیلنا ہے اور نہیں ملاتی تو گرمی میں سڑ سڑ کر مروں، باغ میں آکر اگر نہ بولونگی تو یہ چیخ چیخ کر دنیا کو آگاہ کر دیگا۔

"ملائیے ہاتھ ورنہ پھر مجھے اجازت دیجئے کہ جاؤں لیکن روز درشن کو تو آؤنگا ضرور، چاہے آپ باغ میں آئیں یا نہ آئیں، بندہ تلاش کر ہی لیگا آپ کو۔"

میں کانپ گئی یعنی کہ وہ مجھے کوٹھی تک نہ چھوڑے گا۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ لبوں سے لگا کر چھوڑ دیا، وہ خوشی سے جیسے پاگل ہو رہا تھا، پھر وہ کھڑا چپکے چپکے بتاتا رہا کہ وہ ایک سول سرجن کا لڑکا ہے اور بی۔ اے فائنل میں پڑھتا ہے۔ باپ نے اجازت دے رکھی ہے کہ جس سے اور جس وقت چاہے شادی کر سکتا ہے اور وہ نہ تو اُدئی کر کے چھپ جانیوالی لڑکیوں کو پسند کرتا ہے اور نہ ہی اُچک اُچک کر سڑکوں پر پھرنے والی لڑکیوں کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔ میں نے بھی اپنے حالات بتائے اور آخر میں یہ بتا دیا کہ ایک بھتنے سے میری شادی ٹھہری ہوئی ہے، وہ خوب ہنسا اور اُسی بھوت کو دور کرنے کے لئے عمل پڑھنے کو کہا، پھر وہ چلا گیا، میں دور تک اُسے جاتے دیکھا کی۔

دو دن تک میں اس انوکھے ملاپ کے متعلق سوچ سوچ کر بے حد مغموم رہی اور باغ میں ٹہلنے بھی نہ گئی، کم از کم یہ ضرور سمجھ رہی تھی کہ اس ملاپ کا انجام دائمی جدائی ہوگا، میں والدہ صاحبہ کے پاس تک کر دی جاؤنگی اور ان کی لعنت ملامت مجھے جینے نہ دیگی۔

تیسرے دن پھر باغ پہنچ گئی۔ نظریں بار بار پھاٹک کی طرف اُٹھ رہی تھیں

دل نہ معلوم کیوں ڈوبا جا رہا تھا اور پاؤں کانپ رہے تھے میں ایک بینچ پر بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔ سڑک پر ایک آوارہ سا لونڈا گاتا ہوا جا رہا تھا ؎

سچ سچ بتانا اے دل تو نے کبھی کہیں بھی
سرسبز ہوتے دیکھی اُلفت کی سرزمیں بھی

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کتنا سچ کہا ہے کسی دل جلے شاعر نے میں نے آنسو تو میں خشک کر لئے اور اُدھر دیکھا تو وہ کھڑا تھا، مجھے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا میں لمبے لمبے قدم مارتی ہوئی اُس کے پاس پہنچ گئی۔ اُسے دیکھ کر میں بے حد مسرت محسوس کر رہی تھی۔

"کیا مجھے اندر نہ بلاؤ گی ؟" اُس نے کچھ اس طرح کہا کہ انکار نہ کر سکی۔

"آتے کیوں نہیں !" میں نے کہا اور وہ خوش ہو گیا۔

ہم دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ لیکن میرا دل خوف سے دھڑک رہا تھا کہ کوئی اُسے دیکھ نہ لے لیکن قدرے اطمینان تھا کہ امی اپنی بیٹی سے ملنے گیا ہیں جو یہاں سے بہت دُور رہتی ہے اور چچا دس بجے تک واپس آنے کو کہہ گئے ہیں، چچی بھلا کیوں یہاں آنے کی زحمت کرنے لگیں۔

"کتنی اچھی ہو تم شہلا ! اُس نے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے اور میں کانپ کر رہ گئی۔

"دیکھو اگر یہ حرکتیں کرو گے تو نکال دوں گی باغ سے !"

"اپنے دل سے نکالو تو جانوں ؟" اُس نے مزے میں آ کر کہا۔

"بڑے بُرے ہو تم !" میں نے جل کر کہا اور منہ پھیر لیا۔

"خوب ! یعنی میں نے تم کو اچھا کہا تھا تو تم نے بھی فوراً بدلہ اتار دیا۔"

"لیکن میں نے تو تم کو بُرا کہا ہے، اچھا نہیں !"

"دیکھو ! عورت جب کسی کو چاہتی ہو اور اُسے اپنی زبان سے بُرا کہے تو مطلب اچھے ہی کے ہوتے ہیں۔ بیچاری صاف کہتے ہوئے شرماتی ہے !"

"بڑے فطرت شناس ہو !" میں نے اس کی بات کا مضحکہ اُڑاتے ہوئے ہنس کر کہا لیکن وہ ڈھیٹ بھی میری ہنسی میں شریک ہو گیا پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر سوچنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو ؟" میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں کہ سماج تمیں میرا بننے بھی دیگا یا نہیں۔ میرے گھر والے تو اس معاملے میں آزاد ہیں لیکن یہ تمہارے بزرگ بہت پُرانے خیالات کے ہیں !!"

"یہ تو محبت کرنے سے پہلے سوچا ہوتا !" میں نے ہنس کر کہا تاکہ وہ یہ دل شکن باتیں نہ سوچ سکے۔

"مذاق مت اُڑاؤ شہلا، نہ معلوم کیوں میرا دل کانپتا ہے !"

"تو اپنے دل کو مضبوط پکڑ لو کہ نہ کانپے" اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکا کر کسی گہری فکر میں غرق ہو گیا۔ آج میں نے پہلی مرتبہ اُس کے شریر چہرے پر غم کے آثار دیکھے تھے۔

"دیکھو جی ! یہ سر جھکا کر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا اور تمہارا مغموم چہرہ دیکھ کر دنیا تم پر مہربان ہونے سے رہی، ہاں یہ خوب ذہن نشین کر لو کہ محبت کا دوسرا نام خزاں ہے، ویسے کوشش کرو کہ بہار آ جائے !"

میں نے اُس کا سر اوپر اُٹھا کر کہا، اُس کی طول آنکھوں کی تنہائیاں دیکھ کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا، پھر ایک بار جو نظر اُٹھا کر پھاٹک کی طرف دیکھا تو چچا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے شعلے برساتے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

"چچا آ گئے، اُف خدا اب کیا ہوگا ؟" میں نے چپکے سے کہا،

"میں نہ کہتا تھا کہ میرا دل کانپ رہا ہے !" اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی لیکن وہ بیٹھا رہا۔

"کون ہے یہ ؟" چچا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"یہ ! یہ چچا ایک ـــــــ"

"ایک عاشق ہیں آپ کے، کیوں صاحبزادی صاحبہ ؟" چچا نے مجھے کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھا، لیکن میں انتہائی صبر سے اُس کو یہ سمجھ کر دیکھ رہی تھی کہ یہ آخری دیدار ہے، وہ بیٹھا چچا کو ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا

"عاشق صاحب یہاں سے تشریف لے جائیے، شرم نہیں آتی کہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی کو بہکاتے ہو !"

"لیکن سُنئے تو میرا کوئی بُرا ارادہ نہیں ہے۔ میں تو آپ کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک سول سرجن کا لڑکا ہوں اور خود بی۔ اے میں پڑھتا ہوں !"

"بس بس ! میاں صاحبزادے باہر جاؤ مجھ جیسے جہاندیدہ کو چکمہ نہیں دے سکتے۔ اور تم میری لڑکی کی شادی کی فکر نہ کرو ہو جائے گی !"

"لیکن !"

"لیکن ویکن کچھ نہیں فوراً باہر چلے جاؤ، آیا ہے شادی کرنے جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں !"

"آپ جانتے ہی کیا ہیں، بس اتنا ہی کہ اپنی بیکس بھتیجی کو اپنی بیوی کے وحشی بھانجے کے ساتھ ڈبو دیں گے!" اُس نے کھڑے ہو کر غصّے سے کہا،

"نکل تو بدمعاش!" چچا چیخ پڑے اور میں نے اُس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں منّت کی کہ مجھ پر رحم کرتے ہوئے چلا جائے۔

"خیر میں تو جاتا ہوں لیکن تم بڈھوں کے بگلا بھگت پن پر عمر بھر آنسو بہا کر دُعائیں دونگا جیسے تم نے کبھی کچھ کیا ہی نہ ہوگا" یہ کہہ کر اُس نے مجھے دیکھا اور لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا چلا گیا۔

"چل کوٹھی میں" اُنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور میں آنسو پونچھتی چپکی ساتھ ہو لی۔

رات بھر چچا چچی کھُسر پھسر کرتے رہے اور میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی رہی۔ صبح چچا صاحب نے فرمایا۔

"صاحبزادی بس تم رہ چکیں اپنا سامان درست کرو اور اپنی اماں کے پاس جاؤ تاکہ اُنھیں بھی تمہارے کرتوت معلوم ہوں"

"میں نے کوئی جواب نہ دیا"

"کہتی تھی کہ جلد ہی سے لڑکی کی شادی میرے سلیم سے کردو لیکن انھیں تو بیٹی کو بٹھا کر اچار نکالنا تھا، اب روئیں گی سر پہ ہاتھ رکھ کر" چچی نے بھی چچا کے ساتھ چہکنا شروع کر دیا۔ میں خاموشی سے سامانِ سفر درست کرتی رہی اور پہلی گاڑی سے مجھے لکھنؤ پارسل کر دیا گیا۔ میری جو حالت تھی وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے، اُف یہ بڈھے کتنے پارسا بن جاتے ہیں جیسے انھوں نے اپنی جوانی اعتکاف میں رہ کر گذاری ہوگی، وہی باتیں جو کبھی اپنے لئے جائز ہونگی آج بڑے لئے گناہ ہوگئیں، واقعی کتنا بدترین گناہ تھا کہ میں اپنے لئے آپ ہی زندگی کا ساتھی بنانے کے منصوبے گانٹھ رہی تھی، کاش میں نے اسے اپنا بنا ہی لیا ہوتا تو اس گناہ کو حسین خیال کرتی لیکن افسوس گناہِ بے لذت۔

گھر میں میرے اس قدر جلد پہنچنے پر سب حیران تھے اور طرح طرح کے سوالات ہو رہے تھے لیکن میری ایک چُپ اُن کے سوالات کا جواب تھی۔

تیسرے دن ایک لمبا چوڑا خط اماں کے نام آیا جس میں میری محبت کے ذکر کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا گیا تھا۔ وہ بھی اتنا کہ اماں نے اپنا منہ پیٹ لیا۔

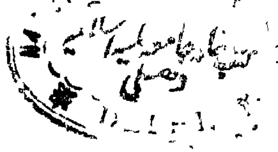
اُف کتنا ظلم ہے اگر میں چچی کے وحشی بھانجے کے ساتھ ایک بار عشق بازی کیا اس سے بڑھ کر کچھ کرتی تو چچی نہال ہو جاتیں اور اماں کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ مہینوں کیا برسوں میری مہمان داری کی جاتی۔ لیکن آج گھر کے بچے تک ذلیل نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں دل میں کہہ رہی تھی کہ کبھی تم بھی جوان ہوگے تو پوچھوں گی۔ اماں خوب کوس رہی تھیں۔ لیکن میں نے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ آخر ماں تھیں، رحم آہی گیا، اور چند دن بعد تو گھر میں سب ہی بھول گئے۔ لیکن میں اس جرمِ بے زبان کو نہ بھول سکی۔ اب بھی جب میرا دل بچّوں کے شور و غل سے گھبراتا ہے تو کوٹھے پر چڑھ جاتی ہوں اور اُس کی موہوم سی یاد مجھے بے کل کر دیتی ہے اور جب دل بہلانے کی کوشش کرتی ہوں تو سامنے وہی جلیبہ کا بیج اُس کے آگے باغ اور پشت پر قبرستان کے سوا کچھ نظر نہیں آتا جو باعثِ تسکین ہو!

میں سر تھام کر بیٹھ جاتی ہوں، اُس وقت مجھے وہ تین ملاقاتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں جو میری زندگی کے اُجڑے ہوئے چمن میں بادِ بہاری کے چند جھونکوں کی طرح آئیں اور چلی گئیں۔

خدیجہ مستور لکھنوی

(بقیہ خادمانِ ادب صفحہ ۴)

(۶۳) جناب ابراہیم خاں رحمت خاں صاحب شرف جوناگڈھی سے سالانہ
(۶۴) محترمہ سلمیٰ خاتون صاحبہ کنیز دناجپور بنگال سے سالانہ
(۶۵) جناب خان شری محبت خان جی آف کوٹھری بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے سالانہ
(۶۶) جناب عبدالستار خاں صاحب قائم گنجوی (دہلی) سے سالانہ
(۶۷) جناب حبیب خاں صاحب حبیب شاہجہانپوری کوئٹہ سے سالانہ
(۶۸) مسٹر اتم سنگھ بی۔اے پروپرائٹر بھولارام اینڈ سنس دہلی سے سالانہ
(۶۹) محترمہ حجاب بنارسی (ناگپور) سے سالانہ
(۷۰) محترمہ اسماء علوی صاحبہ کراچی سے سالانہ
(۷۱) محترمہ میمونہ صاحبہ کراچی سے سالانہ
(۷۲) محترمہ فضہ جی نوشابہ صاحبہ کراچی سے سالانہ
(۷۳) جناب یحییٰ بھائی محمد علی صاحب راولپنڈی سے سالانہ
(۷۴) جناب عارف ابراہیم یوسف برکات فانسکا باکوٹی سے سالانہ
(۷۵) جناب خانصاحب الفد خان جی آف ناکرہ دربار گلو بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے سالانہ
(۷۶) جناب سید ظہیر حسین صاحب ظہیر ہندی سے سالانہ
(۷۷) جناب رفیق احمد صاحب رفیق ڈی کلکٹری صدر بخشی لین پٹنہ سے سالانہ
(۷۸) جناب اکبر علی غلام علی صاحب ستّے والے کراچی سے سالانہ
(۷۹) محترمہ بتول نور الدین بٹال کراچی سے سالانہ
(۸۰) مسٹر ممتاز صمرانی جزنلسٹ نگر مخدوم (پنجاب) سے سالانہ
(۸۱) محترمہ لیڈی سر رحیم بخش سا (ضلع انبالہ) سے سالانہ
(۸۲) جناب کھیم وتی صاحب ضیا میرٹھی سے سالانہ
(۸۳) جناب بھگون ناتھ پوری صاحب رضا۔ نعرہ کوشہ رندھاوا (پنجاب) سے سالانہ
(۸۴) جناب سیٹھ فدا حسین طیب علی صاحب راولپنڈی سے سالانہ
(۸۵) جناب حاتم علی عبدالحسین صاحب علی گڑھ سے سالانہ
(۸۶) جناب احمد جمال صاحب ساحل بمبئی سے سالانہ
(۸۷) جناب سید آلِ حسین صاحب منالپور سے سالانہ
(۸۸) جناب چودھری صادق علی صاحب کوٹ جلالپور سے سالانہ



افسانہ:-

ورثہ

پہلے ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ دو تین مستری چند مزدور ایک منشی اور چندولال جو ٹھیکیدار بھی تھا، منیجر بھی اور کارخانے کا مالک بھی، کارخانے سے کچھ دور ہٹ کر چند کوٹھریاں اور چھوٹے چھوٹے کوارٹر تھے۔ جن میں مزدور اور مستری مع اپنے خاندانوں کے رہتے تھے، کارخانہ بڑھتا گیا مشینوں کے ساتھ ساتھ مستری اور مزدوروں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ ایک منشی کے بجائے کئی منشی ہوگئے، منیجر نیا آگیا اور چندولال رائے بہادر سیٹھ چندولال آنریری مجسٹریٹ ہوگیا، کوارٹر اور کوٹھریوں کا سلسلہ بھی برابر بڑھتا رہا اور کارخانے کے آس پاس ایک اچھی خاصی آبادی ہوگئی۔ پہلے چندولال شہر سے کارخانے تک پیدل یا کبھی کبھی یکہ پر آتا تھا لیکن اب اُس کے پاس بھگوان کے دئیے دو موٹر ہوگئے تھے پھر بھی اُسے شہر کے کاموں سے فرصت نہ ملتی اور وہ بمشکل ہفتے میں دو تین مرتبہ کارخانے آ پاتا، رائے بہادر ہونے سے قبل وہ خود بھی اکثر بھٹی پر کام کرتا لیکن اب اُسے کارخانے میں دفتر کا معائنہ کرنے ہی سے فرصت نہ ملتی تھی، اسکا ایک لڑکا مقامی انجینئرنگ کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ایک ولایت ڈگری لینے گیا ہوا تھا۔ پرانے کارخانے سے ذرا ہٹ کر چندومل کی بنیادیں ڈالی جا چکی تھیں اور عمارت کا کام شروع ہونے والا تھا۔

چند مہینوں کے بعد ہی "چندومل" کا شاندار افتتاح ہوا۔ بڑے بڑے لوگوں کو دعوت دی گئی اور مزدوروں میں پاؤ پاؤ بھر مٹھائی تقسیم ہوئی، شہر کے روسا اور قومی لیڈروں نے چندولال کو اُن کی کامیابی پر مبارکباد دی اخباروں میں اُنکے فوٹو چھپے اور تعریف میں لمبے چوڑے مضامین شائع ہوئے۔ بعض اخباروں نے مزدوروں کے ناخدا کا خطاب دیا۔ مزدوروں کی تعداد بھی پہلے سے دس گنی زیادہ ہوگئی لیکن اُن کی مالی حالت جہاں پر پہلے تھی وہیں قائم رہی۔

مل میں سویرے دو سیٹیاں ہوتیں، پہلی سیٹی کے ہوتے ہی مزدور اور مستری اپنے چھوٹے بڑے دڑبوں سے نکل کر بغل میں دوپہر کے چنے یا ستو یا روٹیاں حسب حیثیت دبائے سیاہ کپڑے پہنے مل کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے اور شام کو جب چھٹی کی سیٹی ہوتی تو سیکڑوں مزدور جنکے ہاتھ میں کپڑے سب کالے ہوتے، کارخانے سے رُکے ہوئے طوفان کی طرح نکلتے۔ کچھ دور آگے جاکر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہوجاتے، راستے بھر مل کی باتیں کرتے رہتے، گھر پہونچتے ہی کلائیوں تک ہاتھ دھوکر کھانا کھاتے اور کھاتے ہی پلنگ پر پڑ کر سو رہتے اور آٹھ دس گھنٹوں کے لئے "چندو نگر" میں خاموشی رہتی۔

"چندومل" کے کچھ مستری پرانے کارخانے کے ملازم تھے اور اب اُنکی مزدوری ایک روپیہ سے بیس آنے روز تک ہوگئی تھی۔ سرجو ان سب میں پرانا تھا وہ چندولال کے یہاں اسوقت ملازم ہوا تھا جب چندولال بھی بھٹی پر کام کرتے تھے۔ سرجو اپنے کام میں کارخانے کے ہر مستری سے ہوشیار تھا، لیکن چار آنے روز کے مزدور سے لیکر بیس روپیہ مہینہ کے منشی تک سے اسکی بنتی نہ تھی۔ اسکی بددماغی اور چڑچڑاپن سارے مل میں مشہور تھا اور اسی وجہ سے اتوار کے دن جب مل بند ہوتا اور چندو نگر کے مزدور مستریوں کے مکان پر جمع ہوکر دارو نشہ کرتے۔ سرجو اپنے مکان میں اکیلا رہتا۔ تھوڑا بہت نشہ سرجو بھی کرتا لیکن ہمیشہ اکیلا اور اپنے گھر پر شراب پیتے ہی اسکا دماغ بہت زیادہ خراب ہوجاتا بُری بُری گالیاں بیساختہ منہ سے نکلنے لگتیں اور وہ اپنی بیوی اور لڑکے کو خواہ مخواہ مارنے لگتا۔

سرجو ہفتے میں دو دن شراب ضرور پیتا اور کبھی کبھی حد سے زیادہ۔ اُسنے تمام عمر کمایا لیکن اپنے کریا کرم کے پیسوں سے زیادہ پس انداز نہ کرسکا۔ سرجو کیا چندو نگر میں کسی کی حیثیت دس پانچ روپیوں سے زیادہ نہ تھی۔ چندو نگر کی ایک ہفتے کی کمائی اتوار کے دن شہر پہونچ جاتی۔ اتوار کو سویرا ہوتے ہی مزدور چھیلا بن کر شہر جانا شروع ہوجاتے اور رات کو دس گیارہ بجے نشہ میں چور شہر سے واپس ہوتے، رستے بھر اُنکی زبان پر ہنٹر والی یا جنگل کی شہزادی کے عجیب و غریب قصے ہوتے یا پھر مبتذل گانے۔

چندو نگر میں کئی ہفتوں سے مستانہ معشوق فلم کے آنے کی دھوم تھی، ہر شخص نادیا کی بہادری اور جانبازی کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ چند لڑکوں نے ابھی تک "سینما" نہیں دیکھا تھا لیکن دن رات نادیا اور مستانہ معشوق کے چرچوں نے اُنکے شوق کو بھی گدگدایا اور سرجو کا لڑکا کیشو بھی اُنکے ساتھ

چلا گیا اور اُسی دن سرجو بھی مل سے پورے ہفتے کی تنخواہ لیکر سیٹھ کے ٹھیکے پر شراب پینے چلا گیا۔ سیٹھ نے اپنے مزدوروں کی تفریح کے لئے ایک تاڑی خانہ اپنے پیسے سے کھلوا دیا تھا۔ سرجو آدھی تنخواہ کلار کو دے کر بدمستی اور خود اغی لئے ہوئے رات کے نو بجے جھومتا گرتا پڑتا گالیاں بکتا اور چندو نگر کی تمام آوارہ عورتوں کے دروازوں پر ٹھہرتا ہوا جب اپنے گھر پہنچا تو گھر میں اندھیرا تھا۔ قدم پہلے ہی ڈگمگا رہے تھے۔ اندھیرے میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ زمین پر پڑے پڑے اُس نے اپنی بیوی کو کئی موٹی موٹی گالیاں دیں اور جب اُسکی بیوی اُسے اُٹھانے آئی تو اسکے سہارے اُٹھکر اُسی کو مارنے لگا۔ سیتلا کی زندگی یونہی گذر رہی تھی، کنوارپن اور بیاہے میں اُس نے صرف ایک فرق دیکھا، کنواری لڑکی باپ بھائی کی جھڑکیاں سہتی ہے گھر والوں پر بار ہوجاتی ہے۔ محلے کے لڑکوں کے جملے سنتی ہے اور بیاہی عورت شوہر کی گالیاں اور مار کھاتی ہے جسکے عوض میں اُسے ہر سال ایک مرجھلا بچہ ملتا ہے جو دوسرے یا تیسرے سال تک بھگوان کے دوار واپس لوٹ جاتا ہے۔

کیشو جب گیارہ بجے رات کو سینما دیکھ کر واپس لوٹا تو سرجو نے ڈانٹ کر اپنے پاس روک لیا اور پھر گرج گرج کر پوچھنے لگا: "کہاں گیا تھا بے بول کہاں گیا تھا۔ ابھی تو آوارہ لونڈوں کے ساتھ نگر کی جوان چھوکریوں کو تاکتا پھرتا ہے، بول کس کے یہاں گیا تھا ——؟"

"شہر گیا تھا، مستانہ معشوق دیکھنے!" کیشو نے بہت آہستہ سے باپ کو جواب دیا اور ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

سرجو پھر چنگھاڑا "مستانہ معشوق دیکھنے گیا تھا۔ شہر عیاشی کرنے جاتا ہے کیوں ——" ایک موٹی گالی دیکر اُس نے کیشو کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا: "دیکھ آج تیری جوانی کا نشہ جھاڑے دیتا ہوں" یہ کہکر سرجو اُسے پھر مارنے چلا لیکن کیشو جو ہمیشہ بہت سعادت سے پٹتا رہا تھا جھٹک کر الگ کھڑا ہوگیا

"باپو بس اب حد ہوگئی۔ میں بچہ نہیں رہا۔ زندگی بھر جا بیجا تمہاری مار نہ کھاؤں گا ——"

بات بڑھ گئی سرجو "ہوں" کہکر جھپٹا۔ اسکے پدرانہ جذبات کی توہین کی گئی تھی اولاد کو مارنا اسکا پیدائشی حق تھا اور آج وہ اس سے محروم کیا جا رہا تھا، اس حق کو بزور منوانے کے لئے اُس نے ڈنڈا اُٹھایا، کیشو بھی پینترا بدل کر کھڑا ہوگیا دونوں آپس میں گتھنے ہی والے تھے کہ سیتلا جو ایک کی بیوی اور دوسرے کی ماں تھی، درمیان میں آگئی اور دونوں کے وار اپنے پر روک کر ایک کو دوسرے سے الگ کیا۔

اس واقعہ کے بعد باپ بیٹوں میں کبھی صفائی نہ ہوئی۔ کیشو گھر سے بے دل ہوکر رہنے لگا۔ سرجو بیمار پڑا لیکن اُس نے خبر نہ لی اور ایک دن جب محلے کی سب عورتیں اور مرد سرجو کی چارپائی کے گرد جمع تھے وہ بھی آکر خاموش کھڑا ہوگیا۔ سرجو نے ایک بار اُسکی طرف دیکھا، کیشو کی گردن نیچے جھک گئی، وہ باپ کے قدموں پر سر رکھنے ہی والا تھا کہ سرجو اسے معاف کئے بغیر دوسرے جنم کے لئے اس چولے کو چھوڑ کر چل دیا۔ اُس کی ماں کے ساتھ محلے کی تمام عورتوں نے رونا شروع کر دیا، لیکن کیشو ایک طرف خاموش کھڑا رہا اور جب اُسکی ماں اس سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی تب بھی اسکی زبان سے کچھ نہ نکلا۔ آنکھ سے چند آنسو زبردستی باہر نکل آئے جنکو کیشو نے فوراً آستین میں جذب کر لیا اور ماں کو خود سے الگ کرکے باہر چلا گیا۔ سرجو کا کریہ کرم سب کچھ ہوگیا لیکن کیشو نے اُف تک نہ کی۔ باپ کے مرجانے سے اسکو کوئی تکلیف نہ تھی۔

سیٹھ چندو لال نے کیشو کے دو آنے بڑھا کر بارہ آنے روز پر اُسے اُس کے باپ کی جگہ پر مستری بنا دیا اور ماں نے سرجو کی تمام چیزیں کیشو کے سپرد کر دیں کیشو رفتہ رفتہ نگر کے دوسرے "فیشن باز" لڑکوں میں شامل ہوتا جاتا تھا۔ اتوار کو سویرا ہوتے ہی نہاتا، دُھلے کپڑے پہنتا، بالوں کو ناریل کے تیل سے تر کر دیتا اور پھر تیل میں ڈوبے ہوئے ہاتھوں کو اپنے منہ پر پھیر کر کالے چمڑے کو تارکول کی طرح چمکا دیتا اور ہاتھ میں سُرخ رومال دبا کر گھر سے باہر نکل جاتا، دن بھر چندو نگر اور پھر شہر کا گشت لگاتا۔ شام کو ایکہ والوں کے سینما میں پستول والی طوفان میل یا ریشمی مینا قسم کی کوئی فلم دیکھتا اور رات کے گیارہ بجے "تیرے جوبن کی قسم" گاتا ہوا گھر واپس آتا۔ آتے ہی کھانا کھا کر چپکے سے لیٹ کر سو رہتا۔ سیتلا جو سرجو کی تمام برائیوں کے باوجود سرجو کے غم میں بیٹھی رہتی جسے ہر بات میں سرجو کی یاد آجاتی۔ ہر شرابی کو دیکھ کر اُسے سرجو کی یاد بے قرار کر جاتی اور محلے میں جب کوئی عورت اپنے گھر میں پٹی جاتی تو خود اسکے بدن کی پرانی چوٹیں اُبھرنے لگتیں اُسے سرجو یاد آجاتا اور پھر گھنٹوں بیٹھی اس کے غم میں رویا کرتی لیکن کیشو کو دیکھ کر وہ تمام رنج و غم بھول جاتی اور کبھی کبھی باپ بھائی اور شوہر سب کے راج سے بیٹے کا راج بہتر سمجھنے لگتی۔

ایک رات کیشو کو بہت دیر ہوگئی۔ سیتلا اپنے پلنگ پر بیٹھی اسکا انتظار کر رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب مکان سے کچھ دور کسی کے گالیاں بکنے کی آواز سنائی دی، سرجو کی آواز اور اس آواز میں کوئی فرق نہ تھا اور گالیاں بھی

شروع سے آخر تک سب وہی تھیں۔ سیتلا بھی شاید اُس کے کان زنگ رہے ہیں اور جب کسی نے دروازے پر بالکل تیر جو کی طرح زور سے پیر مارا تب بھی وہ وہم کے علاوہ کچھ نہ سمجھی لیکن جب اُس نے کیشو کو آتے ہوئے دیکھا تو اُس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے "بھگوان کیا بالکل اپنے باپ پر جائے گا" اُس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے پوچھا۔ کیشو اپنے باپ کی پُرانی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا اور محلے کی تمام لڑکیوں کے نام اور اپنے کارنامے ایک سرے سے بیان کرنا شروع کر دیئے۔ سیتلا بہت ڈرتے ڈرتے اُس کے قریب گئی اور بہت آہستہ سے پوچھا "کیشو ——— کیا نشہ کیا ہے ——— ؟"

"ہاں ——— اب میں روز پیا کروں گا۔ بہت اچھی چیز ہے، میں روز پیا کرونگا"

سیتلا کو معلوم ہوا جیسے کسی نے اسکے پیٹ پر لات مار دی، اُس نے کیشو کو ایک بار سمجھانے کی کوشش کی "تم شراب پیو گے تو پھر اپنی ماں کا پیٹ کیسے بھر سکو گے۔ تمہاری ماں تمہاری زندگی سنوارنے کے لئے روپیہ کیسے جمع کرے گی۔ بیٹا جس گھر میں شراب پھرتی ہے وہاں برکت نہیں رہتی۔ ہم روٹیوں کو محتاج ہو جائیں گے۔

"جھوٹ ——— سیٹھ کے گھر الماریوں شراب ہے لیکن اُس کے یہاں کتنی برکت ہے۔ میں بھی شراب کی بوتلوں سے کوٹھری بھر دونگا"

کیشو بکتا رہا اور سیتلا کچھ سوچتی ہوئی اپنے پلنگ پر چلی گئی اسکے چہرے پر جھُریاں ابھر رہی تھیں، اُس نے دل ہی دل میں کہا "بھگوان میری قسمت لکھتے وقت تم مجھ سے کتنے خفا تھے ———"

مظہر رضوی لکھنوی

روزنامہ **"زمزم"** کا اجرا

ہندوستان کے مشہور قومی اخبار "زمزم" لاہور کو حکومتِ ہند اور حکومت پنجاب دونوں نے شائع کرنے کی اجازت دیدی ہے جس کا پہلا پرچہ خاص نمبر کی صورت میں یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو شائع ہو رہا ہے۔

فرض اور محبّت

(ایک سپاہی کی اپنی محبوبہ سے رخصت)

جا رہا ہوں تیغ کے جوہر دکھانے کے لئے
مُلک کو غیروں کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے
چھوڑ کر تنہا میں اے پُھول، جاؤنگا تجھے
یہ نہ تو ہرگز سمجھنا بھُول جاؤں گا تجھے
زندگی میں تیرا مجھ سے چھُوٹ جانا ہے محال
تو نہ ہوگی ساتھ تو ہوگا ترا پیارا خیال
جان نکلے گی اگر میرے تنِ مجروح سے
ہوگی تیری یاد ہم آغوش میری روح سے
گونج اُٹھے گی جب فضا جھنکار سے تلوار کی
مجھ کو چھاگل کی تیری یاد آئیگی آواز بھی
ندیاں جب بہہ رہی ہونگی عدو کے خون کی
اِن لبوں کی تیرے سُرخی مجھکو یاد آجائیگی
جنگ میں جس وقت دیکھونگا چمک تلوار کی
یاد آ آ کر مجھے تیری ہنسی تڑپائیگی
شورشِ جنگ سے جب دل پہ فضا بھر جائیگی
مجھ کو خاموشی تری اسوقت کی یاد آئیگی

اُف یہ کیا؟ آنسو! اری توبہ! خدارا صبر کر
دل ہوا جاتا ہے بیکل اور کٹتا ہے جگر
جان دیدینا تو ہے آسان مجھکو بالیقیں
آنسوؤں کی تیرے لیکن تاب لاسکتا نہیں
رحم کر لِلّٰہ اے خاتون مجھ پر رحم کر
چھینتی ہے صبر و استقلال تیری ہر نظر
دیکھ ارادہ دل میں آجائے مری خامی کہیں
یہ محبت ہو نہ جائے وجہ بدنامی کہیں

ہائیں یہ کیا! شدتِ گریہ زیادہ ہو گئی
کیوں تجھے کیا اسقدر پیاری ہے میری زندگی
میں نہ جاؤنگا، نہ جاؤنگا کبھی اب جنگ پر
تیرا ہر آنسو ہے اک زنجیر پائے لنگ پر
صبر اب مجھ سے نہیں ہوتا مری تلوار لے
آ محبت سے مری گردن میں باہیں ڈال دے

ہاں ذرا لیکن ٹھہرنا، مجھ کو یہ کیا ہو گیا
اک سپاہی اور اپنے فرض سے نا آشنا
کیا قدم آگے بڑھا کر پھر ہٹنا چاہیے
فرض کو کیا اپنے بالکل بھُول جانا چاہیے
مرد ہو کر ایسی کمزوری نہیں زیبا مجھے
جو کیا ہے عزم پورا اسکو کرنا چاہیے
رُک نہیں سکتا میں ہرگز، مجھکو جانا ہے ضرور
قول میں جو دے چکا، اُسکا نبھانا ہے ضرور

لے خدا حافظ، مجھے اب بھُول جائے نازنیں
فرض کو اُلفت پہ میں قربان کر سکتا نہیں

بخاری ۱۹۴۳

وہ راگ

یہ ہجر کی شب ویراں گھڑی ، یہ غم کی ماری تنہائی
پھر دھڑکن دل کی تیز ہوئی اک راگ کی دُھن پھر یاد آئی

وہ راگ نہیں جو راتوں کو مہ پارے سُنایا کرتے ہیں
اُلفت کے مارے سینوں کے پردوں میں چُھپایا کرتے ہیں

وہ راگ نہیں جو رقصاں ہے پازیبوں کی جھنکاروں پر
معصوم ثریا کے لب پر اور کاہکشاں کے تاروں پہ

وہ راگ نہیں جو ساون میں گھنگھور گھٹائیں گاتی ہیں
سلمائے سحر کی مست نظر معصوم ادائیں گاتی ہیں

وہ راگ نہیں جو بل کھا کر اُٹھتا ہے سُنہری وادی سے
وہ راگ نہیں جو چھنتا ہے گلزاروں کی آبادی سے

وہ راگ نہیں جو گاتے ہیں ملاح بھنور کے دھاروں پر
وہ راگ نہیں جو بہتا ہے جھرنوں کے حسیں فواروں پر

وہ راگ نہیں جو گاتی ہیں دوشیزائیں صحراؤں میں
پنگھٹ کے قریں پیپل کے تلے پنگھٹ کے تٹ پر گاؤں میں

اُس راگ کی درد بھری لے کو ننھی شاما کیا پہچانے
اس راگ کی متوالی دُھن کو معصوم پپیہا کیا جانے

غنچہ کی چٹک بلبل کی چہک بھونرے کی نظر کا راگ نہیں
ماہ و پرویں لیلائے شب و سلمائے سحر کا راگ نہیں

وہ راگ جو پہروں پہلو میں احساس بھرا دل گاتا ہے
وہ راگ کہ جسکو سینے میں شعلوں کا اثر دہکاتا ہے

وہ راگ جو برسا کرتا ہے اکثر ویران نگاہوں سے
وہ راگ جو اُبھا کرتا ہے بیوہ کی ٹھنڈی آہوں سے

وہ راگ جو گایا کرتی ہے خاموش زباں ناداروں کی
وہ راگ کہ رونق ہے جس سے مغرب کے حسیں بازاروں کی

وہ راگ جو بے خود ہو ہو کر آپ اپنے ہی گُن گاتا ہے
فرعونِ سیاست سُنتا ہے ہامانِ تمدن گاتا ہے

وہ راگ جو بھارت ماتا کی سانسوں میں کروٹ لیتا ہے
جذبات کے چکر کھائی ہوئی دھاروں پہ کشتی کھیتا ہے

دل کی دھڑکن کچھ کم نہ ہوئی دل اپنا میں بہلا نہ سکا
افسوس زمانہ گا نہ سکا اُس راگ کی دُھن کو پا نہ سکا

کامل رشید

اک فسانہ ناتمام

آ بنا دیں دہر کو رنگیں ادا رنگیں خرام — تو لنڈھا دے حوضِ کوثر، میں الٹ دوں ایک جام
یہ بھی میرا شورِ مینا وہ بھی میرا عکسِ جام — کھلکھلاتی صبح ہو یا مسکراتی کوئی شام
انکا اندازِ تکلم، اُن کا اندازِ کلام — جیسے بلبل کا ترنم، جیسے شاعر کا پیام
قدسیوں کو بھی کبھی تکلیفِ ہستی دے کے دیکھ — آدمی کب تک رہے مرغِ اسیرِ زیرِ دام
مجھ کو خود ساحل پہ پہونچانے چلا ہے دوشِ موج — ایک پامالِ طلب کا اور اتنا احترام
اب تو سیاروں کو دم لینے کا موقع دے کوئی — اپنی حد سے بڑھ چکی یہ گردشِ مینا و جام
میں نہ جانے کتنی وسعت شوق کو دیتا ابھی — میری ہر سعیِ طلب نکلی مگر سودائے خام
کون میرے غمکدے کو دینے آئے رونقیں — عشق سرگرمِ تماشا، حسن سرمستِ خرام
ہم سے آگے اُڑنے والے قافلو سُننا ذرا — باغ میں پہونچو تو کہدینا ہمارا بھی سلام
کعبہ و دیر و کلیسا درپئے آزار ہیں — ایک دن میرے بھی لب پر آگیا تھا تیرا نام
پھر چمن میں جاگنے والی ہے آزادی کی روح — پھر نئے آذر بنا، پھر وضع کر تازہ غلام
گلستاں کے رنگِ آزادی میں کتنا جبر ہے — پھول مجبورِ تبسم، غنچہ مجبورِ کلام

ہم بھی بزمِ ناز میں کہنے کو لائے تھے اثر
اک کہانی نامکمل اک فسانہ ناتمام

فضل الدین اثر ایم۔ اے [۱]

تاثرات

تنگ ہیں اپنے دلِ ناکام سے — صبح تک بیداریاں ہیں شام سے
ہو نہ جبتک دل میں آزادی کا جوش — غیر ممکن ہے رہائی دام سے
یہ اسیرِ بتگری، وہ بت شکن — کیا تعلق کفر کو اسلام سے
ہو گئے محشر میں آخر بے نقاب — تھے جو پوشیدہ نگاہِ عام سے
انتہائے عشق پر مسرور ہوں — ابتدا کی تھی تمہارے نام سے
دیکھئے کس طرح ہو صبحِ فراق — دل ہے گھبرایا ہوا سا شام سے
دے نہ اذنِ سرخوشی دنیا مجھے — ہوں میں واقف زیست کے انجام سے

لاکھ بدلے رنگ یہ رنگِ جہاں
کام ہے تاثیر اپنے کام سے

نعمان تاثیر

[۱] اثر صاحب ایک مدت سے علیل اور صاحبِ فراش ہیں ناظرینِ شاعر ان کی صحت و شفا کے لئے دعا فرمائیں۔

گلِ رنگیں

اے گلِ رنگیں ازل سے گلستاں پرور ہے تو — کائناتِ رنگ و بو کا دل کشا منظر ہے تو
ہے فضائے گلستاں معمور موجِ نور سے — تیرا جلوہ کم نہیں ہے شمعِ بزمِ طور سے
تیری رنگینی کا منظر جلوۂ عامِ چمن — ہے تری خوشبو سے قائم مستیٔ شامِ چمن
تیرا ہر اک برگِ رنگیں اس طرح ہی جلوہ زا — کوئی شہ پارہ ہو جیسے برقِ طورِ حسن کا
زندگی بخشِ گلستاں ہے تری جلوہ گری — تو فضائے باغ کو دیتا ہے ہر دم تازگی
ہے شفق کی سرخیوں میں اخترِ روشن جبیں — دامنِ رنگیں میں تیرے گوہرِ شبنم نہیں
رازِ حسن و عشق کا غماز ہے جلوہ ترا — مظہرِ خونِ شہیدِ ناز ہے جلوہ ترا
مست رکھتا ہے تجھے صہبائے الفت کا خمار — جھومتا ہے یوں سرِ شاخِ چمن جو بار بار

لے رہا ہے لطفِ زخمِ غمزۂ قاتل سی تو
آگہی رکھتا ہے شاید درد کی منزل سی تو

پھر تری نظروں میں کیوں اے حاملِ صد خامشی — بلبلِ شیدا کے نالے ہیں فقط اک دل لگی
دیکھ تو سوزِ وفا سے کون ہے اندوہگیں — حسن کامل کے لئے اتنا بھی کیا لازم نہیں
ذرّہ ذرّہ ملتفت ہے جانبِ فریادِ عشق — عبرت آموزِ چمن ہے نالۂ بربادِ عشق
پتی پتی ہے زبانِ حال سے گرمِ سخن — باغ کی خاموشیاں ہیں حاملِ صد انجمن
کیوں نہ ہے آئینِ چمن سی تجھکو اتنی بے رخی — تو شریکِ بزم بھی ہے بزم سے بیگانہ بھی

ہے یہاں جو بھی وہ سرگرمِ سخن ہی برمحل
ایک تو ہے صرف پابندِ سکوتِ مستقل

اس سے میں واقف ہوں اے جانِ چمن جانِ بہار — پردہ دارِ رازِ ہستی ہے خموشی کا وقار
بزمِ عالم میں ہے جو ضبط و سکوں سے آشنا — کامیابِ زندگی ہے وہ یہاں صبح و مسا
ہیں تحمل کے نتیجے شرحِ تقدیرِ حیات — صبر و استقلال سے ہوتی ہے تعمیرِ حیات
یہ تو سب سچ ہے مگر اے نو بہارِ زندگی — وقت پر خاموش رہنا بھی تو ہے بے دانشی
قطرہ قطرہ بحرِ ہستی کا سکون آمیز ہے — جب اٹھا طوفاں تو پھر ہر موج طوفاں خیز ہے
چپ ہی رہتی ہے کلی اسکو صبا چھیڑے ہزار — وقت پر لیکن صدا اسکی ہے اعلانِ بہار
مطربِ شام و سحر کے راگ ہیں سب بے خلل — کیونکہ ہر آواز سازِ دہر کی ہے برمحل
تو بھی اک تقریر کر ایسی چمن میں صاف صاف — جس سے ہو رازِ حقیقت کا سراسر انکشاف

التجا دارم کہ اے بیگانۂ ذوقِ سخن
شو حریفِ نالہ ہائے زارِ بلبل در چمن

الم مظفر نگری

تبرکات

شکستِ توبہ سامانِ شکستِ جام ہونا تھا
مرے ذوقِ معاصی کو عبث بدنام ہونا تھا

نہ آنا تھا انھیں، میرا برا انجام ہونا تھا
اب آکر کیا کرینگے ہو چکا جو کام ہونا تھا

نہ تھا دن رہروانِ تیرہ قسمت کے مقدر میں
بیاضِ صبحِ روشن کو سوادِ شام ہونا تھا

غضب ہے دل یہ رنگِ میکشی جچنے نہیں پاتا
غمِ ہستی تجھے اتنا نہ خوں آشام ہونا تھا

برا مانا ہے کیا کیا سن کے اہلِ بزمِ عشرت نے
ہمارے نام کو جا کر وہاں دشنام ہونا تھا

مری وحشت پہ تم ای اہلِ کعبہ طعنہ زن کیوں ہو
کبھی تو چاک آخر پردۂ احرام ہونا تھا

جہانِ نامرادی کا بھی تو بزمِ اہلِ ہمت ہے
یہیں آکر تجھے کچھ حسرتِ ناکام ہونا تھا

کہیں کس سے کہ ہم صیاد کو اپنا سمجھتے تھے
گلہ کس کا ہمیں کو خود اسیرِ دام ہونا تھا

غنیمت ہیں لگائے دام جو کچھ اہلِ "سی۔ پی" نے
اسی بازار میں ناطق ہمیں نیلام ہونا تھا

ناطق گلاؤٹھوی

باز آیا کسی کی یاد سے میں عالم تہ و بالا کون کرے
چپ بیٹھ کے رویا کون کرے دل تھام کے تڑپا کون کرے

ان سنگ دلوں سے ملنے کی بیکار تمنا کون کرے
فولاد کا دل لوہے کا جگر پتھر کا کلیجا کون کرے

مجبور ہے کتنا ہر انساں دنیا کے مصائب جانے ہیں
مرنا بھی تو اپنے بس کا نہیں جینے کی تمنا کون کرے

کچھ شکوۂ دورِ فلک بھی ہے تقدیر پہ کچھ الزام بھی ہے
در پردہ مٹایا کس نے ہمیں اس راز کو افشا کون کرے

بات اتنی ہے اک دل ہے تو کبھی دو کام نہ ہونگے ای واعظ
دنیا کے بکھیڑوں میں رہ کر فکرِ غمِ عقبیٰ کون کرے

تم بہرِ عیادت آئے ہو، آئی ہے اجل بھی بالیں پر
دیکھیں تو مریضِ ہجر ان کو ان دونوں میں اچھا کون کرے

سر دھننے لگی شمعِ محفل پروانے یہ کہکر کود پڑے
جلنا تو ہے اپنی فطرت میں جل بجھنے کی پروا کون کرے

ہے جان کی گاہک تیری ادا اور مفت میں ہے بدنام قضا
اس بات کو دنیا جانتی ہے اس بات کا چرچا کون کرے

اپنوں سے سریر امید ہو کیا جو کچھ بھی کیا اپنوں نے کیا
احباب نہیں اغیار سے کم اغیار کا شکوا کون کرے

سریر کابری

دیہات کی شام

پرچمِ ظلمت سرِ تنویر لہرانے لگا　　چہرِ عالمتاب کے رُخ پر حجاب آنے لگا
لال اور پیلی شعاعوں سے شفق ہے لالہ گوں　　رہگذارِ عام پر ہو جائے جیسے کوئی خوں
چرخِ نیلی فام کی ٹھنڈی ہوئی تپتی جبیں　　نکہتِ نمناک سے ہے مست کھیتوں کی زمیں
بڑھ رہی ہیں رفتہ رفتہ ہلکی ہلکی ظلمتیں　　جذب ہوتی ہیں سکوتِ شام میں سب شورشیں
آگئے ہیں لوٹ کر گلشن میں مرغانِ چمن　　خدشۂ فردا سے غافل آشیانوں میں مگن
چھا گئیں باغوں میں پُر وحشت اثر خاموشیاں　　پیڑ آپس میں لگے کرنے بہم سرگوشیاں
ہو رہے ہیں کھیت سے واپس فسردہ دل کساں　　دھوپ کے مارے تھکے ماندے نزار و ناتواں
عورتیں واپس ہوئیں پانی لئے تالاب سے　　جھوس کے کچے مکاں سب جاگ اٹھے خواب سے
دودھ دُہنے کی صدا معصوم بچوں کی پکار　　دشت کی ویرانیوں سے زندگی ہے آشکار
خامشی کی گود میں غوغائے عالم سو گیا　　یا دھندلکے میں نظامِ نور سارا کھو گیا
گیدڑوں کی چیخ اک جانب سے جھینگر کی صدا　　رات کی ہیبت فزائی میں اضافہ ہو گیا

عارضِ فطرت پہ زلفِ پُرشکن لہرا گئی
یا فضائے نور و تابش پر سیاہی چھا گئی

آسماں پر یک بیک تاروں کی محفل جم گئی　　اک ذرا سی، لہرِ موجِ زندگی کی تھم گئی
ہو گیا روشن جو مٹی کا دیا چوپال پر　　رات بھر رویا کسانوں کے شکستہ حال پر
آبیاری خونِ دل سے کھیت کی کرتے ہیں　　دوسروں کی زندگی کے واسطے مرتے ہیں
فکر ہے ان کو لگان اپنے ادا کیونکر کریں　　دل سے اپنے کاہشِ پیہم فنا کیونکر کریں
چھو نہیں سکتا انہیں جھوٹا تمدن شہر کا　　گاؤں سے رہتا ہے دامن کش تعفن شہر کا

اللہ اللہ شام کیا دیہات کی معصوم ہے!
زندگی سی زندگی ہے گو فضا مغموم ہے

رونق دکنی جمشید پوری

مستقل ہے۔

مکتوبات

سردار عالم حسامی
مانک پور پرتاب گڑھ

اودھ ۱۶ر دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء

برادرم! السلام علیکم مزاج گرامی

آج ایک عرصۂ دراز کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے خاتمہ تک پہونچکر روانہ ہو سکے۔ شرمندہ ہوں کہ آپ کے متعدد خطوط کا جواب آج تک نہ لکھ سکا۔ وجوہات کے طومار لکھنے سے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اعتراف گناہ کرکے عفو کا خواستگار ہو جاؤں۔ یقین فرما لیجئے کہ میں اس دنیا میں دنیا کے بکھیڑوں۔ پیشہ کی معروفیتوں کے علاوہ حادثہ و آلام سے بھی دوچار رہا ـــــ قدرت نے میری زندگی کا نظم غزلیات کے طور پر رکھا ہے۔ مختلف الخیال۔ متضاد النوع۔ سوائے "ستۂ مزدوریہ" کی ردیف کے اور کوئی تسلسل وہم آہنگی نہیں۔ طبابت کے پیشہ میں لوگوں سے واقفیت و مراسم خواہ مخواہ ناقابل برداشت حد تک بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں اپنے اوقات زندگی میں سے کسی حصہ کا بھی مالک باقی نہیں رہ گیا جو باہر سے بچا وہ "گھر" کے نذر ہو گیا۔

"نئے طرح بجز بار لطف دوستاں ہو زندگی" ـــــ اس پر طرہ یہ کہ شریک زندگی "نازک بھی اور نازک مزاج بھی" "این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر" اب اپنے ذوق کی آسودگی تقریباً محال ہے۔ مئی سے اگست تک تعمیر مکان کا سلسلہ رہا۔ دماغ میں خیال و خط کی جگہ "اینٹ گارا" تصور یار کے بجائے خیال معمار۔ ستمبر اکتوبر میں مرضا کی کثرت طرح طرح کے مریض۔ قسم قسم کے امراض۔ رنگ رنگ کے تار وٹے، جگہ جگہ کا آب و دانہ اور میں "دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں" کی عملی تفسیر۔ نومبر میں میرے ماموں بیمار ہو کر آخری ہفتہ میں جوان العمر فوت ہو گئے۔ جن کے تین چھوٹے چھوٹے بچے اور بیوہ منجملہ اسباب سہارا ہیں رفیع پیش نظر۔ میری سخت جانی بھی قابل فخر و ناز ہے "ان حالات میں کسی مضمون کا لکھنا تو کجا خود لکھنے کا بھی موقع حسب مرضی نہ مل سکا۔

نئی کے محبت نامہ کے متعلق بھی چند لفظ سن لیجئے۔ آپ کے نوٹ سے بُرا ماننا کیسا لذت محسوس ہوئی، کاش کبھی ملاقات ہو اور تفصیلی گفتگو ہم کو کسی متحدہ نتیجہ پر پہونچائے۔ خدا کرے "بساط سخن" کی اشاعت کے سامان جلد مہیا ہوں اور آپ کی ادبی زندگی کا یہ کارنامہ بقائے دوام حاصل کرے ـــــ ممنون ہوں کہ آپ نے بہار صاحب کے خط کا اقتباس مجھ تک پہونچایا۔ بہار صاحب فرماتے ہیں کہ "میرا اعتراض اپنی جگہ قائم ہے"۔ حالانکہ بہار صاحب کے مضمون کا اگر تجزیہ کیا جائے اور "تمام ادب برائے ادب" کو علیحدہ کرکے دیکھا جائے تو بجائے اعتراض کے ایک تحقیر آمیز طنز باقی رہ جاتا ہے یعنی اقبال کی تمام کائنات شعری مستعار و ماخوذ ہے" بھائی! اگر کبھی سُنی باتوں کا دُہرانا قابل اعتراض و طنز ہے تو بات کوئی مشکل ہو جائے گی پھر اس شخص پر یہ طنز جو اعلان کرتا ہو کہ "بدست من جہاں دیرینہ چنگ است"۔ بہار صاحب یقین فرما لیں کہ مجھے اُن سے کوئی وجہ پرخاش کی نہیں ہو سکتی بلکہ یقیناً اُنس ہے۔ میں اُن کے ادب کو بلند سے بلند تر مقام پر دیکھنے کا متمنی ہوں۔ ہندوستان کی "بے بحر خیال کی وبا" واقعی قابل صد افسوس ہے اس نے دو گروہ پیدا کر دیئے ایک سر جھکا کر چلنے والا دوسرا اسکے ردعمل کی پیداوار، اگر وہ ہر صحیح و غلط راستہ پر آنکھ موند چلتا ہے تو یہ ضد میں صحیح راستہ سے منحرف ہو جاتا ہے ـــــ

اقبال و فانی میں "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کا فرق تھا اقبال میں تعمیر تھی اور فانی میں تاثر۔

اقبال کے متعلق میرے اور آپ کے نظریہ میں اختلاف ہے آپ اقبال کو سیاسی شاعر سمجھتے ہیں اور سیاست کو متغیر۔ میں اقبال کو حقیقی شاعر سمجھتا ہوں اور حقائق کو غیر متغیر "لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" دنیا ہزار پلٹے کھائے زمانہ میں لاکھوں انقلابات آئیں۔ اقبال کا نظریۂ حیات محکم اسکا درس دوام آمیز۔ آپ مجھے "مولویانہ ذہنیت"

کا بھرطوفہ دینگے۔ دیکھئے اگر "مولویانہ ذہنیت" نام ہے احکام الٰہی و پیغام رسالت پناہی پر ایمان و یقین کا تو مجھے قلبی اعتراف ہے "مولویانہ" ذہنیت کا اور اسی پر خاتمہ کی خواہش

ان کان الرفض حب علی
فیشھد الثقلان انی رافضی

آپنے ایک مضمون کا حکم دیا تھا جس میں "ذاتی و سیاسی عنصر نہ ہو" سچ باور فرمائیگا ایسا تاؤ آیا کہ اگر موقع ہوتا تو اسی وقت قصر الادب پہونچتا۔ پوچھتا اور جھنجھوڑ کر پوچھتا کہ ذات و سیاست سے آپ کو چڑھ کیوں ہے۔ یہ چیز تو آپ کی زندگی کے گوشہ گوشہ پر چھائی ہوئی ہے آپ اس سے دامن کہاں تک بچائینگے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا ادب کاغذی پھولوں کے خوشنما گلدستہ سے آگے نہ بڑھے۔ کیا آپ صرف تخیل کی فضاؤں میں مست رہنا چاہتے ہیں کیا آپ ٹھوس حقیقتوں سے ادب کو عاری رکھنا چاہتے ہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ ادب جب ہی جاندار ہوتا ہے جب اس میں حقیقت ذات اور سیاست سمو دی جائے ——— ایک واقعہ لکھنا چاہتا تھا جو ذات و سیاست کے ساتھ ساتھ پُر لطف بھی ہے لیکن ابھی دماغ معطل ہے۔ سکون میسر ہونے کے بعد انشاء اللہ لکھونگا۔

"مکتوبات" کا سلسلہ "شاعر" میں بہت دلچسپ اور مفید ہے اس کے لئے گنجائش نکالتے رہئے ——— یہ آبرا حسنی گنوری معلوم نہیں کون بزرگ ہیں۔ میرے پاس ایک رسالہ "نرالی دنیا" آیا جو آبر صاحب کے ایما سے بھیجا گیا تھا اور مجھ سے مضمون کی خواہش کی گئی تھی۔ لیکن رسالہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ محض اکابر ادبا پر سب و شتم کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ افسوس کہ لوگ ابھی تک تنقید و تنقیص کا فرق نہیں سمجھے۔ اگر نقدیات کی یہی حالت رہی تو اردو ادب کی یہ گندگیاں ادب اردو کو گھناؤنا بنا دینگی ؎ کوئی مضمون تھا نہ مطلب شوق کے دفتر تھے میں جو لکھنے کے لئے بیٹھا تو دفتر ہوگیا

لکھنؤ
۲۴ نومبر ۴۳ء

مخدوم بھائی تسلیم
نومبر ۴۳ء کا شاعر باصرہ نواز ہوا۔ مضامین نظم و نثر کا معیار بلند ہے

علاوہ بھرتی کی چیزوں کے بحیثیت مجموعی "شاعر" یو۔پی کا ایک قابل مطالعہ ماہنامہ ہے۔

اسی شمارے میں کوثر رحمی صاحب کا ریڈیائی ڈرامہ "راکوں" پڑھکر میرا یہ خیال یقین کی حد تک پہونچ گیا کہ جس طرح بگڑا شاعر مرثیہ گو ہو سکتا ہے اسی طرح بگڑا ادیب الٹے پاؤں پیچھے سرکنے والا اصلاح پسند بن سکتا ہے۔ رحمی صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ اردو ادب کی ایک خالی جگہ کو پُر کرنے کے لئے قلم اٹھایا اور ایک پٹے پٹائے موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے محدودے چند ادبی ماحول میں سانس لینے والی عورتوں پر اپنے حساب خوب کچوکے دے لئے۔ مگر ہاروں وغیرہ کے جگہ جگہ خود کو بھی زخمی فرمالیا۔ ایسے ادیبوں کو آپ میری طرف سے ایک عام مشورہ دیجئے کہ پہلے وہ بغور عورت کی نفسیات کا مطالعہ کریں یوں دور از حقیقت کردار پیش کر کے وہ کچھ بھی نہ بن سکیں گے۔ سوائے اسکے کہ فن کا گلا بیٹھے گھونٹا کریں۔

اب مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے اس شمارے میں نجمہ تصدق، شیریں اور اس بندی کی چیزوں کو کیوں شامل کیا جبکہ آپ اُس ریڈیائی "نگارِ فکر" سے خود بھی فکرمند تھے؟ اس وقت مجھے آپکے ۱۰ ستمبر ۴۳ء کے کرم نامے کے وہ الفاظ یاد آ رہے ہیں کہ "میں بہت مسرور ہوں کہ یو۔پی کی خواتین شعر و ادب میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ خدا ان کی ترقیوں میں استقامت عطا فرمائے"۔ یہ آپ کا قول تھا اور عمل "راکوں" شائع کرنا، کتنا تضاد! حسب الحکم آپا مستورہ صاحبہ کا ایک افسانہ "تین لفافیں" ارسال ہے رسید سے مطلع فرمائے گا، فکر رہے گی۔

والسّلام
ہاجرہ مسرور۔

---

۹ دسمبر ۱۹۴۳ء
کینگ اسٹریٹ لکھنؤ

سرکار ——— !! جواب میں آپ تو بہت تکلف برتتے ہیں۔ یہاں یہ عالم کہ انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں۔ آخر یہ آنکھوں کی مصیبت کب ختم ہوگی۔ خدا کے لئے ذرا آگ کر علاج کرائیے۔ آپ ہر بات

تکلیف ابھی نہیں کی؟ کیا اس دوران میں کوئی اور ادارت کا بار نہیں سنبھال سکتا؟

"ترکش" "افلاد" کا نعم البدل ہے۔ ۱۵ر دسمبر ۴۳ء تک شائع ہو جائیگا۔ اس کا اشتہار بھیج رہا ہوں اگر اس شمارے میں گنجائش ہو تو شائع کر دیجئے "ترکش" آپ ہی کا پرچہ ہے۔ آئندہ اشاعت کے لئے آپ کی نظم کا انتظار کر رہا ہوں۔ میری ذمہ داری کا ذرا خیال رکھئے گا۔

آپ کی نظم و غزلیں "تیر و نشتر" مطبوعہ "عالمگیر" ماہ نومبر ۴۳ء بہت پسند کی گئیں اور [illegible] لوگوں نے بھی تعریف کی جو نئے غزل گویوں میں فراقؔ، جذبیؔ [illegible] کے علاوہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے ایک ایسی ہی غزل "ترکش" کے لئے روانہ کر دیجئے منتظر رہونگا "ترکش" شائع ہوتے ہی حاضر کر دونگا۔ عبادتؔ صاحب "شاعر" کے لئے انشاء اللہ مزید کچھ لکھیں گے اور آئندہ بھی پابندی سے لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

یہ زندگی بھی بُرے دن ہیں۔ مجھے رسوا کرنے پڑتے ہیں، سب کچھ آپ سے کہدیا۔ ۱۲ر دسمبر ۴۳ء کو الہ آباد جا رہا ہوں، کچھ تو "ترکش" کے لئے مضامین لینے کی ضرورت ہے اور پھر اب "ان" سے ملنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ گنگا جمنا کے سنگم پر سوتی ہوئی "آرزو" کو آپ کے خط نے آخر جگانے کے لئے آمادہ کر ہی دیا، لیکن یہ تو بتائیے "بیتے ہوئے لمحوں" کی "ان" کی وضاحت نہ ہو سکی۔ حضور کے مزاج کیسے ہیں۔ اب چھپانے سے حاصل؟ وہ راز ہی کیا جو زبان تک آ گیا۔ پھر آپ کے سامنے تو میری زندگی کے تمام اوراق منتشر کر دیئے گئے۔ اب آپ کو مجھے بھی کچھ پوچھنے کا حق ہونا چاہئے ——— منظر رضوی سلام کہہ رہے ہیں۔

آپ کا شوکت صدیقی

"رضی" منزل
۱۳ ۱۲/۴۴

مکرمی تسلیم و نیاز

شاید فصیح الملک مرحوم کی فاتحہ میں میری عدم حاضری کی وجہ سے

مولانا مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے تمام حالات اسی دن مولانا کو لکھ کر بھیجدیئے تھے جو غالباً اسی شام کو مل گئے ہونگے۔ آج پھر اپنے تمام معاملات لکھ کر روانہ کر رہا ہوں۔ اگر مولانا اجازت دیں تو آپ بھی پڑھ لیجئے۔ اُمید ہے کہ آپ اس معاملہ میں میرے ہم نوا ہو کر مولانا سے میری سفارش کر دینگے۔

"شاعر" مل گیا لیکن جناب میری نظم "دشمن" اس مرتبہ بھی غائب ہے کیا وہ آپ کو پسند نہیں؟ "دوست" کو تو آپ نے دامنِ "شاعر" میں جگہ دی، لیکن "دشمن" سے آپ گریز کر رہے ہیں۔ کیا واقعی دشمن بُری چیز ہے۔ میں تو عرفانِ دوست کے لئے دشمن کا ہونا ضروری سمجھتا ہوں، اور یہی میری اس نظم کا مقصدِ وحید ہے مجھے اپنی یہ نظم "دشمن"، "دوست" سے زیادہ پسند ہے۔ آپ کی آپ جانیں۔

بھائی! مشاعرہ کی صدارت نہ بھول جانا۔ میں نے صرف آپ کی صدارت ہی کی وجہ سے مشاعرہ ۲۵ر کی بجائے ۲۴ر کا کر دیا ہے صدارت کا اعلان بھی ہو گیا ہے۔

مشاعرے کی کامیابی صرف آپ حضرات پر منحصر ہے۔ ہاں "شاعر" میں آپ نے گوزی کے چٹکی واقعی پھر گہری لی ہے۔ لیکن وہ شاید "اب کے مارے تو جانوں" .. والے آدمیوں میں ہیں۔ مولانا مدظلہٗ تو ایسے وسیع الظرف واقع ہوئے ہیں کہ متعدد بار لکھنے کے باوجود بھی ایسے سفیہ الحرکات لوگوں کو بھی سزا نہیں دینے دیتے ورنہ یہ کیا اور ان کی ڈفلیاں کیا۔ کاش مولانا اجازت دیدیں تو پھر ہم لوگ تو بڑی چیز ہیں۔ ہمارے شاگرد ان کا منہ توڑنے کے لئے کافی ہیں۔

مخلص
صبا متھراوی

غروبِ اختر "شاعر" کی آخری کاپی چھپنے جا رہی تھی کہ ابوالفضل [illegible] راز چاند پوری کے خط سے انکے نوجوان صاحبزادے اختر راز کے انتقال کی اطلاع ملی، مرحوم ہونہار طالب علم اور علمی ادبی ذوق سے بہرہ ور تھے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور راز صاحب کو اس غم کے برداشت کی قوت عطا فرمائے۔ ادارہ اُن کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ناظرینِ "شاعر" بھی مرحوم کے لئے دعائے خیر فرمائیں ——— اعجاز صدیقی

شخصیات

الطاف مشہدی

شاعری تنقیدِ حیات ہے ــــ اور حیات گوناگوں آلام و آسائش سے مملو۔ ہندوستان کے دورِ نشاط کا ردِ عمل لازمی اور لابدی تھا۔ قوم و ملک کے بدلتے ہوئے حالات انحطاطی صورتیں ذہنیتوں کی تبدیلی اور وقت کی نزاکتوں نے شاعری اور نہ صرف شاعری بلکہ اُردو ادب ہی کی ہیئت کو بالکل بدلکر رکھدیا۔ اب شاعر کی نظر میں حیات ایک رِستا ہوا ناسور، پکا ہوا پھوڑا اور جلتا ہوا داغ تھی۔ زندگی ایک مسلسل آہ اور مستقل کراہ بنکر رہ گئی تھی۔ سرمایہ داری اپنے آہنی بازوؤں میں غریبوں کو دبائے ہوئے تھی۔ تیرہ بختی غریبوں کا مضحکہ اڑا رہی تھی اور سماج ہچکیاں لے رہا تھا ادھر سوشلزم کی تحریک پوری قوتوں سے اپنا رنگ جما رہی تھی۔ پھر سیاست کی سرگرمیاں نرے اور جگا رہے۔ بیرونی تہذیب و تمدن کی تباہ کاریاں ایسی صورت میں "حیات" پر نشاطی نقطۂ نظر سے کیونکر تنقید ہو سکتی تھی؟ چنانچہ ادب و شعر کے نظریات بدلنے شروع ہوئے اور اتنے بدلے کہ ایک نئی "انقلابی شاعری" نے جنم لے لیا۔ شعرا کو پھول کی پنکھڑی میں بجائے رس اور شگفتگی کے خونِ دہقاں نظر آنے لگا۔ حالی۔ آزاد۔ نذیر احمد۔ اکبر اور اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ نے جن بے حالیوں کو محسوس کیا انھیں اقبال۔ سیماب۔ چکبست۔ جوش اور ظفر علیخاں نے دہکتے ہوئے انگاروں کی صورت میں زبانِ قلم سے برسایا اور نہ صرف برسایا بلکہ قوم و ملک کے سینوں میں بھی اس آگ کو بھر دیا۔

اس دور کا تعلیم یافتہ اور حساس نوجوان شاعر بھلا کیونکر خاموش بیٹھ سکتا تھا اُس نے اپنے بزرگوں سے زیادہ گرم نوائی کے ساتھ انقلابی شاعری کا ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ مجاز۔ ساغر۔ احسان دانش۔ فیض۔ مخدوم محی الدین۔ علی اختر۔ جاں نثار اختر۔ مخمور جالندھری۔ علی سردار جعفری۔ سلام مچھلی شہری اور روش ہی نہیں بلکہ نوجوان شعرا کی ایک بڑی تعداد کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوئی۔ بعض نے بحاملہ سے اور بعض نے توازن سے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم و ملک میں بیداری پیدا کرنی شروع کر دی اور موجودہ نظامِ زندگی کو اُلٹنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انھیں میں الطاف مشہدی بھی ہیں۔

۱۰ فروری ۱۹۱۶ء کو چک نمبر ۱۱ جنوبی ضلع سرگودھا میں الطاف مشہدی کی پیدائش ہوئی۔ ڈھائی سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ یہ سید زادہ اپنی والدہ کے سایہ میں پروان چڑھا۔ دس سال کی عمر میں پرائمری پاس کر کے مڈل اسکول میں قدم رکھا۔ پانچویں جماعت کے امتحان کے بعد آزادی کا سودا سر پر سوار رہا اور بجائے اسکول جانے کے نہر کے کناروں، پہاڑیوں کے دامن اور شیشم کی چھاؤں میں مطالعۂ فطرت ہونے لگا۔ چھٹی کے وقت گھر پہونچ جاتا اور پھر مدرسہ کے وقت ان فضاؤں کی طرف کھنچ آتا۔ یہ تھا الطاف کا عالمِ جوانی۔ والدہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے ایک بڑے عالم سید حسین شاہ صاحب کو الطاف پر مسلط کر دیا چنانچہ دو سال تک اُن کی قید میں رہنا پڑا اتفاق سے وہ اپنے وطن چلے گئے اور پھر پوری آزادی مل گئی۔ جوانی کا عالم جذبات میں ہیجان، آرزوؤں میں تڑپ اور دل میں کسک اسی دور سے شاعری کا آغاز ہوا، سب سے پہلے پنجابی کا ایک شعر کہا اور پھر ایک سی حرفی کہہ کر ایک فقیر کو یاد کرا دی جو بہت مقبول ہوئی۔ تو بڑے بوڑھوں کی نظریں الطاف کے حرکات و سکنات پر تبصرہ کرنے لگیں۔ والدہ نے مقصدِ زندگی سے بدلتے ہوئے گوجرانوالہ میں خالہ کی لڑکی سے شادی کر دی سسرال والے سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ خوش قسمت کی منفعتِ حیات مڈل کے علاوہ کیا مل پاس کا

فاارعربی کی عالم۔ خاطر آزاد بھاگی مولانا رشید احمر ندوۃ العلماء کے تاریخ التحصیل۔ جامعہ ملیہ دہلی کے بی۔ اے۔ الطاف کو اپنی تعلیمی کمی کا احساس ہوا چنانچہ گھر ہی پر اردو علم و ادب کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ مدرسانہ ماحول سے گز رتے رہے اور رفتہ رفتہ حیات نے علمی ادبی اور شعری ذوق کو اُبھار نے میں مدد دی۔ الطاف کے ذوق شعری کو شاعرانہ ماحول میسر نہ تھا اس لئے طبیہ کالج دہلی میں داخلہ لے لیا۔ ارادہ تھا کہ وہاں تعلیم حاصل کی تو حب ہوا ساز گار نہ آئی تو لائل پور آنا پڑا اور یہاں اخبار "توحید" کی ادارت مل گئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد الطاف کو لاہور کی ادبی فضا سرزمین نے کھینچ لیا۔ یہاں رسائل و اخبارات کی ادارت اور کو لمبیا ریکارڈنگ کمپنی کی ملازمت کرنی پڑی۔ اب الطاف تیزی کے ساتھ شعر و شاعری کی منزلوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے نئے احساسات و میلانات تھے۔ وہ نئی شاعری اور انقلاب سامانیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ چنانچہ اُس کے جذبات کا دھارا بھی اسی طرف بہنے لگا۔ اب وہ غزل سے زیادہ نظموں کی طرف متوجہ ہوا۔ اِدھر اخبارات و رسائل نے اُس کے کلام کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ۱۹۳۹ء میں پہلا مجموعۂ کلام "تصویرِ احساس" کے نام سے شائع ہوا اور ۱۹۴۲ء میں دوسرا مجموعۂ کلام "پربت کے گیت" منظرِ عام پر آیا۔ اس میں الطاف کی شاعری زیادہ روشن اور تیز تھی۔ عملی و فنی اغلاط سے بچنے کے لئے مولانا گوہر لکھنوی کا دامن پکڑا اور جب تشنگی کم نہ ہوئی تو کچھ مدت بعد یعنی اسی سال علامہ سیماب اکبر آبادی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گیا۔

الطاف کی شاعری پر تبصرہ کرنا میرے لئے کسی قدر مشکل ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ اُس کے کلام کا کوئی مجموعہ میرے سامنے نہیں ہے۔ بہر حال رسائل میں آئے دن شائع ہونے والی نظموں اور "شاعر" جون ۱۹۴۳ء میں اُس کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے۔ اُسی کی روشنی میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ الطاف مشہدی حقیقی شاعر ہے۔ اس کی شاعری رسمی نہیں وہ سوئے قوموں کو جگانا چاہتا ہے وہ افلاس اور سرمایہ داری کو جھنجھوڑتا ہے اور انقلاب قوت کا ساتھ دیتا ہے اُس کی نظر میں ملک کی گرتی ہوئی حالت ہے اور وہ دوسرے انقلاب پسند شعرا کی طرح قہر و ظلم کو ڈھا دینا چاہتا ہے۔ یہ ایک خاص بات ہے کہ اُس کی شاعری میں خشکی نہیں بلکہ رس ہے اُسکی آواز کرخت نہیں بلکہ مترنم ہے اور اسی لئے اُس کی تلخ سے تلخ بات طبیعت کو گوارا معلوم ہوتی ہے وہ اپنی اکثر نظموں کا پس منظر رومان پر قائم کرتا ہے اور اسی کے تحت سب کچھ کہہ جاتا ہے، مگر انتہا پسندی اور تجاوز اکثر اُس کی شاعری کے افادہ کو ختم کر دیتا ہے۔ مثلاً وہ اپنی ایک نظم "رزانِ جہاں" میں کہتا ہے ؎

اے لڑکی او بھیگی پلکوں والی کیوں مغموم ہے تُو	کنواری کلیوں کی کچلیل ڈالی کیوں مغموم ہے تو
اترا اترا چہرہ ہے اور ہونٹ بھی سوکھے سوکھے ہیں	اُجڑا اُجڑا جوبن ہے اور بال بھی بکھرے بکھرے ہیں
کیسے مہنگی بیلی انگلی جس نازک کے سنگ مات	عصمت تیری بک گئی شاید کسی زردار کے ہاتھ
پیٹ کی آگ بجھا دی آخر شاید تُو نے عالم سے	سیدھی راہ دکھادی آخر رزاقِ دو عالم نے

اُسی کلام کا پیاس بہ اثر و طبیعی نالہ نے نہ سہا ہے

بہرے کو آواز میں دینے سے حاصل کیا ہوتا ہے
بہرہ ہے رزاقِ جہاں، آواز نہ دے نادان نہ بن

یہ نظم کسی قدر طویل ہے اور افلاس کا ایک بھیانک منظر پیش کرتی ہے لیکن تامل کچھ نہیں کاش جناب باری میں ہمارے شعرا اس قدر گستاخی سے کام نہ لیتے۔ یہ سچ ہے کہ انتہائی مایوسی میں خدا سے شکوہ کیا جاتا ہے لیکن شکوہ کا بھی ڈھنگ ہونا چاہئے۔ اقبال کا "شکوہ"، حشر کی "شکایت" اور سیماب کی "فریاد" میں جو اثر ہے اور ان نظموں کا جو انداز ہے وہ ہرگز گستاخانہ نہیں۔ الطاف کی انقلابی شاعری اُس نہج کی ہے جو عام طور پر انقلابی شعرا کر رہے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اُس میں مصلحانہ شان پیدا ہو اور جذبے اور برشتے کے ساتھ ساتھ رونیدگی کا بھی امکان ہونا چاہئے۔ جذبات کو برانگیختہ کرنے کے ساتھ ساتھ نئی راہوں کی طرف بھی اشارہ ہونا چاہئے اور تخریب کا مشورہ دینے کے بعد تعمیری پروگرام بھی پیش کرنا چاہئے۔ یہی وہ خامی باقی ہے جو الطاف اور دوسرے انقلابی شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے۔ یہ تو خیر حقیقی تنقید نہیں کہ الطاف کو تمام انقلابی شعرا سے بڑھا دیا جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ملک میں اُس کی شاعری کافی مقبول ہے اور اُس نے بہت سی ایسی نظمیں لکھی ہیں جو ترقی پسند ادب میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ اُسے الفاظ کے رکھ رکھاؤ میں کافی درک حاصل ہے۔ اس کی نظموں کی بحریں بھی مترنم اور بولتی چلتی ہوتی ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اُس کا رجحان گیتوں کی طرف زیادہ ہے۔ وہ ابتک سیکڑوں گیت لکھ چکا ہے اور اُس قسم کے گیت لکھنے والوں میں نمایاں درجہ رکھتا ہے۔ میری رائے میں حفیظ، سید مقبول حسین احمد پوری کے بعد الطاف نے سب سے زیادہ اور اچھے گیت لکھے ہیں۔ اُسکے گیتوں کا مجموعہ عنقریب بازار میں آنیوالا ہے جو یقیناً قابلِ قدر ثابت ہو کر ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود اُس کا دامن آزاد نظم کے خارزار سے پاک رہتا ہے۔ نہ وہ پنجاب کے بعض دوسرے شعرا کی طرح بے راہ رو ہوا اور یہی ایک چیز مستقبل میں الطاف کو پنجاب کے دوسرے ترقی پسند شعرا سے ممتاز کرے گی اُسکے کلام کی خامیاں بھی بعض ناقدین کو کھٹکتی ہیں لیکن آئندہ شاید وہ اغلاط سے پاک مجموعہ پیش کر سکے بہر حال اُس سے ادب و شعر کی بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں اگر اُس کی شاعری میں توازن پیدا ہو گیا اور اُس نے ترقی پسند شاعری کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تو وہ واقعی صفِ اوّل کا شاعر ہو گا۔ اُس نے کچھ غزلیں بھی کہی ہیں مگر مجھے اُسکے غزل گو شاعر ہونے میں کلام ہے۔ میرے خیال میں وہ غزل گوئی کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا اُسے صرف نظم کہنی چاہئے اور وہ بھی توازنِ جذبات کے ساتھ۔

جی چاہتا تھا کہ الطاف کی متعدد نظمیں بطورِ نمونہ کلام پیش کروں لیکن عدم گنجائش مانع ہے

بھوک

"رو رہا ہے میرے ہمسائے کا بچہ کیا کروں"

جی میں آتا ہے طبیعت کی روانی بیچ دوں	ایک دوشیزہ کی الفت کی کہانی بیچ دوں
جو کبھی نرم و حسیں بانہوں میں لہرائی رہی	ایک ردی کے عوض وہ نوجوانی بیچ دوں
جو دلوں کی وادیوں میں گنگنائی عمر بھر	چند ٹکڑوں کے لئے وہ زندگانی بیچ دوں
جو کسی کی سرمگیں آنکھوں میں محوِ رقص ہے	دل یہ کہتا ہے وہ اُنگور دلا کی بیچ دوں
جو جوانی کے اُبھرو جانے یہ بھی محفوظ ہے	آج کوئی لے تو وہ اسکول کا پانی بیچ دوں
جو جوانی نے عطا کی اُن کی چشمِ مست کو	میرے بس میں ہو تو وہ [illegible] بیچ دوں
یہ زمیں یہ آسماں، یہ غلتیں یہ رفعتیں	ایک بچے کے لئے دُنیائے فانی بیچ دوں

"رو رہا ہے میرے ہمسائے کا بچہ کیا کروں"

اعجاز صدیقی

تحقیق و تصحیح

بعض ایسے الفاظ کے اعراب جن میں غلطی کا امکان ہے

غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح
		ب
بَابُل	بابِل	دوسرا ب بالکسر
بَارَد	بَارِد	ر "
بَاکَرہ	بَاکِرہ	ک "
باہمی	باہَمی	ہ بالفتح
بُتُوَل	بَتُول	ب "
بَدُر		د مجزوم ہے بمعنی پورا چاند
بَدَر		د۔ بالفتح بمعنی باہر
بَدَرِقہ	بَدَرَقہ	ر۔ بالفتح
بَدُون	بُدُون	ب بالضم
بَدَاہَہ	بِدَاہَۃ	ب۔ بالکسر
بِرادَر	بَرادَر	ب بالفتح
بَرِص	بَرَص	ر بالفتح
بَرَف	بَرْف	ر مجزوم
بِرہِمن	بِرَہمَن	ر۔ بالفتح
بَشَارَت	بِشَارت	ب۔ بالکسر
بُشرہ	بَشَرہ	ب بالفتح
بَضَاعت	بِضاعت	ب بالکسر
بَطَالت		بالفتح بیکاری
بِطَالت		بالکسر دلیری
بَغَیر	بِغَیر	ب۔ بالکسر
بِلاغ	بَلَاغ	" بالفتح
بُلَند	بَلَند	" "
بُلُوط	بَلُوط	" "

غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح
بَندِگی	بَندَگی	د بالفتح
بوقُلوں	بوقَلَوں	ل "
بِہجَت	بَہجَت	ب "
بِہانہ	بَہانَہ	ب "
بِیَاضُ	بَیَاض	ب "
پَرَیشاں	پَرِیشاں	ر۔ بالکسر
پَشیمَاں	پَشِیماں	ش " (باقی۔ باقی)

(بقیہ مشاعرہ شاعر صفحہ ۴۸)

جناب سلطان نقشبندی

رخصتِ موسمِ بہاری ہے — دل پہ وحشت ہنوز طاری ہے
اپنے بیگانے ہو گئے سلطان — بخت کی یہ سیاہ کاری ہے

جناب نصیر کوٹی

اُن کے آنے سے ایک وحشت تھی — اور جانے سے بیقراری ہے
سب تو قربان ہو چکے ہیں نصیر — آج مقتل میں اپنی باری ہے

جناب ساجن انصاری بھیڑوی

دل لگائے رہی تو تم سے — زندگی اپنی جسکو بھاری ہے
یار کے سب قریب ہیں ساجن — بُری قسمت فقط ہماری ہے

جناب تحمل دہرن گانوی

قبر میں بھی ہمارا ساتھ دیا — بے کسی کی یہ غمگساری ہے

جناب قاضی ادہونی

ہو چکا امتحانِ پروانہ — کوئی دم میں ہماری باری ہے

جناب خلش دردی

لُٹ رہا ہے کسی کا سے خانہ — بزمِ امکاں پہ کیف طاری ہے

جناب حسن چھپراوی

گردشِ روزگار سے اف ل — آج ماجد تو کل بھکاری ہے

اصلاحِ سخن :- جناب اسعد السدیدی کی غزل پر اعتبار الملک حضرتِ دلؔ شاہجہانپوری کی اصلاح

بھٹکنے ہو عبث کیوں کام تم جذبۂ دل سے ۱ نہ رکھو واسطہ رہگیر سے، رہبر سے، منزل سے

مری نظروں میں جلوے لامکاں کی رقص فرما ہیں ۲ تمہیں کیا قدر ہوا انکی ذرا پوچھو مرے دل سے

میں لذت آشنا کیفِ تصور سے ہوا اتنا ۳ سنے معلوم کرلیتا ہوں حالاتِ جہاں دل سے

خرابِ عشق کی محرومیِ قسمت کو کیا کہئے

~~نہ پوچھو آہ محرومی خرابِ عشق کی لوگو!~~ ۴ نتیجہ کچھ نکلتا ہی نہیں ہے سعیِ حاصل سے

بظاہر جاں نثاری ہے

شہیدانِ وفا کو وہ مخاطب کرکے کہتے ہیں ۵ ~~تمہیں الفت نہیں دل سے~~ تمہیں الفت نہیں دل سے

~~دمِ رخصت کسی کا ہائے یہ کہنا "ادھر آؤ"~~ ۶ ~~لپٹ جاؤ مرے دل سے، مرے دل سے، مرے دل سے~~

~~ارے دل کی گدائی یا شکوہِ شانِ قیصر ہے~~ ۷ ~~یہ جاکر کوئی پوچھے قیصر و دارا کے دل سے~~

پکارا ہی کیا منزل رسیدوں کو بہت میں نے ۸ کسی نے بھی مگر آواز نہ مجھ کو دی منزل سے

چمن کی سیر سے کیا واسطہ اب تو یہ عالم ہے

~~بڑھا دو اور نہ بیتابی مری اے فصلِ گل~~ ~~ہے~~ ۹ کہ دل میں ہوک اٹھتی ہے مرے شورِ عنادل سے

نہیں ملتی ہے ایسی کونسی لذت بھٹکنے میں ۱۰ یہ جاکر کوئی پوچھے رہبرانِ راہِ منزل سے

کہ رازِ منزل

غرض مجھ کو نہیں ~~پابندیِ~~ دیر و حرم سے کچھ ۱۱ کہ میں ناآشنا ہوں امتیازِ حق و باطل سے

تصور ہی کی یہ سب ہیں کرم فرمائیاں اسعدؔ ۱۲ "ہوا کرتی ہیں تنہائی میں باتیں اپنی ہی دل سے"

سبق لو زندگی میں

ترقی پر جو ہیں اسعدؔ وہ پائیں گے تنزل بھی ۱۳ ~~ہے ظاہر یہ تماشا~~ ہے ماہِ نو سے ماہِ کامل سے

ہوں گی

ہماری شاعری کی کیوں نہ شہرت ~~ہوگی~~ اے اسعدؔ ۱۴

تلمذ رکھتے ہیں ہم ~~اعتبار الملک یا~~ دلؔ سے

صاحبِ فن حضرت

توجیہ :-

(۳) اس شعر میں کسی قدر اصلاح کی ضرورت تھی۔ اس لئے کہ "ہوا اتنا" اور "معلوم کرلیتا ہوں" میں زمانوں کا تضاد پایا جاتا ہے۔ اگر پہلا مصرع یوں ہوتا ؎

"میں لذت آشنا کیفِ تصور سے ہوں اس درجہ"

تو یہ عیب دُور ہوسکتا تھا۔

(۴) اسعد صاحب کا مصرع پھُس پھُسا تھا۔ فاضل استاد نے اسی مفہوم کا ایک اچھا مصرع بہم پہونچا دیا۔

(۵) مصرع ثانی میں "الفت نہیں دل سے" کی تکرار اچھی نہ تھی۔ اس لئے ایک جگہ سے نکالدیا گیا۔

(۶-۷) دونوں شعر بھونڈے سے تھے، پہلا زیادہ اور دوسرا کم اس لئے نظری کردئیے گئے۔

(۸) سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرتِ دلؔ نے اس شعر کے پہلے مصرع میں کیوں نہ اصلاح فرمائی۔ ایسے میں صرف سہوِ نظر کہونگا ورنہ مصرع نمایاں طور پر اصلاح طلب ہے "میں نے" کی موجودہ صورت اہل زبان کا محاورہ نہیں ہے۔ مصرع کی صحیح نثر یوں ہوگی "میں منزل رسیدوں کو پکارا ہی کیا"۔ "بہت" بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر "بہت" مصرع میں قائم رکھا جائے تو پھر "ہی" کی ضرورت نہیں۔

(۹) مصرع اچھا نہ تھا "اور" کو بھی مخفف کرکے لکھا گیا تھا۔ اصلاح بہت اچھی دی گئی ہے۔

(۱۰) "پابندی" سے "راز" کہیں زیادہ بہتر اور مناسب ہے۔

(۱۳) اسعد صاحب کے مصرع ثانی میں غلطی تو نہ تھی لیکن ترقی کی ضرورت تھی۔ اصلاح نے اسکو پورا کردیا۔

(۱۴) "ہوگی" کی وجہ سے مصرع اولیٰ چست نہ تھا۔ مصرع ثانی میں "اعتبار الملک" کے بعد "یا" غلط اور زیادہ تھا۔ اصلاح سے یہ عیب جاتا رہا۔

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "کب غمِ عشق اختیاری ہے"

حضرتِ نشتر تیگامی ایڈووکیٹ اورئی

آہ وزاری نہ اشکباری ہے
ضبط کے ساتھ بیقراری ہے

دن کٹھن ہے تو رات بھاری ہو
زندگی کیا نفس شماری ہے

حالِ دل کیا کہیں کسی سے ہم
بیقراری سی بیقراری ہے

اب تو حالت یہ ہے سکوں بھی اگر
دل میں آئے تو بیقراری ہے

رحم اے برق آشیانے پر
ساری دُنیا بھی ہماری ہے

زندگی پر نہ موت پر قابو
واہ کیا زندگی ہماری ہے

ہم سے پوچھو تو عشق کا نشتر
دوسرا نام بیقراری ہے

حضرتِ منظر صدیقی اکبرآبادی

دل ہے اور شغلِ اشکباری ہے
ہائے کیا زندگی ہماری ہے

زندگی پر تو اپنا زور نہیں
عشق میں موت اختیاری ہے

کیوں نہ ہو ناز مجھکو غربت پر
یہ فقیری تو شہریاری ہے

مدعی عشق کا ہے ہر انساں
کیا یہ نعمت بھی اختیاری ہے؟

مجھسے ہوگی نہ شرحِ جلوۂ دوست
کہ یہ توہینِ رازداری ہے

کبھی پی تھی تری نگاہوں سے
آجتک بیخودی سی طاری ہے

اس میں کچھ شک نہیں کہ منظر بھی
حُسن اور پریم کا پجاری ہے

حضرتِ جذب عالمپوری

پھر وہی شغلِ عشق جاری ہے
پھر وہی زندگی ہماری ہے

نگہِ شوق اختیاری ہے
آپ کا حُسن اعتباری ہے

مر رہے ہیں مگر نہیں مرتے
واہ کیا زندگی ہماری ہے

خونفشانیٔ چشمِ شوق نہ پوچھ
ایک سیلاب ہے کہ جاری ہے

دل تمہارا ہے میری چیز نہیں
جان میری نہیں تمہاری ہے

جان دوں اور موت راز رہے
یہ بھی اک شرطِ جاں نثاری ہے

جذب کس سے کہیں محبت میں
کس طرح زندگی گذاری ہے

حضرتِ ارشد صدیقی امروہوی

خونِ دل چشمِ تر سے جاری ہے
ضبطِ غم کی نگوں نگاری ہے

محفلِ حُسن و عشق ہر خاموش
مدتوں سے جمود طاری ہے

ہے غنیمت کہ جاوداں نہ ہوئی
زندگی دو ہی دن کی بھاری ہے

جبر پر بس کسی کا اختیار نہیں
صبر کرنا تو اختیاری ہے

کل تو موسیٰؑ کا امتحان ہوا
طور پر آج کس کی باری ہے

ہجر میں بارِ غم اُٹھے کیونکر
سانس لینا بھی مجھکو بھاری ہے

جب سے پایا ہے اُن کو اے ارشد
دل پہ اک بیخودی سی طاری ہے

حضرت قہر تقوی بجے پوری

عالم اک نقشِ انتظاری ہے
پھر بھی حیرت نظر پہ طاری ہے

عظمتِ عرش پر جو بھاری ہے
وہ ہماری ہی خاکساری ہے

کام لو قوتِ ارادی سے
کامیابی پھر اختیاری ہے

عہد و پیمانِ حسنِ الفت میں
کس قیامت کی استواری ہے

وہ ہماری وفا پہ ہنستے ہیں
جن کی فطرت جفا شعاری ہے

جلوہ جلوہ بنا لیا چلمن
خوب اندازِ پردہ داری ہے

بس ضبط ہے مُہرِ لب تو کیا اے قہر!
دل میں طوفانِ آہ و زاری ہے

جناب اکرم حنیفی دھولیوی

پھر لہو چشمِ تر سے جاری ہے
پھر وہی رنگِ بے قراری ہے

ذکر کس کا زباں پہ جاری ہے
روح پر بیخودی سی طاری ہے

ذکر ہے اور بس تمہارا ذکر
یاد ہے اور بس تمہاری ہے

جان کر جان کیا کوئی دیگا
زندگی ہر کسی کو پیاری ہے

بے قراری ہے زندگی دل کی
زندگی ہے تو بیقراری ہے

جیسے بجلی چمک چمک جائے
آج کچھ ایسی بیقراری ہے

موسمِ گل گذر گیا اکرم
اب چمن میں خزاں کی باری ہے

جناب خلیل نکہوی از سگولی

یہ بھی فطرت کی شاہکاری ہے
کون نوری ہے کون ناری ہے

ننگِ ہستی کی پردہ داری ہے
بیخودی میں بھی ہوشیاری ہے

آمد آمد ہے کس کی گلشن میں
غنچے غنچے پہ وجد طاری ہے

لب پہ مہرِ سکوت ہے لیکن   دل میں صد گونہ بیقراری ہے
کچھ تو وجہ خلش بتلائے غم   دل کی رگ رگ سے خون جاری ہے
جا رہا ہوں دیارِ گلشن سے   جوشِ وحشت کی پاسداری ہے
داغِ دل کے طفیل کیا کہئے   بزمِ ہستی میں لالہ کاری ہے

جناب منظر مظفر پوری

حُسن کی پردہ داریوں کی خیر   پھر تصوّر کی مشق جاری ہے
ایک جلتا ہے، ایک روتا ہے   دیدہ و دل میں دوستداری ہے
شمع کو یوں نہ چھیڑ بادِ نسیم   دلِ جلی آپ غم کی ماری ہے
ہے اُن آنکھوں سے تابِ دید کی آس   جن کو پانی کی بوند بھاری ہے
میں سمجھتا ہوں برق کے تیور   اب مرے آشیاں کی باری ہے
کوئی آئے تو دم میں دم آجائے   سانس، بیمارِ غم کی جاری ہے
جسے کہتے ہیں زندگی منظر   عشق کی وہ فریبکاری ہے

جناب فروغ تابانی دھولیوی

حسن پر کیفیت سی طاری ہے   عشق کی داستان جاری ہے
کون مصروفِ آہ و زاری ہے   دم بخود کائنات ساری ہے
بخش دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں   "کب غمِ عشق اختیاری ہے"
ٹھوکروں میں ہے منزلِ مقصود   گر ارادوں میں استواری ہے
سازِ غم پر وہ راگ چھیڑا ہے   عقد پروین پہ وجد طاری ہے
وہ ہنسے جارہے ہیں سُن سُن کر   اور افسانہ میرا جاری ہے
ہے تصوّر میں کون مستِ ناز   سرخوشی سی فروغ طاری ہے

جناب منظر کلیمی جام پوری

اِن دنوں شغلِ آہ و زاری ہے   نالے ہیں اور بے قراری ہے
دل میں طوفانِ بے قراری ہے   اور زباں پر سکوت طاری ہے
میں تو سجدے میں ہوں مجھے کیا ہوش   بے خودی ہے کہ ہوشیاری ہے
وہ بھی رہتے ہیں کھوئے کھوئے سے   مجھ پہ بھی بیخودی سی طاری ہے
دفن کیونکر کریں مجھے احباب   قلبِ میت سے ذکر جاری ہے
جبر یہ داخلِ سرشت ہوا   "کب غمِ عشق اختیاری ہے"
مستیاں چھوڑتی نہیں منظر   ترک مدت سے بادہ خواری ہے

جناب بیتاب کالپوی

زندگی صرف آہ و زاری ہے   بیقراری سی بیقراری ہے
طعنِ دیوانگی نہ دے اے دوست   بے ہُشی عین ہوشیاری ہے
دل سے مجبور ہے ہر اک انساں   کاہشِ غم کب اختیاری ہے
اک زمانے سے بزمِ ہستی کی   خونِ انساں سے آبیاری ہے
عشق میں آرزوئے زیست نہ کر   جاں گنوانا ہی جاں نثاری ہے
اب بھی باقی ہے وحشتِ انساں   اب بھی انسانیت سے عاری ہے
مائلِ لطف اور وہ بیتاب   صرف وہم و فریبکاری ہے

جناب غنی کلم نوری

بے پئے شغلِ میگساری ہے   چشمِ ساقی کا فیض جاری ہے
بوریائے فقیرِ بے ساماں   رو کشِ تختِ شہریاری ہے
ہے نظر میں، نظر سے پوشیدہ   کس قیامت کی پردہ داری ہے
بزمِ تخئیلِ عالمِ امکاں   نقشِ تصویرِ اعتباری ہے
چاندنی رات کا حسیں منظر   قلبِ مضطر پہ ضرب کاری ہے
یہ ترقی ہے علمِ حاضر کی   نوعِ انساں پہ شعلہ باری ہے
جرعۂ بادۂ عمل سے غنی   کیف مینائے کامگاری ہے

جناب شہید جبلی

آنکھ سے سیلِ اشک جاری ہے   اور لب پر سکوت طاری ہے
آج وہ یاد آئے جاتے ہیں   سلسلہ آنسوؤں کا جاری ہے
یہ تاثر ہے میرے نغموں کا   ایک عالم پہ وجد طاری ہے
مسکراتے ہو، حالِ دل سن کر   واہ کیا خوب غمگساری ہے
لب ہیں خاموش اور آنکھوں سے   سلسلہ گفتگو کا جاری ہے
کشتِ اُمید ہوگئی برباد   کس کے ہاتھوں میں آبیاری ہے
کس کی فرقت میں اے شہید تجھے   ہر نفس زندگی کا بھاری ہے

جناب شاعر کاندھلوی

دوستی صرف اعتباری ہے   دشمنی بھی برنگِ یاری ہے
مر کے پورا ہوا فسانۂ دل   اب نہ دل ہے نہ بیقراری ہے
میرے نزدیک ہی یہ طاعتِ کُل   نام تیرا زبان پہ جاری ہے
یہ بھی ملتا ہے خوش نصیبی سے   "کب غمِ عشق اختیاری ہے"
سوزِ پنہاں میں زندگی پنہاں   زندگی ذوقِ جاں نثاری ہے
یہ وہ سودائے عشق ہے شاعر   جس کا حاصل جہاں میں خواری ہے

جناب سہا قریشی از بھنڈ

آہ دن کو ہے شب گزاری ہے — بیقراری سی بیقراری ہے
سخت مشکل ہے فیصلہ کرنا — دل ہی پیارا کہ جاں پیاری ہے
صحنِ گلشن کی ہر کلی سے عیاں — حسنِ فطرت کی شاہکاری ہے
ضبط کر دوں میں آہ کو کیونکر — یہ کوئی امرِ اختیاری ہے؟
عشق میں اُف کی کیوں نہیں ہوتی — حالتِ زار، جو ہماری ہے
استفادہ سہا میں کیوں نہ کروں — فیضِ سیماب سب پہ جاری ہے

جناب طرفہ قریشی بھنڈاروی

شعلہ ریزی ہے شعلہ باری ہے — ہر طرف اک تباہ کاری ہے
جان دینے پہ کون ہو تیار؟ — زندگی ہر بشر کو پیاری ہے
دل اگر اک ہی بت پہ ہو مائل — بت پرستی بھی دینداری ہے
عشق میں ہر تڑپ ہے اک راحت — ہر سکوں ایک بیقراری ہے
آپ اپنی ادا پہ مٹ جانا — یہ بھی اُن کی عجوبہ کاری ہے
دیں وہ دادِ سخن ہمیں طرفہ — ایسی قسمت کہاں ہماری ہے

جناب وحید نولوی - نحاز پوری

یہ گرانی کا فیض جاری ہے — فاقہ مستی ہے جاں پیاری ہے
ہو گئی آساں مرورِ ہر مشکل — گوارا دوں میں استواری ہے
زندگی کی کشاکش توبہ — اور اسیر بھی جان پیاری ہے
علم کا آفتاب روشن ہے — اور اندھیرا جہاں میں طاری ہے
سارے فتنے فساد کی بنیاد — ذوقِ زر کی طلسم کاری ہے
دیکھنا ہے وحید کیا گزرے — حسن سے آج روبکاری ہے

جناب فارغ ازادے پور

بند عرصے سے گولہ باری ہے — پھر بھی جنگِ عظیم جاری ہے
چین خلوت میں ہے نہ جلوت میں — بیقراری سی بیقراری ہے
مارنے سے جو ڈر گیا انساں — اُس نے تیر طرح بازی ہاری ہے
روندتے تھے جہاں کو ہو کے — روندی جانے کی آج باری ہے
وار کر کے نہ مسکرائے کیوں؟ — جانتا ہے وہ ضرب کاری ہے
مردِ میداں ہی گرتے ہیں فارغ — گر کے اٹھنا ہی شہسواری ہے

جناب خوشتر کھنڈوی

ہو گئی بیخودی میں لغزشِ پا — کیا کہیں کیا خطا ہماری ہے
جس دن آئی ہے موت آئے گی — یہ بھی کیا امرِ اختیاری ہے
عشق میں ہم گلہ کریں کس کا — بدنصیبی تو خود ہماری ہے
جان دیتا ہے کون کس کے لئے — زندگی اپنی سب کو پیاری ہے
تم رہو دل میں اور نظر سے دور — یہ بھی کیا رسمِ پردہ داری ہے
کیا کہیں وقتِ مرگ اے خوشتر — زندگی کس طرح گزاری ہے

جناب ہلال پریمی

کیوں یہ بنتی نہیں تری تصویر — کچھ تصور کی خام کاری ہے
بھیک دے یا نہ دے یہ تیری خوشی — در پہ تیرے، ترا بھکاری ہے
آنکھوں آنکھوں میں کر گئے باتیں — یہ محبت کی رازداری ہے
دیکھنا صرف مسکرا کے ترا — وجہِ تسکینِ بے قراری ہے
ہم وہاں ہیں جہاں محبت میں — بیقراری ہی بیقراری ہے
جل گئی شاخ شاخ گلشن کی — اب مرے آشیاں کی باری ہے

جناب اشعر ہاشمی ملیح آبادی

یہ جو ہر وقت بے قراری ہے — کچھ نہیں دل کی خامکاری ہے
آپ دامن ذرا بچا کے چلیں — مضطرب خاکِ دل ہماری ہے
ہوش جادے کا ہے نہ رہبر کا — ہم ہیں اور جستجو تمہاری ہے
پہلے منزل کو ڈھونڈتے تھے ہم — جستجو میں وہ اب ہماری ہے
حسرتیں سب نکل چکیں دل کی — اب فقط آرزو تمہاری ہے
تم پہ قربان اشعرِ ناشاد — پھر تو کہنا "خطا تمہاری ہے"

جناب منیر نقشبندی کولاری

زندگی بھر کی سوگواری ہے — حاصلِ عشق آہ و زاری ہے
چاہتا ہوں بجھاؤں دل کی لگی — نہیں بے وجہ اشکباری ہے!
پسِ پردہ بھی جذبۂ آشوب — یہی آئینِ دوستداری ہے؟
دوست ہو کر بھی سازشیں کیا خوب — خوب یاری ہے خوب یاری ہے
جس سے کھلتی ہے غنچگی دل کی — وہ شگفتہ نظر تمہاری ہے
جانے والے منیر جا پہنچے — آج کل میں ہماری باری ہے

جناب پی سی شور اٹاوہ

اشک باری ہے بے قراری ہے — ہم نے اپنی یونہی گزاری ہے
اپنے دامن کو تربہ جل دخت — اُن کے محمل کی آج باری ہے
تیرے نقشِ قدم کی سجدہ گاہ — کعبہ و بتکدہ پہ بھاری ہے

حسن والے بھی ہو گئے پیا چاک — جوشِ وحشت گلوں پہ طاری ہے
ماہ و انجم پہ جم گئیں نظریں — اِن میں کچھ کچھ جھلک تمہاری ہے
نظرِ حسن ہو چکی اے شور — آج حسنِ نظر کی باری ہے

جناب انجام کاشمیری

بیخودی حسن پر بھی طاری ہے — کیا یہ تمہیدِ ہوشیاری ہے
زندگی اک طلسم ہے گویا — سانس کا کھیل ہو کر جاری ہے
داغِ غم، داغِ عشق، داغِ ستم — دل میں ہر قت لالہ کاری ہے
حسرتِ دید رنگ لائے گی — حسن انکا نظر ہماری ہے
جس نے بخشی حیاتِ نو دل کو — ہائے وہ چوٹ کتنی پیاری ہے
مان انجام ضبط سے لے کام — کہ بُری چیز بے قراری ہے

جناب عارف بانکوٹی

دل ہے اور آرزو تمہاری ہے — اب یہی زندگی ہماری ہے
لاؤ جان انکے عشق میں دیدیں — یہ نہ کہدیں وہ جاں پیاری ہے
مانگنے کے لئے ہیں ہم مجبور — آپ کی دین اختیاری ہے
ہے عمل پر مدار انساں کا — نہ یہ نوری ہے اور نہ ناری ہے
کام کیا دوسروں کے آئے گا — جس کو اپنا ہی کام بھاری ہے
کہیں مرتے ہیں اہلِ دل عارف! — جاوداں زندگی ہماری ہے

جناب کوکب القادری از کوچین

لے کے دل ہم سے پردہ داری ہے — کیا یہی راہ و رسمِ یاری ہے؟
دل ٹھہرتا نہیں کسی صورت — بیقراری سی بیقراری ہے
ہے فقط ترکِ آرزو کا خیال — اب یہی آرزو ہماری ہے
فکرِ درماں ہے چارہ گر تجھ کو — درد سے زندگی ہماری ہے
دل کو بہلائیں کس طرح کوکب — اسکی فطرت میں بیقراری ہے

جناب ناظم (از چکدین)

زندگی اپنی سب کو پیاری ہے — موت اک جبرِ اختیاری ہے
آج دنیا میں جب کلیم نہیں — کیوں سرِ طور برق باری ہے
جسکے پینے سے اور پیاس بڑھے — وہ بُری چیز بادہ خواری ہے
کیوں چلے آئے تم تصور میں — ہم سے جب اتنی پردہ داری ہے
شاعری جسکا نام ہے ناظم — ایک الہامِ فیض باری ہے

جناب احسن حنیفی دھولیوی

مُردنی روح و دل پہ طاری ہے — ہائے کیا زندگی ہماری ہے
صبح تک دیکھئے ہو کیا انجام — رات ہے دل ہے بیقراری ہے
ابھی آیا کہاں خیال اُن کا — بے خودی کیوں ابھی سے طاری ہے
فرقِ ماضی و حال کچھ بھی نہیں — بے قراری تھی بے قراری ہے
کاش! اجل ہی کو کچھ ترس آتے — زندگی حسرتوں کی ماری ہے

جناب حکیم آسی تریاپوری

وجہ صد گونہ بیقراری ہے — ہائے کیا زندگی ہماری ہے
دوست کیوں رو رہے ہیں بالیں پر — موت پیغامِ رستگاری ہے
اتنے بھی نہ ہو کوئی مضطر — کہ وہ کہدیں یہ جفا سکاری ہے
وہ جفا کو جفا سمجھتے ہوں — میرے نزدیک تو دلداری ہے
حالتِ عشق کیا کہوں آسی — نہ سکوں ہے نہ بیقراری ہے

جناب اسعد السدیدی لکھنوی

منتقل اب تو بیقراری ہے — "واہ کیا زندگی ہماری ہے"
خاک وہ مائلِ سکوں ہوگا — جسکی فطرت میں بیقراری ہے
طائرِ کنجِ آشنا کے لئے — باعثِ ننگ رستگاری ہے
ہم قفس سے چھٹے بہار آئی — یہ مقدر کی سازگاری ہے
کائناتِ سخن میں اے اسعد — حضرتِ دل کا فیض جاری ہے

جناب نسیم سیتاپوری

کبھی حاصل تھی عشق میں راحت — اب تو ہر لحظہ آہ و زاری ہے
تیری بے التفاتیوں کی قسم — اب ہر اک غم سے سنگاری ہے
ہنس رہے ہیں جو زخمِ دل شبِ غم — حسن کی یہ بھی پرده کاری ہے
کعبہ و دیر میں تو کچھ بھی نہیں — عمر ساری وہاں گذاری ہے
ہمتِ عشق کو نگیں ہے نسیم — بیستوں پر بھی نہر جاری ہے

جناب محشر فرخ آبادی

سب ہیں اس دور میں غلش اندوز — درد سے کس کو رستگاری ہے
زندگی کا ہے نام غمخواری! — موت انجامِ جاں نثاری ہے
ہیں پریشاں عناصرِ ہستی — موت بھی زندگی سے عاری ہے
پیت کی آگ پر نہیں قابو — عشق کا غم تو اختیاری ہے
عقلمندی ہے خامشی محشر — بولنا تجربہ کاری ہے

جناب ثاقب ساطع بڑوانی

منزلِ یار کا پتہ نہ چلا
جستجو مدتوں سے جاری ہے

چارہ سازِ دلِ جگر دوز نہیں
ایسی تقدیر کب ہماری ہے

میری رگ رگ میں ہم ہیں جلوہ طراز
کیوں نگاہوں سے پردہ داری ہے

یوں ہے یہ حاصلِ متاعِ حیات
دل پہ چشمِ کرم تمہاری ہے

ہے اور بخشیں خلش وہ دل کو مگر
عین راحت یہ بیقراری ہے

جناب نظر اعظمی

ہیں ہمہ گیر آپ کے جلوے
پھر یہ کیسی پردہ داری ہے

حُسن ناواقفِ حقیقت ہے
عشق کی اس پہ ذمہ داری ہے

کچھ تبسم ہی پہ نہیں موقوف
حُسن کی ہر ادا ہی پیاری ہے

حاصلِ شوق پوچھتے ہو نظر
نالۂ بے اثر ہے خواری ہے

جناب ارشد صدیقی ساگری

رات دن دل کو بیقراری ہے
ہائے کیا زندگی ہماری ہے

ہر نظر شعلہ، ہر نفس سیماب
بیقراری سی بیقراری ہے

ہم کہاں اور کوئے یار کہاں؟
سب تصور کی سحر کاری ہے

یہی نیرنگِ دہر ہے ارشد
کل خوشی، آج غم کی باری ہے

جناب سلام ساگری

اُنکی آنکھوں کا فیض جاری ہے
بے پئے مجھ پہ کیف طاری ہے

دل کی بازی کسی کی اُلفت میں
ہم نے جیتی کہاں ہے ہاری ہے

چشمِ میگوں کا ذکر ہے لب پر
کتنی معصوم بادہ خواری ہے

چل بسا آج کوئی ملکِ عدم
کل سلامِ حزیں کی باری ہے

جناب خلیق ایولوی

یہ جو وحشت سی دل پہ طاری ہے
آمدِ موسمِ بہاری ہے

دل نثار لبِ جاں تمہارے ہیں
کونسی چیز اب ہماری ہے

ایسے عالم میں اب ہیں ہم کہ جہاں
بے ہوشی ہے نہ ہوشیاری ہے

جاؤ دنیا میں جس طرف بھی خلیق
بیقراری ہی بیقراری ہے

جناب وحشت انصاری امنیری

بارگاہِ حرم خاص ہے دل
بے خودی بھی عبادت گزاری ہے

خشک آنکھوں میں بھی نظر کے میں
داستانِ وفا شماری ہے

آپ آئیں غریب خانے پر
ایسی قسمت کہاں ہماری ہے

وحشت زار حاصلِ اُلفت
مستقل درد و بے قراری ہے

جناب سید محمود ایولوی

مجھ پہ مرنے کا یہ مآل ہوا
موت بھی زندگی ہماری ہے

اُن کی آنکھوں سے پی رہا ہوں میں
دیدنی میری بادہ خواری ہے

بن گئے خاکِ زیرِ پائے حبیب
دل جلوں کی یہ خاکساری ہے

اثر انداز کیوں نہ ہو محمود
تیرا ہر شعر اضطراری ہے

جناب شاداں میل فرشارم

اُڑ رہا ہوں غبارِ رہ بنکر
اوج پر میری خاکساری ہے

کروٹیں بے سبب نہیں لیتا
کچھ نہ کچھ وجہ بیقراری ہے

تیرا عاشق کہاں سنبھالا لے
تیغِ ابرو کا زخم کاری ہے

مغفرت کا سبب بنی شاداں
واہ کیا شانِ شرمساری ہے

جناب اثیم تریاتوری

ہے تسلی ہیں مفر سا پہلو
دل دہی ہے کہ دل فگاری ہے

امتحانِ وفا ہے حاصلِ عمر
ورنہ کیا ہم کو زیست پیاری ہے

کیا کریں عرض مدعا ان سے
کہ ہمیں پاسِ وضع داری ہے

نہ ملا چین دو گھڑی بھی اثیم
واہ کیا زندگی ہماری ہے

جناب ظاہر بھڑگانوی

آہ و نالہ ہے اشک جاری ہے
ہجر کی رات کتنی بھاری ہے

اُلٹا دستور ہے محبت میں
ہوش کھونا ہی ہوشیاری ہے

یہ ہے انجامِ عشق اے ظاہر
سلسلہ آنسوؤں کا جاری ہے

جناب نور بدایونی

اُنکی اُلفت میں اور کیا ملتا
رنج ہے غم ہے بیقراری ہے

دل میں رہ کر نہاں ہیں آنکھوں سے
ہائے کیسی یہ پردہ داری ہے

نور دل لے کے وہ یہ کہتے ہیں
چیز میری ہے یا تمہاری ہے؟

جناب غافل ازبتول

عشق میں کل سکون تھا جتنا
آج اُتنی ہی بے قراری ہے

اُن پہ سب کچھ نثار کر بیٹھے
اب تمنائے جاں نثاری ہے

مر رہا ہوں جو عشق میں غافل
حُسن کی یہ بھی پاسداری ہے

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمایئے)

تعارف

فروری سنہ ۱۹۴۴ء

جلد ۱۵ تصویر۔ حضرت علامہ کیفی چریا کوٹی نمبر ۲

سالِ اجرا موسم بہار سنہ ۱۹۳۰ء ——— عرصۂ اشاعت ۱۴ سال

قصر الادب کا خالص علمی و ادبی ماہنامہ

شاعر آگرہ

زیرِ سرپرستی

اعلیٰحضرت ہز ہائینس مہاراجہ والئی پاجود (کاٹھیاواڑ)

عالیجناب سردار صدیق محمد خانصاحب یونیو منسٹر (نابھہ)

منظور شدہ

محکمہ ہائے تعلیم صوبۂ پنجاب، صوبۂ ممالک متوسط و برار ریاست میسور، ریاست کشمیر، حکومت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

چندہ سالانہ

عوام سے	۴ر	معاونین سے	۲۴ر
خواص سے	۶ر	مربیوں سے	۵۰ر
ہمدردوں سے	۱۲ر	محسنین سے	۶۰ر
انیسوں سے	۱۵ر	سرپرستوں سے	۱۲۵ر

ششماہی ۳ر ——— فی پرچہ ۶ر

اشاعت گاہ

مکتبۂ قصر الادب آگرہ

محسنین، مربی، معاونین، سرپرستان و ہمدردانِ شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۵۰ سالانہ
(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیّر خورجوی ۵۰ سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت کتیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۵۰ سالانہ
(۴) محسنِ ادب وزیر زادہ شجاعت خانصاحب جوہر جوناگڈھی ۵۰ سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۵) مربیٔ ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز و اسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹا نگر) ۵ سالانہ

معاونین ادب

(۶) معاونِ ادب مسٹر ایے بی قلیس صابر بی۔اے اکبرآبادی ۲۴ سالانہ
(۷) معاونِ ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسی منزل روڑکی (بمبئی) ۲۴ سالانہ
(۸) معاونۂ ادب محترمہ نگہ تصدق ایم۔اے۔بی۔ٹی مدیرہ رسالہ "ادیب" دہلی ۲۴ سالانہ
(۹) معاونِ ادب جناب صوبہ دار اختر علی صاحب گوالیار ۲۴ سالانہ
(۱۰) معاونِ ادب جناب سید یوسف پیر صاحب نیر کیمی مجید علیم ۲۴ سالانہ
(۱۱) معاونِ ادب جناب مخدوم سید علی اسد صاحب نقوی البنارسی، احمد آباد جوگ ۲۴ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندھری ۱۲ سالانہ
(۱۳) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری مرحوم ۱۲ سالانہ
(۱۴) ہمدردِ ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب لذتی دکنی جمشید پور ۱۲ سالانہ
(۱۵) ہمدردِ ادب جناب خلیل کھوکھر صاحب راز جوناگڈھی ۱۲ سالانہ
(۱۶) ہمدردِ ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲ سالانہ
(۱۷) ہمدردِ ادب جناب نواب زادہ شکور حسین خانصاحب قیس آف سندیلہ ۱۲ سالانہ
(۱۸) ہمدردِ ادب محترمہ عقیلہ جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۱۲ سالانہ
(۱۹) ہمدردِ ادب جناب محبوب خانصاحب وکیل صدر بازار سمن پور (مشرقی خاندیش) ۱۲ سالانہ
(۲۰) ہمدردِ ادب جناب نعمان تاثر صاحب کراچی ۱۲ سالانہ

خادمانِ ادب

(۲۱) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ۶ سالانہ
(۲۲) جناب عبدالحفیظ صاحب تمر صدیقی بی۔اے ۶ سالانہ
(۲۳) جناب لالہ گنگا رام صاحب آبد سرہندی ۶ سالانہ
(۲۴) جناب سید مظفر حسین صاحب عرشی غازی آباد ۶ سالانہ
(۲۵) جناب محمد عبیداللہ خانصاحب ترم امروہوی ۶ سالانہ
(۲۶) جناب نذیر احمد صاحب نذیر بیشیر کوٹی ۶ سالانہ
(۲۷) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثر بمبئی ۶ سالانہ
(۲۸) جناب صبغت اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶ سالانہ
(۲۹) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ۶ سالانہ
(۳۰) جناب طالب دہلی لدھیانوی ۶ سالانہ
(۳۱) جناب فقیر محمد خانصاحب عاشق بیگوالی (کوئٹہ) ۶ سالانہ
(۳۲) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶ سالانہ
(۳۳) ...
(۳۴) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹاہ ۶ سالانہ
(۳۵) جناب شیو پرشاد صاحب برگ باندوی ۶ سالانہ
(۳۶) جناب حکیم مولوی عبدالرحمان صاحب شاور کاندھلوی ۶ سالانہ
(۳۷) علامہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی ۶ سالانہ
(۳۸) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر نہٹوروی ۶ سالانہ
(۳۹) جناب کنور فاروقی علیخاں صاحب عارف رئیس سندیلہ ۶ سالانہ
(۴۰) جناب مقبول احمد صاحب سحر اعظم گڈھی ۶ سالانہ
(۴۱) جناب مولوی منظر الدین صاحب منظر ماماسی گورداسپور ۶ سالانہ
(۴۲) جناب ڈاکٹر ماہر شاد صاحب استعانہ زیب بریلوی ۶ سالانہ
(۴۳) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب آروی جمشید پور ۶ سالانہ
(۴۴) جناب عبدالرؤف صاحب ثاقب بڑوانی اسٹیٹ ۶ سالانہ
(۴۵) جناب من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی۔پی) ۶ سالانہ
(۴۶) جناب محمد حسین صاحب خادم شبلوی دہلی ۶ سالانہ
(۴۷) جناب چودھری علیم یار صاحب رئیس فتح محمد ۶ سالانہ
(۴۸) جناب سید شاہ عنایت علی صاحب تاباں القادری فتاپور (بنگال) ۶ سالانہ
(۴۹) جناب شیخ عبدالرحمان صاحب شباب دہلوی ریوارلی ۶ سالانہ
(۵۰) جناب ملک قربان حسین صاحب شہید جھلی بمبئی ۶ سالانہ
(۵۱) جناب عبدالرؤف صاحب فوق سکریٹری اقبال لائبریری ضلع سونگھیر (گیا) ۶ سالانہ
(۵۲) جناب رگھوویندر راؤ صاحب جذب عالمپوری ۶ سالانہ
(۵۳) جناب پنڈت بے ناتھ صاحب کمل خادم ایم۔ایس۔سی جودھپور ۶ سالانہ
(۵۴) جناب محمد اکرام اللہ صاحب سہا قریشی ایڈووکیٹ بھنڈ ۶ سالانہ
(۵۵) جناب میاں گل محمد خانصاحب کمہار رئیس فیروز کر ضلع گوردھا ۶ سالانہ
(۵۶) جناب منشی ایم۔آر شاہ صاحب ایچ۔پی۔ٹی ڈاکٹر زبان پنجابی و فشتی ابنالہ ۶ سالانہ
(۵۷) جناب خادم حسین صاحب خادم زیبائی جلیبو ۶ سالانہ
(۵۸) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری محمود ۶ سالانہ
(۵۹) جناب شیخ محمد احمد صاحب نازش بمعرفت جناب گلبرگی مولوی محمد حمزہ صاحب رئیس پرتاب گڈھ ۶ سالانہ
(۶۰) جناب ابراہیم خان رحمت اللہ خان صاحب ثمر جوناگڈھی ۶ سالانہ
(۶۱) محترمہ سلمیٰ خاتون صاحبہ کرن منابید بنگال ۶ سالانہ (باقی صفحہ دیکھو)

شعرِ انقلاب ـــــ اے گوشہ نشیں اُٹھ!

کون کہتا ہے فضائے لامکاں کی سیر کر
تُو جہاں پیدا ہوا ہے اُس جہاں کی سیر کر

تیری ہی دُنیا کے حصّے ہیں زمین و آسماں
حدِ ممکن تک زمین و آسماں کی سیر کر

تیرے طیارے خلاؤں میں خراماں ہیں تو کیا
اور اُوپر جا ـــ جہانِ کہکشاں کی سیر کر

ہیں زمیں کی وسعتیں بھی تیرے قدموں کے لئے
مشرق و مغرب کے ہر جلوہ ستاں کی سیر کر

روند ڈال اپنے قدم سے۔ کیا جنوب اور کیا شمال
ہر طرف، ہر سمت، ہر جانب یہاں کی سیر کر

دیکھ سطحِ آب پر سیلاب و طوفاں کا اُٹھان
تہہ میں جا کر باطنِ آبِ رواں کی سیر کر

عالمِ ہستی کے طے کر سب نشیب اور سب فراز
وادی و کہسار و دشت و گلستاں کی سیر کر

دیکھ راہی ہیں رہِ ہستی میں کتنے قافلے
رہگذارِ کارواں در کارواں کی سیر کر

ہیں سزاوارِ تماشا سیرگاہیں عشق کی
نجد و طور و بیستون و ہفتخواں کی سیر کر

قصر و ایواں کی طرح زنداں بھی ہیں شایانِ دید
ہر قفس کی سیر کر ہر آشیاں کی سیر کر

کائناتِ دلکشِ دیر و کلیسا میں گذر
باقیاتِ عظمتِ اسلامیاں کی سیر کر

ہے یہ دُنیا بہرِ انساں اک متاعِ بیکراں
حوصلوں سے اس متاعِ بیکراں کی سیر کر

خُلد اک رنگیں تصوّر ہے، مجسّم ہو نہ ہو
زندگی میں اس بہشتِ جاوداں کی سیر کر

خاک کے پُتلے، تجھے آنا نہیں ہے پھر یہاں
سیر ہو کر جلوہ زارِ خاکداں کی سیر کر

جستہ جستہ تجھ پہ کُھل جائینگے اسرارِ حیات
صفحہ صفحہ میرے افکارِ جواں کی سیر کر

سیماب اکبرآبادی

۲۵ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

صفحۂ جنگ

(نفسیّاتی اشارات)

رُت آئی بسنت کی شگوفے پھوٹے
دامانِ بیاباں پہ کھلے گُل بوٹے
اے کاش ہو گرم محفلِ صلح و سکوں
پیچھا اِن سرد مہریوں سے چھوٹے

اب جنگ کا کچھ عجیب سا عالم ہے
پیدا اک انقلاب سا ہر دم ہے
جاری رہے جنگ۔ ہے یہ امکاں کمزور
اور جلد ہو ختم۔ یہ توقع کم ہے

پولینڈ اور روس میں جو آویزش ہے
یہ بھی اک قسم کی نئی کاوش ہے
ہے مسئلہ سخت، مرحلہ ہے نازک
سمجھوتے کی لیکن ابھی گنجائش ہے

ہٹلر نے بھی شدّاد کی سی، کی تدبیر
یعنی کرلی ہے "اپنی جنت" تعمیر
ہے فکرِ مآلِ زندگی اب اِس کو
شاید نظر آتی ہے قضا دامنگیر!

اٹلی میں مقابلے کی اب تاب نہیں
جرمن افواج بھی ظفر یاب نہیں
شاہنشہیِ روم کا ہے وقتِ زوال
تعمیر کے دور دورِ اسباب نہیں

جاپان بھی چپ ہے چین بھی ہے خاموش
پہلا سا نہیں ہے اِن میں اب جوش و خروش
مشرق میں ہے سرد نسبتاً آتشِ جنگ
مغرب ہے بدستور ابھی شعلہ فروش

اے زندگی تخریب میں تجنے والو!
اے اسلحۂ جنگ سے سجنے والو!
ہوگی کبھی امن و صلح کی بارش بھی؟
اے مشرق و مغرب میں گرجنے والو!

کس طرح یہ رنجِ ہند سہہ سکتا ہے؟
کیونکر "جنت نشان" رہ سکتا ہے؟
جس ملک میں دس کروڑ فاقہ کش ہوں
اُس ملک کو "جنت" کوئی کہہ سکتا ہے؟

جب [redacted] تہذیبِ نوی کی تاسیس
رفتارِ حیاتِ ہند ہے تو ہیں بیس۲۰
عمرِ طبعی کا اوسط و اندازہ
برطانیہ میں ساٹھ، یہاں ہے تیئیس۲۳

یارب کی قدرت آزمائی تو نے
جبروت کی اک شان دکھائی تو نے
اب اپنی خدائی بھی دکھا بندوں کو
بندوں کی بھی تو دیکھ لی خدائی تو نے

سیماب

جرعات

جنوری ۱۹۴۴ء کا "شاعر" جس نئی ترتیب سے شائع کیا گیا تھا اُسے بالاتفاق پسند کیا گیا۔ بعض حضرات نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اتنے کم صفحات میں رسالہ کو اتنا نمایاں کر دینا اعجاز ہے۔ خیر یہ تو "شاعر" اور مدیرِ "شاعر" سے محبت کرنے والوں کا خلوص آمیز مبالغہ ہے لیکن یہ کسی حد تک صحیح ہے کہ "شاعر" تجارتی ماہنامہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اُس کا ہر صفحہ علمی و ادبی ذوق کا حامل نظر آتا ہے۔ صفحات کی کمی کا احساس دوسروں کی طرح مجھے بھی ہے۔ لیکن کیا کروں کہ آگرہ میں کاغذ کی خرید و فروخت پر مقامی حکومت نے ذرا بھی توجہ نہیں دی ہے اور اگر دی ہے تو اسی حد تک کہ کاغذی اپنا حساب کتاب صاف اور صحیح پیش کر دیں خواہ کاغذ ضرورت مندوں کو ملے یا نہ ملے۔ "شاعر" کے لئے حکومتِ ہند کی طرف سے جو کوٹہ منظور ہوا ہے وہ اُس کی ضرورت کا چوتھا حصہ بھی نہیں ہے اشاعت کا یہ عالم ہے کہ ہر ماہ دو دو سو خریدار کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں کوشاں ہوں کہ آئندہ اشاعت سے "شاعر" کے حجم میں ۸ صفحات کا اضافہ کر دوں۔ آٹھ صفحات کے اضافہ کے معنی یہ ہونگے کہ کم از کم سو روپیہ ماہانہ کا خرچ بڑھ جائے گا، مگر یہ بھی تو نہیں دیکھا جاتا کہ اچھے اچھے مضامین اشاعت سے رہ جائیں۔ امید کہ ناظرینِ "شاعر" اُس کی توسیعِ اشاعت میں اور زیادہ سرگرمی سے کام لینگے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ جذبہ کسی قدر سرد ہوتا جا رہا ہے۔ کاش اُسی جذبۂ عمل سے کام لیا جائے جس سے ۱۹۴۳ء میں "شاعر" کو نوازا گیا تھا۔

زیرِ نظر اشاعت۔ پچھلی اشاعت سے زیادہ مضامینِ نظم و نثر اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے "اردو ادب میں خواتین کا حصہ" ہندوستان کی مشہور ادیبہ محترمہ شائستہ اختر سہروردی کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے اور جناب فریدہ انصاری کی ترجمانی کی اہمیت کا ثبوت۔ مضمون کتنا ہی مختصر کیوں نہ سہی پھر بھی معلومات آفریں ہے۔ حضرت مولانا میکش اکبرآبادی کا مقالہ "وحدۃ الوجود اور وحدۃ الموجود" خالص علمی چیز ہے امید کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی بھی اِس ذیل میں کچھ نہ کچھ مزید تحریر فرمائینگے۔ "بائرن" پر ابتک اردو میں متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں اور سب میں انگریزی کتب سے مدد لی گئی ہے۔ سید محمد منظر رضوی کا اندازِ بیان بڑا دلچسپ ہے گو واقعات نئے نہیں لیکن اسلوب نے اُن میں نیا پن پیدا کر دیا ہے یہی نہیں بلکہ "بائرن" کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اُس کی شاعری پر بھی ایک اجمالی تبصرہ ہو گیا ہے۔ "اردو زبان کا ایک انگریز محسن" کوئی نیا نہیں، ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اور اُن کے فورٹ ولیم کالج سے سب واقف ہیں جناب ممتاز گھوائی نے بڑے اختصار کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔

افسانوں میں "قفس کی تیلیوں سے شاخِ آشیاں تک" رشدی بھوپالی کا انتہائی دلچسپ افسانہ ہے "تجلّی" کو خضرِ راہ بنانے والوں کی زبان سے "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" نکلنے ہی والا تھا مگر اس اتفاق کو کیا کیجئے کہ...... "روشن تاریکیاں" میں مصنف نے کوشش کی ہے وہ اندھوں کی نفسیات اور فلسفۂ بصارت سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتا ہے۔ نشاط سعید پہلی بار بحیثیت افسانہ نگار "شاعر" میں جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ موصوف نے آئندہ بھی شاعر کے لئے افسانے لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ "خاکسترِ پروانہ" حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی کی قوتِ شاعرانہ کا مظہر ہے۔ یہ باعتبارِ صنعت ڈراما نہیں بلکہ واقعتاً بے ثباتیٔ زندگی کا عبرتناک ڈرامہ ہے۔ "سنہ ۱۹۴۳ء / ۱۳۶۲ھ کے تاریخی نام اور مادّے" شاعروں کے لئے بڑے کام کی چیز ہیں حضرت مہر نقوی کو اس سلسلے میں جتنی کاوش کرنی پڑی ہوگی اُس سے وہی حضرات اچھی طرح واقف ہو سکتے ہیں جو تاریخیں نکالتے رہتے ہیں۔

منظومات پر کیا تبصرہ کروں، جب آپ عبدالکریم ثمر کی نظم "دوست" دیکھ چکیں تو صبا متھراوی کی نظم "دشمن" بھی دیکھئے۔ "دوست" اور "دشمن" کا ایک جگہ اکٹھا ہو جانا بھی اتفاقِ وقت ہے۔ محمد صادق ضیا کی نظم "مسافر" اُن کے عزمِ بلند اور رفعتِ خیال کی آئینہ دار ہے۔ حضرت راز چاندپوری کی نظم کا ہر لفظ اور ہر ٹکڑا تیر و نشتر ہے اس لئے کہ یہ اُن کے دل کی پکار ہے۔ اللہ انھیں جوان بیٹے کی موت کا غم بھولنے کی ہمت عطا فرمائے۔ غزلیں سب کی سب ماشاءاللہ لطیف تغزل کی حامل ہیں۔

"شاعر" نوازی

(۱) جناب نہال مخدومی۔ نند لور۔ ویلور	۶	خریدار	(عام)
(۲) جناب محمد یعقوب خاں صاحب نسیم سیتاپوری	۲	"	(خاص و عام)
(۳) مخدوم سید علی آسد رضا نقوی البخاری احمدآباد (دکن)	۲	"	(عام)
(۴) جناب عارف ابراہیم یوسف برکار انعامدار باگوٹی	۳	"	"
(۵) جناب محی الدین احمد صاحب شان اویسی احمد پور شرقیہ	۱	"	"
(۶) جناب محمد رفیق انصاری شہادوی	۱	"	"
(۷) جناب منظور احمد صاحب نظر اعظمی (علیگڑھ)	۱	"	"
(۸) جناب تحسیر سیتاپوری (بلگام)	۱	"	"
(۹) صاحبزادہ شفیق الرحمان خاں صاحب شفق ٹونکی	۱	"	(خاص)
(۱۰) جناب ڈاکٹر شمس الحق خاں صاحب کفیل از سگولی (چمپارن)	۱	"	(عام)
(۱۱) جناب منظر مظفرپوری	۱	"	"

اُردو ادب میں خواتین کا حصّہ

اُردو ناول نویسی کے درمیانی دَور میں خواتین نے بہترین ناول لکھکر ہمارے ادب میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔ اُردو میں ناول نویسی کا آغاز مولوی عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا نذیر احمد نے کیا۔ لیکن اُنکے بعد کے لکھنے والے کوئی اچھی چیز پیش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس دور کے بہترین ادبی اور کامیاب ناول، خواتین ہی کے قلم کے رہین منت ہیں۔

اُردو کی ناول نویس خواتین کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

(۱) وہ جنھوں نے "تہذیب نسواں" میں مضامین لکھے یا اسکے اصولوں کی حمایت کی۔

(۲) وہ خواتین جنکا طرزِ تحریر سرشار سے ملتا جلتا ہے ——— اوّل الذکر کے متعلق یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ مولوی نذیر احمد کے طرزِ تحریر سے متاثر ہیں۔

پہلے گروپ کی لکھنے والی خواتین میں سب سے زیادہ ممتاز، محمدی بیگم ہیں۔ انکا پہلا ناول "شریف بیٹی" ——— (مولوی نذیر احمد کے) "مراۃ العروس" سے بہت زیادہ اثر پذیر ہے۔ لیکن قصہ کا پس منظر اور اسکے کردار مختلف ہیں۔ اُنکی بات چیت، طور طریق دلّی والوں جیسے ہیں۔ ان پر اپنے صوبہ کا اثر زیادہ ہے۔ مستثنیات کے علاوہ کردار نگاری کمزور ہے۔ "آجکل" انکا دوسرا ناول ہے۔ جس میں کردار نگاری اچھی ہے۔ قصہ معمولی ہے اور انداز ناصحانہ ——— ! اس میں کاہلی کے بُرے نتائج بتائے گئے ہیں۔ جس طریقہ سے یہ قصہ بیان کیا گیا ہے اور کردار پیش کئے گئے ہیں اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض وعظ کہنے کی غرض سے یہ ناول لکھا گیا ہے یہ چیز نظر انداز کردی گئی ہے کہ فہیدہ (ہیروئن) اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگتی ہے اور یہ کردار غیر موثر ہو جاتا ہے

"صفیہ بیگم" انکا آخری ناول ہے اسکا مقصد بھی اصلاح ہے۔ اسکا اختتام المیہ ہے۔ کردار نگاری سے اسکا انجام بہتر ہو گیا۔ مکالمہ میں تصنع نہیں ہے۔

اس دَور کی ممتاز لکھنے والیوں میں نذر سجاد حیدر بھی ہیں۔ انھوں نے چار ناول اور بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ انکا پہلا ناول "اختر النساء" دوشیزگی کے زمانہ کا ہے۔ قصّہ پیچیدہ ہونے کے باوجود کردار نگاری بہترین ہے مصنف کے ناولوں میں انکے ذاتی تاثرات کے عکس نے حسن اور شدّت پیدا کردی ہے۔ انکے بہترین ناول نامکمل رہ گئے ——— "اُس نے کیا کیا" اور "مزدور امیرزادی" اگر مکمل ہو گئے ہوتے تو اُردو میں اِن دونوں کا شمار بہترین ناولوں میں ہوتا ——— !

عباسی بیگم بھی اس دَور میں ممتاز ہیں "زہرہ بیگم" انکا مکمل ناول ہے۔ آخر کے چند باب اچھی صفات کے حامل ہیں اسکے مقابلہ میں قصہ کا اٹھان اچھا نہیں ہے لیکن اس عیب سے کہانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس گروپ کی لکھنے والیوں میں ولیدہ افضل علی کا ناول "گدڑی کا لعل" نہ صرف کردار نگاری کے اعتبار سے بلکہ اس اعتبار سے بھی کامیاب ہے کہ اس میں متوسط طبقہ اور دیہات کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔

حالانکہ اس دَور کی ناول نویس اور افسانہ نگار خواتین نے دیہی ماحول اور متوسط طبقہ کی زندگی کو نظر انداز کرکے اپنی کہانیوں میں طبقۂ اعلیٰ کو جگہ دی ہے۔

اِس کے علاوہ جن خواتین نے اچھے افسانے لکھے ہیں اکثر انکا ادبی درجہ بلند نہیں ہے لیکن سادگی اور طرز کی وجہ سے خوب ہیں۔ بہرحال ان میں وہ صفات موجود نہیں ہیں جو سرشار کے تخیل پرستوں میں ہیں۔ لیکن محمدی بیگم کا ناول "روشنک بیگم" فسانۂ آزاد سے ملتا جلتا ہے اسکا پلاٹ اور کردار بھی فسانۂ آزاد کی طرح ہیں اور گھریلو زندگی کو بھی کافی نمایاں کیا گیا ہے۔ "ہمایوں فر" کو دوسرا آزاد کہا جاسکتا ہے۔ بہادری کے بجائے ہمایوں فر سماج میں کافی مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ روشنک کا کردار اختر اور زہرہ اور اس دور کے ناولوں کی ہیروئن سے ملتا جلتا ہے ——— روشنک میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو اس زمانہ کی خواتین میں ہونی چاہئیں۔

ناول "شوکت آرا بیگم" کا طرزِ تحریر نہایت شگفتہ ہے۔ اور کردار نگاری میں پورا زورِ قلم صرف کیا گیا ہے۔ اس کے کردار صرف کتابی نہیں ہیں بلکہ ہم سے قریب یعنی ہمارے جانے پہچانے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُردو ناولوں میں ستارہ دری (شوکت آرا بیگم کی ہیروئن) کا کردار کامیاب ترین کہا جاسکتا ہے۔ وہ اتنی ہی نیک اور وفادار ہے۔ جتنا ایک انسان پسند کرسکتا ہے۔ اور اس ناول میں سرمدی کی ذہانت کا مظاہرہ گویا کتاب کی جان ہے۔

افسانے ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۲۵ء تک (جو ان ناولوں کی اشاعت کا بھی دَور ہے) بہت سے اچھے افسانے بھی شائع ہوئے۔ ان میں سے نذر سجاد حیدر اور عباسی بیگم کامیاب افسانہ نگار ہیں اسکے علاوہ "تہذیبِ نسواں"، "عصمت" "مخزن" اور "تمدن" میں کئی اچھی لکھنے والیوں کے افسانے شائع ہوئے۔

لیکن ان کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ سب سے پہلے خاتون اکرم کے افسانے "گلستانِ خاتون" کے نام سے شائع ہوئے۔ انکے اس مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔ انکا طرزِ تحریر پریم چند اور (علامہ) راشد الخیری سے ملتا جلتا ہے۔ اگر وہ زندہ رہتیں تو آج انکا شمار بہترین اور کامیاب لکھنے والیوں میں ہوتا۔ "گلستانِ خاتون" کے بعد خواتین افسانہ نگاروں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔

موجودہ دَور کی مشہور لکھنے والیوں میں حجاب اسمٰعیل۔ رشیدہ ظفر اور عصمت چغتائی ہیں۔ حجاب اور رشیدہ ظفر کا طرزِ تحریر ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن عصمت چغتائی کا طرزِ تحریر بعض حالات میں حجاب سے اور افسانوی طرز یا کہانی کے اعتبار سے رشیدہ ظفر سے ملتا جلتا ہے۔

اگرچہ رشیدہ ظفر کا صرف ایک مجموعہ شائع ہوا ہے لیکن انکا شمار اُردو کی بہترین افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند ادیبہ ہیں جو حقیقتوں کے چہرے پر سے نقاب بلاتکلف اُٹھا دیتی ہیں۔

اگرچہ ترقی پسند ادیبوں میں سب کے یہاں یہ چیز مشترک ملیگی۔ رشیدہ ظفر کے یہاں اسکی شدت ہے۔

آرنلڈ بینٹ نے ناول نگاری کی تعریف یہ کی ہے کہ "وہ اپنے مشاہداتی تاثرات کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے"۔ اس اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بلاتکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خواتین کامیاب ناول نویس ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انکے کردار معیاری ہوں، ان میں بعض اصولی غلطیاں ہوں لیکن یہ چیز صاف ہے کہ وہ صنفِ مخالف کی ناانصافیوں سے بیحد متاثر ہیں وہ متفقہ طور پر سماج کی زیادتیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ مثلاً یہ کہ روپیہ کی خاطر خاندانوں کی خاطر شادیاں نہ کی جائیں۔ یہ کہ پہلے سے شادی کے متعلق زوجین کی رائے معلوم کر لی جائے۔ وہ یہ چاہتی ہیں کہ انکو اور زیادہ آزادی ملے۔ تعلیم و تربیت کے بہتر مواقع میسر ہوں۔ حاصلِ کلام یہ کہ وہ مردوں کے برابر حقوق چاہتی ہیں ———!

(از شائستہ اختر سہروردی)

مترجمہ
فریدہ انصاری بھوپالی

نذرِ اعجاز[1]

تھی یہ معراج آشنائی کی
مجھ پہ تہمت ہے نارسائی کی!

شوق، اور غمِ شکستہ پائی کا
عشق، اور فکر جگ ہنسائی کی!

میرے دم سے قفس میں رونق ہے
کیا کروں کوششیں رہائی کی

گونج اُٹھی ہر طرف مری آواز
آپ نے جب بھی ہمنوائی کی

دن اگر کٹ گیا جدائی کا
شب بھی کٹ جائیگی جدائی کی

ہم نے فرقِ نیاز خم کر کے
لاج رکھ لی تری خدائی کی

عصمتِ حسن! تو ہی کر انصاف
ہم نے کس در پہ جبہ سائی کی؟

ہے مجھی سے یہ بندوبستِ چمن؟
میں کروں کوششیں رہائی کی؟

جب میں خود ہی عزیزِ منزل ہوں
مجھے کیا فکر نارسائی کی

اک سیہ داغ وہ بھی بارِ جبیں
اچھی قیمت ہے جبہ سائی کی!

کیا کہوں کس طرح گذاری ہے
"اک گھڑی آپ کی جدائی کی"

چھو لیا ہے ترے ستاروں کو!
ہم نے جب شوق آزمائی کی

اک تماشا بنا لیا خود کو
کوئی حد بھی ہو خودنمائی کی!

پیس کر رکھدیا دو عالم کو
تم نے جس ڈھنگ سے خدائی کی

جس کو سمجھے ہوئے ہو نقشِ نگوں
وہ ہے تصویر بے نوائی کی

اپنے ہی سوزِ غم سے جل بجھئے
یہ بھی ترکیب ہے رہائی کی

تجھ کو کیا ہو گیا تھا جانِ اثر[2]
لاکھ دنیا نے بے وفائی کی

فضل الدین اثر ایم۔ اے

---

[1] اعجاز صاحب نے غالباً میر کی غزل دیکھکر اس زمین میں غزل کہی تھی اس لئے "نذرِ میر" کے عنوان سے پیش کیا۔ میں نے یہ غزل اعجاز صاحب کی غزل دیکھکر کہی ہے اس لئے "نذرِ اعجاز" کہنا ہی مناسب ہے۔ اثر

[2] اثر صاحب گو ابھی شفاخانے میں زیرِ علاج ہیں مگر نسبتاً اُنکی طبیعت بفضلہٖ اب اچھی اور رُوبصحت ہے اور بقول اُن کے اچھا ہونے یا اچھا ہو سکنے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ شعر کہنے کی کوشش کر سکتے ہیں ——— اعجاز

"وحدۃ الوجود اور وحدۃ الموجود"

دسمبر ۴۳ء کے "شاعر" میں جناب مولانا مخفی القادری کے شائع کردہ مخطوط بعنوان "کراچی سے اعظم گڈھ تک" میں نے بھی پڑھے اس سے قبل بھی موصوف کے متعدد علمی و تحقیقی مضامین سے مستفیض و محظوظ ہو چکا ہوں مگر اس مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی کے چند جملوں نے کچھ شبہات پیدا کر دیئے جنکا اظہار ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے۔ اُمید کرتا ہوں کہ حضرت علامہ (جنکو میں اپنے اساتذہ کے برابر سمجھتا ہوں) اس جرارت کو طلب تحقیق پر مبنی فرماتے ہوئے رہبری فرمائیں گے۔

حضرت علامہ فرماتے ہیں:—

"مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الموجود دو چیزیں ہیں۔ عامہ صوفیہ ان دونوں مسئلوں میں فرق نہیں کرتے لیکن محققین اس بارے میں پورا امتیاز کرتے ہیں۔ مسلمان صوفیہ نے وحدۃ الوجود کو مانا ہے وحدۃ الموجود کو نہیں .... بہر حال میرے نزدیک تو وحدۃ الوجود ایک حال ہے........"

اس بارے میں قابلِ تحقیق یہ امور ہیں کہ کن محققین نے وحدۃ الوجود کو نہیں مانا ہے کیونکہ تمام صوفیہ ہر زمانے میں لاموجود الا اللہ کے داعی رہے ہیں سرًّا او جہرًا۔ التصوف شرك لانه صيانة القلب عن روية الغير ولا غير"

عارفِ شبلی رحمۃ اللہ علیہ (کشف المحجوب)

وان جميع الموجودات من حيث الوجود عين الحق سبحانه وتعالىٰ

صاحب تحفہ مرسلہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال (الله تعالىٰ) يا غوث الاعظم جسم الانسان وقلبه ونفسه وروحه وسمعه لسانه ويده ورجله وكل ذلك ظهرت له بنفسي لنفسي لا هو الّا انا ولا انا غيره۔

شرح کلام ربانی با سید محی الدین جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سبحان من خلق الاشياء وهو عينها شیخ اکبر رح

یہ اور اس قسم کے بے شمار اقوال و اشعار سنائی۔ رومی۔ نظامی، عطار جامی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم کے جو کثرت شہرت کے سبب محتاج بیان نہیں۔ خود مسلک حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ) کے شیخ ہیں لاموجود الا اللہ تھا ملاحظہ ہو مکتوبات حضرت مجدد رح اس ضمن میں علامہ اقبال نے بھی خوب فرمایا ہے

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب | بخود مثل نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش | ز لاموجود الا اللہ دریاب

(ارمغانِ حجاز)

حقیقت میں اصل مسئلہ او متقدمین اولیا و انبیا کا مسلک لاموجود الا اللہ ہی تھا جب اسلام میں فلسفیانہ مباحث داخل ہوئے۔ شرعی علوم بھی یونانی اصطلاحوں میں بیان کئے جانے لگے تو وجود کی بحثیں معرضِ وجود میں آئیں اور وحدۃ الوجود کا نظریہ رائج ہوا۔ اور اگر محققین سے مراد کوئی اور صوفیہ ہیں تو با ادب درخواست ہے کہ انکے اسما اور اقوال سے مستفید فرمایا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ محققین سے مراد حضرت مجدد الف ثانیؒ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ تو وحدۃ الوجود ہی کے قائل نہیں ہیں۔ اُن پر یہ جملہ کس طرح صادق آسکتا ہے کہ "مسلمان صوفیوں نے وحدۃ الوجود کو مانا ہے، وحدۃ الموجود کو نہیں"۔ البتہ مجدد صاحبؒ وحدۃ الوجود کو حال کہنے والے سب سے پہلے بزرگ ہیں اور غالباً اسی بنا پر ان کو مجددیت کا دعویٰ سزاوار مانا گیا ہے۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت مجدد صاحب نے شریعت محمدیؐ میں کوئی تجدید نہیں فرمائی یا کم سے کم کوئی تجدید معلوم و مشہور نہیں ہے۔ یہ مبحث ایک جداگانہ شے ہے کہ آیا وحدۃ الوجود فی الواقع حال ہے یا حقیقت۔ اتنا عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اگر یہ حال خلافِ حقیقت ہو تو اسکے حاصل کرنے کے لئے مجاہدات و ریاضات ایک بے معنی سی چیز ہو جاتی ہے۔ آخر اس فریب میں مبتلا ہونکی ضرورت ہی کیا ہے۔ اللهم ارنا حقائق الاشياء كما هي۔

یہ چند شکوک تھے جنکا رفع کرنا ضروری تھا اور مجھے امید ہے کہ حضرت علامہ کی توجہ سے رفع ہو جائینگے۔

لیکن اس ضمن میں بہت سے ایسے حضرات بھی محاکمہ کرنے کی جرأت فرماتے رہتے ہیں جنکو علم و تحقیق سے کوئی حصہ بھی نہیں ملا۔ حالانکہ یہ مسئلہ اتنا عام فہم نہیں کہ ہر شخص اس پر رائے زنی کر سکے۔ جب تک اسکو پورے ما لہ و ما علیہ سے واقفیت نہ ہو۔ خود صوفیہ میں بھی مختلف فرقے ہیں اور یہ تفریق از روئے اعتقاد ہے۔ ان میں مشہور فرقے یہ ہیں۔ عدمیہ دہریہ خیالیہ۔ معتریہ۔ آدیہ۔ حلولیہ اتحادیہ۔ ملاحدہ۔ ملاحدۂ علیہ۔ عملیہ۔ طبعیہ۔ ظلیہ شہودیہ ———

تصوفِ اسلام ان سب فرقوں کو یکسال باہر سمجھتا ہے۔ سوائے صوفیۂ اہلِ نور کے کہ وہ "علی قدم النبی بدر الکمال" ہیں۔ اب جو شخص کہ یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں قول کس فرقے کا ہے اُسے کیا حق ہے کہ ہر قول کو عامۂ صوفیہ سے منسوب کرکے اعتراض کر دے یہی وجہ ہے کہ اکثر علمائے ظاہر کو مسلکِ تصوف کے بارے میں اشتباہات واقع ہوئے۔ بعض ظاہر بین علما نے بے دھڑک کہدیا کہ صوفیہ حلول و اتحاد کے قائل ہیں جزا و سزا اور شفاعت کے منکر ہیں۔ ان لوگوں سے زیادہ قابلِ افسوس حالت انکے مقلدین کی ہے کہ جو انکے رسالے سامنے رکھکر مضمون نگار بن جاتے ہیں نہ اُن کے پیشواؤں نے مسلکِ تصوف کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ یہ کرتے ہیں۔ اس موضوع پر اُردو لٹریچر اتنا ناکافی ہے کہ اس سے پڑھنے والے کو فن اور مصنف کے علاوہ خود اپنے متعلق بھی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض وقت ذمہ دار حضرات سے بھی فرو گذاشتیں ہو جاتی ہیں۔ حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادی جیسا فاضل بھی جب تصوفِ اسلام پر کتاب لکھتا ہے تو اسکو بجائے کتاب کے ہم کتابوں کی فہرست یا زیادہ سے زیادہ کتابوں پر تبصرہ کہہ سکتے ہیں۔ جس میں تمام مسائل کا اجمالی ذکر آجاتا ہے۔ سوائے "توحید" کے جیسے کوئی قرآن کے تمام مسائل بیان کر دے اور لا الٰہ الا اللہ کو چھوڑ جائے۔

بعض حضرات کو علاوہ اور اتہام کے تصوف میں یہ سقم بھی نظر آتا ہے کہ اسکا سلسلۂ سند منقطع ہے کیونکہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا سماع اُن کے نزدیک جنابِ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے ثابت نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے معترضین خود تحقیق کی تکلیف نہیں کرتے ورنہ انھیں معلوم ہو جاتا کہ جس شخص نے یہ اعتراض کیا تھا اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ یہ مسئلہ اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے بھی طے ہو چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو القول المستحسن فی فخر الحسن) اسکے علاوہ یہ بھی معلوم کرنے کی بات تھی کہ سلسلۂ صوفیہ کی سند صرف حضرت خواجہ حسن بصریؒ ہی سے نہیں ہے اسکے علاوہ اور بھی اسناد ہیں ان پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میرا قصد اس بارے میں زیادہ تفصیل سے گزارش کرنے کا ہے لیکن میری خواہش ہے کہ اولاً تمام اعتراضات کو جمع کر لیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ اس بارے میں دوسرے حضرات میری امداد فرمائیں گے خصوصاً معترض صاحبان۔ اس وقت میری نظر میں محدودے چند مضامین ہیں جن میں سے قابلِ ذکر ایک مضمون وحدۃ الوجود کے خلاف مولانا عبد السلام ندوی کا ہے جو کسی زمانے میں رسالہ صوفی میں شائع ہوا تھا اور دوسرا پروفیسر ضیا احمد صاحب بدایونی کا جو رسالہ معنف علی گڈھ میں شائع ہوا ہے۔ جن کے متعلق ان شاء اللہ آئندہ کسی صحبت میں کچھ عرض کرونگا۔

میکش اکبر آبادی

———— • (؛؛) • ————

ای غلاموں کے غلام بے شعور

(ایک بحث کا نتیجہ)

فلک پہ ہے مرے ذوقِ نظر کی کار فرمائی — سمجھتا ہوں ستاروں کی فرارِ برق پیمائی
مری ہستی کا مقصد ہے خدادانی، خودآگاہی — تری ہستی ازل سے رہنِ دردِ ناشکیبائی
جنوں کیا ہے؟ گلیم بوذری فقرِ سلیمانی — مبارک ہو خرد کو خلعتِ کسریٰ و دارائی
عروسِ قدس کو ہر شے میں پنہاں دیکھ لیتا ہوں — بہت پیچھے ہے مجھ سے سر حدِ ادراک و دانائی
اگر تو اپنے سینے میں دلِ خود بیں نہیں رکھتا — قیامت تک نہ ٹوٹے گا طلسمِ بزم و تنہائی
ابھی واقف نہیں تو عصرِ حاضر کے سلاسل سے — ہلاکِ شاہدِ رعنا قتیلِ جامِ مینائی
کوئی اندازہ کر سکتا ہے میری فہم و دانش کا — چمن میں پا رہا ہوں نکہتِ گلہائے صحرائی
سکونِ بزمِ امکاں منحصر ہے رزمِ ہستی پر — اُدھر طوفاں رُکا۔ ڈوبی ہوئی کشتی اُبھر آئی
مرے افکار ہیں محرم رموزِ سوز و مستی سے — شبِ غم کی طوالت پر ہے تیری خامہ فرسائی
بدل ڈالوں گا دُنیا کا نظامِ زنگ آلودہ — رہینگی کوششیں تا چند محرومِ پذیرائی!
جمالِ حُسن کیا ہے؟ امتزاجِ نور و نغمہ ہے — یہی شیخِ حرم ہے اور یہی سازِ کلیسائی
ثبوتِ زندگی دیتا ہے ہر قطرہ سمندر کا — مگر —— موجِ فرد رفتہ جو ساحل سے ٹکرائی
نسیمِ صبحگاہی پھول پتوں کو نوازے گی — دلِ ہر خار میں بجتی ہے گو فطرت کی شہنائی

"غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں" (علامہ اقبال)

افسر احمد نگری

انگریزی کا ایک بدقسمت شاعر — "بائرن"

جوانی اور موت! ـــــ دونوں لفظ کتنے سنگین ہیں؟ اور اگر دونوں مل جائیں تو ـــــ کیا ہوجاتا ہے؟ زندگیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔ خاندان برباد ہوجاتے ہیں اور سوسائٹی نیست و نابود ہوجاتی ہے اسکا پورا پورا مظاہرہ انگریزی کے مشہور شاعر بائرن کی جوانمرگی میں نظر آتا ہے۔ اُس نے بھرپور جوانی میں دم توڑ دیا۔ اُسکی موت پر تاریخ ادب ہمیشہ سوگوار رہے گی اور انگلستان بھی ہمیشہ ملول رہیگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسکی شاعرانہ عظمت اور شخصی وقار کے لئے رنج و الم ناکافی ہے

بائرن کی شخصیت بڑی عجیب کہی جاسکتی ہے شاعرانہ روایات کے خلاف وہ ایک امیر خاندان کا فرد تھا اور اس لئے امارت سے پیدا ہونے والی بہت سی برائیاں اس میں موجود تھیں۔ اسکا دادا "ایڈمرل جان بائرن" یورپ کے سمندروں کو کھنگالے پڑا تھا۔ اسکا باپ بھی فوجی کپتان تھا۔ عشرت پسندوں کے لئے روپیہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیتھرائن گورڈن سے شادی رچائی۔ وہ خوبصورت نہ تھی لیکن ایک بہت بڑی جائداد کی مالک ضرور تھی اور شادی کا مقصد محض اسکی دولت لوٹنا تھا۔ اُسے برباد کرکے وہ یورپ چلاگیا اور غریب ماں کو معصوم بچوں کی ـــــ جن میں بائرن بھی شامل تھا پرورش کرنا پڑی۔ تین سال کا ننھا بائرن شاید اپنے باپ کی صورت بھی ذہن میں محفوظ نہ رکھ سکا لیکن ماں کا سایہ عرصہ تک سر پر قائم رہا۔ اُسکی ماں ایک مغرور، بے خوف، جلد باز، خود سر اور خبطی عورت مشہور تھی۔ ایک وقت تو وہ بائرن کو سینے سے لگا لیتی اور دوسرے وقت اسے رسیوں سے باندھ کر پٹک دیتی۔ یہ تھا وہ عجیب ماحول جس میں بائرن نے آنکھ کھولی۔ بہت جلد دادا کے شوقِ سیر و سیاحت، باپ کے لاابالی پن اور ماں کے غرور و بے خوفی اور جلد بازی نے اُس کی طبیعت میں جگہ پالی

وہ ۲۲ جنوری ۱۷۸۸ء کو پیدا ہوا اور ۱۷۹۲ء میں اسکے باپ کی موت کی خبر بھی آگئی۔ غالباً تنگ حالی نے اُسے خودکشی پر مجبور کردیا تھا بائرن جب سمجھدار ہوا تو اُس نے اپنے گھر میں دو عورتیں دیکھیں ایک اپنی ماں اور ایک سوتیلی بہن اگسٹا جو پہلی بیوی سے تھی اگسٹا سے بائرن کو والہانہ محبت تھی اور وہ شاید دنیا میں اُسی کو اپنا ہمدرد سمجھتا تھا۔ سات سال کی عمر تک ماں کے پاس رہنے کے بعد وہ ابرڈین کے گرامر اسکول میں داخل ہوگیا۔ یہاں اُس نے اپنی ابتدائی تعلیم کے مدارج طے کئے۔

بہیں اُسکے ساتھیوں کو محسوس ہونے لگا کہ وہ عجیب و غریب فطرت کا انسان ہے۔ کبھی کبھی وہ سست اور رنجیدہ معلوم ہونے لگتا لیکن اُس کے فوراً ہی بعد لوگ دیکھتے کہ وہ ہر کام میں نہایت چستی اور سرگرمی سے حصہ لے رہا ہے۔ اُسے ہنگامی چیزوں سے شروع ہی سے دلچسپی تھی ایک دفعہ اسکول میں جب لڑکوں نے غدر کیا تو بائرن اُن پرجوش باغیوں کا سرگروہ بنا رہا۔ ابتدائے عمر ہی میں بائرن کو ایک سنہری موقع حاصل ہوگیا ۱۷۹۸ء میں اُسکے تایا کا انتقال ہوگیا اور بائرن بلاشرکت غیرے اسکی جائداد اور خطاب کا مالک قرار پایا۔ اب وہ جارج گورڈن نو۔ ال لارڈ بائرن ہوچکا تھا۔

چہرہ مہرہ کے اعتبار سے اُسے جوانِ رعنا کہا جاسکتا ہے، بڑے بڑے سنہری بال اُسکے خوبصورت چہرے پر بکھرے رہتے اور خوبصورت پلکوں میں سے جذبات سے بھری ہوئی آنکھیں بے قرار دکھائی دیتی تھیں۔ ہونٹوں میں ایک عجیب دلفریبی اور رس بھرا ہوا تھا۔ اسکی شخصیت میں عجیب کشش تھی۔ لیکن اُسکی طبیعت میں ایک عجیب قسم کی وحشت اور نزاکت بھی تھی۔ بائرن کے پیر میں پیدائشی لنگ تھا۔ جسکا اُسے خیال رہتا تھا اور اسی نقص کی وجہ سے اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ اُسکا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

اسکول میں اُس نے الف لیلیٰ کی داستانوں میں وقت گذارا۔ یہاں سے وہ ہارو کے مقام پر بھیجدیا گیا۔ ہارو کا قیام بائرن کی زندگی کا اہم باب ہے۔ یہیں اُس نے اپنے رشتے کی بہن میری چاورتھ سے محبت کی اور یہیں اسکو محبت میں سخت ناکامی کا پہلا تجربہ ہوا۔ ایک سال پوری گرمی کی چھٹیاں میری کے ساتھ گذاریں اور اپنے سنہرے مستقبل کے متعلق ہوائی قلعے بناتا رہا۔ وہ اُسے "ستارہ صبح" کے نام سے پکارا کرتا تھا لیکن دوسری گرمیوں میں جب اُسکی ملاقات میری سے ہوئی تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ عہدِ محبت ایک رنگین خواب سے۔ زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ـــــ اب میری کی شادی ہوچکی تھی ـــــ بائرن کی یہ پہلی ناکامی تھی ـــــ؟

ہارو کی دلچسپیوں کو خیرباد کہکر بائرن کیمبرج یونیورسٹی پہونچا۔ یہاں اُس نے کیمبرج یونیورسٹی کی وسیع لائبریری سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ یہیں کے زمانۂ قیام میں اس نوجوان شاعر نے اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ "آورس آف آئلڈل نس" (فرصت کے لمحے) چھپوایا اور بڑے شوق سے اپنے دوستوں میں ایک چھوٹی سی کتاب کو تقسیم کیا

کتاب کی ہر نظم سے نوشتقی ظاہر تھی اور ادبی حیثیت سے وہ قطعاً ناقابل توجہ گجانی جاتی لیکن چونکہ یہ ایک لارڈ کی تصنیف تھی اس لئے اس پر طرح طرح سے پیشگوئیاں کی گئیں یہاں تک کہ "ایڈنبرگ ریویو" نامی رسالے میں اس تصنیف پر سخت نکتہ چینیاں کی گئیں۔ بائرن کی سخت گیر طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکی اور جلد ہی لوگوں کے سامنے ایک نئی تصنیف آگئی جسکا نام "انگلش بارڈس اینڈ اسکاٹ ریوارس" (انگریزی شعراء اور اسکاٹ تبصرہ نگار) تھا۔ یہ ایک عجیب ہجو تھی جس میں اس زمانے کے قریباً ہر مصنف پر سخت چوٹیں کی گئی تھیں۔ یہانتک کہ سر والٹر اسکاٹ کو بھی نہ چھوڑا تھا۔ کتاب پر مصنف کا نام نہ تھا لیکن دُنیا نے جان لیا کہ یہ کس کی حرکت ہے ؟ بائرن محبت کا بھوکا تھا۔ میری چاورتھ سے محبت کرنے کا خشر دیکھنے کے بعد اُس نے اپنی ایک رشتہ دار لڑکی مارگریٹ پارکر سے پھر محبت کی۔ اُسکی پرشباب نظموں کا مرکز یہی لڑکی تھی بائرن اسکے متعلق کہا کرتا تھا "وہ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے قوس قزح سے بنی ہے اور جسکی ساری دلکشی اور رنگ اسی میں موجود ہے"!

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ذوقِ سیر و سفر نے انگڑائی لی۔ ۱۸۰۹ء میں بائرن نے دو سال کے لئے انگلستان کے ساحل کو خیرباد کہا۔ وہ یورپ کے قریب قریب ہر ملک میں گھوما کبھی اُس نے شور و غل سے بھرے ہوئے شہروں میں وقت گذارا تو کبھی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ کیا، کبھی یورپ کے عظیم الشان دریاؤں میں نہایا تو کبھی یونان کے کھنڈروں کی سیر کی۔ شوقِ سیاحت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یورپ سے اُس نے ماں کو لکھا "ہم لوگوں میں ایک ایسا قانون ہونا چاہئے کہ جوانوں کو کچھ عرصہ باہر گذارنے دیا جائے"! دورانِ سفر میں اُس نے اپنے مشہور عالم سفرنامہ کو لکھنا شروع کیا جسے سفر کے بعد بھی لکھتا رہا۔ ۱۸۱۲ء میں انگلستان واپس آنے کے بعد اس سفرنامے "چائلڈ ہیرالڈ پلگریمج" کے دو حصے طبع ہوئے۔ اس کتاب نے اُس کی شہرت میں پر لگا دیئے۔ ملک کے ہر ہر حصے سے تحسین و آفرین کی صدائیں آنے لگیں۔ تمام لندن میں بائرن اور صرف بائرن کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ہزاروں آدمی اس سے ملنے کی تمنا کرتے۔ اکثر اسکے گھر میں اپنے وزٹنگ کارڈ چھوڑ جاتے۔ اس کے گھر کے سامنے گھوڑے گاڑیوں کی اتنی کثرت ہونے لگی کہ راستہ چلنے والوں کو دشواری ہوتی تھی۔ اتنی کمسنی میں شاید دنیا کے کسی شاعر کو اتنی شہرت نصیب نہیں ہوئی "چائلڈ ہیرالڈ" کی اشاعت اور شہرت کے متعلق اُس نے خود کہا ہے کہ "ایک صبح کو جب میں بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپ کو دنیا میں مشہور پایا"۔ سفرنامے کے بعد اُس نے یکے بعد دیگرے منظومات کی جلدیں کی جلدیں لکھ ڈالیں۔ ہر تصنیف پر اسکی شہرت زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہانتک کہ نتیجۃً وہ یورپ کا سب سے بڑا شاعر کہا جانے لگا۔

فطرت بائرن کی بے پناہ شہرت کو دیکھ رہی تھی، کار کنانِ قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ اسکی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی اور اُسے معلوم ہونے لگا۔ جیسے یکایک روشنی میں سے اندھیرے میں پھینک دیا گیا ہو۔ جہاں کی ہر چیز تاریک ہے۔ ۲۰ جنوری ۱۸۱۲ء کو اسکی شادی لیڈی بائرن سے ہوگئی۔ ایک سال تک ازدواجی زندگی قائم رہی لیکن اُس کے بعد ——— لیڈی بائرن اپنے گھر چلی گئی۔ جہاں سے وہ بائرن کے گھر کبھی واپس نہ آئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بائرن کی بدمزاجی اس تلخ انجام کی ذمہ دار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بائرن کی طرف سے اس اختلاف کی کبھی کوئی واضح تشریح نہیں کی گئی۔ غالباً یہ زیادہ صحیح لکھا گیا ہے کہ بائرن نے بالکل اس طرح شادی کر ڈالی جیسے کوئی نیند میں چل رہا ہو۔ وہ ایک .... کی طرح کانپا۔ غلط راہ اختیار کی اور نتیجہ پہلے دن ہی اُسے اپنی ناممکن المفتوح غلطی کا احساس ہوگیا۔ لیکن اُس کے مخالفین نے اسکی خاموشی سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ذاتی عداوتوں اور معاصرانہ چشمکوں کے پردے میں غلط بیانیوں کا ایک طومار کھڑا کر دیا گیا۔ نام نہاد مہذب سوسائٹی نے خاموش بائرن کے اخلاق کو ذاتیات کی عینک سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اٹھارہویں صدی کا یورپ کا بہترین شاعر انیسویں صدی کا بدترین شاعر کہا جانے لگا۔ وہ جس وقت باہر نکلتا لوگوں کی حقارت اور نفرت سے بھری ہوئی نگاہیں اسکا پیچھا کرتیں دکانوں اور ہوٹلوں سے اسکی طرف اشارے کئے جاتے۔ تھیٹر میں پاس بیٹھے ہوئے شریف صورت عیاش اسکی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھتے اور پارلیمنٹ کے وسیع ایوانِ امراء میں اسکی ذات پر حملے کئے جاتے۔

بائرن بے حس نہیں تھا، وہ جانتا تھا کہ اس مخالفت کی تہ میں کون سا رکیک جذبہ کارفرما ہے۔ اُس کے دل میں چوٹ لگی تھی۔ وہ چیخ اُٹھا "میں اس سے واقف نہیں ہوں کہ کس بنیاد پر عوام نے میرے متعلق ایسی رائے قائم کی ہے۔ لیکن پھر بھی ہر جگہ میرے متعلق عوام محض اتنا جانتے ہیں کہ میں نے نظمیں لکھیں تھیں۔ میں ایک شریف آدمی تھا۔ پھر میری شادی ہوئی۔ باپ ہوا اور اسکے بعد میرے تعلقات بیوی اور اُس کے رشتہ داروں سے کشیدہ ہوگئے۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ وجہ یہ ہے کہ مدعی و مدعا علیہ نے (میں اور میری بیوی) کسی قسم کی مزید وضاحت سے انکار کر دیا ——— دریدہ دہن اخبار اس قسم کی باتوں کی راہ تک رہے تھے۔ اس لئے میرے نام کو ——— آج داغ آلودہ کر دیا گیا ہے"۔ بائرن کے چال چلن کے متعلق افواہوں میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گیا۔ بائرن کا اس تعفن آمیز فضا میں دم گھٹنے لگا اور اس سال اُس نے انگلستان کو یہ کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے

چھوڑ دیا کہ "میرے متعلق اگر یہ تمام افواہیں صحیح ہیں تو میں انگلستان میں رہنے کے قابل نہیں ہوں اور اگر یہ غلط ہیں تو انگلستان میرے رہنے کے قابل نہیں ہے"

انگلستان کو چھوڑ کر اُس نے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے مرغزاروں میں پناہ لی۔ اسکا دل ٹوٹا ہوا تھا جسکی تسکین کے لئے ہمدرد نظروں کی ضرورت تھی سوئٹزرلینڈ کی وادیوں میں اسے ایک مخلص دوست مل گیا۔ یہ انگریزی کا ایک بڑا شاعر ——— شیلے تھا۔ دو دیوانے سوئٹزرلینڈ کی خوبصورت جھیلوں کی سیر سے دل بہلاتے رہے۔ شیلے اُن چند خوش قسمت ہستیوں میں سے تھا جن کی بائرن دل سے عزت کرتا تھا۔ اگرچہ شیلے کی باتوں نے بائرن کے دل کی ڈھارس بندھائی لیکن شیلے زمانے کو جہد تک نکلتا تھا ساحل سمندر پر بھی دشمنوں نے پیچھا نہ چھوڑا اور یہاں بھی بائرن کو چین نہ مل سکا۔ خود بائرن کے الفاظ میں "کوئی بدترین داستان نہیں ہے جو انھوں نے (مخالفوں نے) مجھ سے منسوب نہ کی ہو ——— جھیل کے دوسرے کنارے سے مجھے عینکوں کے ذریعہ سے دیکھا جاتا تھا ——— میں جب شام کو سیر کے لئے نکلتا تھا تو راہ میں طرح طرح سے چھیڑا جاتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ آدمی کی صورت میں مجھے ایک عفریت یا عجیب مخلوق سمجھتے تھے"

اب یونان کی جنگ آزادی شروع ہو چکی تھی۔ بائرن خود آزاد رہنا چاہتا تھا اور دوسروں کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ سرزمین یونان سے اسکو پہلے ہی قلبی محبت تھی۔ اب اس محبت کے عملی ثبوت کا وقت آگیا تھا۔ یونانیوں کی مدد کے لئے اُس نے دس ہزار پونڈ اپنی جیب سے دیئے اور عملی خدمت کے لئے یونان روانہ ہو گیا۔ اگرچہ یہاں اُس کو سولنگھی کے سپاہیوں کی کمان دیدی گئی لیکن میدان کی موت اس کی قسمت میں نہ تھی۔

۱۹ اپریل ۱۸۲۴ء کی سرد شام تھی۔ بارش تیزی سے ہو رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن ایک جانباز سوار تاریکی کو چیرتا ہوا تیزی سے اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ ساتھیوں نے اُسے بہت سمجھایا کہ بارش تھمنے تک وہ کہیں رُک جائے لیکن وہ نہ مانا۔ آخرکار پانی سے تر اور گھر پہنچا یہاں آکر بائرن کو معلوم ہوا کہ اس پر سردی نے پورا اثر جما لیا ہے جسکے نتیجے میں اُسے بخار بھی چڑھ آیا۔ بخار برابر بڑھتا رہا اور بائرن کی حالت نازک سے نازک تر ہونے لگی۔ دس دن تک اُس کی بُری حالت رہی۔ دسویں دن بائرن کو اپنی موت کا پورا یقین ہو گیا۔ اب وہ کوئی دوا پینے کو تیار نہ تھا۔ لوگوں نے ڈاکٹر کو بلانا چاہا۔ لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ سب کے اصرار پر اس نے کہدیا "اچھا! اگر تم ڈاکٹروں کو بلانا ہی چاہتے ہو تو بلاؤ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مجھ سے نہ بولیں"

ڈاکٹر آئے۔ اُسے دیکھا اور اُس سے کچھ دریافت کرنا چاہا۔ لیکن ضدی شاعر فوراً چیخ اٹھا کہ "اپنا دم دو یاد کیجئے اور یہاں سے چلے جائیے"

تیماردار بھی مایوس ہو چکے تھے۔ ایک تیماردار نے آخری وصیت کے لئے قلم دوات لانے کے لئے پوچھا لیکن ———

"ارے نہیں" اُس نے کہا "اب وقت نہیں ہے۔ خاتمہ قریب ہے"۔ آخری وقت میں اُس نے اپنی پیاری بہن "آگسٹا" "لیڈی بائرن" اور اپنی معصوم بچی "ایڈا" کو یاد کیا۔

"میری بہن کے پاس جانا" وہ کہے جا رہا تھا "اُس سے کہنا ——— لیڈی بائرن کے پاس جانا ——— اُس سے ملنا اور کہنا کہ ———" یہاں آکر اُس کی آواز تھرتھرانے لگی اور آہستہ آہستہ اتنی کم ہو گئی کہ کچھ بھی نہ سنا جا سکا۔ وہ بیس منٹ تک برابر اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔

"اب میں تم کو سب کچھ بتا چکا ہوں" تب اس نے کہا۔

"مائی لارڈ ———" تیماردار نے کہا "میں سمجھ نہ سکا کہ آپ کیا فرما رہے تھے؟"

"تم نہیں سمجھے" لارڈ بائرن نے اُس کی طرف مایوس نگاہوں سے دیکھکر کہا "کیا کروں ——— لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب سارے جھگڑے ختم ہو چکے ———"

اس کے بعد اُس نے دو ایک باتیں اور کیں جنھیں سُنا نہ جا سکا۔ اُسکے آخری الفاظ یہ تھے ——— "میری بہن ——— آگسٹا ——— میری بچی ——— ایڈا ——— میں اپنی موت سے مطمئن ہوں"

یورپ کا نوابغ شاعر اور یونان کا سب سے بڑا ہمدرد رخصت ہو گیا۔

یونان کا بچہ بچہ بائرن کے غم میں اشکبار تھا۔ وہاں اکیس دن تک اُس کا غم منایا گیا۔ خوددار شاعر اپنی زندگی میں انگلستان نہ لوٹا لیکن اس کی لاش اُس کے وطن میں لائی گئی۔ تجویز تھی کہ اُسے "ویسٹ منسٹر ایبے" میں سپردِ خاک کیا جائے لیکن ——— اسکی روایتی بدنصیبی اب بھی اُس کے آڑے آئی۔ ویسٹ منسٹر کے ارباب بست و کشاد اُسے اس پاک زمین میں دو گز جگہ دینے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ آخرکار وہ اپنے آبائی قبر "نیو اسٹیڈ" میں دفن کر دیا گیا۔

بحیثیت انسان بائرن متضاد صفات کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ وہ جلد بازی غرور، غفلت شعاری اور بے لحاظی کے ساتھ ساتھ شفقت۔ عالی ہمتی، شجاعت اور خودداری جیسی صفات کا بھی حامل تھا۔ وہ بُری باتیں کر جاتا تھا۔ لیکن بُرا آدمی

دیتا تھا۔ بحیثیت شاعر بھی وہ ایک مرتبہ رکھتا ہے۔ مکالے۔ سروالٹر اسکاٹ شیلے اور گوئٹے جیسے ہیزان ادب نے اسکی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ شاعر پیدا ہوا تھا۔ اُسے فطرتِ انسانی کے اظہار و بیان پر زبردست قدرت تھی۔ وہ حیرت انگیز حافظے اور غیر معمولی قوتِ مشاہدہ کا مالک تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تخیل کا اُس کے یہاں فقدان ہے اور اس حیثیت سے وہ شیلے سے کہیں پیچھے ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی ہجو نگاروں کی صفِ اوّل میں اسکا شمار ہوتا ہے۔

وہ دولت۔ جاہ و ثروت اور شہرت و عزت کے لحاظ سے بدنصیب نہ تھا بلکہ اُسکی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ بے حس لوگوں کے درمیان ایک حساس دل رکھتا تھا۔ وہ اس لئے بدنصیب تھا کہ کسی کی محبت اُسے راس نہ آئی۔ وہ اس لئے بدنصیب تھا کہ دُنیا میں ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے بہرہ اندوز نہ ہو سکا۔ وہ اس لئے بدنصیب تھا کہ اُس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھائیوں کے ہاتھوں وہ اذیتیں اُٹھائیں جو ایک غیرت مند انسان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو سکتی ہیں۔ وہ اس لئے بدنصیب تھا کہ اُسے کہیں چین سے نہ رہنے دیا گیا اور وہ اس لئے بدنصیب تھا کہ اُس کے آخری وقت اُس کے سرہانے اُس کی شفیق بہن کی چشمِ پُرنم اور شریکِ زندگی کی اداس نگاہیں نہیں تھیں۔ وہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک قصبے میں پڑا ہوا تنہا موت کے بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ غرض دنیوی نعمتوں کے لحاظ سے وہ سخت بدنصیب تھا۔

بہرحال وہ ایک بڑا آدمی تھا۔

سید محمد منتظر رضوی اکبرآبادی

ارضِ تاج

اے ارضِ تاج اے مری ہستی کی تاجدار
اے ارضِ تاج عالمِ امکاں کی شاہکار

اے ارضِ تاج حاملِ کون و مکاں ہے
اے ارضِ تاج نازشِ فخر [illegible] ہے تو

اے ارضِ تاج تیرا جہاں میں نہیں جواب
ہر ذرہ تیری خاک کا ہے [illegible] آفتاب

اے ارضِ تاج راحتِ قلب و جگر ہے تو
اے ارضِ تاج جنتِ اہلِ نظر ہے تو

اے ارضِ تاج تو ہے زمانہ میں مشتہر
اے ارضِ تاج تو ہے سکونِ دل و جگر

اے ارضِ تاج ایک دُرِ بے بہا ہے تو
اے ارضِ تاج حاملِ ارض و سما ہے تو

اے ارضِ تاج یہ تری رفعت ترا علو
واللہ اوجِ سینۂ گیتی کا دل ہے تو

تو رہ چکی ہے مسکنِ شاہانِ مغلیہ
ابتک ہیں تجھ پہ مدفنِ شاہانِ مغلیہ

ہے دفن تیری خاک میں اکبر سا بادشاہ
کیا تاب ہے جو تجھ سے لائے کوئی نگاہ

ممتاز۔ رفیعِ شاہجہاں پیکرِ شباب
اے ارضِ تاج ہے ترے دامن میں محوِ خواب

ہے بے نیازِ دہر کے ہر شور و شین سے
ہے محوِ خواب شاہجہاں تجھ میں چین سے

وادی ہے تیری شوکتِ رفتہ کا آئینہ
ہر رُخ سے تو ہے عظمتِ رفتہ کا آئینہ

پہلو میں تیرے بہتی ہے جمنا بہ پیچ و تاب
کرتی ہے تجھ سے شوکت و عظمت کا اکتساب

کرتے ہیں فخر کون و مکاں تجھ پہ آجتک
ہے یادگارِ شاہِ جہاں تجھ پہ آجتک

ممنون تیرے فیض کی ابتک ہے شاعری
پیدا کئے ہیں تو نے بہت سے ادیب بھی

تجھکو وطن بنایا ہے غالب نے میر نے
کھولی ہیں تیری گود میں آنکھیں نظیر نے

اے ارضِ تاج تجھ میں ہیں پوشیدہ مہر و ماہ
ذرے ہیں تیری خاک کے عالم کی جلوہ گاہ

تو دورِ حاضرہ میں کسی سے نہیں ہے کم
سیماب جیسے آج بھی ہیں صاحبِ قلم

خالی شرارِ حکمت و دانش سے کب ہے تو
اے ارضِ تاج مرکزِ علم و ادب ہے تو

ہر خاص و عام کو ترا افسانہ یاد ہے
تاج البلاد ہے تو ہی تاج البلاد ہے

مضطر اکبرآبادی مدیر "پریم دیکلی" لاہور

اُردو زبان کا ایک انگریز محسن

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ انگریز تھے جو ہندوستان میں اکیس ۲۱ برس تک مقیم رہے اس عرصہ میں اُنھوں نے اُردو زبان کی ترقی کے لئے جو شاندار کام کیا۔ اُس کا تذکرہ زبانِ اُردو کی ارتقائی تاریخ کا ایک نہایت ہی دلچسپ باب ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس غیر ملکی باشندہ نے جو اُردو زبان کے وجود سے یہاں آکر آشنا ہوا۔ ایسا شاندار لٹریچر تیار کیا جو بلحاظ نوعیت و مقدار اس سے پہلے کسی ہندوستانی اہلِ قلم نے نہ تیار کیا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ اُردو نظم سے کچھ لگاؤ نہ رکھتا تھا اور اسی لئے اس کی تصنیفی کوششوں کے سلسلہ میں اس بات کا ذکر نہیں آتا کہ نظم اُردو کے ساتھ اسکا کیا تعلق تھا۔ لیکن اس بات کے تسلیم کرنے میں شک کی گنجائش نہیں پائی جاتی کہ اُردو نثر کی ترویج اور ترقی کے لحاظ سے اس کو وہی پایہ حاصل ہے جو نظم کی ترقی میں ولی کو۔

ڈاکٹر صاحب ۱۷۵۹ء میں بمقام اڈنبرا پیدا ہوئے تھے، وہیں کے ایک اسکول (جارج ہیرٹ) میں تکمیلِ تعلیم کی۔ اور ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر کے ہندوستان آگئے ان دنوں یہ رواج تھا کہ جن انگریزوں کو ہندوستان بھیجا جاتا تھا۔ اُنھیں ہندوستانیوں سے گفتگو کرنے کے لئے تھوڑی سی فارسی سکھائی جاتی تھی اور اس طرح وہ بجز فارسی دانوں کے اور کسی سے گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو جب یہ تکلیف پیش آئی تو اُنھوں نے سوچا کہ فارسی کے بجائے اگر انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھائی جائے تو اس سے انگریزوں کو ہندوستانیوں سے گفتگو کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی انھوں نے خالص ہندوستانی زبان سیکھنی شروع کی وہ مختلف علاقوں کا دورہ کرتے رہے اور مختلف سوسائٹیوں سے تعلق قائم کر کے بامحاورہ اور صاف ہندوستانی سیکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ دیکھکر اور بھی چند انگریزوں نے ان کی پیروی کی کہ اب وہ اُردو زبان بولنے اور سمجھنے کے اعتبار سے پورے ہندوستانی تھے وہ چاہتے تھے کہ اُن کی طرح باقی انگریز بھی یہ زبان سیکھیں۔ اس خیال کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے نہ صرف ایک منظم تحریک ہی کی ضرورت تھی بلکہ وقت روپیہ۔ اور محنت کی بھی۔ چنانچہ اس کام کی تکمیل کے لئے وہ ہر قربانی کے لئے تیار ہوگئے۔ ۱۷۸۵ء میں انھوں نے ذاتی طور پر معمولی طریقے سے یہ کام شروع کیا۔ جب کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر بھی ان کی تحریک کے حامی ہوگئے۔ تو اس وقت ایک عجیب دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ دقت تھی آسان اُردو نثر کی کتابوں کی تلاش۔ مگر اس سلسلے میں انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ اس لئے کہ اس وقت اُردو نثر کی آسان کتابیں مروج نہ تھیں اور جو مروج تھیں اُن کا اندازِ بیان اور موضوع کچھ اس درجہ غیر مانوس تھا کہ لکھنے والوں کے علاوہ دوسروں کو اجنبی چیز معلوم ہوتی تھی۔ فضلی کی وہ مجلس جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی تھی۔ میر تقی میر کی مثنوی شعلۂ عشق جسے میرزا رفیع سودا نے نثر میں بدلا تھا۔ غرض اس قسم کی چند کتابیں نثر میں پائی جاتی تھیں۔ ان کی نثر ایسی مشکل تھی کہ کوئی فارسی داں ہی انھیں سمجھ سکتا تھا۔ اُن کی عبارت مرصع۔ مسجع اور مقفیٰ وغیرہ اصناف سے مملو تھی۔ بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں نظم کا رواج زیادہ تھا۔ جو لوگ کسی خاص ضرورت یا مذاق میں تنوع پیدا کرنے کے لئے اُردو نثر لکھتے تھے اُن کی نثر میں بھی نظم کا رنگ چڑھ جاتا تھا۔ گویا نثر نگاری کا مذاق ہی پورے طور سے پیدا نہ ہوا تھا۔ اس لئے اس راہ میں چلنے والوں سے عجیب عجیب قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی تھیں جو اُس زمانہ میں غالباً علمی کارنامے سمجھے جاتے ہونگے مگر آج اُن کی اصلیت معلوم ہوتی ہے۔

بہرکیف ڈاکٹر صاحب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بھی خود ہی کمربستہ ہوگئے اور فیصلہ کیا کہ طلبائے اُردو کے لئے نثر کا لٹریچر تیار کرینگے۔ چنانچہ ۱۷۸۷ء میں سب سے پہلے انگریزی ہندوستانی لغت لکھنی شروع کی جو ۱۷۹۰ء میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد سلسلۂ تصانیف ۱۸۰۴ء تک جاری رہا اور اتنی مدت میں اُنھوں نے مندرجۂ ذیل لٹریچر تیار کیا

(۲) **ہندوستانی علم السان** جس کے شروع میں صرف و نحو کے متعلق ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔ (۳) **ہندوستانی کی صرف و نحو** ۱۷۹۶ء۔ کہتے ہیں میرانشا کی "دریائے لطافت" کے بعد اُردو صرف کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ (۴) **مشرقی زباندان**۔ اس کتاب میں ہندوستانی زبان کے متعلق ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔ اور انگریزی ہندوستانی کی لغت بھی ہے۔ یہ کتاب ۱۷۹۸ء میں مکمل ہوئی (۵) **فارسی فعل کا جدید نظریہ** بمعہ **ہندوستانی مترادفات**۔ یہ کتاب طلبا فارسی کے لئے ۱۸۰۱ء میں لکھی (۶) **ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہندوستانی**

کار اہم ۱۸۰۲ء آتالیق ہندی یہ بھی طلبائے فارسی کے لئے لکھی تھی ۱۸۰۳ء (۸) ہندی عربی آئینہ۔ اس کتاب میں عربی الفاظ کی مدد لیں ہیں۔ جن کا ہندوستانی زبان کے ساتھ تعلق ہے۔ ۱۸۰۴ء (۹) قصص مشرقی اس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں سے بعض نامکمل چھوڑ دی گئیں۔

جب ڈاکٹر صاحب نے ایسا عجیب و غریب لٹریچر تیار کرنا شروع کیا۔ تو اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُن کی قوم کے بہت سے لوگ تیار ہوگئے۔ لارڈ ولزلی نے گورنر جنرل مقرر ہونے پر اس اقدام کو بہت سراہا اور ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں انگریزوں کو اُردو پڑھانے اور اُردو پڑھنے والے انگریزوں کے لئے آسان زبان میں کتابیں تصنیف کرنے کے لئے ایک شاندار ادارہ قائم کیا گیا جسکا نام زبانِ اُردو کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج مشہور ہے۔ یہ کالج ڈاکٹر صاحب کے خواب کی تعبیر تھا اور اس سے اُن کے ایک عظیم الشان مقصد کی تکمیل ہوتی تھی۔ کالج کے قیام پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی قوم کے مستقبل پر ایک اعتبار سے فاتحانہ نگاہ ڈالی ہوگی۔ مگر انھیں کیا خبر تھی کہ یہ سب سامان عالم بے خبری میں اُردو زبان کی بہتری کے لئے ہو رہے تھے آج اگر وہ زندہ ہوتے تو انھیں یقیناً اس کا احساس ہوتا۔

۱۸۰۰ء میں کالج قائم ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لارڈ ولزلی کے ذریعہ بورڈ آف ڈائرکٹرز سے شعبہ تالیف کے اخراجات کے لئے کثیر رقم کی منظوری حاصل کر لی اور کالج کو چلانے نیز کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں مالی مشکلات کا مسئلہ کُلّی طور پر حل ہوگیا۔ اس کے بعد مشہور اہلِ قلم حضرات کو دعوتِ شرکت دی گئی۔ اس زمانہ میں سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دہلی کے اہلِ کمال ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے۔ بہت سے لوگ تو خود ہی کلکتہ پہنچ گئے اور معمولی وسیلے سے کالج کے ساتھ منسلک ہوگئے

اُردو نثر لٹریچر تیار کرنے والوں میں زیادہ تر مندرجہ ذیل حضرات کے نام مشہور ہیں (۱) سید حیدر بخش صاحب حیدری۔ جنھوں نے ایک فارسی قصہ کو اُردو میں ترجمہ کرکے آرائشِ محفل نام رکھا (۲) میرزا لطف علی لطف انھوں نے فارسی تذکرہ گلزارِ ابراہیم کا اُردو ترجمہ کرکے تذکرۂ گلشنِ ہند نام رکھا جسکی شہرت تعارف کی محتاج نہیں (۳) میر امن دہلوی جنھوں نے مشہور قصہ چہار درویش کو اُردو کا جامہ پہنا باغ و بہار نام رکھا (۴) میر بہادر علی حسینی جنھوں نے ایک فارسی کتاب مفرح القلوب کا اُردو زبان میں ترجمہ کرکے اخلاقِ ہندی نام رکھا (۵) میر شیر علی افسوس جنھوں نے شیخ سعدی شیرازیؒ کی کتاب گلستان کا اُردو ترجمہ کیا (۶) منشی بینی نرائن نے ہندوستانی شعراء کا منتخب کلام مرتب کیا۔ میرزا جان طپش نے اُردو محاورات پر ایک کتاب لکھی اور ۱۸۱۱ء میں بہارِ دانش کا کچھ منظوم ترجمہ کیا غرض ایسے باکمال لوگ جنکے جوہر ظاہر ہونے کے لئے کسی ایسی ہی تحریک کی ضرورت تھی۔ انگریزوں سے تنخواہ لے کر اپنی پیاری زبان کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ انگریز سمجھ رہے تھے کہ ہماری قوم کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ گویا اُردو کو فطرت کی طرف سے مدد مل رہی تھی۔ اور اُس کا خزانہ جواہرات سے مالا مال کیا جا رہا تھا۔

مصنفین۔ مؤلفین اور مترجمین کو ہدایت تھی کہ جو کچھ لکھیں وہ صاف۔ سلیس عام فہم اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے دلچسپ ہو۔ چنانچہ کالج کی زیر نگرانی جو کتابیں تیار ہوئیں ان میں یہ خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ زیادہ تر فارسی قصّوں کے تراجم کیے گئے۔ اس لئے کہ قصّہ کی زبان میں خود بخود تسلسل پیدا ہوتا جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں زیادہ کاوش سے کام نہیں لینا پڑتا، نہ قصّوں میں کوئی ایسا دقیق مسئلہ ہوتا ہے کہ جو کتاب کے کسی حصّہ کو ناقابلِ فہم بنا دے۔ گو یہ خصوصیت نوخواندہ انگریزوں کے لئے رکھی گئی تھی۔ مگر اُردو زبان کو صاف اور عام فہم بنانے کے لئے بھی ایک زبردست وسیلہ ثابت ہوئی۔ ان کتابوں کی زبان واقعی اُتنی ہی صاف اور سلیس ہے کہ جتنی ممکن ہوسکتی ہے۔ کالج کی کتب کی اس خصوصیت کو دیکھکر دوسرے لکھنے والے بھی متاثر ہوئے اور آسان نثر میں خط و کتابت کرنے اور کتابیں لکھنے کا رواج عام ہوگیا اور اس رواج نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ ۱۸۳۵ء یعنی تھوڑا ہی زمانہ گزرنے کے بعد گورنمنٹ کے دفاتر کی زبان بھی فارسی کی بجائے اُردو قرار پائی۔ اب ہر طرف کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اخبارات جاری ہوگئے گویا اُردو حکومت کی زبان قبول کر لی گئی۔ غرض ہر طرف اُردو نثر کی دھوم مچ گئی۔

یہ تو خیر نہیں کہا جا سکتا کہ اگر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اُردو کتب کا سلسلہ تصنیف و تالیف شروع نہ کرتے اور فورٹ ولیم کالج قائم ہوتا۔ نیز ملک کے چیدہ اور مشہور مصنفین کو جمع کرکے اُردو نثر کا کثیر لٹریچر تیار نہ کراتے تو آج بھی اُردو نثر کی حالت دہ مجلس اور میر تقی کی کتاب مثنوی زہرِ عشق" کی طرح ہوتی۔ یہ ممکن تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کے بغیر بھی اُردو نثر کو کسی اور وسیلے سے ایسی ہی مدد ملتی۔ اس لئے کہ اُس کی قسمت میں عروج لکھا ہوا تھا۔ لیکن اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے بھی ہم گریز نہیں کر سکتے کہ اُردو کا پایہ جو نثر کے لحاظ سے پست تھا اُسے ڈاکٹر صاحب ہی کے دستِ کوشش نے بلند کیا، گو اس کی تہہ میں کوئی اور مقصد کارفرما تھا۔

افسوس کہ ڈاکٹر صاحب کا کالج کے متعلق جو پروگرام تھا وہ ابھی پورا نہیں ہونے پایا تھا کہ وہ علیل ہوکر ۱۸۰۴ء میں اڈنبرا چلے گئے۔ جہاں ۱۸۱۶ء تک قیام کیا اسکے بعد لندن آکر ہندوستان میں آنے والے انگریزوں کو زبانِ اُردو کی تعلیم دینے میں مصروف ہوگئے۔ ۱۸۱۸ء میں کمپنی نے ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام اورینٹل انسٹیٹیوٹ تھا۔ اس نئے ادارہ کا پرنسپل ڈاکٹر صاحب ہی کو مقرر کیا گیا۔ اس ادارہ کو بھی انھوں نے خرابیٔ صحت کے باوجود اعلیٰ پیمانہ پر چلایا۔ ۱۸۲۹ء میں یہ ادارہ بند ہوگیا مگر پھر بھی ڈاکٹر صاحب پرائیویٹ طور پر [illegible]

ایک ایکٹ کا منظوم ڈراما:-

خاکستر پروانہ

تشریح

پہلا سین - نوجوان اور حسین شیام لال کی موت۔
دوسرا سین - اس کا کریا کرم۔
تیسرا سین - اُس کی بری حال اور کمسن بیوہ۔
چوتھا سین - اضطراب اور اضطرار۔
پانچواں سین دم توڑ دینا۔

پہلا سین:—

اب بنانے سے نہیں بنتا ہے کچھ طورِ حیات ہوگیا ہے ختم کُل افسانۂ دورِ حیات
وہ شبابِ رنگِ ہستی اک گلِ افسردہ ہے یادگارِ زندگانی "شیام" یعنی مردہ ہے
ساحلِ گنگا پہ لائے ہیں جلانے کے لئے شمع کو بھی پھر جلا کر پھر بجھانے کے لئے

دوسرا سین:—

دوش سے کشتی اتاری یا اتارا سر سے بار اہلِ دُنیا اور دُنیا کا ہے اتنا اختیار
بولی زباں گویا ہے گنگا کے لبِ خاموش میں لے کے نکلے ماں سے مسافر آخری آغوش میں
آگ کُل تن میں لگائی خاک کرنے کے لئے یعنی باقی عنصروں کو پاک کرنے کے لئے
آہ! جسمِ صاف، آئینے کے سانچے میں ڈھلا آگ کی بیباکیوں سے یہ جلا اور وہ جلا
آہ! یہ سر، گورے گورے ہاتھ کے بالین تھا آج تن آتش میں ہے اور کل یہی لب پہ تھا
آہ! جس گردن میں کل حائل تھی دستِ نازنیں موت نے ڈالا ہے اسمیں آج عقدِ آتشیں
نام رکھا تھا اسی دن کے لئے کیا "شیام لال" سُرخ شعلے آگ کے ہستی کے اک دن ہوتا آل
الغرض جل کر بجھا دم بھر میں نقشِ ہست و بود رہ گئی سلگنے کے آخر بے نشانی کی نمود
خاک آخر ہوگیا رختِ نظامِ زندگی نقشِ گنگا سے ملا جناب نامِ زندگی
جانے والے جا چکے محمل روانہ ہو چکے جسقدر سامان ہستی کے تھے پورے ہو چکے
جز زمین آسمان ساحل پہ اب کوئی نہیں ہاتھ رکھنے والا جسم و دل پہ اب کوئی نہیں

تیسرا سین:—

آرہی ہے اک خزاں پروردۂ تازہ بہار بے دفعہ اوڑھی جوانی ہے، جوانی کا سنگار
بال کھولے سر جھکائے اور آئی ہے خاک میں اور جوانی کی اُمنگیں ہیں نئی پوشاک میں
کل اُمیدیں لٹ چکیں اُجڑا ہوا ارمان ہے بات تو کہنے کی یہ ہے جوگی کی جان ہے
انقلابِ دہر اپنا داؤں پورا چل گیا آسماں سے برق برسی بوستاں کُل جل گیا
رہ گئے شبنم کے آنسو صرف رونے کے لئے اس خزاں دیدہ چمن کی خاک دھونے کے لئے
آہ! ان جادو بھری آنکھوں میں اک بیقرار دیکھتا کیا ہے کھڑا؟ اے انقلابِ روزگار
چہرۂ گل، رنگ اُڑ جانے سے یوں بے رنگ ہے آئینے پر جب نہیں جوہر تو روئے سنگ ہے
ہاں فقط تحریکِ غم سے تمتماتے گال ہیں مونہہ پہ شعلے تھے حنا پر اب بہا ہاں وہ لال ہیں
ہے حجابِ ختمِ گریاں، بے حجابی کا جواب ڈال دی ہے شب نے آکر روئے عالم پر نقاب
اللہ اللہ لٹ رہی ہیں حُسن کی خودداریاں مکنت کی شکل ادائیں، بن گئیں ناچاریاں
ہاتھ پیارے نرم و نازک ہیں جلے جاتے ہیں آہ! آنکھ سے بے ساختہ آنسو چلے جاتے ہیں آہ
آنکھ اُٹھتی ہے سہارے کو جدھر کوئی نہیں اُف اِدھر کوئی نہیں ہے اور اُدھر کوئی نہیں
حال ہے بیچارگی کی رگ سے اُٹھتے ہیں جو دم نزع میں دم ٹوٹتا ہے جیسے کوئی دم بدم
سانس ٹھنڈی شمعِ ہستی کی بجھا دینے کو ہے ہاتھ پردہ زندگانی کا اُٹھا دینے کو ہے
درد جب دل میں اٹھا بیٹھی کلیجہ تھام کر آسماں! اب ختم اپنی گردشِ ایام کر

چوتھا سین:—

کچھ کھسک کر آگئی وہ خاکِ ارماں کے قریب درد حد سے بڑھ کے خود آیا ہے دل کے قریب
شمع نے منہ پر ملی رو رو کے پروانے کی خاک اور زبانِ دل سے نکلی یہ صدائے دردناک
آگ کیوں دل میں لگائی تم کو بجھنا تھا اگر اے مری جانِ تمنا اے مری مدِّ نظر
چھوڑ کر مجھکو گئے تم بیکسی کے واسطے نفع ہے کچھ رہ میں جیوں اب زندگی کے واسطے
جوگ کے واسطے چھینا گیا میرا سہاگ آہ ای پیتم چتا کی لگ گئی مجھ کو نہ آگ
تم ہو جسکے گود میں اس گود کی سوکن بنوں جو سہاگن ہے تمہاری اسکی میں جوگن بنوں
خاک میں تم مل گئے میں ہوں تمہاری خاک پر آسماں! تو ٹوٹ پڑا اس ہجرِ حسرت ناک پر
زندگی میری نہیں ہے ننگ ہے اور شرم ہے نام لے کر اب تمہارا، جان دینا دھرم ہے
پردۂ دوری اُٹھا کر تم بلا لو اپنے پاس عمر بھر کی ہے تمنا، آخری ہے التماس
نیند ہی چادر اُڑھا دو جیسے اب سوتے ہو تم کس لئے خاموش میری بھیک پر ہوتے ہو تم
نیند سے جاگیں تو ہو یہ پاک گنگا کا سماں موج کی کشتی میں مل جل کے کریں اٹکھیلیاں
پیت کا جو دھرم ہے اس میں پتی یاں ہے اور سرِ ایمان پر سب کچھ مرا قربان ہے
حشر کے دن بھی رہے سر خم تمہارے سامنے سب خدا کے سامنے ہوں ہم تمہارے سامنے

پانچواں سین:—

مل گئی پیتم سے جوگن "رشتۂ جاں توڑ کر دل کے جانب ہوگئی دُنیا سے منہ کو موڑ کر
ستی ہو جوگن وہی کرنا بہت آساں ہے ان کے کیفی جیسے مرنا بہت سا ہے

ڈراپ

(علامہ) کیفی چریاکوٹی

افسانہ:-

قفس کی تیلیوں سے شاخِ آشیاں تک!

مُرلی ایک بڑی سی دُکان کے محرابی راستہ کے قریب خراماں خراماں ٹہل رہا تھا، دن کی روشنی میں دُکان کی ایک ایک چیز چمک رہی تھی، جس طرح اُسکا جسم بیقرار تھا اُسی طرح اُسکا دماغ بھی آشفتہ خاطری کا اظہار کر رہا تھا۔ آج ہی صبح اُس نے اخبار میں یہ سائنسی انکشاف پڑھا تھا کہ دنیا اپنے محور پر گھومتے گھومتے اب ختم ہو رہی ہے اور صرف چند لاکھ سال اور برقرار رہے گی۔ اسکے بعد نہ یہ دنیا ادر نہ دُنیا کی یہ دل آویزیاں! اُس جیسے نوجوان کے لئے جو فائنل آرٹس کلاس میں ہو یہ خبر خوش کن نہ تھی۔ اُس کے لئے زندگی کا جو خاکہ مرتب کیا گیا ہے کیا اُسے اسکا اتباع کرنا چاہیئے یا اُسے دُنیا کے خلاء میں تبدیل ہونے تک خالی زندگی گذارنا چاہیئے؟

بھیانک تصوّر سے گھبرا کر اُس نے پیچھے کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور اُس کے بال ایکا ایکی کھڑے ہوگئے۔ جس تلخی اور ناگواری کا وہ احساس کر رہا تھا وہ اب جاتا رہا اور دل میں مسرّت آگیں خیالات لہرانے لگے۔ دوسری ہی نظر میں واقعی یہ محبّت کا معاملہ تھا، کیونکہ پہلی نظر میں ایک لڑکی کے سر پر پھولوں میں گوندھے ہوئے بال دکھائی دیئے جو دُکان سے باہر آرہی تھی وہ برابر اسکو دیکھے جا رہا تھا جیسے وہ کوئی حسین نغمہ ہو، اُسکا دل جو رومانی کہانیوں میں ڈوبا رہتا تھا، دو تین بار بڑے زور سے دھڑکا اور وہ دُنیا کی آنے والی تباہی کو یک لخت بھول گیا، وہ دروازہ میں سے ہوتی ہوئی سامنے والے بس اسٹینڈ کی طرف چلی گئی، اُسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ ساری دُنیا ایک گدلا گڑھا ہے جس میں عام طور پر گھونگے رہتے ہیں اور صرف ایک موتی ہے، یہ موتی اسکی نظروں کے سامنے سے اُڑا جا رہا تھا اور وہ بالکل اس طرح حیران تھا جیسے کوئی بندر آدمیوں کے عجائب گھر کو دیکھ رہا ہو، وہ بھی نہایت متانت کے ساتھ بس اسٹینڈ پر پہونچا، تاکہ لڑکی کا دُنیا کے سرے تک پیچھا کر سکے اور دُنیا کے ختم ہونے تک اُس سے محبّت کرتا رہے۔

مُرلی اپنے ہم جماعتوں کے لئے ایک معمّا تھا، جہاں کہیں بھی وہ لفظ "عورت" سنتا اُسے بڑا خوف محسوس ہوتا اور وہ ٹھٹھک کر چلتا بنتا، شریر دوستوں نے اُس سے کہا تھا کہ مرنے کے بعد اسکی زندگی بڑی خوشگوار ہوگی، اُسکے دونوں شانوں پر خوبصورت پر ہونگے اور سر کے گرد ایک روشن تختی آویزاں ہوگی۔ ایک ہم جماعت قادر اُسے روزانہ اسی طرح چھیڑتا تھا، اُسکی مونچھیں اس عمر میں بھی بڑی خوفناک تھیں قادر الف لیلہ کا کوئی بھولا ہوا کردار معلوم ہوتا تھا مگر اس کے باوجود تجدد پسند روشن دماغ اور رومان طبع واقع ہوا تھا۔ "مزاحمت"، "جنسی بھوک" اور "نفسیاتی علاج" کے الفاظ اسکی نوک زبان رہتے جیسے اُسے یہ فرائڈ سے ورثہ میں ملے ہوں۔

ایک مرتبہ لڑکیوں کا ایک گروہ مرلی کے قریب سے گزرا، قادر نے فوراً فقرہ چست کیا "وہ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر بدل رہا ہے"۔

کسی نے پوچھا "کیا شکل اختیار کر رہا ہے؟"

شریر قادر نے جواب دیا "نسائیت"

قادر برابر بولتا رہا "یہ ایک نفسیاتی نظریہ ہے، طبیعات بھی اسکو قبول کرنے پر مجبور ہے۔ مردانگی کے باریک پردہ کے نیچے وہ نسوانی شکل کا حامل ہے۔ مجھے کسی دن یہ سُن کر کوئی تعجب نہ ہوگا کہ اسکی صنف بدل گئی ہے۔ ایسی چیزیں ہو چکی ہیں"۔ قبل اسکے کہ وہ اپنی نفسیاتی تشریحات ختم کرے مرلی آگ بگولہ ہو کر باہر نکل گیا، اور اُس شام کو اُس نے جبکہ وہ کتابوں کی دُکان کے گرد چکر کاٹ رہا تھا، کسی پروفیسر ہنچیل کی لکھی ہوئی کتاب "عورتوں کی دنیا" کو دیکھتے ہی فوراً خرید لیا۔

اُسی شام کو اپنے "گوہر آبدار" کی ملاقات سے قبل وہ ہنچیل کی کتاب کا بالاستعاب مطالعہ کر چکا تھا اور اُسکے دماغ میں ہنچیل کے مختلف رنگین جملے پوری طرح قبضہ جما چکے تھے،

ہنچیل نے مشورہ دیا تھا "میاں صاحبزادے محبّت غیر متوقع طور پر ایسی ٹرین کی طرح آتی ہے جو کسی سرنگ سے نمودار ہو رہی ہو اور وہی آدمی سمجھدار ہے جو اُس کو اپنی گرفت میں لیلے"۔ مرلی اپنی محبّت کو پا چکا تھا چنانچہ اُس نے لڑکی کا اسی طرح تعاقب شروع کر دیا کہ اگر کانن ڈائل کو اسکا پتہ چل جاتا تو شرلاک ہومز کو بے اہمیت دیتے۔ قبل وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جاتا، لڑکی ایک بس پاس ہوگئی اور اُس میں جا کر بیٹھ گئی۔ مرلی کو اسکا اندیشہ ہوا کہ کشمکش حیات کا سامنا کرنا پڑا وہ بالکل لڑکی کے قریب کھڑا ہوگیا تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ وہ کہاں اُترنا چاہتی ہے لیکن ابھی کنڈکٹر

کے کالج میں بات نہ دہرائے اپنی منزل مقصود بتائی کہ مرلی کو ٹرمنس تک ہی کا ٹکٹ لینا پڑا لیکن وہ بالکل غیر متوقع طور پر درمیانی اسٹاپ پر اتر پڑی اور مرلی بھی اس کیساتھ کنڈکٹر کو حیرانگی کے عالم میں چھوڑ کر اتر پڑا۔ لیکن پنچیل یقیناً مرلی کا بچاؤ کریگا کیونکہ وہ کہتا ہے :۔ سچی محبت کے سامنے شرم اور خوف غائب ہو جاتے ہیں۔ لڑکی نے رکشا کرایہ پر کر لی۔ مرلی حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کیونکہ اس پاس کہیں بھی رکشا کا پتہ نہ تھا، وہ تیز تیز چلا، اور جتنا کہ وہ دوڑ سکتا تھا دوڑا، محض اس لئے کہ رکشا نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے، ایک اور رکشا اسکے "ہدف" کے قریب سے گزری اور کسی نے آواز دی "ہلو وتلا!" خوب تو اسکا نام وتلا تھا! قبل اسکے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ وتلا لڑکی کیلئے موزوں نام ہے یا نہیں، رکشا ایک بڑی عمارت کے سامنے رک گئی، وہ اس میں داخل ہو گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا جو اسکے اور اسکے اُستاد پنچیل کے لئے ایک چیلنج تھا، لیکن پنچیل ہر الجھن اور ہر مشکل کا حل پیش کرتا ہے، اسکا کہنا ہے :۔

"محبت ضرورت کی طرح ایجاد کی ماں ہے"

وہ مکان کے باہر ایک منٹ تک کھڑا رہا، اُس نے اپنے چہرہ کا پسینہ پونچھا اور بال درست کئے، بعد ازاں اُس نے دروازہ پر پنچیل کی ہمت کے ساتھ دستک دی۔ دروازہ کھلا، وتلا نمودار ہوئی، اُس کی نظروں سے ایک قسم کا تجسس ٹپک رہا تھا۔

کیا وہ خوبصورت تھی؟ اگر اُس نے میرے جواب دینے کے لئے کسی بڑے آدمی کو بلایا تو؟ پھر میری شباب انگیز مہم کا کیا حشر ہوگا؟

اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا "معاف کیجئے"

"معاف کیا" اُس نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا،

مرلی کے پاؤں لڑکھڑانے لگے اُس نے پھر کہا،

"معذرت چاہتا ہوں"

"عذر قبول کر لیا گیا"

"مجھے ایسا خیال پڑتا ہے کہ میں نے شاید آپ کو کہیں ضرور دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے یہ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں" مرلی نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا، لڑکی نے نہایت سرد مہری سے اُس پر نظر ڈالی۔ مرلی نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا آپ میری بہن کی ہم جماعت نہیں تھیں؟ وہ اکثر اپنی ذہین اور خوبصورت سہیلی وتلا کا ذکر کیا کرتی تھی"

پنچیل نے کیا خوب کہا ہے :۔

"خوشامد کی قیمت ملتی ہے اور خلوص کو کوئی نہیں پوچھتا"

وتلا ایک لمحہ تک حیران و پریشان کھڑی رہی۔ اسکا چہرہ ایکدم تمتما اُٹھا "آپ ٹھیک کہتے ہیں، وہ میرے سامنے کبھی کبھی ایک بیوقوف کا حال بیان کیا کرتی تھی جو بدقسمتی سے اُسکا بھائی تھا!"

وتلا نے ترچھی نظروں سے اُسکی طرف دیکھا وہ بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکی، وہ ایک سیکنڈ تک ساکت و صامت کھڑا رہا مگر اسے اپنی سلسلہ پیرائی کا پوری طرح احساس تھا "اچھا" اُس نے پھر بولنا شروع کیا "اگر آپ صبر و تحمل سے سنیں تو میں حقیقت حال سے آگاہ کروں کہ میں نے کیوں آپ کے دروازے پر دستک دی میں جو کچھ کہونگا اُس میں کذب و افترا کا خفیف سا بھی شائبہ نہ ہوگا"

"ہاں ہاں فرمائیے" وتلا نے کہا۔

مرلی نے جواب دیا "مگر میں ایسی اہم بات آپ کی دہلیز پر نہیں کہہ سکتا"

"اندر آجائیے" اُس نے بے رخی سے کہا اور وہ اسکے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم تک چلا گیا، وتلا نے اُس کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، قطعاً اتنی دلچسپی کے ساتھ جیسے وہ فرنیچر کا کوئی ٹکڑا ہو۔ پنچیل کی ہدایت کے مطابق وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی آواز کو صاف کرکے وتلا پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔ چند مختصر مگر جامع جملوں میں مرلی نے وتلا پر اپنی حیثیت، سماجی اور ادبی عظمت اور اسکے ساتھ اپنی بے پناہ محبت سب کچھ واضح کر دی اور بڑی دیر تک بے ترتیبی کے ساتھ محبت کے متعلق گل افشانی کرتا رہا!

وتلا نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا "اچھا آپ اس لئے آشیاں بدوش چکر کاٹ رہے ہیں"

"—— جی ہاں، بلبلیں بھی تو آج کل دام بدوش ہیں"

"آپ کو کچھ اور بھی ارشاد فرمانا ہے؟"

"کچھ نہیں" —— وہ مسکرا دی۔

اُس نے مرلی کو مشورہ دیا کہ "آپ تشریف لیجا سکتے ہیں"

لیکن وہ برابر ہنس رہی تھی جس سے مرلی کی آرزوئیں پھیلتی جا رہی تھیں اُس نے یکبارگی اوپر اسکے ہیرو کے انداز میں کہا :۔

"میں تمہیں چاہتا ہوں"

"آپ جائیں گے یا نہیں؟" لڑکی نے کسی قدر تنک مزاجی سے کہا۔

اب اسکے ہنسنے کا موقع تھا،

"دوست،" وہ بولا "معاملات محبت کا ایک ماہر پنچیل کہتا ہے کہ محبت کا

اب محبت ہے، اگر میں تم پر فریفتہ ہوگیا ہوں تو تمہیں بھی اس کا اظہار کرنا چاہیئے۔" وہ
ورسے ہنسا اور ینچیل کی روایت کے مطابق ڈلا کی طرف تیز نظروں سے دیکھا
یا۔ ڈلا کی آنکھیں بے حس و حرکت ہو کر رہ گئیں: "کیا آپ مہربانی فرما کر تشریف
نہیں لیجائیں گے؟"

"دیوی جی گھبرائیے نہیں مجھے آپ سے کس قدر محبت ہے اسکا اندازہ لگانا
شکل ہے۔ میں ایک گھنٹے کے اندر اندر آپ میں خود سے محبت کرنے کا ایسا ہی
پُرجوش جذبہ پیدا کردوں گا جانِ جاں؟"

وہ کانپ اٹھی، اور گو کہ اُس نے کچھ تہیہ کر لیا تھا پھر بھی اُس نے صاف
لہجہ میں کہا:-

"اگر تم ایسے ہی ضدی ہو تو اپنے الفاظ کو صداقت سے ہمکنار کر کے دکھاؤ
میں کچھ اور تفصیلات سننا چاہتی ہوں، کیا تم ذرا میرے مطالعہ کے کمرہ میں
چلنا پسند کرو گے؟"

وہ اسکے مطالعہ کے کمرہ میں بڑے فخر کے ساتھ چلا گیا۔

ڈلا نے کہا "تم یہاں آرام سے بیٹھو، میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں
ہم چائے کی پیالی پر باتیں کریں گے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا اس طرح اچھا
موقع ملیگا۔"

"بہت خوب" وہ مسکرایا "تم نے اسے کہہ ہی دیا"

وہ تیزی سے دروازہ کے پاس آئی، مرلی نے پردوں پر نظر دوڑائی
جیسے اُن کے نقش و نگار اس موقع پر نہایت اہم ہوں، پردوں سے ہٹکر اسکی
نظریں کمرہ کی مختلف چیزوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ اُس نے دل ہی دل میں کمرہ
کی صفائی اور حسنِ سلیقہ پر لڑکی کی نفاست پسندی کی داد دی، اچانک اُس نے
زور کا جھٹکا محسوس کیا، قبل اس کے کہ وہ کوئی حرکت کرسکے اُس نے دیکھا کہ
لڑکی دروازہ کو باہر سے مقفل کر رہی تھی۔ اُسے اب محسوس ہوا کہ وہ اور اسکا
استاد ینچیل دونوں عورتوں کی دنیا میں آکر بُری طرح قید ہوگئے ہیں، دروازہ
کے قریب ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور اُسے لڑکی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر پڑا، لڑکی
نے کہا "میرے پرستار! اب انتظار کرتے رہو، میں تمہارے لئے چائے
لاؤنگی اور جلد ہی پتاجی سے تمہاری ملاقات کراؤنگی، گھبراؤ نہیں —"

مرلی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُسے پہلی مرتبہ اپنی حماقت کا احساس ہوا
اُسے سخت غصّہ بھی آرہا تھا، اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ لڑکی کے اِس مطالعہ کے
کمرہ کو جلے ہوئے کاغذ کی طرح مسل ڈالے۔ کاش یہ اُسکے بس میں ہوتا، دس منٹ
بعد اُسے ینچیل کا بھی خیال نہیں آیا، لڑکی ابھی تک وہاں کھڑی ہوئی تھی۔
اُس نے ملتجیانہ انداز میں کہا "دروازہ کھولدو۔"

"جب تک تم معافی نہ مانگو گے" اُس نے جواب دیا "اور یہ وعدہ نہ کرو کہ
آئندہ ایسی حماقت نہیں کرو گے۔"

"یہ میں نہیں کرسکتا" اُس نے سختی سے کہا "میں تم سے محبت کرتا ہوں
اور تم سے شادی کرنے کا متمنی ہوں۔"

"ارے" اسکے ہونٹ بھنچ گئے "اچھا تو میرے عزیز بزدیل انتظار
کرو اور سخت خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہو۔"

مرلی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر وہ چلی گئی، اسکی آنکھوں سے خوف و وحشت
ٹپک رہی تھی — اُس نے ینچیل کا آخری فقرہ یاد کیا "ہر قسم کی مصیبت
جھیلنے کے لئے تیار رہو۔"

بڑی دیر بعد اُسے کسی شخص کی بھاری آواز سنائی دی۔ جس سے وہ
کانپ اٹھا اور اسکا دل زور زور سے اُچھلنے لگا،

"پتاجی" اُس نے لڑکی کی آواز سُنی اور لرز گیا: "ایک نوجوان آپ کی
عدم موجودگی میں آیا اور آپ کے متعلق پوچھنے لگا کہ کہاں گئے ہیں، کیونکہ اسکا
طرزِ عمل کچھ بے ڈھنگا تھا اس لئے میں نے اُس کو اپنے مطالعہ کے کمرہ میں لیجا کر
بند کردیا۔"

مرلی نے جو یہ الفاظ سُنے تو اسکی جان میں جان آئی۔

"بے ڈھنگا رویہ!" باپ کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"ذرا میری وہ شاندار لکڑی لے آنا" مرلی کو اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔

"پتاجی اسکی ضرورت نہیں" مرلی کو لڑکی کی آواز سنائی دی "میں دروازہ
کھولتی ہوں اور آپ پوچھ لیجئے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔"

دروازہ کھلا اور ایک چھ فٹ کے دیو قامت آدمی کی شکل نے مرلی کو ینچیل
کے تمام داؤں پیچ بھلا دیئے، باپ اژدھے کی طرح پھنکارتا ہوا اندر آیا،
جب اُس نے مرلی کو دیکھا تو اسکا غصہ دیکھتے ہی دیکھتے پگھل گیا۔ وہ مسکرایا
"ارے مجھے بڑا افسوس ہے" چپ چاپ وہ اسکو باہر لے گیا اور ڈرائنگ روم
میں ایک کرسی پر بٹھایا، اُس نے کہا" — تمہاری آمد واقعی اچانک ہی:"

پھر اپنی لڑکی کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا،

"یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، ہمارے لئے چائے لاؤ۔"

لڑکی اس رویہ سے ناراض سی ہوگئی مگر اُس کو خاموشی سے جلد جانا پڑا۔

باپ نے کہا" میں ابھی ابھی تمہارے ہی گھر سے آرہا ہوں"
وہ مسکرا رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ مرلی لرزہ براندام ہو گیا، اسکا دماغ چکرا رہا تھا۔

مرلی نے معذرت خواہ لہجہ میں کہا" مجھے ایک ضروری کام ہے پھر کسی روز حاضر ہونگا"

"ارے ذرا بیٹھو تو سہی، چاء پی کر جانا ایسی جلدی ہی کیا ہے"

جب مضطرب لڑکی چاء لیکر آئی تو مرلی کا پریشان دماغ گھوم رہا تھا۔ اور رما باپ کی مسکراہٹ اُس پر عجب اثر پیدا کر رہی تھی، مرلی نے جلدی جلدی چاء پی اور فوراً روانہ ہو گیا۔ اُس نے باہر آکر کھلی ہوا میں اطمینان کی سانس لی، اگر اس وقت پنچیل وہاں موجود ہوتا تو وہ اُسے ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سُلا دیتا، چاہے اُسے حبسِ دوام ہی کی سزا کیوں نہ ملتی۔ وہ آہستہ آہستہ گھر پہونچا، وہاں اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی انقلاب ہونے والا ہے۔ اُسکے چھوٹے بھائی اسکو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور اُس کے باپ نے مشفقانہ انداز سے کھانا کھانے کی ہدایت کی تاکہ وہ ٹھنڈا نہ ہو جائے

مرلی حیران تھا کہ آج اُسکے ساتھ یہ غیر معمولی طرزِ التفات کیوں برتا جارہا ہے اسکی چھوٹی بہن نے زور سے قہقہہ لگایا اور اُس کو "وملا" کہکر پکارا "وملا" کا نام سنکر اُس کے کان کھڑے ہو گئے سر سے پاتک لرز گیا وہ تعجب کر رہا تھا کہ کہیں آج صبح کی "فراری" کا اسکے گھر والوں کو تو پتہ نہیں چل گیا۔

ماتاجی اسکے پاس آئیں "تم ابتک کہاں تھے؟"

"کہیں نہیں" اُس نے گھبرا کر جواب دیا، وہ پنچیل کو ہزاروں صلواتیں دل ہی دل میں سُنا رہا تھا۔

"آج صبح تمہارے پتاجی کے دوست مسٹر چندرا اپنی لڑکی وملا کی شادی کے متعلق بات چیت کرنے آئے تھے، اُنھوں نے شاید تمہیں دیکھا ضرور ہے اگرچہ وہ ذاتی طور پر تم سے واقف نہیں ہیں۔ ہم نے آئندہ ہفتہ نسبت طے کرنے کی رضامندی دیدی ہے۔ میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتی تھی، اگرچہ اس معاملہ کا سارا انحصار تمہارے پتا پر ہے اور اسکو تم خوب سمجھتے ہو، بہرحال میں نے تمہیں پہلے ہی سے آگاہ کر دیا ہے"

وہ کہے جا رہی تھی مگر مرلی صرف اس خیال میں غلطاں پیچاں تھا کہ آیا وہ پنچیل کے "شاہکار" کو جلادے یا اُسے یادگار کے طور پر محفوظ رکھے ——!

رشدی بھوپالی

(بقیہ خاصان ادب صفحہ ۱۴)

(۶۲) جناب خان شری محبت خان جی آف کوٹھری بانٹوا (کاٹھیاواڑ) ۶ سے رسالانہ
(۶۳) جناب عبدالستار خاں صاحب قائم گھوسی (دہلی) ۶ سے رسالانہ
(۶۴) جناب حبیب خانصاحب حبیب شاہجہانپوری کوئٹہ ۶ سے رسالانہ
(۶۵) مسٹر اُتم سنگھ بی۔ اے پروپرائٹر بھلارام اینڈ سنس دہلی ۶ سے رسالانہ
(۶۶) محترمہ حجاب بنارسی (ناگپور) ۶ سے رسالانہ
(۶۷) محترمہ اسما اسے علوی صاحبہ کراچی ۶ سے رسالانہ
(۶۸) محترمہ میمونہ صاحبہ کراچی ۶ سے رسالانہ
(۶۹) محترمہ فضہ جی لوٹیا صاحبہ کراچی ۶ سے رسالانہ
(۷۰) جناب یحییٰ بھائی محمد علی صاحب راولپنڈی ۶ سے رسالانہ
(۷۱) جناب عارف ابراہیم یوسف برکار قادری بانکوٹی ۶ سے رسالانہ
(۷۲) جناب خانصاحب انور خاں جی آف ناکرٹھ دربار گروہ بانٹوا (کاٹھیاواڑ) ۶ سے رسالانہ
(۷۳) جناب سید ظہیر حسین صاحب ظہیر ہندی ۶ سے رسالانہ
(۷۴) جناب رفیق احمد صاحب نیر نٹ مٹیا کلکٹوری صدر بخشی لین ہوڑہ ۶ سے رسالانہ
(۷۵) جناب اکبر علی غلام علی صاحب تختے والے کراچی ۶ سے رسالانہ
(۷۶) محترمہ بتول نورالدین ٹپال کراچی ۶ سے رسالانہ
(۷۷) مسٹر ممتاز صحرائی جرنلسٹ تنگو مخدوم (پنجاب) ۶ سے رسالانہ
(۷۸) محترمہ لیڈی سر رحیم بخش ساہا (ضلع انبالہ) ۶ سے رسالانہ
(۷۹) جناب کھیچر ول صاحب ضیا پر تھی ۶ سے رسالانہ
(۸۰) جناب جگن ناتھ پوری صاحب رضا دھرم کوٹ رندھاوا (پنجاب) ۶ سے رسالانہ
(۸۱) جناب سیٹھ فدا حسین طیب علی صاحب راولپنڈی ۶ سے رسالانہ
(۸۲) جناب حاتم علی عبدالحسین صاحب علی گڑھ ۶ سے رسالانہ
(۸۳) جناب احمد خانصاحب ساحل بمبئی ۶ سے رسالانہ
(۸۴) جناب آل حسین صاحب مرزاپور ۶ سے رسالانہ
(۸۵) جناب چودھری صادق علی صاحب ترن جلالپور ۶ سے رسالانہ
(۸۶) جناب فدا حسین علی بھائی صاحب راولپنڈی ۶ سے رسالانہ
(۸۷) جناب ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب خوشتر ریونیو سپل کمشنر کھنڈوہ ۶ سے رسالانہ
(۸۸) جناب احمد شہاب الدین صاحب شہاب دہاولی ضلع رتناگری ۶ سے رسالانہ
(۸۹) جناب چودھری لال محمد نور محمد صاحبان فروٹ کمیشن ایجنٹ شاہجہانپور ۶ سے رسالانہ
(۹۰) جناب حکیم سید عباس علی صاحب آسی ترپاتور (ویلور) ۶ سے رسالانہ
(۹۱) جناب حافظ اسحاق صاحب ہلاک پریمی کوکشی (دھار) ۶ سے رسالانہ

افسانہ

روشن تاریکیاں

رتن ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اسکے والد کیلاش بابو اسکے پیدا ہونے کے قبل ہی مر چکے تھے۔ اسکی پرورش اسکی ماں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ بیچاری اس پر جان چھڑکتی اور ہر طرح اسکی دیکھ بھال کیا کرتی۔ ویسے تو خدا کا دیا رتن کو سب کچھ میسر تھا لیکن پھر بھی ایک چیز اُس کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی اور وہ تھی۔۔ اسکی بے نور آنکھیں! وہ اندھا تھا! پیدائشی اندھا!! اُس کی دُنیا تاریک تھی۔ اسکی زندگی تاریک چلی آ رہی تھی ازل ہی سے تاریک!

وہ بارہا اس بات کی کوشش کرتا کہ خوبصورتی اور بدصورتی، دن اور رات، روشنی اور تاریکی کے معنی سمجھ سکے، لیکن ہمیشہ ناکام رہتا وہ اپنی مایوسی اور بیچارگی پر ہمیشہ آنسو بہایا کرتا۔ مسرت اسکے لئے ایک بے معنی لفظ بنکر رہ گئی تھی، خوشی اسکی زندگی سے کوسوں دُور تھی دُور وہ اُس کے لئے نام تھا گرمی کے احساس کا، پھول صرف خوشبو کا، اپنے پرائے نرم اور محبت آمیز آواز تھے۔ اسکی بے نوری دُنیا خلشِ پیہم اور طرح طرح کی اذیتوں سے بھری پڑی تھی۔

اسکی اس بے کیف زندگی کو چوبیس[۲۴] سال کی مدت گذر چکی تھی اُسکی تمام اُمیدیں دُنیا اور دنیا کی چیزوں کے دیکھنے کی آرزو ناامیدی سے بدل گئی تھی۔ اسکی ماں نے بھی کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا بڑے بڑے ماہرین امراض چشم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ لیکن سب بے سود۔ ڈاکٹروں کا یہی کہنا تھا کہ یہ کام انکے بس کا نہیں مگر رتن بھی ڈاکٹروں کے پیہم سوالات "تم کب سے اندھے ہو؟ کیا تم پیدائشی اندھے ہو؟" اور انکے تجارب سے اُکتا سا گیا تھا لیکن وہ ان باتوں کو خاموشی سے برداشت کرتا تھا صرف اپنی ماں کی خاطر وہ ہی اسکا سب کچھ تھی۔ لیکن وہ جلد ہی اس عقدہ کو حل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ایک نہ ہونے والی بات کو دل میں جگہ دینا امیدوں کو نوید دینے کے برابر ہے، بہتری اسی میں ہے کہ وہ اسکا خیال ترک کر دے اور اسکا یہ ترکِ خیال ہی صحیح معنوں میں نشاطِ روح کا باعث ہوگا۔

اسی اثنا میں اطلاع سے اُسے ہوئے ایک ڈاکٹر کے بارے میں یہ خبر تیزی کے ساتھ پھیلی کہ اُس نے بہت سے پیدائشی اندھوں کو دیکھنے کے قابل بنا دیا ہے

رتن کے کہنے پر اسکی ماں نے اُسے بھی بلوایا۔ ڈاکٹر آیا اور اُس نے رتن کی آنکھوں کا بغور معائنہ کیا اور اسکی ماں سے گویا ہوا: "معاف کیجئے گا اگر میں یہ پوچھوں کہ مسٹر رتن کیا پیدائشی اندھے ہیں؟"

اسکی ماں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر ایسا ہے تو..... لیکن میں حتی الامکان کوشش کروں گا۔ آگے خدا کے ہاتھ ہے۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

اب ڈاکٹر رتن کو مخاطب کر کے بولا: "مسٹر رتن میں اگر یہ کہوں....."

"کوئی حرج نہیں شوق سے فرمایئے۔" رتن نے ڈاکٹر کو ہچکچاتے ہوئے دیکھکر کہا۔

"تمہیں سُن کر تکلیف ہوگی۔"

"تکلیف! میں نے بہت دنوں سے تکلیفوں کو گلے کا ہار بنا لیا ہے۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں۔ بلا پس و پیش کہیں۔" رتن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اگر یہ کہوں کہ گو مجھے پورا یقین ہے کہ میں تمہیں تمہاری آنکھیں واپس دلا سکتا ہوں۔ لیکن ......"

اتنا کہہ کر ڈاکٹر رک گیا۔

"لیکن کیا؟ ڈاکٹر!" رتن نے پوچھا۔

"لیکن یہ کہ تمہاری آنکھوں کی روشنی عارضی اور چند لمحات کے لئے ہوگی سمجھے!" یہ کہکر اُس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا وہ پھر گویا ہوا "تمہاری آنکھیں تمہیں واپس مل جائینگی۔ جسکا مجھے یقین کامل ہے۔ لیکن وہ صرف تھوڑی دیر کے لئے کیا تم اس چوٹ کو برداشت کر سکوگے؟"

"درحقیقت اس چوٹ کا برداشت کرنا بہت مشکل ہے لیکن پھر بھی میں کوشش کرونگا۔"

"کیا تم اچھی طرح سمجھ گئے۔" ڈاکٹر بولا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری اندھی آنکھوں میں چند لمحات کے لئے روشنی کا آجانا کیا معنی رکھتا ہے؟ موجودہ حالت میں تمہیں اپنی بصارت کی ذرہ بھر قدر معلوم نہیں تم نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ لیکن اگر ان میں روشنی چلی آئے اور تم دیکھنے لگو

شاید چند گھنٹے کے لئے یا چند لمحات کے لئے اور پھر پہلے کی طرح اندھے ہوجاؤ۔ بالکل اندھے!" اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا شاید کچھ سوچنے لگا۔

"میں ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کرنے کو تیار ہوں جبکہ اُمید کا دامن میرے ناتواں اور کمزور ہاتھوں میں ہے۔" رتن نے ڈاکٹر کو خاموش دیکھکر کہا۔

ڈاکٹر نے رتن کو چند ہدایات دیں اور کہا کہ مجھے امید قوی ہے کہ تم میری ہدایت پر بغیر پس و پیش عمل کروگے۔

"آپ اطمینان رکھیں!" رتن نے کہا۔

ڈاکٹر کے لئے رتن کے بغل میں ایک کمرہ خالی کرادیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے تمام آپریشن کے آلات کے اس میں چلا گیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر نے رتن کی آنکھوں کا آپریشن کیا۔ آپریشن کامیاب رہا پلاسٹر چڑھانے کے بعد پٹی باندھی گئی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق رتن کو تین ہفتے پیٹھ کے بل پر ایک اندھیرے کمرے میں سونا پڑا ڈاکٹر اسکی تیمارداری کے لئے تمام دن حاضر رہتا ڈاکٹر نے اُسے ہلنے جلنے کے لئے بھی منع کردیا تھا۔ رتن نہایت جرأت اور حوصلے سے ان تمام تکالیف کو برداشت کرتا رہا اور برداشت کیوں نہ کرتا۔ اسکی آنکھوں کا سوال تھا۔ اُن آنکھوں کا جو روز ازل سے اندھی چلی آرہی تھیں۔ بیچارہ عبرت خیز مرض میں مبتلا تھا! ——

آج پٹی کھولے جانے کا دن تھا، لیکن ڈاکٹر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اسکا کمرہ کھلا پڑا تھا۔ شاید اُس نے اپنا سامان خود ہی باندھا تھا اور خود ہی اُسے اسٹیشن تک لیجانے کی زحمت بھی اٹھائی تھی۔ وہ جاچکا تھا، بغیر کہے سنے، رتن کی ماں بالکل خاموش تھی۔ جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو وہ تصویرِ غم بنی ہوئی تھی! ——

کیا اُس کی امیدوں کا اسی طرح پامال ہونا لکھا تھا۔

"یہ خط ڈاکٹر کے کمرہ میں پڑا تھا!"

خادمہ نے ایک سفید کاغذ، رتن کی ماں کو دیتے ہوئے کہا ——

رتن کی ماں جو نہ جانے خیالات کی رَو میں بہتی ہوئی کہاں پہونچ گئی تھی —— خادمہ کی آواز سے چونک سی گئی۔ اور اسکو وہاں کھڑے دیکھکر بولی "کیا ہے" "یہ خط ڈاکٹر کے کمرہ سے ملا ہے۔" رتن کی ماں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور خط کو پڑھنے لگی۔ لکھا تھا:—

"مجھے افسوس ہے کہ میں بغیر اطلاع کئے جارہا ہوں۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں، میرا فرض مجھے اس طرح جانے پر مجبور کر رہا ہے ایک کروڑپتی دو ہزار یا اُس سے زیادہ بشرطیکہ اسکا لڑکا اچھا ہو جائے دینے کو تیار ہے۔ اُسکا لڑکا رفتہ رفتہ اپنی بینائی کھو رہا ہے ایسی حالت میں آپ ہی بتائیے کہ میرا جانا کتنا ضروری ہے اور اس جانے سے میرے مستقبل کو بہت فائدہ ہے —— اور ہاں —— رتن کے بارے میں ...... تو رتن اب خود اپنی مدد آپ کرسکتا ہے۔ پلاسٹر کے خشک ہونے ہی آنکھوں کی پٹی کھول دی جائے لیکن میں پھر ایک بار آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ یہ بصارت عارضی ہوگی ——"

خط پڑھ کر رتن کی ماں کی جان میں جان آئی۔ اُمید کی موہوم سی کرن اب بھی اسکے دل میں ضوفگن تھی "رتن کو اسکی آنکھیں واپس مل سکتی ہیں" وہ بڑبڑاتی ہوئی رتن کے کمرے کی جانب چلی۔

رتن چپ چاپ پڑا یہ سب باتیں سنتا رہا "آہ اب کیا ہوگا خیر کوئی ورنا نہیں۔ پٹی کھولنے میں تکلیف تو ضرور ہوگی۔ لیکن اُس کے بعد .... اسکے بعد ...." رتن نے نحیف لہجے میں کہا۔ تکلیف میں زیادتی ہوتی جارہی تھی۔ پلاسٹر خشک ہو چلا تھا۔ لیکن رتن ڈاکٹر کی بات کا خیال کرتا تو اسکی روح کانپ جاتی۔ دن کے دو پہر گئے تک وہ اسی اُلجھن میں رہا کہ آیا اب پٹی کھول دی جائے یا نہیں۔

پلاسٹر کب کا خشک ہوچکا تھا لیکن اُسے ڈر لگ رہا تھا وہ پٹی کھولنے سے ہچکچا رہا تھا۔

وہ اُس ساعت کے تصور میں گم ہوگیا جب اُسکی پٹی کھول دی جائے گی۔ وہ ساعت جب خدا کی بخشی ہوئی انمول دولت خدا کی بہترین نعمت "بصارت" اسکے قبضے میں ہوگی۔ وہ دیکھ سکیگا کہ روشنی کیا ہے؟ جب وہ گہری تاریکی سے نکل کر ایک روشن اور منور دنیا میں آئے گا۔

بالآخر وہ ساعت بھی آگئی، وہی پٹی کھولنے کی ساعت، وہ ہچکچا رہا تھا ایک عجیب ڈر ایک بھیانک اندیشہ اُسے پٹی کھولنے سے روک رہا تھا۔ کیا وہ پہلی بار اس عجیب و غریب دنیا کو دیکھنے کی خوشی پاکے دیکھکر پھر کبھی نہ دیکھنے کا صدمہ برداشت کرسکے گا؟ رتن کی ماں کو اسکی پریشانی اور بھی پریشان کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

"نہیں" وہ چلا اٹھا۔ میں پٹی نہیں کھولوں گا۔ مجھے .... مجھے ڈر لگ رہا ہے ماں .... آہ .... شاید یہ اچھا ہوتا کہ میں نے ڈاکٹر کو نہ بلایا ہوتا۔ میں اسکے قبل خوش تھا —— نہایت خوش —— میرا خیال ہے .....

لمن ...... آپریشن کے بعد بھی اگر میری قسمت میں یہی تاریکی ہے تو بخت دا فردوں سے کیا شکوہ .... میں کبھی بھی خوش نہیں ہو سکتا ...."

رتن کی ماں نے اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا "یہی شفقت تو میری ذلت کا باعث ہے" وہ اپنی ماں کا ہاتھ زور سے جھٹکتے ہوئے چلا اٹھا "تمہاری محبت نے مجھے یہ دن دکھائے۔" اُس نے گردن جھکا لی اور کچھ سوچنے میں منہمک ہو گیا۔

" میں ...... میں کیسے بتاؤں کہ یہ سودا مجھے کتنا مہنگا پڑے گا" وہ بڑبڑایا جیسے خود کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہو "کیا تم سمجھ سکتی ہو ماں! کہ میرے لئے یہ کیا ہے؟ نہیں۔ بھلا تم کیونکر سمجھ سکتی ہو، میں نے تمہیں پرندے، پھول، چاند، سورج، آسمان اور بہت سی چیزوں کے بارے میں کہتے سنا ہے، لیکن آہ میں اُنکے دیکھنے سے معذور ہوں۔ لیکن ماں ..... ذرا خیال تو کرو"

وہ کپکپاتا ہوا پلنگ پر دراز ہو گیا "کیا میں اسے برداشت کر سکوں گا۔ نہیں کبھی نہیں۔ لیکن اگر میں اسے برداشت کر لوں، ایک مرد ہونے کی حیثیت سے تو..."

وہ زور دار آواز میں کچھ دیر بعد کہنے لگا "تو میں تکلیف برداشت کرنا گوارا کروں گا لیکن .... اکیلے ...... بالکل اکیلے"

"اکیلے! یہ کیونکر ہو سکتا ہے" اسکی ماں نے گھبرا کر دریافت کیا۔

"کیوں نہیں ایک شخص اکیلے میں التجا کر سکتا ہے۔ ایک شخص خدا کے نزدیک صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ تنہا ہو، اسی لئے میں تنہا رہنا پسند کرتا ہوں اور اسی میں میری بھلائی ہے" اُس نے کہا "ابھی تھوڑی دیر قبل میں نے خدا سے اسکی دُعا بھی کی ہے اور میں نے عہد کر لیا ہے کہ میں تمام تکالیف اکیلے ہی برداشت کرونگا۔ ہاں ...... ہاں ......" اُس نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔ میں سمجھ گیا یہی میری آزمائش کا وقت ہے"

اُس کی یہ باتیں سُن کر اسکی ماں اس سے لپٹ کر رونے لگی "ایسا نہ کہو رتن۔ میں تمہیں تنہا مصیبتوں کے ہاتھ میں نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ تمہیں آج ہو کیا گیا ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو" اُس نے روتے ہوئے کہا۔

لیکن رتن پر اسکے رونے دھونے کا کوئی اثر نہ ہوا وہ اپنے ارادے میں اٹل تھا "میں تنہا رہوں گا" وہ بڑبڑانے لگا "میں اس وقت تک تنہا رہونگا جبتک کہ میں آنکھوں کی پٹی کھول نہ لوں۔ تم بغیر اجازت کمرے میں نہ آنا۔ میں دروازے کو اندر سے بند کر رکھونگا، تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔ ذرا سوچو تمیں نے انتظار کرنے کے دن کس طرح کاٹے ہیں........"

"لیکن رتن" اسکی ماں کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"ہاں" اُس نے سخت لہجہ میں جواب دیا "کیا تم مجھے میری نظروں میں گرانا چاہتی ہو، کیا ہوا اگر میں چلانے یا بلبلانے لگوں۔ کیا مجھے کسی کی ضرورت ہوگی۔ کم از کم ان لوگوں کی جنھوں نے مجھے ناز و نعم سے پالا کہ وہ میری شکست کا مذاق اڑائیں۔ نہیں۔ نہیں۔ میں تنہا رہونگا بالکل تنہا!"

اسکی ماں اُسکی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی وہ جانتی تھی کہ رتن جب بضد ہو جاتا ہے تو کسی کی نہیں سنتا۔ یہ سوچکر وہ خاموش رہی۔ رتن اسے دروازے تک پہونچانے آیا جب یہ دروازے کے باہر آئی تو اُس نے دروازہ کو یہ کہتے ہوئے اندر سے بند کر دیا "یاد رکھنا جبتک میں نہ بلاؤں ......" یہ اُس کے آخری الفاظ تھے اس کے بعد چابی گھمانے کی آواز آئی پھر ....

رتن اپنی کامیابی پر نازاں تھا۔ اُسے اپنی تنہائی پر از حد خوشی ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی آنکھوں کی پٹی کھولنے لگا۔ لیکن اُسکی انگلیاں کانپنے لگیں، ہاتھوں میں رعشہ آنے لگا۔ یہ سب کمزوریٔ دل کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ ہاتھ کے کانپ جانے کی وجہ سے تکلیف پہونچی اور رتن چلا اٹھا۔ وہ رتن جو تقریباً بچپن ۲ سال تک ان تکالیف کا عادی رہ چکا تھا۔ اسکا سر ایک الماری سے ٹکرایا، وہ درد کے مارے بچوں کی طرح بلبلا اٹھا۔

آخر کار اُس نے پٹی کو آنکھوں پر سے نوچ پھینکا۔ اسکے بعد ایک چیخ غم اور خوشی سے ملی ہوئی اسکے منہ سے نکل گئی۔

وہ دیکھ سکتا تھا! اسکے بوجھل اور موٹے پپوٹے اوپر نیچے آ رہے تھے۔ ایک چرچراہٹ کے ساتھ ــــــ

لیکن وہ دیکھ سکتا تھا اور دیکھ رہا تھا سب سے پہلے اُس نے جو چیز دیکھی وہ کپکپاتی ہوئی تاریکی تھی۔ بھورے رنگ کے ٹکڑے اِدھر اُدھر فضا میں تیر رہے تھے۔ بے ڈھنگے اور بڑے بڑے ــــــ

جب اسکی قوت باصرہ کچھ اور صاف ہوئی تو یہ ٹکڑے غیر مبہم اور اکٹھے ہو کر غائب ہونا شروع ہو گئے۔ اور انکی جگہ کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی نے لے لی۔ وہ اِدھر اُدھر گھوما۔ ڈگمگایا اور اُس نے اپنے ہاتھ اِدھر اُدھر گھمائے۔ صرف اس لئے کہ وہ ان گوناگوں خطرات سے اپنے کو بچائے جو اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اسکے بعد اُس نے کھڑکی کے پاس کے پلنگ پر خود کو گرا دیا اور زور زور سے ہانپنے لگا۔

وہ حد درجہ خوف زدہ تھا، اُسے خیال آیا کہ اُٹھ کر دروازہ کی طرف دوڑ پڑے

لیکن وہ عجائبات کے درمیان وہ گھرا تھا۔ اُسے یہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا کہ ان میں سے دروازہ کون سا ہے کہ جسے کھول کر وہ اپنی والدہ سے جا ملے۔

وہ اپنے اسی خیال کو عملی جامہ پہنا دیتا اگر اسکی بدحواسی اُسے وہیں بیٹھ جانے پر مجبور نہ کر ڈالتی۔ وہ اس وقت سوائے اسکے اور کیا کر سکتا تھا کہ چپ چاپ بیٹھا ماتم کرے اور دل کی دھڑکنوں کو گنتا رہے

آج کا دن نہایت خوشگوار تھا سورج نہایت آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سمندر بھوکے شیر کی طرح رہ رہ کر غرا رہا تھا۔ مضطرب اور بیکل موجیں ساحل سے آ آ کر ٹکراتیں اور ناامید ہو کر واپس لوٹ جاتیں۔ کنارے پر ریت خوب چمک رہی تھی کھڑکی سے دور دور کی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ دور سمندر سے بائیں جانب ایک مندر دکھائی دے رہا تھا اس کے سنہرے کلس سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے یکایک پال والی ایک کشتی اسکی نظروں کے سامنے گزری یہ متعجب تھا کہ یہ کونسی چیز ہو سکتی ہے۔ کیا یہ کوئی پرندہ ہے؟ اسکی نظریں یکایک چند بگلوں پر پڑیں جو اڑتے ہوئے مندر کی طرف جا رہے تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ نہیں پرندہ نہیں ہے ہیں وہ بڑبڑایا " تو وہ سفید بہتی ہوئی چیز کیا تھی ؟

آہستہ آہستہ اسکا خوف زائل ہوتا جا رہا تھا کمزوری دل استقامت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اب اُس نے اپنی ماں کو بلانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ خوشی کے جھولے میں جھول رہا تھا وہ حد سے زیادہ مسرور تھا۔ آنکھوں کی روشنی عود کر آنے کی وجہ سے۔

ہوا کے جھونکے سے کاغذ کا ایک بڑا سا ٹکڑا اسکے سامنے آ کر گرا۔ کیا یہ آدمی ہے؟ اُس نے خیال کیا۔ شور خ لہروں کی ساحل سے ٹکرانے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ یہ سمندر ہے۔ اُس نے صحیح اندازہ لگایا۔ لیکن کیا سمندر اس کا نام ہے۔ جہاں لہروں کے پیہم ٹکرانے کی وجہ سے ایک سپید کف سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یا سمندر نام ہے موجوں کے زیر و بم کے لامتناہی سلسلے کا جو افق سے جا ملا ہے ——

ایک لڑکے کا سایہ، ریت پر دکھائی دیا۔ کیا وہ آدمی تھا؟ اُس نے سوچا۔

آئینہ کے بارے میں اُسے کوئی خاص تجربہ نہیں تھا اور اگر وہ کسی سے اسکے متعلق کچھ دریافت بھی کرنا چاہتا تو وہ مجبور تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر نے منع کر رکھا تھا کہ اُسے آئینہ کبھی نہ دیکھنے دیا جائے اور اسکی تعمیل پورے طور سے کی گئی تھی۔ ڈاکٹر کو کئی بار ہسپتال میں بہت سے تجارب حاصل تھے کہ بہت سے پیدائشی اندھے پہلے پہل آئینہ دیکھ کر پاگل ہو گئے تھے۔ اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ رتن کی ماں جسکی بےچینی اسکے تمام خیالات پر حاوی ہو چکی تھی۔ دبے پاؤں دروازے کے پاس آئی اور دستک دی۔

رتن نے دستک سنی وہ اسکا مطلب بھی سمجھ گیا اور یہ بھی جان گیا کہ دروازہ پر کون ہے۔ اسکی ماں نے دوبارہ دستک دی اور اندر سے رتن کو یہ کہتے ہوئے سنا " ابھی نہیں " وہ زور سے بول رہا تھا " میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں دیکھ سکتا ہوں ——

اسکے جواب میں رتن نے خوشی کی ایک چیخ سنی " لیکن .... ابھی نہیں " وہ چلی گئی۔ اور جب اُسکے قدموں کی چاپ مدھم پڑ گئی تو یہ سنبھل کر پلنگ سے اٹھا اور چند قدم چل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُسے اپنے جسم کا توازن قائم رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو کسی طرح سامنے رکھے ہوئے صوفے تک پہونچایا اور کسی نوزائیدہ خوف سے مغلوب ہو کر صوفے پر دبک کر بیٹھ رہا۔

ایک بار پھر پہلے کی طرح اسکا خوف زائل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی حالت پر مسکرایا۔ اُس نے سب کچھ پہلے سوچ لیا تھا۔ اب کسی بات کا غم کرنا بیکار تھا اُسکا ضمیر اسکی کمزوری دل پر خنداں تھا۔ ساتھ ساتھ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کی تمام چیزیں۔ میز۔ کرسی، الماری، تصاویر، اس پر ہنس رہی ہیں جیسا بے طرح ہنس رہی ہیں۔ قہقہے لگا رہی ہیں۔ اُنکا مخلوط قہقہہ اُسے سنائی دے رہا تھا اُس کے جبڑے پھڑکنے لگے۔ زبان خشکی کے باعث تالو سے چمٹ گئی۔ پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اور وہ زور سے سانس لینے لگا۔

یکایک اسکی ماں نے دروازہ کھٹکھٹایا اُسکا سلسلہ خیال ٹوٹا۔ اُس نے جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن الفاظ حلق میں آ کر اٹک گئے۔ اسکی ماں نے دوبارہ کھٹکھٹایا۔ اس مرتبہ یہ جان بوجھ کر چپ رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ابتک ماں کی صورت دیکھنے کا وقت نہیں آیا۔ اُس نے سوچا کیا وہ ماں کو دیکھنے کی خوشی برداشت کر سکیگا اُس نے ایک بار پھر سمندر اور آسمان پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔

اسی کشمکش میں دو گھنٹے گزر گئے، وہ پژمردگی کی حالت میں صوفے پر پڑا رہا۔ اس دوران میں اسکی ماں نے دو مرتبہ دروازہ پر دستک دی لیکن دونوں مرتبہ اُس نے ایک ہٹی کی طرح دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا اور ہر مرتبہ وہ اسکی بات رکھتی رہی " ایک دفعہ اور " اُس نے دل ہی دل میں کہا اور ایک مسکراہٹ اُسکے لبوں پر کھیلنے لگی لیکن فوراً ہی یہ مسکراہٹ اسکے لبوں سے غائب ہو گئی۔

"یہ کیا ؟" وہ آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ وہ جل رہی تھیں، وہ تیزی سے اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

کیا اُسکی بے بصری واپس آ رہی تھی اُس نے کئی مرتبہ آنکھوں کو بند کیا اور کھولا، اسے سمندر اور آسمان دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر قبل وہ سمندر کے کنارے اُگی ہوئی گھاس دیکھ سکتا تھا لیکن اب .... اب ہر چیز اُسکی نظر میں دھندلی نظر آ رہی تھی ہر طرف بہاڑ بہاڑ سا نظر آنے لگی تھیں۔ موجوں کی وہ سرمستیاں جن سے یہ تھوڑی دیر قبل لطف اندوز ہو رہا تھا اب کپکپاتی ہوئی تاریکی میں بدل گئی تھیں۔

مایوسیوں نے اُسکا دل بجھا دیا۔ وہ چپ چاپ پلنگ پر دراز ہو گیا اُس کی آنکھوں کی پتلیاں گردش کر رہی تھیں۔ در و دیوار اور کمرہ کی چیزیں اسکی نظر میں دُھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ اُسے ڈاکٹر کا کہنا یاد آیا کہ اسکی آنکھوں کی روشنی تھوڑی دیر کے لئے واپس آسکتی ہے۔ وہ فرطِ خوشی میں اس منحوس گھڑی کو بھلا بیٹھا تھا۔ لیکن اب وہی گھڑی اُسکی امیدوں کو پامال کرتی ہوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسکو گھپ اندھیرے میں چھوڑے جا رہی تھی۔ اُسے پھر تاریکی، لامتناہی تاریکی کی دنیا میں واپس جانا ہوگا۔

اس خیال سے وہ کانپ سا گیا۔ "نہیں ——— نہیں ——— ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس رنگین دُنیا کی ایک جھلک، چند لمحات کی خوشی، دُنیا اور دُنیا کے عجائبات کو دیکھکر ——— پھر ہمیشہ کی طرح اندھا ہو جانا۔ بقیہ زندگی کے لئے ——— ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

وہ درد سے کراہنے لگا۔ اُسکی آنکھوں پر تاریکی کے پردے پڑتے جا رہے تھے۔ اُسکے ہاتھوں سے دامنِ استقلال چھوٹ گیا۔ وہ اپنی قسمت کی اس ناانصافی کو جو اسکے ساتھ برتی گئی تھی کوسنے لگا۔

قسمت نے اُسے ایک نئی زندگی سے دوچار کرکے کس طرح اُسکا مذاق اُڑایا تھا۔ یہ سوچکر اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، وہ اٹھا اور اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ تو اُس نے کھول دیا لیکن اسکے پاؤں لڑکھڑا گئے اور وہ چوکھٹ پر گر پڑا۔ اُس پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور دوسرے لمحہ وہ چوکھٹ پر ڈھیر ہو کر پڑ گیا۔

ہوش آنے پر اُس نے آنکھیں کھول لیں۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا۔ شاید وہ دوسری دُنیا میں آگیا ہے۔

کیونکہ وہ دیکھ سکتا تھا، فضا پر ایک ہلکی سُرخی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کی ماں کا چہرہ جسے اُس نے کوئی فرشتہ خیال کیا اُس پر جُھکا ہوا تھا۔

"رتن کیا تم مجھے دیکھ سکتے ہو؟"

"ہاں ——— لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا — آخر بات کیا ہے؟"

وہ جُھک گئی اور رتن کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے بولی:-

"تمہیں استفسار نہیں کرنا چاہئے بلکہ میں جو کچھ بھی کہوں، اسے بالکل صحیح ماننا چاہئے؟"

"میرے خیال میں میں نے اس سے قبل بھی ان ہی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ شاید وہ فریب نظر ہو۔ چونکہ فوراً ہی بے بصری عود کر آتی تھی اور ...." وہ بڑبڑایا،

"نہیں" وہ زور دیتے ہوئے بولی "تم دیکھ سکتے ہو۔ یہ غلط ہے کہ تمہاری بے بصری عود کر آئی تھی۔ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ رات کی آمد سے دن کی روشنی غائب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی قصہ تمہارے ساتھ ہوا رات کی آمد سے دن کی روشنی تاریکی میں تبدیل ہو رہی تھی اور تم سمجھے کہ تمہاری آنکھوں پر تاریکی کے پردے پڑتے جا رہے ہیں، تمہارے ساتھ یہ بات نئی تھی اس لئے تم غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ ورنہ تمہاری آنکھوں کی روشنی اُس وقت بھی قائم تھی اور اب بھی ہے۔"

رتن کئی گھنٹے تک اس بات پر غور کرتا رہا گو وہ بالآخر سمجھ گیا لیکن سمجھنے کی طرح نہیں۔

نشاط سعید

مسافر

مرے قلبِ حیراں میں اک روشنی ہے نمایاں ہر اک شے سے اک زندگی ہے
بڑھا جا رہا ہوں نئی منزلوں میں مجھے اپنی منزل سے خود آگہی ہے
تڑپ ہے کہ مجبور کرتی ہے دل کو خودی ہے کہ راہِ عمل کھینچتی ہے
مری رہنما آج میری خودی ہے سکوں آشنا ہوں، مگر ہوں پریشاں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

مرا قلبِ مضطر امیدوں کا دفتر تلاطم میں جذبات کا ہے سمندر
کبھی یورشِ غم، مسرت کبھی ہے اسی کشمکش میں ہے ہستی برابر
کبھی خوف دل میں ہے تاریکیوں کا امیدوں کی دُنیا کبھی جلوہ گستر
بناؤں گا اک آشیاں سب سے بہتر اُمیدوں کی دل میں ہیں شمعیں فروزاں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

نئی ضو فشانی سے دُنیا بناؤں فضائے ہستی کی رونق بڑھاؤں
رہِ زیست میں ہر طرف ہو چراغاں پھُوں خود ہی شمعوں میں خود جگمگاؤں
یہ جی چاہتا ہے کہ اپنی ضیا سے میں انسان کو راہِ منزل دکھاؤں
میں انساں کو غفلتوں سے جگاؤں فضائیں ہوں میری ہی ضو سے درخشاں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

میں دُنیا میں عالم نیا دیکھتا ہوں نیا ایک طوفاں بپا دیکھتا ہوں
ہر اک شے میں مستور اک زندگی ہے ہر اک شے میں اک حشر سا دیکھتا ہوں
نئے دَور کی ہر طرف روشنی ہے نئے دَور میں اک ضیا دیکھتا ہوں
نئے دَور میں اک وفا دیکھتا ہوں نئے دَور کی ضو سے عالم ہے رخشاں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

یہ دلچسپ دُنیا، یہ رنگیں نظارے یہ پُر کیف راتیں، یہ روشن ستارے
یہ وقتِ سحر نور کا ایک دریا یہ پھولوں کے پُر کیف زریں شرارے
ہر اک چیز معمور ہے زندگی سے ہر اک شے میں ہیں زندگی کے ترارے
ہر اک شے ہے دلکش مناظر ہیں پیارے کبھی میں ہوں ششدر، کبھی میں ہوں حیراں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

کبھی کھو رہا ہوں کبھی پا رہا ہوں کہیں ہوں فتادہ کہیں چھا رہا ہوں
کبھی گم ہوں دُنیا کی پیچیدگی میں کبھی رازِ فطرت کے سلجھا رہا ہوں
کبھی میرے ہاتھوں میں سازِ خودی ہے کبھی نغمۂ بے خودی گا رہا ہوں
مگر دھن میں اپنی چلا جا رہا ہوں مجھے روک سکتا نہیں کوئی طوفاں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

مذاہب کی وادی کبھی رہگذر ہے کبھی میری گہرائیوں میں نظر ہے
رگِ جاں سے نزدیک پاتا ہوں اس کو جو ہستی کا خالق ہے اور دادگر ہے
ہے عرفان مجھ کو حقیقت کا اپنی مرا ناخدا بھی مرا ہم سفر ہے
مری راہ دشوار ہے پُر خطر ہے مگر ہے مرے ساتھ میرا نگہباں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

کبھی دیکھتا ہوں سیاست کا عالم کبھی دیکھتا ہوں میں قوموں کا دم خم
ہم آویزہ ہیں آج فرد و جماعت کبھی اس میں یہ ضم، کبھی اس میں وہ ضم
سیاست کے یہ سور ما جانتے ہیں کبھی ہوں یہاں ہم کبھی ہوں وہاں ہم
علم ہر جگہ نصب کرنا ہے محکم ہے چاروں طرف ایک محشر، مگر ہاں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

سیاست سے اُلجھوں کہ مذہب کو پرکھوں کہ سب سے الگ ہو کے فطرت کو سمجھوں
کہیں جنگ ہے رشح اور حادثے ہیں کہیں ہے سیاست میں انصاف کا خوں
جدھر دیکھتا ہوں پریشانیاں ہیں ہے دنیا سے مفقود تسکیں کا افسوں
پریشاں مناظر میں کس طرح دیکھوں رہِ زیست دشوار ہے اور آساں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

اک انساں ایسا ہے میری نظر میں نہ اُلجھے نظر جس کی سیم اور زر میں
جواں ان ہو جس میں انسانیت ہو بڑھے جائے آگے رہِ پُر خطر میں
جوانسانیت کو نیا پیرہن دے بنائے نیا جادہ راہِ سفر میں
رہے بن کے پامرد ہر رہگذر میں تخیل میں ہے ایک انسان پنہاں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

الٰہی مجھے اک نئی زندگی دے مری زندگی کو نئی آگہی دے
پریشاں نیاں آشنا ہوں نہ مجھ سے کچھ ایسی مجھے خود سے بیگانگی دے
عطا کر مرے قلبِ مضطر کو تسکیں سکوں خیز اک جذبۂ بے خودی دے
مسافر ہوں مجھ کو نئی روشنی دے جو آثارِ منزل کو کر دے نمایاں

چلا جا رہا ہوں خراماں خراماں

محمد صادق ضیا

دوست

"لطیف کے نام"

اے امامِ عارفاں اے پیرِ رومؒ — خاکِ پاکت نسخۂ اکسیرِ دوم
فکر تیری رہنمائے قدسیاں — مجھ پہ ہو اس شعر کا مطلب عیاں

"خشک تار و خشک مغز و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست"

"آبتاؤں میں تجھے ہے راز کیا" — "دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا"
دوست حسن و عشق کی معراج ہے — دوست فرقِ زندگی پر تاج ہے
دوست کیا ہے اک جہانِ رنگ و بو — جو پسینے پر ترے بہا دے لہو
دوست کیا ہے اک نویدِ جانفزا — یا شہیدِ عشق مجروحِ وفا
دوست کیا ہے آبروئے دو جہاں — دوستی ہے رونقِ کون و مکاں
دوست کیا ہے محرمِ رازِ حرم — پیکرِ ایثار و اخلاص و کرم
دوست کیا ہے غمگسارِ زندگی — کامیاب و کامگارِ زندگی
تار کیا ہیں سوزِ دل کا ساز ہیں — زخمہ و رگ کے درد کی آواز ہیں
مغز کیا ہے دردِ روحِ دوست ہے — اور نامِ دوست اُسکا پوست ہے
دوستی ہے زیست کی روحِ رواں — دوست کا دیدار ہے جنت نشاں
دوست کی آواز ہے فردوسِ گوش — دوست کی قربت ہے جانِ عقل و ہوش
دوستی کا مدو ہے دردِ لطیف — ہم جلیس و ہم خیال است و لطیف
روح کی تسکین دیدِ روئے دوست — مغز کی تکمیل خوئے بوئے دوست

"آدمی دید است و باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است"

جستجوئے ہمسفر و ہم نفس — توڑ دیتی ہے دو عالم کے قفس
ہے محبت باعثِ آرامِ جاں — سرفراز و سرخروئے دو جہاں
آدمیت ہے مگر اسکا کمال — پاک بینی پاک بازی کا مآل
دوستداری سے جو دل ہو بے خبر — عشق میں پیدا نہیں ہوتی نظر
بے نیازی دل کی ہے ایسا انعام — دوستی کو بخش دیتا ہے دوام
ہے محبت دو جہاں میں محترم — مفلسی میں دوستی دارا و جم
زندگی اک نغمۂ بے تاب ہے — دوستی اس ساز کا مضراب ہے
کیونکہ بابِ زیست کا مضموں ہے دوست — اس غزل کا مصرعِ موزوں ہے دوست
آرزوئے دوست ہے نورِ حیات — روشنی بخشِ ضمیرِ شش جہات
کارزارِ زندگی میں دل کے تار — دوستداری ہے مگر دل کا وقار
دل کے آئینے پہ آجاتا ہے زنگ — کھولنے لگتا ہے خونِ جل ترنگ
زندگی ہے صبحِ خیزاں کی بہار — محرم و دمساز اسکا اعتبار
ہے دو عالم میں عیاں فیضِ ندیم — دوستی کی ضرب ہے ضربِ کلیم
سنگ سے کرتی ہے جاری جوئے آب — چشمۂ حیواں بنے موجِ سراب
التفاتِ دوست تسخیرِ حیات — خاکپائے دوست اکسیرِ حیات
دوستداری دل کو پیغامِ شفا — خاک کو اوجِ ثریا کی عطا
دوست کی مے سے تہی پیمانگی — ہے بڑی دوں فطرتی دیوانگی

در پریشاں حالی و درماندگی
دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست

(((عبدالکریم ثمر)))

دشمن

خوشی تھی۔ قہقہے تھے زمزمے تھے خوش بیانی تھی سکوں تھا عافیت تھی عشرتیں تھیں نوجوانی تھی
سنہری صبحیں تھیں رنگیں شامیں چاندنی راتیں نیاز و ناز کی بے خوف ہوتی تھیں ملاقاتیں
اُمنگیں ولولے۔ جذبات۔ احساس۔ امیدیں مُرادیں آرزوئیں عشرتیں قسمت کی تائیدیں
چمن میں خوش خرامی۔ خوش جمالی خوشدلی ملکر لب جو خوش بیانی خوش نوائی چہچہے نغمے
سبھی کچھ تھا مگر دنیا حقیقت سے نہ تھی واقف طبیعت پاس تھی لیکن مسرت سے نہ تھی واقف
سمجھتی ہی نہ تھی اصلا سکوں کیا ہے خوشی کیا ہے؟ مسرت کس کو کہتے ہیں نشاطِ زندگی کیا ہے
دماغ و دل سے عرفان و یقیں کی دُور تھی منزل سکوں کو بے سکونی اور خوشی کو غم نہ تھا حاصل
عمل کا جوش ٹھنڈا تھا تساہل تھا ترقی پر اُمنگیں سو چلی تھیں اور تغافل تھا ترقی پر
نہیں تھیں نام لینے کو عمل سامانیاں پیدا وفورِ عیش نے کر دیں تھیں تن آسانیاں پیدا
دلوں میں بزدلی اور بے حسی نے گھر بنایا تھا ظہورِ جوش و ہمت کا کوئی موقع نہ آیا تھا
جوانوں کی جوانی سو رہی تھی بزمِ عشرت میں دلیروں کی دلیری بند تھی زندانِ غفلت میں
دلی جذبات بھڑکانے کو گلشن کی ضرورت تھی جگانے کے لئے دنیا کو دشمن کی ضرورت تھی

مسرت کے ترانوں ہی سے شیون ہو گیا پیدا
رفیقوں کی جماعت میں ہی دشمن ہو گیا پیدا

اگر دشمن نہ ہوتا تو تساہل راج فرماتا دلوں سے جوہرِ خود اعتمادی چھین لے جاتا
اگر دشمن نہ ہوتا تو مچلتیں غفلتیں دل میں اُبھر آتیں پیامِ خواب بنکر عشرتیں دل میں
اگر دشمن نہ ہوتا تو جوانمردی کہاں ہوتی جمود و بے حسی ہوتا یہ سرگرمی کہاں ہوتی
اگر دشمن نہ ہوتا تو رگِ غیرت سکڑ جاتی ہر اک آتشِ نفس کی زندگی پر اوس پڑ جاتی
اگر دشمن نہ ہوتا تو گھسی رہتی جھجھک دل میں نہ ہوتی بات کرنے کی بھی ہمت اہلِ محفل میں
اگر دشمن نہ ہوتا تو نہ ہوتا کچھ بھی اندازا شجاعت کا دلیری کا حکومت اور طاقت کا
اگر دشمن نہ ہوتا تو نہ ہوتی آبرو کچھ بھی ہجومِ خود پسندی میں خلوص و مہر و الفت کی
اگر دشمن نہ ہوتا تو نہ ہوتا فکر کا جذبہ زمانے سے تدبر کا جنازہ اُٹھ گیا ہوتا
دلوں میں کامرانی کے ارادے گھٹ کے رہ جاتے خیالوں میں نشانِ نصرتِ دلخواہ لہراتے

تمناؤں کے کاندھوں پر جنازہ "فتح" کا ہوتا ترانے کی بجائے جوشِ دل کا مرثیہ ہوتا
دلوں میں جرأت و ہمت کا جذبہ تھک گیا ہوتا نہ لڑنے سے ہزاروں دشمنوں کا خون ہو جاتا
نہ "زال و سام" ہی کا تذکرہ ہوتا کتابوں میں نہ "بھیم" ہوتا نہ "ارجن" ہی سمجھی ہوتی حجابوں میں

سکندر کا پتہ ہوتا نہ دارا کی خبر ہوتی
غرض تاریخِ دُنیا کی نہایت مختصر ہوتی

یہ دشمن ہے وہ شعلہ جس نے گرمایا ہے عالم کو یہ دشمن ہے وہ بجلی جس نے بھڑکایا ہے عالم کو
یہ دشمن ہے وہ کانٹا "کھٹکھٹاتی" ہے کھٹک جسکی یہ دشمن ہے وہ بھالا ضو بڑھاتی ہے چمک جسکی
یہ دشمن ہے وہ پتھر جو کبھی ٹھوکر اس سے کھاتا ہے طریقِ زندگی میں بچ کے چلنا سیکھ جاتا ہے
یہ دشمن ہے وہ مارِ آستین جب پھن دکھاتا ہے دلوں میں غیرت و احساس کا طوفان اُٹھاتا ہے
یہ دشمن ہے وہ طوفاں جب بھی اسکی باڑ آتی ہے جمود و بے حسی کے "بند" سارے توڑ جاتی ہے
یہ دشمن ہے وہ آندھی جب بھی جھونکا اسکا آتا ہے بگولوں کی طرح جذبات دل میں جھوم جاتے ہیں
یہ "نشتر" جب کھٹکتا ہے رگِ غیرت بھڑکتی ہے دماغ و دل کے احساس کی چھاتی دھڑکتی ہے
یہ "خنجر" جب چمکتا ہے شجاعت جھوم جاتی ہے اُمنگیں رقص کرتی ہیں دلیری مسکراتی ہے
اسی "کانٹے" سے ہوتا ہے مسرت کا کنول پیدا یہی کرتا ہے نصرت کی تمناؤں میں چہل پیدا
اسی "شاطر" سے دنیا چال چلنا سیکھ لیتی ہے اسی کی چال سے اُلٹی اُسے پھر مات دیتی ہے
اسی "مکار" سے ہوتی ہے دل کو آگہی حاصل اسی سے لڑ کے ہوتا ہے فروغِ زندگی حاصل
اسی "عیار" کی عیاریوں سے ہوش آتا ہے جوانی غیض میں آتی ہے دل کو جوش آتا ہے
اسی "چالاک" کی چالاکیاں چالاک کرتی ہیں حصولِ کامیابی کے لئے بیباک کرتی ہیں
دبا کر اسکو لہراتی ہے نصرت کا نشاں دنیا مٹا کر اسکو پاتی ہے حیاتِ جاوداں دنیا

ہے دشمن بھی شریکِ مستقل تقدیرِ عالم میں
ہوا ہے صرف اسکا خون بھی تعمیرِ عالم میں

—— ((صبا متھراوی)) ——

بیادِ اختر

سنسان جنگل، پُرہول منظر ہمدم ہے کوئی اپنا نہ رہبر
غم کی گھٹائیں چھائیں ہیں سر پر شکرِ کرم اے چرخِ ستمگر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

کس کو سناؤں اپنی کہانی کس کو دکھاؤں سوزِ نہانی
یہ زندگی ہے کیا زندگانی اس زندگی سے مرنا ہے بہتر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

یہ دشتِ غربت اور یہ مصیبت افسوس قسمت، صد حیف قسمت!
ظالم ہے کتنی معصوم فطرت چھڑکا نمک پھر زخمِ جگر پر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

رخصت ہے مجھ سے وہ میرا پیارا وہ میرا پیارا، آنکھوں کا تارا
غربت میں مجھ کو بے موت مارا بے رحم قسمت! ظالم مقدر
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

رمزِ سخن سے وہ باخبر تھا ذوقِ ادب سے وہ بہرہ ور تھا
خوش کار و خوش خو وہ خوش نظر تھا وہ کون؟ اختر، ہاں میرا اختر
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

اے میرے خالق تیری عنایت رنگیں بنا دی میری حکایت
آتا ہے لب پر حرفِ شکایت دل سے نکل کر، بیتاب ہو کر
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

حکمت سے تیری کیا دُور تھا یہ قدرت سے تیری کیا دُور تھا یہ
رحمت سے تیری کیا دُور تھا یہ رہتا جہاں میں کچھ اور اختر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

دُنیا پڑی تھی، سارا جہاں تھا مارا اُسے کیوں جو نوجواں تھا
مرنے کے قابل میں ناتواں تھا آیا نہ تجھ کو کچھ رحم مجھ پر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

دنیا ہے فانی، یہ میں نے مانا دُنیا سے آخر ہے سب کو جانا
لیکن کہیں ہے میرا ٹھکانا؟ یہ تیری جنت' دوزخ ہے یکسر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

سہنے دے مجھ کو اے میرے داور رحمت ہے تیری شاید ستمگر
ظالم نے مارا وہ تیر دل پر جینا ہوا ہے اب مجھ کو دوبھر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

ذوقِ جبیں کو ٹھکرا دیا کیوں؟ حسنِ یقیں کو شرما دیا کیوں؟
قلبِ حزیں کو تڑپا دیا کیوں؟ مجھ کو ملا کیا، یہ داغ دیکر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

میری دُعا سے یہ بے نیازی! ہر التجا سے یہ بے نیازی!
اہلِ وفا سے یہ بے نیازی! کافر ہو آئے جو تیرے در پر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

گستاخ! یہ کیا طرزِ فغاں ہے بیباک کتنی تیری زباں ہے!
اُس بارگہ میں شعلہ فشاں ہے جلتے ہیں جس جا جبرئیلؑ کے پَر!
اللہ اکبر، اللہ اکبر!

راز چاندپوری

---

[1] سنہ ۱۹۴۱ء اور سنہ ۱۹۴۲ء میں دو نوجوان لڑکیاں داغِ مفارقت دے چکی تھیں۔

دیوانِ محبت

اک نغزہ نو چھیڑ بعنوانِ محبت
اے مرغِ نوا سنجِ گلستانِ محبت

خاموش ہیں لب دل میں ہے طوفانِ محبت
یہ آنِ محبت ہے تو وہ شانِ محبت

تو عشق میں آلودۂ تقویٰ ہے ابھی تک
دھو ڈال یہ داغِ سرِ دامانِ محبت

لغزش پہ مری وجد میں آجائیں فرشتے
دیدے مجھے وہ ساغرِ عرفانِ محبت

پابندِ خرد ہے تری محتاط خرامی
آزاد روی مسلکِ مستانِ محبت

بیمارِ الفت کی دعا ہے نہ دوا ہے
عیسیٰؑ سے بھی ممکن نہیں درمانِ محبت

جو دل کہ نہیں درد کی لذت سے شناسا
وہ دل نہیں شائستہ شایانِ محبت

آغازِ محبت ہے جب اپنے کو بھلا دے
وہ یاد نہ آئیں تو ہے پایانِ محبت

کہتے ہیں حسامی جسے آشفتہ نوا ہے
دیوانے کا ہر شعر ہے دیوانِ محبت

حسامی مانکپوری

آسودگیٔ خیال

تیرے کرم سے ہم نہ تری برہمی سے ہم
اپنے لئے وبال ہیں خود عاشقی سے ہم

تخریبِ زندگی بھی ہے تعمیرِ زندگی
یہ جانتے تو جان نہ دیتے خوشی سے ہم

غم بھی اک اضطراب خوشی بھی اک اضطراب
گھبرا رہے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم

تقدیر کو بھی تابعِ تدبیر کر لیا
پھر بھی نہ رہ سکے کبھی آسودگی سے ہم

ہر ذرہ ہے بجائے خود اک سنگِ آستاں
جائیں کہاں نکل کے حدِ بندگی سے ہم

امید کیا، فریب ہے اک مستقل فریب
اکثر بھٹک گئے ہیں رہِ راستی سے ہم

رکھا نہیں ہے راہ میں پہلا قدم ہنوز
منزل کے خواب دیکھ رہے ہیں ابھی سے ہم

دامن بھی ساتھ دیگا گریباں کا ایک دن
مایوس کیوں ہوں رحمتِ دیوانگی سے ہم

صادق کہیں تو کیسے کہیں اُن سے اپنا حال
ڈرتے ہیں انکی بے سبب آزردگی سے ہم

صادق اندوری

روحِ رواں

تو استحاد کون و مکاں کر سکے تو کر
یوں زینتِ زمین و زماں کر سکے تو کر

سجدے ہیں تیرے خالیِ داغِ جبینِ ننگ
یہ کام بے جبین و نشاں کر سکے تو کر

کیا فائدہ بہار کو سمجھا اگر بہار
اس پر بھی اعتبارِ خزاں کر سکے تو کر

دیوانے کیوں ہے سامنے حدِّ تعینات
اک سجدہ غارتِ دو جہاں کر سکے تو کر

بے جان یہ تخیلِ ہستی ہے دیر سے
تحلیل اس میں روحِ رواں کر سکے تو کر

ظالم دلِ غریب پہ کیا مشقِ برہمی
برہم مزاجِ کون و مکاں کر سکے تو کر

سنکر جسے فرشتے پڑھیں عرش پر نماز
اتنی بلند اپنی اذاں کر سکے تو کر

اے آرزو نہیں ہے زمانے میں کوئی دوست
دشمن پہ دوستی کا گماں کر سکے تو کر

آرزو اکبر آبادی

جنونِ شوق

اُمید تو ہے مگر دل امیدوار نہیں
نہیں کہ مجھ میں ابھی تابِ انتظار نہیں

بہار سی ہے بہار اور کبھی خزاں سی خزاں
جنونِ شوق کا باقی کوئی مدار نہیں

زمانہ کیوں نہ ہو ناسازگار میرے لئے
میں خود ہی رنگِ زمانہ کو سازگار نہیں

ڈبو دیا مجھے غیرت نے اُف پشیمانی
تری نگاہ مگر اب بھی شرمسار نہیں

مرے ہی دم سے ہے زندہ جہاں میں نامِ وفا
وفا پرست ہے دُنیا وفا شعار نہیں

یہ حسن و عشق کی تکرار بھی ہے قابلِ دید
کسی کی جیت نہیں اور کسی کی ہار نہیں

یہ اور بات ہے میں قابلِ کرم نہ ہوا
گناہ کرنے سے ورنہ گنہگار نہیں

سکوں کے ساتھ ہے دل کو ازل سے ضد صابر
یقین کون کرے آپ بے قرار نہیں

صابر اکبر آبادی

سنہ ۱۹۴۴ء ۱۳۶۳ھ کے تاریخی نام اور مادّے

لڑکوں کے نام سنہ ۱۳۶۳ھ

افا امیر علی
ابوالظفر عباسی
اشرف علی عثمانی
اظہار حسین حسینی
انتخاب الدین صدیقی
زک محمد خاں
تصدق حسن خاں
تفقد حسین خاں
تفضّل احمد
توضیح الحق
چراغ حسین زیدی
خواجہ شبر علی حسینی
خواجہ علی شیر حسینی
خوش کردار بیگ
ذرّیت احمد
غب حسین بیگ
رضا الرحمٰن بیگ
رضی الحق صدیقی
سراج زماں نظامی
سید تخلیق الحسن
سید تہذیب العالم
سید سرور علی چشتی
سید محمد مقدر علی چشتی
سید محسن علی نظامی

سید محمد مجیب عالم نظامی
سید محمد ممدوح جہاں نظامی
سید نظر الزماں
شرف الاسلام قریشی
شیخ برہان الدین
شیخ رحیم الدین
شیخ کبیر نعمانی
شیخ محمد امیر علی
شیخ محمد سلیم نعمانی
شیخ محمد عابد عالم عباسی
شیخ محمد عزیز احمد صدیقی
ظفر جنگ علی
ظہیر علی حسینی
ظہیر مرزا
عبد البلیغ صدیقی
عظیم الزماں صدیقی
عقیدت حسین خاں
غالب الرحمان
غفران بیگ
غلام عباس حسینی زیدی
فتحمند علی عثمانی
فیض القدیر حسینی
قاضی سید اعجاز رسول
قاضی محمد رفیع
گذارش علی بیگ

لخت جگر علی
محفوظ الرحمٰن
محمد امانت حسین خاں
محمد رضوان صدیقی
محمد شہامت حسن فاروقی
محمد مشیر علی خاں
محمد طمانیت علی خاں
محمد عافیت جہاں خاں
محمد علی شیر خاں
محمد غلام نبی حسینی
محمد فیضان الرحمٰن
محمد کریم نظامی
محمد شرف خاں
محمد مہتاب علی چشتی
محمد نیر اعظم
مخدوم احمد قریشی
مرزا امام رضا بیگ
مرزا امام ضامن علی بیگ
مرزا دلکش علی خاں
مرزا شیخ الاسلام بیگ
مرزا فرخندہ قدم بیگ
مرزا عظیم بیگ
مرزا محمد اکرام علی خاں
مستفید حسن خاں
مستمند حسن خاں

غلام حیدر خاں
غلام خالق علی بیگ
غلام ربّ عثمانی
غلام مشکور النبی صدیقی
فیض احمد نظامی
محمد ارتضا احمد فاروقی
محمد رمضان علی خاں
محمد ظفر النبی عثمانی
محمد غلام علی عثمانی
محمد فیض رساں خاں
محمد نظیر العثمان

مرزا نمد الدین خاں
مظفر احمد عثمانی
مظفر جنگ خاں
مظہر الدین احمد خاں
منظر حسین عثمانی
منصب علی خاں نظامی
میر محمد مرتضیٰ حسین علوی
وفادار خاں نظامی

لڑکیوں کے نام سنہ ۱۳۶۳ھ

اصغری بیگم
اکلیل جواہر خاتون
بہرہ مند خاتون
پیکر جمال خاتون
تمکین النساء خانم
جمال پیکر خاتون
جواہر نما خاتون
خوبصورت بانو
صغرا بیگم
عبرت خانم
عدل آرا خاتون
کرم الٰہی خاتون
لطافت النساء خانم
ممنون احسان خاتون
مشفق النساء خانم
ناز حرم خاتون
نجم الآفاق خاتون

لڑکیوں کے نام سنہ ۱۹۴۴ء

ظہور النساء خانم
حشمت الزمانی خاتون

لڑکوں کے نام سنہ ۱۹۴۴ء

اختر محمد خاں
ترغیب حسن صدیقی
رغبت حسین صدیقی
سید محمد انتظار علی علوی
سید معتقد علی رضوی
شفاعت محمد نظامی

مادّہ جات متعلق پیدائش سنہ ۱۳۶۳ھ

گلِ دولت نو شگفتہ ہوا۔
برآمدِ عشرت افزا ہوا
بخوبی برآمد ہوا آفتاب۔
ظہورِ قطبِ عالم۔
یہ پیدا ہوا فخرِ عیش بہاں۔
شد دولت طالبِ حسنِ مراد۔

مادّہ جات متعلق وفات سنہ ۱۳۶۳ھ

کرد رحلت از جہانِ ابتلا۔
زینتِ خلدِ بریں۔
داخلِ فردوس شد جارو زباں۔
رونقِ فردوس شد صدرِ جہاں۔
انتقالِ آفتابِ نامور۔
بجھ گیا ہے اب چراغِ زندہ دل۔

قمر تقوی جے پوری

قسط یازدہم :- (سلسلہ کے لئے "شاعر" نومبر ۶۲ء دیکھئے)

.... کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں ـــ بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرے کے بعد میسور کے تاریخی مقامات کی سیر)

وسطی حال میں بعض تصاویر کافی بڑی ہیں سب پر ایک جھلکتی ہوئی نگاہ ڈالتے چلے جارہے ہیں ـــ "ذرا یہ تصویر دیکھئے"! ہم میں سے کسی نے کہا اور سب پُر اشتیاق نگاہوں کے دامن کو تیزی سے سمیٹ کر تصویر کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ہندوستان کے قریب قریب تمام عجائب خانوں کی تصاویر میں نے دیکھی ہیں اور اُن میں سے بعض کو بے انتہا پسند بھی کیا ہے لیکن اِس وقت جو تصویر پیشِ نظر ہے وہ آرٹ کا بلند ترین مظہر ہے اور ایسا مظہر کہ اُس کے خالق کی انگلیوں کو تمام عمر چومتے رہنے کو جی چاہتا ہے ـــ ایک دوشیزہ ـــ اُس کے اُلٹے ہاتھ میں شمع ـــ ہاتھ اُبھرے ہوئے سینہ سے کچھ قریب۔ بہ ایں خیال کہ ہوا سے شمع بجھ نہ جائے۔ سیدھے ہاتھ سے اُس کی لَو کو کسی قدر چھپا رہی ہے۔ اِس کوشش و کاوش میں کچھ روشنی اُس کی انگلیوں کے درمیان سے چھن کر باہر آرہی ہے اور ہاتھ کی آڑ ہو جانے کی وجہ سے پوری روشنی سینہ پر لوٹ رہی ہے، مطلقاً یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ایک نور ہے جو سینہ پر لہرا رہا ہے۔ ایک قندیل ہے انتہائی تاباں اور فروزاں، ایک آفتاب ہے جگمگاتا ہوا۔ آرٹ اور اتنا کامیاب! نقل اور اصل سے اس درجہ مطابق؟! خیال ہوا کہ شاید اس کے پیچھے بجلی کا قمقمہ لگا دیا گیا ہو۔ محل کے آدمی سے کہا تو اُس نے تصویر کی پشت بھی دکھا دی، یہی نہیں بلکہ کمرہ کی تمام بتیاں بجھا دیں، تاریکی میں یہ نور اور بھی زیادہ نازنگر نگاہ ثابت ہوا۔

اس محل کی سیر سے فارغ ہوئے تو تانگوں پر سوار ہو کر **نشاط باغ** کی سیر کرتے ہوئے **لال باغ** پہونچے۔ یہ ایک وسیع باغ ہے اور شادابی سے زیادہ چرندوں، پرندوں اور درندوں کی تماشا گاہ ہے، شیر۔ چیتے۔ گینڈے۔ مگر۔ ریچھ۔ بندر۔ شتر مرغ سانپ۔ غرض سیکڑوں قسم کی مخلوق یہاں موجود ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ یہ "جانورستان" ہر اعتبار مکمل ہو۔ جانوروں کے رہنے سہنے کا انتظام بھی بہت معقول ہے، یہاں بھی تقریباً دو گھنٹے صرف ہوئے۔ ½ ۲ بجے قیام گاہ کی طرف واپس ہو رہے ہے۔ تھے کہ راستہ میں حکیم میکش صاحب جالندھری نے شاد صاحب اور حکیم عبد المنتقم خاں صاحب تبسم کو دیکھ کر تانگہ رکوا لیا۔ جب تانگہ میں ہمیں دیکھا تو زبردستی اُتار لیا۔ شاد صاحب سے شکایت کر رہے ہیں کہ آپ صبح سے آئے ہوئے ہیں اور اطلاع بھی نہیں کی۔

میکش صاحب کو جب یہ بتایا گیا کہ اسی ٹرین سے بنگلور واپس ہونے والے ہیں تو وہ مچل گئے۔ بہر حال ہمارے اصرار سے کسی حد تک مان بھی گئے۔ ہم نے شاد صاحب کو قیام گاہ پر بھیجا کہ وہ وہاں سے سامان وغیرہ لے آئیں تا کہ یہیں سے روانہ ہو جائیں۔ کچھ دیر بعد شاد صاحب واپس آئے اور اُن کے ساتھ چند حضرات اور بھی تھے معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ قیام گاہ پر ہمارے منتظر تھے۔ انھیں شام کو ہماری آمد کی اطلاع ہو گئی تھی۔ عبد المتین صاحب بی۔ اے سکریٹری انجمن ترقی اردو بھی آگئے۔ سب کا یہ اصرار ہے کہ ہم آج بنگلور واپس نہ ہوں، اور ہمیں یہ فکر کہ اگر آج واپس نہ ہوئے تو آگے کا تمام پروگرام برہم ہو جائے گا۔ ہمیں ۷ر دسمبر ۶۲ء کو بمبئی پہونچنا ضروری ہے۔ مگر اصرار کرنے والوں کی قوتیں اِس وقت ہمارے انکار سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ ہر چند یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر ہم لوگ میسور میں کل ٹھہر گئے تو شدید نقصان ہوگا، مگر ایک نہ سُنی گئی۔ آخر کار رُکنا ہی پڑ رہا ہے، اسی وقت بمبئی تار دیا جا رہا ہے کہ ہم بجائے ۷ر دسمبر کے اب ۹ر دسمبر کو پہونچیں گے۔ جناب ٹی محمد خلیل صاحب زعیم آر۔ ٹی کنٹریکٹر جو ہمارے خضرِ راہ ہیں کسی طرح آج شب کو میسور میں نہیں ٹھہر سکتے وہ اسی ٹرین سے تشریف لئے جا رہے ہیں۔ ہمارا سامان وغیرہ حکیم عبد الواحد خاں صاحب میکش کے دولت کدہ پر پہونچ چکا ہے۔ حکیم صاحب کے مطب سے اُٹھ کر ایک اسٹوڈیو میں پہونچے اور بجلی کی روشنی میں سب کا فوٹو گروپ ہوا۔ میکش صاحب کے یہاں آکر کھانا کھایا اور باتیں کرتے کراتے ۱۲ بج گئے۔

۴ر دسمبر ۶۲ء

صبح آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ حوائجِ ضروری سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ملنے والوں کی آمد شروع ہو گئی۔ حسن نعمانی صاحب گردش۔ عبد الباسط صاحب قاتل۔ سراج الحسن صاحب۔ حضرت مولانا شاد ابو الحجر صاحب ادیب۔ احمد پیراں صاحب۔ جمیل صاحب کولاری۔ خانصاحب عبد الرحمٰن خاں سکانی پلانٹرد رئیس۔ عبد الغنی صاحب مدیر "نوجوان"۔ عبد القدوس صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ جعفر علی خاں صاحب وکیل۔ حکیم سید غوث محی الدین صاحب تشریف لائے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ زیادہ تر گفتگو کا موضوع اردو زبان اور میسور کی شاعری اور وہاں کے شعراء ہیں۔ معلوم ہوا کہ انجمن ترقی اردو کے اراکین نے رات ہی رات میں ہینڈ بل پوسٹر چھپوا کر ریاست میں ہر طرف چسپاں کرا دئے ہیں۔

اعجاز صدیقی

مستقل

مکتوبات

بھوپال
۱۵ر جنوری ۴۴ء

اعجاز بھائی ——— تسلیم و نیاز

ایک ہفتہ ہوا جب آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ کل جنوری ۴۴ء کا "شاعر" بھی نظر نواز ہوا۔ آپ کے خط کا جواب ابھی "زلفِ دراز" میں الجھا ہوا ہے ——— سردست مجھے محترمہ ہاجرہ مسرور کی "ادائے برہمی" پر چند سطور لکھنی ہیں جس کا اظہار موصوفہ نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۳ نومبر ۴۳ء مطبوعہ "شاعر" بابتہ ماہ جنوری ۴۴ء میں میرے ڈرامہ "ہار اکون" کو پڑھکر کیا ہے اور نہ صرف مجھ پر "سہام تنقید" سے بوچھاڑ کی ہے بلکہ آپ کو بھی نشانہ بنایا ہے ع

بر دوستاں ملامت کہ تو خنجر آزمائی!

میں موصوفہ کے "قیمتی مشورہ" کا شکر گذار ہوں۔ انکی موجودہ ادبی حیثیت صرف ایک "جانبدار" فسانہ نگار خاتون کی سی ہے اور یہاں ——— ع

مارا بجز حکایت مہر و وفا مپرس!

میں موصوفہ کے افسانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جہانتک "تنقید و تبصرہ" کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ موصوفہ "اندھیرے" میں بھٹک گئی ہیں۔ جس طرح موصوفہ نے میرے ڈرامہ پر تنقید فرمائی ہے اس کو دیکھکر مجھے حیرت بھی ہے اور افسوس بھی۔ حیرت اس بات پر کہ اگر موصوفہ میرے ڈرامہ "ہار اکون" کے افراد کی خصوصیات پر غور فرمالیتیں تو شاید مجھ پر اور اعجاز بھائی پر "چوٹیں" کرنے کی نوبت نہ آتی اور نہ ہی موصوفہ کو مجھے اور میرے مانند دیگر ادیبوں کو عورت کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دینا پڑتا۔ اور افسوس اس امر کا ہے کہ ایک بے بنیاد مفروضہ پر موصوفہ اسقدر آتش زیر پا ہو گئیں۔

موصوفہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "ہار اکون" کے افراد جیتے جاگتے کردار ہیں۔ ایک "مخصوص ماحول" کے افراد کی ذہنیت کو اجاگر کرنا، اپنی معاشرت کے حسن و قبح کا فکر پیش کرنا اور "لاابالی قسم کے انسانوں کا خاکہ اڑانا" اگر موصوفہ کی "نظر میں" کچوکے دیتا ہے تو ان حسنِ نظر، حسنِ مذاق اور حسنِ تنقید کے صدقے میرا ڈرامہ اگر ذاتیات سے ملوث ہے یا میں نے جانبداری سے کام لیا ہے یا اس میں عام معاشرت سے کوئی قابلِ اعتراض و گرفت چیز پیش کی ہے تو "اہلِ نظر" خود اس کا محاکمہ کرلیں گے۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ "ہار اکون" کی اشاعت سے صنفِ نازک کی کسی "نمائندہ" کے "حسِ لطیف" کو ٹھیس پہنچے گی۔ موصوفہ خود ایک فسانہ نگار خاتون ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اگر موصوفہ کو اپنے افسانوں میں حقائق کو عریاں کرنے کا "ادعا" ہے تو "ہار اکون" میں موصوفہ کو "اپنی ہار" کا شدید احساس کیوں ہے؟! ——— ہمیں زندہ اور حقیقت پسند ادب کی ضرورت ہے۔ موصوفہ کو یقین رکھنا چاہیئے کہ فن کا گلا مجھ جیسے "گمنام ادیب" نہیں کاٹینگے بلکہ اسکا گلا گھونٹنے والے وہ لوگ ہونگے جو "مغلوبانہ ذہنیت" رکھتے ہیں۔

اعجاز بھائی ——— وقت کی تنگی مجھے اس "سلسلۂ دراز" کے پھیلانے کی اجازت نہیں دیتی۔ رہا۔ آپ کا اور "ان کا معاملہ" تو وہ ایک "جنبشِ قلمِ اعجاز" پر ——— موقوف!!

پریما سلام لکھوا رہی ہیں

زیادہ والسلام

آپ کا ——— کنور پریمی

جودھپور
۱۷ر جنوری ۴۴ء

کرم گستر حضرت اعجاز صاحب صدیقی السلام علیکم

۱- پرسوں "نرالی دنیا" لاہور جنوری ۴۴ء کی ڈاک پال بیک وقت موصول ہوئیں ایک دفتر سے ایک گھر کے پتے سے۔

۲- یہ پرچہ سراپا بیہودگیوں سے لبریز ہے۔ ایسے پرچے صحافت میں کوئی درجہ نہیں رکھتے مجھے تو ان سے سخت نفرت ہے۔ خدا ہمیں ایسی بیکار باتوں سے بچائے

اللّٰھم فرغنی لما خلقتنی لہ ولا تشغلنی بما تکفلت لی بہ

۴۔ مجھے بڑا ملال ہے کہ میرا مضمون اس میں کیوں چھپا، لیکن یہ امر توضیح طلب ہے۔ ۱۹ نومبر ۱۹۴۳ء کو روشن نامی ایک صاحب کا خط موصول ہوا جس میں ایک مضمون کی فرمائش تھی (یہ خط ملاحظہ کے لئے بھیجا جا رہا ہے) چنانچہ "انسان کی تلاش" کا نیم سرکاری طور پر دفتر نشریات و اطلاعات سے بھیج دیا گیا وہ دسمبر میں تو نہیں اب جنوری میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے مجھے قطعاً علم نہ تھا کہ یہ کون صاحب ہیں اور ان کا پرچہ کس جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے ہر زمانے میں مصلح و خود دار ہستیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا ہے۔ آخر صداقت نے تاج کامرانی پہنا ہے اور ظالم سوسائٹی کی پیشانی ندامت کے پسینے سے نم آلود دیکھی گئی ہے علامہ سیماب (مدظلہ) ذی المجد والکرم کے لئے یہ آیت کافی ہے۔

ولا تحزن علیہم ولا تکن فی ضیق مما یمکرون (النمل)

۵۔ برادرم خرافات کا جواب لکھنا تو درکنار پڑھنا بھی تضیع اوقات و اشاعت جرم ہے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

حضرت مولانا مدظلہ کو سلام مسنون۔

محتاج دعا:—

ابوالاسرار رمزی آثاوی

گورنمنٹ ہائی اسکول امروہہ

پیارے بھائی، سلام شوق

خدا گواہ ہے کہ جسقدر خوشی تمہارا محبت نامہ ملنے کے بعد ہوتی ہے غالباً اور کسی صورت نہ ہوتی ہوگی۔ شکر ہی نہیں بلکہ فخر کرتا ہوں کہ تم مجھ مل گئے —— اور شاید مفت مایہ نہ سمجھ لینا کہ تم مفت کی چیز ہو —— واللہ انمول ——! لیکن تم کہیں مغالطہ میں نہ پڑ جانا۔ میرے لئے تم —— بس وہی ہو —— "میرا اعجاز" مگر تمہاری چٹکیاں میٹھی میٹھی ہونے کے ساتھ کبھی کبھی —— خیر مجھے اس میں بھی لطف آتا ہے، خدا تمہاری عمر دراز کرے اور تم یوں ہی ستاتے رہو لیکن یہ چغلیاں بھی مخصوص ہونی چاہئیں —— لو اب تو خوش ہوگئے —— برکلین کو دعائیں دے رہا ہوں۔ حالانکہ اگر مقابلہ کا موقع آگیا تو شاید بزرگ تم ہی ثابت ہوگے اس سے کہ تم "اشد" بھائی کے "دو" اور بچوں کے باجان کہلانے کے مستحق ہو۔

بھئی معاف کرنا، یہ معلوم ہو چکنے کے بعد بھی کہ تم اور مولانا قبلہ بجنور آرہے ہیں میں کسی طرح وہاں نہ پہونچ سکا۔ کیوں؟ اسکا جواب دیتے ہوئے مجھے تکلیف ہوتی ہے اس لئے نہ پوچھو، بلکہ شکر کرو کہ تم پھر آزاد ہو، بعض اوقات تو اپنی غلامی پر واقعی رونا آجاتا ہے۔ اب تم سے ملاقات آگرہ پہونچ کر ہی ہوگی لیکن اسکا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بقول تمہارے شاید بھاگتے دوڑتے ہی تم سے مل سکونگا۔ ڈیپارٹمنٹ نے ہندی کے امتحان کا سنٹر "آگرہ" مقرر کیا ہے اور میں اس زبان میں پرچہ دینے کے لئے آگرہ حاضر ہونگا۔ تاریخ سے پھر مطلع کرسکونگا۔

اچھا ہے تم مجھے فرشتہ ہی سمجھتے رہو۔ اعجاز، گویا آپ بڑے تیس مار خاں ہیں۔ اور اسی میدان کے مرد، چلو تم ہی فخر کرلو اس بات پر کہ تم ادھر کی بہت ہوائیں کھا چکے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ دل میں درد ہمارے بھی ہو سکتا ہے اور یہ ایسی چیز نہیں جسکی تشہیر کی جائے —— اسی لئے اگر اسکا تمہیں اپنا ہوتے ہوئے بھی علم نہ ہو سکے تو تعجب کی بات نہیں بلکہ میں خود سے بھی اس کو چھپاتا رہا —— ہاں اب وہ جنون ختم ہو چکا ہے، میں خوش ہوں اور یقیناً تم بھی اس سے آگاہ ہو ہی جاؤگے ——

ہاں سنو وہ مکتوب، اگر اس مرتبہ کے "شاعر" میں شائع نہ ہو سکا ہو تو جنوری کے پرچہ میں ضرور آجانا چاہئے۔ جانتے ہو کیوں؟ شاید یہی دو پرچے اُن تک پہونچ سکیں گے جن کے نام یہ ہے —— ورنہ اگر یہ نہ چھپا تو تم ایک "غیر معتبر نامہ بر" اور میری بد دعاؤں کے مستحق ثابت ہوگے۔ بھئی وہ نومبر کا پرچہ باوجود خط و کتابت کے ابتک نہ مل سکا اور تم نے اسکے دیکھنے کا جو اشتیاق دلایا ہے اس سے شدید بے چینی بڑھتی جاتی ہے

خدا کے لئے جواب ضرور لکھنا، تمہارے خطوط صحیح طور پر میرے فائل کی زینت ہوتے ہیں جنھیں اکثر میں پڑھ کر مسکرا لیتا ہوں ——

مولانا قبلہ کی خدمت میں آداب بھائیوں کو دعائیں ——

بھابی جان کو تسلیم اور ہاں دعائیں بھی۔ بچوں کو پیار ——

تمہارا اپنا

یاور بخاری

شخصیات :- حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی



میری رائے میں شخصیت منوائی نہیں جاتی بلکہ از خود مانی جاتی ہے۔ پروپیگنڈے کے کس بل پر بننے والی شخصیتیں بہت جلد فنا ہو جاتی ہیں۔ علم و فضل ٹھوس قابلیت اور تبحرِ علمی سے جن کے سینے معمور اور دماغ مخزن ہیں وہ دوست تو کیا حریفِ معصرے بھی اپنا لوہا منوا لیتے ہیں۔ دیکھئے اعترافِ کمال ایسے ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا شبلی نعمانی :-

"تاریخی نظموں کا سلسلہ خوب ہے۔ آپ نے بجبر مجھ سے چھین لی۔ حضرت استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔ ابتدا کی ہے تو اس سلسلے کی انتہا بھی کیجئے۔"

لسان العصر اکبر الٰہ آبادی :-

"آپ میرے استاد زادے ہیں، آپ نے خوب کیا کہ رسالہ العلم کے ذریعہ علوم کو زندہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔"

علامہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم و مغفور :-

"آپ کی نظمیں ملیں، ان پر میں کیا رائے ظاہر کروں، ہم لوگ تو آپ کے زلہ ربا ہیں۔"

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان مرحوم و مغفور :-

مولانا محمد مبین کیفی چریاکوٹی۔ عربی و فارسی کے زبردست فاضل اور مشہور روزگار شاعر ہیں، ان کو ہندی اور انگریزی زبان پر بھی قدرت ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں صنفوں میں بہت بلند معیار رکھتے ہیں ان کا مجموعہ اگر شائع ہو جائے تو اردو کی بڑی خدمت ہو۔"

خواجہ کمال الدین مبلغ اسلام در ممالک یورپ اور امریکہ :-

"فلسفہ و سیاسیاتِ اسلام جس نے دیکھی، اردو زبان تو کیا عربی و فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی کوئی کتاب اس موضوع پر میری نظر سے نہیں گذری اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو جائے تو تنہا یہ کتاب یورپ اور امریکہ کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دینے کے لئے کافی ہے۔"

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو :-

"مولانا کیفی کو میں وصہ سے جانتا ہوں اور اُردو فارسی اور عربی کے محقق ہونے کی حیثیت سے میں بڑی قدر کرتا ہوں۔ اُن کی کتاب "فلسفۂ سیاسیات اسلام" اُن کی قابلیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔"

سر راس مسعود مرحوم مغفور:-

"جناب دادا صاحب قبلہ مرحوم مغفور اور جناب والد صاحب مرحوم مغفور سے آپ کے والدِ ماجد اور چچا صاحب کے جو تعلقات تھے اسکو سب جانتے ہیں۔ آپ کا خاندان علمی تبحّر کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں ممتاز ہے، آپ صحیح طور پر اپنے خاندان کے نمائندے ہیں۔"

علامہ سیّد سلیمان ندوی:-

"مولانا کیفی میرے رفیقِ درس رہ چکے ہیں، وہ عربی و فارسی علوم کی فضیلت کے علاوہ اُردو کے ایک خاص طرز کے مالک ہیں۔"

ہز ہائینس نواب صاحب بہادر ریاست بھاولپور:-

"جامعۂ عبّاسیہ آپ ہی کی چیز ہے۔ آپ اگر اس کو دیکھیں تو اسکی عزت ہو۔ آپ جب تشریف لائیں تو مجھے مطلع کریں تاکہ اسٹیشن پہ آپ کے استقبال کی تیاری کی جائے۔"

مولانا محمد علی مرحوم مغفور (کلکتہ):-

"میں مولانا کیفی کے در کا غلام ہوں۔ کلکتہ میں مولانا کا قیام اہلِ کلکتہ کے لئے برکت کا باعث ہے۔"

مولانا سلیمان اشرف مفتی مسلم یونیورسٹی (علیگڈھ):-

"میں ہندوستان میں مولانا کیفی اور اُن کے بڑے بھائی مولانا محمد امین عباسی چریاکوٹی کے تحقیقِ علم اور قابلیت کے علاوہ اور کسی کو نہیں مانتا۔"

مولانا عبد الحلیم شررؔ مرحوم مغفور:-

"مولانا کیفی کی اُردو نثر بیانِ حکمت اور نظم جادو ہے۔"

مولانا فرخ (الہ آباد)

"مولانا کیفی کی ذات نہ صرف ہمارے خاندان بلکہ پورے ہندوستان کے لئے باعثِ فخر ہے۔"

شمس العلماء مولانا محمد امین صاحب عباسی (گورکھپور)

"مولانا کیفی کو قدرت نے جو فضائل اور کمالات عطا کئے ہیں وہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتے۔"

پنڈت موتی لال نہرو:-

"مولانا کیفی ہندوستان کے لئے مایۂ ناز ہیں۔"

حکیم اجمل خاں مرحوم مغفور:-

"بیشک آپ میرے استاد زادے ہیں۔ آپ کے فتوحاتِ قلمی کا عرصہ سے اعتراف ہے۔"

آنریبل سر فضل (کلکتہ):-

"مولانا کیفی کی ذات اور اُن کا اخبار روزانہ "انقلابِ زمانہ" نہ صرف کلکتہ کے لئے بلکہ تمام بنگال کے لئے قابلِ فخر ہے۔"

نواب صدر یار جنگ بہادر:-

"آپ کا قصیدہ فارسی پڑھا، پڑھ کر حیرت ہوئی کہ اس زمانہ میں بھی ایسی فارسی لکھنے والے موجود ہیں۔"

عبد الوحید سیف ایرانی ایڈیٹر "آزادیٔ مشرق" برلن (جرمنی):-

"رسالہ "سحبان" میں حصّہ فارسی دیکھ کر میرے تعجب کی انتہا نہیں رہی کہ ہندوستان کی سرزمین میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن پہ ایرانی زباں داں بھی رشک کریں۔"

مؤید الاسلام آقائے ایرانی ایڈیٹر حبل المتین (کلکتہ)

"مولانا کیفی کو فارسی پر اتنی ہی قدرت ہے جتنی کسی زباں داں کو اپنی زباں پر۔"

مولانا عبد الحق حقی بغدادی:-

"آپ کے رسالہ "العلم" کو دیکھ کر آپ کی عربی دانی اور تحقیقِ زبانِ عربیہ پر مجھ کو حیرت ہے۔"

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی:-

"آپ کے تفسیری نکات علماء کے لئے بہت کچھ ذخیرۂ معلومات رکھتے ہیں۔"

یہ تو صرف چند خطوط کے مختصر ترین اقتباسات ہیں۔ ہز اکسلنسی لارڈ لن لتھ گو وائسرائے ہند مولانا ناصر حسین مرحوم۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی۔ راس الفاضل نواب عماد الملک بلگرامی نواب حاجی محمد اسحاق خاں مرحوم (میرٹھ) جسٹس سر عبد الرؤف (الہ آباد) مولانا نیاز فتحپوری۔ سر اکبر حیدری مرحوم۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد آنجہانی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ پنڈت امرناتھ جھا۔ شاہ نذیر ہاشمی مرحوم۔ جسٹس چودھری نعمت اللہ (الہ آباد) آر۔ پی ڈیوہرسٹ فاضلِ علومِ شرقیہ اکسفورڈ کالج لندن۔ علامہ ابو الفضل احسان اللہ مرحوم۔ سر شیخ عبد القادر۔ نواب مزمل اللہ خاں مرحوم۔ نواب صاحب

بخاری۔ مفسرِ قرآن مولانا فراہی اعظمی۔ مہاتما گاندھی۔ مولانا شاہ بدرالدین پھلواری رح۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواری رح اور دیگر اکابر۔ عمائد، علما، فضلا، ادبا اور شعرا کے سیکڑوں خطوط اس قابل ہیں کہ حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی کے اعترافِ فضیلت کے سلسلے میں پیش کئے جاسکیں، بہرحال یہ چیز قیاسی نہیں بلکہ حقیقی ہے اگر کبھی علامہ موصوف کے تفصیلی حالات شائع ہوئے تو سامنے آجائے گی۔

علامہ کیفی کا پورا نام محمد مبین اور وطن چریاکوٹ ضلع اعظم گڑھ ہے۔ علامہ کی تاریخ پیدائش کا مجھے علم نہ ہوسکا۔ سلسلۂ نسب سیدنا حضرت عباس بن عبدالمطلب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تک پہونچتا ہے آپ کے مورثِ اعلیٰ حضرت یوسف حسن عباسی متلقب بہ مخدوم صاحب جو حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی رح کے حقیقی بھانجے تھے۔ عدن سے تاج و تخت چھوڑ کر سیف و قلم در دست ہندوستان تشریف لائے اور چریاکوٹ کی سرکش اور ظالم قوم "چریا" کو مغلوب کرکے اس کے قلعہ پر قبضہ کیا اور وہیں اقامت گزیں ہوگئے۔ حصہ مفتوحہ وہاں کی دوسری ہندو اقوام میں تقسیم کردیا۔ جب آپ وارد دہلی ہوئے تو شاہ فیروز تغلق نے مع اپنے وزرا اور امرا کے دو میل سے استقبال کیا اور عرض کیا کہ "تاج و تخت حاضر ہے" آپ نے فرمایا کہ "تمہیں مبارک ہو میں ایک خاص کام کے لئے خدا کی طرف سے مامور ہوا ہوں"۔ اس خاندان کی سب سے بڑی علمی خصوصیت یہ ہے کہ تیرہ ۱۳ چودہ ۱۴ پشت یعنی تک علی التواتر جید علما ہوتے آئے ہیں۔ علامہ کیفی کے نانا چراغ ربانی۔ حضرت مولانا شاہ محمد کامل رح بڑے پایہ کے بزرگ اور عالم تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب امامِ اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رح تک پہونچتا ہے۔ دلیدپور ضلع اعظم گڑھ میں حضرت چراغ ربانی رح کا مزار اب تک سرچشمۂ فیوض و برکات ہے۔

علامہ کیفی کے والدِ ماجد استاد الاساتذہ شیخ الشیوخ امام العلما حضرت مولانا محمد فاروق رحمۃ اللہ علیہ مولانا شبلی رح کے استاد اور حضرت کیفی کے چچا حکیم العصر مولانا غیاث رسول چریاکوٹی۔ سر سید احمد مرحوم کے استاد تھے۔ مولانا محمد فاروق کے حقیقی پھوپھا مولانا احمد علی رح مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا نصر اللہ خاں خورجوی کے استاد تھے۔ بقول مولانا عبدالباری فرنگی محلی رح۔ ہندوستان کے جتنے علمی سرچشمے ہیں وہ سب "یونانِ ہند" چریاکوٹ کے فیوض و برکات کے ممنون ہیں۔ مولانا فاروق اور مولانا غیاث رسول کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان نے ایک صدی کے اندر ان دونوں بھائیوں کا مثل پیدا نہیں کیا۔ حضرت مولانا محمد فاروق کے شاگرد اور حلقۂ درس سے نکلے ہوئے حضرات نہ صرف ہندوستان کے گوشے گوشے بلکہ عرب و عجم میں پھیلے ہوئے ہیں۔

علامہ کیفی نے تصوف کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور اپنے والدِ ماجد سے تمام علومِ معقول و منقول کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن طبیعت کا ذوق فلسفہ و منطق اور تفسیر و ادب کی طرف مائل تھا چنانچہ یہی میدان قلم کی جولانگاہ بنا، عربی فارسی کی تکمیل کے بعد باضابطہ طریقہ پر انگریزی تعلیم حاصل کی اور انٹرنس کا امتحان دیا لیکن طبیعت کی رسائی اور خداداد ذہانت سے اس زبان میں غیر معمولی قابلیت حاصل کرلی۔ انگریزی کے بعد ترکی۔ ہندی۔ عبرانی زبانیں بھی حاصل کیں۔ قدرے فرنچ زبان بھی پڑھی، گویا آپ ہفت زبان ہیں اور بعض زبانوں میں اہلِ زبان کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کی یہ غیر معمولی قابلیت و اہلیت ہی سب کو اعترافِ کمال پر مجبور کرتی ہے۔ تقریباً تیس ۳۰ سال سے اُردو زبان کی خدمت کررہے ہیں۔

علامہ موصوف ایک مدت تک عربی نظم و نثر کی طرف مائل رہے۔ اس زبان میں آپ کے کمالات کا اعتراف مصر کے عربی اخبار "الاخبار" نے حیرت انگیز الفاظ میں کیا ہے عربی کے بعد فارسی میں بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

آپ نے کم و بیش سولہ ۱۶ سترہ ۱۷ ماہانہ رسالوں، ہفتہ وار اور روزنامہ اخباروں کی ادارت کے فرائض انجام دئیے ہیں اور ملک کے تمام اچھے رسائل و اخبارات کو اپنے رشحاتِ نظم و نثر سے نوازا ہے دس سال تک ہندستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے شعبۂ اُردو کے نگراں رہے۔ سات جلدوں یعنی تقریباً پانچ ہزار صفحوں سے زیادہ میں اُردو شعرا کا تذکرہ لکھا جس کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ یہ تذکرہ بذاتِ خود آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ ایک ترکی ڈرامے کا اُردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس دوران میں اُردو زبان کی تحقیق و تفتیش کرنے والوں نے ہندوستان کے ہر گوشہ سے علامہ کیفی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا۔

عربی۔ فارسی اور ہندی کے ذخیرہ کلام کے علاوہ اُردو غزلوں کی تعداد چھ سو اور نظموں کی تعداد پانچسو ۵۰۰ سے زیادہ ہے۔ نظموں میں مذہبی۔ سیاسی۔ اخلاقی تاریخی غرض ہر قسم کی نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ عربی فارسی۔ ترکی۔ ہندی۔ سنسکرت۔ چینی جاپانی، گجراتی۔ بنگلہ، انگریزی۔ فرانسیسی زبانوں کی نظموں کو بھی اُردو کا جامہ پہنایا ہے تصانیف میں فلسفۂ سیاستِ اسلام۔ تفتیش اساس التقدیس، امام رازی کی شرح اُردو میں فلسفۂ عمر۔ جواہرِ سخن سات جلدوں میں (تذکرہ) دھنا کی دیوی (اُردو ڈرامہ) نور و نار (عربی ڈرامہ) اور چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف علوم و فنون پر ہیں۔ ان میں صرف چند کتابیں مطبوعہ ہیں۔ باقی غیر مطبوعہ۔

ہندوستانی اکیڈیمی سے علیحدگی کے بعد ڈاکٹر سر شاہ سلیمان مرحوم آپ کو اپنے ساتھ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ لائے تاکہ شرقی علوم کی کوئی زبردست خدمت لیں ابتداً

آپ سے قانونی مسودوں کا ترجمہ کرایا لیکن بوجوہ علامہ نے اسے پسند نہ کیا۔ سرشاہ سلیمان کی وفات کے بعد علامہ موصوف دل برداشتہ ہو کر مسلم یونیورسٹی سے تشریف لے جا رہے تھے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور خان بہادر عبدالمجید قریشی کی علم دوستی اور معارف پروری نے آپ کو روک لیا۔ اب علامہ کے سپرد "لٹن لائبریری" کی قلمی کتابوں کے کیٹلاگنگ کا اہم اور مشکل کام سپرد کیا گیا ہے۔

شاعری میں آپ کو باضابطہ کسی سے تلمذ حاصل نہیں۔ اپنی ایک ابتدائی غزل حضرت مولانا آسی رح کو حصول برکت کے لئے دکھائی تھی۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نے یہ فرما کر واپس کردی کہ تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں۔ تمہاری طبیعت خود مصلح ہے اور بہت دعائیں دیں۔ علامہ کو یقین واعتقاد ہے کہ یہ جو کچھ ہے وہ شاہ صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

علامہ تمام شعرا کا انکے مرتبے کے مطابق احترام کرتے ہیں۔ کسی معمولی شاعر کی بھی تنقیص اُن کے مسلک میں گناہ ہے۔

آپ مذہبی معاملات میں بہت سخت ہیں اور ہر رنگ میں مذہب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تصوف کے ساتھ خاندانی لگاؤ ہے۔ کسی مذہب کو آپ بُرا نہیں کہتے۔ انتہائی ملنسار خلیق۔ متواضع اور مردم شناس بزرگ ہیں۔

ایک ایسے جید عالم اور فاضلِ ادب کی شاعری پر تبصرہ مجھ جیسے نااہل کے لئے انتہائی مشکل ہے۔ پھر علامہ کا بہت کم کلام میری نظر سے گذرا ہے جو کچھ میں اب تک دیکھ چکا ہوں اُسی کے تحت یہ عرض کرونگا کہ علامہ کی شاعری علمی و فنی نقطۂ نظر سے بہت وزنی ہے۔ جہانتک تیز جذبات اور واردات کا تعلق ہے وہ خیالات کے عمق اور تفکر کی وادیوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ علامہ کی شاعری ہماری عقل و دانش کا امتحان لیتی ہے اور روح کو جھنجوڑنے کے بجائے دماغ سے ٹکراتی ہے ـــــ مگر اس کے ساتھ نرم و لطیف تغزل کے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ میں ایک ایسا ہی ملا جُلا انتخاب پیش کرتا ہوں ؎

قیدِ رسمِ نماز کیا جانے؟ — دل کا سجدہ، نماز کیا جانے
حُسن تو بے نیاز ہے سب سے — کس کو کہتے ہیں ناز کیا جانے

ملتِ کفر و دیں کی بحث گرم تھی خانقاہ میں
اتنے میں کوئی مے پرست دست بجام آگیا
شوق کا اعتبار کیا یاس پہ اختیار کیا
راہِ اُمید و بیم میں، دل کا مقام آگیا

گُل نکہت وہ، جتنی شکایت ہے آپ کی — یہ اس لئے کہ دل میں محبت ہے آپکی

زبانِ شمع کھلتی ہے نہ کچھ پروانہ کہتا ہے — مگر سارا زمانہ بزم کا افسانہ کہتا ہے

دَور میں ساغرِ جام ہے گرداں گردش میں پیمانہ بھی — جتنا برسا جھوم کے بادل، برسا ہے میخانہ بھی
اپنے دل کو سجدہ کروں تو نے جسے پامال کیا — یوں تو قدم ہیں دونوں تیرے کعبہ بھی بتخانہ بھی
چاکِ گریباں لیے میں اب زحمت ہے سلوانے کی — دونوں عالم مجھ کو سکوں ہیں جیب بھی ویرانہ بھی

میں بھر لوں آج اپنا ظرفِ تقدیر — نگاہِ مستِ ساقی ہے کرم ریز

جُھکا کے پھر نہ سرِ بندگی اُٹھانا تھا — کسی کی بندہ نوازی کو آزمانا تھا
میں لطفِ وعدۂ کوثر کی اس ادا پہ نثار — بھرا تھا جام مگر دُور سے دکھانا تھا
سرِ نیاز حرم میں جُھکا دیا میں نے — ابھی یہ بار دو عالم مجھے اُٹھانا تھا
چھڑی ہوئی تھی جہاں بحث کفر و ایماں کی — نظر بچا کے وہاں تم کو مُسکرانا تھا

بس اس پہ اب تمام ہے سب کچھ نماز کا — یعنی سلامِ بندگی دل جدھر ہیں آپ

جہاں لیلیٰ ہے وہ مجنوں کا دل ہے — زمانہ اُس کو محمل جانتا ہے
چلا جاتا ہے یوں دیوانہ خاموش — کہ جیسے راہِ منزل جانتا ہے

ایک مختصر نظم بھی دیکھئے:-

وداعِ دوست

وداعِ دوست، آساں گو مشکل — مگر ہر سانس کی سولی پہ ہے دل
ہوئی ہے موجِ دریا کی روانہ — بھٹک کر رہ گیا سر اپنا ساحل
غبارِ خاکِ مجنوں بھی تو آلے — ٹھہر او ساربان ہاں روک محمل
ارے او دورئ راہِ نظارہ — نگاہوں کو بھی ہو جانے دے شامل
مدد ہاں المدد اے تابِ دیدار — چلا آیا تڑپ کر آنکھ میں دل
اندھیری شب ہے پروانے کدھر جائیں — اُٹھا لی کس نے آ کر شمعِ محفل
سمجھ میں اپنی کیفیت آ رہا ہے — یہی ہے مرگِ مہجوری کا حاصل
تن از ہمراہی او ماند محروم
مگر جانی رود منزل بہ منزل

اعجاز صدیقی

تحقیق و تصحیح :- بعض ایسے الفاظ کے اعراب جن میں غلطی کا امکان ہے

غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح
پَھراط	پُھراط	ص - بالکسر
پَوشاک	پُوشاک	پ - بالضم
(ت)		
تجرُبہ	تجرِبہ	ر - بالکسر
تحتُ اللفظ	تحتَ اللفظ	ت - بالفتح
تِحدید	تَحدید	" "
تِحریف	تَحریف	" "
تِحریم	تَحریم	" "
تِحسین	تَحسین	" "
تِحقیر	تَحقیر	" "
تراوَش	تراوِش	و - بالکسر
تُحفہ	تَحفہ	ت - بالفتح
تَمثال	تِمثال	" - بالکسر
تَنک	تُنک	ن - بالضم
تواضَع	تواضُع	ض - "
تِہبند	تَہبند	ت - بالفتح
تِہلکہ	تَہلکہ	" "
تِہ خانہ	تَہ خانہ	" "
تِہدیم	تَہدیم	" "
تِہذیب	تَہذیب	" "
تِہلیل	تَہلیل	" "
تِہنیت	تَہنیت	" "
تَہیدست	تِہیدست	" بالکسر

غلط اعراب	صحیح اعراب	تشریح
(ث)		
ثانَوی	ثانِوی	ن - بالکسر
ثُبات	ثَبات	ث - بالفتح
ثِقالت	ثَقالت	"
ثِقل		بوجھ - بھاری پن
ثُقل		ہر نفیس چیز
ثَلب		بوڑھا آدمی
ثَلَب		بیل
ثَلَب		نقصان کرنا۔ عیب کرنا
(ج)		
جائداد	جائِداد	ئ - بالکسر
جاوَید	جاوِید	و - "
جبہہ سائی	جبہَ سائی	ہ - بالفتح
جِبیں	جَبیں	ج - "
جَد و جہد	جِدّ و جَہد	پہلا "ج" بالکسر۔ دوسرا بالفتح
جسدی	جَسَدی	س - بالفتح
جُلاب		شربت گلاب۔ مسہل
جَلّاب		کھینچنے والا
جِل آب		پانی پر کی کائی
جِلادھن	جَلادھن	ج - بالفتح
جُلوت	جَلوت	"
جَلوہ		نمود۔ نمائش
جِلوہ		کسی خاص ٹھاٹھ سے خود کو دکھانا

(باقی باقی)

اعجاز صدیقی

اصلاحِ سخن :- جناب ارشد ساگری کی غزل پر حضرت مولانا ناطق گلاؤٹھوی کی اصلاح

اہل نظارہ کو آئینۂ
ہم اگر حسن کے جلووں کو پریشاں کر دیں ۱ ~~حسن کے جلوے ہیں اور بھی~~ حیراں کر دیں

کا ساماں — ہیں
ہو اگر حکم تو اک آہ ~~شبستاں~~ کر دیں ۲ ~~یعنی~~ شیرازۂ عالم کو پریشاں کر دیں

ہم
~~ہر~~ رگِ گل سے کریں ایک گلستاں پیدا ۳ ذرۂ خاک کو ہمدوشِ بیاباں کر دیں

ہو چکی تو
~~اٹھ کہ~~ اے دستِ جنوں فصلِ بہار آئی ہے ۴ اُن کو مجبورِ تماشائے گریباں کر دیں

یہ آئینِ جہاں ہو قائم — وہ جو کچھ اور
مرکزِ شوق ~~سے ہٹ جائیں نہ عشاق کہیں~~ ۵ ~~اُن سے کہدو کہ~~ غمِ عشق کا ساماں کر دیں

تابِ نظارہ زمانے
ہوش ~~دیوانۂ ہستی~~ کو رہے یا نہ رہے ۶ آپ تو شمعِ حقیقت کو فروزاں کر دیں

عشقِ ناکام سے کہدو کہ ابھی صبر کرے ۷ ہم ذرا فطرتِ غم کو تو نمایاں کر دیں

جنھیں تو
وہ نگاہیں ~~تو جنھیں~~ خام سمجھ بیٹھا ہے ۸ ہر کلی کو ترے دامن کی گلستاں کر دیں

ظلمتِ شامِ شبِ غم سے سیاہی لیکر ۹ ماہ و انجم کو شریکِ غمِ دوراں کر دیں

ذوقِ نظارہ دکھانے پہ جو آجائیں کلیم — خود — کو اک شعلۂ
~~خام ہے ذوقِ نظارہ ہی ہمارا ورنہ~~ ۱۰ ہم تو ~~ہر~~ طور ~~کے ذرے کو بھی~~ عریاں کر دیں

ہوا
چھیڑ کر سازِ ~~نظر~~ پر کوئی نغمہ ارشد ۱۱
موجۂ گل کی لطافت کو نمایاں کر دیں

توجیہ :-

(۱) ارشد صاحب کے دونوں مصرعے کچھ عجیب تھے۔ اس کے علاوہ حسن کے جلووں کی تکرار بھی اچھی نہ تھی۔ حضرت ناطق نے اپنی اصلاح سے مطلع میں چار چاند لگا دیے۔ اب مطلع کے معنی و مفہوم پر غور کیجئے۔

(۲) "آہ شبستاں" معناً غلط تھا۔ اس لئے "کا ساماں" بنایا گیا۔ دوسرے مصرع میں "یعنی" بیکار تھا۔

(۳) یہ شعر غزل کا سا نہیں ہے اور دونوں مصرعوں کا مفہوم بٹ جاتا ہے اس سے قطع نظر "ہر" کو "ہم" سے یوں بدلا گیا کہ "ر" "ر" کا اتصال مخلِ فصاحت تھا۔

(۴) اس شعر کی اصلاح سے مجھے کسی قدر اختلاف ہے۔ دستِ جنوں کا اٹھنا ہی میرے خیال میں صحیح ہے "چلنا" درست نہیں۔

(۵) اس شعر کو حضرت مولانا ناطق نے اصلاح سے بڑی ترقی عطا فرما دی۔

(۶) سوال یہ ہے کہ دیوانہ ہوش ہی میں کب ہوتا ہے جو یہ کہا جائے کہ "ہوش دیوانۂ ہستی کو رہے یا نہ رہے"۔ کیا خوب اصلاح ہے۔

(۸) "تو" کا "واو" دب رہا تھا اب یہ عیب دور ہو گیا۔ دوسرے مصرع میں اگر چاہیں تو "مقدم" کر

(۱۰) ارشد صاحب کے مفہوم کو بلند الفاظ کے ساتھ ترقی دی گئی ہے۔ اصلاح کے بعد شعر واقعی بہت اچھا ہو گیا۔ لیکن "ہم تو" کی جگہ "ہم ابھی" ہوتا تو اولیٰ تر تھا۔

(۱۱) "موجۂ گل کی لطافت" کے لئے "سازِ نظر" بے معنی تھا۔ اس لئے "سازِ ہوا" بنایا گیا۔

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر:- مصرع طرح:- "جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

خریدار نمبر ۱۲۶۸ ۔ نمبر ۱۵۴۴ ۔ نمبر ۱۲۹۰ ۔ نمبر ۵۶۸ کی غزلیں غیر معیاری ہونے کی وجہ سے شائع نہیں کی جا رہی ہیں۔ بعض شعرا کی غزلوں کے ایک ایک دو دو شعر انتخاب میں آ رہے تھے اس لئے ایسی غزلیں بھی شائع نہیں کی گئیں۔ امید ہے کہ گرامی شعرا زیادہ فکر و کاوش سے کام لینگے تاکہ اُن کے زیادہ اشعار انتخاب میں آئیں ——— مدیر

حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی

ہم اے دنیا تری شاہنشہی و قیصری سمجھے
یہ رشوت اُس کو دے جو زندگی کو زندگی سمجھے

حدیثِ غم پہ دنیا کی خموشی سے نہ حیراں ہو
کہ جو سمجھے زبانِ دل، وہ دل کی بات بھی سمجھے

گلہ ہو سختیِ منزل کا بے معنی، تو کیا حاصل
اس انداز سے نالہ کہ خارِ راہ بھی سمجھے

تمنائے وصالِ دوست بھی کیا چیز ہوتی ہے
ہم اپنے ہر نفس کو اک پیامِ آخری سمجھے

ہجومِ نغمۂ الہام ہے تاروں سے شبنم تک
یہ وہ سمجھے جو فطرت کی زبانِ خامشی سمجھے

چمن کا چھوڑنے والا چمن میں چھوڑ آیا ہے
اک ایسی بات جس کو پھول سمجھے اور کلی سمجھے

بڑے پردے میں ای سیماب علم و جہل میں حائل
جو خود ہو بولہب وہ کیا مری پیغمبری سمجھے

حضرت نشتر ہنگامی ایڈووکیٹ اورئی

خوشی کو جو الم سمجھے، الم کو جو خوشی سمجھے
وہی سمجھے تو شاید کچھ رموزِ عاشقی سمجھے

اجل در اصل پہلی آزمائش زندگی کی ہے
غلط سمجھے جو اس کو امتحانِ آخری سمجھے

بسر ہم نے ہمیشہ زندگی اس طرح کی اپنی
کہ بندوں کی بھی خدمت کو اُسی کی بندگی سمجھے

سکوں کہتے ہیں جس کو موت سے پہلے نہیں ملتا
کہاں تک کوئی ایسی زندگی کو زندگی سمجھے

کہیں بالا ہے تو انساں کی فہم و فراست سے
تجھے کیا آدمی جانے، تجھے کیا آدمی سمجھے

سکوں ملتا ہو جس کو فطرتاً دل کے دکھانے میں
تسلیِ دلِ ناشاد وہ کیوں لازمی سمجھے

خدا کو کیا سمجھ سکتا ہے کوئی آدمی نشتر
یہی ممکن نہیں جب آدمی کو آدمی سمجھے

حضرت برق صدیقی فتحپوری

حیاتِ عشق سمجھے اُن کو روحِ زندگی سمجھے
سمجھنے کی طرح پھر بھی نہ سمجھے، ہم یہی سمجھے

بسر کر لی محبت کی تلاطم خیز موجوں میں
کہ ہم طوفانِ ہستی کو سکونِ زندگی سمجھے

نہ تھی تمیزِ نیک و بد کی گنجائش محبت میں
ہم اُن کی بے رخی کو بھی ادائے دلبری سمجھے

سرِ راہِ محبت ٹھوکریں سی ٹھوکریں کھائیں!
مگر ہم تھے کہ ہر ٹھوکر کو تاجِ خسروی سمجھے

اسی حسرت نے ہستی کو مٹا کر خاک کر ڈالا
کوئی اپنی گلی کی ہم کو گردِ راہ ہی سمجھے

کچھ ایسے بدگماں ہم ہو گئے نیرنگِ زمانہ سے
کسی نے مہربانی بھی اگر کی، دشمنی سمجھے

جہنم زارِ دنیا برق ابھی فردوس بن جائے
اگر کچھ قدر و قیمت آدمی کی آدمی سمجھے

جناب بیتاب کالپوی

ہوئے واقف خودی سے ہم نہ رازِ بیخودی سمجھے
گنوا دی زندگی لیکن نہ رمزِ زندگی سمجھے

ہمیں کیا درس دینگی اُنکی نظریں ہوشیاری کا
جسے وہ ہوش کہتے ہیں اُسی کو ہم بیہوشی سمجھے

نگاہیں پھیر لیں اُس نے تو اب اسکی شکایت کیا
غرض کی اک لگاوٹ تھی جسے ہم دوستی سمجھے

نہ دنیا ہی کو پہچانا نہ اپنی بات کو سمجھا
ہم اپنی خود فراموشی کو عینِ زندگی سمجھے

نہیں واقف ابھی جو رازِ دردِ محبت سے
وہ کیا میرے دلِ دردآشنا کی بیکلی سمجھے

فنا انجام نکلا مسکرانا بند کلیوں کا
کھلے جب پھول گلشن میں تو رازِ خامشی سمجھے

نگاہِ لطف سے بیتاب کی جانب وہ کیا دیکھے
کہ جو بے التفاتی ہی کو اپنی دلدہی سمجھے

جناب پریم شیدائی دہلوی

ترے جلووں پہ جو دار و مدارِ زندگی سمجھے
وہ پھر کیوں طور ہی کو مرکزِ جلوہ گری سمجھے

لبِ گل سے مئے عرفاں جسے پینا میسر ہو
وہ دنیا سے الگ اپنی ادائے میکشی سمجھے

رہینِ بیخودی ہو کر رُخِ کعبہ بدلتے ہوں
خودی والے نہ نشانِ نیازِ بیخودی کیا سمجھے

وہ کب خاطر میں لائیگا پیامِ شادمانی کو
جو تیرے غم ہی کو کیف و نشاطِ دائمی سمجھے

وہیں بتخانہ اک کعبہ جہاں جھکتی ہو پیشانی
کہاں اہلِ خرد میرا جنونِ بندگی سمجھے

وہ اپنے کاروانِ غم کی منزل ابتدائی تھی
پہنچ کر ہم جہاں اپنا مقامِ زندگی سمجھے

وہ ہوگا کامیابِ جستجو اے پریم دنیا میں
اُسے پانے سے پہلے خود جو مٹنا لازمی سمجھے

جناب حکیم ناظم (جکدین)

مری بیچارگی کو کس طرح بیچارگی سمجھے
جو خود راحت میں ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے

جو ہچکی آئی تیری یاد میں خامِ شبِ فرقت
اُسی کو آخری ہچکی ہم اپنی موت کی سمجھے

ترے ملنے کی ٹھہری شرط جب خود کو مٹا دینا
تو کیا جانباز تیرا زندگی کو زندگی سمجھے

وہ غارتگر کچھ اس انداز سے پہلو میں آ بیٹھا
کہ ہم اسکو بھی اُسکا شیوۂ دلبستگی سمجھے

طبیبو کیا تمہیں معلوم درماں زخمِ اُلفت کا
کیا ہے جس نے دل زخمی وہ اسکی ہی سمجھے

جو ہیں اس رنگ میں اس رنگ کو وہ ہی سمجھتے ہیں
جو دیوانہ نہ ہو وہ کیا مری دیوانگی سمجھے

سُنا کچھ اس طرح ناظم تو رودادِ الم اپنی
کہ سن کر اسکو اپنی داستاں ہر آدمی سمجھے

جناب ارشد صدیقی ساگری

خدنگِ ناز کو اُن کے پیامِ زندگی سمجھے
جگر کی ہر خلش کو اک سکونِ دائمی سمجھے

نہ سوزِ عشق پہچانا، نہ سازِ حسن ہی سمجھے
یہ دیوانے مذاقِ عاشقی کو دل لگی سمجھے

جنوں سے کہہ رہا تھا میں خرد کے رازِ سربستہ
مگر اہلِ خرد اسکو بھی اک دیوانگی سمجھے

تبسم ریز ہے دل کا مرے ہر داغ سینے میں
خیالِ یار کی رعنائیوں کو کیا کوئی سمجھے؟

سکونِ زندگی کیا ہے؟ فریبِ زندگانی ہے!
اُسی کی زندگی ہے جو اجل کو زندگی سمجھے

اُڑاتے خاک سر پر جا رہے ہیں جانبِ صحرا
یہ دیوانے صدائے حشر کو کچھ اور ہی سمجھے

کسی کے نقشِ پا سے ہم تو ارشد عمر بھر کھیلے
مگر اب تک نہ معراجِ مذاقِ بندگی سمجھے

جناب کامل جہلمی

نہ اُنکی دوستی سمجھے نہ اُنکی دشمنی سمجھے
یہ دنیا اک تماشا تھی جسے ہم دل لگی سمجھے

کہاں وہ گلشنِ رضواں کہاں ویرانۂ ہستی
یہی تو موت تھی اپنی جسے ہم زندگی سمجھے

جو ہر ذرّے کی خلوت میں تجھے جلوہ نما دیکھے
وہ کیوں دیر و حرم کو پھر مقامِ بندگی سمجھے

نیا طوفان بنکر نا اُمیدی چھاتی جاتی ہے
مری کشتی لبِ ساحل سے کیا وابستگی سمجھے

یہ انساں دار بن سکتا ہے گلزارِ ارم اب بھی
حقیقت آدمیت کی اگر یہ آدمی سمجھے

بہت آسان ہم سمجھے تھے فنِ شاعری لیکن
بڑی مشکل سے اب تک کچھ رموزِ شاعری سمجھے

قفس سے آشیاں تک اُڑ کے جانا غیر ممکن ہے
ہم اپنی بے پر و بالی کو کامل بے بسی سمجھے

جناب فائق از اودے پور

خودی نے لی جو کروٹ ہم اُسے بھی بیخودی سمجھے
بڑھی جب گمرہی حد سے تو اسکو آگہی سمجھے

مشقت ہے وہی اِنکی، عرقریزی وہی انکی
یہ مفلس آج تک اپنا نہ رازِ مفلسی سمجھے

یہ باطن تو خدا ہے اور بظاہر ہے بتِ کافر
تری عشوہ گری دیکھی تری غارتگری سمجھے

پرستارانِ وفا ہو کر جفا پر جان دیتے ہیں
جہاں والے کہاں تیرا فریبِ دلبری سمجھے

کوئی چشمِ بصیرت اپنی وا کرنا اگر چاہے
مآلِ زندگی دیکھے، مآلِ زندگی سمجھے

اُنھیں کے آشیاں جلنے کی تھی وہ روشنی ساری
اسیرانِ قفس جسکو چھٹکتی چاندنی سمجھے

مٹانا چاہتا ہے جو خودی کو اپنی اے فائق
مری بیچارگی دیکھے وہ میری بے بسی سمجھے

حضرت ضیا فتح آبادی ایم۔ اے

لگی ہو چوٹ جس کے دل پہ رازِ غم وہی سمجھے
جو خود بیکل رہا ہو وہ ہماری بیکلی سمجھے

ہم اُن کی دوستی کو بھی ادائے دشمنی سمجھے
سمجھنا تھا ہمیں کچھ اور، ہم کچھ اور ہی سمجھے

ہمیں اک روز خود کہنی پڑے گی داستانِ دل
نہیں کوئی بھی ایسا جو زبانِ خامشی سمجھے

ترے بندے ہیں ہم، ہم کو عطا کر اپنی رحمت سے
وہ ذہنِ ارتقا جو موت کو بھی زندگی سمجھے

یہ اپنی کور ذوقی، کم نگاہی کا نتیجہ ہے
کہ ہم حسن و جمالِ ظاہری کو باطنی سمجھے

ہمیں تو اے ضیا رونا ہے اپنی بدگمانی کا
وہ اُن کی دشمنی سمجھے نہ اُن کی دوستی سمجھے

جناب خلیل بکھوی از سکولی

نہ کیوں وہ عالمِ غم کو فقط وارفتگی سمجھے
جو دردِ عشق کا حاصل حیاتِ دائمی سمجھے

فریبِ خودنمائی کا اثر اتنا ہوا ہم پر
شرارِ سوزِ غم کو بھی تری جلوہ گری سمجھے

جنوں میں کہہ رہا تھا کچھ زباں سے کچھ نکلتا تھا
نہ وہ سمجھے نہ خود سمجھا نہ اہلِ بزم ہی سمجھے

جو کچھ غم میں ہو جائے اُسے عرفان ہو غم کا
تمناؤں کی اُلجھن میں حقیقت کیا کوئی سمجھے

نیاز و ناز کے پردے اُٹھانے پر نہیں راضی
وہ شاید آرزوئے دید کو بھی بیخودی سمجھے

عقیدت حسنِ غم سے تھی دلِ وحشی کو اس حد تک
قفس کی زندگی کو بھی چمن کی زندگی سمجھے

جناب اکرم حنیفی دھولیوی

وہی دیوانۂ اُلفت رموزِ زندگی سمجھے
عطائے غم کو تیری جو متاعِ سرخوشی سمجھے

مری دیوانگیٔ عشق کی عظمت وہ کیا جانے
ہجومِ رنگ و بو تک جو بہارِ زندگی سمجھے

شگفتہ خاطری سے کام لینا کب انھیں آیا
وہ کب میرے دلِ ناکام کی افسردگی سمجھے

بساطِ دل یہ کس کے جلوۂ رنگیں سے روشن تھی
محبت میں سوادِ شب کو بھی ہم چاندنی سمجھے

مری نالہ کشی کا درد اُسے ہوتا تو کیوں ہوتا
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

غمِ سوزِ محبت سے جنھیں تھا واسطہ اکرم
وہی کچھ میرے سازِ فطرت کی نغمگی سمجھے

جناب منظر کلیمی جام پوری

نہ جانے شیخ کیا سمجھا مگر ہم تو یہی سمجھے
بتوں کی بندگی ہی کو خدا کی بندگی سمجھے

جہاں میں زندگی کا راز اگر سمجھے یہی سمجھے
کہ اپنی زندگی ہم آپ ہی کی زندگی سمجھے

ہماری بے قراری کو نہ کیونکر دل لگی سمجھے
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

جو مشقِ جور ہی کے واسطے دنیا میں آیا ہو
وہ کیا لطف و کرم جانے وہ کیا عیش و خوشی سمجھے

جہانِ حسن کی آزادیاں جس کو میسر ہوں
گرفتارِ محبت کی وہ کیوں کر بے بسی سمجھے

مرا ہر شعر ہے دردِ الم کی داستاں منظر
نہ ہو دل جس کے پہلو میں وہ کیا یہ شاعری سمجھے

جناب ضیا میرٹھی

ہمیشہ عشق میں وہ بات اپنی ہی بڑی سمجھے
ہماری زندگی کو تو فریبِ زندگی سمجھے

ہجومِ شکوۂ غم دیکھکر دل میں مرے چپ تھے
یونہی خاموش رہنے میں وہ اپنی بہتری سمجھے

درستی عقل کی کبھی منزلِ الفت میں ہو جاتی
یہ نقصِ رہبری تھا خضر جس کو رہبری سمجھے

اُٹھاتے جو کہ تکلیف اپنے وعظ کی واعظ
وہ اچھی طرح پہلے مطلبِ عاشقی سمجھے

قیام اسکو ہے جو برباد ہو راہِ محبت میں
وگرنہ زیست کو انساں اپنی عارضی سمجھے

ہماری زندگی تھی اک معمّا اہلِ عالم کو
سمجھنے والے ہم کو اے ضیا اک راز ہی سمجھے

ناب اکرم حسینی، ثریا توری

نا آشنا دل، کیا حقیقت درد کی سمجھے
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

ں کی زندگی ہے زندگی کہلانے کے قابل
جو بہرہ ور دردِ الفت کو نشاطِ زندگی سمجھے

ان بیشگی نے اُس کی یہ دھوکا دیا ورنہ
وفا کی آزمائش تھی جسے ہم بے رخی سمجھے

شی معنٰی دارد کہ در گفتن نمے آید"
غمِ پنہاں سے جو واقف ہو مری خاموشی سمجھے

عیش و عشرتِ فانی کا دلدادہ کہاں ہوگا
جوانی کو جو اپنی چار دن کی چاندنی سمجھے

م اب تک بسر کی عمر اپنی اس تمنا میں
کبھی ہم کو بھی اپنا چاہنے والا کوئی سمجھے

ناب فاروق از کوئٹہ

پھیلا غیر کے آگے کبھی دستِ طلب انکا
جو پیغامِ ...ی سمجھے جو مفہومِ خودی سمجھے

عیانِ جہاں پر منکشف ہو جائیگا اک دن
نہ ... معنی کوئی محفل میں مری خاموشی سمجھے

ایت کیا کریں لیکن دُعا یہ حق سے کرتے ہیں
تجھے اے بے وفا بے مہریِ ایام ہی سمجھے

ت نام ہے مظلوموں کی دلنوازی کا
اسی میں ہے عروجِ آدمیت گر کوئی سمجھے

نفت میں بھی ہے ضربِ کاری آدمیت پر
جسے یہ اہلِ مغرب آج تہذیبِ نوی سمجھے

لہ بنا مرکزِ آفاق اسے فاروق بنجائے
یہی ہم مدعائے سوز و سازِ زندگی سمجھے

ناب نظر اعظمی

و کیا مفہوم و تفریقِ خوشی و ناخوشی سمجھے
مری بربادیِ امید کو بھی جو ہنسی سمجھے

ار زندگی کھونا، اسیرِ قیدِ غم ہونا
معاذ اللہ ہم بھی کیا مآلِ عاشقی سمجھے

جوم شوق ہے ناکامیاں ہیں بے قراری ہے
جو یوں ہو زندگی تو آن اسکو زندگی سمجھے

: اِن دنوں ناآشنائے مہرِ الفت ہے
دلِ بیتاب کی بیتابیوں کو کیوں کوئی سمجھے

ہے بیگانۂ ہستی جو مثلِ سبزۂ خودرو
وہ کیا ہنگامۂ اہلِ چمن کی سرخوشی سمجھے

ار مانوس تمہارے محبت ہی نہیں کوئی
تو پھر کیوں لذتِ دردِ جگر کو وہ ابھی سمجھے

ناب برگ باندوی

مٹا کر اپنی ہستی ہم مآلِ زندگی سمجھے
جو مٹ جائے محبت میں وہ رمزِ بیخودی سمجھے

جس نے دل لگایا ہو وہ کیا دل کی لگی سمجھے
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

ل کا نام سن کر اہلِ ہستی کانپ جاتے ہیں
ہم اس کو بھی ادائے مرحمت فرمائی یار کی سمجھے

م رخصت مرے دل سے دو ارماں خاک بھی نکلے
نہ مٹنے دی مری بربادیوں کو جو کبھی سمجھے

ذر جائے مکان و لامکاں کی حدِ فاصل سے
حقیقت اپنی ہستی کی اگر کچھ آدمی سمجھے

نہ ہو گیا کچھ خدمتِ شعر و سخن کرتے
مگر اب تک نہ ہم اے برگ رمزِ شاعری سمجھے

ناب نور بدایونی

ے عشق میں مرنا کمالِ زندگی سمجھے
مرے جب موت سے پہلے تو رمزِ عاشقی سمجھے

نہیں ہے امتیازِ دیر و کعبہ اسکی نظروں میں
خدا کی جو خدائی کو مقامِ بندگی سمجھے

کسی کی چشمِ میگوں سے کچھ ایسے حظ اٹھائے ہیں
کہ ہم ہر اک اشارے کو پیامِ بیخودی سمجھے

پہنچتا ہے فقط اپنے گریباں تک ہی ہاتھ اپنا
جنوں کی چیرہ دستی کو ہم اپنی بیکسی سمجھے

دلِ پُرغم ہم اُس سے کیا کہیں تیری پریشانی
جو ناداں دل لگانے کو فقط اک دل لگی سمجھے

کمالِ بیخودی سے خود پرستی کو مٹانا تھا
بڑی مدت کے بعد اے نور سرِ بیکسی سمجھے

جناب منطق صابری نمدار گنجوی

سمجھتا ہو جو تکمیلِ نشاطِ دو جہاں غم کو
اُسے پھر کیا ضرورت ہے کہ مفہومِ خوشی سمجھے

مرے دل کی تڑپ پر طعنۂ اغیار کیا معنی
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

نشاطِ بزم کب ساقی کو مہلت اتنی دیتی ہے
کہ دیکھے میری جانب اور مری تشنہ لبی سمجھے

کیا تھا بارگاہِ حسن میں اک سجدۂ الفت
شریعت والے اُس سجدے کو ترکِ بندگی سمجھے

اُسے اہلِ نظر کہنا دلیلِ کم نگاہی ہے
مذاقِ عشق کی رفعت کو جو دیوانگی سمجھے

جو خود اپنے سمجھنے کی نہ رکھتا ہو صلاحیت
وہ منطق کیا بلندیِ مقامِ داری سمجھے

جناب موج شیدائی دیوبندی)

رہینِ بیخودی ہو کر نہ رازِ بیخودی سمجھے
گذر کر ہم حدِ منزل سے منزل آگہی سمجھے

اسیرِ سوز ہو کر بے نیازِ درد و غم رہنا
ہم اپنی زندگی کا آج تک مطلب یہی سمجھے

گرا دی عظمتِ کونین کی وقعت بھی نظروں سے
رہینِ عجز کامل جب مقامِ سرمدی سمجھے

سببِ بربادیِ دل کا کوئی دل سوز کیا پوچھے
حقیقت آپ کے جلووں کی نظروں میں مری سمجھے

تصور کارواں حد سے جنوں کی بڑھ چلیں لیکن
نہ اہلِ کارواں اب تک مری دیوانگی سمجھے

وہی لے موج بالاتر رہے گا بحرِ ہستی میں
فنا ہو کر جو مثلِ موج رازِ زندگی سمجھے

جناب رعنا نظامی (راجوری)

حیاتِ عارضی کو موجبِ تسکیں سبھی سمجھے
مگر ہم موت ہی کو اک سکونِ دائمی سمجھے

مذاقِ زندگی سے آشنا ہے صرف دل اُسکا
نشاطِ زندگی کو جو فریبِ زندگی سمجھے

یہ اچھا ہے نہ کوئی بھی مرا سوزِ دروں دیکھے
یہ بہتر ہے نہ کوئی میرے دل کی بیکلی سمجھے

ازل سے عاشقِ صادق کو ہے حکمِ زباں بندی
غلط کچھ حضرتِ منصور رازِ عاشقی سمجھے

یہ بزمِ عالمِ امکاں بھی رعنا اک معمہ ہے
کوئی کچھ اسکو سمجھا ہی نہیں ہم تو یہی سمجھے

جناب خادم صدیقی تراہوی

ہم انکی یاد میں تھے اہلِ دنیا خامشی سمجھے
خدا سمجھے انھیں یہ کیوں نہ رازِ بیخودی سمجھے

وہی انساں ہے انسانیت کا جس میں جوہر ہو
وہی ہے آدمی جو آدمی کو آدمی سمجھے

میں بدمستِ شبابِ عشق ہو کر لڑکھڑاتا تھا
جوانی کی اسے اہلِ طرب دیوانگی سمجھے

۱؎ حضرت علامہ سیماب مدظلہ العالی۔

بشاکر اپنی ہستی تجھ سے واصل ہو جو دنیا میں
سرائے دہر فانی میں وہ رازِ زندگی سمجھے

دعوٰی فرزانہ نہیں خادم حقیقت میں ہے دیوانہ
مری دیوانگی کو جو فقط دیوانگی سمجھے

جناب نازش پرتاب گڑھی

کوئی کیا خاک اے نازش اِن آنکھوں کی نمی سمجھے
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

وہ ظالم کس طرح آخر مری دیوانگی سمجھے
جو دل کے چھیننے کو کھیل الفت کو ہنسی سمجھے

نفس کی آمد و شد میں کسی کی یاد رہتی ہے
اب اے ہمدم ہم اپنی زندگی کو زندگی سمجھے

نظر آیا ہمیں تو بس جدھر بھی اٹھ گئیں نظریں
چمن میں رنگ و بو نازش ہمیں تجھکو ڈھونڈھنی سمجھے

جو رہتا ہوش تو کیا جانئے کیا کر گزرتا دل
بڑی شے عشق میں اے دوست ہم ازخود رفتگی سمجھے

جناب شاعر کاندھلوی

ریا کو بندگی سمجھے خودی کو بیخودی سمجھے
سراپا جہل و نادانی تھی جسکو آگہی سمجھے

ہزاروں عالم ہستی تصدق اسکے جذبے پر
جو راہِ عشق میں مرنا بقائے دائمی سمجھے

یہ سب ہیں حسن عالمتاب کے جلوے حقیقت میں
بظاہر جنکو ہم شمس و قمر کی روشنی سمجھے

ہوا کیا عمر بھر سجدے کئے گر دیر و کعبے میں
مآلِ عشق ہی سمجھے نہ رازِ حسن ہی سمجھے

جمالِ حسن ہے جسکے سبب ذرّے مہ کامل
وہ کوئی اور ہی نکلا جسے ہم آدمی سمجھے

جناب شہید جبلی

مآلِ زندگی کو جو سرودِ زندگی سمجھے
نہ وہ رازِ خودی سمجھے نہ سرِّ بیخودی سمجھے

میسر دن کو راحت ہے نہ شب کو چین حاصل ہے
ہماری زندگی کو کوئی کیونکر زندگی سمجھے

انھوں نے عارضی سمجھا ہمارے عشق دائم کو
ہم اُن کے حسنِ دو روزہ کو لیکن دائمی سمجھے

خودی اور بیخودی میں بات دن کا بُعد ہے یعنی
خرد کو ہم جنوں سمجھے جنوں کو آگہی سمجھے

خدا سمجھے شہید اہلِ زمانہ کے دماغوں کو
طلسمِ آب و گِل کو کائناتِ آدمی سمجھے

جناب زاہد سوتھڑوی (رامپور)

سکونِ حسن کیونکر میری آشفتہ سری سمجھے
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

بیابانِ ضلالت میں خرد لے آئی ہے ہمکو
کہ ہم تاریکیٔ تہذیب نو کو روشنی سمجھے

کوئی تیرے تصور سے کہاں تک دل کو بہلائے
شبِ تنہائی کے غم کو کوئی کب تک خوشی سمجھے

پناہ کیوں زمانے کے مصائب سے پریشاں ہو
جو دل کو درد سمجھے درد ہی کو زندگی سمجھے

نیاز و عجز بھی زاہد بڑے لوگوں کا شیوہ ہے
ہم اربابِ بصیرت کی غلامی سے یہی سمجھے

جناب خموش برحدی

فریبِ حسن کھا کر مدعائے عاشقی سمجھے
بہت مدت میں رازِ دلدہی و دلبری سمجھے

وہاں دیرینہ نظر تھا مسئلہ تجدیدِ عالم کا
جہاں والے اجل کو اختتامِ زندگی سمجھے

وہی اہلِ خرد اب معترف میری جنوں کے ہیں
مرے دیوانہ ہو جانے کو جو کل تک ہنسی سمجھے

ہمیں خورشیدِ مغرب کی تجلی دے گئی دھوکا
یہ تاریکی سی تاریکی تھی جس کو روشنی سمجھے

خموش کم سخن، اور عالمِ اسرار کی باتیں
دلِ راز آشنا جس کو ملا ہو یہ وہی سمجھے

جناب وکیل ارنڈولوی مشرقی خاندیش

سبب فریاد کا سمجھے نہ وجہِ خامشی سمجھے
دلِ مضطر کا مقصد اور تھا وہ اور ہی سمجھے

مرے اشکوں کی قیمت وہ بتِ بے مہر کیا جانے
کسی نے سچ کہا ہے۔ قدرِ گوہر جوہری سمجھے

خود اسکی موت بھی آزاد اسکو کر نہیں سکتی
غلامی میں جو اپنی زندگی کو زندگی سمجھے

حیاتِ جاودانی کا اسی کو مستحق سمجھو
رہِ حق میں فنا ہونا جو اپنی زندگی سمجھے

وکیل اسوقت ہم کو ایسے لیڈر کی ضرورت ہے
جو ذمہ داریوں کو اپنا فرضِ منصبی سمجھے

جناب پی۔ سی۔ تنور (اٹاوہ)

مرادستِ جنوں محدود کیوں ہو کر دامن تک
مزاج ایسا ہے کہ انکے پردۂ محمل سی بھی سمجھے

وہ کیا تھی ایک موجِ آتشیں تھی حسن رنگیں کی
فریبِ شوق میں ہم جسکو دورِ تشنگی سمجھے

ہمیں یہ دیر و کعبہ راس آئے ہیں نہ آئیں گے
بلا سے کوئی محرومِ متاعِ بندگی سمجھے

کسی ایسے کو سمجھاؤ سمجھنا جس کو آتا ہو
یہاں کیا حضرتِ ناصح ابھی سمجھا ابھی سمجھے

نہ پوچھ اے تنور کیا دارفتگی تھی ہم اسیروں کو
نشیمن پر جو ٹوٹیں بجلیاں نور و روشنی سمجھے

جناب شفیع از بہرائچ

محبت کیا اگر اسکی حقیقت آدمی سمجھے
مراد ہوتی ہے پھر وہ اپنا مرنا زندگی سمجھے

بعد کوشش یہ رشتہ جسم و جاں کا رہ سکا قائم
جو سچ پوچھو تو اب ہم معنیٔ بیگانگی سمجھے

مجھے سمجھانے والے دو نہ رد کو اے حرم والو
رہے ذوقِ طلب کا رازِ پنہاں کیا کوئی سمجھے

اُنھیں سجدے سے کیا جائیں کہیں بھی آستانہ ہو
بجا سمجھے جو ہم یہ مدعائے بندگی سمجھے

شفیع اسرارِ الفت کیا بتائیں مختصر یہ ہے
جسے سب موت سمجھے ہم اسی کو زندگی سمجھے

جناب خلیق ایولوی

وہ تم ہو، ایک قطرہ کو بھی پیمانہ سمجھتے ہو
وہ ہم ہیں، ساغرِ لبریز کو جامِ تہی سمجھے

وہی اک روز اپنی منزلِ مقصد پہ پہنچیگا
جو اپنی گمرہی کو ضامنِ منزل رسی سمجھے

اُدھر ناکامیاں دیکھیں ادھر ناکامیاں دیکھیں
انھیں ناکامیوں کو ہم دلیلِ زندگی سمجھے

محبت اور پھر سچی محبت اسکو کہتے ہیں
میں کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ رازِ دلی سمجھے

یہاں دیکھا وہاں دیکھا ادھر ڈھونڈا ادھر ڈھونڈا
مری اس سعی کو اہلِ جہاں دیوانگی سمجھے

جناب ساحل منڈکھوڑی (بمبئی)

حقیقت عیش و راحت کی کوئی مغموم ہی سمجھے
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بیکلی سمجھے"

بجز ہنگامۂ شر کچھ نہیں یہ محفلِ ہستی
ہے سب کچھ خود اگر اپنی حقیقت آدمی سمجھے

الہٰی شورشِ گہہ عالم میں غافل تعلقہ دو دن
نہ میں نے آپ کو سمجھا نہ مجھ کو آپ ہی سمجھے

نصیحت جس قدر ناصح کریں آپ اُتنا ہی کم ہے
کہ اِس دنیا میں رازِ زندگی اک آپ ہی سمجھے

نیازِ عجز کی دولت سے خود محروم ہے دُنیا
یہ بدقسمت مری قیمت کہاں اے ساحلی سمجھے

جناب شرما انبالوی

کلی جیسے نہ ہو وہ کس طرح دل کی لگی سمجھے
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بے کلی سمجھے"

دلِ ناکام کی حالت بھلا کیونکر کوئی سمجھے
جو کھلنے کو ترس کر رہ گئی ہو وہ کلی سمجھے

رہے دیوانگی اتنی تو مشکل ہو گئی آساں
جدھر اپنا قدم اُٹھا اُدھر اُس کی گلی سمجھے

دلِ پُر آرزو اور ناز کی ٹھوکر قیامت ہے
مگر اے عشق ہم اُن کی خوشی اپنی خوشی سمجھے

گماں ہوتا ہے اپنے درد پر شرما کو درماں کا
نہ کیوں جور و ستم کو بھی عنایت آپ کی سمجھے

جناب خلیل املیزی

وہ گمراہِ حقیقت خاک طرزِ رہبری سمجھے
نہ اپنی خود روی کو بھی کمالِ آگہی سمجھے

گزر کر اِس و آں سے جب مآلِ زندگی سمجھے
ہجومِ غم کو ہم آئینہ دارِ سرخوشی سمجھے

سکوں جس گام پر واماندگی میں ہو گیا حاصل
اسی کو اپنی منزل رہروانِ زندگی سمجھے

سحر تک وہ فقط تمہید تھی عہدِ محبت کی
ستارے جس کو شب بھر داستانِ زندگی سمجھے

وہ رسم و راہِ منزل سے خلیل زار واقف ہو
مسلسل لغزشوں کو جو کمالِ رہبری سمجھے

جناب قاصر فتح آبادی

تڑپنے لوٹنے کو زندگی بھر زندگی سمجھے
جو فطرت عشق کی تھی فی الحقیقت ہم وہی سمجھے

فرشتوں نے مجھے سجدے کئے ہیں عرشِ اعظم پر
غلط سمجھے اگر مجھ کو فرشتہ آدمی سمجھے

سناؤں تو میں رو رو کر دلِ کی داستاں لیکن
کہیں ایسا نہ ہو وہ میرے رونے کو ہنسی سمجھے

خدا معلوم اُس کی موت کا انجام کیا ہوگا
جو اپنی زندگی کو بھی وبالِ زندگی سمجھے

بہت مشکل ہے اے قاصر سمجھنا حسنِ باطن کا
نگاہِ قیس جانے یا مذاقِ غزنوی سمجھے

جناب طالق ہمدانی لدھیانوی

کسی کے در پہ ہم سر کو جھکانا لازمی سمجھے
اسی میں سربلندی اور اسی میں بہتری سمجھے

پسر کے حلق پر رکھا نہ ہو خنجر خود جس نے
وہ کیا جانے محبت کیا حقیقت عبد کی سمجھے

رضا کے راستوں میں ہم نے برسوں ٹھوکریں کھا کر
رموزِ عاشقی جانے نکاتِ زندگی سمجھے

مری روداد غم اُس سے نہ اے قاصد بیاں کرنا
جو خود غمگیں نہ ہو وہ کیا غمِ بیچارگی سمجھے

جناب نیر نقشبندی کولاری

فنا ہونے کو ہم رازِ حیاتِ دائمی سمجھے
نشاطِ زندگی سمجھے نشاطِ برتری سمجھے

بھلا کیا خاک وہ تعبیرِ خوابِ زندگی سمجھے
جہاں میں جو نہ اسرارِ خودی و بیخودی سمجھے

خلوص و انس ہے دنیا میں گویا صورتِ عنقا
اگر ہو آدمیت آدمی کو آدمی سمجھے

نیر زار ہے کس سے سکونِ قلب کا طالب
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بے کلی سمجھے"

جناب نسیم سیتاپوری

محبت میں فنا ہونے کو حاصلِ زندگی سمجھے
جو یہ سمجھے وہی رازِ جنونِ عاشقی سمجھے

نہ رمزِ بیخودی سمجھے نہ دستورِ خودی سمجھے
مگر تیرے بھکاری صرف رسمِ بندگی سمجھے

غم بے انتہا ہو یا مسرت کی فراوانی
محبت میں ہم ان دونوں کی صورت ایک ہی سمجھے

نسیم اپنے جنوں کا تم مذاق اُن کو اُٹھانے دو
کوئی ہشیار کیونکر لذتِ دیوانگی سمجھے

جناب عارف بانکوٹی

نہ جنت سے مجھے نسبت نہ دوزخ سے کوئی رشتہ
جو چاہے جنتی سمجھے جو چاہے دوزخی سمجھے

گرفتارِ مصیبت ہی سمجھتا ہے مصیبت کو
"جو خود تڑپا نہ ہو وہ کیا کسی کی بے کلی سمجھے"

ہماری سامنے کیوں زندگی کی شرح کرتے ہیں
وہ خود ہیں بے خبر جو موت کو بھی زندگی سمجھے

بلند ادراک سے ہے مرتبہ سیماب[1] کا عارف
نہ اِن کو دہلوی سمجھے نہ اِن کو لکھنوی سمجھے

جناب شارب قریشی ناگپوری

محبت میں خوشی کو غم، الم کو جو خوشی سمجھے
حصولِ مدعا کو کیوں نہ مرگِ عاشقی سمجھے

بتوں کو سجدۂ تعظیم حق، اور دعویٰ انا الحق
مگر پہلے کچھ اپنا مرتبہ بھی آدمی سمجھے

تمہارا امتیازِ حق پرستی واہ کیا کہنا
مگر تم کون ہو، یہ بھی کبھی سوچا کبھی سمجھے

یقیناً وہ میر آرائے بزمِ شعر ہے شارب
جو اپنے آپ کو دائم غلامِ داوری سمجھے

جناب غافل بیتول

معاذ اللہ معصومی ہے اُن کی دید کے قابل
ہمارے جان سے جانے کو بھی وہ دل لگی سمجھے

جو آغوشِ فنا میں پل کے خود ہی ختم ہو جائے
کوئی اُس زندگی کو کس طرح پھر دائمی سمجھے

اطاعت کی حقیقت جانتے ہیں اہلِ طاعت ہی
تمہارا نام لینے ہی کو ہم تو بندگی سمجھے

جو آغوشِ غلامی میں اجل کی نیند سویا ہو
بھلا غافل وہ آزادی کی لذت کیا کبھی سمجھے

جناب حکیم آسی ترہاتوری

اُٹھائے کس طرح سر وہ تمہارے آستانے سے
جو راہِ بندگی کی اس کو حدِ آخری سمجھے

مٹایا امتیازِ ما و تو کا زنگ یوں دل سے
کہ عشق و حسن کو ہم دو نہ سمجھے ایک ہی سمجھے

ہم اتنا جانتے ہیں جلوہ گاہِ ناز میں آسی
زبانِ حسن سے وہ آپ کہدے، آپ ہی سمجھے

جناب وحید نوری۔ غازیپوری

اسی کو غمکدے میں دہر کے راحت میسر ہے
جو غم کو مستقل سمجھے خوشی کو عارضی سمجھے

یہ اشیا کی گرانی اور یہ جنگی پریشانی
ہے سب اعمال کی شامت، اگر جب آدمی سمجھے

وحید اس دورِ سحر انگیز میں کس کی حاجت ہے
نئی تہذیب کا فتنہ ہے سحرِ سامری سمجھے!

---

[1] علامہ سیماب مدظلہ العالی

نقد و نظر

سالنامہ عالمگیر لاہور ۱۹۴۴ء

ماہنامہ "عالمگیر" پنجاب کا مشہور ترین کثیر الاشاعت رسالہ ہے جو سرد و گرم زمانہ سے نبرد آزما ہوتا ہوا ایک ہی روش پر بڑی کامیابی سے نکل رہا ہے۔ "عالمگیر" پنجاب کے دیگر رسائل کی بعض بدعتوں سے ابھی تک پاک اور صاف ہے۔ وہ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی دونوں نظریوں کو سامنے رکھ کر ستھرا مواد پیش کرتا ہے، اور سال میں اپنے ناظرین کو دو خاص نمبر بھی دیتا ہے۔

زیر نظر شمارہ اس کا سالنامہ ۱۹۴۴ء ہے جو دو سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔

اس میں اساتذہ اور مشاہیر شعرا کے علاوہ ملک کے اچھے ادیبوں کے مضامین اور ترقی یافتہ افسانہ نگاروں کے دلچسپ ترین افسانے شامل ہیں۔ علمی و ادبی مضامین بہت وقیع اور ٹھوس ہیں۔ عام طور پر آجکل سالناموں میں افسانے زیادہ ہوتے ہیں لیکن ادارہ عالمگیر علمی و ادبی مضامین کا بھی بطور خاص اہتمام کرتا ہے۔ "عالمگیر" کا یہ سالنامہ ہر اعتبار قابل مطالعہ ہے۔ کاغذ کی گرانی کے باوجود کاغذ بہت اچھا لگایا گیا ہے اور طباعت بھی اعلیٰ ہے۔ البتہ سرورق مصوری کا بھونڈا اور بے رنگ نمونہ ہے۔ عالمگیر جیسے سنجیدہ رسالے کو مرد اور عورت کی بھونڈی تصویریں زیب نہیں دیتیں، ادارے کے ذوق نظر پر شبہ کرنا تو خیر جلد بازی ہے۔ قیمت ۶ روپے ملنے کا پتہ منیجر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور

سالنامہ نرالا ۱۹۴۴ء

"نرالا" لاہور کا ایک ایسا ماہنامہ ہے جو علم و ادب کے ساتھ تفریح و رومان کا بھی علمبردار ہے اس رسالہ کی عام اشاعتیں بھی دلچسپ ہوتی ہیں۔ زیر نظر سالنامہ ۱۹۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اپنے دامن میں گوناگوں مضامین نظم و نثر لئے ہوئے ہے جن میں سے بعض بہت اچھے ہیں۔ اس میں ۱۵ افسانے، ۱۱ علمی و ادبی مضامین اور ۳۶ نظمیں ہیں نرالا کا یہ سالنامہ پچھلے سالناموں سے بہ اعتبار مضامین بہت بلند ہے۔ مدیر محترم جناب طاہر میر کی یہ کوشش دکاوش قابل داد ہے کہ انہوں نے تیسرے درجہ کے لکھنے والوں سے سالنامہ کے صفحات کو خراب نہیں کیا۔ زیادہ تعداد اچھے اور مشہور لکھنے والوں کی ہے رہے وہ دو چار مضامین نظم و نثر جو عامی لکھنے والوں کے ہیں تو وہ اس لئے نگاہوں پر بار نہیں کہ اچھے لکھنے والے ہر چھائے ہوئے ہیں۔ سالنامہ کی ترتیب بھی پچھلے سالوں سے کسی قدر متنوع ہے۔ کاش طباعت اور کتابت اگر زیادہ دیدہ زیب ہوتی۔ سرورق سہ رنگا اور نظر کش ہے مگر عریاں۔ مجموعی حیثیت سے سالنامہ خوب ہے۔ قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ ماہنامہ "نرالا" سنت نگر لاہور (پنجاب)

سالنامہ مشہور ۱۹۴۴ء دہلی

دہلی کا یہ مشہور ماہنامہ "مشہور" ابتدا جب شائع ہوا تھا تو لوگوں کا خیال تھا کہ تجارتی مقاصد کے زیر نظر نکالا گیا ہے، مگر ادارہ مشہور نے اپنے معیار کو بلند کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ خالص علمی و ادبی ماہنامہ ہے۔

اس سال شائع ہونے والے تمام سالناموں میں مشہور کا سالنامہ اپنی صوری خوبیوں کے اعتبار سے اس قدر جاذب نظر اور روح نواز ہے کہ بس دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ادب و آرٹ کا ایک ایسا جھلملاتا مرقع ہے جس پر واقعی زر کثیر صرف کرنا پڑا ہوگا۔ کتابت اور طباعت تو اتنی اعلیٰ ہے کہ داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ نظموں اور غزلوں کو رنگین اور خوبصورت ڈھنگ سے مزین کیا گیا ہے معنوی حیثیت سے بھی سالنامہ "مشہور" اچھا ہے۔ مگر اتنا اچھا نہیں جتنا کہ صوری حیثیت سے۔ اس میں ملک کے اچھے اور مشہور لکھنے والے نظر آ رہے ہیں مگر کم امید کہ آئندہ سال مدیر محترم اس کمی کو ضرور پورا کریں گے۔ دو سہ رنگی تصاویر کے علاوہ شعرا و ادبا کی متعدد یک رنگی تصاویر بھی ہیں۔ سالنامہ میں علمی و ادبی مضامین کم افسانے زیادہ اور غزلیں اس سے زیادہ ہیں۔ حصہ نظم یقیناً بلند ہے۔ بہر حال سالنامہ اس قابل ہے کہ وہ ہر صاحب ذوق کی میز پر رہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ سرورق رنگین۔ قیمت عمار

ملنے کا پتہ رسالہ مشہور فراشخانہ دہلی

ندیم گیا "شاد نمبر"

"ندیم" صوبہ بہار کا مشہور ماہنامہ ہے جو سید حسن امام صاحب کی ادارت میں کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ زیر نظر اشاعت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۴ء کی ہے جسے بہار کے شاعر اعظم حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نہ صرف ایک صاحب طرز شاعر ہی تھے بلکہ بلند پایہ ادیب بھی تھے اور اردو ادب انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ "شاد نمبر" میں ان کی نظم و نثر پر ہر پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے گو اس نمبر میں لکھنے والے کم ہیں مگر جتنے ہیں وہ سب مشہور اہل قلم ہیں۔ حضرت شاد عظیم آبادی کی خود نوشت سوانح حیات کے علاوہ ان کا ایک طویل مرثیہ بھی شامل ہے۔ نیز ان کے ہندی کلام ان کی مثنویوں اور مراثی پر تبصرہ ہے۔ آخر میں مشہور اساتذہ کی نظمیں ہیں جو انہوں نے حضرت شاد کے متعلق لکھی ہیں۔ ماہنامہ "ندیم" کی یہ پہلی کوشش یقیناً کامیاب ہے ممکن ہے اس کے بعد شاد مرحوم کے متعلق اس سے بلند و بہتر خاص نمبر شائع ہو سکے۔ طباعت، کتابت اور کاغذ بہتر حجم ۱۶۰ صفحات قیمت ۱۲

ملنے کا پتہ منیجر ماہنامہ "ندیم" حسین منزل گیا (بہار)

اعجاز صدیقی

سالِ اجرا موسمِ بہار ۱۹۳۰ء — عددِ اشاعت ۱۴ سال

تعارف

جلد ۱۵ — مارچ سنہ ۱۹۴۴ء — نمبر ۳

قصر الادب کا خالص علمی و ادبی ماہنامہ

شاعر آگرہ

زیرِ سرپرستی

اعلیحضرت رسوا مظلومی والیٔ پاجود (کاٹھیاواڑ)

عالیجناب سردار صدیق محمد خانصاحب یونیورسٹی (مالیر)

منظور شدہ

محکمہ ہائے تعلیم صوبۂ پنجاب، صوبۂ ممالک متوسط و برار

ریاست میسور، ریاست کشمیر، حکومتِ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

چندہ سالانہ

عوام سے	۴	معاونین سے	۲۴
خواص سے	۶	مربیوں سے	۵۰
ہمدردوں سے	۱۲	محسنین سے	۶۰
انیسوں سے	۱۵	سرپرستوں سے	۱۲۵

ششماہی ۸ — فی پرچہ ۹

اشاعت گاہ

مکتبۂ قصر الادب آگرہ

محسنین، مربی، معاونین اور انیسان و ہمدردانِ شاعر

محسنین ادب و شعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشترؔ ہنگامی ۶۰ روپے سالانہ
(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیرؔ خورجوی ۶۰ روپے سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیا حضرت کیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ اسٹیٹ ۶۰ روپے سالانہ
(۴) محسنِ ادب نوابزادہ شجاعت خانصاحب مہرؔ جوناگڈھی ۶۰ روپے سالانہ

مربیان ادب و شعر

(۵) مربّی ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز و اسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹا نگر) ۴۸ روپے سالانہ

معاونین ادب

(۶) معاونِ ادب مسٹر اے۔ بی فلیس مآبر بی۔ اے اکبرآبادی ۲۴ روپے سالانہ
(۷) معاونِ ادب جناب مولوی محبوب حسن صاحب آسیؔ خوطن رڑکی (بمبئی) ۲۴ روپے سالانہ
(۸) معاونۂ ادب محترمہ سحرؔ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی مدیرہ رسالہ "ادب" دہلی ۲۴ روپے سالانہ
(۹) معاونِ ادب جناب صوبہ دار اختر علی صاحب گوالیاری ۲۴ روپے سالانہ
(۱۰) معاونِ ادب جناب سید یوسف پیر صاحب نیرؔ کہمی صدر ادب ۲۴ روپے سالانہ
(۱۱) معاونِ ادب جناب مخدوم سید علی اشتر صاحب نقوی البخاری، احمد آباد جھنگ ۲۴ روپے سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۲) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندھری ۱۲ روپے سالانہ
(۱۳) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب نسیمؔ گوالیاری مرحوم ۱۲ روپے سالانہ
(۱۴) ہمدردِ ادب جناب ابوعبدالنظیم خانصاحب ذوقؔ دکنی جمشید پور ۱۲ روپے سالانہ
(۱۵) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھر صاحب رازؔ جوناگڈھی ۱۲ روپے سالانہ
(۱۶) ہمدردِ ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۱۲ روپے سالانہ
(۱۷) ہمدردِ ادب جناب نوابزادہ منکور حسین خانصاحب قیسؔ آف ٹینڈو ۱۲ روپے سالانہ
(۱۸) ہمدردِ ادب جناب محترمہ بلقیس جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۱۲ روپے سالانہ
(۱۹) ہمدردِ ادب جناب محبوب خانصاحب وکیل صدر دربار سخن جودھپور (مشرقی خاندیش) ۱۲ روپے سالانہ
(۲۰) ہمدردِ ادب جناب نعمان تائبؔ صاحب کراچی ۱۲ روپے سالانہ
(۲۱) ہمدردِ ادب جناب سید مظفر حسین صاحب گوہرؔ رئیس وان رادھارام ۱۲ روپے سالانہ

خاصانِ ادب

(۲۲) جناب صاحبزادہ خلیق الرحمان خانصاحب خلیقؔ ٹونکی ۶ روپے سالانہ
(۲۳) جناب عبدالحفیظ صاحب قمرؔ صدیقی پھلواری بی۔ اے ۶ روپے سالانہ
(۲۴) جناب سید مظفر حسین صاحب قریش غازی آباد ۶ روپے سالانہ
(۲۵) جناب محمد عبداللہ خانصاحب بزمؔ امروہوی ۶ روپے سالانہ
(۲۶) جناب لالہ گنگا رام صاحب آبدؔ سرہندی ۶ روپے سالانہ
(۲۷) جناب نذیر احمد صاحب نذیرؔ سنبھلی ۶ روپے سالانہ
(۲۸) جناب ماسٹر حسن خانصاحب اثرؔ بستی ۶ روپے سالانہ
(۲۹) جناب صبغۃ اللہ صاحب آزادؔ صدیقی امروہوی ۶ روپے سالانہ
(۳۰) جناب پریم چند صاحب پریمؔ دہلوی ۶ روپے سالانہ
(۳۱) [illegible]

(۳۳) جناب سبحان خانصاحب غافلؔ بیتول ۶ روپے سالانہ
(۳۴) جناب سید علی حیدر صاحب عابدیؔ جمشید پور ۶ روپے سالانہ
(۳۵) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثرؔ نقوی نوگانواں ۶ روپے سالانہ
(۳۶) جناب شیو پرشاد صاحب برقؔ باندوی ۶ روپے سالانہ
(۳۷) جناب حکیم مولوی عبدالرحمان صاحب شاعرؔ کاندھلوی ۶ روپے سالانہ
(۳۸) علامہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفیؔ دہلوی ۶ روپے سالانہ
(۳۹) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعرؔ نکوڑوی ۶ روپے سالانہ
(۴۰) جناب کنور فاروق علی خان صاحب عارفؔ رئیس ٹینڈو ۶ روپے سالانہ
(۴۱) جناب مقبول احمد صاحب سحرؔ اعظم گڈھی ۶ روپے سالانہ
(۴۲) جناب مولوی مظہرالدین صاحب مظہرؔ رامداسی گورداسپور ۶ روپے سالانہ
(۴۳) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیبؔ آروی جمشید پور ۶ روپے سالانہ
(۴۴) جناب عبدالرؤف صاحب عارفؔ رضوانی اینگلٹن ۶ روپے سالانہ
(۴۵) جناب من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی۔ پی) ۶ روپے سالانہ
(۴۶) جناب محمد حسین صاحب خادمؔ شملوی دہلی ۶ روپے سالانہ
(۴۷) جناب چودہری حلیم یار صاحب رئیس فتحپور ۶ روپے سالانہ
(۴۸) جناب سید عنایت علی صاحب تاباںؔ القادری مناپور (بنگال) ۶ روپے سالانہ
(۴۹) جناب شیخ عبدالرحمان صاحب شبابؔ دہلوی ریواڑی ۶ روپے سالانہ
(۵۰) جناب ملک قربان حسین صاحب شہیدؔ جہلمی بمبئی ۶ روپے سالانہ
(۵۱) جناب عبدالرؤف صاحب فوقؔ سکریٹری اقبال لائبریری نوادہ گنج (گیا) ۶ روپے سالانہ
(۵۲) جناب رگھوندر راؤ صاحب جذبؔ عالمپوری ۶ روپے سالانہ
(۵۳) جناب پنڈت جے ناتھ صاحب کول خادمؔ ایم۔ ایس۔ سی۔ جودھپور ۶ روپے سالانہ
(۵۴) جناب محمد اکرام اللہ صاحب سہاؔ قریشی ایڈووکیٹ لشکر (گوالیار) ۶ روپے سالانہ
(۵۵) جناب منشی ایم۔ آر شاہ صاحب تیجؔ بی۔ [illegible] زبان پنجابی و پشتو) انبالہ ۶ روپے سالانہ
(۵۶) جناب خادم حسین صاحب خادمؔ زیدی [illegible]پور ۶ روپے سالانہ
(۵۷) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور ۶ روپے سالانہ
(۵۸) جناب شیخ محمد احمد صاحب نازشؔ پرتاب گڈھی ملا حاجی محمد جعفر صاحب دمشقی تاب گڈھ ۶ روپے سالانہ
(۵۹) جناب ابراہیم خان رحمت خان صاحب شرفؔ جوناگڈھ ۶ روپے سالانہ
(۶۰) محترمہ سلمٰی خاتون صاحبہ کنیز مناپور بنگال ۶ روپے سالانہ
(۶۱) جناب خان زبردست خان جی آف گونڈھی بانٹوا (کاٹھیاواڑ) ۶ روپے سالانہ

شعرِ انقلاب — کلکتہ

اے عروسِ صوبۂ بنگال - اے سحرِ تمام   غازۂ روئے سحر - آرائشِ گیسوئے شام
مرکزِ فن و تجارت، مشرقِ حسن و جمال   مخزنِ جاہ و امارت، مصدرِ علم و کمال
ساحلِ ہندوستاں، گہوارۂ امن و اماں   جلوہ گاہِ صبحِ رنگیں، سجدہ گاہِ ہندیاں
ایک مدت سے پریشاں دیکھتا ہوں میں تجھے   شعلہ و شبنم بداماں دیکھتا ہوں میں تجھے
ہے کبھی آتش فشانی سے فضا تیری حزیں   تیرے آنسو ہیں کبھی ہنگلی میں طوفاں آفریں
بھوک اور فاقوں سے پامال دل تجھے اکثر نڈھال   کثرتِ امراض سے بگڑا ہوا ہے تیرا حال
تیری فطری رونقوں میں پھر بھی بیداری سی ہے   گو فسوں کاری نہیں، لیکن فسوں کاری سی ہے
تیرے بازاروں میں اب بھی ناچتی ہے زندگی   سبزہ زاروں پر ترے کھلتی ہے اب بھی چاندنی
اب بھی ساحل پر ترے کچھ مضمحل رعنائیاں   صبح سے پہلے لیا کرتی تو ہیں انگڑائیاں
اب بھی کالی کے پجاری لشتہ درسر، دف بکف   رات دن گاتے ہیں نغماتِ عقیدت صف بصف
قصر و ایوانِ بلند اور آسماں رفعت مکاں   اب بھی تیری عظمتِ ماضی کے ہیں افسانہ خواں
کارواں مغرب کا جب اترا تھا ساحل پر ترے   تو نے ہندستان کے کھولے تھے اس پر راستے
یاد ہے تاریخ کو ایثار فرمائی تری   آج کیوں بیکار ہے، پھر، کارفرمائی تری؟
چاہیے دورِ گذشتہ کا کوئی ردِ عمل   کیوں تری دنیائے کیف و رنگ میں آئے خلل
اک نئی، لمبی، گرجتی، گونجتی، انگڑائی لے   ہول رجز کے ساتھ جس کے انقلابی پینترے
بند کردے بد سگالانِ وطن کے راستے   لوٹ لے غارتگرانِ رنگ و بو کے حوصلے
ڈالدے رنگینیٔ ماحول پر جادو کے جال   پھونک دے سب لولے، کردے عزائم پائمال
خلد زارِ ہند کا مشرق میں تو ہے پاسباں   بار پا جائے نہ کوئی دشمنِ امن و اماں
سلسلہ افراد کا مربوط ہونا چاہیے   تیرا ہر اک مورچہ مضبوط ہونا چاہیے

دور تر ساحل سے تیرے ڈوب جائے آفتاب
آبِ ہنگلی میں نہا کر آئے صبحِ انقلاب

سیماب اکبر آبادی

۳؍ مارچ سنہ ۴۴ء

صفحۂ جنگ

(نفسیّاتی اشارات)

پھر صلح کے آثار چھپے جاتے ہیں
پہلو تسکین کے دبے جاتے ہیں
رفتہ رفتہ مناظرِ عالمِ جنگ
کچھ اور بھیانک سے ہوئے جاتے ہیں

ہے دورِ فتن کی سحر و شام کچھ اور
شاید کہ ہے عزمِ ہوسِ خام کچھ اور
معروف ہیں یوں جنگ میں دنیا والے
جیسے نہیں جنگ کے سوا کام کچھ اور

لندن پہ بھی خوفناک بمباری ہے
برلن پہ بھی موت رات دن طاری ہے
بجھتا ہی نہیں ہے شعلۂ آتشِ جنگ
ہنگامہ گرم ہے کہ بس جاری ہے

بحری حملے بھی ہیں، فضائی ہی نہیں
لیکن ابھی یاس سے رہائی ہی نہیں
ہے نفع سے نقصان کا پلّہ بھاری
جاپان کو جنگ راس آئی ہی نہیں

ہوتی ہے شجاعت سے بھی دولت پیدا
دولت سے بھی ہوتی ہے شجاعت پیدا
لیکن جب جمع دونوں یک جا ہو جائیں
ہوتی ہے انھیں سے پھر ہلاکت پیدا

خوں ریزی و انسان کُشی ختم نہ ہو
شاید یہ دور جیتے جی ختم نہ ہو
اب جنگ کے بن رہے ہیں تیز آلات
ممکن ہے کہ یہ جنگ کبھی ختم نہ ہو

یہ جنگ اصول، نہ خیالات کی جنگ
قوت کی ہے جنگ اور نہ کمالات کی جنگ
مفہوم ہے اس لڑائی کا صرف یہی
انساں کی ہلاکت اور آلات کی جنگ

ہٹلر بھی حماقتوں کا اک آلہ ہے
یا کہیے، بداؤں کا کوئی لالہ ہے
حاصل نہیں اختیار اک سانس پہ بھی
اسکیم مگر دوازدہ سالہ ہے!

اے مالکِ قوت و حیاتِ ابدی!
شائستۂ سطوت و ثباتِ ابدی!
دنیا تری ناپید ہوئی جاتی ہے
اس جنگ سے دے اسے نجاتِ ابدی

اے شیطنت و کبر و ریا کے چیلو
ہے وقت کہ عقل کا سہارا لے لو
ملتا ہے ابھی بہت ابیر اور گلال
انسان کے خون سے نہ ہولی کھیلو

سیماب

جرعات

"مسلمانانِ ہند کا اقتصادی زوال اور اُس کا علاج"

آجکل باخبر حلقوں میں بحث و نظر کا مرکز بنا ہوا ہے۔ عالمگیر جنگ سے پیدا شدہ حالات۔ سیاسی اُلجھن اور قومی انتشار نے ہر شخص کو چونکا دیا ہے۔ ہندوستان کی جن جماعتوں اور جن قوموں کو بصارت حاصل ہے اور جو وقت کی نزاکت سے اچھی طرح واقف ہیں وہ دوسرے ممالک کی عبرتناک حالت سے سبق لیکر فلاح و بہبود اور نظم و عمل کی طرف دوڑ رہی ہیں لیکن مسلمان بنیادی طور پر کرودی۔ بے مائیگی اور افلاس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اگر اس گرتی ہوئی حالت کو نہ سنبھالا گیا تو وہ دور بہت زیادہ دور نہیں جب اس قوم کی اقتصادی کمزوریاں اسے کلیتاً تباہ و برباد کردیں۔

مسلمانانِ ہند کے اقتصادی زوال اور اُس کے علاج کے سلسلے میں ملک کے مشہور سہ روزہ اخبار "زمزم" لاہور نے ایک اہم۔ مفید اور ضروری قدم اُٹھایا ہے۔ مدیر موصوف چاہتا ہے کہ اس موضوع پر ملک کے تمام اچھے لکھنے والے۔ مفکرین ماہرینِ اقتصادیات اور بیدار دماغ اہلِ قلم انتہائی غور و فکر اور موجودہ حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مضامین تحریر فرمائیں تاکہ انھیں "زمزم" میں شائع کیا جائے اور مجموعی طور پر ان سے ایک نتیجہ اخذ کرکے آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے تاکہ اُس پر کاربند ہوا جاسکے۔ مدیر موصوف نے اوّل۔ دوم۔ سوم اور انعام و بہتر مضامین کیلئے ۲۲۵ - ۱۲۵ - ۱۰۰ اور ۵۰ روپے کے انعامات بھی مقرر کئے ہیں تاکہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوسکے۔ اہلِ قلم اس طرف پوری پوری توجہ فرمائیں۔

تازہ اشاعت کے مضامین میں "شاعر اور شراب" اور "حضرتِ فرقتی فیروزآبادی" بڑے اہم مضامین ہیں۔ اوّل الذکر مضمون کی افادیت اہمیت توضیح محتاجِ شرح کی جا چکی ہے۔ ثانی الذکر مضمون حضرت مولانا مفتی انتظام اللہ کی تلاش و تحقیق کا نچوڑ ہے مفتی صاحب کی طرز نگارش بھی تحسین کا حصہ ہے۔ یہ مضمون ہمارے سامنے ادب و سیاست کا ایک ایسا عکس پیش کرتا ہے جو علم و ہنر کے ساتھ فضلا اور شعرا کسی قدر سیاسی تحریکوں سے علیحدہ نہیں ہے۔ ادبی لطائف جناب سید رفیق مارہروی کا ایک دلپذیر مضمون ہے — آدھوتا ماہری مرحوم و مغفور کی خوش طبعی اور حاضر جوابی ؎ "اب کہاں لوگ ایسی طبیعت کے"

حصۂ نظم - اس مرتبہ بیری امیدوں سے کہیں زیادہ کامیاب اور بلند ہے۔ ترقی یافتہ شاعر کی رُباعی گر سے نقوش ملیں گے کہ ناظرین بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قدر بگنوری کی نظم تردید بار بار پڑھنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی۔ اور الطاف مشہدی کا "اضطراب" اُنکی رگوں میں کھولنے والے جذبۂ انقلاب کا آئینہ دار ہے "عصرِ حاضر" اقبال ماہر کی قوتِ فکر اور شاعرانہ قدرت کا مظہر ہے۔ "تقلید و تجدید" علامہ شفق عمادپوری کی ایک ایسی نظم ہے جو جدید و قدیم شاعری کو بہ نگاہ طنز دیکھتی ہے اور حقائق کا انکشاف کرتی ہے۔ "فلسفۂ خیال" بھی خیالات کی وسعت اور رفعت کا پتہ دیتی ہے۔ مولانا آلِ مظفر نگری ہندوستان کے اُن چند شعرا میں سے ہیں جو محض شاعری میں استادانہ درجہ رکھتے ہیں بلکہ شاعری کو درس پیام کا بھی حامل سمجھتے ہیں "آنسو" مولوی ابوالمحسن صاحب تعبیر بدایونی کی بڑی فلسفیانہ نظم ہے جس میں خیالات کی گہرائی کے ساتھ ساتھ الفاظ کا ایک سمندر موجیں مار رہا ہے۔ "میرلال" صابر اکبرآبادی کے پیدا ہونے جذبات کی خوبصورت نمود ہے۔ افسر احمدنگری اپنے رنگ کے واحد لکھنے والے ہیں۔ غزل میں بھی اُن کے یہاں درس پیام ہوتا ہے۔ علامہ ناطق گلاوٹھوی۔ نجم تصدق۔ علی اسد قمر جوناگڈھی۔ سراج جوناگڈھی اور ضیا فتح آبادی کی نظمیں اور غزلیں کتنی جاذب ہیں۔ اسکا فیصلہ پڑھنے والے کرسکتے ہیں۔

شاعر نوازی

۱- جناب پیرزادہ قاضی معین الدین احمد صاحب حاذق احمدپور شرقیہ — ۳ خریدار (عام)
۲- جناب ارشد ساکری۔ ساگر — ۲ " "
۳- جناب نہال مخدومی — ۲ " "
۴- جناب سید مظفر حسین صاحب گوہر دان رادھارام — ۱ " (خاص)
۵- جناب عارف سیالکوٹی — ۱ " "
۶- جناب طالب امین آبادی۔ دھرم سالہ (کانگڑہ) — ۱ " "
۷- جناب صوبہ دار اختر علی صاحب (ملنگ) — ۱ " "
۸- جناب مخدوم سید علی اسد نقوی البنی ری۔ احمدآباد (جھنگ) — ۱ " (عام)
۹- جناب اکرم حنیفی دھولیوی — ۱ " "
۱۰- جناب محی الدین احمد شان اویسی۔ احمدپور شرقیہ — ۱ " "
۱۱- جناب دیا پرکاش صاحب سود ایڈیٹر شانِ ہند ملتان — ۲ " "
۱۲- حضرت مسلم مالیگانوی — ۱ " "

امدادی فنڈ

جناب عبدالرزاق الٰہی بخش صاحب نثار عدن — ۶ عہ
جناب حکیم مولوی عبدالرحمان صاحب شاہ کانڈھا فیلہ سلطانی —

ماہر

شاعر اور شراب

اعجاز صدیقی

"میرے عزیز دوست حضرت ماہر القادری نے اپنے اس مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ شراب نوشی نہ تو شاعر کے لئے ضروری ہے نہ مستحسن۔ مجھے مسرت ہے کہ ترکِ مے نوشی کا احساس ہمارے طبقے میں بھی پیدا ہو چلا ہے اور یہ اس نوعیت کی دوسری آواز ہے لیکن "شراب و ساقی" جب تک اردو شاعری کے لاینفک موضوعات ہیں اس وقت تک شاعروں کے رجحانات کو شراب کی گندگی اور واعظ و شیخ کی توہین سے بچایا نہیں جا سکتا۔ اسی احساس کے ماتحت سب سے پہلے حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ نے ۲۸ مئی ۱۹۳۸ء کو **بھاول** میں ہزاروں سامعین کے سامنے موضوعِ **"شراب"** کو اردو شاعری سے حذف کرنے کا اعلان کیا۔ اور اب خدا کا شکر ہے کہ نہ صرف "آگرہ اسکول" کے ہزاروں پیروکار بلکہ دوسرے شعرا بھی اپنے کلام میں معناً یا اصطلاحاً شراب و ساقی اور اس کے متعلقات کا ذکر نہیں کرتے۔

ضرورت ہے کہ تمام شعرا اس موضوع سے دست بردار ہو جائیں۔ نہ شاعری میں شراب کا ذکر ہوگا نہ تشویق و تحریص کے جراثیم پھیلیں گے نہ اکابرِ اسلام پر تبرا بازی ہوگی۔ جس طرح شاعر کے لئے شراب پینا ضروری نہیں ہے اسی طرح شراب اور اس کے متعلقات پر فکر کرنا بھی لازمی نہیں۔ ہزاروں موضوعاتِ شاعری کی موجودگی میں اگر ایک موضوع جو بلحاظ مآل و اثر مخربِ اخلاق ہے، حذف کر دیا جائے تو نفسِ شاعری کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔

اگر شراب اور اس کے موضوعات سے کوئی لطیف کنایہ اور استعارہ مقصود ہو، جیسے "چشمِ میگوں"، "خمخانۂ عشق"، "صہبائے نظر" وغیرہ وغیرہ، تو چنداں مضائقہ نہیں، لیکن اس طرح کہنا ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا
سبحہ اٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اٹھا

یقیناً سنجیدگی کے خلاف ہے ———

زمانہ کا خونریز اور تیز انقلاب جس طرح کرۂ ارضی کے جغرافیہ کو تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے، اسی طرح خیالات اور معتقدات میں عام انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ انسانی تصورات اپنی مرکزیت اور اعتدال سے بیگانہ ہو چکے ہیں، بغاوت اور لاقانونیت کے بحران نے انسان کو اخلاق و کردار سے بغاوت پر آمادہ کر دیا ہے۔ جو لوگ انقلاب کی طرف جتنے زیادہ مائل ہیں، اتنا ہی ان کا جھکاؤ فواحش و معاصی کی طرف ہے۔ عریانی اور بے حیائی عام ہو رہی ہے، ہندوستان کی وہ خواتین جن کے آنچل پر مہ و مہر کی نگاہ بھی نہ پڑتی تھی، ایسے بیباکانہ مضامین لکھ لکھ کر اخباروں اور رسالوں میں چھپوا رہی ہیں جن کو پڑھ کر غیرت کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ "انقلاب و ترقی" کے نام پر ہو رہا ہے کوئی درد مند ان بے اعتدالیوں پر اعتراض کرتا ہے تو اس کو دقیانوسی، قدامت پرست اور جاہل کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بغاوت و انقلاب کا یہی جنون ادب کے ساتھ بے ادبی کر رہا ہے۔ بے حیائی اور فحش نگاری کو "آرٹ" (ART) کہتے ہیں اور یہ "لے" اتنی بڑھ گئی ہے کہ بانگِ دہل کہا جا رہا ہے:۔

"شاعر کے لئے شراب پینا ضروری ہے، شراب کے بغیر شعر میں مستی اور قوت پیدا نہیں ہو سکتی"

اس تبلیغِ مے نوشی کا یہ اثر ہے کہ ہمارے بہت سے نوخیز شعر گو اور مضمون نگار شراب نوش بنتے جا رہے ہیں۔ اور یہ خیال کہ مے خواری کو شعر گوئی سے خاص ربط ہے، اب عملی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اسی غلط فہمی اور گمراہ خیالی کے ازالہ کے لئے چند صفحے اربابِ نظر اور اہلِ ادب کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں ——— اس یقین اور توقع کے ساتھ کہ اگر آپ میرے خیال سے متفق ہوں تو اپنے حلقۂ عمل میں آپ بھی ان خیالات کو عام کرنے کی کوشش فرمائیں۔ تنہا ایک آدمی تبلیغ کا فرض انجام نہیں دے سکتا۔ نیکی کی اشاعت اسی طرح ممکن ہے کہ ایک دوسرے سے کہے اور دوسرا تیسرے سے اور یہ سلسلہ ریاضی کے قاعدے کے مطابق ضرب کھاتا ہوا چلا جائے ———! میں اس مضمون کے پڑھنے والوں کو ایک ذمہ داری سونپ رہا ہوں، کاش! وہ اس امانت

صحیح حق ادا کریں ——— !

شراب کا اثر فکر و احساس پر

میں شاعر کو "پیغمبر" "فرشتہ" اور "معصوم" نہیں سمجھتا۔ عام انسانوں کی طرح اُس سے بھی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ وہ بھی معصیت سے آلودہ ہو سکتا ہے لیکن میں شاعر کو اگر "پیغمبر اور فرشتے" کی حیثیت سے نہیں دیکھتا تو میں اُس کو "شیطان" بھی نہیں سمجھتا، شاعر پر بھی اخلاق و جماعت کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اچھا شعر کہنے کے بعد اخلاق و انسانیت کی ذمہ داریوں سے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتا، تہذیب و ترتیب اور نظم و ضبط کی نزاکتوں کا شاعر کو تو عام لوگوں سے اور زیادہ احساس ہونا چاہئے کہ شاعری کا مدار ہی خیال و لفظ کی "تنظیم" اور "ہم آہنگی" پر ہے!

میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بات منوانے کے لئے ہٹ دھرمی اور زیادتی پر اتر آتے ہیں اور ثابت شدہ حقائق کے جھٹلانے سے بھی نہیں جھجکتے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ متقدمین شعرا میں بعض شراب نوش بھی تھے، میں تو یہاں صرف اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں کہ شاعر کے لئے شراب پینا بالکل ضروری نہیں ہے اور بہت سے ایسے شعرا بھی ہوئے ہیں جنھوں نے جام و مینا کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور وہ اپنے دَور کے بہت بڑے شاعر تھے اور آج بھی ادب اُن کے نام اور کام پر فخر کرتا ہے۔

ہاں! اتنی بات میں مزید کہوں گا کہ جو شاعر شراب نوش تھے اگر وہ شراب نوشی نہ کرتے تو جو کچھ شعر و ادب کا سرمایہ انھوں نے چھوڑا ہے، اُس سے بہت زیادہ بلند پاکیزہ اور مفید سرمایہ دُنیا کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔ میخواری نے اُن کی صلاحیتوں کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا اور یہ بات میں مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ طب و نفسیات کا مطالعہ مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ شراب سے وقتی طور پر تو رگ و پے میں توانائی اور انتعاش محسوس ہونے لگتا ہے لیکن اس کا ردِ عمل انتہائی مُضر اور تباہ کُن ہوتا ہے۔ اور اعصاب کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کی توانائیاں بھی تکان اور تشنج محسوس کرنے لگتی ہیں۔ دل و دماغ کی کمزوری دراصل فکر و احساس کی کمزوری ہے اور شاعری میں سارا کھیل فکر و احساس ہی کا ہے۔

شراب جذبۂ حیوانیت کو اُبھارتی ہے، مستی کے عالم میں جو شعر کہا جائے گا اُس کے رنگین اجزا ء کا سب سے بڑا عنصر "حیوانی جذبہ" کو متحرک کرنے والا ہوگا۔ اس قسم کی شاعری صحتِ فکر سے بڑی حد تک عاری ہوگی، جہاں "صحتِ فکر" نہ ہو وہاں سماج اور معاشرت کے لئے افادیت اور بہتری کی تلاش ہی بیکار ہے۔

شاعرانہ استعارے

یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ جو شاعر شراب و مستی کے مضامین نظم کرتا ہو وہ شراب خور اور رند بھی ہو۔ شراب نہ پی کر بھی اس موضوع پر بہتر سے بہتر شعر کہے جا سکتے ہیں۔ حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم کے دیکھنے والے اور ملنے والے سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور وہ سب اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ ریاض نے "اُم الخبائث" اور "بنت العنب" کو کبھی منہ نہیں لگایا، ریاض بڑے پاکباز اور نیک کردار انسان تھے "شراب" اُن کی شاعری کا خاص موضوع تھی، اس موضوع کو اُنھوں نے آخر تک نبھایا اور اس رنگ کو اتنا تیز کر دیا :—

جہاں ہم خشتِ خُم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

"جام و مینا" "شراب و میخانہ" "جام و ساقی اور "لغزش و مستی" دراصل شاعرانہ استعارے ہیں، اس پیرایہ میں شاعر بلند مضامین ادا کرتا ہے اور پڑھنے والوں کی توجہات کو جذب کرنے کے لئے یہ رنگین انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ شاعرانہ اصطلاح میں "شراب" سے مراد "وسکی" اور "برانڈی" نہیں ہوتی اور "ساقی" ہوٹل یا (BAR) کے اُس "BOY" کو نہیں کہتے جو سفید وردی پہن کر شراب "SERVE" کرتا ہے۔ غالب جو بدقسمتی سے شراب[1] کا شغل کرتے تھے، فرماتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو "بادہ و ساغر" صرف استعارے اور شاعرانہ اصطلاحیں ہیں، شاعر کی اس سے مراد کچھ اور ہوتی ہے۔

بابا فغانی کا شعر ہے :— ؎ اے کہ می پرسی چرا جامے بہ جانے می دہی
این سخن با ساقیٔ ما گو کہ ارزاں کردہ است

اس شعر میں "ساقی" سے مراد شراب پر نگالی پلانے والا نہیں ہے، بلکہ اُس "شراب خانہ" کا "ساقی" ہے جس کی "حمد" میں غالب نے کہا ہے :—

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست
فسونِ بابلیان فصلے از فسانۂ تست

شاعرانہ اصطلاح میں شراب مستی کا حاصل یہی "نشاطِ معنوی" ہے۔

غالب کا ایک شعر ہے :—

بُرد آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت
ریخت مے بر خاک چوں در جام گنجیدن نہ داشت

---

[1] مگر اپنے اس گناہ پر وہ نادم تھے، اور اُن کے شاگرد میر مہدی مجروح کا بیان ہے کہ نشہ اُترنے کے بعد وہ سینکڑوں بار توبہ استغفار کرتے تھے ——— ماہر

یہاں "امانتِ آدم" اور "قرآنی آیت" کی تشریح کی جا رہی ہے اور اظہارِ مطلب کے لئے "جام و مے" کے استعاروں سے کام لیا جا رہا ہے۔ معمولی فہم کا انسان بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ وہ آسمانی شراب جو زمین پر گر پڑی اُس سے مراد یہ شراب نہیں ہو سکتی جو بھٹیوں پر تیار ہوتی ہے۔ شاعر نے مفہوم کو رنگین اور دل نشین بنانے کے لئے یہ پیرایہ اختیار کیا ہے!

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ روحانی شراب کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر شعراء مادی شراب کا بھی ذکر کر جاتے ہیں۔ غالب کہتا ہے:—

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را۔

مگر صوفیانہ نقطۂ نگاہ سے اس "مادی شعر" کی بھی "معنوی توجیہہ" ہو سکتی ہے کہ "بادۂ صافی" سے "خالص توحید" اور "گلاب" سے "امتزاجِ کثرت" مراد ہے، کیونکہ:—

"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"

بہر حال یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ "جام و بادہ" کے پیرایہ میں شاعر بہت سے بلند اور پاکیزہ حقائق بیان کرتا ہے اور اظہارِ بیان کی یہی سرمستی اور رنگینی شعر اور فلسفے کے مابین امتیازی حد قائم کرتی ہے۔

شراب نہیں پیتے تھے

اب میں ان چند نامور اور باکمال شعراء کو پیش کرتا ہوں کہ جو شعر و ادب کے امام اور مجتہد تھے مگر شراب نوشی کی لعنت سے وہ ہمیشہ دُور رہے۔

خاندان بنو امیہ کے مشہور خلیفہ عبدالملک ابن مروان کے عہد میں جمیل مشہور عربی شاعر گذرا ہے، اور اُس نے شراب کے موضوع پر بہت کچھ کہا ہے۔ مگر سیرت نگاروں نے اُس کی پاکبازی کی تعریف کی ہے۔ یہی حال ابوالعتاہیہ کا ہے کہ اُس نے جام و مینا کو ہاتھ تک نہیں لگایا، ابوالعتاہیہ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار کا مشہور شاعر اور ملک الشعراء ابونواس کا ہمعصر تھا، ابوالعتاہیہ کی شاعری کو عربی لٹریچر میں خاص امتیاز حاصل ہے۔

ابنِ رشیق قیروانی فنِ نقد کا امام تھا اور باکمال شاعر بھی تھا، سیرت نگاروں نے ابنِ رشیق کو پاکباز، مرتاض، زاہد اور بلند کردار بتایا ہے ——!

سعدی، خسرو، عراقی، جامی، حکیم سنائی، مولانا روم، ابنِ یمین (وغیرہ) جو آج بھی خسروِ سخن کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ شراب نوش نہیں تھے، اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے اُن کا مقام بہت بلند تھا۔ ان تمام مشاہیر نے شراب و مستی پر بہت کچھ کہا ہے مگر اس "مادی شراب" کی صورت تک نہیں دیکھی۔

علامہ آزاد بلگرامی جن کی ذات عرب و عجم کے لئے مایۂ ناز ہے۔ عربی اور فارسی کے بہترین شاعر تھے، لیکن اُن کا کردار، چاندنی کی طرح اُجلا اور طور کی مانند شفاف تھا کردار کی یہی پاکیزگی شعر کے سانچے میں ڈھل کر "صورتِ سرمدی" اور "نغمۂ سروش" بن گئی۔

مرزا مظہر جانجاناں، خواجہ میر درد، میر تقی میر، آتش، ذوق، امیر، داغ اور اکبر الٰہ آبادی (وغیرہ) بھی شراب نہیں پیتے تھے۔ حالانکہ شراب و مستی پر اُنھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ شراب نہ پینے سے اُن کے کلام کی مستی کم نہیں ہوئی اور ہم آج بھی ان کے اشعار پڑھکر سر دُھنتے اور وجد کرتے ہیں۔

خداشناس خیام

خیام کے اشعار میں جام و مینا گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یورپ مجاز کے شیدائی اور مادیت کے پرستار یورپ نے خیام کے اسی رنگ سے متاثر ہو کر خیام کی شاعری کو قبول کر لیا —— لیکن خیام کے زمانہ کے تذکرہ نگار خیام کی شراب نوشی کا ذکر تک نہیں کرتے اور اس کا کہیں بھی ثبوت نہیں ملتا کہ خیام شراب پیتا تھا۔

بلکہ اس کے برعکس خیام خداشناس شاعر و عالم تھا۔ اُس کی موت بھی فکر و استغراق کے عالم میں واقع ہوئی۔ اُس کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الحاد، دہریت اور بے دینی کا شدید دشمن تھا، اُس نے اپنے عالمانہ اور فلسفیانہ مضامین میں خدا کے وجود کو ثابت کر کے منکرین اور متشککین کے اعتراضات و شکوک کا ازالہ کیا ہے۔

خیام نے اپنے مشہور رسالہ "کون و تکلیف" میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو واجب الوجود اور علت العلل بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ واجب الوجود جس طرح اپنے وجود کی علت سے بے نیاز ہے، اسی طرح اس کے اوصاف و صفات بھی اسباب اور علتوں سے بے نیاز ہیں۔ یہ کائنات واجب الوجود کے صفتِ کرم کا نتیجہ ہے!

"انقلاب و ترقی" کے "گوشِ ہوش" سُن رہے ہیں ——!

شراب نوشی سے انکار

حضرت نظامی گنجوی چھٹی صدی ہجری کے مشاہیر شعراء ظہیر فاریابی، انوری اور خاقانی کے ہمعصر تھے، نظامی کی ذات پر ایران فخر کرتا ہے، مثنوی کے وہ مسلم الثبوت استاد تھے۔ نظامی ایران کے اُن چند شاعروں میں سے ہیں جن کا نام محبت ہی نہیں عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے بھی تمام شاعروں کی طرح "شراب و ساقی" پر بہت کچھ کہا ہے۔ مگر اپنے نقطۂ نگاہ کو خود ہی واضح بھی کر دیا ہے:—

نہ پنداری اے خضرِ پیروز پے — کہ از مے مرا هست مقصود مے
ازاں مے ہمی بیخودی خواستم — بداں بیخودی مجلس آراستم

مرا ساقی از وعدۂ ایزدی بست   صبوح از خرابی مے از بے خودی است
دگر نہ بہ یزداں کہ تا بودہ ام
بہ مے دامنِ لب نیا لودہ ام

صاف صاف فرماتے ہیں کہ شراب سے میری غرض صرف "بے خودی" ہے اور اسی "بے خودی" سے میں نے شاعری کی مجلس کو سنوارا ہے اور میں نے اپنے لبوں کو شراب سے آلودہ نہیں کیا۔

میں نے مضمون کی تمہید میں جو کچھ عرض کیا تھا اسکی لفظاً اور معناً تائید حضرت نظامیؒ کے اشعار سے ہوتی ہے!

میں نے جن باکمال شعراء کو اوپر پیش کیا ہے، اُن سے میرا یہی مقصد ہے کہ بہت سے مشاہیر شعرا ایسے گذرے ہیں جو شراب نہیں پیتے تھے اور اُن کے کلام میں مستی اور زور بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ یہ خیال نہ صرف غلط بلکہ گمراہ کُن اور مجرمانہ ہے کہ شاعر کے لئے شراب پینا ضروری ہے وہ شعرا جو وسکی، برانڈی اور بیر کے سہارے اپنے کلام میں مستی اور زور پیدا کرتے ہیں۔ اُن کے کلام کی زندگی بھی شراب کے نشہ کی زندگی سے زیادہ نہیں ——! بہت سے بہت ایک رات، کہ خمار اترا اور مستی غائب ——!

یہ چند سطریں ایک واعظ و زاہد نے نہیں بلکہ ایک درد مند گناہگار نے ایک خاص احساس کے ساتھ سپردِ قلم کی ہیں۔ غرض طنز و تعریض نہیں اصلاحِ حال ہے ؎

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے
شاعر! ترے سینہ میں نفس ہے کہ نہیں ہے

انسانیت "بوئے شراب" کے تعفن سے بیچ بیچ گھبرا چکی ہے اور آج گلستانِ جہاں کو ایسے ہی نفسِ پرسوز کی ضرورت ہے کہ "گل و لالہ" کی آگ بھڑک اُٹھے، کیونکہ:-

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ماہر القادری

> **مشاعرۂ شاعر:- مصرع طرح برائے ماہ مئی ۱۹۴۴ء**
>
> "خودی پسند کبھی بیخودی نہیں ہوتی"
>
> بیخودی۔ زندگی وغیرہ قوافی نہیں ہوتی ردیف
>
> نوٹ:- غزلیں یکم اپریل تک آجانی چاہئیں۔ مشاعرہ کے لئے صرف مستقل خریدار غزلیں بھیج سکتے ہیں غزل کیلئے خریدار ہونا ضروری ہے۔ مشاہیر شعرا اس قید سے آزاد ہیں۔ منیجر

نذرِ صفی

نہ مطربہ نہ صبوحی نہ دورِ پیمانہ   ہے تیری فہم سے بالا خودی کا میخانہ
لہو ترنگ کو تو جلترنگ کہتا ہے   اسی لئے تو یہ آبادیاں ہیں ویرانہ
کہاں وہ لذتِ ایماں وہ شوکتِ جبروت   خیالِ مردِ مسلماں فسونِ افسانہ
یہی وہ چیز ہے کہتی ہیں جانِ پاک جسے   میں کیا بتاؤں رموزِ حدیثِ رندانہ
بغور دیکھ سوادِ بہارِ حُسنِ فرنگ   فقط فریبِ نظر ہے یہ آئینہ خانہ
لطیف بات ہے لیکن کہوں تو کس سے کہوں   چراغِ برق سے روشن ہے میرا کاشانہ
گمان و وہم کو احساس سے نہ کر تعبیر   کہاں وہ جامِ تہی اور کہاں یہ میخانہ
کسے خبر کہ سزاوارِ حکمرانی ہے   ازل کے دن سے ہی جس کی روش گدایانہ
جنونِ عشق گلستاں بھی ہے بیاباں بھی   مگر خرد کی کشاکش نہیں حریفانہ
"خرابِ ہوش" ہیں رندانِ پاکباز تمام   نہ خُم نہ ساقیِ رنگیں سخن نہ پیرِ میخانہ
صدائے طبل و علاجل ہے میرے نغموں میں   مجھے پسند نہیں ہائے و ہوئے مستانہ
جہانِ کُن فیکوں یہ طلسم گاہ کُہن   مری نگاہ میں ہے زندگی کا میخانہ

شکستِ عزم ہے افسر فروغِ عزمِ شکست
اسی میں ہے مرے "افکارِ نو" کا افسانہ

افسر احمد نگری

حضرت فرقتی خیرآبادی

علامہ فضلِ حق متخلص فرقتی خیرآبادی کے والد مولانا فضل امام بن شیخ ارشد ہرگامی نسباً فاروقی تھے۔ فضل وکمال کے ساتھ منطق و فلسفہ میں تبحر خاص تھا۔ دلی میں صدر الصدور کے فرائض انجام دیتے تھے مگر اس کے ساتھ باپ دادا کا طریقہ بھی جاری تھا منتہی طلبا کو بالخصوص علوم معقول کا درس دیتے "مرقات" "حاشیہ افق المبین یادگار" سے ہیں سنہ ۱۲۴۴ھ میں انتقال کیا۔

سنہ ۱۲۱۲ھ میں علامہ فضلِ حق پیدا ہوئے باپ سے جملہ علوم و فنون کی تحصیل کی، سندِ حدیث مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے لی ۱۴ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے اور باپ کے تلامذہ کو درس دینے لگے۔[2]

ایک طالب علم مولانا فضلِ امام سے پڑھنے آیا، آپ نے فرمایا کہ میاں جاؤ فضلِ حق سے سبق لے لیا کرو وہ انکے پاس آیا——غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ، علم کم، ذہن کند۔ یہ نازک طبع نازپرور جمالِ صورت و معنی سے آراستہ چودہ برس کا سن و سال نئی فضیلت ذہن میں جودت بھلا ایسے سے کیسے ملے۔ صحبت راس آتے تو کیونکر آتے۔ تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے، جھٹ اسکی کتاب پھینکدی، برا بھلا کہہ کر نکال دیا وہ روتا ہوا مولانا کے پاس پہونچا اور سارا حال کہہ سنایا، فرمایا بلاؤ اس خبیث کو۔ مولوی فضلِ حق آئے۔ دست بستہ کھڑے ہوگئے، مولانا نے ایک تھپڑ دیا اور ایسے زور سے کہ ان کی دستارِ فضیلت دور جا پڑی پھر فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعم میں پرورش پائی، جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطرداری سے پڑھایا۔ طالب علموں کی قدر و منزلت کو تو کیا جانے اگر بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ ؎

درازیِ شب از مژگانِ من پرس
کہ یک دم خواب در چشمم نگشت ست[3]

ملازمت اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا، دلی میں ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمے کے سررشتہ دار ہوگئے۔ ابوظفر ولی عہد سے دوستانہ مراسم تھے، قلعہ میں آتے جاتے، دلی وہ دلی تھی کہ ایک طرف حدیث و فقہ کا دور دورہ، دوسری طرف منطق و فلسفہ کی گرم بازاری، شعر و سخن کے گلی کوچوں میں چرچے بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر موجود، انکے ہم سبق مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ مولوی امام بخش صہبائی علامہ عبداللہ خاں علوی حکیم مومن خاں مومن۔ نواب مرزا اسداللہ خاں غالب۔ نواب ضیاءالدین خاں نیر، شاہ نصیرالدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ حکیم آغاجان عیش حافظ عبدالرحمٰن احسان۔ میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔[1]

علامہ فضلِ حق کے بزرگوں کے وطن کے لحاظ سے ان کو خیرآبادی کہہ لو مگر حقیقت میں اُن کا بچپن، جوانی، بڑھاپا سب دلی میں گذرا، مرزا غالب آگرہ سے دلی آئے تو ان سے بھی رسم پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ بڑھ گئی یہاں تک کہ مرزا ان کو اپنا مخلصِ بے ریا سمجھنے لگے۔

مناظرہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید ابن مولوی عبدالغنی بن حضرت ولی اللہ دہلوی علامہ سے بیس سال بڑے تھے، علوم منقول ہی میں نہیں بلکہ معقول میں بھی انھیں اجتہادی درجۂ کمال تھا۔ بدعات و محدثات کے خلاف آواز اٹھائی، علمائے دین بھڑک اٹھے، علامہ بھی انکے آگے آگے تھے۔ کبھی اکبر شاہ ثانی کو ابھارا، مگر شہید کی حق گوئی نے بادشاہ کی زبان بھی بندکردی آخر مناظرہ کی ٹھنی۔ ایسا بازار گرم ہوا جسکا سلسلہ ہندوستان میں برسوں جاری رہا۔

امتناعِ نظیر، امکانِ نظیر کا مسئلہ، رفع یدین آمین بالجہر کی بحثیں چھڑ گئیں ہر دو الجھتے ہی رہے۔ دونوں میں تحریری مناظرہ ہوا کرتا۔ ایک مرتبہ علامہ اور حکیم مومن خاں مومن شطرنج کھیل رہے تھے۔ کوئی اعتراض دماغ میں آیا، اسی وقت آدمی کو لکھکر دیا جاؤ، مولانا سے جواب لاؤ وہ گیا۔ حضرت شہید کسی کام میں تھے۔ خادم واپس آگیا۔ شطرنج سے آنکھ اٹھاکے پوچھا جواب لائے وہ بولا ابھی جواب نہیں لکھا ہے تحریر دے آیا ہوں مسکراکے بولے بس ہولیا جواب" یہ بات حکیم مومن خاں کو بری لگی

۱؎ سیرالعلما ۲؎ مولانا فضلِ حق و عبدالحق خیرآبادی مطبوعہ مجلسِ مصنفین علی گڈھ
۳؎ منقول مولانا غوث علی شاہ قلندر (تذکرہ غوثیہ)

۱؎ گلِ رعنا صفحہ ۲۱۲ ۲؎ امیر الروایات از امیر شاہ خاں۔

حکیم صاحب اور شہید پر جا پڑے اور ہم عقیدہ سے نکلے کہنے لگے وہ بات ہی ایسی کہی ہے جسکا جواب مولانا محمد اسمٰعیل نہ دے سکیں اس پر ہر دو میں بحث خوب خوب رہی، ہر دو کے مزاج برہم سے ہونے لگے۔ حکیم صاحب نے یہ رنگ دیکھکر بساطِ شطرنج طے کی اور چلتے ہوئے یہ شعر پڑھا [5]

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

علامہ فرقتی اور آرزو ہر دو تخلص رکھتے تھے۔ دو ایک دن بعد یاد آگئی، حکیم صاحب کے گھر گئے اور دوست کو منالائے۔ انھوں نے فی البدیہہ کہا۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

علامہ نے ایک دن مرزا غالب سے کہا حضرت! فذرہ کے ہونہ نمازکے کچھ تو آخرت کے لئے نیکی کا کام کرو موقعہ اچھا ہے۔ گھے ہاتھوں ثواب لے لو۔ وہ مسکرائے اور کہا فرمایئے کیا کام ایسا ہے۔ آپ نے کہا فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو جس میں اُنکے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید او رخاصکر مولوی شاہ محمد اسمٰعیل کو مخاطب کرکے امتناع ختم النبین کے مسئلہ کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کرو۔ اس مسئلہ میں شاہ صاحب کی یہ رائے تھی کہ ختم النبین کا مثل ممتنع بالذات اور ممتنع بالغیر ہے۔ ممتنع بالذات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت صلعم کا مثل اس لئے پیدا نہیں ہوسکتا کہ اسکا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے نہ اس لئے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے برخلاف اسکے علامہ کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبین کا مثل ممتنع بالذات ہے اور جسطرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کرسکتا اس طرح خاتم النبین کا مثل بھی پیدا نہیں کرسکتا۔ مرزا صاحب نے مثنوی لکھ ڈالی جو کلیات میں مثنویات کے سلسلہ میں چھٹی مثنوی ہے۔

علامہ مثنوی دیکھ کے خوش نہیں ہوئے بلکہ چراغ پا ہوگئے۔ مرزا کو نہ شاہ صاحب سے خصومت تھی اور نہ اُنکے مخالفوں سے تعلق بلکہ صرف دوست کی رضاجوئی مقصود تھی چنانچہ علامہ کے کہنے سننے سے کچھ اور اشعار کا اضافہ کرکے دوست کو رضامند کرلیا۔ [6]

جھجر کی روانگی

عرصہ کے بعد ریزیڈنسی کشنری میں اپنے آپ کو تبدیل کرالیا مگر یہاں بھی زمانہ بے رنگ تھا۔ یہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ حکام تھے تنگ مزاج حفظ مراتب کہاں۔ ارباب علم اور بے علم سب ایک آنکھ دیکھے جاتے۔ علامہ نے استعفیٰ دیا۔ نواب فیض محمد خاں۔ رئیس جھجر نے بانعدہ ...

ماہوار معارف کے لئے پیش کیا اور قدر دانی کے ساتھ اپنے پاس بُلایا دہلی سے روانگی کے وقت ولیعہدِ سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر نے اپنا ملبوس دوشالہ علامہ کو اڑھا دیا اور بوقت رخصت آب دیدہ ہوکے کہا چونکہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں۔ میرے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ میں بھی اسکو منظور کروں مگر خدا علیم ہے کہ لفظِ وداع زبان پر لانا دشوار ہے [1]

ایک عرصہ تک جھجر رہے پھر الور رہاراجہ نے بلوالیا۔ کچھ دنوں بعد سہارنپور قیام رہا۔ نواب ٹونک کے پاس بھی رہے۔ نواب یوسف علی خاں نے رام پور بُلالیا۔ خود تلمذ اختیار کیا اور محکمۂ نظامت اور مرافعہ عدالتیں میں منسلک کردیئے گئے۔ نواب کلب علیخاں نے بھی کچھ آپ سے پڑھا۔ آٹھ دس برس رہنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ [2] وہاں صدر الصدور ہوگئے۔

مولوی رحمٰن علیخاں تذکرہ علمائے ہند میں اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں کہ میں نے سنہ ۱۲۶۴ھ میں بمقام لکھنؤ مولانا کو دیکھا کہ حقہ نوشی کی حالت میں شطرنج بھی کھیلتے جاتے تھے اور ایک طالب علم کو افق المبین کا درس اس خوبی سے دیتے تھے کہ مضامین کتاب طالب علم کے ذہن نشین ہوتے جاتے تھے [3]

ادیب

فضل وکمال وعلمی حیثیت سے علامہ جس قدر و منزلت کے شخص تھے اسکی نظیر ہندوستان میں مشکل سے ملے گی۔ علوم معقول کے تو امام تھے ہی۔ علم ادب جو عربیت کا بڑا جوہر ہے اس میں وہ کمال پایا کہ عرب کے معاصر شعراسے گوئے سبقت لے گئے۔ علامہ کو عربی نظم پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ چار ہزار سے زائد اشعار کہے۔ مولانا غوث علی شاہ قلندر واقعہ بیان کرتے تھے کہ علامہ نے ایک قصیدہ عربی میں امرأ القیس کے ایک قصیدہ کی طرز پر لکھا اور مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کو سنانے کے لئے گئے۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیئے۔ مولانا فضل امام بھی اسوقت وہاں موجود تھے وہ فرمانے لگے کہ بس حد ادب علامہ نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں۔ فن شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ برخوردار تم سچ کہتے ہو مجکو سہو ہوا۔ [4]

علامہ عربی کے سوا فارسی میں بھی فکر سخن کرتے تھے۔ فرقتی تخلص تھا۔ یہ شعر نقل ہے

فرقتی در کعبہ رفتی بارہا   نا مسلماں نا مسلمانی ہنوز [5]

---

[1] آب حیات صفحہ ۴۸۱ [2] انتخاب یادگار منشی امیر احمد امیر مینائی صفحہ ۲۹ [3] تذکرہ سیر العلما مرتبہ حکیم بہار الدین صدیقی گوپاموی [4] تذکرہ غوثیہ از مولانا گل حسن شاہ پانی پتی [5] گلزار بہار صفحہ ۱۱۲

[6] یادگار غالب صفحہ ۱

ظرافتِ طبع

مولانا با ایں علم و فضل خشک طبیعت نہ رکھتے تھے۔ زندہ دلی رفیقِ طبیعت تھی۔ سرکاری ملازم ہونے سے جب داڑھی سفید ہونے آئی تو خضاب لگانے لگے انکے ایک مولوی دوست کو اس پر سخت اعتراض تھا اور وہ ہمیشہ مولانا سے کہا کرتے کہ آپ خضاب کیوں لگاتے ہیں مولانا ہمیشہ اپنے مولوی دوست کا اعتراض سُن کر خاموش ہو جاتے۔ لیکن ایک دن ضبط نہ ہو سکا تو کہنے لگے کہ مولوی صاحب کوئی دنیا کمانے کے لئے مسجد میں مولوی بن کر بیٹھا ہے۔ کوئی پیری مریدی کرتا ہے۔ کوئی لوگوں کو تعویذ لکھکر دیتا ہے میں بھی آخر دنیا دار ہوں، دُنیا کمانے کے لئے مریدوں اور غرضوں کی جیب نہیں کاٹتا صرف اپنا منہ سیاہ کر لیتا ہوں۔ مولوی صاحب جو اتفاق سے پیر جی بھی تھے اور فال و تعویذ والے بھی۔ اس جواب سے بہت منفعل ہوئے[1]

مولانا پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری راقم السطور سے یہ واقعہ بیان فرماتے تھے کہ علامہ لکھنؤ میں صدر الصدور جس زمانہ میں تھے منشی نولکشور نے مولانا سے عرض کیا کہ فرصت کے اوقات میں عربی کتب کی کاپی کو ملاحظہ فرما لیا کریں تو عین بندہ نوازی ہو، مولانا نے ازراہِ اخلاق منظور کر لیا۔ اُس وقت مجتہد العصر کی ایک مناظرہ کی کتاب مطبع میں طبع ہونے آئی اسکی کاپیاں تصحیح کے لئے آپ کی خدمت میں آئیں۔ تصحیح بھی عبارت کی کرتے جاتے۔ حاشیہ پر اعتراضات کا جواب بھی لکھتے جاتے۔ جب کتاب چھپکر مجتہد العصر کے پاس گئی تو کتاب دیکھ کے سر پیٹ لیا کہ تمام عمر کی کمائی برباد گئی اور منشی نولکشور سے دریافت کیا تو اصل واقعہ انھوں نے کہدیا۔ آخرش کتابوں کے انبار میں آگ لگوا دی گئی[2]

بیعت

مولوی فیض الحسن کہتے تھے کہ میرے استاد مولوی فضل حق رام پوری کا بیان ہے کہ علامہ فرماتے رہتے تھے کہ میں حضرت مجدد صاحب کے سلسلہ کا زیادہ معتقد نہ تھا لیکن جب سے میں نے شاہ عبد القادر کو دیکھا اس سلسلہ کا بہت معتقد ہو گیا۔

کیونکہ اگر وہ سلسلہ فی الحقیقت ناقص ہوتا تو ایسے لوگ اس سلسلہ میں داخل نہ ہوتے۔ چنانچہ آپ حضرت شاہ دھومن دہلوی کے مرید ہو گئے[3]۔ اس کے بعد سے ہی ریاضت و مجاہدہ اختیار کیا۔

موجودہ انتخابِ دیوانِ غالب

مولانا جس زمانہ میں دلّی میں سررشتہ دار تھے اس وقت مرزا خانی کوتوال شہر تھے۔ یہ تھے مرزا قتیل کے شاگرد نثر و نظم میں کمال دستگاہ حاصل تھی اور مرزا کے ہم مذاق اور مرزا غالب سے دلی دوستی تھی۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ مولانا آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں۔

"انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا۔ کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئینگے مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے انھوں نے کہا خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کیا دونوں صاحبوں نے دیکھکر انتخاب کیا وہی دیوان ہے جسے آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں[5]"

مگر اس واقعہ کو مولانا حالی یادگار میں چبا گئے کہا ہے مگر ان الفاظ میں نہیں۔

سیاست

علامہ ایک حکیمانہ دماغ لے کے آئے تھے قوم میں اضمحلال آنکھوں دیکھتے آیا۔ اکبر شاہ ثانی کا عہد دیکھا۔ بہادر شاہ کا زمانہ پایا۔ انگریزی حکومت کے معزز عہدوں پر سرفراز رہے۔ شاہ امیر علی امیٹھوی ہنومان گڑھی کے ہنتوں کی سرکوبی کو آمادہ ہوتے اور انکے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ یہ لکھنؤ میں صدر الصدور تھے تو نواب اودھ کا ساتھ دیکر شاہ صاحب کو سمجھاتے بجھاتے رہے[6]۔ آخرش شاہ صاحب نے نواب اودھ کی فوج کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ تازیانۂ عبرت تھا۔ ادھر دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی آگرہ سے لکھنؤ آئے تو آپس میں ملے جلے۔ رنگ کچھ اور ہی ہو گیا۔ دلاور جنگ فیض آباد گئے۔ ایک سال بعد ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہوا یہ دلّی آئے فتویٰ لکھا، جنرل بخت خاں سے ملے مگر سب تدبیریں اُلٹی پڑیں وہاں سے وطن چلے آئے۔ بادشاہ دلّی رنگون روانہ کئے گئے۔ صہبائی گولی سے اُڑے۔ آزردہ شیفتہ قید کئے گئے جو بعد کو آزاد کر دیئے گئے۔

سیر العلماء میں ہے:-

"سنہ ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا مولانا موصوف کے فیصلہ کے لے جیوری بیٹھی ایک اسیسر نے واقعات سُن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کئے اور پھر خود ہی مثلِ تارِ عنکبوت عقلی و قانونی ادلّہ سے توڑ دیئے۔ جج یہ رنگ دیکھکر

---

[1] ریاست اخبار دہلی ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء [2] فضلائے ہند مرتبہ انتظام اللہ شہابی و داستان تاریخ اردو مرتبہ پروفیسر حامد حسن قادری [3] الطرز والدیا صفحہ ۳۸ [4] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۱۶۴

[5] آب حیات صفحہ ۵۲۱ [6] تاریخ اودھ از حکیم عبد الغنی رام پوری۔

پریشان تھا انہیں اُن سے ہمدردی بھی تھی۔ کرے تو کیا کرے، ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائینگے۔ سرکاری وکیل لاجواب تھے۔ چنانچہ پیروکار مقدمہ منشی کرم احمد خیرآبادی نے لکھنؤ سے سید اعظم علی خیرآبادی کے نام خیرآباد۔ یہ خط لکھا:۔

" مدتیکہ دو چند روز است کہ جناب مخدوم والا خوال عجیب تقدیر مبتلائے حبس شدہ از سیتاپور بہ لکھنؤ برائے روبکاری صفائی روانہ کردہ شدہ اند زبانی آنکہ ہرگاہی ہم از تحریرات انجا ہر روز منکشف میشود کہ امروز فردا بفضلہ تعالیٰ رہائی خواہد شد روز بنابر ادائے شہادت صفائی مولوی صاحب مکرم مولوی نبی بخش صاحب (خیرآبادی راقم سطور کے پھوپھا) مشفقی مولوی قادر بخش صاحب و برخوردار مولوی سید ضامن حسین بموجب [illegible] راست (شمس العلما) مولوی عبدالحق بمعیت ایشان روانہ لکھنؤ شدہ اند و ہمگیاں را امید از خدائے کریم است دیگر روز بلضرور مخلصی یافتہ وارد دولتخانہ خواہد شد و تعالیٰ ہم چنیں کند ہمہ ہا از خورد و کلاں ذکور و اناث چشم براہ انتظار کش رہ مباشند و رنج و قلق عظیم دارند ایزد جل و علی برجمیع کساں رحم خود فرمایند"۔

دوسرے دن آخری دن تھا۔ آپ نے اپنے او پر جتنے الزام سے لئے تھے ان کو ایک ایک کر کے رد کیا اور جس مخبر نے فتوے کی خبر کی اسکے بیان کی توثیق و تصدیق کی اور فرمایا پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی اب عدالت میں میری صورت دیکھ کے مرعوب سا ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے چنانچہ اس کے بعد بھی بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبسِ دوام کا حکم سنایا۔ آپ نے مسرت سے منظور کیا۔ یہ رنج آپ کو کام سیکھ چکا تھا۔ مذکورہ خط میں اسکا ذکر اس طرح سے ہے۔

" برادرمن مادہ عشرہ بسبب عدم بہرسی حال ایں لفافہ افتادہ ماند حالیہ آدمی خاص مقرر کردہ فرستادمی شد کہ جواب شافی یابد و حال پرملال جناب مولوی (فضل حق) صاحب از لکھنؤ دریں عرصہ نوشتہ آمد لاہوں گرسیتن بود او حالا کہ درن است یعنی حبس دوام از پیشگاہ حکم صدور یافت خواہد بود احتراماً تعالیٰ رحم فرمایند"[1]

محررہ بستم فروری مطابق ۱۷ رجب سنہ ۱۲۷۵ھ

انڈمان پہونچکے مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی ... اکبرآبادی اپنے استاد کی زبانی کہتے تھے کہ ٹونا

کو خدمت ذلیل درجہ کی دی گئی تھی۔

جیل سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا ماہر تھا اسکی پیشی میں ایک سزایافتہ مولوی بھی تھے۔ اپنی تصنیف کتاب ہیئت کی جو فارسی میں تھی وہ ان کو دی کہ عبارت صحیح و درست کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام چلا نہیں۔ علامہ کو گئے ہوئے ایک سال ہی گذرا تھا ان کو وہ کتاب دی اور کہا مولانا آپ اس کو درست کر دیں چنانچہ علامہ نے اسکی عبارت درست کی اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر دیا اور حاشیہ میں کثیر التعداد کتب کے حوالے لکھے جب یہ کتاب مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے وہ دیکھکر حیران و ششدر رہ گیا اور اس نے کہا مولوی صاحب تم بڑا لائق آدمی ہے۔ مگر جن کتابوں کے حوالے ہیں اور ان کی عبارتیں جو نقل ہیں یہاں کہاں ہیں۔ مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لیکے بارگ میں آیا۔ علامہ تھے نہیں کچھ انتظار کے بعد دیکھا ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ ہیئت دیکھ کے آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور معذرت کی اور کلرکی میں لے لیا اور گورنمنٹ میں اُن کی سفارش کی۔ ادہر علامہ کے صاحبزادہ مولوی شمس الحق دہلوی اور علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ گوپاموی کے داماد منشی خواجہ غلام غوث بیخبر خان بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹنٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے پروانۂ آزادی حاصل کیا اور مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہو گئے وہاں جہاز سے اُترے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا، انہوں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر المظفر سنہ ۱۲۷۸ھ کو علامہ کا انتقال ہو گیا اب سپردِ خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ہمراہ ہوگئے اور دفن و فاتحہ و دفن بعد حسرت و یاس لوٹے۔

چند عربی شعر قصیدۂ نعتیہ سے نقل ہیں ؎

هو اول الانبياء آخرهم به	ختم النبوة وابتداء الابداء
وہ پہلا نبی ہے اور آخر انبیا ہے	اوس پر تمام ہوئی نبوت اور اوس سے شروع ہوئی
قد خصه الباری باوصاف علی	لم يعطها الا حداث والقدما
خاص کیا اسکو اللہ تعالیٰ نے ساتھ بڑی صفتوں کے	کہ نہیں دی وہ اوصاف پچھلوں اور اگلوں کو

الجنس الغالی شرح جواہر العالی

تصانیف شرح تہذیب الکلام۔ تحقیق حقیقۃ الاجسام۔ حاشیہ قاضی مبارک حاشیہ افق المبین۔ حاشیہ تلخیص الشفا۔ ہدیہ سعیدیہ فی الحکمت الطبیعہ۔ روض المجود فی تحقیق الوجود۔ رسالہ مبحث قاطیغوریاس۔ رسالہ تحقیق علم و معلوم۔ تاریخ احوال۔ ایام غدر اور ان تصنیفات کے علاوہ خطبات قصائد عربی شعر میں سو سے زائد ہیں۔[2]

انتظام اللہ شہابی

[1] سیر العلما [2] تذکرۂ مصنفین از مولوی اکرام اللہ شہابی گوپاموی

ادبی لطائف

جس طرح ہم کوئی اچھا شعر سُنتے ہیں تو ہمارا دماغ اُس کی لذت سے براہِ راست متاثر ہو کر ہمارے دوسرے قوائے شعوریہ کو لذت گیر کر دیتا ہے بالکل اسی طرح جب کسی بذلہ سنج و لطیفہ گو کی زبان سے کوئی چست جملہ یا پُر لطف فقرہ ادا ہوتا ہے تو ہمارا دل باوجود ہمہ پژمردگی و افسردگی ایک عجیب قسم کے کیف میں ڈوب جاتا ہے، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک پُر لطف بات مختلف طبائع پر مختلف اثرات مترتب کرتی ہے یعنی جس بات سے ایک شخص خندۂ دنداں نما پر مجبور ہو جاتا ہے تو دوسرا اُسی بات کی سماعت پر معمولی مسکراہٹ سے بھی متکلم کی پذیرائی نہیں کر سکتا۔

ہمارا اُردو ادب ہر قسم کے لطائف و ظرائف سے ملوث۔ لطائفِ بیربل اور ظرائفِ مُلّا اپنی قدامت کے باوجود بعض صحبتوں میں گرما گرمی کا باعث ہیں لیکن ان کا وجود کسی حد تک سنجیدگی پر بار ہے اور اُن کی جگہ ایک نوع کی دوسری سنجیدہ اور بامعنی ظرافت لے چکی ہے چنانچہ اس دور میں ظرافت آمیز تحریروں کی بہا۔ اُردو ادب میں کمی نہیں بلکہ طنزیات اردو ادب کا دل پسند موضوع ہو چکا ہے اور بعض صاحبانِ قلم اپنی ظرافت متعالی و طنز نگاری کو شہرت و قبولیت کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ رسالۂ شاعر کی بعض سابقہ اشاعتوں میں "ادبی لطائف" کے زیرِ عنوان کچھ اقساط میں ایک مضمون منشی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی کا شائع ہو چکا ہے۔ جس میں خوش نصیب بعض شعرا کے چند غیر موضوع لطائف ادبی پیش کئے گئے تھے اور اس طرح شاعر کے خالص فنی و ادبی اوراق میں سنجیدہ مذاق کا نیا باب کھولا گیا تھا، یہ باب اگر ادبی حدود کے اندر ہی رہے تو یقیناً بصیرت افروز ہے۔ عام لوگوں سے قطع نظر اگر ادبی مذاق رکھنے والے افراد کی پُر تکلف صحبتوں کا تجزیہ کیا جائے تو بہت سی معمولی معمولی باتیں جو وہ روزمرہ آپس کے ہنسی مذاق میں کیا کرتے ہیں۔ مفید و پُر لطف ثابت ہو سکتی ہیں۔ ایک ادیب یا شاعر جو عام صحبتوں میں محض ایک شاعر یا ادیب کی حیثیت رکھتا ہے جب اپنے احباب و ہم مذاق اعزا کی صحبتوں میں شریک ہوتا ہے تو اُس کا وہی دل و دماغ جو عام صحبتوں میں متانت و سنجیدگی سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے اس بے تکلف صحبت میں شوخی و زندہ دلی سے ہم کنار ہو جاتا ہے اور ایسے مواقع کی لطیفہ گوئیاں اور حاضر جوابیاں اپنی گیرائیِ مفہوم و وسعتِ خیال کے اعتبار سے اس قابل ہوا کرتی ہیں کہ ان کو سمجھا جائے اور ان سے پورا پورا لطف اُٹھایا جائے۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم کو دُنیا ایک شاعر و ادیب کی حیثیت سے زیادہ جانتی ہے لیکن اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ خوش مذاقی و شوخی بھی اُن کی فطرت میں بدرجۂ اتم موجود تھی، مولانا مرحوم شاعرانہ کمالات اور فنی اقتدارات کے دوش بدوش اپنی بذلہ سنجی اور مزاح کے بہت سے ایسے واقعات بھی ہمارے ذہن نشین فرما گئے ہیں جو اگرچہ ہمارے لئے معمولی اور روزمرہ باتوں سے آگے کچھ نہیں لیکن ان کے اُن مداحین، عقیدت مند اور احباب کے لئے جو ان کو محض ایک شاعر و نقادِ فن کی حیثیت سے جانتے ہیں یقیناً لطف و کیف کا باعث ہوں گے۔ کچھ لطیفے ناظرینِ شاعر بھی سنکر لطف اُٹھائیں:۔

———•(۱)•———

"ایک روز مولانا احسن مارہروی مرحوم اپنے ایک قریبی عزیز سے کسی خانگی مسئلہ پر گفتگو فرما رہے تھے بات اتنی بڑھی کہ جانبین میں برافروختگی و رنجش کے آثار پیدا ہو چلے جس کا احساس مرحوم کو ہوا، بات ہی بات میں رشتہ دارانہ تعلق و اخوت کو ختم کرنا گوارا نہ ہوا اور مولانا مرحوم کچھ نرم ہو گئے۔ مقابل عزیز برابر تیز گفتاری فرماتے رہے بالآخر دورانِ گفتگو میں مولانا نے فرمایا کہ "آپ کو نہیں معلوم میں جزوِ خاندان ہوں"۔ مقابل نے بگڑ کر کہا "اگر آپ جزوِ خاندان ہیں تو بندہ کل خاندان ہے"، اس جواب پر مولانا مرحوم کی طبع مزاح پر مجبور ہوئی اور جواباً نہایت سنجیدگی سے فرمایا کہ جناب اگر کُل خاندان ہیں تو ۔۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

اس برجستہ جواب کا نتیجہ یہ دیکھا گیا کہ جو آثارِ کدورت پیدا ہو چلے تھے وہ بیک وقت ختم ہو گئے۔ جانبین جو گرم و زرم گفتگو کر رہے تھے قہقہے لگانے لگے۔

———•(۲)•———

مولانا مرحوم ایک روز اپنے ایک بزرگ کے ہمراہ ایک عزیز کے یہاں تشریف لے گئے اور ایک ایسے مقام پر بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے جو زنانہ ڈیوڑھی سے متصل تھا، مولانا مرحوم کے ہمراہی مالکِ مکان سے ایک بہت راز دارانہ گفتگو فرما رہے تھے یکایک زنان خانہ سے ایک عورت برآمد ہوئی اور ملازم کو آواز دے کر کسی کام کو کہا مولانا کے ہمراہی نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے۔ والد مرحوم نے جواب دیا خادمہ لطفن ہے وہ عورت چلی گئی، تھوڑی دیر کے بعد پھر آئی اور نوکر سے بات کرنے لگی۔ بزرگ نے پھر پوچھا کون، جواب ملا لطفن، عورت چلی گئی اور پھر آکر ملازم سے باتیں کرنے لگی —— بزرگ سلے

پوزرا دہی طبیعت رکھتے تھے پھر بولے کون، جواب دیا گیا کہ ”لطفن“۔ الغرض یہ کہ اس طرح وہ خادمہ چار پانچ دفعہ دروازہ پر آکر مولانا کے ہمراہی کے مخلِ صحبت ہوئی اور ہر بار انھوں نے پوچھا کہ کون، ایک دفعہ جو خادمہ آئی اور مولانا کے ہمراہی نے حسبِ معمول دریافت کیا کہ کون تو مولانا اس ہر بار کے استفسار سے پریشان ہوگئے۔ جواباً بہ طرزِ مزاح بجائے خادمہ کا نام ”لطفن“ لینے کے بولے ”ایضاً“ اس سماعی قافیہ پیمائی سے وہ بزرگ ایسے خاموش ہوئے کہ پھر لطفن کئی بار آئی لیکن انھوں نے پھر نہ کہا کہ کون۔

(۳)

مارہرے میں ایک کہنہ مشق شاعر حضرت یوسف حسن صاحب طیش ہیں۔ نہایت پر مذاق اور لطیفہ گو واقع ہوئے ہیں، مولانا مرحوم سے ہمیشہ پر لطف باتیں رہا کرتی تھیں طیش صاحب کا رنگ مائل بہ سیاہی ہے۔ ایک دفعہ ہمارے یہاں معصومِ کربلا کی یاد میں مجلس تھی۔ حضرتِ طیش پڑھنے کے لئے منبر پر بیٹھے دو ایک بند ہی پڑھے تھے کہ گیس کی روشنی کم ہونا شروع ہوگئی۔ خادم اٹھا اور گیس کو درست کرنے لگا لیکن گیس کی روشنی کسی طرح درست نہ ہوئی بلکہ کم ہی ہوتی گئی۔ مجلس میں بے ربطی پیدا ہو چلی تھی کہ مولانا مرحوم جو ایک طرف کھڑے تھے فوراً بولے، اب کوششیں بیکار ہیں گیس کالے کے آگے چراغ جلتا ہے، اس جملہ پر تمام محفل پھڑک گئی۔

(۴)

مولانا مرحوم کے ایک عزیز کی کفایت شعاری بخالت تک پہونچ چکی تھی اور مولانا اُن کے بخل پر ہمیشہ طعنہ ریز رہا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک لڑکے کو بغرضِ تعلیم علی گڑھ مولانا مرحوم کی زیرِ نگرانی رکھا، ایک دفعہ وہ حضرت اپنے لڑکے کے لئے ایک شیروانی سلوا کر لے گئے اور مولانا مرحوم کے سامنے لڑکے کو پہنا کر دیکھا، شیروانی لڑکے کے ڈھیلی اور نیچی تھی، مولانا مرحوم یہ دیکھکر بولے کہ بیٹے کو اچکن بنوائی تو اس میں بھی بخل کو ہاتھ سے نہ دیا، ان حضرت نے حیرت سے پوچھا کہ یا حضرت اس میں کیا بخل، اچکن کا ڈھیلا اور نیچا ہونا تو سخاوت اور فضول خرچی پر دلیل ہے، مولانا ہنس کر بولے کہ یہ غلط ہے اچکن اس لئے ڈھیلی اور نیچی بنوائی گئی ہے کہ آئندہ سال دوسری اچکن کی ضرورت نہ ہو بلکہ لڑکا مدت تک اسی اچکن کو پہنتا رہے، اس حاضر جوابی اور نکتہ رسی پر سب ہنسنے لگے اور لڑکے کے باپ خاموش ہوگئے۔

(۵)

ایک دفعہ مولانا مرحوم کے ایک بدایونی عقیدت مند پر بدایوں ہی کے بعض لوگوں نے کسی معاملے پر مقدمہ دائر کر دیا وہ پریشان ہو کر مولانا کے پاس آئے اور کہا کہ میں مقدمہ کی وجہ سے بہت متردد ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ درمیان میں پڑکر تصفیہ کرا دیجئے یا میرا تبادلہ بدایوں سے کہیں دوسری جگہ کرا دیجئے اس معاملے میں بدایوں کے لوگوں کی افترا پردازی اور دوست نما دشمنی وغیرہ کا بہت کچھ دکھڑا رویا اور کہا کہ جس حاکم کے یہاں مقدمہ ہے اس کو سفارشی خط لکھ دیجئے اور مجھے ایک ایسا وظیفہ بتا دیجئے جو میں دورانِ مقدمہ میں پڑھتا رہوں اور بدایونی حضرات کی دشمنی سے نجات پاؤں۔ مولانا نے سفارشی خط اسی وقت لکھکر اُن کو دے دیا لیکن جب ان عقیدت مند نے پڑھنے کے لئے وظیفہ پوچھا تو خاموش ہوگئے اور ہر نماز کے بعد صدقِ دل سے دعا کرنے کے لئے کہہ دیا لیکن وہ عقیدت مند بدایونی حضرات کی مہربانیوں سے کچھ ایسے پریشان تھے کہ مولانا کے سر ہوگئے اور برابر اصرار کرتے رہے کہ مجھے کوئی خاندانی وظیفہ بھی پڑھنے کے لئے بتا دیا جائے۔ مولانا نے بہت ٹالا، جب وہ کسی صورت نہ مانے تو بولے اچھا جس روز مقدمہ کی پیشی ہو تو عدالت میں جاتے ہوئے ہر قدم پر یہ ورد کرتے جانا کہ:—

”میری قسمت میں بدایوں تھا“

مولانا کی اس حاضر جوابی سے وہ عقیدت مند جھینپ کر رہ گئے اور سب حاضرین ہنسنے لگے۔ ناظرینِ ”شاعر“ لفظِ قسمت اور بدایوں پر غور فرما کر لطف اٹھائیں۔

(۶)

مارہرے میں ایک خاندان ہے جس کے افراد کے نام لفظ الٰہی پر ختم ہوتے ہیں مثلاً داد الٰہی، نور الٰہی، رفعت الٰہی وغیرہ وغیرہ، اسی خاندان کے ایک شخص والد مرحوم سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور جب کبھی ان کے لڑکا ہوتا تھا تو مولانا مرحوم سے نام رکھوایا جاتا تھا، اس طرح سات آٹھ لڑکے ہوئے اور سب کے نام مولانا مرحوم ہی نے رکھے، اتفاق سے ایک دفعہ مولانا مرحوم کسی فکر میں بیٹھے تھے وہ حضرت آئے اور بولے کہ کل شب کو میرے یہاں لڑکا ہوا ہے اس کا نام رکھ دیجئے مولانا نے فرمایا کہ اس وقت میں دوسرے خیال میں ہوں۔ اطمینان سے سوچ کر نام رکھ دوں گا۔ وہ حضرت مولانا کے سر ہوگئے کہ نہیں اسی وقت نام رکھ دیجئے۔ بہت ٹالا جب وہ نہ ٹلے تو مولانا نے کہا کہ یار تمہارے روز بچے ہوتے ہیں۔ میں کہاں تک الٰہی کے قافیہ پر نام رکھوں اچھا جاؤ اس بچے کا نام رکھ لو ”بس الٰہی“۔

(۷)

مولانا مرحوم کے احباب میں چودھری فاروق حسن صاحب مارہروی کو اپنے علمی مذاق کی بنا پر خصوصیت حاصل تھی اور چودھری صاحب مذکور مولانا مرحوم کے خاص جلیس تھے۔ روزمرہ صبح و شام معمولاً تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، چودھری صاحب خلافِ معمول صبح کو تشریف لائے۔ آدمی بھیجا گیا،

جواب میں چودہری صاحب نے ثنات شعروں کا ایک قطعہ لکھکر بھیجا اور حاضری سے معذرت چاہی، قطعہ یہ تھا:-

فرصتے شایدم مرا امروز حاجتے خاص در روزِ حمام است
واقعہ این کہ راست می گویم نہ کہ تزویر و حیلہ و دام است
خاورے از افق کہ سرزدہ است دلِ پر آز طالبِ جام است
تاچساں روزو روزہ ام گزرد مبل دو فرنگہا کہ تا شام است
عرضِ حالم نہفتہ باید خواند کہ بگردت عدو و نمام است
لطف فرماؤ مہر و افسر کن کہ ترا طبع عفو و اکرام است

این نہ قطعہ است دلے غزل حضرت
عرضِ حالِ ادیب بدنام است

یہ منظوم رقعہ جب مولانا کو ملا تو اُسی وقت برجستہ ثنات شعر ارقام فرما کر یوں جواب دیا

قطعۂ یا لطیفہ برسید ار نجا لأ جوابش ارقام است
تو بہ حمام و من حمام تلاش ہر یکے از کارِ خویش در کام است
حاجتے مزبرات دامن گیر حاجتی بہرِ من بحمام است
طالبِ جامِ تست خواہشِ من بہ تلاشِ ستے بچہ و جام است
می رسد تا بہ شامِ افطاری کہ ہنوز آں طعام خویش خام است
چوں شود خفیہ صورتِ ظاہر کہ دلِ بندہ صیدِ بود دام است

عرضِ حالت نہفتہ کے ماند
کہ نگاہِ اسیر بربام است

——— (۸) ———

ایٹہ کے ایک وکیل صاحب سے مولانا کے خاص تعلقات تھے، اکثر مولانا کے مقدمات کی وکالت وہی فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ مارہرے تشریف لائے۔ مولانا نے اُن کی دعوت کر دی، دعوت کے دوران میں ہنسی مذاق شروع ہو گیا، کھانا کچھ اتنا لذیذ تھا کہ وکیل صاحب نے اُن کی تعریف ذومعنا یوں فرمائی "مولانا آپ کے یہاں کھانا اتنا لذیذ اور اچھا کھایا کہ ہم نے گویا اپنا بقایا محنتانہ بھر پایا" مولانا مرحوم نے جواباً یہ رباعی ارشاد کی:-

موکلوں میں وکیلوں پر بہت کھاتے مقدم ان میں زرِ نقد محنتانہ ہے
گر جو دعوتِ شیراز کا مرادف ہو وہ محنتانہ نہیں ہے مجبانہ ہے

سید رفیق خلفِ حضرت احسن مارہروی مرحوم

ذکرِ ماضی

ماضی کا ذکر چھیڑ نہ اے ہمنوا کہ میں بیٹھا ہوا ہوں حشر کا ساماں لئے ہوئے
وہ دن نشاط خیز، وہ راتیں سحر ریز درد اور اضطراب کا درماں لئے ہوئے
وہ حُسن اور عشق کا افسانۂ لطیف صہبا کا رنگ و کیف فراواں لئے ہوئے
وہ موسمِ بہار میں نظارۂ چمن ہر اک روش پہ سروِ خراماں لئے ہوئے
گردوں پہ ایک چاند زمیں پر بھی ایک چاند وہ سوزِ غم، یہ جلوۂ خنداں لئے ہوئے
پھیلا ہوا ہر ایک طرف نور اور سُرور پیغامِ انبساطِ دل و جاں لئے ہوئے

گونجی ہوئی فضاؤں میں نغمات کی صدا
مچلے ہوئے شباب کے ارماں لئے ہوئے

ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے

خوابِ حسیں

آج پھر روح میں اک آگ سی لہراتی ہے دل کی گہرائی میں آہوں کی صدا آتی ہے
یہ سکوتِ لبِ گلنار، یہ کھوئی ہوئی رُت یاد بیتے ہوئے لمحات کی تڑپاتی ہے
کتنی کاوش سے مجھے دیتے ہو تعلیمِ خرد مجھکو اربابِ خرد تم پہ ہنسی آتی ہے
ایک نکتے پہ ٹھہر جاتی ہے کونین کی نبض عشق میں ساعت اک ایسی بھی تو آجاتی ہے
پردۂ ابر میں جیسے کوئی محجوب کرن وہ نظر آج کچھ اس طرح سے شرماتی ہے
آہ! وہ میرے چھلکتے ہوئے ایامِ جمیل میری خلوت مری ہر خواب کو دہراتی ہے

آگیا ذہن میں نجمہ کسی کافر کا خیال
کائنات ایک حسیں خواب بنی جاتی ہے

نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

تردید

اک عمر سے جسکا دھڑکا تھا بالآخر وہ دن آ ہی گیا
معصوم تمنّاؤں کے محل بیدرد زمانہ ڈھا ہی گیا

کہتے ہیں تمہاری شادی ہے سنتا ہوں کہ کچھ مغموم سی ہو
چُپ چُپ سی ہمیشہ رہتی ہو بیزار سی ہو مظلوم سی ہو

عارض کے شگفتہ پھولوں کا وہ رنگ نہیں وہ روپ نہیں
جب بھی تمہیں دیکھا یوں دیکھا کھوئی ہوئی نظریں چیں بہ جبیں

اُڑتی سی خبر اک یہ بھی ہے ویسے تو بہت مسرور ہو تم
کچھ سوچ بڑا بھاری ہے مگر کچھ سوچنے پر مجبور ہو تم

گر بار نہ ہو تو یہ پوچھوں اے ماہِ لقا کس سوچ میں ہو؟
اے جانِ تمنّا روحِ وفا اے حور ادا کس سوچ میں ہو؟

خیر، آؤ بتا دوں میں ہی تمہیں یہ راز بھی میں ہی فاش کروں
وہ سوچ جو اتنا بھاری ہے اُس سوچ کا باعث میں ہی ہوں

یہ ڈر ہے تمہیں میں جوش میں آکر کیا جانے کیا کر بیٹھوں
اُف کتنا غلط سمجھی ہو تم، میں اور تمہیں رسوا کر دوں

ہاں تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں آج اسکی شکایت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں، میں تم سے محبت کرتا ہوں

ناکامِ محبت کی باتیں سمجھیں کہ ابھی میں سمجھاؤں؟
جو شعلے بھڑکتے ہیں دل میں ان شعلوں کو کیا بھڑکاؤں؟

جانے دو تمہارا نازک دل لائیگا نہ تابِ غم ہرگز
احساسِ مظالم کا اپنے تا زیست نہ ہوگا کم ہرگز

اے میرے خیالوں کی ملکہ اے میرے سپنوں کی رانی
اس سانحۂ جانکاہ کو بھی جھیلوں گا بخندہ پیشانی

دل خون کے آنسو روئیگا کھیلے گا تبسّم ہونٹوں پر
اک شخص کی دُنیا لُٹتی ہے ہوگی نہ کسی کو بھی یہ خبر

ہاں جان گنوانا آسان ہے اور زندہ رہنا مشکل ہے
تا عمر جلن انگاروں کی ہنس ہنس کر سہنا مشکل ہے

تم دیکھنا میری زندہ دلی جب "اُن" سے تعارف ہوگا مرا
ہے نور تو خوش اخلاق بہت، یہ تم سے کہیں گے "وہ" بخدا

گو خون رگوں میں کھولیگا اور جوش میں بازو پھڑکیں گے
کیا یہ ہے؟ یہی ہے میرا رقیب! الفاظ یہ دل میں دھڑکیں گے

پھر عہدِ تمنّا کی یادیں کچھ اور جگر برمائیں گی
"ہاں مار دے یا خود مرجا" کی پہلو سے صدائیں آئینگی

قربان گہہِ اُلفت کی قسم ہر جذبے کو بہلا لونگا
طوفانِ جنوں سے کھیلوں گا اور اس موقع کو ٹالونگا

ہے خالقِ اکبر سے یہ دُعا تم شاد رہو آباد رہو
راس آئیں یہ زرّیں زنجیریں بے فکر رہو آزاد رہو

نور بجنوری

اضطراب

آسماں آگ اگلتا ہے زمیں ہانپتی ہے
موت کی زیست کے چہرے پہ نظر کانپتی ہے
بھوک بیباک نگاہوں سے ہمیں بھانپتی ہے

تم مگر میرے لئے عشق و وفا لائی ہو
بن کے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو؟

بوتلیاں چاٹتی ہیں چوستے کھیتوں کا لہو
اشکِ خونیں سے ہیں لبریز خم و جام و سبو
عصمتیں پیٹ نے کر رکھی ہیں وقفِ من و تو

اور تم میرے خیالات پہ لہرائی ہو
بن کے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو؟

یہ سلگتے ہوئے آنسو یہ سسکتی آہیں
جھونپڑوں سے یہ محلات کو جاتی راہیں
حسن کی گردنِ نازک میں ہوس کی باہیں

اس لئے کیوں میرے جذبات پہ تم چھائی ہو
بن کے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو؟

زلفِ پیچاں ہے کہ زنجیر ہے زندانوں کی
حسن یا مستیِ بے کیف ہے میخانوں کی
اور ہنسی تو ہے ریا ساز صنم خانوں کی

کیا تم اس بھیس پہ اپنے کبھی شرمائی ہو
بن کے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو؟

ہوسِ جاہ جھکی پڑتی ہے بیماروں پر
کس قدر بوجھ ہے گرتی ہوئی دیواروں پر
زندگی لوٹتی ہے دہکتے انگاروں پر

تم مگر حسن کو پھولوں میں بسا لائی ہو
بن کے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو؟

کسمساتا ہوا جوبن کہ سمٹتا ہوا ناگ
جھلملاتا سا تبسم کہ پگھلتی ہوئی آگ
پُرہوس جسم کہ سپنوں میں الاپا ہوا راگ

مجھ کو جینے کی تمنا تھی کہ تم آئی ہو
بن کے کیوں میری خلوت میں چلی آئی ہو؟

آؤ تم آ ہی گئی ہو تو کوئی کام کریں
مردہ اجسام میں اب خون نہیں آگ بھریں
اپنے ناموس کو افلاک سے اونچا کر دیں

آج بیباک ہو، مدتوں شرمائی ہو
کتنا اچھا ہوا تم خود ہی چلی آئی ہو؟

الطاف مشہدی

عصرِ حاضر

اب نظر آتے نہیں شمس و قمر کے کارواں
اوڑھ کر کالی ردائیں سو گیا ہے آسماں

یک کشتی جا رہی ہے آفتوں کے درمیاں
زندگیِ جاوداں اسکی نہ مرگِ ناگہاں

یوں تو سب کہتے ہیں یہ ہے گلستاں یہ بوستاں
اُڑ رہی ہیں ہر طرف پھولوں کی سوکھی پتیاں

پائمال و بیکس و آفت زدہ وحشت بجاں
کیا اسی کا نام ہے ہندوستاں جنت نشاں

پہلے جس سے جوش میں آتی تھی روحِ کارواں
بھول بیٹھا وہ حدی خوانی بھی شاید ساربان

یوں شکارِ وہم کبتک اے مریضِ ناتواں
ہمنشیں ہونگی تری کبتک دوا کی شیشیاں

آ رہی ہے پھر سحر پیغام بیداری لئے
ہے اسیرِ بادۂ دوشیں مگر ہندوستاں

گھن گرج توپوں کی آتی ہیں صدائیں دمبدم
کوندتی ہے سر پہ رہ رہ کر کہیں برقِ تپاں

صور کی آواز ہے یا نغمۂ بانگِ درا
آج کس منزل پہ ہے انسانیت کا کارواں

رات دن ڈھلتے ہیں اب چیخوں میں عیاشی کے راگ
پُر فشاں ہیں آسماں پر ظلم کی چنگاریاں

ٹوٹتے جاتے ہیں ٹکرا کر سبو و ساتگیں
خاک و خوں میں مل رہی ہیں آج ساری مستیاں

پھینک کر ناہید نے بھی بربط و چنگ و رباب
ہاتھ میں اپنے سنبھالے تیر و شمشیر و سناں

بھیک ملتی ہے فقیروں کو وطن کے نام پر
چین سے محلوں میں اب سوتے نہیں کشورستاں

سامنے ہے اُن کسانوں کے بھی روٹی کا سوال
جنکے ٹکڑوں پر کبھی پلتا رہا سارا جہاں

خوف سے آندھی کے قبل از وقت تنکے اڑ گئے
ہو گئیں خالی وہ شاخیں جن پہ کل تھا آشیاں

اپنی منقاروں سے جو کارِ عمل لینے کو ہیں
توڑ ڈالیں گے کسی دن وہ قفس کی تیلیاں

بڑھ کہ ماہر پانوں سے لگ کر ظفر یابی چلے
اُٹھ کہ تیرے ہاتھ میں ہو فتح و نصرت کا نشاں

اقبال ماہر الہ آبادی

افسانہ:۔

دل کی آواز

(شہرۂ آفاق امریکن مصنف "ایڈگر ایلین پو" کا ایک شاہکار افسانہ)

صحیح، بالکل صحیح ——— میں گھبرا گیا تھا، بہت ہی خوفزدہ ہو گیا تھا ——— مجھ پر اب بھی خوف وہراس اور دہشت و سراسیمگی کی کیفیت طاری ہے ——— یہ درست ہے مگر تم لوگ یہ کیوں کہتے ہو کہ میں دیوانہ ہوں؟ ——— آخر کیوں؟! ——— کیوں اُس بیماری نے میرے احساسات میں ہیجان و تموّج پیدا کر دیا تھا۔ میری قوتِ حسّیہ کو غیر معمولی طور پر تیز تر کر دیا تھا ——— سب سے زیادہ میری قوتِ سامعہ فزوں سے فزوں تر ہو گئی تھی۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ میں بہشت کی بہت سی باتیں سُن رہا ہوں ——— میں جہنم کی بھی بہت سی باتیں سُننے لگا تھا ——— تم مجھے پاگل کیوں کہتے ہو ——— سُنو اور دیکھو کہ میں کس قدر اطمینان و سکون سے اپنی آپ بیتی سُناتا ہوں ——— مگر پھر مجھے پاگل نہ کہنا ———

میرے دل میں اُس تخیّل کے پیدا ہونے کی ابتدا کیا تھی؟ ——— یہ بتانا ناممکن ہے البتہ ایک مرتبہ دل میں پیدا ہو جانے کے بعد یہ مجھے شب و روز پریشان کرنے لگا ——— یہ نہ تو کوئی بغض تھا اور نہ عداوت و دشمنی یا طیش و غضب ——— مجھے اُس بڈھے سے اُنس تھا۔ اُس نے مجھے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، نہ میری کبھی توہین ہی کی تھی اُس کے سیم و زر کی بھی مجھے قطعاً خواہش نہیں تھی ——— شاید اُس کی آنکھ ——— ہاں ٹھیک یہی بات تھی ——— اُس کی ایک آنکھ گدھ کی آنکھ جیسی تھی ——— نیلی پیلی اور اُس پر دھندلا سا جالا ——— میری طرف وہ جب کبھی گھور کر دیکھتا تو مجھے رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگتا ——— اُس آنکھ سے پیچھا چھڑانے کے لئے اُس بڈھے کو مار ڈالنے کے سوا اَسے کوئی علاج میری سمجھ میں نہ آیا اور بالآخر میں نے اسکی جان لے لینے کا فیصلہ کر لیا۔

ذرا غور و فکر سے کام لو ——— تم لوگ مجھے دیوانہ سمجھ بیٹھے ہو ——— دیوانہ کچھ نہیں جانتا بوجھتا۔ لیکن تم دیکھو گے کہ میں نے کس قدر ہوشیاری و خبرداری کتنی چالاکی و عیاری اور کیسی صفائی و عمدگی سے اپنے کام کو منزلِ تکمیل تک پہنچایا۔ جس روز میں نے اُس بڈھے کا کام تمام کیا۔ اس سے ایک ہفتہ پیشتر میں اُسکا ایسا ہمدرد و خیر خواہ بن گیا تھا جیسا کہ قبل ازیں کبھی نہیں بنا تھا۔ روزانہ نصف شب کے قریب میں آہستہ سے اُس کے کمرہ کا دروازہ کھولتا ——— بہت ہی آہستہ ——— اور جب میں دروازہ اس قدر کھول لیتا کہ اپنا سر اندر کر سکوں، تب میں ایک چور لالٹین کو اندر لے جاتا جس کی روشنی اِدھر اُدھر بالکل نہیں پھیلتی تھی ——— پہلے میں اپنا سر اندر کرتا آہستہ، بہت آہستہ ——— کہ کہیں میری یہ حرکت بڈھے کی نیند میں خلل انداز نہ ہو ——— اتنی دور تک اپنا سر اندر کرنے میں کہ میں بستر پر سوتے ہوئے بڈھے کو دیکھ سکوں، مجھے ایک گھنٹہ سے کم نہیں لگتا تھا ——— یہ تمام کام میں اس قدر چالاکی اور ہوشیاری سے کرتا تھا کہ اگر تم دیکھتے تو ہنس پڑتے ——— اور پھر بھی تم مجھے دیوانہ کہتے ہو ——— پاگل سمجھتے ہو ——— اندر جانے کے بعد نہایت اطمینان اور صفائی سے اپنی لالٹین کا ڈھکن ایک طرف کو ذرا سا ——— بہت ہی ذرا سا کھولتا ——— اتنا ذرا سا کہ روشنی کی صرف ایک شعاع نکل کر اُس گدھ جیسی آنکھ پر پڑتی ——— ٹھیک آدھی رات کے وقت ——— سات راتوں تک مسلسل میں نے یہ کام کیا۔ مگر مجھے ہمیشہ اسکی وہ آنکھ بند ہی ملی ——— اسی لئے تو میں اپنا کام پورا نہ کر سکا ——— کیونکہ وہ بڈھا میرے لئے اذیت رساں تھوڑا ہی تھا میں تو اُس چشمِ وحشت خیز سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا ——— میں صبح کو روزانہ اُس کے پاس جاتا۔ اور اُس سے خوب گھل مل کر گفتگو کرتا ——— اُس سے یہ بھی دریافت کرتا کہ رات کیسی گذری؟ ——— اس کے باوجود بھی اگر اسے اس بات کا شک تھا کہ میں روزانہ نصف شب کے درمیان اس کے کمرہ میں جاتا ہوں تو اُس کے عمیق خیالات کا مالک ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا ———؟

آٹھویں شب کو دروازہ کھولتے وقت میں بہت زیادہ محتاط و مطمئن تھا۔ میرے ہاتھ گھڑی کی سوئیوں سے بھی زیادہ سست رفتاری مگر عمدگی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ اُس رات سے پیشتر مجھے کبھی بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ میں اس قدر محتاط اور اتنا باخبر و ہوشیار ہوں۔ میں اس بات پر فخر و انبساط محسوس کر رہا تھا کہ میں اتنی آہستگی اور صفائی سے دروازہ کھول رہا ہوں کہ اُس کے فرشتوں کو بھی میرے افکار و عزائم پلکہ دار و اعمال کا علم نہیں ہو سکتا ——— مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی ——— اور شاید اُس نے سُن لیا

کیونکہ وہ سوتے سوتے یکایک چونک سا گیا۔ تم خیال کرتے ہو گے کہ میں فوراً پیچھے لوٹ آیا ہوں گا ـــــ نہیں، اُس کا کمرہ بے انتہا تاریک تھا چوروں کے خوف سے وہ کھڑکیاں بھی بند کر کے سوتا تھا اور میں جانتا تھا کہ میرا دروازہ کھولنا اُسے نظر نہیں آ سکتا ـــــ میں آہستہ آہستہ دروازہ کھولتا رہا۔

میں نے اپنا سر اندر کیا۔ اور لالٹین کھولنے ہی کو تھا کہ بڈھا چونک کر اُٹھ بیٹھا اور چلایا:- "کون ہے؟"

میں مُہر بلب ساکت و صامت کھڑا رہا اور گھنٹہ بھر تک اپنی ایک اُنگلی کو بھی تو جنبش نہیں دی اور اس دوران میں بڈھا بھی نہیں لیٹا۔ بالکل اسی طرح بستر پر بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے ایک ہلکی سی کراہ سُنی اور میں سمجھ گیا کہ یہ موت کے خوف کو کراہنے کی آواز ہے۔ یہ کوئی غم آگیں یا درد بھری آہ نہیں ہے۔ وہ متوحش، آہستہ اور دبی ہوئی آواز تھی جو موت کے خوف سے بے دم مضطرب دل کے عمق ہی سے نکل سکتی ہے۔ میں اُس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا ـــــ آدھی رات کے وقت جبکہ سارا عالم، نیند کے آغوش میں ہوتا ہے، یہی آواز اکثر میرے بھی دل سے اُٹھتی تھی اور اس وحشت خیز اور بھیانک آواز سے میرا خوف و اضطراب دوگنا ہو جاتا تھا۔ میں اس آواز کو پہچانتا تھا اور جانتا تھا کہ بڈھے پر اس وقت کیا بیت رہی ہے۔ میں سر در تھا گر مجھے بڈھے پر رحم آ رہا تھا ـــــ پہلی ہی دھیمی سی آواز پر وہ بیدار ہو گیا تھا اور اس وقت سے اُس کا خوف و ہراس فزوں سے فزوں تر ہی ہو رہا تھا، وہ اپنے آپ کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے ـــــ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:- "کچھ نہیں صرف ہوا ہے یا شاید چوہے دوڑ رہے ہیں" ـــــ مگر خود کو اس طرح بہلانے کی سعی و کوشش، بیکار و رائیگاں ثابت ہوئی۔ کیونکہ موت نے اپنے عکسِ سیاہ سے بڈھے کو پہلے ہی ڈھانپ لیا تھا اور یہ اسی غیر معلوم اور یاس آفریں سائے کی کرشمہ سازی تھی کہ وہ بغیر دیکھے اور سُنے ہی محسوس کر رہا تھا کہ میں اُس کے کمرہ میں ہوں۔

بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب میں نے اُسے لیٹتے ہوئے نہیں دیکھا تو میں نے اپنی چور لالٹین کو تھوڑا اور بہت ہی تھوڑا سا کھولنے کی جرأت کی بڑے اطمینان و سکون سے میں نے لالٹین کھولی۔ اور اس میں سے صرف ایک پتلی اور دُھندلی سی شعاع نکل جو ٹھیک اُس گدھ جیسی آنکھ پر پڑی۔

وہ آنکھ کھلی ہوئی تھی ـــــ اور پوری کُھلی ہوئی تھی ـــــ بس پھر کیا تھا ـــــ اُس آنکھ کو دیکھتے ہی طیش و غضب سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی ـــــ میں اُس آنکھ کو صاف صاف دیکھ رہا تھا ـــــ دھندلی اور نیلگوں اور جس پر ایک نفرت خیز جالا سا تھا۔ خوف و دہشت سے میرا خون اور ہڈیوں کے اندر تک کا حصہ جمنے لگا۔ مگر مجھے بڈھے کا چہرہ یا جسم کا کوئی اور حصہ بالکل نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ کسی غیر معلوم قوت کے اثر و حکم سے وہ شعاع ٹھیک اُس وحشت خیز آنکھ پر ہی پڑ رہی تھی۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ تم جسے دیوانگی اور پاگل پن تصور کرتے ہو، وہ صرف میری عظیم الشان قوت حسیّہ کی افزونیت تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے ایک آہستہ مسلسل اور بھدی آواز سنائی دی۔ جیسے روئی کے انبار میں دبی ہوئی گھڑی میں سے نکلتی ہے۔ اس آواز کو میں بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ بڈھے کے دل کی دھڑکن تھی۔ اس سے میرا طیش و غضب اور بھی فزوں تر ہو گیا ـــــ بالکل اسی طرح جس طرح طبلِ جنگ سپاہیوں کے حوصلے بڑھا دیتا ہے۔

میں اُس وقت بھی ساکت و خاموش رہا۔ میں اپنی سانس تک روکے ہوئے تھا۔ میرے ہاتھ میں لالٹین کو ذرا بھی جنبش نہیں ہو رہی تھی۔ اُسکی شعاع برابر اُسی آنکھ پر پڑ رہی تھی مگر وہ خوف زدہ دھڑکن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ لحظہ بہ لحظہ اسکی تیزی و شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یقیناً بڈھے کا خوف اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اُس آواز میں ہر لحظہ افزونیت تھی ـــــ سُنتے ہو، ہر لحظہ ـــــ میں کہہ چکا ہوں کہ میں بہت جلد سراسیمہ ہو جاتا ہوں ـــــ رات کے اس سکوتِ مسلسل اور اس پُرانے مکان کی دہشت آگیں سنسناہٹ اور اس عجیب وحشت خیز آواز کے تسلسل نے مجھے خوف اور ڈر سے پاگل بنا ڈالا۔ پھر بھی میں کچھ دیر تک اور بغیر کسی نقل و حرکت کے خاموش کھڑا رہا، مگر وہ آواز اور بھی بڑھ گئی ـــــ بہت زیادہ ـــــ جیسے بڈھے کا دل پھٹنے ہی والا ہو ـــــ اور ساتھ ہی ساتھ مجھے ایک اور بات کا بھی خوف ہونے لگا کہ اگر کوئی پڑوسی بڈھے کی اس آواز کو سُن لے تو ـــــ

بڈھے کا وقت آ چکا تھا۔ میں نے ایک ہی جھٹکے میں لالٹین کھول ڈالی اور کود کر بڈھے کے پاس پہنچ گیا ـــــ وہ چلایا ـــــ بس پہلی اور آخری بار ـــــ لمحہ بھر میں میں نے اسے کھینچ کر فرش پر دے مارا اور بھاری بستر اُس کے اوپر ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہو جانے کے بعد میرے لبوں پر فاتحانہ تبسم رقص کرنے لگا۔ کئی منٹ تک گھٹی ہوئی سی آواز کے ساتھ اسکا دل دھڑکتا رہا۔ مگر اب مجھے کوئی خوف اور کھٹکا نہ تھا۔ یہ آواز اُس کے کمرہ کی دیواروں کی حدود سے متجاوز نہیں ہو سکتی تھی۔ بالآخر آواز رک گئی ـــــ بڈھا ختم ہو چکا تھا ـــــ میں نے بستر اُٹھا کر نعش کا معائنہ کیا۔ بڈھے کے مرنے میں اب کوئی شک و شبہ نہ تھا میں نے اُس کے دل پر اپنا ہاتھ رکھا اور بہت دیر تک رکھے رہا۔ اب دھڑکن کا پتہ

نہ تھا، وہ مر چکا تھا ــــــ اب اُس کی آنکھ مجھے کبھی پریشان کرے گی۔

اگر تم مجھے اب بھی دیوانہ سمجھتے ہو، تو میں نے نعش چھپانے میں جس ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیا، اُس کو سُننے کے بعد پھر نہیں سمجھو گے۔ رات گذری جا رہی تھی میں نے بڑی پھرتی اور خاموشی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ پہلے میں نے نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ سر، ہاتھ، پیر سب کاٹ کر جُدا جُدا کر دئیے۔

اس کے بعد میں نے فرش میں سے تین پتھر نکال کر کھودنا شروع کیا۔ کافی گہرا گڑھا ہو جانے پر نعش کے ٹکڑوں کو اس میں بھر دیا۔ پھر پتھروں کو انتہائی علٰحدگی اور صفائی سے اپنی جگہ ویسے ہی جما دیا ــــــ ایسی چالاکی سے کہ کسی آدمی کی آنکھ حتیٰ کہ اُس بڈھے کی بھی آنکھ معلوم نہیں کر سکتی تھی۔ فرش دھونے کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں خون کا ایک بھی دھبّہ نہ تھا۔ یہ سب کام میں نے ٹین کے ٹب میں کیا تھا ــــــ ہاہاہا ــــــ

جب میرا کام اختتام پذیر ہو چکا تو اُس وقت تاریکی کافی چھائی ہوئی تھی جیسے ہی چار کا گھنٹہ بجا کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اطمینان و سکون سے نیچے گیا ــــــ اب خوف کس کا تھا؟ ــــــ میں نے دروازہ کھول دیا ــــــ تین پولیس آفیسر اندر داخل ہوئے۔ رات کے وقت کسی پڑوسی نے چلانے کی آواز سنی اور پولیس آفس میں اطلاع کر دی۔

میں مسکرایا ــــــ اب مجھے کس بات کا خوف تھا ــــــ میں نے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ میں نے انھیں بتلایا کہ وہ چلانے کی آواز میری ہی تھی۔ میں اکثر رات کو سوتے سوتے چلّا اٹھتا ہوں

میں نے انھیں پورے مکان میں گھمایا اور اچھی طرح تلاشی لینے کے لئے کہا آخر میں انھیں بڈھے کے کمرہ میں بھی لے گیا۔ میں نے اُنھیں بڈھے کا تمام مال و متاع اور زیور وغیرہ سب کچھ دکھایا جو بالکل محفوظ تھا۔ خوشی و مسرت سے بیخود ہو کر میں اُسی کمرہ میں کرسیاں لے آیا اور انھیں وہیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ اپنی پوری کامیابی و کامرانی کے دیوانہ پن میں میں نے اپنی کرسی ٹھیک اسی جگہ پر رکھی، جہاں بڈھے کی نعش دفن تھی۔

وہ لوگ مطمئن ہو گئے ــــــ میرے طور و طریق سے اُن کو کسی طرح کا شک و شبہ نہ ہوا۔ میں بہت مطمئن و مسرور تھا۔ وہ اور میں بیٹھ کر گپیں ہانکنے لگے۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں خوف و دہشت سے زرد پڑتا جا رہا ہوں اور میری دلی خواہش ہونے لگی کہ وہ لوگ جلد اُٹھ کر چلے جائیں۔ میرے سر میں درد شروع ہو گیا اور کانوں میں جھنجھناہٹ سی ہونے لگی۔ لیکن میں بیٹھا ہوا گپ شپ کرتا ہی رہا۔ میرے کانوں میں جو آواز آ رہی تھی۔ وہ اور بھی صاف سُنائی دینے لگی۔ میں اُسے دبانے کے لئے زور زور سے باتیں کرنے لگا، لیکن وہ بڑھتی ہی گئی۔ یہانتک کہ مجھے معلوم ہوا کہ یہ آواز میرے کانوں کی تخلیق کردہ نہیں ہے۔

حقیقتاً میں اب بہت زرد پڑ گیا تھا۔ مگر میں اور زیادہ زور سے، پہلے سے بھی زیادہ جلدی جلدی گفتگو کرنے لگا۔ مگر آواز میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ ــــــ یہ ایک آہستہ، بھدّی اور مسلسل آواز تھی، جیسے روئی میں لپٹی ہوئی گھڑی میں سے نکلتی ہے ــــــ میرا دم گھٹنے لگا مگر وہ لوگ اُس آواز کو نہیں سن رہے تھے۔ میں اور زیادہ جلدی اور زور زور سے باتیں کرنے لگا ــــــ مگر آواز بڑھتی ہی گئی ــــــ آخر یہ لوگ کیوں نہیں ٹلتے؟ ــــــ میں کھڑا ہو کر فرش پر پیر مارتا ہوا جلدی جلدی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ گویا ان لوگوں پر میرا راز آشکار ہو جانے سے مجھے طیش آ رہا ہو ــــــ مگر آواز بڑھتی ہی گئی ــــــ یا خدا میں کیا کروں؟!

اور زیادہ طیش سے بے قابو ہو کر میں نے اپنی کرسی فرش پر گھسیٹنی شروع کر دی ــــــ مگر وہ آواز اس کے باوجود ترقی پذیر رہی۔

وہ لوگ اب بھی گپ شپ کر رہے اور ہنس رہے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اس آواز کو نہیں سُن رہے تھے؟ ــــــ نہیں نہیں، وہ سُن رہے تھے اور ضرور سُن رہے تھے، انھیں میرے اوپر شک ہو رہا تھا، وہ سب کچھ جان گئے تھے۔ وہ میرے خوف زدہ ہو جانے کا مضحکہ اُڑا رہے تھے ــــــ میں نے اس وقت یہی مناسب سمجھا اور اب بھی یہی سمجھتا ہوں ــــــ مگر اس اذیت و مصیبت سے سب ہی کچھ اچھا تھا۔ یہ گپ شپ یا مضحکہ یا اور کچھ بآسانی انگیز کیا جا سکتا تھا ــــــ مگر وہ بناوٹی اور مصنوعی ہنسی میری حدِ برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اگر میں چلّا نہ اٹھا تو ختم ہو جاؤنگا اور پھر ــــــ پھر کیا ہوا؟ ــــــ سنو ــــــ وہی آواز اور زیادہ تیز ــــــ اور زیادہ ــــــ اور زیادہ ــــــ

میں چلّا اُٹھا: "شیطانو! اب زیادہ دق نہ کرو۔ میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ ان پتھروں کو اکھاڑ ڈالو ــــــ یہاں ــــــ یہاں ــــــ یہ اس کے وحشت انگیز اور نفرت خیز دل کی دھڑکن ہے!"

(مصنف:- امریکن افسانہ نگار "ایڈ گر ایلین پو")

مترجم

امتیاز نسیمی

افسانہ :-

لاجونتی

میں دور سے دریائے ستلج کو دیکھ رہا تھا جو ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح مچلتی ہوئی پہاڑ سے پرے میدان میں بہہ رہی تھی۔ جب میری نگاہ یکایک بائیں جانب پھری تو ایک سفید اور عالیشان عمارت نظر آئی جو فاصلہ کی وجہ سے ایک سفید بنگلے کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔ میرے پہاڑی نوکر نے بتایا کہ یہ سینی ٹوریم ہے جہاں دق جیسے لاعلاج مرض کا علاج ہوتا ہے .... لاعلاج مرض، میں نے ایک بار آہستہ سے کہا، ہاں بابوجی یہ مرض ہی بہت موذی ہے لیکن میں نے ہر سال بیسیوں مریض اس سینی ٹوریم سے تندرست ہو کر جاتے دیکھے ہیں، بجز ان بدقسمت لوگوں کے جن کا خون تقریباً سب کا سب دق کے جراثیم کی نذر ہو چکا ہے اور جن کے پھیپھڑوں کو یہ آنکھوں سے نظر نہ آنے والے جراثیم اپنی خوراک بنا ڈالتے ہیں۔ وہ بیچارے اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں اور یہ جراثیم ان کا خون چوسا کرتے ہیں، اس نے ایک بار پھر یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

کیا نام ہے اس سینی ٹوریم کا؟ میں نے اس سے دریافت کیا۔

نام تو مجھے یاد نہیں پڑتا۔ کوئی بڑا سا نام ہے لیکن وہاں کے ڈاکٹر کا نام جانتا ہوں۔ بہت مشہور ڈاکٹر ہے۔ میرا ایک بھائی وہاں "وارڈ بوئے" ہے "ڈاکٹر جوزف" ہے نام۔ سنتا ہوں عیسائی ہیں اور ان کے ہاتھوں میں حضرت عیسٰیؑ جیسی شفا ہے۔

ڈاکٹر جوزف، ٹھیک یہی نام ہے۔ میرے دوست دیپک نے ایک بار اپنے خط میں یہ نام لکھا تھا۔ خدا معلوم اب وہ کیسا ہے۔ تین سال سے اسکا کوئی خط نہیں آیا میرا خیال ہے وہ خود اسی سینی ٹوریم میں ہے۔ میں آج ہی شام کو وہاں جاؤنگا۔

صرف کچھ میل کا فاصلہ ہے بابوجی ہم آسانی سے پہونچ سکتے ہیں۔

اسی شام کو میں اپنے پہاڑی نوکر "مست رام" کے ساتھ "سینی ٹوریم" پہونچا میرے دوست دیپک کا پتہ آسانی سے معلوم ہو گیا۔ مجھے یہ دیکھکر انتہائی مسرت ہوئی کہ وہ کافی تندرست تھا ـــــ اسکی زبانی معلوم ہوا کہ "یہ سینی ٹوریم" حال ہی میں قائم ہوا ہے اور اس سے قبل وہ بھوالی میں تھا لیکن ڈاکٹر جوزف کا نام سن کر یہاں آ گیا اور اب اسکی حالت بہت اچھی ہے ـــــ مجھے اندر کبھی بہت حالات معلوم ہوئے ـــــ میں خود بھی سینی ٹوریم سے قریب میں گرمیوں تک کے لئے ٹھہر گیا۔ اور شملہ میں ٹھہرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا

میرا دوست دیپک سیالکوٹ کا رہنے والا تھا۔ وہ یہاں گرمیوں میں آیا تھا اسکی حالت بہت خراب تھی اور مرض شدید تر۔

اُسے تمام کھیلوں سے نفرت تھی اور کتابوں کے علاوہ دنیا میں اُسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی اور پھر تنہائی میں جبکہ روح کی تمام کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ ایک سنجیدہ انسان کے لئے مطالعہ سے بڑھکر دوسری چیز ہو ہی کیا سکتی ہے۔ وہ تمام دن لیٹے لیٹے پڑھا کرتا تھا۔ خدا معلوم سینی ٹوریم کی فضا میں رہ کر اس نے کتنی کتابیں لیٹے لیٹے ہی ڈالیں۔ رات کو ۹ بجے پورے سینی ٹوریم کی بجلیاں گل کر دی جاتی تھیں لیکن وہ ۹ بجے تک بھی پڑھتا ہی رہتا تھا جبکہ دوسرے مریض گپیں لگانے میں محو رہتے۔ اکثر کتابوں کی ورق گردانی میں وہ ایسا مصروف رہتا جیسے کوئی سائنسداں جس نے اپنی تمام زندگی ایک ایسی دوا کی تلاش کے لئے وقف کر دی ہو جو کسی لاعلاج مرض کا علاج بن سکے۔

آخر کار اسکا انجام وہی ہوا جو ہو سکتا تھا۔ وہ روز بروز زرد رہنے لگا اسکی آنکھیں ہر وقت خواب آلود رہنے لگیں، ہر وقت اسکے اعصاب پر ایک پژمردگی سی چھائی رہتی اور پھر۔ پھر وہ اسقدر کمزور ہو گیا کہ جوانی کے تمام آثار اس کے چہرے سے مفقود ہو گئے۔ یہاں تک کہ بھوالی سینی ٹوریم چھوڑ کر اپنے آخری علاج اپریشن کے لئے یہاں آنا پڑا۔

اس کے آنے کے کچھ عرصہ بعد ایک اور مریضہ دہلی سے یہاں آئی۔

لاجونتی ایک پنجابی کھتری کی لڑکی تھی۔ بیچاری کو مرض گویا ورثہ ہی میں ملا تھا۔ اسکی ماں جوانی ہی میں اس جانکاہ مرض میں مر چکی تھی۔ لیکن لاجونتی نے مرض کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ اسکی طبیعت پہلے سے کافی بہتر ہو گئی۔

اس سینی ٹوریم میں داخل ہونے سے قبل وہ ایک حد درجہ خوش مزاج لڑکی تھی۔ اُسے پہاڑی مناظر سے انتہائی دلچسپی تھی اور وہ ہمیشہ خوش رہا کرتی تھی لیکن دق کے جراثیم نے اس پر قبضہ کر کے اسکے مسرور ماحول کو مکدر کر دیا، وہ ہر وقت سست رہنے لگی۔ یہاں تک کہ اُسے خون آنے لگا لیکن جب سے وہ اس سینی ٹوریم میں داخل ہوئی تھی اسکی حالت روز بروز بہتر ہوتی جا رہی تھی اور ڈاکٹر اسکی تدریجی اصلاح پر جو حرارت کی کمی۔ بھوک کی

زیادتی۔ ذہن کی بہتری اور اسکے چہرہ کی سُرخی سے عیاں ہو رہی تھی۔ بہت ہی خوش تھے
اُسے آئے ہوئے ابھی کچھ ہی روز ہوئے تھے کہ اسکی ملاقات دیپک سے ہوئی جبکہ ہم ایک روز
شام کے وقت (RECREATION HALL) کی طرف بیٹھے ہوئے ان
کوہسانی مناظر کا لطف اٹھا رہے تھے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک خواب کی
مانند لہرائے ہوئے تھے۔

چند دن گذرنے کے بعد ہی شناسائی کی دوسری منزل آن پہونچی ——
اب دونوں گہرے دوست ہوگئے تھے۔

لاجونتی کی مسرتوں کی کوئی انتہا نہ تھی کہ اُس نے اپنے گھر سے اسقدر دور۔
ایسے مکدر ماحول میں ایک دوست حاصل کیا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ خیال انتہائی مسرت انگیز
بھی تھا کہ انکے اچھے ہو جانے کے بعد انکی یہ دوستی اور محبت انھیں اس ماحول کی یاد دلایا
کرے گی جس میں اُس کی تخلیق ہوئی تھی لیکن دیپک کا یہ خیال نہ تھا، حالانکہ وہ بہت
بڑی قوتِ ارادی کا مالک تھا اور وہ ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ کو مضمحل نہ ہونے دیتا لیکن
پھر بھی وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا۔ اسکے مطالعہ اور مشاہدے نے اُسے یہی بتایا تھا
کہ دق کے مریض لاعلاج ہوتے ہیں اور اگر وقتی طور پر بچ بھی رہیں تو انکی زندگی دُنیا کے
رنگ و بُو کے عام زندہ لوگوں سے بالکل مختلف اور نازک ترین ہوتی ہے جیسے ایک
شیشہ کا گلاس جسکی ہر طرح حفاظت کی جاتی ہے لیکن گر کر کبھی بچ نہیں سکتا اور گرتا
ضرور ہے۔ اسکا خیال تھا کہ اسکے گھر والوں نے اسکو یہاں بھیج کر اسکا راستہ صاف
کر دیا ہے اور زندگی کے بقیہ لمحات وہ اپنی خواہشات کے مطابق چین سے بسر کر سکے گا
اور اسکے گھر والے بھی ایک حد تک اسکی ہر وقت کی تیمارداری سے محفوظ رہ سکیں گے۔

دیپک اُس زرد خوبصورت لڑکی کو ایک سرد جذبہ کے ماتحت دیکھا کرتا تھا اور
اس میں اس کو ایک خاص لطف محسوس ہوتا کہ وہ اسکی زندگی کا ایک جزو بن رہی تھی
لیکن کب؟ جبکہ اسکی زندگی کی بتی جھڑ قریب تھی اور ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی اُسے
منتشر کرنے کے لئے کافی تھا۔ بہرحال اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جہاں بھی جائیگا
لاجونتی کو اپنے ساتھ لے جائیگا اور اس طرح وہ ایک دوسرے سے کبھی جُدا
نہ ہونگے۔

ایک شام جبکہ بادل آسمان پر آوارہ اور پریشان تھے۔ دن کی روشنی
رات کی سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ تمام چیزوں پر ایک دھندلکا سا چھا رہا تھا
لاجونتی اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی چھت سے ٹکٹکی لگائے ہوئے تھی۔ دیپک
اسکے قریب ہی کرسی پر بیٹھا تھا وہ چپکے چپکے کہہ رہی تھی " جب تم یہاں نہ تھے میں کسقدر
اُداس اور تنہائی محسوس کرتی تھی۔ اکثر تو دن کاٹے نہیں کٹتے تھے اور میں سو جا کرتی تھی

اگر میں گرمیوں سے قبل اچھی نہ ہوئی تو شاید میں کبھی اچھی نہ ہو سکونگی۔ تم جانتے ہی ہو
گرمی ہم مریضوں کے لئے کتنی مضر ہوتی ہے —— مگر اب —— اب میں ان تمام
باتوں کا خیال کیوں کروں میں جلد ہی صحت یاب ہو کر خوش خوش اپنے گھر جاؤنگی
اور اپنے خاندان والوں سے جا ملونگی —— آہ مجھے انکی جُدائی کتنی شاق ہے
اُف میرے والدین —— تم خیال ہی نہیں کر سکتے وہ مجھے کسقدر چاہتے ہیں۔ اور
میرے تمام اعزا، چچا۔ چچی اور ماموں ممانی؟ ....
لاجونتی خاموش ہوگئی۔ دیپک جو اسکی باتوں کو بہت غور سے سُن رہا تھا، ایک خشک
اور پھیکے انداز سے بولا " ہاں کہتی جاؤ تمہاری باتیں کافی دلچسپ ہیں۔

میں سب کچھ کہہ چکی۔ سچ مانو میں اپنے احساسات کا اظہار کر ہی نہیں سکتی۔
میں بہت خوش ہوں۔ بہت .... " لیکن یہ خوشی کب تک لاجونتی"
دیپک نے پوچھا۔

لاجونتی اس سوال سے چونک سی پڑی۔ کب تک؟ یقیناً اسوقت تک جب تک
میں زندہ رہونگی۔

پھر اسکے بعد۔ دیپک نے پوچھا،

" اس کے بعد شاید میں مر جاؤنگی! لاجونتی نے کہا " اور میرا خیال ہے یہ
تمہارے لئے مسرت کا باعث ہوگا۔

دیپک کھڑا ہوگیا، اور اپنے سامنے شملہ کی سرسبز پہاڑیوں کو دیکھتے ہوئے
بولا " ہاں شاید دُنیا کو —— آئندہ صدیوں کو اور تاریخ کو تمہارے آج نہیں
بلکہ کچھ عرصہ بعد مرنے سے بہت بڑا فائدہ ہوگا!

اس سے تمہارا مطلب؟ میں سمجھتی ہوں تم چاہتے ہو کہ میں ابھی مر جاؤں۔
ہاں —— بالکل یہی .... دیپک نے لاجونتی کی طرف رُخ کرتے
ہوئے کہا ...... دیکھو لاجونتی حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تو یہ دُنیا رہنے کے لائق ہے
اور نہ ہماری زندگی جینے کے قابل ...... یہ زندگی کیا ہے؟ جانتی ہو......
یہاں ہم لوگ ہزارہا لاحاصل چیزوں کے لئے سراپا جد و جہد بنے رہتے ہیں لیکن
وہ صرف نہیں کیونکہ جلد ہی ہم کو، موت کا جام پینا پڑتا ہے۔ ہم خدا معلوم کتنی معمولی
معمولی چیزوں کے لئے اپنی زندگی تلخ کر لیتے ہیں گویا انھیں پا لینے اور نہ پا لینے ہی پر
ہماری زندگی کا انحصار ہے اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہم بہت مسرور
ہوتے ہیں اور اگر نہیں تو بہت مغموم ہو جاتے ہیں —— لیکن کل —— جب ہم
اس دُنیا میں نہ رہیں گے تب بھی یہاں کی تمام چیزیں اس طرح جاری رہیں گی اگویا
ہمارا ہونا نہ ہونا دونوں اس کے لئے یکساں ہیں، لہذا۔ کامیابی اور ناکامی۔ خوشی

اور رنج سب کا نتیجہ ایک ہی ثابت ہوا اور پھر کتنے عرصے تک تم مرنے کے بعد یاد کیجاؤگی
—— چندے .... اور وہ بھی اگر تم یاد کی گئیں اور پھر اس وقت تم
وہاں ہوگی جہاں لوگوں کے خیال کو بھی راہ نہیں اور تم لوگوں کی ہمدردی اور بیزاری
دونوں سے بے خبر رہوگی، لیکن لاجونتی کبھی تم نے اس وقت کا بھی خیال کیا ہے۔
جب تمہارے بال سفید ہو جائیں گے۔ کمر خم ہو جائے گی۔ تمہیں خدا معلوم کتنے بچوں
اور متعلقین کی دائمی مفارقت برداشت کرنی پڑے گی۔ ممکن ہے آج تم شمعِ انجمن اور
روحِ محفل بن سکو لیکن اسوقت لوگ تمہاری صحبت سے گریز کرینگے۔ تمہیں اپنے آرام
کے لئے خدمتگار رکھنے پڑیں گے بشرطیکہ تم اس قابل ہوئیں ورنہ تمہاری بات تک
پوچھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہے گی اور کوئی زندگی کی راہ میں
راستہ بتانے والا تک نہ ہوگا۔ اس وقت تم اپنے بقیہ دن گنوگی اور دیپک ——
ایک غیر دلچسپ اور بیجان ان ہوگا جسکے تمام [illegible] مضمحل ہوچکے ہونگے ——
زندگی جس پر ایک بارِ گراں ہوگی اور [illegible] زندہ رہیگا صرف اس لئے کہ تمہیں مسرتِ
دید حاصل ہو........ سوچو لاجونتی کیا تم ان تکلیف دہ ایام کو برداشت
کرسکوگی؟ ابد کی ہیبت ناک خاموشی تمہارے ننھے سے دل میں حشر برپا کردیگی اور
تمہارا مذاق اُڑائیگی، لیکن ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے تم اب بھی اِس تکلیف دہ
اور ہیبت ناک مستقبل سے چھٹکارا حاصل کرسکتی ہو۔

کیا نزع کی تکلیفوں کا مزا جب موت نہ آئے جوانی میں
کیا لطف جنازہ اُٹھنے میں، ہر گام پہ جب ماتم نہ ہوا

(جوشؔ)

بس دیپک اب بند کردو اپنا فلسفۂ حیات۔ لاجونتی نے پریشان ہوکر کہا۔
میں نے تمہیں ایک اٹل حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔ اب تم خود اپنے لئے انتخاب
کرسکتی ہو۔

جوانی کی موت یا بڑھاپے کی طویل اور بے مقصد زندگی

اس کے بعد کمرے میں وحشت ناک خاموشی چھاگئی اور دھندلکے میں بیمار لاجونتی
کی بھاری سانس کی آواز سنائی دینے لگی دیپک کی اتنی سنگین گفتگو اس کے لئے بہت
قوت آزما ثابت ہوئی اور اُس کے ذہن میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔
دھیرے دھیرے یہ ہیجان ختم ہوا حتیٰ کہ اسکا دماغ اس پراگندگی سے
خالی ہوگیا اور وہ حسبِ معمول سوگئی۔ اس وقت اسکی سانس ایک بچے کی سانس کی مانند
چل رہی تھی۔ دیپک چپ چاپ کرسی سے اُٹھا اور خوابیدہ لاجونتی کی پیشانی کو
آہستہ سے چوم کر خاموشی سے باہر چلا گیا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک شام کو جبکہ بہت بارش ہوچکی تھی اور تمام کائنات بجز ان
چیزوں کے جنکو انسانی ہاتھوں نے ڈھانک رکھا تھا۔ دھل کر نکھر گئی تھی۔ چیڑ کے سبز
درخت سبز تر معلوم ہو رہے تھے۔ "بینی ٹریم" کا چھوٹا سا باغیچہ نہا کر نکھر چکا تھا۔
حتیٰ کہ گیندوں کی پتیوں تک پر ایک دھبہ نہ تھا۔ مطلع بالکل صاف تھا اور حدِ نظر تک
چیزیں صاف نظر آرہی تھیں درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں شاداب نظر آرہی تھیں
سورج کی آخری جھلملاتی ہوئی شعاعیں پتیوں پر پڑے ہوئے قطروں کو منعکس کرکے
عجیب سماں پیدا کر رہی تھیں۔ پانی کے قطرے چپکے چپکے پتیوں پر سے گر رہے
تھے۔ مغرب کی جانب افق سنہرے رنگ میں رنگا ہوا تھا، لیکن دوسری سمت سیاہ
بادل گھرنا شروع ہوگئے تھے اور تاریکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔
دیپک اور لاجونتی حسبِ معمول یکجا تھے۔ لاجونتی کھڑکی کے پاس کھڑی
ہوئی ان مناظر کا لطف اُٹھا رہی تھی۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا چلا اور دیکھتے ہی
دیکھتے بارش شروع ہوگئی۔ دیپک نے اُٹھ کر کھڑکی بند کردی اور چند لمحوں بعد پانی
کی دھاریں شیشوں پر بھی نظر آنے لگیں۔
آخرکار لاجونتی نے خود ہی سے مخاطب ہوکر کہا —— "اور پچھلے دنوں میں
گایا بھی کرتی تھی" اور فوراً ہی مدھم سُروں میں ایک غزل گانا شروع کردی جو
اس وقت اُسکے حسبِ حال تھی...........
جیسے ہی اُس نے گانا ختم کیا اُس پر ایک رقت سی طاری ہوگئی۔ اُس نے افسوس
کرتے ہوئے اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھدیا۔ اسوقت اُس کی بیمار جوانی سسکیاں
بھر رہی تھی۔ دیپک نے سُنا اور اُس سے مخاطب ہوکر کہا۔
آؤ لاجونتی ہم ناامیدی کے اس ہجوم سے ایک اُمید بنائیں ——
زندگی کے اس مختصر خواب کے بعد ہم ایک ایسی دُنیا میں بیدار ہوکر آنکھیں کھولیںگے
جہاں حُسن ہی حُسن، محبت ہی محبت اور آزادی ہی آزادی ہوگی وہاں ہم
اور تم لامحدود مدت کے لئے ساتھ رہیں گے۔
جونہی اُس نے اپنا جملہ ختم کیا ایک غیر ارضی روشنی اسکی آنکھوں میں چمک گئی
وہ بیٹھ گیا لیکن لاجونتی دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے بدستور کھڑی رہی۔
یکایک دیپک پھر اُٹھا اور لاجونتی کے قریب آکر اُس نے پُر زور طریقہ
پر کہا، "لاجونتی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں کائنات کی ہر چیز سے زیادہ
عزیز سمجھتا ہوں لیکن مجھے تمہارے لب لعلیں۔ تمہاری جوانی اور تمہاری آغوش
کی ہوس نہیں۔ کیونکہ تمہارے ہونٹوں کی یہ سرخی، تمہاری جوانی کا یہ نور اور تمہارے
جسم کی یہ لطافت عرصہ تک قائم نہ رہے گی۔ میری صرف یہ خواہش ہے کہ تم مجھے

آئندہ زندگی میں تنہا نہ چھوڑو اور اُس دوسری دنیا کو جہاں ہمیں ہمیشہ رہنا ہے اپنی عدم موجودگی سے تیرہ و تار نہ بناؤ —— بولو. لاجونتی —— کہو کہ تم مجھے ان پھولوں کے پاس بے یار و غمگسار نہ چھوڑنے دو گی —— کہو کہ تم وہاں میرے ساتھ ساتھ چلو گی۔

"ہاں —— تم یہاں رہنا کبھی بھی پسند نہیں کرو گی"

لاجونتی نے خود سے مخاطب ہو کر کہا۔

بہادر لاجونتی کبھی نہیں —— ہرگز نہیں ——

اس کے بعد اسکی حالت روز بروز خراب ہونے لگی. حرارت تیز ہو گئی۔ بھوک ختم ہو گئی —— وزن روز بروز کم ہونے لگا —— ہر وقت ایک تکان ایک سستی سی اُس پر غالب رہنے لگی. گالوں کی سرخی غائب ہو کر پھر وہیں چلی گئی جہاں سے آئی تھی —— چہرے پر زردی آ چکی تھی —— ڈاکٹر اسکی اس حالت سے بہت پریشان تھے. ان کا خیال تھا لاجونتی ضرور بد پرہیزی کرتی ہے —— وہ حیران تھے کہ اسکی غیر معمولی تبدیلی کی کیا وجہ ہے. شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ جب کسی کو زندگی کی خواہش نہیں رہتی تو تیر بہدف دوائیں بھی بیکار ثابت ہوتی ہیں. گرمی شروع ہوئی. لاجونتی کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہونے لگی اور معلوم ہوتا تھا کہ اب اسکا وقت ختم ہونے کو ہے۔

ایک شام وہ اِس دنیائے رنگ و بو سے کوچ کر گئی. اتنی خاموشی سے جیسے وہ سو رہی ہے۔ آہ جوانی کا یہ خواب اس طرح اتنی مختصر سی مدت میں ختم ہو گیا۔

اسکے انتقال سے کچھ گھنٹے قبل دیپک اُس کے بستر کے پاس گیا اور بہت چپکے سے جس کو صرف لاجونتی ہی سُن سکتی تھی اُسکے کان میں کہا

"لاجونتی دیکھو تم مجھ سے پہلے جا رہی ہو۔ وہاں میرا انتظار کرنا. میں تم سے پہلی ہوئی چاندنی میں ہو میں مار کے کے دریا کے پاس ملونگا. اس موذی مرض میں گھل گھل کر مرنے سے آج تمھیں نجات مل رہی ہے. سچ جانو آج تمہاری زندگی کا پہلا دن شروع ہوگا.

اچھا خدا حافظ لاجونتی

میرا دوست دیپک ابھی زندہ ہے لیکن اسکو زندگی کی خواہش نہیں. وہ اپنے کو بالکل بھول چکا ہے. لاجونتی کی موت کو ابھی صرف چار ماہ کا عرصہ ہوا ہے. دیپک نے مجھ سے کہا کہ میں اُس کی موت کی سالگرہ کی طرح رکھونگا اور تم دیکھو گے کہ میں اپنی موت کیلئے بھی وہی دن منتخب کرونگا. جو میری ساتھی لاجونتی کا تھا۔

خدا معلوم فلسفی دیپک کہاں تک درست کہتا ہے. اسکو صرف مستقبل ہی بتا سکتا ہے۔

سید عزت علی فہمی الہ آبادی

تبرّکات

(ردیف بین القافیتین)

سمجھو مری ہستی کو اُجڑا ہوا میخانہ | پھوٹی ہوئی قسمت ہے ٹوٹا ہوا پیمانہ
وحشت جسے کہتے ہیں وہ بات کہاں صاحب | کیا کہتے ہو مجنوں ہے دیکھا ہوا دیوانہ
چل کو رُخ کا عالم ہو ساقی اک جام ملنے دے | رکھا ہی نہ رہ جائے رکھا ہوا پیمانہ
جب ذکر نکلتا ہے بیتابیٔ خاطر کا | تو طرح چلتا ہے چھیڑا ہوا افسانہ
روتی ہیں کہ اب ہم ہیں اور شمع شبستم ہے | بجھتا ہوا مشعلہ ہے، جلتا ہوا پروانہ
اک عالم مستی ہے. تئے ہے کہ برستی ہے | ہے بادِ بہاری کیا اُڑتا ہوا میخانہ

اس دَور میں بھی ناطق جو پائے محبت ہے
کس وہم میں پھرتا ہے کھویا ہوا دیوانہ

(مولانا) ناطق گلاؤٹھوی

افسانۂ دل

(بقید یک قافیہ)

تار ٹوٹے نہ بربطِ دل کا | بجھ نہ جائے چراغ محفل کا
جب ہوا ذکر انکی محفل کا | رنگ کچھ اور ہو گیا دل کا
ہائے کیا کیا فریب کھائے ہیں | بارہا مان کر کہا دل کا
کیا خبر جادۂ محبت میں | لُٹ گیا کارواں کہاں دل کا
اُسکو دیر و حرم سے کیا مطلب | جسکو عرفان ہو گیا دل کا
بیکسی میں بھی دیر رہا ہے ساتھ | درد غمخوار بن گیا دل کا
جسکو کہتے ہیں گلشنِ جنت | ایک گوشہ ہے دامن دل کا
ان کو اپنا سمجھ رہا ہوں میں | کتنا رنگیں فریب ہے دل کا
حاملِ انقلاب تھی وہ نظر | جسنے نقشہ بدل دیا دل کا
آپ کیا جانیں آپ کیا سمجھیں | ہے جو عالم دکھی ہوئے دل کا

آپ سب جانتے ہیں بندہ نواز
حال جو کچھ ہے قمر کے دل کا

ریڈیائی تمثیل :-

بیگناہ

افراد

(۱) پشپا :- نوجوان بیوہ
(۲) ارملا :- پشپا کی مغرور ساس
(۳) چکرورتی :- تعلیم یافتہ اور چالاک نوجوان پشپا کا دیور
(۴) شانتی :- شوخ ارملا کی لڑکی۔
(۵) کنتی :- قدامت پسند پڑوسن۔
(۶) سروپ :- پشپا کا چھوٹا بھائی۔

(گلاس گرنے کی آواز)

ارملا :- (اونچی آواز سے) یہ کلموئی دودھ کی مارکھ گئی ہے مگر گلاس پھر خالی پڑا ہے اچھا آج اسکی خوب مرمت کرتی ہوں۔ (پکارنے کی آواز) پشپا پشپا ارے کچھ سنتی بھی ہے۔

پشپا۔ (دور سے) آئی ماتاجی۔ (دوڑ کر آتی ہے)

ارملا۔ (ناراضگی کے ساتھ) تجھے آوازیں لگاتے لگاتے میرا گلا بھی درد کرنے لگا اور تو ہے کہ کچھ سنتی ہی نہیں، تو سمجھتی ہے کہ شاید کوئی کتیا بھونک رہی ہے۔

پشپا۔ میں نے ابھی ابھی آپ کی آواز سنی اور بھاگ کر چلی آئی۔ کہئے کچھ کام ہے۔

ارملا۔ (جل کر) کیا میرا دماغ خراب ہوگیا ہے جو بغیر کام کے بلا رہی ہوں۔ چل دوڑ کر پانی لا، جانتی بھی ہے کہ گرمی کا موسم ہے بغیر پانی کے روٹی گلے سے نہیں اترتی۔ پھر بھی تو نے کھانا بغیر پانی کے رکھا۔ تو مجھ سے شرارت کرتی ہے اگر سمجھاؤں تو کہتی ہے کہ دکھیا کو سبھی تنگ کرتے ہیں۔ جا دوڑ کر پانی لا، کیا دیکھ رہی ہے؟

پشپا :- لیکن میں سچ کہتی ہوں ماتاجی کہ میں نے تھالی کے پاس ہی گلاس رکھا تھا

ارملا۔ (بگڑ کر) اگر تو یہ کہہ دیتی کہ مجھ سے غلطی ہوئی آئندہ نہ ہوگی تو کوئی تجھے کھا جاتا تو تو سمجھتی ہے کہ میں بکواس کر رہی ہوں۔

(چکرورتی کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز)

پشپا۔ ماتاجی میں نے ہرگز ایسا خیال نہیں کیا، میں تو سمجھتی ہوں عورت کا فرض ساس اور سسر کی خدمت ہے لیکن ....

چکرورتی۔ (بات کاٹ کر) آپ اتنی سی بات کے لئے کیوں ناراض ہوتی ہیں ماتاجی؟ پانی تو میں نے اٹھا کر پی لیا تھا۔

ارملا :- اس سے صاف ظاہر ہے تو نے پانی مانگا، اس نے انکار کر دیا تو میرا پانی پی گیا (پشپا سے) تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے جو چکرورتی کو ذلیل کرتی ہے۔ یاد رکھ پھر کبھی ایسا ہوا تو کھال ادھیڑ دونگی۔

پشپا۔ (بھرائی ہوئی آواز) لیکن ماتاجی .... موہن نے مجھ سے پانی مانگا بھی تو نہیں

ارملا۔ اس بات کا تجھے خیال رکھنا چاہیے تھا کہ آدمی باہر سے آتا ہے اُسے سب سے پہلے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جا دور ہو میری آنکھوں کے سامنے سے (پشپا آہستہ آہستہ جاتی ہے) نخرے کئے بغیر تو چلا ہی نہیں جاتا (ڈانٹ کر) ادھر آ، دیکھ نیچے بیٹھی ہوئی عورتیں بچے کی عمر درازی کے لئے دعائیں کر رہی ہیں۔ اس لئے پانی لاتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ تیری صورت نہ دیکھیں۔ سمجھی۔ ایک مرتبہ پھر کان کھول کر سن لے۔ پانی غسل خانے والے نل سے لانا، بیٹھک کے پاس والے سے نہیں، اس بات کا بھی خیال رہے کہ منگا دکھلا پر نہ پڑنے پائے۔

(پشپا ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوئی جاتی ہے)

ارملا۔ (چکرورتی سے) بیٹا، تمہاری سسرال سے کیا کیا آیا ہے۔

چکرورتی۔ یہی کوئی دس تولے سونا —— چار ساڑھیاں اور ....

ارملا۔ (بات کاٹ کر) کُل دس تولے سونا، یہ تو ایک معمولی آدمی بھی دے سکتا ہے جب ہماری شانتی کی گود بھری گئی تھی تو اُسکی ساس کو پچاس تولے سونا دیا تھا۔ تب بھی اُس کے ماتھے کی شکن دور نہ ہوئی تھی۔ (نفرت سے) اُونہہ۔ اگر انھیں اپنے نام کو بٹا لگانا تھا تو کم از کم ہماری عزت کا تو خیال کرنے

چالیس تولے کی کوئی بات نہ تھی۔

(پشپا آتی ہے اور گلاس رکھ کر بیٹھ جاتی ہے)

ارملا۔ (پشپا سے) دوسری طرف منہ کرکے بیٹھو۔ بھوکوں کی طرح کیوں دیکھ رہی ہے۔ جب بھی کوئی کھانے بیٹھتا ہے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہے۔ اسی وجہ سے کسی کی صحت اچھی نہیں ہوتی، دن بدن سوکھتے جا رہے ہیں۔

چکرورتی (درمیان میں بولتا ہے) پیار سے سمجھائیے ماتا جی۔ بیچاری کو بھوک لگ رہی ہوگی۔

ارملا۔ پیار ——— کیا یہ پیار کے قابل ہے۔ دن رات دل ہی دل میں تمام گھر والوں کو کوسا کرتی ہے۔ ایسے رکھکر ہم نے کتنا نقصان اٹھایا ہے۔ روئی کے سٹے میں دو لاکھ کی کمی، دوکان میں بیس ہزار کی کمی اور دو بھینسوں کی چوری میں کہتی ہوں یہ عورت نہیں چڑیل ہے چڑیل، آج کے مبارک دن منہ نہ لگاؤ۔ معلوم نہیں چکرورتی آج میری دائیں آنکھ پھڑک کیوں رہی ہے؟

چکرورتی۔ چھوڑیئے چھوڑیئے ان وہموں کو۔ آپ پڑھ لکھکر بھی ایسی باتوں پر یقین کرتی ہیں۔

ارملا۔ دل کہتا ہے آج ضرور کچھ نہ کچھ ہوگا (پشپا سے) بیٹھی کیا کر رہی ہے چل برتن مانجھ، جب دیکھو بیٹھی ہے نہ کام سے مطلب نہ کاج سے۔

چکرورتی۔ ماتا جی . . . .

ارملا۔ آؤ بیٹا ہم نیچے چلیں جہاں ہمارا راستہ دیکھ رہے ہیں

چکرورتی۔ آپ چلیں میں ابھی کھانا کھاکر آتا ہوں

(ارملا سیڑھیوں سے نیچے اترتی ہے اور پشپا رونے لگتی ہے)

چکرورتی بھابی تم روتی کیوں ہو؟

پشپا۔ اگر قسمت رُلانے پر خوش ہو تو پھر کیوں نہ روؤں۔

چکرورتی۔ اگر تم چاہو تو تمہاری قسمت بدلی جا سکتی ہے تمہارے لئے پھر خوشی کے سامان پیدا ہو سکتے ہیں تاکہ تم چین سے زندگی گذار سکو

پشپا۔ اگر پرماتما کو یہ منظور ہوتا تو وہ پھر کیوں مرتے؟

چکرورتی کسی کے نہ ہونے سے دنیا میں کوئی کام نہیں رکتا تم میرے پاس آؤ میری محبت ان جھڑکیوں سے تمہیں نجات دلائے گی میرا ہاتھ تم پڑنے والی مصیبتوں میں ڈھال کا کام کریگا۔ تم ایک مرتبہ ——— صرف ایک مرتبہ کہہ دو کہ . . . . . .

پشپا۔ یہ کیا کہہ رہے ہو چکرورتی۔ میں تمہاری بھابی ہوں . . . .

تمہارے بڑے بھائی کی بیوی۔

چکرورتی۔ میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔ بھائی کے بعد اُسکی دولت و جائداد کا مالک اُسکا چھوٹا بھائی ہوتا ہے۔ مان بھی جاؤ ضد نہ کرو۔

(چکرورتی پشپا کو پکڑ لیتا ہے)

پشپا۔ چھوڑو۔ چھوڑو، میں بیوہ ہوں۔ ایک بیوہ کو چھونا گناہ ہے۔

چکرورتی۔ بیوہ (ہنستا ہے) ہاہاہا ——— بیوہ عورت ——— خوبصورت اور جوان عورتیں بیوہ نہیں ہوتیں۔

پشپا۔ (چھڑاتے ہوئے) چھوڑو۔ مجھے چھوڑ دو بدمعاش نہیں تو میں زور زور سے چلاؤنگی۔ (چیخنے کی آواز)

کیا ہوا کیا ہوا کہتی ہوئی نیچے والی عورتیں اوپر آتی ہیں۔

چکرورتی:۔ (چھوڑ کر) ماتا جی ——— آپ کے جانے کے بعد اس نے مجھے پکڑ لیا، جب میں نے اس سے پیچھا چھڑانا چاہا تو لگی چلانے ——— میں . . . . میں قسم کھاکر کہتا ہوں میں بالکل بے قصور ہوں۔

کُنتی۔ رام، رام کلجگ کا زمانہ ہے آجکل کی لڑکیوں کو نہ معلوم کیا ہوگیا؟ ہمارے زمانے میں کیا کسی کی مجال جو دوسرے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

شانتی۔ دیکھو تو سہی۔ چور اور پھر چالاک (پشپا سے) کیوں ری پاپن، تو میرے بھائی کو کلنک کا ٹیکا لگانا چاہتی ہے۔ سب مہمانوں کو دکھا کر اُسے بدنام کرنا چاہتی ہے کیا اسی لئے ہم تجھے اچھے سے اچھا کھانا اور عمدہ سے عمدہ کپڑے دیتے ہیں کہ سب کے سامنے تو ہماری ناک کاٹے۔

پشپا۔ (روتی ہے) ماتا جی . . بہن جی . . . .

شانتی (بات کاٹ کر) پچھلے زمانے میں عورتیں اپنے خاوند کی چتا کے ساتھ جل جاتی تھیں۔ اب تیری جیسی ذلیل عورتیں اسی لئے ستی ہونا پسند نہیں کرتیں کہ وہ سماج کو گندگیوں اور گناہوں سے بھرنا چاہتی ہیں (زور سے) جا۔ اگر تجھے عشق و محبت کی آگ ستاتی ہے تو بازار میں جاکر بیٹھ ——— کسبی نہیں تو۔

کُنتی۔ (کھانس کر) چھوڑو شانتی۔ آج کے مبارک دن اور کچھ نہ کہو۔

ارملا۔ (آہیں بھر کے) میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ لڑکا جوان ہوا تو وہ نہ رہا، بہو آئی تو گھر کی عزت و آبرو پر پانی پھرتی ہوئی۔ ہائے بھگوان

شانتی۔ ماتا جی — میں اُس دن نہ کہتی تھی کہ پرائی آگ کو اپنے آنچل میں نہ باندھئے۔ مل گیا آج آپ کو اپنی مہربانیوں کا پھل۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس چڑیل کو مائکے بھیج دیجئے وہاں جاکر یہ اپنے بھائی بہنوں کو نہال کرے

(اُرملا روتی ہے)

کُنتی۔ صبر کرو بہن۔ اس طرح رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔

ارملا۔ صبر کا گھونٹ تو میں نے اُسی دن پی لیا تھا جب اس ڈائن نے میرا جوان بچہ کھایا تھا، اچھا چلو

(لِشپا کے علاوہ سب نیچے جاتے ہیں)

{ شیلا ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے اور روتی ہے کہ اُس کا بھائی آجاتا ہے }

سروپ۔ بہن جی۔ آپ آج اتنی غمگیں کیوں ہیں — رو کیوں رہی ہیں؟

کچھ نہیں، یوں ہی رو رہی ہوں۔

نہیں آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔ بتایئے کیا دکھ ہے آپ کو۔ کوئی خاص بات آج معلوم پڑتی ہے بتایئے۔

لِشپا۔ اگر تم اصرار کرتے ہو تو سُنو (ٹھنڈی سانس لیکر) ایک بیوہ کی زندگی کتنی دُکھی ہوتی ہے اور پھر اسکی جس نے اپنی تمناؤں، خواہشوں اور آرزوؤں کو بھی پورا نہ کیا ہو، جوانی میں بیوہ ہو جانا سب سے بڑا گناہ ہے۔ ایک ایسا دور کشمکش شروع ہوتا ہے۔ جس میں ثابت قدم رہنے کے لئے دکھوں اور تکلیفوں سے دو دو ہاتھ ہونا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر بد نامی موجود ہے اس سے بچنا مشکل ہے تاہم عصمت و عفت کی دیویاں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہیں، اپنی بے گناہی پر گناہوں کا بوجھ مجبوراً اُٹھاتی ہیں اور آنسوؤں کی مالا پر پرماتما کا نام جپتی ہیں۔ یہاں گناہ کرنے والے بیگناہ ہوتے ہیں۔ اور بے قصور ٹھہرائے جاتے ہیں قصور کرنے والے — کاش سماج کی اِن بیجا تکمّہ تاریکیوں کے پردے کو کوئی چاک کر سکے اور دیس کی نوجوان بیوہ لڑکیاں سسک سسک کر جان نہ دیں۔

{ آواز آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ڈوب جاتی ہے۔ }

پرشوتم سنگھ سیٹھی

میرا لال

آنکھ کا تارہ مرا نورِ نظر لختِ جگر
ہیں منوّر جس سے یہ راتیں مری مثلِ سحر

یہ مری حسرت، مری امید و ارمان ہے
گو یہ کہنے کو ابھی معصوم سی اک جان ہے

زندگی کے ساز کا سب سے سُریلا ایک تار
گلشنِ امید کی رنگین و تازہ تر بہار

ایک تحفہ، ایک عطیہ نعمتِ عظمیٰ بھی ہے
مختصر سی جان بھی چھوٹی سی اک دنیا بھی ہے

زندگی کے دور میں گویا پیامِ انقلاب
ازدواجی زندگی کا اک ثواب لاجواب

ایک دُنیا ہے انوکھی اک جہاں سب سے الگ
ایک غنچہ، ایک گُل، اک گلستاں سب سے الگ

کھیلنے لگتا ہے تو لیتا نہیں تھکنے کا نام
کھیلئے اُس سے تو پھر کیوں یاد آئے کوئی کام

بات کرنے کا سلیقہ گو ابھی آیا نہیں
مکتبِ قدرت سے اُس نے درس ابھی پایا نہیں

کر ہی لیتا ہے کنایہ سے مگر باتیں ضرور
اُس کی ہوں ہوں سے بہت کچھ مل ہی جاتا ہے سرور

جب یہ ہنستا ہے تو منہ سے پھول برساتا ہوا
گود میں آتا ہے ڈالی سے لچکتا بل کھاتا ہوا

نیند سے اک دشمنی سی ہوتی جاتی ہے اسے
یہ نہیں معلوم کیوں کم نیند آتی ہے اسے

کیا گوارا ہو گیا نظارۂ دُنیا اسے
یا ہے اِس دنیا پہ اک دن تبصرہ کرنا اسے

یہ خدا کے لطف کی اک جاگتی تصویر ہے
ناز کے قابل ہو جو تقدیر وہ تقدیر ہے

شکر کے سجدے ہوں کیا گو لاکھ بار ہو جبیں
شکر باری میں زباں مجبور ہوتی ہے یہیں

پھر بھی دل سے شکر، تیری نعمتوں کا بادشاہ
اِس دُعا کے ساتھ "اس پر بھی رہے تیری نگاہ"

سراجِ سخن

گھبرا گئے ہیں کشمکشِ جسم و جاں سے ہم
آخر نکل کے جائیں کہاں آسماں سے ہم

مانا اُلٹ بھی دیں رخِ رنگیں سے وہ نقاب
لائیں گے تابِ دید کی لیکن کہاں سے ہم

اُن کی نگاہِ مست کی سرمستیاں نہ پوچھ
اب تک ہیں بے نیاز مئے ارغواں سے ہم

ناکام آرزو بھی رہیں گو تمام عمر
شکوہ مگر کریں گے نہ اپنی زباں سے ہم

ہاں پھر اُسی نگاہِ محبت سے دیکھئے
تنگ آ گئے ہیں شدتِ دردِ نہاں سے ہم

اُن کی نگاہِ ناز کے صدقے میں ہمنشیں
بیٹھے ہیں بے نیازِ غمِ دو جہاں سے ہم

سارا جہاں بتوں کی محبت میں غرق ہے
کیسے بچیں سراجؔ نگاہِ بتاں سے ہم

تقلید و تجدید

(رنگِ تغزل میں)

دنیائے ادب چونک پڑی خوابِ گراں سے
تھی صورِ سرافیل اذاں مرغِ سحر کی

سرمہ تھا بصیرت کا گلستاں کا نظارہ
آنکھیں کھلیں جب صنعتِ صانع پہ نظر کی

ہر برگ تھا اک قدرتِ باری کا مرقع
ہر شاخ پہ تھی عطر فشانی گلِ تر کی

ہر غنچہ تھا میرے دلِ خوں گشتہ کا خاکہ
ہر پھول تھا تصویر مرے داغِ جگر کی

ہر طائرِ خوش لحن کے منقار کا نغمہ
دل میں اتر آیا تھا چھری بنکے اثر کی

کہنے لگی سوسن کی زباں مجھ سے کہ "تو نے
مشہورِ زباندانوں میں اک عمر بسر کی

پھر کون سنے گا ترے دلدوز ترانے
تاثیر کہیں زمزمہ سنجی میں اگر کی

تقلید میں تجدید کے اصلاحی اشارے
لکھ ایسے، کہ سب کہدیں فہم دونوں کی سر کی

میں بول اٹھا، اہلِ زباں اگلے کہاں اب
مضموں مرے بس کا نہ زباں ہے مری گھر کی

تقلید ہوئی جاتی ہے خود مائلِ تجدید
جھک جائیگی ہر شاخ ہوا ہوگی جدھر کی

دلی ہو کہ ہو لکھنؤ، دونوں ہیں غنیمت
دیکھتا ہوں لگی لپٹی ادھر کی نہ ادھر کی

مغرب کے کسی گل میں بھی خوشبو نہیں ہوتی
مشرق کے تو ہر نخل کو حاجت ہے ثمر کی

میزانِ عروضی کے بہت پلے ہیں بھاری
نظموں کو ضرورت ہے اب اوزانِ دگر کی

کیوں پیچھے ردیفوں کے پڑیں قافیئے بیکار
شاعر ہے خبر پاؤں کی جسکو ہو نہ سر کی

پابند کسی قاعدے کے کیوں رہیں آزاد
کیوں شرط جزا کی ہے کیوں قیدِ خبر کی

ترکیبیں گڑھیں ایسی لغت سے نہوں پاویں
جدت تو ہے محتاج نہ فن کی نہ ہنر کی

صفحوں پہ برہنہ ہوں حسینوں کے مرقعے
عریاں رہیں سینے بنے تصویر کمر کی

ہر کاغذی پیراہنِ تصویر سے گویا
ہو پردہ دری حسنِ دلآویز بشر کی

ہندی ہے، بھاشا ہے۔ اردو کا مٹے نام
بے تال کا یہ میل ہے شے خوف و خطر کی

ہو قلعۂ اردوئے معلّٰی متزلزل
تخریب ہی تعمیر ہے اجڑی نگر کی

مغرب کی ہوا کھا کے تو مشرق سے بڑھی دور
گھر بیٹھے نہ منزل ہوئی طے ہم سے سفر کی

رنگ اپنا شفق کھل نہ سکا آپ ہی مجھ پر
حد ہو گئی، کوتاہیِ دامانِ نظر کی

(علامہ) شفق مینائی عمادپوری

فلسفۂ خیال

جلوہ نظر فریب ہے حسنِ شہود کا — کیا اعتبار کیجئے ذہنی وجود کا
یہ چرخ اور اسپہ ستاروں کا یہ جمال — موتی ٹکے ہوئے ہیں سرِ دامنِ خیال
جوشِ بہار جلوۂ نیرنگئ خزاں — ہیں خوابِ زندگی کی سحر آفرینیاں
دھوکا ہے ہر ادا سحرِ لالہ فام کی — ہیں اک فریبِ نرم ہیں گیسوئے شام کی
تخلیقِ واہمہ ہے سراپائے زندگی — گلشن کا شور ہو کہ بیاباں کی خامشی

ہے معترف وہ اسکا جو اہلِ کمال ہے
"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"

جب ہے خیال ہی پہ ہر اک شے کا انحصار — دیں پھر خیال ہی کو نہ کیوں رنگِ استوار
بخشیں ہر ایک درد کو آرامِ جاوداں — صبحِ وصال تا ہو شبِ ہجر سے عیاں
ہو گل فشاں بہار خزاں کے نکھار سے — لاکھوں چمن بنیں سرِ ہر نوکِ خار سے
جلتی ہے تا سحر یہ فنا سے ہے بے نیاز — ہر اشکِ شمعِ بزم ہے دنیائے سوز و ساز
دے تو بھی ہر خیال کو تقدیرِ انقلاب — ہر قطرہ تا ہو بحر ہر اک ذرہ آفتاب

ظلمت ہو کفر کی کہ ہو ایماں کی روشنی
ہے قوتِ خیال سے ہر نقش منجلی

الم مظفر نگری

حدیثِ درد

جاں کاہئ مذاقِ محبت نہ پوچھئے — کس درجہ ہو رہی ہے اذیت نہ پوچھئے
شرحِ حدیثِ درد کی دقت نہ پوچھئے — کیوں ہے مری زباں میں لکنت نہ پوچھئے
واماندگی کا ہشِ فرقت نہ پوچھئے — ہر ہر نفس ہے تازہ مصیبت نہ پوچھئے
افسوس راز دل کا میں "ان" سے نہ کہہ سکا — کیوں سِل گئے تھے لب؟ یہ حقیقت نہ پوچھئے
تعبیرِ خوابِ حسن و جوانی نہ ہو سکی — کیوں تھا خیالِ خوفِ شریعت نہ پوچھئے
دنیائے اختیار میں "مجبورِ زندگی" — کیوں کر رہا ہے تری عبادت نہ پوچھئے
گذری تھیں "ان" کے قرب میں جو چند ساعتیں — ہے انکی یاد حاصلِ جنت نہ پوچھئے
غمدیدہ ایک دل ہے اور اس دل میں "ان" کی یاد — وحدت پرست کیوں ہے طبیعت نہ پوچھئے

قلب و جگر میں مرکزِ برق و شرر اسد
یہ سوزِ غم ہے کس کی ودیعت نہ پوچھئے

علی اسد

آنسو

طفلکے پروردۂ آغوشِ موجِ رنج و غم — دُرِ پیدا کردہ قعرِ لجۂ بحرِ الم
پارۂ برق از سحابِ حزن و غم رنج و ملال — یا شہابِ ثاقبے از آسمانہائے ستم
قطرۂ از آتشِ سیالِ سوزِ اندروں — یک شرار از احتراقِ سینۂ پُر درد و غم
نکتۂ غم از حکایتہائے دردِ فتنہ زا — شرحِ افسانۂ فریادیِ بختِ دژم
جوہرے از معدنِ اندوہِ حسرت بیم و یاس — لختے از صد پارۂ دل گوہرے از چشمِ نم

گو کہ اک قطرہ ہے دریا پر مگر بھاری ہے تو!
ہے بظاہر آبِ خلقت میں مگر ناری ہے تو!

تیری ہی نم سے مجلّٰی قلب کا آئینہ ہے — موتیوں سی تیرے ہی معمور یہ گنجینہ ہے
قلزمِ عرفاں سے جاملتی ہے تیری جوئے سیل — تیری اک اک موج گویا معرفت کا زینہ ہے
جب ہو وادیٔ ندامت کی طرف سیلاں ترا — پھر درِ رحمت باری سے تو ہم سینہ ہے
ہے کسی بیوہ کی پرنم آنکھ کا دُرِّ یتیم — یا کسی بیکس کے سوزِ قلب کا آئینہ ہے
ہے ضعیفِ خستہ جاں کا آخری ہتھیار تو — بے بسی کے پاؤں رکھنے کے لئے اک زینہ ہے

صنفِ نازک کا ہے تو اک آلۂ زینہار
چشمِ فتنہ زا سے جب گرتے ہوں دُرِّ شاہوار

پرورشِ آغوشِ دل میں جب کہ پاتا ہے تو — غم کی گرمی سے پگھل کر باہر آجاتا ہے تو
جب ڈھلکتا ہو کسی بیوہ کی پرنم آنکھ سے — بنکے نالہ عرشِ اعظم تک پہنچ جاتا ہے تو

کانپ کر گرتا ہے جب چشمِ یتیمِ زار سے — آہ! پھر بابِ اجابت کو بھی تھراتا ہے تو
جب ٹپکتا ہے کسی چشمِ ندامت بار سے — کوثر و تسنیم کی موجوں میں مل جاتا ہے تو
دردِ قومی سے ہو تر جب دیدۂ خوں نابہ بار — اس گھڑی لعلِ بدخشانی کو شرماتا ہے تو
اہلِ دنیا گو کہ نظروں سے گراتے ہیں تجھے — بارگاہِ ربِّ عزت میں جگہ پاتا ہے تو
وقتِ پیدائش بھی تو موجود وقتِ نزع بھی — مہد سے لیکر لحد تک ہم کو پہنچاتا ہے تو
بادۂ بہجت کا اک سرجوش ہے تیرا وجود — جب ایاغِ شادمانی بھر کے چھلکاتا ہے تو
تجھ سے ہی آغاز اپنا تجھ پہ ہی انجام ہے — سرگزشتِ فطرتِ انساں کو دکھلاتا ہے تو

تیری ہستی پارۂ دل کی مرے تفسیر ہے
آہ! تو سوز و گدازِ قلب کی تصویر ہے

دل کی ساری کائنات اس تیری اک قطرہ میں ہے — چشم کا رازِ حیات اس تیری اک قطرہ میں ہے
جب گھٹا اندوہ کی محصور کرلے قلب کو — زندگیٔ بے ثبات اس تیری اک قطرہ میں ہے!
دل میں جب گھٹ گھٹ کے رہتی ہو محبت کی خلش — پھر مداوائے ممات اس تیری اک قطرہ میں ہے
چشمِ نادم جس گھڑی تائب کی ہو لبریزِ اشک — سب گناہوں کی زکوٰۃ اس تیری اک قطرہ میں ہے!
ضبطِ گریہ پر بھی آجائے جو چشمِ شوق تک — عشق کی کل واردات اس تیری اک قطرہ میں ہے!

قطرہ کہئے یا کہ بحرِ بیکراں کہئے تجھے؟
غم کی دنیا حسرتوں کا اک جہاں کہئے تجھے!

بصیر بدایونی

منقول :-

مکتوبات

برادرم اعجاز صاحب

سلام مسنون!

حادی صاحب کی معرفت سلام پہنچے ——— وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ——— کہیے مزاج تو اچھے ہیں ——— بڑی مدت کے بعد یاد فرمایا ہے ——— پھر بھی یاد فرمائی کا شکر گذار ہوں ——— آپ کو آنکھوں کی تکلیف تھی ——— اب بفضل تعالیٰ شفا ہو گی ——— کیوں؟ ایسا ہی ہے نہ! خدا کرے ایسا ہی ہو!

میں بہت پریشان رہا ہوں ——— میری پریشانی کی بہت سی وجوہ ہیں ——— اسی لئے کوئی عریضہ ارسال نہیں کر سکا ——— نہ قبلہ و کعبہ اور آپ کی خیر و عافیت معلوم کر سکا ——— امید کہ ناگوار خاطر نہ ہوا ہو گا۔ میں تو دل ہی دل میں شرمسار ہو رہا ہوں ———

کبھی کبھار کوئی غزل بھیجدیتا ہوں ——— اور اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ مگر طبیعت کو ابھی سکون نہیں ——— اس لئے کچھ کہا اور لکھ بھی نہیں سکتا۔ دعا کیجئے کہ خدا میری پریشانیاں دور کرے اور میری مشکلات کا بہترین حل تلاش کر دے ——— آپ بزرگ لوگ ہیں اور برگزیدہ۔

آپ کی نئی نئی نظمیں پڑھ اور سُن رہا ہوں ——— اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ——— آپ بہت اچھا کہہ رہے ہیں ——— یقین مانئے کہ آپ نے ادبی دُنیا میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے ——— اور آپ کا نام مٹنے کا نہیں ——— سبحان اللہ جیسا باپ ویسا بیٹا ——— سچ کہا کہنے والوں نے کہ بیٹا باپ کے قدم ہی لیتا ہے۔ "شخصیات" کے باب میں کبھی اپنے خاندان اور خاندان کے قابلِ قدر افراد کا نام بھی شامل کر لیا کیجئے ——— ہر چند ہم آپ سے قریب ہیں ——— مگر دور ——— اور اسکی وجہ آپ ہیں ——— ہم آپ سے کیا کیا پوچھیں ——— اور بغیر جانے رہا نہیں جاتا ———

خدا کرے قبلہ و کعبہ کا دوسرا دیوان چھپ جائے ——— مجھے تو دیکھنے کا بہت شوق ہے ——— ہاں! آپ بھی تو اپنا دیوان تیار کرنے کی کوشش کریں ——— آپ کے پاس کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہو گا ——— ایک عرض کرتا ہوں ——— کہ "نفسیاتی اشارات" کے عنوان سے جو قطعات قبلہ و کعبہ نے تیار فرمائے ہیں ——— انھیں اگر آپ ایک مختصر رسالے میں ایک مقدمے کے ساتھ شائع کر دیں تو کیا بہتر ہو گا ——— کیونکہ جب یہ چیزیں پرانی ہو جائیں گی ——— اور یہ اشارات دور دور ہو جائیں گے تو اُس وقت بے جان معلوم ہونگے ——— اب تو انھیں گھر گھر پہنچایا جا سکتا ہے۔

دُعا کیجئے کہ کبھی قسمت آگرہ لے آئے ——— اور آپ لوگوں کی زیارت کروں ؎

میرے نصیب میں ہو آپ کی قدمبوسی
مرا نصیب کبھی بہرہ یاب ہو جائے (شان)

آپ کی سرکوبی کی اجازت دی ہوتی ——— دل ہی دل میں جل بھُن کر رہ جاتا ہوں ——— کیا کروں ——— اُسکی تو وہ دُرگت بناتا کہ یاد کرتا ——— کیا کیا بکواس کرتا ہے ——— ہاں اتنا تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ اُس کا رویہ ادبی حلقوں میں بُرا سمجھا جا رہا ہے۔ اور وہ آسمان کا تھوکا منہ پر کی مثال خود ہی ذلیل و خوار ہو رہا ہے ——— آپ کا کچھ نہیں کر سکا اور نہ کر سکے گا ہر کوئی جانتا ہے ؏

"مہ نور مے فشاند و سگ بانگ مے زند"

اور آپ کی خاموشی بھی قابلِ تعریف ہوگئی ہے ——— کیونکہ کمینے سے چھیڑ کرنا اپنی ہتک ہوتی ہے۔ آپ اچھا کر رہے ہیں۔

دشنام دہد اگر خبیثے ——— چارہ نبود بجز شنیدن

قبلہ و کعبہ کی خدمت میں سلام اور نیاز۔

ہمیشہ کے لئے آپ کی توجہ اور نظرِ کرم کا طالب

محی الدین احمد شان اویسی احمد پور شرقیہ

مدیر محترم مولانا اعجاز صاحب اکبرآبادی۔ تسلیم و نیاز

میرا ارادہ اُن حضرات کے خلاف ادبی محاذ قائم کرنے کا ہے جو حضرت سیماب مدظلہٗ کی شان میں اخلاق سوز الفاظ استعمال کر کے ملک کے ادب و آرٹ کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں مجھے

آپ کی قلمی امداد پوری پوری طرح حاصل ہو نیز چونکہ میرا حلقۂ احباب محدود ہے اس لئے اگر مخالفانہ مضامین نویسی کا مواد بہم پہنچانا بھی آپ اپنے ذمے لیں تو کہیں زیادہ بہتر ہے۔

ناز اکبرآبادی حال مقیم جے پور۔ آحق پھپوندوی۔ بوم شوم۔ اور ابر احسنی گنوری حال مقیم بدایونی کو بھی آج مصالحانہ خطوط لکھ رہا ہوں۔

میں نے انھیں خطوط کے ذریعہ ان اصحاب سے درخواست کی ہے کہ بیجا اور فحش تنقیدات لکھ کر ملک کے ادب کو ٹوٹو نہ بنائیں۔ ورنہ ہندوستان کے خوددار اور ادب پرور ادبا اُن کے خلاف ایک زبردست ادبی محاذ قائم کرکے دنیا کو بتادینگے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر؟ دیکھئے کیا جواب آتا ہے۔

آج کل یہ لوگ حضرت سیماب صاحب مدظلہ کے خلاف بھاری پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ چنانچہ سید شوکت صاحب رضا رسولپوری ناز کے استاد اسی سلسلہ میں ابھی حال ہی میں لوہارو آئے تھے نیز انھوں نے مقامی متعدد اصحاب کے سامنے اپنی ایک سوسائٹی کے قواعد پیش کئے تھے، جس کا سب سے پہلا فرض حضرت سیماب کے خلاف ہندوستان میں زہر پھیلانا ہوگا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ جملہ اصحاب نے انکاری جواب دیدیئے۔

اس سوسائٹی کا نام "انجمن مربیانِ ادب" رکھا جا رہا ہے۔ اس کمیٹی کا ایک رسالہ بھی "مربیِ ادب" کے نام سے شائع ہوگا۔ جس کا مقام اشاعت بدایوں قرار پایا گیا ہے۔ واجباً عرض کر رہا ہوں

امید ہے جواب باصواب سے جلد تر مطلع فرمائیں گے

خاکسار: اجمل العارفی ریاست لوہارو

مکرمی زید الطافکم السلام علیکم

اُمید کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔ فی الحال باعث تصدیع یہ امر ہے کہ کمترین محررِ سطور ایک مضمون بعنوان "جانِ فصاحت" مع ایک غزل (قبلہ حضرت معجز) ارسالِ خدمت کر رہا ہے۔ امید کہ مؤقر "شاعر" کے قیمتی صفحات پر ان دونوں چیزوں کو کسی قریبی اشاعت میں جگہ ملیگی۔

مقالہ ہذا کی اشاعت شاعر میں بمقابلہ ملک کے دیگر رسائل کے میں اس وجہ سے مناسب سمجھتا ہوں کہ رسالہ "فصاحت" حیدرآباد (دکن) ادارۂ "شاعر" اور بالخصوص حضرت علامہ سیماب مدظلہ کے خلاف جس فتنہ انگیزی کا مظاہرہ کر رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مجھے آپ کے اس فیصلہ سے قطعی اتفاق ہے کہ ان تمام ہفوات کا جواب

خامشی ہے۔ انتخاب کے لئے بعض اشعار پر نشان لگا دیئے ہیں۔ اگر پسند ہوں تو انھیں کو انتخاب میں رکھئے۔ م م م

ادارۂ شاعر کی جانب سے بجز خموشی اور کچھ نہ ہوگا۔ بنابریں مضمون زیرِ نظر میں میں نے کہیں کنایۃً بھی اڈیٹر "فصاحت" کی اُن زہرافشانیوں کا تذکرہ نہیں کیا جو وہ قبلہ حضرت سیماب دام فیوضہٗ کے خلاف فرما رہے ہیں۔ طالب آملی پر جب اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی تو اُس نے کیا خوب کہا تھا ؎

دشنام خلق را ندہم جز دعا جواب ۔۔ ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

نامور اہل کمال ہستیوں کا پایہ بر خود غلط معترضین کی نکتہ چینیوں اور خردہ گیریوں سے کہیں بلند ہے۔ اڈیٹر صاحب "فصاحت" خواہ قبلہ حضرت سیماب کے خلاف مضامین کو اپنے رسالہ میں جگہ دیں یا مسدس حالی پر اعتراضات فرما کر اپنے کو نمایاں کرنے کی سعی فرمائیں۔ اُن کی اس قبیل کی تمام مساعی اہل علم کے نزدیک در خورِ اعتنا نہیں ——— بہر حال طبیعت چاہتی ہے کہ اڈیٹر "فصاحت" کی لیاقت علمی اور اہلیتِ ادبی سے ناظرین "شاعر" کو روشناس کرایا جائے اور دنیا پر واضح ہو جائے کہ حیدرآباد اسکول کا یہ ہونہار طالب علم کیسا ذہن اور فکرِ عالی قدرت سے اپنے ساتھ لایا ہے۔ یہی خیالات مضمون ہذا کی ترقیم کے محرک ہیں۔ مضمون پر قبل اشاعت آپ غائر نظر ڈال لیں۔ اگر یہ حضرت سیماب مدظلہ کے ملاحظہ سے گذر جائے تو بہتر ہے۔ بصورت اشاعت مطلع فرمائیگا اور بحالت ناپسندیدگی مقالہ مذکور بذریعہ بیرنگ واپس فرما دیجئے تاکہ مجبوراً کسی دوسرے رسالہ کو بھیجوں۔ امید کہ جس نمبر میں مضمون شائع ہوگا، حضرت کے پاس پہنچیگا۔ والسلام

جواب کا منتظر

نیازکیش: سید قمر احمد نقوی۔ سہسوانی

محبی اعجاز صاحب ——— سلام مسنون

عرصۂ بعید سے آپ کی جانب سے کوئی نوازش نامہ صادر نہیں ہوا۔ میں بھی اس عرصے میں اپنی ذاتی مصروفیتوں کے باعث سخت پریشان رہا۔ پھر کچھ طبیعت بھی ناساز ہوگئی۔ جس سے کوئی نیاز نامہ پیش نہ کر سکا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ماہ بماہ "شاعر" کا جستہ جستہ مطالعہ کر لیتا ہوں۔ جس سے آپ کی اور حضرت علامہ مدظلہ العالی کی علمی و ادبی تحریکات سے واقفیت ہوتی رہتی ہے۔ نہایت مسرت ہوا کرتی ہے یہ دیکھ کر کہ ماشاء اللہ "شاعر" اپنے مشن میں ہر طرح کامیابی کی منزل کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔ دراں حالیکہ اُس کے بدخواہ اُسے نقصان پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ بعض خورد و مگر رسائل علامہ مدظلہ کے خلاف جو گندگی اچھالتے رہنے کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اُن کے مضامین سے بعض اوقات بہت زیادہ ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن میری گذارش ہے کہ آپ اُن کے منہ نہ لگئے۔ آپ کی اَن تھک خدمات ہی سب کا مکمل جواب ہیں۔

"تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے" کے مصداق طرح میں غزل کہنی پڑی جو خط ہذا کے ساتھ ہے

شخصیات:- حضرت مولانا آسی الدنی ثم الکھنوی

ہندوستان نے ہر دَور میں ایسے صدہا شاعر پیدا کئے جو اپنی فطری صلاحیتوں، ذاتی جوہر اور علم و فضل کے اعتبار سے اس قابل تھے کہ انھیں شہرت و قبولیت کے نقطۂ آخر پر پہونچنا چاہئے تھا لیکن دست بردِ زمانہ، افکارِ معیشت اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر وہ اپنا لوہا اس طرح منوا سکے جس طرح منوانا چاہئے تھا۔ ایسے ہی شعرا میں مولانا آسی لکھنوی کی ذاتِ گرامی بھی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جب متغزلین اُردو کے سلسلے میں ناقدین حسرت۔ سیماب۔ فانی۔ آرزو۔ جگر۔ اثر لکھنوی۔ جلیل۔ دل۔ قمر۔ ثاقب۔ صفی۔ یاس وغیرہ کا ذکر کریں تو مولانا آسی اور بعض دوسرے اچھے اساتذہ کو نظر انداز کردیں۔ ایسے تو خیر میں ماننے کے لئے تیار نہیں کہ مولانا آسی یا ایسے دوسرے اساتذہ جنھیں فراموش کیا جاتا ہے۔ کسی انفرادیت کے حامل نہیں یا اُن کے کلام میں اتنی جان نہیں کہ وہ کسی حد تک متاثر کرسکیں۔ میرے خیال میں ہر پختہ مشق اور پختہ کار شاعر کسی خاص اصول و نظریئے کے تحت ہی میں شعر کہتا ہے۔ خواہ وہ زبان و محاورہ کی شاعری ہو یا بلند و لطیف خیالات کی۔ اس لئے ناقدین کیوں نہ اُسی رنگ میں اس کا ذکر کریں۔ ہاں یہ یقیناً صحیح ہے کہ بعض ایسے شاعر خود اپنی ہی بے نیازی کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جب اس دَور کی اندھی تنقید، رواداری، یا جانبداری سراہتے سراہتے کم مشق اور معمولی کہنے والوں کو سب سے بڑا غزل گو، سب سے بڑا ناظم سب سے بڑا انقلابی شاعر، سب سے بڑا زبان پسند اور خدا جانے کیا کیا بنا دیتی ہے تو ایسے شعرا جو نہ صرف علم و فضل کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں بلکہ استادانہ درجہ رکھتے ہیں۔ کیوں نہ سراہے جائیں؟ میں جانتا ہوں کہ شاعری میں "پسند اپنی اپنی" ایک کھلا ہوا معیار ہے۔ مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ منزل خود راہرو کے پاس نہیں آتی بلکہ راہرو منزل کے پاس جاتا ہے۔ جب شعرا ہی اپنے کلام کی نشر و اشاعت میں کوتاہی برتیں تو بیچارے ناقدین کا کیا قصور۔ بعض لوگ سعدی کے "مشک آنست" والے نظریئے کو دہرائیں گے۔ گر میں اسے یہاں صحیح نہیں سمجھتا۔ بسا اوقات دوسری چیزوں کی خوشبو سے مشک کی خوشبو کے ہلکے پڑجانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح "پسند اپنی اپنی" کے اس ہنگامہ خیز دَور میں بعض اچھے شعرا کی آواز کا دب کر رہ جانا بعید از قیاس نہیں خصوصاً ایسے شعرا کی آواز جو تنقید کی گرم بازاری کو برداشت نہیں کرسکتے۔

ان مثبت و منفی خیالات کے اظہار کا مقصد مولانا آسی اور ناقدین، دونوں کو اپنے فرض کے احساس کی منزل تک کھینچ کر لانا ہے اور کچھ نہیں۔ میں تنقید میں ذرا سی بھی رواداری کو گناہِ عظیم سمجھتا ہوں نہ شعر کو ہر وقت اپنے جذبات کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں بلکہ اُس کے مجموعی اثرات اور شعر کے تمام تر لوازمات پر بھی غور کرتا ہوں۔ اسی اصول کے پیشِ نظر مولانا آسی کو متغزلین اُردو میں نمایاں جگہ دی جاسکتی ہے۔

مولانا آسی کا پورا نام عبدالباری ہے۔ ابن منشی خلیفہ حسام الدین احمد حسام تلمیذ مرزا غالب ابن مولوی شیخ خدا بخش عاجز ابن شیخ عبدالحکیم عاشق عرف میاں نتھن معاصر و ہم جلیس میر تقی میر اکبرآبادی۔ ۱۸۹۳ء میں "الدن" ضلع میرٹھ میں ولادت ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ اس کے بعد فارسی کی تکمیل مولوی حافظ برکت علی صاحب سے اور عربی کی سید سراج احمد صاحب سراج سے کی۔ مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی سے بھی بعض کتب حدیث و فقہ کا استفادہ کیا۔ ۱۹۰۸ء میں دہلی میں حکیم نواب جان مرحوم سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں شاہجہانپور میں دو برس تک فارسی پڑھانے پر مامور رہے۔ ۱۹۱۲ء میں درس و تدریس سے جی گھبرایا تو مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" دہلی میں چلے آئے۔ اس وقت سید جالب دہلوی اُس کے ایڈیٹر تھے ۱۹۱۴ء میں جب "ہمدرد" کی حالت خراب ہوئی تو لکھنؤ چلے آئے اور اُس وقت سے اب تک یہیں ہیں۔

شاعری مولانا آسی کا خاندانی ذوق اور فطری جذبہ تھی اس لئے دورانِ تعلیم ہی میں شعر کہنا شروع کردیا اور ایک دن خود بخود یہ شعر ہوگیا؎

کیا تم نے زخمی کیا دل ہمارا
بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے۔ اس کے بعد آپ نے قریب قریب روزانہ شعر کہے اور دنوں بغیر کسی تخلص کے مشقِ سخن جاری رہی۔ ایک دوست کے مشورہ سے عاصی تخلص رکھا۔ ادھر مولانا سید سراج احمد صاحب سراج نے مشقِ سخن کو سراہا۔ شدہ شدہ آپ کے والد بزرگوار کو بھی خبر ہوگئی۔ انھوں نے ایک مصرع دیا۔ آسی صاحب نے غزل کہی، بہت خوش ہوئے مگر فرمایا کہ ابھی بہت کمی ہے۔ کبھی کبھی اصلاح بھی دیدیا کرتے تھے۔ پھر آسی صاحب اپنے دادا صاحب کے دیوان سے استفادہ کرتے رہے۔ لیکن اب تک صرف فارسی کے دیوان نظر سے گذرے تھے۔ سب سے پہلے اُردو میں مرزا

دیوان پڑھا اور وہ بھی بہت سمجھ کر۔ اپنے والد صاحب سے اُس کے معانی پر پورا عبور حاصل کیا۔ پھر گلزارِ نسیم کو سبقاً سبقاً دیکھا۔ ۱۹۱۰ء میں حضرت ناطق گلاوٹھوی سے ملاقات ہوئی۔ علامہ ناطق، آسی صاحب کے قریبی عزیز بھی ہوتے ہیں۔ آسی صاحب نے اصلاح کی درخواست کی اور علامہ ناطق نے منظور فرمالیا اور سب سے پہلے عاصی کو آسی سے بدلا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک آپ مولانا ناطق ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ دو غزلوں پر مرزا داغ سے بھی اصلاح لی۔ مگر کلیتاً فیض مولانا ناطق ہی کی ذاتِ گرامی سے پہونچا۔

آسی صاحب کو ابتدا میں ناسخ کا رنگ محبوب تھا۔ بہت سی غزلیں اُسی رنگ میں کہیں۔ جب اُس کی قباحتیں ذہن نشیں ہوئیں تو مولانا حالی کا رنگ اختیار کیا، ایک زمانہ میں۔ ہر شعر میں کوئی محاورہ نظم کرنے کا شوق ہوا پھر ایہام و کنایہ سے دلبستگی رہی جس کی مولانا ناطق نے ممانعت فرمائی۔ تین سال تک مرزا داغ کے رنگ میں شعر کہے۔ لکھنؤ اکر "غالبیت" اختیار کی، غرض ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد اور لکھنؤ کے روایتی بین و بکا کو ترک کرکے خود اپنے جذبات و واردات کے مطابق شعر کہنے لگے خواہ وہ کسی کے رنگ کے ہوں۔

مولانا آسی کو تمام اصنافِ سخن پر قدرت حاصل ہے مگر رباعی اور غزل آپ کی محبوب چیزیں ہیں۔ تلامذہ کی تعداد بھی کافی ہے اور ان میں سے بعض مشہور بھی ہیں مثلاً مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی۔ امین سلونوی۔ عمر انصاری۔ شہید بدایونی۔ زخمی لکھنوی۔ حیرت لکھنوی۔ اسد الہ آبادی۔ آزاد لکھنوی وغیرہ

آپ ایک مدت سے کتب خانہ منشی نولکشور کے ناظم ہیں اور اردو علم و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ شرحِ دیوانِ غالب۔ شرح تحفۃ العراقین۔ ترجمہ و شرح دیوان حافظ۔ ترجمہ فرہنگ آنند راج۔ معرکۂ سخن وغیرہ وغیرہ۔ حال ہی میں آپ نے کلیات میر تقی میر اکبر آبادی مرتب فرمایا ہے۔ جو آپ کا لافانی کارنامہ ہے۔ افسوس کہ مولانا آسی نے اپنی غزلوں۔ نظموں اور رباعیات کا مجموعہ نہیں چھپوایا، حالانکہ یہ تینوں مجموعے مرتب و مکمل ہیں۔ عرصہ ہوا رباعیات کا ایک مجموعہ "لطائف" کے نام سے شائع ہوا تھا

مولانا آسی نے بڑی دور رس نگاہ پائی ہے۔ علم عروض میں بھی آپ کو کامل دستگاہ حاصل ہے۔ نظم کی طرح نثر پر بھی قدرت تام ہے۔ کاش مولانا شاعری کرنے کی طرح کریں اور صرف چند مشاعروں ہی تک یہ چیز محدود نہ رہے۔ مولانا تغزل میں دہلی اسکول کا اتباع کرتے ہیں۔

غضب ہی ڈھا گیا آسی یہ کہنا اُنکو وعدہ پر
تمھارے کون ہم وہ تھے، تمھیں ہم یاد کیا کرتے

اُس سال فصلِ گل میں اُجڑا اتھا بنتے بنتے
رہتا تو آشیاں کو اب ایک سال ہوتا

بجھا دے اے ہوائے تُند مدفن کے چراغوں کو
سیہ بختی میں یہ اک بدنما دھبا لگاتے ہیں

جو ٹوٹا ہے تو پھر ہم اُس کے اجزا جوڑتے کیونکر
خدا جانے مرے دل میں کہاں کیا تھا کہاں کیا تھا

لے دشمنِ مروت کچھ حق بھی ہے ہمارا
برسوں تڑپ لئے ہم احباب سے لڑے ہیں

دیکھتا ہے نہ عمارت کو نہ ویرانے کو
جس جگہ پڑ رہا نیند آگئی دیوانے کو

مناسب خیر رکھیں زخمِ دل پر چارہ گر مرہم
مرے نزدیک تو کوئی خدا سے لڑ نہیں سکتا

اُتنے ہی دستِ شوق میں پھول چُنے ہوئے ملے
جتنے کسی غریب نے پھول چُنے بہار میں

اُن کو یہ غصہ کہ میں اُن کی گلی میں کیوں گیا
مجھ کو یہ حیرت کہ کیونکر شکل پہچانی مری

جہاں مولانا آسی کے یہاں ایسے تفلسیانی سادہ مگر اشعار ملتے ہیں وہیں جذبات و واردات میں ڈوبے ہوئے لطیف تغزل کے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے کتنے جاذب ہیں ؎

ہزاروں طرح اپنا درد ہم اُنکو سناتے ہیں
مگر تصویر کو ہر حال میں تصویر پاتے ہیں

ایک عالم پڑ رہنے پائیں دل کی حسرتیں
تم نے جب دیکھا نئے انداز سے دیکھا مجھے

میں چپ بیٹھا ہوا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے
کہ جیسے اک زمانہ کہہ رہا ہے داستاں میری

دُنیا میں کوئی غم کے علاوہ خوشی نہیں
وہ بھی ہمیں نصیب کبھی ہے کبھی نہیں

نغموں ہی کی تخصیص نہیں اہلِ طلب میں
سُننے پہ کوئی آئے تو نالہ بھی مزا دے

چمک جاؤ اے شامِ غم کے ستارو
مصیبت کے ماروں پہ احسان ہوگا

زندگی مورد آفات ہوئی جاتی ہے
جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی جاتی ہے

تمنا کو خموشی دی، خموشی کو زباں تو نے
مکمل کر کے چھوڑی بے بسی کی داستاں تو نے

اعجاز صدیقی

قسط دوازدہم :-

.... کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں ــــ بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرے کے بعد میسور کے تاریخی مقامات کی سیر)

آج شب کو ٹاؤن ہال میں مشاعرہ ہے۔ دن بھر کہیں نہ جاسکے۔ شام کو خانصاحب عبدالرحمٰن خاں صاحب کی کار میں تفریح کے لئے نکلے۔ میسور میں ایک چھوٹی سی پہاڑی بھی ہے نام تو یاد رہا نہیں۔ شام کی جھلملاتی ہوئی دھوپ میں اُس پر پہونچے۔ اس پہاڑی سے ریاست کا منظر بڑا دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ ریاست میسور میں بجلی کی روشنی کا خاص انتظام ہے۔ بلندی سے یہ روشنی ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے زمین سے تارے

آج صبح حکیم سید غوث محی الدین صاحب پروفیسر طبیہ کالج میسور نے شب کے کھانے پر مدعو کر دیا تھا۔ سیر سے واپس ہوئے تو حکیم عبدالواحد خاں صاحب بیکش، شاد صاحب اور تبسم صاحب کے ساتھ حکیم صاحب کے دولتکدہ پر پہونچے، موصوف نے کھانے میں بڑا اہتمام فرمایا ہے۔ خود بھی بڑے خلیق، متواضع اور صاحبِ علم بزرگ ہیں۔ دعوت سے واپس ہوئے تو حضرت قبلہ علامہ سیماب مدظلہٗ نے مشاعرے میں پڑھنے کے لئے چند صفحہ کا خطبۂ صدارت تیار فرمایا۔ اتنے میں اراکینِ انجمن ترقی اُردو آگئے اور شعرا کا یہ قافلہ ٹاؤن ہال کے لئے روانہ ہوگیا۔ ہال کے دروازے پر کار رُکتے ہی لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا، اندر پہونچے تو تقریباً دو سَو آدمیوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ ہال میں آدمی زیادہ تو نہیں ہیں پھر بھی مشاعرہ شروع ہونے کے وقت تک چار سو یا پانچسو ہوگئے ہیں۔ تحریکِ صدارت کے بعد حکیم عبدالمنتقم خانصاحب تبسم بنگلوری نے علامہ سیماب کا تعارف کرایا۔ تبسم صاحب بھی خاصی تقریر کر لیتے ہیں۔ اُن کے برمحل جملے اور ذخیرۂ الفاظ اُن کے علمی تبحر کے شاہد ہیں۔ اندازِ بیان سے بھی وہ جنوبی ہند کے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔ دامنٹ تک بے تکان بولتے رہے۔ مشاعرہ غیر طرحی ہے اچھی اور بُری ہر طرح کی غزلیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے میزبان بیکش صاحب اچھا پڑھتے ہیں۔ اور کتنے بھی اچھا ہیں۔ ۱ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اس کے بعد عبدالغنی صاحب مدیر "نوجوان" نے ایک مختصر سی تقریر کی اور تقریر میں ہمیں متوجہ کرکے فرمایا کہ یو۔ پی اور پنجاب کے جرائد جنوبی ہند کے شعرا اور ادبا کی ہمت افزائی نہیں کرتے اور اس طرح جنوبی ہند میں بسنے والوں کا ذوق آگے نہیں بڑھتا۔ تقریر ختم ہونے کے بعد سکریٹری صاحب انجمن ترقی اُردو نے ایک تقریر کی اور انجمن کی طرف سے حضرت قبلہ علامہ سیماب مدظلہٗ کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی اور معذرت چاہی کہ انجمن زیادہ خدمت نہ کر سکی۔

میسور سے بعد خواہ کم میں بنگلور میں سُن چکا ہوں، بہر حال میں بنگلور کا ادبی ذوق میسور

سے کسی قدر بڑھا ہوا ہے لیکن اُردو زبان میں ترقی کرنے کا جذبہ دونوں جگہ یکساں طور پر اُبھرا ہوا ہے۔ انجمن ترقی اُردو میں جو نوجوان کام کر رہے ہیں ان کا ذوق و شوق بھی لائقِ داد و تحسین ہے۔ مسٹر عبدالمتین بی۔ اے اور مسٹر عبدالغنی مدیر نوجوان سے کچھ دیر گفتگو ہوئی۔ بہرحال دونوں نوجوانوں کو جذبۂ عمل سے مخمور پایا۔

علی الصباح بنگلور واپس ہوتا ہے۔ بیکش صاحب کے یہاں آکر کچھ دیر آرام کیا اور صبح ۹ بجے اسٹیشن چلے آئے۔ اس اخلاق اور مشاہیر دوستی کی کیا داد ہو سکتی ہے کہ مولانا شاہ ابوالحسن صاحب ادیب۔ جناب سید شاہ اسد پیراں صاحب قادری اور دیگر حضرات شب کی جگار کے باوجود علی الصباح ہمیں رخصت کرنے اسٹیشن تشریف لائے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسد پیراں صاحب نے ایک مختصر سا قصیدہ بھی پیش کیا ہے۔ اُنکے خلوص و محبت اور عقیدت کی یادگار میں اُسے یہاں نقل کر رہا ہوں ؎

شاد ہوں شاد حضرتِ سیماب ۔۔۔ شاعرِ محترم بلند رکاب
جانشینِ جنابِ مرزا داغ ۔۔۔ رونق افروزِ محفلِ آداب
نکتہ دانی میں آپ اپنی نظیر ۔۔۔ شعر فہمی میں آپ اپنا جواب
کانِ علم و کمال کے جوہر ۔۔۔ بحرِ دانش کے گوہرِ نایاب
یہ کمالات اور اتنا عجز ۔۔۔ جائے عبرت ہے یا اولی الالباب
ماہر باکمال و باعظمت ۔۔۔ ناقدِ قیل و قالِ حسن و شباب
جادہ پیمائے دانش و ادراک ۔۔۔ جلوہ افزائے حکمتِ احباب
کارِ امروز آپ کا پیغام ۔۔۔ کارِ فردا کا جس میں استصواب
عالمِ عصر، شاعرِ فطرت ۔۔۔ لوحش اللہ اے دلیلِ صواب
ایسے انسان کا زمانہ میں ۔۔۔ ہے وجود آج جائے استعجاب
وقت اچھا ہے نیک ساعت ہے ۔۔۔ اب دُعائے اسد ہو گوشِ شتاب
سیکڑوں سال آپ شاد رہیں ۔۔۔ مع اعجازِ حضرتِ سیماب

اور ہر دن ابد کا ہمسر ہو
جس سے حیراں ہو چشمِ اصطرلاب

اسد صاحب کی اس عقیدت نے ہم پر بڑا اثر کیا۔ شب کے کسل و خمار اور ارباب میسور کے اخلاق و کردار کو دل و دماغ میں لئے ہوئے ٹھیک ۹ بجکر ... منٹ پر ٹرین ... ایک جنبش کے ساتھ سمت ... ۱۰۰ ... ۹۶ ۱

تحقیق و تصحیح ـــــ سہرا

جناب منظور مبارکپوری نے "سہرے" کے متعلق مجھ سے ایک استفسار کیا تھا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اس کی اصلیت کیا ہے، کب سے رواج ہوا اور کیونکر؟ منظور صاحب نے یہی استفسار ہفت روزہ "خیام" لاہور کو بھی بھیجا ہوگا۔ جناب عبدالرحیم شبلی بی کام نے "خیام" میں "سہرے" کی تحقیق کے سلسلے میں جو ایک پُر از معلومات مقالہ تحریر فرمایا۔ میں یہاں شبلی صاحب ہی کا جواب نقل کر رہا ہوں تاکہ ناظرینِ "شاعر" بھی آگاہ ہو جائیں۔ **اعجاز صدیقی**

جواب: "سہرا" (بالکسر) ہندی زبان کا لفظ ہے۔ "نور اللغات" میں اس کے یہ معنی لکھے ہیں "وہ پھولوں کی لڑیاں جو دولہا دُلہن کے سر پر سے منہ پر لٹکائی جاتی ہیں"۔ لیکن سہرا ان پھولوں کی لڑیوں کو بھی کہتے ہیں جو مزار کے طاقچوں پر لٹکا دی جاتی ہیں۔ چنانچہ

رآسخ ؎

جنوں میں موت آئی ہے مجھے پھولوں سے کیا مطلب
مری تربت پہ سہرا ہو مرے تارِ گریباں کا

لہذا میرے نزدیک "سہرے" کے معنی پھولوں کی لڑیاں ہیں خواہ وہ نوشہ کے چہرے پر لٹکائی جائیں۔ یا مزار کے طاقچوں پر۔ نیاز فتحپوری صاحب نے ایک مرتبہ لکھا تھا ممکن ہے یہ لفظ عربی کے "سَہَر" سے مشتق ہو جس کے معنی "رات کو جاگنا" کے ہیں لیکن جب ہندی میں اس کے معنی موجود ہیں تو خواہ مخواہ عربی کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ ہندوؤں میں سہرا باندھنے کی رسم سورج بنسی خاندان کے زمانہ سے چلی آتی ہے اور جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ رامائن میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مسلمانوں نے اسی رسم کی تقلید کی ہے ورنہ عرب و عجم میں اس کا رواج نہ تھا۔ ہندوؤں میں شاعروں کی ایک جماعت زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہے۔ جسے "بھاٹ" کہتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر امراؤ رؤسا کی تعریفیں کر کے پیٹ پالتے تھے۔ اور نہ صرف شادی بیاہ کا پیام ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ بلکہ لڑکی والوں کے یہاں پہنچ کر دولہا کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے بھی ملایا کرتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ لوگ وہی فرائض انجام دیتے جو مسلمانوں کے یہاں میراثیوں اور ناتیوں کے سپرد ہیں۔ رفتہ رفتہ شادی بیاہ کے موقع پر باقاعدہ نظمیں کہنے کا رواج عام ہو گیا اور جب لکھنؤ کی درباری شاعری نے "قصیدے" کا رُخ کیا تو اس کا ایک پہلو "سہرے" کی شکل میں نظر آنے لگا۔ لہذا میرے نزدیک "سہرا" کوئی علیحدہ صنفِ ادب نہیں ہے بلکہ "قصیدے" کی ایک شاخ ہے غالب اور ذوق سے پہلے رآسخ اور جان صاحب نے "سہرے" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن مدحیہ رنگ میں نہیں محاورے کے طور پر "رآسخ" کا شعر اوپر درج کیا جا چکا ہے

جان صاحب نے "سہرے کی لڑی کا ٹوٹنا" لکھا ہے۔ جو عورتوں کے نزدیک بدشگونی ہے

کم نہ تھا ؎

ہو خبر دُلہن دولہا کی ماتھا مرا ٹھنکا
اچھا نہیں بی ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا

جان صاحب نے "سہرا جلوے" کی ترکیب کو "بیاہتا بیوی" کے معنی میں استعمال کیا ہے ؎

کیوں سوت کی میں آگ میں جل جل کے مروں گی
ہوں سہرے نہ جلوے کی جو بھرنا میں بھروں گی

"سہرا" کو ردیف قرار دے کر سب سے پہلا قصیدہ ذوق نے لکھا۔ اس کے بعد متعدد محاورے ظہور میں آ گئے ؎

سہرا گوندھنا۔ (ذوق)

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

ناسخ ؎

حور و غلماں کا اگر بزمِ طرب میں ہو گزر
سہرا دولہا کا یہ گوندھیں وہ دلہن کا سہرا

سہرا گانا ؎ ذوق

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

سہرا لکھنا ؎ (غالب)

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

سہرا کہنا ؎ (ریاض)

دھوم مچ جائے بزمِ نوشہ میں — شور اُٹھے خوب ہی کہا سہرا

سہرا باندھنا ؎ (بحر)

رات گذری ہیں دولہا کی طرح فرقت میں — صبح کو آنسوؤں کے تار نے باندھا سہرا

سہرے کے پھول کھلنا یعنی بیاہ کا وقت آنا ؎

دونوں دولہا دلہن خوشی سے ملیں — کہیں سہرے کے پھول جلد کھلیں

"سہرا" کی ردیف سے چونکہ مضامین میں وسعت پیدا نہیں ہو سکتی اس لئے آج کل اس پابندی کا خیال نہیں کیا جاتا اور عام قصیدوں یا نظموں کی طرح سہرے لکھے جاتے ہیں۔ **شبلی۔ بی کام**

اصلاحِ سخن

محمد عبید اللہ خاں بزم امروہوی کی غزل پر حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی اصلاح

مرے چمن میں خزاں کی بہار باقی ہے ۱ ... بادۂ ناخوشگوار باقی ہے

اب ہیں پھول
چمن کا نام بشکلِ مزار باقی ہے ۲ ~~گل ہیں باقی~~ نہ صوتِ ہزار باقی ہے

بعد مُردن بھی
جو دل میں لذتِ پیکانِ یار باقی ہے ۳ اُسی کا لطف اُٹھاؤں گا ~~جیتے جی~~

جو پاؤں میں
~~جگر میں~~ جو خلشِ نوکِ خار باقی ہے ۴ قرار لینے نہیں دیتی کوئی دم مجھ کو

رحمتِ پروردگار
اُمیدِ لطفِ ~~خداوندگار~~ باقی ہے ۵ گناہگار و خطاکار ہوں مگر پھر بھی

ابھی تو گردشِ لیل و نہار باقی ہے ۶ تباہ حال پہ کیا ہنس رہا ہے اے ستم

۷
نفس شماری سے مہلت نہیں ہے بزم ہمیں
خیال
~~حسابِ~~ پرسشِ روزِ شمار باقی ہے

توجیہہ

(۲) مصرع چست نہ تھا۔ اصلاح سے صفائی اور چستی پیدا ہو گئی باقی کی پہلے مصرع میں کمی تھی۔

(۳) مرنے سے لذتِ پیکانِ یار کا لطف اُٹھانا کوئی ایسی بات نہیں ہاں "بعد مُردن بھی" لطف اُٹھانا یقیناً لطف انگیز ہے۔ اور لذت کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے

(۴) جگر سے خلشِ نوکِ خار کا تعلق شاعرانہ مبالغہ تو ہو سکتا ہے۔ حقیقت نہیں ہو سکتی خار کا تعلق تو پاؤں ہی سے زیادہ مناسب اور قریں ہے۔ اب پہلے مصرع سے ربط مکمل ہو گیا۔

(۵) "خداوندگار" صحیح نہیں تھا اس لئے رحمتِ پروردگار بنا دیا گیا۔

(۷) "حساب" اور پرسشِ روزِ شمار۔ یعنی چہ؟ "خیال" ہی ہونا چاہئے۔

اعجاز صدیقی

جناب شیدا اٹاوی مرحوم کی غزل پر حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم کی اصلاح

ہم کو متوالا بنا دے تیری پیمانے کی خبر ۱ سُنکے نام آئے ہیں ساقی تیرے میخانے کی خبر

بھر دے نیت مری
~~جلد دیدے مجھے~~ ساقی تیرے پیمانے کی خبر ۲ تشنہ لب دیر سے بیٹھا ہوا تکتا ہوں

اُڑ گئے ہوش یہ کہتے ہوئے
~~جھوم کر بادِ صبا کہتی ہے~~ مستانے کی خبر ۳ ~~جام الفت سے جو مخمور ہوئی ہیں آنکھیں~~
نے کیا دیدۂ عاشق کو جو مست

بیڑیوں میں ہے یہ غل ہو تیرے دیوانے کی خبر ۴ عاشقِ زلف ہوں زنجیروں کو ہے شوق مجھے

~~زیر گیسو رہی صیاد تیرے دانے کی خبر ۵ خواب دانا ہے جو دانے کو مرغِ دل کے~~

کندھا
ناز کی نے یہ شرارت سے کہا شانے کی خبر ۶ جب جنازہ کو دیا میری انھوں نے ~~کاندھا~~

۷
دھیان اتنا ہے گیسو میں دلِ شیدا ہے
نوکِ شانہ کی نہ چبھ جائے ترے شانے کی خبر

توجیہہ

(۲) دوسرے مصرع کو اصلاح سے ترقی دی گئی ہے۔ تشنہ لبی کے اعتبار سے "بھر دے نیت مری" بہت اچھا ہے

(۳) بادِ صبا سے آنکھوں کا کوئی تعلق نہیں۔ فاضل استاد نے اصلاح سے مصرعوں میں ربط پیدا کر دیا۔ دوسرے مصرع کو دیکھئے کتنا برجستہ ہو گیا ہے "اُڑ گئے ہوش یہ کہتے ہوئے مستانے کی خبر" مستی میں ہوش کا کیا کام؟ "ہوش" ہی کی زبان سے "مستانے کی خبر" کہنا خوب ہے

(۵) شعر بھونڈا اور مبتذل تھا اس لئے قلم زد کر دیا گیا۔

(۶) "کاندھا" اور "کندھا" دونوں صحیح ہیں لیکن کندھا فصیح کا مستعمل ہے اس لئے ترمیم کی ضرورت ہوئی۔

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :- "خزاں کا دَور گیا موسمِ بہار آیا"

خان بہادر حضرت علامہ وحشت کلکتوی

کچھ اس ادا سے خدنگ نگاہِ یار آیا
کہ میں نے جانا علاجِ دلِ فگار آیا

مری تو خاطرِ افسردہ کو خبر نہ ہوئی
چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ بہار آیا

تری گلی کو ترا آشنا نہ چھوڑ سکا
ہزار بار گیا اور ہزار بار آیا

فریب غمزہ بھی تھا اپنی سادہ لوحی بھی
کہ اُسکی بزم سے پھر میں اُمیدوار آیا

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

نگاہِ لطف کہاں چشمِ قہر بھی تو نہ تھی
میں کس اُمید پہ آخر اُمیدوار آیا

ملا نہ ایک بھی دل دردِ عشق کے قابل
میں خانقاہ میں وحشت بہت پکار آیا

حضرت نشتر ہنگامی۔ ایڈووکیٹ اودری

حریم یار سے محروم دید یار آیا
میں بیقرار گیا اور بیقرار آیا

شبِ فراق مسلسل خیالِ یار آیا
ہزار بار ہٹایا، ہزار بار آیا

نہ جانے جیت ہوئی عشق کو کہ ہار ہوئی
ملا تھا دل جو مجھے ایک میں وہ ہار آیا

چمن اسی کا، اسی کی خزاں اسی کی بہار
مذاقِ سیرِ چمن جس کو سازگار آیا

تمام عمرِ محبت اسی طرح گذری
میں بیقرار ہوا اور، جب قرار آیا

ہزار بار کشیدہ ہوا محبت سے
ہزار بار محبت پہ مجھ کو پیار آیا

ہزار دھوکوں پہ دل کا یہ حال ہے نشتر
کہ اُس نے بات کوئی کی، اور اعتبار آیا

حضرت نواب از کرنول

دلِ تپاں کو نہ اک بار بھی قرار آیا
چمن میں موسمِ گل یوں تو لاکھ بار آیا

بھلا ہو بیخودیِ شوق کا وہ آ ہی گئے
بڑے ہی کام سے میرا انتظار آیا

ترے مزاج میں مجھ سے جو کدورت ہے
وہ آئینہ ہوں نہ جس میں کبھی غبار آیا

اسیرِ دامِ محبت ہوا جو طائرِ دل
تمہارے ہاتھ عجب مفت کا شکار آیا

ہوئے تھے راہِ محبت میں جنکی مرکے خاک
ہماری خاک سے افسوس اُنکو عار آیا

نہ پارہ پارہ ہو کیوں اُسکا دفترِ عصیاں
جو عرصہ گاہِ قیامت میں شرمسار آیا

نہیں ہے ہستیِ نواب ہی پہ کچھ موقوف
جو تیرے کوچہ میں آیا وہ بیقرار آیا

حضرت برق صدیقی فتحپوری

سمجھ میں کچھ نہ محبت کا کاروبار آیا
کسی سے مل کے بھی دلکو کہاں قرار آیا

بچا بچا کے بہت دل کا آئینہ رکھا
مگر یہ ٹوٹ کر اُن پر تاُلِ کار آیا

کسی کے وعدۂ فردا نے ضیق میں ڈالا
کچھ اعتبار نہ آیا کچھ اعتبار آیا

یہ بھول جانے کی خو انکی کچھ بری بھی نہیں
خدا گواہ بہت لطفِ انتظار آیا

فضائے دل میں ضیائے نشاط پھیل گئی
وہ آ گئے کہ مہِ عید جلوہ بار آیا

کھلا دیا نفسِ جاں فزا سے غنچۂ دل
لئے بہارِ سراپا وہ نوبہار آیا

وطن کی یاد دلِ برق میں ہوئی تازہ
دیارِ غیر میں جب موسمِ بہار آیا

حضرت مسلم مالیگانوی

معاملہ یہ محبت میں بار بار آیا
نگاہِ شوق ملی تھی کہ دل کو پیار آیا

ادائیں اُن کی ہیں ایک ایک پیار کے قابل
بتاؤں کیا؟ کہ مجھے کس ادا پہ پیار آیا

چمن کے ہاتھ لگے کیسے رنگ رنگ کے پھول
مرے نصیب میں اک قلب داغدار آیا

اُلجھ کے رہ گئی دشتِ جنوں کے کانٹوں میں
ہمارے کام نہ دامن کا ایک تار آیا

وہی ہے میکدۂ زندگی میں صاحبِ ذوق
بغیرِ بادہ و ساغر جسے خمار آیا

لگائی لاش ٹھکانے مری عزیزوں نے
تہِ لحد بھی میں احساں سے زیر بار آیا

جواب میری صدا کا کہاں ملا مسلم؟
میں بارہا حرم و دیر میں پکار آیا

حضرتِ رونق دکنی جمشید پور

یہ کون بنکے سراپردۂ بہار آیا
دل و نگاہ کو بے اختیار پیار آیا

سکوں تو موت بیگونہ ہو گیا حاصل
نہ بیقراریِ دل کو مگر قرار آیا

طلسم کاریِ دُنیا سے ہوش اری توبہ!
اُسی کے ہوش اُڑائے جو ہوشیار آیا

خزاں رسیدہ چمن کا یہ انقلاب تو دیکھ
کبھی نہ تذکرۂ شوخیِ بہار آیا

کتابِ زیست میں راحتِ دل سکوں کا ذکر نہیں
کسی کو موت سے پہلے کہاں قرار آیا

یہ کس نے چھیڑا فسانہ تباہیِ دل کا
یہ کیوں کلیجہ مرے منہ کو بار بار آیا

وہ جلوۂ یار میرا اعتبار تھا رونق
مجھی کو اپنی نظر پہ نہ اعتبار آیا

جناب طرفہ بھنڈاروی

پہن کے جامۂ احرام سوئے دار آیا
خرد کے سارے مراحل جنوں گذار آیا

نظامِ زیست میں جس وقت انتشار آیا
تو میرے لب پہ ترا نام بار بار آیا

شکستِ خوردگیِ قلبِ نامراد نہ پوچھ
خیال بھی ترا آیا تو شرمسار آیا

ملی بھی زیست بشر کو تو عارضی ہی ملی — حیات لے کے بھی آیا تو مستعار آیا
روش روش گل و لالہ کی آمد آمد ہے — چمن میں کون لئے مژدۂ بہار آیا؟
مجھے سکون کی منزل پہ دیکھنے والو! — قرار تھا ہی مجھے کب، کہ اب قرار آیا؟
غلامی حسن کی طرفہ ہوئی نصیب جسے — جہانِ عشق کا بن کر وہ تاجدار آیا

جناب شاعر کاندھلوی

جمالِ یار جواں بن کے جلوہ بار آیا — "خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"
زہے نصیب جنوں جسکو سازگار آیا — خوشا وہ دیدۂ جو دنیا میں اشکبار آیا
خوشا وہ زیست کہ جو یادِ یار میں گذری — زہے وہ مرگ کہ جسمیں پیامِ یار آیا
گمان گور کے جلووں کا ہوگا گلشن پر — بہار بن کے جو وہ رونقِ بہار آیا
وہ کیوں نہ گردشِ دوراں سے پائمال رہے — جسے فریبِ زمانہ پر اعتبار آیا
ہے مرگ و زیست برابر خمارِ الفت میں — میں بیقرار ہی کب تھا جو اب قرار آیا
وہ ایک لمحہ جوانی کا تھا فقط شاعر — تمام عمر میں جو دورِ خوشگوار آیا

جناب بیتاب کالپوی

مجھے جنونِ محبت جو سازگار آیا — تو رفتہ رفتہ مری روح کو قرار آیا
سکون و صبر سے آخر اُسے تعلق کیا — جسے نہ زیست میں اک روز بھی قرار آیا
یہ انتہائے محبت نہیں تو پھر کیا ہے — کسی کے جور و ستم پر بھی مجھکو پیار آیا
چھپا ہوا تھا وہ میرے ہی دل کی خلوت میں — کنشت و دیر و حرم میں جسے پکار آیا
دلِ خراب کو میرے کہیں سکوں نہ ملا — میں اُن کی بزمِ طرب سے بھی بیقرار آیا
سُنا ہے رہتے ہیں اب شعر مرے لئے مضطر — مٹا کے ہستیٔ دل میری اُن کو پیار آیا
امیدِ عفو و کرم کی لئے ہوئے بیتاب — تری حضور گناہوں سے شرمسار آیا

جناب اکرم حنیفی دھولیوی

پکارتا ہوا یہ ابرِ کیف بار آیا — "خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"
غلط کہ بزم ہے ان کی سکون کا مسکن — میں بے قرار گیا اور بے قرار آیا
فسردگیٔ طبیعت قفس میں کب بدلی — نظر کے سامنے کب جلوۂ بہار آیا
کسی کی یاد مری دل میں بار بار آئی — کسی کا ذکر مرے لب پہ بار بار آیا
جنوں زدوں سے نہ پوچھو بہار کا حاصل — جب آیا ہاتھ میں دامن تو تار تار آیا
ہزار عالمِ تسکیں نثار اُس دل پر — تمہاری بزم سے ہو کر جو بیقرار آیا
یہ میرا شیوۂ صدق و نیاز ای اکرم — پسندِ خاطرِ احباب بے شمار آیا

جناب منیر نقشبندی کولاری

حریمِ ناز سے آیا تو سوگوار آیا — تباہِ غم کو وہاں بھی نہ کچھ قرار آیا
پیامِ فصلِ بہاراں تو بار بار آیا — مگر نہ ساقیٔ میخانۂ بہار آیا
یہی نہیں کہ فقط موسمِ بہار آیا — ہوا کے دوش پہ بادل بھی بادہ بار آیا
ہوا چمن کی کہاں راس آئی وحشی کو — گیا تو کر کے گریباں کو تار تار آیا
چمن میں عید منائیں نہ کیوں چمن والے — "خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"
کسے امید کہ مر کر اُسے قرار آئے — نہ جیتے جی جسے دم بھر کبھی قرار آیا
منیر کو ترے در سے جو عزّ و جاہ ملا — دیارِ شعر میں یہ بن کے شہر یار آیا

جناب عاصی ننگھلوی

قفس سے چھٹکے جو عاصی ترانہ بار آیا — جہاں میں غل ہوا پیغمبرِ بہار آیا
فراقِ دوست میں جب بھی خیالِ یار آیا — مجھے خزاں میں نظر عالمِ بہار آیا
وفا کو بعدِ زوالِ وفا حیات ملی — کسی کی جان گئی اُن کو اعتبار آیا
اُسے شگفتِ نشاطِ بہار میں دیکھا — مجھے چمن میں نظر وہ ہزار بار آیا
شہید کو نہ سہی زندگی وفا کو ملی — وہ چار پھول لئے بر سرِ مزار آیا
عجب بہار مرے مطلعِ نظر سے رہی — شبابِ شیب میں مجھ پر ہزار بار آیا
عذابِ نار جو عاصی پہ غالب نہ آسکا — جھجک کے بولا یہ اچھا گنہگار آیا

جناب فارغ ازادیورہ

شبِ الم متواتر خیالِ یار آیا — جو ایک بار نہ آتا تھا بار بار آیا
کھٹک رہا تھا نگاہوں میں میری بلبل سے — مٹا کے خارِ تمنا مجھے قرار آیا
ترانے ہجر کے گاتی ہوئی خزاں آئی — پیامِ شوق لئے موسمِ بہار آیا
گھٹا بہار کی آئی برسنے تربت پر — کہ بال کھولے ہوئے وہ سرِ مزار آیا
گیا جو بزمِ محبت سے سوگوار گیا — جو آیا بزمِ محبت میں بیقرار آیا
بساطِ بزمِ چمن اب بدلنے والی ہے — "خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"
نفاق و بغض ہیں فارغ مقیم بلبل سے — تو کیا مزا ہی وطن اِن کو سازگار آیا

جناب سحر اعظم گڈھی

نسیمِ صبح کا جھونکا جو مشکبار آیا — مری زباں پہ ترا نام بار بار آیا
مرے خرابے میں وہ رشکِ لالہ زار آیا — "خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"
دکھا سکا نہ انھیں اضطراب کا عالم — وہ آئے اور دلِ بیتاب کو قرار آیا
بس ایک چال میں دل مات کھا گیا ہمدم — گیا تھا اُن کو ہرانے یہ خود کو ہار آیا
لحد میں خوابِ گراں سے جگایا کس نے — یہ کون حشر بداماں سرِ مزار آیا؟
ملی نجات نہ اسے حسرتِ ہم آغوشی — خیالِ یار بھی دشمن سے ہمکنار آیا
سنور رہی ہے عروسِ شبِ فراق سحر — وہ دورِ نشہ گیا موسمِ خمار آیا

جناب محشر فرخ آبادی

اک ایسی عمر بھی میں عشق میں گزار آیا
جب ایک لمحہ نہ دل کو کبھی قرار آیا

روش روش پہ نسیم چمن پکار آیا
"خزاں کا دور گیا، موسم بہار آیا"

نقاب حسن سے پھر زندگی طلوع ہوئی
دلوں کو اہل محبت کے پھر قرار آیا

دل فسردہ ہوا پھر شباب لذت عشق
کلی کلی میں نظر حسن سحر کار آیا

ہو گلکدے میں نہ کیوں اہتمام رقص و سرود
کہ جھومتا ہوا پھر مطرب بہار آیا

پھر اہل باغ کو ہے فکر آشیاں بندی
چھٹے اسیر تو پھر ہوش کاروبار آیا

لٹا کے گھر بھی تو محشر کھلی نہ چشم وطن
وہی نفاق طبیعت بروئے کار آیا

جناب اسعد السدیدی لکھنوی از اولہ

پھر آج کوئی سر بام جلوہ بار آیا
خوشا کہ جذبۂ الفت بروئے کار آیا

چمن میں لیکے جو میں طلب داندار آیا
سبھی پکار اٹھے "فصل بہار" آیا

وہ دیکھو منزل مقصد طلوع ہوتی ہے
خوشا کہ عزم مصمم بروئے کار آیا

چمن کے لالہ و گل سب ہوئے ہمہ تن گوش
یہ کون ساز رگ جاں پہ نغمہ بار آیا

تمام لالہ و گل پر چمن میں اوس پڑی
خرام ناز سے وہ نازش بہار آیا

حریم دل ہے مرا طور معرفت یکسر
کہ بار بار اسی میں جمال یار آیا

جہاں میں راحت و تسکیں کا ذکر کیا اسعد
تہ لحد بھی کسے چین اور قرار آیا

جناب اشعر ہاشمی ملیح آبادی

تپش میں دل کی اگر جوش اضطرار آیا
تو سیل اشک ٹپکنے کو بے قرار آیا

تمہارے حسن کی پردہ دری نہ تھی منظور
نہیں تو ہاتھ گریباں پہ بار بار آیا

شباب اور پھر ان کا شباب؟ کیا کہنا
مجھے گماں یہ ہوا موسم بہار آیا

جبیں کے مٹنے ہی والی تھی بندگی کی خلش
کہ یاد آستاں میں پھر نقش پائے یار آیا

کسی نے فاش کیا کیا مآل حسن چمن؟
کلی کے رخ پہ عجب رنگ بار بار آیا

گلوں نے خاک اڑائی برس کی الفت میں
چمن سے دور تک اڑتا ہوا غبار آیا

کرم جو کرتا وہ اشعر تو حال کیا ہوتا
جفاؤں پر تو مجھے اسکی اتنا پیار آیا

جناب خادم شملوی از دہلی

گھٹائیں جب اٹھیں جب موسم بہار آیا
خیال اس بت کافر کا بار بار آیا

خیال کس کا مجھے شام انتظار آیا
جگر کا خون ہوا آنسوؤں کا تار آیا

چمن میں تم نہ گئے مجکو اعتبار آیا
مگر بتاؤ تو پھولوں پہ کیوں نکھار آیا

اگر نہیں ہے محبت تو اور یہ کیا ہے
تری جفاؤں پہ کیوں ہم کو آج پیار آیا

لحد میں سلسل محبت ہنوز باقی ہے
خلد کر رشتۂ الفت کو میں اتار آیا

مری کشش نے یہاں تک اثر کیا اس پر
میں ایکبار گیا وہ ہزار بار آیا

دل و نگاہ کی بازی لگی تھی اے خادم
کسی کی جیت کی خاطر جسے میں ہار آیا

جناب ہلاک پریمی از کوکشی (ریاست دھار)

مجھے زمانہ بہ ایں طور سازگار آیا
کبھی سکون، کبھی غم، کبھی قرار آیا

میں وہ ہوں غنچۂ افسردہ اے چمن والو
بہار میں بھی نہ جس پر کبھی نکھار آیا

کبھی تو روح سکوں مند زندگی ہوگی
اسی خیال سے دل کو مرے قرار آیا

مجھے بہار و خزاں سے نہیں ہے کچھ نسبت
مرے چمن کو ہر اک رنگ سازگار آیا

وہی ہے زیست، وہی حسرتیں وہی آہیں
اگر قرار بھی آیا تو کیا قرار آیا

ملا چھپا ہوا وہ مجھ کو دل کے گوشوں میں
جسے تمام زمانے میں، میں پکار آیا

کھلے تو کیسے کھلے اے ہلاک دل کی کلی
خزاں گئی نہ کبھی موسم بہار آیا

جناب جارح۔ کوہ آبو

کچھ اس ادا سے تمہارا گنہگار آیا
کہ اس پہ داور روز جزا کو پیار آیا

ہوئی تھی کیا مری تخلیق بیقراری سے
تمام عمر نہ اک لمحہ بھی قرار آیا

تو ہی بتا کہ تجھے کوئی اب کہاں ڈھونڈے
کنشت و دیر و حرم میں تو ہی پکار آیا

تڑپ کے رہ گئے اہل قفس بصد حسرت
چمن پہ جھوم کے جب ابر نو بہار آیا

چمک کے برق نے پھر سوئے آشیاں دیکھا
الٰہی خیر ہو پھر موسم بہار آیا

لبوں پہ آہ و فغاں چشم نم، جگر تھامے
یہ کون پردہ نشیں شام انتظار آیا

نہ جانے کس لئے اے جارح کل سر محفل
زباں پہ انکی مرا نام بار بار آیا

جناب خلیل راغبی آملنیری

مبارک اہل چمن دور خوشگوار آیا
خزاں چمن سے گئی موسم بہار آیا

سکوت شب میں خدا جانے کیا ہوا دل کو
تمہارا نام مرے لب پہ بار بار آیا

ہر ایک ذرے کو دیکھا جمال طور بدوش
وہ جب خیال میں ضوریز جلوہ بار آیا

مآل گلشن ہندوستاں معاذ اللہ
برنگ دور خزاں موسم بہار آیا

فسانہ ذوق تجسس کا مختصر یہ ہے
میں حد کون و مکاں تک انہیں پکار آیا

تری نگاہ نے کچھ ایسی مستیاں بھر دیں
کہ تا حیات نہ آپے میں بادہ خوار آیا

خلیل دیکھئے ماتم شہید حسرت کا
اٹھا جو ابر وہ مدفن پہ اشکبار آیا

جناب انجام کاشمیری

موافقت پہ مرا بخت سازگار آیا
مری نگاہ میں چھپنے وہ پردہ دار آیا

جو اس جہاں میں آیا خراب و خوار آیا
کسے قرار ملا ہے کسے قرار آیا

صدائے صور سے بھی اب میں اٹھ نہیں سکتا
نگاہ دوست سنبھالے مجھے خمار آیا

ے غریب میں زندہ رہے شبِ فرقت
گر نہ راس ہیں تیرا انتظار آیا

ہیں نہ دادِ طلب بے زبانیاں میری
زباں پہ حرفِ تمنا تو بار بار آیا

دی کے عالم میں آنا ہوا میں خود رفتہ
کہ بیخودی کو بڑی دور تک پکار آیا

یاتِ عشق کا انجام دیکھئے کیا ہو
عجیب طرح کا یہ دورِ نو بہار آیا

جناب ارشد صدیقی ساگری

"خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"
گر جنونِ محبت نہ ساز گار آیا

مزہ تو دیکھئے نکلا وہ میرے دل کے قریب
میں دیر و کعبہ میں جا کر جسے پکار آیا

لگا دی آگ گلوں نے چمن کے دامن میں
ہزار شعلے لئے موسمِ بہار آیا

تمہارا دامنِ گل ریز کب ہوا حاصل؟
ہمارے اشکِ محبت کو کب قرار آیا

جہاں میں کوئی بھی ہوگا نہ مجھ سا بد قسمت
کہ جب میں قید ہوا موسمِ بہار آیا

تمہارے واسطے ارشد نے چھوڑ دی دنیا
مگر کرم نہ تمہارا بروئے کار آیا

جناب کلیم شمس آبادی

دورِ درد سے دل کو نہ جب قرار آیا
ترا خیال تسلی کو بار بار آیا

نگاہِ شوق کو محرومِ دید رہنا تھا
نہ کام جذبۂ دل اور نہ انتظار آیا

نہیں ملال اگر بار یاب ہو نہ سکا
یہ فخر کم ہے ترے در پہ بار بار آیا

کسی کا موسمِ گل میں گلِ امید کھلا
مرے نصیب میں داماں تار تار آیا

ملے نہ دشتِ جنوں میں جناب خضر تو کیا
قدم قدم پہ مری رہبری کو خار آیا

کلیم دیکھنا توبہ نہ ٹوٹ جائے کہیں
فضا میں جھومتا پھر ابرِ میگسار آیا

جناب حبیب از کوکشی (دھار)

کسی طرح نہ تری بزم میں قرار آیا
میں اشکبار گیا تھا اور اشکبار آیا

میں اپنی خیر مناؤں کہ آشیانے کی
پھر انقلاب گلستاں میں شعلہ بار آیا

پھر آج جیب و گریباں کی سمت ہاتھ اٹھا
الٰہی خیر ہو پھر موسمِ بہار آیا

شگفتہ گل ہوئے غنچے کھلے ہنسی کلیاں
"خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"

ہوا نہ کوئی سکوں مند راہِ الفت مند
جو آیا عشق کی دنیا میں بیقرار آیا

کسی کی یاد نے تڑپا دیا حبیب مجھے
کسی کا نام مرے لب پہ بار بار آیا

جناب ابوسعید خادم صدیقی تراہویں از جبلپور

دیارِ حسن سے جب عشق کامگار آیا
سکوں نصیب ہوا دل کو کچھ قرار آیا

نگاہِ ساقیٔ مخمور کی کرامت ہے
کہ بے نیازِ مے و جام بادہ خوار آیا

اسی کے قلب سے پوچھو کہ کیا گزرتی ہے
قفس میں رہ کے جسے موسمِ بہار آیا

حرم میں دیر میں گردوں پہ عرشِ اعظم پر
کہاں کہاں نہ تمہیں جا کے میں پکار آیا

الٰہی حاملِ الفت یہ ہو کر حشر کے دن
وہ پوچھیں خادمِ جانباز و جاں نثار آیا

جناب دلبر عثمانی امروہوی

جو میرے آئینۂ دل پہ کچھ غبار آیا
تو پھر صفائی کو فوراً خیالِ یار آیا

وہ اس طریقے سے محشر میں جلوہ آرا تھے
بشر تو کیا ہے خدا کو بھی ان پہ پیار آیا

نہ رازِ عشق چھپا وقتِ نزع کھل ہی گیا
کسی کا نام زباں پر جو بار بار آیا

ہمیں تو اس دلِ صد چاک نے خراب کیا
کسی کی زلف دوتا کو مگر سنوار آیا

دلبر نالوں سے کیوں حشر کر دیا برپا
یہ کس کے وعدۂ فردا پہ اعتبار آیا

جناب سید محمود دالوی

ہر ایک پھول میں نیرنگیاں تجھی سے ہیں
ہر اک چمن میں ترے حسن سے نکھار آیا

تصورات میں سجدے ہزار بار کئے
قدم قدم پہ نظر آستانِ یار آیا

قضا بھی لوٹ گئی پاس سے سرِ بالیں
یہ کس کا نام مرے لب پہ بار بار آیا

ہم انتظار میں سو بار مر کے جی اٹھے
کبھی قرار نہ ہم کو تہِ مزار آیا

حرم میں دیر میں کعبے میں اور کلیسا میں
کہاں کہاں نہ تجھے محمود بھی پکار آیا

جناب سلام ساگری از جبلپور

تمہاری بزم میں یہ کون بیقرار آیا
نگاہِ ناز نے اٹھ کر کہا شکار آیا

چھلکتے جام لئے موسمِ بہار آیا
قسم خدا کی مجھے بے پئے خمار آیا

غضب تھا انجمنِ ناز میں مرا جانا
قرار لے کے گیا اور بیقرار آیا

غرور جسکو نہ آنے پہ تھا تصور میں
وہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار آیا

بڑی امید سے بازی لگائی تھی دل کی
مگر کسی کی محبت میں اسکو ہار آیا

جناب احسن حنیفی دھولیوی

یہ انقلاب گلستاں میں بار بار آیا
"خزاں کا دور گیا، موسمِ بہار آیا"

کسے یقین تیرا موسمِ بہار آیا
ہزار بار گیا تو ہزار بار آیا

الم نصیب جوانی کا یہ خلاصہ ہے
خزاں کے بھیس میں ہنگامِ خوشگوار آیا

غرور کر نہ سکا اپنے حسن پر کوئی
جو انکے سامنے آیا وہ شرمسار آیا

ملا سکون محبت میں کسکو اے احسن
ستم سے باز کہاں وہ ستم شعار آیا

جناب ظاہر بھڑگانوی

نہ کوئی پاس جدائی میں غمگسار آیا
خیالِ یار کے قربان خیالِ یار آیا

کہو کہ طرزِ نوا بلبلیں بدل ڈالیں
خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا

ازل سے حسن و محبت میں اک تعلق ہے
جلی جو شمع تو پروانہ بیقرار آیا

سمجھ کے کعبۂ مقصد جبینِ شوق جھکی
نظر ہمیں جو کہیں نقشِ پائے یار آیا

یہ شوقِ دید کہ میں کوہِ طور پر ظاہر — ہزار بار گیا اور ہزار بار آیا

جناب کلیم سہرامی

جو ابر جھوم کے بالائے کوہسار آیا — پیامِ آمدِ گلہائے نوبہار آیا
غبارِ تربتِ عاشق ہے اُٹھ کے کی تعظیم — وہ فاتحہ کے لئے جب سرِ مزار آیا
سیاہ خانۂ دنیا مقامِ گریہ ہے — چراغ سامنے آیا تو اشکبار آیا
یہ کس نے دی مجھے لبیک کی صدا ہر بار — یہ کس کو میں حرم و دیر میں پکار آیا
حیات و موت ہیں یکساں کلیم اُسکے لئے — نہ زندگی میں جسے ایک دم قرار آیا

جناب خیال قریشی احمد آبادی

نویدِ اہلِ چمن عہدِ خوشگوار آیا — "خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"
وہ بجلیاں ہی گرانے چلے گئے اس پر — جہاں نظر انھیں قلبِ امیدوار آیا
جو بھول کر بھی تسلی نہ دے سکا مجھ کو — وہ آج کیوں مری بالیں پہ اشکبار آیا
ترے وجود کا مجھکو کہیں نشاں نہ ملا — کہاں کہاں میں تجھے ڈھونڈتا پکار آیا
نہ جانے کون سی منزل میں رہ گیا ہے خیال — کہ مضطرب بہت اُڑتا ہوا غبار آیا

جناب قاصر فتح آبادی

ہمارے دل کا تڑپنا ہی ساز گار آیا — کہ آج بزمِ وفا میں وہ بیقرار آیا
چھپا ہوا نظر آیا وہ دل کے پردوں میں — ہزار بار جسے طور پر پکار آیا
مبارک آپ کو حسنِ بیاں کی رنگینی — مجھے بھی آپ کے وعدے پہ اعتبار آیا
ہوا کے جھونکے کو آہٹ ہوئی جو اے قاصر — تو میں یہ سمجھا کہ وہ جانِ انتظار آیا

جناب وفا

کلی پہ روپ، ہر اک پھول پر نکھار آیا — مبارک اہلِ چمن! دورِ ساز گار آیا
سکوں نصیب، دلِ زار کو قرار آیا — خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا
وفا شوق میں پروانے بھی ہیں نوحہ سرا — یہ کون بزمِ محبت میں شمع وار آیا

جناب جانباز کوکشی (دھار)

یہ وقتِ عہدِ محبت میں بار بار آیا — کسی نے عہد کیا دل کو اعتبار آیا
وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں سکوں ملا کہ نہیں — میں دل سے پوچھ رہا ہوں تجھے قرار آیا؟
ہوا نہ جب کوئی پرسانِ غمِ شبِ فرقت — تسلیاں مجھے دینے خیالِ یار آیا

جناب احقر از کرہٹی (باندہ)

ستم سے باز نہ اب بھی ستم شعار آیا — مجھے مٹا کے سرِ قبر سوگوار آیا
کیا تھا طور پہ کل جس نے دعویٰ ارنی — سُنا ہے تیری تجلی سے شرمسار آیا
نگاہِ حضرتِ سیماب کہہ رہے اے احقر — وہ بزمِ تاج میں شاعر کا جاں نثار آیا

جناب شباب دہلوی

برائے سیرِ چمن آج گلعذار آیا — خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا
خیالِ یار تری دلدہی کا کیا کہنا — تیرے بغیر نہ دل کو کبھی قرار آیا
شباب حشر میں آقا نے بخشوا ہی لیا — وگرنہ شور تھا پر سوگنہگار آیا

جناب نصیر از کسولی

خوشا نصیب وہ پروردۂ بہار آیا — مرے جہان میں بھی موسمِ بہار آیا
کسی کے سوزِ دروں کو جگا کے اے بیدرد — ذرا بتا کہ تجھے کس طرح قرار آیا

جناب شارق از اودیپور

جہانِ عشق کی ویرانیاں پہ جائے دوست! — مجھے کبھی نہ یہ ماحول ساز گار آیا
جو بخش دے تو ہیں بندہ نوازیاں تیری — تری جناب میں شارق گنہگار آیا

جناب انجم احمد آبادی

عجب نہیں کہ انا الحق کوئی پکار اُٹھے — زباں پہ اُن کی سرِ بزم ذکرِ دار آیا
نیاز و ناز کی انجم بڑی سند ہے یہی — انھیں عتاب جو آیا تو مجھکو پیار آیا

جناب چودھری صادق علی نوتن بھولیوالی

شگوفے پھولنے پھلنے لگے ہیں از سرِ نو — "خزاں کا دور گیا موسمِ بہار آیا"

جناب عبدالستار خاں قائم گنجوی

کبھی قرار کبھی دل میں انتشار آیا — بدل بدل کے نئی شکل انتظار آیا

جناب اثر بریلوی

نگاہیں عرش سے ٹکرائیں تصور میں — سرِ نیاز میں ہلکا سا جب خمار آیا

جناب گلشن چھاونی نیمچ

سلوک کم نہیں اسکا یہ بعدِ مُردن بھی — چڑھانے اشک کی چادر سرِ مزار آیا

نقد

...ریخی رومان | مرتبہ جناب شبلی بی کام مدیر عالمگیر لاہور۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۹۲ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کا...
...اری۔ قیمت مجلد دو روپیہ چار آنہ ملنے کا پتہ :- نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور۔

جناب شبلی بی کام اُن باخبر سنجیدہ اور خوش فکر ادیبوں میں سے ہیں جن کی تحریر ادبی حلقوں میں زیادہ سے زیادہ پسند کی جاتی ہے اور جن کا مذاق انتہائی ستھرا اور رشح نواز ہے۔ "تاریخی رومان" ۵ تاریخی اور نیم تاریخی افسانوں کا مجموعہ ہے اور جس کا ہر افسانہ بیحد رومان آفریں ہے۔ ان افسانوں کے لکھنے والے پندرہ ... افسانہ نگار ہیں۔ مرتب کی یہ کوشش قابلِ داد ہے کہ اُس نے صرف اچھے اور بلند معیار کے افسانوں ہی کو اس مجموعہ میں لیا ہے۔ یہ رومان پرور تاریخی و نیم تاریخی افسانے اس سے ... بھی متنوع اور رنگا رنگ ہیں کہ ان میں سے کسی کا تاریخی پس منظر ایرانی ہے تو کسی کا ... افسانہ ہندوستان کے دورِ شہنشاہیت کا جاہ و جلال پیش کرتا ہے تو کوئی انگلستان ... کے تاریخی نقوش ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ مجموعہ بہر حال دلچسپ اور فاضل مرتب کی نگاہ رسی کا شاہکار ہے۔

کھنڈر | از جناب طاہر میر تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۷۶ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت مجلد عہ ملنے کا پتہ دار النشر بھاٹی گیٹ لاہور۔

جناب طاہر میر پختہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ یہ مجموعہ اُن کے آٹھ طبعزاد افسانوں پر مشتمل ہے۔ قریب قریب سب افسانے اچھے اور دلچسپ ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ افسانے بے مقصد نہیں ہیں۔ ہر افسانہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی کام کی بات رکھتا ہے ... انداز بیان گو سادہ ہے اور اُس میں شاعری کم ہے لیکن یہ سادگی بھی دلفریب ہے ... دلکش ہے۔ افسانوں میں خشکی نہیں بلکہ شگفتگی ہے اور وہ غیر فطری نہیں معلوم ہوتے ... ہماری گوشت و پوست کی دنیا سے ادا۔

نگارستان | از افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم و مغفور تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۲۵۰ صفحات۔ ...کھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ... ملنے کا پتہ عالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر۔

شاعر آگرہ

سال ... نمبر ۲ ... قصر الادب کا خالص علمی و ادبی ماہنامہ



شاعر آگرہ

زیر سرپرستی

۳۲۰

علم الحروف

بہ ایک دن نہایت اہم ... الہیٰ رباجود (کاٹھیاواڑ) زبانوں کی تخلیق۔ ان میں ترمیم و اصلاح ... آیا۔ دنیا کے تمام ملکوں میں بادشاہوں، عالموں، کاتبوں وغیرہ کے تحقیقی اور تاریخی حالات نیز اُن کی ایجادات اور زبان وغیرہ میں اختراعات۔ دنیا کی ہر زبان کی ابتدا اور انتہا سب کی عکسی تصاویر۔ طرزِ تحریر مشہور کاتبوں کے ہاتھ کی نایاب وصلیاں غرض بڑی جامع اور جامع کتاب ہے۔ قیمت سے ...

انشائے نسواں - یہ کتاب ع۔ ف خانم صاحبہ نے بڑی محنت سے لکھی ہے اس میں عام فہم اردو۔ نسوانی جذبات۔ بیگماتی زبان اور زنانہ لب لہجہ کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ نیز تربیتِ اخلاق کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ خواتین کو خط و کتابت میں ماہر کرنے کے لئے بہترین کتاب ہے۔ سرورق پر خوبصورت تصویر ہے۔ قیمت ۱۲

مقدمہ شعر و شاعری اُردو شاعری پر مفصل و مبسوط تنقید۔ اصنافِ سخن کی مثالیں۔ شاعری کی جدید راہوں اور اس کے تمام پہلوؤں پر تحقیقی اور علمی بحث۔ یہ مولانا حالی کی وہ تصنیف ہے جس کا مطالعہ شاعر کو پختہ کار بنا دیتا ہے۔ قیمت عہ

آیاتِ وجدانی - مرزا یاس یگانہ عظیم آبادی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ جس میں اُن کی زندگی کے حالات کے علاوہ اُن کے کلام پر تبصرہ اور خود اُن کے قلم سے اُن کے اشعار کی توضیح و تشریح ہے۔ آخر میں متفرق کلام ہے۔ حجم ۳۰۴ صفحات بڑا سائز قیمت ...

مکاتیب امیر مینائی یہ کتاب مولوی احسان اللہ خاں ثاقب کی مرتبہ ہے اور اس میں منشی امیر احمد امیر مینائی کے خطوط کے علاوہ اُن کے مفصل حالاتِ زندگی تصانیف و تالیف پر تبصرہ مخصوص تلامذہ کے مختصر حالات۔ مشہور تلامذہ کی غزلوں پر اصلاحیں، نظم و نثر امیر، موازنہ امیر، موازنہ امیر و داغ۔ قطعاتِ تاریخ اور تبصرے ہیں۔ کتاب بڑے کام کی ہے۔ صرف چند جلدیں باقی رہ گئیں ہیں۔ حجم ۳۰۴ صفحات بڑا سائز قیمت ...

طلسم عمل اس کے مطالعہ سے زندگی کی ناکامیاں کامیابیوں سے بدل جاتی ہے گاہکوں کی موہ لینی تجارت کو فروغ دینے اپنے ماتحتوں میں سرگرمی عمل پیدا کرنے لوگوں میں رسوخ پیدا کرنا انھیں اپنی طرف مائل کرنا بہترین تعلقات پیدا کرنا۔ انگریزی زبان میں صرف دو سال میں ۴۴ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اُردو میں دوسرا اڈیشن ہے قیمت مجلد ...

گہوارۂ تمدن - حضرت مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت کا کیا درجہ ہے۔ قیمت ...

(محصول ذمہ خریدار)

...صر الادب دفتر "شاعر" آگرہ

[illegible]

محسنین ادب وشعر

(۱) محسنِ ادب جناب محترم بابو ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی ۵/۶۰ سالانہ
(۲) محسنِ ادب جناب محترم مولوی محمد خانصاحب نیر خورجوی ۵/۶۰ سالانہ
(۳) محسنۂ ادب ہر ہائینس علیہ حضرت گنیانہ والی بیگم صاحبہ آف جوناگڈھ ۵/۶۰ سالانہ
(۴) محسنِ ادب وزیرزادہ شجاعت خانصاحب ظہیر جوناگڈھی ۵/۶۰ سالانہ
(۵) محسنِ ادب جناب لالہ مُرلی دھر صاحب شاد دہلوی منیجنگ ڈائریکٹر لائل بورکان ۵/۶۰ سالانہ
(۶) محسنۂ ادب خطیبۂ ہند زہرۂ سخن سیدہ سردار بیگم اختر حیدرآبادی ۵/۶۰ سالانہ

مربیانِ ادب وشعر

(۷) مربّی ادب جناب محترم سید تفضل کریم صاحب مالک جمشید پور ٹاکیز واسٹار ٹاکیز جمشید پور (ٹاٹا نگر) ۵/۳۰ سالانہ

معاونین ادب

(۸) معاونِ ادب مسٹر اے. بی فلیس صابر بی. اے اکبرآبادی ۵/۲۴ سالانہ
(۹) معاونِ ادب جناب مولوی محبوب حسن خانصاحب آسی متوطن بڈکی (بمبئی) ۵/۲۴ سالانہ
(۱۰) معاونۂ ادب محترمہ تصدق ایم. اے. بی. ٹی مدیرۂ رسالہ "ادیب" دہلی ۵/۲۴ سالانہ
(۱۱) معاونِ ادب جناب صوبہ دار اختر علی صاحب گوالیار ۵/۲۴ سالانہ
(۱۲) معاونِ ادب جناب سید یوسف پر صاحب نیر کیمی بھدراچلم ۵/۲۴ سالانہ
(۱۳) معاونِ ادب جناب مخدوم سید علی اشہد صاحب نقوی البخاری، احمدآباد جھنگ ۵/۲۴ سالانہ

ہمدردانِ ادب

(۱۴) ہمدردِ ادب جناب مولوی عبدالغفور صاحب سلیمان جالندہری ۵/۱۲ سالانہ
(۱۵) ہمدردِ ادب محترمہ بیگم صاحبہ سید کرم علی صاحب تبسم گوالیاری ۵/۱۲ سالانہ
(۱۶) ہمدردِ ادب جناب بابو عبدالعظیم خانصاحب روش دکنی جمشید پور ۵/۱۲ سالانہ
(۱۷) ہمدردِ ادب جناب اسمٰعیل کھوکھو صاحب راز جوناگڈھی ۵/۱۲ سالانہ
(۱۸) ہمدردِ ادب جناب غلام غوث صاحب مالک سورن بیڑی فیکٹری کولار ۵/۱۲ سالانہ
(۱۹) ہمدردِ ادب جناب نوابزادہ نسکوہ حسین خانصاحب قیس آف بینڈو ۵/۱۲ سالانہ
(۲۰) ہمدردِ ادب محترمہ طفیلس جہاں آرا بیگم صاحبہ ریاست نابھہ ۵/۱۲ سالانہ
(۲۱) ہمدردِ ادب جناب محبوب خانصاحب وکیل مدیر "بہارِ سخن" جوپڑہ (خاندیش) ۵/۱۲ سالانہ
(۲۲) ہمدردِ ادب جناب نعمان تاثر صاحب کراچی ۵/۱۲ سالانہ
(۲۳) ہمدردِ ادب جناب سید مظفر حسین صاحب گوہر رئیس (۱۰) رامپور ۵/۱۲ سالانہ

خاصانِ ادب

(۲۴) جناب صاحبزادہ شفیق الرحمان خانصاحب شفق ٹونکی ۶/- سالانہ
(۲۵) جناب عبدالحفیظ صاحب قمر صدیقی چھرادی بی. اے ۶/- سالانہ
(۲۶) جناب سید مظفر حسین عرشی غازی آبادی ۶/- سالانہ
(۲۷) جناب محمد عبید اللہ خانصاحب بزم امروہوی ۶/- سالانہ
(۲۸) جناب لالہ گنگارام صاحب آبد سرہندی ۶/- سالانہ
(۲۹) جناب نذیر احمد صاحب نذیر شیرکوٹی ۶/- سالانہ
(۳۰) جناب صبغۃ اللہ صاحب ارشد صدیقی امروہوی ۶/- سالانہ
(۳۱) جناب پریم چند صاحب پریم دہلوی ۶/- سالانہ
(۳۲) جناب فاتن ہمدانی لدھیانوی ۶/- سالانہ
(۳۳) جناب نظر محمد خانصاحب عارف سیالکوٹی (کوئٹہ) ۶/- سالانہ
(۳۴) جناب سبحان خانصاحب عاقل جیتولی ۶/- سالانہ
(۳۵) جناب اطہر حسن خانصاحب آشتر بمبئی ۶/- سالانہ
(۳۶) جناب سید علی حیدر صاحب عابدی جمشید پور ۶/- سالانہ
(۳۷) جناب سید اشفاق حسین صاحب کوثر نقوی کوٹاہہ ۶/- سالانہ
(۳۸) جناب شبو رشاد صاحب برگ بانڈوی ۶/- سالانہ
(۳۹) جناب حکیم مولوی عبدالرحمان صاحب تاثر کاندھلوی ۶/- سالانہ
(۴۰) علامہ برکت رحو من صاحب ذبانہ کیفی دہلوی ۶/- سالانہ
(۴۱) جناب سید غلام مرتضیٰ صاحب شاعر ہتوروی ۶/- سالانہ
(۴۲) جناب کنور فاروق علیخاں صاحب عارف رئیس میڈو ۶/- سالانہ
(۴۳) جناب مقبول احمد صاحب سحر اعظم گڈھی ۶/- سالانہ
(۴۴) جناب مولوی نظام الدین صاحب نظر راداسی گوردا سپور ۶/- سالانہ
(۴۵) جناب حبیب الرحمان صاحب حبیب اردوی جمشید پور ۶/- سالانہ
(۴۶) جناب عبدالرؤف صاحب ناجی ٹردانی اٹنٹ ۶/- سالانہ
(۴۷) جناب من موہن لال صاحب ساگری چھندواڑہ (سی. پی) ۶/- سالانہ
(۴۸) جناب محمد حسین صاحب خادم شبلوی دہلی ۶/- سالانہ
(۴۹) جناب چودھری حلیم یا بخاصاحب رئیس فتحپور ۶/- سالانہ
(۵۰) جناب سید عنایت مولیٰ صاحب تاباں العلاؤری مدناپور (بنگال) ۶/- سالانہ
(۵۱) جناب شیخ عبدالرحمان صاحب شباب دہلوی ریواڑی ۶/- سالانہ
(۵۲) جناب ملک قربان حسین صاحب فہمید جہلمی بمبئی ۶/- سالانہ
(۵۳) جناب عبدالرؤف صاحب فوق سکریٹری اقبال لائبریری نوادہ گنج (گیا) ۶/- سالانہ
(۵۴) جناب رگھو ندر راؤ صاحب جذب عالپوری ۶/- سالانہ
(۵۵) جناب پنڈت سبحناتھ صاحب کول خادم ایم. ایس. سی. جودھپور ۶/- سالانہ
(۵۶) جناب محمد اکرام اللہ صاحب سہا قریشی ایڈووکیٹ بھنڈ گوالیار ۶/- سالانہ
(۵۷) جناب منشی ایم. آر شاہ صاحب ایچ. پی. ٹی (آنرز) پنجابی و پشتو) انبالہ ۶/- سالانہ
(۵۸) جناب خادم حسین صاحب خادم زیبائی جبلپور ۶/- سالانہ
(۵۹) جناب لائبریرین صاحب پبلک لائبریری میسور ۶/- سالانہ
(۶۰) جناب شیخ محمد احمد صاحب ناز ٹن پڑنا بگوڑھ ولد حاجی محمد صنو صاحب تپس پرتاب گڈھ ۶/- سالانہ

(بقیہ صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ کیجئے)

شعرِ انقلاب

شاعر اور جنگ

الا یا ایہا الشاعر! اسیرِ حسنِ ظن ہے تو
ہو کوئی حال لیکن اپنی ہی دُھن میں مگن ہے تو

سماعت سوز طیاروں کی ہیں پُرہول آوازیں
مگر اک لحنِ دل آرا سے سرگرمِ سخن ہے تو

سخن کی محفلیں جاگی ہوئی ہیں تیرے نغموں سے
بدستور اپنے اندازِ کہن میں نغمہ زن ہے تو

تجھے شاید نہیں معلوم اپنا معنوی منصب
کہ شاعر ہی نہیں، پیغمبرِ دورِ فتن ہے تو

خیالوں کے ذریعے، رہنمائی کام ہے تیرا
قلم کے واسطوں سے قائدِ اہلِ وطن ہے تو

تری "رنگین غزلیں" قوم کے کیا کام آئینگی؟
یہی ہے رنگ اگر تیرا، تو ننگِ علم و فن ہے تو

تری یہ شاعری، تہذیبِ باطن کر نہیں سکتی
نہیں اہلِ سخن، اہلِ سخن کا پیرہن ہے تو

صدا جسکی ضمیرِ قوم میں جھولے، وہ شاعر ہے
جو کانوں میں اُتر کر روح کو چھولے، وہ شاعر ہے

یہ جلسے شعر کے، یہ رات بھر نغمہ سرا ہونا
یہ ہر اک شعر پر، پیہم صدائے "مرحبا" ہونا

"تغزّل" میں یہ جنسیات کی جذبوں ... عریانی
یہ رازِ خلوت و ناموس کا عقدہ کشا ہونا

"رباعی" میں برنگِ فلسفہ تذلیل مذہب کی
بصد آزادیِ تخیّل، بیزارِ خدا ہونا

ذرا کر غور، کیا یہ وقت ہے تخریب کاری کا؟
ذرا یہ سوچ، کیا انجام ہے اس کام کا ہونا

یہ دورِ انقلاب، اور یہ تری وارفتہ سامانی!
تجھے تو چاہیے اس دورِ نو کا ناخدا ہونا

تو شاعر ہے، تری آواز ہے پیغامِ مستقبل
تجھے زیبا نہیں ہے سدِّ راہِ ارتقا ہونا

جو قدرِ وقت جانے تو، جو میری بات مانے تو
تو اب بھی عین ممکن ہے بھلا کرنا، بھلا ہونا

وہی اشعار پڑھ، جن سے فضا تیار ہو جائے
وہی نغمہ سنا، جس سے وطن بیدار ہو جائے

اپریل ۱۹۴۳ء

سیماب اکبرآبادی

صفحۂ جنگ

(نفسیاتی اشارات)

ہے حاصلِ سعیٔ کار بے تاثیری
ثابت ہوئی انساں کی زبوں تدبیری
با ایں ہمہ، دُنیا کے پرستاروں میں
باقی ہے ہنوز حرصِ دنیاگیری

بڑھتی ہوئی قوموں کو زمانہ نہ دیا
گرتی ہوئی ملت کو سہارا نہ دیا
دُنیا کے لئے ہوگئے لاکھوں برباد
دُنیا نے مگر ساتھ کسی کا نہ دیا

جاپانی بھی جوش میں ہیں اور جرمن بھی
اور ہوش میں ہے سیاستِ لندن بھی
اس ہوش اور جوش کا نتیجہ کیا ہے؟
ہے ہوش ربا بھی جنگ، جوش افگن بھی

ہر واقعہ، غور و فکر کے قابل ہے
آندھی اور زلزلے! - بڑی مشکل ہے
بے فصل کے بارش اور ژالہ باری!
فطرت خود انقلاب پہ مائل ہے

فطرت جو شریکِ جنگ ہوجائیگی
سائنس کی عقل دنگ ہوجائیگی
جوش آگیا رحمتِ الٰہی میں اگر
یہ جنگ بدل کے چنگ ہوجائیگی

اپریل ہے — اور وہی بُرودت باقی
ہے موسمِ سرما کی طراوت باقی
سورج زادوں کی گرمجوشی معلوم!
"سورج" میں بھی اب نہیں حرارت باقی

میخوار ہے، خود پرست ہے. فاسق ہے
گھنگرو ہے گلے میں؛ اور جگر میں دق ہے
ہونٹوں پہ دھڑی. گال پہ بکھری ہوئی بال
اے صلِ علیٰ! یہ شاعرِ مشرق ہے!!

بے وقت کی شہنائی ہیں اس کے افکار
دن کو سوتا ہے اور ہے شب بیدار
اُمیدِ عروج اس سے رکھنی ہے فضول
شاعر ہے زوالِ قوم کی پیداوار

لندن میں مباحثے ہوا کرتے ہیں
رشیا میں مناظرے ہوا کرتے ہیں
اور ہند کی پوچھو، تو یہاں کچھ بھی نہیں
دن رات "شاعرے" ہوا کرتے ہیں

جیسے پرچے پہ ہوں مناظر پیدا
ہوتے رہتے ہیں روز شاعر پیدا
ہوجاتے ہیں جب ہزار شاعر ناپید
ہوتا ہے کہیں ایک مفکر پیدا

سیماب

جرعات

یومِ عبدالحق کے سلسلے میں "بزمِ نشرِ اردو بھوپال" کی طرف سے جو تحریک کی گئی تھی وہ کامیاب ہوئی یا ناکامیاب، یہ ایک بالکل جداگانہ چیز ہے جہاں تک نفسِ تحریک کا تعلق ہے اس سے اختلاف کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کوئی باخبر شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اردو کی ترویج اس کی نشر و اشاعت اور اُسے سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے میں ایک منظم کوشش اور عزم سے کام لیا ہے۔ اُن دیگر دراز صوبوں میں بھی جہاں اُردو زبان کو ثانوی حیثیت حاصل ہے انجمن ترقی اردو نے اپنی شاخیں قائم کر کے اُردو کا عام ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یہی نہیں بلکہ انجمن نے مختلف موضوعات پر اُردو کی بہت سی ٹھوس اور مفید کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ غرض مولوی عبدالحق صاحب کی بیدار دماغی اور انتھک مساعی نہ آج قابلِ فراموش ہو سکتی ہیں اور نہ مستقبل میں۔ اب رہا "یومِ عبدالحق" کی تحریک سے اختلاف تو یہ آواز اُنھیں رسائل، اخبارات اور ارباب ادب کی ہے جو ذاتی طور پر ڈاکٹر صاحب سے اختلاف رکھتے ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ اُن کا مسلک مُردہ پرستی ہے وہ کسی بڑی شخصیت کی زندگی میں اس کے کمالات اور خدمات کا اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔ علمی، ادبی حلقوں اور اُردو داں طبقوں میں تنگ دلی اور تنگ نظری کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی کی خدمات کا اعتراف بھی نہیں کر سکتے۔

مجھے بعض اربابِ نظر کے اس اعتراض سے اتفاق ہے اور میں اسے اراکینِ بزمِ نشرِ اُردو کی غفلت پر محمول کرتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کو اُردو کی ترویج و ترقی کا سب سے بڑا علمبردار اور محسنِ اعظم قرار دے کر ایک حدِ امتیاز قائم کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس دور میں اور بھی کئی ایسی جلیل القدر شخصیتیں اور ادارے موجود ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے اُردو زبان کی خدمت اور ترویج میں مولوی صاحب سے پیچھے نہیں۔ جب خدمت کی نوعیتیں جداگانہ ہیں مگر نوعیتیں اور کام اثر یکساں تو ایسی حالت میں کوئی حدِ امتیاز قائم نہیں کی جا سکتی اور اگر ایسا کیا جاتا ہے تو یہ دوسرے خدمت گذاروں کی دل آزاری کا باعث ہوگا۔ ادارۂ "شاعر" فراخدلی کے ساتھ "بزمِ نشرِ اُردو بھوپال" کی تحریک پر اظہارِ مسرت کرتا ہے اور متمنی ہے کہ وہ اُردو زبان و ادب کے دوسرے خدمت گذاروں کی یادگاریں منانے کا بھی انتظام کرے گی اور ہندوستان کے ذوقِ مُردہ پرستی کو اپنی ٹھوکروں کی ضربوں سے پاش پاش کر دیگی۔

دو تین مہینے سے "شاعر" پھر بے تاخیر شائع ہو رہا ہے۔ جو لوگ تاخیر کے داخلی پہلوؤں اور مشکلات پر نظر رکھتے ہیں وہ اس کی شکایت نہیں کرتے مگر بعض حضرات اس سلسلے میں بار بار لکھ کر ادارہ کو خواہ مخواہ مجبور فرماتے ہیں۔ "شاعر" کے ناظرین یقین فرمائیں کہ "شاعر" کو وقت پر لانے کی امکانی کوشش کی جا رہی ہے

زیرِ نظر اشاعت کے مضامین میں حضرت بہار کوٹی کا مضمون "دورِ حاضر کی ایک ہندی شاعرہ" اُن کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ہندی زبان کے شعرا اور شاعرات پر اُردو زبان میں تبصرہ بین الاقوامی حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور معلومات آفرینی میں تو شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ "شاعر" کی آئندہ اشاعت میں ہندی زبان کے مشہور جرنلسٹ سیّد قاسم علی صاحب کا ایک مضمون اسی موضوع پر آ رہا ہے اور اس میں ہندی کی متعدد مشہور شاعرات کا ذکر ہے۔ "اُردو ادب کے نئے رجحانات" "مدیر شاعر" کا ایک ادبی مطالعہ ہے۔ اختلاف و اتفاق کی راہیں تو ہر چیز کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ مگر ابتک جن دو ادبی اجتماعات میں یہ مضمون پڑھا گیا اُن میں عام طور پر پسند کیا گیا۔ اس اشاعت میں افسانے ہر اشاعت سے زیادہ دیئے جا رہے ہیں۔ شاید افسانوی ادب پسند کرنے والوں کے پیہم تقاضوں کا بوجھ اس طرح ہلکا ہو سکے۔ گذشتہ اشاعت کے حصۂ نظم نے ہر طرف سے خراجِ تحسین حاصل کیا ——— میرا خیال ہے کہ تازہ اشاعت کا حصۂ نظم پچھلی اشاعت سے بھی زیادہ بلند اور وسیع ہے یہی نہیں بلکہ مقدار بھی بہت زیادہ ہے۔ منظومات کے سلسلے میں "شاعر" کو ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ تعلّی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اس وقت بھی سیکڑوں اچھی نظمیں اور غزلیں اشاعت کے لئے آئی ہوئی ہیں۔ مگر "شاعر" کی کوتاہ دامنی کا کیا علاج ہے۔

دو محسنین کا سرِ فہرستِ محسنین "اضافہ "شاعر" کی بڑھتی ہوئی شہرت و مقبولیت اور اس کی ٹھوس خدمات کا بیّن ثبوت ہے۔ اس میں اُن علم دوست اور ادب نواز ہستیوں کے جذبۂ ایثار و خدمت کو بھی بہت بڑا دخل ہے جنھوں نے "شاعر" نوازی فرمائی۔ ادارہ **محترمی جناب لالہ مرلی دہر صاحب شاد دہلوی** جنگ گڑھ ایئر کنڈ لائل پور کاٹن ملز اور **خطیبۂ ہند، زہرۂ سخن محترمہ نواب سیدہ رابعہ اختر** حیدر آبادی کا بیحد ممنون ہے۔ لالہ مرلی دہر صاحب شاد دہلوی۔ وحیدالدہر حضرت بیخود دہلوی کے شاگرد، خوش فکر شاعر، علم دوست، ادب نواز اور بڑے مخیّر انسان ہیں ——— زہرۂ سخن سیدہ اختر حیدر آبادی کے متعلق کیا لکھوں۔ فطرت نے ان میں اتنی خوبیاں جمع کر دی ہیں کہ وہ خواتین میں شاید اپنی مثال آپ ہیں۔

"شاعر" اس نازک ترین دور میں ترقی کی لا متناہی منزلوں کی طرف تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ یہ بڑی قابلِ مسرت بات ہے کہ "شاعر" کے ہر گرامی خریدار کو اس کی توسیع اشاعت کا خیال ہے۔ ذیل میں جو فہرست دی جا رہی ہے اس کی تابناکی کا اندازہ لگایئے۔ "شاعر" کے مقاصد کو تقویت پہونچانے والے دراصل اُردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام جلی حروف میں لکھوا رہے ہیں۔

(فہرست طویل ہے اس لئے آئندہ شائع ہوگی)

اعجاز صدیقی

دورِ حاضرہ کی ایک ہندی شاعرہ

(مہادیوی ورما بی۔ اے)

کسی ہندی شاعر یا شاعرہ کے کلام پر فنی نقطۂ نظر سے قلم اٹھانا اسے بھاؤ۔ رس ہن بھید کی کسوٹی پر کسنا، اس پر سنچاری اور استھائی بھاؤں۔ ان کے تینتیس بھیدوں اور بھر رسوں (شری نگر۔ ہاس۔ کرن۔ اودر۔ ویر۔ بھیانک۔ ربھتس۔ ربھت۔ شانت) کے اعتبار سے ماہرانہ تبصرہ کرنا یقیناً میرے لئے آسان نہیں۔ اور نہ میں اس کا مدعی کہ میں نے مہادیوی کے کلام کو ہر پہلو سے جانچا ہے

ہندی شاعری میں جس طرح متقدمین و متوسطین میں بردائی چھبیہ تلسی داس چوپائی۔ سورداس بدیہ۔ بہاری دوہہ۔ گردھر کنڈلی۔ پدما کر دھنا کچھری چھند کے لئے مشہور ہیں۔ متاخرین میں پرشاد نیچرل مالکھن لال چترویدی قومی سمترانندن رومانی اور سوکانت ترپاٹھی اور مہادیوی ورما متصوفانہ و فلسفیانہ شاعری کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ اردو کے برخلاف ہندی شاعری میں رومان کا عنصر کچھ مدھم ہے اور اس صنف میں بہاری کیشو۔ متی رام۔ دیو۔ پدماکر اور ہریش چندر کا کلام مابہ الامتیاز ہے۔

فارسی اور اردو تغزل اور ہندی کی رومانی شاعری اور شرنگار رس میں کیا تفاوت ہے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندی شاعری میں اردو کی نسبت تمثیل و محاکات کا عنصر غالب ہے۔

کیشو کا شعر ہے ؎

کیشو کیسن اہس کری جس ادہن نہ کرائیں
شاعر کا نام بال ایسا کیا جیسا دشمن بھی

چندر بدن مرگ لوچنی بابا کہہ کہہ جائیں
ماہ پارہ (حسین) حسین جمیل عورت

(کیشو ان بالوں نے مجھ پر وہ ظلم کیا ہے کہ دشمن بھی نہ کرتا (میرے سفید بالوں کو دیکھکر) حسین و نوخیز عورتیں مجھے "بابا" کہہ کر پکارتی ہیں۔)

رس خان کا شعر ہے :-

بانھ چھڑائے جات ہو نبل جان کے موئے
بازو جاتے ہو کمزور مجھے

ہردے سے جب جاؤ تو مرد بدوں میں توئے
دل سمجھو تجھے

(مجھے کمزور سمجھکر بازو چھڑا کر چلے تو جا رہے ہو میں تمہیں بہادر اسی وقت سمجھونگی جب میرے دل سے بھاگ چھوٹو گے)

متی رام کا شعر ہے :-

نین جور مکھ موا ہنس نیسکھ نیہ جائے
نظر آنکھ ملاکر منہ پھیر کر ہنسکر دل پرچھاکر

آگ لین آئی ہتے، ہیرے گئی لگائے

(وہ آگ لینے آئی تھی لیکن نظر ملا کر منہ پھیر کر مسکرا کر میری رگ رگ میں آگ بھر گئی)

اردو شاعرات کے برخلاف ہندی شاعرات انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ متقدمین میں میرا بھائی اور دیا بائی متاخرین میں مہادیوی ورما قابلِ ذکر ہیں۔ اردو شاعرات کی کثرت ادبِ اردو کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہونچا سکی یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندی ادب سے میرا اور مہادیوی کا کلام خارج کردینے کے بعد ہندی شاعری کی تنگی بڑی حد تک محسوس کی جاسکتی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ میرا اور مہادیوی ایک طرف اور ہماری تمام شاعرات ایک طرف۔ شاید اس صورت میں بھی پلڑے برابر نہ رہیں۔ مجھے اتنی فرصت نہیں کہ میں اس حقیقت کے اسباب و علل پر غائر نظر ڈالوں۔ یہ کہنا کہ ہماری خواتین کو شاعری کا صحیح مذاق ودیعت نہیں ہوا ظلم ہوگا شاید ان کی شاعری اس لئے پروان نہ چڑھ سکی اور ان کے افکار اس لئے صنفِ کم از سمجھے گئے کہ ان کی شاعری کا پس منظر محدود ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی فطرت کے منافی تھا۔ ان کی نسائیت ان بھڑکی ہوئی بلکہ عریاں جذبات کے اعلانیہ اظہار کی متحمل نہ ہوسکی جو کچھ عرصے پہلے۔ (بلکہ بعض حلقوں میں اب بھی) شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے تھے وہ فارسی شاعری کا کھلے خزانے تتبع نہ کرسکتی تھیں۔ صنائع بدائع کے بکھیڑوں میں الجھنے کی انھیں فرصت نہ تھی اور جنھوں نے اپنی نسائیت کو مجروح بھی کیا (یعنی مبتذل رکیک اور سوقیانہ شعر لکھے اور کہہ رہی ہیں۔ میں ان کا نام لے کر ہدفِ تشنیع نہیں بننا چاہتا اور نہ مثال میں ان کے اشعار پیش کرنے کی جسارت کرونگا) اور اپنی لطافت کو کثافت سے دوچار ہونے دیا، ان کی

..بازاری اس لئے نہ ہو سکی کہ ثقات یا ہماری ادبی سوسائٹیوں نے اُن کے اقدام کو
..شائستہ حرکت سے تعبیر کیا اور اُن کے کارناموں کو بنظر استحسان نہ دیکھا ——
..ش ان میں ابتکارانہ قوت اور افتراقنا اسپرٹ ہوتی اور اگر وہ مہادیوی نہیں تو کم سے کم
..ا بن سکتیں۔ میں جانتا ہوں کہ دورِ حاضر کی بعض شاعرات جن کا کلام ملک
..جرائد و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے (بشرطیکہ اس پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق
..ہو) ابھی استعداد و صلاحیت رکھتی ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اپنی "نوائے کارگر" سے
..نیائے شعر و ادب کی کایا پلٹ کر دیں۔

مقامِ حیرت ہے کہ ہماری خواتین کے برعکس ہندی کی تمام شاعرات تصوف و معرفت
..ن دلدادہ ہیں۔ وہ

"دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں"

کا راگ الاپتی سنائی دیتی ہیں —— اُن کا ایمان ہے۔ "انجمن بے شمع ہے۔ گر برق
خرمن میں نہیں"۔ ان میں سے ہر ایک پکار پکار کہہ رہی ہے ؎

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

میرا کی :-

گھائل سی گھومت پھروں مرا درد نہ جانے کوئے
ہے ری میں تو پریم دوانی مرا درد نہ جانے کوئے
سولی اوپر سیج ہماری کس بدھ سونا ہوئے
درد کی ماری بن بن ڈولوں وید ملیا نہیں کوئے
میراں کی پربھو پیر مٹے گی جب وید سنولیا ہوئے

..دالی شاعری ہندی لٹریچر سے بھلا کیونکر محو کی جا سکتی ہے۔ خیر میرا تو بڑی چیز ہے
سہجو بائی اور دیا بائی جیسی گمنام شاعرات کا ایک ایک شعر سنئے :-

سہجو بائی ؎ سیس کان مکھ ناسکا اونچے اونچے ناؤں
سہجو نیچے کارنے سب کوئی پوجے پاؤں

(حالانکہ پیشانی، کان، منہ، ناک اونچے ہیں، لیکن پاؤں ہی چومے جاتے
ہیں اس لئے کہ وہ نیچے ہیں۔ یعنی خاکساری عروج دیتی ہے۔)

دیا بائی ؎

بوری ہو چتوت پھروں ہری آویں کہی اور
چھن اٹھوں چھن گر پروں رام دکھی من مور

(میں دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر یہ دیکھتی پھرتی ہوں کہ میرا محبوب کس سمت
سے آ رہا ہے، کبھی اٹھتی ہوں کبھی گرتی ہوں۔ خدایا میرا دل دکھی ہے۔)

شیکسپیئر کہتے ہیں

The lunatic, the lover and the poet, Are of imagination all compact

(پاگل، پریمی اور شاعر کے تخیلات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔)

کا صحیح اطلاق ہندی شاعرات پر ہوتا ہے۔ میرا کو کرشن کی چھب نے لوٹا اور مہادیوی
"حسنِ خود بیں" کی جستجو میں گم ہے۔ وہ محبت کرتی ہے اور بے پناہ لیکن کس سے یہ بتانا
آسان نہیں، اُسے تلاش ہے اور انتھک لیکن کس کی یہ وہی جان سکتی ہے۔ اُسکی
محبت اتھاہ اور اسکی جستجو امیٹ ہے۔ اس کے یہاں جنون ہے اور بے پایاں تڑپ اُسکی
بے اور بیکراں۔ وہ اس دنیائے آب و گل سے بہت اوپر اڑ کر لامحدودیت کا
نغمہ الاپتی ہے۔ وہاں تک پہونچ جانے کی حسرت اور نہ پہونچنے کی تشویش اُسے
رلاتی رہتی ہے ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے پہ مجبور ہے

قیس کہتا تھا ؎

أَلَا أَيُّهَا الْقَلْبُ الَّذِي لَجَّ هَائِمًا
فَلَيْدَا بِلَيْلَىٰ لَمْ تَقْطَعْ تَمَائِمُهُ

(میں لیلیٰ کے عشق کے بھنور میں اسی وقت پھنس گیا تھا جب بچہ تھا
اور میرے گلے کی تعویذ بھی نہ کٹی تھی۔

لیکن مہادیوی روزِ ازل ہی سے گرفتارِ محبت ہے ؎

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

سُنئے ؎ دُور انجیں نیلم کُووں پر پیٹرا کا سلے جھینا تار
ابھواسوں کی گونتھی مالا میں نے پائی تھی اُبچار

یہ وہی "نیلم کو لے" ہیں جن کی آرزو غالبؔ نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

کہتی ہے ؎

اُس سونے کے سپنے کو دیکھے کتنے یُگ بیتے
جگ گذرے

آنکھوں سے کوش ہوتے ہیں موتی برسا کر دیتے
پیالے خالی

اپنے اس سونے پن کی میں ہوں رانی متوالی
پرانوں کا دیپ جلا کر کرتی رہتی دیوالی
جان چراغ

میری آہیں سوتی ہیں ان ہونٹوں کی اوٹوں میں
میرا سرِ دیس چھپا ہے ان دیوانی چوٹوں میں
کائنات

آہوں کا ہونٹوں کی اوٹ میں سونا۔ شاعرہ کی تمام کائنات کا "دیوانی چوٹوں" میں پنہاں ہونا کتنا حسین انداز بیان ہے۔ ایذا طلبی ملاحظہ ہو:-

چِنتا کیا ہے ہے زرمم بجھ جائے دیپک میرا
فکر ظالم چراغ
ہو جائیگا تیرا ہی پیڑا کا راج اندھیرا
درد

(مجھے مرنے کا غم نہیں۔ غم تو یہ ہے کہ تیرے درد کی دنیا ویران ہو جائیگی یعنی شاعرہ کے بعد کوئی حریف مئے مرد افگنِ عشق باقی نہ رہیگا۔)

غالب نے خوب کہا ہے ؎

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

بودلیر (Boudelaire) کہتا ہے:-

"شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس بنہایت، تر بذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ اختلالِ خیالات واقع ہوتا ہے۔ خیالات میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہو جاتا ہے، آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نغمہ پیدا ہوتا ہے۔"

غالب اسی مقام سے کہتا ہے:-

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
گرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

سمجھا ہے گرنہ سنئے نالہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

مہادیوی انھیں منازل سے گذر رہی ہے۔ اس کی نظر ابدی حجابات کی تہوا۔ دقعال ہے۔

کہتی ہے:-

دلوک یہاں لٹتا ہے، بجھ جاتے ہیں تارا گن
جو سماوی تارے
اویرام جلا کرتا ہے پر میرا دیپک سامن
مسلسل
جسکی وشال چھایا میں جگ بالک سا سوتا ہے
وسیع
میری آنکھوں میں وہ دُکھ آنسو بن کر کھوتا ہے
جگ ہنس کر کہہ دیتا ہے میری آنکھیں ہیں نردھن
تہی دست
ان سے برسائے موتی کیا اب تک پایا وہ گن
میری گھنا پر آتی جس دیولوک کو کریڑا
حالِ زار دنیا کھیل
اُن کے پرانوں سے پوچھو وہ پال سکیں گے پیڑا

اجرام فلکی کا قافلہ لٹ جاتا ہے ستاروں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں، لیکن مہادیوی کا دیپک سامن مسلسل جلتا رہتا ہے۔ درد آنسو بن کر اس کی پلکوں پر آتا ہے اور اُس کی وسیع چھاؤں میں دنیا معصوم بچے کی طرح محوِ خواب ہو جاتی ہے۔ لوگ اُسے طعنہ دیتے ہیں کہ اُسکی آنکھوں میں آنسو نہیں رہے۔ انھیں کیا معلوم کہ یہ آنکھیں کتنے موتی برسا چکی ہیں۔ جو اُس کے حالِ زار کا مضحکہ اڑاتے ہیں، کیا وہ بھی محبت کا روگ پال سکتے ہیں؟

اقبال نے کہا تھا ؎ آہ اُمیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ اس سازِ دلِ مضراب کی کھائی نہ کبھی

مہادیوی اس "مضراب" کی چوٹیں دن رات کھاتی ہے اور مسکراتی ہے۔ وہ اس درد کی دنیا کو اپنی ہستی میں جذب کر لینا چاہتی ہے۔

جب اسیم سے ہو جائیگا میری لگھو سیما کا میل
مختصر حد لامحدود

دیکھوگے تم دیو امرتا کھیلے گی مٹنے کا کھیل
حیاتِ ابدی

یعنی جب میرا ناکارہ وجود لامحدودیت میں گم ہوجائیگا تو تم دیکھوگے کہ ابدیت فنا کا کھیل کھیل رہی ہے یعنی ابدیت خود مائل بہ فنا ہے۔ شاید مہادیوی یہ کہنا چاہتی ہے کہ اس کی حقیر ہستی میں وہ قوی جذب ہے کہ ابدیت بھی اس میں محلول ہوجانا چاہتی ہے غالب نے شاید ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یہاں

سے انھیں تاثرات کی ترجمانی کرنا چاہتی ہے۔

مہادیوی بھی اُسی دشت کی سیاح ہیں جہاں پہونچکر غالب نے کہا تھا ؎

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے کہ مجھکو جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

اسکی نگاہ میں دنیائے آب و گل کی ہر چیز غیر وقیع اور ناپائدار ہے کہتی ہے۔

نہ رہتا بھونروں کا آہواں نہیں رہتا پھولوں کا راج
گونجنا
کوکلا ہوتی انتر دھیان چلا جاتا پیارا رت راج
کوئل غائب موسمِ بہار

اسمبھو ہے چر سمیلن
ناممکن زیادہ عرصہ تک یکجائی
نہ بھولو چھن بھنگر جیون
جلد فنا ہوجانیوالی زندگی

دیکھے مرجھانے کو پھول اُدے ہونا چھپنے کو چند
کھلتے طلوع چاند
شونیہ ہونے کو بھرتے میگھ دیپ جلتا ہونے کو مند
خالی بادل چراغ گل

یہاں کس کا اننت یون
لافانی جوانی
ارے استھر چھوٹے جیون
بیقرار

یعنی بھونروں کی گونج اور پھولوں کی سلطنت ختم ہوجائیگی۔ بہار کے سہانے موسم کے ساتھ کوئل غائب ہوجائیگی۔ اِن کی یکجائی لاعید دوام ممکن نہیں۔ متلون زندگی پر نظر ڈالو۔ پھول مرجھانے اور چاند چھپنے کے لئے طلوع ہوتا ہے بادل خالی ہونے کے لئے پانی سے پُر ہوتے ہیں۔ چراغ بجھنے کے لئے جلتا ہے۔ دُنیا میں کسی کا شباب دیرپا نہیں۔

غالب نے اس احساس کی ترجمانی اس طرح کی ہے:۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

مختصر یہ ہے ؎ "دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے"

غالب کی "بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہئے" والی آرزو مہادیوی کو بھی بیقرار رکھتی ہے وہ اس انوکھے سنسار کی تمنا ان حسرت بھرے الفاظ میں کرتی ہے۔

جہاں کے نربھر زوگان سناکرتے امرتو پردان
آبشار سکوں پرور حیاتِ جاوید بخشنے والے
سناتا بنھ اننت جھنکار بجا دیتا ہے سارے تار
آسمان ابدی نغمہ

بھرا جس میں اسیم سا پیار
لامحدود

کون پہونچا دیگا اُس پار
پُشپ میں ہے اننت مکان تیاگ کا ہے ماروت میں گان
پھول لاانتہا خوشبو خود فراموشی فضا
سبھی میں ہے سورگیہ وکاش وہی کومل کمنیہ پرکاش
فردوسی نزہت لطیف جمیل تجلی

دور کتنا ہے وہ سنسار

یعنی کاش مجھے کوئی اُس سنسار میں پہونچادے، جہاں کے جھرنوں میں حیاتِ جاوید بخش دینے والے اور سکوں پرور نغمے ہیں اور جہاں کی فضا سرمدی ترنم سے معمور ہے جہاں محبت ہی محبت ہے جہاں ایسے پھول کھلتے ہیں، جن کی خوشبو ابدی ہے اور جہاں کی ہوا بھی موسیقی سے لبریز ہے جو ملاّق دنیاوی سے بے خبر کردے، جہاں کے ہر چیز میں فردوسی نزہت ہے اور جہاں تجلیاں ہی تجلیاں ہیں۔

مہادیوی کی غم دوستی کا عالم ملاحظہ ہو۔ اُس نے غالب کی طرح درد لادوا میں اپنے درد کی دوا تلاش کی ہے۔ محبوب کی کرم پاشیاں اسکی روح کو

سکوں نہیں بخشتیں، وہ درد کی دنیا میں اپنے محبوب کو ڈھونڈنا چاہتی ہے اور
سو وقت تک ڈھونڈتی ہے جب تک اُسے یہ نصیب نہ ہو جائے کہ اسکا محبوب سراپا
درد بن گیا ہے۔

لکھتی ہے:—

چاہے جرجر تاروں میں اپنا مانس اُلجھا دو
کمزور ذہن
ان پلکوں کے پیالے میں سکھ کا آنسو چھلکا دو
میرے بکھرے پرانوں میں ساری کرُنا ڈھلکا دو
جانِ مضطرب رحم
میری چھوٹی سیما میں اپنا استیتو مٹا دو
حد وجود
پرشیش نہیں ہوگی یہ میرے پرانوں کی کریڑا
ختم کھیل
تم کو پیڑا میں ڈھونڈا تم میں ڈھونڈونگی پیڑا
درد

یعنی۔ خواہ تم ستاروں کے روپ میں جلوہ گر ہو خواہ میری آنکھوں کو خوشی کے
آنسوؤں سے بھر دو، خواہ میری مضطرب روح میں رحم و کرم کی بارش کر دو۔
خواہ خود میری حقیر ہستی میں جذب ہو جاؤ۔ میری روح کی تشنگی نہ مٹے گی۔ اس لئے
میں نے عالمِ درد میں تمھیں ڈھونڈا تھا اور اب تم میں درد ڈھونڈونگی۔
پیڑا میں ڈھونڈا تم کو میں ڈھونڈونگی پیڑا۔ کتنا بے پناہ ٹکڑا ہے۔
اختلاط کے راز و نیاز کے ذکر پر مہادیوی کی سہیلی کہتی ہے کہ یہ تو سب
خواب کی باتیں ہیں۔ مہادیوی اسے یقین دلانے کے لئے عجیب و غریب دلائل
پیش کرتی ہے:—

کیسے کہتی ہو سپنا ہے
اس ملوک ملن کی بات
خلوت
بھرے ہوئے اب تک پھولوں میں
میرے آنسو اُن کے ہاس
مسکراہٹ

یعنی اے سکھی تم میری اور اُن کی ملاقات کو خواب و خیال سے کیوں
تعبیر کرتی ہو تم نہیں دیکھتیں کہ پھولوں میں اب تک میرے آنسو اور اُن کا رنگین
تبسم بھرا ہوا ہے۔

وصل کی کتنی حسین شہادت ہے

مہادیوی کے حالات زندگی پر انشاء اللہ آئندہ فرصت میں روشنی ڈالونگا۔

بہار کوٹی

تبدیلی

گناہگارِ محبت ہوں یہ نصیب کہاں؟ ترے بہشتِ شبستاں میں آ ؤنگا نہ کبھی
میں بھول کر بھی نہ چھیڑونگا التجا کا رباب تجھے حجاب کا پیکر بنا ؤنگا نہ کبھی
طویل راتوں کی تاریکیوں کے سائے میں چراغِ ساغرِ زریں جلا ؤنگا نہ کبھی
تجھے جو خلوتی لمحات میں پسند نہیں وہ اُلجھی اُلجھی کہانی سنا ؤنگا نہ کبھی
اگر اجازتِ بے باکیٔ نگاہ نہیں میں تیری سمت نظر بھی اُٹھا ؤنگا نہ کبھی
یہ دستِ شوق نہ اُلجھے گا گیسوؤں سے ترے یقین کر تجھے بیدرد جگا ؤنگا نہ کبھی
تری زبان سے سنونگا نہ بیکسی کا گلہ شکستِ شوق پہ آنسو بہا ؤنگا نہ کبھی
تری حسین جبیں پر بہ التہابِ شباب میں تھرتھراتے لبوں کو جھکا ؤنگا نہ کبھی
طلسمِ وہم و گماں ہے اگر نگاہِ کرم میں اس نگاہ کے دھوکے میں آ ؤنگا نہ کبھی
ترے شباب کی رنگین وادیوں کے قریب وقارِ ہستی و مستی لٹا ؤنگا نہ کبھی

یہ آج عشق کی فطرت میں انقلاب بھی دیکھ
ہزار شکووں کا اک مختصر جواب بھی دیکھ

موج بی۔اے (علیگ)

اُردو ادب کے نئے رجحانات

(مدیر "شاعر" نے یہ خطبۂ صدارت ۱۱ مارچ کو متھرا کے ایک مشاعرہ میں پڑھا)

بزرگو۔ دوستو اور بھائیو!

اسے اپنی ذات سے محبت کرنے والوں کی ستم ظریفی نہ کہوں تو اور کیا کہوں کہ میری بے مائیگی اور گوناگوں علمی و ادبی اور کاروباری معروفیتوں کے علم کے باوجود مجھے یہاں کھینچ بلایا، یہی نہیں بلکہ مجھ سے بدرجہا بہتر اور افضل بزرگوں کو چھوڑ کر میرے کمزور کندھوں پر بارِ صدارت بھی رکھ دیا ——— اِس بار کو اٹھاؤں تو کیونکر اور اس سے عہدہ برآ ہو جائے تو کس طرح؟ بہرحال تفویضِ اعزاز کے لئے منت گذار اور سراپا تشکر و امتنان ہوں، مگر اپنی نااہلی کی پردہ پوشی مجھ سے کسی طرح ممکن نہیں۔

آجکل ادبی جلسوں اور مشاعروں کی صدارت یوں اور بھی ایک بارِ عظیم اور کارِ اہم معلوم ہوتی ہے کہ ان میں صدر کو صدارتی تقریر کرنی پڑتی ہے یا خطبۂ صدارت پڑھنا پڑتا ہے۔ یہاں یہ حال کہ تقریر میں "لکنتِ موسوی" کا اندیشہ اور تحریر کے لئے سکون و اطمینان، غور و فکر اور فرصتِ مطالعہ مفقود ——— اٹھارہ گھنٹے غزلوں نظموں اور مضامین کی ترتیب و اصلاح کا خیال، کاتب اور مطبع کی بے سر و سامانیاں، خطوط کے پلندے اور دست و قلم کو تھکا دینے والے جوابات کا لامتناہی سلسلہ۔ عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کی آمد و رفت، مشاعروں کی جبری شرکت، شب بیداریاں غرض ہر لمحہ ایک ہنگامۂ نو اور ہر ساعت ایک طوفانِ تازہ ——— دل بے چین، روح گھبرائی ہوئی ——— مگر حوصلے جوان اور دل و دماغ تازہ ———

میری مجبوریوں اور معروفیتوں کا یہ دھندلا سا خاکہ اگر آپ کی توقعات کو مجروح کر دے تو اس کی ذمہ داری مجھ سے زیادہ ان مخلصین پر عائد ہوتی ہے جن کے اصرار نے مجھے گریز پائی کی اجازت نہ دی۔ اور مجھے "پابہ دستے دگرے دست بدستے دگرے" یہاں آنا پڑا،

اُردو ادب و شعر کا ایسا کونسا موضوع باقی رہا ہے۔ جس پر اب تک اردو کے بیدار دماغ اور روشن خیال ادیب قلم نہ اٹھا چکے ہوں۔ "اُردو ادب کے نئے رجحانات" جو اس مشاعرہ کا بھی موضوعِ تشریح ہے۔ آجکل سب سے زیادہ عنوانِ فکر بنا ہوا ہے، لیکن اس پر بھی دو تین سال میں اتنے اچھے اور معلومات آفریں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ کہ مزید خامہ فرسائی بے سود معلوم ہوتی ہے۔ شاید میں اس سلسلے میں کوئی نئی بات نہ کہہ سکوں، بہرحال اسی موضوع پر کچھ خیالاتِ پریشاں پیش کر رہا ہوں،

" اُردو ادب کے نئے رجحانات معرضِ بحث میں آتے آتے اب کسی قدر قدیم معلوم ہونے لگے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ قدیم الخیال حضرات اس جدیدیت پر اب زیادہ منہ نہیں سکیڑتے۔ کچھ تو اس لئے کہ ہمارے ادب کے نئے رجحانات غیر فطری نہیں اور کچھ اس لئے کہ ان میں اکثر و بیشتر ہماری زندگی کے رِستے ہوئے ناسور دہکتے ہوئے شعلے۔ بلکتے ہوئے اعضا اور ڈوبتے ہوئے نفس کی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ہم آج بھی گلی کوچوں میں چلتی پھرتی نعشیں۔ بدبودار میلے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی زندگیاں۔ خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں کی طرح لدے ہوئے سر اور شانے، پسینے سے تر اور جسم۔ پیٹ سے پتھر باندھے ہوئے انسان نما حیوان اور آہ بلب دُکھے ہوئے دل دیکھتے ہیں۔ جب ہماری زندگی اتنی کچلی ہوئی اس درجہ درد انگیز اور اسقدر آلام و مصائب سے بھری ہوئی ہو تو ہماری شاعری اور ہمارے ادب کا ترجمانِ زندگی نہ ہونا کیا معنی؟

مجھے کہنے دیجئے کہ دورِ نشاط کا ادب جسے ہم قدیم اور "ادب برائے ادب" کہتے ہیں، وہ بھی ہماری زندگی کا ترجمان رہا ہے، وہ بھی اپنے وقت کی ترجمانی تھا۔ اُس کا ہر لفظ، ہر فقرہ۔ ہر مصرع اور ہر شعر کھنکتے ہوئے ساغروں کی آوازوں، بہکتے ہوئے مستوں کی غوغا آرائی۔ عود و عنبر کی بھینی بھینی لپٹوں، رخسارِ صبیح و ملیح پر بکھری ہوئی زلفوں۔ رنگ فروش لبوں۔ غزالی آنکھوں۔ شرابی اداؤں۔ چاند سی دمکتی ہوئی پیشانیوں اور کمر سے نیچے لہرائی ہوئی چوٹیوں کا عکسِ جمیل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ قدیم ادبِ اُردو میں بھی ہم وہی خاصیت پاتے ہیں جو جدید اُردو ادب میں نظر آتی ہے، لیکن دونوں کی راہوں میں فرق ہے ——— ایک ایسا فرق جو ماتمے اور مدح میں ہو، ایک ایسا تضاد جو دن رات میں ہو، اور ایک ایسا امتیاز جو زندگی اور موت میں ہو۔

جدید و قدیم کی بحث کو میں اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتا صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر دَور کا ادب اُس دَور کی خصوصیات اور رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے؛

ہندی سو ہی شعلہ قدم اس تنک پری کا
پاپوش نے سیکھا ہے چلن کبکِ دری کا

زُلف اُلجھی ہے مرے شانے پر
بعد مدت کے یہ رات آئی ہے

کیا چال یہ نکالی تم نے جوان ہو کر
اب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرو ہے

وصل کے دن بھی مرا کانپ اٹھتا ہے جی ٹھہر ٹھہر
یاد آتے ہیں وہ صدمے جو شبِ ہجراں کے

ہائے پوچھو نہ تصور کے مزے
گود میں تم کو لئے بیٹھے ہیں

آگے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت
پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

کمر لچکتی ہے خنجر سنبھل نہیں سکتا
اور آپ آئے ہیں عاشق کے انتقال کے لئے

قاضی و محتسب شہر سدھائے حج کو
میکشو خوب پیو، حلق کے دربان گئے

لے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں
تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے
زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

حنا ہاتھوں میں، ہونٹوں پر تبسم گدگدی دل میں
وہ آئے پھول برساتی مری پھولوں کی محفل میں

اتنی کثرت سے اداکر ساقی، پھر اتنی تند و تیز
اچھے اچھے پینے والے آج توبہ کر اُٹھے

یہ اشعار قدیم ادب کے نشاطی اور اہتزازی رجحانات کی یادگار اور ہندو اور مسلمان بادشاہوں کے عہدِ سکون و اطمینان اور فراغت و تن آسانی کے مظہر ہیں یہ وہ دور تھا جب خانہ جنگی کے باوجود غریبوں اور امیروں کو پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھانپنے کو حسبِ مراد کپڑا ملتا تھا۔ جب گرانی اور گراں جانی خواب و خیال تھی۔ جب دو پیسے کا مزدور بھی اپنی زندگی آرام و آسائش سے بسر کرتا تھا، جب ہندوستان کی زمین سے اُگلا ہوا سونا اسی کے ذرّوں کو زرنگار بنایا کرتا تھا۔ جب وطن کے سمندروں سے نکلے ہوئے موتی اسی کے ساحلوں پر بکھرا کرتے تھے جب وطن کی کانوں سے جھانکتے ہوئے جواہرات اہلِ وطن ہی کے کانوں کو فروزاں کیا کرتے تھے۔ جب اس کے کھیتوں کی ہری بھری ڈالیاں اسی کے افراد پر سایہ فگن تھیں اور جب اس ارضِ پاک پر بہتی ہوئی دودھ کی شیریں نہریں اسی کے تشنہ کاموں کو سیراب و آسودہ کیا کرتی تھیں ۔۔۔ یہ ادب اُن مسکراتے ہوئے دنوں، قہقہے لگاتی ہوئی راتوں، گاتے ہوئے مہینوں اور جھومتے ہوئے سالوں کی یادگار رہے۔ جب وطن کے گلی کوچوں میں امن برسا کرتا تھا۔ جب ہندوستان کی تمام قومیں باہم شیر و شکر تھیں جب مذہب دلوں میں تھا۔ جب مسجدیں اور مندر ایک ہی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جب ہندوستان ایک مشترک رسم و رواج۔ ملے جلے تمدن اور بین الاقوامی تہذیب کا مرکز تھا۔ افتراق کی گھٹائیں بھول کر بھی اس کے آسمان پر نہ چھاتی تھیں اور چھاتی تھیں تو کچھ دیر برس کر کھل جاتی تھیں۔

مگر آج ۔۔۔ بطور ردِّ عمل وطن میں وہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ جو کسی طرح تہذیب تمدن۔ مذہب معاشرت فلاح و بہبود۔ آسودگی و آسائش اور سکون و اطمینان کی موت سے کم نہیں۔ مدتوں سے ہر شخص درد بجاں اور آہ بلب ہے۔ ایسی حالت میں اُردو ادب کا کینچلی نہ بدلنا غیر فطری اور ناممکن تھا۔ مغربی تہذیب کے سائے ہم پر مسلط ہو چکے تھے انگریزی تعلیم اور دوسرے ممالک کی تحریکوں سے ہم واقف ہو چکے تھے۔ شدید مصائب سے دوچار ہو کر اور اپنی انفرادیت کھونے کے بعد اپنی بے بسی۔ بے کسی اور غلامی کا احساس ہمیں پوری طرح ہو چکا تھا۔ انقلابِ وقت ہمیں چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں ہمارے ادب سے ہمدردیوں کی طالب تھیں۔ موجودہ زندگی کے پیچ و خم ادب کو رہبری کے لئے بلا رہے تھے۔ مزدوروں کی درد بھری پکاریں ادبا اور شعرا کو تڑپا رہی تھیں سرمایہ داری کے ناگ ہر طرف پھنکاریں مار رہے تھے اور تہذیبِ نو کی رنگینیاں ادب کو نقاب کشائی کی دعوت دے رہی تھیں؛

اندریں حالات ہمارے ادب نے انگڑائی لی، شعرا اور ادبا جاگے خیالِ دوشینہ اور کسلِ ماضی کا لبادہ انھیں مجبوراً اُتارنا پڑا۔ ادب میں نئے اور ترقی پسندانہ رجحانات اتنی تیزی سے پیدا ہوئے کہ ہر شاعر اور ادیب کو ترقی پسندی کا دعویٰ ہونے لگا۔ چنانچہ اُن شعرا کو چھوڑ کر جن کی شاعری نے کسی قدر دورِ نشاط کی دھوپ چھاؤں دیکھی تھی۔ باقی سب کے سب ترقی پسندانہ رنگ میں رنگ گئے۔ آج اُردو شاعری میں انقلابی ڈھول جس قوت سے پیٹا جا رہا ہے۔ اس سے ہمارے کان اچھی طرح واقف ہیں ۔۔۔ مگر اس کی "پول" ۔۔۔ معاذ اللہ!

یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ادب کے نئے رجحانات غیر فطری اور غیر شعوری نہیں ہیں۔ بلکہ وقت اور حالات کے تقاضوں نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی نظم و نثر کو زندگی کے اتنے قریب لے آئیں کہ اُس میں اُس کا عکس جھلکنے لگے۔ چنانچہ یہ عکاسی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ہو رہی ہے۔ مغربی تعلیم و تہذیب کے اثرات، سیاسی تحریکیں، روس کا نظریہ اشتراکیت عام انتشار و اضطراب اور سماج کی گرتی ہوئی حالت نے ادبا اور شعرا کو نعرۂ انقلاب پر مجبور کر دیا ہے۔

انقلاب پسند ادیب اور شاعر اس اعتبار سے تو قابلِ تعریف ہیں کہ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے رہے ہیں، اُن کے دل موجودہ دور کی کشمکش سے

دکھ ہوئے ہیں۔ اُن کی نظر میں آج کا ہندوستان زخموں سے چُور ہے لیکن افسوس کہ وہ زخموں کے اندمال کی کوئی صورت پیدا نہیں کرتے بلکہ اُسے نشترا دینا چاہتے ہیں۔ وہ زخموں کی عفونت کا مضحکہ اڑانا جانتے ہیں، وہ درد و کرب کی تصویر کشی کر سکتے ہیں۔ لیکن علاج سے نابلد ہیں۔ کوئی انقلابی شاعر جو ادب کے نئے رجحانات کو لیکر آگے بڑھ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے جو منزل رسی کی دعوت دے۔ ہاں قوم و ملک کو ٹھکنے پر لعن طعن ضرور کرتا ہے۔ آجکل کا انقلابی ادب ایک بحرانی اور ہیجانی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ وضیع و پرشکوہ الفاظ لُٹ و خون۔ بربادی۔ غارتگری۔ توپ اور تفنگ۔ شعلوں۔ نفتوں۔ بھوک، پیاس، مزدور اور سرمایہ داروں کا ذکر ذرا گرج کر اور برس کر کرنے کا نام انقلابی شاعری ہے۔ موجودہ نظام کو اُلٹ دینے والے خیالات۔ جذبۂ انتقام اور سزا دینے والے واقعات جدید شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ غرض انقلابی شاعری کا مقصد و منشا اس دُنیا کو قطعاً نیست و نابود کر دینا ہے لیکن اسکی جگہ کسی بہتر اور نئی دُنیا کی تشکیل و تعمیر کا ڈھانچہ کوئی انقلابی شاعر پیش نہیں کرتا۔ کسی چیز کی بربادی اور تاراجی سے پہلے واقعات مابعد پر بھی نظر ہونی چاہئے ——— نئی شاعری کے تجاوز اور اس کی انتہا پسندی نے اس کے افادہ کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ چونکہ انقلابی شاعری کی تقلید اندھا دھند ہوئی اور بغیر سوچے سمجھے اس میدان میں اشہب فکر دوڑنے لگا اس لئے نقائص پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ نہ اس میں کوئی ادبی اور شاعرانہ گہرائی پیدا ہوئی نہ اسے تجرباتی دور سے گذرنا پڑا اس لئے یہ ایک وقتی اور ہنگامی چیز ہو کر رہ گئی۔ جدید شاعری کی اشاریت مسلّم اس کا کشش معلوم ——— اس اشاریت اور کشش کو ہم حسنِ شاعری کہہ سکتے ہیں لیکن بھیانہ طرزِ نگارش، تخریبی نظریے ایک ہی قسم کے خیالات کا اظہار اس حسن کو چھپا دیتا ہے ——— یہ صحیح ہے کہ ادب کے نئے رجحانات قطعاً تنقیدی ہیں اور اس دور کے شاعروں اور ادیبوں کو زندگی پر مختلف زاویوں سے تنقید کرنی پڑتی ہے مگر عام طور پر تنقید ہر جہتی نہیں ہوتی۔ اس میں صرف ایک پہلو روشن ہوتا ہے۔ اور وہ **بغاوت** ہے۔ بغاوت اور **انقلاب** میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اُسے اہلِ نظر اچھی طرح جانتے ہیں۔ انقلاب پسند ہرگز تباہی اور بربادی کا درس نہیں دیتا۔ یہ کام صرف **باغی** کا ہے یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری باغیانہ خیالات سے تھوڑی دیر کے لئے تو ہماری رگوں میں خون کھولنے لگتا ہے لیکن اس کے بعد جو انجماد شروع ہوتا ہے وہ رہی سہی حرارت کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ حالانکہ صحیح انقلابی شاعری وہ ہے جو رہبرِ منزل بنائے۔ انقلاب اس کا نام نہیں کہ مرجھائے ہوئے پودوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے بلکہ انقلاب و اصلاح اسے کہتے ہیں کہ سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دے کر سرسبز و شاداب بنایا جائے۔ جس زمین میں روئیدگی کے آثار بالکل مفقود ہوں اُسے بغیر جوتے بوئے چھوڑ دینا تو غیر مناسب بھی ہے لیکن جو زمین ذرا سی محنت، غور و فکر اور توجہ سے زرخیز ہو سکتی ہو اُسے نظر انداز کر دینا کسی طرح قرینِ عقل نہیں۔ ہندوستان کے حالات ابھی اتنے یاس انگیز نہیں ہیں۔ اگر ہمارا جدید ادب ہندوستانیوں میں ذوقِ عمل اور شعورِ زندگی پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اس نظامِ کہنہ سے نظامِ نو خود طلوع ہو سکتا ہے۔ گرجنے اور برسنے میں وہ لطف کہاں جو چھائے رہنے میں ہے۔ اگر جدید ادب کو ہم واقعی کام کا بنا لیں اور اس کی بحرانی کیفیت کو ختم کر دیں تو اب بھی پتھروں سے پانی، کانٹوں سے پھول، ظلمتوں سے نور اور مایوسیوں سے اُمید کی جھلک پیدا ہو سکتی ہے۔

انقلابی شاعری کے تحت ہی میں اُردو ادب کے دوسرے نئے رجحانات بھی آ جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک خدا اور مذہب کے خلاف بغاوت بھی ہے۔ یہ لادینی اور دہریت بھی مغرب زدگی کے باعث ہے۔ اگر ہم خالص مشرقی نقطۂ نظر سے خود کو دیکھیں اور اپنی "خودی" کو دوسروں کے مفروضات پر بھینٹ نہ چڑھائیں تو آج بھی خدا اور مذہب کا عرفان ممکن ہے۔ میں ہرگز ان قیود کو مذہب سے تعبیر نہیں کرتا جو انسان کو قدم قدم پر دوزخ و جنت کا سماں دکھائیں بلکہ روایات سے قطع نظر عقل و درایت کی روشنی میں اُسے دیکھئے، کا حامی ہوں۔ اگر خدا اور مذہب سے بغاوت کرنے والے شعرا اور ادبا اپنی ہیجانی کیفیت کو ذرا کم کر کے خلوصِ دل کے ساتھ اس معاملہ پر غور کریں تو انھیں معلوم ہو کہ دنیا کے امن و سکون اور نظامِ کائنات کے ثبات میں خدا اور مذہب کو کتنا دخل ہے۔ اگر خدا اور مذہب ہمیں برائیوں کی طرف لیجائیں تو ہمیں یقیناً بغاوت کی ضرورت ہے۔ لیکن آج تک کوئی منکرِ خدا و مذہب اس بات کو ثابت نہیں کر سکا۔ جب قانون و قیود ہمارے سماج، ہماری ذہنیتوں اور ہمارے کردار کے لئے ضروری اور لابدی ہیں تو پھر ایک قانون مذہب بھی سہی، ہماری بے لگام زبانیں تو اُس وقت خدا کی جناب میں بیباک ہونی چاہئیں، جب خدا بدیوں کی دعوت دے ——— خدا کا عرفان تو ہر مادی آلائش کو فنا کر دیتا ہے۔ جب خدا اور مذہب کے فرائض و اصول ہماری فلاح و بہبود، نسق و نظم اور اصلاح و تہذیب کے لئے ہیں تو پھر یہ بغاوت نفس کی رعونت نہیں تو اور کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر خدا اور مذہب کو انسان سمجھ لے تو یہ کشت و خون اور حرص و آز کا بازار گرم ہو ہی نہیں سکتا۔ موجودہ اُردو شاعری کا یہ رجحان اس قدر تکلیف دہ اور مذموم ہے کہ بسا اوقات ترقی پسندوں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ اگر ترقی پسند شاعری کا مقصد اصلاح و انقلاب ہے تو مذہب کے سڑے ہوئے اعضا پر عمل جراحی کیا جائے اور اُس کی خرابیوں کو دور کیا جائے۔ نفسِ مذہب سے اختلاف و انحراف تو کھلی ہوئی

جہالت اور بغاوت ہے۔

حضرات ———

میں بہت ہی اختصار کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں، ورنہ اُردو ادب کے نئے رجحانات پر اتنا لکھا جا سکتا ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں۔ ادب کے نئے رجحانات میں ایک جنسی بھوک بھی ہے اور یہ بھی "مغربی ساقِ سیمیں" کی جلوہ آرائیوں کا نتیجہ ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ جنسی میلانات سے انسان کسی طرح نہیں بچ سکتا اور نہ بچنا چاہئے۔ ہم دُنیا میں اس لئے پیدا نہیں ہوئے کہ زندگی کے سوتوں کو خشک کرلیں اہتزازِ روح حاصل نہ کریں اور رہبانیت کے بھوت کو اپنے سر پر سوار کرلیں——— نہیں——— ہرگز نہیں، پھولوں کا رس بھونروں کی تشنگی بجھانے کے لئے ہے، تاروں کی جوت بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتانے کے لئے ہے۔ کلیوں کا روپ آنکھوں میں نظر کشی پیدا کرنے کے لئے ہے اور انسانی حُسن و جمال سکونِ خاطر کے لئے، لیکن سوسائٹی کے قوانین توڑ کر اور تہذیب و شائستگی کا گلا گھونٹ کر حمام سے باہر ننگا نکل آنا دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے؟

رومانی جذبات کا اظہار ہر دور کے ادب و شعر میں ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں بھی ایسے لکھنے والے موجود ہیں جن کی اصلاحی اور انقلابی نظموں کا پس منظر رومانی ہوتا ہے مگر یہ رومان بوالہوسی تک نہیں پہونچتا بلکہ دیکھنے اور سننے کے بعد لذت گیر ہونے اور کیف و سرور کی دعوت دیتا ہے۔ اس سے جذبات میں مطلقاً ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لطیف کنائے اور استعارے براہِ راست روح کو چھوتے ہیں——— یہ کہنا کہ دورِ ماضی کے شعرا کے یہاں بھی فحش اشعار ملتے ہیں۔ اس لئے ہم اگر عریاں جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو کیا بُرا کرتے ہیں۔ قطعاً ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ چونکہ ڈارون کے نظریہ کے مطابق پہلے انسان بندروں کی سی حرکات و سکنات کرتا تھا۔ اس لئے اب بھی اُسے بندر رہ جانا چاہیے۔ پیش روؤں کی تقلید ہی جو ٹھہری! کیا ترقی پسندی کے یہی معنی ہیں؟ ترقی پسندی تو اسے کہتے ہیں کہ اُردو غزل جو کبھی کھلی ہوئی معاملہ بندی تھی۔ آج سنجیدہ ہو کر سیاست، درس و پیام اور ادراک و عرفان کی حامل ہے۔

فحش نگاری کے بعد نئی شاعری کے رجحانات میں اور بھی بہت سی چیزیں آتی ہیں۔ انھیں میں آزاد نظم بھی ہے لیکن میں ان سب کو وقت کی کمی کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں۔ اُردو ادب کے نئے رجحانات فی نفسہٖ اچھے اور کام کے ہیں لیکن افسوس کہ کج روی اور بے راہ روی عدمِ تجربہ اور نقصِ فکر نے اُن کے افادہ کے جوہر کو جلا کر خاک کردیا ہے۔ میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ خلوص اور جذبۂ عمل کی کمی اس دور کی نئی شاعری کو بہت جلد فنا کردیگی۔ ممکن ہے انقلابی شعرا کو اس وقت اپنی شاعری ایک تمتماتا ہوا آفتاب معلوم ہو رہی ہو لیکن میرے خیال میں یہ آفتاب غروب ہونے کے بعد پھر شاید کبھی نہ نکلے گا۔ طوفان آتا ہے اور چلا جاتا ہے کچھ دیر کے بعد اُس کے آثار بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسا دریا جو آہستہ خرامی اور سبک رفتاری کے ساتھ میدان میں بہہ رہا ہو۔ اُس کے خشک ہونے اور اُترنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

حضرات، میں نے آپ کا بڑا بیش قیمت وقت لیا، نہیں کہہ سکتا کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ کہہ سکا یا نہیں، بہرحال اب میں خطبے کو ختم کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ آج ہی شب کے آخری حصہ میں مجھے یہاں سے جے پور جانا ہے——— چاہتا ہوں کہ کچھ دیر آپ حضرات کے کلام سے لطف اندوز ہوں۔

۱۱ مارچ ۱۹۴۸ء

اعجاز صدیقی

———:(٭):———

جذبات

اے کاش سنا دے کوئی پیغامِ ملاقات
بھڑکے ہوئے ہیں آج مرے عشق کے جذبات

اک لمحہ فراموش ہوئے رنجِ خرابات
کیا لطفِ ملاقات ہے کیا لطفِ ملاقات

انسان میں باقی نہیں اب کشف و کرامات
پھر تازہ ہوئے لات و ہبل بتکدہ طلسمات

گر تفرقہ پرداز نہ ہوں ہجر کی گھڑیاں
ہے باعثِ خوشنودیِ دل لطفِ ملاقات

اس غلبۂ شخصی کے وہ قائل نہ کبھی تھے
تاریخ میں پڑھ تو سہی اسلاف کے حالات

ظاہر ہے نہ ہونے ہی سے اسکا نہیں ہونا
منفی کے دلائل ہیں سبھی دعوئ اثبات

ہر رنگ سے جنت میں فراغت تھی میسر
انساں یہاں آکے ہوا موردِ آفات

اک آن میں دنیا کے رواجوں کو بدل دے
کر زندگیِ نو کے لئے ترکِ رسومات

گنجائشِ اصلاح نہیں ذہن میں تیرے
ترمیم کے محتاج ہیں یہ تیرے ارادات

اے صاحبِ اقبال تجھے یہ بھی خبر ہے
مفلس کی نظر ہے طرفِ دورِ مساوات

کیا پہنچے گزند اسکو ضیا بزمِ سخن میں
سیماب سے وابستہ ہوئے جسکے افادات

ضیا میرٹھی

حسنِ اتفاق

"یہ قصّہ ہے جب کا، کہ آتش جوان تھا"

ہندوستان کے ریلوے اسٹیشنوں کا میدان قیامت ہونا مبالغہ سہی، لیکن جنوں گاہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سکون و اضطراب سنجیدگی و سراسیمگی۔ حواس اور بدحواسیوں کے اختلاط کا لطف آپ اسوقت اٹھا سکتے ہیں۔ جب آپ بغیر کسی ضرورت کے صرف چہل قدمی یا "مردم شناسی" کے لئے اسٹیشن جائیں۔ اگر آپ کو سفر کرنا یا کوئی بھی دوسرا کام ہے تو یقین فرمائیے کہ آپ پر بھی بدحواسی کی کوئی نہ کوئی قسم ضرور طاری ہو جائے گی۔ یہ ممکن ہے کہ آپ اسے محسوس نہ کریں۔ فرض کیجئے کہ آپ کو سفر کرنا ہے اور بتقاضائے احتیاط آپ قبل از وقت پہونچ گئے اور گاڑی ہوئی "لیٹ" تو آپ لامحالہ پورے اسٹیشن کا دورہ فرمانے پر مجبور ہونگے۔ کبھی پلیٹ فارم کی پیمائش۔ کبھی بکنگ آفس کی تاک جھانک۔ کبھی مال گودام کا معائنہ۔ کبھی مسافروں کا جائزہ۔ کبھی اشتہارات اور ٹائم ٹیبل کا مطالعہ، کبھی ریلوے کی بدانتظامیوں کا مذاکرہ۔ بالآخر تشنہ طبیعتی کسی بنچ پر رونق افروزی اور تمباکو پان یا سگرٹ بیڑی وغیرہ سے شغل اور گاڑی کے جلد آنے کی دل ہی دل میں دعائیں۔ اور اگر بہ ادعائے "خلیلی" بعد از وقت دولتخانہ سے روانہ ہوئے ہیں تو راستہ بھر گاڑی لیٹ ہونے کی دعائیں مانگتے ہوئے اسٹیشن پہونچیں گے اور پوری "بوکھلاہٹ" کے ساتھ بکنگ آفس کے مجمع خلاف قانون میں ایک رکن ممبر کی حیثیت سے شریک ہو کر کوشش یہ فرمائینگے کہ سب سے پہلے ٹکٹ حاصل کرنے میں آپ ہی کامیاب ہوں ——— چنانچہ ایک مرتبہ مجھے بھی الہ آباد فتحپور کے درمیان ایک وسطی اسٹیشن سے سفر کرنا تھا۔ پانچ میل یکہ کا سفر اور وقت تنگ، راستہ بھر یکہ والے کی قوتِ یکہ بانی کو ہیجان میں لانے اور تیز ہانکنے کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں پورا زور بیان صرف کرتا ہوا اسٹیشن پہونچا۔ گاڑی آنے ہی والی تھی مجھ پر بھی "بوکھلاہٹ" طاری ہوئی۔ یکہ سے کود کر بکنگ آفس کی جانب جارحانہ انداز سے جھپٹا۔ کسی کے ٹھوکر لگی اور کسی کے دھکا۔ کوئی صرف تیکھی چتونوں سے دیکھ کر رہ گیا، کسی نے کہا "دکھائی نہیں پڑتا" کوئی بولا "لاٹ صاحب معلوم ہوتے ہیں" میں نے دیکھا، اور سنا سب کچھ لیکن ایسے نازک وقت میں مباحثہ قائم کرنا خلاف دانشمندی تھا میں بکنگ آفس میں داخل ہو گیا ——— بابو صاحب ایک ٹکٹ انٹر کلاس کا دیدیجئے"۔ بابو صاحب نے گردن گھما کر دیکھا ضرور لیکن شانِ "بابویت" کے ساتھ بدستور تھرڈ کلاس کا ٹکٹ بانٹتے رہے۔ ایک منٹ انتظار کے بعد میں نے پھر کہا "ٹکٹ دیدیجئے صاحب"! اس مرتبہ انھوں نے گردن کو جنبش دینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے خیال کیا شاید یہ سنتے نہیں ہیں بات مکرر کہے بغیر۔ لہذا "دونا ہو التفات" کے طور پر ڈبل آواز میں ٹکٹ کا تقاضا کیا۔ بابو صاحب نے جھلا کر فرمایا "میں بہرا نہیں ہوں آپ کسی جگہ کا نام تو لیتے نہیں اور ٹکٹ مانگ رہے ہیں"۔ یہ واقعہ تھا کہ بوکھلاہٹ میں میں نے کسی جگہ کا نام نہیں لیا تھا، میں نے پھر گفتگو کو شارٹ کرتے ہوئے کہا "جناب فتحپور" کتنا خوبصورت اور برمحل شارٹ! مجھے ٹکٹ مل گیا اور میں پلیٹ فارم پر آیا۔ ایکسپریس آرہا تھا اور یہاں کا ہنگامہ پورے شباب پر ——— کوئی گٹھری سنبھالے، کوئی بچوں کو دبائے۔ کوئی برقعہ پوشوں کو لئے۔ کوئی پھر بھر کر قلی کو دیکھنے میں بے اختیارانہ مصروف حرکت تھا۔ میرے قدم بھی اسی عالم بے اختیاری میں آہستہ آہستہ ایک طرف کو بغیر ارادہ اٹھ رہے تھے کہ یکایک سامنے۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

کا مجسمہ نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آیا۔ کھلتا رنگ۔ کشادہ پیشانی بڑی بڑی آنکھیں "گرہ بزادشب رایس آفتاب" کی تصویر اور "دست مرہونِ حنا رخسارہ رہینِ غازہ" کی تفسیر۔ علامہ سیماب مدظلہٗ کے لفظوں میں ؎

پنہاں ہر اک نگاہ میں اک موجۂ بہار ——— ہر سانس میں نوائے عنادل لئے ہوئے
ڈالے ہوئے ہر اک خم گیسو میں اک گرہ ——— ہر ہر گرہ میں عقدۂ مشکل لئے ہوئے
مینا فروز آنکھوں میں لب ہائے ساغریں ——— تارے بھرے ہوئے مہ کامل لئے ہوئے
اک قشقۂ جمیل جبینِ کشادہ میں ——— کعبے کا اور دیر کا حاصل لئے ہوئے
اک بانکپن فسردہ جگر کے محاذ میں ——— اک تیر بالمقابلۂ دل لئے ہوئے

شاید کسی ایسے ہی اجتماع حسن و شباب کے فتنہ ساماں نظارے نے حضرتِ داغ سے کہلوا دیا تھا۔ ۱

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

فالسئی رنگ کی جھلمل کناری دار ساری زیب تن اونچی ایڑی کا لیڈی شوزیب پا ایک ہاتھ میں چھوٹا اٹیچی کیس۔ دوسرے میں انٹر کلاس کا ٹکٹ نگاہِ بے محابا اور ادائے بے پرواکے ساتھ ہنستے ہوئے ایکسپریس کو دیکھ رہی تھی۔ میں ابھی دامانِ نگہ کی تنگی اور گلِ حسن کی فراوانی میں گلہ دارد" تک پہونچا تھا کہ ایکسپریس پلیٹ فارم پر آگیا بعد تمنائے ہمسفری دیسے گاڑی پر ایک نظر ڈالی۔ اتفاق یہ کہ انٹر کلاس بالکل ہمارے سامنے آکر لگا اور حسنِ اتفاق یہ کہ بالکل خالی۔ میں پھر ایک کشمکش میں پھنس گیا۔ اگر میں اس خالی درجہ میں بیٹھتا ہوں تو شاید وہ اس میں آنا پسند نہ کرے۔ اگر اس کے بیٹھنے کا انتظار کرتا ہوں تو پھر میرا اس درجہ میں سوار ہونا اخلاقی طریقہ پر کہاں تک مناسب ہوگا..................

میں جذبِ دل پر بھروسہ کرکے خالی درجہ میں بیٹھ گیا میرے بعد ہی وہ گاڑی میں آئی اور بغیر کسی جھجک اور تردد کے میری ہی سیٹ پر پلیٹ فارم کی طرف منہ کرکے بیٹھ گئی۔ گاڑی نے سیٹی دیکر رینگی ——— میں اسکی بے حسی بیباکی اور خود فراموشی پر دل ہی دل میں تبصرہ کر رہا تھا کہ یکایک ذہن میں ایک تضمین آگئی۔ بھول جانے کے خیال سے میں نے چاہا کہ لکھ لوں۔ فاؤنٹن پن نکال کر جیبوں میں کاغذ تلاش کرنے لگا۔ ایک مترنم آواز آئی" شاید آپ کو کاغذ چاہئے۔ حاضر ہے۔" میں نے چونک کر دیکھا۔ پنجاب کے ادبی لفظوں میں ایک ساقِ مرمریں پنجۂ نگاریں میں خوبصورت سا لیٹر پیڈ لئے ہوئے میری طرف بڑھی ——— سامنے سیٹ پر اٹیچی کیس کھلا رکھا تھا ——— اس خلافِ توقع "حادثہ" کے لئے میں پہلے سے تیار نہیں تھا۔ جلدی میں "شکریہ" کو بطور "سپر" استعمال کرتے ہوئے کاغذ لے لیا۔ زبان نے اس سے زیادہ مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اعترافِ شکست کے طور پر سیٹ کے اوپر کاغذ رکھکر میں نے لکھنا شروع کیا:-

حُسن را ہنگامہ ساز بزم عالم کردہ	از مذاقِ عاشقی آشفتہ کارم کردہ
در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ	وز برائے نالہ ہم تاکید محکم کردہ

"باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش"

"اچھا آپ شاعر ہیں!"

دوسرا حملہ ہوا اور ذرا سخت کیونکہ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ ایک ہندو دوشیزہ فارسی تو کیا اُردو سے بھی واقف ہوسکتی ہے میں نے ذرا سنبھل کر اور قدرے جھجکتے ہوئے انداز میں کہا۔

"مسرت کی بات ہے کہ آپ کو فارسی سے بھی ذوق ہے"

"نہیں میں فارسی تو نہیں جانتی۔ ہاں اُردو سے ضرور دلچسپی ہے۔ میرے خاندان کا تقریباً ہر شخص فارسی داں ہے۔ اس لئے فارسی سے بھی تھوڑا بہت لگاؤ ہے۔"

"میں ——— ایک ہندو خاتون کا فارسی سے اسقدر واقف ہونا میں تو فارسی کی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔" وہ مسکرائی، ایسی مسکراہٹ جس میں طنز جھلک رہا تھا۔

"اُردو جاننے والوں کے لئے فارسی سے تھوڑی بہت واقفیت تو ناگزیر ہی۔ مسلمان فرمانرواؤں نے اُردو کی ایجاد ہی اسی لئے کی تھی کہ ہندوستان میں فارسی زبان و تہذیب رائج و مستحکم ہو جائے۔

"میں ——— آپ نے ایجادِ اُردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ممکن ہے کہ اُردو کے مخالف طبقہ سے خراجِ تحسین بھی وصول ہو جائے لیکن، افسوس ہے کہ یہ کوئی مفید اور قابلِ اعتنا اضافہ نہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اُردو نہ کسی مسلمان حکمراں کی زبان ہے نہ ایجاد بلکہ ہندو مسلم یکجائی اقتصادی و معاشرتی ضرورتوں کی فطری پیداوار ہے۔ مسلم فرمانرواؤں کی علم دوستی نے اسکی سرپرستی کی۔ ہندو مسلم علمائے عصر نے اسکو سنوارا۔ عوام نے پذیرائی کی۔ اسکی ساخت اتنی شستہ سبک اور لچکدار تھی کہ زبان نے نہایت آسانی کیساتھ اسکو قبول کر لیا ——— زعفران۔ خفقان۔ لکھنؤ۔ رانوں نرم کہنے میں زبان کو کئی کئی بل کھانے پڑتے تھے۔ اب بے تکلف زعفران۔ خفقان۔ لچھمن۔ راون کہنے لگی ——— اس نے بات کاٹ کر کہا:-

"میں نہیں جانتی تھی کہ کسی اُردو پروپیگنڈسٹ سے باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے اُردو کی لطافت۔ لوچ۔ لچک۔ جذب و اثر سب تسلیم لیکن کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک مشترک زبان کے لئے صرف مسلمان ہی کیوں اُردو کا جھنڈا لیکر میدان میں اُتر آئے اور حفاظتِ اُردو کا نعرہ لگا کر ہندو سے دست و گریباں ہو گئے

میں ——— "صرف مسلمان" تو مجھے تسلیم نہیں۔ ہاں اُردو کی تخریب و فنا سے مسلمان زیادہ متاثر ضرور ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مسلمان شاید فطرتاً زود اعتماد اور جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ جب اُردو کی تدوین و ترویج ہوئی تو مسلمانوں نے فوراً بغیر سوچے ابنائے وطن کے تعاون پر اعتماد کرکے اپنا تمام لٹریری سرمایہ اُردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ یہانتک کہ وہ اپنی مذہبی زبان عربی

اور دفتری زبان فارسی سے بیگانہ ہوگئے۔ اب مسلمانوں کے لئے اُردو کا تحفظ لازمی
والبتہ ہو جانے کے مترادف ہوگیا۔"

"یہ جانتے اگر تو لُٹاتے نہ گھر کو ہم"

"بہتر تو یہ تھا کہ یہ مسلمان اُردو کے اس خوبصورت تحفہ کو "مشترکہ" کے ہاتھوں ہندوؤں کو عطا کرنے کے بجائے اپنے ہی پاس رہنے دیتے۔ ہندو ہندی کی ترویج کرتے اور مسلمان اُردو کی اور اس طرح یہ ہندی اُردو کا جھگڑا ہمیشہ کو ختم ہو جاتا۔

میں: آپ کو مغالطہ ہوا ہے یا دیا گیا ہے۔ ہندی اُردو مقابل زبانیں نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے برِصغیر میں دیس دیس کی زبانیں علیحدہ ہیں بنگالی۔ پنجابی۔ پشتو۔ فارسی۔ ہندی۔ تلنگو۔ اُڑیا۔ ملیالم۔ مرہٹی وغیرہ۔ لیکن اُردو تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح براعظم یورپ میں متعدد زبانیں ہیں لیکن بین الاقوامی ضروریات انگریزی سے پوری ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی بین الاقوامی اور صوبہ جاتی ضرورتیں اسی اُردو سے پوری ہوتی ہیں گویا یہ پورے ہندوستان کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یو۔پی اور سی۔پی سے ملحقہ مقامات پر عام ہے۔ دوسرے مقامات پر عام نہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک بنگالی پنجاب میں اپنا مافی الضمیر بتانا چاہے تو وہ بنگالی میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس طرح اس کے برعکس لیکن اُردو میں دونوں جگہ اظہارِ خیال ہو سکتا ہے۔ ہندی کو آپ فارسی کے مقابلہ میں اور سنسکرت کو عربی کے مقابلہ میں پیش کر سکتی ہیں اس کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان فارسی عربی کی ترویج کریں اور ہندو ہندی اور سنسکرت کی۔ لیکن اُردو فرقہ دارانہ صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔ اسکی حمایت ہر شخص کر سکتا ہے لیکن کوئی اپنا نہیں سکتا۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "تمام ہندو آپ جیسے فیاض تو نہیں ہیں کہ ایسی ہندوستان گیر زبان سے بحق مسلمانان دستبردار ہو جائینگے۔"

وہ ہنس پڑی اور اسکے موتی جیسے دانت چمکنے لگے۔ اس نے پہلو بدلا۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ باہر کی فضا پر ایک نظر ڈال کر پھر میری طرف مخاطب ہوئی ——— "آپ کے ساتھ گفتگو میں بڑی دلچسپی رہی۔ لیکن اب اس خشک مبحث کو ختم ہی کر دینا چاہیے۔ ہاں آپ کی تضمین خوب ہے۔ شاید آپ عورتوں کی تعلیم۔ ترقی اور آزادی کو پسند نہیں کرتے" ——— اتنی دیر کی گفتگو اور اسکی بیباکی سے رغبت میں کمی ہو چکی تھی اور ہم ایک طرح پر "ریل فیلو" بن چکے تھے۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ غیر متوقع پیدا ہو جانے والی بحث سے اکتا گئی ہے اور بجائے اس خشک مبحث کے کوئی تر و تازہ اور شگفتہ موضوع چھانٹی کی عمر اور تعلیم و تربیت کے مطابق ہو شروع کرنا چاہتی ہے۔ تضمین کی طرف اشارہ، عورت کا موضوع ایک قسم کی ہدایت ہے ——— صہبائے شباب جب مینائے حُسن میں جلوہ افروز ہو تو اس کی فتنہ سامانیاں مسلّم ہیں۔ میں بھی پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے" بیحد کافی متاثر مسرور اور لذت اندوز تھا تاہم میرا دل میرے پہلو میں تھا اور زخم نا خوردہ دماغ میرے قابو میں بھی محفوظ جنوں ———

میں نے خیال کیا کہ اس کے تقاضائے شباب کی پذیرائی کے لئے "تمہیں تو نہیں نوجوان اور بھی ہیں"۔ اس چلتی ملاقات میں روشِ عام کی پیروی عامۃ الورود جذبہ کا اتباع انقطاع سفر کے ساتھ رخصت ہو جائے گا۔ لہٰذا ہر موضوع پر گفتگو کا ایک ہی طرز رکھا جائے تاکہ کچھ روز تو وہ یاد پر مجبور رہے میں نے متانت سے جواب دیا "میں عورتوں کی تعلیم۔ ترقی اور آزادی کا مخالف نہیں ہوں۔ لیکن جب الفاظ عام ہوں تو تعیّنِ مفہوم کے بغیر گفتگو میں غلط فہمی ہوتی ہے۔" اس نے متفکرانہ انداز میں کہا:-

"میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب" ——— میں: "تعلیم، ترقی اور آزادی سے اگر احساسِ انسانیت۔ اخلاق میں بلندی۔ خیال میں وسعت اور اعمال میں پاکیزگی پیدا ہو تو ہر ذی ہوش اسکی تائید اور حمایت کرے گا اور اگر اس کے برعکس حدود انسانیت کو پھاند جانے والی ہوں تو گوارا کئے جانے کے قابل نہیں۔"

"میں نے تو مروجہ تعلیم وغیرہ کے متعلق کہا اور آپ اصول لیکر بیٹھ گئے۔"

میں: "عجیب بات ہے کہ آجکل ہر شخص کو اصول سے بیر ہے۔ آپ کی مروجہ تعلیم کی بنیاد کھوکھلی ہے جس میں احساسِ انسانیت۔ تعمیرِ اخلاق اور حسنِ عمل کی گنجائش نہیں۔ خصوصاً ہندوستان کا معیارِ تعلیم تو صرف اتنا ہے کہ سکھاتی ہے غلاموں کو غلامی کا طریق۔" ابتک تو یہ تعلیم نوکری کی قابلیت اور مزدوری کی اہلیت پیدا کرنے سے آگے نہیں بڑھی، تعلیمیافتہ مردوں ہی نے کون سا کارِ نمایاں کر لیا ہے۔ لیکن کوئی دوسری تعلیم آپ کے اختیار میں نہیں۔"

میں: "مگر اس تعلیم پر رضامندی کے یہ معنی ہونگے کہ کبھی تعلیم ہمارے اختیار میں نہ ہو؟ بہر حال میں سادہ کاغذ پسند کرتا ہوں۔ بجائے اسکے کہ اس پر غلط مسودہ لکھا جائے۔"

"دنیا جانتی ہے کہ دوسرے ملکوں کی عورتیں اس تعلیم کی بدولت ترقی کر رہی ہیں اور دنیا کے کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔"

میں: "کیا کر رہی ہیں یہی ناکہ دفاتر میں نوکری۔ ملازمت جس عہدے"

کارخانوں میں مزدوری، تھیٹروں، سینماؤں میں رقص، ہوٹلوں اور کلبوں میں نمائشِ حسن۔ مردوں کا ہاتھ بٹانا ممکن ہے کہ یورپ کے تناسب کی آبادی یا طریق کار کی غلطی کی وجہ سے وہاں یہ ضرورت ہو مگر ہندوستان میں تو ابھی مرد ہی بے کار اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ عورت کو ہاتھ بٹانے کی زحمت کی ضرورت ہی نہیں۔ یہی تعلیم ہے جس نے مشرقی معصومیت کو مغربی آلودگیوں سے کہیں کا نہ رکھا۔

ل دطلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اقبال

آپ دیکھتی ہیں کہ مغربی کلچر کے ہاتھوں مشرقی تہذیب کا گلا کس بے دردی سے گھونٹا جا رہا ہے۔

"مشرقی تہذیب گلا گھونٹنے ہی کے قابل ہے"

"ہیں۔ آپ تعلیم حاصل کر رہی ہیں"—— "جی ہاں کالج میں میرا پہلا سال ہے"

"میں —— یہ اسی مغربی تعلیم کا فیض ہے کہ آپ کو اپنی ہر چیز سے نفرت ہونے لگی، اچھائی برائی کا تعلق زیادہ تر ذہن و ضمیر سے ہے اور ذہن و ضمیر اور تصورات کی تعمیر تعلیم سے ہوتی ہے۔ صاحبِ اقتدار طبقہ کبھی اپنی تہذیب اپنا کلچر تلوار کے زور سے نہیں تعلیم کی قوت سے نافذ کرتا ہے اور یہی تعلیم و تربیت محکوم طبقہ کی نگاہوں میں اپنی ہر بہتر و برتر چیز کو کمتر و فروتر بناتی ہے۔ رفتہ رفتہ محکوم تہذیب مقتدر تہذیب میں جذب و حل ہو کر رہ جاتی ہے کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ اونچی ایڑی "کاٹو" اپنی تمام خطرسامانیوں کے ساتھ کیوں خوبصورت ہے اور الٹی ٹیڑھی مانگ کی سیدھی مانگ سے زیبائی کی کیا دلیل ہے؟——

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

مختصر یہ کہ اہلِ حکومت نے قوت سے جسم پر اور تعلیم کے ذریعہ روح پر قبضہ کر لیا ہے اس لئے مشرقی تہذیب گلا گھونٹنے کے قابل اور مغربی تہذیب پھولنے پھلنے کے لائق نظر آتی ہے ؎

جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں اسی طرح قید و بند۔ رسم و رواج۔ پردہ و چار دیواری کی گندی اور مہلک فضا میں دم توڑتی رہیں۔ یہ تو اب ہونا نہیں——"

وہ جھنجھلا اٹھی اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اس کا حسن و شباب۔ اس کی تعلیم و تربیت اس کی آزادی کسی اور حرف و حکایت کی متقاضی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس سے زیادہ برہمی اس کی برداشتِ طبیعت سے باہر ہے میں نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ نے فیصلہ سنانے میں جلدی کی —— یہی ہوتا ہے اور یہی ہو کر رہے گا! فطرت سے زیادہ دیر تک جنگ جاری نہیں رہ سکتی۔ عورت آج اس جنگ میں جس جگہ پہنچ چکی ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اس کے جارحانہ اقدام کی آخری حد ہے لیکن وہ دن دور نہیں جبکہ وہ مدافعانہ دور میں قدم رکھے اور درجہ بدرجہ اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے مراکز کی طرف شان سے پسپا ہو چکی ہوگی۔ یورپ میں جو آزادیٔ نسواں کی رزمگاہ ہے ایسی علامات کا اندازہ ہونے لگا ہے رہ گیا رسم و رواج قید و بند۔ پردہ و چار دیواری یہ ذرا طویل داستان ہے مرد ہی غریب اس جکڑ بندیوں سے کب آزاد ہے۔ جو عورتیں مردوں کے دوش بدوش ان پابندیوں سے آزاد ہو سکیں گی۔ انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور مدنیت نام ہی ہے رسم و رواج اور پابندیوں کا۔ یہ ممکن ہے کہ آپ ایک رسم توڑ کر ایک رواج مٹا کر اس کی جگہ دوسرے رسم و رواج کو اپنے اوپر مسلط کر لیں جو آپ کے نقطۂ نظر اور ضروریات کے مطابق ہو لیکن بغیر رسم و رواج کے حیاتِ انسانی کا شیرازہ درست ہی نہیں رہ سکتا ؎

دہر میں عیشِ دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

قید و بند ہی اصل میں بنیادِ تعمیر ہے۔ اسی سے حسن و ترنم پیدا ہوتا ہے۔ اس پر جھنجھلانا اور اس سے چڑنا کیا معنی —— آپ ڈرائنگ جانتی ہونگی۔ ایک صفحہ پر چند سیدھی آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر حد بندیاں کیجئے۔ ایک خوشنما پھول۔ ایک خوبصورت تتلی۔ ایک حسین عورت کی تصویر بن جائیگی۔ میدان میں دیواروں سے حد بندیاں کیجئے۔ مکان۔ غسل خانہ۔ باورچی خانہ۔ ڈرائنگ روم وغیرہ تیار ہونگے غرضکہ جسقدر قیدیں بڑھتی جائینگی حسن و رعنائی میں اضافہ ہوتا جائیگا——

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند قطرۂ نیساں ہے آغوشِ صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

اجسام میں متحرک کی قید لگائیے حیوان کہلانے لگا۔ حیوان کو ناطق میں بند کر دیجئے تو انسان ہو جائیگا۔ انسان میں لطافت و نزاکت حسن و دلکشی کی قیود کا اضافہ کیجئے تو قدرت کا حسین ترین شاہکار "عورت" جلوہ گر ہو جائیگی۔ عورت اگر قیدِ شباب میں آئے تو کیا چیز ہوگی" اسے محسوس کر سکتا ہوں لیکن کہہ

نہیں سکتی" ——— وہ ایک برق پاش مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اب تو آپ نے شاعری شروع کردی" اور اس کے چہرے پر ایک خاص کیفیت نمایاں ہوگئی۔

میں: "شاعری نہیں حقیقت ہے عورتیں اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو یقیناً محسوس کریںگی کہ وہ آزادی و ترقی کے نام سے تنزلی کررہی ہیں اور اپنے صحیح مقام سے پستی کی جانب اُتر رہی ہیں ؎

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

"تو گویا انسانی آبادی کے ایک نصف حصہ کو گھروں کے قیدخانوں میں محبوس و معطل رکھا جائے اور بقول آپ کے "قدرت کا یہ حسین ترین شاہکار" چولہے اور بچے" سے آگے نہ بڑھے۔

میں: "یہ آپ کی زیادتی ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا۔ میرا اعتقاد ہے کہ حیاتِ انسانی عورت کے وجود و امداد کی محتاج ہے۔ بغیر عورت کے زندگی کا نظم و تسلسل ناممکن۔ شگفتگی و شادمانی نایاب۔ ہماری زندگی معاش کی محتاج ہے۔ اور معاش کے دو شعبے ایک فکر و کسبِ معاش دوسرا اہتمام و انتظامِ معاش تقسیمِ کار کے طور پر پہلا شعبہ مرد کے ہاتھوں اور دوسرا عورت کے ذریعہ چل رہا ہے۔

کیوں صاحب! اگر یہ شعبے بدل لئے جائیں تو کوئی ہرج ہے یعنی اب عورت کسبِ معاش اور مرد اہتمامِ معاش کے تجربات حاصل کریں۔

میں: ہرج ہے اور قطعی ہرج ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ ناممکن! کسبِ معاش۔ جہادی صنف ہے عورت کی نزاکت اسکی متحمل نہیں ہوسکتی اہتمام و انتظام سکون و طمانیت کا مقتضی ہے۔ مرد کے گرم دل و دماغ کے بس کی بات نہیں۔ علاوہ ازیں حمل زچگی رضاعت وغیرہ کے موانعات کسبِ معاش کی ہنگامہ خیز زندگی سے مناسبت نہیں رکھتے ——— اُس نے قدرے متبسم ہو کر کہا۔

"یہ رضاعت وغیرہ تو اختیاری چیزیں ہیں ترک کی جا سکتی ہیں۔ رہ گیا نزاکت کا الزام۔ یہ قطعی مردوں کی زبردستی ہے۔ عورتوں کے سر نزاکت کا خوشنما سہرا باندھ کر خود اُن کے محافظ بن بیٹھے۔

میں: آپ نے رضاعت وغیرہ کو اختیاری کہکر معاملہ کو خوب ختم کیا۔ اگر جنسی رجحانات اور فطری تقاضوں کو بغرضِ محال نظرانداز کیا جائے جو کسی طرح ممکن نہیں تو بھی عرض کرونگا کہ میرے اوپر نصف انسانی آبادی کو مجبور و معطل کرنے کا الزام اور آپ پوری آبادی کو بتدریج ختم کرنے کا پروگرام بنانا چاہتی ہیں ———

میں ممنون ہوں کہ آپ نے عورت کی فطری نزاکت پر دلیل کی زحمت سے مجھے سبکدوش کردیا۔ جب آپ مرد کی زبردستی کی قائل ہیں تو عورت کی نزاکت تسلیم کرنے میں آپ کو کیا تامل ہے ——— سچ یہ ہے کہ اگر واقعہ برعکس ہوتا تو مرد کے ہاتھوں میں چوڑیاں اور عورت کے ہاتھ میں تلوار ہوتی۔ مرد رونقِ کاشانہ ہوتا اور عورت میدان کارزار میں مسلح اگر برابر کی جوڑ ہوتی تو یا دنیا ایک مستقل رزمگاہِ جنسی ہوتی یا کم از کم دونوں قسم کے مظاہرے موجود ہوتے۔ جب ایسا نہیں ہے تو عورت کی نزاکت مسلم اور مرد پر اسکی محافظت فرض ؎

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی | نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا | اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

(اقبال)

عورت کی تعلیم ترقی اور آزادی حدودِ نسوانیت کے اندر ہی ہونی چاہئے۔ عورت کے ذہن و ضمیر کی تربیت اس نوع سے ہونی چاہئے کہ قدرت کا "یہ حسین ترین شاہکار" متاعِ نسوانیت کی قدر و قیمت سے خبردار ہو ؎

حُسن جس پیکر میں اپنی جلوہ ارزانی کرے | اس سے کہدو اس امانت کی نگہبانی کرے
اے امینِ حُسن قدرِ حُسن کرنی چاہئے | ہے وہی یوسف جو سعیِ پاکدامانی کرے

(سیماب)

"لیکن اب ہم خود اپنی حفاظت کے قابل ہوگئے ہیں لہذا براہِ کرم مرد اپنی "نوازشاتِ محافظانہ" سے ہم کو آزاد و سبکدوش فرمادیں تو بہتر ہے"۔

میں ——— خوب! اگر آزادی مانگنے سے ملنے والی چیز ہوتی اور اقتدار طلب و خواہش سے ہٹ سکتا تو غلام آباد ہندوستان کب کا آزاد ہوگیا ہوتا۔ آپ دیکھتی ہیں کہ "سیاسی بھکشو" کتنی خوشامد۔ چاپلوسی سماجت و منت سماجت سے آزادی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ آپ کے اس کہدینے سے کہ آپ اپنی حفاظت کے قابل ہوگئی ہیں۔ مرد اپنے اس فرض سے جو قدرت نے اُن کو طاقتی برتری عطا فرماکر ان پر عائد کیا ہے۔ کیونکر روگردانی کرسکتے ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آپ دوسروں سے اپنی حفاظت کرسکتی ہیں تو بھی مرد کے حفاظتی فریضہ کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ کیونکہ آپ خود اپنے سے بھی خطرہ میں ہیں آپ کے پہلو بھی ایک راہزن موجود ہے۔

اُس کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا ——— میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر مرد یہ کہدیں کہ ہم عورتوں کو نظربند کرکے حقیقت میں مرد دل کی حفاظت کررہے ہیں تو آپ کے پاس کیا جواب ہوگا۔ کیونکہ یہ مسئلہ قاعدہ ہے کہ

نظر بند اسی کو کیا جاتا ہے۔ جن سے
خطرہ ہو۔ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ شاعرانہ لفظوں میں ہزاروں بجلیاں
ایک ساتھ کوند گئیں

"تو کیا آپ خطرناک ہیں؟" ——— "میں ——— بےشک ہیں اور یقیناً ہیں
اگر آپ ثبوت چاہیں تو میں لاکھوں شعرائے کرام کے زبانی و تحریری بیانات پیش
کر سکتا ہوں" ——— ابھی میں نے جملہ پورا کیا ہی تھا کہ ایکسپریس رکا، آواز
آئی "فتحپور" میں نے کہا ہمارے شعرا کو "مرغ موذن" کے ساتھ اسٹیشن کے
"قلی" کا بھی اضافہ کرنا پڑیگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا سفر ختم کرنے پر مجبور ہوں
بہرحال ہمسفری کا جتنا بھی موقع مل سکا اس پر ناز رہے گا اور آپ نے ہمکلامی
کا جو فخر عطا فرمایا اور میری خشک و بے مزہ گفتگو کو گوارا فرماتی رہیں اس کا
سپاس گذار ہوں۔

"کیا آپ یہاں اتر جائینگے؟ (اس نے متاسفانہ انداز میں کہا) آپکے
ساتھ گفتگو میں کافی دلچسپی رہی کاش ہمارا ساتھ اور طویل ہوتا۔ آپ کی
باتیں یاد رہینگی ———

"میرے لئے اتنا سہارا ہی کافی ہے اسکا مزید شکریہ" میں بادل ناخواستہ
اٹھا وہ بھی کھڑی ہوگئی اور اس نے معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا ———
ہاتھ کے مس ہوتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ بجلی کی ایک لہر میرے جسم میں سرایت کر گئی
اس پر بھی ایک خاص کیفیت طاری تھی۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور عزیز لکھنوی
کے شعر کو مجسم کر دیا ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

(بجم شاہ) **سردار عالم حامی**
مانک پور۔ پرتاب گڈھ

> ## مشاعرۂ شاعر: مصرع طرح برائے ماہ جون ۱۹۴۴ء
> "شیشہ ٹوٹے کہ چراغ در میخانہ بجھے"
> قوافی دیوانہ۔ پیمانہ وغیرہ۔ قوافی جو لکھے اجتناب کیا جائے
> نوٹ:۔ غزلیں یکم جولائی تک ملنی چاہئیں۔ شاعر کے لئے صرف مستقل خریدار غزلیں بھیج سکتے ہیں
> غزل پر خریداری نمبر درج ہونا ضروری ہے۔ خاص نمبر شعرا اس سے آزاد ہیں۔ منیجر

انقلاب تغزل

دل کے داغوں میں تری جلوہ گری ہونے لگی
رات آئی چھاؤں تاروں کی گھنی ہونے لگی

اہل مال و زر کی جیب اتنی بڑی ہونے لگی
بھوک کی شدت سے گھر گھر خودکشی ہونے لگی

خوش ہوں اے مزدور اب یہ بات بھی ہونے لگی
زندگی تیری شریک شاعری ہونے لگی

پھینک دیں اُن کے دل پر ایک انقلاب آمیز نگاہ
اب جہاں والوں کو تیری آگہی ہونے لگی

داوری شمع تمدن ظلمتیں بڑھنے لگیں
اور ہم سمجھے جہاں میں روشنی ہونے لگی

عشق کے چرچے ہوئے کچھ حسن کے قصے بڑھے
ہم جہاں بیٹھے وہیں پر شاعری ہونے لگی

میں ترا بندہ، ترے بندوں کا بھی ادنیٰ غلام
دے دعا مجھکو کہ بندہ پروری ہونے لگی

بیٹھے بیٹھے جانکلتے ہیں سر انجمن کے پاس
تیری دنیاؤں میں بھی آوارگی ہونے لگی

اب نہیں حسرت کہ کھائیں اور بھی کوئی فریب
اتنی بے مقصد ہماری زندگی ہونے لگی

مدھ بھری آنکھوں سے پھر مخمور آتے ہیں پیام
پھر انہیں محسوس میری تشنگی ہونے لگی

مخمور جالندھری

کیف جمال دوست

شام فراق ہے غم جاناں ہے اور ہم
درماندگی ہے درد فراواں ہے اور ہم

آوارگی کوہ و بیاباں ہے اور ہم
یعنی جفائے گردش دوراں ہے اور ہم

ہر لحظہ اضطراب محبت ہے مستقل
اک بے کنار شورش طوفاں ہے اور ہم

اس زندگی پہ کیا ہو تمنائے زندگی
بے کیفیٔ حیات کا ساماں ہے اور ہم

رہتی ہے لب پہ عشق و محبت کی داستاں
ہر وقت ذکر حال پریشاں ہے اور ہم

دیکھا ہے جب سے عالم کیف جمال دوست
ساغر ہے مئے ہے جوش بہاراں ہے اور ہم

اپنے نیاز عشق پہ کیوں ہو نہ ہمکو ناز
گوہر کسی کا گوشۂ داماں ہے اور ہم

(سید) مظفر حسین گوہر (اقبال آباد علیم)

نفسیات

وہ اپنے کو ماہرِ نفسیات سمجھتا تھا۔

آج ہنسی اسکے قابو سے باہر تھی، معلوم نہیں یہ ہنسی فطری تھی یا مصنوعی، لیکن معنی خیز ضرور تھی اس میں کوئی راز تھا جسکو شروع میں اخلاق نے مصلحتاً بتانے سے انکار کیا اور تجسس کی بیتابیاں بڑھتی گئیں۔ آخرکار اُس نے سب کچھ بتا دیا ـــــــ وہی مخصوص اندازِ بیاں، وہی محبت آمیز لہجہ اور وہی نفسیات کی آڑ لیکر اپنے ہر فعل کی صفائی کر دینا ـــــــ اخلاق نے بڑی تمہید کے بعد بتایا کہ اسوقت جب اسکی کالج کی زندگی کا آخری سب سے بے رونق سال ختم ہونے کو تھا۔ للیتا سے اتفاقیہ ملاقات کیوں نہ اسکے دل و دماغ پر غیر معمولی اثر کرتی ہم لوگ اسکی باتوں کا پچاس فیصدی حصہ صحیح سمجھتے تھے لیکن پھر بھی اس نے یہ بتانے میں پس و پیش نہ کیا کہ للیتا اسکی علمی قابلیت اور خصوصاً اسکے نفسیاتِ انسانی پر عبور سے کافی متاثر ہے۔

اسی دن سے مجھے اسکے کردار سے ایک طرح کی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میں نے معمولی سے معمولی تبدیلیوں کو بھی غور سے دیکھنا شروع کیا ـــــــ آواز میں درد کا، چہرہ پر پاؤڈر کا، لباس میں خوشبو کا، اور ہونٹوں پر پان کی سرخی کا اضافہ زیادہ قابلِ توجہ نہ تھا۔ یہ تو ایک انسانی کمزوری ہے۔ میں نے خود یہی درجے میں دوسرے لڑکوں کو بھی، جو اپنے کو تعلیم یافتہ سمجھتے تھے، اس سے بڑی حماقتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ للیتا کے درجہ میں داخل ہونے ہی ان میں "خاتونِ مشرق" اور "خاتونِ مغرب" پر گرم بحثیں سنی تھیں، انھیں کے منہ سے اُن کی قابلیتوں کے چرچے سنے تھے بے محل مذاق کرکے انھیں لوگوں کو للیتا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ صرف اس اُمید پر کہ وہ بھی ان کے بے معنی فقروں پر جھوم جائے اور اسی لیے اخلاق میں یہ تبدیلی زیادہ قابلِ تعجب نہ تھی۔

حلقہ احباب میں ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ اخلاق کی خواہشات کے ساتھ ساتھ اسکی حماقتیں بھی جوان ہوتی جا رہی تھیں۔ اسکا زیادہ تر وقت کالج کی محفلوں کی نذر ہوتا تھا۔ لباس کی ضرورت سے زیادہ اہمیت اور اس میں دن میں کئی بار تبدیلی مضحکہ خیز صورت اختیار کر رہی تھی۔ للیتا کے ملنے والوں سے خود بخود متعارف اور پھر بے تکلف ہو جانا اور اُس سے گفتگو کرنے کے بعد گھنٹوں اس پر تبصرہ کرنا اور اُن کی باریکیوں اور پوشیدہ معنوں پر غور کرنا اسکا پسندیدہ شغل تھا۔ گانے کی مشق بڑھتی جا رہی تھی اور اپنی چال میں نزاکت، لوچ اور جاذبیت پیدا کرنے میں اُس کو کافی محنت کرنا پڑی تھی۔ اُس کے ساتھی اسکی ہر ایک ادا پر مسکراتے لیکن 'ماہرِ نفسیات' سب کو تلقین کرتا کہ "صنفِ نازک سے قریب رہنے سے ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور انسان اپنے کو ہر وقت سنوارنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر تم لوگ میری جگہ ہوتے تو یہی کرتے" اور اسکی گفتگو ایک تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ختم ہو جاتی۔

مجھے اخلاق کی باتوں پر ہنسی آتی، کیونکہ میں نے بھی 'للیتا' کو قریب سے دیکھا تھا، اسکے کردار کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ میں اسکو "مجسم اخلاق" سمجھتا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ لوگ اس کے اخلاق سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسکا شریف برتاؤ انکو غلط فہمیوں کا شکار بناتا ہے وہ ہر ایک سے ملتی اور سچے دل اور پاک ارادوں کے ساتھ قومی ہمدردی اور بے غرض مدد کرنے کا جذبہ اسکی ہر بات سے ظاہر ہوتا۔ عصمت کو اسکی ہستی پر ناز تھا۔ اُس نے لوگوں کو صرف دیکھا نہ تھا بلکہ اُن کے دل کی گہرائیاں بھی دیکھی تھیں۔ وہ اپنے کو ماہرِ نفسیات، تو نہ کہتی تھی لیکن حقیقتاً اُسے ہر شخص کے پہچاننے میں بڑا درک حاصل تھا۔ اس میں کردار کی رگ رگ سے واقف ہو جانے کی صلاحیت تھی، وہ اپنے ساتھیوں کی نگاہوں میں غرور بھی دیکھ سکتی تھی اور انکسار بھی۔ اُس میں قابلیت کو پرکھ سکنے کی قابلیت بھی تھی اور جہالت سے نفرت کرنے کا جذبہ بھی۔ اُس نے دولت و ثروت کے اظہار میں ہوس کی کارفرمائیاں دیکھی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ جب ہولی کے موقع پر اخلاق کو تیار کیا گیا کہ وہ للیتا کو ایک بیش بہا تحفہ پیش کرے تو میں نے اسکی مخالفت کی اس لئے کہ مجھے للیتا کی شرافت کے ساتھ ساتھ اپنے دوست کی عزت کا بھی پاس تھا اور مجھے ڈر تھا کہ یہ بڑھتی ہوئی دلچسپی کسی دن دیوانگی کی صورت نہ اختیار کرلے۔ لیکن اسوقت اخلاق کی روش کی مخالفت کرنا اُس سے دشمنی مول لینا تھا ـــــــ اور حسبِ معمول تمام دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ زمانہ

نیا۔

تھکے ہوئے موسم نے ایک آخری انگڑائی لی اور کالج کا شباب ختم ہوگیا۔ ...پر خاک اُڑانے لگی جہاں ہر وقت ہزاروں روحیں رقص کرتی پھرتی ...۔ کالج کے کمرے خاموش اور افسردہ تھے ـــــ وہ کمرے جہاں جوانی ...، چمکتی ہوئی آنکھیں ہم عمر نگاہوں سے ٹکراتی ہیں جہاں رومانی جذبات ... بدلتے ہیں اور اپنے خطرناک انجاموں کے ساتھ سو جاتے ہیں۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ میں اخلاق کے مکان پر پہونچا، وہ صحن میں بیٹھا ہوا تھا ـــــ بالکل خاموش جیسے اُس نے کوئی دردناک نظم سُنی ہو۔ سورج کی کرنوں کی طرح اسکی جوانی بھی ڈھلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے کچھ اشعار سنائے۔ آج اسکی آواز میں بلا کا درد تھا اور اسکی آنکھوں میں ایسی مایوسی تھی جو میں نے آجتک نہ دیکھی تھی۔ درد بھرے اشعار اسکے دلچسپ اور ہر دلعزیز موضوع کی محض تمہید تھے۔ وہ اپنے دل کی داستان سنانے کے لئے بے چین سا تھا۔ چنانچہ چار سامنے آتے ہی اُس نے کہنا شروع کیا "کیول ڈیر، (DEAR) ـــــ میرا عقیدہ ہے کہ محبت کی یہ اُلجھنیں صرف میرے دل تک محدود نہیں بلکہ اُس کے دل میں بھی ایک خلش پیدا کر دیتی ہیں جس پر میں نے اپنی نیندیں نثار کر دی ہیں۔"

مجھے اس قسم کے سوال کی اُمید تھی اور جواب کے لئے بھی میں تیار تھا ـــــ ایک ایسا جواب جو صحیح صورت حال کو واضح کر سکے ـــــ میں نے کہا "لیکن آج ...نیا کافی تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور دل و دماغ کی کشمکش کو اچھی طرح سمجھنے والی ہوگئی ہے۔ آج دل کا قبضہ دماغ پر اتنا زیادہ نہیں ہے۔ لوگ اندھی محبت نہیں کرتے اور نہ ان نظریوں پر یقین رکھتے ہیں کہ سڑکوں پر چلتے ہوئے محبت ہو جائے اور بغیر کسی قربت کے بڑھتی جائے۔ خصوصاً ہندوستان میں یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہے۔ جہاں رسم و رواج کی پابندی، ملت و مذہب کی عزت اور عمر اور خاندانی وقار کی بندشوں کا کچھ لحاظ رکھنا ہوتا ہے تو محبت ان حدود میں آکر دم توڑ دیتی ہے۔ ـــــ اخلاق نے میرے اشارے کو سمجھ لیا اور حقیقت کی تلخی کو محسوس کرکے تڑپ کر کہنے لگا "تم بسا اوقات بچوں کی سی باتیں کرتے ہو، تمہاری حماقتوں پر جسقدر بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ ارے بھائی، میں نے نفسیات اور فلسفے پر کتابیں پڑھی ہیں، میں نے للیتا کی ہر نقل و حرکت کو مختلف پہلوؤں سے جانچا ہے۔ تم خود غور کرو۔ میں زیادہ تر ساتھ رہتا ہوں، اور پھر ہر وقت اُس سے محبت اور جنسیات پر بحث کرتا ہوں، اس سے زیادہ قربت اور کیا ہوسکتی ہے، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ سب سے بڑا اثر انسانی وجاہت کا پڑتا ہے۔"

اس کے بعد وہ معصوم انداز میں مسکرایا۔ جیسے اسکو میری سادگی پر رحم آرہا ہو۔ ایک شاعرانہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا "تمہیں کیا معلوم کہ میں نے چھٹیوں کے دن کس طرح گن گن کے کاٹے ہیں۔ اس زمانے میں میں نے صرف محبت، شادی اور جنسیات پر کتابیں پڑھی ہیں اور یہ قانون فطرت ہے کہ صنف نازک میں محبت کا جذبہ قوی تر ہوتا ہے لیکن وہ اسکے اظہار میں کبھی پیش قدمی نہیں کرتی ـــــ پھر تم ہی بتاؤ کہ اگر میں نے اپنے خط میں اسکی دل کی بات لکھدی تو کیا بُرا کیا ـــــ لیکن نہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی ہیں اور نہ خط کا جواب آتا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ ڈوبتے ہوئے چاند نے میری نیند سے بوجھل آنکھیں دیکھی ہیں اور طلوع ہوتا ہوا آفتاب میرے آنسوؤں پر مسکرایا ہے۔" میرے اصرار پر اخلاق نے بتایا کہ اپنے خط میں اُس نے چند رومانی اشارے کئے ہیں اور اُس کے بعد اُس نے اپنی طویل داستانیں چھیڑ دیں ـــــ اب مجھے اسکی حماقتوں پر ہنسی کے بجائے رونا آرہا تھا

گرمیوں کے طویل، خاموش، اور جلتے ہوئے دن ختم ہوگئے۔ بہار اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ آئی اور کالج میں زندگی سی زندگی بھر دی۔ فضا، مبارکبادیوں، قہقہوں اور معصوم لڑکیوں کے بے معنی فقروں سے گونج اُٹھی۔ کالج کی روشوں پر ساریوں کے آنچل لہرانے لگے، پھر وہی قیمتی شیروانیاں، سوٹ، ٹائی اور چمکتے ہوئے جوتے ـــــ کہیں سرمایہ داری کے مظاہرے، کہیں مفلسی کا ماتم ـــــ سہمی سہمی سی لڑکیاں اور مسکراتے ہوئے لڑکے ـــــ انھیں میں مجھے اخلاق نظر آیا ـــــ افسردہ، خاموش اور نڈھال ـــــ آج اسکے اشتیاق نے بے رخی کا منہ دیکھا تھا، اسکی امید سے چمکتی ہوئی آنکھوں نے للیتا کی آنکھوں میں غصے کی چمک دیکھی تھی ـــــ بے نیازی کی جھلک اور پھر ان آنکھوں میں جن کو پہلی بار دیکھ کر اخلاق نے محسوس کیا تھا کہ انسانی جسم میں آنکھوں کی قیمت کسقدر گراں ہے اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

مجھے للیتا کی شرافت پر بڑا اعتماد تھا۔ میں کیسے یقین کرتا کہ اُس نے کسی کے خط کا جواب نہ دیا ہو یا کسی کی بات کا جواب کرخت لہجے میں دیا ہو۔ میں نے اُس سے اُسکے رویّہ کی وجہ پوچھی۔ لیکن مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ میں اپنے کو مجرم تصوّر کرنے لگا کہ میں نے ایسا سوال پوچھا ہی کیوں ـــــ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب للیتا نے بتایا کہ اخلاق نے اپنے خط میں دل کی دھڑکنیں بھر دی تھیں اس میں شب کی آہیں تھیں اور صبح کے نالے۔ اس میں تنہائی کی الجھنوں کا ذکر بھی

تھا اور یکجائی کے خواب بھی ـــــــ

اب مجھے نہ اخلاق سے دلچسپی ہے اور اس کے کردار سے ــــــ اسکی دنیا بدل چکی ہے۔ اسکی محبت کی منزل وہ ہے جہاں للیتا کو بھی اسکی حالت سے ہمدردی ہے وہ حماقتوں کا جواب شرافت سے دیتی ہے۔ اخلاق اشتراکی ہے اور محض اشتراکی ــــــ مزدوروں اور غریبوں پر جان دینے کو تیار اور سرمایہ داری کا جانی دشمن لیکن سوٹ پر ایک اچھی رقم خرچ کرنے کے بعد پالش کرنیوالے کے دو پیسے زیادہ مانگنے کا جواب اب بھی ٹھوکر ہے۔ سینما گھر میں غریبوں کی حالت زار پر آنسو بہاتا ہے لیکن باہر آکر تانگے والے کو کچھ کم دینے کی کوشش اب بھی باقی ہے۔ اسکی محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ اس جذبے کو لامحدود بنانا چاہتا ہے۔ ہر لڑکی سے ملنا، محبت کرنا اور جنسی خواہشات کو پورا کرکے اسکو بھول جانا ہی اسکا نظریہ حیات ہے اسکے خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے لیکن اب بھی وہ خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے اور حسن و رومان کا بھوت اس پر اب بھی سوار ہے۔ جوش ملیح آبادی کے گرانقدر مجموعوں میں "جنگل کی شہزادی" اسکی سب سے زیادہ پسندیدہ نظم ہے ــــــ

سیّد ذکی رضا رضوی بی۔ اے (آنرز)

پردۂ نگاہ

نہ فغاں میں اثر نہ آہ میں ہے — دل کی ہر بات اشتباہ میں ہے
درد و غم اضطراب و جوش جنوں — اک قیامت دل تباہ میں ہے
جلوۂ حسن ہو کہ جلوۂ عشق — جو بھی کچھ ہے مری نگاہ میں ہے
بے خبر ڈھونڈنے چلا ہے کہاں — حسن تو پردۂ نگاہ میں ہے
میں ہوں اور لذتیں ندامت کی — کچھ عجب کیفیت گناہ میں ہے
وہ کبھی دل میں جلوہ فرما ہیں — دل کبھی ان کی جلوہ گاہ میں ہے

ہے یہ توحید عشق اے میکش
جو ہے دل میں وہی نگاہ میں ہے

میکش اترولوی

نالۂ بے صدا

صدائے نغمہ ہائے جانفزا کیا — سکوت نالہ ہائے بے صدا کیا
تمناؤں میں برپا ہے قیامت — دل مرحوم زندہ ہو گیا کیا
مکین لامکاں دل میں مکیں ہے — ہمیں دیر و حرم سے واسطا کیا
کسی سے مجھ کو امید وفا ہے — کسی کی بیوفائی کا گلا کیا
جنوں کے مختلف منظر ہیں بھی — خرام ناز کیا حسن ادا کیا
سوا تیرے نہیں جب کوئی موجود — تو پھر نقش وجود ماسوا کیا
مسیحا ہے مرض جب تیرے حق میں — مریض عشق اب سعی دوا کیا

حیات دہر حاوی یک نفس ہے
پھر اس طول امل سے مدعا کیا

(پیرزادہ) حاوی نعمانی بہاولپوری

اے عشق کہیں لے چل

شوکی

بھیگی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ فضا میں نکھار اور مستی آگئی تھی۔ ٹھنڈک تر اسے تھے۔ جھینگر بھی چپ۔ چپ بھی کا نغمہ الاپ رہی تھی اور ساون کی سہانی بوندیں برس کر چھم چھم کرتی ہوئی ابھی ختم ہوئی تھیں۔ میں جلد ہی کھانے سے فراغت حاصل کرکے چھت پر آگیا۔ مدہوش کن چاندنی کی بدمست فضا نے مجھ میں سرور پیدا کر دیا خواہ مخواہ دل کا تار جھنجھنانے لگا۔ رگ رگ میں نشہ سا چھا گیا اور وسعتِ خیال میں کائنات ناچنے لگی۔ میں نے منڈیر سے لگ کر نیچے جھانکا، اور سیاہ لٹوں کے دو ناگوں کے درمیان ایک انتہا سے زیادہ ملائم اور دلنواز چہرہ نظروں سے ہو کر دل کی گہرائی میں ڈوب گیا۔

"زقو" میں پکارا وہ سیاہ ناگ پشت پر چلے گئے، اور کمان سی لچک پیدا کرکے، ذرا جھک کر، دھیمے سے، بھیگی آنکھوں کو بھیگی چاندنی سے اور بھگو کر وہ گنگنائی: "اختر" میرے دل کی دھڑکن میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔ کپکپاتے لب اور کپکپانے لگے اور میں پکارا "آج تو خوب بارش ہوئی" وہ مسکرائی جیسے برف کی ڈلی چمک رہی ہو اور بولی "ساون کی رت جو ہے" اور میں سوچنے لگا کہ ساون کی رت بھی ہے، چاندنی بھی اپنے پورے شباب پر ہے۔ ہمارے دل بھی جوان ہیں، موسم جوان ہے اور سب سے بڑھ کر تو ہماری محبت جوان ہے گو تم اس کا اقرار نہیں کرتی ہو اور نہ کرنے کی امید ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ ہماری نظروں کا تصادم دونوں دلوں کو رہا جاتا ہے، دونوں کے رگ و پے میں بجلی دوڑ جاتی ہے اور میرے لپک کر منڈیر سے لگنے کے ساتھ ہی تمہاری نازک کمر بھی لچک کر بل کھانے لگتی ہے۔ اسے محبت نہیں کہتے تو کیا کہتے ہیں؟ لیکن تم اپنے ملائم ہونٹوں کی کپکپاہٹ کو یہ کہنے کی تکلیف نہیں دوگی کہ ہاں یہ محبت ہی ہے۔

"زقو" میں نے کہا "کاش میں شاعر ہوتا"۔

"پھر" اس نے سیاہ ناگوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"پھر" میں نے جواب دیا "پھر میں دیوان کے دیوان اس خوشگوار سماں، اُبلتی چاندنی، بھیگی فضا، ہنستے مناظر، اور . . . . اور تم پر لکھ ڈالتا"

"مجبور ——————؟" وہ شرم اور تبسم کے سنگم پر آئی اور کائنات میں جوانی بکھیرتی ہوئی کھٹ کھٹ نیچے اتر گئی اور میں دیر تک، بہت دیر تک ماہتاب کی سیمیں چاندنی میں چھت پر لیٹا غالب اور داغ کے اشعار گنگناتا رہا۔

دوسرے روز صبح سویرے میں اٹھ کر غسل ہی کر رہا تھا کہ دروازہ پر ایک فٹن آکر رکی اور میں سمجھ گیا کہ خالہ جان کلکتہ سے بغرض تفریح آئی ہیں۔ جلدی سے کپڑے پہن کر میں ان سے ملنے آیا۔ خالہ تو خیر خالہ ہیں مگر خالہ کی زیبا تو کبھی زیبا نہیں ہو سکتی۔ گوری رنگت، مخملیں رخسار، ستواں ناک، کٹورے جیسی آنکھیں، گدرایا ہوا بدن اور لہراتے ہوئے گیسو۔ میرا دل بری طرح کانپا سانس میں بے ربطی پیدا ہوگئی اور میں سوچنے لگا کہ "کاش میں تم کو اپنا سکتا تمہارے نرم گیسو، مخملیں رخسار، اور شربتی آنکھوں کو سجدہ کر سکتا اور تمہارے دل کی دھڑکن میں اپنی دھڑکنوں کو جذب کر سکتا تو میں سمجھتا کہ میں ایک خوش قسمت انسان ہوں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب تم بھی مجھے اپنی زلفوں کے سایہ میں پناہ دینے کے لئے رضامند ہو جاؤ۔

میں انھیں خیالات میں مستغرق تھا کہ زیبا ایک قدم آگے بڑھی اور لجاتے ہوئے بصد ناز بولی "بھائی جان! میں آپ کی کامیابی پر آپ کو بہت بہت مبارکباد دیتی ہوں" اور ایک خوشنما گھڑی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ خالہ اور والدہ کی ہنسی کے درمیان، زیبا کے انگوری لبوں کی لرزشِ پیہم پر غور کرتے ہوئے میں گھڑی لیکر اپنے کمرہ میں چلا آیا، دل میں مسرت اور انبساط کی ایک دنیا انگڑائیاں لے رہی تھی۔

اسی روز شام کو میں کچھ پڑھ رہا تھا کہ ہلکی چاپ کے ساتھ زیبا کی آواز سنائی دی۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟" اور میں نے ہزاروں عجز کی شانیں پیدا کرتے ہوئے اس کی پذیرائی کی اور جب اس نے قہقہہ لگایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کائنات جھوم گئی ہو۔ بلبلیں نغمہ گئی ہوں اور ساون کی گھٹا کھلکھلا کر ہنسنے لگی ہو۔ "کیا پڑھ رہے ہیں آپ؟" اس نے سوال کیا اور میں نے غالب کا

دیوان آگے بڑھا دیا۔

"خوب تو گویا آپ شعر و سخن سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اچھا بتائیے تو اس میں کون شعر آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"رہئیے اب ایسی جگہ چل کر ——— الخ" میں نے جواب دیا اور اس پر ایک خندۂ شیریں کے ساتھ وہ بولی "آخر آپ اس عمر میں کنجِ تنہائی کو کیوں پسند کرتے ہیں؟"

میں کیا جواب دیتا۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتا کہ تمہارے رسیلے ہونٹوں سے شہد نہیں چھین سکتا اور تمہارے ہوشربا جسم کو گود میں سمیٹ نہیں سکتا اس لئے میں نے کنجِ تنہائی کو ترجیح دی ہے۔ لیکن اگر تم اس کے لئے تیار ہو جاؤ اور جذبہ سپردگی کو اپنے دل کے کسی گوشہ میں جگہ دے دو تو میں اس خیال سے باز آ سکتا ہوں کیوں!" اور میں نے بطور استفہامیہ اس کی طرف دیکھا اور شاید وہ بھی میری نگاہوں کا مطلب اخذ کرتی ہوئی مسکراہٹوں کے ساتھ چلی گئی۔

میں رات کو کھانا کھا کر چھت پر گیا۔ زیبا کچھ خط و کتابت میں مصروف تھی میرے کانوں میں ہلکی سی آواز آئی "اختر" اور میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ منڈیر سے نیچے نظر کی تو دو تو تھی، چھت پر، کالے گیسوؤں کو سینہ پر پھیلائے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی "بڑا انتظار کرایا، میں تو نا امید ہو چلی تھی۔"

"کیوں ———؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیوں ——— !" وہ سٹ پٹا گئی "میرا مطلب یہ ہے کہ میں دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی"

"او و معاف کرنا مجھے مطلق فرصت نہیں" میں نیچے بھاگا۔ کمرے سے زیبا کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی، صاف اور شیریں لَے میں ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

شہاب انجینئرنگ کالج

(۹۷) مسٹر ایم جمیل سیالکوٹ سے ۶ سالانہ
(۹۸) جناب منشی شاہ محمد صاحب بدایونی سے ۶ سالانہ
(۹۹) جناب سردار احمد خاں صاحب بلوچ رئیس فرد کہ۔ ضلع سرگودھا سے ۶ سالانہ
(۱۰۰) جناب حکیم ڈاکٹر محمد عبد الحبیب صاحب ناظم ایم ڈی۔ ایچ۔ رمضان پور بونگیر سے ۶ سالانہ
(۱۰۱) جناب عبد الرحمٰن ابن حسین صاحب ساگر۔ سی۔ پی سے ۶ سالانہ
۱۰۲ جناب مولوی احسان حسن خاں صاحب احسان۔ بسلیم پور ڈومریا ضلع مظفر پور سے ۶ سالانہ

(بقیہ خاصانِ ادب صفحہ ۴)

(۶۱) جناب ابراہیم خاں رحمت خاں صاحب فرقت جوناگڈھ سے ۶ سالانہ
(۶۲) جناب خان شری محبت خاں جی آف کوٹھری بانٹوا (کاٹھیاواڑ) سے ۶ سالانہ
(۶۳) جناب عبد الستار خاں صاحب قائم گنجوی سے ۶ سالانہ
(۶۴) جناب حبیب خاں صاحب حبیب شاہجہانپوری کوئٹہ سے ۶ سالانہ
(۶۵) مسٹر آتم سنگھ بی۔ اے دہلی سے ۶ سالانہ
(۶۶) محترمہ حجاب بنارسی (ناگپور) سے ۶ سالانہ
(۶۷) محترمہ اسما اے علوی صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ
(۶۸) محترمہ نفقہ جی بوٹیا صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ
(۶۹) جناب یحییٰ بھائی محمد علی صاحب راولپنڈی سے ۶ سالانہ
(۷۰) جناب عارف ابراہیم یوسف برکار قادری بانکوٹی سے ۶ سالانہ
(۷۱) جناب خانصاحب انور خاں جی آف ناکڑہ دربار گڑھ بانٹوا۔ کاٹھیاواڑ سے ۶ سالانہ
(۷۲) محترمہ میمونہ صاحبہ کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۳) جناب سید ظہیر حسین صاحب ظہیر مہدی سے ۶ سالانہ
(۷۴) جناب رفیق احمد صاحب رفیق نشاط کلکتوی۔ ہوڑہ سے ۶ سالانہ
(۷۵) جناب اکرمی غلام علی صاحب تختے والے کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۶) محترمہ بتول نور الدین ٹپال کراچی سے ۶ سالانہ
(۷۷) مسٹر ممتاز صحرائی جڑملٹ لنگر مخدوم (پنجاب) سے ۶ سالانہ
(۷۸) محترمہ لیڈی سر رحیم بخش سابا (ضلع انبالہ) سے ۶ سالانہ
(۷۹) جناب کچھ طول صاحب قنبا برکٹی سے ۶ سالانہ
(۸۰) جناب جگن ناتھ پوری صاحب رضا دہرم کوٹ ندھاوا (پنجاب) سے ۶ سالانہ
(۸۱) جناب سیٹھ فدا حسین طیب علی صاحب راولپنڈی سے ۶ سالانہ
(۸۲) جناب حاتم علی عبد الحسین صاحب علی گڈھ سے ۶ سالانہ
(۸۳) جناب حمد خانصاحب ساحل بمبئی سے ۶ سالانہ
(۸۴) جناب آل حسین صاحب دناپور سے ۶ سالانہ
(۸۵) جناب چودہری صادق علی صاحب نوان جلا پور سے ۶ سالانہ
(۸۶) جناب فدا حسین علی بھائی صاحب راولپنڈی سے ۶ سالانہ
(۸۷) جناب ڈاکٹر ممتاز احمد خانصاحب نوشتر کفنڈوہ سے ۶ سالانہ
(۸۸) جناب احمد شہاب الدین صاحب شہاب داپولی ضلع رتناگری سے ۶ سالانہ
(۸۹) جناب چودہری لال محمد صاحب ن فریٹ کیشن ایجنٹ شاہجہانپور سے ۶ سالانہ
(۹۰) جناب حکیم سید عباس علی صاحب آسی ترپاتور (ویلور) سے ۶ سالانہ
(۹۱) جناب حافظ اسحاق صاحب ہلال برہمی کوکشی (دھار) سے ۶ سالانہ
(۹۲) جناب سید مرید حسین صاحب مجذوب۔ رجوعہ (جھنگ) سے ۶ سالانہ
(۹۳) جناب گل محمد صاحب منظر کلیمی جام پوری سے ۶ سالانہ
(۹۴) جناب لکشمی نرائن صاحب فارغ ازا ودے پور سے ۶ سالانہ
(۹۵) جناب عبد الرحیم صاحب اثر رحمت نگری سے ۶ سالانہ
(۹۶) جناب بی ایس کنول۔ یول کیمپ ضلع کانگڑہ سے ۶ سالانہ

شبنم

میری ویران راتوں میں چمکنے والی زہرہ ——— ! تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے۔

میرا ابتک وہی حال ہے ——— میں اکثر راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر تم سے باتیں کرتا ہوں ——— بتاؤ کیسے بھول جاتا؟ دُنیا اسقدر وِیرانی ہونے آئی لیکن چاند کی مسلسل سرد مہری کے باوجود چکور کے دل میں اُس پر قربان ہونے کی تمنا آج بھی بیدار ہے، شمع کی بیرحمی سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی پروانہ اُس سے ہمکنار ہو کر جل مرنا ہی محبت کی معراج جانتا ہے، بھونرا ابتک کنول کی نازک پنکھڑیوں میں قید ہو کر جان دیدینا شرطِ محبت سمجھتا ہے۔ پھول کی مسلسل خموشیوں کے باوجود بلبل آج بھی اسکی زبان سے نغمۂ محبت سننے کے لئے بیچین ہے ———

فطرت نے شاید ازل ہی سے حُسن کو ظالم اور محبت کو آشفتہ سر بنایا ہے ———

اچھا ہی کیا تم نے مجھے بھلا دیا، اچھی شبنم! ورنہ شاید میری طرح تمہاری زندگی بھی سنسان ہو جاتی۔ اب تم سکھی ہو: میرا خدا جانتا ہے، میں بھی خوش ہوں ؎

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
تو زندگی وہ محبت کی زندگی نہ ہوئی

مگر تم سے ایک بہت بڑی شکایت ہے۔ بھولی شبنم۔ تم نے میرے دل پر پاؤں رکھدیا اور تمہیں کبھی اس کا احساس بھی نہ ہوا کہ تمہارے پیر کے نیچے کیا ہے؟ کسی کا سکون! کسی کی تمنا! کسی کی زندگی!!! تمہیں اپنا بنانے کے خیال سے تو میں اُسی دن مایوس ہو چکا تھا جبدن میں نے اپنے مقابل کچھ چمکتے ہوئے ستارے دیکھ لئے تھے۔ لیکن میں ایک اچھوتے طریق پر تم سے قریب رہنا چاہتا تھا ——— جیسے مرغابی کے پر پانی میں رہنے کے باوجود بھیگتے نہیں، لیکن مرغابی پانی کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتی ——— میں چاہتا تھا ؎

مجھے اور جس طرح چاہو مٹا دو
مرے ہاتھ سے اپنا دامن نہ کھینچو

آہ! نہ پوچھو تم نے کسقدر نراس کر دیا۔ جگر بیٹھا جاتا ہے شبنم ——— بالآخر پر جب نظر ڈالتا ہوں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ امیدوں کے خاکستر میں اب ایک چنگاری بھی چمکتی نظر نہیں آتی۔ ناکام آرزوؤں پر آنسو بہانے کے سوا اب زندگی میں باقی ہی کیا رہ گیا ہے، لیکن دل اب بھی دھوکے دئیے جاتا ہے اور شاید اسی لئے میں زندہ ہوں ؎

یہ وہم ہو کہ حقیقت، سکون ملا ہے اسی سے
سمجھ رہا ہوں کہ تو بیقرار میرے لئے ہے

غضب ہوا کہ رات ایک عجیب خواب دیکھا، جیسے تم پرار کے کمرہ کا پردہ ہٹا کر میری کرسی کے عقب میں آ کھڑی ہوئیں، اور تم نے چپکے چپکے کہنا شروع کیا "شبنم تمہاری ہے۔ شبنم کا جسم تمہارا نہ ہو سکا لیکن اسکی روح کے صرف تم مالک ہو۔ اپنی آخری سانسوں تک وہ تمہاری ہی رہیگی۔ شبنم کے خون کے ذرّہ ذرّہ میں تمہاری محبت کی گرمی رقصاں ہے۔ شبنم کے تخیل میں صرف تم آباد ہو"! گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میری زبان پر یہ شعر تھا جو میں نے تمہاری .... کے موقعہ پر کہا تھا۔

مجھ سے تجھ کو کوئی طاقت دُور کر سکتی نہیں
دل تو مر سکتا ہے روحِ عشق مر سکتی نہیں

توبہ! کسقدر عجیب لیکن کتنا رنگین خواب تھا۔ بھلا یوں ہو بھی سکتا ہے؟ غلط! شاید ناممکن!! مایوسیوں نے دل و دماغ پر ایک دھندلکا سا بکھیر دیا، ساری فضا ویران نظر آنے لگی۔ میں نے گنگنانا شروع کیا ؎

تجھ سے چھٹ کر زندگی بے لطف ہی بے کیف ہے   ورنہ دُنیا اس سے پہلے مجھ پہ بار ایسی نہ تھی

شبنم! سوچتا ہوں تمہیں اپنے کچھ شعر سناؤں یا نہ سناؤں؟ جو میں نے صرف تمہارے لئے کہے ہیں یا وہ جو ہماری پہلی یا آخری ملاقاتوں کی یادگار ہیں ——— لہو کی چھینٹیں، آگ کے شرارے اور دل میں ٹوٹ کر رہ جانے والے نشتر ——— اچھا اسوقت صرف ایک شعر سن لو ؎

جب تو نہیں ہے ساتھ تو کیا چاندنی کا لطف   داغِ سیاہ ہے مہِ کامل ترے بغیر

یاد ہے تم نے میرا ایک نام بھی رکھا تھا۔ اسوقت جب میں نے تمہیں پہلی بار شبنم کہہ کر پکارا۔ شروع کے دو حرف لکھے دیتا ہوں، ممکن ہے یاد آ جائے تمہیں ——— ہوں، اچھا خدا حافظ ——— ما در بنجارم!

مضطرب روحیں

فضاؤں میں نظر آتی ہیں کچھ چنگاریاں مجھ کو — اور ان چنگاریوں میں مضطرب روحوں کی ٹولی سی
یہ روحیں چیختی سی، کلبلاتی سی، تڑپتی سی — سناتی ہیں تمدن کی بھیانک داستاں مجھ کو
جگا دیتی ہیں اکثر ان کی نوحہ خوانیاں مجھ کو

دسمبر کی وہ صبحِ غم فزا بھولی نہیں اب تک — میں اکثر شب کی تنہائی میں چونک اٹھتا ہوں بستر پر
دھڑکتا ہے دل پے در پے چبھ جاتے ہیں کچھ نشتر — تصور میں یکایک کانپ اٹھتی ہے زمیں اب تک
نظر آتی ہے ہر ذرے میں مرگِ ناگہاں مجھ کو

چلی تھی پچھلے اسٹیشن سے وہ لاہور کی گاڑی — جو شاید آٹھ بج کر کچھ منٹ پر آنے والی تھی
وہی گاڑی جو اک مدت سے یونہی آتی جاتی تھی — تڑپتی، دوڑتی، بے تاب بل کھاتی ہوئی گاڑی
گذر جاتی تھی رنگ و بو کا دکھلا کر سماں مجھ کو

فلک پر بزمِ انجم منتشر سی ہوتی جاتی تھی — نرالی شان و شوکت سے افق پر آفتاب آیا
زمیں کی سمت اپنے تیز رو قاصد کو دوڑایا — شفق کے لالہ زاروں سے کرن اک نور کی نکلی
نظر آتی فضا لیتی ہوئی انگڑائیاں مجھ کو

مرے نزدیک ہی اک نوجواں بیٹھا ہوا مردہ — چبائے جا رہا تھا چیتھڑوں میں ہڈیاں اپنی
مگر جچتی نہ تھیں اس سے شکستہ حالیاں اپنی — وہ اپنی زندگی سے آپ شرماتا ہوا مردہ
ابھی تک یاد ہیں اس شخص کی بیتابیاں مجھ کو

یہ آنکھیں دیکھ کر روئی ہیں اکثر ایسی شکلوں کو — یہ عادی ہو چکی ہیں ایسے وحشت ناک خوابوں کی
اسی کا بس میں دل مبتلا ہے اور آنکھیں بھی — میں کوشش کر رہا تھا روکنے کی اپنے اشکوں کو
مگر معلوم ہوتی تھی یہ کوشش رائیگاں مجھ کو

وہ مردہ ریل کی پٹڑی سے تھوڑی دور بیٹھا تھا — فضا ارض و سما کی اس زبوں حالی پہ روتی تھی
ادھر سگنل نے بھی کچھ دیر سے گردن جھکائی تھی — کہیں نزدیک ہی سے آ رہا تھا شور گاڑی کا
دکھائی دے رہا تھا پاس ٹیلوں کے دھواں مجھ کو

صبا رفتار انجن دندناتا پاس سے گذرا — بگولے ساتھ لے کر آندھیوں کا دیوتا آیا
زمیں کانپی۔ فضا تھرا اٹھی۔ اک زلزلہ آیا — وہ مردہ جاگ کر تیزی سے پٹڑی کی طرف لپکا
نظر آئیں ہوا میں اس کی اڑتی دھجیاں مجھ کو

فضا میں ایک ہیبت ناک سیٹی کی صدا گونجی — صبا رفتار گاڑی رک گئی دھچکے سے کچھ کھا کر
میں بجلی کی سی تیزی سے وہاں پہنچا جو گھبرا کر — زمیں پر خون میں ڈوبی ہوئی اک زندگی دیکھی
فلک پر چار سو آئیں نظر تاریکیاں مجھ کو

اور اب تک رات کی تاریکیوں میں ہمنشیں اکثر — نظر آتی ہے مجھ کو مضطرب روحوں کی ٹولی سی
یہ روحیں چیختی سی کلبلاتی سی تڑپتی سی — برنگِ ابر چھا جاتی ہیں دنیائے تصور پر
سناتی ہیں تمدن کی بھیانک داستاں مجھ کو

ناوک بن طالع محمد ساڑی انڈس

درسِ بیخودی

جب حریفِ محفل آرائی ترا کوئی نہیں
پھر جہاں تو ہے وہاں تیرے سوا کوئی نہیں

تیرا غمزہ کسقدر بیگانگی آموز ہے
تیری محفل میں کسی کا آشنا کوئی نہیں

بیخودیٔ شوق نے مجھ کو دیا درسِ خودی
میں ہی میں ہوں ہر طرف میرے سوا کوئی نہیں

کیوں وسائل کا عدم ہو اس قدر ہمت شکن
کیا خدا نا خواستہ میرا خدا کوئی نہیں

تھیں بیاں کرنے کے قابل دردِ دل کی لذتیں
پر کہوں کس سے یہاں درد آشنا کوئی نہیں

راہ پیمائی سے مطلب ہے، نہ کر منزل کی فکر
تو چلا چل، کیا ہوا جو رہنما کوئی نہیں

حوصلہ افزا بھی ہے حوصلہ فرسا بھی
جو نہ آتی ہو تجھے ایسی ادا کوئی نہیں

تو کسی کا ہو کے دیکھ اے شکوہ سنجِ روزگار
کیوں یہ کہتا ہے کہ دنیا میں مرا کوئی نہیں

ہمصفیر اپنا طلب کرتا ہے ذوقِ شعر سے
کیوں حریفِ وحشتِ رنگیں نوا کوئی نہیں

(خان بہادر) رضا علی وحشت کلکتوی

دُعا

ستاروں کو ذوقِ سفر دینے والے
پہاڑوں کو اوجِ نظر دینے والے

عطا کر مجھے رفعت و سربلندی
مہ و مہر کو تاجِ زر دینے والے

مجھے سروری دے مجھے حیدری دے
غلاموں کو تاجِ دگر دینے والے

مری راکھ کو پھر شرار آفریں کر
پتنگوں کو تاب و شرر دینے والے

ملے اشک کو میرے نیساں کی فطرت
صدف کو متاعِ گہر دینے والے

منور مرے دل کی تاریکیاں کر
شبِ غم کو شمعِ سحر دینے والے

دلِ تندخو اور شوقِ جری دے
فغاں کو مذاقِ اثر دینے والے

مجھے نطقِ روح الامیں پھر عطا کر
سخنور کو سوزِ جگر دینے والے

شرابِ محبت سے بے خود بنا دے
دو عالم کی مجکو خبر دینے والے

مجھے بھی عنایت ہو نورِ بصیرت
ستاروں کو نورِ نظر دینے والے

مرا گلشنِ آرزو ہو ثمرور
درختوں کو شرمِ ثمر دینے والے

عبدالکریم ثمر

عبرتِ انجام

اُداس شام اور اندوہناک تنہائی!

ستاروں سے ہم آغوش وسعتِ افلاک — نگار خانۂ ہستی۔ فسانۂ غمناک
صنمکدوں میں بپا ایک بے صدا کہرام — حقیقتوں میں نواریز بربطِ اوہام
درختِ صبح میں پیشانیاں جھکائے ہوئے — دھندلکے ہر طرف اپنی فضا میں چھائے ہوئے
نشیمنوں میں صفیروں کے زمزمے مستور — فلک کی سطح پہ تاروں کی مشعلیں بے نور
تحیرات میں کھوئے ہوئے نشیب و فراز — کسی کی یاد میں ڈوبے ہوئے نشیب و فراز
کراہتی ہوئی سانسوں سے جھاڑیاں آباد — لٹے لٹے سے سمن زار۔ کھیتیاں ناشاد
فضا میں ناگ لپکتے ہوئے سحابوں کے — کنارِ آب پہ حلقے نحیف خوابوں کے

اُداس شام اور اندوہناک تنہائی!

میں بر بنائے تکلف حیات سے مانوس — جلا رہا ہوں امیدوں کے عارضی فانوس
مری نگاہ میں لرزاں ہیں بے مرام نقشے — برائے نام۔ سبک۔ ناتمام و خام نقشے
محیطِ روح ہے اک کسل مند انگڑائی — لبِ خموش ہیں آئینہ دارِ پسپائی
نفس نفس میں ہیں نوحے قرارِ رفتہ کے — مرے حواس ہیں شاکی بہارِ رفتہ کے
دلِ نحیف پہ چرکے لگائے جاتے ہیں — مجھے یہ راگ پپیہوں سے گائے جاتے ہیں
شریکِ حال ہیں میرے بصورتِ غمخوار — یہ انتظار میں ڈوبے ہوئے در و دیوار
ہوا کی ہلکی سی آہٹ پہ کانپ جاتی ہیں — نہ جانے کس کے اشاروں کو بھانپ جاتی ہیں

اُداس شام اور اندوہناک تنہائی!

وفا و حسن کا تھا کس قدر حسیں آغاز — کسی نے پھر نہ فضاؤں سے دی مجھے آواز
وہ عطر بار و غزلخوان سرمئی راتیں — وہ دلنواز کنارے وہ دلنشیں گھاتیں
وہ کیف بار گھٹاؤں میں بارشِ الہام — وہ اضطرابِ سکوں کے لطیف تر پیغام
وہ لمحے آہ وہ لمحے نہ کیوں مدام رہے — صحیفے شوق و تمنا کے ناتمام رہے
ادائے ناز شریکِ نیاز ہو نہ سکی — نیاز خوئی سزاوارِ ناز ہو نہ سکی
کیا نہ صبحِ مسرت نے باریاب مجھے — اٹھا اٹھا کے گرانے پڑے حجاب مجھے
حیاتِ آرزو مجروحِ اضطراب رہی — سکوں فریبیِ ایام کامیاب رہی

اُداس شام اور اندوہناک تنہائی!

محمد عبداللہ مضطر گجراتی

مہر و ماہتاب

چمکا کچھ ایسی شان سے وہ حُسنِ بے حجاب　　دل بن کے رہ گیا مرا اک موجِ اضطراب
ہیں آجکل وہ ساری خدائی میں لاجواب　　عینِ شباب پر ہے جوانی کا ماہتاب
میں اِن دنوں ہوں میکشِ میخانۂ شباب　　رہتی ہے بیخودی مجھے بے جام و بے شراب
دیکھا ہے حُسن و عشق کو اسطرح ہمرکاب　　اک سمت آفتاب تھا اک سمت ماہتاب

(قطعہ)

آ اور میری خلوتِ دل میں سما بھی جا　　یوں شوخیاں دکھا نہ مجھے برقِ بے حجاب
کر ختم بے نیازیٔ پیہم کا سلسلہ　　اچھا نہیں مقابلۂ مہر و ماہتاب

دل آجکل ہے کیفِ مسلسل سے وجد میں　　جیسے کسی حسین کا چھُوتا ہوا شباب
دونوں سے مجھ کو لاگ ہے تو ہو کہ تیری یاد　　بس یوں بھی کامیاب ہوا اور یوں بھی کامیاب
میری نظر میں غم ہے مآلِ نشاطِ زیست　　میں نے کیا ہے اپنے لئے غم کو انتخاب
میری نہ پوچھئے کہ ہوں میں تو شکستہ دل　　ہاں سازِ نو ہے آپ کا نکھرا ہوا شباب
اب میں نہیں ہوں اُن سے تغافل کا شکوہ سنج　　گویا دلیلِ عینِ محبت ہے اجتناب
دانستہ دُور دُور رہوں یوں تیری بزم سے　　تا ہو نہ جائے ذوقِ پرستش مرا خراب
ہر پھُول ہر کلی سے جوانی برس پڑی　　چمکا کچھ اس ادا سے جوانی کا ماہتاب
مجھ سے قریب ہو کے بھی وہ دُور ہی رہے　　اب اسکو التفات سمجھئے کہ اجتناب
یہ آئینہ ہے آیئے کچھ فیصلہ کریں　　یہ آپ کا شباب ہے یا ہے مرا شباب
میں آفتابِ عشق ہوں تو ماہتابِ حُسن　　میرا کہیں جواب نہ تیرا کہیں جواب
اب عزم یہ ہے کیجئے کچھ اُن سے گفتگو　　دل کہہ رہا ہے اب نہیں حائل کوئی حجاب
ہم کہہ گئے یہ اُن سے کہ ہے حالِ دل بخیر　　کہنا یہ تھا کہ حالتِ دل ہے بہت خراب

منظرؔ محیطِ بزمِ دو عالم ہے میری ذات
میرا ہی ایک عکس ہے ہر منظرِ شباب

منظرؔ اکبرآبادی

نا اُمیدی

دیدنی ہے گلشنِ امید کی فصلِ بہار
رنگ و بُو، جوشِ نمو، رقص و سرود و جوئبار

ہر طرف بے صبر ہیں غنچے چٹکنے کے لئے
بلبلیں بے تاب شاخوں پر چہکنے کے لئے
رنگ اور نکہت بداماں ہے نسیمِ جانفزا
مستعد ہیں عطر زا جھونکے لہکنے کے لئے
آس کے اشکِ طرب یعنی یہ قطرے اوس کے
مضطرب ہیں دامنِ گل پر ڈھلکنے کے لئے
ابر بنکر چھا رہی ہیں آسماں پر مستیاں
میکدوں میں خم اچھلتے ہیں چھلکنے کے لئے
لغزشِ مستانہ ہے تھامے ہوئے دستِ نشاط
با وضو بیٹھا ہے تقویٰ بھی بہکنے کے لئے
غیرتِ فردوس گویا ہے چمن اُمید کا
مستعد ایمائے فطرت پر بہکنے کے لئے

محفلِ دل میں نوا و رنگ کا ہے اہتمام
ہے کسی کی منتظر اُمید با صد احتشام

محو ہے آرائشوں میں، نو عروسِ آرزو
اپنی منزل پہ ہے گویا کاروانِ رنگ و بو
کائناتِ دل کا ہر ذرہ چمک اُٹھنے کو ہے
دوڑتی پھرتی ہیں بجلی کی سی لہریں چار سو
"تو ہی تو ہے" کی صدائیں آ رہی ہیں قلب سے
اور فضا پر چھا رہی ہے سطوتِ اللہ ہو
آرزو سے رشتۂ قائم مذہبِ انساں میں ہے
بہرہ مند قرب ہے بندہ بقدرِ آرزو
سوز و سازِ شوق بھی ہے کس قدر صبر آزما
خشک ہو جاتا ہے جس میں خود تمنا کا لہو
ہے حجابِ جہل طاری آگہیِ شوق پر
ورنہ بیٹھی ہے عروسِ کامیابی روبرو

ہو کسی کا بھی بہت تکلیف دہ ہے انتظار
آدمی کو بے سکوں کرتا ہے یہ سیماب وار

اک ہوا ایسی چلی سارا گلستاں جل گیا!
سب نوا و رنگ اور عشرت کا ساماں جل گیا
خشک ندیاں ہو گئیں، چلنے لگی بادِ سموم
آگ غنچوں میں لگی، گلچیں کا داماں جل گیا
ہو گئی غائب ہوس میں محفلِ رقص و سرود
ساز سے شعلے اُٹھے ایسے غزلخواں جل گیا
اے معاذ اللہ سوزش آتشِ جانسوز کی!
جل گیا پہلو میں دل اور دل میں ارماں جل گیا
گلشنِ آرزو میں آگ کچھ ایسی لگی
خرمنِ تسکینِ دل تا حدِ امکاں جل گیا
جل گئے پر طائرِ تخییل کے اک آن میں
دم زدن میں کار فرمائے بہاراں جل گیا

جو چمن سینچا گیا تھا خونِ دل سے بار بار
نا اُمیدی سے ہوا وہ پل کی پل میں نذرِ نار

نا اُمیدی، خستہ و مجروح ہے تیرا اسیر
رہ گیا ہو ٹوٹ کر پہلو میں اس کے جیسے تیر
عقل اس کی نارسا اور ہوش اسکے باختہ
ہمتیں عاجز، ارادے مضمحل، افسردہ ضمیر
مبتلائے درد ہے وہ اور اُسکی زندگی
رہنِ ماتم، وقفِ غم، لاکھوں مصائب میں اسیر
نوحۂ غم نغمۂ عشرت بھی ہے اُس کے لئے
فطرتِ معصوم بھی اس کی نظر میں ہے شریر
اک جمودِ مستقل طاری ہے اُسکے قلب پر
ہے بہارِ زندگی اس کی خرابِ زمہریر
بیخودی میں کاش کھو دیتا وہ اپنے آپ کو
ہے فقط اک بیخودی گرتوں کی تنہا دستگیر

منحصر اُمید پہ ہے زندگی کا آسرا
اور خود اُمید کو ہے بیخودی کا آسرا

شہ زور کاشمیری

وقفۂ زندگی

راہِ حرم نہیں تو کیا؟ کوچۂ دَیر ہی سہی! — وقفۂ زندگی ہے کم، لذّتِ سیر ہی سہی!
خیر! ہُوا، شکست تو اُن کا غرور و کبر و ناز! — بزم میں اُن کی باریاب ہم نہیں غیر ہی سہی!
عرضِ وفا وہاں نہیں درخورِ اعتنا، مگر — ہم تو سُنائے جائیں گے حُسن کو بیر ہی سہی!
کیسی سحر کہاں کی شام، آؤ بدلدیں یہ نظام — کارِ جہاں کریں تمام اُن کے بغیر ہی سہی

اختر خوشنوا خموش! رازِ حیات کر نہ فاش
حُسن کے اختیار میں شر نہیں خیر ہی سہی!

خطیبۂ ہند زہرۂ سخن
سیّدہ اختر حیدرآبادی

ساقی

گھٹا چھائی ہوئی ہے اور چمن خاموش ہے ساقی — یہ کیا اندھیرے ایسے میں تُو خاموش ہے ساقی
ستارے مضمحل ہیں اور فضا خاموش ہے ساقی — یہ عالم دشمنِ صبر و سکون و ہوش ہے ساقی
اگر کچھ ہوش ہے مجھ کو تو اتنا ہوش ہے ساقی — ترے غم میں یہ ہستی اب وبالِ دوش ہے ساقی
جسے دیکھو مئے پندار سے مدہوش ہے ساقی — نہیں معلوم فطرت کس لئے خاموش ہے ساقی
وہ میکش جن سے تیرے میکدے کی شان قائم تھی — نہ اُن میں ولولے باقی نہ اب وہ جوش ہے ساقی
سکونِ دائمی بخشے گا کیا میخانۂ ہستی — ہر اک ذرّہ یہاں کا انقلاب آغوش ہے ساقی
مجھے ڈر ہے نظامِ میکدہ برہم نہ ہو جائے — ابھی میں ہوش میں ہوں اور تو خاموش ہے ساقی
نہیں عہدِ جوانی میں مزا کچھ مے پرستی کا — ابھی تو زندگی خود میکدہ بردوش ہے ساقی
پلائے جا پلائے جا مئے رنج و الم مجھ کو — تجھے معلوم ہے فطرت مری غم کوش ہے ساقی

مجھے اس واسطے اربابِ دُنیا شمس کہتے ہیں
مرے دل میں نہاں اک آتشِ خاموش ہے ساقی

شمس زبیری مرادآبادی

نشترِ سادہ

کِس قدر زود آشنا ہے یہ — آپ کی آنکھ ہے، قضا ہے یہ
خوش دلی سے مجھے گلا ہے یہ — میرے دشمن پہ مبتلا ہے یہ
پاسِ مہر و وفا بھی ہے کہ نہیں — ایک جفا جو سے پوچھنا ہے یہ
نہ وہ لیتے ہیں دل نہ پھیرتے ہیں — قابلِ دید ماجرا ہے یہ
بوالہوس سے ذرا بچے رہنا — اپنے مطلب کا آشنا ہے یہ
جذبۂ عشق کو خدا رکھے — میری کشتی کا ناخدا ہے یہ
عشق کا ہم نہ ساتھ چھوڑینگے — جان و دل کھوکے اک بچا ہے یہ
کہتے ہیں حشر میں ملینگے ہم — کِس قیامت کا فیصلہ ہے یہ
خیر گذری وہ مہرباں نہ ہوا — میں سمجھا رہا جفا ہے یہ
تم کو افسوس دل کی قدر نہیں — لاکھ میں ایک باوفا ہے یہ
آپ بھی دل سے روٹھ بیٹھے ہیں — آپ ہی کے تو نام کا ہے یہ

شادؔ کو آج شاد کر دیجے
آپ کے نام پر فدا ہے یہ!

(لالہ) مُرلی دھر شادؔ دہلوی

موجِ نشاط

کتنا حسین جبر کئے جا رہا ہوں میں — جینا ہے ناگوار جئے جا رہا ہوں میں
مر مر کے اُنکے غم میں جئے جا رہا ہوں میں — تکمیلِ ذوقِ عشق کئے جا رہا ہوں میں
ساقیِ دلنواز کی یہ کم نگاہیاں! — خونِ جگر کے گھونٹ پئے جا رہا ہوں میں
پھر آچلا ہے اپنے پہ کچھ اعتماد سا — پھر دل پہ اعتبار کئے جا رہا ہوں میں
آہوں کے ساز پر یہ مرے آنسوؤں کا رقص — اِن گردشوں سے کام لئے جا رہا ہوں میں
اُف اے حیاتِ عشق کی یہ دلفریبیاں — خود کو فریبِ عشق دیئے جا رہا ہوں میں
رنگینیاں سمیٹ کے دنیائے عشق کی — صَرفِ نگاہِ حُسن کئے جا رہا ہوں میں
مسرور جس سے ہے دلِ ساقی بجائے خود — آنکھوں سے وہ شراب پئے جا رہا ہوں میں
ہو جائے جس سے رنگِ تمنا کچھ اور شوخ — تخئیل کو وہ رنگ دیئے جا رہا ہوں میں

افشائے غم کا یہ بھی تو ہے ایک رُخ نشاطؔ
درمانِ ضبطِ غم جو کئے جا رہا ہوں میں

نشاط سعید

مستقل:-

مکتوبات

لکھنؤ

۲ر فروری ۱۹۴۴ء

مجتبیٰ!

بتجدید مراسم؟ ۔۔۔۔ انقطاع کو گویا آپ تسلیم کر چکے! خاموشی کا مفہوم اسقدر قطعی و شدید تو شاید نہیں ہوتا۔

احباب کے باہمی مراسم و تعلقات روح و قلب کی چیزیں ہیں محض سکوت سے انکو ختم سمجھ لینا ۔ ۔ اس لئے "تجدید" کا کوئی سوال ہی نہیں ۔۔۔۔ پھر اگر ہے تو آپ کی جانب سے ممکن ہو سکتا ہے۔ ادبی دنیا اور خصوصاً اردو ادب کی ... ہیں آپ مجھے اگر پھر بلانا چاہتے ہیں تو ذرا رخصت گویائی دیجئے ۔۔۔۔ مجھے جہاں بلا رہے ہیں وہاں کے مجروح کن تجربات سے ابھی تک دل اذیت محسوس کر رہا ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب کی دنیا صرف اُن لوگوں کے واسطے ہے، جو سرمایہ دار ہوں یا پھر فاقہ کرنے کی ہمت رکھتے ہوں اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم ذاتی پروپیگنڈے کے ... مہارت رکھتے ہوں۔ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے ان میں سے ایک چیز بھی نصیب نہیں ہے اور زمانے نے ... تلخ سبق دیا ہے کہ اب اِن باتوں کے سیکھنے کی ہمت نہیں۔

باایں ہمہ آپ فرمائیں تو پھر میری مجال نہیں کہ سرتابی کر سکوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو میری خاموشی کا احساس اسقدر جلد ہو گیا۔ مصائب کی فراوانی میں بہن ... باپ کی اچانک موت نے دل کو کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ خوشی کا احساس مشکل سے ہوتا ہے مگر آج آپ کے مکتوب کی تین سطور کو پڑھکر دل میں کچھ انبساط سی پیدا ہوئی ہے۔ آپ کی مختصر نویسی کا شکوہ کس طرح کروں۔ اس سے بھی محروم ہی تھا ... ہے ۔۔۔۔ لکھنؤ آیئے کبھی

آپ کا

مسعود جاوید

برادرم مکرم جناب اعجاز صاحب مدفیوضکم

السلام علیکم! اکبرآباد کی شاداب رنگیں سرزمین کو خیرباد کہے ہوئے کافی ... گذر گیا۔ دورانِ قیام میں جو کچھ دیکھا اور حاصل کیا وہ میرے خیال میں زندگی ... رہیگا ... وہ ہو تہا میں حیات گلاب کے پھول کی طرح سرتاجی کا اہمیت رکھیگا

"تاج محل" اور علامہ سیماب صاحب! مبارک ہیں آپ لوگ کہ تاج محل کی ملکوتی عمارت کے جلووں سے آنکھوں کو پرنور رکھتے ہیں اور محبت جو ایک ابدی شعلہ کا نام ہے۔ اس کی زندہ تصویر اپنی سرزمین میں رکھتے ہیں۔ محبت کا پاکیزہ معیار جا کر معلوم ہوتا ہے۔ مجھے "تاج" کے ہر در و دیوار پر محبت ہی محبت نظر آئی ۔۔ اس کی خاموش فضا میں محبت کا پرسوز نغمہ پایا جاتا تھا۔ زندگی میں محو پر رقت کا اتنا شدید عالم جو کسی منظر سے زائیدہ ہو شاذ ہی ہوا ہے اور اگر ہوا بھی ہے تو اسکا نقش حافظہ کی حریری پردوں پر ... نہیں "تاج" ہی نے جہاں حسن پرست نگاہوں کا احترام و ادب سکھایا ہے۔ دل کو بھی ایک ایسا درد بخشا ہے جو "دستورِ زباں بندی" سے مجروح ہے ہر قدم پر دل کے گریاں ہونے کی صدائیں سُن رہا تھا اور زبانِ حال سے مترشح تھا کہ ؎

شک نہ کر میری خشک آنکھوں پر
یوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں — ساغر

تاج کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو ہے خدا کرے کہ یہ آرزو برآئے ؏

زندہ رہے تو تاج کو دیکھیں گے دوبارا

علامہ موصوف کی ذاتِ بابرکت سے مشرف ہو کر روحانی نشاط حاصل ہوئی۔ علم و ادب میں علامہ صاحب کا جو بلند پایہ ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اور نہ میری کج مج زبان میں طاقت، بھائی صاحب احسان دانش نے استاد کے لئے علامہ صاحب کا ہی نام لیا تھا۔ کیونکہ بھائی صاحب سے تعلقات پُرانے ہیں اور اُن کی بے لوث محبت میرے دل میں جاگزیں ہے۔ یہ کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ گرامی استاد کی شاگردی کا فخر اس ہیچمدان کو بھی حاصل ہوگا خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے اس جلیل المرتبت ہستی سے معنوی انتساب ہوا جس کے ہزاروں خوشہ چیں اطرافِ ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اور آپ کی عنایت و شفقت سے بھی انکار کرنا کفر کے مترادف ہے کہ آپ نے تعارف کرا کے مجھے یہ سعادت بخشی۔ خداوند تعالیٰ آپ کے مراتب ارفع کرے آمین! بھائی صاحب اعجاز میں آپ کی ملاقات سے چوتھے روز چلا آیا تھا۔ کیونکہ جس مقصد کے لئے میرا وہاں ورود ہوا تھا وہ پورا نہیں ہوا تو میں اپنی سسرال آ گیا اور یہیں سے آپ کو یاد کر رہا ہوں۔ میرے حالات ناخوشگوار ہیں۔ مصائب و آلام کا اژدہا میری طرف منہ پھاڑے ہوئے ہے ۴۲ء میں محترمہ والدہ صاحبہ کا

سانحۂ ارتحال کا غم کی زندگی کو بھی نے اٹھا بعد ازیں والد صاحب اور اس ناچیز کا بسترِ علالت پر دراز رہنا بھی حوادث کا ایک سلسلہ تھا۔ ابھی جامِ صحت کے جرعے حلق سے نیچے اترنے نہ پائے تھے کہ آسمان سے ایک اور حادثہ زمین پر نازل ہوا اور "خانۂ انوری کجا باشد" کے مصداق غم کا کاشانہ جو ہیں ڈھونڈ پایا اور میری اہلیہ محترمہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ملیریا کی صورت اختیار کر کے اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن صحت کا منہ دیکھنا ابھی تک "ہنوز دلی دور است" والی بات ہے۔ ایک سال ہو گیا۔ بے دریغ روپیہ علاج پر صرف کیا جا رہا ہے مگر کھانسی اور خفیف بخار نہیں جاتا۔ خیر سے

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

والد صاحب کی ہستی غنیمت ہے۔ ہم صرف دو بہن بھائی ہیں "روزگار" کا مسئلہ بھی پریشان کن ہے۔ نوج میں والد صاحب نہیں جانے دیتے ۔۔۔، دیگر ملازمتیں صرف اپنا ہی خرچ بمشکل پورا کرنے دیتی ہیں۔ بھائی صاحب احسان نے مجھے بھی ایک دفعہ مکتبۂ دانش حزبگ لاہور کی دعوت دی تھی مگر تنخواہ قلیل تھی مجھے ادباء کی سوسائٹی میں رہنے کا بہت شوق ہے مگر یہ خام ہی رہا۔ ماحول کس طرح بدلوں قدرت میری تقدیر کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ خیال تھا کہ اگر آگرہ میں تقرر ہوا تو بھائی اعجاز صاحب کی خدمت میں رہ کر کچھ حاصل ہو جائے گا مگر ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہاں یاد آیا، ایک غزل آپ کو برائے اصلاح بہ ارشادِ استاد دے آیا تھا۔ اپنے دوست کی معرفت اپنا ایڈریس بھی دیا تھا۔ اب نہ معلوم اس کا کیا حشر ہوا۔ میری موجودگی میں تو وہ آئی نہ تھی۔

ایک نظم مولانا بزرگوار کی خدمت میں برائے اصلاح ارسال ہے۔ اصلاح کے بعد میرے وطن کو ارسال کریں۔ جوابی لفافہ پر پتہ رقم کر دیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ شاعر کی خریداری کا اہتمام وطن پہنچ کر کروں گا فقط والسلام

عقیدت کیش

ناچیز شمس الدین باسم بیوانی

اعجاز بھائی !

سلام مسنون۔

آپ کی دیدہ شدہ غزل موصول ہوئی۔ یوں معلوم ہوا جیسے روٹھے ہوئے ساجن نے غیر متوقع پیغام بھیجا ہو۔ خدا جانتا ہے کہ مجھے آپ کی اصلاح پا کر یک گونہ خوشی حاصل ہوتی ہے مگر مشکل یہ آ پڑتی ہے کہ جونہی میں نے مطالعہ کے لئے کوئی کتاب یا کوئی رسالہ اُٹھایا۔ کوئی غزل یا نظم نظر سے گذری، دل کو بھلی معلوم ہوئی۔ دماغ میں قافیہ اور مضمون نے ہلچل پیدا کی اور میں غزل مکمل کرنے بیٹھ گیا۔ بارے غزل ختم ہوئی تو پھر اصلاح کی باری آئی۔ جب تک آپ کی جانب سے ایک غزل موصول نہیں ہوتی میں اس عرصہ میں کئی غزلیں لکھ لیتا ہوں۔ اس لئے میں نے چاہا تھا کہ مہینہ بھر میں آپ چار غزلیں درست فرمایا کریں تو یہ ذخیرہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے۔ مگر آپ سمجھتے ہیں، میں بھی شرمندہ ہوں کہ آپ کی عدیم الفرصتی کے باوجود بھی آپ کو اکسا رہا ہوں، آخر کیا کروں، لے دے کے یہی ایک در تو نظر آتا ہے کاش! آپ اس جذبۂ شوق کا اندازہ فرما سکتے۔ جس سے میں غزل بغرضِ اصلاح لے کر خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور جب تک آپ کی طرف سے غزل بعد اصلاح موصول نہیں ہوتی۔ آپ کے کرمت نامہ کا انتظار مجھے خیالات کے ایک عجیب عالم میں لا کھڑا کرتا ہے۔

پچھلے دنوں میں ماہنامہ ادیب دہلی کو سرسری نگاہ سے دیکھ رہا تو کہ حضرت نوح ناروی کی غزل نظر سے گذری بحر چونکہ چھوٹی تھی۔ طبیعت مچل پڑی کچھ شعر تو اُسی دم ہو گئے۔ کچھ بعد میں لکھکر غزل مکمل ہو گئی۔ لیکن غزل لکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ اگر غزل حضرت نوح ناروی کی غزل سے سبقت نہ لیجا سکے تو کم از کم اس کا جواب تو ہو ورنہ سورج کو چراغ دکھانے سے فائدہ

طبیعت جب لکھنے کے لئے زور کر رہی ہو تو میں اسکو روک تا نہیں۔ غزلیں بہت لکھی ہوئی اصلاح طلب پڑی ہیں۔ لیکن اگر آپ مہینہ بھر میں صرف چار غزلیں دیکھنے کا وعدہ فرمائیں تو پانچویں نہیں بھیجوں گا۔

نیاز مند

غلام محمد

---

۷۸۶ بھوپال ۲۴ مارچ ۴۳ء

محترمی و معظمی، السّلام علیکم۔ سوا سو اشعار کی رسید کا شکریہ۔ مجھے اس سے اتفاق ہے اس مجموعے کے بجائے میرا مجموعۂ کلام شائع ہونا چاہئے تھا، مگر بعض احباب کے اصرار سے اسکی اشاعت پر مجبور ہو گیا۔ حالات اگر ساعد ہوئے تو انشاء اللہ اپنا دیوان جلد طبع کراؤں گا

مجھے یہ دیکھکر سخت اذیت ہوئی ہے کہ بعض غیر ذمہ دار حضرات علامہ سیاب مدظلہ کے خلاف برابر پروپیگنڈے میں مصروف ہیں اور آپ کامل طور پر سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں، یہ صحیح ہے کہ آفتاب پر خاک نہیں ڈالی جا سکتی، لیکن معاندین کی منظم سازشوں کا کچھ جواب دینا چاہئے، میری رائے میں ہم کو بھی اس ہرزہ سرائی کے انسداد کے لئے کوئی موثر اقدام کرنا چاہئے، افسوس ہے کہ بھوپال سے کوئی ادبی رسالہ نہیں نکلتا ورنہ پہلے سے اسکا انتظام

مکرمی جناب اعجاز! سلام صد نیاز!

گرامی نامہ ملا۔ دلی شکریہ!

بڑی مسرت ہوئی کہ نہ صرف آپ میری معروفیتوں سے واقف ہیں بلکہ اُن کا احساس بھی ہے ــــ یقین جانئے اگر انسان کو معروفیتیں نہ میسر ہوتیں تو شاید ایک "لمحۂ حیات" بھی با آرام بسر نہ ہوتا ــــ یا بالفاظ دیگر ہم جنہیں "معروفیتیں" سمجھتے ہیں، یہ در اصل وہ تسبیح ہیں جنکی معیت میں ہم ہر دشوار "منزلِ زندگی" سے بآسانی گذر جاتے ہیں ــــ نہ ہم کو "غمِ ماضی" ہوتا ہے اور نہ "اندوہِ حال" ــــ رہا اندیشۂ فردا ...... سو اسکا احساس تک نہیں ہوتا ــــ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان "فرصت و بیکاری" سے دو چار نہ ہو تو اُسے کبھی زندگی کی جانکاہیاں، سرگرانیاں اور بے کیفیاں محسوس نہیں ہو سکتیں ــــ "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے"....... میں وہ لذت و سرور کہاں؟ جو طلب و تلاش اور کاوش و جستجو میں ہے؟ ــــ

حضرت اصغرؔ گونڈوی نے اس حقیقت کی طرف کیا خوب اشارہ کیا ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

"چلا جاتا ہوں" کا ٹکڑا آئینہ دارِ معروفیت ہے ــــ زندگی نام ہے ایک مسلسل معروفیت اور پیہم جد و جہد کا ــــ خواہ وہ معروفیت و جد و جہد "ہنستی کھیلتی" ہو یا خاموش و دلفگار ــــ جس طرح دریا بغیر روانی کوئی معنیٰ نہیں رکھتا ــــ بعینہٖ زندگی بھی معروفیت اور جد و جہد کے بغیر ایک مہمل اور لایعنی شے ہے ــــ حضرت علامہ سیمابؔ مدظلہٗ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

"نشاطِ بزمِ عالم" زندگی کے کیف و کم تک ہے
یہ ساز اور اسکا ہر نغمہ نفس کے زیر و بم تک ہے

کریں ارباب جادہ کیا تعین اپنی منزل کا
مسلسل اک سفر ایوانِ ہستی سے عدم تک ہے

یا پھر میرے یہ دو شعر ؎

تو سمجھو بیٹھا ہے اک خوابِ گراں ہے زندگی
زندگی نا آشنا! تجھ میں کہاں ہے زندگی

کوئی کردے یہ سبکسارانِ ساحل کو خبر!
موجِ طوفاں بنکے دریا میں رواں ہے زندگی

خدا جانے زندگی کی اس لا متناہی معروفیت کا سلسلہ کہاں تک چلا گیا ہے؟ ــــ آخر اسکی کوئی حد بھی ہے کہ نہیں ــــ اور اگر حد ہے تو کیوں ہے؟ کس لئے ہے اور کہاں ہے؟

کیونکہ بقول مولانا سیمابؔ مدظلہٗ ؎

ابھی لا انتہا ذرّوں کو ہے پرواز کی حسرت
کوئی آندھی بقدرِ ظرفِ ویرانہ نہیں اُٹھی

کچھ بگولے تو اکثر و بیشتر اُٹھے اور چند ذرّوں کو اُڑا کر لے گئے لیکن "بقدرِ ظرفِ ویرانہ" کوئی آندھی ابتک نہیں اُٹھی ــــ اور نہ خدا کرے کبھی اُٹھے، کیونکہ جبتک "بقدرِ ظرفِ ویرانہ" کوئی آندھی نہیں اُٹھتی ...... لا انتہا ذرّوں میں حسرتِ پرواز باقی رہے گی ــــ اور یہی حسرتِ پرواز مقصودِ زندگی ہے تشنگی و ناتمامی اصلِ حیات ہیں لیکن حرکت و اضطراب کے ساتھ ساتھ ــــ ورنہ جس دن اضطراب سکوں سے اور حرکت جمود سے تبدیل ہو جائیگی۔ میرے خیال میں وہی دن "زندگیٔ کائنات" کا آخری دن ہوگا ــــ پس زندگی کو ہر اعتبار سے معروف و مشغول رکھنا چاہئے ــــ تاآنکہ لمحاتِ زندگی ــــ "اندیشۂ سود و زیاں سے" دامن بچا کر گذر جائیں اور انسان اپنی فطری استعدادوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کر سکے اور کرتا رہے ؎

رفعتوں کی ہیں فضاؤں میں بہت گنجائشیں
اک نئی انگڑائی لیکر آسماں ہو جائیے
(مولانا سیمابؔ)

لکھ گئی ہوں جنون میں کیا کیا کچھ ......؟ اس لئے خدا کرے کہ آپکے سوا کوئی نہ سمجھے ــــ الغرض چونکہ آپ میری معروفیتوں سے واقف ہیں ــــ یہ بصیرت آپ کو مبارک! رہا محبت و اہلِ محبت کا مسئلہ! ــــ تو بھائی صاحب "محبت" فراموش کر دینے والی چیز نہیں اس لئے محبت کرنے والے بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے! لیکن محترم شاعر! پہلے یہ بتائیے کہ محبت کرنے والے ہیں کہاں؟ خصوصاً اس مادّی عہد میں جس میں "محبت" رسم و تجارت" بنکر رہ گئی ہے اور جو اس قحط و گرانی کے زمانے میں بھی ارزاں ہے ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

یہ تو غالبؔ کے زمانے کا حال تھا ــــ آج آبروئے شیوۂ اہلِ نظر ...... کا تو کیا ذکر ...... خود اہلِ نظر ہی کا فقدان و قحط ہے ــــ مشرق ہو کہ مغرب ــــ ہر جگہ نام نہاد اہلِ نظر و اہلِ محبت کی افراط ہے ــــ ہر کالج کا پڑھا ہوا "گریجوئیٹ" "اہلِ محبت"........ ہر قومی لیڈر اہلِ محبت ــــ ہر کانگریسی، ہر مسلم لیگی، احراری، مہا سبھائی، ہر مولوی، ہر مہاتما، ہر ادیب، ہر اہلِ قلم ...... غرض جسکو دیکھئے "اہلِ محبت" کا سارٹیفکٹ لئے، پیٹ کے جہنم کو بھر رہا ہے ــــ بنگال میں لاکھوں انسان فاقے سے مر گئے ــــ مگر آفریں بر ایں اہلِ محبت....... کہ بیٹھے بیٹھے تمام فرائضِ محبت ادا کر دئیے۔ اخبارات میں پُر جوش بیانات چھپ گئے ــــ رسائل میں دل تڑپا دینے والی نظمیں طبع ہو گئیں ــــ بعض اہلِ محبت نے صوبہ بنگال کی سیاحت بھی فرمائی ــــ اور ...... اہلِ محبت ہونے کا حق ادا کر دیا...! الغرض آجکل اہلِ محبت پیدا نہیں ہوتے سائنٹیفک طور پر پیدا کئے جا رہے ہیں۔ اب یہ دوسرا مسئلہ ہے کہ ان عاشقانِ کرام کی مجلسیں (بقیہ)

شخصیات :-

اُردو غزل ماضی میں مختلف ادوار سے گذری ۔ حال میں بھی اس کی قدریں بلدلہی ہیں اور بدل چکی ہیں۔ مستقبل میں بھی یقیناً حالات کے تقاضوں اور طبیعتوں کے تضاد سے اسے مختلف النوع شکلیں اختیار کرنی پڑینگی ۔ اُردو غزل میں ابتک جتنے انقلابات ہوئے ہیں۔ اُن کا کریڈٹ (Credit) انفرادی طور پر ایک ہی شخص کو حاصل ہوا ہے ۔ میر اگر سادگی کے خالق ہوئے تو غالب فلسفہ اور بلند الفاظ کے ۔ میر درد نے تصوف کو غزل میں سمویا تو مومن نے خیال کی گہرائیاں پیدا کیں ۔ اسی طرح آتش اور ناسخ نے بھی نئے رنگ کی بنیاد ڈالی ۔ آخری دور میں مرزا داغ دہلوی نے سب سے بڑھکر نیا نہیں تو کم از کم ایک مخصوص رنگ ضرور پیدا کیا اور اُسے اسقدر اپنایا کہ اُن کے ہمعصر اور لکھنؤ کے مشہور شاعر حضرت امیر مینائی بھی اس کی تقلید پر مجبور ہوگئے ۔ داغ کا سہل ممتنع ۔ فصاحت ۔ روزمرہ صفائی اور شوخی صرف اُنھیں کا حصہ ہے ۔ عام رائے ہے کہ جسقدر اچھے تلامذہ مرزا داغ نے چھوڑے اُس کی مثال کسی دور میں نہیں ملتی ۔ مرزا داغ کے پچاس فیصدی شاگرد اپنے وقت کے استاد ہوئے اور بعض نے بڑی حد تک اُن کا تتبع بھی کیا ۔ حضرتِ نوح ناروی بھی مرزا داغ کے ارشدِ تلامذہ میں سے ہیں اور استادانہ درجہ رکھتے ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ اُن کا رنگ بڑی حد تک مخصوص ہے ۔

آپ کا نام محمد نوح اور نوح تخلص ہے ۔ والد کا نام مولوی عبدالمجید ہے ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء کو اپنے نانا شیخ علم الہدیٰ صاحب کے یہاں بھوانی پور ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے ۔ حضرت نوح کے والدِ محترم سب جج تھے ۔ صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کے مختلف شہروں ، شاہجہانپور اور بلند شہر وغیرہ میں جلیل القدر عہدوں پر مامور رہے اور پنشن حاصل کرنے کے بعد قصبۂ نارہ ضلع الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کی ۔ خیرخواہی میں نہ صرف حکومتِ ہندی سے بہت کچھ پایا بلکہ خود بھی کافی مال املاک پیدا کیا ۔ حضرتِ نوح کی کمسنی ہی میں سب جج صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا ۔

تکمیلِ تعلیم "نارہ" ہی میں ہوئی ۔ مختلف اساتذہ مثلاً حافظ قدرت علی صاحب مولوی یوسف علی صاحب ۔ حاجی عبدالرحمٰن صاحب جائسی اور میر نجف علی صاحب سے اُردو فارسی اور قدرے عربی کی تعلیم حاصل کی ۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی پڑھی ۔

آپ کے آخری استاد میر نجف علی صاحب نے شعر و شاعری کا ذوق دلایا ۔ ابتدا میں اُنھیں سے اصلاح لیتے رہے ۔ چونکہ شاعری کا ذوق فطری اور صحیح تھا اس لئے

حضرت نوح ناروی

کچھ مدت میں اچھی خاصی ترقی ہوگئی اور بقول مولانا احسن مارہروی مرحوم قرب و جوار میں دادِ سخن پاتے لیتے رہے ۔ میر نجف علی صاحب کے بعد حضرتِ امیر مینائی لکھنوی کو دو تین غزلیں دکھائیں ۔ پھر حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد ہوگئے اور ۵ ۔ ۶ غزلوں پر اصلاح لی مگر ذوق کی تسکین نہ ہوئی تو اعزا کو اطلاع دئے بغیر بیتابانہ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی خدمت میں حیدرآباد پہونچ گئے اور شرفِ تلمذ حاصل کیا ۔ واپس آئے تو رنگ ہی دوسرا تھا ۔ کئی سال تک ذریعۂ خط و کتابت اصلاح لیتے رہے ۔ دو تین ہی سال گذرے تھے کہ مرزا داغ نے دوبارہ حیدرآباد بلایا ۔ یہ سنہ ۱۹۰۳ء کا واقعہ ہے ۔ دوبارہ بہت عرصہ تک آپ استاد کی خدمت میں رہے اور قریب رہ کر فیض حاصل کیا ۔ حیدرآباد ہی میں حضرت داغ دہلوی اور حضرت ظہیر دہلوی نے سندیں دیں ۔

نوح صاحب مرزا داغ کے بڑے عقیدت مند تلامذہ میں سے ہیں ۔ آپ کو سیکڑوں اشعار فصیح الملک مرحوم کے زبانی یاد ہیں ۔ آپ نے فصیح الملک کے رنگ کو سمجھنے کی بھی بیحد کوشش کی ہے ۔ خود بھی نہایت ذہین اور طباع ہیں ۔ چونکہ معاش کی طرف سے کوئی فکر نہیں ہے اس لئے زیادہ وقت شعر و سخن پر صرف کرتے ہیں ۔ ہندوستان میں آپ کے شاگرد کافی ہیں اور ان میں بہت سے مشہور بھی ہیں ۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے "سفینۂ نوح" اور "طوفانِ نوح" شائع ہو چکے ہیں ۔ تیسرا دیوان بھی شائع ہونے والا ہے ۔ تمام ہندوستان میں آپ مشہور ہیں اور اکثر مشاعروں میں شرکت فرماتے رہتے ہیں ۔

حضرتِ نوح کا کلام بہت سادہ اور صاف ہوتا ہے ۔ آپ حقیقی معنیٰ میں زبان کے شاعر ہیں گو کلام میں مرزا داغ کی سی حلاوت اور رس نہیں لیکن فصاحت، سلاست اور روانی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے ۔ آپ شعر میں الفاظ کے اُلٹ پھیر سے لطف پیدا کر دیتے ہیں ۔ آپ کی غزلوں کے مقطع خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہوتے ہیں ۔ جن میں تخلص کی رعایت سے آپ سیلاب اور طوفان کا ذکر ضرور کرتے ہیں ۔

نمونۂ کلام

دکھائے پانچ عالم اک پری پر شوق نے مجھ کو
اُلجھنا ، روٹھنا ، لڑنا ، بگڑنا ، دُور ہو جانا

کیونکر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھئے
سب مجھ سے پوچھئے یہ مصیبت نہ پوچھئے

نکھر آئی نکھار آئی، سنور آئی سنوار آئی — گلوں کی زندگی بنکر گلستاں میں بہار آئی
مشیّت کو نہیں منظور دو دن پارسا رکھنا — اِدھر کی میں نے توبہ اور اُدھر فوراً بہار آئی
اسیرانِ قفس کو واسطہ کیا اِن جھمیلوں سے — چمن میں کب خزاں آئی چمن میں کب بہار آئی

ہوگئیں ختم ہجر کی گھڑیاں — اور تھوڑی سی رات باقی ہے
بے پئے نام تک نہیں لیتا — مجھ کو یہ احترامِ ساقی ہے

دل ہے تو اُسی کا ہے جگر ہے تو اُسی کا — اپنے کو رہِ عشق میں برباد جو کر دے
اور تو ہم نے کچھ بھی نہ جانا لیکن اتنا جان گئے — دنیا میں ناداں آئے ناداں رہے ناداں گئے
اللہ اللہ اُس کا جلوہ ہم جلوے کو ماں گئے — دیکھیں تو کیا حال ہوا اپنا بے دیکھے قربان گئے
ہم اُن سے کیوں کہیں آزادِ دُنیا ملتوی کر دو — طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے
کمبخت کبھی جی سے گذرنے نہیں دیتی — جینے کی تمنا جب مجھے مرنے نہیں دیتی

اُن سے ملکر ملا نہیں میں کھو گیا — اور جو کچھ ہے وہ آنکھ کا راز ہے

میں غم کا فسانہ کس سے کہوں غمخوار دلِ گھر خالی ہے
کون آنے جانے والا ہے سانس آنے جانے والی ہے

بیفرضی دیکھ لئے دو نامِ دستورِ محبت نے — حقیقت میں مرا دل ہو نہ ارمان ہو نہ پیکاں ہے

تیروں کے مناظر نے کروٹ نہ کبھی بدلی — اندر وہی آبادی باہر وہی ویرانہ
رہ طلب میں بنے وہ نشترِ اِدھر جاتے اُدھر جاتے — جسے جو کانٹے قدم قدم پر اِدھر سے جاتے اُدھر جاتے
کبھی تھک کر کے کوئی دم طوافِ بزمِ حبیب میں ہم — چلے ہیں دیر و حرم بھی اکثر اِدھر جاتے اُدھر جاتے
بہکانے والے بہکائیں شوق سے اکثر ہم کو تم کو — آ جا چلا لنا جائے چھپ کر کھل کر ہم کو تم کو
پھر گردوں پر بدلی چھائی بدلی میں بجلی لہرائی — پینے جائیں دیتا جائے ساقی ساغر ہم کو تم کو
اب اور اِس سے سوا حالِ زار کیا ہوگا — وہ مجھ کو دیکھنے آئے مگر نہ دیکھ سکے
دینے والے نے فقط دل کو یہ قدرت دی ہے — ابھی گلشن ابھی صحرا ابھی دریا ہو جائے
وادیِ اُلفت میں دیکھی ہم نے کب منزل کی شکل — گر پڑے، گر کر اُٹھے، اُٹھ کر سنبھلتے ہی رہے

اعجاز صدیقی

(بقیہ صفحہ ۳۸) میں تضاد ہے۔ اُن کی بحثیں جداگانہ مفہوم، مطلب اور مقصود رکھتی ہیں —— انشاء اللہ کبھی فرصت میں ان کی بحثوں پر اظہارِ خیال کروں گی۔

—— ہاں! تو اس "مرگ انبوہ جشنے دارد" پر جب نظر ڈالتی ہوں تو واللہ محبت سے نفرت ہو جاتی ہے —— ہر حقیقت ایک تابناک انفرادیت کی حامل ہوتی ہے —— مثلاً —— آئینہ —— آفتاب، ماہتاب! —— آئینہ کی انفرادیت یہی ہے کہ دیکھنے والے کو اس میں اپنا عکس نظر آئے لیکن اگر آئینہ میں یہ خصوصیت نہیں تو اسکی قدر و قیمت معلوم —— بجنسہٖ اگر آفتاب و ماہتاب سے اُن کی روشنی چھین لی جائے تو پھر کبھی اُنکی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے —— یا پھر آسمان پر نکلنے والے تمام ستارے ماہتاب و آفتاب بنجائیں تو اس طرح بھی آفتاب و ماہتاب کی انفرادیت اور دلکشی و رعنائی باقی نہیں رہتی —— اس حقیقت کے ثبوت میں علامہ سیماب کا یہ شعر کافی ہے

مخصوص میرا ذوقِ وفا تھا ترے لئے —— تا بندیام نے جسے عمومی کر دیا۔ معاف کیجئے

اپنی رَو میں کہاں سے کہاں پہونچ گئی —— محبت کی اِس تشریح سے مقصود آپ کی جراحت قلب نہیں اور نہ آپ کی محبت کا آپریشن ...... یہ تو ایک جنونِ محبت تھا جو خدا جانے کیا کیا لکھ گئی —— محبتوں، نوازشوں اور عنایتوں کا بیحد شکریہ —— محبت کی دُنیا میں مایوسی کا کہیں وجود نہیں اس لئے آپ کا مایوس نہ ہونا "مقتضائے محبت" ہے —— ہمارے عاشقانِ کرام نے مایوسی و نامرادی، ناکامی و تشنگی جیسے چند حسین الفاظ وضع کر لئے ہیں جنکو محض دوسروں پر اثر ڈالنے کے لئے گاہے گاہے استعمال کرتے رہتے ہیں —— ورنہ محبت تو مسلسل ایک فتح کامرانی اور کامیابی کا نام ہے —— ہم محبت میں جن کو ناکامیاں اور نامرادیاں سمجھ بیٹھے ہیں۔ حقیقتاً یہی کامیابیاں ہیں —— آج کسی عاشق میں ہمت ہے کہ وہ حدودِ تعینات سے آگے بڑھے اور مایوسی و ناکامی کی دوشیزہ کے رُخ سے نقاب ہٹا کر ...... پکارے ؏

ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈ لیا — آخرش کامیاب ہونا تھا؟

ارسال کردہ غزل قلم برداشتہ ہے اور صرف "شاعر" کے لئے انتہائی عجلت میں لکھی گئی ہے —— کسی دوسرے رسالے میں چھپنے کا سوال تو ایک طرف —— میرے پاس اس غزل کا مسودہ تک نہیں —— رمضان کی نماز تراویح میں کثرتِ قرآن خوانی سے حافظِ قرآن کو اکثر تشابہ ہو جایا کرتا ہے۔ —— کیا عجب کہ آپ کو بھی! اپنے ادبی انہماک، مطالعہ کی کثرت اور "شاعر" کی ترتیب کی محویت میں .... "شاعرانہ تشابہ" ہو گیا ہو —— کیا آپ خط لکھتے وقت کوئی شعر تو نہیں کہہ رہے تھے؟

آجکل —— علامہ سیماب مدظلہٗ کے خلاف جو محاذ قائم کیا گیا ہے —— مجھے بڑی مسرت ہے کہ شاعر نے ابتک اس طرح توجہ نہ کی اور اپنے زرّیں لمحات اور قیمتی صفحات ضائع نہ کئے —— تاریخ شاہد ہے —— کہ آجتک کون ایسا مصلح، رشی، رہنما، عالی ظرفی کی دلیل ہے ...... ؏ "خلقے پس دیوانہ و دیوانہ بکارے" —— اُمید کہ آپ مع الخیر ہونگے —— مولانا کی خدمت میں میری اور رضا صاحب کی جانب سے سلام مسنون السلام

اور چند غزلوں [illegible] —— [illegible] —— [illegible]

.... کی ڈائری

(۱۸ دن جنوبی ہند میں ___ بنگلور کی عظیم الشان کانفرنس اور مشاعرے کے بعد ریاست میسور کے تاریخی مقامات کی سیر)

اعجاز صدیقی

۱۱ دسمبر ۴۴ء

تقریباً تین بجے پھر "بنگلور" کے ملازار میں پہونچ گئے ___ "گلزارِ اختر" میں قدم رکھا تو خانصاحب عبدالغنی اور سیدہ اختر حیدرآبادی کو ہمہ تن انتظار پایا۔ شعرا جو یہاں قیام پذیر تھے رخصت ہو چکے ہیں۔ گو "گلزارِ اختر" میں وہ چہل پہل اور رونق نہیں لیکن اُس کے نقوش ہر طرف انگڑائیاں لیتے ہوئے ضرور نظر آ رہے ہیں۔ شعرا کی گنگناہٹوں کی جگہ چڑیوں کے مدھم اور سُریلے راگ ہیں۔ بعض کمروں کی آرائشوں کے کچھ دھندلے خاکے بھی موجود ہیں اس لئے کہ شعرا کی رخصت کے بعد اُن کا تمام سامان ہٹا لیا گیا ہے۔ البتہ سیدہ اختر کا "ڈرائنگ روم" اسی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ سیدہ اختر صاحبہ اور خانصاحب کو پہلے سے علم تھا کہ ہم لوگ بھی آج شب کو بمبئی کے لئے روانہ ہو جائینگے اس لئے راستہ کے لئے کھانا وغیرہ سب تیار ہے۔ گو سفر ایک دن اور دو راتوں کا ہے لیکن سیدہ نے کئی دن کا انتظام کر دیا ہے۔ منع کر رہے ہیں مگر وہ نہیں مانتیں۔ خانصاحب تھوڑی دیر کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ جب واپس ہوئے تو ذرہ ہمہ قسم کے چھوٹے بڑے بلک بسکٹ اور خدا جانے کیا کیا "بیکری" سے لیتے آئے ___ یا اللہ رختِ سفر اور اتنا زیادہ۔ سیدہ کا اصرار ہے کہ سب ساتھ رکھئے۔ سیدہ اختر نے روانگی کے وقت "نذرانے" بھی پیش کئے اور نہایت معقول ___ بقول خانصاحب سیدہ نے چلتے وقت ہر شاعر کو حسبِ حیثیت کچھ نہ کچھ ضرور دیا ہے۔ شاعر دوستی شاعر نوازی اور علم و ادب کی قدر دانی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے شعرا کے اس مطالبے کے علاوہ جو وہ اپنے مستقر پر منگا چکے تھے انھیں چلتی مرتبہ بھی کثیر رقم دی گئی۔ شاید یہ پہلی مثال ہے۔ سیدہ اور اُن کے گرامی شوہر خانصاحب عبدالغنی فرما رہے ہیں کہ علامہ اگر آپ کچھ دن اور قیام فرمائیں تو ہمارے لئے باعثِ مسرت ہو۔ بعض لوگ تو ہم پر بار ہو گئے۔ لیکن آپ کی موجودگی ہمارے لئے راحت کا سبب ہوئی ___ اللہ اکبر، احساس اور اتنا زندہ احساس۔

۹½ بجے شب کو خانصاحب عبدالغنی اور سیدہ اختر کے ساتھ اسٹیشن روانہ ہوئے۔

ایک کار اور ایک گھوڑا گاڑی سامان سے لدی ہوئی اسٹیشن کی طرف رواں ہے بنگلور کی شاداب فضائیں مسکراتے ہوئے ذرے۔ گاتی ہوئی ہوائیں۔ سب قدم قدم پر سلامِ آخری قبول کر رہی ہیں۔ جی نہیں چاہتا کہ بنگلور کو الوداع کہا جائے ___ مگر کہہ رہے ہیں "ارضِ تاج" اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور ذرائض کا احساس دلمیں چٹکیاں لے رہا ہے ___ اسٹیشن پہونچے تو بعض دوسرے مخلصین اور عقیدت مند بھی ہار اور پھول لئے موجود تھے۔ یہ منزل بہر اعتبار سخت اور بہت کٹھن ہے۔ سیدہ اختر، خانصاحب اور دوسرے مخلصین سے جُدائی کا خیال، ٹکٹ ملنے کی دشواری اور اس سے زیادہ ٹرین میں جگہ کا سوال، فرسٹ کلاس سے لیکر تھرڈ کلاس تک کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ پہلی دشواری تو یوں ختم ہوئی کہ سیدہ اختر نے ہیروں سے لدی ہوئی انگلیوں والا ہاتھ بکنگ کلرک صاحب کی طرف بڑھایا اور جب اُن کی آنکھیں خیرہ ہوئیں تو وہ چونکے اور فوراً اسکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیدیا ___ ٹکٹ کی کھڑکی سے سیدہ ہٹیں تو اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں پہونچیں اور زور دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح دو نشستوں کا انتظام کریں۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب بھی کچھ دیر اِدھر اُدھر بھاگے پھرے مگر اس انبوہ میں اُن کی کون سنتا تھا۔ سیدہ اختر کہہ رہی ہیں کہ اسٹیشن ماسٹر صاحب آپ کو دوسری "بوگی" لگوانی چاہئے ___ جب اسٹیشن کے اربابِ حل و عقد خود کچھ نہ کرسکے تو سیدہ اختر نے اپنے ذاتی عزمِ جواں سے کام لینا شروع کیا اور بغیر پس و پیش ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں چڑھ گئیں جسے چھ انگریز افسر گھیرے ہوئے تھے کبھی اپنی زبان میں کبھی ان کی زبان میں سیدہ نے انھیں اثر گیر اور مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ میں بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ دوسری نشست کی تلاش میں سرگرداں تھا جب اُس ڈبہ کے قریب پہونچا تو سیدہ اختر کے اس جملہ کے بعد کہ "میں بھی وار ڈیفنس کونسل کی ممبر ہوں" دو انگریزوں کے گلوں میں ہار ڈالتے ہوئے دیکھا جو ہمارے لئے آئے تھے۔ پھر کیا تھا، یورپ کی تہذیب و معاشرت کے مطابق عورت کے حقوق کا صحیح احترام کرنے والی قوم کے یہ دونوں فرد مسکرائے اور بقیہ پھولوں کے ہار سیدہ اختر کے

اصلاحِ سخن

:- جناب عارف سیالکوٹی کی غزل پر حضرت ارشد صدیقی امروہوی کی اصلاح

۱ خیال پست ~~ہیں تیرے~~ (ہے تیرا)، نظر بلند نہیں	~~وگرنہ عشق کی رہ~~ (یہ راہِ عشق ہے اس) میں کوئی گزند نہیں
۲ جو قربِ دوست ہی منظور، ترک کر یہ خودی	خودی ~~ہے باعثِ دوری یہ~~ (ہو دل میں تو انساں) قرب مند نہیں
۳ وہ سر ہی کیا کہ نہیں جس میں عشق کا سودا	وہ دل ہی کیا جو محبت سے بہرہ مند نہیں
۴ جو اس جہاں کو سمجھتا ہے دارِ رنج و محن	~~وہ اس جہاں کے مصائب~~ (مصیبتوں میں کسی طرح) میں فکر مند نہیں
۵ درِ حبیب اگر بند ہے تو ہونے دو	~~درِ خیال ہمارے لئے~~ (تصوّرات کی محفل کا در) تو بند نہیں
۶ حدودِ ہوش سے آگے ہے حدِ حسن و جمال	جو ~~ہوش میں رہا ہے وہ~~ (کوئی ہوش میں رہتا ہے) ہوشمند نہیں
۷ متاعِ زیست لٹا دے جو عیش و عشرت میں	وہ بے نیازِ فراست ہے عقلمند نہیں
۸ نگاہِ دہر میں (بھی) تو ارجمند کیسے ہو!	نگاہِ حسن میں ہی جبکہ ارجمند نہیں
۹ ~~دل و دماغ و زباں کی، نظر کی، ہاتھ کی~~ (زباں کی ہو، نظر کی ہو، یا کہ دل کی ہو)	مجھے تو کوئی بھی آوارگی پسند نہیں
۱۰ یہ سب ہیں کہنے کی باتیں ~~وگرنہ سچ تو یہ ہے~~ (زمانہ سازی ہے)	کسی کا کوئی بھی دنیا میں دردمند نہیں

۱۱
فسانہ بلبل و گل کا ہے ذکرِ جام و شراب
کلام ~~حضرتِ~~ (اب ایسی شاعری) عارف ہمیں پسند نہیں

توجیہ:-

۱۔ "خیال" واحد استعمال ہوا ہے اس لئے فعل بھی واحد ہونا چاہئے۔ اصلاح سے مصرعِ اولیٰ کا یہ عیب دور ہو گیا۔ دوسرے مصرع میں "رہ" محلِ نظر تھا۔ حضرتِ ارشد نے اپنی اصلاح سے مصرع کو صاف اور شستہ بنا دیا۔

۲۔ "یہ قرب مند نہیں" کا ٹکڑا بے جوڑ سا تھا۔ "خودی قرب مند نہیں" اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ "انسان" ہی کی ضرورت تھی۔

۴۔ دونوں مصرعوں میں "اس جہاں" کی تکرار اچھی نہیں تھی۔ اسی لئے اصلاح دی گئی۔ چونکہ پہلے مصرع میں "جو" آیا ہے اس لئے میرے خیال میں دوسرے مصرع میں "وہ" ہونا ضروری ہے۔ مصرع اگر یوں کر دیا جاتا تو مناسب تھا ؎

کسی طرح وہ مصیبت میں فکر مند نہیں

۵۔ عارف صاحب کے مصرعِ ثانی میں تعقید تھی مصرع یوں ہونا چاہئے "در خیال تو ہمارے لئے بند نہیں" اصلاح سے یہ عیب دور ہو گیا۔ نہ صرف مصرع بلند اور اچھا ہو گیا بلکہ اب تو "یہ" صحیح معنی میں زور پڑ رہا ہے۔

۶۔ مجھے اصل شعر اور اصلاح دونوں سے اختلاف ہے۔ ثانی مصرع یوں ہونا چاہئے۔

"رہے جو ہوش میں اپنے وہ ہوشمند نہیں"

۸۔ "میں ہی" مخلِ فصاحت تھا۔ اس لئے پہلے مصرع سے "تو" نکال کر "بھی" بنا دیا اور دوسرے میں "تو" کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح شعر کے تمام عیوب دور ہو گئے اور شعر زوردار ہو گیا۔

۹۔ عارف صاحب کے پہلے مصرع کا مفہوم نامکمل تھا۔ اصلاح سے شعر کا مفہوم واضح ہو گیا اور الفاظ کی جو کمی محسوس ہو رہی تھی وہ پوری ہو گئی۔ دوسرے مصرع میں "کوئی بھی" کی جگہ "کسی کی بھی" ہوتا تو اب اولیٰ تھا۔

۱۰۔ "وگرنہ سچ تو یہ ہے" بھرتی کا ٹکڑا تھا۔ اصلاح بہت مناسب دی گئی ہے۔

۱۱۔ "ہے" مصرع کے دونوں ٹکڑوں کو علیحدہ نہیں کر رہا تھا۔ "کہ" کے اضافہ نے التباس پیدا کر دیا تھا۔ دوسرے مصرع کی اصلاح نے شاعر کے نظریہ کی وضاحت کر دی۔

اعجاز صدیقی

مشاعرۂ شاعر

مصرع طرح :۔ "زندگی غم کی اک کہانی ہے"

حضرت نشتر ہنگامی

میں ہوں فانی یہ جاودانی ہے   مجھ سے بہتر مری کہانی ہے
سچ ہے لاکھ، لاکھ فانی ہے   پھر بھی ایک چیز زندگانی ہے
کس کو اپنی کہوں کسے نہ کہوں   ہر کہانی مری کہانی ہے
موت کو دیکھئے تو درپردہ   زندگانی ہی زندگانی ہے
کیوں نہ کر دوں سپرد جیتے جی   آخر اک روز جاں جانی ہے
دے رہا ہوں انھیں جفا کے سبق   اُلٹی گنگا مجھے بہانی ہے
حُسن سے، اک ہیں نے کیا نشتر   اچھوں اچھوں نے ہار مانی ہے

حضرت آغاز برہانپوری

یہ بھی کیا شانِ زندگانی ہے   ہر حقیقت اب اک کہانی ہے
میں ہوں اور ماتم جوانی ہے   کتنی بے کیف زندگانی ہے
تیرے عہدِ جواں کا کیا کہنا   اب تو ہر شے پراک جوانی ہے
تم سنو گے تو میں سُناؤنگا   ذہن میں اک نئی کہانی ہے
اک نگاہِ وفا نے تیرے لئے   ساری دنیا کی خاک چھانی ہے
ہمہ تن گوش لالہ و گل ہیں   کتنی رنگیں مری کہانی ہے
اب کہاں لطفِ زندگی آغاز   مجھ سے روٹھی ہوئی جوانی ہے

زہرۂ سخن سیدہ اختر حیدرآبادی

غمِ دل جس کو شادمانی ہے   زندگی اُسکی غیرفانی ہے
یہ حقیقت بھی تو نے جانی ہے   "عاشقی" آگ اور پانی ہے
آفریں اعتمادِ عشقِ دوست!   ہر شکست ایک کامرانی ہے
اور کیا چاہئے محبت کو!   حسن ہے نغمہ ہے جوانی ہے
اب کہاں داد؟ اب کہاں فریاد؟   کہ ترا عہدِ حکمرانی ہے
درد دل جس میں ہوگیا آمیز   وہ نفس عمرِ جاودانی ہے
کیسے اُس در سے اب اٹھوں اختر   کہ مجھے پاسِ ناتوانی ہے

حضرت آسی رڑکوی

غم میں ڈوبی ہوئی کہانی ہے   اور پھر شمع کی زبانی ہے
ہر طرف دورِ شادمانی ہے   زندگی حبِ نوجوانی ہے
غم میں گذرے کہ عیش میں گذرے   زندگی ہر طرح کہانی ہے
ہیں تصور میں ان سے راز و نیاز   چاندنی رات کیا سہانی ہے
دل میں درد آنکھ خشک لب پہ ہنسی   آدمیت کی ترجمانی ہے
شکوۂ نارسائی انجام   اور ابھی عالمِ جوانی ہے
آسی بے خبر کا حال نہ پوچھ   کشتۂ عالمِ جوانی ہے

حضرت مولانا سلیمان نقشبندی مجددی از جالندھر

نقشِ سیماب جاودانی ہے   کیوں نہ ہو داغ کی نشانی ہے
دل سے اک جوئے خوں بہانی ہے   اُن کو رنگیں غزل سُنانی ہے
کہکشاں زار میرا کاشانہ   عرش پر میری پَرفشانی ہے
پاؤں پھر راہِ شوق میں اُٹھا   پھر قدم بوس کامرانی ہے
دل کی دلّی نہ کیوں سہانی ہو   میرے راجہ کی راجدھانی ہے
اُن کی محفل میں میری خاموشی   ایک منہ بولتی کہانی ہے
سب سے ادنیٰ ہوا جو سلیمان تو   دیکھ پھر کون تیرا ثانی ہے

حضرت برق صدیقی فتحپوری

سوزِ دل آبِ زندگانی ہے   یہ خبر شمع کی زبانی ہے
خامشی رازِ عشق کی تفسیر   بے زبانی مری کہانی ہے
زُلف والوں کا عنوانِ جمال   چاندنی رات کی جوانی ہے
اُنکے لب ہیں کہ پنکھڑی گل کی   گفتگو ہے کہ گلفشانی ہے
آؤ نکلی ہوئی تمنّاؤ!   پھر مجھے بزمِ دل سجانی ہے
شوقِ دیدار تھا تو سب کچھ تھا   اب نہ جلوہ نہ لنترانی ہے
منظرِ برق دابر باراں برق   میری تصویرِ نوجوانی ہے

حضرت مسلم مالیگانوی

دو گھڑی پھول کی جوانی ہے   کیا یہی! ظرفِ شادمانی ہے؟
دل کی تاریکیوں میں اُنکا خیال!   رات اور رات بھی سہانی ہے
ٹمٹماتا سا اک چراغِ مزار   میری تصویر بے زبانی ہے
باتوں باتوں میں کہہ گیا غمِ دل   وہ سمجھتے رہے کہانی ہے

آ گلستاں میں پھول پھول کو دیکھ / حسن ہے، رنگ ہے، جوانی ہے
دلِ خانہ خراب کی باتیں / کچھ حقیقت ہے کچھ کہانی ہے
خوش ہوئے آپ شعرِ مسلم سے / بندہ پرور! یہ قدردانی ہے

حضرتِ رعنا بلیوی

عشق ہے حسن ہے جوانی ہے / خوب تصویر دہرِ فانی ہے
غم بہ عنوانِ شادمانی ہے / کیا نظامِ جہانِ فانی ہے
یہ وہ ساغر نہیں جسے توڑوں / زندگی جامِ ارغوانی ہے
دل چھٹا وہ چھٹے جہاں چھٹا / رہ گئی زندگی تو فانی ہے
چاند ہو حسن ہو محبت ہو / ہر حسیں چیز جاودانی ہے
دین و دنیا کا کوئی ہو مالک / دل پہ تیری ہی حکمرانی ہے
چاند تارے بھی چھپ گئے رعنا / اب شبِ ہجر کچھ سہانی ہے

جناب طرفہ قریشی

اک تری ذات جاودانی ہے / ورنہ ہر شے جہاں کی فانی ہے
رزمگاہِ ہوس معاذ اللہ / خونِ انساں بھی آج پانی ہے
جس کا عنوان ہے "شبِ دیجور" / میرا افسانۂ جوانی ہے
کس نے رخ سے اٹھا دیا ہے نقاب / جس طرف دیکھئے جوانی ہے
ترجمانِ حدیثِ مرگ و حیات / مرنے والے کی بے زبانی ہے
ذکر ہے جس کا ان کی محفل میں / وہ مری غمزدہ جوانی ہے
اپنا ہر شعر بالیقیں طرفہ / مخزنِ گوہرِ معانی ہے

جناب خلیل از سگولی

زندگی اسکی جاودانی ہے / جو ہلاکِ غمِ نہانی ہے
دور تر ہے حریمِ جلوۂ دوست / بارِ سجدہ سے سرگرانی ہے
کہہ گیا کچھ وفورِ مستی میں / تم کو ناحق کی بدگمانی ہے
موت اور زندگی کو کیا کہئے / اک حقیقت ہے اک کہانی ہے
کچھ تو کہئے سکوتِ یاس کی قسم / کس لئے مجھ سے بدگمانی ہے
شامِ فرقت کی کب سحر ہوگی! / ان کو روداد غم سنانی ہے
جلوہ گر ہے خلیل کیا کوئی / بتکدے میں جو گلفشانی ہے

جناب شہید جبلی

آنسوؤں کی جو یہ روانی ہے / سوزِ فرقت کی مہربانی ہے
اب یہی وجہِ شادمانی ہے / میری تکلیف جاودانی ہے
آفتوں کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں / جب کبھی دل کی بات مانی ہے
کل جوانی ہمیں میسر تھی / آج حاصل غمِ جوانی ہے
مٹ گئے جورِ محبت میں / زندگی ان کی جاودانی ہے
اللہ اللہ یہ اسکی تابانی / داغِ دل حاصلِ جوانی ہے
شاملِ اشکِ خونِ دل ہو شہید / درسِ عبرت مری کہانی ہے

جناب کفیل از سگولی

اب تو غم ہے نہ شادمانی ہے / زندگی صرف اک کہانی ہے
کثرتِ غم سے سرگرانی ہے / ناتوانی سی ناتوانی ہے
جامِ رنگیں ہے بھر دو مستی / آج ہے کیف سی جوانی ہے
آگیا ہوں فریبِ ہستی میں / ایک دھوکا سا زندگانی ہے
بے حجابی گئی حجاب آیا / وہ لڑکپن تھا یہ جوانی ہے
اللہ اللہ خمارِ نشۂ زیست / بعدِ مردن بھی سرگرانی ہے
عمرِ فانی کو کیا کہوں میں کفیل / جیسے دریا کا بہتا پانی ہے

جناب غنی جبلپوری

یہ جو مرنے کی ہم نے ٹھانی ہے / کسی ظالم کی مہربانی ہے
سب جسے ذکرِ طور کہتے ہیں / اک پرانی مری کہانی ہے
سعی کیوں اپنی رائیگاں سمجھوں / مجھ کو امیدِ کامرانی ہے
سب سمجھتے ہیں بے نشاں مجھ کو / بے نشانی مری نشانی ہے
ان کو دھوکا ہے شمع ساں ہوں میں / اپنے سائے سے بدگمانی ہے
بے پئے اک خمار رہتا ہے / یہ جوانی بھی کیا جوانی ہے
اے غنی غیر تو ہیں پھر بھی غیر / مجھ پہ اپنوں کی مہربانی ہے

جناب جمال دہلوی بی۔ اے۔ ایل ایل بی

سوزِ دل کی یہ مہربانی ہے / خون آنکھوں میں جو نہانی ہے
ہم ہیں اور جبہ سائی ہے / اک مصیبت میں زندگانی ہے
ہجر کی ساعتیں معاذ اللہ / موت سے بڑھ کے زندگانی ہے
مجھ پہ مٹنے کی دیر ہے پھر تو / زندگانی ہی زندگانی ہے
چاکِ دامن پہ ہنس نہ اے ناصح / یہ جوانی کی اک نشانی ہے
وہ بھی ایسے میں کاش آجاتے / ابر چھایا ہے رت سہانی ہے
ہم وہاں ہیں جمال اب کہ جہاں / ارنی ہے نہ لن ترانی ہے

جناب اسعد السدیدی ابولہ ضلع ناسک

رخصتِ عہدِ جوانی ہے اب جہنم جہانِ فانی ہے
دل کو آ جگاؤ عزم بنا گر تمنائے کامرانی ہے
شبِ غم بس ہے بولے تارہ؟ کیا ابھی پاسِ رازدانی ہے؟
سیلِ دریا پہ یہ نمودِ حباب میری فطرت کا نقشِ ثانی ہے
آج ہر ہر نفس شبِ فرقت مژدۂ مرگِ ناگہانی ہے
شبِ فرقت وہ پاس بیٹھے ہیں یہ تصور کی مہربانی ہے
ہے طبیعت جنوں اثر اسعد کچھ عجب تیری بدگمانی ہے

جناب فاروق از کوئٹہ

ذاتِ حق صرف جاودانی ہے باقی جو چیز ہے وہ فانی ہے
خود فریبی یقیں کی محرومی خود شناسائی کامرانی ہے
صرف انساں کا خون ہے ارزاں اور ہر چیز کی گرانی ہے
حریت کی نہیں جو بو باقی یہ غلامی کی مہربانی ہے
جو کسی کے بھی رحم پر گذرے بدتر از موت زندگانی ہے
اپنی تقدیر خود بناتی ہیں زندہ قوموں کی یہ نشانی ہے
اب تو ہستی بھی بار ہے فاروق ہائے کس درجہ ناتوانی ہے

جناب منیر نقشبندی کولاری

راز پہلے سمجھ نشیمن کا! بے محل ذوقِ پرفشانی ہے
اے بہارِ چمن کے دیوانے! تو کہاں محوِ نغمہ خوانی ہے
جس سے تعمیرِ قوم ہو جائے اُس کی ہستی ہی جاودانی ہے
میں بھی افسردہ دل بھی افسردہ آخرِ شب کی یہ کہانی ہے
یہ جنونِ سیاستِ امروز مدعا، محض خونفشانی ہے
بامِ دل پر یہ جلوہ گر ہے کون؟ روح تک جسکی ضوفشانی ہے
وارثِ تختِ سیمابی[۵] ملکِ معنیٰ پہ حکمرانی ہے

جناب عارف سیمابی بانکوٹی

ارنی ہے نہ لن ترانی ہے اب وہ جلوہ فقط کہانی ہے
کون کہتا ہے، روح فانی ہے یہ تو اک موجِ جاودانی ہے
ہے کلی سے نمودِ گل یعنی پہلے بچپن ہے پھر جوانی ہے
عہدِ پیری ہے موت ادوار کی کچھ تو کر لے کہ اب جوانی ہے

ہو جہاں شہیدِ قوم و وطن زندگی اسکی جاودانی ہے
تیرے مایوس دید کو اے دوست خواہشِ مرگِ ناگہانی ہے
کون مانے گا آپ کی عارف دہر میں کس نے کس کی مانی ہے

جناب خلش دردی بڑودوی

عشق ممنونِ کامرانی ہے حسن مجبورِ مہربانی ہے
بدلی بدلی سی ہے نگاہِ کرم سہمی سہمی سی زندگانی ہے
شورِ ناقوس ہو کہ بانگِ درا نغمۂ دل کی ترجمانی ہے
چاک دامانِ آرزو کر دیں اب یہی ہم نے دل میں ٹھانی ہے
کیوں لٹاتا ہے اپنے ہاتھوں سے رحم کر رحم یہ جوانی ہے
راہ میں اُن کی اٹھ رہی ہے قدم دلیلِ احساسِ ناتوانی ہے
میری دنیائے عاشقی میں خلش موت کا نام زندگانی ہے

جناب خلیق الولوی

میں بھی فانی ہوں تو بھی فانی ہے اک غمِ عشق جاودانی ہے
قول اور فعل جسکے یکساں ہیں اُنکے قدموں میں کامرانی ہے
ذکرِ غم پر وہ بول اُٹھے فوراً یہ حکایت بہت پرانی ہے
آپ کو کیسے بھول جاؤں میں آپ کی یاد زندگانی ہے
اے تونگر! یہ اہلِ قبر سے پوچھ کون باقی ہے کون فانی ہے؟
قصۂ ابتدائے عشق نہ پوچھ ایک عبرت اثر کہانی ہے
ہر گھڑی مشغلِ آہ آہ خلیق واہ کیا لطفِ زندگانی ہے

جناب زاہد سوتھری (از رامپور)

گر یہی رنگِ زندگانی ہے ہم نے کچھ اور دل میں ٹھانی ہے
آبلہ جیسے پائے زخمی پر واہ کیا اپنی زندگانی ہے
دل کی بنیاد دردِ پر قائم دردِ دل اصلِ زندگانی ہے
لطفِ صیاد میری حالت پر! کیسی بے جوڑ سی کہانی ہے
یہ تو پہلے ہی سوچ لینا تھا عشقِ غم ہے کہ شادمانی ہے
صرف زاہد ہی اک نہیں محکوم عشق کی عام حکمرانی ہے

جناب ادب از ریواڑی

ربِ ارنی ہے لن ترانی ہے حاصلِ طور یہ کہانی ہے
جب غمِ مرگ ناگہانی ہے خاک پھر اپنی زندگانی ہے
کیوں نہ قاتل سے سرخرو ہو لیں اک نہ اک روز جان جانی ہے

---

[۵] یہ اشارہ ہے حضرت قبلہ علامہ سیماب کی طرف ــــ منیر

ابھی کیا اُن کو امتیازِ وفا
ابھی اٹھتی ہوئی جوانی ہے

دل کسی شے سے کیا لگائیں یہاں
کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے

کیوں نہ اس کو عزیز رکھوں اب
داغِ دلِ دوست کی نشانی ہے

جناب ناظم (از جگدیش پور، بہار)

زندگی کس کی جاودانی ہے
موت اک روز سب کو آنی ہے

گو زمیں لاکھ آسماں بدلے
عالمِ عشق غیر فانی ہے

تو طرح کے خیال ہیں دل میں
ایک آفت مری جوانی ہے

لب پہ نالہ ہے آنکھ میں آنسو
کیا یہی حاصلِ جوانی ہے

ہند میں آج آدمی کے سوا
اور ہر چیز کی گرانی ہے

جو ہیں اہلِ کمال اے ناظم
زندگی اُنکی جاودانی ہے

جناب ارشد صدیقی ساگری

اب کسے شوقِ زندگانی ہے؟
ابتو مرنے کی دل میں ٹھانی ہے

عشق کو منہ شباب میں نہ لگا
عشق غارتگرِ جوانی ہے

عہدِ ماضی کی داستاں کو نہ چھیڑ
یہ کہانی بڑی پرانی ہے

میں نے دیکھی ہے شام گلشن کی
میں نے صحرا کی خاک چھانی ہے

قصۂ زندگی نہ دہراؤ
زندگی دُکھ بھری کہانی ہے

لیگیا دل مجھے وہاں ارشد
غم جہاں عینِ شادمانی ہے

جناب عالی علی نگری

دل ہے اور عالمِ جوانی ہے
کس مصیبت میں زندگانی ہے

سوزِ غم دولتِ نہانی ہے
کامرانی سی کامرانی ہے

اُن کی پہلی نظر کو کیا کہیئے
اک محبت بھری کہانی ہے

گلستاں مجھ کو بھول سکتا ہے؟
میرا نغمہ تو جاودانی ہے

موت کہتے ہیں نیند آنے کو
زندگی کیا ہے اک کہانی ہے

مجھے عالی مراد سے کیا کام
نامرادی ہی کامرانی ہے

حکیم نجم احمد آبادی

خامہ فرسا شرحِ زندگانی ہے
ہر نفس غم کی اک کہانی ہے

جلوہ گر ہے پھر اٹھانی ہے
تابِ نظارہ آزمانی ہے

جناب شہید جبلی

... زندگانی ہے
تو کہاں مرگِ ناگہانی ہے؟

آشیاں کی جو یہ روانی چمن
گلفشانی ہی گلفشانی ہے

اب یہاں وجہِ شادمانی ہے نہیں
کس نے بیرِ فلک کی ٹھانی ہے

صبحِ عشرت ہے شامِ غم انجم
یہ جوانی کوئی جوانی ہے

جناب شاعر کاندھلوی

ہے جو کچھ اس جہاں میں فانی ہے
صرف اک حسن جاودانی ہے

الغرض ظلم، گردشِ دوراں
ہم بھی فانی ہیں تو بھی فانی ہے

جان تم سے عزیز کیا رکھتیں
جان جانی ہے موت آنی ہے

میں کہاں اور کہاں ترا سودا
یہ بھی اک امرِ ناگہانی ہے

جس کے جذبات ہیں جواں شاعر
زندگی اُسکی جاودانی ہے

جناب بیتاب کالپوی

ساری دنیا کو کر دیا رنگیں
کتنی رنگیں مری کہانی ہے

مٹ گئے جو ترے لئے اے دوست
زندگی اُن کی جاودانی ہے

اک زمانہ ہے مبتلا تیرا
کتنی کافر تری جوانی ہے

ہے محبت ہی کو دوام نصیب
اور جو کچھ یہاں ہے فانی ہے

زندگی درد بن گئی بیتاب
درد ہی اب تو زندگانی ہے

جناب فارغ (از مودے پور)

صبحِ پیری ہے زرد و دلگیر
نوجوانی کی شب سُہانی ہے

ذات تیری ہے بے بدل لیکن
حُسن تیرا ہی نقشِ ثانی ہے

وہ ہے تیری ہی داستانِ حسیں
تو سمجھتا ہے جسے کہانی ہے

تو ہی ظاہر ہے تو ہی پوشیدہ
تو ہی باقی ہے تو ہی فانی ہے

عشق فارغ ہے نغمۂ رنگیں
حُسن صہبائے ارغوانی ہے

جناب ملال پریمی

غم و آلام کی کہانی ہے
چشمِ پُر آب کی زبانی ہے

موت کی راہ سے گذر کر دیکھو
زندگانی ہی زندگانی ہے

اشک آنکھوں میں اور ہنسی لب پر
یہ بھی اندازِ شادمانی ہے

جس میں ہر گام حادثات نہ ہوں
وہ جوانی کوئی جوانی ہے

اُس کو اپنا بنا کے دنگا میں ملال
غیر ہونے کی جس نے ٹھانی ہے

جناب منتظر کلیمی جام پوری

درد کا عہدِ کامرانی ہے
حسرت اور یاس کی جوانی ہے

عشق جاوید ہو مرے دل میں
درد ہے اور جاودانی ہے

بندۂ مدعا کو کیا معلوم
نامرادی ہی کامرانی ہے

درد ہے میں ملک پنداری بھی
ہر کسی کے لب پہ یہی کہانی ہے

رشد انمہ منتظر ہیں سیزوں! — وقفِ آلام زندگانی ہے

جناب احمد خاں ساحلؔ بمبئی

کیا عجب اپنی زندگانی ہے — پل میں غم پل میں شادمانی ہے
جان دے دی تمہاری فرقت میں — اپنی یہ مختصر کہانی ہے
نہ لگے جس کو روگ الفت کا — وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے!
رہِ الفت میں مرنے والوں کی — موت ہی اصل زندگانی ہے
جب سے تو بدگماں ہوا مجھ سے — ساری دنیا کو بدگمانی ہے

جناب غنیؔ فاروقی کلم نوری

آئینہ دار تجربِ بے پایاں — مرے جذبات کی روانی ہے
تھامئے دامنِ عمل ہمدم — کہ یہی رازِ کامرانی ہے
قدمِ استوار کے آگے — کامرانی ہی کامرانی ہے
ضربت کا لا الٰہ الا اللہ — آب شمشیر حکمرانی ہے
کب تھے اشعار قابلِ تحسیں — اے غنیؔ اُن کی مہربانی ہے

جناب عاصیؔ ننگھلوی

زندگی ایک نقشِ فانی ہے — موت کے بعد زندگانی ہے
اور کیا ہے جہانِ الفت میں — بدگمانی ہی بدگمانی ہے
میری ہمت کا امتحان ہے آج — اور سر سے بلند پانی ہے
ہے چمن میں بہار کی آمد — کس کی شاید اس نے ٹھانی ہے
حشر میں بندائے رحمت تھی — کوئی عاصیؔ کی بھی کہانی ہے؟

جناب حبیبؔ از کوکشی

یہی رودادِ زندگانی ہے — زندگی غم کی اک کہانی ہے
یہ جہاں اک سرائے فانی ہے — نقش برآب زندگانی ہے
دل میں شعلے کسی کی الفت کے — اور آنکھوں سے خونفشانی ہے
میں ترے پاس خود چلا آتا — حائلِ شوق ناتوانی ہے
موت ہے اک طلسمِ راز حبیبؔ — محرمِ راز زندگانی ہے

جناب سلامؔ ساگری

خوب دستورِ بے زبانی ہے — دل کی آنکھوں سے ترجمانی ہے
عشق ہے اور نوجوانی ہے — کتنی رنگیں مری کہانی ہے
دارِ فانی سے اک ذرا ہٹ کر — ہم کو دنیا نئی بسانی ہے
چاندنی رات اور وہ پیشِ نظر — آج کی رات کیا سہانی ہے

اے سلامؔ ان کی یہ کوشش ہوں ضرور — ایک دن یوں بھی جان جانی ہے

جناب خلیلؔ آملیشری

یہ میری شرحِ زندگانی ہے — کچھ فسانہ ہے کچھ کہانی ہے
جلوۂ برق، موجِ بادِ سحر — یہی تفسیرِ نوجوانی ہے
اللہ اللہ بہار کے جلوے — خاکِ گلشن بھی آسمانی ہے
کھنچے آتے ہیں دل نگاہ کے ساتھ — واہ کیا چیز نوجوانی ہے
تیلیوں میں قفس کی رہ کے خلیلؔ — ننگ میری یہ پرفشانی ہے

جناب کلیم شمسؔ آبادی

گلِ افسردہ کی زبانی ہے — حسن فانی ہے حسن فانی ہے
ہم بہاتے ہیں خون آنکھوں سے — وہ سمجھتے ہیں صرف پانی ہے
بیوفا تجھکو ڈھونڈنے کے لئے — سارے عالم کی خاک چھانی ہے
عزمِ راسخ تو پہلے کر پیدا — تیرے قدموں میں کامرانی ہے
یاد ایسے میں اُن کی آتی ہے — چاندنی رات کیا سہانی ہے

جناب شرماؔ انبالہ چھاؤنی

مختصر یہ ہے زیست کا قصہ — زندگی غم کی اک کہانی ہے
ضعف سے جھک گئے ہم نہیں چلتے — ڈھونڈتے ہیں کہاں جوانی ہے
پھول ہنستے ہیں روتی ہے شبنم — عشق کی بھی عجب کہانی ہے
دہر میں کیا ثبات کا ارماں — اس کی ہر چیز آنی جانی ہے
اُلٹی دنیا ہے عشق کی شرماؔ — ایسی ناکامی، کامرانی ہے

جناب غیرتؔ مورانوی

آپ ہی آپ ہوش کھو بیٹھا — یہ جوانی بھی کیا جوانی ہے
کر نہ برباد دل کی دنیا کو — یہ محبت کی راجدھانی ہے
آشیانہ ہو یا قفس ہمدم — کوئی بھی ان میں جاودانی ہے؟
آگئے وہ خیال میں میرے — رقص میں آج پھر جوانی ہے
زندگی ہے گرانبہا غیرتؔ — لیکن افسوس آنی جانی ہے

جناب شاربؔ ناگپوری

اب کسے شوق زندگانی ہے — اب تو مرنے کی [illegible]
سارا عالم ہے گوش بر آواز — کس کی [illegible] کہانی ہے
دل رز رہے لگے ستاروں کے — [illegible] اپنی زندگانی ہے
کیا یہاں کوئی شے نہیں باقی؟ — [illegible] نہ اک روز جان جانی ہے

اُن کی محفل میں جاکے شاربِ آج … اپنی رودادِ غم سُنانی ہے

جنابِ خادم جبلپوری

اُس نے جانے کی دل میں ٹھانی ہے … تو کہاں مرگِ ناگہانی ہے
حُسن تیرا جو غیر فانی ہے … میری اُلفت بھی جاودانی ہے
پوچھ لینا اگر کلیم ملیں … اب بھی کیا ذوقِ لنترانی ہے
اُن کا جلوہ بقدرِ ظرف ہے عام … اب نہ موسیٰؑ نہ لنترانی ہے

جنابِ سحر اعظم گڑھی

عشق میں انتہائے ناکامی … اصل میں عشق کامرانی ہے
تیری فرقت میں تجھ کو کیا معلوم … کتنی بے کیف زندگانی ہے
نغمۂ زندگی فزائے تری … شمعِ اُمید پھر جلانی ہے
چشمِ انجم سے پوچھتا ہوں سحر … شبِ غم کس قدر سُہانی ہے

جنابِ … از کرہٹی

عارضی موت و زندگانی ہے … نعمتِ عشق جاودانی ہے
آہ کیا عشق کی کہانی ہے … جو مری اور تری زبانی ہے
… سوچو مجھے ہر … ہنے کیوں اتنی خاک چھانی ہے
یاد میں اسکی جی لو … ذرہ یہ زندگانی ہے

جنابِ محمود ایوبی

زندگی غم کی اک کہانی … امتحانی ہے
سوزِ اُلفت کی مہربانی … گر کہانی ہے
سُن لے رودادِ مختصر سُن … کی کہانی ہے
نہیں دل کی یہ سرگذشت کلیم … سانی ہے

جنابِ انور سلیمانی (جالندھر)

عیش کو چھوڑ، عیش فانی ہے … ہے
راہِ اُلفت میں خاک ہے اے دل … ہے
اک نفس بھی خوشی نصیب نہیں … کتنی بے کیف زندگانی ہے
بادۂ عشق نوش کر انور … کہ سرور اسکا جاودانی ہے

جنابِ شاہ آزاد موتیہاری

حُسن ہے وہ ہیں نوجوانی ہے … درد ہے میں ہوں ناتوانی ہے
منفعل ہوں خطاؤں پر اپنی … آگے مولیٰ کی مہربانی ہے
ہے جو ارماں جو میری تقدیر … کوئی شاید مرا [illegible]

اپنے مطلب کے یار ہیں سب آہ … کتنی دُنیائے دوں میانی ہے

جنابِ سلطاں نقشبندی پالوروی (الولہ)

کاش ایسے میں آئیں باغ میں وہ … آہ کتنی فضا سُہانی ہے
سوزِ دل کی کہیں حکایت آہ … سازِ دل پر مجھے سُنانی ہے
اللہ اللہ ترقیٔ تہذیب! … ہر طرف آج خونفشانی ہے
ہے بھنور میں سفینۂ سلطاں … ڈوب جانے کی یہ نشانی ہے

جنابِ خیال قریشی احمد آبادی

خون آنکھوں میں ہے نہ پانی ہے … آپکے غم کی مہربانی ہے
رنج سے غرض نہ راحت سے … یہ بھی فانی ہے وہ بھی فانی ہے
کیا مٹائیگا آسماں اسکو … داغِ دل نقشِ غیر فانی ہے
اے خیالؔ اُن مسرتوں پہ نثار … جن سے تعمیرِ زندگانی ہے

جنابِ لطیف نشتر (اسلامی)

جو گزرتی ہو وہ گذر جائے … صرف دو دن کی زندگانی ہے
طور و موسیٰؑ کا ذکر رہنے دو … یہ کہانی بہت پرانی ہے
جستجو میں کسی کی اے نشتر … مدتوں ہم نے خاک چھانی ہے

جنابِ شباب دہلوی از رواڑی

زندگی کب یہ جاودانی ہے … چند روزہ ہے اور فانی ہے
تذکرہ اُن کا اور میں ہر دم … یہی قصہ، یہی کہانی ہے
شوخیوں سے وہ کھیلتے ہیں شباب … نئی دُنیا نئی جوانی ہے

جنابِ جارج۔ کوہ آبو

آگے آگے رواں دواں کچھ ہیں … پیچھے پیچھے یہ عمرِ فانی ہے
ایک ہچکی میں خاتمہ ہوگا … مختصر زیست کی کہانی ہے
جارج اس بُت کے آستانے پر … آج تقدیر آزمانی ہے

جنابِ غافل از بتول

کیا کہوں تم سمجھ نہیں سکتے … زندگی عمر کی اک کہانی ہے
موتیوں کی طرح ٹپکتے ہیں … آنسوؤں کی بھی کیا روانی ہے
پوچھ لیتے ہیں بات غافل کی … مہربانوں کی مہربانی ہے

جنابِ کلیم سہسرامی

یہ جو آنکھوں کی خونفشانی ہے … شرحِ حالِ غمِ نہانی ہے
[illegible] تمھارے ہیں بیچ نے … کہ لہو بھی جگر میں پانی ہے